عنایت اللہ
خاکی وردی لال لہو
شہرۂ آفاق ناول ''طاہرہ'' کا دوسرا حصّہ
PAKISTANIPOINT
1
مکتبہ داستان

خاکی وردی لال لہو

جلد اول

شہرۂ آفاق ناول ''طاہرہ'' کا دوسرا حصہ

عنایت اللہ

واحد تقسیم کار

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 7352332، 7232336 فیکس: 7223584

www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

پیش لفظ

”طاہرہ“ کا دُوسرا حصّہ ”خاکی وَردی لال لہو“ پیشِ خدمت ہے۔ کہانی آٹھ سو صفحات پر پھیل گئی ہے اس لیے یہ ہم دو جلدوں میں پیش کر رہے ہیں۔ پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میں جب ناول ”طاہرہ“ لکھ رہا تھا تو مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ یہ اتنا زیادہ مقبول ہو گا کہ قارئین اور نقّاد متفقہ طور پر رائے دیں گے کہ یہ ناول بیٹی کے جہیز میں شامل ہونا چاہیئے۔ ”طاہرہ“ کو مزید شہرت ٹیلیویژن والوں نے اس طرح دی کہ اسے قسط وار ڈرامہ بنا کر دکھانا شروع کیا لیکن اس کے تحریکِ پاکستان والے حصّے کو نہ حکومتِ پاکستان برداشت کر سکی نہ بھارت سرکار۔ چنانچہ اس ناول کے ڈرامے سے تحریکِ پاکستان کا تمام تر حصہ نکال دیا گیا اور کہانی میں باقی جو کچھ رہ گیا تھا اسے مسخ کر کے ٹی۔وی پر پیش کیا گیا۔ ملک کے تقریباً تمام اخباروں نے اپنے کالموں میں احتجاج کیا کہ ”طاہرہ“ کی روح نکال دی گئی ہے۔

اس طرح ” طاہرہ“ کو مزید شہرت ملی۔ اس کے بعد کئی قارئین نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کہانی کو آگے چلایا جاتے جس میں جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء اور جنگِ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پوری طرح بیان کیا جاتے۔

کام بڑا لمبا اور خاصا نازک تھا۔ تجویز بہر حال مجھے پسند آئی اور میں نے اس پر کام شروع کر دیا۔ ”طاہرہ“ کی کہانی اُس مقام پر ختم ہو گئی تھی جہاں طاہرہ کو اپنا باپ جس کے متعلق اُسے یقین تھا کہ مر چکا ہے، زندہ مل جاتا ہے، ارشد کو طاہرہ مل جاتی ہے جسے وہ چھ برسوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔ طاہرہ پہلی بار اپنی مری ہُوئی اُس سہیلی کے بچّے کو دیکھتی ہے جس پر اُس نے اپنی پہلی اور آخری محبت قربان کر دی تھی۔

اس بچّے کی خاطر باپ (ارشد) دوسری شادی نہیں کرتا اور بچّے کا شعور بیدار ہوتے ہی اُسے تحریکِ پاکستان کی کہانیاں سنانی شروع کر دیتا ہے۔ اُسے بتاتا ہے کہ یہ پاکستان کتنا خون دے کر حاصل کیا گیا تھا اور اسے دشمن سے بچاتے رکھنا آج کی نسل کا فرض ہے۔ باپ نے بچّے کے جذبات میں آگ بھر دی۔

میں نے خود بھی محسوس کیا کہ اس بچّے سے کہانی آگے چلائی جا سکتی ہے اور نئی نسل کو بتایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کو کون سے بیرونی اور اندرونی دشمنوں کا سامنا ہے اور نئی نسل کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ یہ بات کہانی کی صورت میں کرنی تھی تاکہ کہانی کی دلچسپیاں اصل بات کو دلوں میں اُتار دیں۔ یہ ایک حقیقت ہے افسانہ نہیں۔ میں نے حقیقی زندگی سے کردار نکالے بعض کو میں جانتا تھا، کچھ اور مل گئے بعض کو یادوں کے دریچوں سے دیکھا اور ان سب کو ایک کہانی میں پرو لیا۔

اس بڑی لمبی کہانی میں آپ کو بھارت کے بڑے خوبصورت جاسوس ملیں گے۔ ان کی خفیہ سرگرمیاں بھی آپ دیکھیں گے۔ کشمیر کا کمانڈو اپریشن ”جبرالٹر“ بھی اس میں شامل ہے۔ دل دہلا دینے والے کمانڈو ایکشن بھی آپ دیکھیں گے۔ پھر جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کا پس منظر اور جنگی مناظر آپ کے سامنے آئیں گے۔ اس جنگ

کا میں عینی شاہد اور مبصّر ہوں ۔ اسی جنگ نے مجھے پاکستان کا واحد جنگی وقائع نگار بنایا تھا ۔ میں نے
س ناول (خاکی وردی لال لہو) میں جنگِ ستمبر کے ہر پہلو کو شامل کیا ہے ۔

پھر ۱۹۷۱ء کی جنگ آتی ہے اور آدھے پاکستان کو اپنے ساتھ ہی لے جاتی ہے ۔ میں نے اس جنگ کے پس منظر اور پیش منظر کو کھل کر بیان کیا ہے ۔

میں نے ناول کو کہیں بھی خشک نہیں ہونے دیا کئی مناظر اتنے جذباتی ہیں جو آپ کی آنکھیں پُرنم کر دیں گے ۔ اس میں آپ کو ایسے بدکار بھی ملیں گے جو گناہوں کا کفّارہ ادا کرتے ہیں ۔ میں کہانی پر مزید تبصرہ نہیں کرنا چاہتا ۔ صرف یہ کہوں گا کہ اس میں آپ کو کہانی کے تمام تر لوازمات ملیں گے اور ایسی حقیقت کو آپ اپنے سامنے بے نقاب دیکھیں گے جو آپ کے خون کو گرما دے گی ، آپ کو شرمسار کر دے گی اور آپ کی سوچوں میں انقلاب بپا کر دے گی ۔

کہانی اچھی ہے یا نہیں ، اس کا فیصلہ قارئین کریں گے ۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے ۔

ایک تلخی سی ہے جس نے مجھے بہت پریشان کیا ہے ۔ یہ ناول "حکایت" میں قسط وار چھپتا رہا ہے ۔ س دوران ہم پر سنسر کی پابندی عائد کر دی گئی ۔ سنسر کی قینچی بڑی بے رحمی سے چلائی گئی ۔ اس قینچی نے اس ناول کو بھی نہ بخشا ۔ بے شمار فقرے بلکہ پیرے کاٹ دیئے گئے اور انہیں ضائع کر دیا گیا ۔ غور فرمایئے کہ یہ ایک ناول ہے جس میں پاکستان کے دشمنوں کا اور پاکستان کے دفاع کا ذکر ہے مگر اس میں سے بھی سنسر نے کچھ حصّے کاٹ دیئے ۔

اب میں ان اقساط کو کتاب کی صورت میں یکجا کرنے لگا تو مجھے سنسر کے پیدا کیے ہوئے خلاء پر کرنے میں بہت دشواری ہوئی ۔ بڑے اچھے اور پُراثر فقرے اور پیرے کاٹ دیئے گئے تھے ۔

بعض قارئین نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں نے کئی معرکۃ الآرا ناول لکھے ہیں لیکن کبھی کسی ناول کی تقریبِ رونمائی کی خبر اخباروں میں نہیں آئی نہ کبھی کسی اخبار کے ادبی ایڈیشن میں کسی ناول کا کبھی ذکر آیا ہے ۔ س ضمن میں عرض ہے کہ میں ادبی ایڈیشنوں میں آنے والا ادیب نہیں نہ مجھے رُونمائی کی ضرورت ہے ۔ ہ میں نے رائٹرز گلڈ کے انعامی مقابلے میں کبھی اپنا ناول بھیجا ہے کیونکہ میں سستی شہرت کے لیے فرشی سلام کرنے والا ادیب نہیں ، نہ میں اسلام آباد کی اہلِ قلم کانفرنس کے مدعوئین میں سے ہوں ۔ میں

اُندلس کے آخری دَور کے ادیبوں اور مدح سرا شاعروں میں سے نہیں ہوں جنہوں نے سلطنتِ خداداد اُندلس کا بوریا بستر وہاں سے گول کیا تھا ۔ میرے سامنے ایک مشن ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک فرض سونپا ہے ۔ مجھے اس مشن اور اس فرض کی تکمیل عزیز ہے ۔

ناول کے عنوان کے متعلق کچھ عرض کر دوں ۔ ہم نے اس ناول کا عنوان تجویز کرنے کے لیے قارئین کو دعوت دی تھی کیونکہ یہ ناول قارئین کی فرمائش پر ہی لکھا گیا تھا ۔ ہمیں بارہ ہزار چار سو تریّن عنوان ملے تھے ۔ ان میں سے کوئی عنوان ناول کی روح سے مطابقت نہیں رکھتا تھا ۔ آخری قسط کے ساتھ عنوان لازمی تھا ۔ ہم نے عنوان کے لیے ایک ہزار روپے کے انعام کا اعلان کر رکھا تھا جو ہم قارئین کو بہرصورت پیش کرنا چاہتے تھے مگر قارئین کی طرف سے کوئی موزوں عنوان مل نہیں رہا تھا ۔ اس مسئلے کو ہم نے یوں حل کیا :

کمیٹی نے ایک عنوان چن کر سربمہر کر لیا جو ناول کے مصنّف تک کو نہ بتایا گیا ۔ کمیٹی نے قارئین کو موقع

دینے کے لیے ہم سے اعلان کرایا کہ ناول کا عنوان آخری قسط میں موجود ہے ۔ یہ بڑا ہی واضح اشارہ تھا ۔ عنوان موصول ہونے لگے جو ہم دیکھے بغیر کمیٹی کے بکس میں ڈالتے رہے ۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء شام سات بجے کمیٹی نے "حکایت" کے دفتر میں سربمہر عنوان لفافے سے نکالا ۔ یہ تھا "خاکی وردی لال لہو" ۔ کُل عنوان جو موصول ہوئے ، ان کی تعداد چھبیس ہزار تین سو پندرہ تھی ۔ ہم نے قارئین کو یہ رعایت دی تھی کہ ہر قاری ایک سے زیادہ عنوان بھیج سکتا ہے ۔ ایک صاحب نے ایک سَو ایک عنوان بھیجے ۔ تیس سے چالیس تک تو کئی قارئین نے بھیجے تھے ۔

ان میں سے کمیٹی نے سینتالیس عنوان انتخاب میں شامل کیے جن میں سے چھبیس بالکل صحیح نکلے اور انہیں انعام کا مستحق قرار دیا گیا ۔ ہم نے ایک ہزار روپیہ انعام کا اعلان کیا تھا ۔ اس رقم کو چھبیس خواتین و حضرات میں تقسیم کریں تو بہت تھوڑی رقم ہر ایک کے حصّے میں آتی تھی ۔ ہم نے انعامی رقم ایک ہزار سے بڑھا کر دو ہزار چھ سَو روپے کر دی تاکہ منتخب عنوان بھیجنے والے ہر قاری کو ہم ایک سو روپیہ پیش کر سکیں جو ہم نے پیش کر دیا ۔

انعام پانے والوں کے نام

۱ ۔ امان اللہ سُومرو پٹھان محلّہ لقمان ۔ ضلع خیرپور
۲ ۔ چوہدری محمد یونس ڈسپنسر ۔ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال بھکّر
۳ ۔ مطیع الحق ۔ کوارٹر نمبر ۱۸ ۔ جی / ۹ ۔ ۱۱۷ ۔ پی او ایف واہ کینٹ
۴ ۔ رقیّہ سلطان ۔ بی ۔ ا خیبر کالونی پشاور
۵ ۔ محمد اسلم کھوکھر پرسنل نمبر ایم ۔ ای ۳۹۸۰۱۶ پی او ایف گدوال ۔ ضلع راولپنڈی
۶ ۔ ڈاکٹر عمر خطاب دُرّانی مسجد توحید ۔ خیشگی پایان تحصیل نوشہرہ ۔ ضلع پشاور
۷ ۔ شریف اللہ ۔ اولڈ ٹائر سروس ۔ مردان چھاؤنی
۸ ۔ محمد سرور صدیقی ولد نائب صوبیدار دیوان علی ۔ سوکنونڈ تحصیل پسرور ۔ ضلع سیالکوٹ
۹ ۔ اعجاز احمد امجد ۔ مکان نمبر ۲۴۰۳ محلہ کنگڑ مسجد ۔ مانسہرہ
۱۰ ۔ محمد اجمل ۔ پریپ سکول ۔ گھوڑا گلی کالج مری
۱۱ ۔ محمد یونس ۔ فنانس منیجر ۔ سوات چاتنا کلے پراجیکٹ مینگورہ ۔ سوات
۱۲ ۔ محمد اشرف ۔ مکان نمبر ۶ ساہواڑی ۔ گندہ نالہ ۔ شالامار لنک روڈ لاہور
۱۳ ۔ محمد قیام الحق ۔ اے ۔ ۱۱ حُور اپارٹمنٹ سیکٹر I ۔ ۱۱ نارتھ کراچی
۱۴ ۔ لطیف چوہدری ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۳ ۔ مدینہ منورہ سعودی عرب
۱۵ ۔ عبدالکریم ۔ III ۔ جی ۔ ۱۲۷ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور ۔ ۱۴
۱۶ ۔ سہیل رضوان معرفت عبدالغفور ۔ دفتر آئی ۔ او ۔ ڈبلیو ۔ پاکستان ریلوے ۔ سیالکوٹ
۱۷ ۔ اورنگ زیب قریشی فورمین ۔ شادمان کاٹن ملز ۔ ای ۔ ۱۱ کوٹری ۔ ضلع دادو
۱۸ ۔ جویریہ سلیم معرفت ایس ۔ ایم سلیم ۔ طارق ہاؤس سٹریٹ نمبر ۲ محلّہ اسلام آباد ۔ گوجرانوالہ

۱۹۔ TASAWAR IQBAL 133-ABERCROMBY AVENUE HIGH WYCOMBE BUCK'S U.K

۲۰۔ چوہدری ذوالفقار علی۔ کوٹھہ کلاں۔ مورگاہ۔ راولپنڈی

۲۱۔ محمد جہانگیر خان قادری۔ سعید میڈیکل سٹور۔ بیرون لوہاری گیٹ۔ لاہور

۲۲۔ شبّیر عالم شیخ ایڈووکیٹ۔ ۲۵۔ ڈسٹرکٹ کورٹس۔ فیصل آباد

۲۳۔ عبدالغفار مکینک۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۰۹۱۶۔ ریاض۔ سعودی عرب

۲۴۔ علی اصغر۔ کول کمیشن ایجنٹ۔ مچھ بولان۔ بلوچستان

۲۵ انجم شیخ۔ مکان نمبر ۳/۵۸۲ شاہ فیصل کالونی۔ کراچی۔ ۲۵

۲۷ سیّد امجد علی شاہ۔ ۶/۵ شالامار ٹاؤن۔ سلطان محمود روڈ۔ لاہور ۹

تمام خواتین و حضرات کو ناول کی ایک ایک کاپی اعزازی طور پر پیش کی گئی ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

راولپنڈی سے لاہور جانے والی ریل گاڑی جب اُن پہاڑیوں میں داخل ہوئی جو جہلم اور راولپنڈی کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں تو دن کی روشنی کو اندھیرے نے نگل لیا۔ ریل گاڑی کا شور اور زیادہ بڑھ گیا۔ پہیوں کی ٹھک، ٹھکا ٹھک اور زیادہ بلند ہوگئی۔ اس شور میں عتاب سا تھا جیسے ریل گاڑی اندھیرے کو چیر کر اُجالے میں چلی جانے کی کوشش کر رہی ہو۔

ریل گاڑی اندھیرے سے نکل گئی۔ اس کے ڈبے پھر روشن ہو گئے۔ اب کے انجن کی چھک چھکا چھک یوں سنائی دی جیسے کالا سیاہ انجن اندھیرے پر قہقہے لگا رہا ہو۔

اندھیرے نے اُجالے پر ایک بار پھر حملہ کر دیا۔ اب کے اس نے پوری گاڑی کو نگل لیا۔ انجن کی آواز اور زیادہ گرجدار ہوگئی اور اُس کا اُگلا ہوا دھواں ڈبے کے اندر آنے لگا۔

"امّی جان! دیکھنا، اب پھر روشنی ہو جائے گی .... ابھی آتی .... ابھی آتی .... یہ آگئی۔"

معصوم سی آواز نے طاہرہ کو چونکا دیا۔ اُسے دھچکا سا لگا لیکن اپنے ساتھ لگے بیٹھے بچّے کو ہنستا دیکھ کر اُس کی بھی ہنسی نکل گئی۔ چھ سال کی عمر کا بچہ گھوما اور سیٹ پر گھٹنے ٹیک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"ہاں طاہری!" — طاہرہ نے بچّے کی طرف دیکھتے ہوئے زیرِ لب کہا — "ہر اندھیرے کے بطن سے روشنی جنم لیا کرتی ہے" — وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی — "اندھیرے روشنیوں کو ہڑپ کرنے کے لیے لپکتے جھپٹتے رہتے ہیں لیکن روشنی کی خفیف سی کرن گھُپ اندھیروں کا جگر چاک کر دیا کرتی ہے۔"

"بچّہ ماشاء اللہ ذہین معلوم ہوتا ہے" — ریل گاڑی کے شور میں سے ایک پختہ سی نسوانی آواز طاہرہ کے کان میں پڑی۔ اُس نے اُدھر دیکھا۔ ایک اُدھیڑ عمر معزّز سی عورت اُسے کہہ رہی تھی — "تمہارا بھائی ہے یا بیٹا؟"

سنسناتا ہُوا ایک تیر طاہرہ کے سینے سے پار ہو گیا۔ اُس کے ساتھ سفر کرتا ہُوا بچّہ اُس کا بھائی نہیں تھا۔ وہ اُس کا بیٹا بھی نہیں تھا۔ وہ اُس کا کچھ بھی نہیں لگتا تھا۔ طاہرہ نے سینے میں بہت تیر کھائے تھے۔ اُس نے ہر تیر اپنے دل و جگر میں جذب کر لیا تھا۔ اس تیر کو بھی اس نے اپنے سینے میں چھپا لیا۔ بازو لمبا کر کے اُس نے بچّے کو بازو کے گھیرے میں لیا اور اپنی گود میں گرا کر اُس کی پیشانی چُومی۔

"یہ میرا بیٹا ہے" — طاہرہ نے کہا — "طاہری .... طاہر پرویز۔"

اس کے بعد طاہرہ نے توجہ نہ دی کہ اُس کی یہ اُدھیڑ عمر ہمسفر کیا کہہ رہی ہے اور کیا پوچھ رہی ہے۔ وہ طاہر پرویز میں کھو گئی تھی۔ بچّہ اُس کی گود میں چت لیٹا ہُوا تھا اور طاہرہ اس کے نرم اور ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔ بچے کے معصوم چہرے میں طاہرہ کو کئی چہرے نظر آنے لگے۔ نمایاں چہرے

ارشد اور عفّت کے تھے۔ بچّے کے خدوخال میں ارشد اور عفّت نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔

بچّے کے چہرے پر طاہرہ کو اپنی داستان لکھی ہُوئی نظر آ رہی تھی۔ اُسے اس داستان کے تمام کردار اس معصوم چہرے میں دکھائی دیتے۔ ان سب نے اس کی زندگی کی ریل گاڑی کو تاریکی میں دھکیل دیا تھا۔ ابھی ابھی ریل گاڑی پہاڑی علاقے سے گزرتے جن دو تاریک سرنگوں میں داخل ہوئی تھی، وہ زیادہ لمبی نہیں تھیں۔ گاڑی چند سیکنڈ میں دونوں میں سے گزر آئی تھی مگر طاہرہ کی زندگی کی ریل گاڑی جس سرنگ میں داخل کر دی گئی تھی، وہ بڑی ہی لمبی تھی۔ اس میں سے نکلتے اُسے سات سال لگے تھے۔

"کیا تاریک سرنگ ختم ہو گئی ہے؟" ۔۔۔ یہ سوال اُسے پریشان کرنے لگا۔

"امّی جان! دیکھنا، اب پھر روشنی ہو جائے گی" ۔۔۔ بچّے کے الفاظ اُس کے ذہن میں گونجنے لگے۔

"میں تھک گئی ہوں" ۔۔۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا ۔۔۔ "اُف میرے خدا! میں تھک گئی ہوں۔"

"بھول جاؤ" ۔۔۔ اُسے ایک اور آواز سنائی دی جو اُس کی اپنی ہی تھی ۔۔۔ "دِن جو گزر گئے ہیں، انہیں ذہن سے اُتار دو۔ ماضی کی زنجیریں توڑ دو۔ اُگل دو اُن یادوں کو۔"

ہو نہیں سکتا۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ماضی آسیب کی طرح حال اور مستقبل پر سوار رہتا ہے، اور جس کا سارا ماضی آسیب زدہ ہو وہ ایک مسلسل خوف کی زندگی بسر کرتا ہے۔ طاہرہ کے اعصاب پختہ تھے مگر قلعوں کی دیواریں بھی ٹوٹ جایا کرتی ہیں۔ طاہرہ کے اعصاب میں ابھی کچھ دم باقی تھا مگر کوئی ہلکا سا اشارہ یا اپنے ہی ذہن سے اٹھا ہُوا ایک جھونکا اُسے دور پیچھے لے جاتا تھا اور اُسے وہ سب کچھ یاد آ جاتا تھا جو وہ بھول جانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اب جب کہ وہ سات سال بعد لاہور جا رہی تھی اور ارشد نے اُسے کہا تھا کہ اُس کی زندگی کی تلخیاں اور تاریکیاں ختم ہو چکی ہیں تو بھی ماضی اس کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔

لاہور کو جاتی ہوئی ریل گاڑی جب سرنگ کی تاریکی میں سے گزری تو طاہرہ کو اٹک سے آگے کی وہ سرنگیں یاد آ گئیں جن میں سے گزر کر وہ اپنے سسرال گئی تھی اور ابھی اُس کے ہاتھوں سے مہندی کا رنگ بھی نہیں چھٹا تھا کہ وہ بیوہ ہو کر انہی سرنگوں میں سے گزری اور راولپنڈی آ گئی۔ اُسے مختصر سی ازدواجی زندگی کا ایک ایک لمحہ یاد آیا۔ اپنا خاوند نعیم اور اُس کا بھولپن یاد آیا۔ اُسے اپنا سُسر یاد آیا جو مجسّم وقار اور پیار تھا مگر اُس کی ساس عورت کے روپ میں ڈائن تھی۔

"کیا کوئی ماں تسلیم کرے گی کہ وہ اپنے بیٹے کو کھا گئی ہے؟" ۔۔۔ طاہرہ کو خیال آیا ۔۔۔ "اپنی بہو کے خلاف محاذ آرائی میں کوئی ساس نہیں سوچتی کہ وہ اپنے بیٹے کی ازدواجی مسرّتوں میں زہر گھول رہی ہے اور ایک دن یہ میٹھا زہر اُس کے بیٹے کی جان لے لے گا۔"

طاہرہ کی ازدواجی مسرّتوں کو اور اُس کے خاوند کو ایسی ہی ایک ساس نے ڈس لیا تھا۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب اُس کے خاوند کا، اُس کے سہاگ اور اُس کے ارمانوں کا جنازہ نکلا تھا۔ طاہرہ اس بھیانک یاد سے لرز اٹھی۔ اُس پر خوف طاری ہو گیا۔ اُس نے دیکھا، طاہر پرویز اُس کی گود سے اُٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا بیٹھا تھا۔ طاہرہ نے لپک کر بچّے کے گرد بازو لپیٹا اور اُسے پھر گود میں لٹا لیا، اور اب کے اُس نے بچے کو اس طرح گود میں لٹا کر اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا جیسے اُس کی ساس جیسی کوئی عورت بچّے کی مسرّتوں میں زہر گھولنے کے لیے دبے پاؤں بڑھی چلی آ رہی ہو۔

"نہیں ... نہیں" ۔۔۔ طاہرہ اپنے آپ میں کانپنے لگی ۔۔۔ "ایسے نہیں ہوگا۔ اس بچّے کی مسرّتوں پر میں اپنی خوشیاں قربان کر دوں گی۔"

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر بے خیالی سی میں یوں ہاتھ پھیرا جیسے ذہن کے کواڑ بند کر دیتے ہوں کہ اب ماضی کی کوئی یاد ذہن میں نہ آنے پاتے مگر ریل گاڑی اُسے جس ماحول میں سے گزار رہی تھی، وہ اُسے گھسیٹ گھسیٹ کر ماضی کی طرف لیے جا رہا تھا اور دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہُوئے ریل گاڑی کے پہیّوں کی ٹھک، ٹھکا ٹھک اور زیادہ بلند ہو جاتی تھی جیسے گزرے ہوئے دن طاہرہ کے ذہن کے بند کواڑوں کو بڑی زور زور سے کھٹکھٹا رہے ہوں۔

ذہن کے کواڑ بڑے کمزور ہوتے ہیں۔ انہیں لاشعور کی دیمک کھاتی رہتی ہے۔ ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے کُھل جاتے ہیں۔ کوئی ان پر آہستہ سے ہاتھ رکھے، پیار سے چاہے غصّے سے ذہن کے کواڑ کُھل جاتے ہیں اور اس میں یادوں کے جھکڑ داخل ہونے لگتے ہیں۔

طاہرہ نے باہر دیکھا۔ ریل گاڑی پہاڑی کے دامن کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی اور دوسری طرف اُفق تک اُونچی نیچی چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ طاہرہ کو یوں لگا جیسے ریل گاڑی اٹک کا پُل پار کر کے سرحد کی پہاڑیوں میں داخل ہو گئی ہو اور وہ نعیم کے ساتھ پشاور اپنے سُسرال جا رہی ہو۔ وہ لمحے بہت خوبصورت تھے وہ طاہرہ کے ذہن میں رنگ برنگی چڑیوں کی طرح چہچہانے اور پھدکنے لگے۔ طاہرہ دلہن تھی لُتمانی سنجمہ نے راولپنڈی سے اُسے ماں کا پیار دے کر رخصت کیا تھا اور نعیم اُسے یوں اپنے ساتھ پشاور لے جا رہا تھا جیسے سہانے سپنوں کو سینے میں سمیٹ کر لے جا رہا ہو۔

خواب پانی میں گھولے ہُوئے صابن کے بلبلے ہوتے ہیں بچہ نلکی میں سے پھونک مارتا ہے تو بلبلے کتنے رنگ دکھا کر اور ذرا سا اُڑ کر پھٹ جاتے ہیں نعیم اور طاہرہ کے خواب بھی بِن کِھلے مُرجھا جانے والے غنچوں کی طرح اور صابن کے بلبلوں کی طرح رنگ دکھا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر طاہرہ کی زندگی کی ریل گاڑی ایسی ہی پہاڑیوں میں سے گزر کر واپس وہیں آ گئی تھی جہاں سے وہ طاہرہ کو گود میں اُٹھا کے لے گئی تھی۔

"امّی!" ۔۔۔ اُسے طاہر پرویز کی پیاری سی آواز سنائی دی ۔۔۔ "امّی جان! لاہور میں ابّو مجھے جس کی قبر پر لے جایا کرتے ہیں وہ کون تھی؟ ... وہ میری امّی تو نہیں تھی نا؟ میری امّی آپ ہیں نا! ... ہیں نا امّی جان!"

طاہرہ کے ہونٹوں پر بہت بڑا جھوٹ آ گیا ۔۔۔ "ہاں طاہر! میں ہی تمھاری امّی ہُوں" ۔۔۔ مگر اُس کا دِل ڈوب گیا اور اُس پر رقّت طاری ہو گئی۔ اُس نے بڑی مشکل سے آنسو روکے۔ اُسے آنسو روکنے میں مہارت حاصل ہو گئی تھی۔

"بولو نا امّی جان!" ۔۔۔ طاہر پرویز نے پھر پوچھا ۔۔۔ "میری امّی آپ ہی ہیں نا!"

"ہاں طاہر!" ۔۔۔ طاہرہ نے بچے کا مُنہ چوم کر جھوٹ بول ہی دیا ۔۔۔ "میں نہیں تو اور کون ہے تمھاری امّی!"

"پھر وہ کون تھی جس کی قبر پر ابّو مجھے لے جایا کرتے ہیں؟"

"وہ ... وہ ..." طاہرہ نے ذرا جھجک کر دوسرا جھوٹ بھی بول دیا ۔۔۔ "وہ میری بہن تھی۔ تمھارے

ساتھ بہت پیار کیا کرتی تھی۔ تم ابھی بہت چھوٹے تھے تو وہ مرگئی تھی۔"

ریل گاڑی پہاڑی علاقے میں سے نکل گئی تھی اور طاہرہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے ریل گاڑی کبھی دائیں، کبھی بائیں مڑ رہی ہو۔ طاہرہ کا ذہن ڈول رہا تھا۔ ایک اس لیے کہ اُسے عفت یاد آگئی تھی، دوسرے یہ سوال اُسے پریشان کر رہا تھا کہ اِس بچے سے کب تک اس حقیقت کو چھپایا جا سکے گا کہ اُس کی ماں عفت تھی اور وہ اپنی زندگی اُسے دے کر مر گئی تھی ـــــ طاہر پرویز کی پیدائش عفت کی موت ثابت ہوئی تھی ـــــ وہ اپنے بچے کو دیکھ بھی نہیں سکی تھی۔

عفت یاد آئی تو طاہرہ کے وہ آنسو بہ نکلے جو اُس نے بڑی مشکل سے روک رکھے تھے۔ اُس نے بڑی جلدی سے آنسو دوپٹے میں جذب کر لیے اور بچے کی طرف دیکھا۔ اُسے یہ دیکھ کر اطمینان ہُوا کہ بچہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے طاہرہ کے آنسو نہ دیکھے، لیکن اُن عورتوں نے آنسو دیکھ لیے جو اُس کے سامنے بیٹھی ہُوئی تھیں۔

"کیوں؟" ـــــ ادھیڑ عمر معزز عورت نے طاہرہ سے پوچھا ـــــ "کیا بات ہے؟"

"اپنی بہن یاد آگئی تھی" ـــــ طاہرہ نے اُداس سی مُسکراہٹ سے کہا ـــــ "مر گئی ہے۔ میرے بچے کے ساتھ بہت پیار کیا کرتی تھی۔"

طاہرہ پھر خیالوں میں کھو گئی۔ اُس نے عفت کے لیے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ عفت اُس مرد کو چاہتی تھی جس کی روح میں طاہرہ اُتر گئی تھی اور جو طاہرہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا مگر طاہرہ نے عفت کی شادی اِس آدمی کے ساتھ کرا دی تھی۔ اس شادی کی نشانی طاہر پرویز تھا مگر عفت اپنے پیچھے اپنا بچہ ہی نہیں ایک ایسی کہانی بھی چھوڑ گئی تھی جس میں تلخیاں اور غلط فہمیاں تھیں اور جو پاکستانی معاشرے کا ایک المیہ تھا، اور یہ المیہ جس نے طاہرہ کی بہت بڑی قربانی سے جنم لیا تھا، طاہرہ کو جلاوطن کر گیا تھا۔

"بھول جاؤ" ـــــ اُسے پھر اپنی آواز سنائی دی ـــــ "بھول جاؤ اُن دنوں کو جو ماضی کے قبرستان میں دفن ہو گئے ہیں۔ آگے دیکھو۔ مستقبل کو ماضی کے آسیب سے بچاؤ۔"

ناممکن! ـــــ اُس کا باپ جو ماضی کے قبرستان میں دفن ہو چکا تھا اور جس کی اُس نے صورت بھی نہیں دیکھی تھی، اور جس کے متعلق یقین سے کہا جاتا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ گیا اور فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور جنگ میں مارا گیا تھا، چند دن پہلے طاہرہ کے سامنے آگیا تھا۔ باپ بیٹی ستائیس اٹھائیس سال بعد ملے۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہی نہیں تھے مگر خون نے اپنے خون کو پہچان لیا ـــــ بھولا بسرا ماضی طاہرہ اور اُس کے باپ کے سامنے آگیا۔

اور طاہرہ نے اپنی ماں کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ پیدا ہوئی اور اُس کی عمر ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں ہُوئی تھی کہ اُس کے باپ نے اُس کی نانی سے کہا کہ وہ بچی کو اٹھا لے جائے کیونکہ وہ لڑکی کا باپ نہیں کہلانا چاہتا۔ نانی نے اُسے کوئی سخت بات کہہ دی۔ طاہرہ کا باپ اُس کی نانی کو مارنے کے لیے دوڑا تو طاہرہ کی ماں جس کی زچگی کا ابھی نصف گھنٹہ بھی پورا نہیں ہُوا تھا، اٹھ کر اپنی ماں اور خاوند کے درمیان آگئی مگر نقاہت سے گر پڑی۔ خاوند اُس سے ٹھوکر کھا کر اُس کے اوپر اِس طرح گرا کہ اُس کے گھٹنے طاہرہ کی ماں کے پیٹ پر آ گئے۔ زچگی کی ماری ہوئی عورت برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ طاہرہ کا باپ گھر سے بھاگ گیا۔

طاہرہ کو نانی اٹھا کر لے آئی اور وہ جوان ہو گئی تو بھی نانی نے اُسے نہ بتایا کہ اُس کی ماں مر گئی تھی۔ وہ خود اُس کی ماں بنی رہی مگر اُس کی ماں ماضی کی تاریکیوں میں چھپی نہ رہ سکی۔ ایک تصویر نے پردے چاک کر دیئے لیکن اُس وقت طاہرہ کی نانی ۱۹۴۷ء کی ہجرت میں شہید ہو چکی تھی۔

طاہرہ نے ریل گاڑی میں لاہور کو جاتے ہوئے کئی بار سر کو جھٹکا دیا اور اپنے آپ کو بار بار تلقین کی کہ وہ ماضی کو بھول جائے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کا دِل ملول ہوتا جا رہا تھا۔ صرف ایک امید تھی جو ملال کو مسرّت میں بدل رہی تھی مگر امید کی یہ کرن مدھم پڑ جاتی تھی۔ اُس کی زندگی کی ریل گاڑی ایک اندھیری سرنگ سے نکلتی تھی تو سامنے ایک اور سرنگ منہ کھولے کھڑی ہوتی تھی۔ اب حالات نے ایسی غیر متوقع کروٹ بدلی تھی کہ اُسے اپنے سامنے اجالا نظر آنے لگا تھا۔

چھ سات دن ہی گزرے تھے کہ اُسے اپنا وہ باپ مل گیا تھا جسے وہ سمجھتی تھی کہ کبھی کا مر چکا ہے۔ یہ ڈرامائی بلکہ معجزانہ ملاقات تھی۔ باپ نے اُسے بتایا تھا کہ وہ اُس کی ماں کا قاتل ہے۔ پھر ارشد اور اُس کے بیٹے طاہر پرویز سے اس کی ملاقات بھی ڈرامائی اور غیر متوقع تھی۔ ارشد نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنا بچہ طاہرہ کے سوا کسی عورت کو نہیں دے گا۔ بچے کی ماں عفت نے وصیت بھی کی تھی کہ وہ زندہ نہ رہی تو طاہرہ کو ڈھونڈنا اور بچہ اُسی کو دینا۔ وہی اُس کے بچے کی ماں ہوگی۔

☆

زندگی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ طاہرہ نے تو تھوڑی سی عمر میں بہت سے رنگ دیکھ لیے تھے۔ اب اُس کی زندگی کی ریل گاڑی سرنگ سے نکل آئی تھی۔ اُس کے سامنے اور دائیں بائیں سبز پوش پہاڑیاں اور وادیاں تھیں۔ فضا روشن، ماحول منوّر تھا مگر طاہرہ کو زندگی نے جو چوٹیں لگائی تھیں، اِن کی ٹیسیں ابھی تھمی نہیں تھیں۔ یہ ٹیسیں اور کچھ اندوہناک تجربات اُسے ڈرا رہے تھے ـــــ انسانوں سے، آنے والے وقت سے ـــــ کبھی تو یہ خواہش دل سے اُمڈ آتی تھی کہ وہ اگلے سٹیشن پر اُتر جائے اور لاہور سے آنے والی گاڑی میں سوار ہو کر واپس راولپنڈی چلی جائے ـــــ مگر وہ ایک قیدی کی طرح جا رہی تھی۔ ارشد اور اُس کے بچے طاہر پرویز کی محبّت نے اُسے پابجولاں کر لیا تھا۔ ان زنجیروں کو وہ توڑ نہیں سکتی تھی۔

اُس کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ خون کا کوئی رشتہ زندہ نہ تھا۔ اب اُسے باپ مل گیا تھا لیکن باپ کو وہ سہارا یا پناہ نہیں سمجھتی تھی۔ یہ تو ایک ذمّہ داری تھی جو اُس پر آ پڑی تھی۔ وہ خود اپنی ایک اُستانی نجمہ کے گھر رہتی تھی۔ نجمہ کا خاوند تھا۔ بچے بھی تھے۔ وہ سب طاہرہ کو اپنے کنبے کا فرد سمجھتے تھے، پھر بھی طاہرہ کے ساتھ ان کا خون کا تو کوئی رشتہ نہ تھا ـــــ اسے اب باپ مل گیا تو یہ مسئلہ سامنے آگیا کہ باپ بیٹی اکٹھے رہیں مگر ارشد آ گیا اور اس کے ساتھ عفت کا بچہ بھی آ گیا۔

ارشد کا تبادلہ لاہور سے راولپنڈی ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بچے سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اُس نے راولپنڈی جاتے ہی کرائے کا مکان لے لیا اور بچے کو ساتھ لے آیا۔ بچے کو اُس نے اُس سکول میں داخل کرایا جہاں طاہرہ استانی تھی۔ یہ تو خدا نے ارشد اور طاہرہ کی ملاقات کا ایک سبب بنایا تھا۔ ارشد کی ماں اس کے ساتھ راولپنڈی جانا چاہتی تھی مگر ارشد اُسے ساتھ نہ لے گیا۔ اپنے گھر میں وہ کھچا کھچا رہتا تھا۔ کھچاؤ کی وجہ یہ تھی کہ اُسے ماں، باپ، بھابی اور بڑا بھائی دوسری شادی کے لیے کہتے رہتے

تھے۔ انہوں نے اس کے لیے ایک سے ایک اچھی لڑکی تلاش کی مگر ارشد اس ایک رٹ اور عزم سے نہ ہٹا کہ وہ طاہرہ کو ڈھونڈ لے گا اور اُسی کے ساتھ شادی کرے گا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ شادی کرے گا ہی نہیں۔ عفّت کو مرے چھ سال گزر گئے تھے۔ ارشد کی زبان پر دو ہی نام ہوتے تھے — طاہر پرویز جسے وہ طاہری کہتا تھا اور طاہرہ — ارشد کی ماں بیٹے کے غم میں بڑی تیزی سے بوڑھی ہوتی جا رہی تھی۔ طاہرہ جس طرح گھر سے نکل گئی تھی۔ اس سے ان لوگوں کی یہ امید ختم ہو گئی تھی کہ وہ واپس آ جائے گی۔

ارشد کے لیے طاہرہ ایک واہمہ اور ایسا تصور بن گئی تھی جسے وہ ٹھوس اور مجسم سمجھنے لگا تھا۔ تنہائی میں اس کے ساتھ وہ باتیں کرتا تھا۔ اس کی ماں اور بھابی نے کئی بار راتوں کو اس کے کمرے کے قریب سے گزرتے اُس کی بلند سرگوشیاں سنی تھیں — "طاہرہ! آ جاؤ.... مجھے آواز دو طاہرہ! میں آ جاؤں گا" — وہ محبت کے اُس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں سے دیوانگی کی کیفیت شروع ہو جاتی ہے — جنونی کیفیت جو انسان کا حقیقت سے رشتہ توڑ دیتی ہے۔

ارشد نے اپنے ماں باپ، بھائی، بھابی اور اُن کے بچوں سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ وہ اُن کے درمیان موجود ہوتے ہوئے غیر حاضر ہوتا تھا۔ اُس کا رشتہ قائم تھا تو اپنے بیٹے طاہری کے ساتھ اور طاہرہ کے تصوّر کے ساتھ۔ اس کیفیّت میں اُس کا تبادلہ راولپنڈی ہو گیا تو اُسے خوشی سی ہوئی کہ وہ اس محل جیسی کوٹھی سے جسے لاہور کے لوگ "آشا بھون" کے نام سے جانتے پہچانتے تھے۔ دُور جا رہا ہے۔ طاہرہ اسی کوٹھی سے بھاگی تھی۔ طاہرہ نے اسی کوٹھی میں ارشد کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ عفّت کے ساتھ شادی کرے۔ اسی کوٹھی میں عفت نے اُس کی زندگی جہنم بنا دی تھی پھر ایک بچّہ ارشد کی گود میں ڈال کر اور یہ وصیّت کر کے کہ میرا بچّہ طاہرہ کے سوا کسی کو نہ دینا، مر گئی تھی۔ اس کوٹھی میں طاہرہ کی اتنی غیر معمولی قربانی اُس کی رسوائی کا باعث بن گئی تھی۔

یہ کوٹھی ارشد کے لیے آسیب زدہ ہو گئی تھی۔ اس کے برآمدوں اور کمروں میں اُسے عفّت کی سسکیاں اور طاہرہ کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی رہتی تھی۔ چاندنی میں اُس نے طاہرہ کو لان میں ٹہلتے اور فضا میں تحلیل ہوتے دیکھا تھا۔ اُسے ایسی آوازیں سنائی دیتی تھیں جو وہ نہیں سننا چاہتا تھا:

"ابو! امّی کب آئے گی؟"

"ارشد بیٹا! طاہرہ نہیں آئے گی عفّت مر چکی ہے۔"

"بیٹا! اپنی جوانی پر رحم کرو۔"

"لوگ باتیں بنا رہے ہیں ارشد بیٹا! کہتے ہیں جانے اِس خاندان میں کیا خرابی ہے کہ ان کے جوان بیٹے کو کوئی رشتہ نہیں دیتا۔"

"لوگ کہتے ہیں امرتسر کے اِن مہاجروں کو کون رشتہ دے گا!"

"ارشد بھائی! مان جاؤ۔"

یہ الفاظ ارشد کے گرد بھڑوں کی طرح بھنبھناتے رہتے تھے۔ اب تو دیواروں سے بھی یہی آوازیں آنے لگی تھیں۔

"مجھے بھول جاؤ" — ارشد نے کئی بار جھنجھلا کر کہا تھا — "خُدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو مجھ پر یہ احسان

کرنا کہ میرے بچے کو نہ بتانا کہ اس کی ماں مر گئی ہے میں اسے بتا رہا ہوں کہ طاہرہ اس کی امّی ہے اور طاہرہ آ جائے گی۔"

اب ارشد کا تبادلہ لاہور سے راولپنڈی ہو گیا تو اُس نے خُدا کا شکر ادا کیا کہ اُسے "آشا بھون" سے رہائی ملی۔ سب نے اُسے کہا کہ وہ بچے کو ساتھ نہ لے جائے مگر وہ نہ مانا۔ وہ تو بچّے کو اپنے پاس سُلایا کرتا تھا۔ باپ بیٹا صرف دفتر اور سکول کے وقت جدا ہوتے تھے، ورنہ بچّہ ارشد کے جسم کا ایسا حصّہ بنا رہتا جو کاٹا نہ جا سکتا تھا۔

ماں نے ارشد سے کہا کہ بچّے کی خاطر وہ اس کے ساتھ جائے گی۔ ارشد یہ بھی نہ مانا۔ وہ "آشا بھون" میں رہنے والے کسی بھی فرد کو اپنے ساتھ نہ رکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اس کوٹھی کے آسیب کو اپنے ساتھ لے جانے سے ڈرتا تھا۔ ماں کی بجائے وہ نور دین کو ساتھ لے گیا۔ نورُدین صرف نوکر نہیں اس گھر کا فرد بھی تھا۔ وہ امرتسر کے قصبے جلال آباد میں طاہرہ کی نانی خاتون کا مزارعہ تھا۔ اُسے طاہرہ سے بہت پیار تھا ہجرت میں نور دین طاہرہ کے ساتھ آیا تھا۔ لاہور آ کر ارشد کے باپ نے کسی ہندو کی یہ متروکہ کوٹھی "آشا بھون" الاٹ کرائی تو ارشد نے طاہرہ اور عفت کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ ان دونوں کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ طاہرہ نور دین کو بھی ساتھ ہی لے آئی تھی اور اُسے "آشا بھون" میں آباد کر لیا تھا۔

"آشا بھون" سے طاہرہ چلی گئی تو نور دین کو یہ کوٹھی کھنڈر کی طرح نظر آنے لگی تھی۔ وہ دن رات طاہرہ کی خیریت اور واپسی کی دعائیں کرتا رہتا تھا۔ اُس نے بارہا چاہا کہ کہیں چلا جائے یا اُسے پتہ چل جائے کہ طاہرہ کہاں ہے تو وہاں چلا جائے مگر اَن پڑھ اور تنہا آدمی کہاں جاتا۔ طاہر پرویز پیدا ہُوا تو اُسے اس بچے سے اتنا پیار ہو گیا کہ وہ وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ بچّے کے ساتھ راولپنڈی میں نور دین کو ہی ہونا چاہیئے تھا۔ ارشد اُسی کو لے گیا وہ کھانا پکانا بھی جانتا تھا۔

☆

سات سال بعد جب ارشد اور عفّت کا طاہری چھ سال کا ہو چکا تھا، ارشد کو طاہرہ اور طاہری کو امّی مل گئی۔ ارشد نے جذبات اور مسرت کے جوش سے طاہرہ کے باپ سے کہا تھا — "یہ اب طاہرہ نہیں، مسز ارشد ہے" — تو طاہرہ ہنس پڑی تھی مگر نجمہ کے گھر جا کر طاہرہ پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

نجمہ اور ارشد کی ملاقات بھی خواب کی ملاقات لگتی تھی۔ نجمہ کو معلوم تھا کہ آج طاہرہ دیر سے گھر آئے گی۔ طاہرہ نے اُسے صبح ہی بتا دیا تھا کہ وہ چھٹی کے بعد جوزی بابا کے گھر چلی جائے گی۔ سلیقے سے تراشی ہوئی سپید داڑھی اور سپید سر والا جوزی بابا سکول کے چھوٹے سے چھوٹے بچّے سے لے کر ہیڈ مسٹرس تک کا باپ سمجھا جاتا تھا۔ طاہرہ کے ساتھ تو اُسے سب سے زیادہ اُنس تھا اور طاہرہ اُس کی مُرید بنی ہوئی تھی۔ جوزی بابا سکول کے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ طاہرہ کے وہاں اکیلے جانے پر نجمہ کو اعتراض نہیں تھا۔

دن کے پچھلے پہر طاہرہ آ گئی۔ وہ اکیلی تھی۔

"آپا!" — طاہرہ نے نجمہ سے کہا — "آپ نے جاگتے ہُوئے کبھی خواب دیکھا ہے؟"

طاہرہ کے مزاج میں شگفتگی تھی۔ نجمہ سمجھی کہ طاہرہ اس وقت ہلکے پھلکے موڈ میں ہے۔ نجمہ ہنس پڑی اور بولی — "آج معلوم ہوتا ہے جوزی بابا نے کوئی نیا خواب دکھا دیا ہے۔"

"نہیں آپا!"۔۔۔ طاہرہ نے کہا ۔۔۔"جوزی بابا ایک خواب تھا، آج وہ اپنی تعبیر خود ہی بن گیا ہے"
۔۔۔ اور طاہرہ کا مسکراتا ہُوا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔

"کیا کہہ رہی ہو طاہرہ!"۔۔۔ نجمہ نے پوچھا۔۔۔"کوئی خاص بات ہُوتی ہے کیا؟"

"خاص نہیں، غیر معمولی"۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔۔۔"غیر متوقع.... جوزی بابا جمال بیگ ہے.... میرا باپ.... کہانی بعد میں سناؤں گی۔ اُٹھو اور میرے ساتھ دروازے تک چلو۔ آپ خود ہی کہہ اُٹھیں گی کہ آپ بیداری میں خواب دیکھ رہی ہیں۔"

نجمہ اُس کے ساتھ دروازے تک گئی۔ دروازہ کھولا تو حیرت سے اُس کا مُنہ کھل گیا اور آنکھیں ٹھہر گئیں۔ جوزی بابا کو تو وہ ہر روز دیکھتی تھی۔ وہ اسی سکول میں اُستانی تھی۔ وہ ارشد اور طاہر پرویز کو دیکھ کر حیران ہُوتی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ یہ خواب ہے یا حقیقت کہ ارشد آگے کو لپکا اور نجمہ سے بغلگیر ہوگیا۔

نجمہ کے آنسو بہہ نکلے۔ ان آنسوؤں کا باعث عفت کی موت بھی تھی لیکن ارشد اور طاہرہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وجہ کچھ اور بھی ہے۔ نجمہ کا ایک ہی بھائی تھا۔ وہ ۱۹۴۷ء میں لاہور میں انگریزوں کے پرُوردہ خضر حیات ٹوانہ کی وزارت کے خلاف ایک مظاہرے میں پولیس کی گولی سے شہید ہوگیا تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ اُن دنوں کالج میں پڑھتا تھا۔ ارشد بھی اُن دنوں کالج سٹوڈنٹ تھا۔ وہ تحریکِ پاکستان کے عروج کا دَور تھا۔ نجمہ کے شہید بھائی کی شکل وصورت ارشد سے مِلتی جلتی تھی۔ نجمہ، ارشد اور طاہر لوسر حد پار جلال آباد میں تحریکِ پاکستان کا معرکہ دوش بدوش لڑے تھے۔ نجمہ اور ارشد منہ بولے بہن بھائی بن گئے تھے۔ ایک روز نجمہ نے ارشد کو بیساختہ گلے لگا لیا اور کہا تھا ۔۔۔"تم میرے سامنے رہا کرو۔ میں تمھیں جی بھر کے دیکھا کروں۔"

طاہر پرویز کو گلے لگا کر نجمہ کی ہچکی بندھ گئی۔ نجمہ کا خاوند اظہر آگیا۔ وہ پہلی بار ارشد سے مل رہا تھا۔ اِس سے پہلے اُس نے ارشد کی باتیں سنی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ اندر بیٹھے ہُوئے تھے اور چائے کا دَور چل رہا تھا۔ ارشد کی نجمہ اور طاہرہ سے ملاقات کوئی حیران کُن واقعہ نہیں تھا۔ بچھڑے ہُوئے انسان زندہ رہیں تو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر مل ہی جاتے ہیں۔ حیران کُن ملاقات طاہرہ کے باپ کی تھی۔ اُسے تو سب مرا ہُوا سمجھتے تھے۔

"اگر میرے پاس اپنی امّی کی تصویر نہ ہوتی تو مجھے اپنے ابّا جان، ہر وقت میرے ساتھ ہوتے ہُوئے بھی کبھی نہ مِل سکتے"۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔

"تمھاری امّی نے مجھے یہ تصویر کبھی نہیں دکھائی تھی"۔۔۔ طاہرہ کے باپ جمال بیگ نے کہا۔ اُس کی آواز دبی دبی سی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔

کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی۔ طاہرہ نے ابھی کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اُس کی ماں اُس کے باپ کے ہاتھوں مری تھی اور اُس وقت اُس کی عمر بمشکل ایک گھنٹہ تھی۔ باپ نے اپنے کوارٹر میں اُسے سارا واقعہ سنا دیا تھا۔

"آپ اتنا عرصہ رہے کہاں؟"۔۔۔ نجمہ نے جمال بیگ سے پوچھا۔

جمال بیگ کا وہی چہرہ جو بڑھاپے کے باوجُود کھِلا سا رہتا تھا، بُجھ سا گیا۔ اُس نے نجمہ کی طرف یُوں دیکھا جیسے اُس نے اسے ماں بہن کی گالی دے دی ہو۔ نجمہ اور طاہرہ نے جمال بیگ کے

چہرے پر یہ تاثر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کا تاثر آگیا۔۔۔ یہ چہرہ جمال بیگ کا تھا، جوزی بابا کا نہیں تھا جو ہر بات کا روشن پہلو دیکھتا اور دکھایا کرتا تھا اور بچّوں خصوصاً بچّیوں کے لیے سراپا پیار تھا۔

نجمہ نے طاہرہ کی طرف دیکھا، پھر سب کی نظریں جمال بیگ پر جم گئیں۔

"ابا جان مجھے سُنا چکے ہیں"۔۔۔ طاہرہ نے اپنے باپ کے چہرے کا تاثر بھانپتے ہُوئے کہا۔۔۔"یہ میری پیدائش سے دو چار دن پہلے میری امّی سے کسی بات پر روٹھ کر گھر سے چلے گئے تھے۔ وہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا۔ انہیں غصّہ آجاتا تھا۔ ان کی غیر حاضری میں میں پیدا ہُوئی اور امّی مرگئیں۔ مجھے نانی امّاں اپنے گھر لے گئیں۔ ابّا جان واپس آئے تو...."

"نہیں"۔۔۔ جمال بیگ نے طاہرہ کی بات کاٹ کر کہا۔۔۔"میری بیٹی نے مجھے آپ سب کی نظروں سے گرنے سے بچانے کی کوشش میں جھُوٹ بولا ہے.... سچ یہ ہے کہ میں اس کی ماں کا قاتل ہوں"۔۔۔ اور اُس نے سب کو سنا دیا کہ طاہرہ کی ماں اس کے ہاتھوں کس طرح مری تھی۔

کمرے میں سناٹا اور زیادہ گہرا ہوگیا۔

"اگر آپ لوگ مجھے سزا دینا چاہتے ہیں تو میں ہر سزا قبول کروں گا"۔۔۔ جمال بیگ نے کہا۔۔۔"میں اس قابل ہوں کہ آپ مجھے دھتکار دیں اور مجھے اچھوت قرار دے دیں۔ مجھ سے بھول ہُوئی جو میں نے طاہرہ کو بتا دیا کہ میں اس کا باپ ہُوں۔"

اُس نے خاموش ہوکر سب کو باری باری دیکھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سب کو سکتہ ہوگیا ہو۔

"آپ قاتل نہیں ابّا جان!"۔۔۔ طاہرہ نے سکوت توڑا۔

"میں پھر بھی مجرم ہوں"۔۔۔ جمال بیگ نے کہا۔۔۔"میں درندہ تھا۔ لوگوں کو اس سے کیا غرض کہ مجھے درندہ کس نے بنایا تھا۔ خُدا نے پہلے مجھے ماں کی محبت سے ہمیشہ کے لیے محروم کیا۔ یہ وہ عمر تھی جب بچّہ ماں کو ہی خدا اور ماں کو ہی دیوتا سمجھتا ہے۔ باپ نے مجھے سوتیلی ماں کے حوالے کردیا۔ پھر باپ بھی مرگیا اور سوتیلی ماں نے ایک اور شادی کرلی.... ماں بھی سوتیلی اور باپ بھی سوتیلا.... اور جب ان کے بچّے پیدا ہونے شروع ہُوئے تو میں ان کا نوکر بن گیا...."

جمال بیگ نے اپنے بچپن اور لڑکپن کی کہانی مکمل سنا دی اور اس دوران اُس کے آنسو بہتے رہے۔

"محبت کے بغیر انسان انسان نہیں رہتا"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔"مجھے عورت ذات سے نفرت ہوگئی۔ میں کوئی اچھی بات سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یہ خیال میرے ذہن میں زنگ کی طرح بیٹھ گیا تھا کہ عورت ماں ہوتی ہے جو بچے کو اکیلا چھوڑ کر مر جاتی ہے، اور سوتیلی ماں بھی عورت ہوتی ہے جو دوسروں کے بچوں پر ظلم و تشدد کرتی اور ان کے دلوں سے محبت نکال کر نفرت ڈالتی ہے....

"یہ نفرت مجھ پر آسیب کی طرح سوار ہوگئی۔ اسی آسیب کا اثر تھا کہ میں نے طاہرہ کی ماں سے کہا کہ لڑکی کو جنم نہ دینا۔ میں گھر میں لڑکی کا وجود برداشت نہیں کرسکوں گا۔ میں نے طاہرہ کی نانی سے کہا کہ تیری بیٹی نے بیٹی کو جنم دیا تو بچی کو تم اٹھا لے جانا.... پھر جو ہُوا وہ میں آپ کو بتا چکا ہُوں....

"میں نے جب دیکھا کہ طاہرہ کی ماں مرگئی ہے تو معلوم نہیں میرے اندر کیسا دھماکہ ہُوا کہ میں بھاگ اٹھا۔ میں پاگل ہوگیا تھا.... شاید میں مرگیا تھا، پھر میں نے دوسرا جنم لیا۔ تب مجھ میں درندگی نہیں تھی۔ نفرت

نہیں تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں ہندوستان کے کس کس شہر کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ جہاں کہیں کسی کی بچی کھیلتی نظر آتی، میں اُسے اُٹھا کر چُومنے لگتا۔ میں نے ہندوؤں کی، سکھوں کی، عیسائیوں کی اور بھنگیوں کی بچیوں کو بھی چوما۔ میں ہر بچی میں اپنی بچی کی جھلک دیکھا کرتا تھا۔ میں نے باقی عمر ایک گناہ کا کفّارہ ادا کرتے گزاری ہے۔ میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ یہ سزا تھی جو میں نے اپنے آپ کو دی....

"جب پاکستان بن گیا اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہُوا تو میں نے ادھر کا رُخ کیا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے طاہرہ کی نانی کبھی ملے گی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی نانی ماری گئی ہو گی۔ بچّی کے متعلق تو مجھے یقین تھا کہ بچپن میں ہی مر گئی ہو گی۔ نہ جانے میں نے اپنے آپ کو یہ یقین کیوں دلا لیا تھا۔"

"بہر حال خُدا نے آپ کا کفّارہ قبول کر لیا ہے"۔۔۔ ارشد نے کہا۔۔۔"آپ کو آپ کی بیٹی مل گئی ہے یہ آپ کو بتائے گی کہ اس نے پاکستان کس طرح بنایا ہے۔"

"خُدا نے ایک دکھیاری عورت کی پشین گوئی پوری کر دی ہے"۔۔۔ جمال بیگ نے کہا۔۔۔"طاہرہ کی نانی نے مجھے کہا تھا۔۔۔ 'یاد رکھنا جمال! یہی بچی تجھے کفن پہنائے گی۔' یہ مجھے کفن پہنانے کے لیے ملی ہے۔"

باتیں بڑی لمبی تھیں۔ نجمہ کو ارشد سے اور ارشد کو نجمہ اور طاہرہ سے بہت کچھ کہنا اور سننا تھا مگر طاہرہ کے باپ نے محفل کا رنگ بدل دیا۔

"آپا!۔۔۔ طاہرہ نے نجمہ سے کہا۔۔۔"اب تو میں ابّا جان کے ساتھ رہوں گی نا!.... یہ نہ کہنا کہ ابّا جان کو بھی یہیں لے آؤ۔ میں نہیں مانوں گی۔ میں ان کے ساتھ جا رہی ہُوں۔"

ارشد نے چونک کر طاہرہ کی طرف دیکھا۔ طاہرہ نے اُسے دیکھا تو وہ اشارہ سمجھ گئی۔

☆

اُسی شام طاہرہ اپنا سامان ساتھ لیے اپنے باپ کے کوارٹر کے سامنے تانگے سے اُتری۔ باپ بھی ساتھ تھا، ارشد اور طاہر پرویز بھی ساتھ تھے۔ ارشد نے سامان اندر رکھوایا اور موقع پیدا کر کے طاہرہ سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ چلے۔ رات کو اُسے واپس لے آئے گا۔

"کل آجاؤں گی"۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔۔۔"ابّا جان کی ذہنی حالت دیکھ رہے ہو نا، کیا ہو رہی ہے۔"

"جانتی ہو میں نے طاہری کو کیا بتا رکھا ہے؟"۔۔۔ ارشد نے کہا۔۔۔"کہ تم اس کی ماں ہو۔ میں اسے یہی بتاتا رہا ہوں۔ تم دیکھ رہی ہو کہ یہ تم سے الگ نہیں ہو رہا۔ میرے ساتھ آجاؤ۔ یہ سو جائے گا تو میرے ساتھ واپس آجانا.... تمھارے ابّا جان سے میں بات کرتا ہُوں۔ میں انھیں ساری بات بتا دوں گا۔"

"بچے کو یہیں چھوڑ جاؤ"۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔

"طاہرہ!"۔۔۔ ارشد نے جھنجلا کر کہا۔۔۔"میں نے چھ سال اور چھ مہینے تمھارا انتظار کیا ہے۔ میرے بچّے نے بھی تمھیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

طاہرہ نے چونک کر ارشد کی طرف دیکھا۔ ارشد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ طاہرہ کی قسمیں ٹوٹ گئیں۔ اُس نے قسم کھا رکھی تھی کہ اب جذبات کے جھمیلے میں اور شادی کے جال میں نہیں آئے گی۔ ان ساڑھے چھ برسوں میں وہ ارشد کو دل سے اتارنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہُوئی تھی لیکن اُس نے یہ طے کر لیا تھا کہ ارشد کبھی سامنے آ بھی گیا تو وہ اُسے یوں ملے گی جیسے پہلے بھی

کہیں ملاقات ہُوئی تھی۔ کبھی کبھی ارشد اُسے تصوّروں اور یادوں میں مل جاتا تھا تو وہ تڑپ اٹھتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس خوف کی گرفت میں رہی کہ ارشد سامنے آگیا تو جانے کیا ہو جائے۔

اب اُس نے ارشد کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو وہ یوں دور پیچھے ماضی میں جا پڑی جیسے تیز و تند آندھی گھاس کی خشک پتی کو اپنے ساتھ اڑا لے گئی ہو۔ اُسے جلال آباد والا ارشد یاد آگیا۔ اُسے سرحد پار والا اپنا پڑوسی نوجوان کمال یاد آگیا جو ارشد جیسا ہی خوبرو تھا اور جو تحریکِ پاکستان کے ایک جلوس میں پولیس کی گولی لگنے سے شہید ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے نجمہ کا بھائی سلیم آگیا۔ وہ بھی ارشد جیسا خوبرو نوجوان تھا۔ وہ بھی پولیس کی گولی سے شہید ہُوا تھا۔ ارشد ہر روز شہید ہونے کے لیے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ جلوسوں اور مظاہروں کے انتظامات کرتا اور جنگِ آزادی میں پیش پیش رہتا تھا۔

طاہرہ کو ایک ثانیے میں یاد آگیا کہ ارشد ہی اُسے جہاد کے میدان میں لایا تھا۔ طاہرہ ہر لمحہ یہ خبر سننے کے لیے تیار رہتی تھی کہ ارشد لاٹھی چارج یا گولی سے شہید ہو گیا ہے۔ اُسے پلک جھپکتے بہت کچھ یاد آگیا۔ ارشد کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے دو آنسوؤں میں طاہرہ کو بڑے لمبے لمبے جلوس نظر آئے۔ پُورے پُورے جلوس کی آنکھوں سے ایسے ہی آنسو بہہ رہے تھے اور ماحول پر آنسو گیس کے بادل چھاتے ہوتے تھے۔ ارشد کے آنسوؤں میں اُسے پولیس کی لاٹھیاں اور گولیاں برستی نظر آئیں۔ اُسے مہاجرین کے قافلے، خون میں نہاتے ہُوتے، لاشیں اٹھاتے ہُوئے راہِ پاکستان پر لاشیں بکھیرتے نظر آئے۔

"طاہرہ!۔۔۔ اُسے شاید اپنی ہی آواز سنائی دی۔۔۔"ارشد کے آنسوؤں میں صرف تمھاری محبّت نہیں۔ یہ ایک عورت کی محبّت کے آنسو نہیں۔ یہ اُس پاکستان کی محبت کے آنسو ہیں جو تم نے بنایا تھا، جو ارشد نے بنایا تھا، جو تم جیسی بیٹیوں اور ارشد جیسے بیٹوں نے بنایا تھا۔"

"کیا سوچ رہی ہو طاہرہ!"۔۔۔ ارشد نے کہا۔۔۔"تمھارے ابّا جان اور طاہری آرہے ہیں۔ جلدی جواب دو.... میرے ساتھ چلو گی؟ واپس چھوڑ جاؤں گا۔"

"چلوں گی"۔۔۔ طاہرہ نے یوں کہا جیسے آہ بھری ہو۔

جمال بیگ نے طاہرہ کے جانے پر اعتراض نہ کیا بلکہ اُس کے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ آگئی۔

"کیا تم مجھے اس قابل سمجھ رہے ہو کہ مجھ سے اجازت لے کے جاؤ؟"۔۔۔ جمال بیگ نے ارشد اور طاہرہ سے کہا۔۔۔"میں نے اپنے آپ کو اس حق سے محروم کر رکھا ہے۔"

طاہرہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس پر رقّت طاری ہو گئی۔ بول ہی نہ سکی۔

"امّی جان! چلو نا"۔۔۔ طاہر پرویز نے طاہرہ کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ اُس نے ارشد کا بازو پکڑ کر کہا۔۔۔"ابّو! اپنے گھر نہیں چلیں گے؟"

☆

ارشد کے نوکر نور دین نے جب ارشد کے ساتھ طاہرہ کو دیکھا تو اُس کی بھی وہی حالت ہُوتی جو نجمہ کی ارشد کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ کچھ دیر تو آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا جیسے غش کھا کر گر پڑے گا۔ طاہرہ کی ہنسی اُسے ہوش میں لے آئی۔

"طاہرہ بی بی؟"۔۔۔ نور دین کے ہونٹوں سے سرگوشی نکلی۔

"ہاں نورا!" — ارشد نے کہا — "یہ طاہرہ بی بی ہے۔ میں نے ڈھونڈ نکالی ہے۔ طاہری کو اپنی امّی مل گئی ہے۔"

نوردین نے آگے بڑھ کر طاہرہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا — "میں نے تمھارے لیے بی بی اسوا روپے کی نیاز اور چالیس نفل مانے ہوتے ہیں۔"

نوردین بھی راہِ پاکستان کا مسافر تھا۔ وہ ارشد، طاہرہ، عفّت اور طاہرہ کی نانی خاتون کا ہمسفر تھا۔ وہ سِکھوں کی کرپانوں اور برچھیوں کے سائے میں، راہِ پاکستان کے شہیدوں کے خون پر پھسلتا ان سب کے ساتھ آیا تھا۔ وہ خاتون کا مزارعہ تھا۔ سکھوں نے جب خاتون کے گھر پر حملہ کیا، اُس وقت نوردین وہاں موجود تھا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں بی بی؟" — نوردین نے پوچھا۔

"اب بی بی تمھارے پاس ہی رہے گی نورا!" — ارشد نے ہنستے ہوئے کہا — "اس سے سُن لینا یہ کہاں غائب ہوگئی تھی۔"

طاہر پرویز کھانا کھا کر سو گیا تو ارشد اور طاہرہ الگ کمرے میں جا بیٹھے۔ طاہرہ نے ارشد کو تفصیل سے بتایا کہ اُسے خاوند کیسا اور ساس کیسی ملی تھی اور اس ماں نے کس طرح اپنے بیٹے کو قبر میں اتار دیا ہے۔ نعیم کو یاد کرکے وہ بہت روئی۔ اس کے چال چلن پر جو داغ لگائے گئے تھے، وہ بھی اُس نے ارشد کو سنائے اور کہا کہ وہ دُکھی انسانوں کے دکھ دور کرنے میں لگی رہتی تھی مگر انسانوں نے اُس کا سینہ دُکھوں سے بھر دیا۔ وہ مفاہمت اور صُلح جوئی کی کوشش کرتی تو اُسے فاحشہ اور بدکار کہا جاتا تھا۔ اُس کے عزم اور ارادے چار دیواری کے کوڑے کرکٹ کی نذر ہو گئے۔

"ارشد!" — طاہرہ نے دکھیاری سی آواز میں کہا — "جو کہو گے مان لوں گی۔ مجھے یہ نہ کہنا کہ ہم شادی کرلیں۔"

ارشد نے چونک کر اُسے دیکھا۔ طاہرہ نے ایسی بات کہہ دی تھی جو ارشد کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اُس کے خواب یوں چکنا چور ہو گئے جیسے شیشے کا گلاس بے خیالی میں ہاتھ سے چھُوٹ کر پکّے فرش پر جا پڑے۔

"آؤ، ہم ایک دوسرے کے لیے خوبصورت یادیں بن کر زندہ رہیں" — طاہرہ نے کہا۔

"طاہرہ!" — ارشد نے کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا — "مجھ پر ایک کرم کرو۔ میرے بیٹے کو سینے سے لگا لو اور مجھے اپنے ہاتھوں زہر دے دو۔"

"جذبات سے نِکلو ارشد!"

"طاہرہ!" — ارشد نے گرج کر کہا — "تم مجھے زہر کا ایک پیالہ پلا چکی ہو۔ خدا نے مجھے نہ جانے کِس مٹی سے بنایا ہے کہ میں مرا نہیں۔ مجھے عفت کے مرنے کا بہت افسوس ہے لیکن وہ زندہ رہی تو میں پَل پَل مرتا تھا۔ اُس نے جس طرح تمھیں رسوا اور بدنام کیا، کوئی اور ہوتا تو وہ اُسے قتل کر دیتا یا خودکشی کرلیتا۔ مجھے تم نے اس جہنّم میں کود جانے کو کہا تھا۔ میں نے تمھاری محبّت کی خاطر یہ قربانی دی تھی.... کیا اس کا انعام یہ جواب ہے جو تم نے مجھے دیا ہے؟"

"میں چھ سال ایک جہنّم میں گزار کے آئی ہوں" — طاہرہ نے کہا۔

"وہ لوگ جاہل تھے" — ارشد نے کہا — "تمھاری ساس پسماندہ تھی۔ وہ گھر تمھارے لیے نہیں تھا۔"

"تمھارا گھرانہ تو جاہل نہیں تھا" — طاہرہ نے کہا — "پسماندہ بھی نہیں مگر وہاں مجھ پر جو شرمناک الزامات تھوپے گئے تھے، کیا وہ جاہلوں اور پسماندہ لوگوں والے نہیں تھے؟.... تم عقل والے ہو ارشد! جہالت اور پسماندگی اُن کے ہاں بھی ہوتی ہے جن کے پاس اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں ہوتی ہیں، جو کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور جن کے ہاں روپے پیسے کی افراط ہوتی ہے۔ جھوٹ بولنے والے مصلّے پر بیٹھے ہوئے بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ زاہد اور پارسا بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ جہالت اور پسماندگی کے لیے ان پڑھ ہونا ضروری نہیں۔"

"تم جو چاہو کہہ سکتی ہو طاہرہ!" — ارشد نے کہا — "تم مظلوم ہو، تم حق پر ہو۔ میرے اور آپا نجمہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ تم سراپا خلوص، پیار اور ایثار ہو لیکن تم یہ نہیں سمجھ سکیں کہ میرے دل میں تمھاری جو محبّت ہے وہ اُس حد تک پہنچ گئی ہے جہاں محبت کرنے والے دیوانے ہو جایا کرتے ہیں اور لوگ انھیں پاگل قرار دے دیا کرتے ہیں۔ میں نے یہ اُمّید اب ترک کر دی تھی کہ تم مجھے مل جاؤ گی، پھر بھی میں یہی کہتا رہا کہ طاہرہ مِل جائے گی اور وہی میرے بچّے کی ماں بنے گی۔"

"میں نے طاہری کی ماں بننے سے انکار نہیں کیا" — طاہرہ نے کہا — "بچّہ میرے حوالے کردو۔ اس کی تربیت اس سے زیادہ اچھی ہوگی جو تمھارے ذہن میں ہے۔"

"کیا میں طاہری کے بغیر زندہ رہ سکوں گا؟" — ارشد نے کہا — "ہوش میں آؤ طاہرہ! میری محبت کی دیوانگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ میں نے تم سے کوئی گلہ نہیں کیا۔ مجھے نجمہ آپا سے بھی گلہ ہے یہاں آکر تم مجھے اطلاع دے سکتی تھیں کہ تم نجمہ آپا کے پاس ہو۔ تمھیں معلوم تھا کہ میں تمھارے لیے کتنا پریشان ہوں گا۔ پھر تم نے شادی کرلی لیکن مجھے اطلاع نہ دی۔ نجمہ آپا کو چاہیئے تھا کہ مجھے تمھارے متعلّق صحیح اطلاع دے دیتیں۔ عفّت کی وفات کے بعد آپا مجھے لاہور مِلی تھیں۔ انہوں نے تمھیں ضرور بتایا ہوگا کہ عفّت مرگئی ہے اور یہ بھی کہ میں کِس حال میں ہوں اور طاہرہ، طاہرہ پکارتا پھر رہا ہوں۔"

"مجھے اطلاع مِل گئی تھی" — طاہرہ نے آہ لینے کے انداز سے سر پیچھے پھینک کر کہا — "یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ تم کِس حال میں ہو لیکن میں تمھیں بتانا نہیں چاہتی تھی کہ میں کِس حال میں ہوں۔"

"میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ تم نے مجھے محبت کا دھوکہ دیا اور راولپنڈی آکر اپنی پسند کی شادی کرلی" — ارشد نے کہا — "بیوہ ہو کر بھی تم نے مجھے اطلاع نہیں دی۔"

"لیکن اب میں اپنی پسند کی شادی نہیں کروں گی" — طاہرہ نے کہا — "میں جو زنجیریں توڑ چکی ہوں، مجھے پھر انہی میں نہ جکڑو ارشد!.... خُدا کے.... خدا کے لیے" — اور طاہرہ سسک سسک کر رونے لگی۔ اُس نے چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپالیا اور آگے کو جھک گئی۔

ارشد اپنے آپ کو بھی جانتا تھا اور طاہرہ کو بھی۔ اُسے طاہرہ کے حسین چہرے اور دلکش جسم سے نہیں، اُس کے کردار سے محبت تھی۔ اُسے اُس کے جذبۂ ایثار سے پیار تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ طاہرہ کے ساتھ اُس کی ماں اور بھابی نے کیا سلوک کیا تھا اور طاہرہ کی مختصر سی ازدواجی زندگی کیسی گزری

تھی۔ اب طاہرہ کا جو ردِ عمل تھا اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس میں اپنے متعلّق کوئی فیصلہ کرنے کی اہلیّت ختم ہو چکی ہے۔ وہ خوفزدہ ہے اور اُس پر یاسیّت کا آسیب طاری ہو چکا ہے — طاہرہ تنہا تھی۔ اس کا خون کا کوئی ایک بھی رشتہ زندہ نہیں تھا۔

ارشد نے لپک کر اُسے کندھوں سے پکڑا اور اُسے اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"تمھیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا" — ارشد نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا اور اس کا آنسوؤں سے بھیگا ہُوا چہرہ اپنے سینے سے لگا کر بازو اُس کے گرد لپیٹ دیئے۔

"میں ہار گئی ہوں ارشد!" — طاہرہ نے اپنا گال ارشد کے سینے سے رگڑتے ہُوئے کہا — "میں ڈوب رہی ہوں — مجھے بچا لو ارشد! ... میرا گلا گھونٹ دو" — اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ارشد اُسے اس طرح بہلانے لگا جس طرح ماں اپنے بچّے کو گود میں لے کر، تھپک تھپکا کر اور پچکار کر بہلایا کرتی ہے۔ طاہرہ کی طبیعت سنبھلتے خاصی دیر لگی۔ وہ یوں نڈھال ہو گئی تھی جیسے اُس نے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔

"میں تمہیں ہارنے نہیں دوں گا طاہرہ!" — ارشد کے لہجے میں اب التجا نہیں حکم تھا — "تمہارے فیصلے مجھے کرنے ہیں اور میں یہ فیصلے اپنے لیے نہیں کروں گا۔ ہم اپنے لیے پیدا نہیں ہُوئے۔ ہم طاہر پرویز کے لیے پیدا ہُوئے تھے۔ ہم اُن بچوں کے لیے پیدا ہوئے ہیں جو پیدا ہوں گے۔ اپنے آپ کو اپنے پنجرے میں قید نہ کرو۔ آنکھیں کھولو۔ اپنے اردگرد دیکھو۔ کیا یہ وہی پاکستان ہے جو ہم نے بنایا تھا؟ کیا ہم یہ پاکستان اپنے بچّوں کو دے کر جائیں گے؟"

طاہرہ خلا میں دیکھنے لگی جیسے بیدار ہو رہی ہو۔

"تمھاری عمر چھبیس سال ہو گی" — ارشد نے کہا — "میری عمر تیس سال ہو گئی ہے۔ ہم عمر کا نہایت قیمتی دَور رو رو کر گزار رہے ہیں۔ میں نے عمر کے ساڑھے چھ سال تمھارے لیے آہیں بھرتے اور راتوں کو کروٹیں بدلتے تباہ کر دیئے ہیں۔ تم اپنے دکھوں سے رو رہی ہو۔ ہم نے اپنے اُوپر وہی زنگ چڑھا لیا ہے جو قوموں کے وقار کو کھا جاتا ہے۔ یہ زنگ قوموں کو تاریخ کے کوڑے کباڑ میں پھینک دیا کرتا ہے۔ ... تم اپنی زندگی کا مشن بھول گئی ہو۔"

"ہاں ... ہاں ... تم نے ٹھیک کہا ہے" — اب طاہرہ کسی اور لب و لہجے میں بول رہی تھی۔ اُس نے آہستہ آہستہ سر گھمایا اور ارشد کو یوں دیکھنے لگی جیسے آسیب زدگی سے بیدار ہُوئی ہو یا ارشد کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز سے بولی — "میں بھول گئی ہوں ... میں بُھلا بیٹھی ہوں۔"

"ہمارے وہ نعرے دفن نہیں ہو سکتے جن کی گرج جلال آباد سے امرتسر تک سنائی دیتی تھی" — ارشد نے کہا — "یہ پاکستان اُن کا نہیں جو پاکستان کو آج اپنی جاگیر سمجھ بیٹھے ہیں۔ پاکستان اُن بچوں کا ہے جنہیں سکھوں اور ہندوؤں نے کرپانوں اور برچھیوں سے قیمہ کر دیا تھا۔ پاکستان قوم کی اُن ستّر ہزار بیٹیوں کا ہے جو آج بھی ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں ہیں۔ یہ پاکستان اُن کا ہے جن کی لاشیں گِدھ اور گیدڑ کھا گئے تھے۔ اب پاکستان کو اس کے اپنے گِدھ اور گیدڑ کھا رہے ہیں۔ ہمارا دشمن پاکستان کو ہندوستان میں شامل کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کو پاکستان کے دفاع کے لیے تیار کرنا ہے۔"

"کیا تم نے طاہر پرویز کو بتایا ہے کہ ہم نے پاکستان کی کیا قیمت ادا کی تھی؟" — طاہرہ نے پوچھا۔

"ہاں" — ارشد نے کہا — "اس عمر میں وہ جو کچھ سمجھ سکتا ہے وہ میں نے بتا دیا ہے لیکن ابھی اس کا ذہن یہ معمّہ حل کرنے میں اُلجھا رہتا ہے کہ اس کی امّی کہاں ہے اور وہ آتی کیوں نہیں۔ وہ تمھیں اپنی ماں سمجھتا ہے۔ اِسے ہم نے بتایا ہی یہی ہے۔ اگر تم نے اسے اپنا بیٹا نہ بنایا تو یہ ذہنی مریض ہو جائے گا۔"

"نہیں .... ایسا نہ کہو" — طاہرہ نے جیسے تڑپ کے کہا ہو — "پاکستان کا کوئی بچّہ ذہنی مریض نہیں ہوگا۔"

☆

اور سات آٹھ روز بعد ریل گاڑی طاہرہ، طاہر پرویز اور ارشد کو لاہور لے جا رہی تھی۔ ارشد مردانہ ڈبے میں تھا۔ طاہرہ اور ارشد نے جمال بیگ کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا مگر وہ نہیں مانا تھا۔ بہت اصرار کیا لیکن اُس نے ہنس کے ٹال دیا تھا۔

"مجھے میری ہی دنیا میں رہنے دو" — اُس نے کہا تھا — "میں بچّوں میں خوش رہتا ہوں۔ یہی میری دُنیا ہے۔ میں کسی سے ملتا ملاتا نہیں ہُوں۔ تم جاؤ" — اور اُس نے طاہرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا — "جلدی آ جانا۔"

طاہرہ کو دُور سے شاہی مسجد کے مینار نظر آنے لگے۔ وہ ماضی کی دلدل سے نکل آئی۔ اُس کا انگ انگ بیدار ہو گیا۔ یہ مینار پاکستان کی عظمت کے نشان ہیں۔ اُسے یاد آیا کہ "آشا بھون" شاہی مسجد سے تھوڑی ہی دور ہے۔ اُسے اچانک خیال آیا کہ "آشا بھون" کتنا مکروہ نام ہے۔ اُس نے سوچنا شروع کر دیا کہ اس کا نام کیا ہو — "پاک منزل .... طاہر منزل .... قصرِ طاہر .... منزلِ مراد .... قصرِ طاہر اچھا رہے گا۔"

اُس نے اپنے قریب بیٹھے ہُوئے طاہر پرویز کو دیکھا اور ایک سوچ اسے پریشان کرنے لگی — "اِس بچّے سے کب تک چھپایا جا سکے گا کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں؟ .... کیا اِسے بتا دیا جائے کہ حقیقت کیا ہے؟ .... نہیں .... اس پر بہت بُرا اثر ہوگا۔"

ریل گاڑی جب ریلوے سٹیشن میں داخل ہوئی تو طاہرہ کو آٹھ سال پہلے والا لاہور یاد آ گیا۔ اُسے خُون کی بُو محسوس ہونے لگی۔ اُسے زخمیوں کی کربناک سسکیاں، عورتوں کے بَین اور بھوکے پیاسے ہراساں بچوں کی آہ و بکا سنائی دینے لگی۔ ریل گاڑی کی رفتار کم ہو رہی تھی۔ بریکوں کی ہلکی ہلکی چیخیں طاہرہ کو آٹھ سال پیچھے لے گئیں، پاکستان ایسی ہی چیخوں، کربناک سسکیوں، عورتوں کے بَینوں اور بھوکے، پیاسے، ہراساں بچوں کی آہ و بکا سے اُبھرا تھا۔ طاہرہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے چونک کر کھڑکی سے سر نکالا۔ گاڑی کی رفتار اور کم ہو گئی تھی اور پلیٹ فارم طاہرہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر مسافروں کا ہجوم آٹھ سال پہلے کے مسافروں سے بہت ہی مختلف تھا۔ آٹھ سال پہلے کا ہجوم تھکن، خوف اور زخموں سے چُور تھا۔ وہ چلتی پھرتی لاشوں کا ہجوم تھا۔ یہ ہجوم جسے طاہرہ آج دیکھ رہی تھی، تازہ دم تھا اور گاڑی پر ہلّہ بول دینے کو تیار۔ آٹھ سال پہلے کا ہجوم بڑی ہی لمبی مسافت طے کر کے منزل پر آ گرنے والے انسانوں کا تھا۔ انسانوں کے اس انبوہ کا سفر ایک صدی بعد ختم ہُوا تھا۔

"لاہور آ گیا" — طاہرہ کے کانوں میں طاہر پرویز کی آواز پڑی تو وہ جیسے تڑپ اُٹھی ہو۔ آٹھ سال پہلے بھی اُس نے یہ آواز سنی تھی — "لاہور آ گیا۔ پاکستان آ گیا" — اُسے دُور سے ہی پاکستان کا پرچم نظر آ گیا تھا۔ خون ٹپکاتے قافلوں کے سینے اس پرچم کو دیکھ کر نعروں سے پھٹنے لگتے تھے۔

کبھی یوں ہوتا ہے کہ کوئی یاد ذہن سے اُبھرتی ہے تو انسان پہروں اسی میں کھویا رہتا ہے، اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ برسوں پر پھیلا ہُوا ماضی پلک جھپکتے آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتا ہے جیسے جادۂ صد سالہ ایک آہ میں طے ہو گیا ہو۔ ریل گاڑی کے پلیٹ فارم میں داخل ہونے سے رُکنے تک پورا ایک منٹ نہیں لگا ہو گا لیکن طاہرہ نے ان چند لمحوں میں جیسے اُفق سے اُفق تک کا فاصلہ طے کر لیا ہو۔ وہ اگست ۱۹۴۷ء کے آخری یا ستمبر کے ابتدائی دنوں میں لاہور ریلوے سٹیشن میں پہلی بار آئی تھی۔ اس کے ساتھ ارشد تھا اور عفّت بھی تھی۔ انھیں پتہ چلا تھا کہ مشرقی پنجاب سے ریل گاڑیوں پر بھی مہاجرین آ رہے ہیں اور ایک ریل گاڑی لاشوں سے بھری ہُوئی آئی ہے۔

طاہرہ بھی مہاجر تھی۔ امرتسر کے قصبے جلال آباد سے پیدل لاہور آئی تھی۔ ان مہاجرین پر وہ اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار رہتی تھی۔ اُس کے کانوں میں جب یہ خبر پڑی کہ لاشوں سے بھری ہُوئی ریل گاڑی آئی ہے تو وہ تڑپ اُٹھی تھی۔ اس نے ارشد سے کہا تھا کہ وہ ابھی، اسی وقت سٹیشن پر جانا چاہتی ہے۔ ارشد جانتا تھا کہ اس لڑکی کو روکا نہیں جا سکتا۔ اگر روکا تو یہ اُٹھ دوڑے گی۔

وہ جب ارشد اور عفّت کے ساتھ ریلوے سٹیشن میں داخل ہُوئی تھی تو عفّت رُک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور اُس نے خوفزدگی کے عالم میں طاہرہ کا بازو پکڑ لیا تھا۔

"طاہرہ!" — عفت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا تھا — "واپس چلو۔ دم گھُٹ رہا ہے۔ بدبُو برداشت نہیں ہوتی۔"

"عفت!" — طاہرہ نے دھیمی مگر قہر سے لرزتی آواز میں کہا تھا — "کیا تم بھول گئی ہو کہ تم خُود اس بدبُو کا حصہ ہو؟ قوموں کو یہی بدبُو زندہ رکھا کرتی ہے.... تم کب سمجھو گی عفّت! شہیدوں کے لہو کی بُو کو تم بدبُو کہہ رہی ہو۔"

عفّت کچھ ایسی ہی لڑکی تھی۔ کھسیانی سی ہو کے چپ ہو گئی تھی۔ لاہور ریلوے سٹیشن انسانوں کے سیلاب میں ڈوبا ہُوا تھا۔ مشرقی پنجاب سے آنے والی دو تین ریل گاڑیاں ان انسانوں کو یہاں اُگل گئی تھیں۔ جہاں گاڑیوں کا سفر ختم ہو گیا تھا وہاں سے ان کے مسافروں کا سفر شروع ہُوا تھا مگر مسافروں کو منزل کا کچھ پتہ نہ تھا۔ اُنھوں نے پلیٹ فارموں پر ہی ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ رضا کار انھیں ریفیوجی کیمپ میں چلنے کو کہتے تھے لیکن وہ اُس گاڑی کے انتظار میں وہیں ڈھیر ہو گئے تھے جو انھیں عافیت کی منزل تک پہنچا دے گی۔

ان میں بچے بھی تھے، عورتیں بھی تھیں، بُوڑھے اور جوان بھی تھے۔ ان میں زخمی بھی تھے اور مریض بھی۔ بعض کے زخموں سے ابھی تک خون رِس رہا تھا۔ اُنھوں نے زخموں پر پگڑیاں اور دوپٹے پھاڑ کر باندھ لیے تھے۔ ان لوگوں کے چہروں سے پتہ چلتا تھا جیسے انھیں قبروں سے نکالا گیا ہو۔ وہ کنبہ در کنبہ بیٹھے تھے۔ کچھ عورتیں اپنے بچوں کو، اپنے بھائیوں کو، اپنے بیٹوں اور بعض اپنے خاوندوں کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ کوئی عورت دُور سے کسی بچے کو دیکھ کر دوڑ پڑتی اور بچے کے پاس جا کر رک جاتی تھی پھر اس کے آنسو بہنے لگتے تھے۔

بعض کنبے کسی کی لاش کے اردگرد بیٹھے رو رہے تھے۔ کسی بھی لاش کو کفن نصیب نہیں ہُوا تھا۔ ان پر میلی کچیلی چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ ریلوے سٹیشن پر انجنوں کی وِسلیں بھی یوں سنائی دیتی تھیں جیسے عورتیں چیخ چلّا رہی ہوں۔ انجنوں کے سیاہ سینوں میں سے بھی ہُوک ہی نکلتی تھی۔

ہر ایک پلیٹ فارم کی یہی کیفیّت تھی۔ طاہرہ ارشد اور عفّت کے ساتھ اُس پلیٹ فارم پر گئی جہاں وہ لاشوں کی ریل گاڑی کھڑی تھی۔ وہ سٹیشن سے الگ تھلگ پلیٹ فارم تھا۔ اس گاڑی کے ساتھ انجن نہیں تھا۔ ریلوے کے بھنگی گاڑی کے ڈبوں کو اندر سے دھو رہے تھے۔ اندر پانی پھینکا جا رہا تھا اور ڈبوں کے اندر سے یہ پانی گہرا لال خون بن کر باہر آتا تھا۔ ڈبوں کی اندرونی دیواروں اور چھتوں پر بھی خون جما ہُوا تھا۔ کچھ لوگ پلیٹ فارم پر کھڑے اس گاڑی کو دُھلتا دیکھ رہے تھے۔ وہ دُور اس لیے کھڑے تھے کہ ان پر دُھلتے خون کے چھینٹے نہ پڑیں۔

اور طاہرہ بہت قریب چلی گئی جیسے اس کوشش میں ہو کہ اس خون کے چھینٹے بارش کی طرح اس پر پڑیں اور وہ خون کی اس بارش میں نہا لے۔ ارشد اُس کے ساتھ تھا۔ عفت دُور کھڑی رہی۔ پلیٹ فارم پر ربڑ کے چار پانچ پائپ تھے جن سے ڈبوں کے اندر پانی ڈالا جا رہا تھا۔ ایک پائپ ویسے ہی پڑا تھا اور اس سے پانی بہا جا رہا تھا۔ طاہرہ نے دوڑ کر وہ پائپ اٹھا لیا اور ایک ڈبے کی طرف پانی پھینکنے لگی۔ ارشد نے لپک کر اُس سے پائپ چھین لیا اور پھینک دیا۔

"ہوش میں آؤ طاہرہ!" — ارشد نے اُسے کہا — "کیا کر رہی ہو؟"

طاہرہ واقعی ہوش میں نہیں تھی۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے دانت یوں پس رہے تھے جیسے یخ ٹھنڈ میں بجا کرتے ہیں۔ اُس پر ہسٹیریا کے دورے کی کیفیّت طاری ہو چکی تھی۔

"مجھے یہ گاڑی دھو لینے دو ارشد!" — طاہرہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "پھر ریلوے والوں سے کہوں گی کہ ان ڈبوں کو کہیں الگ کھڑا کر دو۔ ان کے اردگرد پھولوں کا باغ اُگا دو۔ پھر پاکستان کے لوگ یہاں

آکر ان ڈبوں میں پھولوں کی پتیاں بکھیرا کریں گے۔ یہ گاڑی پاکستان والوں کے لیے زیارت گاہ ہوگی۔ ہم اپنے بچوں کو یہاں لایا کریں گے۔"

"چلو طاہرہ!" ـــ ارشد نے اُسے بازو سے پکڑ کر کہا ـــ "تم اپنے آپ میں نہیں ہو، چلو گھر چلیں۔"

"ابھی نہ لے جاؤ مجھے ارشد!" ـــ طاہرہ نے کہا ـــ "ذرا دیکھ لینے دو...... اِس گاڑی میں وہ آتے تھے...... وہ اسی گاڑی میں آتے تھے۔ اُن کی روحیں......"

"کون آتے تھے طاہرہ!" ـــ ارشد نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

"پاکستان بنانے والے آتے تھے اس گاڑی میں" ـــ طاہرہ نے کہا ـــ "وہ زندہ چلے تھے مگر اُن کی روحیں پاکستان میں پہنچیں...... ان سے کہو نا، اس گاڑی کو الگ کھڑا کردیں۔"

"یہ لڑکی مہاجر معلوم ہوتی ہے" ـــ طاہرہ اور ارشد کو ایک آواز سنائی دی۔ دونوں نے دیکھا ریلوے کا ایک ادھیڑ عمر آدمی ان کے پاس کھڑا تھا۔

"جی ہاں!" ـــ ارشد نے جواب دیا ـــ "ہم دونوں مہاجر ہیں۔ یہ ذرا زیادہ جذباتی ہے۔"

"آپ ریلوے میں ہیں؟" ـــ طاہرہ نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر پوچھا ـــ "جب یہ گاڑی آئی تھی تو آپ یہیں تھے؟ آپ نے اس میں آنے والوں کو دیکھا تھا؟"

"یہیں تھا" ـــ ریلوے کے اس آدمی نے جواب دیا ـــ "میں نے انھیں دیکھا تھا جو اس گاڑی میں آتے تھے" ـــ اُس نے بڑی لمبی آہ بھری اور دکھ سے بوجھل آواز میں بولا ـــ "اب تو ساری عمر انھیں دیکھتا رہوں گا...... تم دونوں خوش نصیب ہو کہ یہ گاڑی اُس وقت نہ دیکھی جس وقت آئی تھی، ورنہ تم پر ساری عمر غم اور غصے کا آسیب طاری رہتا۔"

"کیسے تھے؟" ـــ طاہرہ نے جذباتی لہجے میں پوچھا ـــ "کس حال میں آتے تھے وہ؟"

ریلوے کے اس آدمی نے اُسے بتایا کہ یہ مسافر گاڑی ہندوستان سے آرہی تھی۔ چونکہ یہ پاکستان کو آرہی تھی اس لیے پاکستان کو آنے والے مہاجر قتلِ عام سے بچنے کے لیے اس گاڑی میں سوار ہوتے گئے۔ اس کی چھتوں پر بھی تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ پائیدانوں پر بھی پاکستان کے مسافر کھڑے تھے۔ امرتسر کے قریب ہندوؤں اور سکھوں نے گاڑی پر حملہ کردیا۔ چھتوں پر بیٹھے مسافروں نے کود کر بھاگنے کی کوشش کی مگر بھاگ نہ سکے۔ گاڑی میں سے کسی کو باہر نہ نکلنے دیا گیا۔ کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا گیا۔ انجن چلانے والے تین آدمی اور گارڈ زندہ رہے اور انہیں اس لیے زندہ رہنے دیا گیا تھا کہ ریل گاڑی پاکستان تک پہنچا دیں۔

"میں نے بچوں کی لاشیں مری ہوئی ماؤں کی گودیوں میں دیکھی ہیں" ـــ اُس نے کہا ـــ "پائیدانوں پر جو کھڑے تھے وہ کٹ کر وہیں کہیں گر پڑے تھے...... تم پوچھتی ہو وہ کس حال میں تھے؟...... میں نے بچوں کی لاشیں کھڑکیوں سے باہر لٹکتی دیکھی ہیں اور ماؤں کے مُردہ ہاتھوں نے مرنے کے بعد بھی انہیں پکڑ رکھا تھا کہ وہ گاڑی سے گر نہ پڑیں۔ جب گاڑی یہاں آئی تھی تو اس میں سے خون اس طرح بہ رہا تھا جس طرح تم اس میں سے پانی باہر آتا دیکھ رہے ہو۔"

بولتے بولتے ریلوے کے اس ادھیڑ عمر آدمی کو ہچکی آئی اور وہ چُپ ہوگیا۔ طاہرہ چپ تھی، ارشد بھی چپ تھا۔ ریل کے ڈبے بھی چپ تھے۔ ریلوے کے آدمی نے اپنی پیدا کردہ چپ توڑی مگر اُس نے اپنے آنسو نہ پونچھے۔

"اب یہ ڈبے دُھل رہے ہیں" ـــ اُس نے کہا ـــ "یہ پشاور سے کراچی تک چلا کریں گے۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ یہ گاڑی پاکستان پر قربان ہوجانے والوں کی لاشیں لائی تھی۔ یہ گونگے ڈبے کسی کو کچھ بھی نہیں بتا سکیں گے۔"

☆

اب آٹھ برس بعد طاہرہ اسی قسم کی ریل گاڑی پر راولپنڈی سے لاہور آرہی تھی۔ اُس نے چونک کر ڈبے کی دیواروں اور چھت کو دیکھا۔ ڈبہ دُھلا دھلایا تھا۔ اسے ڈبے میں بیٹھی ہوئی عورتیں یُوں دکھائی دیں جیسے پاکستان کے شہیدوں کی روحیں ہوں۔ اُس کے جی میں آئی کہ ہر عورت کا منہ چُوم لے مگر اُسے فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہ روحیں نہیں، عورتیں ہیں۔ گاڑی دھچکے سے رُکی اور ان عورتوں نے ہڑبونگ بپا کردی۔

طاہرہ آرام سے اٹھی۔ ایک طرف سے ایک عورت نے اُسے دھکہ دے کر کہا ـــ "اری اُترنا ہے تو اُتر، نہیں تو ایک طرف ہوجا" ـــ طاہرہ اس کے دھکے سے سیٹ پر جا پڑی۔

عورتوں کو اتارنے کے لیے ان کے مرد ڈبے میں گھس آتے۔ رواج کے مطابق اُنھوں نے سارا سامان زنانہ ڈبے میں رکھوایا تھا۔ یہ سامان اتارتے اور قلیوں سے اترواتے کسی کو ہوش نہیں تھا کہ کوئی بچہ کچلا جائے گا۔ ڈبے میں یوں بھگدڑ اور نفسا نفسی بپا ہوگئی تھی جیسے گاڑی پر سکھوں نے حملہ کردیا ہو۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔

"اُٹھو نا امّی جان!" ـــ طاہر پرویز نے طاہرہ سے کہا ـــ "لاہور آگیا ہے۔"

"یہ رش نکل جانے دو طاہری!" ـــ طاہرہ نے کہا ـــ "کوئی ٹرنک کا کونہ مار کر تجھے زخمی کردے گا۔"

ارشد آگیا۔ طاہرہ اور طاہری بڑی مشکل سے ڈبے سے نکلے۔ طاہرہ ارشد کے پیچھے پیچھے جارہی تھی مگر اُس کا ذہن آٹھ سال پیچھے چلا گیا تھا۔ وہ جب ۱۹۴۸ء کے آخری دنوں میں لاہور سے کسی کو بتائے بغیر راولپنڈی چلی گئی تھی تو اُس وقت بھی ان پلیٹ فارموں پر مہاجرین موجود تھے مگر اب، آٹھ سال بعد یہاں سرگرم زندگی کی گہما گہمی اور دھکم پیل تھی۔ شہیدوں کی ریل گاڑی اُس کے ذہن سے اُتر نہیں رہی تھی۔ طاہرہ اسے ذہن سے اتارنے کی کوشش بھی نہیں کر رہی تھی۔ کوئی بھی پاکستانی جو مشرقی پنجاب سے ہجرت کرکے آیا ہے، ہجرت کے سفر کو ذہن سے نہیں اتار سکتا۔

طاہرہ جنگِ پاکستان کی مجاہدہ تھی۔ وہ پاکستان اپنے ہاتھوں بنانے والی طالبات میں سے تھی۔ اُس نے جنگِ پاکستان کا پورا ذائقہ چکھا تھا۔ پاکستانی علاقوں کے مسلمانوں کی جنگِ آزادی ۳ جون ۱۹۴۷ء کے روز ختم ہوگئی تھی اور وہ آزادی کی تقریب کے منتظر تھے مگر ہندوستانی علاقوں، خصوصاً مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی ایک اور جنگ شروع ہوگئی تھی جو یک طرفہ تھی کیونکہ مسلمان نہتّے تھے۔ انہیں قتلِ عام سے بچ کر پاکستان پہنچنا تھا۔

طاہرہ کے گھر پر سکھوں نے حملہ کیا تھا۔ گھر میں چار عورتیں تھیں ـــ طاہرہ، عفّت، طاہرہ کی نانی خاتون اور عفّت کی ماں ـــ اس کنبے میں کوئی مرد نہ تھا۔ یہ کمی ارشد اور خاتون کے دو مزارعوں نے پوری کی تھی۔ طاہرہ نے اپنے ہاتھوں ایک حملہ آور سکھ کو اپنے نانا کی کرپچ (فوجی تلوار) سے ہلاک کیا تھا۔ ارشد اور مزارعوں نے بھی سکھوں کو ہلاک کیا تھا، پھر طاہرہ کے مکان کو آگ لگ گئی تھی اور وہ اپنی نانی، عفّت اور اُس کی ماں، ارشد اور دو مزارعوں کے ساتھ وہاں سے نکل آئی تھی۔

طاہرہ اس سفر کو کیسے بھول سکتی تھی جس قافلے کے ساتھ وہ آئی تھی، اُس پر راستے میں سکھوں نے

حملہ کیا تھا۔ قافلہ بکھر گیا تھا۔ کچھ سکھ گھوڑوں پر سوار تھے جو مہاجرین باجرے اور مکئی کے فصل میں چھپنے کو دوڑے تھے، انہیں گھوڑ سواروں نے برچھیوں اور کرپانوں سے شہید کیا تھا۔ ارشد، دونوں مزارعوں اور طاہرہ اور عفّت نے بھی سکھوں کا مقابلہ کیا تھا۔ قافلہ جب اکٹھا ہُوا تو اس کی نفری آدھی سے کم رہ گئی تھی اور کئی جوان لڑکیاں لاپتہ تھیں۔

اس قافلے پر دو اور حملے ہُوئے تھے۔ پہلے طاہرہ کی نانی شہید ہوئی۔ دونوں مزارعوں نے کلہاڑیوں سے قبر کھود کر اُسے دفن کر دیا تھا اور طاہرہ نے اپنا تحریکِ پاکستان کا سبز دوپٹہ قبر پر ڈال دیا تھا پھر عفّت کی ماں شہید ہُوئی۔ اسے بھی دفن کر دیا گیا تھا۔ پھر ایک اور حملے میں ایک مزارع شہید ہو گیا تھا۔

آگے دریا آ گیا جس میں طغیانی تھی۔ طاہرہ نے ارشد کی پیٹھ پر اور عفّت نے مزارع نور دین کی پیٹھ پر دریا پار کیا تھا۔ دریا نے انھیں اپنے ساتھ بہا لے جانے کی بہت کوشش کی تھی۔ سیلابی موجوں نے انھیں اٹھا اٹھا کر پٹخا تھا مگر ارشد اور نور دین دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیے دریا پار کر آئے تھے۔

طاہرہ ان لاشوں کو کیسے بھول سکتی تھی جو پاکستان کے راستے میں پڑی گل سڑ رہی تھیں۔

آج وہ، آٹھ سال بعد، ارشد کے پیچھے پیچھے مسافروں کے ہجوم میں سے گزرتی، دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی گاڑیوں کے ڈبوں کو دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ اُن ڈبوں کو ڈھونڈ رہی تھی جن میں پاکستان بنانے والوں کی لاشیں آئی تھیں۔ وہ ڈبے انہی جیسے تھے جو اُسے نظر آ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ان ڈبوں کو حکومتِ پاکستان نے الگ کیوں نہیں کر دیا۔ انھیں ہجرت کی یادگار کے طور پر ہندوؤں کی مسلم کُشی کے ثبوت کے طور پر الگ کھڑا کر دینا چاہیئے تھا تاکہ قوم کے بچّے انھیں دیکھتے اور جان سکتے کہ ملّتِ پاکستان نے اپنی آزادی کی کیا قیمت ادا کی ہے۔

☆

وہ سوچوں اور یادوں میں گم لاشعوری طور پر چلی جا رہی تھی۔ وہ پُل پر چڑھ گئی۔ ارشد اور طاہر پرویز بہت آگے نکل گئے تھے۔ مسافروں کا رش کم ہو گیا تھا۔ یہ سٹیشن کا اندرونی پُل تھا جس پر وہ جا رہی تھی۔ اُس نے بائیں طرف دیکھا۔ اُسے وہ پلیٹ فارم نظر آ گیا جس پر شہیدوں کی لاشوں والی گاڑی کھڑی تھی۔ اب وہاں مال گاڑی کے ڈبے کھڑے تھے۔ طاہرہ کے قدم رُک گئے۔ وہ پُل سے نہیں، گزرے ہوئے وقت سے ایک بار پھر گزر رہی تھی۔ اُسے دو نوجوان لڑکے اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ وہ اٹھکیلیاں کرتے آ رہے تھے۔ طاہرہ انھیں ماضی کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا اپنا کوئی بھائی نہیں تھا۔ ان نوجوانوں کو ہنستا مُسکراتا دیکھ کر طاہرہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

اُسے تحریکِ پاکستان کے فیصلہ کُن دَور کے طلباء یاد آ گئے۔ وہ ایسے ہی تھے جنہوں نے انگریزی حکومت اور ہندوؤں کے متحدہ محاذ کو توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ طاہرہ کو کل کی بات کی طرح یاد تھا کہ یہ لڑکے لڑکیوں کے جلوسوں کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا دیا کرتے تھے۔ ان میں کتنے ہی شہید ہو گئے تھے بعض کی آنکھیں آنسو گیس نے ساری عمر کے لیے خراب کر دی تھیں۔ ان کے زورِ بازو کو انگریز اور ہندو ساری عمر نہیں بھولیں گے۔

طاہرہ رُکی کھڑی ان دونوں لڑکوں کو دیکھ رہی تھی اور ان کی عمر کا اندازہ کر رہی تھی۔ آٹھ سال پہلے ان کی عمر دس گیارہ سال ہو گی۔ بہت چھوٹے تھے۔ اُس وقت تو دس گیارہ سال کی عمر کے بچے بھی چھوٹی چھوٹی

جھنڈیاں اٹھائے گلیوں میں نعرے لگاتے پھرتے تھے — "لے کے رہیں گے پاکستان... بَٹ کے رہے گا ہندوستان"۔

طاہرہ کو ایک ہچکی سی آئی۔ دُکھ کی ایک لہر برقی رَو کی طرح اُس کے وجُود میں دوڑ گئی۔ اُس نے ہجرت کے سفر میں پاکستان کے راستے پر ایسے بے شمار بچوں کی لاشیں دیکھی تھیں۔ ان کے پیٹ پھٹے ہُوئے تھے، گردنیں کٹی ہُوئی تھیں۔ وہ پاکستان کے نام پر ذبح ہو گئے تھے۔

دونوں لڑکوں کی چال میں مستی سی آ گئی تھی اور ان کے قدم رک رہے تھے۔ طاہرہ نے بے اختیار چاہا وہ انھیں روک کر کہے کہ تمھیں اگر کسی نے بتایا نہ ہو تو میں تمھیں بتاتی ہوں کہ پاکستان کے لیے قوم نے تم جیسے ہزاروں بچے ذبح کروائے ہیں اور ستّر ہزار بیٹیاں اغوا ہوئی ہیں.... آؤ، میرے بھائیو، میں تمھیں وہ پلیٹ فارم دکھاؤں جہاں پاکستان بنانے والوں کی لاشوں کی بھری ہوئی گاڑی آ کر رُکی تھی۔

طاہرہ حسین لڑکی تھی۔ عمر سے کم لگتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایمان کی چمک اور چہرے پر روح کی رونق تھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں اَدھ کھلی کلی کا حُسن تھا۔ دونوں لڑکے اُس کے قریب آئے تو ایک نے اُس وقت کا ایک فلمی گیت گانا شروع کر دیا — "کبھی آر کبھی پار لاگا تیرِ نظر" — اور دوسرا لڑکا ہیجڑوں کی طرح تالی بجانے لگا۔ گانے والا لڑکا طاہرہ کے ساتھ لگ کر گزرا۔

طاہرہ کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ چہرے کی رونق کی جگہ کرب کا تاثر آ گیا جیسے کسی سکھ کی کرپان نے اُس کے سینے میں اُتر کر اُس کا دل چیر دیا ہو۔ لڑکے آگے نکل گئے۔ طاہرہ ایک زناٹے سے شہیدوں کے آسمان سے شوہدوں کی زمین پر آ پڑی۔ وہ یوں چل پڑی جیسے کوئی بلندی سے گر کر اٹھا اور چلنے کی کوشش کیا کرتا ہے اُس نے دو تین بار گھوم کر دیکھا۔ دونوں نوجوان گھوم گھوم کر دیکھتے اور قہقہے لگاتے جا رہے تھے۔

طاہرہ جب سیڑھیوں تک پہنچی تو اُسے اپنے قریب ہی ایک لڑکے کی آواز سُنائی دی — "سوہنیو! بھائی دربار لے چلتے"۔

طاہرہ نے گھوم کے دیکھا۔ وہی نوجوان اُس کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ طاہرہ سراپا قہر بن گئی۔ اُس کا دایاں ہاتھ اٹھا، بجلی کی طرح ہوا میں گھوما اور یہ ہاتھ اس قدر زور سے ایک نوجوان کے منہ پر پڑا کہ وہ تیورا کر گرا اور پُل کی چوڑی سیڑھیوں پر قلابازیاں کھاتا ہُوا پلیٹ فارم تک پہنچ گیا۔ وہ اُٹھا اور اتنی تیز دوڑا جتنی تیز وہ کبھی نہیں دوڑا ہو گا۔ طاہرہ دوسرے نوجوان کو دیکھنے کے لیے گھومی۔ وہ غائب ہو چکا تھا۔

"بیٹی!" — طاہرہ نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ اُس نے دیکھا۔ ایک بزرگ صُورت انسان کہہ رہا تھا — "کس کس کو تھپڑ مارو گی۔ یہاں تو پوری نسل نہ جانے کون سی تہذیب میں رنگی گئی ہے۔ یہاں کے زندہ انسانوں کے چہروں پر شہیدوں کی یاد کی جو سرخی تھی، وہ بجھتی جا رہی ہے"۔

"یہ کس قوم کے بیٹے ہیں؟" — طاہرہ نے پوچھا — "یہ کہاں سے آتے ہیں؟"

"یہ ہمارے ہی بیٹے ہیں" — بزرگ نے کہا — "اس سٹیشن کی فضا میں ۱۹۴۷ء کے شہیدوں اور زخمی مہاجروں کے خون کی بُو باس ابھی تک تر و تازہ ہے جسے کوئی ایمان والا ہی سونگھ سکتا ہے۔ یہ چھوکرے سٹیشن کے اندر آ جاتے ہیں اور مسافر گاڑیوں کے زنانہ ڈبوں کے سامنے منڈلاتے، بکواس کرتے اور شریف زادیوں کو فحش اشارے کرتے رہتے ہیں"۔

"انھیں کسی نے بتایا نہیں کہ...؟"

طاہرہ چپ ہوگئی۔ بزرگ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ اُس پلیٹ فارم کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں ۱۹۴۷ء میں شہیدوں سے بھری ہوئی ریل گاڑی رُکی اور دُھلی تھی۔

"بیٹی! تم نے وہ گاڑی نہیں دیکھی تھی" — بزرگ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں کہہ رہا تھا — "وہ گاڑی دُھلنی نہیں چاہیئے تھی۔ اُس میں سے لاشیں نکلنی نہیں چاہیئے تھیں۔ آج وہ ہڈیوں کے ڈھانچے ہوتے۔ ڈبوں پر اس گاڑی کی تاریخ لکھی ہوتی۔ وہ گاڑی ہماری آتش فشاں تاریخ کی ملکیت تھی۔ ظالموں نے اسے دھوڈالا اور اب وہ تاریخ جانے کہاں کہاں لڑھکتی پھر رہی ہے۔"

"طاہرہ.... طاہرہ!"

طاہرہ نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ارشد اُسے بلا رہا تھا۔ طاہر پرویز نے ارشد کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ طاہرہ اس قدر تیزی سے سیڑھیاں اُتری اور اُس نے چھ سال کی عمر کے طاہر پرویز کو اُٹھا کر یوں سینے سے لگالیا جیسے اُسے اس تہذیب سے بچانے کی کوشش کی ہو جس میں پاکستان کی نئی پود رنگی گئی تھی۔

"وہاں کیوں رُک گئی تھیں؟"

طاہرہ نے اسے تفصیل سے بتایا کہ پُل پر کیا ہُوا اور اُس نے کیا کیا اور یہ بزرگ صورت انسان اُسے کیا کہہ رہا تھا۔

"جذبات سے نکلو طاہرہ!" — ارشد نے اُسے کہا — "ان جذبات نے تمہیں نارمل نہیں رہنے دیا"۔

☆

پاکستان کے نام پر مرمٹنے والوں کا خون ابھی خشک نہیں ہُوا تھا کہ پاکستان کی نئی پود سمندر پار سے آتی ہُوئی بڑی دلکش غلاظت میں ڈوبنے لگی۔ یہ ایک یلغار تھی جو پاکستان کی ثقافت پر لڑائی مارکٹائی، جرائم، خون خرابے اور جنسی لذّت سے بھرپور انگریزی فلموں اور ناولوں کی صورت میں ہُوئی۔ چھوٹے چھوٹے ناول اتنے سستے داموں ملنے لگے کہ طلبا معمولی سے جیب خرچ سے بھی خرید لیتے تھے۔ انھیں ہر بچے تک پہنچانے کے لیے محلوں میں ایک "آنہ لائبریریاں" کھل گئیں جہاں سے صرف ایک آنہ کرایہ پر بچوں کو وہ ناول ملنے لگے جن میں چرس اور افیون کا نشہ تھا۔

انگریزی فلمیں جن میں بے حیائی اور عریانی پہلے ہی کچھ کم نہیں تھی، اپنے ساتھ "بلیو پرنٹ" بھی لانے لگیں۔ پاکستانی فلم سازوں نے جب دیکھا کہ لوگ جو انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتے سمجھتے، انگریزی فلموں کے شیدائی ہو گئے ہیں تو اُنھوں نے اردو اور پنجابی فلموں میں انگریزی فلموں والی عریانی، فحاشی اور لڑائی مارکٹائی بھردی۔ ناچ اور گانے لچر اور فحش ہو گئے۔

فحاشی باقاعدہ کاروبار بن گئی۔ پبلشروں کے کھمبیوں کی طرح ابھرنے لگے۔ فحش لٹریچر کے پبلشر اور عریاں فلموں کے ڈسٹری بیوٹر دولت کے لالچ میں پاکستان اور اسلام کے دشمنوں کے ایجنٹ بن گئے۔

نوزائیدہ مملکتِ پاکستان ایک کانٹا بن کر دنیائے کفر کے سینے میں اُتر گئی تھی۔ ہندو اسے اپنی ماتا کا ٹکڑا، یہودی اور نصرانی اسے اپنا دیرینہ دشمن سمجھتے تھے مگر پاکستان ایک حقیقت بن کر کرۂ ارض پر اُبھرا تھا۔ اسے فوجی حملے سے مٹایا نہیں جاسکتا تھا۔ ان اسلام دشمن قوموں کے دانشوروں نے انسانی فطرت کی کمزوری

کو سامنے رکھ کر پاکستانی قوم کی ذہنی تخریب کاری کا منصوبہ بنایا۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کے امین نوجوان ہوتے ہیں کسی بھی قوم کے نوجوان ذہن میں جنسی لذّت پرستی ڈال دی جائے وہ قوم زوال کے راستے پر چل پڑتی ہے۔ انسانی فطرت لذّت کی طرف جلدی مائل ہو جاتی ہے۔

جب ذہن بدلتے ہیں تو سوچیں بدل جاتی ہیں، اطوار بدل جاتے ہیں، لباس بدل جاتے ہیں، تہذیب بدل جاتی ہے، پسند اور ناپسند کے پیمانے بدل جاتے ہیں اور جب ذہن کی تبدیلی، لذّت پرستی اور فرار پسندی کے زیرِ اثر ہو تو اخلاقیات اور مذہب کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ کردار کے قلعے مسمار ہو جاتے ہیں۔ نیک و بد کی تمیز مٹ جاتی ہے اور انسان حیوان بن جاتے ہیں۔ قومی روایات سے انحراف شروع ہو جاتا ہے۔

تخریب کا یہ عمل پاکستان میں شروع ہو چکا تھا۔ وہ نونہال اور نوجوان جو قومی روایات کے رکھوالے اور وارث تھے "ٹیڈی بوائے" بن گئے تھے۔ پتلونیں اتنی تنگ پہنتے تھے جیسے کپڑا ٹانگوں پر پلیٹ کر سی دیا گیا ہو۔ لڑکیوں کے بھی لباس اتنے تنگ ہو گئے تھے کہ ملبوس ہوتے ہوئے مستور نہیں تھیں۔ دوپٹہ رسی کی طرح گلے میں پڑا رہتا تھا۔ لڑکے لڑکی میں دوستی لگانے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ لڑکی بھری محفل میں "بوائے فرینڈ" کا ذکر بڑے فخر سے کرتی تھی۔ بات کرنے کے، کھڑے ہونے اور بیٹھنے کے، کھانے پینے اور چلنے پھرنے کے انداز بدل گئے تھے اور اس انداز میں "امریکی کاؤ بوائز" کا رنگ غالب تھا۔

جرائم کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ اونچے گھرانوں کے لڑکے جو انگریزی فلمیں دیکھتے اور اردو کے جو ناول پڑھتے تھے، ان کی نقالی باقاعدہ جرائم (عام طور پر ویران سڑکوں اور سنسان گلیوں میں رہزنی) کی صورت میں کرنے لگے تھے۔ ان میں جو گرفتار ہوتا تھا وہ اپنے بڑے عہدے والے باپ کی بدولت تھانے سے گھر بھیج دیا جاتا تھا۔ قانون کے پرخچے اُڑنے لگے تھے۔

دشمن کی یلغار کامیاب تھی، اور کامیاب اس لیے تھی کہ جس مورچے پر دشمن نے حملہ کیا تھا وہ مورچہ خالی تھا۔ پاکستان بنانے والا ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کے روز اس دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ پیچھے حکومت کرنے والے رہ گئے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف مورچہ بندی کر لی تھی۔ وہ اقتدار کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر اخباری بیانوں اور دھواں دھار تقریروں کے گولے داغ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے انھوں نے قانون شکن گروہوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی پولیس کو قانون اور شہریوں کے جان و مال اور عزت کے تحفظ کے لیے نہیں اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے استعمال کرتی تھی۔ مخالفین کو جھوٹے مقدمات میں ملوّث کر کے انھیں جیلوں میں بند رکھا جاتا تھا۔ جب مخالفین کی حکومت بن جاتی تھی تو وہ سابقہ برسرِ اقتدار لیڈروں سے انتقام لیتے تھے۔

ان کی سیاست جو سیاست نہیں بلکہ معرکہ آرائی تھی، کالجوں میں بھی پہنچ گئی اور اس کے ساتھ خنجر، چاقو، ریوالور اور سٹین گنیں بھی طلبا کے ہاتھوں میں دے دی گئیں۔ پھر قوم کے نونہالوں کو سیاسی مقاصد اور مفادات کی خاطر توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ ہوسٹل گوریلا کیمپ بن گئے۔ سٹوڈنٹ لیڈروں کو باقاعدہ وظیفہ ملنے لگا اور سیاسی پارٹیاں غیر ممالک کی آلۂ کار بن گئیں — اور ملک دشمن کے ایجنٹوں کی گرفت میں آگیا۔

☆

"تم نے آٹھ سال کہاں گزارے ہیں طاہرہ؟" ـــــ ارشد نے اُسے تانگے میں گھر کو جاتے ہوئے کہا ـــ "کیا تم نے آج دیکھا ہے کہ ایک نوجوان نے تمہیں چھیڑا ہے؟ تم اس انقلاب سے بے خبر کس طرح رہی ہو؟ لاتعلق کس طرح رہی ہو؟"

"میں نے تمہیں راولپنڈی میں تفصیل سے بتایا تھا کہ مجھ پر کیا بیتی ہے" ـــ طاہرہ نے جواب دیا ـــــ "مجھے تو اپنی ہوش نہیں رہی تھی کہ میں دیکھتی کہ پاکستان پر کیا بیت رہی ہے...لیکن ارشد!" ـــ طاہرہ نے کربناک لہجے میں کہا ـــ "ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ ویسے ہی نوجوان ہیں جیسے تم تھے۔ کمال شہید بھی انہی جیسا تھا۔ نجمہ آپا کا بھائی بھی انہی جیسا تھا۔ اب یہ نوجوان کیوں نہیں سمجھتے کہ انہیں دشمن تباہ کر رہا ہے۔"

"اِس لیے کہ ہم نے ریل گاڑی کے ڈبوں سے شہیدوں کا خون دھو ڈالا ہے" ـــ ارشد نے کہا ـــ "اور گڑھے کھود کر سب کی لاشیں اکٹھی ان گڑھوں میں پھینک دیں اور مٹی ڈال کر گڑھوں کو زمین کے ساتھ ملا دیا تھا...ہم نے اپنی تاریخ گڑھے میں پھینک دی ہے۔ آٹھ برسوں کی اُڑتی مٹی اور ریت نے گڑھا بھر کر اسے زمین کے ساتھ ہموار کر دیا ہے۔ ہم نے اپنی روایات کو دفن کر دیا ہے طاہرہ!"

دونوں تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور طاہر پرویز اگلی سیٹ پر تھا۔ تانگے والا ارشد اور طاہرہ کی باتیں سن رہا تھا۔ اُس نے گھوم کے دیکھا۔

"اوئے!" ـــ تانگے والے نے حیرت زدہ لہجے میں کہا ـــ "میں تو تمہیں سواریاں سمجھا تھا لیکن تم اپنے ہی نکلے...تم ارشد ہو نا!"

ارشد اور طاہرہ نے اُسے چونک کر دیکھا۔ ارشد نے نعرہ لگانے کے لہجے میں کہا ـــ "اوئے کامے!" ـــ ارشد نے ہاتھ بڑھا کر اُس سے ہاتھ ملایا اور کہا ـــ "میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا یار! کہو، خیریت سے لاہور آ گئے تھے یا...؟"

"ارشد باؤ!" ـــ کامے تانگے والے نے کہا ـــ "اللہ نے کرم کیا اور میرا سارا کنبہ خیریت سے آ گیا تھا۔ اسی تانگے پر سب کو لایا تھا۔"

"کہیں ٹھکانہ بن گیا تھا؟" ـــ ارشد نے پوچھا۔

"ایک جھگی ڈال لی تھی" ـــ کامے نے جواب دیا ـــ "اسی کو پکا کر لیا ہے...شکر ہے مولا کا ارشد باؤ! قسم لے لو جو کبھی امرتسر یا جلال آباد یاد آیا تھا مگر اب دونوں شہر بہت یاد آتے ہیں۔"

"بھول جا کامے!" ـــ ارشد نے کہا ـــ "بے شک ہم اپنی جائیدادیں اور اپنا سب کچھ وہاں چھوڑ آئے ہیں مگر..."

"ارے نہیں ارشد باؤ!" ـــ کامے نے باگیں کھینچ کر گھوڑے کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا ـــ "اللہ پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نہ وہ پکا مکان یاد آتا ہے نہ وہ مال اسباب یاد آتا ہے جو وہیں رہ گیا ہے۔ وہ نعرے یاد آتے ہیں، وہ جذبے یاد آتے ہیں، وہ ولولے یاد آتے ہیں اور قوم کے وہ شیر پُتر یاد آتے ہیں جنہوں نے جلال آباد سے امرتسر تک کی زمین اور آسمان ہلا ڈالے تھے۔ مجھے وہ جلوس یاد ہے جسے منتشر کرنے کے لیے فوج آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک گورا لفٹین تھا۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو۔ وہ لاپتہ ہو گیا تھا۔"

"ہاں، ہاں" ـــــ ارشد نے کہا ـــ "سُنا تھا مگر یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ مل گیا تھا یا نہیں۔"

"نہیں" ـــ کامے نے کہا ـــ "وہ کہاں سے ملتا۔ اُسے چار آدمیوں نے اُس کے اوپر کمبل ڈال کر اغوا کیا تھا۔ ان آدمیوں میں تین ملنگ تھے اور چوتھا میں تھا۔ یہ انتظام ایک مسلمان تھانیدار نے کرایا تھا۔ وہ رہتک کا رہنے والا تھا۔ عبدالجلیل خان۔ وہ اُس روز امرتسر سے پولیس کی گارد لے کر آیا تھا۔ جلال آباد کا اجو بدمعاش تمہیں یاد ہے نا؟...اُس کی دوستی اس تھانیدار کے ساتھ تھی۔ تھانیدار نے اسے کہا تھا کہ موقع ملے تو اس انگریز لفٹین کو اٹھا لے جانا اور قبرستان کے تکیے تک پہنچا دینا۔ اجو بدمعاش میرا لنگوٹیا یار تھا۔ یہیں ہے۔ اب بھی بدمعاشی کرتا ہے۔ لیڈروں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اُس نے مجھے اور تین ملنگوں نے کہا تھا کہ یہ کام کرنا ہے...تم اُس روز جلوس کی تیاریوں اور انتظام میں لگے ہوئے تھے اور ہم اس انگریز کے اغوا اور قتل کا انتظام کر رہے تھے۔"

کامے نے لمبی آہ بھری اور بولا ـــ "اجو بدمعاش تھا۔ شریف میں بھی نہیں تھا اور ملنگ تو تم جانتے ہو کہ ہوتے ہی چرسی اور بھنگی ہیں۔ ان کی بلا سے، حکومت انگریزوں کی ہو، ہندوؤں کی ہو چاہے سکھوں کی۔ تھانیدار عبدالجلیل نے اجو اور ملنگوں سے کہا تھا کہ اس کام کا پیسہ ایک نہیں ملے گا۔ یہ کام پاکستان اور اسلام کے نام پر کرنا ہے...اور ارشد باؤ! انہوں نے یہ کام کر دیا۔ انگریز لفٹین کو انہوں نے رات تکیے میں قتل کیا اور قبرستان میں گہرا گڑھا کھود کر دفن کر دیا تھا۔ میں ان کے ساتھ تھا...بس یہی کچھ یاد آتا ہے کہ اُس وقت بدمعاش بھی مومن ہو گئے تھے۔ اب دیکھو، مومن بدمعاش ہو گئے ہیں...اُس جلوس نے تھانے پر قبضہ کیا تھا نا! مجھے یاد ہے۔ ایک لڑکی نے بڑی جوشیلی تقریر کی تھی۔"

"اس لڑکی کو پہچانا نہیں تم نے کامے؟" ـــــ ارشد نے کہا ـــ "یہ تمہارے پیچھے بیٹھی ہے۔"

کامے نے گھوم کر دیکھا اور طاہرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا ـــــ "میں نے اسے نہیں پہچانا تھا ارشد باؤ! میں تمہاری طرف دیکھتا بھی نہ لیکن اس بچی نے جو باتیں کیں اور جو کچھ تم نے اسے کہا، وہ سُن کر میں نے تمہاری طرف دیکھا تھا۔ میرے تانگے کی پچھلی سیٹ پر تو سارا دن لوگ بیٹھتے اور اُترتے رہتے ہیں۔ آدمی کس کس کو پہچانے۔ جو آتا ہے، چند منٹ ساتھ دیتا اور چلا جاتا ہے" ـــ اُس نے طاہر پرویز کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا ـــ "یہ بچہ تمہارا ہے؟...اللہ لمبی عمر دے...شادی یہاں آ کر کی تھی؟"

"ہاں کامے!" ـــ ارشد نے کہا ـــ "یہاں آ کر کی تھی۔"

"میں اس بچی کو جانتا ہوں" ـــ کامے تانگے والے نے کہا ـــ "اِس بے چاری نے تو نہ اپنا نانا دیکھا ہے نہ باپ دیکھا ہے۔ یہ لفٹین خیر دین کی دوہتی ہے۔ وہ صوبیدار میجری پنشن آیا تھا اور اُسے لفٹیننی کا عہدہ ملا تھا۔ اس بچی کی نانی خاتون بڑی بھاگوان عورت ہے۔"

"تھی کامے!" ـــ ارشد نے کہا ـــ "راستے میں شہید ہو گئی تھی۔"

"اللہ شہادت قبول کرے" ـــ کامے نے کہا ـــ "میں اس لڑکی کے باپ کو جانتا تھا۔ میں اُسی محلے میں رہتا تھا۔ وہ انسان نہیں تھا۔ ہر روز اس بچی کی ماں کو گالیاں دیتا اور کبھی کبھی پٹائی بھی کر دیا کرتا تھا۔ یہ بچی پیدا ہوتی تو اس کی ماں اس کے باپ کے ہاتھوں ماری گئی اور وہ گھر سے بھاگ گیا۔ کچھ دنوں بعد اُس کی گلی سڑی لاش نہر سے ملی تھی۔ اُس نے خودکشی کر لی تھی۔"

"میری امّی کو تم نے دیکھا تھا کامے؟" — طاہرہ نے پوچھا۔

"تین چار بار میرے تانگے پر تمہاری نانی کے ہاں گئی تھی" — کامے نے جواب دیا — "یہی تانگہ تھا جہاں تم بیٹھی ہو، تمھاری امّی یہیں بیٹھا کرتی تھی۔ تم اُس کی صحیح تصویر ہو۔ اُسے دیکھنا چاہو تو آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیا کرو۔"

ارشد اور طاہرہ نے آنکھوں آنکھوں میں طے کر لیا کہ کامے کو یہ نہ بتایا جاتے کہ طاہرہ کا باپ زندہ ہے اور وہ انھیں مِل گیا ہے۔

کاما جلال آباد کا رہنے والا تھا اور وہ تحریکِ پاکستان کا سرگرم کارکن تھا۔ تحریک کے کاموں کے لیے اُس نے اپنی خدمات پیش کر رکھی تھیں۔ تحریک کے کارکنوں کو تانگے پر اِدھر اُدھر لے جانے کے وہ پیسے نہیں لیا کرتا تھا۔

"تمھارے خاندان کے سارے فرد خیریت سے آ گئے تھے ارشد باؤ؟"

"بالکل خیریت سے" — ارشد نے جواب دیا۔

"تمھارے ابّا جان کیا کرتے ہیں؟"

"پچھلے مہینے سروس سے ریٹائر ہو گئے ہیں۔"

"اور تم؟"

"بڑی اچھی سرکاری نوکری ہے۔"

کاما خاموش ہو گیا۔

"ارشد باؤ!" — اُس نے کچھ دیر بعد کہا — "تمھارا گھر شاید قریب آ رہا ہے۔ ایک بات کرنی ہے۔"

"تانگہ روک لو نا!" — ارشد نے کہا — "ہمیں کوئی جلدی نہیں۔"

کامے نے تانگہ ایک طرف کر کے روک لیا اور بولا — "پاکستان بنانے میں تم لوگوں نے مجھے جو بھی ڈیوٹی دی وہ میں نے پوری کی۔ میں ایک انگریز لفٹین کے قتل میں بھی شامل ہوا۔ اگر اس کے اغوا میں ہی پکڑا جاتا تو بھی مجھے عمر قید ملتی۔ میں نے ہر وہ فرض ادا کیا جو مجھے دیا گیا، پھر بھی میری بات میں کوئی وزن نہیں کیونکہ میں تانگے والا ہوں اور لوگ مجھے کمال دین کی بجائے کاما کہتے ہیں کیونکہ میں کمال دین کہلانے کے قابل نہیں۔ میں اَن پڑھ ہوں، چرسی ہوں اور میں بدمعاش بھی ہوں۔ شاید تم بھی میری بات سُن کر ہنس پڑو کہ کامے کا دماغ چل گیا ہے۔"

"بات کرو کامے!" — ارشد نے کہا — "میں جو مدد کر سکتا ہوں کروں گا۔"

"مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے ارشد باؤ!" — کامے نے کہا — "اپنے اُس پاکستان کی مدد کرو جو تم نے اپنے ہاتھوں بنایا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہ پاکستان نہیں جو ہم نے بنایا تھا.... نہ ارشد باؤ! ایسی بات تم نہ کہنا۔ یہ وہی پاکستان ہے جس کی خاطر ہم نے لاکھوں جانیں قربان کر دی ہیں۔ اس پاکستان کو دیمک لگ گئی ہے۔ جس راستے پر ہم اپنے عزیزوں کی لاشیں بکھیرتے آتے تھے، اُس راستے اب سمگلنگ ہوتی ہے اور سمگلروں میں یہاں ہندوستان کے جاسوس بھی آتے ہیں۔ ان کی مدد بعض پاکستانی کرتے ہیں۔"

"تم کسی کو جانتے ہو؟"

"میں تانگے والا ہوں" — کامے نے کہا — "اور میں بدمعاش بھی ہوں۔ میں بہت کچھ جانتا ہوں، لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک بار ایک آدمی کی نشاندہی کی تھی۔ میرا جو حشر ہوا وہ میں ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ تم سرکاری رتبے والے آدمی ہو ارشد باؤ! بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میں تین چار دنوں سے بہت پریشان ہوں۔ سرحد پار سے دو ہندو لڑکیاں آتی ہیں۔ ان کے نام اسلامی ہیں۔ انھیں آتے ہوئے دو تین مہینے ہو گئے ہیں۔ ان کا میل جول پاکستان کے افسروں کے ساتھ ہے۔ میں ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ شاید تم کچھ کر سکو لیکن میں تمھیں یہ بتا دوں کہ ان کے خلاف رپورٹ کرو گے تو کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔ ہو سکتا ہے تمھارے خلاف کارروائی ہو جاتے.... کچھ اور کرنا پڑے گا.... میں قتل تک کی سوچ چکا ہوں۔ اگر کچھ کر سکتے ہو تو مجھے کسی جگہ ملو۔ میں پوری بات بتاؤں گا۔ ہم سارے ملک کو دشمن کے جاسوسوں سے صاف نہیں کر سکتے لیکن جسے ہم جانتے ہیں اُسے تو صاف کر دیں۔"

"یہ ہمارا فرض ہے کامے!" — ارشد نے کہا — "چلو، ہمیں گھر پہنچا دو۔ کل اسی وقت یہیں مِلنا۔"

"ملوں گا ارشد باؤ! ضرور ملوں گا۔"

تانگہ کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہُوا تو طاہرہ کا دل بیٹھ گیا جیسے کسی مجرم کو عمر بھر کے لیے جیل خانے میں داخل کیا جا رہا ہو۔ کوٹھی کے ماتھے پر ابھی تک "آشا بھون" لکھا ہُوا تھا۔ بڑی خوشنما اور بہت بڑی کوٹھی تھی۔ اس کے آگے سرسبز وسیع لان تھا۔ اس کی ہریالی ویسی ہی تھی جیسی وہ سات سال پہلے چھوڑ گئی تھی۔ پیڑ پودے بھی ویسے ہی تھے ان کی دل کشی اور ان کا حسن کچھ زیادہ ہی نکھر آیا تھا مگر طاہرہ کے پُرشباب چہرے پر وہ نکھار نہ رہا جو کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے تھا۔

گھوڑے کے قدموں کی آواز پر ارشد کی امّی برآمدے میں آئی۔ گھر والوں کو ارشد اور طاہرہ کے آنے کی اطلاع نہیں تھی۔ ارشد نے گھر اطلاع نہیں دی تھی کہ اُسے طاہرہ مل گئی ہے اُس کی امّی نے تانگے کی اگلی سیٹ پر طاہر پرویز کو دیکھا تو وہ بانہیں پھیلا کر دوڑی ——"میرا طاہر!"—— مگر پچھلی سیٹ سے اُس نے ارشد کے ساتھ طاہرہ کو اترتے دیکھا تو طاہر پرویز کے لیے اُس کے پھیلے ہوئے بازو ہوا میں معلّق رہے اور وہ رُک کے بُت بن گئی۔ اُس کا منہ کھل گیا اور آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اس کے منہ سے حیرت زدہ سرگوشی نکلی ——"طاہرہ؟"

ارشد کے قہقہے نے اُس کے بُت میں جان ڈال دی۔

"یہ طاہرہ ہی ہے امّی جان!" —— ارشد نے کہا۔

دوسرے لمحے طاہرہ ارشد کی امّی کے بازوؤں میں تھی۔ اتنے میں ارشد کا باپ، بڑا بھائی یوسف اور بھابی باہر آچکی تھیں۔ اُن سب نے طاہرہ کو دیکھا۔ کسی کو بھی جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ طاہرہ ہے۔ یہ تو ارشد تھا جس نے "آشا بھون" میں طاہرہ کے نام کو زندہ رکھا ہُوا تھا۔ طاہرہ کو روپوشش ہوتے سات سال گزر گئے تھے۔ اُس کی واپسی کی امید کبھی کی دم توڑ چکی تھی۔ اگر ارشد عفّت کی موت کے بعد دوسری شادی کر لیتا تو یہ لوگ طاہرہ کا نام بھی بھول چکے ہوتے۔

"میں کہتا نہ تھا کہ طاہرہ مل جائے گی؟" —— ارشد نے مسرّت سے بھرپور لہجے میں کہا —"لو آگئی ہے"

پھر یوں ہُوا جیسے سب طاہرہ پر ٹوٹ پڑے ہوں۔ ہر کسی نے اُسے گلے سے لگایا۔ وہ طاہرہ کو دیکھ کر شاید اتنی زیادہ خوشی کا اظہار نہ کرتے۔ وہ خوش اس لیے ہُوتے تھے کہ ارشد کا گھر آباد ہونے کا ذریعہ پیدا ہو گیا تھا۔ ارشد نے اعلان کر رکھا تھا کہ وہ طاہرہ سے شادی کرے گا۔ طاہرہ نہ ملی تو وہ اپنے بچے کو کسی اور عورت کے حوالے نہیں کرے گا۔

طاہرہ کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ تھی۔ وہ جیسے ان میں سے کسی کو بھی دیکھ کر خوش نہ ہوئی ہو۔ وہ جب سب کے ساتھ کوٹھی کے اندر گئی تو اُس کی نظر اُس کمرے کے اندر چلی گئی جو ارشد اور عفّت کا کمرہ تھا۔ وہ ان دونوں کو اس کمرے میں چھوڑ کر دبے پاؤں نکل گئی تھی، کبھی واپس نہ آنے کے لیے مگر اُسے یہیں واپس آنا پڑا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ رک گئی اور اُس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ سات برس گزرے، اس کمرے

کو اُس نے اپنے ہاتھوں سجایا تھا۔ شبِ عروسی والا پلنگ اُسی جگہ پڑا تھا جہاں طاہرہ نے رکھوایا تھا۔ اس پلنگ پر اُس نے پھول بچھائے تھے۔ عفّت کو اُس نے اپنے ہاتھوں اس کمرے میں داخل کیا تھا۔

اس کمرے میں اُس نے اپنی محبت ذبح کی تھی۔ اس کمرے میں اُس نے ارشد اور عفّت کی ازدواجی زندگی کے نام اپنے پیار کا صدقہ دے دیا تھا۔ اپنا دل قربان کر دیا تھا مگر انسانوں نے اُس کا صدقہ قبول نہ کیا۔ اُس کی اتنی عظیم قربانی یوں لَوٹ کے اُس کے وجود کے ساتھ آلگی جیسے ویرانے میں اپنی ہی صدا دیواروں جیسی ننگی چٹانوں اور بھوتوں جیسے ٹیلوں سے ٹکرا کر بھٹکنے لگتی ہے۔

وہ دروازے میں کھڑی سسکیاں لیتی رہی۔ اُس نے آنسو پونچھے نہیں، بہہ ہی جانے دیئے —— سات برس پہلے کے لمحے کمرے میں لَوٹ آئے تھے اور صدائے بازگشت کی طرح کمرے میں بھٹک رہے تھے۔ طاہرہ کو پہلے ارشد کی امّی نے کندھوں سے تھاما اور وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی، پھر ارشد کی بھابی نے اسے وہاں سے ہٹ آنے کو کہا مگر اُس نے دوپٹہ چہرے پر ڈال لیا اور وہ اور زیادہ رونے لگی۔ ارشد نے رندھی ہُوئی آواز میں اُسے کہا —"طاہرہ! چلو، صبر کرو" —— وہ وہاں سے نہ ہلی۔ سب کے آنسو بہنے لگے۔

"امّی جان!" —— عفّت کے بچّے طاہر پرویز نے طاہرہ کا ہاتھ پکڑ کر روتی ہوئی سی آواز میں کہا —"آپ کیوں روتی ہیں؟ .... نہ روئیں نا امّی جان!"

طاہرہ جیسے چونک اٹھی ہو۔ اُس نے جھک کر طاہر پرویز کو اٹھا لیا اور دیوانہ وار اُس کا مُنہ چوم کر بولی —"نہیں طاہری! میں رو نہیں رہی۔ تیرے لیے تو میرے آنسو بھی مُسکرائیں گے" —— اور وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ کر سب کے ساتھ آگے چل پڑی۔

✪

رات بچّے سو گئے تھے۔ ارشد کی امّی، اس کا باپ، اس کا بھائی یوسف اور یوسف کی بیوی زینت اور ارشد طاہرہ کے پاس بیٹھے تھے۔

"طاہرہ!" —— ارشد نے کہا —"کامے نے پیسے نہیں لیے تھے"

"زبردستی دے دینے تھے" —— طاہرہ نے کہا۔

"زبردستی کی تھی" —— ارشد نے کہا —"اُس نے ایسا گھور کر دیکھا کہ میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ جاتے جاتے کہنے لگا —"کل ضرور ملنا.... ارشد باؤ! اب معلوم ہو رہا ہے کہ پاکستان بنا لینا کوئی مشکل نہیں تھا، اِسے دشمن سے بچائے رکھنا مشکل نظر آرہا ہے" —— اُس نے تانگہ چلا کے روک لیا اور مجھے سر کے اشارے سے اپنے قریب بلا کے رازداری سے کہنے لگا —— "امرتسر والا چوہدری اکرم یاد ہے؟ مہر اللہ بخش یاد ہے؟" —— مجھے دونوں یاد ہیں" —— ارشد نے اپنے باپ سے مخاطب ہو کے کہا —"ابّا جان! آپ ان دونوں کو جانتے ہوں گے۔ امرتسر کے مشہور جاگیردار تھے اور دونوں انگریزوں کے خاص آدمی تھے۔ یونینسٹ پارٹی میں تھے"

"ہاں ہاں" —— ارشد کے باپ نے کہا —"دونوں کو جانتا ہُوں۔ نظریۂ پاکستان کے بڑے سخت مخالف تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان دونوں نے اپنے مزارعوں کو اور ان کی جاگیروں میں جو گاؤں تھے وہاں کے رہنے والوں کو دھمکیاں دے کر کہا تھا کہ وہ پاکستان کا نعرہ نہ لگائیں اور مسلم لیگ کو ووٹ نہ دیں۔

انہوں نے کتنی ایک مزارعوں کو بے دخل کر بھی دیا تھا... میں انھیں جانتا ہوں۔ اب ان میں سے ایک پنجاب اسمبلی کا اور دوسرا قومی اسمبلی کا ممبر ہے۔ اب وہ دونوں اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے پاکستان صرف ان دونوں کی قربانیوں کا حاصل ہے۔ پاکستان میں انہوں نے اُدھر سے دگنی جاگیریں حکومت کی باقاعدہ منظوری سے ہتھیالی ہیں.... یہ کاما کون ہے جس نے تم سے پیسے نہیں لیے تھے؟"

"کاما تانگے والا ہے" ــــ ارشد نے جواب دیا ــ "ہم آج اسی کے تانگے پر سٹیشن سے گھر آتے تھے۔ راستے میں اُس نے ہمیں پہچان لیا۔ وہ تحریکِ پاکستان کا بڑا ہی سرگرم رکن تھا بلکہ زمین دوز ورکر تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جلال آباد میں ہم نے ایک بہت بڑا جلوس نکالا اور تھانے پر قبضہ کیا تھا۔ اُس روز ایک انگریز لیفٹیننٹ لاپتہ ہو گیا تھا۔ اُسے ایک مسلمان پولیس انسپکٹر عبدالجلیل خان نے غائب کروایا پھر قتل کروا کے اُس کی لاش غائب کر دی تھی۔ اس انگریز کے قتل میں کاما بھی شامل تھا۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ اس نے مجھے تانگے میں پہچان لیا تھا۔ وہ طاہرہ کے والد، والدہ اور نانی کو بھی جانتا تھا...

"کامے نے مجھے راستے میں کہا کہ جو پاکستان ہم نے لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر حاصل کیا تھا اسے دیمک لگ گئی ہے۔ سمگلنگ باقاعدہ پیشہ بن گیا ہے اور سمگلروں میں ہندوستان کے جاسوس بھی پاکستان میں آتے اور جاتے ہیں اور بعض پاکستانی ان کی مدد کر رہے ہیں۔ اُس نے بتایا ہے کہ دو ہندو لڑکیاں چوری چھپے پاکستان میں آتی ہیں۔ ان کے نام مسلمانوں جیسے ہیں اور ان کا میل جول پاکستان کے افسروں کے ساتھ ہے.... کاما بہت پریشان تھا اور کہتا تھا کہ وہ اس پاکستان کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے جو اُس نے اپنے ہاتھوں بنایا تھا۔"

"کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ آٹھ برسوں میں پاکستان کی حالت کیا ہو گئی ہے؟" ــــ ارشد کے باپ نے کہا ــ "ایک وزیراعظم قتل ہو چکا ہے اور اس کے بعد کتنے وزیراعظم کرسی سے اتر چکے ہیں۔ صوبوں میں من مانی ہو رہی ہے۔ وہی سیاسی لیڈر جنہوں نے پاکستان بنایا تھا ان میں سے ہر ایک پاکستان کو اپنی جاگیر سمجھ بیٹھا ہے ہر ایک نے اپنا اپنا گروہ بنا لیا ہے۔ یہ گروہ سیاسی لیڈروں کے ہیں۔ یہ جاگیرداروں کے گروہ ہیں۔ امرتسر والے چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش جیسے لوگ انہی گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح پاکستان کے بدترین مخالف پاکستان کے بہی خواہ بنے پھرتے ہیں مگر وہ صرف وزارتوں کے گاہک ہیں۔ یہی لوگ وزیر بنتے ہیں اور چند روزہ دورِ وزارت میں سرکاری خزانے سے جتنا بھی اڑا سکتے ہیں اڑا لے جاتے ہیں

"دھاندلی اور لوٹ کھسوٹ کے لیے یہ وزیراعظم، صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور دوسرے وزیر سیکرٹریوں، ڈپٹی سیکرٹریوں اور ان کے عملے کو استعمال کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں افسر شاہی کا دور دورہ شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت ملک کے بادشاہ وزیر نہیں افسر ہیں۔ وہ وزیروں کے پیٹ دوروں کے الاؤنسوں اور دیگر سرکاری ذرائع سے بھرتے رہتے اور من مانی کرتے ہیں۔ وہ وزیروں سے اپنی مرضی کے بیان دلواتے اور ان کی آنکھوں میں سبز باغوں کی دھول جھونک کر اپنے مفادات کے مطابق صنعتی، تجارتی اور دیگر پالیسیاں بناتے رہتے ہیں۔ یہ افسر شاہی، اپنے ملک کی صنعتی ترقی کے راستے میں حائل ہو گئی ہے۔ یہ لوگ درآمدات میں دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ غیر ممالک کی حکومتیں اور کمپنیاں انہیں رشوت دیتی ہیں۔ آٹھ سال گزر گئے ہیں، پاکستان کسی بھی چیز میں خود کفیل ہونے کی بجائے ترقی یافتہ ملکوں کا محتاج ہو کے رہ گیا ہے اور یہ محتاجی بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رکھا گیا تو چند برسوں بعد پاکستان کسی نہ کسی بڑی طاقت کا غلام ہو کے رہ جائے گا۔

ہم اپنے ملک کے دفاع کے لیے بھی بڑی طاقتوں کے محتاج ہوں گے اور اقوامِ عالم میں پاکستان کی ملّیت ویسی ہی رہ جائے گی جیسی گاؤں میں کمین ذات کی ہوتی ہے۔ ہم اپنے ملّی وقار کے تحفظ کی بات بھی نہیں کر سکیں گے کیونکہ ہمیں مالی امداد، اناج اور چند ایک ہتھیاروں کی بھیک دینے والے ملک کہیں گے کہ تم ان سے وقار کی بات کرتے ہو؟ کہاں ہے تمہارا وقار؟"

ارشد تحریکِ پاکستان کے اُن مجاہدین میں سے تھا جو جانیں ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اُترے تھے۔ اُن کا نعرہ تھا ــــ "پاکستان یا موت" ــــ یہ مجاہدین پاکستان کے خلاف بے ضرر سا اشارہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے مگر ساڑھے چھ سات برسوں سے ارشد ایسے حالات میں اُلجھ گیا تھا کہ گردوپیش سے کٹ کے رہ گیا تھا۔ وہ طاہرہ کو چاہتا تھا، طاہرہ اُسے چاہتی تھی مگر طاہرہ نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ عفت کے ساتھ شادی کرے۔

اُس نے عفّت کے ساتھ ہی شادی کر لی مگر عفت نے اُس کی زندگی جہنم بنا دی، پھر عفت طاہر پرویز کو جنم دے کر مر گئی۔ طاہرہ اس سے پہلے ہی اُسے بتائے بغیر گھر سے غائب ہو گئی تھی۔ گھر والے ارشد کو دوسری شادی کے لیے کہتے تھے تو وہ کہتا تھا کہ وہ اپنا بچّہ طاہرہ کے سوا کسی کے حوالے نہیں کرے گا۔ وہ دفتر سے گھر آ کر بچے کے ساتھ کھیلنے لگتا تھا۔ وہ بچے کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ بچّہ سو جاتا تو وہ تصوروں میں طاہرہ کی تلاش میں بھٹکنے لگتا تھا۔ اس کی جذباتی دنیا میں ایسا زلزلہ آیا تھا کہ زمین و آسمان تہ و بالا ہو گئے تھے۔

طاہرہ اُسے اُس وقت ملی جب بچہ چھ سال کا ہو چکا تھا۔ ارشد حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔ کامے تانگے والے نے اور پھر اُس کے باپ نے اُسے بتایا کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے تو ارشد کے سینے میں وہ نوجوان مجاہد بیدار ہو گیا جس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر پاکستان بنایا تھا۔ طاہرہ کو تو وہ دو نوجوان بیدار کر گئے تھے جنہوں نے ریلوے سٹیشن کے پُل پر اس کے ساتھ چھیڑ خانی کی تھی۔

✪

اباجان! ــــ ارشد نے کہا ــ "پاکستان بنانے والے کہاں ہیں؟ کیا وہ ان غدّاروں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے؟"

ہم نے انگریزوں سے آزادی حاصل کر لی تھی" ــ طاہرہ نے کہا ــ ہم نے ہندوؤں کو شکست دے دی تھی تو کیا ہم چھوٹے سے اس گروہ سے پاکستان کو نہیں بچا سکتے؟"

ارشد کا باپ ایسی ہنسی ہنسا جس میں طنز اور دکھ تھا۔

ہم پاکستان کو بچا سکتے ہیں" ــــ ارشد کے باپ نے کہا ــ "لیکن مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ پاکستان کی محبت کامے تانگے والے جیسے لوگوں کے دلوں میں رہ گئی ہے جو جاگیرداروں اور مفاد پرست لیڈروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پاکستان کی محبت اُن کے دلوں میں رہ گئی ہے جو اپنے مکان اور اپنی زمینیں، اپنے عزیزوں کی لاشیں اور اپنی بیٹیوں کی عصمتیں سرحد پار چھوڑ آئے ہیں۔ پاکستان کی محبت غریبوں اور ناداروں کے دلوں میں رہ گئی ہے.... ہاں، ارشد! بات بہت دُور نکل گئی ہے۔ تم کہہ رہے تھے کہ کامے تانگے والے نے تمہیں چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش کے متعلق کچھ بتایا تھا۔"

ان کے متعلق کامے نے بتایا ہے کہ ہندوستانی سمگلروں کے ساتھ ان کا گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے
ارشد نے کہا — اور یہ دونوں پاکستان کی جڑیں کاٹ رہے ہیں"۔

"کل تمہیں اس سے ملنا ہے ارشد!" — طاہرہ نے کہا۔

ارشد کی ماں اور بھابھی ان کی باتوں سے اُکتائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے جمائیاں لینی شروع کر دی تھیں۔ بھابھی نے اپنے خاوند کو کہنی ماری۔ ارشد کی ماں نے بھی اپنے بڑے بیٹے کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ عورتیں کیا چاہتی ہیں۔

"ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں — ارشد کے بڑے بھائی یوسف نے کہا — اور ہمیں پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی ملک بنانے کے لیے وہ سب کچھ کرنا چاہیئے جو ہمارے بس میں ہے لیکن ارشد اور طاہرہ بہن! میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ تم دونوں پاکستان کے نام پر مر مٹنے کے لیے تیار ہو لیکن تمہیں اتنا بھی علم نہیں کہ پاکستان میں ہو کیا رہا ہے اور مفاد پرست گروہ نے پاکستان کو تباہی کی کھائی تک پہنچا دیا ہے تمھاری لاعلمی کی وجہ صاف ظاہر ہے" — یوسف نے مسکراتے ہوئے دونوں کو دیکھا۔

"سمجھ گئی ہو طاہرہ، یوسف نے کیا کہا ہے؟" — ارشد کی ماں نے کہا۔

"اب تم دونوں حقیقت کی دنیا میں آجاؤ" — ارشد کی بھابی نے کہا۔

✪

سب کو توقع تھی کہ طاہرہ شرما جائے گی اور کہے گی کہ ہاں، میں اشارہ سمجھ گئی ہوں لیکن اُس نے سر جھکا لیا اور جب اُس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ محفل اداس ہو گئی۔ کسی نے اسے کچھ کہنے کی جرآت نہ کی۔ طاہرہ کی نگاہیں سب پر گھوم گئیں۔

"میں آپ سب سے ایک بات کہوں گی جو شاید آپ کو اچھی نہ لگے" — طاہرہ نے کہا — "لیکن مجھے یہ بات کہنی ہے۔ اس کے بغیر آپ کے دل صاف نہیں ہو سکتے۔ میں جانتی ہوں کہ میں آج آپ کو اس لیے اچھی لگ رہی ہوں کہ آپ کے بیٹے نے قسم کھالی تھی کہ وہ میرے بغیر کسی اور لڑکی کو قبول نہیں کرے گا۔ میں آپ کو مل گئی ہوں.... ارشد نے مجھے راولپنڈی بتایا تھا کہ اس نے آپ کو وہ راز ابھی تک نہیں بتایا جس نے مجھے آپ کی نظروں میں گرایا اور مجھ پر آپ نے یہ الزام لگایا تھا کہ میں ارشد اور عفت کی ازدواجی زندگی میں زہر گھو[illegible]ہی ہوں۔ آپ کے دل ابھی تک صاف نہیں ہوئے"۔

"نہ بیٹی!" — ارشد کی ماں نے کہا — "ہمارے دل صاف ہیں۔ تم ہماری بیٹی ہو"۔

"امی جان!" — طاہرہ نے آہ بھر کر کہا — "میں زندگی کے کچھ سال ایک ساس کے قید خانے میں گزار آئی ہوں۔ وہ اُن ماؤں میں سے ہے جو اپنے بیٹوں کو کھا جایا کرتی ہیں۔ میری ساس میرے سہاگ کو نہیں اپنے بیٹے کو کھا گئی ہے۔ میں نے راولپنڈی ارشد سے کہا تھا کہ ان ٹوٹی ہوئی زنجیروں سے پھر مجھے نہ باندھو لیکن عفت کی وصیت اور طاہری کے پیار نے مجھ سے ہتھیار ڈلوا لیے"۔

"اتنی لمبی باتوں کو جانے دو طاہرہ!" — ارشد نے کہا — "راز کی وہ بات کہو جس نے اس گھر کی خوشیاں تباہ کر دی تھیں"۔

سب نے طا[illegible] کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ طاہرہ کے چہرے پر ایسا سنجیدہ سا تاثر چھا گیا

تھا جس نے سب پر سناٹا سا طاری کر دیا۔

"میں اس الزام کی ملزم نہیں ہوں جو آپ نے مجھ پر عائد کیا تھا" — طاہرہ نے کہا — "میں ایک اور جرم کی مجرم ہوں۔ وہ میری ایک نیکی تھی جو گناہ بن گئی۔ آپ نے مجھے یہ سزا دی کہ مجھے روحانی اذیت میں ڈالا اور میں نے اپنے آپ کو یہ سزا دی کہ اپنے آپ کو جلا وطن کر دیا"۔

"طاہرہ!" — ارشد نے پیار سے رعب سے کہا — "تمہید ختم کرو اور وہ بات کہو جو ہم نے راولپنڈی میں فیصلہ کیا تھا کہ انھیں بتا دیں گے"۔

"وہ بات یوں ہے ابا جان!" — طاہرہ نے کہا — "میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ عفت میری بہن ہے۔ عفت کا میرے ساتھ خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ میرے خاندان کی لڑکی نہیں تھی۔ اگر آپ ذات اور برادری کے رنگ میں بات کرتے ہیں تو وہ میری ذات کی نہیں تھی اور ہماری برادری کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ہمارے معاشی اور معاشرتی معیار کی بھی لڑکی نہیں تھی۔ عفت اُن بیوہ ماؤں میں سے ایک بیوہ کی بیٹی تھی جو آپ جیسے گھروں میں جھاڑو برتن کرتی اور آپ کا بچا ہُوا کھاتی ہیں"۔

سب نے بیٹھے بیٹھے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سب کے چہروں پر ایک جیسا تاثر آ گیا جیسے وہ اس فیصلے پر متفق ہوں کہ طاہرہ کا جرم ثابت ہے اور اسے سزا ملنی چاہیئے۔

"لیکن ....." طاہرہ نے کہا — "عفت کو میں ایک پھول سمجھی تھی جو کوڑے کرکٹ کے غلیظ ڈھیر میں کھلا تھا۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ وہ کتنی خوبصورت تھی۔ اس کا جسم کتنا دلکش تھا۔ آپ کو ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کہ یہ لڑکی ایک جھگی میں پیدا ہوئی اور کھاتے پیتے گھروں کا جھوٹا کھا کر اور ان کی اُترن پہن کر جوان ہُوئی ہے"۔

"تو کیا اس لڑکی کے لیے تمھیں ہمارا ہی گھر ملا تھا؟" — ارشد کی ماں نے دکھیارے سے لہجے میں کہا — "کیا تمھیں اپنی نوکرانی کے لیے ہمارا ہی بیٹا ملا تھا؟"

"وہ میری نوکرانی نہیں تھی" — طاہرہ نے پختہ آواز میں کہا — "میں نے اسے بہن بنا لیا تھا اور جھگی سے نکال کر اسے اپنے گھر میں رکھا تھا.... اور امی جان! اگر عفت نہ ہوتی تو آج آپ کا یہ بیٹا ارشد آپ کے سامنے موجود نہ ہوتا۔ اس کی کہیں قبر بھی نہ ہوتی۔ اس کی ہڈیاں مشرقی پنجاب کی مٹی میں مل کر خاک ہو چکی ہوتیں"۔

ارشد کی ماں کا جسم یوں کانپا جیسے سردی کی یخ بستہ لہر اس سے ٹکرا کر گزر گئی ہو۔ وہ ماں تھی اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"عفت ایک جھگی میں اس لیے پیدا ہُوئی تھی کہ چوبارے میں پیدا ہونے والے ایک بیٹے کو سکھوں کی برچھیوں سے بچا کر اور اسے ایک بیٹا دے کر خُدا کے حضور لوٹ جائے" — طاہرہ نے کہا اور اُس کے آنسو بہ نکلے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اور دوپٹے سے آنسو پونچھ کر رقت سے دبی ہوئی آواز میں بولی — "بعض انسان دکھ سہنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور عفت کی طرح نوجوانی میں ہی سارے دکھ اپنے سینے میں سمیٹ کر قبر میں اُتر جاتے ہیں"۔

✪

"ارشد کے ساتھ میں نے دھوکہ نہیں کیا تھا" — طاہرہ نے کہا — "اسے معلوم تھا کہ عفت کون

ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ عفّت کی ماں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ ایسی مائیں اپنے بچوں کو بچپن میں ہی گھروں میں یا ماں بنا بیوں کے ہاں نوکر کرا دیا کرتی ہیں۔ ایسے بچے بچپن میں ہی جوان ہو جایا کرتے ہیں لیکن انسان نہیں رہتے، حیوان بن جاتے ہیں اور ان کی ضروریات حیوانوں جیسی ہو جاتی ہیں لیکن عفّت کی ماں نے اُسے سکول میں داخل کرا دیا۔ وہ بچی کو تعلیم نہیں دلانا چاہتی تھی بلکہ اُسے دس جماعتیں پاس کرانا چاہتی تھی۔ اُس نے میری نانی سے کہا تھا کہ لڑکی دس جماعتیں پاس کر لے گی تو کسی سکول میں استانی لگ جائے گی یا دو چار بچوں کو گھروں میں پڑھا کر دو وقت کی روٹی کما لے گی اور پھر اُسے میٹرک پاس سمجھ کر کوئی با عزّت گھرانہ اس کا رشتہ لے لے گا، مگر ماں آٹھویں جماعت سے آگے اسے نہ پڑھا سکی....

”عفّت کو پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ میری کلاس فیلو تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ماں اسے نویں جماعت میں داخل نہیں کرا رہی تو میں اسے اپنے گھر لے آئی اور اپنی نانی سے کہا کہ اسے بھی میرے ساتھ پڑھائیں۔ نانی نے عفّت کو میرے کپڑوں میں سے ایک جوڑا دیا اور مجھے کہا کہ کل اسے نویں کلاس میں لے جانا اور فیس بھی دے دیا کرنا.... دوسرے دن عفّت کی ماں میرے کپڑے جو عفّت کو میری نانی نے دیئے تھے، اٹھائے ہوئے آئی اور کپڑے واپس کر دیئے۔ کہنے لگی کہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اس بچی کا پیٹ پال رہی ہوں، خیرات قبول نہیں کروں گی۔ جن گھروں میں کام کرتی ہوں، وہاں سے اپنا حق سمجھ کر کپڑے لے لیا کرتی ہوں۔ آپ کو تو میں جانتی پہچانتی ہی نہیں، آپ سے کپڑے کیوں لوں؟....

”مجھ میں ایثار کا جذبہ نانی نے پیدا کیا تھا۔ اس نے عفّت کے ساتھ اس کی ماں کو بھی اپنے گھر رکھ لیا اور اسے اپنے مکانوں کے کرائے وصول کرنے اور زمین اور فصلوں کے متعلق کچھ کام دے دیئے۔ عورت خوددار اور عقلمند تھی۔ اُس نے دیانت داری سے کام کیا۔ عفّت کو اچھا کھانے اور اچھا پہننے کو ملنے لگا اور پڑھنے کی خواہش بھی پوری ہو گئی تو اس کا رنگ روپ نکھرنے لگا اور قد بُت یوں سیدھا ہو گیا جیسے اس کے سر سے کسی نے وہ بوجھ اتار دیا ہو جو وہ اب تک اٹھائے پھرتی تھی لیکن اس میں جھجک اور جھینپ قائم رہی۔ وہ دل کی بات کہنے کے انداز نہ سیکھ سکی۔ میں نے اسے بہن کا اور خوشحال گھرانے کی لڑکی کا درجہ دیئے رکھا۔“

”میں شاید ساری بات سمجھ گیا ہوں“ —— ارشد کے باپ نے کہا —— ”لیکن طاہرہ بیٹی! میں حیران ہوں کہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں تم میں اتنی عقل تھی!“

”نہیں ابّا جان!“ —— طاہرہ نے کہا —— ”اُس عمر میں میرے پاس صرف جذبات تھے۔ یہ میری نانی کے پیار اور ایثار کی پیداوار تھی۔ ہم غریب نہیں تھے۔ زمینیں تھیں، مکان کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ مزارعے تھے جو ہمارے گھر کا کام کاج بھی کرتے تھے مگر میری نانی نے کبھی بھی امیری کا اظہار زبانی یا عملاً نہیں کیا تھا۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ انسان تو ایک ہی جیسے ہوتے ہیں لیکن ایک کے بچے تعلیم کی آخری ڈگری بھی حاصل کر لیتے ہیں اور دوسرے کے بچے سکول میں داخل ہونے کی سوچ بھی نہیں سکتے۔ کچھ انسان اتنے اتنے بڑے مکانوں میں رہتے ہیں جن میں پورا شہر سما سکتا ہے اور کچھ ایک ہی جھگی میں ٹھونسے ہوتے ہیں۔ مجھے اس سوال کا جواب کہیں سے بھی نہیں ملتا تھا کہ خدا تو سب کا ایک ہے مگر قسمت سب کی ایک دوسرے سے مختلف ہے....

”اُس عمر میں میرے پاس ایسے ہی جذبات تھے۔ عقل بعد میں آئی تھی۔ مجھے کتابوں نے نہیں انسانوں نے عقل دی ہے۔ میرے ساتھ انتہائی بُرا سلوک ہوا تو میرے اندر نیکی اور انسان دوستی کا جذبہ اور زیادہ پختہ ہو گیا.... میں عقل کی بات آج کر سکتی ہوں، چودہ پندرہ برس کی عمر میں نہیں کر سکتی تھی۔“

”پھر تم نے عفت اور اس کی ماں کو اپنے گھر رکھ لیا“ —— ارشد کے بھائی نے کہا —— ”اور عفت سے بھی تم نے دس جماعتیں پاس کرا لیں۔“

”نہیں“ —— طاہرہ نے کہا —— ”پھر میں نے تحریکِ پاکستان کے پہلے شہید کی لاش دیکھی۔ وہ ارشد کے کالج کا لڑکا تھا۔ جلوس پر گولی چلی تھی۔ شہید کا گھر ہمارے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ شہید کی بہنوں اور اُس کی ماں کی آہ و زاری اور بین سنے تو میری ذات میں شہید کی ماں اور شہید کی بہن بیدار ہو گئی۔ میں نے اپنے چوبارے کی اوپر کی منزل سے آزادی کے شہید کی لاش آتی دیکھی تھی۔ اُس کے ساتھی اُسے چارپائی پر ڈال کر لائے تھے۔ لاش پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی اور یہ چادر خون سے لال تھی۔ ایسا ہی خون میری آنکھوں میں اتر آیا۔ میں نے اپنی نانی سے کہا کہ شہید کے ساتھیوں میں سے کسی کو اُوپر بلا لائے....

”نانی واپس آئیں تو ان کے ساتھ ارشد تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے بتاتے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور لڑکیاں اپنے بھائیوں کا کس طرح ساتھ دے سکتی ہیں۔ ارشد نے جب بتانا شروع کیا تو میرے سامنے کسی اور ہی دنیا کے دروازے کھلتے چلے گئے.... اس کے بعد جو ہوا، جو ارشد نے کیا، جو ارشد کے ساتھیوں نے کیا اور جو ساری قوم نے کیا وہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو عفّت کی بات سنا رہی ہوں۔ یہ غریب بیوہ کی بیٹی ہر محاذ پر ہمارے ساتھ رہی، خطروں میں بھی ہمارے ساتھ رہی اور ہجرت میں بھی ہمارے ساتھ تھی۔

”آپ لوگ خوش نصیب ہیں کہ اچھے وقت ریل گاڑی پر نکل آتے تھے۔ آپ نے کرم کیا کہ ارشد کو ہمارے پاس چھوڑ آتے تھے۔ ہم جس حال میں وہاں سے نکلے، وہ آپ کو معلوم ہے۔ ہم پیدل آتے۔ ہمارے قافلے پر سکھوں نے چار بار حملہ کیا۔ ہمارا ایک مزارعہ شہید ہو گیا۔ میری نانی شہید ہو گئیں۔ عفّت کی ماں شہید ہو گئی.... امّی جان! اب میں آپ کو جو بات سنانے لگی ہوں وہ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سننا۔“

”سُن رہی ہوں بیٹی!“ —— ارشد کی ماں نے کہا —— ”ہم نے تو وہ وقت کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ تم ہمیں پھر گزرے ہوئے وقت میں لے گئی ہو۔“

”میں، ارشد، مزارعہ اور عفت قافلے سے الگ ہو گئے تھے“ —— طاہرہ نے کہا —— ”قافلے پر سکھ بار بار حملے کرتے تھے۔ ہم نے الگ تھلگ سفر بہتر سمجھا مگر تین سکھوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ دو کے پاس کرپانیں اور ایک کے پاس لمبی کلہاڑی تھی۔ وہ دو مسلمان مردوں سے دو نوجوان لڑکیاں چھین لے جانے آتے تھے۔ ہم نے مقابلہ کیا۔ کلہاڑی والا سکھ میری طرف آیا۔ میں اس سے بچنے کے لیے اُلٹے قدم تیزی سے پیچھے ہٹی تو گر پڑی۔ میرے ہاتھ میں میرے نانا کی کرچ تھی۔ مزارعہ نور دین میرے اور سکھ کے درمیان آ گیا۔ میں نے ارشد کو دیکھا، یہ کرپان والے سکھ سے لڑ رہا تھا۔ اس کے پیچھے سے دوسرے سکھ نے اس پر کرپان کا وار کرنے کے لیے کرپان گھمائی۔ ارشد کی گردن اور سکھ کی کرپان میں صرف دو لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں گری ہوئی تھی، نور دین مجھے بچانے کے لیے لڑ رہا تھا۔ ارشد کا کرپان سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی لیکن میں نے کرچ پھینک کر دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے۔ جو کچھ ہونے

والا تھا وہ میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں اُس سکھ تک پہنچ بھی نہیں سکتی تھی ....

"امّی جان! میں نے ارشد کی لاش دیکھنے کے لیے آنکھوں سے ہاتھ ہٹاتے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ارشد کے پیچھے والے سکھ کے ہاتھ سے کرپان گر پڑی تھی۔ عفّت کی برچھی اس کے پہلو میں اُتر گئی تھی۔ یہ معجزہ تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ عفّت کہاں تھی اور جہاں کہیں بھی تھی، کس طرح پہنچی۔ وہ اڑ کر ہی پہنچ سکتی تھی۔ اُس نے اتنی طاقت سے برچھی سکھ کے پہلو میں اتاری تھی کہ اُس سے برچھی کی اَنّی سکھ کے پہلو سے باہر نہیں نکل رہی تھی اور سکھ تڑپ رہا تھا۔ ارشد کو معلوم نہ تھا کہ موت اس سے بال برابر دور رہ گئی تھی اور عفّت نے اسے بچالیا ہے۔ عفّت نے اسے لاہور آکر بھی نہ بتایا کہ یہ اُس کی پھُرتی اور جرأت کی وجہ سے زندہ ہے۔ اسے میں نے بتایا تھا۔"

ارشد کی ماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔ اُس کی آنکھوں کی بے چینی بتا رہی تھی جیسے سکھوں نے اس کے بیٹے کو گھیرے میں لے لیا ہو۔ اُس نے نظریں ارشد پر گاڑ دیں۔

"یہ کارنامہ اُس لڑکی کا تھا جس کا دھیان پیٹ سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ جھگی میں جنمی پلی لڑکی کے لیے جس کی قسمت میں گھر گھر کی نوکری، جھوٹا کھانا اور دوسروں کے پرانے کپڑے لکھے ہوتے تھے، پاکستان کوئی اہمیّت نہیں رکھتا تھا۔ ماں بیٹی کو ہجرت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہندوؤں اور سکھوں کے حوالے کر دیتیں تو ان کے لیے کوئی فرق نہ پڑتا۔ لیکن انہوں نے وہی قربانی دی جو ہم نے دی ہے۔ عفّت نے ثابت کر دیا تھا کہ سب انسان ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

ارشد کی ماں نے دوپٹہ ہاتھوں پر پھیلا کر کہا ـــــ "اللہ اُسے اپنی رحمت میں رکھے جس نے میرا بچہ مجھے زندہ دیا ہے۔ اللہ اُس کی قبر ٹھنڈی کرے۔"

"میں آپ کو یہ بتاتے ہوئے جھینپوں گی نہیں کہ میں اور ارشد ایک دوسرے کو اس طرح چاہتے تھے کہ ایک لمحے کی جدائی ناقابلِ برداشت تھی"ـــــ طاہرہ نے کہا ـــــ "ہمیں شادی کرنی تھی اگر آپ اجازت دے دیتے۔ عفّت کو ہماری محبت کا علم نہیں تھا۔ میں اور ارشد جتنے دن رلیفیوجی کیمپ میں رہے، رات کو ہم کیمپ سے نکل جاتے اور ریلوے لائن کے پاس جا بیٹھتے تھے۔ عفّت کو ہم سوتا چھوڑ جاتے تھے مگر اُسے پتہ چل گیا۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ تب اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے دل میں ارشد کی محبت کو پال رہی ہے ....

"مجھے اُس کے الفاظ ساری عمر نہیں بھُولیں گے۔ اس نے کہا تھا ـــــ 'تم نے مجھے کال کوٹھڑی سے نکال کر محل میں بسایا تھا۔ تم نے مجھے غربت کی گرد سے اٹھا کر نواری پلنگ پر سُلایا تھا۔ تم نے میری نامراد اور اداس زندگی کو مسرّت اور کامرانی دی تھی مگر تم جان نہ سکیں کہ تم نے یہاں آکر میری تمناؤں کو اور میری امنگوں کو کس بیدردی سے کچل ڈالا ہے۔ تم نے اچھا کیا ہے کہ مجھے بتا دیا ہے کہ غریب لڑکی کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے، اُسے کسی امیرزادے سے محبت کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا' ....

"اور اُس نے یہ بھی کہا تھا ـــــ 'میں کمتر ہوں طاہرہ! میں حقیر ہوں۔ تمہیں اور ارشد کو اکٹھے باہر جاتے اور ایک دوسرے کو مسکراتے دیکھتی ہوں تو اپنے وجود کو مخمل میں کمبل کا پیوند سمجھنے لگتی ہوں' ـــــ اور اُس نے کہا تھا ـــــ 'ارشد کو جب اپنے والدین مل جائیں گے تو تم دونوں چلے جانا۔ مجھے اسی کیمپ میں پڑی رہنے دینا۔ میں محرومی اور پستی میں پل کر جوان ہوتی ہوں۔ مجھ سے توقع نہ رکھو کہ میں بلند خیال ہو گئی ہوں۔ میں

[عو]رت ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے اندر رقابت اور حسد پیدا ہو جاتے۔ میں ہر [پست]ی تک آسانی سے اُتر سکتی ہوں۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ میں غلاظت میں رہ سکتی ہوں۔ میں ہر قسم کی غلاظت سے سمجھوتہ کر سکتی ہوں۔ مجھے ارشد سے بھی محبت ہے اور میرے دل میں تمہاری محبت بھی ہے۔ میں اپنا آپ تم دونوں پر قربان کر دوں گی لیکن جیتے جی ارشد کو کسی دوسری عورت کے ساتھ نہیں دیکھ سکوں گی' ....

"ایک آواز میرے اندر سے اٹھی کہ قربانی روپے پیسے کی نہیں ہوتی، کسی کی خاطر اپنی امنگیں ترک [کر]نے کو قربانی کہتے ہیں۔ طاہرہ! تم نے اس لڑکی کو تاریکی سے نکالا تھا، اب اسے تنہا نہ چھوڑ دینا، [ور]نہ وہ ایسی تاریکی میں جا پہنچے گی جہاں انسان حیوان اور درندے بن جایا کرتے ہیں .... اب آپ سب مجھے [جا]ہل کہ لیں، گناہگار کہہ لیں، میں نے ارشد سے کہا کہ میں اس لڑکی کو بہت بڑا انعام دینا چاہتی ہوں اور یہ انعام تم ہو۔ ارشد نہیں مان رہا تھا۔ میرا اپنا دل نہیں مان رہا تھا لیکن میں نے ارشد کو بھی قائل کر لیا اور اپنے آپ [کو] بھی، اور آپ کو عفّت کو اپنی بہن بتا کر اسے ارشد کے ساتھ بیاہ دیا ....

"یہ میری بھول تھی۔ بڑی خطرناک لغزش تھی۔ مجھے بہت جلدی پتہ چل گیا کہ یہ بے جوڑ شادی ہوئی ہے۔ پہلے میں یہ سمجھتی رہی کہ ارشد نے عفّت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ میں ارشد کو الگ بٹھا کر اور اسے اپنے [پیا]رے میں بلا کر اپنی محبت کا واسطہ دے دے کر کہتی رہی کہ عفّت کو قبول کر لو۔ ارشد نے مجھے بتایا [ک]ہ بہت کوشش کر چکا ہے مگر عفّت احساسِ کمتری اور پسماندگی سے نجات حاصل نہیں کر سکی۔ میں ارشد سے بار بار کہتی تھی کہ میری محبت پر قربان ہو جاؤ۔ عفّت کو اپنی سطح پر لے آؤ۔ ارشد نے کوشش جاری رکھی [مگر] یہ تنگ آگیا اور پوری طرح مایوس ہو گیا۔ اس کا ردِّعمل عفّت کو لے بیٹھا۔ وہ میری دشمن ہو گئی۔"

طاہرہ نے ارشد کی بھابی سے مخاطب ہو کے کہا ـــــ "بھابی! مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ نے میرے [کم]رے کی کھڑکی کے ساتھ کھڑے ہو کر میری اور ارشد کی باتیں سنی تھیں مگر آپ نے پوری باتیں نہ سنیں۔ [آپ] چار جملے سن کر ان کی تفسیر کچھ اور بنا لی اور سب کو یہ تاثر دیا کہ ارشد کے ساتھ میری ملاقاتیں نازیبا ہیں اور [می]ں اسے خراب کر رہی ہوں۔"

بھابی جھینپ گئی اور اُس کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ آگئی۔

"میں آپ میں سے کسی کو بھی شرمسار نہیں کرنا چاہتی"ـــــ طاہرہ نے کہا ـــــ "میں کسی کو اپنا دشمن نہیں [سمج]ھتی۔ میں آپ کو اتنی لمبی بات اس لیے نہیں سنا رہی کہ آپ مجھے بےگناہ قرار دے دیں، بلکہ میں تو اپنی ایک بھیانک لغزش کی روئیداد سنا رہی ہوں۔ میں نے اپنے گناہ کا کفّارہ یوں ادا کیا کہ اپنے آپ کو جلاوطن [کر] دیا۔ مجھے اس کا دکھ نہیں کہ میں بدنام ہو کے نکلی اور بلاوجہ بدنام ہوئی، دکھ یہ تھا کہ میری ایک نیکی اور قربانی ایکاں گئی تھی اور دکھ یہ بھی تھا کہ میں نے ارشد کو ایسی ذہنی اور روحانی اذیّت میں ڈالا جس سے نجات کا کوئی [ذر]یعہ ہی نہ تھا ....

"میں واپس آنے کے لیے نہیں گئی تھی۔ ارشد سات سال بعد میرے سامنے آگیا۔ میں نے اس کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا مگر اس نے جب یہ کہا کہ عفّت نے وصیّت کی تھی کہ میرا بچّہ طاہرہ کے سوا کسی کو نہ دینا اور یہ کہ بچہ عفّت کی بجائے مجھے اپنی ماں سمجھتا ہے تو میری قسمیں ٹوٹ گئیں۔ [می]ں نے یہ بھی سوچا کہ ارشد کی زندگی میری ایک غلطی سے اجیرن ہوئی تھی تو میں اس کے ساتھ آگئی

✪

"ہم سمجھ گئے ہیں" — ارشد کے باپ نے کہا — "تم ناتجربہ کار تھیں، تم نے اگر علمِ نفسیات پڑھا ہوتا تو ایسی غلطی نہ کرتیں۔ عفت جیسے انسان احساسِ کمتری سے نکل کر سیدھے برتری کے احساس کی گرفت میں چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھڑکیلے کپڑے پہنتے ہیں، امیروں کی طرح ایکٹنگ کرتے ہیں، دوسروں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ ان میں نمود و نمائش اور تصنّع پیدا ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کے لیے وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی ذات سے باہر نہیں آ سکتے۔"

"اگر آپ ماہرِ نفسیات بننے کی کوشش نہ کریں تو کیا بہتر نہیں ہوگا؟" — ارشد کی ماں نے اُس کے باپ سے کہا — "عفت جیسی بھی تھی، ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی ہے۔ اب آگے کی بات کرو۔ اگر یہ غلطی تھی، نیکی تھی، جو ہونا تھا ہو گیا۔"

"یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میرے پاس کتنی زیادہ رقم تھی" — طاہرہ نے کہا — "وہ سب ابا جان اور ارشد کے ہاتھوں مہاجرین پر خرچ کر دی تھی اور اپنے تمام زیورات عفت کو دے دیتے تھے۔ میں صرف یہاں سے غائب نہیں ہوتی تھی، میں نے تو اپنی ذات کو بھی ختم کر دینے کے لیے شادی کر لی۔"

"شادی کر لی؟" — ارشد کی ماں اور بھابی نے بیک زبان کہا اور دونوں کے چہرے لٹک گئے۔ دونوں نے ارشد کی طرف دیکھا۔ وہ تو خوش تھیں کہ طاہرہ آ گئی ہے اور اب ارشد کا گھر آباد ہو جائے گا۔ اب طاہرہ نے کہا کہ اُس نے شادی کر لی تو اُن کے چہروں پر ایسے تاثرات آ گئے جیسے انہیں طاہرہ کے ساتھ ذرہ بھر دلچسپی نہ ہو۔

"رات بہت گزر گئی ہے" — ارشد کی ماں نے کہا — "اٹھو اور سو جاؤ۔"

"باتوں باتوں میں اتنا وقت گزر گیا ہے" — ارشد کی بھابی نے اکتاہٹ سے کہا۔

"تمھارے میاں کیا کام کرتے ہیں؟" — ارشد کے باپ نے کہا۔

"فوت ہو چکے ہیں" — طاہرہ نے کہا۔

"بچے؟"

"کوئی نہیں" — طاہرہ نے جواب دیا — "میرے خاوند کی اپنی ماں نے انہیں دل کا مریض بنا دیا تھا۔ میں اب آزاد ہوں۔"

ارشد کی ماں اور بھابی کے لٹکے ہوئے چہروں پر پھر رونق آ گئی۔ ان کی اکتاہٹ ختم ہو گئی اور طاہرہ انہیں پھر پیاری لگنے لگی۔

"اب تم آزاد نہیں ہو طاہرہ!" — ارشد کی ماں نے کہا۔

"اپنے آپ کو تنہا اور لاوارث لڑکی نہ سمجھنا طاہرہ بیٹی!" — ارشد کے باپ نے کہا — "یہ فیصلہ تمھیں خود کرنا ہے۔"

"یہ فیصلہ ہو چکا ہے ابا جان!" — ارشد نے کہا — "اگر آپ اجازت دیں تو میں اور طاہرہ دن مقرر کر لیں۔"

"کر لو نا!" — ارشد کی ماں نے کہا۔

"لیکن شادی بالکل خاموشی سے ہو گی ابا جان!" — طاہرہ نے کہا — "اور شادی راولپنڈی میں نجمہ آپا کے گھر میں ہو گی۔ میرے ابا جان وہیں ہیں۔"

"ابا جان؟" — ارشد کے باپ نے حیران ہو کے پوچھا — "کون نئے ابا جان بنا لیے ہیں؟"

"میرے اپنے ابا جان!" — طاہرہ نے کہا — "جنہیں میں سمجھتی تھی کہ مر چکے ہیں۔"

طاہرہ نے پوری تفصیل سے سنایا کہ اُسے اُس کے ابا جان کس طرح ملے ہیں لیکن یہ نہ بتایا کہ اُس کے ابا جان اُس کی امی جان کو جان سے مار کر بھاگ گئے تھے۔ سب نے خوشی کا اظہار کیا اور محفل برخاست ہونے لگی۔

"بہت ضروری بات رہ گئی ہے" — ارشد کے باپ نے طاہرہ سے کہا — "عفت اور ارشد کا بچہ طاہر پرویز تمھیں اپنی ماں سمجھتا ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ بچہ اس راز سے واقف نہ ہو۔ بچہ تمھاری پوچھتا تھا تو ہم ہر بار نیا جھوٹ بول کر اسے بہلا لیتے تھے۔ ارشد اور اس کی امی نے بچے پر پیار کا نشہ طاری کیے رکھا ہے۔ اب اس راز کی رکھوالی تمھیں کرنی ہے۔ گھر میں ارشد کے اِس بڑے بھائی یوسف کے دو بچے طاہر پرویز کی پیدائش کے وقت بہت چھوٹے تھے۔ وہ عفت کو بھول چکے ہیں۔ تم اب راولپنڈی چلی جاؤ گی تو بچہ تمھارے ساتھ جائے گا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ آج کتنا خوش تھا؟ وہ تمھارے کمرے میں سویا ہے۔"

"میں آئی ہی اس بچے کے لیے ہوں" — طاہرہ نے کہا — "میں اسے اس راز کے آسیب سے بچائے رکھوں گی۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ لڑکے بڑے ہو کر ماں باپ کا سہارا بنتے ہیں لیکن میں طاہر پرویز کو دکھی اور مظلوم انسانیت کا سہارا بناؤں گی۔ میں اسے اُس پاکستان کا رکھوالا بناؤں گی جو ہم نے بنایا تھا۔ اس بچے کو اور میرے بطن سے پیدا ہونے والے ہر بچے کو پاکستان کے راستے میں شہید ہونے والوں کے خون کے قطرے قطرے کا انتقام لینا ہے۔"

"طاہرہ!" — ارشد کے باپ نے کہا — "تم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی ہو۔ تم یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم اس بچے کو اور اپنے ہونے والے بچوں کو ڈاکٹر بناؤ گی، بیرسٹر بناؤ گی، انجینئر بناؤ گی۔ تم حقیقت سے دور ہٹتی جا رہی ہو۔"

"ابا جان!" — طاہرہ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا — "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا اپنے بچوں کو پاکستان کا رکھوالا بنانے والے حقیقت سے دور ہٹ گئے ہیں؟"

"نہیں بیٹی!" — ارشد کے باپ نے کہا — "میں بچوں کے روشن مستقبل کی بات کر رہا ہوں۔"

"اور میں پاکستان کے روشن مستقبل کی بات کر رہی ہوں .... اگر پاکستان کا ہی مستقبل تاریک ہو گیا تو پاکستان کے بچوں کا مستقبل کیا رہ جائے گا؟" — طاہرہ نے کہا — "انگریزوں کی غلامی میں ہمارا مستقبل کیا تھا؟ .... غلاموں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا ابا جان!"

ارشد کا باپ ہنس کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا — "تمھاری انہی باتوں کی وجہ سے تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

✪

دوسرے دن اُس وقت جو اُس نے کامے تانگے والے کو بتایا تھا، ارشد سڑک کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ وہ ہر تانگے کو غور سے دیکھتا تھا۔ پیچھے سے ایک تانگہ آیا جو اُس کے قریب سے گزرنے لگا تو تانگے والے نے اُسے دیکھا۔ تانگہ رک گیا۔ وہ کامے کا تانگہ تھا۔

"ارشد باؤ!" — کامے نے کہا — "میں تمھاری کوٹھی کی طرف سے آ رہا ہوں۔ میرا خیال تھا تم کوٹھی کے باہر شاید مل جاؤ .... آؤ، بیٹھو۔"

ارشد تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگہ چلا تو کامے کی زبان بھی چل پڑی۔

"ارشد باؤ!..... میں تانگے والا ہوں"— کامے نے کہا— "تانگے والے چرسی ہوتے ہیں نا! بھنگی، افیمی، بدمعاش، سو برائیوں کی ایک بُرائی، پر یاد کرلو ارشد باؤ! پاکستان بنانے والوں میں تانگے والے چرسی، بھنگی اور بدمعاش سب سے اگلے مورچے میں تھے۔ تم جیسے بچوں نے پولیس اور فوج کا مقابلہ جان کی بازی لگا کر کیا ہے مگر انگریز لفٹین کو تین ملنگوں اور ایک تانگے والے نے اغوا اور قتل کیا تھا اور چرس کا دم لگا کر قتل کیا تھا اور جب ہم نے اس کی لاش گڑھے میں پھینک کر گڑھا بھر دیا تھا تو اللہ گواہ ہے کہ ہم نے نعرہ لگایا تھا— "پاکستان زندہ باد"۔

کامے نے ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا— "تم بہت پڑھے لکھے ہو ارشد باؤ! مجھ سے زیادہ سمجھتے ہو لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم نے پاکستان اُسی رات لے لیا تھا جس رات ہم نے اس انگریز لفٹین کو قتل کیا تھا۔ یوں سمجھ لو کہ ہم نے ایک انگریز لفٹین کی نہیں، انگریزی راج کی لاش گڑھے میں دبا دی تھی..... اب کہو کہ یہ غلط ہے تو میں تم کو بتاتا ہوں کہ یہ غلط نہیں ہے۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب ہمیں کہا جاتا تھا کہ کسی انگریز کی طرف انگلی نہ کرنا، یہ جرم ہے۔ یہ ایک عقیدہ بن گیا تھا کہ انگریز کی طرف انگلی اٹھاؤ تو انگریز گرفتار کر لیتا ہے لیکن ہم نے اور تم نے انگریز کو بتا دیا کہ اب اُس نے کسی مسلمان کی طرف انگلی اُٹھائی تو اُس انگریز کا پورا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ انگریز ہر گناہ بخش سکتا تھا مگر یہ برداشت نہیں کرتا تھا کہ اُس کا ہندوستانی غلام اُس کے سامنے آنکھ اُٹھائے لیکن ہم نے اور تم جیسے شیر جوانوں نے اُس کے خلاف ہتھیار اٹھائے.....

"ارشد باؤ! جلال آباد جیسے چھوٹے سے قصبے میں ایک انگریز لفٹین کا ایسا غائب ہو جانا کہ بدبخت کا کوئی سراغ ہی نہ ملے، انگریزی راج کے لیے معمولی سی بات نہیں تھی۔ بندر کی اولاد سمجھ گئی کہ اب مسلمان کو لاٹھیوں، گولیوں اور آنسو گیس سے دبائے رکھنا ممکن نہیں..... مجھے سی۔آئی۔ڈی سے پتہ چلا تھا کہ جلال آباد میں ہم نے اُس روز جو مظاہرہ کیا تھا اس کی خفیہ رپورٹ گورنر کو بھیجی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں لکھا گیا تھا کہ سارے ہندوستان میں صرف جلال آباد ہی نہیں جہاں مسلمانوں نے یہ مظاہرہ کیا ہے۔ سارے ہندوستان کا نہیں تو اکیلے صوبہ پنجاب کا ہی حساب کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کو دبانے کے لیے سارے ہندوستان کی فوج استعمال کرنی پڑے گی جو کسی صورت ممکن نہیں اور یہ دانشمندی بھی نہیں"۔

ارشد نے ہنس کر پوچھا— "تمہیں یہ رپورٹ کس نے دکھائی تھی کامے؟"

"انسپکٹر عبدالجلیل خان نے!— کامے نے کہا— "یہ نام تمہیں یاد آیا؟ اسی نے انگریز لفٹین کو اغوا اور قتل کرایا تھا۔ وہ امرتسر پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہوتا تھا۔ یہ باتیں اُس نے مجھے پاکستان میں آکر بتائی تھیں"۔

"وہ پاکستان میں ہے؟"— ارشد نے اشتیاق سے پوچھا— "کامے! میں تو اُسے ملوں گا۔ اب تو وہ ڈی۔ ایس۔ پی ہوگا"۔

کاما طنزیہ ہنسی ہنس کر بولا— "اب تو وہ انسپکٹر بھی نہیں رہا۔ تم کہتے ہو وہ ڈی۔ ایس۔ پی ہوگا۔ چار سال گزرے، اُسے معطل کیا گیا، پھر اُسے وقت سے پہلے جبری پنشن پر گھر بھیج دیا گیا"۔

"کیوں؟ جرم کیا تھا؟"

"یہی کہ اُس نے پاکستان کے لیے قربانیاں دی تھیں"— کامے نے آہ بھر کر کہا— "اور

[پاکست]ان میں آکر وہ اُس پاکستان کی باتیں کرتا تھا جس کا مطلب تھا لا الٰہ الا اللہ۔ اُس نے طالب علموں کے [ا]ے جلوس پر آنسو گیس پھینکنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ پاکستان کے بچے ہیں اور میں انگریز [نہی]ں ہوں۔ پھر اُس نے ان دو جاگیرداروں سے ٹکر لے لی تھی جن کا میں نے تمہارے ساتھ ذکر کیا تھا"۔

"چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش؟"

"ہاں"— کامے نے کہا— "اُنہوں نے اسے سروس سے نکلوایا ہے مگر وہ چین سے بیٹھ نہیں گیا۔ [ا]س نے اپنا ایمان بنا رکھا ہے کہ پاکستان کی جڑیں کاٹنے والوں کی گردنیں کاٹ دو..... میں نے دو ہندو [و]الیوں کا ذکر کیا تھا نا؟ ان کے متعلق ساری بات تمہیں وہی بتلائے گا"۔

"اگر کبھی ملاقات ہوگئی تو"۔

"میں تمہیں اُسی کے پاس لے جا رہا ہوں ارشد باؤ!"— کامے نے کہا— "معلوم نہیں مجھے تم پر کیوں [ا]عتبار آگیا ہے۔ اگر ان آٹھ برسوں میں تم پاکستان کے شہیدوں کو بھول نہیں گئے تو تم محسوس کرو گے [ک]ہ پاکستان کو اب پھر تمہاری ضرورت ہے۔ شاید تمہارے خون کی بھی ضرورت آپڑے۔ ساری بات تمہیں [عب]دالجلیل خان بتائے گا"۔

"میں ہر طرح تیار ہوں کامے!"

"اور کاما تانگے والا تو ہر وقت تیار رہتا ہے ارشد باؤ!"

کامے نے تانگہ سڑک پر روکا اور گھوڑے کی لگام کھمبے کے ساتھ باندھ دی۔ اس نے ارشد کو ساتھ لیا اور ایک گلی میں چلا گیا۔ کشادہ اور پکی گلیوں کا یہ علاقہ آٹھ سال پہلے ہندوؤں اور سکھوں کا علاقہ ہُوا کرتا تھا۔ اب یہاں مشرقی پنجاب کے مہاجرین آباد تھے۔

ایک دروازے پر رُک کر کامے نے دستک دی۔ ایک قدآور آدمی باہر آیا۔ غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی لیکن لگتا جوان تھا۔ اس کے چہرے پر رونق اور شگفتگی تھی اور آنکھوں میں ایسی چمک جو دل میں اُترتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ روح کا پرتو تھا جو اس شخص کے چہرے کا نور بن گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر تبسّم تھا۔ وہ مطمئن اور مسرور انسان لگتا تھا۔ اس کا چہرہ اور تبسم بتا رہا تھا کہ اس شخص کو کوئی غم نہیں، کوئی رنج نہیں۔

کامے نے ارشد سے کہا تھا کہ وہ اُسے انسپکٹر عبدالجلیل خان کے پاس لے جا رہا ہے۔ یہ شخص عبدالجلیل نہیں ہوسکتا تھا۔ اُسے تو سروس سے قبل از وقت ریٹائر کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ بےانصافی ہُوئی تھی۔ وہ مطمئن اور مسرور نہیں ہوسکتا تھا۔

"لو خان صاحب! یہ ہے ارشد باؤ"۔۔۔ کامے نے ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تانگے والوں کے لہجے میں کہا ۔۔۔"اصیل نسل۔ اصل شیر کا بچہ۔ ٹھوک بجا کر دیکھ لو۔ کھوٹا نکلے تو آپ کی جُوتی میرا سر"۔۔۔ اُس نے ارشد سے مخاطب ہوکر کہا ۔۔۔"اور ارشد باؤ! یہ ہیں انسپکٹر عبدالجلیل خان۔ ان کے متعلق تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں اور خان صاحب! ارشد کے متعلق آپ کو بہت کچھ بتا چکا ہوں"۔

عبدالجلیل خان کا تبسّم بڑی جانفزا مسکراہٹ بن گیا۔ اس نے ارشد کو گلے لگا لیا، پھر اسے اور کامے کو اندر لے گیا۔

"ارشد بھائی!"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا ۔۔۔"تھانیداروں کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جاتا۔ تم بھی شاید مجھے شک کی نگاہ سے دیکھو لیکن مجھے امید ہے کہ تمہارے تمام شکوک رفع ہو جائیں گے"۔

"کامے نے مجھے آپ کا جو کارنامہ سنایا ہے، وہ اگر سچ ہے تو مجھے آپ پر اعتماد ہے"۔۔۔ ارشد نے کہا ۔۔۔"لیکن خان صاحب! یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان انسانوں کی فطرت ہی بدل گئی ہے جنہوں نے پاکستان بنایا تھا"۔

"ہم ان لوگوں کی فطرت کو اصل روپ میں لے آئیں گے"۔۔۔ عبدالجلیل خان نے کہا ۔۔۔"تمہیں اِسی مقصد کے لیے بلایا ہے"۔

عبدالجلیل نے ارشد سے اُس کے خاندان کے متعلق، جلال آباد میں اُس کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق، وہاں کی جائیداد، یہاں اُس کے بدلے جو کچھ الاٹ کرایا، موجودہ پوزیشن اور پاکستان کے متعلق اُس کے نظریات کے بارے میں یوں پوچھنا شروع کر دیا جیسے وہ کسی مشتبہ کو شاملِ تفتیش کر کے پوچھ گچھ کر رہا ہو۔

وہ ارشد کو بڑی ہی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تم مجھ سے اُکتا چکے ہوگے!"۔۔۔ عبدالجلیل خان نے کہا ۔۔۔"ایک آخری سوال ہے۔۔۔۔ کیا تم پاکستان کے موجودہ حالات سے مطمئن ہو؟"

"نہیں"۔۔۔ ارشد نے جواب دیا۔

"تم کیا محسوس کر رہے ہو"۔۔۔ عبدالجلیل نے پوچھا ۔۔۔"ذرا ٹھہرو۔۔۔۔ میں جو محسوس کر رہا ہوں وہ تمہیں بتاتا ہُوں۔ تم اس کے مطابق سوچ کر جواب دینا۔۔۔۔ پاکستان کی عمر صرف آٹھ برس ہُوتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں آٹھ برس آٹھ لمحوں کے برابر ہوتے ہیں۔ اتنے کم عرصے میں وہ پاکستان ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے جس کے لیے برِصغیر کے مسلمانوں نے پوری ایک صدی جان اور مال کے نذرانے دیئے تھے"۔

"خان صاحب!"۔۔۔ ارشد نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ۔۔۔"میں یہ محسوس کر رہا ہُوں کہ ۱۹۴۷ء میں ہم نے اپنے آپ کو انگریز سے آزاد کرایا اور یہ خطہ حاصل کیا تھا۔ ہماری جدوجہد ابھی ختم نہیں ہُوئی۔ اب ہمیں پاکستان کو آزاد کرانا ہے"۔

"کس سے؟"

"مذہب اور سیاست کے ان لیڈروں سے جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک نظریۂ پاکستان کے مخالف تھے۔ ان میں سے بعض انگریز کے پروردہ تھے اور بعض ہندو کے دوست اور بہی خواہ۔ اب وہ پاکستان کی باگ ڈور پر قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم انگریز سے آزاد نہیں ہُوئے۔ ہم انگریز اور ہندو کے حواریوں اور حاشیہ برداروں کے غلام ہو گئے ہیں"۔

"ہمیں پاکستان کے ان آقاؤں کے خلاف کام کرنا ہے"۔۔۔ عبدالجلیل خان نے کہا ۔۔۔"اور یہ کام زمین کے نیچے ہوگا۔۔۔۔ میں کہہ رہا تھا کہ اتنے قلیل عرصے میں پاکستان کا یہ حال ہو گیا ہے تو تھوڑا سا عرصہ اور گزرا تو۔۔۔۔ تو۔۔۔۔ ارشد بھائی! میں تو اس انجام کے تصوّر ہی سے کانپ اٹھتا ہُوں۔۔۔۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں تم پر کس طرح بھروسہ کر سکتا ہوں کہ تم ہمارا ساتھ دو گے اور دھوکہ نہیں دو گے؟ تم سرکاری ملازم ہو"۔

"خان صاحب!"۔۔۔ ارشد نے کہا ۔۔۔"یہی سوال میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ پر کس طرح بھروسہ کر سکتا ہوں؟ آپ پولیس انسپکٹر تھے۔ آپ کو ڈی۔ ایس۔ پی بننا تھا مگر ایک وزیر آپ سے ناراض ہو گیا اور آپ کو کسی جرم کے بغیر جبری پنشن پر گھر بھیج دیا گیا۔ میں آپ پر شک کر سکتا ہوں کہ آپ حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں کی مخبری کر رہے ہیں جو موجودہ حکومت کے خلاف ہیں"۔

"ایسا شک نہ کرو ارشد باؤ!"۔۔۔ کامے نے کہا ۔۔۔"خان صاحب کو تم نہیں جانتے"۔

"مجھے خوشی ہُوئی ہے ارشد!"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا ۔۔۔"اس ملک میں ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھو۔ دل کی بات کسی کو نہ بتاؤ۔ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں جس سے تمہیں یقین دلاؤں کہ میں سرکار کا مخبر نہیں۔ اگر مخبری ہی کرنی ہوتی تو میں وزیروں کی حکم عدولی کیوں کرتا۔ مجھے معلوم تھا کہ حکم عدولی کی سزا کیا ہے لیکن میں غلط حکم نہیں مان سکتا تھا۔۔۔۔ مجھے تمہارے متعلق کسی نے نہیں بتایا تھا کہ تم پاکستان کے موجودہ حالات سے نالاں ہو۔ مجھے کامے نے صرف یہ بتایا تھا کہ تم تحریکِ پاکستان کے مجاہد نہیں جانباز ہو اور تم مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صفِ اوّل کے کارکن تھے"۔

"اگر آپ مخبری ہی کر رہے ہیں تو آپ نے مجھ پر ہاتھ ڈال کر غلطی نہیں کی" ـــ ارشد نے کہا ـــ "پاکستان کے جو معدودے چند حکمران آتے ہیں، میں ان کا جانی دشمن ہوں۔ انہوں نے پاکستان کو مثالی مملکت بنانے کی بجائے سارا زور، سرکاری ذرائع قوم کے خزانے کا پیسہ اور پولیس کا محکمہ اپنے مخالفین کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا اور ملک کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا۔ میرے وہ تمام ساتھی جو آٹھ سال پہلے نوجوان تھے، سٹوڈنٹ تھے، پاکستان کو اقتدار کا اکھاڑہ بنانے والوں کے دشمن ہیں۔ وہ دانت پیس رہے ہیں۔ کر کچھ نہیں سکتے۔"

ارشد کی آواز میں وہی جلال آباد والا جلال اور تحریکِ پاکستان والا جوش آ تا جا رہا تھا۔ عبدالجلیل خان اُسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے مسحور ہو گیا ہو۔

"خان صاحب!" ـــ ارشد کہہ رہا تھا ـــ "آج کا پاکستان جو انگریزوں کے پیچھے چھوڑے ہوئے جاگیرداروں اور وڈیروں کی ذاتی جاگیر بن گیا ہے، ۴۷-۱۹۴۶ء کے نوجوانوں، طلبا اور طالبات کو کس طرح مطمئن کر سکتا ہے۔ آپ بھولے تو نہیں ہوں گے کہ اُس وقت کے طالب علموں نے کالجوں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ دن رات تحریک میں مصروف رہتے تھے۔ ان میں سے کتنے ایک گرفتار ہوتے۔ پولیس کے تشدّد اور ایذا رسانی نے انھیں جسمانی اور بعض کو دماغی لحاظ سے معذور کر دیا تھا۔ کچھ ایسے لاپتہ ہوتے کہ اُن کا سراغ تک نہ ملا۔ کتنے ایک پولیس کی لاٹھیوں اور گولیوں سے شہید ہو گئے تھے....

"باقی پاکستان کو ہجرت کر آئے۔ انہوں نے تعلیم اور ڈگریاں تحریکِ پاکستان پر قربان کر دی تھیں۔ خود میں بی۔ اے نہ کر سکا۔ وہ میرا آخری سال تھا۔ میرے تمام ہم جماعت میرے ساتھ تھے۔ کسی نے بھی پروا نہ کی کہ یہ بی۔ اے کا آخری سال ہے۔ ہم میں اس احساس نے قہر بھر دیا تھا کہ یہ تحریک کا آخری معرکہ ہے۔ ہم ہار گئے تو ہمیشہ کے لیے ہار جائیں گے اور برِصغیر کا وارث ہندو ہو جائے گا.... خان صاحب! ہمارے ساتھ ایف۔ اے کے دونوں سالوں کے طلبا بھی تھے۔ کیا آپ جانتے ہیں خان صاحب! پاکستان میں ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ انہیں اچھی ملازمتیں نہ مل سکیں کیونکہ ان کے پاس ڈگریاں نہیں تھیں۔ اُن کی کسی نے نہ سنی کہ اُنہوں نے اپنی ڈگریاں پاکستان پر قربان کر دی تھیں۔ میں نے یہاں لاہور میں اپنے دو کلاس فیلو دیکھے ہیں۔ وہ آڑھتیوں کے منشی ہیں۔ وہ سرحد پار بی۔ اے کے آخری سال میں تھے مگر تحریکِ آزادی میں شامل ہو گئے....

"اور خان صاحب! میں اپنے محکمے میں آپ کو ایک افسر دکھا سکتا ہوں۔ وہ جلال آباد میں میرے کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ بی۔ اے نہیں کر سکا تھا۔ وہ سٹوڈنٹ فیڈریشن میں بھی نہیں تھا۔ تحریک کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ایک یونینسٹ زمیندار کا بیٹا ہے۔ یہاں آتے ہی وہ گزیٹڈ آفیسر ہو گیا اور اُس نے اپنے نام کے ساتھ ایم۔ اے لکھنا شروع کر دیا۔"

"تم ایک زمیندار کے بیٹے کو جانتے ہو ارشد!" ـــ عبدالجلیل نے کہا ـــ "میں تمہیں ایسے کتنے بیٹے دکھا سکتا ہوں جنہوں نے بڑی مشکل سے دس جماعتیں پاس کی تھیں لیکن ان کے پاس بی۔ اے کی ڈگریاں ہیں اور سرکاری محکموں میں اچھے عہدوں پر ملازم ہیں۔ انہوں نے ڈگریاں خریدی تھیں۔ انہیں کوئی قانون پکڑ نہیں سکتا۔ قانون اُن کا ہے جن کے یہ بیٹے ہیں۔"

"میں کہہ رہا تھا کہ آپ اگر مخبری کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے صحیح آدمی کو پکڑا ہے" ـــ ارشد نے کہا ـــ "میں اِن لیڈروں کا جانی دشمن ہوں۔ مجھے وہ پاکستان چاہیئے جو میں نے بنایا تھا، جو میرے دوستوں نے بنایا تھا۔"

"ارشد باؤ" ـــ کامے نے کہا ـــ "خان صاحب رہتک کے رہنے والے ہیں۔ یہ تو اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ امرتسر میں تھے۔ وہیں سے لاہور آ گئے۔ ان کے والد صاحب، والدہ، دو بھائی، ایک بہن، ایک بھائی اور بہن کے بچے رہتک ہی میں تھے۔ سب شہید ہو گئے تھے۔"

ارشد نے عبدالجلیل کی طرف دیکھا۔ عبدالجلیل کے چہرے پر وہی شگفتگی اور ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی جو پہلے تھی۔ اُسے اپنے پورے کے پورے خاندان کے ختم ہو جانے کا جیسے کوئی غم نہیں تھا۔

"مجھ پر اعتبار کرو ارشد!" ـــ عبدالجلیل نے کہا۔

درد مشترک تھا۔ جذبہ ایک تھا۔ دلوں کے زخم ایک جیسے تھے۔ خون ایک تھا۔ وہ بیٹیاں سب کی تھیں جو سرحد پار اغوا اور بے آبرو ہوئی تھیں۔ وہ بچے سب کے تھے جو کرپانوں اور برچھیوں سے کٹ گئے تھے۔ وہ لاشیں ایک ہی قوم کی تھیں جو مشرقی پنجاب کے کھیتوں میں بکھر گئی تھیں۔ عبدالجلیل خان اور ارشد اسی قوم کے فرد تھے۔ دل نے دل کو پہچان لیا۔

✪

ایک عورت چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں آئی۔

"السلام علیکم" ـــ اُس نے کہا اور ٹرے تپائی پر رکھ کر اُس نے نظریں ارشد کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"ارشد کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو؟" ـــ عبدالجلیل نے اس سے پوچھا اور ارشد سے کہا ـــ "ارشد بھائی! یہ میری بیوی ہے۔"

"پہچان لیا ہے" ـــ عورت نے کہا ـــ "میں نام بھول گئی تھی۔ ارشد صاحب کو میں یاد نہیں رہی۔ میری اُس وقت نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ یہ مجھے امرتسر لے آئے تھے۔"

"یہ تحریک میں اُسی طرح سرگرم رہی ہے جس طرح ارشد، تم سرگرم تھے" ـــ عبدالجلیل نے کہا ـــ "اور جس روز تم نے جلال آباد میں آخری جلوس نکالا اور تھانے پر قبضہ کیا تھا، اُس روز یہ جلال آباد میں تھی اور عورتوں کے جلوس میں شامل تھی۔ بیوی جلوس میں تھی اور خاوند جلوس کو لاٹھی چارج سے منتشر کرنے کے لیے ڈیوٹی پر تھا۔"

"میں نے آپ کو مسلم لیگ نیشنل گارڈ والی حویلی میں دیکھا تھا" ـــ عبدالجلیل کی بیوی نے کہا ـــ "آپ تین چار لڑکیوں کو ساتھ لائے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جلال آباد کے اس مظاہرے میں جان ڈالنے کے لیے وہاں کی مسلم لیگ نے امرتسر مسلم لیگ سے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ عورتیں جلال آباد بھیجی جائیں۔ ہم سینتالیس لڑکیاں امرتسر سے جلال آباد گئی تھیں۔ مجھے وہ لڑکی یاد ہے جس نے تھانے کے سامنے نیشنل گارڈ کے گھوڑے پر کھڑے ہو کر بڑی جوشیلی تقریر کی تھی۔"

"طاہرہ" ـــ ارشد نے کہا ـــ "اُس کا نام طاہرہ ہے۔"

کچھ پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ اُنہیں بہت یاد کیا گیا جو اُن کی صفوں کے مجاہدین تھے۔ جس کا بھی نام آتا اُس کی باتیں یاد کی جاتیں اور ہر ایک کی باتوں کے بعد یہ الفاظ ضرور کہے جاتے ـــ "معلوم نہیں زندہ آ گیا تھا یا نہیں .... معلوم نہیں کہاں ہو گا" ـــ وہ موت کے سائے میں سوئے منزل چلے تھے اور منزل تک کوئی پہنچا

تھا۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا!

ارشد نے عبدالجلیل سے پوچھا — "کیا آپ نے مجھے باتوں کے لیے بلایا تھا یا کچھ کرنا ہے؟"

"کچھ کرنا ہے" — عبدالجلیل نے کہا — "لیکن کامے نے بتایا ہے کہ تم شادی شدہ ہو اور تمہارے بچے بھی ہیں۔"

"میرا ایک ہی بچہ ہے" — ارشد نے کہا — "لیکن شادی دو چار سال بعد ہوگی۔"

سب نے اُسے حیران ہو کے دیکھا۔ ارشد مسکرانے لگا۔ ذرا سا خاموش رہ کر اُس نے اپنی شادی کی کہانی سنا دی اور انہیں بتایا کہ اب وہ اُس طاہرہ کے ساتھ شادی کر رہا ہے جس نے تھانے کے سامنے جوشیلی اور جذباتی تقریر کر کے ہجوم کو مشتعل کر دیا تھا۔

"ہمیں اس لڑکی کی گرفتاری کا حکم ملا تھا" — عبدالجلیل نے کہا — "تم لوگوں نے بڑی عقل مندی کی تھی کہ اسے فوراً غائب کر دیا تھا۔ جلال آباد کے تھانہ انچارج کو حکم ملا تھا کہ اس لڑکی کو گرفتار کر کے بغیر مقدمے کے جیل بھجوا دیا جائے۔ اسے گرفتار کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ وہاں کا تھانیدار سکھ تھا۔ اُس کے ساتھ میری گہری دوستی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ مجھ پر احسان کرے اور اس لڑکی کو گرفتار نہ کرے۔ اُس نے دوستی کا حق ادا کیا۔ اس طرح طاہرہ گرفتاری سے بچ گئی۔"

"طاہرہ میری روحانی قوت ہے" — ارشد نے کہا — "وہ نہیں تھی تو میں جیسے مر ہی گیا تھا۔ پہلی شادی سے میرا جو بچہ ہے اسے میں اور طاہرہ پاکستان کے لیے جوان کریں گے۔ میں اولیت اُس کی تعلیم کو نہیں اُس کے فرض کو دوں گا..... آپ مجھے یہ بتائیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور یہ بھی کہ ہم کتنے ہیں اور کون کون ہیں۔"

✪

عبدالجلیل خان نے آہ لی۔ ارشد کو سر سے پاؤں تک پھر پاؤں سے سر تک دیکھا اور بولا — "ہمارے ساتھ کون کون ہے اور ہماری تعداد کیا ہے؟ یہ سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے یہ سن لو کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔ ہمیں حکومت کا تختہ نہیں الٹنا۔ اگر ایک بار تختہ اُلٹنے کا رواج شروع ہو گیا تو اس ملک میں تختے ہی اُلٹتے رہیں گے۔ پھر جس کسی کے ہاتھ لاٹھی آجائے گی بھینس اُسی کی ہوگی۔ فوج کی مدد کے بغیر تختہ نہیں اُلٹا جا سکتا۔ میں نجومی اور جوتشی نہیں ہوں ارشد! میں یہ جانتا ہوں کہ ایک بار فوج سیاست میں آگئی تو فوج پھر چھاؤنیوں میں کبھی نہیں جائے گی۔ یاد رکھو ارشد! کسی بھی ملک کی سلامتی ایک مضبوط، پُرعزم اور قومی جذبے سے سرشار فوج کے بغیر ممکن نہیں لیکن پاکستان کو تو بہت ہی زیادہ مضبوط اور ایماندار فوج کی ضرورت ہے کیونکہ پاکستان کا سامنا ایک ایسے دشمن کیساتھ ہے جو اس کے وجود کا ہی منکر ہے اور جو پاکستان کو اپنے ملک کا حصہ سمجھتا ہے۔ وہ برِصغیر سے اسلام کا نام ونشان مٹانا چاہتا ہے.....

"۱۹۴۷ء میں اُس نے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ وہ ابھی تک مسلم کُشی کی مہم جاری رکھے ہُوئے ہے۔ وہاں مسجدیں ویران ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ پاکستان کی فوج جتنی طاقتور ہوگی، ہندوؤں پر اُس کی اتنی ہی دہشت طاری رہے گی اور ہندوستان کے مسلمان اور وہاں کی مسجدیں محفوظ رہیں گی۔ اگر ہم نے فوج کو سیاست میں گھسیٹ لیا اور اگر سیاسی لیڈروں نے اسے اقتدار کے حصول کا آلۂ کار بنا دیا تو فوج ملک کے دفاع کے قابل نہیں رہے گی۔ دشمن ہمارے خلاف تیاری کرتا رہے گا اور اُس کے لیے ہماری سرحدیں کھلا دروازہ بنی رہیں گی۔"

"پھر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" — ارشد نے کہا — "میں اپنے دشمن کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔"

"فوج کا مقابلہ فوج کیا کرتی ہے" — عبدالجلیل نے کہا — "ہمارا مقابلہ اسی دشمن کی ایک اور فوج سے ہوگا۔ یہ ہے اس کے جاسوسوں اور تخریب کاروں کی فوج۔ دشمن کی اس فوج میں وہ پاکستانی بھی شامل ہیں جو اسے پاکستان میں پناہ اور مدد دیتے ہیں۔ ان میں وہ سیاسی اور مذہبی لیڈر شامل ہیں جو نظریۂ پاکستان کے خلاف تھے۔ وہ اب پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے دشمن کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ وہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کہا کرتے تھے کہ پاکستان ایک مذاق ہے۔ اگر مسلمانوں نے پاکستان حاصل کر بھی لیا تو یہ چند دنوں کا کھیل ثابت ہوگا۔ وہ پاکستان کی جڑیں کاٹ کر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اُنہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔"

"کیا آپ ہندوستان کے کسی جاسوس اور تخریب کار کو جانتے ہیں؟" — ارشد نے پوچھا۔

"میں تمہیں یہی بتانے لگا تھا" — عبدالجلیل نے جواب دیا — "دو ہندو لڑکیاں ہیں۔ بہت خوبصورت بہت شوخ۔ پتھر کو پگھلا سکتی ہیں۔ تم جیسے جوانوں کو انگلیوں پر نچا سکتی ہیں۔"

"مجھے یہ بتائیں کہ اس وقت کون اُن کی انگلیوں پر ناچ رہا ہے؟" — ارشد نے پوچھا۔

"امرتسر کے دو جاگیردار" — عبدالجلیل نے جواب دیا — "ایک کا نام مہر اللہ بخش ہے، اور....."

"اور دوسرے کا نام چوہدری اکرم ہے" — ارشد نے اُس کی بات پوری کر دی۔

"تم اُسے جانتے ہو؟"

"کامے نے یہ دونوں نام بتاتے تھے" — ارشد نے کہا — "میرے ابّا جان انہیں جانتے ہیں۔ ان میں ایک مرکزی اسمبلی کا ممبر ہے اور....."

"اور دوسرا صوبائی اسمبلی کا" — عبدالجلیل نے کہا — "اسمبلیوں کے ممبروں کی حیثیت ایسی نہیں ہوتی کہ ملک کے نازک اور اہم معاملات میں دخل اندازی کر سکیں یا سرکاری پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکیں لیکن یہ دونوں آدمی ہر ڈھنگ کھیلنا جانتے ہیں اور اثر و رسوخ والے ہیں۔ یہ دونوں ہندو لڑکیاں اسلامی ناموں سے یہاں دو کوٹھیوں میں رہتی ہیں۔ ان کے خاوند بھی ہیں۔"

"وہ ہندو ہوں گے۔"

"نہیں" — عبدالجلیل نے جواب دیا — "وہ مسلمان ہیں۔ دونوں ان جاگیرداروں کے آدمی ہیں۔ ان کا تعلق سمگلروں کے ساتھ ہے۔ سمگلروں کے ذریعے یہاں سے راز اور اہم خبریں ہندوستان کو جاتی ہیں۔ یہ دونوں کوٹھیاں ہندوستان کے اڈے ہیں۔ وہاں پاکستان کے بڑے بڑے افسر جاتے ہیں۔ وہاں ہندوستان کا پیسہ تقسیم ہوتا ہے۔"

"وہ کون سے راز ہیں جو اسمبلیوں کے ان دو ممبروں کے پاس ہوں گے؟" — ارشد نے پوچھا۔

"میں انگریزوں کی پولیس میں رہا ہوں" — عبدالجلیل نے جواب دیا — "ہمارا واسطہ جرمنی اور جاپان کے جاسوسوں اور تخریب کاروں سے پڑتا رہا ہے۔ جاسوسی میں ان دونوں ملکوں کا مقابلہ کوئی ملک نہیں کر سکتا۔ میں نے جاسوسوں کی سراغرسانی کی ٹریننگ لی تھی۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ جاسوس فوجی راز کہیں اور سے لیتے ہیں اور چھپنے اور اپنے ملک کو جانے کی مدد کہیں اور سے لیتے ہیں۔ تم نے ٹھیک کہا ہے کہ اسمبلیوں کے ممبروں کے پاس فوجی راز نہیں ہوتے ہمارے یہ دو ممبر چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش جاسوسوں کو صرف چھپاتے ہُوئے ہیں۔"

”کیا ہماری انٹیلی جنس اتنی کمزور ہے کہ اس کی موجودگی میں ہندوستان کے جاسوس اور تخریب کار یہاں اڈے بناتے ہوئے ہیں؟“

”انٹیلی جنس کمزور نہیں ارشد بھائی!“ — عبدالجلیل نے کہا — ”لیکن انٹیلی جنس کا محکمہ پکڑ سکتا ہے، کسی کو سزا نہیں دے سکتا۔ سزا کے لیے کیس عدالت میں بھیجنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ مجرموں کو سزا دلانے میں دلچسپی رکھتے ہیں یا نہیں۔“

”اگر ہم ان دو لڑکیوں اور ان کے برائے نام خاوندوں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں“ — ارشد نے کہا — ”یا ان کے خلاف رپورٹ کر دیں تو کیا ہوگا؟“

”ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی“ — عبدالجلیل نے کہا — ”تمہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی ہوتی ہے یا نہیں۔ ہوسکتا ہے تمہارے خلاف کسی فرضی جرم میں کارروائی ہو جاتے تمہیں تخریب کار اور کمیونسٹ کہا جائے گا۔ ایسا ہو چکا ہے اور ایسے ہی ہوگا۔“

ارشد کچھ دیر عبدالجلیل کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ عبدالجلیل ہنس پڑا۔

”ہم نے انگریزوں کے خلاف کھلی جنگ لڑی تھی“ — ارشد نے کہا — ”میں نہیں جانتا جاسوسوں کے خلاف کس طرح لڑا جاتا ہے۔“

”جاسوس بن کر“ — عبدالجلیل نے کہا — ”ان کی کارروائیاں زمین دوز ہوتی ہیں، اس لیے ان کے خلاف جنگ بھی زمین دوز لڑی جاتی ہے۔ قوم کے بچے بچے کو یہ ٹریننگ ملنی چاہیے کہ وہ دشمن کے جاسوسوں کو پہچان سکے اور ان کے خلاف کارروائی کر سکے۔ تخریب کاری صرف یہ نہیں ہوتی کہ کہیں پل اڑا دیا، کسی سرکاری عمارت میں دھماکہ کر دیا، گولہ بارود کے کسی سٹور کو اڑا دیا۔ تخریب کاری نظریاتی بھی ہوتی ہے جو ان آٹھ برسوں میں مشرقی پاکستان میں شروع ہو چکی ہے۔ اگر ہماری طرف سے جوابی یا انسدادی کارروائی نہ ہوئی تو یہ ناممکن نہیں کہ مشرقی پاکستان ہم سے کٹ جائے۔“

”نہیں خان صاحب!“ — ارشد نے تڑپ کر کہا — ”ایسا نہیں ہوسکتا۔ پاکستان کا کوئی ذرا سا حصہ بھی الگ نہیں ہوسکتا۔“

”بہت کچھ ہوسکتا ہے ارشد بھائی!“ — عبدالجلیل نے کہا — ”ہم خوش فہمیوں میں جینے والے لوگ ہیں۔ خرگوش کو بھی اپنی تیز رفتاری کی خوش فہمی تھی لیکن دوڑ کچھوے نے جیت لی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ خواب خرگوش ہمیں کچھوے سے شکست دلائے گی۔ ایک پہلو پر غور کرو ارشد! ہمارے حکمران اور وزیر سیاسی ہوتے ہیں اور ان کی سیاست اقتدار کے گرد گھومتی ہے۔ انہیں جب یقین ہو جاتا ہے کہ دشمن کے جاسوسوں سے ان کی کرسی اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں تو وہ دشمن سے نگاہیں پھیر لیتے ہیں۔“

”بات پوری کرو خان صاحب!“ — کالے تانگے والے نے کہا — ”اگر ہمارے کسی بھی لیڈر کو اپنے ملک اور اپنے مذہب کا دشمن یقین دلا دے کہ وہ اسے اقتدار میں لے آئے گا، اس کے عوض وہ اس کے جاسوسوں کو پاکستان میں کھلی چھٹی دے دے تو وہ لیڈر دشمن سے دوستی کرے گا۔“

”ان حالات میں ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟“ — ارشد نے کہا — ”میرے دماغ میں تو یہی آتا ہے کہ جس کے متعلق ہمیں یقین ہو جاتے کہ یہ دشمن کا جاسوس ہے اسے ایسے طریقے سے قتل کر دیں کہ قاتل

کا سراغ نہ ملے۔“

”ہوسکتا ہے ہمیں قتل ہونا پڑے“ — عبدالجلیل نے کہا — ”ہم نے خون دے کر یہ ملک بنایا تھا، خون دے کر ہی اسے بچایا جاسکتا ہے۔ اگر ہم سب یہ سوچنے بیٹھ جائیں کہ خون کون دے تو وہ دن جلدی آجائے گا جب دشمن ہمیں آکر دبوچ لے گا۔“

”ارشد باؤ!“ — کالے نے کہا — ”تم فکر نہ کرو۔ خون دینے کے لیے ہم موجود ہیں جس طرح مجھ جیسی مخلوق ۴۷-۱۹۴۶ء میں تمہارے ساتھ رہی ہے اسی طرح اب بھی ساتھ ہوگی۔ ہماری بیٹیاں اغوا ہوئی ہیں ارشد باؤ! ہم اس دشمن کو کس طرح دوست بنا سکتے ہیں۔ تم اپنی قوم کو جانتے ہو۔ یہ قوم ہے جو ہندو کی دوستی کو قبول نہیں کر رہی، ورنہ ہمارے وزیر اعظم کبھی کے پاکستان کا سودا کر چکے ہوتے۔“

”کیا ہمارے ساتھ اتنے آدمی ہیں جو سارے پاکستان میں پھیل کر ہندوستان کے ایجنٹوں کا قلع قمع کر سکیں؟“ — ارشد نے کہا — ”ہم زیادہ سے زیادہ ان دو لڑکیوں کو ختم کر سکتے ہیں۔“

”ذرا اور گہرائی میں جاؤ ارشد!“ — عبدالجلیل نے کہا — ”ہم نے پاکستان ایک دن میں حاصل نہیں کر لیا تھا۔ قرارداد پاکستان، ۱۹۴۰ء میں پاس ہوئی تھی لیکن اس قرارداد کی جڑیں دور پچھلی صدی میں گئی ہوئی تھیں۔ اس کا بنیادی پتھر تحریک مجاہدین کے جانبازوں نے رکھا تھا۔ فتح یا کامیابی ایک رات میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ جد و جہد جاری رہے تو بھی برس گزر جاتے ہیں۔ کام جو تم شروع کرو گے وہ تمہارے بچے مکمل کریں گے۔ مخالف قوت زیادہ ہوئی تو ہوسکتا ہے تمہارے بچوں کے بچے وہ کام مکمل کر سکیں۔“

”اس وقت تک دشمن ہماری جڑیں کاٹ چکا ہوگا“ — ارشد نے کہا۔

”نہیں، میں تمہیں یہ نکتہ بھی سمجھا دیتا ہوں“ — عبدالجلیل نے کہا — ”اگر ہم نے دشمن کے دو چار ایجنٹوں کو لاپتہ کر دیا تو دشمن بھی چوکنا ہو جائے گا اور دشمن کے پاکستانی دوست بھی ذرا پھونک کر قدم اٹھائیں گے۔ ہم اپنا کام جاری رکھیں گے۔ اپنے ساتھیوں میں اضافہ کرتے چلے جائیں گے۔ دشمن کے آدمیوں اور ان کے مقامی دوستوں کی گمشدگی کی وارداتیں بڑھتی جائیں گی۔ اس سے دشمن بھی اور ہماری حکومت بھی سمجھ جائے گی کہ ملک میں ایک زمین دوز رَو چل رہی ہے۔ ہمیں اپنی حکومت کے خلاف کچھ نہیں کرنا۔ ہمیں اپنے آپ کو خانہ جنگی کے راستے پر نہیں ڈالنا۔ ہمیں سیاسی نوعیت کے جلسے، مظاہرے اور ہنگامے نہیں کرنے....

”میں تمہیں اپنی مثال دیتا ہوں۔ وہ سکولوں اور کالجوں کے طلبا۔ کا جلوس تھا جس پر مجھے لاٹھی چارج کا حکم ملا تھا۔ میں نے اپنی اتنی لمبی نوکری قربان کر دی۔ آدھی پنشن قربان کر دی لیکن یہ حکم نہ مانا۔ مجھے معلوم تھا کہ دو سیاسی پارٹیوں نے مل کر ہمارے بچوں کو آلۂ کار بنایا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں افواہیں پھیلائی گئی تھیں کہ برسرِ اقتدار پارٹی کے ایک وزیر کے حکم سے چار پانچ طلبا۔ کو پولیس سے پٹوایا گیا ہے۔ یہ محض افواہ تھی۔ بے بنیاد خبر تھی۔ یہ حزبِ مخالف کی اڑائی ہوئی تھی اور مقصد یہ تھا کہ طلبا۔ کو حکومت کے خلاف بھڑکا کر ان کے جلوس نکلوائے جائیں....

”طلبا۔ کا جلوس نکلا جو پُرامن تھا۔ لڑکوں نے تقریریں کیں اور جلوس منتشر ہو گیا۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسرے دن جلوس پر تشدد کرنے کا جواز پیدا کرنے کے لیے جلوس میں سرکاری غنڈے شامل کر دیئے گئے۔ میں ان میں سے کئی ایک کو ذاتی طور پر جانتا پہچانتا تھا.... ارشد بھائی! تم شاید یقین نہ کرو، جلوس میں ہمارے

بدترین دشمن ہندوستان کے ایجنٹ بھی شامل ہو گئے۔ میں ان میں سے دو کو پہچانتا تھا۔ دشمن ایسے ہنگاموں میں جلتی پر تیل ڈالا کرتا ہے تاکہ پاکستان میں بدامنی پھیلے۔ چنانچہ برسرِاقتدار پارٹی کے غنڈوں نے طلباء کے پُرامن جلوس کو یُوں مجرموں کا ہجوم بنا دیا کہ دکانوں میں توڑ پھوڑ اور لوٹ مار شروع کر دی۔ دشمن کے ایجنٹوں نے پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ طلباء پڑھے لکھے ذہنوں کے لڑکے تھے۔ ان میں سے کچھ پتھراؤ میں شامل ہو گئے....

"مجسٹریٹ نے لاؤڈ سپیکر پر جلوس کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سرکاری غنڈے اور کچھ اور آدمی جن میں دشمن کے تخریب کار شامل تھے، جلوس کو منتشر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ مجھے جلوس پر لاٹھی چارج کا حکم ملا۔ میں نے مجسٹریٹ سے کہا کہ لاٹھی چارج کی کوئی ضرورت نہیں۔ جلوس میں غنڈے شامل ہو گئے ہیں۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ میں انہیں گرفتار کر لوں گا۔ اسی سے جلوس پُرامن ہو جائے گا....

"مجسٹریٹ ایک انسپکٹر کے مشورے کو اپنی توہین سمجھا۔ اس نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ میں لاٹھی چارج کروں۔ میرا ڈی۔ ایس۔ پی آ گیا۔ اُس نے بھی مجسٹریٹ کا حکم دہرایا۔ میں نے اُسے بھی وہی مشورہ دیا جو مجسٹریٹ کو دیا تھا۔ اُس نے بھی مجسٹریٹ کی طرح مجھے ڈانٹا۔ مجھے جلال آباد کا وہ جلوس یاد آ گیا جو تم لوگوں نے نکالا تھا۔ میں انگریز کا نوکر تھا لیکن میں نے انگریز لیفٹیننٹ سے بھی کہہ دیا تھا کہ اس جلوس پر لاٹھی چارج اور آنسو گیس پھینکنے کی حماقت نہ کرنا۔ اُس نے مجھے گالی دی تھی۔ اُس کے انجام سے تم واقف ہو....

"اب یہاں میں دیکھ رہا تھا کہ طلباء کا کوئی جرم نہیں۔ میں نے لاٹھی چارج نہ کیا تو ڈی۔ ایس۔ پی نے خود ہی لاٹھی چارج کا حکم دے دیا اور مجھے معطل کر دیا۔ رپورٹ وزیرِ داخلہ تک پہنچی۔ اُس نے مجھے بلایا اور لیکچر دینے لگا۔ میں نے اُس سے کہا۔۔۔ 'جناب! میں حیران ہوں کہ آپ وزیر ہیں اور میں معمولی سا انسپکٹر پولیس ہوں اور آپ مجھے اپنے ہاں بلا کر لیکچر دے رہے ہیں۔ میں اتنا اہم آدمی نہیں ہوں'۔۔۔ اُس نے مجھے بے معنی سا جواب دیا۔ میں نے اُسے کھری کھری سنا دیں.... حقیقت یہ ہے ارشد بھائی! یہاں حکمرانی پولیس کے سہارے کی جاتی ہے۔ ملک میں ڈاکے پڑتے رہیں، قتل ہوتے رہیں، تالے ٹوٹتے رہیں، پولیس سے جواب طلبی نہیں ہوتی۔ پولیس کا فرض یہ ہے کہ حکمران کی کرسی اُس کے نیچے سے نہ نکلے اور پولیس حکمران پارٹی کے مخالفین کو سر نہ اٹھانے دے.... میں نے وزیرِ داخلہ سے کہا کہ یہ ملک اپنا نہ ہوتا تو میں غلط حکم مان لیتا۔ میرے سامنے کوئی وزیر اور وزیرِ اعظم نہیں۔ میری دلچسپیاں پاکستان اور پاکستان کے بچوں کے ساتھ ہیں.... میں اس وزیر کو قائل نہ کر سکا۔ مجھے قبل از وقت جبری پنشن پر گھر بھیج دیا گیا....

"میں تم سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں ایسی تحریک چلانی ہے جو طلباء کو سیاسی لیڈروں سے محفوظ رکھے اور وہ آلۂ کار نہ بن سکیں۔ یاد رکھو ارشد! سیاسی پارٹی اور تحریک میں سیاہ اور سفید جتنا فرق ہے۔ کامیاب ہمیشہ تحریکیں ہُوتی ہیں۔ پاکستان تحریکِ پاکستان کا حاصل ہے۔ آزادی ملتے ہی تحریک ختم ہو گئی اور سیاسی پارٹیاں میدان میں آ گئیں اور ملک اقتدار پرستی کا اکھاڑہ بن گیا۔ تم نے اس کے بداثرات آٹھ برسوں میں ہی دیکھ لیے ہیں۔ اب ایک اور تحریک کی ضرورت ہے جو پاکستان کو وہ پاکستان بنا دے جس کے لیے ہم نے اپنے بچّے ذبح کرائے تھے اور جس کا مطلب تھا لا الٰہ الاّ اللہ۔ وہ پاکستان ہندو کے آسیب سے پاک ہو گا لیکن اسے پاک کرنا پڑے گا۔"

"میں ابھی تک یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ نے میرا انتخاب کیوں کیا ہے؟"۔۔۔ ارشد نے پوچھا۔۔۔ "صرف کام کے کہہ دینے سے آپ کو یقین نہیں کر لینا چاہیئے تھا کہ میں اتنی خطرناک تحریک میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

"صرف اس لیے کہ یہ پاکستان تم نے بنایا ہے"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا۔۔۔ "وہ خون تم نے دیکھا ہے جو راہِ حق پر قوم نے بہایا ہے.... اب تم کہو گے کہ وہ تو لاکھوں اور کروڑوں نے دیکھا ہے۔ میں اس کا یہ جواب دوں گا کہ وہ سب قابلِ اعتماد ہیں۔ انھیں ایک اشارے کا انتظار ہے۔ شرط یہ ہے کہ اشارہ صحیح سمت کو ہو، اور اشارہ مردِ مومن کی فطرت کے مطابق ہو۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ ۱۹۴۶ء میں تمہیں سب سے پہلی عورت کو تحریک میں شامل کرنے کے لیے گھر سے باہر لانے میں کتنی دشواری پیش آئی تھی؟ کیا تم بھول گئے ہو کہ پاکستان کا نام سن کر پرانی وضع کے لوگوں نے تمہارا کس طرح مذاق اُڑایا تھا؟ انگریزوں کے گماشتے زمیندار، نمبردار، ذیلدار، سفید پوش، انعام خور، تھانیداروں کے خوشامدی اور مخبر اور مسجد و منبر کے اجارہ دار پاکستان کا نام سنتے ہی کیا تمہارے ساتھ ہو گئے تھے؟....

"پھر تم نے انہیں اپنے ساتھ دیکھا۔ بڑے جاگیردار اور مذہب کے بڑے بڑے ٹھیکیدار کسی اور وجہ سے تمہارے خلاف تھے، باقی سب تمہارے محاذ میں آ گئے تھے۔ جس کے پاس جو کچھ تھا اُس نے تحریکِ پاکستان کو دے دیا تھا.... کیوں؟ صرف اس لیے کہ انہیں صحیح سمت کو اشارہ ملا تھا۔ وہ مان گئے تھے کہ وہ بھٹکے ہُوئے مسافر ہیں۔ تم نے انھیں منزل کا راستہ دکھا دیا تھا۔ اب وہ منزل پر آ گئے ہیں لیکن منزل بھٹک گئی ہے۔ منزل کو ایسے راہبر ملے ہیں جو خضرِ راہ کے بھیس میں رہزن ہیں۔ ہمیں اپنی منزل کو ان کے فریب سے بچانا ہے۔ تم جس کسی سے یہ بات کہو گے وہ تمہارے ساتھ ہو جائے گا.... میں نے تمہارا انتخاب کر کے غلطی نہیں کی"۔۔۔ عبدالجلیل نے ارشد کی طرف جھک کر دھیمی اور پُرعزم آواز میں کہا۔۔۔ "میں نے غلطی نہیں کی ارشد! اگر تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تو یہ تمہاری بڑی ہی خطرناک غلطی ہو گی۔ تمہیں غائب کر دیا جائے گا۔"

ارشد نے چونک کر عبدالجلیل کی طرف دیکھا۔ عبدالجلیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ارشد کے ہونٹوں پر بھی مُسکراہٹ آ گئی۔

"اگر تم میرا ساتھ نہ دینا چاہو تو بتا دو اور چلے جاؤ"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا۔۔۔ "پھر ہم ایک دوسرے کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھیں گے۔ اگر تم نے میرے ساتھ شامل ہو کر مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی تو تمہارا اکلوتا بچّہ جو چھ سال اپنی ماں کو ڈھونڈتا رہا ہے، ساری عمر اپنے باپ کو ڈھونڈتا رہے گا۔"

ارشد کا سر جھک گیا۔ کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔

"ارشد بھائی!"۔۔۔ کچھ دیر بعد عبدالجلیل نے سکوت توڑا۔۔۔ "میں نے تمہیں ٹوٹنے کے لیے دھمکی نہیں دی"۔۔۔ عبدالجلیل کی آواز کانپ گئی۔ اُس نے ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس کی انگلیوں نے اُس کے کندھے کو شکنجے کی طرح جکڑ لیا۔ عبدالجلیل کی آواز جو اَب تک دھیمی اور ٹھہری ٹھہری تھی، قہر سے لرزنے لگی۔۔۔ "پاکستان لُٹ رہا ہے"۔۔۔ اُس نے اور زیادہ اونچی آواز سے کہا۔۔۔ "اسلام لُٹ رہا ہے۔ اسلام کے قلعے کی دیواروں میں مجھے دراڑیں نظر آ رہی ہیں۔ ایک لُٹی ہُوئی قوم کا پاکستان لُٹ رہا ہے۔ ہمارا عزم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ہندوستان کو پاکستان میں شامل کریں گے، تب ہم اس پاکستان کو دشمن سے بچا کر اسے اسلام کا قلعہ بنا سکیں گے۔"

"میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا"۔۔۔ ارشد نے جذبات سے دبی دبی آواز میں کہا۔۔۔ "میں

اپنے مذہب اور اپنے ملک سے غدّاری نہیں کر سکتا۔"

"غدّاری.... غدّاری!" — عبدالجلیل نے جذباتیت سے لرزتے لہجے میں کہا — "ہم غدّاروں کی ڈسی ہوئی قوم ہیں۔ ہماری تاریخ میں جتنی شجاعت ہے، اتنی ہی اس میں غدّاری ہے۔ ٹیپو کو غدّاروں نے مروایا، سیّد احمد شہید کو غدّاروں نے مروایا، ۱۸۵۷ء میں مجاہدینِ آزادی نے دِلّی پر اسلام کا جو پرچم لہرایا تھا وہ غدّاروں نے اُتروایا اور دِلّی کے دروازے انگریزوں کے لیے کھول دیئے، پھر ہندوستان جو اسلامی ملک تھا، اسلام کے شیدائیوں کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں جہنم بن گیا۔ مسلمان پر یہ زمین تنگ ہو گئی۔ محمد بن قاسمؒ، محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کے نعرے بھٹکی ہوئی، دبی دبی سی، گریاں و نالاں گونج بن کے رہ گئے۔"

عبدالجلیل کے ہونٹ کانپنے لگے مگر آواز خاموش ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ اُس کی بیوی برتن اٹھانے کے لیے کمرے میں آئی تو اسے یوں لگا جیسے وہ خلا میں آگئی ہو۔ کمرے میں اتنی گہری خاموشی تھی جس میں بے وزنی کا احساس ہوتا تھا۔ پیالیوں میں چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ کامے تانگے والے نے بھی چائے نہیں پی تھی۔ عبدالجلیل کی بیوی نے سب سے پہلے خاوند کو دیکھا۔ آہستہ آہستہ چلتی اُس تک گئی اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"آپ نے پھر اپنے خون کو جوش دے لیا ہے؟" — اُس کی بیوی نے ایسے لہجے میں کہا جس میں ماں اور بہن کے پیار کی جھلک نمایاں تھی۔ اُس نے سنجیدہ سی ہنسی ہنس کر ارشد سے کہا — "یہ مجھے کہا کرتے ہیں کہ جذباتی نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے آپ پر جذبات نہیں عقل کو غالب رکھا کرو۔"

"بات ہی کچھ ایسی ہے بھابی جان!" — ارشد نے کہا — "بڑی جذباتی بات ہے۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھنا محال ہو جاتا ہے۔"

"اپنے آپ کو قابو میں رکھنا پڑے گا ارشد!" — عبدالجلیل کی بیوی نے کہا — "ہم نے جذبات کو قابو میں رکھا تھا اور انہیں ایک قوت بنا کر پاکستان حاصل کر لیا تھا۔ اب بھی اُسی ڈسپلن میں رہ کر ہم پاکستان کو بچا بھی لیں گے۔"

ارشد کو یوں لگا جیسے طاہرہ بول رہی ہو۔ اُس نے چونک کر اس جوان عورت کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ طاہرہ ہی لگتی تھی۔ چہرے پر بڑا حسین وقار اور پُر نور سنجیدگی تھی۔

"میں جذباتی نہیں ہوا سلمیٰ!" — عبدالجلیل نے کہا — "ارشد نے پوچھا تھا کہ میں نے اِس کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ میرا ذہن بڑی دور پیچھے چلا گیا۔ میں اِسے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے سامنے نہ اپنی ذات ہے نہ اِس کی ذات ہے، نہ کامے کی نہ تمہاری۔ میرے سامنے ایک اللہ کی ذات ہے اور پاکستان ہے جو مملکتِ خداداد ہے مگر یہ انسانی خداؤں کے قبضے میں آگیا ہے۔ ہم نے جس دشمن کو شکست دے کر یہ خطّہ فتح کیا تھا، وہ ہماری بنیادوں میں اُترتا جا رہا ہے۔"

"ارشد کو اتنی لمبی چوڑی باتیں بتانے کی کیا ضرورت ہے" — سلمیٰ نے کہا — "یہ سارا پس منظر جانتا ہے۔ اب آگے کی بات کریں۔"

"وہ کل شام ہوگی" — عبدالجلیل نے کہا — "کل شام آسکتے ہو؟"

"میں لے آؤں گا" — کامے نے کہا۔

"نہیں کامے!" — ارشد نے کہا — "میں آجاؤں گا۔"

"کل شام سات بجے" — عبدالجلیل نے کہا — "کچھ اور دوستوں سے بھی ملاقات ہوگی۔"

✪

ارشد جب کامے کے تانگے پر گھر واپس جا رہا تھا تو کامے نے اُسے بتایا کہ عبدالجلیل کسی بھی وقت گرفتار ہو سکتا ہے کیونکہ امرتسر والے دونوں جاگیردار، مہر اللہ بخش اور چوہدری اکرم اس کے سخت خلاف ہیں۔ وہ دونوں سمگلنگ کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے صوبائی وزیروں کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ کامے نے اس شک کا اظہار بھی کیا کہ دونوں جاگیرداروں کو شاید معلوم ہے کہ عبدالجلیل ان کے خلاف کہیں دوز سرگرمیوں میں مصروف ہے۔

"عبدالجلیل کو معلوم ہے؟"

"ہاں!" — کامے نے جواب دیا — "معلوم ہے لیکن اسے پروا ہی نہیں۔ کہتا ہے کہ اس کے خلاف مخبری ہوئی تو وہ معلوم کر لے گا کہ مخبر کون ہے۔ اُس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔"

"میں ایک پہلو پر غور کر رہا ہوں کامے!" — ارشد نے کہا — "عبدالجلیل کس کے بھروسے اتنی بڑی مہم چلانا چاہتا ہے؟"

"اپنے اخلاق اور کردار کے بھروسے پر" — کامے نے جواب دیا — "یہ شخص ضلع امرتسر کے تین تھانوں کا ایس۔ایچ۔او رہا ہے۔ ان تھانوں کے تمام جرائم پیشہ لوگ اس کے مرید تھے۔ اس نے ایسے بھی نہیں کیا تھا کہ کہیں چوری ڈاکے کی واردات ہو جاتی تو علاقے کے تمام عادی مجرموں کو تھانے بلا کر مارنا پیٹنا شروع کر دے۔ انہی لوگوں کی مدد سے اور اپنی عقل سے چور کو پکڑ لیتا تھا۔ یہاں لاہور میں کسی نامی گرامی مجرم سے کہہ دو کہ تمہیں رہتک والے خان صاحب بلا رہے ہیں تو وہ دوڑتا پہنچے گا.... میں تمہیں سچی بات بتاؤں ارشد باؤ! مجھے پاکستان کے ساتھ شاید اتنی محبت نہیں ہے جتنی اس شخص کے ساتھ ہے، اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس شخص کو کوئی ذاتی لالچ نہیں تو ہم اس کے کیوں نہ مرید بن جائیں؟"

کاما ارشد کو اس کی کوٹھی کے سامنے اتار کر چلا گیا۔ طاہرہ ارشد کے انتظار میں بے چین تھی۔

"دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے؟" — طاہرہ نے پوچھا — "کچھ تھکے تھکے سے لگتے ہو۔"

"آج ایک ایسے دوست سے مل کر آیا ہوں جس نے ساری تھکن دور کر دی ہے" — ارشد نے کہا — "تمہیں یاد ہوگا طاہرہ! جلال آباد میں ہم نے جو آخری جلوس نکالا تھا جس میں تم نے تھانے کے سامنے تقریر کی تھی، اس میں ایک انگریز لیفٹیننٹ لاپتہ ہو گیا تھا۔"

"ہاں، سنا تھا" — طاہرہ نے کہا — "لیکن اکثر لوگ کہتے تھے کہ یہ افواہ ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انگریز لیفٹیننٹ لاپتہ ہو جاتے۔"

"وہ افواہ نہیں تھی" — ارشد نے کہا — "میں اُس پولیس انسپکٹر سے مل کر آرہا ہوں جس نے اس انگریز لیفٹیننٹ کو اغوا اور پھر قتل کرایا تھا۔"

ارشد اُسے تفصیل سے بتانے لگا کہ عبدالجلیل خان نے اُس کے ساتھ کیا باتیں کی ہیں اور وہ کیا چاہتا ہے۔ ارشد بولتا جا رہا تھا اور طاہرہ کے چہرے پر آٹھ نو برس پہلے والا تاثر آتا جا رہا تھا — آٹھ برس پہلے جب انگریز اور ہندو نے تہیہ کر رکھا تھا کہ پاکستان نہیں بننے دیں گے — طاہرہ کے

چہرے کا یہ تاثر جذبۂ حرّیت کی سرخی بن گیا۔ اس دوران طاہر پرویز ان کے پاس آگیا اور وہ بھی ان کی باتیں بڑے غور سے سننے لگا۔

"ابا جان! آپ کون سے دشمن کی بات کر رہے ہیں؟" ـــ طاہر پرویز نے پوچھا ـــ "ہمارا دشمن کون ہے؟"

"ہم پاکستان کے دشمن کی بات کر رہے ہیں بیٹا!" ـــ طاہرہ نے اُسے بازوؤں میں لے کر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا ـــ "ہم تمہیں بتائیں گے کہ وہ دشمن کون ہے۔ تم اس دشمن کو مارو گے۔ اُسے اپنے ہاتھوں تباہ کرو گے۔"

پھر ارشد اور طاہرہ باتیں کرتے رہے اور چھ سالہ طاہر پرویز اُن کی باتیں سنتا رہا۔ وہ دونوں کبھی کبھی بیٹے کو ایسی نگاہوں سے دیکھتے تھے جیسے یہی ہے وہ بچّہ جو اس کام کی تکمیل کرے گا جو وہ شروع کریں گے۔ دونوں اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کر رہے تھے کہ بچّے کو پاکستان کے وقار اور آن کا محافظ بنانا ہے اور اس کے خون میں اس کے آباؤ اجداد کی روایات کو شامل کرنا ہے، اور اسے اس کے مذہب اور ملک کا دشمن دکھانا ہے۔

✪

اُسی شام لاہور کی ایک کوٹھی کے سامنے اُس وقت کے جدید ماڈلوں کی چار پانچ کاریں کھڑی تھیں۔ اُن دنوں سڑکوں پر کاروں کی یہ بھرمار نہیں تھی جو آج دیکھنے میں آرہی ہے۔ موٹر سائیکل اور سکوٹر بھی بہت کم تھے کیونکہ ابھی پاکستانیوں کو کسی نے باہر کے ملکوں کا راستہ نہیں دکھایا تھا۔ ابھی لوگ پاسپورٹ اور ویزا جیسے الفاظ سے واقف نہیں ہُوتے تھے۔ روپے پیسے کا لالچ تو ہر کسی کے دل میں تھا لیکن کسی کو ابھی یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ روپے پیسے کی کانیں سمندر پار ہیں۔ ابھی تک لوگ عرب کے صحرا کا ذکر تقدس اور احترام سے کرتے تھے کہ اس ریگزار نے رسولِ خدا کو جنم دیا تھا اور غارِ حرا بھی اسی ریگزار میں ہے جس کی تاریکی سے اسلام کی کرنیں پھوٹیں اور اللہ کی زمین اس کے نور سے منوّر ہُوتی تھی۔

وہ وقت ابھی دُور تھا جب پاکستانیوں پر انکشاف ہُوا تھا کہ اس مقدّس صحرا کے نیچے تیل کا سمندر ہے جو انہیں پکار رہا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب صحرائے عرب سے لوگوں کو اس لیے پیار نہ رہا کہ وہاں سے اسلام آیا تھا بلکہ اس لیے کہ وہاں سے پیسہ آتا ہے۔ اس پیسے سے جاہل، اَن پڑھ اور پسماندہ ذہنوں کے لوگ بھی کوٹھیاں اور محلّات جیسی حویلیاں تعمیر کرا سکتے ہیں اور کاریں خرید سکتے ہیں۔ ابھی لوگ "دبئی کے پیسے" سے واقف نہیں ہُوتے تھے۔ ان کے قریب سے کار گزرتی تھی تو وہ رک کر دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ کسی وزیر کی ہوگی، کوئی بڑا افسر ہوگا، شاید کوئی سمگلر ہو۔

لاہور کی اُس کوٹھی میں اُس وقت کے جدید ماڈلوں کی چار پانچ کاریں کھڑی دیکھ کر راہ جاتے لوگ رک کر دیکھتے اور آگے نکل جاتے تھے۔ وہ سوچتے تھے یہ کوئی شاہی خاندان ہے۔ اس کوٹھی میں ایک جوان سال بڑی خوبصورت بیوی اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ گرمیوں میں وہ مری یا سوات چلے جاتے تھے۔ سردیوں میں اس کوٹھی میں رونق آجاتی تھی۔ ایسی کاریں اس کوٹھی میں آتی ہی رہتی تھیں اُس شام وہاں کاریں کھڑی دیکھ کر کوئی حیران نہ ہُوا۔

اس کوٹھی میں رہنے والی کا نام عقیلہ تھا۔ اس کے ہاں اس جیسی ایک بڑی ہی دلکش اور جوان عورت مدعو تھی جس کا نام نسیمہ تھا۔ اس کوٹھی کے قریب سے گزرنے والوں کو معلوم نہیں تھا کہ عقیلہ عقیلہ نہیں اور نسیمہ نسیمہ نہیں۔ لوگوں کو معلوم ہی کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ دونوں ہندو ہیں۔ کوٹھی کے قریب سے گزرنے والے پاکستانیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کوٹھی میں آج شام جو لوگ مدعو ہیں، ان میں ایک ان کا وزیرِ داخلہ چوہدری نذر حسین ہے اور دوسرا وزارتِ داخلہ کا سیکرٹری۔ مہر اللہ بخش اور چوہدری اکرم بھی مدعو تھے۔ نسیمہ بھی اپنے خاوند کے ساتھ مدعو تھی۔

تلاشِ معاش میں مارے مارے پھرتے رہنے والے اور مشقّت کے مارے ہُوئے پاکستانیوں کو علم نہ تھا کہ اس کوٹھی میں ان کی قسمت پر مہر ثبت ہو رہی ہے اور اُنہوں نے آٹھ سال پہلے غلامی کی جو زنجیریں توڑی تھیں وہ انہیں پھر پہنانے کے منصوبے بن رہے ہیں۔

کوٹھی کی فضا شراب کی بُو سے مخمور ہوتی جارہی تھی۔ ہندوستان سے آتی ہوئی فرانسیسی شراب نے، عقیلہ اور نسیمہ کے حسن و جوانی نے دوست اور دشمن کو ایک کر دیا تھا۔ سرحدیں مٹ گئی تھیں۔ محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور قائدِ اعظم کا نام و نشان مِٹ گیا تھا۔ رات گزرتی جارہی تھی۔ پاکستانی گہری نیند سو گئے اور پاکستان کی ایک کوٹھی میں دشمن بیدار ہوتا چلا جارہا تھا۔

"چوہدری اکرم!" ـــ شراب سے مخمور قہقہوں میں مہر اللہ بخش کی سرگوشی سنائی دی ـــ "اوتے، اس عبدالجلیل خان کا خیال رکھنا۔ بڑا زہری آدمی ہے۔ سنا ہے کوئی گڑبڑ کر رہا ہے۔"

"اُڑا دوں گا مہر جی!" ـــ چوہدری اکرم نے بدمست آواز میں کہا ـــ "اُس کی بیوی اور بچّوں کو اُٹھوا دوں گا۔ میں نے اُس کے پیچھے مخبر لگا رکھے ہیں۔"

اگلی شام ارشد پھر عبدالجلیل خان کے گھر میں بیٹھا ہُوا تھا۔ وہاں کا متے تانگے والے کے علاوہ چار آدمی اور تھے۔ تین ارشد کی عمر کے تھے اور ایک کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ عبدالجلیل نے ارشد کو اس کا نام عبدالقدیر بتایا۔

"یہ ہوشیارپور میں اے۔ ایس۔ آئی پولیس ہُوا کرتے تھے" ـــ عبدالجلیل نے عبدالقدیر کے متعلق ارشد کو بتایا ـــ "وہاں ان کے خاندان کا بہت نقصان ہُوا تھا۔ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور بیوی بچّوں

کو ساتھ لے آتے تھے۔ ان کے باقی سب رشتہ دار شہید ہو گئے تھے۔ پاکستان میں دو سال بعد جب انہیں ترقی ملنے والی تھی، اپنے ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ ان کی چپقلش چل پڑی۔ اُس نے انہیں رشوت خوری کے جھوٹے الزام میں محکمانہ کارروائی کر کے سروس سے نکلوا دیا۔ انہوں نے بیروزگاری کا ایک سال نافہ کشی میں گزارا ہے۔ پاکستان کے نام پر یہ جان چھڑکتے ہیں۔ پہاڑوں سے ٹکرا جانے والے مرد ہیں۔ یہ عقیلہ اور نسیمہ کو جانتے ہیں۔"

"میں انہیں جانتا ہی نہیں بلکہ ان کی زمین دوز سرگرمیوں سے بھی واقف ہوں" — عبدالقدیر نے کہا — "میں اُن پاکستانیوں کو بھی جانتا ہوں جن کے ساتھ ان دونوں ہندو لڑکیوں کا دوستانہ ہے۔ ان پر جس جس شخص نے پردہ ڈالا ہُوا ہے، میں انہیں بھی جانتا ہُوں۔"

"ان کے ساتھ میری مُلاقات آٹھ دس روز گزرے ہُوتی ہے" — عبدالجلیل نے عبدالقدیر کے متعلّق بتایا — "ہم آزادی سے پہلے فیروز پور میں اکٹھے رہے تھے۔ پاکستان میں آکر پہلی ملاقات آٹھ دس روز پہلے، آزادی کے آٹھ سال بعد ہُوتی ہے۔ یہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ آزادی سے پہلے کی باتیں ہونے لگیں تو مہاجرین کے قافلوں کی طرح باتیں لہولہان ہو کر پاکستان میں آگئیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے حبّ الوطنی کی اور ایک غلط حکم نہ ماننے کی یہ سزا ملی ہے کہ مجھے قبل از وقت جبری پنشن پر بھیج دیا گیا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے پنشن تو مل گئی ہے، انہیں وہ بھی نہیں ملی؛ اُدھر ہندوؤں اور سکھوں نے لُوٹ لیا، اِدھر اپنوں نے ذاتی رنجش کی بنا پر ذریعۂ معاش سے محروم کر دیا اور ان کے بچّوں کا مستقبل مخدوش کر دیا تھا۔"

"پھر آپ اپنے پاؤں پر کس طرح کھڑے ہُوئے عبدالقدیر صاحب!" — ارشد نے پوچھا۔

"مختلف جگہوں پر نوکریاں کیں" — عبدالقدیر نے جواب دیا — "پھر ایک دکان کھول لی۔"

"اب تو اللہ کا فضل ہے" — عبدالجلیل نے کہا — "اِن کا جنرل سٹور ہے۔ دو سیلز مین ہیں۔ اچھا خاصا مکان ہے۔ اللہ تو انصاف کرتا ہے نا! بے انصاف اللہ کے بندے ہوتے ہیں۔ بھلا کوئی انسان کسی انسان کی روزی چھین سکتا ہے؟ .... ہاں تو، میں تمہیں بتا رہا تھا کہ ان کے ساتھ پاکستان کی باتیں ہوئیں تو میں نے ان کے ساتھ وہی باتیں کیں جو کل تمہارے ساتھ کی تھیں اور ان کے ساتھ اِن دو ہندو لڑکیوں کا بھی تذکرہ کیا جو عقیلہ اور نسیمہ کے نام سے یہاں ایک کوٹھی میں رہتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ان دونوں کو جانتے ہیں۔ ان کے پاکستانی دوستوں اور مددگاروں کو بھی جانتے ہیں۔ میں نے چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش کے نام لیے تو کہنے لگے کہ یہ انہیں بھی جانتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ دونوں شخص ان لڑکیوں کی مدد سے سمگلنگ کرتے ہیں اور یہاں جاسوسی کرتی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہاں ہندوستان کی دولت پانی کی طرح تقسیم ہوتی ہے۔"

"اور یہ سمگلنگ اور پاکستان کے خلاف جاسوسی اُن راستوں پر ہو رہی ہے جن راستوں پر اُدھر کے مسلمان اپنا خون بہاتے اور اپنے بچوں اور اپنے عزیزوں کی لاشیں پھینکتے آتے تھے" — عبدالقدیر نے جذباتی لہجے میں کہا — "ان راستوں پر شہیدوں کا خون ابھی خشک نہیں ہُوا .... مجھے جب پتہ چلا تھا کہ سمگلنگ اور جاسوسی شروع ہو گئی ہے تو میں سر سے پاؤں تک کانپنے لگ گیا تھا۔ میں نے پولیس کے کئی افسروں کے ساتھ بات کی۔ کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ اپنے ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ اسی بات پر میری ترش کلامی ہُوتی تھی۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ پاکستان تمہارے باپ کی جاگیر نہیں، نہ تم اس ملک کے گورنر جنرل ہو۔ اپنے

عہدے اور اپنی حیثیت کے مطابق بات کیا کرو۔ اس ڈی ایس۔ پی کے ساتھ دشمنی ایسی بڑھی کہ مجھے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اُس روز خان صاحب سے ملاقات ہو گئی تو میں نے ان کے سینے میں بھی وہی درد دیکھا جو میرے سینے میں ہے اور جو تم جیسے جوانوں کے سینوں میں ہے۔"

"میں نے انہیں کہا کہ پاکستان کسی گورنر جنرل اور کسی وزیرِ اعظم کی جاگیر نہیں" — عبدالجلیل خان نے کہا — "یہ ایک قوم کا وطن ہے جو قوم نے جان اور مال کی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے۔ یہ اللہ کی سرزمین ہے جسے راہِ حق کے شہیدوں نے سیراب کیا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کچھ کرنا چاہتا ہُوں۔ انہیں یہ بھی بتایا کہ میرے ہاتھ میں ایسے آدمی ہیں جو نہ مرنے سے ڈرتے ہیں نہ کسی کو جان سے مار دینے سے گھبراتے ہیں۔"

"میں نے ان کی یہ بات سُنی اور یہ جذبہ دیکھا تو انہیں کہا کہ میں ایسے ہی جانبازوں کی تلاش میں ہوں" — عبدالقدیر نے کہا — "مجھے خان صاحب کے ساتھ پورا پورا اتفاق ہے کہ جس ملک کے لیڈر اور حکمران دشمن کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں اور اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا کر لیں کہ یہ دشمن نہیں دوست ہے تو یہ فرض قوم پر عائد ہوتا ہے کہ اپنے ملک کو دشمن سے بچاتے۔ لیڈروں کی نظر اقتدار کی کرسی پر ہوتی ہے۔ قوم اپنی زمین کی امین ہوتی ہے۔ عوام دشمن کی فوج کے خلاف نہیں لڑ سکتے لیکن وہ دشمن کے جاسوسوں اور ایجنٹوں کو جہنّم واصل کر سکتے ہیں .... میں نے خان صاحب سے کہا کہ مجھے اپنے ساتھ سمجھیں اور مجھے آزمائیں۔"

"اتفاق کی بات ہے کہ جس دشمن پر میری نظر تھی، اسے عبدالقدیر بھی جانتے ہیں" — عبدالجلیل نے کہا — "میں ان کے ساتھ ساری بات کر چکا ہُوں۔ آج ہم ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے لیے اکٹھے ہُوتے ہیں۔"

باقی تین آدمیوں کا بھی تعارف ہُوا۔ ان میں ایک کالج سٹوڈنٹ نجم الحسن تھا۔ بی۔ اے کے آخری سال میں تھا۔ دوسرے نے ایک سال گزرا بی۔ اے کیا تھا۔ اس کا نام ناصر تھا اور تیسرا حفیظ، کسی وکیل کا بیٹا تھا اور وکالت پڑھ رہا تھا۔ کاما تانگے والا ان سب کو جانتا تھا۔ عبدالقدیر کے ساتھ اُس کا پہلا تعارف تھا۔

"قدیر بھائی!" — عبدالجلیل نے عبدالقدیر سے کامے کا تعارف کراتے ہوتے کہا — "یہ کاما ہے۔ تانگہ چلاتا ہے لیکن گھوڑے کی نسبت انسانوں کو بہتر طریقے سے لگام ڈال سکتا ہے۔ اس نے جلال آباد میں جو کارنامے کر دکھاتے تھے، وہ تمہیں سناؤں گا۔"

عبدالقدیر نے کامے کو بڑے غور سے دیکھا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کامے جیسے لوگ بڑے کام کے ہوتے ہیں خان صاحب!" — عبدالقدیر نے کہا — "کامے دوست! چھری چاقو چلانا جانتے ہو؟"

کاما یوں ہنس پڑا جیسے کسی بچّے کی معصومانہ سی بات پر کوئی بڑی عمر کا آدمی ہنس دیتا ہے۔

"وقت آتے گا تو تمہیں پتہ چلے گا قدیر بھائی!" — عبدالجلیل خان نے کہا۔

"کیا آپ لوگوں نے کوئی باقاعدہ سکیم بنالی ہے یا ابھی خفیہ پارٹی بن رہی ہے؟" — عبدالقدیر نے پوچھا۔

"ابھی پارٹی بن رہی ہے" — عبدالجلیل نے جواب دیا۔

"ہماری سکیم کا بنیادی اصول ہوگا قتل!" ۔ کالج سٹوڈنٹ نجم الحسن نے کہا۔

"لیکن قتل صرف دشمن کے آدمیوں کا" ۔ عبدالجلیل نے کہا ۔ "ہم اپنے لیڈروں کو قتل کرکے سیاسی قاتل نہیں کہلانا چاہتے لیکن ہم اپنے لیڈروں اور وزیروں سے یہ بھی نہیں کہنا چاہتے کہ جس کام کا بیڑہ ہم نے اٹھایا ہے یہ ان کا کام ہے۔ لیڈر کی نظر سیاسی مفاد پر ہوتی ہے۔ ہماری نظر سرحدوں پر ہے۔"

"خان صاحب!" ۔ عبدالقدیر نے ارشد کی طرف اشارہ کرکے کہا ۔ "آپ نے ان کا تعارف نہیں کرایا۔"

"اوہ! معاف رکھنا ارشد!" ۔ عبدالجلیل نے کہا ۔ "میں اپنے سب سے زیادہ دلیر اور آزمائے ہوئے مجاہد کا تعارف کرانا بھول گیا ہوں.... قدیر بھائی! اس جوان کا نام ارشد ہے۔ صوبائی حکومت کا ملازم ہے۔ بڑے اچھے عہدے پر ہے۔ راوی روڈ پر 'آشا بھون' نام کی بہت بڑی کوٹھی میں رہتا ہے" ۔ اور عبدالجلیل خان نے تفصیل سے بتایا کہ ارشد نے تحریکِ پاکستان میں کیا کام تھا۔

عبدالقدیر نے گرم جوشی سے ارشد سے ہاتھ ملایا۔

"خان صاحب!" ۔ ارشد نے کہا ۔ "ہم ایک بنیادی غلطی کر رہے ہیں جو کسی بھی وقت ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔"

"ہاں، ہاں بتاؤ ارشد!" ۔ عبدالجلیل نے کہا ۔ "تمہاری بات سننے سے پہلے میں سب کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں جذبات سے نکل کر سوچنا اور مشورے دینا ہے۔ کوئی بھی تجویز ہو اس کے پیچھے جذبات نہیں عقل ہونی چاہیئے۔"

"میں اسی غلطی کی نشاندہی کرنے لگا تھا" ۔ ارشد نے کہا ۔ "مجھے یہی شک ہو رہا ہے کہ یہاں جذبات کے تحت باتیں ہو رہی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ ایک دوسرے کے متعلق ہمیں بالکل یقین نہیں کہ ہم سب دیانتدار ہیں اور ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دیں گے یا ہم میں سے کوئی پیٹھ نہیں پھیر جائے گا یا ہم میں سے کوئی مخبر نہیں بن جائے گا.... کیا آپ نے اس کا کوئی علاج سوچا ہے؟"

"حلف" ۔ عبدالقدیر نے کہا ۔ "قرآن پر ہاتھ رکھ کر سب سے حلف لیا جائے۔"

"حلف تو وزیروں سے بھی لیا جاتا ہے" ۔ ارشد نے کہا ۔ "حلف تو گورنر جنرل بھی اٹھاتا ہے۔"

"اس کے سوا اور کیا ذریعہ ہوسکتا ہے!" ۔ عبدالجلیل نے کہا۔

"میں جاہل اور ان پڑھ ہوں" ۔ کامے نے کہا ۔ "میں نے کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ان پولیس افسروں کی طرح دنیا دیکھی ہے اور انسانوں کو پڑھا ہے۔ لوگ خانۂ خدا میں بیٹھ کر اسی طرح جھوٹ بولتے ہیں جس طرح میں تانگے میں یا تکیئے والے اڈے پر بیٹھ کر جھوٹ بولا کرتا ہوں۔ جھوٹ بولنے کے لیے نہ پرمٹ لینا پڑتا ہے نہ لائسنس۔ انسان بڑی ناپاک چیز ہے خان صاحب! میں اس کا علاج پیش کرتا ہوں۔ ہمارے ساتھ جو بھی شامل ہوگا اسے خبردار کر دیا جائے کہ اس نے دھوکہ دیا، پیٹھ پھیر گیا یا مخبری کی تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور لاش غائب کر دی جائے گی۔"

"لیکن پارٹی کی تو نشاندہی ہو جائے گی" ۔ وکیل کے بیٹے حفیظ نے کہا۔

"پارٹی کی نشاندہی ہوگی" ۔ ناصر نے کہا ۔ "تمام ممبروں کی نشاندہی نہیں ہوسکے گی۔ جو ممبر محفوظ رہیں گے وہ پارٹی کو دھوکہ دینے والے کو ختم کر دیں گے۔"

"اگر میں باہر رہا تو غداروں کو قتل کرنے کے لیے بڑے استاد مل جائیں گے" ۔ کامے نے کہا۔

یہ تعارفی محفل تھی جو مشوروں اور تجویزوں میں اور کچھ جذباتی باتوں کے بعد برخاست ہوگئی اور اگلی میٹنگ کا دن اور وقت طے ہوگیا۔

عبدالقدیر کی شخصیت میں جاذبیت تھی۔ لگتا نہیں تھا کہ وہ اے۔ایس۔آئی رہ چکا ہے۔ چہرے کے خدوخال میں کشش تھی۔ قد بُت نگاہوں کو اچھا لگتا تھا۔ رنگ روپ بڑا پیارا تھا اور اس کے بات کرنے کا انداز پُراثر تھا۔ بات کرتے وقت اس کی آنکھیں ساری محفل پر گھومتی تھیں۔ وہ محفل کو مسحور کرسکتا تھا مگر اگلی رات وہ جس محفل میں بیٹھا ہوا تھا وہاں مخمور تھا۔

وہ اس نسیمہ کی کوٹھی تھی جس کا نام نسیمہ نہیں تھا۔ وہ ہندو لڑکی تھی اور اس کا ایک خاوند بھی تھا جو اصل میں اس کا خاوند نہیں تھا۔ ان کے آگے شراب کی بوتل اور گلاس رکھے تھے۔ نسیمہ کا جعلی خاوند بھی کچھ دیر پہلے یہیں تھا لیکن وہ کسی سے ملنے کے بہانے باہر نکل گیا تھا۔ اُسے کسی سے نہیں ملنا تھا۔ اُسے عبدالقدیر نے اشارہ کیا تھا کہ وہ باہر چلا جائے۔ خاوند کو معلوم تھا کہ عبدالقدیر نسیمہ سے اپنی اُجرت وصول کرنے کے لیے اُسے باہر بھیج رہا ہے۔ وہ باہر چلا گیا تھا۔ اب نسیمہ عبدالقدیر کی تھی۔

یہ ہندو لڑکی اپنے دشمن ملک کو کھوکھلا کرنے کی قیمت ادا کر چکی تو اس نے عبدالقدیر سے پوچھا کہ کوئی خاص خبر ہے یا وہ تفریحاً آگیا ہے۔

"اتنی خاص خبر کہ تم سن کر کانپ جاؤ گی" ۔ عبدالقدیر نے کہا ۔ "ہماری سرکار کی آنکھوں میں تو تم اور عقیلہ نے دھول جھونک رکھی ہے مگر ہماری قوم کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔"

"کیا ہوا؟" ۔ نسیمہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"تمہارے قتل کی سکیمیں بن رہی ہیں" ۔ عبدالقدیر نے کہا ۔ "اور عقیلہ کے قتل کی بھی۔"

"پبلک میں ہمیں کون جانتا ہے؟"

"ایک ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر!" ۔ عبدالقدیر نے جواب دیا ۔ "چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش اُسے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"اُس کا منہ اور اُس کی آنکھیں کس طرح بند کی جاسکتی ہیں؟" ۔ نسیمہ نے پوچھا۔

"عورت کے معاملے میں وہ پتھر ہے" ۔ عبدالقدیر نے کہا ۔ "روپے پیسے کا اُسے لالچ نہیں۔"

"تم ایک بار اُسے یہاں لے آؤ" ۔ لڑکی نے کہا ۔ "میں اس پتھر کو موم کرلوں گی۔"

"یہ پتھر تمہاری کھوپڑی توڑ دے گا"

"تم کس مرض کی دوا ہو؟" ۔ نسیمہ نے پوچھا ۔ "کیا یہ تمہارا کام نہیں کہ کسی کو رکاوٹ نہ بننے دو؟ وہ سرکاری افسر نہیں، وزیر نہیں، کچھ بھی نہیں۔ معمولی سا ایک آدمی ہے۔ کیا اُسے ٹھکانے نہیں لگایا جاسکتا؟"

"وہ اکیلا نہیں" ۔ عبدالقدیر نے کہا ۔ "پورا گروہ ہے.... پہلے یہ بتاؤ کہ کل رات عقیلہ کے ہاں وزیرِ داخلہ اور سیکرٹری داخلہ مدعو تھے، تم بھی گئی تھیں۔ کوئی بات بنی؟"

"تمھارے وزیر صاحب تو آج بھی آئے تھے" ـــــ لڑکی نے کہا۔ "زُلف کے اسیر ہو گئے ہیں؟"

"غلام کہو" ـــــ نسیمہ نے کہا ـــــ "کیا ان سے بات کرنے کی ضرورت ہے؟"

"ابھی نہیں" ـــــ عبدالقدیر نے کہا ـــــ "تمھارے پاس تو ویسے ہی چلا آیا ہوں میں بات تو چودھری اکرم اور مہر اللہ بخش سے کروں گا لیکن ابھی کوئی کارروائی نہیں کریں گے کیونکہ ابھی گروہ بن رہا ہے۔ یہ مغز پھروں کا گروہ ہے جو اس وہم میں مبتلا ہیں کہ وہ نہ ہوتے تو پاکستان بھی نہیں رہے گا۔ میں تمھیں خبردار کرتا ہوں کہ کبھی اکیلی باہر نہ نکلنا۔ تم کبھی کبھی ٹہلنے کے لیے نکل جاتی ہو۔"

"کیا وہ اتنے خطرناک لوگ ہیں؟"

"جہاں ایک پرانا تھانیدار اور ایک تانگے والا اکٹھے ہو جائیں وہاں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا" ـــــ عبدالقدیر نے کہا ـــــ "جس شخص نے انگریزوں کی حکومت میں ایک انگریز لیفٹیننٹ کو ایک تانگے والے اور دو ملنگوں سے قتل کرا دیا اور سراغ تک نہیں چھوڑا تھا، اُس کے لیے دو ایسی لڑکیوں کو جو اس ملک کی شہری بھی نہیں، غائب کرا دینا کوئی مشکل کام نہیں۔"

نسیمہ کے اتنے دل کش چہرے پر خوف و ہراس چھا گیا۔ عبدالقدیر نے اُسے بڑی گہری نظر سے دیکھا اور بازو لمبا کر کے اُسے اپنی طرف کیا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔

"ڈرو نہیں رادھا!"

"پاگل!" ـــــ لڑکی نے اُس سے ایک جھٹکے سے الگ ہو کر کہا ـــــ "نسیمہ کہا کرو تم کسی اجنبی کے سامنے بھی مجھے رادھا کہہ گزرو گے اور پھنساؤ گے۔"

"ہاں تو نسیمہ!" ـــــ عبدالقدیر نے کہا ـــــ "میں تمھیں ایک بات کہنا چاہتا ہوں تمھارے چہرے کا رنگ اُڑ گیا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟ ... تم اپنے ملک کے لیے اپنی عصمت قربان کر سکتی ہو، اپنی جان نہیں۔ مجھے ڈر ہے تم خود ہی کہیں پھنس جاؤ گی۔ میں نے عقیلہ میں بھی یہی کمزوری دیکھی ہے۔ دل مضبوط رکھو۔"

"قدیر!" ـــــ لڑکی نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا ـــــ "میں گریجویٹ ہوں۔ اپنی انٹیلی جنس سے ٹریننگ لے کر آئی ہوں۔ ہمیں انسانی فطرت کی کمزوریاں اور دکھتی رگیں بتائی گئی تھیں اور بتایا گیا تھا کہ پاکستانیوں کی رگیں زیادہ دکھتی ہیں لیکن صرف اُن کی جو سیاست کا کھیل کھیلتے ہیں۔ حکومت انہی کی ہوتی ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ لوگ بادشاہ ہوتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے لوگوں سے بچنا..... تم یہاں کے کسی بھی لیڈر کا نام لو، کسی جاگیردار اور کروڑ پتی کارخانے دار کا نام لو میں نہیں ڈروں گی۔ تم نے ایک تانگے والے کا نام لیا ہے تو میرا دل کانپ گیا۔ تم خود پولیس میں رہ چکے ہو۔ شاید انٹیلی جنس کے لوگوں کو جانتے ہو گے۔ بہت ہی ذہین لوگ ہوتے ہیں۔ ہماری ہندوستانی انٹیلی جنس کو انگریزوں نے تربیت دی ہے۔ وہ پاکستان کے عوام کی نفسیات اور جذبات سے پوری طرح واقف ہیں۔ ہمیں یہ بتا کر خبردار کیا گیا تھا کہ پاکستان کے بڑے سے بڑے افسر سے بھی نہ ڈرنا لیکن پاکستان کے ہر اس عام آدمی سے جس نے پھٹے پرانے کپڑے ہی کیوں نہ پہن رکھے ہوں، بچ کے رہنا۔"

"جانتی ہو کیوں؟" ـــــ عبدالقدیر نے کہا ـــــ "اس لیے کہ پاکستان ان پھٹے پرانے کپڑوں والوں نے ہی بنایا تھا اور پاکستان انہی کا ہے۔ اگر تمھاری کوٹھی کے سامنے سے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چلنے والے نیم فاقہ کش انسانوں کو پتہ چل جاتے کہ اس کوٹھی میں ایک ہندو لڑکی رہتی ہے جو مسلمانوں جیسے نام کے بھروپ میں پاکستان کی جڑیں کاٹ رہی ہے تو یہ لوگ اس کوٹھی کو آگ لگا دیں اور تمھیں زندہ جلا دیں۔ خود ہی دیکھو اور غور کرو۔ تم نے یہاں کے کیسے کیسے آدمی پھانس رکھے ہیں مگر ایک ریٹائرڈ تھانیدار، ایک تانگے والے اور تین چار گمنام سے آدمیوں کو تمھارے متعلق پتہ چلا تو وہ تمھارے اور عقیلہ کے قتل کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ عام اور خاص آدمی میں یہ فرق ہوتا ہے۔"

"مجھے یہ بتاؤ کہ ہوگا کیا؟"

"تم اور عقیلہ خوش قسمت ہو کہ مجھے اس گروہ کا پتہ چل گیا ہے" ـــــ عبدالقدیر نے کہا ـــــ "یہ تھانیدار میرا دوست نکلا اور اُس نے مجھے اپنے گروہ میں شامل کر لیا ہے۔ یہ گروہ ابھی بن رہا ہے۔ میں اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لوں گا مگر ان لوگوں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ حکومت کے خلاف کچھ نہیں کر رہے۔ وہ اپنے لیڈروں کو قتل نہیں کرنا چاہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم دشمن کے تخریب کار ایجنٹوں سے بھڑک کر اپنے آدمیوں کو قتل کر دیں تو دشمن کو اس سے خوشی ہو گی..... تم بھی اتنا نہ ڈرو۔ ضرورت پڑی تو میں ان لوگوں کو کسی اور جال میں لے آؤں گا۔"

"اور تمھیں منہ مانگا انعام ملے گا" ـــــ نسیمہ نے کہا ـــــ "اور مل رہا ہے۔ تم اُس جائیداد اور مال اسباب سے کئی گنا زیادہ میری حکومت سے لے چکے ہو جو تم ۱۹۴۷ء میں ہوشیارپور چھوڑ آئے تھے۔"

"مجھے صرف تمھاری محبت چاہیئے" ـــــ عبدالقدیر نے لڑکی کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر ہندوستان سے آئی ہوئی ولائتی شراب کے نشے سے جھومتے ہوئے کہا ـــــ "جس روز مجھے پتہ چلا کہ تمھاری محبت کاروباری ہے تو وہ تمھاری زندگی کا یا شاید میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

"میں تمھاری ہوں قدیر!" ـــــ بھارتی انٹیلی جنس کی تربیت یافتہ لڑکی نے گال اُس کے گال سے رگڑتے ہوئے کہا ـــــ "میں واپس جاؤں گی تو تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

"آج ایک اور تھانیدار ہمارے گروہ میں شامل ہو گیا ہے" ـــــ ارشد طاہرہ سے کہہ رہا تھا ـــــ ہوشیارپور اُسے اتنا ہی ہوش تھا کہ اُسے اپنے گھر جانا ہے اور رات بہت گزر گئی ہے۔ اُس نے قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ اُس کے سر پر فلیٹ ہیٹ تھا۔ کوٹھی سے نکل کر اُس نے کوٹ کے کالر اوپر کر لیے۔ چہرہ کچھ ان سے ڈھانپا گیا۔ فلیٹ ہیٹ آگے سے نیچے کر لیا۔ پیشانی بھی ڈھانپی گئی۔ دُور ایک تانگہ کھڑا تھا۔ ابھی لاہور میں رکشے اور ٹیکسیاں نہیں چلی تھیں۔ اُس نے کوٹھی سے بہت آگے جا کر تانگے والے کو آواز دی۔ وہاں روشنی بہت تھوڑی تھی۔

تانگہ سرپٹ دوڑتا آیا۔ عبدالقدیر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تانگے والے کو بتایا کہ کہاں جانا ہے۔ اُس کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی کہ تانگے والے سے پیسے پوچھتا اور کم کراتا۔ تانگہ چل پڑا۔

"صاحب آپ یہیں کہیں رہتے ہیں؟" ـــــ کمبل میں لپٹے ہوئے تانگے والے نے پوچھا۔

"نہیں" ـــــ عبدالقدیر نے جواب دیا ـــــ "کسی سے ملنے آیا تھا۔"

"صاحب!" ـــــ تانگے والے نے پوچھا ـــــ "آپ ان کوٹھیوں سے واقف ہیں؟"

"کیوں؟" — عبدالقدیر نے پُوچھا — "کسی کا اَتا پتہ پُوچھنا ہے؟"

"صاحب بہادر!" — تانگے والے نے کمبل کی بُکل میں سے کہا — "سوچتا ہُوں اِس مُلک کا کیا بنے گا ..... سُنا ہے یہاں ایک کوٹھی میں ایک ہندو لڑکی رہتی ہے جس نے اپنا کوئی اسلامی نام رکھا ہُوا ہے اور ہمارے بڑے بڑے لیڈر اور افسر یہاں آتے ہیں"۔

"آتے ہوں گے بھائی!" — عبدالقدیر نے جمائی لیتے ہُوئے کہا — "کوئی اُونچی طوائف ہوگی۔ تانگے والے

کا مہاجر ہے۔ عبدالقدیر۔ بڑا خُوب صُورت آدمی ہے۔ اَندر سے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ اُس کی اور عبدالجلیل خان کی کہیں اتفاقیہ مُلاقات ہوگئی تھی۔ پتہ چلا کہ وُہ بھی اُن دو ہندو لڑکیوں کو اور اُن کی تخریب کاری کو اچھی طرح جانتا ہے۔ بڑا جوشیلا اور صحیح جذبے کا آدمی ہے"۔

اُس وقت جوشیلا اور صحیح جذبے کا آدمی ہندو لڑکی کے بیڈ رُوم میں تھا۔

ارشد اور طاہرہ رات بہُت دیر تک پاکستان اور پاکستان دُشمنوں کی باتیں کرتے رہے۔ اِن باتوں میں تلخی تھی۔ کئی ایک سوال تھے جن کے جواب نہیں مِل رہے تھے۔ طاہرہ کو کوئی وجہ سُوجھ نہیں رہی تھی کہ لوگ اپنے مُلک اور اپنی قوم سے غداری کِس طرح گوارا کر لیتے ہیں۔

"آخر کیوں؟" — طاہرہ نے جھنجھلا کر کہا — "اِس مُلک کی بنیادوں میں ہم سب کا خُون شامل ہے، پھر چند ایک انسان اپنے خُون کی لاج کیوں نہیں رکھتے؟ وُہ دُشمن سے اِس کی قیمت کیوں وصُول کرتے ہیں؟"

اُس وقت عبدالقدیر جس کے خاندان کے بہُت سے انسانوں کا خُون ہوشیار پُور میں بہہ گیا تھا، ہندو لڑکی کی کوٹھی سے جھُومتا ہوا نکل رہا تھا۔ شراب نے اُسے اِس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ اپنے آپ سے پُوچھ سکتا اور اپنے آپ کو بتا سکتا کہ وُہ اپنے خاندان کے خُون کی قیمت اپنے دُشمن سے کیوں وصُول کر رہا ہے۔

تو ایسے اڈوں سے واقف ہوتے ہیں"۔

"نہیں، آپ کو معلُوم نہیں" — تانگے والے نے کہا — "مَیں جاہل اور اَن پڑھ آدمی ہُوں۔ ہماری عادت ہوتی ہے کہ اپنی سواری کے ساتھ باتیں کرتے جاتے ہیں۔ آپ جیسی کوئی سواری مِل جائے تو اُس سے عقل کی دو باتیں معلُوم ہو جاتی ہیں۔ مَیں نے سُنا ہے کہ یہاں جو ہندو لڑکی رہتی ہے وُہ ہندُوستان کی جاسُوس ہے"۔

"اگر جاسُوس ہے تو تم اس کا کیا بگاڑ سکتے ہو؟" — عبدالقدیر نے کہا — "تم اپنے کام سے مطلب رکھو"۔

"بگاڑنے کو تو مَیں بہُت کچھ بگاڑ سکتا ہُوں صاحب!" — تانگے والے نے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" — عبدالقدیر نے کسی شک کی بنا پر پُوچھا۔

"کاما جناب!" — تانگے والے نے کمبل کی بُکل اچھی طرح مارتے ہُوئے کہا — "میرا نام کاما ہے"۔

تانگہ اندھیری سڑک سے گزر رہا تھا۔ عبدالقدیر نے فلیٹ ہیٹ اور نیچے اور کوٹ کے کالر اور اُوپر کر لیے جہاں اُسے جانا تھا، وہاں پہُنچنے سے پہلے اُس نے پیسے اگلی سیٹ پر پھینکے اور تانگہ ابھی رُک رہا تھا کہ وُہ اُتر کر چلا گیا۔ کاما اُسے پہچان نہ سکا۔

طاہرہ کا باپ جمال بیگ جو جوزی بابا کے نام سے مشہُور تھا، ایک روز سکول سے غیر حاضر تھا۔ وہ بیمار ہوتو ہی غیر حاضر ہُوا کرتا تھا، ورنہ آندھی، طُوفان اور زلزلے اُسے سکول جانے سے نہیں روک سکتے تھے۔ اُس کی رُوح سکول میں تھی۔ اُس کے دِل میں سکول کے بچّوں کا جو پیار موجزن تھا، اُسے بیماری سے بھی اُٹھا لیا کرتا تھا۔ وُہ جب غیر حاضر ہوتا تھا تو اُس کی کلاس کے بچے اُداس ہو جایا کرتے تھے۔

اُس کی پہلے دن کی غیر حاضری سکول کے سٹاف نے محسُوس نہ کی۔ وہ دوسرے دِن بھی نہ آیا اور اُس کی کوئی اطلاع بھی نہ آئی تو سب ایک دُوسرے سے پُوچھنے لگے کہ جوزی بابا کو کیا ہو گیا ہے۔ اسکول کے زنانہ حصّے میں صرف نجمہ ایک اُستانی تھی جو جوزی بابا کی غیر حاضری کو محسُوس کر رہی تھی اور اُسے کچھ شک ہو رہا تھا۔ وہ ہر روز جوزی بابا سے مِلتی تھی۔ اَب اُس کی عقیدت بڑھ گئی تھی کیونکہ وہ جوزی بابا نہیں جمال بیگ تھا اور وہ طاہرہ کا باپ نکلا۔

طاہرہ کو ارشد کے ساتھ لاہور گئے تیسرا چوتھا دن تھا۔ اُس کے جانے کے اگلے روز جمال بیگ سکول آیا تھا، پھر نہیں آیا اور اگلے دن بھی نہیں آیا۔ نجمہ کو کچھ شک سا ہُوا۔ نجمہ ذہین اُستانی تھی اور اَب اُسے جوزی بابا کے ماضی کا پتہ چل چکا تھا۔ وہ جِس طرح کلاس کے بچّوں، خصُوصاً بچیوں سے پیار کرتا تھا، اِسے والہانہ پن بھی کہا جا سکتا ہے اور دیوانگی بھی۔ بہرحال اُس کا یہ رَویہ اور انداز نارمل ذہن کے انسان کا نہیں تھا۔ نجمہ کو شک یہ ہُوا تھا کہ جوزی بابا اپنے آپ کو اپنی بیوی کا قاتل سمجھتا تھا اور اُس نے اپنی اِس نوزائیدہ بچّی کو دیکھنا بھی گوارا نہ کیا تھا جو بڑی ہو کر طاہرہ بنی اور جِس کے جاننے والے تحریکِ پاکستان کے ذِکر کو طاہرہ کے بغیر نامکمل سمجھتے تھے۔

اَب جوزی بابا کو وہ بچّی مِل گئی تھی جِس کی پیدائش طاہرہ کی ماں کا جُرم بن گئی تھی اور جوزی بابا جو اُس وقت جمال بیگ تھا، درندہ بن گیا تھا اور اُس نے بچّی کی ماں ساجدہ اور اُس کی نانی خاتُون سے کہہ دیا تھا کہ اُس نے پہلے ہی اُنہیں خبردار کر دیا تھا کہ اُس کی بیوی نے بچّی کو جنم دیا تو بچّی کو میرے گھر سے لے جانا۔ ساجدہ کے اِس جُرم نے جمال بیگ کو اُس کا قاتل بنا دیا تھا۔

نجمہ کو یہ شک تھا کہ اب طاہرہ پچیس چھبیس سال کی ہو کے اُسے مِل گئی ہے، شاید یہ دھچکہ جمال بیگ کے لیے اچھا ثابت نہیں ہُوا۔ چھُٹی ہُوئی تو نجمہ جمال بیگ کے گھر چلی گئی جو سکول کا ہی کوارٹر تھا۔ باہر کا دروازہ کھُلا تھا۔ نجمہ اندر چلی گئی۔ دیکھا کہ جوزی بابا چارپائی پر لیٹا ہُوا ہے اور اُس کی نظریں چھت پر جمی ہُوئی ہیں۔ میز پر کھانا پڑا ہے اور سالن جم چکا ہے۔

"بابا جان!" — نجمہ نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پُوچھا — "خیریت تو ہے؟ آج دُوسرا دن ہے آپ سکول نہیں آئے"۔

وُہ کچھ دیر چُپ رہا۔ نجمہ کی طرف دیکھا تک نہیں۔ نجمہ اُس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی اور ایک بار پھر کہا — "بابا جان!"

جمال بیگ نے نجمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے دُوسرا

ہاتھ بھی نجمہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ نجمہ جوان اور خوب صورت عورت تھی۔ جمال بیگ پچاس برس سے ایک دو سال اُوپر عُمر کا تندرست آدمی تھا۔ اُس کے زیادہ تر بال سفید ہو گئے تھے لیکن چہرے پر بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن نجمہ نے بالکل محسوس نہ کیا کہ وہ ایک مَرد کے پاس تنہا بیٹھی ہے۔ اُس نے اپنا ہاتھ جمال بیگ کے ہاتھوں سے نہ چھڑایا۔

"طاہرہ یاد آرہی ہے؟" — نجمہ نے پُوچھا — "وہ آجائے گی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ وہ ارشد کے ساتھ کیوں گئی ہے۔ چار پانچ دنوں تک آجائے گی"۔

"آجائے گی" — جمال بیگ نے یُوں کہا جیسے سِسکی لی ہو۔ کہنے لگا — "کیا کرے گی یہاں آکر؟ اگر آپ کی ماں قتل ہو جائے تو کیا آپ اپنی ماں کے قاتل کو اپنا باپ کہیں گی؟"

"ہوش میں آئیں بابا جان!" — نجمہ نے کہا — "طاہرہ آپ کو قاتل نہیں اپنا باپ سمجھتی ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ وہ کتنی خوش ہے"۔

"خوش ہے؟" — جمال بیگ نجمہ کا ہاتھ چھوڑ کر اُٹھ بیٹھا اور بولا — "تم کہتی ہو وہ خوش ہے؟ اِسی لیے ایک غیر مَرد کے ساتھ چلی گئی ہے؟ ارشد اُس کا خاوند تو نہیں"۔

"وہ آپ کی اجازت سے گئی ہے بابا جان!"

"اُس نے مجھ سے اجازت نہیں لی تھی" — جمال بیگ نے کہا — "اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جا رہی ہے"۔

"خدا کے لیے طاہرہ کو ایسا نہ سمجھیں بابا جان!" — نجمہ نے جھنجھلا کر کہا — "اُسے آپ نہیں جانتے، مَیں جانتی ہُوں۔ ارشد جانتا ہے۔ اُس کا کردار زم زم کے پانی جیسا پاک اور شفاف ہے۔ دُکھ جو اُس نے جھیلے ہیں وہ آپ نے ابھی نہیں سُنے" — نجمہ جذباتی ہوتی چلی گئی۔ اُس نے قدرے کانپتی ہُوئی آواز میں کہا — "طاہرہ آپ کی نہیں، میری نہیں، وہ پاکستان کی بیٹی ہے۔ اُس کا کوئی نہیں۔ اُس کا کوئی ٹھکانہ نہیں"۔

"میرا کون سا ٹھکانہ ہے؟" — جمال بیگ نے کہا — "تم لوگ ہندوستان سے ہندوؤں اور سکھوں سے بھاگ کر آئے تھے اور مَیں اپنے آپ سے بھاگا ہُوا ہُوں۔ اپنے آپ سے پناہیں ڈھونڈ رہا ہُوں"۔

"آپ کو اپنی بیٹی مِل گئی ہے" — نجمہ نے کہا — "آپ کو پناہ بھی مِل جائے گی .... چلئے، اُٹھیئے، کھانا کھالیں۔ مَیں گرم کر دیتی ہُوں"۔

جمال بیگ اُٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نجمہ سالن گرم کرنے کے لیے اُٹھانے لگی تو جمال بیگ نے اُسے روک دیا۔ کہنے لگا کہ وہ خود گرم کر کے کھالے گا مگر نجمہ نہ رُکی۔ وہ چولہا جلا کر سالن گرم کر لائی۔ جمال بیگ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔ نجمہ نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر التجا کی — "بابا جان! کھانا کھالیں"۔

جمال بیگ نے بے ساختہ اور بے اختیار نجمہ کو اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیا اور ہچکیاں لے لے کے رونے لگا۔

"مجھے کیا ہو گیا ہے نجمہ!" — اُس نے بے بسی کے عالم میں کہا — "مَیں کہاں تھا؟ کہاں چلا آیا ہوں؟"۔ اُس نے ایک جھٹکے سے نجمہ کو الگ کر کے کہا "نہیں ..... نہیں ..... طاہرہ مجھے مجرم سمجھتی ہے۔ اِسی لیے وہ ارشد کے ساتھ چلی گئی ہے ..... نجمہ! اُسے خط لکھ دو کہ یہاں نہ آئے" — وہ پھر جمال بیگ ... اُس نے سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور بڑی سخت آواز میں بولا — "اُسے لکھ دو تمہارا باپ پاگل ہو گیا، تمہاری ماں کا قاتل پاگل ہو گیا ہے۔ وُہ اپنے گُناہوں کی سزا بُھگت رہا ہے۔ یہاں نہ آنا۔ یہاں نہ آنا"۔

نجمہ اُسے آنکھیں حیرت سے پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ اُسے طاہرہ کا خیال آیا۔ طاہرہ کو باپ ملا تو کس حال میں ملا۔ کیا خدا طاہرہ کو ایک اور آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہے؟

☆

اُدھر نجمہ طاہرہ کے لیے پریشان اِدھر طاہرہ پاکستان کے لیے پریشان۔

طاہرہ نجمہ کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ ان کی ذات برادری بھی ایک نہیں تھی۔ ہندوستان سے ہجرت تک ان کا تعلق استاد اور شاگرد کا تھا۔ نجمہ سرحد پار جلال آباد میں استانی تھی اور طاہرہ اس کی شاگرد، لیکن ان کا خون ایک تھا، جذبہ ایک تھا اور وہ ایک محاذ پر لڑی تھیں۔ یہ جنگِ آزادی کا محاذ تھا۔ وہ خُون میں ڈوبی ہُوئی اُس بڑی لمبی راہ کی ہمراہی تھیں جو ہندوؤں اور سکھوں کے جہنّم سے پاکستان کی جنّت کو آتا تھا۔

طاہرہ اکیلی رہ گئی تھی مگر اُس نے آنسو نہیں بہاتے تھے۔ اُس کے پاس پلّے جو کچھ تھا، وہ اُس نے مہاجروں کے تین خاندانوں کو آباد کرنے پر خرچ کر دیا تھا۔ اُس نے اپنی محبت بھی قربان کر دی تھی۔ نجمہ کو اسی لیے وہ اچھی لگتی تھی کہ وہ دوسروں کو آباد کرنے کے لیے خود برباد ہو جانے والی لڑکی تھی۔ وہ نجمہ کو صرف اچھی نہیں لگتی تھی بلکہ نجمہ اُسے اپنی بیٹی بھی سمجھتی تھی اور اپنی بہن بھی۔ یہ روحانی رشتہ تھا جو توڑنا چاہو تو بھی نہیں ٹوٹتا۔

ارشد نے طاہرہ کو بتا دیا تھا کہ دشمن سمگلروں اور بڑی ہی حسین اور چالاک لڑکیوں کے ذریعے پاکستان کی جڑوں میں اُترتا جا رہا ہے۔ ارشد نے طاہرہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر عبدالجلیل خان کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے جو دشمن کے ایجنٹوں کے خلاف زمین دوز کارروائیاں کرے گا۔ ارشد نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ ایک اور ریٹائرڈ تھانیدار عبدالقدیر بھی ان کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔

طاہرہ یہ سن کر خوش نہ ہوئی کہ ارشد اور کچھ دوسرے لوگ دشمن کے خلاف زمین دوز جنگ شروع کر رہے ہیں۔ اُسے یہ سوال پریشان کرنے لگے تھے کہ اپنے ملک میں کیا دشمن کے خلاف چوروں کی طرح لڑنا ہے؟ کیا پاکستان کی انٹیلی جنس اور پولیس کو معلوم نہیں کہ جو دشمن پاکستان کو ابتداء ہی میں ختم کرنے اور ہندوستان میں شامل کر لینے میں ناکام ہو گیا تھا، وہ اب چند ایک بےضمیر اور ایمان فروش پاکستانیوں کے کندھوں پر بندوقیں رکھ کر پاکستان کے اندر آگیا ہے؟

طاہرہ کا ذہن آٹھ سال پیچھے چلا گیا۔ صرف اپنا قصبہ جلال آباد ہی نہیں، اُسے ۴۷-۱۹۴۶ء کے وقت کا سارا ہندوستان یاد آنے لگا۔ اُس وقت وہ ہر روز اخبار پڑھا کرتی تھی۔ مسلم لیگ کے دفتر میں اور نیشنل گارڈز کی حویلی میں سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے جہادِ آزادی، جوش و خروش اور جذبۂ ایثار کی باتیں ہوتی تھیں۔ طاہرہ اُن علاقوں کی بھی خبریں سنا کرتی تھی جہاں مسلمانوں کی آبادی بمشکل پانچ اور دس فیصد تھی۔ وہاں کے ہندو اپنی اکثریت کے زور پر مسلمانوں کا خون بہاتے رہتے تھے کہ وہ پاکستان کی باتیں کرتے ہیں اور کانگرس میں شامل نہیں ہوتے۔ وہ مسلمان ابھی ہار رہے تھے کہ جس پاکستان کے نام پر

وہ ہندوؤں کی درندگی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، وہ اگر معرضِ وجود میں آ بھی گیا تو ان کے علاقوں سے سینکڑوں میل دُور وجود میں آئے گا اور انہیں انہی ہندوؤں کے رحم وکرم پر رہنا پڑے گا جو آج انہیں کانگرس میں شامل ہونے پر مجبور کر رہے ہیں، مگر مسلمان نظریۂ پاکستان پر قربان ہوتے جا رہے تھے۔

طاہرہ کو آٹھ سال پہلے کا وہ وقت یاد آرہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ ۱۹۴۶ء میں گڑھ مکتیشر میں ہندو مسلمانوں پر منظّم طریقے سے ٹوٹ پڑے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے وہاں مسلمانوں کا صفایا کر دیا تھا۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جو نفرت بھری ہوئی تھی، اس کا اظہار ان ہندوؤں نے یوں بھی کیا تھا کہ اُن مسلمان عورتوں کو گھروں سے گھسیٹ کر باہر لے گئے جن کے پیٹوں میں بچے تھے۔ ان کے پیٹ چاک کر کے بچے نکالے اور انہیں ہندوؤں نے دیواروں کے ساتھ ٹپخا تھا۔

پھر اُسے صوبہ بہار میں مسلمانوں کا قتلِ عام یاد آیا۔ ہزاروں مسلمانوں کو، ان کی خواتین اور ان کے بچوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ وہاں کانگرسی مسلمان بھی تھے۔ انہوں نے ہندوؤں سے کہا کہ ہم کانگرسی ہیں ہمارا پاکستان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہندوؤں نے یہ کہہ کر ان سب کو قتل کر دیا تھا کہ ہمیں مسلمان کا خون چاہیئے خون برساتی فضا میں ہندوؤں کے نعرے سنائی دیتے تھے — "بھارت ماتا کی جے.... بھارت میں مسلمان نہیں رہے گا۔"

اِن یادوں سے خون ٹپک رہا تھا اور طاہرہ کا خون کھَول رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ یہ تو آٹھ نو سال پہلے کی باتیں ہیں، ابھی ایک ہی روز پہلے کے اخبار میں اُس نے خبر پڑھی تھی کہ ہندوستان میں تین جگہوں پر ہندوؤں نے نہ جانے کیا بہانہ ڈھونڈ نکالا اور بہت سے مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔

طاہرہ کو اس سوال کا جواب کہ ہندو مسلمانوں کے دشمن کیوں ہیں، عرصہ گزرا ہندوؤں نے خود ہی دے دیا تھا مگر اس سوال کا جواب اُسے نہیں مِل رہا تھا کہ پاکستانی مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں میں کیوں کھیل رہے ہیں۔

☆

طاہرہ کو برآمدے میں چھوٹے چھوٹے قدموں کے دوڑنے کی آہٹ سنائی دینے لگی جو بلند ہوتے ہوتے اُس کے کمرے میں آگئی۔ طاہر پرویز تھا۔ دوڑتا آیا اور طاہرہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"امّی جان!" — اُس نے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا — "کُتّا بلّی کا ہندو ہوتا ہے؟"

طاہرہ کی ہنسی نکل گئی۔

"باہر بلّی بیٹھی ہوئی تھی نا امّی جان!" — طاہر پرویز نے کہا — "ایک کُتّا گیٹ کے اندر آگیا۔ اُس نے بلّی کو دیکھا تو اسے پکڑنے کے لیے دوڑا آیا۔ بلّی درخت پر چڑھ گئی۔ کتا درخت کے نیچے کھڑا اُوپر دیکھتا اور غراتا رہا۔ میں نے اُسے پتھر مارا تو وہ بھاگ گیا.... کتا بلّی کا ہندو ہوتا ہے نا؟"

"ہاں طاہری!" — طاہرہ نے اُسے سینے سے لگا کر کہا — "کُتّا ہندو ہوتا ہے لیکن مسلمان بلّی نہیں طاہری! مسلمان شیر ہوتا ہے۔"

"وہ شیر جو چڑیا گھر میں دیکھا تھا" — بچّے نے خوشی سے کہا۔

"نہ طاہری!" — طاہرہ نے کہا — "پنجرے والا شیر نہیں۔ اس شیر نے پنجرہ توڑ لیا ہے۔ اب آزاد ہے۔"

ارشد نے طاہر پرویز کو اُس روز سے پاکستان کی حمیّت اور حریّت کے سبق دینے شروع کر دیئے تھے جس روز بچہ توتلی زبان میں بولنے لگا تھا۔ اب تو اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ پاکستان کیوں اور کیسے بنا تھا اور پاکستان کا دشمن کون ہے۔ وہ ہندو اور دشمن کو ایک چیز سمجھتا تھا، اسی لیے وہ کُتّے کو بلّی کا ہندو کہتا تھا۔

طاہر پرویز پھر باہر کو دوڑ پڑا۔ طاہرہ نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ بچہ لان میں ایک درخت کے نیچے کھڑا بلّی کو دیکھ رہا تھا جو کُتّے کے ڈر سے ابھی درخت سے اُتری نہیں تھی۔ طاہرہ کی نظریں بچے پر جم گئیں۔ بچہ بڑا ہونے لگا اور وہ اُن دو نوجوانوں جتنا بڑا ہو گیا جنہوں نے طاہرہ کو ریلوے سٹیشن کے پُل پر اکیلے دیکھ کر بیہودہ بکواس کی تھی۔ ان میں سے ایک کے مُنہ پر طاہرہ نے اتنی زور سے تھپڑ مارا تھا کہ وہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہُوا پلیٹ فارم پر جا پڑا تھا۔

"نہیں نہیں" — طاہرہ تڑپ اٹھی — "طاہری ایسا نہیں ہوسکتا۔ پاکستان کا کوئی بچہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ پاکستان کی مائیں اُن بچوں کو نہیں بھول سکتیں جو سرحد پار کٹ گئے تھے۔ انہوں نے جو بچے یہاں آکر جنے ہیں انہیں ضرور بتاتی ہوں گی کہ انہیں اپنے بھائیوں کا اور اپنی بہنوں کے خون کا حساب چکانا ہے۔"

پاکستان کی مائیں بھی یہی کچھ سوچ رہی تھیں۔ وہ اپنے شہید بچوں کو نہیں بھُولی تھیں۔ ان کا بھی خون طاہرہ کی طرح کھولتا ابلتا رہتا تھا مگر پاکستان اُن کے ہاتھ آگیا تھا جو شریکِ سفر نہ تھے۔ انہوں نے سیاسی پارٹیاں بنالی تھیں اور قیادت اور حکومت کے حق پر اُنہوں نے اپنی اپنی مہریں لگالی تھیں۔ قوم کے جذبات اور ارادے چھوٹی چھوٹی تنظیموں اور تحریکوں کی صورت میں کسی نہ کسی گوشے سے اٹھتے رہتے اور دب جاتے یا دبا دیتے جاتے تھے۔

ملک میں انٹیلی جنس کا محکمہ بھی تھا جو حکمرانوں کو بتاتا رہتا تھا کہ قوم کی جذباتی کیفیت کیا ہے اور قوم کیا سوچ رہی ہے۔ حکمرانوں کے پاس اس کا بڑا اچھا علاج تھا — مہنگائی اور جرائم — قوم کو مویشیوں کا ریوڑ بنا دو۔ دن دہاڑے ڈاکہ زنی کی وارداتیں کراؤ۔ ہوش نہ آنے دو۔ قوم کے ہوش اور جذبات فاقوں سے مار دو۔

اور طاہرہ سوچوں میں ڈوبی جا رہی تھی۔

"کن سوچوں میں کھوئی ہوئی ہو طاہرہ!"

طاہرہ نے چونک کے دیکھا۔ ارشد کی بھابی اُس کے پاس آبیٹھی تھی۔

"امّی کہہ رہی ہیں کہ اپنے لیے کپڑے اور زیورات خود ہی پسند کرلو" — بھابی نے کہا — "اور طاہرہ! اب اور زیادہ انتظار نہ کراؤ۔ شادی جلدی ہو جانی چاہیئے۔"

"جلدی ہو جائے گی آپا!" — طاہرہ نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا — "لیکن ہوگی راولپنڈی.... میں نے آپ سے کہا تھا کہ شادی بالکل سادگی سے ہوگی۔ آپ کپڑوں اور زیورات کے جھنجھٹ میں نہ پڑیں۔ عفّت مرحومہ کے زیورات جو ہیں۔"

"نہ طاہرہ!" — بھابی نے کہا — "امّی کے سامنے ان زیورات کا نام نہ لینا۔ اپنی مری ہوئی بہو کی

کوئی چیز تمہیں نہیں پہننے دیں گی۔ تمہارے لیے نئے زیورات بنیں گے۔ پسند تمہاری ہوگی۔"

گھر میں ارشد اور طاہرہ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سارے گھر میں خوشیاں تھیں مگر ارشد دشمن کے ایجنٹوں کے خلاف لڑنے کے لیے ایک زمین دوز گروہ میں شامل ہو گیا تھا اور طاہرہ کے ذہن اور اعصاب پر پاکستان کی سلامتی اور پاکستان کے دشمن سوار ہو گئے تھے۔

☆

عبدالقدیر صوبائی اسمبلی کے ممبر چوہدری اکرم کی کوٹھی میں بیٹھا اُسے سنا رہا تھا کہ عبدالجلیل خان ایک خفیہ گروہ بنا رہا ہے اور اس کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔

"اتفاق سے اُس سے ملاقات ہو گئی اور وہ مجھے اپنے گھر لے گیا" — عبدالقدیر نے عبدالجلیل کا تمام تر خفیہ پروگرام سنا کر کہا — "میں چونکہ اُس کی فطرت سے واقف ہوں اس لیے میں نے اپنے آپ کو پاکستان کی آن پر مر مٹنے والا جانباز ثابت کر دیا، اور اُس نے مجھے اپنے گروہ کے عزائم بتا دیئے ہیں نسیمہ کو بتا آیا ہوں کہ وہ اکیلی باہر نہ نکلا کرے۔ عقیلہ کے پاس نہیں جا سکا۔"

"تم نے کمال کر دکھایا ہے قدیر!" — چوہدری اکرم نے کہا — "لو، اس خوشی میں دو گھونٹ پی لو اور مہراللہ بخش کے گھر چلتے ہیں۔ ان سے بات کرتے ہیں کہ اس عبدالجلیل کا کیا کریں گے۔"

عبدالقدیر نے دو کی بجائے چار گھونٹ وہسکی پی۔ چوہدری اکرم کے ساتھ کار میں بیٹھا اور دونوں مرکزی اسمبلی کے ممبر اللہ بخش کے گھر جا پہنچے۔ عبدالقدیر کو ساری رپورٹ ایک بار پھر دہرانی پڑی۔

"ارے کہاں کا سچا پاکستانی ہے" — مہراللہ بخش نے کہا — "اسے ہم ڈی۔ ایس۔ پی بنوا دیتے تو ہماری جوتیوں میں بیٹھا رہتا۔ ہم نے اسے سروس سے نکلوایا ہے۔ وہ ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے۔"

"میں پولیس میں رہا ہوں مہر صاحب!" — عبدالقدیر نے کہا — "جو میری نظر دیکھ سکتی ہے وہ آپ نہیں دیکھ سکتے۔ اگر آپ اور عبدالجلیل کسی جلسے میں تقریر کریں تو لوگ عبدالجلیل کے ساتھ ہوں گے۔ میں آپ کو صحیح رپورٹ دیتا ہوں۔ لوگ بھوک برداشت کر لیں گے، ہندو کی دوستی کو قبول نہیں کریں گے۔ عبدالجلیل کو آپ معمولی آدمی نہ سمجھیں۔"

"بھائی میرے!" — مہراللہ بخش نے کہا — "سیدھے طریقے سے نہ مانا تو ایسا انتظام کر دوں گا کہ اُس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔۔۔۔ اس کے ساتھ اور کون ہے؟"

"میں نے تو ابھی تین چار مغز پھرے دیکھے ہیں" — عبدالقدیر نے کہا — "ایک جوان کچھ حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا امرتسر میں کمشنر کے دفتر میں ایک سپرنٹنڈنٹ ہوا کرتا تھا، چوہدری اشفاق احمد۔"

"ہاں ہاں" — چوہدری اکرم نے کہا — "جلال آباد والا۔ پچھلے سال بڑے اچھے عہدے سے ریٹائر ہوا ہے۔"

"میں اس کے بیٹے ارشد کی بات کر رہا ہوں" — عبدالقدیر نے کہا — "سنا ہے جلال آباد میں اس نے مسلم لیگ کا بہت کام کیا ہے۔ بڑا جوشیلا اور عقل مند جوان ہے۔"

"سنبھال لیں گے" — مہراللہ بخش نے کہا — "تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ معمولی معمولی آدمی ہمارا مقابلہ کر سکیں گے؟ ان لوگوں کی اس قسم کی تقریروں نے ہمارا کیا بگاڑ لیا ہے کہ پاکستان کے جو مخالف تھے وہ پاکستان میں آ کر وزیر اور لیڈر بن گئے ہیں۔ لیڈری تو ہماری ہی رہے گی، پاکستان رہے نہ رہے۔"

"مہر صاحب!" — عبدالقدیر نے کہا — "اِن باتوں کو چھوڑیئے۔ میں آپ کو حقیقت بتا رہا ہوں کہ کیا ہے اس قوم کو کوئی جگانے والا مل گیا تو آپ نہیں رہیں گے، پاکستان رہے گا۔ اصل طاقت تو یہ لوگ ہیں جنہیں آپ اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ محمد علی جناح صرف ایک آدمی تھا۔ پاکستان کروڑوں آدمیوں نے مل کے بنایا ہے۔ ان کروڑوں آدمیوں نے پاکستان کی جو قیمت دی ہے وہ آپ جانتے ہیں۔ یہ لوگ اتنی جلدی بھول نہیں سکتے۔"

"بھول جائیں گے" — مہراللہ بخش نے کہا — "تم جانتے ہو حکومت ہماری ہے۔ وزیر ہماری پارٹی کے ہیں۔ تم چھوٹے تھانیدار رہے ہو۔ جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے۔ چونکہ تم اپنے آدمی ہو، اس لیے تمہیں بتا رہا ہوں کہ ان کروڑوں آدمیوں کو ہم اُس ٹھکانے پر لا رہے ہیں جس پر ہندوستان کی ریاستوں میں مہاراجوں نے اپنی رعایا کو رکھا ہوا ہے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو عبدالقدیر، کہ لوگوں کے مسئلوں کا ہم کوئی علاج نہیں کر سکتے؟" — چوہدری اکرم نے کہا — "کیا ہماری حکومت منڈی پر کنٹرول نہیں کر سکتی؟ کیا ہم شہر سے بارش کے پانی کے نکاس کا انتظام نہیں کر سکتے؟ کیا ہم رشوت بند نہیں کر سکتے؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم پولیس کو لگام نہیں ڈال سکتے؟۔۔۔۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم جھگیوں میں رہنے والوں کو بڑے اچھے فلیٹوں میں رکھ سکتے ہیں۔ ہم چور اچکوں اور غنڈہ گردی کرنے والوں کو ایک دن میں سیدھے راستے پر لا سکتے ہیں۔ خلفائے راشدین کا طرزِ حکومت یہاں بھی چلایا جا سکتا ہے مگر حکومت نہیں چلا تے گی۔ ہمارا دشمن ہندوستان نہیں، اپنی سیاسی پارٹیاں ہماری دشمن ہیں۔ اگر لوگ مطمئن اور خوشحال ہو گئے تو ہماری تقریریں کون سنے گا؟"

"تم بچے تو نہیں ہو عبدالقدیر!" — مہراللہ بخش نے کہا — "کیا وہ باتیں ہماری زبان سے کہلانا چاہتے ہو جو تم جانتے ہو؟ اگر تم پولیس میں رہتے تو اب زیادہ سے زیادہ سب انسپکٹر ہوتے۔ اب حساب کرو تم کیا کما رہے ہو۔ تمہارے آئی جی کی اتنی آمدنی نہیں جو تم کما رہے ہو۔ ولایتی وہسکی الگ اور نسیمہ جیسی لڑکی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ کیا پاکستان تمہیں اتنی عیش کرا سکتا ہے؟ اب تم نے بہت بڑا کارنامہ کر دکھایا ہے کہ ایک خطرناک گروہ کا سراغ لگایا ہے۔ اس کا تمہیں انعام ملے گا۔ ان لوگوں پر نظر رکھو۔ اگر کسی چھوٹے آدمی کو قتل کرنا ضروری ہو تو خود کر دو یا کرا دو اور ہمیں بتا دینا۔ کوئی بڑا آدمی سامنے آئے تو ہمیں بتانا۔ ہم اُسے سیکورٹی ایکٹ میں گرفتار کرا کے جیل میں بٹھا دیں گے۔ کہیں گے کہ شرپسند ہے، تخریب کار ہے، انڈیا کا جاسوس ہے۔ تم جانتے ہو کہ سیکورٹی ایکٹ میں پکڑے ہوئے آدمی کا کیس عدالت میں جایا ہی نہیں کرتا۔"

"مجھے عبدالجلیل کے گروہ کے باقی آدمیوں کا سراغ لگا لینے دیں" — عبدالقدیر نے کہا اور پوچھا — "مہر صاحب! آپ کا وزیر بننے کا چانس نہیں ہے؟"

"بالکل ہے" — مہراللہ بخش نے کہا — "اسی لیے تو سارا جھنجھٹ کر رہا ہوں" — اُس نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا — "چند ایک محبِ وطن گرفتار کرا دو تو وزارت اپنی ہے۔"

"وہ تو کرا دیتے" — عبدالقدیر نے کہا — "میری ایک ضرورت پوری کر دیں۔۔۔۔ مجھے صرف ایک مکان الاٹ ہوا تھا۔ وہ محلے میں ہے۔ ہر وقت لوگوں کی نظر میں رہتا ہوں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ میرا کاروبار یا ملازمت کیا ہے۔ یہ خطرہ ہے۔ نسیمہ اور عقیلہ کے علاقے میں ایک کنال زمین دلا دیں اور کوٹھی بنانے کے لیے قرضہ دلا دیں۔ کوٹھیوں کی آبادی میں پڑوسی کو پڑوسی کی خبر نہیں ہوتی۔ ہر کوئی اپنے آپ کو [illegible] لیکن

سمجھتا ہے۔ وہاں بُری سے بُری اور بہت ہی خطرناک حرکتیں بھی چھپائی جا سکتی ہیں۔"

"تم جگہ دیکھو" ــــ مہراللہ بخش نے کہا ــــ "کوٹھی بن جاتے گی۔"

☆

عبدالقدیر عبدالجلیل کے ہاں گیا اور اُسے بتایا کہ وہ اب پاکستان میں ہندوستانی تخریب کاروں کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اُس کا خون کھَول رہا ہے۔ اب اس کے سامنے جو آتے گا اُسے وہ قتل کر دے گا۔ عبدالجلیل نے اُسے کہا کہ وہ اتنا جذباتی ہو کر نہ سوچے زمین دوز کارروائیوں کی پلاننگ بڑے تحمل سے اور جذبات پر قابو پا کر کی جاتی ہے۔

"خان صاحب!" ــــ عبدالقدیر نے بے تاب ہو کر کہا ــــ "معلوم ہوتا ہے آپ ذہنی عیاشی کر رہے ہیں۔ آپ کچھ آدمی اکٹھے کر کے ان کے کمانڈر بننا چاہتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ آپ کے پاس کوئی ٹھوس پلان نہیں۔"

عبدالقدیر نے ایسے جذباتی لہجے میں اپنے شکوک کا اور بے تابی کا اظہار کیا کہ عبدالجلیل خان جیسا چالاک، ہوشیار اور تجربہ کار آدمی بھڑک اُٹھا اور اُس نے اپنا سارا پلان عبدالقدیر کو بتا دیا۔ اُس نے چند اور آدمیوں کے نام بھی بتا دیتے جو اُس کے گروہ میں شامل ہو چکے تھے یا ہونے والے تھے۔

"خان صاحب!" ــــ عبدالقدیر نے کہا ــــ "آپ شاید خواب دیکھ رہے ہیں۔ آپ کا یہ پلان ایک افسانہ ہے۔ آپ سے مجھے اس معاملے میں اتفاق ہے کہ آپ پاکستان کو تقریروں، اخباری بیانوں اور جلوسوں کے ذریعے نہیں بچا سکتے۔ آپ کو دہشت گردی کرنی پڑے گی یعنی یہ ٹیررسٹ موومنٹ ہو گی۔ اس کے بغیر آپ ان لوگوں کے چنگل سے پاکستان کو چھڑا نہیں سکتے جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک نظریۂ پاکستان کے منکر اور ہندو کے دوست تھے لیکن یہاں آکر وہی پاکستان کے حاکم اور آقا بن گئے ہیں۔ آپ کا طریقۂ کار اغوا اور قتل ہو گا یا سرکاری افراد کو یرغمالی بنا کر آپ اپنے مطالبات اور صحیح نظریات منوائیں گے مگر آپ نے یہ نہیں سوچا کہ جن بالو لوگوں کو اور کالجوں کے لڑکوں کو آپ نے اپنے ساتھ ملایا ہے، کیا یہ اغوا اور قتل جیسی وارداتیں کر سکیں گے؟.... نہیں کر سکیں گے خان صاحب!"

"او بیوقوف قدیرے!" ــــ عبدالجلیل خان نے کہا ــــ "کہاں پولیس کی نوکری کرتے رہے ہو۔ اس وقت لاہور کے زیادہ نہیں تو ڈیڑھ سو غنڈے، بدمعاش اور جرائم پیشہ میرے ایک اشارے پر جانیں قربان کرنے کو آجائیں گے۔"

"کون ہیں وہ؟"

"وہی جو سیاسی پارٹیوں کا کام کرتے ہیں" ــــ عبدالجلیل نے کہا ــــ "یہ اُن کا ذریعہ معاش ہے۔ اُن کا ایمان میرے ہاتھ میں ہے.... اور یہ غریب اور فاقہ کش لوگ جو گلیوں، محلّوں اور احاطوں میں رہتے ہیں ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ پاکستان انہی لوگوں کی قربانیوں کا حاصل ہے۔ میں نے جن ڈیڑھ سو غنڈوں کا ذکر کیا ہے انہیں سیاسی لیڈروں نے غنڈے بنایا ہے۔ تم میرے پاس ایک ایسا جرائم پیشہ آدمی لے آؤ جس کے متعلق تمہارا خیال ہو کہ یہ پتھر ہے اور اسے احساس ہی نہیں کہ پاکستان کی اہمیت کیا ہے اور وطن کیا ہوتا ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہیں اس آدمی میں سے ایک ایسا انسان نکال کے

دکھاؤں گا جس کے سامنے تم مذاق میں کہو گے 'پاکستان مردہ باد' تو دوسرے منٹ یہاں تمہارا مُردہ پڑا ہوا ہو گا....

"اور کالج کے جن لڑکوں کے متعلق تم نے کہا ہے کہ وہ اغوا اور قتل جیسی وارداتیں نہیں کر سکیں گے، وہ ایسے کام کر دکھائیں گے کہ اپنے دشمن کو حیران کر دیں گے یہی تو پاکستان کی قوت ہے ان لڑکوں اور لڑکیوں کو تم نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے نہیں دیکھا تھا؟"

عبدالقدیر کی مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی جسے عبدالجلیل مسرّت کی مسکراہٹ سمجھ رہا تھا مگر وہ جان نہ سکا کہ یہ مسکراہٹ ہے تو مسرت کی لیکن اس کے پیچھے نیّت کچھ اور ہے۔

"تم کامے کو صرف تانگہ بان سمجھتے ہو گے" ــــ عبدالجلیل نے کہا ــــ "وقت آیا تو دیکھنا یہ شخص مرا دایاں بازو ہے۔ اس کے سامنے کبھی کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھنا۔"

"اور ارشد کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"رائے تو اچھی ہے" ــــ عبدالجلیل نے کہا ــــ "لیکن اسے میں ابھی پُوری طرح اعتماد میں نہیں لے رہا۔ وہ ہے تو پکّا پاکستانی۔ پاکستان اس سے جو قربانی مانگے گا وہ دے گا لیکن اُس کا باپ ریٹائرڈ آفیسر ہے اور اُس کا بڑا بھائی سیکرٹریٹ میں بڑی اچھی پوزیشن پر لگا ہُوا ہے۔ خود ارشد سرکاری ملازم ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اُس کا باپ اپنی پنشن کے تحفظ کے لیے اور اس کا بڑا بھائی اپنی نوکری کی خاطر اُسے میرے گروہ میں نہیں ٹھہرنے دیں گے۔ ہو سکتا ہے کسی وقت ارشد کو ہی اپنی ملازمت اور ترقی کا خیال آجاتے۔ اسے میں ابھی آزما رہا ہُوں۔ اسی لیے اسے یہ پلان نہیں بتایا جو تمہیں بتا دیا ہے۔ تم پر تو میں شک نہیں کر سکتا قدیر! تم ہندوستان سے زخم کھا کر آتے ہو۔ تم پاکستان کی قیمت دینے والوں میں سے ہو۔"

"مجھ سے پاکستان اور قیمت مانگے گا تو اور دوں گا" ــــ عبدالقدیر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ــــ "مجھے اپنا بازو سمجھیں خان صاحب!"

☆

عبدالقدیر حریّت پسندوں کے گروہ کا بھیدی بن گیا۔ یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اسے اس گروہ کے متعلق ابھی کچھ اور بھی معلوم کرنا تھا۔

اُدھر کامے نے ان دونوں ہندو لڑکیوں جو نسیمہ اور عقیلہ کے فرضی ناموں سے جانی پہچانی جاتی تھیں، کی کوٹھیوں پر نظر رکھی ہُوئی تھی۔ عبدالجلیل نے اُسے کچھ ہدایات دے رکھی تھیں۔ ان کے مطابق وہ جاسُوسی کر رہا تھا۔ عبدالجلیل نے اُسے عبدالقدیر کے متعلق یقین دلا دیا تھا کہ وہ گروہ کا قابلِ اعتماد اور بڑے کام کا آدمی ہے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کامے نے تانگہ شام کو جوتا تھا۔ اس کا تانگہ خوشنما اور گھوڑا بڑی اچھی نسل کا تھا۔ اُس دَور میں مال روڈ پر بھی تانگے چلا کرتے تھے۔ روپے پیسے والی سواریاں مِل جاتی تھیں سیر سپاٹا اور عیش و عشرت کرنے والے شام کو نکلا کرتے تھے اور خوشنما تانگے شام کو ہی دیکھنے میں آتے تھے۔ لاہور کے ان تانگوں میں کامے کا تانگہ بھی تھا۔

اُس رات گیارہ بجے وہ کوٹھیوں کی اُس آبادی میں چلا گیا جہاں دیہات کے جاگیرداروں اور امیر کبیر زمینداروں نے بھی محلوں جیسی کوٹھیاں بنالی تھیں۔ یہاں وہ عیاشی کرنے اور وزیروں کی دعوتیں کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ابھی بہت سا علاقہ خالی تھا۔ پلاٹ بک رہے تھے اور کوٹھیاں بن رہی تھیں۔

کاما جب نسیمہ کی کوٹھی کے قریب پہنچا تو اُس نے باہر ایک تانگہ کھڑا دیکھا۔ بڑا خوبصورت تانگہ تھا۔ کامے کو اس کوٹھی سے ذرا دور تانگہ روکنا اور کچھ دیر دیکھتے رہنا تھا کہ کوٹھی میں کون آتا جاتا ہے۔ اُس نے جب وہاں تانگہ کھڑا دیکھا تو تانگے والے کو پہچان لیا اور کوٹھی کو قریب سے دیکھنے کے لیے تانگہ اُس تانگے کے ساتھ جا روکا اور تانگے والے سے گپ شپ لگانے لگا۔ اُس تانگے والے نے اُسے بتایا کہ وہ ایک آدمی کو لایا ہے اور اُس نے تانگہ روکے رکھنے کو کہا ہے۔

کاما جاسوسی کے لیے وہاں رکا تھا۔ اس نے سگریٹ نکالا۔ اس میں سے تھوڑا سا تمباکو اپنی ہتھیلی پر انڈیل کر جیب سے چرس کی گولی نکالی۔ اسے تمباکو میں ملا کر تمباکو سگریٹ میں ڈال کر سلگایا اور ایک کش لگا کر تانگے والے کو سگریٹ دے دیا۔ چرسیوں کی ملاقات ہوتی ہے تو محبت اور پیار کا اظہار ایک دوسرے کو چرس کا کش لگا کر کرتے ہیں۔

"جہانے یار!"— کامے نے اُس سے پوچھا —"اس کوٹھی میں کون رہتا ہے؟"

"معاملہ گڑبڑ ہے"— جہانے نے جواب دیا —"بڑی خوبصورت عورت رہتی ہے یہاں۔ میرا خیال ہے چلتی ہے۔"

"اونچا مال ہوگا۔"

"اونچا ہی لگتا ہے"— جہانے نے کہا —"یہ سواری جو اندر گئی ہے، کوئی روپے پیسے والا آدمی ہے۔ پچھلے تین مہینوں میں اسے کوئی آٹھ بار لا چکا ہوں۔ رہتا تو سنت نگر کے ایک محلّے میں ہے لیکن یاری کوٹھیوں میں لگا رکھی ہے۔ کبھی اس نے کرایہ نہیں چکایا۔ تم جانتے ہو میں سنت نگر کے علاقے میں ہوتا ہوں۔ صرف دو تانگے امیر سواری کے قابل ہیں۔ ایک میرا ہے۔ اس لیے میں وہاں ہوں تو یہ میرے ہی تانگے پر آتا ہے۔"

کامے نے گپ شپ کے انداز میں جہانے سے کچھ اور باتیں معلوم کرلیں۔ اتنے میں وہ آدمی کوٹھی سے نکلا۔ بڑے گیٹ پر دو بتیاں جل رہی تھیں۔ وہ آدمی ان بتیوں کی روشنی میں آیا تو کاما دوڑ کر آگے ہوگیا۔

"آپ ہیں؟"— کامے نے اُس سے رازداری سے پوچھا۔

"اوہ، تم .... سنا کامے! کیا حال ہے؟"

وہ عبدالقدیر تھا۔ اُس نے پتلون اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اوورکوٹ تھا۔ فلیٹ ہیٹ ابھی اُس کے ہاتھ میں تھا۔ کاما اس طرح اچانک اُس کے سامنے چلا گیا تھا کہ اُسے اپنا چہرہ چھپانے کے لیے اوورکوٹ کے بڑے بڑے کالر اُوپر کرنے اور ہیٹ سر پر رکھ کر آنکھوں پر کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔

"میں نے آپ کو اُستاد مان لیا ہے"— کامے نے کہا —"خان صاحب کہتے تھے کہ بھائی عبدالقدیر اتنے ہوشیار ہیں کہ ان لڑکیوں کی کوٹھیوں تک رسائی حاصل کرلیں گے۔ آپ نے بھیس خوب بدلا ہے۔"

"اچھا تم چلو کامے!"— عبدالقدیر نے کہا —"میرا تانگہ کھڑا ہے۔"

"آپ اسے پیسے دے دیں"— کامے نے کہا —"آپ کو گھر تک میں لے چلوں گا۔ اپنا تانگہ ہے تو پیسے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

تھوڑے سے بحث مباحثے کے بعد کاما جیت گیا۔ عبدالقدیر نے جہانے کو پیسے دیئے اور کامے کے تانگے کی پچھلی سیٹ پر سوار ہوگیا۔ عبدالقدیر نے فلیٹ ہیٹ سر پر رکھ کر آگے سے نیچے کرلیا اور اوورکوٹ کے کالر اوپر کرلیے۔ کامے نے اُسے دیکھا تو اُسے شک سا ہوا۔ تین راتیں پہلے اُس نے ایسی ہی ایک سواری جو اسی کوٹھی سے نکلی تھی، اپنے تانگے میں بٹھائی تھی اور اُسے سنت نگر اتارا تھا — کیا وہ عبدالقدیر ہی تھا؟

"کیا آپ پہلے بھی اس کوٹھی میں آتے ہیں کبھی؟"— کامے نے پوچھا۔

"نہ کامے!"— عبدالقدیر نے جواب دیا —"میرا یہاں کیا کام تھا پہلے۔ آج پہلی بار آیا ہوں۔"

کاما دیکھ چکا تھا کہ عبدالقدیر کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ اُس کے اپنے پھیپھڑوں اور نتھنوں میں چرس بھری ہوئی تھی لیکن اُس نے عبدالقدیر کی سانسوں میں شراب کی بو سونگھ لی تھی۔ اُسے دوسرے تانگے والے نے بتایا تھا کہ اِس سواری کو گذشتہ تین مہینوں میں کوئی آٹھ مرتبہ یہاں لا چکا ہے۔ اگر آٹھ مرتبہ وہ لا چکا ہے تو کئی مرتبہ وہ کسی دوسرے تانگے میں آیا ہوگا۔ تین رات پہلے تو کاما اُسے یہاں سے لے گیا تھا اور وہ سنت نگر اُترا تھا۔

"آپ نے شراب بھی شاید پہلی بار پی ہے"— کامے نے کہا۔

عبدالقدیر نے شراب کے نشے میں جھومتا ہوا قہقہہ لگایا اور کہا —"جسے اپنے جال میں پھانسنا ہوتا ہے، اُس کی ناروا بات بھی ماننی پڑتی ہے۔"

سفر لمبا تھا۔ کاما عبدالقدیر سے باتیں پوچھنے کے لیے گھوڑے کو تیز نہیں چلنے دے رہا تھا۔

"دو تین راتیں پہلے بھی آپ یہاں آئے تھے"— کامے نے کہا —"میں آپ کو یہاں سے سنت نگر لے گیا تھا۔ اِس سے پہلے بھی آپ یہاں آتے رہے ہیں۔"

"کیا بکواس کررہے ہو کامے!"— عبدالقدیر نے ایسے غصّے سے کہا جس میں دوستانہ بے تکلفی تھی —"کیا تم مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہو؟"

عبدالقدیر شراب کے نشے میں تھا اور کامے نے چرس پی رکھی تھی۔ رات کی ٹھنڈی ہوا لگی تو دونوں کا نشہ تیز ہوگیا۔

"مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ آپ مجھے اپنا دوست نہیں سمجھ رہے"— کامے نے کہا —"میں اگر اپنی جان قربان کردوں تو بھی آپ کہیں گے کہ چلو کیا ہوا، تانگے والا تھا، مرگیا تو کیا قیامت آگئی۔ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں۔ خان صاحب کو آپ سب کچھ بتا دیں گے۔"

عبدالقدیر نے پھر بھی اُسے کہا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا اور وہ پہلی بار اس کوٹھی میں آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نشے میں کہہ دیا کہ وہ اگر جھوٹ بول رہا ہے تو عبدالجلیل سے بھی وہ جھوٹ ہی بولے گا۔ وہ اُس کا گورنر نہیں لگا ہوا۔

"تم شاید اُسے ابھی تک تھانیدار سمجھ رہے ہو"— عبدالقدیر نے کہا —"میں اُسے کیا سمجھتا ہوں!"

یہاں سے بات کا رنگ ہی بدل گیا۔ کامے کو ایک شک ہو چکا تھا جو پکا ہوتا چلا گیا۔ اُس نے جاسوسوں والی چال چلی اور ہنس پڑا۔ کہنے لگا —"جناب! آپ سو دفعہ آئیں، ایک بار بھی نہ آئیں۔ مجھے کیا۔ سچی بات ہے، ہم چور اُچکے اور بدمعاش ہیں۔ وہاں بھی یہی کچھ کرتے رہے۔ یہاں بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔ خان صاحب وہاں بھی مدد کرتے رہے، یہاں بھی مدد کرتے رہے، اور میں اُن کے لیے مخبری کرتا رہا۔ بڑے نامی گرامی چور پکڑواتے ہیں۔ اگر آپ کہیں مخبری کرانا

چاہتے ہیں یا کوئی اور کام کرانا چاہتے ہیں جو کوئی شریف آدمی نہیں کر سکتا تو کاما حاضر ہے۔ اس کوٹھی کا کوئی کام ہو تو بتائیں۔"

"تانگہ روکو کامے!" ــــ عبدالقدیر نے کہا۔

کامے نے تانگہ روک لیا۔ ساتھ میاں میر نہر تھی۔ اُس دور میں یہ علاقہ رات کے وقت سنسان ہو جاتا تھا۔ اس کے اردگرد آبادی نہیں تھی۔

"عبدالجلیل خان کا ساتھ چھوڑ دو" ــــ عبدالقدیر نے کہا ــــ "اور میرے ساتھ ماہوار مقرر کر لو"

"کام کیا ہے؟"

"لعنت بھیجو کام پر" ــــ عبدالقدیر نے کہا ــــ "فائدے میں رہو گے ورنہ کوئی جرم کیے بغیر اندر ہو جاؤ گے۔ عیش کرنی ہے تو میرے ساتھ رہو۔"

"سمگلنگ کے لیے؟" ــــ کامے نے طنزیہ پوچھا ــــ "پاکستان کی جاسوسی کے لیے؟ پاکستان کی جڑیں کاٹنے کے لیے؟"

"اپنی حیثیت پہچان کامے!" ــــ عبدالقدیر نے کہا ــــ "تو چور رہا ہے میں تھانیدار رہا ہوں۔"

"مجھ جیسے چور اور تم جیسے تھانیدار میں کوئی فرق نہیں میرے دوست!" ــــ کامے نے اُسے آپ کی بجائے 'تم' کہہ کر اپنی سطح پر گھسیٹ لیا ــــ "تم ہمیں دھوکہ دے رہے ہو۔"

"ہاں! میں تمھیں دھوکہ دے رہا ہوں" ــــ عبدالقدیر نے اوور کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ نالی کامے کی طرف کر کے بولا ــــ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اپنے خان صاحب کو میری رپورٹ دینے کے لیے زندہ رہو گے؟ صبح تک یہ نہر تمھاری لاش اگلے دریا تک پہنچا دے گی اور تمھارا تانگہ اسی گھوڑی کے ساتھ اسی شہر میں چلتا رہے گا۔ کوئی یہ بھی نہیں دیکھے گا کہ کوئی تانگے والا مرا ہے یا کوئی کتا مر گیا ہے۔"

کامے پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اُسے اب یقین ہو گیا کہ عبدالقدیر ہندوستانی جاسوسوں کا ساتھی ہے لیکن اُس کے پاس ریوالور تھا جس کی نالی اُس کے پیٹ سے ایک ہی ہاتھ دُور تھی۔ عبدالقدیر نشے میں تھا۔ اُس کی عقل اُس کے قابو میں نہیں تھی۔ ٹریگر دبانے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔

"ایک غریب کو قتل کر کے آپ کو کیا ملے گا!" ــــ کامے نے ڈری ہوئی آواز میں کہا ــــ "مجھے حکم دیں دل و جان سے غلامی کروں گا۔"

"تم جیسے پاکستانیوں کو میں ایک ایک کر کے ختم کر دوں گا" ــــ عبدالقدیر نے کہا۔

وہاں اندھیرا تھا۔ رات آدھی گزر گئی تھی۔ لمحے تیزی سے گزر رہے تھے۔ کاما ساکن کھڑا تھا۔ عبدالقدیر بھی شاید اُسے بُت سمجھ بیٹھا تھا۔ اچانک اُس کے ریوالور والے ہاتھ کی کلائی پر کامے کا ہاتھ یوں پڑا جیسے کسی نے ہتھوڑا مارا ہو۔ ریوالور گر پڑا۔ عبدالقدیر ریوالور اُٹھانے کو جھکا تو کامے نے بڑی تیزی سے اپنے نیفے سے وہ خنجر نکالا جو وہ ہر وقت نیفے میں اُڑس کے رکھتا تھا۔ دوسرے لمحے خنجر جھکے ہوئے عبدالقدیر کے دل میں اُتر گیا۔ کاما خنجر چلانا جانتا تھا۔ اُس نے نیچے سے وار کیا تھا۔

عبدالقدیر سیدھا نہ ہو سکا۔ کامے نے اُسے گرنے نہ دیا۔ اُس کے پیچھے ہو کر اُس کی کمر میں بازو ڈالے اور اُسے دھکیلتا ہُوا نہر کے کنارے تک لے گیا۔ نہر تین چار قدم دُور تھی۔ اُس نے دھکّا دیا اور عبدالقدیر نہر میں جا پڑا۔ کامے نے ایک آدھ منٹ اُسے دیکھا۔ وہ ہاتھ پاؤں نہیں مار رہا تھا ــــ خنجر اپنا کام کر چکا تھا۔

کامے نے ریوالور اٹھایا اور تانگہ بڑی سڑک کی طرف لے گیا۔ اُس نے سگریٹ میں چرس بھری اور لمبے لمبے کش لگاتا لاہور میں کہیں غائب ہو گیا۔

صبح کامے تانگے والے نے جب عبدالجلیل خان کو اُس کے گھر جا کر بتایا کہ اُس نے عبدالقدیر کو قتل کر دیا ہے، عبدالجلیل کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور کچھ دیر کامے کے چہرے پر ٹِکٹِکی باندھے یُوں بُت بنا رہا جیسے اُس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو، یا جیسے اُسے دھوکہ ہو رہا ہو کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔

"ہاں خان صاحب! میں نے عبدالقدیر کو رات قتل کر دیا ہے" ــــ کامے نے عبدالجلیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا بلند آواز سے کہا اور جیب سے عبدالقدیر کا ریوالور نکال کر عبدالجلیل کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ــــ "یہ اُس کا ریوالور ہے جس کی نالی اُس نے رات میرے سینے کی طرف کر کے کہا تھا تم جیسے پاکستانیوں کو میں ایک ایک کر کے ختم کر دوں گا.... میں نے اُسے گولی چلانے کی مہلت نہ دی۔"

"کیوں؟" ــــ عبدالجلیل نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا ــــ "ایسی کیا دشمنی پیدا ہو گئی تھی اُس کے ساتھ؟ اُس کا مطلب کچھ اور ہو گا؟"

"وہ ہندوستان کا آدمی تھا" ــــ کامے نے کہا ــــ "وہ ہندوستان کے جاسوسوں کا ساتھی تھا۔"

عبدالجلیل گرج کر بولا ــــ "کیا بکتے ہو کامے؟ کون سے عبدالقدیر کی بات کر رہے ہو؟"

"آپ کو یقین نہیں آئے گا خان صاحب!" ــــ کامے نے کہا ــــ "اطمینان سے میری بات سنیں میں آپ کے دوست عبدالقدیر کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے اُسی عبدالقدیر کو قتل کیا ہے جو ہمارا ساتھی بنا تھا۔ وہ ہمیں دھوکہ دے رہا تھا۔"

کامے نے عبدالجلیل کو پوری تفصیل سے سنایا کہ رات کیا ہُوا تھا اور اُس نے عبدالقدیر کو کیوں اور کس طرح قتل کیا تھا۔

عبدالجلیل خان ساری داستان سُن کر بہت دیر خاموش رہا اور اُس کی نظریں کسی ایک جگہ پر جمی رہیں۔ پھر اُس نے آہ بھری اور زیرِ لب بولا ــــ "کوئی کس پر اعتبار کرے" ــــ اُس نے کامے کی طرف دیکھ کر کہا ــــ "تم نے یقین کر لیا تھا کہ وہ ہمیں دھوکہ دے رہا ہے؟ کہیں گرما گرمی میں ہی کام کے ایک آدمی کو تو نہیں مار ڈالا؟"

"شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی خان صاحب!" ــــ کامے نے کہا۔

"تمہیں کیسے یقین آگیا تھا کہ وہ مر گیا ہے؟" ــــ عبدالجلیل نے کہا ــــ "ہو سکتا ہے وہ صرف زخمی ہُوا ہو اور تمھارے آنے کے بعد نہر سے نکل آیا ہو۔"

"میں تھوڑی دیر وہاں رُکا تھا" ــــ کامے نے کہا ــــ "نہر کا پانی گہرا نہیں۔ وہ مرا نہ ہوتا تو کھڑا ہو جاتا۔ وہ پانی سے نہیں اُبھرا۔ مجھے یقین ہے کہ خنجر اُس کے دل میں لگا تھا۔"

عبدالجلیل خان بڑا عرصہ تھانیدار رہ چکا تھا۔ وہ مشرقی پنجاب کے اُن علاقوں میں تھانوں کا انچارج رہا تھا جہاں ہر روز قتل کی ایک واردات ہوتی تھی۔ اُسے قاتلوں کا سراغ لگانے کی مہارت حاصل تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ قتل ہضم کس طرح کیے جاتے ہیں۔ اُس نے کامے سے قتل کی اِس واردات کے متعلق اِس طرح باتیں پوچھیں جیسے تفتیش کر رہا ہو، پھر اُس نے کامے کو اچھی طرح بتایا کہ اُسے کیا کرنا ہے اور قتل ہضم کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ عبدالجلیل خان نے عبدالقدیر کا ریوالور اپنے پاس رکھ لیا۔

"دیکھ لیا تم نے کامے؟" ـــ عبدالجلیل نے کہا ـــ "پاکستان میں ایسے پاکستانی بھی موجود ہیں، مجھ جیسا تجربہ کار تھانیدار بھی اس کے دھوکے میں آ گیا تھا۔"

"وہ بھی تھانیدار رہ چکا تھا خان صاحب!" ـــ کامے نے کہا ـــ "میں حیران ہوں کہ لوگ اپنے ملک اپنے مذہب اور اپنی قوم کو بھی دھوکہ دینے پر آ جاتے ہیں۔"

"پیسے میں بڑی طاقت ہے کامے!" ـــ عبدالجلیل نے کہا ـــ "اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں۔ تمہیں عالم فاضل بھی ہندوؤں کی دوستی کا دم بھرتے دکھائی دیں گے۔ اپنے حکمران طبقے میں اور سیاسی لیڈروں میں تمہیں ایسے ملیں گے جو اپنے وطن کے دشمن کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ ہمیں ان غداروں اور ایمان فروشوں کو چن چن کر ختم کرنا ہے.... اور سنو کامے! کسی اور سے عبدالقدیر کے قتل کا ذکر نہ کرنا۔ ہمارے جو ساتھی بن گئے ہیں، ان میں سے کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے۔"

"لاش برآمد ہو جائے گی؟" ـــ کامے نے پوچھا۔

"ہونے دو" ـــ عبدالجلیل نے کہا ـــ "اور اس واردات کو بھول جاؤ۔ عبدالقدیر اتنی بڑی شخصیت نہیں تھی کہ پولیس اس کے قاتل کا سراغ لگاتی پھرے گی۔"

☆

ارشد کی چھٹی ختم ہو چکی تھی۔ وہ عبدالجلیل خان سے ملنے گیا۔

"میں لاہور واپس آنے کی کوشش کروں گا" ـــ ارشد نے کہا ـــ "میں آپ سے اتنی دور رہ کر کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔"

"تم بہت کچھ کر سکتے ہو ارشد!" ـــ عبدالجلیل نے کہا ـــ "پہلا کام یہ کرنا ہے کہ کسی کو اشارے سے بھی نہیں بتانا کہ ہم نے کوئی خفیہ تحریک چلائی ہے ورنہ اُڑنے سے پہلے ہی تمہارے پر کٹ جائیں گے۔ تمہارا کام یہ ہو گا کہ اپنے دوستوں کو پاکستان کی سلامتی اور بقا کے لیے تیار کرتے رہو اور اُن کے ساتھ ایسی باتیں کرتے رہو کہ وہ خود کہیں کہ ایک تحریک شروع کرنی چاہیئے.... تم عقلمند آدمی ہو ارشد! خود سوچ سکتے ہو کہ تمہارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ راز داری لازمی ہے۔"

اگلی صبح ارشد اور طاہرہ راولپنڈی پہنچ گئے۔ طاہر پرویز بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ ریلوے سٹیشن سے نجمہ کے گھر چلے گئے۔ طاہرہ کی خوشی اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی مگر تھوڑی دیر بعد نجمہ نے اس کے چہرے سے مسرت کا تاثر دھو ڈالا۔ طاہرہ نے نجمہ سے اپنے ابا جان کے متعلق پوچھا تھا کہ کیسے ہیں۔

"طاہرہ!" ـــ نجمہ نے آہ بھر کر کہا ـــ "معلوم ہوتا ہے تمہیں ایک اور مہم سر کرنی پڑے گی.... ارشد! تم بھی میری بات غور سے سُننا۔ طاہرہ! تمہارے ابا جان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ جوزی بابا رہے تو اچھے رہے۔ انہیں تم مل گئیں تو وہ جمال بیگ بن گئے۔ اب اُن کی ذات میں وہ جمال بیگ بیدار ہو گیا ہے جس کے ہاتھوں تمہاری ماں اس لیے مر گئی تھی کہ اُس نے تمہیں جنم دیا تھا مگر اب جو جمال بیگ بیدار ہوا ہے وہ تاسف اور پچھتاوے میں جل بھن رہا ہے۔"

"وہ روتے ہوں گے؟" ـــ ارشد نے پوچھا ـــ "افسوس کرتے ہوں گے؟"

"نہیں!" ـــ نجمہ نے کہا ـــ "وہ بظاہر غصّے کا اظہار کرتے ہیں کہ طاہرہ تمہارے ساتھ ان سے پوچھے بغیر لاہور چلی گئی ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ طاہرہ مجھے مجرم سمجھتی ہے اس لیے ارشد کے ساتھ چلی گئی ہے۔ وہ تین دن سکول نہیں گئے۔ میں انہیں دیکھنے چلی گئی۔ اُنہوں نے ایسی باتیں کیں کہ میں پریشان ہو گئی۔ انہوں نے یہاں تک کہا ہے کہ طاہرہ کو لکھ دو کہ تمہاری ماں کا قاتل پاگل ہو گیا ہے۔ یہاں نہ آنا۔ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔"

طاہرہ بجھ کے رہ گئی۔

"نجمہ آپا!" ـــ طاہرہ نے اداس سے لہجے میں پوچھا ـــ "آپ پھر بھی انہیں دیکھنے گئی تھیں؟ وہ سکول جاتے ہیں یا نہیں؟"

"میں کل بھی گئی تھی" ـــ نجمہ نے جواب دیا ـــ "اب سکول جاتے ہیں۔ میں نے ان کا وہم دُور کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔ پہلے سے بہتر نظر آتے ہیں۔ ان میں یہ تبدیلی پیدا ہو گئی ہے کہ اب سکول کے بچوں کے ساتھ وہ بے تابانہ پیار نہیں کرتے جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ اب تم دونوں ان کے پاس جاؤ اور ان پر باتوں سے بھی اور عملی طور پر بھی ثابت کر دو کہ تم دونوں کی زندگی میں اُن کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور ان کے بغیر تمہاری زندگی خالی خالی سی رہ جائے گی.... طاہرہ! تم میں پتھروں کو موم کرنے کی اہلیت ہے۔ تمہارے ابا جان اگر اسی کیفیت میں رہے تو وہ فی الواقع پاگل ہو جائیں گے۔ اب تم دونوں سوچ لو کہ ان کے ساتھ کیسی باتیں کرنی ہیں.... تم ارشد! ان سے مل کر اپنے گھر چلے جانا۔ طاہرہ اور طاہر پرویز کو اس کے ابا جان کے پاس رہنے دینا۔"

ارشد اور طاہرہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکے۔ اُن کے اچھے بھلے کھلے ہُوئے چہروں پر سنجیدگی اور اُداسی طاری ہو گئی تھی۔ طاہرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"سنبھال لیں گے طاہرہ!" ـــ ارشد نے کہا ـــ "گھبراؤ نہیں۔"

"مُجھے اس شخص سے نفرت ہونی چاہیئے تھی" ـــ طاہرہ نے کہا ـــ "لیکن وہ میرا باپ ہے۔ میری ماں کو تو اس نے مار ڈالا تھا لیکن میری رگوں میں اسی باپ کا خُون ہے۔ میں اس خون کا احترام کرتی ہوں۔ ابا جان دُکھی ہیں ارشد! انہوں نے میری خاطر بہت لمبی سزا بھگتی ہے۔ میں انہیں پاگل نہیں ہونے دوں گی۔ انسانوں کو پاگل انسان ہی کیا کرتے ہیں۔"

نجمہ، اُس کا خاوند اطہر اور ارشد طاہرہ کے منہ کی طرف دیکھتے رہے جیسے سوچ رہے ہوں کہ اس کا باپ پاگل ہو نہ ہو، یہ خود پاگل ہو جائے گی ـــ دوسروں کے دکھ اپنے سینے میں ڈال لینے والے لوگ نارمل نہیں ہُوا کرتے۔

☆

ارشد نے جمال بیگ کے کوارٹر کے دروازے پر دستک دی تو دروازہ جمال بیگ نے کھولا۔

"تم؟" ـــ جمال بیگ نے بے تاثر سے لہجے میں کہا ـــ "تم لوگ آ گئے؟"

ارشد اُس سے ہاتھ ملانے کی بجائے جھک گیا اور اس کے پاؤں چھُو لیے پھر اس سے مصافحہ کیا، پھر طاہرہ نے اُس کے پاؤں چھوئے، اُس کے ہاتھ چومے اور پھر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ جمال بیگ نے لپک کر طاہر پرویز کو اٹھا لیا اور سب اندر چلے گئے۔

"کیا تم لوگ مجھے اس قابل سمجھتے ہو کہ میرے پاؤں چھوؤ؟" — جمال بیگ نے پوچھا۔ اُس کے لہجے میں کچھ اور ہی طرح کی اُداسی تھی۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے ابّا جان؟" — طاہرہ نے کہا — "کیا اپنی کھوئی ہوئی بیٹی کو پا کر آپ خوش نہیں ہیں؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ میں خوش یا کیا ہوں" — جمال بیگ نے ایسے انداز سے کہا جیسے وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے مگر اُسے پتہ نہیں چل رہا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ کہنے لگا — "تمہارے آنے سے پہلے میری ذہنی کیفیت کچھ اور تھی۔ تم دونوں کو دیکھ کر کچھ اور ہو گئی ہے۔"

"اپنے آپ کو سنبھالیں ابّا جان!" — ارشد نے کہا — "ہم آپ کو اپنے ساتھ رکھیں گے۔ آپ کی خدمت کریں گے۔"

جمال بیگ دکھیاری سی ہنسی ہنس پڑا اور اس نے سر جُھکا لیا۔

ارشد ہوٹل سے کھانا لے آیا۔ کھانے کے بعد ارشد اپنے بیٹے طاہر پرویز سے یہ کہہ کر جانے کے لیے اٹھا کہ تم طاہری، اپنی امّی اور اپنے نانا جی کے پاس رہو گے۔ میں کل آؤں گا — طاہر پرویز نے کچھ حیران ہو کے طاہرہ کی طرف دیکھا۔ طاہرہ نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ کچھ دیر بعد بچہ سو گیا۔

"میں آپا نجمہ سے مل کے آ رہی ہوں" — طاہرہ نے کہا — "اُس نے آپ کے متعلق مجھے بڑی تشویشناک بات بتائی ہے۔ میں اُس سے یہی پوچھنے گئی تھی کہ آپ کیسے ہیں۔"

"طاہرہ بیٹی!" — جمال بیگ نے آہ بھر کر کہا — "میں خوش تھا کہ جمال بیگ مر گیا ہے اور میری ذات نے جوزی بابا کو جنم دیا ہے مگر تم نے آ کر جوزی بابا کو قتل کر دیا ہے۔ تم نے اپنی ماں کے خون کا انتقام لے لیا ہے۔ میں پھر جمال بیگ بن گیا۔ اپنی بیٹی کا بھگوڑا اور اپنی بیوی کا مفرور قاتل .... اور پھر کبھی سوچتا ہوں کہ جوزی بابا مرا نہیں۔ جمال بیگ پھر سے جی اٹھا ہے اور وہ دونوں میری ذات میں ایک دوسرے کو لہولہان کر رہے ہیں۔"

"ابّا جان!" — طاہرہ نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا — "اپنے آپ میں آئیں۔ آپ نے میری ماں کو قتل نہیں کیا تھا۔ وہ زچگی کی حالت میں گر پڑی تھی اور آپ اُس سے ٹھوکر کھا کر اُس کے پیٹ پر گر پڑے تھے۔ مجھے نانی امّاں نے یہ سارا واقعہ سنایا تھا۔ آپ نے میری ماں کو قتل نہیں کرنا چاہا تھا۔ خدا کے لیے اپنے آپ کو یوں سزا نہ دیں۔"

طاہرہ نفسیات کی ڈاکٹر نہیں تھی، نہ جمال بیگ اپنا نفسیاتی تجزیہ کر سکتا تھا۔ وہ ایک نفسیاتی ردِ عمل کا شکار ہو رہا تھا۔ اُس نے سکول کے بچوں اور بچیوں کے پیار میں ڈوب کر اپنے گناہ کا کفّارہ ادا کیا تھا۔ اُس نے اپنے ماضی سے رشتہ توڑنے کے لیے اپنا نام بدل ڈالا تھا۔ وہ جمال بیگ سے جوزی بابا بن گیا تھا۔ وہ تو پاگل بھی ہو گیا تھا اور آزادی سے پہلے ہندوستان کی گلیوں میں جانے کتنے مہینے یا کتنے سال بھٹکتا پھرتا رہا تھا۔ اُسے اتنا ہی یاد تھا کہ اُس نے کسی کی ننھی سی ایک بچی کا مُنہ چُوما تھا تو وہ اپنے آپ میں آ گیا تھا پھر اُن اجنبی گلیوں میں جس بچی کو دیکھتا، اُسے اٹھا کر چومتا اور مسکراتا تھا۔ کتنی بار ایسے ہُوا کہ کسی نے اُسے کسی بچی کو اُٹھاتے دیکھ لیا تو اُس سے بچی چھین لی اور اُسے گالیاں دے کر بھگا دیا۔

اُسے پاگل پن سے بیدار تو برِصغیر کی آزادی نے کیا تھا جب مسلمانوں نے ملک کے ٹکڑے

کر کے پاکستان بنا لیا تھا۔ اُس وقت جمال بیگ ہندوستان میں ہی تھا اور پاگل پن سے اتنا سا نکل آیا تھا کہ لوگ اسے نیم پاگل اور بعض اسے خبطی کہتے تھے۔ اُس وقت وہ مشرقی پنجاب میں تھا۔ اُس نے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتلِ عام دیکھا۔ گلیوں اور بازاروں میں مسلمان بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کی کٹی پھٹی، کچلی مسلی ہوئی لاشیں دیکھیں تو وہ پوری طرح بیدار ہو گیا اور پاگل پن کی دلدل سے نکل آیا۔ وہ کچھ دن ان لاشوں میں گھومتا پھرتا رہا۔ اُس کا حُلیہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کے قاتل اُسے پاگل سمجھتے رہے جس کا کوئی مذہب نہ تھا۔ اس طرح وہ قتل ہونے سے بچ گیا اور وہ لہولہان قافلوں سے الگ تھلگ، آہستہ آہستہ چلتا جانے کتنے دنوں بعد پاکستان میں آ گیا۔

پاکستان نے اُسے نئی زندگی دی۔ اسے نیا ذہن دیا۔ نئی سوچیں دیں۔ وہ اب پاگل نہیں، پیار کا ہی پیاسا اور پیار کا ہی سرچشمہ تھا — پھر جمال بیگ ایک خوش لباس اور معزز انسان کے روپ میں جوزی بابا کے نام سے سامنے آیا اور وہ اس سکول میں جہاں نجمہ اور طاہرہ پڑھاتی تھیں، ایک ایسے استاد کی شکل میں مشہور ہُوا جو پیار اور محبت کی علامت تھا۔

اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی بیٹی جس کے پیدا ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کے اوپر گر کر مار دیا تھا، زندہ ہو گی اور زندگی کے کسی موڑ پر اور کسی دوراہے پر اُسے مل جائے گی۔ وہ اُسے اچانک مل گئی تو انسانی نفسیات کا چکّر اُلٹا چل پڑا۔ جوزی بابا کے ذہنِ لاشعور سے جمال بیگ قہقہے لگاتا اٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس کا ماضی اُس کے ذہنِ لاشعور میں قید تھا۔ یہ قید خانہ ٹوٹ گیا۔ بوتل میں بند کیا ہُوا جن نکل آیا۔

انسان بیک وقت دیوانہ بھی ہوتا ہے فرزانہ بھی۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ دیوانگی غالب آ جاتی ہے یا فرزانگی کہ انسان پر ذہنِ لاشعور کس حد تک غالب آتا ہے اور ذہنِ لاشعور میں ماضی کا بھرا ہُوا زہر کس مقدار میں شعور میں سرایت کرتا ہے۔ جمال بیگ نے بچوں کے پیار میں اپنے گھناؤنے ماضی سے اور اپنے ایک جرم سے فرار حاصل کیا تھا مگر اس کے جرم کی یادگار جس کا نام طاہرہ تھا اُس کے سامنے آ گئی اور طاہرہ نے اُسے اپنی امّی کی تصویر بھی دکھا دی تو وہ ذہنِ لاشعور کے تنور میں جا گرا جس میں بڑی تلخ اور زہریلی یادیں ایندھن کی طرح جل رہی تھیں۔ جمال بیگ کو اب جلنا تھا۔ اُسے پاگل ہی ہونا تھا۔

"میری سزا ختم نہیں ہوئی طاہرہ بیٹی!" — اُس نے کہا — "میں مفرور تھا۔ مزے میں تھا۔ تم نے مجھے گرفتار کر لیا ہے۔ تم کہتی ہو میں گزرے ہوئے وقت کو بھول جاؤں۔ کیسے بھول جاؤں؟ .... گناہوں سے نظریں پھیرو گے تو وہ گھوم کر تمہارے سامنے آ جائیں گے۔ ضمیر بڑی ظالم چیز ہوتی ہے طاہرہ بیٹی! .... مجھے گناہوں کا کفّارہ ادا کرنا ہے۔ میں ابھی اس قابل نہیں ہوں کہ تم میرے پاؤں چھوؤ اور میری خدمت کرو۔ میرے اندر سے ایک زہر اُٹھ رہا ہے۔"

"آپ کفّارہ ادا کر سکتے ہیں" — طاہرہ نے کہا — "میں آپ کو ایک طریقہ بتاتی ہوں۔ میری خوشیوں کی خاطر اور اس بچے کے مستقبل کی خاطر یہ زہر پی جائیں جو آپ کے اندر اٹھ رہا ہے۔ آپ کو یاد ہے نا، کہ آپ نے مجھے جب پہچان لیا تھا اور ارشد بھی آ گیا تھا تو ارشد کے اشارے پر آپ نے مجھے ارشد کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اب ہماری شادی ہو رہی ہے۔ جلدی ہو رہی ہے

اگر آپ کہیں کہ یہ شادی نہ ہو تو میں شادی نہیں کروں گی۔ آپ کے حکم پر قربان ہو جاؤں گی۔ اگر آپ میری شادی پر مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو جوزی بابا بن جائیے۔ آسیب نہ بنئے۔ نہ اپنے لیے نہ میرے اور ارشد کے لیے۔"

جمال بیگ پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اُس نے نظریں طاہرہ کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ طاہرہ اُس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی مگر جمال بیگ اپنی بیٹی کے چہرے مہرے میں کھو گیا تھا، پھر اس کی نظریں اپنی بیٹی کے سراپا کا طواف کرنے لگیں، اور پھر اس کی بیٹی جھیل میں درختوں کے عکس کی طرح جھلمل جھلمل کرنے لگی جیسے کسی نے جھیل میں کنکری پھینک دی ہو۔ طاہرہ کا چہرہ اُس کے آنسوؤں میں لہرا لہرا کر دھندلا گیا۔

"تمھاری خوشیوں کی خاطر میں زہر کا پیالہ پی لوں گا"۔۔۔ جمال بیگ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اپنے آپ سے بات کی ہو۔۔۔ "مجھے صرف یہ یقین دلا دینا کہ تمھاری ماں کی رُوح نے مجھے معاف کر دیا ہے"۔۔۔ اُس نے لمبی آہ بھری اور بولا۔۔۔ "لیکن طاہرہ بیٹی! آندھیوں میں دیپ جلانے کی کوشش کی جاتی ہے، دیپ جلا نہیں کرتے۔۔۔ تمھیں اور ارشد کو روشنی کی ضرورت ہوتی تو میں اپنا آپ جلا کر تمہاری دنیا کو روشن کر دوں گا۔"

طاہرہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس نے بے اختیار اور بے قابو ہو کر سر اپنے باپ کی گود میں پھینک دیا اور یوں ہچکیاں لے لے کے رونے لگی جیسے ہار گئی ہو، تھک کر چور ہو گئی ہو اور اب پناہیں ڈھونڈ رہی ہو۔ جمال بیگ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

جمال بیگ کے لیے مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ طاہرہ کی شکل و صورت اور قد و قامت بالکل اپنی ماں ساجدہ سے ملتا جلتا تھا۔ طاہرہ نے اسے ایک دوسرے کو پہچاننے سے پہلے اپنی ماں کی جوانی کی تصویر دکھا کر کہا تھا کہ یہ میری تصویر ہے تو جمال بیگ مان گیا تھا لیکن اُس کی داخلی دنیا میں اتنا شدید بھونچال آیا کہ وہ بنیادوں تک ہل گیا تھا۔ اب وہ طاہرہ کو دیکھتا تھا تو ساجدہ کو اپنے سامنے کھڑا پاتا اور فرار کی راہیں ڈھونڈنے لگتا تھا۔

طاہرہ کی ہچکیوں اور آنسوؤں نے جمال بیگ کو سنبھال لیا اور وہ اپنے آپ میں آگیا تھا مگر نہ طاہرہ سمجھ سکی نہ جمال بیگ کہ یوں سنبھل جانا اور جذبات کے تلاطم میں ٹھہراؤ پیدا ہو جانا عارضی کیفیت ہے اور ایسا سکوت بڑے خوفناک طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ طوفان کب اٹھے گا اور کیسی تباہی اپنے ساتھ لائے گا۔۔۔ طاہرہ نے اپنے آنسوؤں اور وارفتگی سے ایک طوفان اپنے باپ کے سینے میں روک دیا تھا۔

تیسرے دن لاہور کے اخباروں میں خبر چھپی کہ لاہور سے پچیس میل دُور نہر سے ایک لاش پکڑی گئی ہے جس کے سینے میں خنجر کا گہرا زخم ہے۔ مقتول کی جیب سے ریوالور کی چند گولیاں برآمد ہوئی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کے پاس ریوالور تھا۔ مقتول کی جیب سے خاصی رقم بھی برآمد ہوئی ہے۔ سونے کی انگوٹھی لاش کی انگلی میں تھی اور قیمتی گھڑی بھی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول کو لوٹنے کے ارادے سے قتل نہیں کیا گیا۔ قتل کا باعث عداوت ہو سکتا ہے۔

خبر میں یہ بھی تھا کہ نہر سے جس علاقے سے لاش برآمد ہوئی ہے اُس علاقے کے تھانیدار نے مقتول کو پہچان لیا ہے۔ کبھی وقت مقتول اس کے ساتھ پولیس میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر رہا ہے۔ مقتول کچھ عرصہ پہلے پولیس سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ اُس کا نام عبدالقدیر تھا۔

لاش لاہور کے ایک ہسپتال میں لائی گئی۔ اخباروں میں پڑھ کر عبدالقدیر کے گھر والے ہسپتال پہنچ گئے اور انہوں نے لاش پہچان لی۔ لاش خراب ہو گئی تھی لیکن موسم سرد تھا اور پانی ٹھنڈا اس لیے لاش ابھی پہچانے جانے کے قابل تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کا باعث خنجر کا زخم بتایا گیا تھا خنجر نے دل کو کاٹ دیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہو گیا کہ کیس کون سے تھانے میں رجسٹر ہو۔ اُس علاقے کے تھانے میں جس میں عبدالقدیر کا گھر تھا، یا اُس تھانے میں جہاں لاش برآمد ہوئی ہے یا اُس تھانے میں جس کے علاقے میں مقتول قتل ہوا ہے؟ اس تیسرے تھانے کا تو کسی کو علم نہ تھا۔ یہ سوال اس لیے اُٹھا تھا کہ کوئی تھانہ ایسا کیس لینے پر آمادہ نہیں تھا جس کی تفتیش مشکل تھی۔ قتل کی اس قسم کی وارداتوں میں قاتل کا سراغ لگانا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔

لاش لواحقین کے حوالے کر دی گئی تھی۔ وہ تھانے رپورٹ درج کرانے گئے تو تھانیدار نے انہیں کہا کہ ابھی یہ فیصلہ نہیں ہُوا کہ رپورٹ کہاں درج ہو گی۔ جوں ہی فیصلہ ہُوا متعلقہ تھانہ اپنے آپ انہیں اطلاع دے کر کارروائی شروع کر دے گا۔

پاکستان سیاست دانوں کی حکمرانی کے اُس دَور میں داخل ہو چکا تھا جس میں پولیس اور رجسٹرڈ غنڈوں اور بدمعاشوں کی چاندی ہو گئی تھی۔ پولیس کو برسرِ اقتدار پارٹی کے وزیروں، وزیرِ اعظم اور صدرِ مملکت کی حفاظت کے لیے اور پارٹی کے مخالفین کی سرکوبی کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ غنڈے اور جرائم پیشہ افراد سرکاری پارٹی کے پاس بھی تھے اور حزبِ مخالف کے پاس بھی۔ ایک دوسرے کے جلسے جلوس انہی سے اکھاڑے جاتے تھے۔ پاکستان پولیس سٹیٹ بن چکا تھا۔ کوئی قتل ہو جاتے، لڑائی جھگڑے میں زخمی ہو جاتے، کسی کا گھر لُٹ جائے، کسی کی بہو بیٹی اغوا ہو جاتے، کچھ ہی ہو جاتے، متعلقہ تھانیدار رپورٹ درج کرنے سے گریز کرتا تھا۔ پولیس کے خلاف رپورٹ سننے والا کوئی نہ تھا کیونکہ حکمران پولیس کو ناراض کرنے کا خطرہ مُول نہیں لے سکتے تھے۔ اس کے نتیجے میں پولیس من مانی کر رہی تھی۔

عبدالقدیر جیسے گمنام سے لوگ قتل ہوتے ہی رہتے تھے۔ اس کے لواحقین خالی ہاتھ رپورٹ درج کرانے چلے گئے تھے۔ مایوس لوٹ آئے۔

☆

تیسرے روز عبدالقدیر کی بیوہ گھر میں بیٹھی بین کر رہی تھی۔ محلے کی عورتیں بھی اس کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔ باہر عبدالقدیر کے چھوٹے بھائی کے پاس محلے کے تین چار آدمی بیٹھے ملک میں بڑھتے ہوئے جرائم کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ بار بار افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ عبدالقدیر جیسا نیک اور بھلا مانس آدمی بھی رہزنوں کا شکار ہو گیا ہے۔

ایک آدمی آیا جسے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اُس نے بتایا کہ

یہ ایک درخواست ہے جس پر مقتول کی بیوہ کے دستخط یا نشان انگوٹھا کی ضرورت ہے۔ عبدالقدیر کے بھائی نے درخواست پڑھی۔ یہ عبدالقدیر کی بیوہ کی درخواست تھی جو آئی جی پولیس کے نام لکھی گئی تھی۔

"یہ کس نے لکھی ہے؟" ــــ عبدالقدیر کے بھائی نے اس شخص سے پوچھا ــــ "آپ کہاں سے آتے ہیں؟ ہم نے ایسی کوئی درخواست نہیں لکھوائی۔"

"آپ اسے پڑھ لیں" ــــ اس شخص نے کہا ــــ "اس سے آپ کو کوئی غرض نہیں کہ میں کون ہوں اور درخواست کس نے لکھی ہے۔ ہمیں قاتل کو پکڑنا ہے۔"

مقتول کے بھائی نے درخواست پڑھی۔ اردو میں کسی نے مقتول کی بیوہ کی طرف سے آئی جی کو لکھا تھا کہ اس کے خاوند کے قتل کا کیس سی۔آئی۔اے کو دیا جائے۔ مقتول کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس نے پاکستان سے پہلے پولیس کی سروس میں ہوتے ہوئے تحریک پاکستان کے لیڈروں کی بہت مدد کی تھی۔ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے ایک بہت بڑے قافلے کو وہ اپنی حفاظت میں خیریت سے پاکستان لایا تھا۔ پاکستان میں اُس نے موجودہ حکومت کی درپردہ بہت مدد کی ہے۔ مرکزی اسمبلی کے ممبر مہر اللہ بخش صاحب اور صوبائی اسمبلی کے ممبر چوہدری اکرم صاحب مقتول کی خدمات سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ پنجاب کے ہوم منسٹر اور ہوم سیکرٹری سے پوچھا جا سکتا ہے کہ مقتول نے موجودہ برسرِ اقتدار پارٹی کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ میرے خاوند کو موجودہ حکومت کی مخالف سیاسی پارٹیوں نے قتل کرایا ہے۔ مقتول ایک سچا پاکستانی اور ہندوستان کا بہت بڑا دشمن تھا لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں کہ مقتول کا قتل صرف میرا مسئلہ نہیں بلکہ یہ پاکستان کا اور موجودہ حکومت کا مسئلہ ہے۔ اس کے قتل کی تفتیش سی۔آئی۔اے کے سپرد کی جائے۔ اگر تفتیش متعلقہ تھانے میں کی گئی تو خطرہ ہے کہ موجودہ حکومت کے مخالفین پولیس پر اثر انداز ہو کر اصل قاتل کو سامنے نہیں آنے دیں گے۔"

عبدالقدیر کے بھائی نے درخواست لانے والے کو بتایا کہ ان کے تھانے کے انچارج نے قتل کی رپورٹ لی ہی نہیں۔ کہتا تھا کہ ابھی فیصلہ نہیں ہُوا کہ کون سا تھانہ تفتیش اپنے ہاتھ میں لے گا۔

"ہمیں معلوم ہے" ــــ اس شخص نے کہا ــــ "اسی لیے یہ درخواست دی جا رہی ہے۔"

درخواست پر بیوہ کا انگوٹھا لگوا دیا گیا۔

☆

"عبدالقدیر نے مجھے بتایا تھا کہ میرے اور عقیلہ کے قتل یا اغوا کا خطرہ ہے" ــــ اُس ہندو لڑکی نے کہا جس کا نام رادھا تھا لیکن پاکستان میں نام نسیمہ تھا ــــ "معلوم ہوتا ہے یہ اسی خفیہ پارٹی کا کام ہے عبدالقدیر نے مجھے ایک ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر کا نام بتایا تھا۔"

"عبدالجلیل خان" ــــ چوہدری اکرم نے کہا ــــ "عبدالقدیر ہمیں اس خفیہ پارٹی کی ساری رپورٹ دے کر قتل ہُوا ہے۔"

"مجھے سولہ آنے یقین ہے کہ عبدالقدیر کو عبدالجلیل نے قتل کرایا ہے" ــــ مہر اللہ بخش نے کہا۔

"لیکن وہ عبدالجلیل کی پارٹی میں شامل ہو گیا تھا" ــــ چوہدری اکرم نے کہا ــــ "اُس نے وہاں اپنا اعتماد پیدا کر لیا تھا۔"

"تم عبدالجلیل کو نہیں جانتے چوہدری؟" ــــ مہر اللہ بخش نے کہا ــــ "اُس کا ہر کام شیطانی ہوتا ہے۔ تم امرتسر سے اُسے جانتے ہو۔ یہاں مجھے مخبروں نے بتایا ہے کہ وہ پولیس سے ریٹائر ہو چکا ہے لیکن غنڈے ابھی تک اس کے مرید ہیں۔ تانگوں والے بھی اس کے یار ہیں۔ اسے اندر کرانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ میں نے عبدالقدیر کی بیوہ سے درخواست لکھوا کر آئی جی کو دے دی ہے اور ہوم منسٹری کے سیکرٹری نے کہا ہے کہ کیس سی۔آئی۔اے کے پاس چلا جائے گا۔"

یہ سب نسیمہ کی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ عقیلہ بھی وہیں آ گئی تھی۔ ان کے جعلی خاوند بھی موجود تھے۔ دونوں لڑکیاں ڈری ہُوئی تھیں۔ عبدالجلیل نے ٹھیک کہا تھا کہ دشمن کے دو تین ایجنٹ قتل ہو گئے تو باقی سب چوکنے ہو جائیں گے۔ نسیمہ اور عقیلہ تو لڑکیاں تھیں۔ انہیں ہوم منسٹری تک کا تحفظ حاصل تھا پھر بھی ان پر عبدالقدیر کے قتل نے خوف طاری کر دیا تھا۔

"آپ ہندوستانی سفارت خانے کو اطلاع دے دیں کہ کسی خفیہ ہاتھ نے ہمارے ایک پاکستانی ایجنٹ کو قتل کر دیا ہے، لہٰذا ہماری حفاظت کا مزید انتظام کیا جائے" ــــ عقیلہ نے کہا۔

"مت ڈرو لڑکی!" ــــ مہر اللہ بخش نے کہا ــــ "ہم مر تو نہیں گئے۔ میں چند دنوں بعد کراچی جا رہا ہوں۔ تمہارے سفیر کو بتا دوں گا۔ اُس وقت تک اُسے یہ بھی بتا سکوں گا کہ ہم نے اُس خفیہ ہاتھ کو پکڑ لیا ہے، ورنہ وہ کہے گا کہ ہم لوگ اُس کی بھیجی ہوئی وہسکی پینے کے سوا کوئی کام نہیں کر رہے۔"

"مہر صاحب!" ــــ چوہدری اکرم نے کہا ــــ "یہ بھی سوچ لیں کہ ہمارے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں کہ عبدالقدیر کو عبدالجلیل نے قتل کرایا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ عبدالقدیر کیسا آدمی تھا۔ وہ ریس کھیلتا تھا۔ جوا کھیلتا تھا۔ ہیرا منڈی کی ٹاپ کی طوائفوں کے ساتھ اُس کا یارانہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ کسی جواری نے یا کسی اور آدمی نے جس کے اُس نے پیسے دبا لیے ہوں گے، اُسے قتل کر کے لاش نہر میں پھینک دی ہو گی۔ عبدالجلیل کی جاسوسی اتنی تیز نہیں ہو سکتی کہ اُسے اتنی جلدی پتہ چل گیا ہو گا کہ عبدالقدیر اُسے دھوکہ دے رہا ہے۔"

"تم عبدالجلیل کے چاچے لگتے ہو یا مامے؟" ــــ مہر اللہ بخش نے کہا ــــ "میں کیس سی۔آئی۔اے کو کیوں دلا رہا ہوں؟ تم سمجھے نہیں؟..... عبدالجلیل کو پھانسنے کے لیے۔ خدا نے ایک موقع پیدا کر دیا ہے۔ اُسے گرفتار کرا دیں گے۔ کیس ۳۰۲ ہے اس لیے ضمانت نہیں ہونے دیں گے۔ اِدھر سے بچ گیا تو ہوم منسٹری اپنی ہے۔ اُسے سیکورٹی ایکٹ میں اندر کرا دیں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو قتل کرا دیں گے۔ یہ تو یقین ہو چکا ہے نا، کہ اُسے اِن دونوں لڑکیوں کا سراغ مل گیا ہے۔ ہماری تو اُس کے ساتھ پہلے سے ہی دشمنی ہے۔ حکومت ہماری ہو تو ایسا دشمن باہر کس طرح گھومتا پھرتا رہے!"

ہندوستان سے آئی ہوئی وہسکی کا دور چلتا رہا اور اس دوران ہوم منسٹری کا سیکرٹری بھی آ گیا۔ اُس نے خبر سُنائی کہ عبدالقدیر کے قتل کا کیس سی۔آئی۔اے کے سپرد ہو گیا ہے۔ یہ کام اُس کے ہاتھ میں تھا جو اُس نے کر دیا اور داد طلب نگاہوں سے نسیمہ کو پھر عقیلہ کو دیکھا۔ وہ تربیت یافتہ لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے اُسے کُھل کر داد دی، اور پھر اُس کے بھی ہوش و حواس وہسکی میں اُڑنے لگے۔

☆

تفتیش ایک ڈی۔ایس۔پی اور ایک انسپکٹر کر رہے تھے۔ اُن کے ایس۔پی نے انہیں بتایا تھا کہ مقتول موجودہ حکومت کا نہایت اہم آدمی تھا۔ اس تفتیش میں مہر اللہ بخش اور ہوم منسٹری کے سیکرٹری کی کوششیں شامل تھیں۔ انہوں نے وزیرِ اعلیٰ کو بھی بتایا تھا کہ عبدالقدیر کو پارٹی کے دشمنوں نے قتل کرایا ہے اور عبدالقدیر پارٹی کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔ اِس طرح سی۔آئی۔اے پر سرکاری دباؤ اتنا پڑا اور تاثر ایسا ملا کہ عبدالقدیر کا قاتل نہ ملا تو وہ گورنر اور وزیرِ اعلیٰ کو بھی قتل کر دے گا۔

ڈی۔ایس۔پی اور انسپکٹر کی تفتیشی ٹیم مقتول کے گھر والوں سے معلوم کر چکی تھی کہ وہ گھر سے کس وقت نکلا اور کیا بتا گیا تھا۔ اُن سے یہ بھی پُوچھا جا چکا تھا کہ انہیں کس پر شک ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں بتا سکے تھے۔ مخبروں کا ایک گروہ تھا جو مقتول کے محلے اور آبادی میں کسی سُراغ اور کسی ایسے اشارے کی سُن گن لیتا پھر رہا تھا جو قاتل کی نشاندہی کر دے یا یہی پتہ چل جاتے کہ قتل کا باعث کیا تھا۔

مہر اللہ بخش اور چوہدری اکرم کھُلم کھُلا بھی اِس کیس میں دلچسپی لے رہے تھے اور درپردہ بھی کام کر رہے تھے۔ وہ اپنی زبان سے تفتیشی ٹیم سے نہیں کہنا چاہتے تھے کہ انہیں ریٹائرڈ انسپکٹر پولیس عبدالجلیل خان پر شک ہے۔ یہ شک انہوں نے ایک مُخبر کے ذریعے ڈی۔ایس۔پی تک پہنچایا۔ اس کے علاوہ مہر اللہ بخش نے وزیرِ اعلیٰ کے کان اِس انداز سے بھرے کہ وہ بھی عبدالجلیل کو مجرم سمجھنے لگا ——— اور شک کا یہ طوفان عبدالجلیل خان کے دروازے تک پہنچ گیا۔

دستک کی آواز پر عبدالجلیل نے ہی دروازہ کھولا۔ ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔

"ملک رجب علی ڈی۔ایس۔پی صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے" ——— کانسٹیبل نے کہا۔

"مجھے؟" ——— عبدالجلیل نے پُوچھا ——— "مجھ سے اُن کا کیا کام ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو انہوں نے نہیں بتایا۔"

"میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں" ——— عبدالجلیل نے کہا ——— "کسی وقت ہم انبالہ میں اکٹھے رہے ہیں۔ وہ اچھے آدمی ہیں۔"

عبدالجلیل نے جو کپڑے پہن رکھے تھے انہی میں چلا گیا۔ اپنی بیوی سے وہ کہہ گیا کہ جلدی آجاتے گا مگر سی۔آئی۔اے کو اُسے واپس بھیجنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

☆

ڈی۔ایس۔پی اُسے بڑے تپاک سے ملا جیسے مُدّتوں سے بچھڑے ہوتے دو دوست ملے ہوں۔ وہ آزادی سے پہلے اکٹھے رہے تھے۔ ہم عمر اور ہمجولی تھے۔

"خان! تمہاری مدد کی ضرورت آپڑی ہے" ——— ڈی۔ایس۔پی نے کہا۔

"حُکم کر ملک! حاضر ہوں۔"

"یاد ہے تمھیں، عبدالقدیر نام کا ایک اے۔ایس۔آئی ہُوا کرتا تھا" ——— ڈی۔ایس۔پی نے کہا ——— "وہ قتل ہو گیا ہے۔"

"کب؟" ——— عبدالجلیل نے حیران ہو کے پُوچھا۔

"تمہیں معلوم نہیں؟"

"نہ ملک!" ——— عبدالجلیل نے کہا ——— "مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا... تم تفتیش کر رہے ہو؟... تم سی۔آئی۔اے میں ہونا!... بتاؤ، میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"وہ تمہیں کب ملا تھا؟"

"مجھے؟" ——— عبدالجلیل سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بھی پولیس آفیسر رہ چکا تھا۔ سمجھ گیا کہ دال میں کالا ہے۔ بولا ——— "کوئی ایک مہینہ گزرا بازار میں ملا تھا۔ کچھ دیر گپ شپ ہوئی، پھر اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"وہ تمہارے گھر نہیں گیا تھا؟"

"نہ یار!" ——— عبدالجلیل نے جواب دیا ——— "اُس کے بعد میں نے اُسے دیکھا ہی نہیں۔"

"خان!" ——— ڈی۔ایس۔پی نے دوستانہ لہجے میں کہا ——— "ہم پرانے دوست ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ تم میری یہ مدد کر سکتے ہو کہ مجھ سے کچھ چُھپانے کی کوشش نہ کرو، اور میں تمہاری یہ مدد کروں گا کہ جس بات پر پردہ ڈالنا مناسب سمجھا، پردہ ہی ڈالے رکھوں گا... مقتول تمہارے گھر گیا تھا، بلکہ جاتا رہتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ تم جھُوٹ کیوں بول رہے ہو۔"

عبدالجلیل خان کا دماغ بیک وقت دو سوچوں میں مصروف ہو گیا۔ ایک یہ کہ ڈی۔ایس۔پی کو کیا جواب دے اور دوسری سوچ یہ کہ کاما تانگے والا اتنا پنچ ہو سکتا ہے کہ اُس نے پولیس کو بتایا ہو گا کہ عبدالجلیل حکومت کے خلاف ایک زمین دوز جماعت تیار کر رہا ہے اور عبدالقدیر بھی اس کے گھر آتا ہے؟... نہیں! کاما ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر اُسے دھوکہ دینا ہوتا تو عبدالقدیر کو قتل کر کے اُسے کیوں آ کے بتاتا؟ اُس کا ریوالور اُسے کیوں دے دیتا؟

"خان!" ——— ڈی۔ایس۔پی نے کہا ——— "تم جو اتنا سوچ سوچ کر جواب دیتے ہو نا، اِس سے اپنے خلاف شبہ پکّا کر رہے ہو۔"

"اوہ! میں اب سمجھا" ——— عبدالجلیل نے کہا ——— "میں تمہارا مُشتبہ ہوں۔ تم نے مجھے مُشتبہ بٹھایا ہے۔"

"میں اٹھا بھی سکتا ہوں" ——— ڈی۔ایس۔پی نے کہا ——— "تفتیش میرے ہاتھ میں ہے۔ تم مجھے صاف بتا دو کہ تمہارا اس واردات میں کتنا کچھ عمل دخل ہے۔ تمھیں اِس میں سے نکال دوں گا اور..."

"اور کسی اور کو پکڑ کر کیس ثابت کر دوں گا" ——— عبدالجلیل نے اُس کا فقرہ پُورا کرتے ہوتے کہا ——— "یہی کہنا چاہتے ہو نا!... ملک! تم شاید بھُول گئے ہو کہ میں بھی تھانیدار رہ چکا ہوں اور تم جانتے ہو کہ میں کس قسم کا تھانیدار ہُوا کرتا تھا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں قتل یا اعانتِ جرم کا مجرم ہوں تو کیا میں تمھیں بتا دوں گا کہ ہاں میں مجرم ہوں، مجھے گرفتار کر لو؟"

"تمہیں بتانا پڑے گا خان!" ——— ڈی۔ایس۔پی نے کہا ——— "نہیں بتاؤ گے تو تم جانتے ہی ہو کہ کیا ہو گا۔"

عبدالجلیل کے ذہن میں کاما بھی تھا۔ وہ جواب بھی سوچ رہا تھا اور یہ بھی کہ ہو سکتا ہے کاماے نے عبدالقدیر کے پاس کچھ رقم دیکھ لی ہو اور رقم اُڑانے کے لیے اُسے قتل کر دیا ہو اور مجھے آ کر یہ کہانی سُنا دی ہو کہ عبدالقدیر ہمیں دھوکہ دے رہا تھا۔

"تم ڈی۔ایس۔پی ہو کر زیادہ عقل مند تو نہیں ہو گئے ملک" ——— عبدالجلیل خان نے کہا۔

"میرے دل سے دوستی کا پیار نہ نکالو خان!" —— ڈی۔ایس۔پی نے کہا —— "تم دیکھ لینا ایک دوست دوستی کا حق کس طرح ادا کرتا ہے۔"

کاما ٹانگے والا ضرور ہے، اتنا کمین نہیں ہو سکتا۔ عبدالجلیل کو اس سوچ نے سکون سا دیا کہ کاما دھوکہ دینے والا آدمی نہیں۔

"اگر تم مجھے مجرم سمجھتے ہو تو تفتیش کرو" —— عبدالجلیل نے کہا —— "مجھ پر وقت ضائع نہ کرو۔ میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہو کر لو۔ تمہیں کچھ بھی حاصل نہ ہو گا۔ میں تم سے نہیں پوچھوں گا کہ میرے خلاف کس نے شک پیدا کیا ہے۔ تم یہ معلوم کرو کہ عبدالقدیر کی میرے ساتھ کیا دشمنی تھی۔ خود سوچو کہ اُس سے میری دشمنی ہو کیا سکتی ہے؟"

"مہر اللہ بخش، چوہدری اکرم اور ہوم سیکرٹری کے ساتھ تمہاری کیا دشمنی ہے؟" —— ڈی۔ایس۔پی نے رازداری سے پُوچھا —— "کیا تم نے واقعی کوئی ایسا گروہ بنا رکھا ہے جو موجودہ حکومت کا تختہ اُلٹے گا؟"

"اب آئے ہو تم پٹڑی پر" —— عبدالجلیل خان نے کہا —— "کیا تم بھول گئے ہو کہ اُن کے ساتھ میری کیا دشمنی ہے؟"

"ہاں، مجھے یاد ہے" —— ڈی۔ایس۔پی نے کہا —— "تم نے طلبا کے جلوس پر لاٹھی چارج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

☆

دن گزر گیا۔ عبدالجلیل کو کھانے کے لیے کچھ نہ دیا گیا۔ چائے کی صرف دو پیالیاں اُسے پلائی گئیں یا وہ پانی پیتا تھا۔ رات کے دس بج گئے۔ ڈی۔ایس۔پی ابھی تک اُس سے پُوچھ گچھ کر رہا تھا۔ عبدالجلیل عقلمند اور تجربہ کار انسان تھا۔ اُسے معلوم تھا قاتل کون ہے لیکن اسے وہ جرم نہیں سمجھتا تھا۔ عبدالقدیر کو قتل ہی ہونا چاہیے تھا۔ عبدالجلیل کے ضمیر پر کسی جرم اور کسی گناہ کا بوجھ نہ تھا، اس لیے اُس کی جسمانی اور رُوحانی قوتیں بیدار تھیں۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ مر جائے گا، قتل کا الزام اور سزا قبول کر لے گا، اپنی زبان سے یہ نہیں کہے گا کہ قاتل کاما ہے۔

رات دس بجے کے بعد ڈی۔ایس۔پی کمرے سے نکل گیا اور اُس کی تفتیشی ٹیم کا انسپکٹر دوست محمد آ گیا۔ عبدالجلیل کو پولیس کا طریقہ تفتیش معلوم تھا۔ ڈی۔ایس۔پی تھک گیا تھا اور وہ آرام کرنے چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ عبدالجلیل کو رات بھر جگائے رکھنے کے لیے یہ انسپکٹر آ گیا تھا۔

"آؤ دوست!" —— عبدالجلیل نے مسکرا کر کہا۔ "اب تم زور لگا لو۔"

انسپکٹر دوست محمد نے دروازہ بند کر دیا اور ہاتھ جوڑ کر عبدالجلیل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"آپ میرے استاد ہیں" —— اُس نے عبدالجلیل سے کہا —— "مجھے وہ وقت بھولا نہیں جب میں آپ کے پاس ایک بچے کی طرح آیا تھا۔ میں کوئی گستاخی نہیں کروں گا۔ اپنی نوکری کا مارا آپ کے سامنے آ گیا ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ آپ کو آپ کے دشمنوں نے پھانسا ہے۔ مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ یہ کوئی چکر ہے۔ ایک ریٹائرڈ اے۔ایس۔آئی قتل ہو گیا۔ تھانے والے اس کیس کو لے ہی نہیں رہے تھے لیکن دو تین دنوں میں کیس سی۔آئی۔اے کے پاس آ گیا۔ مقتول کہاں کا وزیرِاعظم اور کس ملک کا صدر تھا کہ اُس کے قتل کی تفتیش ایک ڈی۔ایس۔پی اور ایک انسپکٹر کر رہا ہے؟ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے پیر استاد کو میرے سامنے مُشتبہ بٹھا دیا جائے گا۔"

"تم اپنی ڈیوٹی کا خیال رکھو دوست محمد!" عبدالجلیل نے کہا —— "میں تم سے بالکل یہ توقع نہیں رکھوں گا کہ میرے ساتھ ذرا سی بھی رعایت کرو۔ تمہیں جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کرو۔"

ڈی۔ایس۔پی ابھی گیا نہیں تھا۔ وہ دفتر میں بیٹھا کسی کے ساتھ فون پر بات کر رہا تھا:

"میں اسے بڑی اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھ چکا ہوں سر! یہ بالکل صاف ہے.... جی سر! آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ بڑا کاریاں تھانیدار رہ چکا ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں اور ایجی ٹیشن میں اُس نے درپردہ مسلمانوں کی بہت مدد کی تھی۔ اُس نے اپنی نوکری بھی خطرے میں ڈال دی تھی لیکن اس کیس میں یہ صاف ہے۔ میں نے صبح نو بجے تفتیش شروع کی تھی اور دس بجے رات اُسے چھوڑا ہے۔ اب اسے انسپکٹر دوست محمد کے حوالے کر دیا ہے.... جی سر! بجا فرمایا آپ نے۔ جی جی سر۔ جی میں سمجھ گیا۔ یہ تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ اسے پھنسایا جا رہا ہے.... جی سر! میں اوپر والوں کے دباؤ کو سمجھتا ہوں۔ جی سر! ہوم سیکرٹری کو معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا دشمنی ہے۔ جی سر! اگر حکم یہی ہے تو میں کیس اسی کے خلاف ثابت کر دوں گا۔ ہمیں تو نوکری کرنی ہے۔ ہماری ترقیاں انہی کے ہاتھ میں ہیں.... بہت اچھا سر! اسے نہیں نکلنے دوں گا۔ کل اس کے گھر کی تلاشی لے لیں گے۔ ایک دو گرینیڈ ساتھ لے جائیں گے۔ دو تین ریوالور لے جائیں گے اور یہ سارا اسلحہ اُس کی خانہ تلاشی کی برآمدگی دکھا دیں گے۔ خدا حافظ سر!"

اِدھر ڈی۔ایس۔پی نے ریسیور رکھا اُدھر ایس۔پی نے ریسیور رکھا۔ دونوں کے چہروں پر تاسّف اور پریشانی کا ہلکا سا تاثر بھی نہیں تھا۔

☆

ایک کانسٹیبل نے انسپکٹر دوست محمد کو آ کر بتایا کہ ڈی۔ایس۔پی صاحب گھر چلے گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ عبدالجلیل کو ساری رات سونے نہ دینا۔

"دوڑ کر جاؤ اور سامنے والے ہوٹل سے کھانا لے آؤ" —— دوست محمد نے کانسٹیبل سے کہا۔

وہ چلا گیا تو دوست محمد نے عبدالجلیل سے کہا —— "میں اسی انتظار میں تھا کہ ڈپٹی یہاں سے لاپتہ ہو جاتے تو آپ سے بات کروں۔ آپ کے گھر والے آپ کے لیے پریشان ہیں۔ آپ کا نوکر شام سے باہر گیٹ پر بیٹھا ہے۔ آپ کا پوچھ رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ رات دس بجے آ جائے لیکن اندر نہ آئے۔ میں اُسے بلا لیتا ہوں۔ آپ اُسے تسلی دلاسہ دے دیں۔ میں آپ کے لیے یہی کچھ کر سکتا ہوں" —— اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

عبدالجلیل حیران تھا کہ اُس کا نوکر کون ہے۔ تھوڑی دیر بعد نوکر آ گیا۔ وہ کاما تھا۔ اُسے دیکھ کر عبدالجلیل کو کئی خیال آئے۔ کامے کا آنا بھی پولیس کی چال ہو سکتی تھی۔ دوست محمد کامے کو عبدالجلیل کے پاس بٹھا کر باہر چلا گیا۔

"میں پوری جاسوسی کر رہا ہوں" —— کامے نے کہا —— "مجھے پتہ چل گیا تھا کہ کیس سی۔آئی۔اے میں آ گیا ہے۔ آپ کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ ایک کانسٹیبل آپ کو ساتھ لایا ہے۔ میں نے آپ کی بیگم سے

کہہ کر عبدالقدیر کا ریوالور آپ کے ٹرنک سے نکال لیا اور راوی میں پھینک آیا ہوں۔ آپ نے اُنہیں کیا بتایا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں" — عبدالجلیل نے کہا اور اُسے جلدی جلدی بتا دیا کہ ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ اُس کی کیا باتیں ہوئی ہیں۔ اُس نے کہا — "میں سارا چکر سمجھ گیا ہوں۔ یہ لوگ مجھے چھوڑیں گے نہیں۔"

"میں بھی بہت کچھ سمجھتا ہوں خان صاحب!" — کامے نے کہا — "میں اس کیس کا رُخ کسی اور طرف کر دوں گا۔ ہم نے میٹنگ کر لی ہے۔"

"کیا کرو گے؟"

"ہم ان دونوں ہندو لڑکیوں کو اغوا کر کے غائب کر دیں گے" — کامے نے کہا — "ہم نے سکیم بنا لی ہے۔ پکے آدمی ساتھ لے لیے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تین یا چار دِنوں بعد آپ خبر سُنیں گے کہ نسیمہ اور عقیلہ نام کی دو لڑکیاں لاپتہ ہو گئی ہیں۔"

انسپکٹر دوست محمد اندر آ گیا اور بولا — "خان صاحب! اب اسے جانے دیں۔ کوئی اوپر والا نہ آ جائے۔"

کاما کمرے سے نکل گیا۔

عبدالجلیل خان اُس کمرے میں بیٹھا رہا جس میں ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی نے اُسے لا بٹھایا تھا اور جس میں ڈی۔ ایس۔ پی کے جانے کے بعد انسپکٹر دوست محمد نے اُسے کھانا کھلایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انسپکٹر دوست محمد نے اُسے کھانا کھلا کر اور اُس کے ساتھ دوستانہ شفقت سے باتیں کر کے اُس پر کرم کیا تھا اور اُس نے خطرہ مُول لیا تھا۔ وہ خود پولیس کا ریٹائرڈ انسپکٹر تھا۔ وہ اس کمرے میں پہلی بار آیا تھا لیکن اس قسم کے کمروں سے وہ ناواقف نہیں تھا۔ سرحد پار، انگریزوں کے دَور میں اس قسم کے کمروں میں اس نے ایسے ملزموں اور مشتبہوں سے مسلسل کئی کئی دن اور راتیں پوچھ گچھ کی تھی جو پتھر دل سے بھی سخت مجرم تھے۔ مانتے نہیں تھے۔ بڑی بڑی سخت چوٹوں سے بھی نہیں ٹوٹتے تھے، مگر توڑ ہی لیے جاتے تھے۔ بےگناہ بھی بلبلا کے کہہ اُٹھتے تھے — "جو کہلوانا چاہتے ہو لکھ لو، میں دستخط کر دوں گا۔"

یہ کمرہ جس میں عبدالجلیل مشتبہ کی حیثیت سے تنہا بیٹھا تھا، اُسے ڈرا نہیں سکتا تھا۔ ڈرنے کی بجائے وہ سوچ رہا تھا بلکہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا مگر خون کا ابال اسے اچھی طرح سوچنے نہیں دے رہا تھا۔ اُس کے وجُود میں غصّے کی لہر اُٹھتی تھی تو وہ ربڑ کی گیند کی طرح اچھل کر اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ کھڑکی ایک ہی تھی جس میں سلاخیں لگی ہُوئی تھیں۔ دروازہ سلاخوں کے بغیر تھا۔ اس میں شیشے لگے ہُوئے تھے۔ عبدالجلیل جوں ہی اٹھتا تھا، باہر پہرے پر کھڑا کانسٹیبل شیشوں میں سے اُسے جھانکتا تھا۔

اُسے معلوم تھا کہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں اس قسم کے کمرے موجود ہیں اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اب ان کمروں کو انویسٹیگیشن روم کہا جاتا ہے۔ انگریزوں کے دَورِ حکومت میں یہ کمرے ڈکیتی، قتل اور جاسوسی کے ملزموں کی تفتیش کے لیے استعمال ہوتے تھے مگر پاکستان چونکہ آزاد ملک تھا اس لیے یہ کمرے آزادی سے استعمال ہونے لگے تھے۔ اب یہاں کسی پیچیدہ اور "عدم پتہ" واردات کے ملزموں اور مشتبہوں اور ملک دشمن جاسوسوں اور ان کے ایجنٹوں کو لانے کی بجائے پاکستان کی آئے دِن بدلتی حکومتوں کے مخالفین کو لایا جاتا اور اُن کی برین واشنگ کی جاتی تھی۔

پاکستان کے ہرے پرچم نے اپنی عمر کے آٹھویں نویں سال ہی یہ عجوبہ دیکھا کہ انویسٹیگیشن روم میں لائے ہُوئے اور اذیّت سے بلکتے تڑپتے ملزم اور مشتبہ گزرے ہُوئے کل کے یا آنے والے کل کے حکمران ہوتے تھے، اور پھر ان کے حکم سے اِن کمروں کی رونق قائم رکھنے کے لیے اِن کے مخالفین کو لایا جاتا اور انہیں تخریب کار اور وطن دشمن کہا جاتا تھا۔ قوم بےخبر رہتی تھی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی کہ برسرِاقتدار پارٹی نے برسرِاقتدار آنے والی پارٹی کے کتنے ہی افراد ان ذبح خانوں میں بند کر رکھے ہیں جنہیں انویسٹیگیشن روم کہا جاتا ہے — اور اس سارے عمل کو سیاست کا نام دیا جاتا ہے۔

✪

ریٹائرڈ انسپکٹر عبدالجلیل خان جانتا تھا سب کچھ جانتا تھا۔ ملزموں سے پوچھ گچھ کرنے والا خُود ملزم بنا

بیٹھا تھا۔ اُس کی نگاہیں دیواروں اور چھت پر گھومنے پھرنے لگیں اور اُسے ملزموں کی آہ و بکا سنائی دینے لگی۔ ایسی چیخیں جو پولیس کے سوا کوئی اور شہری برداشت نہ کر سکے۔ انسان کو یہاں لا کر اسے انسان سمجھنا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ان غیر انسانی اذیتوں سے نجات کا ایک ہی راستہ تھا ــــ موت یا پولیس کی مرضی کے مطابق اقبالِ جرم ــــ ان کمروں میں بعض افراد مر بھی جاتے تھے۔ کسی کے متعلق کہہ دیا جاتا تھا کہ اس نے خودکشی کر لی ہے اور کسی کی لاش باہر پھینک کر اخباروں کو خبر دی جاتی تھی کہ پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے ــــ اور پھر ایسا جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پولیس لاش غائب کر کے خاموش رہتی تھی۔ مرنے والے کے لواحقین واویلا بپا کریں تو پولیس کی طرف سے لاعلمی کا اظہار ہوتا تھا کہ اس نام کے کسی آدمی کو کبھی گرفتار کیا ہی نہیں گیا۔

عبدالجلیل کو اپنا انجام نظر آنے لگا تھا۔ اُسے ڈی۔ ایس۔ پی نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں بتانا پڑے گا۔ نہیں بتاؤ گے تو جانتے ہو کیا ہو گا۔

"نہیں بتاؤں گا" ــــ عبدالجلیل نے اپنے آپ سے کہا ــــ "کا مجرم نہیں مجاہد ہے۔ میں اُس کی خاطر جان دے دوں گا۔ نہیں بتاؤں گا۔"

کمرے کا دروازہ کھلا۔ انسپکٹر دوست محمد اندر آیا۔ اُس کا چہرہ اُداس تھا۔ عبدالجلیل بنچ پر بیٹھا تھا۔ انسپکٹر دوست محمد اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور سر جھکا لیا۔

عبدالجلیل نے اسے دیکھا۔ ایک بگولہ سا اُس کے ذہن سے اُٹھا اور اُس کے ذہن میں ہی غرّاتا گھومتا غائب ہو گیا۔ "کیا دوست محمد مجھے پیار اور محبت کا دھوکہ دے کر مجھ سے راز اگلوانا چاہتا ہے؟"

یہ بھی پولیس کا طریقۂ تفتیش تھا کہ ایک دو آدمی ملزم کو ناقابلِ برداشت اذیتیں دیتے تھے اور ان کے جانے کے بعد ایک تھانیدار سراپا پیار اور ہمدردی بن کر آ جاتا تھا۔ وہ ایسی باتیں کرتا تھا جیسے ملزم کی چوٹوں کا درد اُس کے جگر میں چلا گیا ہو۔ وہ ملزم پر تشدد کرنے والوں کو گالیاں دیتا اور خود مومن بنا رہتا تھا۔ ملزم تو تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہا ہوتا تھا، اس لیے پیار کے جال میں آتے وہ زیادہ وقت نہیں لگاتا تھا۔

انسپکٹر دوست محمد نے سر اٹھایا اور بولا ــــ "خان صاحب! میرے لیے حکم ہے کہ آپ کو ساری رات سونے نہ دوں.... ڈپٹی کو شاید معلوم ہے کہ میری آپ کے ساتھ دوستی ہے۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ محبّت اور دوستی کا چکّر چلانا۔"

"چلا لو یار!" ــــ عبدالجلیل نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا ــــ "جو چکّر چل سکتا ہے چلا لو۔"

دوست محمد نے دائیں بائیں سر ہلایا اور بولا ــــ "نہیں چلاؤں گا۔ کوئی چکّر نہیں چلاؤں گا" ــــ اُس نے آہ بھری اور کہنے لگا ــــ "سب سمجھتا ہوں خان صاحب! سب سمجھتا ہوں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ جو تین چار کانسٹیبل یہاں ڈیوٹی پر ہیں یہ میرے اپنے آدمی ہیں۔"

"کانسٹیبل کسی کے بھی آدمی نہیں ہُوا کرتے دوست محمد!" ــــ عبدالجلیل نے کہا ــــ "کسی پر بھروسہ نہ کرنا۔ اپنے محکمے کو تم جانتے ہو۔ سچ پوچھو تو مجھے تم پر بھی بھروسہ نہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں خان صاحب!" ــــ انسپکٹر دوست محمد نے کہا ــــ "ابھی کل ہم آزاد ہوتے ہیں اور آج بھائی نے بھائی کو کھانا شروع کر دیا ہے۔ ہم دین و ایمان سے بھی آزاد ہو گئے ہیں۔"

"مجھے ساری رات کس طرح جگائے رکھو گے؟" ــــ عبدالجلیل نے مذاق کے لہجے میں پوچھا۔

"میں اس واردات کی کوئی بات نہیں کروں گا جس میں آپ کو پھانسا گیا ہے" ــــ دوست محمد نے جواب دیا ــــ "میں آپ کے پاس بیٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن ڈر ہے کہ ملک صاحب نہ آ جائیں ..... باتیں کریں گے۔ گپ شپ لگائیں گے۔"

اور وہ گپ شپ لگاتے رہے۔ پرانی باتیں، پاکستان کی باتیں، اُس دور کی باتیں جب وہ انگریزوں کے ملازمت میں کہیں اکٹھے رہے تھے، پاکستان کے لیے خون دینے والوں کی باتیں، پاکستان کی رگوں سے خون چوسنے والوں کی باتیں، پاکستان کے اُن مخالفین کی باتیں جو پاکستان کے تخت و تاج پر قابض تھے، اور وہ دونوں ان باتوں میں ایسے مگن ہوتے کہ رات کے دو بج گئے۔

"سو جائیں خان صاحب!" ــــ انسپکٹر دوست محمد نے کہا ــــ "یہیں بنچ پر سو جائیں۔"

دوست محمد اس انداز سے کمرے سے نکل گیا جیسے گپ شپ لگانے ہی آیا تھا۔

✪

دوسرے دن ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی اپنے ایس۔ پی کے گھر بیٹھا تھا۔ ایس۔ پی نے اسے صبح سویرے ہی بلا لیا تھا۔ اُس نے رجب علی کو اُن بالائی افسروں کے نام بتاتے جنہوں نے اُسے گزشتہ رات فون پر کہا تھا کہ عبدالجلیل کو چھوڑ نہ دینا۔

"ملک صاحب!" ــــ ایس۔ پی نے کہا ــــ "معلوم ہوتا ہے جیسے سیکرٹیریٹ کی ساری توجہ اس مسئلے پر مرکوز ہو گئی ہے کہ عبدالجلیل کو کس طرح پھانسی چڑھایا جا سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں نا، کہ میں کس کس کی بات کر رہا ہوں، ورنہ عبدالقدیر جیسے گمنام آدمی تو یہاں قتل ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ عبدالجلیل کے ساتھ ان لوگوں کی دشمنی کیا ہے" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "سمگلنگ کا سلسلہ تو نہیں؟"

"جانے دو جی!" ــــ ایس۔ پی نے کہا ــــ "ہمیں نوکری کرنی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاتھوں کتنے قاتل چھڑوائے گئے ہیں اور کتنے قتل کرائے جا چکے ہیں۔ آپ دشمنی کی وجہ پوچھتے ہیں۔ حکومت اوچھے اور کمینے لوگوں کے ہاتھ آ گئی ہے۔ ان سے آپ اس سے زیادہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ پسماندہ دیہاتیوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر دشمنی پیدا کر لیں اور طاقت کا استعمال اپنے دشمنوں کے خلاف کریں۔ پاکستان کی اور ہماری قسمت اب انہی کے ہاتھ میں ہے۔"

"مجھے تو افسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہمارے ہاتھوں کتنا ظلم کرا رہے ہیں" ــــ رجب علی نے کہا۔

"میں نے بھی شروع شروع میں افسوس کیا تھا" ــــ ایس۔ پی نے کہا ــــ "لیکن نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھنے یا ترقی سے محروم ہو جانے کا افسوس قابلِ برداشت نہیں تھا۔ عبدالجلیل کا حشر دیکھ لو۔ آج ایس۔ پی نہیں تو ڈی۔ ایس۔ پی ضرور ہوتا مگر اسے جبری ریٹائرمنٹ پر بھیج دیا گیا اور آج قتل کا ملزم ہے۔ میں جانتا ہوں سے ملزم کس نے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے..... ملک صاحب!" ــــ ایس۔ پی نے آہ بھر کر کہا ــــ "ہم نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح عہد کیا تھا کہ پاکستان میں حلال کی کھاؤں گا اور یہاں کسی مجرم کو زندہ نہیں رہنے دوں گا مگر پاکستان کی حکومت ہی مجرموں کے ہاتھ آ گئی اور انہوں نے ہمیں بھی مجرم بنا ڈالا ہے، کیا ہیں ملک صاحب؟ .... مجرموں کے محافظ.... ہمیں حکم ماننا ہے۔ ہمارا اوّلیں فرض یہ ہے کہ کرسی پر جو بیٹھ جائے اُس کی حفاظت کریں۔"

"یہاں جو بھی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اُس کی یہی ایک خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا جنازہ اسی کرسی پر اُ
— ملک رجب علی نے کہا۔

"جاؤ بھائی میرے!" — ایس۔پی۔ نے کہا "ثابت کرو کہ عبدالقدیر کا قاتل عبدالجلیل ہے"۔

"مگر صاحب!" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "آپ اسے جانتے ہیں وہ کتنا عقلمند اور تجربہ کا
پولیس انسپکٹر رہ چکا ہے"۔

"وہ آپ کے قبضے میں ہے" — ایس۔ پی نے کہا — "اُس کی عقل مار دو۔ اس کے ہوش گم کر
دو۔ زبان سے نہیں ہاتھوں سے کام لو سیکرٹریٹ کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا ملک صاحب! اس کے گھر کی
تلاشی لو۔ اسلحہ برآمد کرو۔ آلۂ قتل برآمد کرو"۔

ملک رجب علی جب وہاں سے اُٹھا تو اُس کے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اُس کا ذہن صاف تھا۔ اُسے
ایس۔ پی بننا تھا۔ اس کے لیے اسے کچھ کر کے دکھانا تھا۔

✪

وہ جب سی۔ آئی۔ اے کے تفتیشی کمرے میں داخل ہُوا، اُس وقت عبدالجلیل بنچ پر گہری نیند سویا ہُوا
تھا۔ انسپکٹر دوست محمد دفتر میں بیٹھا تھا۔ اُس نے رجب علی کو بتایا تھا کہ اُس نے ملزم کو ساری رات
سونے نہیں دیا لیکن وہ ملزم سے کچھ بھی اگلوا نہیں سکا۔ رجب علی نے کہا تھا — "اُگلے گا۔ اس کا باپ
بھی اُگلے گا"۔

ملک رجب علی کے ہاتھ میں افسروں والی دو فٹ لمبی چھڑی تھی۔ اُس نے چھڑی بڑے زور سے سو ئے
ہوتے عبدالجلیل کے پہلو میں چبھوئی۔ عبدالجلیل اُٹھ بیٹھا۔

"کیا ارادے ہیں دوست؟" — اُس نے عبدالجلیل سے پوچھا — "مجھے گناہگار نہ کر و یار! میرے
ہاتھ سے ہڈیاں نہ تڑواؤ"۔

عبدالجلیل ہنس پڑا۔ رجب علی نے اس کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا۔ عبدالجلیل اٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس
نے سیدھا گھونسہ رجب علی کے منہ پر مارا۔ رجب علی تین چار قدم پیچھے پیٹھ کے بل گرا۔ دروازے پر
کھڑا کانسٹیبل دوڑ کر اندر آیا۔ رجب علی اٹھ رہا تھا۔ عبدالجلیل نے اچھل کر اُس کے پہلو میں لات ماری۔ ڈی ایس پی
دیوار سے جا لگا۔ کانسٹیبل کے پاس رائفل تھی۔ وہ رائفل دونوں ہاتھوں میں لے کر عبدالجلیل کو بٹ مارنے
کے لیے آگے بڑھا۔ عبدالجلیل نے لپک کر اُس کی رائفل پکڑ لی اور اس کے پیٹ میں ٹھڈ مارا۔ کانسٹیبل
دوہرا ہوگیا اور اُس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی۔

عبدالجلیل نے رائفل نہ اٹھائی۔ رجب علی اب آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔ عبدالجلیل کھڑا رہا۔

"اب پوچھو میرا ارادہ کیا ہے" — عبدالجلیل نے اُسے کہا — "مجھے معلوم ہے میرا انجام کیا ہوگا۔
اب میری ہڈیاں توڑنے کا بندوبست کرو۔ میں تیار ہوں"۔

اور اُس کی ہڈیاں توڑنے کا بندوبست کر دیا گیا۔

وہ ایک اور کمرہ تھا۔ وہاں سے کسی کی آواز باہر نہیں آتی تھی۔

پورا ایک دن اور ایک پوری رات گزر جانے کے بعد جب ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی اس کمرے
میں داخل ہُوا تو عبدالجلیل فرش پر پڑا تھا۔ رجب علی نے عبدالجلیل کے پہلو میں ٹھوکر ماری تو عبدالجلیل نے
کروٹ بدلی۔ اس کی آنکھیں آدھ کھلی تھیں اور چہرے کا رنگ لاش جیسا تھا۔

"مجھے پہچانتے ہو جلیل؟" — رجب علی نے کہا۔

جلیل نیم غشی کی حالت میں تھا۔

رجب علی نے ایک کانسٹیبل سے پانی مانگا۔ گلاس ہاتھ میں لے کر اُس نے کھڑے کھڑے
پانی کی دھار عبدالجلیل کے ہونٹوں اور چہرے پر انڈیلی۔ عبدالجلیل کے ہونٹ ہلنے لگے۔ وہ نیم غشی میں پانی
پینے کی کوشش کر رہا تھا، پھر اُس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ رجب علی اور دو کانسٹیبل جو ہڈیاں توڑنے
کے ایسے ماہر تھے کہ جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں ہوتا تھا، کھڑے دیکھتے رہے۔ عبدالجلیل بیٹھ گیا۔ اُس
کے چہرے پر اذیّت اور درد کا تاثر تھا۔

"عبدالقدیر کو کس نے قتل کیا ہے عبدالجلیل؟" — ملک رجب علی نے پوچھا۔

عبدالجلیل نے اوپر دیکھا۔ اس کی آنکھیں پوری نہیں کھل رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ ہلے جیسے کچھ کہہ رہا
ہو۔ ملک رجب علی اس کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا اور کان اس کے منہ کے قریب کیے۔

"عبدالجلیل کو کس نے قتل کیا ہے جلیل؟" — رجب علی نے کہا — "بول سکتے ہو؟"

"سُن ملک!" — عبدالجلیل نے بڑی دھیمی سی سرگوشی کی — "تم میری ہڈیاں توڑ سکتے ہو۔ میرا ایمان سلامت
ہے اور آخری سانس تک سلامت رہے گا"۔

"کیوں اپنی زندگی تباہ کرتے ہو خان!" — ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی نے دوستانہ لہجے میں کہا —
"میں تمہیں اب بھی عبدالجلیل خان ہی کہوں گا۔ مان جاؤ۔ بول پڑو"۔

"تم اپنا ایمان ڈی۔ ایس۔ پی کے عہدے کے عوض پاکستان کے دشمنوں کے قدموں میں
پھینک چکے ہو" — عبدالجلیل نے کہا — "میں ایمان پر اپنی جان دے دوں گا۔ تم مرد نہیں ہو ملک!
مرد ہوتے تو مجھے للکار کر انتقام لیتے"۔

"آج شام تک سوچنے کی مہلت دیتا ہوں" — ملک رجب علی نے کہا — "نہیں مانو گے تو
رات کو تمہارے گھر کی تلاشی لی جائے گی"۔

"ابھی سے لو تلاشی" — عبدالجلیل نے کہا — "شام کو بھی میرا یہی جواب ہوگا جو تم اب سن رہے ہو"۔

"اسے یہیں پڑا رہنے دو" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کانسٹیبلوں سے کہا — "اس کے پاس
پانی رکھ دو اور تم دونوں باہر سے تالا لگا کر چلے جاؤ"۔

دونوں کانسٹیبل ڈی۔ ایس۔ پی کے پیچھے پیچھے نکل گئے اور دروازہ بند کر کے تالا لگا گئے۔

✪

عبدالجلیل خان کو جیسے پتہ ہی نہ چلا ہو کہ اس کی ہڈی پسلی ایک کر دینے والے جا چکے ہیں۔ اسے
ایک دن اور ایک رات جو اذیتیں دی گئی تھیں ان سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ یہ تو پولیس کا معمول
تھا۔ البتہ عبدالجلیل نے ان اذیتوں کا ذائقہ پہلی بار چکھا تھا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں وہ پل پل مرا اور مر مر کے
زندہ ہُوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے سیاہ کالی گھٹا آجاتی اور گزر جاتی تھی۔ کبھی اسے یوں دھماکے
سنائی دیتے جیسے اس کے جسم کے اندر بجلیاں کڑکی اور چمکی ہوں۔

اپنے ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ باہر جا کر ایک کانسٹیبل نے کہا تھا — "جناب! یہ تو بڑا ہی سخت جان ہے۔ اسے ہم نے برف کے بلاک پر پیٹ کے بل لٹایا اور میں آدھے گھنٹے سے زیادہ اس کی پیٹھ پر بیٹھا رہا۔ دو منٹ بعد ملزم چیخنے چلّانے لگتے ہیں لیکن جناب! اس کی آواز نہیں نکلی۔ تڑپا نہیں۔ بولا نہیں۔"

"میرا تو خیال تھا کہ مر گیا ہے" — دوسرے کانسٹیبل نے کہا — "میں نے اس کے منہ کی طرف ہو کر دیکھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ جناب! وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ اللہ کے کسی ایسے کلام کا وِرد کر رہا تھا جس میں کوئی طاقت ہے جناب! آدھے گھنٹے تک کوئی انسان برف کے بلاک پر ننگا لیٹ کر زندہ رہ سکتا ہے؟"

"پھر جناب!" — پہلے کانسٹیبل نے کہا — "ہم نے اس پر وہ حربہ بھی آزمایا جس سے پتھر بھی موم ہو کر پگھل جاتے ہیں۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ درد کی شدت اس سے برداشت نہیں ہو رہی لیکن جناب! اس کے ہونٹ ہم نے پھر ہلتے دیکھے۔"

"یہ وہی وِرد کر رہا تھا" — دوسرے کانسٹیبل نے کہا۔

دونوں کانسٹیبل بولتے جا رہے تھے اور ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی آہستہ آہستہ ان سے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ وہ کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کانسٹیبلوں کی باتیں اُسے تکلیف دے رہی ہیں۔

"ہم نے کئی بار پوچھا، اقبالِ جرم کرو گے؟" — ایک کانسٹیبل نے کہا — "اس نے کوئی جواب نہ دیا۔"

"جناب!" — دوسرے کانسٹیبل نے کہا — "اس کے ہاتھ میں کوئی طاقت ہے۔ پہنچ والا لگتا ہے جناب!"

رجب علی نے گرج کر کہا — "بکواس بند کرو..... دفع ہو جاؤ اور اگلے حکم کا انتظار کرو۔"

انسپکٹر دوست محمد اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی کی گرج سن کر باہر آ گیا لیکن اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ اس نے دیوار کا سہارا لے لیا اور جھک گیا جیسے گرنے والا ہو۔

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" — ملک رجب علی نے اُس سے پوچھا۔

"صبح سے چکر آ رہے ہیں" — دوست محمد نے جواب دیا — "میں آپ کے ہی انتظار میں تھا۔ کھڑا نہیں ہُوا جاتا۔ دل پر بہت گھبراہٹ ہے" — اور وہ بیٹھ گیا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ تانگہ لے آئے اور دوست محمد کو ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ دوست محمد نے کسی دوسرے کانسٹیبل کو ساتھ لے لیا۔ وہ جب تانگے میں بیٹھا تو چکر ختم ہو چکے تھے۔ جس کانسٹیبل کو اُس نے ساتھ لیا تھا اسے اُس نے کہا کہ اُسے کوئی تکلیف نہیں۔ وہ بالکل تندرست ہے۔

"تم جانتے ہو عبدالجلیل خان میرا دوست ہی نہیں اُستاد بھی ہے" — دوست محمد نے کانسٹیبل سے کہا — "جب تک اسے یہاں رکھا جائے گا میں یہاں سے غائب رہوں گا۔ اسے دشمنی سے پھانسا جا رہا ہے۔ تم واپس آ کر ملک رجب علی سے کہنا کہ انسپکٹر صاحب راستے میں بے ہوش ہو گئے تھے۔ میں ڈاکٹر سے لکھوا لوں گا کہ میں پندرہ بیس دنوں تک ڈیوٹی کے قابل نہیں رہا۔"

✪

ملک رجب علی اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس کے اندر انسانی ہمدردی کا جذبہ مر چکا ہے۔ اس نے تین ساڑھے تین برسوں میں سینکڑوں ملزموں اور مشتبہوں کو غیر انسانی ایذا رسانی کی چکی میں ڈالا تھا۔ ان میں بے گناہ بھی تھے۔ وہ جانتا تھا یہ بے گناہ ہیں لیکن اسے ڈی۔ ایس۔ پی کا عہدہ حاصل کرنا تھا جو اُسے حاصل ہو گیا تھا۔ اب اسے ایس۔ پی بننا تھا۔ اس نے اپنے اندر نہ قوم کا کوئی جذبہ رہنے دیا تھا نہ کسی انسان کا۔ انسانی لاش اس کی نگاہ میں مری ہوئی چیونٹی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ تھانیداری کے زمانے میں جب کسی مقتول کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجا کرتا تھا تو پوسٹ مارٹم کے بعد لاش اس کے لواحقین کے حوالے کرنے کی بھی رشوت لیا کرتا تھا۔ وہی نہیں، تھانوں کے بیشتر ایس۔ ایچ۔ او مقتول کی لاش پر گِدھوں کی طرح بیٹھ جاتے اور منہ مانگا نذرانہ وصول کر کے لاش وارثوں کے حوالے کیا کرتے تھے۔

اسے پرانے افسروں نے یہی سبق دیا تھا کہ درندہ بننا پڑتا ہے، ظالم ہونا پڑتا ہے۔ دل میں انسانوں کا درد رکھو گے تو پٹ جاؤ گے، مگر اب وہ عبدالجلیل کو نیم غشی کی حالت میں دیکھ کر آیا تو وہ اپنے اندر ایک چبھن سی خلش سی اور جھنجھلاہٹ سی محسوس کر رہا تھا جیسے اسے کوئی طعنے دے رہا ہو۔

"تم اپنا ایمان ڈی۔ ایس۔ پی کے عہدے کے عوض پاکستان کے دشمنوں کے قدموں میں پھینک چکے ہو۔"

"تم میری ہڈیاں توڑ سکتے ہو۔ میرا ایمان سلامت ہے۔"

"تم مرد نہیں ہو ملک!"

اُس کے اردگرد بے شمار بھِڑیں بھنبھنانے لگیں۔

"وہ اللہ کے کسی ایسے کلام کا وِرد کر رہا تھا جس میں کوئی طاقت ہے جناب!"

"آدھے گھنٹے تک کوئی انسان برف کے بلاک پر لیٹ کر زندہ رہ سکتا ہے؟"

"اس کے ہاتھ میں کوئی طاقت ہے۔"

بھِڑوں کے بادل جیسے بھنبھناتے غول میں سے کوئی کوئی بھِڑ اسے ڈنک بھی مارنے لگی تھی۔ اس نے اپنے خیالوں کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ سوچنے لگا کہ آج رات عبدالجلیل کے گھر کی تلاشی لے گا اور کچھ اسلحہ برآمد کرنے کا انتظام کر لے گا۔

"کیا برآمد ہونا چاہیے؟" — اُس نے سوچا۔

"ریوالور تو ضرور ہونا چاہیے" — اس نے اپنے آپ کو جواب دیا — "لیکن اس کے پاس لائسنس کا ریوالور تو ہو گا ہی۔ ایک ریوالور بغیر لائسنس برآمد کرنا ہے۔"

"میرا ایمان آخری سانس تک سلامت رہے گا" — ایک بھِڑ نے اُسے ڈنک مار کر تڑپا دیا۔

اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے ان آوازوں سے توجہ ہٹا لی۔

"اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ تخریب کار ہے، دو گرینیڈ برآمد کرنے لازمی ہیں۔"

"اس کے ہاتھ میں کوئی طاقت ہے۔"

رجب علی اس آواز پر سٹپٹا اٹھا۔

"تین چار خنجر ضرور برآمد کروں گا۔"

"تم ڈی۔ ایس۔ پی ہو کر زیادہ عقلمند تو نہیں ہو گئے ملک!" — اُسے عبدالجلیل کی دو تین روز پہلے

کی آواز سنائی دی۔

فون کی گھنٹی بجی۔ وہ یوں بدکا جیسے گھنٹی نے اس پر طنزیہ قہقہہ لگایا ہو۔ اُس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ اُس کا ایس۔پی بول رہا تھا۔

"ملک صاحب! چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش کے ہاتھ بڑے ہی لمبے ہیں۔ ہوم منسٹر لوں پیچھے پڑ گیا ہے جیسے ایک ریٹائرڈ اے۔ایس۔آئی نہیں، منسٹر کا باپ قتل ہو گیا ہے۔ مجھے جواب طلبی کی دھمکی دے رہا ہے اور پوچھتا ہے کہ تفتیش کون کر رہا ہے.... کیا حال ہے اُس کا؟"

"بے ہوش پڑا ہے بدبخت!" — ملک رجب علی نے جواب دیا۔

"مانا نہیں؟"

"نہیں جی!" — رجب علی نے اکتاتے ہوتے لہجے میں کہا — "وہ کیا مانے گا، سر! اس واردات میں اس کا ذرا سا بھی عمل دخل معلوم نہیں ہوتا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں صحیح تفتیش شروع کر دیتا ہوں اس پر تو ہم وقت ضائع کر رہے ہیں.... سچی بات یہ ہے سر! میں تو اس شخص کے سامنے جاتے ہوئے بھی گھبرانے لگا ہوں۔"

"کیوں؟"

"یہی تو میں سمجھ نہیں سکتا" — رجب علی نے جواب دیا۔

ایس۔پی نے جب بولنا شروع کیا تو ملک رجب علی کے چہرے سے تذبذب کا تاثر ڈھلنے لگا اور رونق عود کرنے لگی۔ ایس۔پی نے جب ریسیور رکھا تو ڈی۔ایس۔پی کے گرد بھنبھناتی ہوئی سینکڑوں بھڑیں غائب ہو چکی تھیں۔

☆

عبدالجلیل خان اُسی کمرے میں دیوار کے ساتھ پیٹھ لگاتے فرش پر بیٹھا تھا۔ اُس کے جسم کا ہر ایک جوڑ دُکھ رہا تھا۔ کبھی تو درد کی لہر سر سے اٹھتی اور پاؤں کے ناخنوں تک چلی جاتی تھی۔ اس پر نیم غشی طاری تھی۔ ایک مسلسل تاریکی تھی جو اُس کی آنکھوں میں چھا گئی تھی۔ اس کا دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اعصاب ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ گزرے ہوتے چوبیس گھنٹوں میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔ اسے کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا۔ اُس نے پانی بھی نہیں پیا تھا۔

اُسے شعوری طور پر یہ بھی یاد نہیں تھا کہ ڈی۔ایس۔پی رجب علی آیا تھا اور اس نے پوچھا تھا کہ عبداللہ کو کس نے قتل کیا ہے۔ اُسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ اُس نے رجب علی کی ہر بات کا جواب دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنے ایمان پر جان دے دوں گا۔ وہ لاشعوری طور پر جواب دیتا رہا تھا۔ غشی، نیند اور نشے کی بدمستی میں انسان کی زبان سے وہ باتیں نکلتی ہیں جو اُس کے ذہن لاشعور کی تہوں میں چھپی ہوتی ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی فطرت کے ڈھکے چھپے گوشے اور ان گوشوں میں چھپاتے ہوتے بھید بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

عبدالجلیل غشی میں ایمان اور ایمان پر جان دینے کی باتیں کرتا رہا تھا۔ اب وہ اس احساس سے بیگانہ تھا کہ وہ تنہا ہے اور وہ بھوکا اور پیاسا ہے۔ اسے اس تاریکی میں جو اُس کی آنکھوں کے سامنے اور ذہن میں چھا گئی تھی، ہلکی ہلکی روشنی نظر آنے لگی جیسے پَو پھٹ رہی ہو۔ ایک شور سا کہیں سے اُٹھنے لگا جو تیزی سے بلند ہوتا گیا، پھر اُسے سائے سے نظر آنے لگے جیسے سمندر کی بپھری ہوتی سفید سفید موجیں ساحل کی چٹانوں کو پاش پاش کرنے کو بڑھی آ رہی ہوں۔

قریب آئیں تو یہ موجیں انسانوں کا روپ دھارنے لگیں اور ان انسانوں کا شور واضح ہونے لگا — "پاکستان زندہ باد" — یہ شور گھٹاؤں کی گرج بنتا چلا گیا — "لے کے رہیں گے پاکستان.... بٹ کے رہے گا ہندوستان" — "لا الٰہ الاّ اللہ، لا الٰہ الاّ اللہ" — تکبیر کے نعرے۔ رسالتؐ کے نعرے نعروں کی گھن گرج جیسے رعد کی کڑک — سبز پرچم اور سبز دوپٹے بھی دکھائی دینے لگے۔

عبدالجلیل کے ہونٹوں پر جو سوکھ کے پھٹ گئے تھے تبسم آ گیا۔ اس کے جسم میں جو رُوئی کی طرح دُھنک دیا گیا تھا، حرکت ہوئی۔ جسم کانپا اور ہونٹوں کا تبسم مسکراہٹ بن گیا۔ عبدالجلیل اُٹھ کھڑا ہوا اور انسانوں کے اس سمندر میں گم ہو جانے کو آگے بڑھا مگر یہ سمندر جنگل بن گیا — ہرا سر سبز جنگل — پھڑ پھڑاتے، لہراتے اور بڑی شان سے جھومتے ہوتے جھنڈوں کا ہرا بھرا جنگل۔ جھنڈے بڑے بھی تھے، چھوٹے بھی اور سبز جھنڈیاں بنیری کی طرح دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

عبدالجلیل کو ہزاروں چاند اور ہزاروں تارے دکھائی دیتے اور وہ ان میں گم ہو گیا۔ اس نے اپنی ذات بپھری ہوئی طوفانی موجوں جیسے ہجوم میں مدغم کر دی۔ وہ اب ذرّہ نہیں کُل تھا۔ وہ اب فلک کی بیکراں وسعت میں بھٹکتا ہوا ننھا سا ستارہ نہیں تھا، کہکشاں تھا۔ وہ اب آسمان سے گرنے والا ایک قطرہ

نہیں تھا، سیلابی دریا تھا۔ وہ اب شرارہ نہیں شعلہ تھا — اور وہ جھنڈوں کے جنگل میں چلا جا رہا تھا۔

آسمان میں دو پتنگ جن کی ڈوریں ایک دوسری سے اُلجھی ہوئی تھیں، اُسے ڈولتی دکھائی دینے لگیں — ایک پتنگ سبز تھی، دوسری نیلی، سرخ اور سفید لکیروں والی — ان میں سے ایک کو کٹ جانا تھا۔ عبدالجلیل جس ہجوم کا ایک ذرّہ بن گیا تھا، اس ہجوم سے للکار سنائی دینے لگی — "سبز پتنگ کی ڈور نہیں کٹ سکتی۔ اسے ہم نے اپنے خون اور شہیدوں کی پسی ہوئی ہڈیوں کا مانجھا دیا ہے۔"

کچھ دیر کے لیے عبدالجلیل نے اپنے آپ کو ہجوم سے الگ تھلگ دیکھا۔ اُس کا لباس جُدا اور اس کی سرگرمیاں جُدا تھیں — وہ پولیس کی وردی میں تھا، مگر وہ فوراً ہی ہجوم میں تحلیل ہو گیا۔ اُس نے چلّا چلّا کر کہا تھا — "یہ نہ دیکھو میں نے کیا پہن رکھا ہے۔ میں تم میں سے ہوں۔ میں بھی تمھاری منزل کا مسافر ہوں۔"

پھر ایک پتنگ کٹ گئی۔ کٹی ہوئی پتنگ سبز نہیں تھی۔ وہ جو سبز تھی وہ عجب شان سے تیر کی طرح اوپر چلی گئی تھی، اور وہ جو کٹ گئی تھی وہ دُور ہی دور ہٹتی اور گرتی جا رہی تھی، پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی ہجوم کے نعروں کی گرج نے زمین و آسمان ہلا ڈالے۔

✪

ایک کانسٹیبل نے اس کمرے کا دروازہ کھولا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا عبدالجلیل کی طرف بڑھنے لگا۔ عبدالجلیل دونوں بازو اوپر کر کے لہرا رہا تھا اور اس کے ہونٹوں سے سرگوشیاں پھسل رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ دیوار کے ساتھ بیٹھ لگاتے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

کانسٹیبل کو ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی کہہ گیا تھا کہ کچھ دیر بعد اسے دیکھ لینا۔ ہوش میں آئے تو اسے پانی پلا دینا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل کو رجب علی کہہ گیا تھا کہ عبدالجلیل کو معمولی سا کھانا کھلا دینا۔

ہیڈ کانسٹیبل کمرے میں یہ دیکھنے کے لیے داخل ہُوا کہ ملزم ہوش میں آ گیا ہو تو اسے کھانا کھلا دے۔ اس نے دیکھا کہ کانسٹیبل عبدالجلیل کے پاس بیٹھا اُس کی سرگوشیاں سن رہا ہے۔ کانسٹیبل ہیڈ کانسٹیبل کو دیکھ کر اٹھا۔ اُس نے ہیڈ کانسٹیبل کو سر ہلا کر بتایا کہ ہوش میں نہیں۔ دونوں باہر نکل آئے۔

"بے ہوشی میں نعرے لگا رہا ہے" — کانسٹیبل نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا — "میں نے اس کی سرگوشیاں سنی ہیں۔ یہ پاکستان بنا رہا ہے۔ کہتا ہے، لے کے رہیں گے پاکستان۔"

"مطلب ہے ابھی ہوش میں نہیں آیا" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "یہ اسی پاکستان میں رہے گا جواب بے ہوشی میں بنا رہا ہے۔ پہلا پاکستان تو اس نے دیکھ لیا ہے... پڑا رہنے دو۔"

دونوں باہر نکل گئے اور باہر سے دروازہ مقفّل کر دیا۔

عبدالجلیل کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اُس کے دانت پسنے لگے — وہ ہجوم بکھر گیا تھا جس کا وہ حصّہ بن گیا تھا۔ کہکشاں کے ستارے اِدھر اُدھر ٹوٹ رہے تھے۔ نعرے کربناک چیخوں اور آہ و بکا میں بدل گئے تھے۔

خُون — ہر سو خُون — زمین سرخ، آسمان لال!

خون ٹپکاتے قافلے چلے جا رہے تھے۔ عبدالجلیل اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ اپنی بیوی کو، اپنے

بچوں کو دیکھ رہا تھا۔

لاشیں — بچوں کی، عورتوں کی، بوڑھوں کی اور جوانوں کی — ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے کھیتوں کو مسلمانوں کے خُون سے سیراب کر لیا اور ان میں ان کی ہڈیوں کی کھاد ڈال دی۔

ہولناک خواب — تاریک رات — اس رات کے بطن سے جس سحر نے جنم لیا وہ مسلمانوں کے خون سے دُھلی ہُوئی تھی۔

عبدالجلیل نے منزل پالی — خُون ٹپکاتے قافلے منزل پر آ گئے — عبدالجلیل تھک کر گر پڑا — یہاں آ کر تو سبھی گر پڑے تھے لیکن اٹھ کھڑے ہُوئے۔ سب نے اس زمین کو دیکھا جس کی خاطر اُنھوں نے بچے ذبح کرائے تھے۔

ایک صدی بعد قافلہ منزل پر پہنچ گیا۔ اتنی لمبی مسافت کے ٹوٹے ہُوئے جسم تر و تازہ ہو گئے۔ چہروں پر رونق آ گئی۔ سر اونچے ہو گئے۔

کانسٹیبل جو کمرے کے باہر ڈیوٹی پر تھا، وہ چونک اٹھا۔ اسے کمرے میں کوئی آواز سنائی دی تھی۔ وہ دروازہ کھولنے ہی لگا تھا کہ اندر سے دروازے پر بڑی زور سے دستک ہوئی۔ کانسٹیبل دروازہ کھول کر اندر گیا۔ اسے عبدالجلیل دروازے کے پاس کھڑا دکھائی دیا۔

"تم ہوش میں آ گئے ہو؟" — کانسٹیبل نے اُس سے ایسے لہجے میں پوچھا جس لہجے میں وہ جرائم پیشہ ملزموں کے ساتھ بات کیا کرتا تھا۔

"سب کو بلاؤ" — عبدالجلیل نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا — "یہ دیکھو۔ اس زمین پر کتنے سانپ آ گئے ہیں" — وہ فرش کی طرف اشارہ کر رہا تھا — "مار دو ان سانپوں کو۔ یہ ہماری زمین کے اور ہماری قوم کے دشمن ہیں۔ یہ پاکستان کو ڈس لیں گے۔"

کانسٹیبل نے جھنجھلا کر اُسے بازو سے پکڑا اور اسے گھسیٹ کر بنچ کے قریب لے گیا۔

"یہاں بیٹھ جا!" — کانسٹیبل نے اسے دھکا دے کر بنچ پر بٹھاتے ہُوئے کہا — "ابھی تو بے ہوش پڑا تھا۔ اب تجھے سانپ نظر آنے لگے ہیں۔ یہاں تجھ جیسا جو آتا ہے اُسے سانپ ہی نظر آتے ہیں۔ تیرا دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔"

عبدالجلیل ہوش میں نہیں تھا۔ اس کا ذہن لاشعور زندہ و بیدار تھا۔ وہ اُٹھ کر دروازے تک جانے کے قابل نہیں تھا۔ اُسے پاکستان کی سرزمین پر بڑے زہریلے سانپ رینگتے نظر آتے اور وہ بیہوشی کے عالم میں اُٹھ کھڑا ہُوا تھا جیسے نیند میں چلنے والے کیا کرتے ہیں۔ اُسے تو احساس ہی نہیں تھا کہ کانسٹیبل نے اُسے گھسیٹ کر بنچ پر بٹھا دیا ہے۔

"سانپ.... آستین کے سانپ" — وہ بڑبڑا رہا تھا۔

اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی آواز دبتی جا رہی تھی — "یہ سانپ پاکستان کو ڈس لیں گے" — اور وہ بنچ سے لڑھک کر فرش پر جا پڑا۔

✪

دو روز بعد اخباروں میں خبر چھپی کہ ایک ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر عبدالجلیل خان کو ریٹائرڈ اسسٹنٹ سب انسپکٹر عبدالقدیر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ آج رات اس کی خانہ تلاشی میں اُس کے گھر

سے دو ریوالور، دو گرنیڈ، ایک سٹین گن اور چار خنجر برآمد ہوتے ہیں۔ ایک بکس ایمونیشن کا بھی مِلا ہے معلوم ہُوا ہے کہ ملزم عبدالجلیل وطن دشمن سرگرمیوں میں ملوّث تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی نے بڑے ڈرامائی انداز میں ملزم کا سراغ لگایا اور اسے گرفتار کیا ہے۔ سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

عبدالجلیل کو جاننے والے اس خبر کو سچ نہیں مانتے تھے لیکن وہ جس محلّے میں رہتا تھا، وہاں کے لوگ کہتے تھے کہ عبدالجلیل کو ہتھکڑیوں میں لایا گیا۔ ساتھ ایک ڈی۔ ایس۔ پی اور پولیس کی کچھ نفری تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے عبدالجلیل کے گھر کی تلاشی لی اور اسلحہ برآمد کیا۔

محلّے والوں نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ تلاشی لینے کے لیے کتنے لوگ اندر گئے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ محلّے والے دیکھ نہیں سکے تھے کہ جو اسلحہ اور ایمونیشن برآمد کیا گیا ہے، وہ باہر سے اندر گیا تھا۔ برآمد کرنے والے یہ اپنے ساتھ چھپا کر لے گئے تھے۔ جن دو گواہوں کی موجودگی میں برآمدگی کی گئی تھی وہ پولیس کے اپنے آدمی تھے۔ وہ پولیس کے تیار کیے ہوئے مقدموں میں استغاثہ کے خالی خانوں کو پُر کرنے کی مہارت رکھتے تھے۔

عبدالجلیل پر خاموشی طاری تھی۔ اس کا سَر ڈول رہا تھا۔ اُسے تو ہوش ہی نہیں تھا کہ دیکھتا کہ اُس کے گھر میں پولیس کِس طرح من مانی کر رہی ہے۔ اُسے ہتھکڑیوں میں اس حال میں دیکھ کر اس کی بیوی پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اُس کا ایک ہی بیٹا تھا جس کی عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ اُس کا نام اصغر تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرف لپکتا تھا اور پولیس اُسے باپ کے قریب جانے نہیں دیتی تھی۔

یہ خبر راولپنڈی میں ارشد اور طاہرہ نے بھی پڑھی۔ ارشد کتنی ہی دیر خبر کے الفاظ میں کھویا رہا۔ طاہرہ نے ارشد کی زبان سے عبدالجلیل کا نام سنا تھا۔ وہ ارشد سے پوچھ رہی تھی کہ اس خبر میں کہاں تک سچائی ہو سکتی ہے کہ عبدالجلیل وطن دشمن سرگرمیوں میں ملوّث تھا۔

"بالکل جھوٹ ہے" — ارشد نے کہا — "میں حیران ہوں کہ عبدالقدیر کو عبدالجلیل نے کیوں قتل کیا ہے۔ مجھے لاہور جانا پڑے گا۔ معلوم ہوتا ہے عبدالجلیل کو کسی جال میں پھانسا گیا ہے۔"

اس جال کو کاما تانگے والا سمجھتا تھا۔ اُس نے یہ خبر پڑھی تو سر سے پاؤں تک ہل گیا۔ وہ عبدالجلیل کے گھر گیا اور اُس کی بیوی سے پوچھا کہ کیا ہُوا تھا۔ بیوی نے اسے بتایا کہ عبدالجلیل تو جیسے ہوش میں ہی نہیں تھا۔ گھر سے سب کو باہر نکال دیا گیا تھا۔ سارا محلّہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ عبدالجلیل کی بیوی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اسلحہ اور ایمونیشن جو برآمد کیا گیا ہے وہ پولیس کِس طرح اندر لے گئی تھی۔

عبدالجلیل کی بیوی رو رہی تھی۔ اُس پر خوف و ہراس بھی طاری تھا لیکن اُس کے اکلوتے اور کمسن بیٹے اصغر کی آنکھیں خشک تھیں۔ کامے کو وہ جانتا تھا۔ وہ کامے سے پوچھنے لگا کہ یہ کیا قصّہ ہے۔

"اپنا دل مضبوط رکھو اصغر بیٹا!" — کامے نے کہا — "تمہارے ابّو آجائیں گے۔"

کامے کی زبان ہکلا رہی تھی۔ اُسے کوئی بات سُوجھ ہی نہیں رہی تھی۔

"سُن میری بہن!" — اس نے عبدالجلیل کی بیوی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "میں اپنا آپ قربان کر سکتا ہُوں۔ دعا کرنا۔ میں تمہارا سہاگ واپس لانے جا رہا ہوں۔"

کاما جانتا تھا کہ سی۔ آئی۔ اے کا طریقہ تفتیش کیا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ عبدالجلیل کو کیسی کیسی

اذیتیں دی گئی ہوں گی۔ وہ باہر نکلا۔ تانگہ گھر لے گیا۔ گھوڑا کھول کر اُس نے کُھرلی پر باندھا اور چل پڑا۔

✪

ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی دفتر میں بیٹھا عبدالجلیل کا کیس تیار کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اسے بہت سے جھوٹے گواہوں کی ضرورت تھی۔ اس کے دروازے پر کھڑے کانسٹیبل نے اندر جا کر اُسے بتایا کہ ایک آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے کہ میں کاما تانگے والا ہُوں۔ عبدالقدیر کے قتل کا سراغ دے سکتا ہُوں۔ رجب علی نے اُسے فوراً بلا کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"میں ایک شرط پر بتا سکتا ہوں کہ قاتل کون ہے" — کامے نے ڈی۔ ایس۔ پی سے کہا — "انسپکٹر عبدالجلیل خان کو چھوڑ دیں۔ وہ بیگناہ ہے۔"

"تم اسے کس طرح اور کب سے جانتے ہو؟"

"ہماری یاری پاکستان سے پہلے کی ہے جناب!" — کامے نے جواب دیا — "میں اس شخص کا مرید ہوں۔ یہ وطن دشمن نہیں ہو سکتا۔"

"اس کے گھر سے ریوالور، سٹین گن اور گرنیڈ برآمد ہُوئے ہیں۔"

"سرکار!" — کامے نے ہنس کر کہا — "آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ ان برآمدگیوں سے میں خوب واقف ہُوں۔ خان صاحب نے غلطی یہ کی ہے کہ وزیروں اور حاکموں سے دشمنی مول لے لی ہے۔ آپ کو عبدالقدیر کا قاتل چاہیئے۔ وہ میں آپ کو دے دوں گا۔"

"دے دو۔"

"آپ خان صاحب کو چھوڑ دیں" — کامے نے کہا — "ابھی آپ نے مقدمہ تیار نہیں کیا۔"

"کیا تم ایک ڈی۔ ایس۔ پی پر اعتبار نہیں کرتے؟" — رجب علی نے کہا — "سمجھ لو کہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ مجھے اصل قاتل چاہیئے۔"

"وہ میں ہوں" — کامے نے کہا۔

"تم؟" — ڈی۔ ایس۔ پی نے حیران ہو کر پوچھا — "کیا وجہ تھی قتل کی؟"

"سرکار!" — کامے نے کہا — "وطن دشمن اور تخریب کار عبدالجلیل نہیں، عبدالقدیر تھا۔ وہ ہندوستان کے جاسوسوں کا ساتھی تھا۔"

کامے نے رجب علی کو پوری تفصیل سے سنا دیا کہ اُس نے عبدالقدیر کو کیوں اور کس طرح قتل کیا ہے اُس نے یہ نہ بتایا کہ اُس نے قتل کر کے عبدالجلیل کو بتایا تھا اور عبدالقدیر کا ریوالور اسے دے دیا تھا۔ اُس نے یہ بتایا کہ اُس نے مقتول کا ریوالور راوی میں پھینک دیا تھا۔ اُس نے نا ف سے وہ خنجر نکال دیا جس سے اُس نے عبدالقدیر کو قتل کیا تھا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے کانسٹیبل کو اندر بلایا اور کامے کو اُس کے حوالے کر کے کہا کہ یہ ملزم ہے۔ اسے تھوڑی دیر باہر بٹھاؤ۔ کانسٹیبل کامے کو باہر لے گیا۔ رجب علی نے ایس۔ پی کو فون کیا اور بہت دیر اُس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔

کاما اُس کانسٹیبل کو اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا جس کے حوالے اسے کیا گیا تھا۔ کانسٹیبل نے کامے سے پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ کامے نے اُسے بتا دیا کہ وہ عبدالجلیل کو چھڑانے کے لیے

اقبالی بیان دینے آیا ہے۔

"دل سے نکال دو کہ عبدالجلیل کو چھوڑ دیا جائے گا"۔۔۔ کانسٹیبل نے کہا ۔۔۔ "یہاں قتل کی تفتیش نہیں ہو رہی کامے! یہاں عبدالجلیل کو چکی میں پیسنے کی ترکیب ہو رہی ہے۔ دیکھو کامے! ہماری تمہاری پرانی یاری ہے۔ اگر تم واقعی قاتل ہو تو اقبالی بیان نہ دینا۔ تمہاری یہ شرط کوئی نہیں مانے گا کہ عبدالجلیل کو چھوڑ دو۔ اپنی گردن اپنے ہاتھوں پھانسی کے پھندے میں نہ ڈالو۔"

ڈی۔ایس۔پی نے کامے کو اندر بلا لیا۔

"کامے!"۔۔۔ ڈی۔ایس۔پی نے کہا ۔۔۔ "جانتے ہو قتل کی سزا کیا ہے؟"

"پھانسی یا عمر قید۔"

"اگر میں تمہیں صاف نکال دوں تو خوش ہو گے نا؟"

"میں تو عبدالجلیل خان کو نکلوانے آیا ہوں جناب!"۔۔۔ کامے نے کہا ۔۔۔ "میں سوچ سمجھ کر آیا ہوں کہ اقبال جرم کروں گا تو میرا انجام کیا ہو گا۔"

"میں تمہیں وعدہ معاف گواہ بناؤں گا"۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا ۔۔۔ "میں نے اُوپر بات کر لی ہے۔"

"لیکن سرکار! واردات تو میں نے اکیلے کی ہے"۔۔۔ کامے نے کہا ۔۔۔ "مجھے آپ وعدہ معاف گواہ کس طرح بنائیں گے؟"

"کیا تمہیں پھانسی یا عمر قید کا شوق ہے کامے؟"۔۔۔ ڈی۔ایس۔پی نے کہا ۔۔۔ "تم میری مرضی کا بیان دے دو اور موج کرو.... بیان عبدالجلیل کے خلاف دینا ہے۔ اُوپر والے اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ تم قتل میں اپنے آپ کو شامل رکھو لیکن یہ کہو کہ عبدالجلیل نے مقتول کو مرنے سے پہلے نہر میں پھینکا تھا۔"

"میرے جسم کے ٹکڑے کر دو جناب!"۔۔۔ کامے نے کہا ۔۔۔ "خان صاحب کے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دوں گا۔"

"تو کیا میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟"۔۔۔ رجب علی نے کہا ۔۔۔ "کل اِس وقت تم اپنی زبان سے کہو گے کہ اقبالی بیان اپنی مرضی کا لکھ لو اور میرا انگوٹھا لگوا لو.... بولو، کیا کہتے ہو؟"

"میں بیان نہیں دوں گا"۔۔۔ کامے نے کہا۔

ڈی۔ایس۔پی نے کانسٹیبل کو بلایا اور کسی اے۔ایس۔آئی کا نام لے کر کہا کہ اُسے بُلا لاؤ۔ کانسٹیبل چلا گیا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ ڈی۔ایس۔پی نے ریسیور اٹھایا۔ کامے کو معلوم تھا کہ دروازے پر جو کانسٹیبل کھڑا رہتا ہے وہ اے۔ایس۔آئی کو بلانے چلا گیا ہے۔ کاما کرسی سے اٹھا اور بجلی کی تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

ڈی۔ایس۔پی نے ریسیور پھینکا اور دوڑتا کمرے سے نکلا۔ باہر کئی لوگ تھے۔ کاما بڑے دروازے کی طرف نہ گیا۔ وہ بیت الخلاء کی طرف دوڑتا گیا۔ بیت الخلاء کے ساتھ احاطے کی دیوار تھی۔ کاما بیت الخلاء کے عقب میں گیا اور دیوار پر چڑھ کر پرے کود گیا۔

پولیس کے بہت سے آدمی اُدھر کو دوڑے۔ کچھ بڑے دروازے سے باہر نکل گئے مگر کاما انہیں نظر نہ آیا۔ وہ شہر کے ہجوم میں روپوش ہو گیا تھا۔

اُس وقت تک لاہور پُر ہجوم اور ہنگامہ پرور شہر بن چکا تھا۔ اُس شہر لاہور میں جو چند ہی سال پہلے تک اکھاڑوں، پہلوانوں اور میٹھی زبان والوں کا شہر کہلاتا تھا، جواریوں کے اڈوں اور سینما گھروں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لاہور کی روایتی زندہ دِلی کا رُخ بدل گیا تھا۔ اب زندہ دلانِ لاہور کی نوجوان اولاد نے نظر بازی، تاک جھانک اور راہ جاتی عورتوں پر پھبتیاں کسنے جیسے مشاغل اختیار کر لیے تھے۔ اکھاڑے اُجڑ گئے اور اُن کی جگہ چھوٹے بڑے ہوٹل آباد ہو رہے تھے۔ شہر پھیل رہا تھا۔ گنجان ہو رہا تھا۔ مضافات کے جنگل اور ویرانے کوٹھیوں اور کالونیوں میں تبدیل ہوتے چلے جا رہے تھے۔

سمگلنگ ہر کاروبار کی طرح ایک کاروبار اور مہذّب عصمت فروشی فیشن بن گیا تھا۔ پیشہ ور مجرموں کو قانون کے محافظوں کی پشت پناہی حاصل ہو گئی تھی۔ غنڈہ گردی سیاست کی ایک ضرورت بن گئی تھی لہٰذا غنڈے معزّز شہری کہلانے لگے تھے۔ روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ روپے پیسے سے وہ لاٹھی خریدی جا سکتی تھی جو جس کے ہاتھ میں آ جاتے بھینس اُسی کی ہو جاتی ہے۔ سڑکوں پر کاریں، سکوٹر اور پرائیویٹ تانگے عام نظر آنے لگے تھے۔

اب اس شہر میں کسی مفرور مجرم کا روپوش ہو جانا مشکل نہیں رہا تھا۔ کاما بہت سے اڈوں سے واقف تھا۔ وہ رہنے والا تو امرتسر کے علاقے کا تھا لیکن آزادی کے گزرے ہوتے آٹھ برسوں میں وہ لاہور کی انیٹ انیٹ سے واقف ہو گیا تھا۔ وہ جب سی۔آئی۔اے کے دفتر سے فرار ہُوا تھا تو اُس کا ذہن صاف تھا۔ وہ جب ڈی۔ایس۔پی ملک رجب علی کے کمرے سے بھاگا تو اُس نے اِس حقیقت کو اپنے سامنے رکھ لیا تھا کہ وہ اب مفرور ہے اور وہ ایک ڈی۔ایس۔پی کو اپنے جرم کا راز دے کر فرار ہُوا ہے اور وہ جانتا تھا کہ پکڑے جانے کی صُورت میں اُس کا انجام کیا ہو گا۔

وہ اُستاد تھا۔ دیسی شراب بھی مِلے تو پی لیتا تھا اور چرس کا تو وہ نشئی تھا۔ سزا یافتہ تو نہیں تھا لیکن سزا یافتہ جرائم پیشہ اُستاد بھی اُسے اُستاد مانتے تھے۔ اُس نے عبدالقدیر کو قتل کر کے ذہن میں کوئی خلش یا ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کیا تھا۔ کہتے ہیں قاتل کے دماغ پر خون سوار ہو جاتا ہے جو اُسے دن رات بے چین اور پریشان رکھتا ہے مگر کامے کے دماغ پر ایک اور خون سوار تھا۔ یہ اُن ہزاروں لاکھوں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا خون تھا جو ہندوؤں اور سکھوں نے اس لیے بہایا تھا کہ اُنہوں نے پاکستان بنا لیا تھا۔

کاما ان کی لاشوں میں سے گزر کر آیا تھا۔ اُس نے اپنی قوم کی بیٹیوں کی برہنہ لاشیں بھی دیکھی تھیں۔ وہ تو خُون کی دلدل تھی جس میں سے وہ بڑی مشکل سے نکل کر آیا تھا۔ وہ چرس کے نشے میں ہوتا یا ہوش میں، پاکستان کا نام آ جاتا تو وہ تصوّروں میں خون کی دلدل میں دھنس جاتا اور اپنے آپ سے کہا کرتا تھا ۔۔۔ "پاکستان اُن کی امانت ہے جن کی لاشوں میں سے گزر کر میں پاکستان آیا تھا۔"

☆

وہ جب سی۔ آئی۔ اے کے تفتیشی مرکز کی دیوار پھلانگ کر باہر نکلا تو اندھا دھند نہ بھاگا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اُس طرف چلا گیا جدھر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہجوم میں شامل ہو کر اُس نے پیچھے دیکھا۔ اُس کے تعاقب میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔ وہ سنبھل کر یوں چلنے لگا جیسے ہر کوئی چلا جا رہا تھا۔ وہ دائیں بائیں اور آگے پیچھے اس انداز سے دیکھتا تھا جس سے کسی کو شک نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہیں سے بھاگ کے آیا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ اس کے پیچھے تو کوئی نہیں آ رہا؟

وہ حیران ہو رہا تھا کہ پولیس اس کے پیچھے کیوں نہیں آ رہی۔ اُسے شک ہونے لگا کہ پولیس نے اُسے دیکھ لیا ہے اور پولیس کے آدمی اچانک سامنے سے اور دائیں بائیں سے آجائیں گے۔ وہ ہر طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ اُس کے قریب سے تانگے گزرتے جا رہے تھے۔ وہ سب کو جانتا تھا اور سب اُسے جانتے تھے لیکن وہ ان سے نظریں بچا رہا تھا۔

ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی جس کے دفتر سے کاما فرار ہوا تھا، کامے کے تعاقب میں بڑے دروازے سے باہر چلا گیا تھا۔ ایک اے۔ ایس۔ آئی اور تین چار کانسٹیبل اُس کے ساتھ گئے تھے۔ وہ جب اُس طرف گئے جدھر کاما دیوار سے کودا تھا، رجب علی نے انہیں واپس بلا لیا تھا۔

"جانے دو"۔۔۔ اُس نے کہا تھا۔۔۔ "گواہ تھا، ملزم نہیں تھا۔ میں اُسے جانتا ہوں۔ شام تک پکڑ لوں گا۔"

اے۔ ایس۔ آئی اور کانسٹیبلوں کے چہروں پر رونق آگئی تھی کہ ڈی۔ ایس۔ پی نے تعاقب روک دیا تھا مگر اے۔ ایس۔ آئی نے سینہ تان کر کہا تھا۔۔۔ "حضور! اجازت دیں۔ میں اُسے پندرہ منٹ میں پکڑ کر آپ کے قدموں میں لا پھینکوں گا۔"

"ہاں، ہاں"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "تم ہی اسے پکڑ کر لاؤ گے۔ آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں وہ کہاں ملے گا۔"

اے۔ ایس۔ آئی کا منہ لٹک گیا۔

دفتر میں آکر ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی نے اے۔ ایس۔ آئی اور کانسٹیبلوں سے پوچھا کہ ان میں اسے کوئی جانتا ہے؟ اس کے گھر ٹھکانے کا کسی کو علم ہے؟

دو کانسٹیبل کامے کو جانتے تھے اور یہ بھی کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ دونوں نے کہہ دیا کہ وہ تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں۔ ایک نے کہا کہ اُس نے اس کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔

ڈی۔ ایس۔ پی کو اس کا کوئی غم نہیں تھا کہ کاما اب ہاتھ نہیں آئے گا۔ کامے نے اسے عبدالقدیر کے قتل کی تفصیلات سناتے ہوئے اپنے متعلق بتایا تھا کہ وہ تانگہ بان ہے اور سارے شہر میں سالم تانگہ چلاتا ہے۔ کسی ایک روٹ پر دو دو چار چار آنے کی سواریاں لے کر نہیں چلتا۔ اُس نے اپنے اقبالی بیان میں عبدالجلیل کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اُس نے عبدالقدیر کو اپنے ذاتی جذبے اور اشتعال کے تحت قتل کیا ہے۔

اُس نے قتل کیا تھا یا نہیں، یہ بعد کی بات تھی۔ اب اُسے پکڑنا تھا اور اُسے پکڑنا مشکل نہیں تھا۔ کسی تانگہ بان کے ٹھکانے کا سراغ لگانا آسان تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اُسی وقت اپنے سٹاف کے ایک اے۔ ایس۔ آئی کو کامے کا نام اور حلیہ بتا کر حکم دیا کہ اس تانگہ بان کا سراغ لگا کر اُسے جس قدر جلدی ہو سکے پکڑ لائے۔

اے۔ ایس۔ آئی سراغرسانی اور کامے کی گرفتاری کے لیے نکل گیا۔

ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی گہری سوچ میں کھو گیا۔ اُسے شک ہونے لگا تھا کہ کامے کا آنا اور اقبالِ جرم کرنا ایک ڈرامہ تھا۔ وہ عبدالجلیل کو چھڑانے آیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ایک تانگے والے میں خلوص اور ایثار کا اتنا جذبہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کی خاطر اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دے۔

"اگر یہ تانگہ بان اقبالِ جرم کرنے آیا تھا تو بھاگا کیوں؟"۔۔۔ ملک رجب علی نے سوچا اور اُس نے اپنے آپ کو جواب دیا۔۔۔ "وہ عبدالجلیل کے زمین دوز گروہ کا آدمی ہے۔ اُس نے اچانک آکر اس توقع پر اقبالِ جرم کیا کہ میں عبدالجلیل کو چھوڑ دوں گا۔ میں نے اُسے عبدالجلیل کے خلاف گواہی دینے کو کہا تو وہ سمجھ گیا کہ میں عبدالجلیل کو نہیں چھوڑوں گا۔ اُس نے فرار ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قاتل وہی ہے اور عبدالجلیل بے گناہ ہے۔۔۔۔ یہ ایک چال تھی۔"

رجب علی عبدالجلیل کو بیگناہ سمجھتا تھا۔ اُس نے ایس۔ پی سے کہہ بھی دیا تھا اور ایس۔ پی نے اُسے کہا تھا کہ بیگناہ ہے یا گناہگار، یہ ثابت کرنا ہے کہ قاتل عبدالجلیل ہے۔ مگر اب رجب علی عبدالجلیل کو مجرم سمجھنے لگا۔ رجب علی ڈی۔ ایس۔ پی تھا۔ اُسے غصہ آنے لگا کہ عبدالجلیل نے ایک تانگے والے سے اُسے بیوقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔

☆

رات کو راوی روڈ کی کوٹھی "آشا بھون" میں ارشد کا باپ، اُس کی ماں، اُس کا بڑا بھائی یوسف اور یوسف کی بیوی اکٹھے بیٹھے ارشد اور طاہرہ کی شادی کا پروگرام طے کر رہے تھے۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ یوسف باہر گیا۔ ایک اجنبی باہر کھڑا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ ارشد سے ملنا چاہتا ہے۔ یوسف نے اُسے بتایا کہ وہ راولپنڈی جا چکا ہے۔

"اُس کے والد صاحب ہوں گے؟"۔۔۔ اجنبی نے پوچھا۔

"گھر پہ ہی ہیں۔"

"بہت ضروری کام ہے"۔۔۔ اجنبی نے کہا۔۔۔ "اور میں باہر کھڑے ہو کر نہیں، اندر بیٹھ کر بات کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ایک کمرے میں ارشد کے باپ کے سامنے بیٹھا تھا۔

"آپ مجھے شک کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں"۔۔۔ اجنبی نے کہا۔۔۔ "میرا حلیہ، میرا لباس اور میرا رنگ روپ ہی ایسا ہے کہ آپ مجھے مشتبہ سمجھ رہے ہیں لیکن بات کرنے سے پہلے میں یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو اعتماد میں لوں یا نہ لوں۔"

"پھر کسی سے پوچھ کے آؤ کہ میں قابلِ اعتماد ہوں یا نہیں"۔۔۔ ارشد کے باپ نے قدرے ترشی سے کہا۔۔۔ "بات کا کوئی سر پیر تو ملے۔۔۔۔ تم نے ارشد کے متعلق پوچھا تھا۔ اس کی بجائے تم میرے ساتھ بات کرنا چاہتے ہو۔ اگر بات ارشد کے متعلق ہے تو میں واحد آدمی ہوں جس کے ساتھ یہ بات کی جا سکتی ہے۔"

"میرا نام کاما ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "کاما تانگے والا۔"

"ہاں! میں نے تمہارا نام سنا ہے"۔۔۔ ارشد کے باپ نے کہا۔۔۔ "ارشد نے مجھے تمہارے متعلق

بڑی اچھی باتیں سناتی ہیں.... کہو کامے! کیا بات ہے۔ کوئی کام ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں تمھاری مدد کروں گا۔ ارشد چھٹی پوری کر کے راولپنڈی چلا گیا ہے"۔

"مجھے کوئی مدد نہیں چاہیئے"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "میں آپ کی اور ارشد کی کچھ مدد کرنے آیا ہوں.... میں مفرور قاتل ہوں۔ آج صبح پولیس کی حراست سے فرار ہُوا ہوں"۔

ارشد کے باپ کی آنکھیں ٹھہر گئیں جیسے اُس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

"میں پناہ مانگنے نہیں آیا"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "میں یہاں چھپنے کے لیے اور مالی امداد کے لیے نہیں آیا"۔

"تم جس کام کے لیے آئے ہو فوراً بتا دو"۔۔۔ ارشد کے باپ نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔ "مفرور قاتل ہونا کوئی معمولی سی بات نہیں، تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔ فوراً بولو کہ ارشد سے تمھیں کیا کہنا ہے"۔

"آپ گھبرائیں نہیں"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "آپ کے بیٹے کا اس قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مقتول میرا دشمن نہیں تھا۔ وہ پاکستان کا دشمن تھا...."۔

کامے نے ارشد کے باپ کو پوری تفصیل سے سُنا دیا کہ اُس نے پولیس کے سابق اے ایس آئی عبدالقدیر کو کیوں اور کس طرح قتل کیا ہے۔ اس میں عبدالجلیل کا ذکر بھی تھا۔ اُن دو ہندو لڑکیوں کا بھی ذکر تھا جو نسیمہ اور عقیلہ کے فرضی ناموں سے لاہور میں مقیم تھیں۔ کامے نے چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش کا بھی ذکر کیا۔

"میں جانتا ہوں کامے!"۔۔۔ ارشد کے باپ نے کہا۔۔۔ "میں چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش کو جانتا ہوں اور میں انسپکٹر عبدالجلیل کو بھی جانتا ہوں۔ امرتسر میں میرے ساتھ اُس کا سرکاری تعلق بھی رہتا تھا، ذاتی بھی۔ اُس نے آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کی جس طرح درپردہ مدد کی تھی میں وہ بھی جانتا ہوں"۔

"آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش جو آزادی سے پہلے ہندوؤں کے غلام بنے ہوئے تھے اور پاکستان کے نعرے لگانے والوں کے منہ نوچتے پھرتے تھے وہ آج پاکستان کے حاکم بلکہ حکمران ہیں"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "اور آزادی کی جنگ کا مجاہد عبدالجلیل بےگناہ پولیس کی حراست میں پڑا ہے۔ اُسے عبدالقدیر کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے"۔

"کیا میں اُس کے لیے کچھ کر سکتا ہُوں؟"۔۔۔ ارشد کے باپ نے پوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "اُسے چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش نے گرفتار کرایا ہے اور سکریٹریٹ کا سیکرٹری بھی اس کے خلاف ہے.... میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں نے عبدالقدیر کو کیوں قتل کیا ہے۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ راولپنڈی جا کر ارشد سے کہہ دیں کہ کسی کے ساتھ ایسی کوئی بات نہ کرے جس سے یہ ظاہر ہو کہ اُس کا عبدالجلیل کے ساتھ یا میرے ساتھ کوئی تعلق ہے"۔

"کیا عبدالجلیل کے ساتھ اور تمھارے ساتھ ارشد کا کوئی خاص تعلق ہے؟"

"بہت گہرا!"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ افسر رہ چکے ہیں۔ میں اَن پڑھ ہُوں.... ہندوستان کے جاسُوس پاکستان کی بنیادوں میں اُتر گئے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ان کے سَروں پر کون سے پاکستانیوں کا ہاتھ ہے۔ آپ اس لیے بھی مجھے شک کی نگاہوں سے دیکھیں گے کہ ایک تانگے والا پاکستان کے تحفّظ اور دفاع کی باتیں کر رہا ہے لیکن جناب! پاکستان ہم لوگوں نے بنایا ہے۔ خُون ہمارے بچوں کا بہہ گیا تھا۔ بچیاں ہماری اغوا اور سرِعام بے آبرو ہُوئی تھیں۔ ان لوگوں کا کچھ

نہیں گیا جو وہاں انگریز اور ہندو حاکموں کے خوشامدی اور ٹھُو تھے اور یہاں آ کر حاکم بن گئے ہیں"۔

"کامے! میں سب کچھ جانتا ہوں"۔۔۔ ارشد کے باپ نے قدرے غصّے میں کہا۔۔۔ "مجھے وہ بات بتاؤ جس کے لیے آئے ہو۔ اس قتل کے ساتھ ارشد کا کیا تعلق ہے جو تم نے کیا ہے، یا تم کہتے ہو کہ تم نے کیا ہے"۔

"کچھ بھی نہیں جناب!"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "ارشد کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اتنی لمبی بات اس لیے شروع کر دی تھی کہ مجھے ڈر ہے کہ آپ مجھے تانگے والا سمجھ کر میرا اعتبار نہیں کریں گے.... قتل کی بات تو میں آپ کو سنا چکا ہُوں۔ میری اس واردات کے پیچھے ایک اور وجہ ہے۔ عبدالجلیل نے ایک زمین دوز تحریک اس مقصد کے لیے شروع کی تھی کہ پاکستان کے دشمنوں کو، وہ ہندوستانی ہوں یا پاکستانی، ایسے طریقے سے ختم کرتے جائیں کہ کسی کو قاتلوں کا سراغ نہ ملے"۔

"عبدالجلیل یہ سلسلہ کب تک چلا سکتا ہے؟"۔۔۔ ارشد کے باپ نے کہا۔۔۔ "یہ سب جذباتی باتیں ہیں"۔

"ذرا گہرائی میں سوچیں میاں جی!"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "پاکستان کے دشمن کے ایجنٹوں کو پکڑنا پاکستان کی حکومت کا کام ہے مگر حکومت کا صرف ایک پُرزہ دشمن کے ہاتھ کا اور اس کی مرضی کا فٹ کیا ہو تو وہ ساری مشین کو اپنے مطابق چلائے گا۔ یہ حال ہماری حکومت کا ہے۔ عبدالجلیل خان صاحب کہتے ہیں کہ ایک ایجنٹ کو قتل کر دو تو سَو ایجنٹ زمین کے نیچے چلے جائیں گے، اور اگر یہ سلسلہ چلتا رہے تو دشمن سمجھ جائے گا کہ اس ملک میں پولیس اور فوج کے علاوہ کوئی اور طاقت کام کر رہی ہے.... میاں جی! وہ طاقت ہم ہیں۔ ہم جو تانگے چلاتے ہیں، چرس پیتے ہیں، غنڈے اور بدمعاش کہلاتے ہیں.... اور جی! یہ طاقت اس ملک کے یہ نوجوان ہیں جنہیں سیاسی جماعتیں فریب دے کر اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہی ہیں"۔

"اور تم نے دشمن کے ایک ایجنٹ کو ختم کر دیا ہے"۔۔۔ ارشد کے باپ نے کہا۔

"جی میاں جی!"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "میں نے بسم اللہ کی ہے مگر حکومت کے کَل پرزے ہم سے زیادہ تیز نکلے۔ میں جانتا ہوں کہ پاکستان کی قسمت ان لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے جن کے دلوں میں پاکستان کی ذرا سی بھی محبت نہیں۔ پاکستان کو وہ مردار سمجھ کر اسے گیدڑوں اور گِدّھوں کی طرح کھا رہے ہیں لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ایمان اور انسان کا احترام بالکل ہی اٹھ گیا ہے۔ پولیس نے عبدالقدیر کے قتل کے جرم میں عبدالجلیل کو پکڑ لیا ہے اور اُس کے گھر سے...."۔

"اوہ!"۔۔۔ ارشد کے باپ نے چونک کر کہا۔۔۔ "میں نے یہ خبر اخباروں میں پڑھی ہے۔ یہ آج ہی کی بات نہیں؟.... اُس کے گھر سے کچھ اسلحہ برآمد ہُوا ہے"۔

"یہ اسلحہ پولیس اپنے ساتھ لے گئی تھی"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں نے یہ خبر پڑھی تو اپنے آپ کو پولیس کے سامنے پیش کر کے اقبال جرم کر لیا اور کہا کہ خان صاحب کو چھوڑ دیں مگر ایک ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے کہا کہ وہ مجھے سلطانی گواہ بنائیں گے اور میں اس بیان پر انگوٹھا لگا دوں جو پولیس لکھے گی۔ مجھے موقع مِلا اور میں وہاں سے بھاگ آیا"۔

"اب کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟"

"میں آخر پکڑا جاؤں گا" — کامے نے کہا — "اور آپ کو معلوم ہے کہ جب پکڑا جاؤں گا تو کہاں جاؤں گا.... پکڑے جانے سے پہلے میں اپنا ایک عہد پورا کرنا چاہتا ہُوں.... میں پاکستان کے دو چار دشمنوں کو قتل کر کے پھانسی چڑھوں گا۔ آپ کو میں یہ بتانے آیا ہوں کہ میں نے ارشد کی ملاقات عبدالجلیل خان سے کرائی تھی اور ارشد بھی ہماری اس خفیہ تحریک میں شامل ہو گیا تھا"

"کیا پولیس تک ارشد کا نام بھی پہنچ چکا ہے؟"

"نہ میاں جی!" — کامے نے کہا — "آپ بے فکر رہیں۔ آپ کا بیٹا محفوظ ہے"

"میرا بیٹا اگر پاکستان پر قربان ہو گیا تو مجھے کوئی غم نہیں ہو گا" — ارشد کے باپ نے کہا — "مگر میں اپنے بیٹے کو اس طرح ضائع نہیں کرنا چاہتا کہ وہ کچھ کیے بغیر مارا جائے۔ صرف میرا ارشد نہیں کامے! اس قوم میں لاکھوں ارشد موجود ہیں جو پاکستان کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دیں گے"

"آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے میاں جی!" — کامے نے کہا — "میں بھی یہی کہنے آیا ہوں کہ ارشد کو ضائع نہ ہونے دیں۔ اُس نے بھی آج اخباروں میں عبدالجلیل خان کی گرفتاری کی اور ان کے گھر سے اسلحہ کی برآمدگی کی خبر پڑھ لی ہو گی۔ وہ جوشیلا لڑکا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دوڑا آئے اور خان صاحب کے گھر چلا جائے۔ وہاں اب مخبر اور سی آئی۔ ڈی کے آدمی بھیس بدل کر گھوم پھر رہے ہوں گے مجھے یاد آتا ہے کہ خان صاحب کو عبدالقدیر پر بڑا بھروسہ تھا اور اُنھوں نے عبدالقدیر کے ساتھ ارشد کا تعارف کرایا تھا۔ ہو سکتا ہے عبدالقدیر نے کہیں بتا دیا ہو کہ ارشد نام کا ایک آدمی بھی عبدالجلیل خان کا ساتھی ہے لیکن آپ فکر نہ کریں۔ ارشد کا اتا پتہ کسی کو معلوم نہیں"

"میں ارشد کو آج ہی خط لکھ دوں گا" — ارشد کے باپ نے کہا۔

"نہ میاں جی!" — کامے نے کہا — "آپ سیانے آدمی ہیں۔ خط پکڑا گیا تو ارشد کے ساتھ آپ بھی پکڑے جائیں گے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ آپ آج ہی راولپنڈی چلے جائیں اور ارشد کو سختی سے کہہ دیں کہ وہ عبدالقدیر کے قتل اور عبدالجلیل خان کی گرفتاری کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے اُن کے ساتھ ذرا سا بھی تعلق ظاہر ہو۔ میں ارشد سے نہیں مل سکوں گا" — کامے نے سسکی سی لی اور اُس کے آنسو نکل آئے — "مجھے وہ وقت یاد آ رہا ہے جب جلال آباد میں ارشد جیسے نوجوانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کے منہ پھیر دیئے تھے۔ وہ نعرے یاد آتے ہیں مگر آج ہم ارشد سے کہہ رہے ہیں کہ وہ زبان بند کر لے کیونکہ یہ دَور مجاہدوں کا نہیں مجرموں کا ہے اور یہاں اب مجاہدوں کو مُجرم سمجھا جاتا ہے"

کاما اُٹھ کھڑا ہُوا اور اُس نے ارشد کے باپ سے ہاتھ ملانے کو ہاتھ بڑھایا۔

"میں ایک دو دنوں کا مہمان ہُوں میاں جی!" — کامے نے کہا۔

"تمھارے بچّے ہیں؟"

"نہیں" — کامے نے جواب دیا — "یہ بھی خوش نصیبی ہے میری.... بیوی ہے۔ اس کا غم ہے سوچتا ہوں میرے بعد اس کا کیا ہو گا"

ارشد کے باپ نے اُس کا ہاتھ دبا کر کہا — "اللہ تمھیں محفوظ رکھے کامے! اگر کوئی ایسی ویسی ہو گئی تو اپنی بیوی کو میرا گھر دکھا دینا"

"وہ آپ کے گھر آ جائے گی" — کامے نے کہا — "آپ میرے گھر نہ جانا۔ میں پاکستان کے نام پر اس دنیا سے جا رہا ہوں لیکن میرا گھر پولیس کی نظر میں رہے گا.... اللہ حافظ میاں جی!"

"زندہ رہے تو ملیں گے کامے!"

"اگلے جہان میاں جی!" — کامے نے کہا — "اگلے جہان" — اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

ارشد کا باپ باہر نکلا۔ کاما ایک سائے کی طرح کوٹھی کے پھاٹک سے نکل رہا تھا، پھر یہ سایہ پاکستان کی رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔

☆

جب کاما "آشا بھون" کے پھاٹک سے نکل رہا تھا اُس وقت اُس کے گھر کے دروازے پر دستک ہُوئی۔ اُس کی بیوی نے یہ کہتے ہُوئے دروازہ کھولا — "گھوڑی گھر میں بندھی ہے اور خود بے لگام گھوم پھر رہا ہے"

اُس نے ابھی زنجیر کھولی ہی تھی کہ کواڑوں کو باہر سے کسی نے بڑے زور سے دھکیلا۔ کواڑوں کا دھکا اُسے بھی لگا۔ وہ سمجھی کہ آج کاما زیادہ پی کے آیا ہے۔ وہ اسے کوسنے لگی تھی لیکن اُس کا مُنہ کھلا رہ گیا۔ تین آدمی اندر آ گئے اور تینوں صحن میں سے دوڑتے ہُوئے مکان کے دونوں کمروں میں داخل ہو گئے۔ کامے کی بیوی ان کے پیچھے دوڑ پڑی۔ اگر وہ تینوں پولیس کی وردی میں نہ ہوتے تو یہ عورت انہیں ڈاکو سمجھ کر شور مچا دیتی مگر وہ پولیس کے آدمی تھے۔ وہ برآمدے میں رک گئی۔

پولیس کے آدمی اندر چارپائیوں کے نیچے بھی دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے باورچی خانے میں بھی دیکھا جو سیڑھیوں کے نیچے تھا اور بیت الخلا میں بھی دیکھا۔ ایک آدمی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ جب وہ دھما چوکڑی اور خانہ تلاشی سے فارغ ہُوئے تو کامے کی بیوی کو گھیر لیا۔

"کہاں ہے وہ؟" — اے۔ ایس۔ آئی نے اُس سے پوچھا۔

"کون کہاں ہے؟" — کامے کی بیوی نے حیران ہو کے پوچھا — "تم تو جیسے گھر لُوٹنے آئے ہو۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ"

"وہ تیرا خصم کہاں ہے؟" — ایک کانسٹیبل نے پُوچھا۔

"اگر بدزبانی کرو گے تو باہر کھڑی ہو کر وہ سناؤں گی کہ تمھاری ماں بہن کو ننگا کر کے رکھ دوں گی" — کامے کی بیوی نے کہا — "دماغ ٹھکانے رکھ کر بات کرو۔ تم جیسے تھانیدار اور سپاہی بہت دیکھے ہیں"

"مائی!" — اے۔ ایس۔ آئی نے ذرا آرام سے پوچھا — "تم کامے کی گھر والی ہو؟.... ہم کامے کو ڈھونڈ رہے ہیں"

"کیا کیا ہے اُس نے؟"

"ہم کامے کی پوچھ رہے ہیں" — اے۔ ایس۔ آئی نے کہا — "ہمیں حکم ملا ہے۔ یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں کہ اُس نے کیا کیا ہے۔ اُسے ساتھ لے جانا ہے گرفتار نہیں کرنا"

"ہاں، تم اُس کے ماموں لگتے ہو نا!" — کامے کی بیوی نے کہا — "تم اُسے گرفتار نہیں کرو گے اُسے ولیمے پر لے جاؤ گے۔ تم تو اس طرح میرے گھر میں داخل ہُوئے تھے جیسے بھُوکے ڈنگر

کھُرلی پر ہلّہ بولتے ہیں، اور کہتے ہو اُسے گرفتار نہیں کریں گے۔"

"مائی! ہم جو پوچھتے ہیں وہ بتا"—— اے۔ایس۔آئی نے کہا—"کاما کہاں ہے؟"

"وہ یہاں ہوتا اور تم لوگ اس گھر میں داخل ہوتے تو سارا لاہور تماشا دیکھتا"—— کامے کی بیوی نے کہا—"وہ گھر میں نہیں ہے۔ تم نے سارا گھر دیکھ لیا ہے۔ یہ پٹیالہ کے مہاراجے کا محل تو نہیں۔ دو ہی تو کمرے ہیں یہاں۔ تم نے چارپائیوں کے نیچے گھس کر بھی دیکھ لیا ہے۔"

"جانتی ہو وہ کہاں ہوگا؟"

"میں صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ صبح تانگہ جوت کر نکلا تھا"—— کامے کی بیوی نے کہا—"تھوڑی ہی دیر بعد واپس آگیا۔ اُس نے تانگہ کھول دیا۔ میں پوچھتی رہی کہ وہ واپس کیوں آگیا ہے۔ اُس نے گول مول سا جواب دیا۔ میں نے ذرا آنکھیں دکھائیں تو کہنے لگا کہ بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ شام کو آؤں گا، اور وہ چلا گیا۔ سارا دن گھر نہیں آیا۔ تم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میں سمجھی کہ وہ آگیا ہے۔"

"ذرا کان کھول کے سُن لے مائی!"—— اے۔ایس۔آئی نے کہا—"کاما آجائے یا وہ جہاں کہیں بھی ہے، اُسے کہہ دینا کہ پیش ہو جائے۔ اگر وہ کل دوپہر تک پیش نہ ہُوا تو ہم تمھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے اور تمھارا تانگہ اور گھوڑی بھی ضبط ہو جائے گی۔"

"یہ نہیں بتاؤ گے کہ اُس نے کیا کیا ہے؟"—— کامے کی بیوی نے پوچھا۔

"تمھیں پتہ چل جائے گا"—— اے۔ایس۔آئی نے کہا اور اپنے کانسٹیبلوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

رات کو ہی کامے کے گھر پر نظر رکھنے کے لیے دو مخبر مقرر کر دیئے گئے۔

☆

ٹیاٹر ڈانسپکٹر عبدالجلیل خان کا جسم بے حس ہو چکا تھا۔ وہ پتھر بن گیا تھا۔ دو کانسٹیبلوں نے اُس کے دونوں ہاتھوں کی درمیانی اور شہادت کی انگلیوں کے درمیان پنسل جتنی موٹی ایک ایک سلاخ ڈال رکھی تھی اور دونوں کانسٹیبل اس کی انگلیوں کو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑے ہُوئے تھے۔ درد کی شدت سے عبدالجلیل کی آنکھیں بند تھیں۔ اوپر نیچے کے دانت ملے ہُوئے اور منہ کھلا ہُوا تھا۔ اُس کا چہرہ جو کرب کی تصویر بنا ہُوا تھا، پسینے سے ڈھل رہا تھا مگر اُس کے مُنہ سے ہلکی سی "سی" بھی نہیں نکلتی تھی۔

"اوئے بدبخت!"—— ڈی۔ایس۔پی ملک رجب علی اُسے تین بار کہہ چکا تھا—"صرف یہ بتا دے کہ کامے تانگے والے کے ساتھ تمھارا کیا تعلق ہے۔"

عبدالجلیل نے تینوں بار نفی میں سر ہلایا تھا، اور تینوں بار رجب علی نے کانسٹیبلوں سے کہا تھا——"اور زور سے دباؤ"—— اب کانسٹیبل اتنی زور سے عبدالجلیل کی انگلیاں دبا رہے تھے کہ اُن کے چہروں پر وہی تاثر آگیا تھا جو عبدالجلیل کے چہرے پر تھا۔

ملک رجب علی کو ایک ہی بار بے شمار خیالوں نے گھیر لیا اور وہ یوں ہر خیال کو جھٹکنے لگا جیسے کوئی غلیظ انسان اپنے رال ٹپکاتے منہ سے بار بار مکھیاں اُڑا رہا ہو۔

"یہ چیختا کیوں نہیں؟ .... بولتا کیوں نہیں؟.... میں تو اسے سچا اور بےگناہ سمجھتا تھا لیکن کاما اس کے خلاف نیا شک پیدا کر گیا ہے.... کیا اسے کامے کی گرفتاری تک کچھ نہ کہا جاتے؟ .... کیا کاما گرفتار

ہو جائے گا؟.... عبدالجلیل بےگناہ ہے.... سچّے اور نیک انسان کو خدا اتنی طاقت اور اتنی قوتِ برداشت دے دیتا ہے کہ اس کے اعضا کاٹتے رہو اُسے محسوس نہیں ہوتا.... کیا ایسے ہی ہوتا ہے؟.... یہ مجھے کس نے بتایا تھا؟"

عبدالجلیل تو ایذا رسانی کے درد سے بے حال ہو رہا تھا مگر رجب علی کو اُس کے اپنے متضاد خیالات اذیّت پہنچانے لگے۔ عبدالجلیل جس صبر اور خاموشی سے اُس کی اذیت برداشت کر رہا تھا ملک رجب علی کے لیے ایک طعنہ بن گئی تھی، پھر یہ طعنہ ماں بہن کی گالی بن گیا۔ اُس نے بار بار عبدالجلیل سے کہا کہ وہ کچھ تو کہے مگر نفی میں ہلتا ہُوا اُس کا سَر اُسے آگ بگولہ کر رہا تھا۔

اُس کے دل میں رحم کی چنگاری سلگی۔ اُسے خیال آیا کہ ایسی اذیّت کوئی سچا اور خُدا کا پیارا انسان ہی برداشت کر سکتا ہے۔

"میں ایس۔پی سے کہہ دوں گا کہ یہ شخص بےگناہ ہے۔ مجھ سے گناہ نہ کراؤ"—— اُس نے ارادہ کیا۔

"رجب علی!"—— اُس کے اندر سے ڈی۔ایس۔پی کی آواز اُٹھی—"تم اسے چھوڑ کر میرا گلا گھونٹ دینا چاہتے ہو؟.... تم ڈی۔ایس۔پی ہو۔ انسانوں کی طرح مت سوچو۔ کیا تم ایس۔پی نہیں بننا چاہتے؟"

ملک رجب علی الٹے سیدھے خیالوں سے سٹپٹا اٹھا۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ آگیا۔ اُس کے اندر سے ایک شعلہ اٹھا۔ اُس وقت عبدالجلیل خان اس پوزیشن میں تھا کہ وہ فرش پر بیٹھا تھا۔ اُس کے دونوں بازو دائیں اور بائیں پھیلے ہُوئے تھے۔ ایک ہاتھ ایک کانسٹیبل کے ہاتھوں میں اور دوسرا دوسرے کانسٹیبل کے ہاتھوں میں دبایا ہُوا تھا۔ انگلیوں میں سلاخیں تھیں۔ اس سے پہلے عبدالجلیل کے جسم کو مختلف اذیّتوں میں ڈالا گیا تھا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔

ڈی۔ایس۔پی رجب علی کے اندر سے جو شعلہ اٹھا تھا اس نے اُسے اندھا کر دیا۔ اُس کے سامنے عبدالجلیل فرش پر بیٹھا تھا۔ رجب علی نے پوری طاقت سے عبدالجلیل کے پیٹ میں اِس طرح ٹھُڈ مارا جس طرح فٹ بال کو کِک ماری جاتی ہے۔ عبدالجلیل کا سَر اوپر کو اٹھا اور پھر آگے کو گر پڑا۔

اس ٹھُڈ نے رجب علی کو جیسے جگا دیا ہو۔ اُس نے یوں محسُوس کیا جیسے عبدالجلیل کو یہ ٹھڈ اُس نے نہیں مارا تھا۔ اُس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ غصے کی ایک لہر نے اُسے اندھا کر دیا تھا۔ یہ غصّہ اسے اپنے آپ پر آیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ میں لرزہ سا محسوس کیا۔

اُس نے عبدالجلیل کو دیکھا۔ اس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے لگی ہُوئی تھی اور اُس کے منہ سے خون کا ایک قطرہ اس کے کپڑوں پر گرا تھا۔ پھر ایک قطرہ اور گرا۔

"اس کے ہاتھ چھوڑ دو"—— ملک رجب علی نے کانسٹیبلوں سے کہا۔

کانسٹیبلوں نے جب عبدالجلیل کے ہاتھ چھوڑے تو وہ کچھ دیر ڈولتا رہا پھر ایک پہلو کو لڑھک گیا۔ اُس کے منہ سے خون کے قطرے فرش پر گرنے لگے۔ رجب علی کا ٹھڈ اُس کے پیٹ پر اتنی زور سے لگا تھا کہ اندر گہرا زخم ہو گیا تھا۔ یہ اندر کے زخم کا خون تھا جو منہ سے باہر آ رہا تھا۔ رجب علی نے اس کی نبض پر انگلی رکھی۔ وہ اچھل کر اٹھا اور دوڑتا باہر نکل گیا۔

دونوں کانسٹیبلوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر دونوں عبدالجلیل کو دیکھنے لگے۔

☆

اُس وقت کاما اُس کوٹھی کے باہر اندھیرے میں کھڑا تھا جس میں نسیمہ رہتی تھی۔ یہ وہ ہندو لڑکی تھی جس کا اصل نام رادھا تھا۔ کاما اس کوٹھی سے اچھی طرح واقف تھا اور اس کوٹھی میں رہنے والوں کو بھی جانتا تھا۔ وہ بہت دن اور اکثر راتیں مخبروں اور جاسوسوں کی طرح اس کوٹھی کو دیکھتا رہا تھا۔ اُسے جو کچھ نظر آتا وہ عبدالجلیل کو بتا دیا کرتا تھا۔ اُس کا خون کھولتا تھا مگر سمجھ نہیں سکتا تھا کہ کیا کرے۔ اب وہ خوش تھا کہ عبدالجلیل جیسا لیڈر مل گیا ہے جو اُسے بتاتے گا کہ دشمن کے ایجنٹوں کے خلاف کیا کارروائی کی جاتی ہے۔

آج رات وہ اپنا لیڈر خود بن گیا تھا۔ اُس نے ایک منصوبہ خود ہی بنا لیا تھا۔ وہ تھوڑی ہی دیر پہلے اس کوٹھی کے قریب آیا تھا۔ نسیمہ کی کار موجود نہیں تھی۔ کار پورچ میں کھڑی رہتی تھی۔ کامے کو توقع تھی کہ نسیمہ واپس آئے گی۔ برآمدے میں روشنی تھی۔ کمروں میں اندھیرا تھا۔

کاما سارا دن ایک دوست کے گھر چھپا رہا تھا۔ شام کے بعد وہاں سے نکلا اور ارشد کے باپ سے ملنے چلا گیا تھا۔ وہاں سے نسیمہ کی کوٹھی تک آ گیا تھا۔ رات اتنی گزر چکی تھی کہ یہ علاقہ بے رونق ہو گیا تھا۔ اکا دکا کار زناٹے سے گزر جاتی تھی یا کوئی تانگہ بڑی سڑک پر جاتا نظر آتا تھا۔ پیدل چلنے والوں کی چہل پہل ختم ہو چکی تھی۔ کامے کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہاں اندھیرا تھا۔ کوٹھی کے احاطے کی دیوار اور درخت تھے۔

اُسے ایک کار کی آواز سنائی دی۔ وہ دبے پاؤں کوٹھی کی دیوار کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک گیا۔ کار نسیمہ کی ہی تھی۔ اُس کا جعلی خاوند چلا رہا تھا۔ کار پھاٹک کے اندر چلی گئی تو کاما اس کے پیچھے پیچھے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ کار پورچ میں رُکی۔ نسیمہ اور اُس کا جعلی خاوند کار سے نکلے۔ نسیمہ نے کامے کی طرف دیکھا اور خاوند سے کہا کہ یہ دیکھنا کون آ رہا ہے۔

فاصلہ تھوڑا سا تھا۔ کاما یوں خود اعتمادی سے چلا جا رہا تھا جیسے اسی کوٹھی میں رہتا ہو یا اسی کوٹھی میں ملازم ہو۔

"کون ہو بھئی؟ ـــ خاوند نے کار کے پاس کھڑے کھڑے پوچھا۔

نسیمہ کار کی ڈگی کے پاس کھڑی کامے کو دیکھ رہی تھی۔

"چوہدری صاحب کا پیغام لایا ہوں" ـــ کامے نے کہا اور ایک ہاتھ اپنی قمیض کے اندر ناف تک لے گیا جہاں اُس نے وہ خنجر اڑسا ہُوا تھا جس سے اس نے عبدالقدیر کو قتل کیا تھا۔

"کون سے چوہدری صاحب؟" ـــ نسیمہ نے پوچھا۔

کاما اُس تک پہنچ گیا۔ وہ خنجر چلانا جانتا تھا۔ اُس نے بجلی کی سی تیزی سے ناف سے خنجر نکالا اور نسیمہ کے دل پر وار کیا۔ نسیمہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ کامے نے خنجر نکالا اور دُوسرا وار پیٹ پر کر کے خنجر کو ایک طرف جھٹکا دیا۔ نسیمہ کا پیٹ چاک ہو گیا۔

نسیمہ کا جعلی خاوند جو کار کی دوسری طرف تھا، کامے کی طرف آیا۔ پورچ کی بتی جل رہی تھی۔ کاما اُس کی طرف دوڑا۔ خاوند نے اُس کے ہاتھ میں خنجر دیکھ لیا۔ کاما اُسے بھی قتل کرنا چاہتا تھا مگر وہ وہیں سے گھوما اور اپنے نوکروں کو آوازیں دیتا اتنی تیز دوڑا کہ فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کاما ابھی گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ دشمن کے اس پاکستانی ایجنٹ کے پیچھے نہ گیا۔ اُسے نوکروں

کے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ اُن کے آنے سے پہلے کوٹھی کے احاطے سے نکل گیا۔

☆

وہ دوڑتا ہی چلا گیا۔ اُس کا رُخ اُس کوٹھی کی طرف تھا جس میں نسیمہ جیسی دوسری ہندو لڑکی کرن رہتی تھی لیکن پاکستان میں عقیلہ کے نام سے مشہور تھی۔ اُس کا بھی ایک جعلی خاوند تھا۔ اُس کی کوٹھی کوئی تین فرلانگ دور تھی۔ کاما دوڑتا ہی گیا۔ اُسے پکڑے جانے کا کوئی ڈر نہ تھا۔ اُسے عقیلہ کو قتل کرنا تھا جو وہ اپنی جان دے کر بھی کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔

عقیلہ کی کوٹھی میں رونق تھی جو کم ہوتی جا رہی تھی۔ زیادہ تر مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ نسیمہ بھی وہیں سے آئی تھی۔ عقیلہ کے ہاں ابھی چوہدری اکرم، مہر اللہ بخش اور ہوم سیکرٹری جیسے مہمان موجود تھے۔ فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور عقیلہ کے جعلی خاوند نے اٹھایا۔ اُس نے "ہیلو" کہا اور اس کے بعد اُس کے منہ سے سخت گھبرائی ہُوئی آواز نکلی ـــ "ہائیں؟.... نسیمہ قتل ہو گئی ہے؟"

اور اس کے ساتھ ہی عقیلہ کی کوٹھی میں ایک ہی ڈراؤنی آواز گونجنے لگی ـــ "نسیمہ قتل ہو گئی ہے" ـــ یہ اطلاع دینے والا نسیمہ کا جعلی خاوند تھا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اُس نے کہا تھا ـــ "عقیلہ کا خیال رکھنا۔ قاتل بھاگ گیا ہے۔"

عقیلہ کی کوٹھی میں جو چند ایک آدمی تھے وہ باہر نکل آئے۔ عقیلہ بھی باہر آئی۔ وہ سب سے زیادہ ڈری ہُوئی تھی۔ باہر تین کاریں کھڑی تھیں۔ کچھ لوگ ان میں بیٹھ گئے۔ عقیلہ ابھی برآمدے میں کھڑی تھی۔ اُس کا جعلی خاوند گیراج سے گاڑی نکالنے چلا گیا تھا۔

ایک آدمی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہُوا۔ وہ دوڑا آ رہا تھا اور گھبرائی ہُوئی آواز میں چلاتا آ رہا تھا۔ "نسیمہ قتل ہو گئی ہے.... عقیلہ صاحبہ! ظلم ہو گیا.... او تے نسیمہ بے چاری ماری گئی ہے۔ میں وہیں سے آ رہا ہوں۔"

عقیلہ برآمدے سے اُتر آئی۔ کاروں میں جو بیٹھ گئے تھے، انہوں نے باہر نکلنے کے لیے کاروں کے دروازے کھولے۔ وہ آدمی سیدھا عقیلہ کی طرف گیا۔ عقیلہ اس خیال سے اُس کی طرف چلی کہ وہ نسیمہ کے قتل کا کوئی عینی شاہد ہے مگر اس آدمی نے خنجر نکالا اور پہلا وار عقیلہ کے دل کے مقام پر اور دوسرا پیٹ میں کیا۔ عقیلہ کے منہ سے ویسی ہی آواز نکلی جیسی ذبح ہوتے وقت بکرے کے مُنہ سے نکلا کرتی ہے۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر گر پڑی۔

قاتل نے خنجر ہوا میں لہرا کر کہا ـــ "پاکستان کے دشمنو! میں ہوں کاما تانگے والا۔ عبدالقدیر کو بھی میں نے ہی قتل کیا تھا۔"

اُسے توقع تھی کہ خنجر دیکھ کر سب اِدھر اُدھر ہو جائیں گے اور وہ چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش کو بھی قتل کر دے گا مگر وہ لوگ زیادہ تھے۔ انہوں نے دور دور اس کے گرد گھیرا ڈال لیا اور وہ ایک دوسرے کو للکارنے لگے ـــ "ڈرنا نہیں۔ پکڑ لیں گے۔"

کاما کوٹھی کے برآمدے میں چلا گیا۔ دو آدمی برآمدے میں ایک طرف اور دو تین دوسری طرف کھڑے

ہو گئے۔ کسی نے کسی کو پکار کر کہا۔ "اندر سے بندوق اور پیٹی لے آؤ۔"

کاما ایک طرف دوڑا۔ اُدھر جو دو آدمی تھے، انہوں نے اُس کے خنجر سے ڈر کر اُسے راستہ دے دیا۔ آگے ایک نوکر آگیا جس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ اس نے کامے کو روکنے کی کوشش کی لیکن کاما اتنی تیزی سے اُس کی طرف گیا کہ وہ آدمی بھاگ گیا۔ اُس کے سامنے کوٹھی کا لان اور دیوار تھی۔ وہ لان میں سے دوڑتا گذر گیا۔ پھاٹک بند کر دیا گیا تھا۔ وہ اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا۔ بندوق فائر ہوئی۔ اگر رائفل ہوتی تو کاما فوراً ختم ہو جاتا۔ یہ دونالی بندوق تھی جس کے کارتوسوں میں چھرّے تھے۔ کئی چھرّے اُس کی پیٹھ میں اُتر گئے۔

کاما سنبھل گیا۔ وہاں روشنی تو نہیں تھی لیکن دیوار پر ہونے کی وجہ سے وہ نظر آرہا تھا۔ وہ دیوار سے باہر کُودنے لگا تو ایک اور کارتوس فائر ہوا۔ کاما دیوار سے پرے جا پڑا۔ اُسے کچھ اور چھرّے لگ گئے تھے۔ کوٹھی سے سب آدمی پھاٹک کی طرف دوڑے۔ انہوں نے پھاٹک کھولا مگر بڑی احتیاط سے نکلے کہ قاتل کے کوئی ساتھی ہو سکتے ہیں جن کے پاس ریوالور ہوں گے۔ بندوق والا آدمی باہر نکلا۔ اُس کے پیچھے دو تین نوکر نکلے۔ اُس جگہ تک پہنچتے جہاں کاما گِرا تھا، کچھ وقت لگ گیا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوٹھی کے اردگرد گھوم کر دیکھا۔ کوئی آدمی نظر نہ آیا۔۔۔۔ قاتل نکل گیا تھا۔

☆

آدھی رات سے کچھ بعد کا وقت تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی تھوڑی ہی دیر پہلے سویا تھا۔ اُس کی کوٹھی کے سامنے ایک تانگہ رُکا۔ ایک آدمی اُترا اور تانگہ چلا گیا۔ یہ آدمی کاما تھا۔ وہ دو تین قدم چلا تو اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ دوسرے کارتوس کے چھرّے اس کی گردن پر لگے اور دو چھرّے کھوپڑی کو بھی لگے تھے۔ وہ عقیلہ کی کوٹھی سے بھاگ کر پچھلی طرف چلا گیا تھا۔ جسم میں ابھی خون موجود تھا۔ کاما چلتا گیا اور دوسری سڑک پر جا پہنچا۔

اُسے ایک تانگہ آتا دکھائی دیا۔ اُس نے آگے ہو کر تانگہ روک لیا۔ تانگے والے نے اُسے پہچان لیا لیکن اُس کا خون بہتا دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اُس نے کامے کو سہارا دے کر تانگے میں بٹھا لیا اور پوچھا کہ کون سے ہسپتال لے چلوں۔

"مجھے ایک ڈی۔ ایس۔ پی کے گھر پہنچا دو" ۔۔۔ کامے نے کہا۔ "ہسپتال سے پہلے پولیس کے پاس جانا ضروری ہے۔"

کاما پولیس کے تمام بڑے افسروں کے اتے پتے جانتا تھا۔ اُس نے تانگے والے کو راستہ بتایا اور تانگے والے نے گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔ اُس نے کامے سے پوچھا کہ اسے کس نے زخمی کیا ہے۔ کامے نے اُسے ایک من گھڑت کہانی سنا دی۔ تانگے والے نے اُسے ملک رجب علی کی کوٹھی تک پہنچا دیا۔ کامے نے اُسے کہا کہ وہ چلا جائے۔

کاما ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی کی کوٹھی میں داخل ہوا تو چوکیدار نے اُسے روکا۔ کامے نے کہا کہ ملک صاحب کو فوراً جگا دو۔ میں نزعی بیان دینے آیا ہوں۔ چوکیدار نے اردلی کو جگایا۔ اردلی نے آکر کامے سے کہا کہ وہ تھانے چلا جائے مگر کاما کوٹھی کے برآمدے میں دروازے تک جا پہنچا۔ اس کے جسم سے بہت سا خون نکل گیا تھا اور باقی جو رہ گیا تھا وہ نکل رہا تھا۔

اردلی اور چوکیدار ڈی۔ ایس۔ پی کو جگانے سے ڈرتے تھے اور کامے کو وہ اٹھا کر باہر بھی نہیں پھینک سکتے تھے۔ کامے نے اردلی کے منع کرنے کے باوجود دروازے پر ہاتھ مارنے شروع کر دیئے۔ اردلی اور چوکیدار اسے روک رہے تھے۔ اس شور سے ملک رجب علی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بڑے غصے سے اٹھا اور باہر نکل آیا۔ کامے کو خون میں نہایا ہوا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

"کون ہے یہ؟" ۔۔۔ رجب علی نے غصے سے گرجتی آواز سے پوچھا۔ "اسے یہاں کون لایا ہے؟ اٹھا کر لے جاؤ اسے تھانے میں پھینک آؤ۔"

کامے نے سر اٹھا کر کہا۔ "جناب! آپ کا مفرور ملزم ہوں۔ کاما تانگے والا۔ یہ لیں خنجر۔ دو قتل اور کر کے آیا ہوں۔ میرا بیان لے لیں۔ میں زندہ نہیں رہوں گا۔"

"اسے سہارا دے کر اندر لے چلو" ۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔ "اور تم باہر انتظار کرو۔"

☆

کامے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آتا اور گزر جاتا تھا۔

"مجھ سے بھاگے کیوں تھے کامے؟"

"یہی بتانے آیا ہوں" ۔۔۔ کامے نے لڑکھڑاتی، ہکلاتی اور ڈوب ڈوب کر اُبھرتی آواز میں کہا ۔۔۔ "اب یقین کر لیں کہ عبدالقدیر کو میں نے ہی قتل کیا تھا اور انسپکٹر عبدالجلیل خان صاحب کو اس قتل کا کوئی علم نہیں۔ میں نے جب آپ کی باتیں سنیں تو میں سمجھ گیا کہ آپ خان صاحب کو چھوڑنے کی بجائے اُن کے خلاف قتل ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس جھوٹے مقدمے میں مجھے خان صاحب کے خلاف استعمال کریں گے۔ میں تو انہیں چھڑانے گیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں بھاگ جاؤں گا تو پکڑا بھی جاؤں گا۔ میں نے سوچا کہ سزا سے پہلے میں پاکستان کے اُن دشمنوں کو کیوں نہ قتل کر دوں جنہیں میں جانتا ہوں۔ میں نے آپ کو ان دو ہندو لڑکیوں کے نام بتاتے تھے جو اسلامی ناموں سے یہاں مسلمانوں کی طرح رہ رہی ہیں اور پاکستان کی جڑیں کاٹ رہی ہیں....

"میں ان دونوں کو قتل کر آیا ہوں۔ آپ کو وہ لوگ صبح بتا دیں گے کہ میں نے انہیں کس طرح قتل کیا ہے۔ عقیلہ کو جس کا اصلی نام کرن ہے، قتل کر کے میں بھاگا تو احاطے کی دیوار پھلانگتے مجھ پر بندوق فائر ہوئی۔ ساری پیٹھ چھلنی ہو گئی ہے۔ سر میں بھی چھرّے لگے ہیں۔"

کامے کا سر ڈول گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ملک رجب علی نے اُسے پانی پلایا۔ وہ پانی پی رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ سے گلاس گر پڑا۔

"اپنے مُلک کو بچاؤ ملک صاحب!" ۔۔۔ کامے نے کہا۔ "اگر آپ میں اتنی ہمت نہیں تو مُلک کو بچانے والوں کو گرفتار نہ کرتے پھرو۔ یہ کل کی بات ہے ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ آپ آج بھول گئے ہیں کہ ہم نے اس ملک کی کیا قیمت دی ہے۔ یہ عہدے دنیا میں رہ جائیں گے ملک صاحب!"

کامے کو ایسا چکر آیا کہ وہ ایک طرف لڑھک گیا اور ہاتھ فرش پر رکھ کر سنبھل گیا۔

"مرنے سے پہلے میں ایک خوش خبری سننا چاہتا ہوں" ۔۔۔ کامے نے کہا۔ "کہہ دیں عبدالجلیل خان کو آپ نے آزاد کر دیا ہے۔"

"ہاں کامے!" ۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔ "عبدالجلیل آزاد ہو گیا ہے۔"

"میرا دل نہ پرچاؤ ملک صاحب!" ۔۔۔ کامے نے کہا۔ "سچ کہو۔"

"سچ کہہ رہا ہوں کامے!" ملک رجب علی نے کہا "وہ دنیا کے مکر اور فریب سے آزاد ہو گیا ہے۔"

کامے نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا مگر اُس کی آنکھیں بند رہیں۔ اُس نے سرگوشی کی "کیا کہا آپ نے؟"

"عبدالجلیل آزاد ہو گیا ہے" — ملک رجب علی نے کہا "وہ مر گیا ہے۔"

"مر گیا ہے؟" — کامے کے ہونٹوں سے حیرت زدہ سرگوشی نکلی "خان صاحب مر گئے ہیں؟"

شہید کہو ملک صاحب! پاکستان کو زندہ رکھنے والے مر کر بھی زندہ رہیں گے۔"

اب کاما لڑھکا تو اُٹھ نہ سکا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اس کی نبض دیکھی۔ وہ مر چکا تھا۔

✡

اُس رات کے بطن سے جس رات نے عبدالجلیل خان اور کامے تانگے والے کے خون پر سیاہ پردہ ڈال دیا تھا، پاکستان کی ایک اور صبح نے جنم لیا۔ پاکستانی جاگ اُٹھے۔ یہ صبح ویسی ہی تھی جیسی ہر صبح ہُوا کرتی تھی — ایک عام سی صبح جو اس لیے طلوع ہُوتی تھی کہ اسے طلوع ہونا تھا — اور لوگ اس لیے جاگ اُٹھے تھے کہ انہیں جاگنا تھا۔ پیٹ کے تنور کے لیے ایندھن اکٹھا کرنا تھا۔ پاکستانی صرف جاگے تھے، بیدار نہیں ہوئے تھے۔ ایک کے پیچھے دوسرے آنے والے حکمرانوں نے پاکستانیوں کی بیداری کو حکمرانی کی جنگ میں جھونک دیا تھا — لوگ جاگے تھے، بیداری اونگھ رہی تھی۔

کامے تانگے والے کی گھوڑی کھُرلی پر بندھی تھی اور اُس کا تانگہ باہر کھڑا تھا۔ گھوڑی بھی پاکستانیوں کی طرح باہر نکل جانے کو بیتاب ہو رہی تھی۔ اُسے تانگے کے آگے جُت جانا چاہیئے تھا۔ انسانوں کی طرح گھوڑی کو بھی احساس تھا کہ جُتے بغیر اور سارا دِن انسانوں کا بوجھ گھسیٹے بغیر اسے کھانے کو کچھ نہیں مِلے گا۔ وہ چارہ کھا چکی تھی اور کھُر مار مار کر کامے کو بلا رہی تھی۔

کامے کی بیوی دروازے میں پریشان کھڑی تھی۔ کاما کبھی کبھی ایسے ہی غائب ہو جایا کرتا تھا اور وہ جب واپس آتا تو بیوی اس پر غصّہ نکال لیا کرتی تھی۔ کامے نے غصے کا جواب کبھی غصے سے نہیں دیا تھا۔ وہ ہنسی مذاق اور پیار سے بیوی کو راضی کر لیا کرتا تھا۔ بیوی رات بھی عتاب میں تھی۔ کاما تانگہ کھول اور گھوڑی کھُرلی پر باندھ کر بیوی کو کچھ بتائے بغیر چلا گیا تھا۔ رات پولیس نے اُس کے دروازے پر دستک دی تو بیوی یہ سمجھ کر کہ کاما آیا ہے، اُسے کوستی آئی اور دروازہ کھولا تھا، اور جب پولیس تلاشی لے کر نکلی تو تھانیدار نے کامے کی بیوی سے کہا تھا کہ کاما آجائے تو اُسے کہہ دینا کہ پیش ہو جائے، نہیں تو ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے اور تمہارا تانگہ اور گھوڑی بھی ضبط ہو جائے گی۔

کامے کی بیوی باقی رات سو نہیں سکی تھی۔ وہ دروازے میں کھڑی انتظار کر رہی تھی کہ گھوڑی اور تانگہ لینے پولیس آئے گی یا کاما۔ وہ ڈر بھی رہی تھی۔ اُسے غصہ بھی آرہا تھا "کامے نے کیا کیا ہے؟" — یہ سوال اُسے اور زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ کامے نے اُس سے کبھی کچھ چھپایا نہیں تھا۔ سرحد پار جب کاما جلال آباد میں آزادی کی جنگ میں کود پڑا تھا تو اُس کی بیوی اُس کے شب و روز کے ایک ایک لمحے اور ہر ایک کارروائی سے واقف تھی؛ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کاما صرف نعرہ باز نہیں اور وہ جلسوں جلوسوں میں عام لوگوں کی طرح صرف نعرے لگانے اور جلوس کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے شامل نہیں ہوتا بلکہ اس کی زیادہ تر سرگرمیاں زمین دوز تھیں۔

پولیس اُن دِنوں بھی اُس کے گھر دو تین بار آئی تھی۔ وہ سی۔ آئی۔ ڈی تھی۔ کامے کے گھر کی تلاشی دو مرتبہ ہوئی تھی اور تین بار سی۔ آئی۔ ڈی پولیس نے کامے کی بیوی سے یہی الفاظ کہے تھے — "اُسے کہہ دینا کہ پیش ہو جائے، نہیں تو اُس کی گھوڑی اور تانگہ بحق سرکار ضبط ہو جائے گا۔" — کاما پیش نہ ہُوا اور اُس کی گھوڑی تانگے کے آگے جُتی ہُوئی گردن اونچی کر کے جلال آباد کی سڑکوں پر دوڑتی رہی تھی۔ کامے نے جب ملنگوں کے ساتھ ایک انگریز لیفٹیننٹ کو قتل کر کے اس کی لاش زمین میں غائب کر دی تھی تو بھی کامے کی گھوڑی اُن سڑکوں

پر جو آج ہندوستان کی سڑکیں کہلاتی ہیں، سر اونچا کر کے بھاگتی دوڑتی رہی تھی ——— اور اگست ۱۹۴۷ء میں یہ گھوڑی اسی طرح گردن تانے پاکستان میں داخل ہوئی تھی۔

کامے کو اُس وقت پولیس گرفتار کرنے آئی تھی تو اس کی بیوی کا سینہ پھیل جاتا اور سر اونچا ہو جاتا تھا مگر اب آٹھ ساڑھے آٹھ سال بعد پاکستان میں کامے کے گھر پولیس آکر چلی گئی تو اس کی بیوی کا دل خوف کے شکنجے میں آگیا۔ پاکستان میں اس کے پیچھے پولیس کے پھرنے کا مطلب یہ تھا کہ اُس نے کوئی جرم کیا ہے۔ کامے نے بیوی کو بتا رکھا تھا کہ قوم نے جو پاکستان اپنے بیٹے، اپنی جانیں اور اپنی بچیوں کی عصمتیں قربان کر کے حاصل کیا تھا، وہ پاکستان بہت بڑے خطرے میں آگیا ہے اور ملک کو اس خطرے سے بچانے کے لیے ایک زمین دوز تحریک شروع کی گئی ہے۔

"اپنے ملک کو دشمن سے بچانے کے لیے جو تحریک شروع کی گئی ہے وہ زمین دوز کیوں؟" ——— کامے کی بیوی نے اس سے دو چار مرتبہ پوچھا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی ——— "مرد تو دشمن کو للکار کر اور کھلے میدان میں لڑا کرتے ہیں۔"

کامے نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن اس عورت کا ذہن ان باتوں کو قبول نہیں کرتا تھا جو اُسے کاما بتاتا تھا۔ وہ کہتی تھی ——— "روپے پیسے کا لالچ تو ہم غریبوں کو ہونا چاہیے۔ ان اتنے بڑے بڑے لوگوں کو جن کے گھر سونے چاندی سے بھرے ہوئے ہیں، دولت کا ایسا لالچ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنا ایمان اور اپنا وطن بھی دشمن کے ہاتھ بیچ کھائیں۔"

وہ نہیں سمجھ سکی تھی۔ لوگوں کو ان پڑھ اور بھوکا ننگا اسی لیے رکھا جاتا ہے کہ ان کی سوچ تانگے کی گھوڑی سے آگے نہ بڑھ سکے۔ مہنگائی، ملاوٹ، جرائم، رشوت خوری، لاقانونیت، کسمپرسی وغیرہ کا علاج اسی لیے نہیں کیا جاتا کہ قوم کا ہر فرد تانگے کی گھوڑی بن جاتے اور اس کے اندر صرف یہ احساس باقی رہ جاتے کہ اُس کے جینے کا مقصد جُتنا اور ایسے انسانوں کا بوجھ گھسیٹے پھرنا ہے جنہیں وہ جانتا پہچانتا ہی نہ ہو اور جو دوست اور دشمن کی تمیز سے محروم ہو۔

کامے کی بیوی کو کاما جو بات زندگی میں نہیں سمجھا سکا تھا وہ اُس نے مر کر سمجھا دی مگر اُس کے سوال کا جواب جو کامے کے خون سے لکھا گیا تھا، اُس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑی انتظار کر رہی تھی۔

✪

گوالوں، ریڑھ اور تانگہ بانوں، خوانچہ فروشوں اور لوگوں کے گھروں میں جھاڑو برتن کرنے والی عورتوں اور ورکشاپوں اور چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں صبح سے آدھی رات تک کام کرنے والے بچوں کی اس بستی کے لوگ کامے کی بیوی کے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے۔ بہت سی بہنیں بھی اس کے سامنے سے گزر گئی تھیں۔ بعض عورتوں نے اس کے سامنے سے گزرتے پوچھا تھا ——— "کاما نہیں آیا ابھی؟ دروازے میں کھڑی کیا کر رہی ہو؟"

کامے کی بیوی نے کسی ایک کو بھی جواب نہیں دیا تھا، نہ کوئی جواب سننے کے لیے رُکا تھا لیکن ماسٹر احمد علی اس کے پاس رُک گیا۔ ماسٹر احمد علی ایک سرکاری سکول میں دوسری جماعت کو پڑھاتا اور رہتا اِس آبادی میں تھا۔ اسے اتنے پیسوں میں یہاں ایک جھگی مل گئی تھی جتنے وہ دے سکتا تھا۔ وہ کامے کی بیوی کے پاس رکا۔ اُس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔

"کاما کہاں ہے بُوا؟" ——— ماسٹر احمد علی نے اس سے پوچھا ——— "اور سُنا ہے رات پولیس آئی تھی تمہارے گھر میں؟"

"نہ یہ پتہ ہے کہ کاما کہاں ہے نہ یہ جانتی ہوں پولیس کیوں آئی تھی" ——— کامے کی بیوی نے اُداس سے لہجے میں کہا ——— "کل تانگہ کھول کے چلا گیا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔"

ماسٹر احمد علی نے اخبار اپنے سامنے کر لیا اور دیکھنے لگا۔ اُس نے اخبار سے نظریں ہٹا کر کامے کی بیوی کو دیکھا۔ اُس نے ایسے انداز سے دیکھا تھا کہ کامے کی بیوی کو شبہ سا ہُوا۔ اُس نے آگے ہو کر اخبار پر نظر ڈالی جیسے وہ اخبار پڑھ سکتی ہو۔ وہ چونکی اور اخبار ماسٹر احمد علی کے ہاتھ سے چھین کر غور سے دیکھا۔

"ہائیں!" ——— اس نے ایک ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ کر کہا ——— "یہ تو کامے کی تصویر ہے۔ یہ کیسی تصویر ہے ماسٹر جی؟ ہے تو کاما۔"

"کاما ہی ہے بُوا!" ——— ماسٹر احمد علی نے آواز میں درد و غم پیدا کرتے ہوئے کہا ——— "مگر کاما ... کاما ... زندہ نہیں۔ یہ مرے ہوئے کامے کی ..."

کامے کی بیوی نے بڑی زور سے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ مار کر اتنی زور سے چیخ ماری کہ اس آبادی کی بھینسوں کے دل بھی دہل گئے ہوں گے۔ عورتیں اور بچے جھگیوں اور چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکانوں اور گندگی سے اَٹی ہوئی پیچ در پیچ گلیوں سے یوں اُمڈ آئے جیسے زمین سے کیڑے مکوڑے نکل آتے ہوں ——— پھر ہر جھگی سے، ہر گلی سے آوازیں سنائی دینے لگیں:

"کاما پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔"

"اخبار میں خبر آئی ہے۔"

"کامے کی تصویر چھپی ہے۔"

"کامے نے دو عورتوں کو قتل کر دیا ہے۔"

"کامے نے کمال کر دکھایا ہے۔"

"کاما تانگے والا ڈاکہ ڈالتے مارا گیا ہے۔"

"آدمی شیر تھا۔"

"بڑا ہی دلیر تھا۔"

"پکّا چور تھا۔"

"اب بیوی اس کی بھیک مانگتی پھرے گی۔"

کامے کی بیوی کے تو جیسے کان بند ہو گئے تھے۔ وہ بازو لہرا لہرا کر بَین کر رہی تھی۔ اُس کے گرد عورتوں کے ہجوم کے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"یہ بے چاری کہاں دھکے کھاتے گی یارو!" ——— ماسٹر احمد علی نے کہا ——— "چلو کسی سے پتہ کریں۔ کامے کی لاش تو لے آئیں۔"

"پولیس خود ہی اطلاع دے دے گی" ——— آچھی خوانچہ فروش نے کہا ——— "مجھے معلوم ہے پولیس اطلاع دے گی۔ گھنٹہ ڈیڑھ دیکھ لو۔ نہ آئی تو میں جاؤں گا۔"

آچھی کو سب معلوم تھا۔ وہ تھا تو غریب سا خوانچہ فروش لیکن پولیس کا مُخبر تھا۔

✪

اخبار میں جو خبر چھپی تھی، اس نے صرف کامے کی آبادی کو ہی نہیں، سارے شہر میں سنسنی پیدا کر دی تھی؛

دو خطرناک مجرم پولیس مقابلے میں مارے گئے

ایک اے۔ایس۔آئی اور دو کانسٹیبل زخمی ہُوئے

کل دو بڑے ہی خطرناک مجرم سی۔آئی۔اے کی حراست سے فرار ہو گئے۔ پولیس نے ڈی۔ایس۔پی رجب علی کی قیادت میں ان کا تعاقب کیا۔ دونوں نے فرار اور تعاقب کے دوران یکے بعد دیگرے دو کوٹھیوں میں ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن دونوں کوٹھیوں میں رہنے والے بیدار ہو گئے۔ مجرموں نے دونوں کوٹھیوں میں ایک ایک عورت کو قتل کر دیا۔ پولیس کی دی ہوئی مصدقہ اطلاعات کے مطابق ایک مجرم کا نام عبدالجلیل خان تھا جو پولیس کا ریٹائرڈ انسپکٹر تھا اور دوسرے کا نام کرم دین عرف کاما تھا جو جرائم پیشہ دنیا میں کاما تانگے والا کے نام سے مشہور تھا۔

اس سے پہلے یہ خبر شائع ہو چکی ہے کہ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر عبدالجلیل خان کو ایک ریٹائرڈ اسسٹنٹ سب انسپکٹر عبدالقدیر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کی خانہ تلاشی میں اس کے گھر سے دو ریوالور، ایک سٹین گن، چار خنجر اور ایک بکس ایمونیشن کا برآمد ہُوا تھا۔ انکشاف ہُوا تھا کہ ملزم عبدالجلیل خان ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوّث تھا۔

مزید اطلاعات کے مطابق ریٹائرڈ اے۔ایس۔آئی کے قتل کے الزام میں کرم دین عرف کامے کو بھی گرفتار کیا گیا۔ اس کے اقبالی بیان کے مطابق اس نے اور عبدالجلیل خان نے ڈکیتی کی تین مسلح وارداتیں کی تھیں اور بھارت کے جاسوسوں کے ساتھ بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ کل رات دونوں کو تفتیش کے لیے سی۔آئی۔اے کے ہیڈکوارٹر میں لے جایا جا رہا تھا کہ ان کے گروہ نے دونوں کو بڑے دلیرانہ اور ڈرامائی انداز میں پولیس کی حراست سے آزاد کرا لیا اور وہ فرار ہو گئے۔ یہ مجرم اس قدر تجربہ کار اور خطرناک تھے کہ اُنہوں نے پولیس کے تعاقب کی پرواہ نہ کی اور ایک کوٹھی میں ڈاکہ زنی کے لیے داخل ہو گئے۔ عقیلہ نام کی ایک خاتون کی آنکھ کھل گئی مجرموں نے اُس کے پیٹ میں خنجر گھونپ کر ہلاک کر دیا اور فرار ہو گئے۔ وہ تھوڑی ہی دُور ایک اور کوٹھی میں گھس گئے جس میں نسیمہ نام کی ایک خاتون جاگ اٹھی۔ مجرموں نے اسے بھی خنجر سے ہلاک کر دیا اور دونوں بھاگ گئے۔

پولیس ان کے تعاقب میں تھی۔ تعاقب کی قیادت ملک رجب علی ڈی۔ایس۔پی کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک زیرِتعمیر کالونی میں چھاپہ مار کر مجرموں کو ایک نئے اور خالی مکان گھیر لیا۔ مجرموں نے پولیس پر فائرنگ کی جس سے اے۔ایس۔آئی عمران خان، کانسٹیبل عبدالوحید ور کانسٹیبل نذر حسین زخمی ہو گئے۔ پولیس نے جوابی فائر کیا۔ آدھے گھنٹے کے مقابلے میں دونوں مجرم ہلاک ہو گئے۔ سنسنی خیز انکشافات اور مزید گرفتاریوں کی توقع ہے۔ سی۔آئی۔اے کے ذرائع نے ہمارے نمائندے کو بتایا ہے کہ دونوں ہلاک شدہ مجرم ڈاکوؤں اور تخریب کاروں کے بڑے ہی منظم اور خطرناک گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

✪

پولیس نے رات ہی رات یہ خبر تیار کی اور اسے سچا ثابت کرنے کے لیے شہادت بھی تیار کر لی۔ عبدالجلیل خان ایذارسانی سے مرا تھا۔ اس کی لاش میں ریوالور کی دو گولیاں فائر کی گئیں۔ دو گولیاں کامے کی لاش کے پار کی گئیں۔ رات کو ہی ان کے فوٹو تیار کر کے خبر کے ساتھ اخباروں کو دے دیئے گئے۔ ملک رجب علی کو ہیرو بنایا گیا اور اخباروں میں پاکستان کے دشمنوں کے دو دشمنوں کو پاکستان دشمن، ڈاکو اور تخریب کار بنا دیا گیا۔

عبدالجلیل خان اور کامے کے قریبی دوستوں اور رازداروں کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ انہیں جو نہیں جانتے تھے وہ اس خبر کو سچ مان گئے۔ ان دونوں کے خلاف پکّے ثبوت یہ تھے کہ ایک پولیس انسپکٹر رہ چکا تھا، اس لیے اُس کا دوستانہ جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہونا قابلِ یقین تھا۔ کامے کے متعلق یہی کہہ دینا کافی تھا کہ وہ تانگے والا تھا۔ للٰہذا لوگوں کی نگاہوں میں دونوں ڈکیتی، قتل اور پولیس کی حراست سے فرار کے مجرم تھے۔

اُس وقت تک پاکستان کے وہ سیاسی لیڈر جو اقتدار میں رہ چکے تھے وہ پاکستان کو پولیس کی ریاست بنا چکے تھے۔ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے مخالفین کو دبا تے رکھنا ضروری تھا اور یہ کام پولیس ہی کر سکتی تھی، چنانچہ پولیس نے یہ رول ادا کرنا شروع کر دیا تھا اور پولیس کی من مانی اور سکھّا شاہی کا محاسبہ حکمران بھی کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

یہ خبر عبدالجلیل خان کے گھر بھی پہنچی اور پولیس کے مخبروں نے اُس محلّے میں افواہیں پھیلائیں ——— اور جب پوسٹ مارٹم میں اُس کی چیری پھاڑی ہُوئی لاش اس کے گھر پہنچی، اُس وقت تک عبدالجلیل خان بھارت کا جاسوس، روس کا آدمی، ڈکیت، بردہ فروش اور سمگلر بن چکا تھا۔ اُس کا منہ دیکھنے والے ہجوم کے دل میں اس کی محبّت نہیں تھی، نہ اس کی موت کا غم تھا۔ لوگ دیکھنے کو ٹوٹ پڑے کہ جاسوس، سمگلر، ڈکیت اور پولیس مقابلے میں مارے جانے والے آدمی کیسے ہوتے ہیں۔

✪

ڈاکے اور قتل کی خبر کے ساتھ یہ ضرور لکھا جاتا ہے کہ سارے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا لیکن اس خبر نے خوف و ہراس نہ پھیلایا۔ لوگ خوش تھے کہ ملک کے خطرناک مجرموں میں دو کم ہو گئے ہیں۔ البتّہ ایک آدمی ایسا تھا جس نے اخبار میں یہ خبر پڑھی تو خوف و ہراس سے اس کا دل ڈوب گیا۔ یہ شخص راوی روڈ کی کوٹھی "آشنا بھون" میں رہتا تھا اور وہ ارشد کا باپ تھا۔ اُس نے ارشد کے بڑے بھائی یوسف کو بلایا اور اسے خبر دکھا کر کہا کہ یہ پڑھو۔ یوسف خبر پڑھ چکا تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"یہ شخص" ——— ارشد کے باپ اشفاق احمد نے کامے کی تصویر پر انگلی رکھ کر کہا ——— "یہ رات میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ قتل کرنے اور قتل ہونے جا رہا ہے"

"آپ کے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا؟" ——— یوسف نے پوچھا۔

"میرا نہیں" ——— اشفاق احمد نے جواب دیا ——— "ارشد کا ان کے ساتھ گہرا تعلق تھا"

"ارشد کا؟" ——— یوسف نے گھبرائی ہُوئی حیرت زدہ آواز میں پوچھا ——— "ان مجرموں کے ساتھ ارشد کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟"

ریٹائرڈ انسپکٹر عبدالجلیل خان اور کامے تانگے والے کے متعلق ارشد نے اپنے باپ کو بہت کچھ بتا رکھا تھا اور باقی کہانی رات کو کاما سنا گیا تھا۔ ارشد کے باپ نے یوسف کو یہ ساری کہانی سنائی۔

"دیکھو، اقتدار کی ہوس پاکستان کو کس مقام پر لے آئی ہے" ——— اشفاق احمد نے کہا۔

"لیکن اس وقت جو صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے، اس میں آپ پاکستان کو بھارتی جاسوسوں سے بچانا چاہتے ہیں یا ارشد کو پولیس سے؟" — یوسف نے پوچھا — "کیا پولیس کو معلوم ہے کہ ارشد کا بھی اس تحریک کے ساتھ تعلق ہے جو عبدالجلیل نے شروع کی تھی؟"

"میں تمہارے ساتھ یہی بات کرنا چاہتا ہوں" — اشفاق احمد نے کہا — "ارشد کا اس تحریک کے ساتھ تعلق ابھی ابھی شروع ہوا تھا۔ انہی دنوں جب وہ طاہرہ کے ساتھ چھٹی پر آیا تھا وہ کامے اور عبدالجلیل سے ملا تھا۔ اُس نے مجھے ساری تفصیل اور ان لوگوں نے جو پروگرام بنایا تھا بتا دیا تھا۔ رات کاما میرے پاس آیا۔ وہ تھا تو تانگے والا لیکن آدمی عقل والا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ ارشد سے میں کہہ دوں کہ اخباروں میں کوئی خبر پڑھ کر وہ عبدالجلیل کے گھر نہ چلا جائے کیونکہ اس محلے میں سی۔ آئی۔ ڈی کے دو آدمی اور ان کے مخبر گھوم پھر رہے ہوں گے۔ کامے نے کہا تھا کہ اُسے ڈر ہے کہ ارشد جو مردِ مجاہد ہے اور جوشیلا جوان ہے، وہ ضائع ہو جائے گا۔"

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" — یوسف نے کہا — "یہ تو معلوم نہیں کہ پولیس کو ارشد کے متعلق علم ہے یا نہیں۔"

"مجھے خبر کے یہی الفاظ پریشان کر رہے ہیں کہ مزید گرفتاریوں کی توقع ہے۔ اس 'مزید' میں ارشد کا نام بھی ہو سکتا ہے۔ اُس کے ساتھ نہ ٹیلیفون پر بات کرنی چاہیئے نہ تار دینی چاہیئے۔ میں خود راولپنڈی چلا جاتا ہوں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اِدھر سے آپ روانہ ہوں اور اُدھر سے ارشد خبر پڑھ کر اِدھر آ جائے" — یوسف نے کہا — "میں یہاں موجود ہوں گا لیکن ہو سکتا ہے وہ میرے قابو میں نہ آئے۔ آج اور کل انتظار کر لیں.... اور گھر میں ابھی ذکر نہ کریں۔"

"یہ کیسا رہے گا کہ ارشد کو تار دیا جائے کہ بہت ضروری کام ہے، تار ملتے ہی صرف ایک دن کے لیے آ جاؤ" — ارشد کے باپ اشفاق احمد نے کہا۔

"یہی بہتر ہے" — یوسف نے کہا — "میں ابھی جا کے تار دے آتا ہوں۔"

"تار گھر کے پتے پر دینا" — اشفاق احمد نے کہا — "آج چھٹی ہے۔ ارشد دفتر میں نہیں ہو گا" — اشفاق احمد نے چھت کی طرف دیکھ کر لمبی آہ بھری اور دکھیاری سی آواز میں بولا — "کیا بنے گا اس ملک کا! انجام کیا ہو گا۔ یہ سب اقتدار پرستی کی لعنت ہے۔ اقتدار کے ہوس کار اپنے ملک بلکہ اپنے مذہب کے دشمنوں سے بھی مدد لینے سے گریز نہیں کرتے.... یوسف! تم نے کبھی سوچا ہے کہ آدھا پاکستان ہم سے ایک ہزار میل دور ہے اور پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان ہمارا بدترین دشمن موجود ہے، اگر بنگالیوں نے ہمارے دشمن سے مدد لینے کی سوچ لی تو پاکستان کو بچانا بہت مشکل ہو جائے گا۔"

"بنگالی اپنے دشمن سے مدد لیں نہ لیں، دشمن انہیں اپنے پروپیگنڈے سے اپنے زیرِ اثر کر رہا ہے" — یوسف نے کہا — "بنگالی ہمارے ساتھ موجود ہیں۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ مغربی پاکستان والے عیش کر رہے ہیں اور مشرقی پاکستان میں عوام فاقہ کشی تک جا پہنچے ہیں۔ اس میں صداقت ہو یا نہ ہو، ہمارا دشمن یہی پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ اس پروپیگنڈے کا ہماری طرف سے نہ عملی طور پر کوئی جواب دیا جا رہا ہے نہ زبانی۔"

"ہمارے حکمرانوں کو اپنے پروپیگنڈے سے فرصت ہو گی تو وہ دشمن کے پروپیگنڈے کا جواب دیں گے" — اشفاق احمد نے کہا — "اپنی قوم کی جو حالت ہے وہ دیکھ لو اور اخباروں میں جو کچھ چھپتا ہے وہ بھی تم پڑھتے رہتے ہو۔ جن اخباروں کے در پردہ سرکاری وظیفے لگے ہوتے ہیں، ان کی خبروں اور اداریوں سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان

میں سب خیریت ہے اور ہر کوئی خوشحال ہے۔ حکمران اور اس کے وزیروں کی تصویریں اور تقریریں موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف اپوزیشن کے اخبار ہیں۔ وہ حکمرانوں کو یہ بتانے کی بجائے کہ اپنے دشمن سے ہوشیار رہو اور دشمن کے ایجنٹ دیمک کی طرح تمہاری بنیادوں میں اتر گئے ہیں، وہ پاکستان کی ایسی گھناؤنی تصویر پیش کرتے ہیں کہ پڑھ کر شرم آتی ہے۔ وہ ملّی جذبے اور وقار کی، ملک و ملت کے دشمن اور اس کے عزائم کی، پاکستان کے معاشی استحکام کی اور عالمی سیاست میں پاکستان کی پوزیشن کی بات نہیں کرتے۔ ان کا مشن صرف یہ ہے کہ قوم کو برسرِ اقتدار پارٹی کے خلاف اُکسایا جائے اور ملک میں ذہنی انتشار پیدا کر کے حکمران پارٹی کے لیے مشکلات پیدا کی جائیں۔"

"دیانتدار اور مخلص نہ حکومت کرنے والے ہیں نہ اُن کے مخالفین" — یوسف نے کہا — "آپ دیکھ لینا کہ یہی واقعہ جس میں عبدالجلیل اور کاما مارے گئے ہیں، اپوزیشن کی پارٹیوں کے لیے تقریروں اور بیانوں کا موضوع بن جائے گا۔ ان کے حامی اخبار اسے خوب اچھالیں گے اور حکمرانوں کے اخبار تردیدیں اور مزید جھوٹ شائع کرتے رہیں گے۔ نہ برسرِ اقتدار پارٹی ضرورت سمجھے گی نہ اپوزیشن والے اس پر زور دیں گے کہ غیر جانبدار کمیٹی یا کوئی ٹربیونل اور ہائی کورٹ کا کوئی جج تحقیقات کرے کہ اصل واقعہ کیا ہوا تھا۔"

"اس کا فائدہ ہمارے دشمن کو مِل رہا ہے" — اشفاق احمد نے کہا — "یہ دو عورتیں، عقیلہ اور نسیمہ جنہیں اخباروں نے خواتین لکھا ہے، بھارت کی جاسوس تھیں۔ مجھے ارشد نے بتایا تھا اور رات مجھے کامے نے بھی بتایا تھا۔ وہ انہی کو قتل کرنے جا رہا تھا۔ میں اُسے روک نہ سکا۔ وہ میری اس دلیل کو سمجھنے کی ذہنی حالت میں نہیں تھا کہ ایک یا دو سانپوں کو مار ڈالنے سے سارے سانپ نہیں مر جاتے۔ اس بِل کو بند کرنا چاہیئے جہاں سے سانپ پَل پَل کر نکل رہے ہیں۔"

"لیکن ابّا جان!" — یوسف نے کہا — "جسے سانپ نظر آ جاتا ہے وہ تو اُسے مارتا ہی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ سانپ کہاں سے آیا ہے.... یہاں تو آستینوں میں سانپ پالے جا رہے ہیں۔"

"اوہ، یوسف!" — اس کے باپ نے کہا — "تم ارشد کو تار دے آؤ۔"

✪

راولپنڈی میں طاہرہ اپنے باپ جمال بیگ کے ساتھ جسے ہر کوئی جوزی بابا کہتا تھا، اُسی کوارٹر میں رہتی تھی جو سکول کی طرف سے جمال بیگ کو ملا ہوا تھا۔ اس کوارٹر میں اخبار کبھی نہیں آیا تھا۔ طاہرہ نے آکر اخبار جاری کرا لیا تھا۔ اُس صبح اخبار والا اخبار پھینک گیا تھا لیکن نہ طاہرہ نے اخبار کھول کر دیکھا تھا نہ جمال بیگ نے۔ چھٹی کا دن تھا۔ طاہرہ ذرا دیر سے اٹھی تھی۔ ارشد اور عفت کا بیٹا طاہر پرویز جو طاہرہ کو اپنی ماں سمجھتا تھا، طاہرہ کے ساتھ رہتا تھا۔ ارشد ان سے دور اپنے ایک نوکر کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔

طاہرہ نے ناشتہ تیار کیا۔ اس نے طاہر پرویز کو نہ جگایا۔ اپنے باپ کے ساتھ ناشتہ کرنے لگی تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کے باپ کی ذہنی کیفیت اُکھڑی اُکھڑی سی ہے۔ وہ اپنے آپ کو طاہرہ کی ماں کا قاتل سمجھتا تھا۔ اُس نے لوگوں کے بچوں کے پیار سے گناہ کے اس احساس کو تسکین دے لی تھی لیکن طاہرہ اس کے سامنے آئی تو گناہ کا احساس پھر سے بیدار ہو گیا۔ طاہرہ اور نجمہ اسے بارہا کہہ چکی تھیں کہ وہ اس احساس سے آزاد ہونے کی کوشش کرے لیکن وہ زندگی کی راہ سے ہٹتا جا رہا تھا۔ اس صبح ناشتے کے وقت بھی طاہرہ نے اُسے بدلی ہوئی کیفیت میں دیکھا۔

"اباجان!"— طاہرہ نے مسکرا کر پوچھا —"رات نیند نہیں آئی آپ کو؟"

"نیند تو بڑی گہری آئی تھی بیٹا!"— جمال بیگ نے کہا —"لیکن نیند میں بھی بیدار رہا ہوں"— اُس نے آہ بھری اور کہا —"رات تمہاری ماں آئی تھی"— اور وہ خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے پر اُداسی اور زیادہ گہری ہوگئی۔ دھیمی سی آواز میں بولا —"مجھے شرمسار کرنے آجاتی ہے۔"

"کیا کہتی تھیں میری امّی!"

"جب آتی ہے ایک بات ضرور کہتی ہے"— جمال بیگ نے کہا —"کہتی ہے، یہی تھی نہ وہ بیٹی جو تجھے اچھی نہیں لگی تھی اور تو نے میری جان لے لی۔ دیکھ لی وہ بیٹی! میرے سو بیٹے ہوتے تو اس ایک بیٹی پر قربان کر دیتی۔ اب دل میں اس کا پیار لبا لے اور اپنے گناہ کا کفّارہ ادا کر۔"

"اباجان!"— طاہرہ نے کہا —"اپنا وعدہ بھول گئے ہیں آپ؟.... آپ نے کہا تھا کہ تمہاری خوشیوں کی خاطر میں زہر کا پیالہ پی لوں گا.... میں آپ کو اس کیفیت میں دیکھتی ہوں تو میری خوشیاں پامال ہوجاتی ہیں۔ آپ میری امّی کو دیکھنا چھوڑ دیں۔ مجھے دیکھا کریں۔"

"کاش! میں تمہیں نہ دیکھتا"— جمال بیگ نے آہ بھر کر کہا —"اگر تم میری بیٹی نہ ہوتیں تو میں تم سے اتنی دُور بھاگ جاتا جہاں تمہارا تصوّر بھی مجھ تک نہ پہنچ سکتا۔ تمہارے پیار نے مجھے گرفتار کرلیا ہے اور تمہارا پیار مجھے میرے گناہ کی سزا دے رہا ہے۔ میں اس سزا سے نہیں بھاگوں گا۔ یہ میرا مقدّر ہے۔ میں نے اسے قبول کرلیا ہے۔ تم کہو گی کہ جلتی آگ میں کود جاؤ تو میں کود جاؤں گا طاہرہ بیٹی!"

"لیکن آپ تو مجھے جلتی آگ میں پھینک رہے ہیں"— طاہرہ نے اپنی مخصوص شگفتگی سے کہا —"آپ کو اس حالت میں دیکھ کر میں کس طرح خوش رہ سکتی ہُوں۔"

جمال بیگ چونک اُٹھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ایسا نہ کہو طاہرہ بیٹی!"— اس نے کہا —"جس آگ کے شعلے تمہیں جلانے کو لپکیں گے انہیں میں اپنے خُون کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کر دوں گا.... میں جس حالت میں بھی ہُوا کروں، تم پریشان نہ ہُوا کرو۔ ایک تلوار سی ہے جو میری ذات کے دو ٹکڑے کر رہی ہے۔ میں اپنے آپ کو فریب دیتا رہا ہُوں۔ اپنے آپ سے بھاگتا رہا ہوں مگر تم نے آکر مجھے میرا قیدی بنا دیا ہے۔ مجھے میری ذات کے کھنڈروں میں بند کر دیا ہے۔"

"آپ ایک بڑی خوبصورت اور بڑی پختہ عمارت ہیں اباجان!"— طاہرہ نے کہا —"آپ میری پناہ ہیں۔"

جمال بیگ کی نظریں طاہرہ کے چہرے پر جم گئیں اور اُس پر خاموشی طاری ہوگئی۔ طاہرہ کا جواں سال اور حسین چہرہ نوزائیدہ بچی کا چہرہ بن گیا جسے دائی نے ابھی دھویا بھی نہ ہو۔ جمال بیگ کو ایک گرج سنائی دی —"لے جا اس بچّی کو یہاں سے"— یہ کسی درندے کی دھاڑ تھی — یہ جمال بیگ کی اپنی آواز تھی — پچیس سال پرانی آواز — آج وہی آواز اسے سنائی دی تو وہ تڑپ اُٹھا۔ اُس نے پہلے تو بڑی آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھا کر طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا، اب اپنے ذہن میں ماضی کی صدائے بازگشت سن کر اُس نے جھپٹا مار کر طاہرہ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

طاہرہ نے اُس کا چہرہ دیکھا تو گھبرا گئی۔ جمال بیگ کے چہرے پر خوفزدگی کا بھیانک تاثر تھا۔ اس کی آنکھیں اُبل آئی تھیں۔

"کیا ہُوا اباجان؟"

"کس نے کہا تھا، جا لے جا اس بچی کو یہاں سے؟"— جمال بیگ نے ڈراؤنے سے لہجے میں پوچھا۔

"اباجان!"— طاہرہ اُٹھ کھڑی ہُوئی —"کیا ہوگیا ہے آپ کو؟"

جمال بیگ نے طاہرہ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"اب میری بچّی کو کوئی نہیں لے جاسکتا"— جمال بیگ نے کہا —"میں اپنی بچی کی خوشیوں کی خاطر زہر کا پیالہ پی لوں گا۔"

جمال بیگ کی ذات اور شخصیت دو متضاد حصّوں میں کٹ گئی تھی۔

✪

دروازے کی دستک نے اُسے بیدار کر دیا۔ وہ طاہرہ سے یہ کہہ کر کہ تم بیٹھو، میں دیکھتا ہُوں کون ہے، ارشد ہی ہوگا، دروازہ کھولنے چلا گیا۔

وہ ارشد ہی تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اچھی خبر نہیں لایا۔

"تم نے اخبار پڑھا ہے طاہرہ؟"

"کیا ہُوا؟"— طاہرہ نے گھبراتے ہُوئے لہجے میں پوچھا —"میں نے تو ابھی اخبار دیکھا ہی نہیں۔"

"عبدالجلیل خان اور کاما پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں"— ارشد نے کہا اور اخبار اس کے آگے کرتے ہُوئے بولا —"یہ خبر پڑھو.... پڑھو یہ جھوٹ۔"

طاہرہ خبر پڑھنے لگی۔ جمال بیگ بھی اُس پر جھک کر پڑھنے لگا۔ ارشد کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ طاہرہ کا رنگ اُڑتا جارہا تھا۔ خبر پڑھ کر اُس نے خالی خالی نظروں سے ارشد کو دیکھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ عقیلہ اور نسیمہ ہندو لڑکیاں ہیں"— ارشد نے کہا —"عبدالجلیل اور کامے نے دونوں کو قتل کر دیا ہوگا۔"

"اس سے پہلے تم نے بتایا تھا کہ ایک ریٹائرڈ تھانیدار عبدالقدیر قتل ہوگیا ہے"— طاہرہ نے کہا —"تم کہتے تھے کہ وہ تمہارا آدمی ہے۔ پھر خبر آئی تھی کہ اُسے عبدالجلیل نے قتل کیا ہے۔"

"میں بتا نہیں سکتا یہ کیا معاملہ ہے"— ارشد نے کہا —"میں ابھی لاہور چلا جاتا ہوں۔ وہیں سے کچھ پتہ چلے گا۔ رات کی گاڑی سے واپس آجاؤں گا۔"

"نہ جاؤ ارشد!"— طاہرہ نے التجا کے لہجے میں کہا —"پولیس تک تمہارا نام بھی پہنچ چکا ہوگا۔ یہ سب ایک ڈرامہ ہے جو پولیس نے بنایا ہے۔"

"بات کیا ہے؟"— جمال بیگ نے پوچھا۔ وہ جیسے بیدار ہوگیا تھا۔ کہنے لگا —"بیٹھ جاؤ ارشد بیٹا! اتنا جذباتی ہوکر فیصلہ نہ کرو۔ کچھ مجھے بھی سمجھاؤ۔"

ارشد نے اُسے تفصیل سے بتا دیا کہ عبدالجلیل خان کون تھا، کاما کون تھا اور عبدالجلیل نے بھارتی ایجنٹوں کے خلاف ایک تحریک شروع کی تھی۔ ارشد نے اس تحریک کے اغراض و مقاصد اور لائحہ عمل بھی بتایا اور اُس نے اپنے متعلق بھی بتایا کہ وہ اس تحریک میں کس طرح شامل ہُوا تھا۔ جمال بیگ انہماک سے سُنتا رہا اور اس کے ماتھے پر شکن پڑتے گئے۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"لاہور نہ جانا ارشد بیٹا!"— جمال بیگ نے کہا —"کچھ کیے بغیر پکڑے جاؤ گے۔ چند دن انتظار کرلو۔ معلوم ہوتا ہے تم لوگوں نے عقل سے نہیں جذبات سے کام لیا ہے۔ جوش میں آکر کسی تحریک کی بنیاد رکھ لینا کوئی مشکل کام نہیں۔ اصل کام اسے کامیابی سے چلانا ہے جو عقل اور احتیاط کے بغیر ممکن نہیں۔"

جمال بیگ نے ارشد کو قائل کر لیا کہ وہ لاہور نہ جاتے اور دن اُسی کے گھر گزارے۔

✪

اُس وقت پاکستان کا دارالحکومت کراچی میں تھا اس لیے دوسرے ملکوں کے سفارت خانے بھی کراچی میں تھے۔ اُس صبح کی خبر نے کراچی میں بھارت کے سفارت خانے کو یوں ہلا دیا جیسے شدید زلزلہ آیا ہو۔ بھارت کی دو بڑی ہی کارآمد لڑکیاں ماری گئی تھیں، اور بھارتی سفارت خانے کے لیے دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ پاکستان میں کوئی ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو جاسوسوں کے خلاف سرگرم ہے۔ بھارت کے ہائی کمشنر کو ایک گھنٹے کے اندر اندر لاہور سے بذریعہ ٹیلیفون تفصیلی اطلاع مل گئی تھی کہ اس پولیس مقابلے کی اصل حقیقت کیا تھی۔ اُس نے اپنے سٹاف کے اُس آدمی کو بلایا جس کا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ تھا۔ پاکستان میں بھارت کے جو جاسوس اور ان کے جو پاکستانی ایجنٹ تھے، ان کی ہدایت کاری، دیکھ بھال، ان سے رپورٹیں لینے کا کام اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے دیگر امور جو بھارت کے کام آ سکتے تھے، ان سب کی ذمہ داری اس آدمی جی۔ سی ورما کی تھی۔

ہر ملک میں ہر ملک کا سفارت خانہ ہوتا ہے اور ہر سفارت خانہ جاسوسی کا اڈہ ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھارت کا سفارت خانہ تو خاص طور پر جاسوسی کا بڑا ہی سرگرم مرکز تھا۔ یہاں سے دولت تقسیم ہوتی تھی۔ یہ پاکستانیوں کے ایمان کا نیلام گھر تھا۔ یہاں پرانے اور قابلِ اعتماد ایجنٹوں کے ذریعے نئے ایجنٹ بھرتی کیے جاتے تھے۔ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے ایمان کی قیمت سب سے زیادہ تھی۔ ان کے ذمے صرف یہ کام تھا کہ اپنے عوام میں ذہنی انتشار اور ذہنی عیاشی پیدا کرتے رہیں۔ دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں میں ہندومت اور بھارت کا پرچار کرتے رہیں۔ پاکستانیوں کے عسکری جذبے کو نہ اُبھرنے دیں۔ اس قسم کے کچھ اور فرائض بھی تھے جو قلمکاروں اور صحافیوں کے ذمے تھے۔

دوسرا گروہ جاسوسوں کا تھا جن میں اسلامی ناموں سے ہندو بھی تھے اور پاکستانی مسلمان بھی۔ یہ پاکستانی سرکاری شعبوں کے اہل کار بھی تھے۔ ان میں اُس افسر شاہی کے کچھ کل پُرزے بھی تھے جو اقتدار میں آنے والے ہر سیاسی لیڈر پر اپنا طلسم طاری کر کے داخلہ اور خارجہ پالیسیاں بناتے اور من مانی کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے پاکستان کا کوئی راز پوشیدہ نہیں رہتا تھا۔

اس گروہ میں وہ سیاسی اور مذہبی لیڈر بھی تھے جو آزادی سے پہلے دو قومی نظریہ اور پاکستان کے مخالف تھے مگر اب پاکستان کی سیاست کی قیادت ان کی مٹھی میں تھی۔ وہ کوئی نہ کوئی نعرہ دے کر ملک میں ہنگامے کراتے رہتے تھے۔ انہوں نے کالجوں پر اپنا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا اور وہ طلباء کو سیاسی ہنگاموں میں استعمال کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے سٹوڈنٹ لیڈر پیدا کیے اور انہیں بے دریغ رقمیں دیتے تھے۔ یہ کثیر رقمیں بھارت کے سفارت خانے سے آتی تھیں۔ روس اور امریکہ کے سفارت خانے بھی پاکستان کے سٹوڈنٹ لیڈروں کو اپنے مقاصد کے لیے بڑی بڑی رقمیں دیتے تھے۔

طلباء میں سیاست کے جراثیم اور ان کے اپنے لیڈر پیدا کرنے کا فائدہ پاکستان کے دشمن کو یوں پہنچا کہ وہ نوجوان جنہیں پاکستان کا وارث اور پاسبان بننا تھا وہ تخریب کار بن گئے اور "پاکستان زندہ باد" کے نعرے کو وہ اقتدار پرستی کی سیاست کے استعمال کی چیز سمجھنے لگے اور خود نادانستہ طور پر دشمن کے استعمال کی چیز بن گئے۔ لیڈروں نے ان کے منہ میں نعرے بھی دیئے، پیسے بھی دیئے اور انہیں خنجر، چاقو اور ریوالور بھی دیئے۔

اس طرح پاکستان میں بھارتی سفارت خانہ ہندوؤں کی اُس دیوی کی مانند تھا جس کے بے شمار ہاتھ ہیں۔ یہ ہاتھ پاکستان کے ہر شعبے میں پہنچے ہُوئے تھے اور پاکستان کے حکمران سیاست کے میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا تھے۔

✪

پاکستان میں بھارت کے ہائی کمشنر نے اپنے سٹاف کے انٹیلی جنس کے افسر کو اور دو اور افسروں کو بلایا اور انہیں یہ خبر سنائی کہ لاہور میں رادھا اور کرن (اسلامی نام نسیمہ اور عقیلہ) قتل ہو گئی ہیں۔

"اِس سے پہلے ہمارا ایک پاکستانی ایجنٹ عبدالقدیر قتل ہو گیا تھا"۔۔۔ ہائی کمشنر نے کہا۔۔۔ "اُس کا قاتل ایک ریٹائرڈ انسپکٹر پولیس عبدالجلیل خان پکڑا گیا تھا۔ اب خبر آئی ہے کہ اُس کے ساتھ ایک تانگے والا بھی تھا۔ رادھا اور کرن کو بھی انہوں نے ہی قتل کیا ہے اور دونوں قاتل اتنے دلیر اور تجربہ کار تھے کہ وہ پولیس کی حراست سے فرار ہوتے اور انہوں نے پولیس کا مقابلہ کیا اور مارے گئے"۔

"عبدالجلیل خان ہماری دونوں لڑکیوں کے قتل میں شامل نہیں تھا"۔۔۔ انٹیلی جنس کے جی۔ سی ورما نے کہا۔۔۔ "وہ دو سیاستدانوں کی ذاتی دشمنی کا شکار ہُوا ہے۔ وہ دونوں آدمی چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش ہیں۔ البتہ عبدالجلیل خان نے ہماری انٹیلی جنس کے خلاف ایک گروہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن عبدالقدیر نے اس سے یہ راز لے لیا اور اس کی سکیم بھی معلوم کر لی"۔

جی۔ سی ورما نے اس واقعہ کے متعلق اور اس کے ساتھ جن افراد کا تعلق تھا، مکمل معلومات دیں جیسے وہ ذاتی طور پر ہر ایک کو جانتا ہو اور وہ اس واقعہ کا عینی شاہد ہو، حالانکہ وہ کراچی میں تھا مگر اس کی آنکھیں پاکستان کے دُور دراز اور اندھیرے گوشوں کے اندر جھانک رہی تھیں۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں ہمارے خلاف کوئی تحریک چل رہی ہے"۔۔۔ ہائی کمشنر نے کہا۔۔۔ "ہمیں یہاں کے لوگوں کی اس تحریک کو اور ان کے جذبے کو ختم کرنا ہے۔ جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ یہ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر سیاست دانوں کے ساتھ ذاتی دشمنی کا شکار ہُوا ہے، یہ بہت اچھی بات ہے۔ ان لوگوں کو آپس میں ٹکراتے رہو..... اس واقعہ کے متعلق مزید چھان بین کریں اور مجھے بتائیں کہ اس واقعہ میں کون کیا تھا اور آئندہ کیسے کِس طرح بہتر طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ آپ کو آپ کے فرائض یاد دلاؤں لیکن میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو ایک بار پھر بتا دوں کہ اپنے آپ کو صرف افسر نہ سمجھیں۔ اپنے آپ کو صرف سفارت کار بھی نہ سمجھیں۔ آپ بھارت کے سپوت ہیں۔ اس حقیقت کو مت بھولیں کہ پاکستان مسلمانوں کی سیاسی غنڈہ گردی کا نتیجہ ہے۔ یہ بھارت کا حصہ ہے اور اسے ہر جائز اور ناجائز طریقے سے بھارت میں شامل کرنا ہے"۔

"بھارت نہیں"۔۔۔ ایک ہندو افسر نے کہا۔۔۔ "مہا بھارت کہیں"۔

"ہاں مہا بھارت"۔۔۔ ہائی کمشنر نے کہا۔۔۔ "جس میں اُدھر برما، اِدھر افغانستان اور دجلہ اور فرات تک مہا بھارت ہے۔ جو ہندو پاکستان کے وجود کو تسلیم کرے گا اُسے ہندو جاتی سے خارج کر دیا جائے گا۔ مہا بھارت کی عزت ہمیں اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی عزت سے زیادہ عزیز ہے..... ہماری حکومت پاکستان کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف رہتی ہے لیکن ہمیں یہ کمال کر دکھانا ہے کہ فوج کے بغیر پاکستان کو ختم کر دیں"۔

"اپنی سکیم پر مزید بحث کی ضرورت نہیں"۔۔۔ جی سی ورما نے کہا ۔۔۔ "ہمیں پاکستان کو اس قدر کمزور کرنا ہے کہ جب ہماری فوج پاکستان پر حملہ کرے تو پاکستان کی فوج چند دنوں میں ہتھیار ڈال دے۔ مشرقی پاکستان میں ہم نے زمین کے نیچے قدم جما لیے ہیں۔ اِدھر بھی ہم کامیابی حاصل کر لیں گے۔ اس میں وقت لگے گا لیکن ہم فتح حاصل کر لیں گے۔"

بھارتی سفارت خانے میں بہت دیر پاکستان کی تخریب کے منصوبے پر بحث مباحثہ ہوتا رہا اور بات پھر عبدالجلیل خان اور کامے تانگے والے اور پولیس مقابلے پر آگئی۔ بھارتی ہائی کمشنر نے کہا کہ سارے پاکستان میں اپنے آدمیوں کو خبردار کر دو کہ زمین کے نیچے چلے جائیں اور اگلے حکم کا انتظار کریں۔

✪

ارشد ابھی جمال بیگ اور طاہرہ کے ساتھ ہی تھا۔ اس کا بیٹا طاہر پرویز جاگ اٹھا تھا۔ وہ اپنے باپ کو دیکھ کر بہت خوش ہُوا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ ارشد اُس کے ساتھ ہنسی مذاق کرے گا۔ کھیلے گا مگر ارشد اور طاہرہ کو اُس نے اُداس اور پریشان دیکھا۔ وہ بھی سمجھ گیا۔ جب ارشد نے اسے کہا کہ جاؤ بیٹا پڑھ لو، پھر ہمارے پاس آنا تو اسے بہت ہی مایوسی ہوئی تھی۔ ارشد اور طاہرہ کو عبدالجلیل خان اور کامے کی موت کا نہیں ایک تحریک کی موت کا غم تھا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ وہ سب کھانے پر بیٹھے ہی تھے کہ ارشد کا نوکر آگیا۔ اُس کے ہاتھ میں تار تھا۔ نوکر تار ملتے ہی دوڑا آیا۔ ارشد نے تیزی سے تار کھولا۔ اس کے بھائی یوسف کا تھا لکھا تھا۔۔۔ "فوراً آؤ۔ بہت ضروری کام ہے۔"

"کیا کام ہو سکتا ہے؟"۔۔۔ طاہرہ نے پوچھا۔

"میرے بغیر گھر کا کوئی کام کبھی نہیں رُکا"۔۔۔ ارشد نے کہا ۔۔۔ "کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔"

کھانا کھا کر وہ اپنے گھر گیا۔ درخواست لکھ کر نوکر کو دی اور اُسے کسی کا نام بتا کر کہا کہ کل صبح دفتر میں اُسے درخواست دے آئے۔ وہ لاہور کو روانہ ہو گیا اور رات نو بجے لاہور اپنے گھر پہنچ گیا۔ کھانے کے بعد اُس کا باپ اور بڑا بھائی یوسف اُسے الگ لے گئے۔

"تم نے آج کے اخبار دیکھے ہیں؟"۔۔۔ ارشد سے اس کے باپ نے پوچھا۔

"مجھے پہلے یہ بتائیے کہ وہ ضروری کام کیا ہے جس کے لیے آپ نے مجھے بلایا ہے؟"۔۔۔ ارشد نے پوچھا ۔۔۔ "آپ نے میرے کان میں کہہ دیا تھا کہ میں امّی اور بھابی کے سامنے اس کام کی بات نہ کروں۔ اب آپ پوچھ رہے ہیں کہ میں نے آج کے اخبار دیکھے ہیں یا نہیں..... ہاں دیکھے ہیں۔ عبدالجلیل خان اور کاما پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں۔ اس کے سوا میں نے اخباروں میں اور کچھ نہیں پڑھا۔"

"ہم نے تمہیں اسی سلسلے میں بلایا ہے"۔۔۔ ارشد کے باپ اشفاق احمد نے کہا اور اُسے بتایا کہ رات کاما یہاں آیا تھا اور وہ کیا کچھ بتا گیا ہے ۔۔۔ "عبدالجلیل خان اور کامے کو قتل کیا گیا ہے۔ کوئی پولیس مقابلہ نہیں ہُوا۔ تم نے خبر کے آخری الفاظ پڑھے ہوں گے کہ مزید گرفتاریوں کی توقع ہے۔ کاما مجھے صرف یہ کہنے آیا تھا کہ عبدالقدیر نے عبدالجلیل کا دوست بن کر اُس سے سارا بھید لے لیا اور اُس نے تمہارا نام بھی ظاہر کر دیا ہو گا۔ عبدالقدیر کو کامے نے قتل کیا تھا۔ کاما مجھے سختی سے کہہ گیا ہے کہ ارشد سے کہنا کہ وہ اُس کے اور عبدالجلیل

کے گھر سے دُور رہے ورنہ پکڑا جائے گا اور پاکستان کے لیے کچھ کیے بغیر مارا جائے گا۔"

"ہمیں یہ ڈر تھا کہ تم خبر پڑھتے ہی آجاؤ گے"۔۔۔ ارشد کے بڑے بھائی نے کہا ۔۔۔ "اور تم سٹیشن سے سیدھے عبدالجلیل کے گھر نہ چلے جاؤ۔ ہم نے تار اس لیے دیا تھا کہ تم ضروری کام کا پڑھ کر پہلے گھر آؤ۔"

"تو کیا آپ مجھے گرفتاری سے ڈرانا اور بچانا چاہتے ہیں؟"۔۔۔ ارشد نے کہا ۔۔۔ "کیا ہم نے پاکستان اِس لیے بنایا تھا کہ پاکستان بنانے والے مشتبہ اور مجرم بنائے جائیں اور یہ ملک اقتدار پرستوں کا اکھاڑہ اور ہندوستانی جاسوسوں کا گھر بن جائے؟"

"جذبات سے نکلو ارشد!"۔۔۔ باپ نے کہا ۔۔۔ "تحریکیں جذبات سے نہیں چلا کرتیں۔ عقل سے کام لو۔ میں تمہیں پاکستان کے لیے مر مٹنے سے نہیں روک رہا۔ میں تم جیسے دس بیٹے پاکستان پر قربان کرنے کی ہمت رکھتا ہوں لیکن میں تمہیں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ تم ہندوستان کے جاسوسوں کی بات کر رہے ہو۔ ہندوستان کے جاسوسوں سے اور ہندوستان کی فوج سے کون ڈرتا ہے؟ ڈر اپنوں کا ہے۔ قرآن کی سرزمین کے دشمن خود وہ ہیں جو ہر تقریر میں قرآن کے حوالے دیتے ہیں۔ دشمن چنگاری پھینکا کرتا ہے، اپنے ہوا دیا کرتے ہیں۔ ہمیں ان اپنوں کے خلاف محاذ بنانا ہے۔ لوگوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنی ہے۔ اس میں وقت لگتا ہے۔ ایسی تحریک ایک دن یا ایک مہینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے تمہارے عزم کی تکمیل تمہارا بیٹا جوان ہو کر کرے۔"

"کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ...؟"

"ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں"۔۔۔ ارشد کے باپ نے اُسے آگے بولنے نہ دیا ۔۔۔ "جذبات سے نکلو، جذبے کو زندہ رکھو۔ اپنے جذبے اور اپنی روایات کو اپنے بچے کے سینے میں ڈال دو۔ ابھی سے اُسے بتانا شروع کر دو کہ ہم نے پاکستان کی کیا قیمت دی تھی اور آزادی کی کیا قیمت ہے اور ہمارا دشمن کون ہے۔"

"اگر تم عبدالجلیل خان اور کامے جیسی کارروائیاں اور باتیں کرو گے تو تم بھی اسی انجام کو پہنچو گے"۔۔۔ ارشد کے بڑے بھائی نے کہا ۔۔۔ "ہمارے ملک میں دو قسم کے مخبر ہیں۔ ایک ہندوستانی جاسوس ہیں اور دوسرے جاسوس اپنے ملک کے ہیں۔ یہ اپنے ملک کی نہیں بلکہ ہر اُس حکمران کی انٹیلی جنس ہوتی ہے جو اقتدار میں آتا ہے۔ یہ انٹیلی جنس اپنے ملک کے دشمنوں کو نہیں اپنے حکمران کے دشمنوں کو پکڑتی ہے۔ یہ دو طرح کے جاسوس تمہارے گروہ کے ایک ایک فرد کو چن چن کر مارتے چلے جائیں گے۔"

رات گزرتی جا رہی تھی اور ارشد کا باپ اور اُس کا بھائی اُسے جذباتیت سے نکالنے اور تلخ حقائق کی طرف لانے کے لیے بولتے چلے جا رہے تھے۔ ارشد پر یہ دلیلیں اثر کر گئیں مگر یہ خطرہ موجود رہا کہ پولیس کی فہرست میں ارشد کا نام بھی ہو گا۔

✪

ارشد چار روز کی چھٹی آیا تھا۔ اُس نے یہ دن گھر میں ہی گزارے۔ اُس کی چھٹی کی آخری رات تھی۔ نو بج چکے تھے۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ یوسف باہر گیا اور گھبرایا ہُوا اپنے باپ کے کمرے میں گیا۔

"کون ہے؟"۔۔۔ باپ نے پوچھا۔

"ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی"۔۔۔ یوسف نے سرگوشی کی ۔۔۔ "پولیس مقابلے کا ہیرو..... ارشد کو اِدھر اُدھر کر دیں؟ اِس وقت اُس کے آنے کا مطلب ہی کیا ہو سکتا ہے؟"

"نہیں"——ارشد کے باپ اشفاق احمد نے اٹھتے ہوئے کہا——"میں اُسے جانتا ہوں۔ اُس وقت سے جانتا ہوں جب یہ اے۔ ایس۔ آئی تھا۔"

اشفاق احمد باہر گیا اور رجب علی سے بغلگیر ہو کر ملا۔

"ارشد غالباً راولپنڈی ہوتا ہے"——ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی نے پوچھا۔

"تم اندر آؤ یار!"——اشفاق احمد نے بے تکلفی سے کہا——"مجھے معلوم ہے تم ارشد کے لیے آئے ہو"

وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ اشفاق احمد اُس کے ساتھ ہنس ہنس کر اور کچھ خوشامدانہ لہجے میں باتیں کر رہا تھا مگر رجب علی اتنا سنجیدہ تھا کہ چہرے پر سنجیدگی کرب کا تاثر بن گئی تھی۔ اشفاق احمد نے جب اپنی ہنسی اور خوشامد کو رائیگاں جاتے دیکھا تو خاموش ہو گیا کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی جسے اشفاق احمد نے توڑا۔

"ملک صاحب!"——اشفاق احمد نے کہا——"میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو میں ابھی تک اپنا ویسا ہی دوست سمجھتا رہا جب آپ اے۔ ایس۔ آئی ہوا کرتے تھے۔ میں بھول گیا تھا کہ آپ ڈی۔ ایس۔ پی ہیں اور میرے بیٹے کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔"

ملک رجب علی نے اُس کی طرف دیکھا پھر اُس کا سر جھک گیا۔ اس نے جب سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور اُس کے چہرے پر کرب کا تاثر زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔

"ملک صاحب!"——اشفاق احمد نے کہا——"بھول جائیں کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی جانتے پہچانتے بھی تھے۔ اپنا فرض ادا کریں۔ صاف کہہ دیں کہ اشفاق، میں تمھارے بیٹے کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔"

رجب علی اور زیادہ بے چین ہو گیا۔ اُدھر دوسرے کمرے میں یوسف ارشد سے کہہ رہا تھا کہ ہم جس بات سے ڈرتے تھے وہی ہوئی ہے۔ خبر میں جس ڈی۔ ایس۔ پی کا نام آیا تھا، وہ ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا ہے۔ وہ تمھاری پوچھ رہا ہے۔

"میں اُس کے سامنے ہو جاتا ہوں"——ارشد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں"——یوسف نے کہا——"پہلے دیکھ لو ابا جان کیا کرتے ہیں۔"

"بھائی جان!"——ارشد نے کہا——"میں اپنے بوڑھے باپ کو کسی مشکل میں نہیں ڈالوں گا۔ وہ اس ڈی۔ ایس۔ پی کی خوشامد کر رہے ہوں گے۔ اسے کہہ رہے ہوں گے کہ جو لینا ہے لے لو میرے بیٹے کو گرفتار نہ کرو۔ میں اپنے باپ کا سر نیچے نہیں ہونے دوں گا"——اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

"یہ ہے میرا بیٹا ارشد!"——اشفاق احمد نے رجب علی سے کہا——"مجھے وارنٹ گرفتاری دکھا دو اور اسے لے جاؤ۔"

"چوہدری اشفاق!"——ڈی۔ ایس۔ پی نے دبے دبے سے لہجے میں کہا——"آپ عقل والے انسان ہیں۔ آپ خاندانی ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ میرے جذبات کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں..... بیٹھ جاؤ ارشد! .... چوہدری اشفاق! میں آیا تو ارشد کے لیے ہوں لیکن میں اپنے ایک گناہ کا کفّارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ پولیس بڑا ہی بدنام محکمہ ہے لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ پولیس والے انسان ہوتے ہیں۔ ہم سے وہ کچھ کرایا جاتا ہے جو ہم نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری ٹریننگ کچھ اور ہوتی ہے لیکن ہمیں فرائض کچھ اور بتائے جاتے ہیں۔"

"ملک رجب علی!"——اشفاق احمد نے کہا——"ایسی تمہید کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے مجھے پریشانی اور کوفت ہو رہی ہے۔ میرا بیٹا حاضر ہے۔"

"چوہدری اشفاق! خدا بھی حاضر ہے"——ملک رجب علی کی آواز میں جان آگئی۔ اس نے کہا——"آپ میرے خاندان کو جانتے ہیں۔ آپ کو میرا باپ یاد ہو گا۔ ملک اللہ یار خان کو سارا مشرقی پنجاب جانتا تھا۔ ان کی جاگیر دُور دُور تک مشہور تھی۔"

"مجھے یاد ہے"——اشفاق احمد نے کہا——"ہندوؤں نے انہیں بہت لالچ دیتے تھے۔ میں امرتسر ڈی سی آفس کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ میں نے بہت کچھ اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ انگریز ڈی سی نے آپ کے والد صاحب کو اپنے دفتر میں بلا کر کہا تھا کہ ان کی جاگیر کے تمام ووٹ کانگرس کے بکس میں جائیں ورنہ ان کی جاگیر کے وہ مربعے جو انہیں انگریزی حکومت سے ملے ہیں ضبط کر لیے جائیں گے۔ آپ کے والد صاحب نے جواب دیا تھا کہ ساری جاگیر ضبط کر لو لیکن میرے زیرِ اثر جتنے ووٹ ہیں وہ پاکستان اور قرآن کے نام پر مسلم لیگ کے امیدوار کے بکس میں جائیں گے۔ میں اپنی جاگیر سے دست بردار ہو سکتا ہوں اپنے مذہب سے نہیں۔ پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ——یہ میرا کلمہ ہے جو میرے پیدا ہوتے ہی میرے کان میں ڈالا گیا تھا۔ یہ کہہ کر آپ کے والد صاحب نے ڈی سی سے کہا کہ کوئی اور حکم؟ اور وہ اس انگریز کو رسمی سا سلام بھی کیے بغیر چلے گئے تھے۔"

"وہ تمام جاگیر وہیں رہ گئی"——ملک رجب علی نے کہا——"میرے والد صاحب بہت خوش تھے کہ پاکستان کے نام پر ان کی جاگیر قربان ہو گئی ہے.... وہ پچھلے سال سکون اور اطمینان کی زندگی گزار کر فوت ہوئے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے"——اشفاق احمد نے کہا——"میں ان کے جنازے میں شریک تھا۔"

"میں اس باپ کا بیٹا ہوں"——ملک رجب علی نے کہا——"اُس نے کہا تھا کہ انسان کو انسان اور پاکستان کو اپنا ایمان سمجھنا مگر جس ملک سے ایمان اُٹھ گیا ہو وہاں کوئی اپنا ایمان کہاں تک محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ہم نے ایک قاتل کو پکڑا تو چار ٹیلیفون آ گئے کہ خیال رکھنا، اپنی پارٹی کا آدمی ہے، مقدمہ ڈھیلا رکھنا سیشن سے بری کرا لیں گے۔ کرتے کرتے پولیس کی ڈیوٹی یہ رہ گئی کہ پاکستان کے تخت پر کوئی اُلّو کا پٹھا ہی کیوں نہ بیٹھ جائے، اُس کی حفاظت کرنا اور وہ جس کی طرف اشارہ کرے اُسے اندر کر دینا اور مخالفین پر ایسے ذلیل الزام عائد کرنا کہ وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے.... یہ فرض میں بھی ادا کرتا رہا۔ لوگوں کے گھر لٹتے رہے۔ جرائم بڑھتے گئے۔ لوگ پولیس کو گالیاں دیتے رہے لیکن پولیس کو کسی اور طرف مصروف رکھا گیا۔ پولیس اور غنڈے سیاستدانوں کے ہتھیار بن گئے۔"

"میں یہ سب کچھ جانتا ہوں ملک صاحب"——اشفاق احمد نے کہا——"آپ یہ مجھے کیوں سنا رہے ہیں۔"

"میں اقبالِ جرم کر رہا ہوں چوہدری اشفاق!"——رجب علی نے کہا——"میں گناہوں کی گٹھڑی آپ کے آگے پھینکنے آیا ہوں۔ میں آپ کے بیٹے کو گرفتار نہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اس کیس کی حقیقت کیا ہے؟"——ارشد نے پوچھا۔

"حقیقت یہ ہے کہ کوئی پولیس مقابلہ نہیں ہوا تھا"——ملک رجب علی نے کہا——"عبدالجلیل خان میرے ہاتھوں کمرے کے اندر مرا ہے۔ میں اُس کا قاتل ہوں۔ وہ پولیس مقابلے کے قابل کہاں تھا۔ اُسے تو ہم نے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا.... اور کا ماں دو ہندو لڑکیوں کو قتل کر کے زخمی حالت میں میرے پاس آیا تھا۔ اس کی پیٹھ میں بارہ بور بندوق کے چھرّے اُتر گئے تھے۔ وہ عبدالقدیر کے قتل کا بھی اعتراف کر

کے اور مجھے شرمسار کر کے میرے گھر میں مرا تھا۔"

"یہ جانتے ہوئے کہ آپ ایک عظیم باپ کے بیٹے ہیں ملک صاحب!" ــــ اشفاق احمد نے کہا ــــ "پھر بھی یقین نہیں آتا کہ ایک ڈی۔ ایس۔ پی اس طرح اپنے جرائم کا اعتراف کرے۔"

"آپ کسی بھی پولیس افسر کا سینہ کھول کر دیکھیں" ــــ ملک رجب علی نے کہا ــــ "وہاں آپ کو ایک انسان دبکا بیٹھا نظر آئے گا۔ اس انسان میں انسانیت کی محبت اور درد ہے۔ یہ انسان مجرموں کا اتنا ہی دشمن ہے جتنا ہر شہری ہے۔ اس انسان کو دفن کر دیا گیا ہے اور اس پر پولیس کی وردی کا کفن چڑھا دیا گیا ہے مگر یہ حکمرانوں کی بھول ہے۔ یہ ہم سب کی بھول ہے۔ اس انسان کو دفن نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم میں نہیں کر سکا۔ اندر کا انسان مر نہیں سکتا کیونکہ وہ خدا کا نائب ہے۔ ہُوا یوں تھا کہ عبدالجلیل کو اس حکم کے ساتھ میرے حوالے کیا گیا کہ اس کے خلاف عبدالقدیر کا قتل ثابت کرنا ہے۔ میں عبدالقدیر کو بھی جانتا تھا، عبدالجلیل کو بھی۔ عبدالقدیر مشکوک چال چلن کا خطرناک آدمی تھا اور عبدالجلیل مردِ مومن تھا۔ سی۔ آئی۔ اے میں اُسے ایسی ایسی اذیتیں دی گئیں جو تجربہ کار ڈاکو اور پتھر جیسے جسموں والے بھی برداشت نہیں کر سکتے لیکن عبدالجلیل کے یہ الفاظ مجھے مرتے دم تک یاد رہیں گے۔ اُس نے نیم غشی کی حالت میں کہا تھا ــــ 'ملک! تم میری ہڈیاں توڑ سکتے ہو۔ میرا ایمان سلامت ہے اور آخری سانس تک سلامت رہے گا'....

"میں نے اُسے اذیّت رسانی کے لیے جو دو کانسٹیبل مقرر کیے تھے وہ اس کام کے ماہر ہیں۔ انہوں نے حیران ہو کر مجھے بتایا تھا کہ اُسے برف کے بلاک پر ننگا لٹایا گیا اور اس کے اوپر ایک کانسٹیبل بیٹھ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ عبدالجلیل کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ کوئی وِرد کر رہا تھا۔ دوسرے کانسٹیبل نے کہا تھا ــــ 'یہ کوئی پہنچ والا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی خدائی طاقت ہے' ــــ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ عبدالجلیل کے ہاتھ میں حق اور صداقت کی طاقت تھی۔ میں نے اُس کی یہ طاقت دیکھی ہے۔ وہ بیہوشی میں بھی اللہ کا نام لیتا اور مجھے کہتا تھا ــــ 'میرا ایمان سلامت ہے ملک!'....

"میں رات کو سو نہیں سکتا تھا۔ اُس کے الفاظ میرے اوپر بھڑوں کی طرح بھنبھناتے رہتے تھے۔ میں ہار گیا تھا لیکن میرا ایس۔ پی مجھے انسان سے پھر ڈی۔ ایس۔ پی بنا دیتا تھا۔ میں سچ اور جھوٹ میں پِسنے لگا۔ حق اور باطل نے دو پتھروں کی طرح مجھے اپنے درمیان لے کر میری روح کو کچلنا شروع کر دیا۔ میں پاگل ہونے لگا۔ اگلی صبح اُس کمرے میں گیا جہاں عبدالجلیل فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ تقریباً بے ہوش تھا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ مجھے غصّہ اُن پر تھا جنہوں نے مجھے یہ فرض سونپا تھا۔ مجھے غصہ اُن سیاسی لیڈروں پر آ رہا تھا جو پولیس کو جلّادوں اور درندوں کی سطح پر لے آئے تھے۔ یہ غصہ قہر بن گیا۔ میں نے اندھا ہو کر پوری قوت سے ایک ٹھڈ مارا جو میں نے اپنے خیالوں کی زہریلی تلخی میں کسی اور کو مارا تھا لیکن ٹھڈ عبدالجلیل کے پیٹ میں پڑا۔ اُس کے منہ سے خون کے چند قطرے گرے۔ وہ لڑھک گیا اور مر گیا....

"اور اس کے ساتھ ہی وہ رجب علی مر گیا جو ڈی۔ ایس۔ پی تھا اور وہ رجب علی جاگ اُٹھا جو آپ کے آگے اقبالِ جرم کر رہا ہے۔ اُس رات کا ماخون میں ڈوبا ہُوا میرے گھر آ گیا۔ رات آدھی گزر گئی تھی لیکن میں جاگ رہا تھا۔ میرے کمرے میں اپنے والد صاحب کی بہت بڑی تصویر لگی ہوئی ہے۔ اس تصویر سے مجھے ڈر آ رہا تھا لیکن میں اس سے نظریں ہٹا بھی نہیں سکتا تھا۔ والد صاحب مجھے قہر کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

تصویر کا چہرہ عبدالجلیل کا چہرہ بن جاتا تھا اور مجھے کمرے میں اندھے چمگادڑ کی طرح بھٹکتی ہوئی آواز سنائی دیتی تھی ــــ 'میرا ایمان سلامت ہے۔ آخری سانس تک سلامت رہے گا' ــــ میں یہی آوازیں سُنتا اور تڑپتا رہا۔ میں ایمان، حق اور صداقت کا قاتل تھا....

"اس کیفیت میں مجھے باہر اونچی اونچی باتیں سنائی دیں۔ میں غصے میں باہر نکلا۔ وہاں کا ماتا نگے والا جو میری حراست سے بھاگا تھا، خون میں ڈوبا ہُوا نظر آیا۔ میں اُسے اندر لے آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ عبدالقدیر کا قاتل عبدالجلیل نہیں وہ ہے اور اُس نے دونوں لڑکیوں کے قتل کا اقبال کیا۔ اس نے کہا ــــ 'اپنے مُلک کو بچاؤ ملک صاحب! اگر آپ میں اتنی ہمت نہیں تو مُلک کو بچانے والوں کو گرفتار نہ کرتے پھرو۔ یہ عہدے دنیا میں رہ جائیں گے ملک صاحب' ــــ پھر وہ مر گیا۔ صبح اخبار آئے تو خبر پڑھ کر میرا رہا سہا دم بھی نکل گیا۔ خبر میں مجھے ہیرو بنایا گیا تھا۔ ایس۔ پی نے مجھے کہا کہ تمہیں انعام دلاؤں گا۔ میں اُسے کچھ نہ کہہ سکا۔ میرا دم گھُٹ رہا تھا۔"

✪

انسان اپنے اوپر ہزار خول چڑھاتے، پردے پر پردہ ڈالتا جاتے لیکن وہ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور جس کا خمیر نیکی اور خیر سے اٹھایا ہے وہ کبھی نہ کبھی خول توڑ کے سامنے آ جاتا ہے۔ اسے آہنی پردوں میں بھی قید نہیں کیا جا سکتا۔ وہ وقت کڑی آزمائش کا ہوتا ہے جب انسان کے سینے میں مقیّد اشرف المخلوقات آزاد ہونے کی جدّوجہد کرتا ہے۔ بڑی بھیانک کشمکش ہوتی ہے جس سے بعض انسان گھبرا جاتے ہیں۔ یہ وقت بڑا ہی مقدّس ہوتا ہے۔ اس کیفیّت میں انسان اپنے آپ کو اجنبی لگنے لگتا ہے۔

ملک رجب علی اُن انسانوں میں سے تھا جنہیں حالات کا ایک جھٹکا یا کوئی صدمہ پلک جھپکتے سیاہ سے سفید کر دیتا ہے۔ وہ بے بس ہو جاتے ہیں۔ اُن کے اندر شر کی جو قوتیں پیدا ہو چکی ہوتی ہیں وہ اچانک ختم ہو جاتی ہیں۔ خیر کی قوتیں ابھرنے لگتی ہیں اور شر اور خیر کے درمیان کا فاصلہ خلا بن جاتا ہے۔ انسان دیوانگی اور فرزانگی کے درمیان معلّق ہو جاتا ہے۔

ملک رجب علی کے عظیم باپ کی جو عظمت تھی اور انسان اور پاکستان کی جس محبت کو مرحوم باپ نے ایمان کہا تھا، وہ عظمت اور وہ ایمان ملک رجب علی کے خون میں رواں دواں تھا۔ وہ خون سیلاب بن کے آ گیا اور ڈی۔ ایس۔ پی کو اپنے ساتھ بہا لے گیا تھا۔ وہ بہت ہی کمزور اور بے حال ہو گیا تھا۔

"چونکہ مجھے اس خُونی ڈرامے کا ہیرو بنا دیا گیا تھا اس لیے اس کے اگلے منظر کی ہدایت کاری بھی مجھے سونپ دی گئی" ــــ ملک رجب علی کہہ رہا تھا ــــ "مجھے کہا گیا کہ مزید گرفتاریاں کروں۔ اسمبلیوں کے دو ممبر، مہر اللہ بخش اور چوہدری اکرم، ہوم سیکرٹری اور وزیر داخلہ اس ڈرامے کے روحِ رواں ہیں۔ ان کا خفیہ رابطہ ہندوستانی سفارت خانے (ہائی کمشن) کے ساتھ ہے۔ انہوں نے ایک فہرست تیار کر کے مجھے دی ہے جس میں اپوزیشن پارٹیوں کے کچھ لوگ شامل ہیں۔ برسرِ اقتدار پارٹی اس واقعہ کو اپنے مخالفین کو گرفتار کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ دوسری طرف ہمیں مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ اپوزیشن کی سیاسی پارٹیاں اس واقعہ کی اخباری خبر کو سارے ملک میں مظاہرے، جلسوں اور جلوسوں کے لیے استعمال کرنے کی تیاریاں کر رہی ہیں....

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اپوزیشن لیڈر کاسے کی بیوی اور عبدالجلیل کی بیوی سے تحریری بیان لے چکے ہیں۔ انہیں اصل واقعہ کا اور اس کے پس منظر کا کچھ علم نہیں لیکن انہوں نے کوئی اور ہی کہانی گھڑلی ہے۔ اب

کچھ دن سڑکوں پر مظاہرے ہوں گے۔ اسمبلیوں میں جھڑپیں ہوں گی۔ گرفتاریاں ہوں گی۔ اخباروں میں بیان بازی ہوگی اور اس طرح قوم کی آنکھوں میں دونوں طرف سے دھول جھونکی جائے گی۔ حکومت کی طرف سے بھی اپوزیشن کے لیڈروں کی طرف سے بھی۔"

"اور اس سے ہمارا دشمن فائدہ اٹھائے گا"۔۔۔ اشفاق احمد نے کہا۔

"دشمن فائدہ اٹھا رہا ہے"۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔۔۔ "ہمارے لوگوں کو تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ جب کوئی جلوس نکلتا ہے تو ہمارے دشمن کے آدمی اس میں شامل ہو کر توڑ پھوڑ کرتے اور جلوس اور پولیس کو ٹکرا دیتے ہیں۔"

"آپ فہرست کی بات کر رہے تھے"۔۔۔ اشفاق احمد نے کہا۔

"اس فہرست میں ارشد کا نام بھی ہے"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "لیکن میں کسی ایک کو بھی گرفتار نہیں کروں گا۔ ہم جنہیں جانتا ہوں ان کے متعلق رپورٹ لکھوں گا کہ ان کا اس واقعہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں گناہ کا کفّارہ اسی طرح ادا کر سکتا ہوں۔"

"پھر آپ باقی تمام سروس ڈی۔ایس۔پی ہی رہیں گے"۔۔۔ اشفاق احمد نے کہا۔

"میں شاید استعفیٰ دے دوں گا"۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔۔۔ "لیکن چوہدری اشفاق! یہ میرا معاملہ ہے ..... ارشد بھائی! اگر عبدالجلیل کی تحریک کا کوئی وجود ہے تو اس سے لاتعلّق ہو جاؤ۔"

"لیکن ملک صاحب!"۔۔۔ ارشد نے کہا۔۔۔ "میں پاکستان سے تو لاتعلق نہیں ہو سکتا۔"

"ہم میں سے کوئی بھی پاکستان سے لاتعلّق نہیں ہو سکتا"۔۔۔ رجب علی نے کہا اور اُس نے وہی باتیں شروع کر دیں جو اس کا باپ اُسے کہہ چکا تھا۔

"پاکستان شہیدوں کی سرزمین ہے ارشد!"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "یہاں جو حکمران من مانی کرے گا وہ ذلیل و خوار ہو کر تخت سے گرے گا۔ اپنے جذبے کو زندہ رکھو۔ جھوٹ کو آخر شکست ہوگی۔"

ملک رجب علی جانے کے لیے اُٹھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"چوہدری اشفاق!"۔۔۔ اُس نے ارشد کے باپ سے کہا۔۔۔ "میں جب امرتسر میں اے۔ایس۔آئی ہُوا کرتا تھا تو آپ نے دو موقعوں پر میری مدد کی اور مجھے مصیبت سے نکالا تھا۔ اب مجھے پھر آپ کی مدد کی ضرورت ہے..... کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں نے یہاں آکر کیا باتیں کی تھیں۔ ارشد کی رپورٹ صاف ہوگی۔ شاید کوئی آدمی آپ سے کسی طرح یعنی گپ شپ کے انداز سے یا سرکاری طور پر پوچھے کہ میں یہاں آیا تھا یا نہیں۔ کہنا کہ میں نے اس کوٹھی میں چھاپہ مارا تھا اور کوٹھی کے تمام کمروں، ٹرنکوں اور الماریوں میں سے ہر ایک چیز نکال کر دیکھی تھی۔"

ڈی۔ایس۔پی رجب علی کوٹھی سے نکلا اور رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

✪

اس کے بعد پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں جلسوں اور جلوسوں نے رونق پیدا کر دی۔ اپوزیشن کے اخباروں نے کاسے تانگے والے اور عبدالجلیل کی بیویوں کی تصویریں اور بیان چھاپے اور ایسی اشتعال انگیز کہانیاں شائع کیں جن کا اصل واقعہ کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ لوگوں کو خوب بھڑکایا گیا۔ پولیس نے جلوسوں پر لاٹھی چارج کئے اور ہر شہر سے سینکڑوں آدمیوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ٹھونس دیا۔

تین چار دنوں بعد کاسے اور عبدالجلیل کی بیویوں کے بیان برسرِ اقتدار پارٹی کے اخباروں میں شائع ہُوئے جن میں دونوں عورتوں نے اپنے پہلے بیانوں کی نہ صرف تردید کی بلکہ کہا کہ ان کے ناموں سے جو بیان منسوب کئے گئے ہیں وہ اخباروں نے خود ہی گھڑ لیے تھے۔۔۔ حکمران پارٹی کا ان دونوں عورتوں کو دیا ہُوا پندرہ پندرہ ہزار روپیہ اور جان سے مار دینے کی دھمکیاں کام کر گئی تھیں۔ عبدالجلیل خان کی بیوی سے کہا گیا تھا کہ اُس نے پندرہ ہزار روپے کے عوض حکومت کے لکھے ہُوئے بیان پر دستخط نہ کئے تو اس کے بیٹے کو اغوا کر لیا جائے گا۔ یہ عورت ہتھیار ڈالنے والی نہیں تھی لیکن مامتا نے اسے بے بس کر دیا۔

اور پھر تین ہی مہینوں بعد عبدالجلیل اور کاسے کا قتل برسوں پرانی بات ہوگئی۔ حکمران اور مخالف سیاسی لیڈروں نے نئی باتیں پیدا کر لی تھیں۔ ڈی۔ایس۔پی رجب علی کے استعفے کی خبر کسی بھی اخبار میں شائع نہ ہُوئی۔

اس واقعہ کے چار ماہ بعد لاہور سے ارشد کی بارات راولپنڈی جا رہی تھی۔ بارات کو راولپنڈی نجمہ کے گھر اترنا تھا۔ طاہرہ کو وہیں دلہن بنایا گیا تھا۔ ارشد کی بارات کے ساتھ اس کا باپ، بڑا بھائی، نوکر نور دین اور ارشد کی ماں تھی۔ طے یہی ہُوا تھا کہ شادی نہایت خاموشی سے ہوگی۔

طاہرہ کو نجمہ کے گھر نجمہ نے اور اس کی ساتھی استانیوں نے دلہن بنایا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں اس نے پہلی شبِ عروسی گزاری تھی۔ نجمہ اور استانیاں ہنس رہی تھیں، گا بھی رہی تھیں اور طاہرہ سے چھیڑ چھاڑ بھی کر رہی تھیں مگر طاہرہ گم سُم بیٹھی تھی۔ وہ مسکراتی تھی تو اس کی مسکراہٹ بھی گم سم سی لگتی تھی۔۔۔ اسے نعیم یاد آگیا تھا اور اپنے پہلے سہاگ کی موت بھی یاد آگئی تھی۔

"طاہرہ!"۔۔۔ نجمہ نے اس کے کان میں کہا۔۔۔ "میں جانتی ہوں تم کہاں کھو گئی ہو۔ نکل آؤ ماضی کے کھنڈروں سے۔ تمہارا ارشد آ رہا ہے..... تمہارا ارشد..... تمہاری وہ محبت آ رہی ہے جو تم نے عفت پر قربان کر دی تھی۔"

طاہرہ نے نجمہ کی طرف دیکھا اور اب اُس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ آئی وہ گم سم مسکراہٹ نہیں تھی۔

"تم قاتل ہو رجب علی!"

"تم نے اُسے قتل کیا ہے۔"

"ترقی کی خاطر۔"

"اُوپر والوں کی خوشنودی کی خاطر۔"

"وہ کوئی پہنچ والا تھا۔"

"تمہاری کہاں تک پہنچ ہے رجب علی؟"

"اُس کے ہاتھ میں کوئی خدائی طاقت تھی۔"

"عبدالجلیل.... عبدالجلیل خان.... ریٹائرڈ انسپکٹر عبدالجلیل خان۔"

"یہ نام.... یہ شخص.... ایک آسیب جو ساری عمر تمہارے دل پر، تمہارے دماغ پر، تمہاری سوچوں اور تمہارے اعصاب پر چھایا رہے گا۔"

"عبدالجلیل خان مرا نہیں کرتے.... تم مر گئے ہو رجب علی!.... ڈی۔ ایس۔ پی مر گیا ہے۔ تانگے والے کا مرکر بھی زندہ رہا کرتے ہیں۔ تم زندہ رہ کر مرے ہوئے ہو۔"

"اُس کے ہاتھ میں خدائی طاقت تھی۔"

"تمہارے ہاتھ میں کون سی طاقت ہے؟.... کون سی طاقت تھی تمہارے ہاتھ میں؟.... کیا رہ گیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟"

"کس کی خاطر تم نے ترقی پر ایمان قربان کر دیا ہے؟.... تمہاری بیوی مر گئی ہے۔ تمہارا کوئی بچہ بھی زندہ نہیں رہا۔"

آوازیں ــــ کڑوی، تیکھی، زہریلی آوازیں ــــ ملک رجب علی کے شب و روز اب انہی آوازوں میں گزر رہے تھے۔ یہ آوازیں چمگادڑوں کی طرح اُس کے سر پر اور اُس کے اردگرد سرسراتی پھڑپھڑاتی اور دیواروں سے ٹکراتی رہتی تھیں۔ کبھی یہ آوازیں اس طرح اُس کی اپنی ذات سے اٹھتی تھیں جیسے چمگادڑوں سے بھرے ہوتے غار میں پتھر مار دیا ہو۔

رجب علی کے ضمیر کے غار میں عبدالجلیل خان کے قتل کا پتھر ایسا پڑا کہ آوازوں کے چمگادڑوں نے اُس پر یلغار کر دی۔ اُس نے ان آوازوں کا مقابلہ نہ کیا۔ ان کے خلاف لڑنے کا کوئی جواز نہ ڈھونڈا۔ اُس نے ان کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور پہلا کام یہ کیا کہ استعفیٰ دے دیا۔ وہ اب ڈی۔ ایس۔ پی نہیں تھا اور وہ بھول جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کبھی ڈی۔ ایس۔ پی ہوا کرتا تھا۔

وہ لمحے مقدّس ہوتے ہیں جب انسان اپنے ضمیر کی آوازوں پر کان دھرتا ہے، یا وہ لمحے مقدّس ہوتے ہیں جب انسان اپنے گناہوں کی گٹھڑی کھول کر اپنے آگے رکھتا اور تسلیم کرتا ہے کہ یہ گناہ میرے ہیں۔ عظمت اپنے ضمیر کی آوازیں سننے اور اپنے گناہوں کو تسلیم کرنے میں ہے مگر یہ عظمت وہ پھول ہے جو کانٹوں میں چھپا ہوتا ہے۔ ہر کانٹے کی چبھن زہرناک اور درد سے بھرپور ہوتی ہے۔ عظمت کا یہ پھول اُسی نے حاصل کیا جس نے کانٹوں کو اپنا خون دیا اور ان کے زہر کو اپنے آپ میں جذب کر لیا۔

ملک رجب علی اس مقام پر پہنچ گیا تھا۔ اُس کی روح میں اتنے کانٹے اُتر گئے تھے کہ روح لہولہان ہو گئی تھی لیکن اُس نے راہِ فرار نہ ڈھونڈی۔ اس اذیّت کو وہ یوں قبول کر چکا تھا جیسے کوئی رہزن خود ہی قاضی کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ہاتھ آگے کر کے کہے کہ یہ ہاتھ کاٹ دو، یہ رہزن کے ہاتھ ہیں۔

✪

"ڈاکٹر صاحب! میں سو نہیں سکتا"ــــ ملک رجب علی نے اپنے فیملی ڈاکٹر سے کہا ــــ "میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے دیکھیں۔ جسم میں جان نہیں رہی۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین کی عمر ستر برس سے تجاوز کر گئی تھی۔ وہ تین پُشتوں سے رجب علی کے خاندان کا ڈاکٹر چلا آرہا تھا۔ رجب علی کے باپ ملک اللہ یار خان کا گہرا دوست تھا۔ رجب علی کی عمر پینتیس سال تھی۔ وہ تو جیسے ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں میں پیدا ہُوا تھا۔ آٹھ ساڑھے آٹھ سال پہلے رجب علی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے خاندان اکٹھے مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

"رجب علی!"ــــ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اُس سے کہا ــــ "دوسری شادی کر لو۔ فوراً کر لو۔ تم ابھی جوان ہو۔ تمہارے لیے تنہائی اچھی نہیں۔ تمہارا ایک بھی بچّہ ہوتا تو تم اس حال کو نہ پہنچتے۔ تم مجھے اپنی آنکھوں کے صرف حلقے دکھا رہے ہو۔ میں تمہیں سر سے پاؤں تک دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔ تم تندرست نہیں ہو رجب بیٹا!"

"میں شادی نہیں کروں گا ڈاکٹر صاحب!"ــــ رجب علی نے ایسی آواز میں کہا جو دُکھ اور کرب سے بوجھل تھی۔ یہ کراہتی ہوئی آواز تھی ــــ "میں اب کسی ساتھی کو خوش نہیں رکھ سکوں گا۔"

"ایک تو تم تنہا رہ گئے"ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ "اور ایک غلطی تم نے خُود کی۔ سروس سے استعفےٰ دے دیا۔ فراغت اچھے بھلے آدمی کو مریض بنا دیتی ہے.... نیند نہ آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ پیٹ ٹھیک ہے تمہارا؟.... میں بلڈ پریشر چیک کر لیتا ہوں....؛"

"سب کچھ ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب!"ــــ ملک رجب علی نے کہا ــــ "میرے جسم کی بات نہ کریں۔ میں اپنے جسم سے دستبردار ہو گیا ہوں تین مہینے جو گزرے ہیں وہ جیسے جہنم میں گزار دیئے ہیں۔"

"کیسے جہنم میں؟"ــــ ڈاکٹر ذاکر حسین نے مشفق باپ کی طرح پیار سے سے انداز سے جھنجھلا کر کہا۔ ــــ "معلوم ہوتا ہے اپنے والد صاحب اور اپنی بیوی کے مرنے کے بعد تم نے اپنا دماغ خاصا خراب کر لیا ہے۔ اُدھر تمہارا ایک کارنامہ اخباروں میں شائع ہُوا اِدھر تم نے استعفیٰ دے دیا۔ میں اس خبر کے انتظار میں تھا کہ تم ایس۔ پی ہو گئے ہو۔ مجھے وہ خبر پڑھ کر بہت خوشی ہُوئی تھی کہ تم نے بڑے خطرناک مجرموں کو...."

"ڈاکٹر صاحب!"ــــ ملک رجب علی نے ڈاکٹر کی بات یوں کاٹ دی جیسے ڈاکٹر اُسے گالیاں دے رہا ہو۔ اُس نے اکتاتے ہُوئے لہجے میں کہا ــــ "جو خبر پڑھ کر آپ کو خوشی ہُوئی تھی وہ میرے لیے موت کا پروانہ تھا۔ میری نیند، میرا سکون اور میری صحت یہی خبر اُڑا لے گئی ہے جسے آپ میرا کارنامہ کہتے ہیں.... ڈاکٹر صاحب! مجھے کوئی دوائی نہیں چاہیئے۔ میں آپ سے نیند اور ذہنی سکون کی گولیاں لینے نہیں آیا۔ مجھے جذباتی سہارے کی ضرورت ہے۔"

اُس نے ڈاکٹر کے ساتھ وہی باتیں کیں جو اُس نے تین مہینے پہلے "آشا بھون" میں اشفاق احمد اور اُس کے بیٹے ارشد کے ساتھ کی تھیں۔ اُس نے انہی جذبات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین یہ روئیداد جو رجب علی کا اقبالِ جرم تھا یوں گم سم ہو کے سن رہا تھا جیسے بُت بن گیا ہو، یا جیسے ایسی حیران کُن اور اتنی سنسنی خیز کہانی اُس نے اتنی لمبی عمر میں پہلی بار سُنی ہو۔

"میں قاتل ہوں"ــــ ملک رجب علی نے کہا ــــ "میں نے اپنے ضمیر کی نجات کے لیے ایک تو یہ کام کیا ہے کہ مجھے جن لوگوں کی گرفتاری کا حکم ملا تھا، ان میں سے میں نے کئی ایک کے متعلّق بالکل صاف رپورٹ دی اور باقی جو تھے انہیں میں نے گرفتار نہیں کیا۔ اس کی بجائے میں نے استعفےٰ دے دیا ہے۔ مجھ پر کوئی یہ الزام عائد نہیں کر سکتا کہ میں نے مجرموں کو گرفتار کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس فہرست میں کوئی ایک بھی

مُجرم نہیں تھا۔ عبدالجلیل خان نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ کامے نے ملک کے تین دشمنوں کو قتل کیا تھا حکمران پارٹی اس واقعہ کو ایک ڈرامہ بنا کر اپنے مخالفین کو گرفتار کرنا چاہتی تھی جو اُس کے لیے زیادہ خطرناک تھے۔"

"لیکن مخالف پارٹیاں زیادہ ہوشیار نکلیں" — ڈاکٹر نے کہا — "اُنہوں نے اسی واقعہ کو اپنی ضرورت کا رنگ دے کر خوب ہنگامے اور مظاہرے کرائے تھے۔"

"لوگوں کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اصل واقعہ کیا ہے" — ملک رجب علی نے کہا — "حقیقت کا کسی کو بھی علم نہیں۔"

"اور نہ ہوگا" — ڈاکٹر نے کہا — "اس ملک میں اب اقتدار کی ہی سیاست چلے گی۔ یہاں ایک سیاسی ٹولہ بن چکا ہے۔ پاکستان اب اسی ٹولے کے درمیان گیند کی طرح اُچھلتا اور اُڑتا رہے گا۔ رجب علی! تم جانتے ہو نا، اِن لیڈروں کو جن کے ہاتھوں میں پاکستان آ گیا ہے انہیں پاکستان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ پاکستان میں اگر کوئی دل کی گہرائیوں سے دلچسپی لے رہا ہے تو وہ ہندوستان ہے۔ تم پولیس میں رہے ہو رجب علی! تمہارا مشاہدہ کیا ہے؟"

"سچ پوچھتے ہیں آپ؟" — رجب علی نے کہا — "میرا مشاہدہ یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں نے آپس کی معرکہ آرائی چھوڑ کر مشرقی پاکستان کی طرف توجہ نہ دی تو ہم ملک کا وہ حصّہ گنوا بیٹھیں گے۔ وہاں ہندوؤں کا اثر زیادہ ہے۔ میں پچھلے سال مشرقی پاکستان گیا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے ہمیں شکی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ ہندو مشرقی پاکستان کی سیاست اور کلچر میں اُتر گیا ہے اور وہ دو قومی نظریے کو توڑ پھوڑ رہا ہے۔"

"یہ تو سیاست کی باتیں ہیں رجب علی!" — ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا — "تم اپنی صحت کے متعلق شکایت لے کر آتے تھے۔ مجھے تمہاری اس رائے سے اتفاق ہے کہ تمہیں نیند اور ذہنی سکون کی گولیوں کی یا کسی اور دوائی کی ضرورت نہیں۔ تم گناہوں کا کفّارہ ادا کرنے کی بات کر رہے تھے۔ یہ تم ہی سوچ سکتے ہو کہ اس کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ تم استعفےٰ دے کر مطمئن نہیں ہوئے۔ تم نے ان لوگوں کو گرفتار نہیں کیا جن کی تمہیں فہرست دی گئی تھی۔ اس سے بھی تمہاری روح کو سکون نہیں ملا.... تمہیں سکون مل جائے گا۔ خُدا کو یاد کیا کرو اور اُسی سے گناہوں کی بخشش مانگتے رہو۔ خُدا نے تمہیں بڑی جائیداد اور زمین دی ہے تمہیں تو نوکری کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس جائیداد اور دولت پر سانپ بن کر نہ بیٹھ جانا۔ حقدار غریبوں اور ناداروں کی مدد کرو۔ کسی کے کام آؤ۔"

"میں اپنی ساری جائیداد دے دوں گا" — رجب علی نے کہا — "اس کے عوض کوئی مجھے روحانی سکون دے دے۔ مجھے سکون کی نیند واپس لا دے۔"

"میں تمہیں ذہنی سکون کے لیے گولیاں لکھ کے دے سکتا ہوں لیکن نہیں لکھوں گا" — ڈاکٹر نے کہا — "تم ایک دوراہے پر کھڑے ہو۔ ایک راستہ عارضی اور مصنوعی سکون کا ہے اور دوسرا روحانی سکون کا۔ میں گولیوں کی صورت میں تمہیں عارضی سہارا نہیں دوں گا، ورنہ تم گولیوں کے عادی ہو جاؤ گے نشئی ہو جاؤ گے پھر تم شراب بھی پینے لگو گے۔ آج تم اس لیے شادی نہیں کرنا چاہتے کہ تم اپنی رفیقہ کو مسرّتیں نہیں دے سکو گے۔ تم اپنے آپ کو دکھی سمجھتے ہو۔ ایک بار تم نشے کے عادی ہو گئے تو تم اس لیے شادی نہیں کرنا چاہو گے کہ تمہارے تعلّقات کئی عورتوں کے ساتھ ہوں گے۔ تمہاری کوٹھی میں بازاری عورتیں رونق پیدا کیا کریں گی.... رجب علی! میں تمہیں ہوش میں رکھنا چاہتا ہوں۔ ہوش میں رہ کر یہ اذیّت جھیلو۔ حقیقت کو ہوش و حواس میں دیکھو۔ اپنے گناہوں کا سامنا آنکھیں کھول کر کرو.... میں وعظ نہیں سنا رہا رجب علی! میں تمہیں علمِ نفسیات کا اصول سمجھا رہا ہُوں۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہارا ضمیر بول اٹھا ہے۔ تمہاری سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ تم نے اپنے ضمیر کی آواز سن لی ہے۔"

"کیا وہ لوگ اچھے نہیں رہتے جو اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیتے ہیں؟"

"تم اُسی مقام پر کھڑے ہو جہاں لوگ اپنے ضمیر کو جھٹلا کر فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں" — ڈاکٹر نے کہا — "وہ شراب، افیم، جنسی لذّت اور تصوّر پرستی میں جا پناہ لیتے اور اسے اپنی جنّت سمجھتے ہیں مگر وہ ایک نہ ایک روز پکڑے جاتے ہیں۔ وہ پھر بھاگتے ہیں اور یوں ان کی زندگی مفرور مجرم کی طرح گزر جاتی ہے....

"دوسرا راستہ عظمت، درویشی اور ذہنی سکون کی طرف جاتا ہے۔ یہ راستہ دشوار اور پُرخار ہے لیکن اس منزل تک جہاں تم پہنچنا چاہتے ہو، یہی راستہ جاتا ہے۔ اس ذہنی اذیّت سے نہ گھبراؤ جس نے تمہاری نیند اُڑا دی ہے۔ اس آگ سے نکل کر تم کُندن بنو گے۔ انسانوں سے اور اپنے وطن سے محبّت کرو۔ اپنی ذات کو الگ رکھ دو۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین بولتا جا رہا تھا اور اُس کا ایک ایک لفظ رجب علی کی روح میں اُترتا جا رہا تھا۔ وہ جب وہاں سے اُٹھا تو وہ کچھ سکون محسوس کر رہا تھا۔

✪

وہ اپنی کوٹھی کی طرف پیدل چل پڑا۔ اُس کے قریب سے لوگ گزرتے جا رہے تھے۔ کوئی اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اُسے کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ اُس کی پہچان ختم ہو چکی تھی۔ اس کا اُسے ذرا سا بھی افسوس نہیں تھا۔ وہ کسی کے متعلق تو سوچ ہی نہیں رہا تھا۔ اُسے جیسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اُس کے قریب سے کاریں، بسیں اور تانگے گزر رہے ہیں۔ اُس کے گرد ابھی تک ڈاکٹر ذاکر حسین کی باتیں گونج رہی تھیں۔

سامنے سے ایک آدمی فٹ پاتھ پر چلا آ رہا تھا۔ اُس کا کاروبار ایسا تھا کہ پولیس کے ساتھ اُس کا واسطہ اکثر پڑتا تھا۔ اسی سلسلے میں اُس نے ملک رجب علی کے ساتھ دوستانہ گانٹھ رکھا تھا۔ اُسے تحفے بھی پیش کیا کرتا رہتا تھا۔ آٹھویں دسویں روز رجب علی کی کوٹھی میں جاتا اور خوشامد کے نت نئے کرتب دکھاتا تھا۔ وہ سامنے آیا تو رجب علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور اس کے قدم سُست ہو گئے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ آدمی رُکے گا۔ اس سے جُھک کر پھر بغلگیر ہو کر ملے گا اور اپنی کوٹھی کی طرف گھسیٹے گا۔ رجب علی اُس کے گھر جانے کے مُوڈ میں نہیں تھا۔ اُس نے فوراً ایک بہانہ تراش لیا۔

وہ آدمی اور قریب آیا تو رجب علی اور زیادہ آہستہ ہو گیا اور اس کا دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے اٹھنے لگا۔ وہ آدمی پہلے ہی دو قدم ایک طرف ہو گیا تھا۔ اُس نے رفتار اور تیز کر لی اور رجب علی کے قریب سے گزرتے رسمی انداز سے بولا — "خیریت ہے ملک صاحب؟" — اور وہ یوں بے رُخی سے آگے نکل گیا جیسے رجب علی کو اتنا ہی جانتا ہو کہ کسی ہوٹل میں یا کسی سینما ہال میں یا کبھی ریل گاڑی کے ڈبے میں مُلاقات ہُوئی تھی۔

رجب علی کے قدم جو اس شخص کو دیکھ کر رُکنے لگے تھے وہ رُکتے ہی گئے جیسے وہ تھک کر چُور ہو چکا ہو

وہ شخص جو اس کے پاؤں میں بیٹھا رہتا تھا، اس کے قریب سے اکڑ کر گذر گیا تھا۔ رجب علی نے اپنے دل میں درد سا محسوس کیا لیکن اُسے ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ یاد آ گئے — "ہوش میں رہ کر یہ اذیّت جھیلو۔ حقیقت کو ہوش و حواس میں دیکھو۔ اپنے گناہوں کا سامنا آنکھیں کھول کر کرو۔"

رجب علی کے دل میں درد کا جو احساس اٹھا تھا وہ دل میں ہی کہیں غائب ہو گیا۔ اُس کے قدموں میں کوشش کے بغیر تیزی آ گئی۔ اُس نے ایسی بات نہ سوچی کہ — تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے رہتا ہے۔ "یہ شخص جو میرے پاس سے گزر گیا ہے میرے گناہوں کی چلتی پھرتی یادگار ہے" — رجب علی کو خیال آنے لگے — "اچھا ہُوا جو رُکا نہیں، گزر گیا ہے۔ رکتا تو محض رسمی باتیں کرتا۔ اس کے دل میں میری ذرا سی بھی محبت نہیں، اور میرے دل میں اس کی کوئی محبت نہیں تھی۔ یہ مجھے تحفے دیتا اور اپنا کام کراتا تھا اور اس کے تحفے مجھے اچھے لگتے تھے۔ اب یہ اُس کے قدموں میں تحفے پیش کرتا ہو گا جو میری جگہ لگا ہو گا .... یہی ہے زندگی .... زندگی یہی ہے۔ محبّت وہی زندہ رہتی ہے جو دلوں سے اُبھرے اور روحوں میں اُترے .... اس شخص کا میں مشکور ہوں کہ اس نے مجھے احساس دلا دیا ہے کہ میں انہی لوگوں میں سے ہوں جو فٹ پاتھوں پر پیدل چلے جا رہے ہیں اور ایک دوسرے کو پہچاننے کی انہیں مہلت، فرصت بلکہ ضرورت ہی نہیں۔"

✪

وہ انہی سوچوں میں کھویا ہُوا چلا جا رہا تھا اور اُس کے قدم اپنے آپ اُٹھتے جا رہے تھے۔ اُسے آواز سنائی دی — "او بھائی صاحب! آگے نہ جانا" — وہ رک گیا اور اُس نے اس طرح اِدھر اُدھر دیکھا جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ ایک کانسٹیبل اُس کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔ رجب علی سڑک پار کرنے لگا تھا۔ وہ سڑک پر رکا کھڑا تھا۔

"آپ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں" — کانسٹیبل نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیلتے ہُوئے کہا — "اپنی عزت کا خیال نہیں تو ہماری عزّت کا ہی خیال کرو۔ چلو پیچھے۔"

ملک رجب علی نے ماحول کا جائزہ لیا۔ سڑک پر کوئی ٹریفک نہیں تھی۔ ابھی ابھی ٹریفک چل رہی تھی، ابھی سڑک خالی ہو گئی۔ سڑک پر پولیس کا قبضہ تھا۔ لوگ فٹ پاتھوں پر کھڑے تھے۔ کسی کو سڑک پار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کانسٹیبل جب رجب علی کو دھکیل کر پرے ہٹا تو ایک اے۔ ایس۔ آئی دوڑا آیا۔ اُس نے رجب علی سے ہاتھ ملایا۔

"یہ بدتمیز آپ کو جانتا نہیں تھا" — اے۔ ایس۔ آئی نے رجب علی سے معذرت کے لہجے میں کہا — "آپ تو جانتے ہیں کہ یہ حرام خور جب گزرتے ہیں تو پولیس کی ڈیوٹی کیا ہوتی ہے۔"

"کون گزر رہا ہے؟"

"گورنر" — اے۔ ایس۔ آئی نے نفرت سے کہا — "آپ جانتے ہیں وہ جا کہاں رہا ہے؟ .... پانی کی ایک ٹینکی تعمیر ہُوئی ہے۔ گورنر صاحب اس کے افتتاح کے لیے جا رہے ہیں .... جیسے ٹینکی نہیں ملک کا سب سے بڑا ڈیم تعمیر ہُوا ہو .... آئیے، آپ کو سڑک پار کرا دوں۔ اس کے آنے کا کوئی پتہ نہیں۔"

"میں اب ڈی۔ ایس۔ پی نہیں اصغر!" — ملک رجب علی نے کہا — "میں اب عوام میں سے ہوں۔ تم اپنی ڈیوٹی پوری کرو۔"

اصغر کو ملک رجب علی کے اثر و رسوخ سے پولیس میں اے۔ ایس۔ آئی لیا گیا تھا۔ وہ اس کا احسان مند

تھا۔ وہ کچھ دیر رجب علی کو دیکھتا رہا اور رجب علی اُسے دیکھ کر مُسکراتا رہا۔ دونوں کو ایک دِل نما ہُوٹر نے جیسے بیدار کر دیا ہو۔ اے۔ ایس۔ آئی ملک رجب علی سے ہاتھ مِلا کر اور یہ کہہ کر چلا گیا — "عالم پناہ کی سواری آ رہی ہے۔"

رجب علی وہیں کھڑا رہا۔ آگے آگے پولیس کی جیپ تھی۔ پیچھے پولیس کی کار تھی اور اس کے پیچھے اُس وقت کے جدید ماڈل کی کار تھی جس کے آگے پاکستان کا جھنڈا تھا۔ کار کے دروازوں کے شیشے چڑھے ہوتے تھے۔ ملک رجب علی کو گورنر نظر آ رہا تھا۔ وہ دائیں بائیں لوگوں کو دیکھتا ہاتھ ہلا رہا تھا اور لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے — "یہ کوئی وزیر ہے؟" — ملک رجب علی کے قریب کھڑے ایک آدمی نے کہا — "انگریز اپنا ایک لاٹ صاحب پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔"

گورنر بند کار میں ہاتھ ہلاتا جا رہا تھا مگر اُسے رک کر دیکھنے والوں میں سے کسی کا بھی ہاتھ نہیں ہل رہا تھا۔ بہت سے لوگ تو اُسے دیکھنے کے لیے رُکے بھی نہیں تھے۔ رجب علی اس شخص کو جانتا تھا۔ بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اتنی قریب سے جانتا تھا جیسے بیوی اپنے خاوند کو اور خاوند اپنی بیوی کو پہچانتا ہے۔ وہ حکمران پارٹی کا آدمی تھا۔ ملک رجب علی اُن تین جوان اور بڑی ہی خوبصورت عورتوں کو بھی جانتا تھا جو گورنر ہاؤس میں ہوتیں تو سوسائٹی کی معزّز خواتین سمجھی جاتیں اور گورنر ہاؤس سے باہر انہیں صرف پولیس اور کسٹم والے جانتے پہچانتے تھے۔ یہ عورتیں اُس کلاس کی تھیں جو کہا کرتی ہیں — "میں کسی کی بیٹی نہیں۔"

رجب علی کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ شخص جو گورنر ہے اور پاکستان کا پرچم لہراتا گزر گیا ہے شراب کون سی پیتا ہے اور جب گورنر نہیں تھا تو کون سی شراب پیا کرتا تھا اور جب گورنر نہیں رہے گا تو اتنی اعلیٰ شراب کہاں سے پیئے گا۔

رجب علی کو یہ بھی معلوم تھا کہ مملکتِ خداداد پاکستان کا یہ گورنر پانی کی ایک ٹینکی کا افتتاح کرے گا تو اس کی تقریر کے الفاظ کیا ہوں گے — "اس ٹینکی کی تعمیر سے پاکستان ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے۔ موجُودہ حکومت نے عہد کر رکھا ہے کہ پاکستان کو پانی کے معاملے میں خود کفیل کر دیا جائے گا۔ ایک کمیٹی نامزد کی جا رہی ہے جو یہ جائزہ لے گی کہ مزید ٹینکیوں کے لیے کون سے ملک کے ٹیوب ویل درآمد کیے جائیں۔ صدرِ پاکستان اور وزیرِ اعظم امریکہ سے امداد کے طور پر ٹیوب ویل حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

سابق ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی کو یہ بھی معلوم تھا کہ گورنر کی یہ تقریر وہ ٹھیکیدار توجہ اور دلچسپی سے سُنے گا جس نے تین لاکھ روپوں میں ٹینکی تعمیر کر کے دس لاکھ روپوں کا بِل وصول کیا ہو گا، اور یہ تقریر اُن بڑے صاحبوں اور اُن کے کلرک بادشاہوں کو اچھی لگے گی جنہوں نے اس ٹینکی کا ٹھیکہ دیا، بِل پاس کیا، چیک لکھا، بڑے صاحب کے دستخط کراتے اور چیک ٹھیکیدار کو دیا ہے — اور کل صبح اخباروں کے پہلے صفحوں پر یہ شہ سرخی ہو گی — "پاکستان ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے" — اور اس کے ساتھ گورنر کی دو تین تصویریں ہوں گی۔

اور اس کے بعد اخباروں میں خطوط شائع ہونے لگیں گے کہ فلاں آبادی میں ٹینکی بنے آٹھ نو مہینے گزر گئے ہیں لیکن وہاں کا ٹیوب ویل بیکار پڑا ہے کیونکہ اسے بجلی کا کنکشن نہیں دیا گیا۔ پھر لوگ اس ٹینکی کو اسی طرح دیکھا کریں گے جس طرح وہ مغلیہ دَور کے کسی بادشاہ کے مقبرے کو دیکھا کرتے ہیں — عوام پانی کی ایک بوند کو ترستے رہیں گے اور گورنر ہاؤس میں شراب کی نہریں بہتی رہیں گی۔

ملک رجب علی سب کچھ جانتا تھا جیسے دائی عورت کے پیٹ کا حال جانتی ہے۔ اس گورنر نے کتنے آدمیوں کو سیکورٹی ایکٹ کے تحت مقدمے کے بغیر جیلوں میں بند کیا، کتنے شریف لوگوں کو ہسٹری شیٹر غنڈہ قرار دیا اور کتنے مجرموں کو جیلوں سے نکلوایا تھا، ملک رجب علی کو اچھی طرح یاد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک روز یہ گورنر بھی معتلا ہُوا انسان بن جائے گا اور جب اس کی پارٹی کی حکومت نہیں رہے گی یا جب اپنی پارٹی کی حکومت میں ہی اس سے کوئی سیاسی بدپرہیزی ہو جائے گی تو یہ فٹ پاتھ پر کھڑا اپنے جانشین کو دیکھ رہا ہو گا اور اگلے روز کے اخبار پڑھ کر کہا کرے گا ـــ "بے ایمان، چور، عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔ ایک ٹینکی کی تعمیر سے پاکستان ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے۔ ابھی تک اپنے ملک میں ٹیوب ویل بھی نہیں بنا سکتے..... یہ سب اقتدار کی سیاست کی چکر بازیاں ہیں جی!"

ملک رجب علی نے اپنی سوچوں کو اقتدار کی سیاست کے گورنروں، صدروں اور وزیروں کو ذہن سے نکال دیا۔ اُسے تسکین سی محسوس ہونے لگی کہ وہ اب عوام کو دھکے دینے والوں میں سے نہیں، دھکے کھانے والے عوام میں سے ہے۔

گزرنے والا گزر گیا۔ لوگ جو عقیدت سے نہیں، تماشہ دیکھنے رک گئے تھے اور جو روک لیے گئے تھے، جو منہ میں آیا، کہتے ہوئے چل پڑے۔ پولیس کا ہر فرد جو وہاں جانے کب سے ڈیوٹی پر تھا، اُکتایا اُکتایا سا دکھائی دے رہا تھا۔ ملک رجب علی بھی چل پڑا۔ وہ لوگوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اُن کی سنتا جا رہا تھا۔ بعض پولیس کو بُرا بھلا کہتے جا رہے تھے۔

رجب علی بوڑھا نہیں تھا۔ اُس کے پاؤں میں لغزش نہیں تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی باتوں نے بہت تسکین دی تھی، اور جب اُس نے دیکھا کہ لوگ حکمرانوں اور ان کی پولیس کو بُرا بھلا کہتے جا رہے ہیں تو اسے اور زیادہ اطمینان محسوس ہُوا کہ لوگ جنہیں بُرا بھلا کہہ رہے ہیں، ان میں اب وہ شامل نہیں ـــ وہ بڑے جاندار قدموں سے چلتا گیا۔

✪

ارشد اور طاہرہ اب میاں بیوی تھے۔ شبِ عروسی دو مہینے پرانی ہو گئی تھی۔ اُس رات جو اُن کی ازدواجی زندگی کی پہلی رات تھی، اُنہوں نے بہت باتیں کی تھیں۔ رات باتوں میں بیت گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، یادوں کی روشنی میں دُور پیچھے ماضی میں چلے گئے تھے۔ وہاں سے لوٹے تو سحر ہو چکی تھی۔ گم گشتہ محبت انہیں مِل گئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی پہلی محبت تھے مگر حالات نے انہیں ایک دوسرے سے نوچ پھینکا تھا۔ ان کے خوابوں کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔

وہ سرحد پھلانگ گئے اور جلال آباد جا پہنچے تھے۔ انہوں نے ایک ایک لمحے کو یاد کیا۔ ہر اُس انسان کو یاد کیا جو تحریکِ پاکستان کے میدان میں ان کے دوش بدوش لڑا تھا۔ وہ جلال آباد سے نکلے تو یادیں جلتے مکانوں میں جلنے لگیں۔ وہاں سے جھلستی ہوئی نکلیں تو خون میں ڈوبنے لگیں۔ ان پر ہندو اور سکھ غرّانے اور جھپٹنے لگے۔ یادیں برچھیوں سے چھلنی اور کرپانوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگیں۔

انہیں وہ پاکستان یاد آیا جس میں وہ خون کے دریا پار کر کے آئے تھے ـــ ارشد چونک اُٹھا جیسے اُسے کوئی بھولی بسری بات اچانک یاد آ گئی ہو۔

"عبدالجلیل خان مارا گیا ہے" ـــ ارشد نے کہا۔

"اور کاما بھی مارا گیا ہے" ـــ طاہرہ نے کہا۔

دونوں پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ان کے چہروں پر ایک ہی جیسا تاثر آ گیا۔

"کیا یہ وہی پاکستان ہے؟" ـــ طاہرہ نے سکوت توڑا۔

"وہی ہے طاہرہ!" ـــ ارشد نے کہا ـــ "یہ وہی پاکستان ہے۔ شہیدوں کا لہو رائیگاں نہیں جاتے گا۔"

وہ اس پاکستان کی باتیں کرنے لگے جس کی عمر نو سال ہو چلی تھی۔ اُس رات یہ باتیں صرف ارشد اور طاہرہ ہی نہیں، ہر وہ پاکستانی کر رہا تھا جس نے تحریکِ آزادی میں ذرا سی بھی قربانی دی تھی۔ ارشد اور طاہرہ کی باتوں میں کوئی بات نئی نہیں تھی۔ ان کے پاس کوئی منصوبہ نہیں تھا جو پاکستان کو اقتدار پرست لیڈروں سے بچا کر اس ملک کو ہر سچے پاکستانی کے خوابوں جیسا بنا سکتا۔ ان کے پاس جذبہ اور جوش تھا۔

ایسا ہی جذبہ اور جوش ساری قوم میں تھا۔ قوم کے ہر فرد میں تھا۔ پاکستان کی خاطر جان و مال کی قربانی دینے کے لیے قوم اب بھی تیار تھی مگر اب قوم افراد میں بٹ گئی تھی ـــ سورج کی کرنیں بکھر گئی تھیں ـــ انہیں بکھیرا گیا تھا اور بکھیرا اس لیے گیا تھا کہ کرنیں جب ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہیں تو آگ لگا دیا کرتی ہیں۔ یہی کرنیں جب مرکوز ہوئی تھیں تو برّصغیر کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ پاکستان جن کے جنگل میں آ گیا تھا وہ جانتے تھے کہ یہ افراد اگر قوم بنے رہے تو مفاد پرست لیڈروں کے ٹکڑے کر دیں گے۔

ہر محبِّ وطن پاکستانی غم و غصے سے جل رہا تھا، جوش و خروش سے پھٹا جا رہا تھا مگر ہر شخص کی توانائی ضائع ہو رہی تھی۔ یہی حال ارشد اور طاہرہ کا تھا۔ ہر پاکستانی کی طرح وہ بھی سمجھتے تھے کہ پاکستان کی کایا پلٹ دیں گے مگر اُن کی جوش اور جذبے سے پھٹ پھٹ جانے والی سوچیں جدھر جاتی تھیں اُدھر اژدہا اور عفریت منہ کھولے موجود تھے۔

"کیا اُبھرتی ہُوئی نسل اِس پاکستان سے محبت کر سکے گی؟" ـــ طاہرہ نے کہا۔

"اپنے بچوں کے دلوں میں وطن کی محبت ہم پیدا کریں گے" ـــ ارشد نے کہا ـــ "طاہر پرویز صرف اُس صورت میں پاسبانِ وطن بنے گا کہ ہم اسے بتائیں کہ پاکستان کی مائیں بچوں کو سینے سے لگاتے رکھنے کے لیے نہیں جنا کرتیں۔"

ارشد اور طاہرہ طاہر پرویز کی تعلیم و تربیت کے متعلق باتیں کرنے لگے، پھر ازدواجی زندگی کی پہلی رات گزر گئی۔

✪

ان دو مہینوں میں پاکستان میں کوئی انقلاب نہ آیا۔

اپنی دو جاسوس لڑکیوں کے قتل سے ہندوستان کی انٹیلی جنس میں ذرا سی ہلچل پیدا ہُوئی۔ رادھا اور کرن کے نام جاسوسوں کی فہرست سے کاٹ دیئے گئے اور ان کی جگہ دو اور نام لکھ دیئے گئے اور خفیہ فہرست میں ان دو نئے ناموں کے آگے لکھ دیا گیا ـــ "پاکستان۔"

ہندوستان کے جاسوسوں کو ختم کرنے کی جو تحریک عبدالجلیل خان نے شروع کی تھی وہ اُس کے ساتھ قبر میں دفن ہو گئی۔ اس شخص نے جو گروہ بنایا تھا وہ بکھر گیا اور مِلّی جذبے سینوں میں قید ہو گئے۔

ہندوستان کا سفارت خانہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا۔

پاکستان کے حکمرانوں کی پولیس کا خفیہ شعبہ ان کے سیاسی مخالفین کو ہراساں اور گرفتار کرتا رہا۔

اپوزیشن پارٹیاں برسرِ اقتدار پارٹی کو ذلیل و رسوا کرنے کا ہر حربہ استعمال کرتی رہیں۔ دونوں دھڑے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے۔ حکمران پارٹی کے اخباروں کے مطابق پاکستان خوش حال ملک تھا اور ہر کسی کو انصاف مساوی اور مفت ملتا تھا، مگر اپوزیشن کے اخباروں کے مطابق پاکستان ایک کنگال اور بھکاری ملک بن چکا تھا جہاں کے عوام کیڑوں مکوڑوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بھوکے پیاسے مر رہے تھے۔ ان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔

صرف عوام جانتے تھے کہ وہ کس حال میں جی رہے ہیں۔ پاکستان کی عمر کے نویں سال بھی بے گھر اور بے آسرا مہاجرین کو معلوم تھا کہ پاکستان کی قیمت کیا ہے۔ اقتدار کی سیاست کے لیڈروں کو یہ تو یاد رہ گیا تھا۔ .... "پاکستان کا مطلب کیا ـــ لاالٰہ الا اللہ" ـــ لیکن وہ بھول گئے تھے کہ پاکستان کی قیمت کیا ہے۔ ان کی دھواں دھار تقریروں کا اور ان کی گرماگرم پریس کانفرنسوں کا نشانہ اور ہدف تھا ـــ اقتدار اور صرف اقتدار!

ان دو مہینوں میں پاکستان دو سال اور پیچھے چلا گیا تھا۔

ہمارے ازلی دشمن ہندو نے جب دیکھا کہ پاکستان کی حکومت کو معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ جو دو لڑکیاں قتل ہو گئی ہیں وہ ہندوستان کی جاسوس تھیں اور ریٹائرڈ اے۔ ایس۔ آئی عبدالقدیر بھی ہندوستان کا ایجنٹ تھا تو ہندوؤں نے پاکستان میں مزید انسانی بارودی سرنگیں بچھا دیں۔ ہندوؤں کو پتہ چل گیا کہ پاکستان کے لیڈر ہر واقعہ اور ہر حادثے پر اپنا رنگ چڑھا کر اسے سیاسی معرکہ آرائی میں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے ہیں تو ہندوؤں نے پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے انتظامات پہلے سے زیادہ مؤثر اور تباہ کن کر دیئے۔

✪

ایک رجب علی تھا جس کی ذات اور جس کے کردار میں انقلاب آ رہا تھا۔ یہ ایک اذیت ناک انقلاب تھا۔ کبھی تو وہ اس اذیت سے گھبرا کر فرار کی راہیں ڈھونڈنے لگتا اور کبھی ڈاکٹر ذاکر حسین کی باتیں اسے نیا حوصلہ اور نیا ولولہ دے دیتیں اور وہ مسرتوں سے سرشار ہو جاتا مگر بعض حقائق باتوں سے بہلا نہیں کرتے۔ جب یلغار کرتے ہیں تو بڑے بڑے جابروں اور حوصلہ مندوں کے بھی پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔

رجب علی کو سب سے بڑی جس حقیقت کا سامنا تھا وہ اس کی اپنی ذات تھی، اُس کا اپنا ذہن اور اس کی اپنی سوچیں تھیں۔ ریٹائرڈ انسپکٹر عبدالجلیل خان ایک واہمے کی طرح اور کبھی آسیب کی مانند اُس پر غالب آ گیا تھا۔ پہلے اُس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو اتنا ہی بتایا تھا کہ اُسے نیند نہیں آتی اور اس کے خیالات پریشان رہتے ہیں لیکن اس کے کچھ دنوں بعد اُس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنی جو کیفیت بتائی اس سے ڈاکٹر بھی پریشان ہو گیا۔

"آپ نے میری کوٹھی دیکھی ہے" ـــ اُس نے ڈاکٹر کو بتایا ـــ "بہت بڑی ہے۔ اس کے بہت سے کمرے ہیں۔ اس میں رہنے والا میں اکیلا ہوں۔ ایک خانساماں ہے اور ایک نوکر۔ کبھی یہ کوٹھی پُر رونق ہوتی تھی۔ جن کے دم قدم سے رونق تھی وہ دنیا سے اُٹھ گئے ہیں۔ پہلے والدہ پھر والد صاحب اللہ کو پیارے ہوئے۔ پھر بھائی جان بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پیچھے ان کی بیوی اور دو بچوں کی رونق رہ گئی تھی مگر بھابی نے ہمارے ایک دشمن خاندان کے ایک آدمی کے ساتھ شادی کر لی اور بچوں کو لے کے چلی گئی۔ میں اور میری بیوی رہ گئے۔ پھر بیوی بھی ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ گئی۔ اب میں ہوں اور اتنی بڑی کوٹھی کی تنہائی ہے۔ وحشت ہوتی ہے وہاں ڈاکٹر صاحب! وحشت .... اگر آپ نے سجی سجائی، ایرانی قالینوں اور بیش قیمت فرنیچر سے مزین کمروں کی وحشت بھی

نہ دیکھی ہو تو میری کوٹھی میں دیکھ لیں ....

"بیوی کے مرنے کے بعد مجھے کتنی لوگوں نے بیٹیاں پیش کیں۔ یہ سب کنواری تھیں، بیوہ کوئی بھی نہیں تھی۔ میں نے کسی کو قبول نہ کیا۔ یہ لوگ مجھے نہیں میری کوٹھی، میری جائیداد اور میری ان زمینوں کو بیٹیاں دے رہے تھے۔ کسی کو میرے جذبات سے ذرا سا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ کسی کو میری تنہائی پر رحم نہیں آتا تھا۔ وہ رجب علی کو نہیں بلکہ ایک ڈی۔ ایس۔ پی کو جو صاحبِ جائیداد بھی تھا اپنی بیٹیاں پیش کر رہے تھے ....

"اور ڈاکٹر صاحب! میری کوٹھی میں شام کے بعد میلہ لگ جایا کرتا تھا۔ یہ لوگ بھی رجب علی کے پاس نہیں، ایک ڈی۔ ایس۔ پی کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان میں میرے ماتحت ہوتے تھے .... انسپکٹر، سب انسپکٹر، ہیڈ کانسٹیبل .... یہ سب خوشامدی تھے۔ وہ سب سے پہلے میرا موڈ دیکھتے تھے۔ میں مُسکراتا تو وہ قہقہے لگاتے تھے۔ میرے چہرے پر سنجیدگی ہوتی تو وہ منہ لسور لیتے تھے۔ میں دن کو رات کہوں تو وہ پولیس والی دلیلیں دے کر ثابت کر دیتے تھے کہ یہ دن نہیں رات ہے ....

"ان کے علاوہ میرے پاس وہ لوگ آتے تھے جن کا پولیس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ یہ سب چُغل خور تھے۔ ان میں گامے ماجھے نہیں، اونچی سوسائٹی کے، آپ کی اور میری سوسائٹی کے لوگ ہوتے تھے۔ ان میں سیاسی لیڈر بھی ہوتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی غیبت کرنے آتے تھے۔"

"صرف تمہارے پاس نہیں رجب علی!" ـــ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا ـــ "تمام بڑے افسروں کے پاس بھی خوشامدی اور چغل خور جایا کرتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ترقیاں انہی لوگوں کی جھوٹی رپورٹوں پر دی اور روکی جاتی ہیں؟ .... پاکستان کا نظام ان تین چیزوں پر چل رہا ہے .... خوشامد، چغلی اور رشوت .... چپڑاسی سے چیئرمین تک خوشامدی، چغل خور اور رشوت خور ہیں۔ حکومت کے اندر کے جوڑ توڑ خوشامد اور چغلی سے ہوتے ہیں۔ وزارتیں انہی سے ٹوٹتی اور بنتی ہیں۔ مشورے اُن کے قبول ہوتے ہیں جو خوشامد اور چغل خوری کے ماہر ہوتے ہیں۔"

"اور یہی تین چیزیں پاکستان کو لے ڈوبیں گی" ـــ رجب علی نے کہا ـــ "جس طرح آپ انسان کے جسم کے اندر کی مشینری کو سمجھتے ہیں اور کوئی نقص ہو تو اس کی نشاندہی فوراً کر دیتے ہیں، اسی طرح پولیس کا ہر ایک ڈی ایس پی اور اس سے اوپر کے افسر جانتے ہیں کہ پاکستان کے قصرِ صدارت سے لے کر چونگی کے محرر تک سرکاری مشینری کس طرح چل رہی ہے۔ اس کے نقائص کی نشاندہی صرف ہم لوگ کر سکتے ہیں ....

"ذرا گہری نظر سے دیکھیں کہ قوم کو کس طرح ذہنی طور پر مفلوج کیا جا رہا ہے۔ مجھے ذہنی مریض بنا دیا گیا ہے۔ اب جب خود مجھ پر بیتی ہے تو میں سمجھا ہوں کہ جسے کوئی غلط کام کرنے سے انکار پر نہ صرف نوکری سے برطرف کر دیا جاتا ہے بلکہ اس کی برطرفی کی رپورٹ میں یہ لکھا جاتا ہے کہ اس نے مجرموں کو سزا سے بچانے کی کوشش کی اور رشوت لی، اُس انسان کا دماغی توازن کھو بیٹھنا حیران کُن نہیں ہوتا۔ مجھ جیسے کئی ہیں جو گھروں میں بیٹھے خونِ جگر پی رہے ہیں ....

"قوم کو چوروں اور اٹھائی گیروں کے رحم و کرم پر ڈال کر اور قوم کو انصاف سے محروم کر کے اور منڈی کے بھاؤ چڑھا کر اور اس ملک کو پولیس سٹیٹ بنا کر نفسانفسی کی ایسی کیفیت پیدا کر دی گئی ہے کہ قوم افراد میں بٹ گئی ہے۔ جھاڑو کے تنکے بکھر گئے ہیں۔ ایک تنکا ملک سے برائیوں اور قباحتوں کو صاف نہیں کر سکتا۔ تنکا جو جھاڑو سے الگ ہوتا ہے وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ شاخ جو شجر سے الگ ہو جاتی ہے سوکھ جاتی ہے۔ قوم کے

افراد کا یہی حال ہو رہا ہے۔"

✪

"ہم بہت دُور نکل گئے ہیں"— ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا —"تم اپنی بات کر رہے تھے۔ اپنی ہی بات کہو:"

"میں یہی کہہ رہا تھا کہ اب ہر پاکستانی اپنی ہی بات کرتا ہے"— رجب علی نے کہا —"میں بھوکا مر رہا ہُوں، میرے بچے بیمار ہیں۔ ایک جائز کام کی مجھ سے رشوت لی گئی ہے۔ میرا گھر لُٹ گیا ہے.... قوم کو پستی کے اُس مقام تک پہنچا دیا گیا ہے جہاں ہمارا وہ نعرہ —"پاکستان یا موت"— بے معنی ہو کے رہ گیا ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ سارا پاکستان بیمار ہے، سارا پاکستان رشوت دے رہا ہے، پاکستان لُٹ رہا ہے، پاکستان اناج کی بھیک مانگ رہا ہے۔"

ملک رجب علی بولتا جا رہا تھا۔ زبان رُک نہیں رہی تھی۔ اُس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر اکتاہٹ کے آثار بڑے صاف تھے۔ رجب علی نے اپنی بات کا رُخ پھیر دیا۔

"میں اپنی کوٹھی کی ویرانی کی بات کر رہا تھا"— اُس نے کہا —"جس کوٹھی میں شام کے بعد میلہ لگ جاتا تھا وہاں اب اُلّو بولتے ہیں۔ اب وہاں کوئی نہیں آتا۔ کوئی نہیں آتا ڈاکٹر صاحب!"— وہ چُپ ہو گیا اور ذرا دیر بعد دبی ہُوئی سی آواز میں بولا —"صرف وہ آتا ہے.... دوسری تیسری رات آجاتا ہے"— اور اُس نے خلاء میں ٹکٹکی باندھ لی۔

"وہ کون؟"— ڈاکٹر ذاکر حسین نے پوچھا۔

ملک رجب علی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"میں نے پوچھا ہے وہ کون ہے؟"— ڈاکٹر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے جھنجھوڑتے ہُوئے پوچھا —"رجب! کس کی بات کر رہے ہو؟"

ڈاکٹر ذاکر حسین کو اس شخص کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی جو رجب علی کے گھر جاتا تھا۔ ڈاکٹر اُس کی اِس کیفیت سے چونک پڑا تھا جو اچانک اس میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رجب علی کی ذہنی کیفیت نارمل نہیں رہی۔

"رجب علی!"— ڈاکٹر نے اب اُسے ذرا زور سے جھنجھوڑا اور پوچھا —"باتیں کرتے کرتے کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کون دوسری تیسری رات آجاتا ہے؟"

"عبدالجلیل خان!"— رجب علی نے کہا —"صرف عبدالجلیل خان میرے پاس آتا ہے"— رجب علی کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ آگئی اور اُس نے کہا —"میں نے اُسے دن کے وقت بھی اپنی کوٹھی میں دیکھا ہے۔"

"تمہاری ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی رجب علی!"— ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا —"اپنے آپ کو سنبھالو۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تمہیں کیا نظر آتا ہے۔ تمہارا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ اب مجھے تمہارا کوئی علاج کرنا پڑے گا۔"

✪

"تقریباً ایک مہینہ گزرا"— ملک رجب علی نے کہا —"میں کوٹھی میں اکیلا بیٹھا تھا۔ سامنے دیوار پر والد صاحب کی تصویر لگی ہُوئی تھی۔ میری نظریں اس تصویر پر جم گئیں۔ ایسے لگا جیسے تصویر نے مجھے ہپناٹائز کر لیا ہو۔ میرے دماغ اور میرے جسم پر اس تصویر نے قبضہ کر لیا۔ میں کوشش کے باوجود نظریں تصویر سے ہٹا نہ سکا۔ آپ اسے واہمہ

کہیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے تصویر کی آنکھیں بند ہوتے دیکھیں اور ذرا سی دیر بعد تصویر نے آنکھیں کھولیں تو میرے والد صاحب کا چہرہ عبدالجلیل خان کا چہرہ بن گیا۔ میں نے عبدالجلیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی اور مجھے اُس کی آواز سنائی دی —"ملک! تم میری ہڈیاں توڑ سکتے ہو۔ میرا ایمان سلامت ہے اور آخری سانس تک سلامت رہے گا۔"...

"ڈاکٹر صاحب! میں کمزور دل تو نہیں لیکن میرے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ تصویر کانپی اور یہ پھر میرے والد صاحب کی تصویر بن گئی۔ مجھے ایک اور آواز سنائی دی —"یہ کوئی پہنچ والا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی خدائی طاقت ہے"— میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ کمرے کی ہر چیز کو دیکھا۔ کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟.... یہ خواب نہیں تھا۔ یہ میرا تصور بھی نہیں تھا۔"

"یہ جو کچھ بھی تھا تمہارے لیے ٹھیک نہیں تھا"— ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا —"تم نے عبدالجلیل کو اپنے ذہن پر سوار کر لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ تم نے اپنے ایک گناہ کو اپنے ذہن میں زندہ اور تروتازہ رکھا ہُوا ہے۔ اسے ذہن سے نکالو۔ گناہ جو ہو چکے، لغزشیں جو ہو چکیں، انہیں بھول جاؤ۔ یہ گناہ کا احساس یا بوجھ بن کر ضمیر کو دبائے رکھتا ہے۔ پہلے ذہن بگڑتا ہے پھر انسان کا دماغی توازن خراب ہوتا ہے یا جسمانی مشینری میں بگاڑ پیدا کرتا ہے۔"

"اُسی رات کا واقعہ ہے"— ملک رجب علی نے کہا —"رات شاید ابھی آدھی ہی گزری تھی۔ میں گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ کسی نے میرے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کو پکڑ کر کھینچا بھی تھا اور دائیں بائیں ہلایا بھی تھا۔ اگر یہ میرا وہم یا خیال ہوتا تو مجھے کیسے پتہ چلتا کہ کسی نے میرے پاؤں کا انگوٹھا پکڑا تھا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ ابھی ابھی کسی نے مجھے انگوٹھے سے پکڑ کر ہلایا ہے۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ٹیبل لیمپ جلایا۔ مجھے ہنسی سنائی دی۔ میں نے دروازہ دیکھا۔ چٹخنی چڑھی ہُوئی تھی۔ کھڑکی کے کواڑ کھلے ہُوئے تھے جو میں ہوا کے لیے کھول کے رکھتا ہوں....

"ایک خیال یہ آیا کہ مجھے قتل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جن کے راز میرے سینے میں ہیں، اُنہوں نے کرائے کے کسی قاتل کو بھیجا ہو گا لیکن میری آنکھ کھل گئی.... یہ قاتل نہیں تھا۔ مجھے جگانے کی اُسے کیا ضرورت تھی۔ میں ریوالور تیار رکھتا ہوں۔ ریوالور اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ کوٹھی بالکل خاموش تھی.... میں اب بھی ہنسی کی ہلکی ہلکی سسکی سن رہا تھا۔ میں اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ دروازے اور کھڑکی کی چٹخنیاں چڑھا دیں۔ میں ڈر رہا تھا۔ اگر یہ کوئی زندہ انسان ہوتا تو میں اسے للکارتا لیکن وہ عبدالجلیل تھا۔ میں نے آیت الکرسی پڑھی اور لیٹ گیا مگر باقی رات مجھے نیند نہ آئی۔ میں کمرے میں کسی ایسی چیز یا کسی ایسے انسان کی موجودگی کو محسوس کرتا رہا جسے انسانی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔"

✪

"اگلی رات پھر ایسے ہی ہُوا"— ملک رجب علی نے کہا —"میرے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کو کسی نے کھینچا اور ہلایا۔ میں جاگ اُٹھا اور ہاتھ لمبا کر کے ٹیبل لیمپ جلایا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا لیکن میں نے کل رات کی ہنسی سُنی۔ کبھی خیال آتا ہے کہ یہ ہنسی تھی اور کبھی سوچتا ہوں کہ کسی کی سسکیاں تھیں۔ دروازے کی اندر کی چٹخنی چڑھی ہُوئی تھی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ یہ کوئی چور نہیں تھا۔ کوئی قاتل بھی نہیں تھا۔ چور اور قاتل اپنا کام کر کے کھسک

جاتے ہیں، ہنستے یا سِسکتے نہیں....

"اگلی رات پھر ایسے ہی ہُوا تو میں جاگ کر پلنگ پر بیٹھا رہا۔ ٹیبل لیمپ نہ جلایا۔ میں نے کہا —— 'عبدالجلیل! میں تمھارا قاتل ہُوں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں تمہیں قتل کر کے خوش نہیں ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو ذہنی اذیّت میں ڈال دیا ہے۔ نوکری سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ میں تمہیں دنیا میں واپس نہیں لا سکتا۔ میں گناہ کا کفّارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں'.... ڈاکٹر صاحب! میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ مجھے کمرے میں کسی کے آہستہ آہستہ چلنے کی آہٹ سنائی دی جیسے کوئی ننگے پاؤں چل رہا ہو۔ میں نے ٹیبل لیمپ جلا دیا اور تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔ اُف میرے خُدا! میں نے کیا منظر دیکھا۔ کمرے کے فرش پر عبدالجلیل بیٹھا تھا۔ اُس کا سر سینے پر ڈھلک گیا تھا اور اُس کے منہ سے خون کے ایک دو قطرے اُس کی قمیض پر گرے۔ میں پلنگ سے اٹھ کر اور ریوالور پھینک کر اُس کی طرف لپکا مگر عبدالجلیل وہاں نہیں تھا۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین کے چہرے پر پریشانی صاف نظر آنے لگی تھی۔ اُس کے گہرے دوست ملک اللہ یار خاں مرحوم کا بیٹا ذہنی طور پر نارمل نہیں تھا۔ اس کے ساتھ حادثہ ہُوا تھا۔ اس سے ایک غلط کام کرایا گیا اور اُس نے اپنی نوکری ختم کر ڈالی تھی۔

"عبدالجلیل کو دیکھ کر مجھے یہ یقین ہو گیا کہ رات کو کوئی چور یا قاتل نہیں آتا" —— رجب علی نے کہا —— "میرے دِل سے قتل ہونے کا ڈر نِکل گیا لیکن مجھ پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ خدا نے مجھے معاف نہیں کیا اور میرے مقتول کی روح ساری عمر میری تنہائی کی ساتھی بنی رہے گی۔"

"اس کے بعد بھی تمہیں وہ نظر آیا ہے؟"

"ایک بار نہیں کئی بار" —— رجب علی نے کہا —— "کبھی تو میں اسے دیکھ کر اذیّت ناک پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہوں اور کبھی میں اُس سے اپنے گناہ کی معافی مانگتا ہوں تو میری روح مطمئن ہو جاتی ہے۔"

"وہ تمہیں اسی حالت میں نظر آتا ہے؟" —— ڈاکٹر ذاکر حسین نے پوچھا —— "زخمی حالت میں؟ مرا ہُوا؟"

"کبھی زخمی حالت میں اور کبھی بالکل تندرست و توانا" —— ملک رجب علی نے کہا —— "جس رات اُسے پہلی بار دیکھا تھا اس سے ایک رات بعد میں سونے کے لیے لیٹا ہی تھا تو مجھے کھلی ہوئی کھڑکی میں کوئی کھڑا دکھائی دیا۔ وہ سایہ سا تھا۔ یہ واہمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کوئی زندہ آدمی کھڑا تھا۔ میرے لیے آسان تھا کہ ریوالور نکال کر اُسے گولی مار دیتا لیکن اسے زندہ پکڑنا بہتر سمجھا۔ میں آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا کہ اندھیرے میں مجھے اس سائے کے خدوخال نظر آنے لگے —— وہ عبدالجلیل تھا —— میں نے لیمپ نہ جلایا۔ پلنگ سے اٹھا بھی نہیں۔ میں نے کہا —— 'تم نے میری معافی قبول نہیں کی؟ میں تمہیں اپنی جان پیش کرتا ہُوں، پھر میں بھی تمہاری طرح روح بن کر بھٹکتا رہا کروں گا۔ مجھے جیتے جی سزا نہ دو'....

"وہ مُسکرایا اور اُس کے آنسو بھی نکل آئے۔ اُس کے ہونٹ کانپے مگر مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ میں نے اُسے کہا —— 'میں تم سے بدتر ہوں۔ میں حقیر ہوں' —— میری آواز اپنے آپ ہی بلند ہو گئی —— 'میں قابلِ نفرت ہوں' —— میں نے اُس کی آواز سنی —— 'تم حقیر اور بدتر ہی رہو گے۔ میں بھی پولیس آفیسر تھا لیکن میں مر کر بھی زندہ ہُوں، تم زندہ رہ کر بھی مرے ہوتے ہو۔ میرا ایمان سلامت ہے۔ تمھارا ایمان کہاں ہے؟ اپنا ایمان ڈھونڈو' —— اور وہ اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔"

"رجب!" —— ڈاکٹر ذاکر حسین نے جھنجھلاتے ہُوئے لہجے میں کہا —— "یہ تمھارے اپنے ذہن کی آوازیں

ہیں۔ بیشتر اس کے کہ یہ تمہارے ذہنِ لاشعور میں اُتر جائیں انہیں ذہن سے نکالو۔ تم اَن پڑھ نہیں ہو، گنوار اور پسماندہ نہیں ہو۔ اپنے اوپر احساسِ گناہ طاری کیے رکھنے کے نتائج بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ تم اب گناہگار نہیں ہو۔"

"لیکن وہ کہتا ہے کہ میں آتا رہوں گا" —— رجب علی نے کہا —— "دو رات بعد وہ پھر آیا تھا۔ میرے کمرے میں ٹہلتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔"

"یہی باتیں کرتا رہا ہو گا جو تم مجھے سنا چکے ہو۔"

"نہیں" —— رجب علی نے کہا —— "کہتا تھا —— 'تم نے مجھے مار ڈالنے سے پہلے استعفیٰ کیوں نہ دے دیا؟ تم مجھے قتل کرنے کا ارادہ کیے ہوتے تھے' —— میں نے اُس سے التجا کی —— 'جلیل! خدا کے لیے مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ تمھارا قتل میرا حکم نہیں تھا' —— اُس نے کہا —— 'اور یہ حکم خدا کا بھی نہیں تھا۔ انسان جب خدا بن جاتے ہیں تو وہ نہیں سمجھتے کہ ایک روز وہ پکڑے جائیں گے اور اللہ کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے.... تُو نے چرس پینے والے تانگہ بان کا ایمان دیکھا ہے؟' —— مجھے چکر آ گیا اور جب میں ذرا سنبھلا تو کمرے میں تاریکی کے سوا کچھ بھی نہ تھا....

"بہت دیر بعد میری آنکھ لگی۔ اگر نوکر مجھے نہ جگاتا تو میں دن بھر سویا رہتا۔ نوکر کی آواز پر آنکھ کھلی تو میرے ذہن میں سب سے پہلے جو چیز آئی وہ چرس آئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کہیں گے کہ میں دماغی توازن کھو بیٹھا ہوں لیکن میرا ذہن حقیقی دنیا سے کٹ چکا تھا۔ عبدالجلیل نے کہا کہ تُو نے چرس پینے والے تانگہ بان کا ایمان نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا تھا ڈاکٹر صاحب! میں نے آپ کو کاسے تانگے والے کی ساری بات سنائی تھی.... مجھے نوکر نے جگایا تو میرے ذہن میں چرس تھی۔ میں نے نوکر سے کہا کہ مجھے تھوڑی سی چرس لا دو۔ اُس نے مجھے حیران ہو کے دیکھا۔ میں نے پھر کہا کہ مجھے تھوڑی سی چرس لا دو۔ اُس نے کہا —— 'ملک صاحب! وِسکی کی آدھی بوتل پڑی ہے' —— میں نے غصے سے کہا —— 'تم جانتے ہو کہ جب سے استعفیٰ دیا ہے میں نے شراب نہیں پی۔ میں کہہ رہا ہوں چرس لا دو'....

"اور وہ چرس لے آیا۔ میں نے چرسیوں کی طرح سگریٹ میں چرس بھری۔ نوکر میرے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ میں جب سگریٹ مُنہ میں لینے لگا تو ایک ہاتھ سگریٹ اور میرے منہ کے درمیان آ گیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ ہاتھ میرے نوکر کا تھا۔ میں نے اُس کے مُنہ کی طرف دیکھا تو اس نے کہا —— 'چرس کا کش نہیں لگانے دوں گا' —— میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اُس نے میرا غصہ بھی سلب کر لیا تھا۔ وہ میرا نوکر تھا جیسے گھروں میں نوکر ہوتے ہیں۔ مالک کو خوش کرنے کو ایمان سمجھتے ہیں لیکن میرے نوکر نے میرے ہاتھ سے سگریٹ لے لیا اور بولا —— 'میں آپ کی جُوتیوں کا بھی خادم ہوں۔ لعنت ہے میری وفاداری پر کہ میں آپ کو چرس پینے دوں۔ بہت بُری چیز ہے ملک صاحب! میرا باپ چرسی نہ ہوتا تو میں گھروں میں نوکری نہ ڈھونڈتا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نہ ہوتا تو انسپکٹر ضرور ہوتا.... اگر آپ کو میری یہ حرکت بُری لگے تو مجھے معاف کر دیں یا گھر سے نکال دیں۔ چرس نہیں پینے دوں گا' —— میں نے سر سے اشارہ کیا کہ جاؤ....

"وہ سگریٹ لے گیا۔ باقی چرس بھی لے گیا۔ میں اٹھ کر کھڑکی میں سے دیکھنے لگا۔ نوکر مجھے دکھائی دیا۔ اُس نے چرس کوٹھی سے باہر پھینک دی اور سگریٹ مروڑ اور مَسل کر پھینک دیا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور خیال آیا کہ اس کی جگہ وہ خوشامدی ہوتے جو میرے زرخرید غلام بنے رہتے تھے تو وہ چرس

کی تعریف کرتے اور اگلے روز ان میں سے ہر ایک پاؤ پاؤ چرس حاضر کرتا۔"

"کچھ سمجھو رجب علی!" ـــــ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا ـــــ "علم اور ایمان کتابوں میں نہیں، دولت میں نہیں اور جاگیرداری میں نہیں۔ علم یہ ہے جس سے ایک ان پڑھ نے تمہیں پڑھایا اور ایمان یہ ہے جو اس گنوار نے تمہیں دکھایا ہے۔ اس نے حقِ نمک ادا کیا ہے۔ اس نے تمہاری خوشنودی کو اور اپنی نوکری کو تمہارے بھلے پر قربان کر دیا تھا، اور تمہارا غصہ اس لیے سلب ہو گیا تھا کہ وہ حق پر تھا۔ وہ سچ بات کہہ رہا تھا۔"

"سب کچھ سمجھنے کے باوجود ایسے لگتا ہے جیسے میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہا" ـــــ رجب علی نے کہا ـــــ "میں تو اب اپنے نوکر کا سامنا کرنے سے بھی گھبراتا ہوں .... میں نے سوچا کہ شہر سے نکل جاؤں۔ میں اپنی زمینوں پر چلا گیا۔ میرا چھوٹا سا ایک مکان وہاں بھی ہے۔ نوکر چاکر ساتھ تھے۔ مزارعے بھی تھے۔ انہوں نے مجھے شہزادہ بنا دیا مگر وہ میرے دل کا حال نہ سمجھ سکے....

"میں سورج غروب ہونے سے پہلے کھیتوں کو نکل گیا۔ بہت خوبصورت ماحول تھا۔ فضا خوشگوار تھی۔ میں لہلہاتے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا آگے ویرانے میں چلا گیا۔ میں چلا جا رہا تھا۔ اپنے پیچھے مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ خیال آیا کہ جھاڑیوں میں سے ہوا کا جھونکا گزرا ہوگا۔ میں اطمینان سے چلنے لگا۔ ایک آدھ منٹ بعد مجھے ہنسی کی آواز سنائی دی جو میں نے پہچان لی۔ میں اس ہنسی کو پہچانتا ہوں۔ عبدالجلیل کی ہنسی تھی یہ....

"میں رک گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ قریب ایک درخت سے ایک گدھ اُڑا۔ ایسے لگا جیسے پہلے بھی اسی کے پروں کی آواز تھی، ہنسی نہیں تھی لیکن وہ سامنے آگیا.... عبدالجلیل خان.... آپ نے اسے دیکھا نہیں تھا ڈاکٹر صاحب! بہت خوبصورت جوان تھا۔ اس کے چہرے پر نور تھا۔ وہ مجھ سے دس بارہ قدم دور ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ میں رک گیا، بلکہ زمین نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں اونچی آواز میں بولا تھا یا نہیں لیکن میں کہہ رہا تھا ــ خدا کے لیے مجھے بخش دو جلیل، یا مجھے بتا دو کہ میں تمہاری خوشی کے لیے کیا کروں' ـــــ وہ مسکرایا اور بولا ـــــ 'چرس تمہیں اذیت سے نہیں بچا سکتی۔ شراب تمہاری روح کو سکون نہیں دے سکتی' ـــــ اور وہ غائب ہوگیا....

"میں کہاں تک سناتا چلوں ڈاکٹر صاحب! وہ آتا ہے اور ایسی ہی کوئی بات کہہ کر چلا جاتا ہے۔ میری نیند ختم ہوگئی ہے۔ سکون ختم ہوگیا ہے.... یہ کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟ مرے ہوؤں کی روحیں اس طرح نظر آیا کرتی ہیں؟ کیا مجھے کسی پیر فقیر کے پاس جانا پڑے گا؟"

"ڈاکٹری میں اس کا علاج مسکّن اور خواب آور گولیاں ہیں جو میں تمہیں نہیں دوں گا" ـــــ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا ـــــ "میں نے تمہیں اس روز بھی بتایا تھا کہ تمہیں مصنوعی اور جھوٹے سہارے اور زیادہ خراب کریں گے۔ ذہنی سکون اور نیند کی گولیاں ذہنی بیساکھیاں ہیں۔ اپنے پاؤں چلو۔ تم جس عبدالجلیل کو دیکھ رہے ہو یہ ایک واہمہ ہے۔ یہ روح یا بد روح نہیں۔ یہ ایک جرم کا احساس ہے جس نے تمہارے دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ کلیئر کی گرفت ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ تم سنبھل جاؤ گے رجب! تم سنبھل جاؤ گے۔ گناہ کا کفّارہ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نیکی کرو۔ نیکی اور بدی کے درمیان ایک خلا ہے، تم اس میں بھٹک رہے ہو۔ عبادت کرو۔ دکھی انسانوں کے دکھ اپنے سینے میں ڈال لو۔ بہترین علاج تو یہ ہے کہ شادی کر لو۔ زندگی کا ساتھی ڈھونڈ لو۔"

"شادی نہیں کروں گا" ـــــ ملک رجب علی نے کہا ـــــ "ہو سکتا ہے میں پاگل ہو جاؤں۔ ہو سکتا ہے میں خودکشی کر لوں۔ کیوں کسی عورت کی زندگی تباہ کروں۔"

"پھر میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔"

✪

ملک رجب علی نے وہی کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے خانساماں کا ایک لڑکا جس کی عمر بارہ تیرہ سال تھی کسی ہوٹل میں اور اس سے چھوٹا کسی گھر میں نوکر تھا۔ رجب علی نے خانساماں سے کہا کہ وہ دونوں کو نوکری سے ہٹا لے اور شام کو انہیں کوٹھی میں لے آیا کرے۔ دونوں چونکہ سکول میں داخل ہونے کی عمر سے بہت آگے چلے گئے تھے اس لیے رجب علی نے ان کے لیے ایک سکول ماسٹر کے ساتھ بات طے کر لی جس نے کوٹھی میں آکر دونوں بچوں کو دو گھنٹے روزانہ پڑھانا شروع کر دیا۔ رجب علی نے ان کے لیے نئے کپڑے سلوائے اور ان میں دلچسپی لینے لگا۔

اُس کے ذہن میں اب یہی ایک مسئلہ رہتا تھا کہ وہ اور کس کس کو اپنی پناہ میں لے کر اُس کا مستقبل سنوار دے۔ اُس نے تین اور غریب بچوں کے ماہوار وظیفے لگا دیئے۔

ایک روز اُس نے سوچا کہ کسی ایسے سکول کے ہیڈ ماسٹر سے ملے جہاں غریبوں کے بچے پڑھتے ہیں اور چند ایک بچوں کی کم از کم فیسیں اپنے ذمّے لے لے۔ اس کی اپنی سوسائٹی میں کوئی بچہ کسی کا محتاج نہیں تھا۔ اس کی کوٹھی شہر کے پرانے حصّے میں ہی تھی۔ ایک روز وہ پیدل چلتا ایک ہائی سکول کے صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ اُسے ہیڈ ماسٹر سے ملنا تھا لیکن وہ صدر دروازے میں ہی رُک گیا۔ وہاں تیرہ چودہ سال کی عمر کا ایک لڑکا کھڑا تھا جس نے بستہ اٹھا رکھا تھا اور وہ بہت اداس تھا۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتا رہا ہے۔ بچے کلاسوں میں پڑھ رہے تھے اور یہ بچّہ اکیلا باہر اُداس کھڑا تھا۔

"سکول دیر سے آتے ہو اس لیے اندر جانے سے ڈرتے ہو؟" ـــــ رجب علی نے اُس سے پوچھا۔

لڑکا اس قدر غمگین تھا کہ اُس کے مُنہ سے جواب نہ نکلا۔ اُس نے سر ہلایا کہ نہیں، وہ دیر سے نہیں آیا۔ رجب علی نے دیکھا کہ بچہ غریب سا تو لگتا ہے لیکن چہرے مُہرے سے کسی شائستہ گھرانے کا معلوم ہوتا ہے۔ رجب علی اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ بچے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ رجب علی نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"مجھے نہیں بتاؤ گے تم کیوں رو رہے ہو؟"

بچے نے ہاتھ سے دونوں آنکھیں پونچھیں اور رُندھی ہوئی آواز میں بولا ـــــ "ماسٹر صاحب نے پیٹا ہے اور کلاس سے نکال دیا ہے۔"

"کوئی شرارت کی تھی؟"

"نہیں جی!" ـــــ اُس نے سسکتے ہوئے کہا ـــــ "میرے پاس دو کتابیں نہیں ہیں۔ میں خرید نہیں سکتا۔ امّی کو ابھی پیسے نہیں ملے۔ ماسٹر ہر روز کہتا تھا کہ کتابیں لاؤ۔ کل اُس نے مجھے غدّار کا بچہ اور ڈاکو کی اولاد کہا تھا۔"

"تمہارا باپ زندہ ہے؟"

"اگر وہ زندہ ہوتا تو مجھے غدّار کا بچہ اور ڈاکو کی اولاد کہنے والا ماسٹر زندہ نہ ہوتا" ـــــ بچّے نے غصے سے جواب

دیا اور اُس نے دانت پیس کر کہا — "آج چھوٹا ہوں تو کیا ہُوا، ذرا اور بڑا ہو لوں تو اِسے چھوڑوں گا نہیں"۔

رجب علی پولیس میں رہ چکا تھا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بچے کس طرح مجرم بنتے ہیں۔ یہ اتنی پیاری شکل و صورت والا بچہ محرُومی اور غصے کی وجہ سے عادی مجرموں کے راستے پر چلنے والا تھا۔ رجب علی نے اُس سے پوچھا کہ کتابوں کی دوکان کہاں ہے۔ بچے نے بتایا کہ یہ قریب ہی ہے۔ رجب علی بچے کو ساتھ لے گیا اور دونوں کتابیں خرید دیں۔ پھر اُس کا بستہ کھلوا کر دیکھا۔ کاپیوں کی بھی کمی تھی۔ اُس نے بچے کو دس بارہ چھوٹی بڑی کاپیاں اور پنسلیں بھی خرید دیں۔

بچّہ رجب علی کے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ رجب علی نے اُسے کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔

"آپ کون ہیں؟" — بچّے نے حیران ہو کے پُوچھا۔

"میں کوئی بھی ہوں تمہیں اِس کی فکر نہیں کرنا چاہیئے" — رجب علی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا — "آؤ میں تمھارے ماسٹر کے ذرا کان کھینچ آؤں۔ وہ آئندہ تمہیں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کہے گا"۔

بچّہ جھجک رہا تھا۔ اُس کے ساتھ چلنے سے گریز کر رہا تھا۔

"آؤ نا بیٹا!" — رجب علی نے اُس کا بازو پکڑا — "ڈر کیوں رہے ہو؟"

"مجھ سے امّی پوچھیں گی کہ یہ کتابیں، کاپیاں اور پنسلیں کہاں سے لاتے ہو تو میں کیا جواب دوں گا؟" — بچّے نے کہا — "آپ مجھے بتا دیں نا آپ کون ہیں!.... آپ میرے ابّا جان کے دوست ہیں؟.... آپ نے مجھے کتابیں اور کاپیاں کیوں لے دی ہیں؟"

"اس لیے کہ تم ہونہار طالب علم ہو" — رجب علی نے کہا — "اور تم صرف اس لیے کلاس سے نکال دیئے گئے ہو کہ تمھاری امّی تمھارے لیے کتابیں اور کاپیاں نہیں خرید سکتی"۔

"میرے ابّا جان کہا کرتے تھے کہ کسی کا سہارا نہیں لینا چاہیئے" — بچّے نے کہا — "امّی بھی مجھے یہی کہا کرتی ہیں کہ تمھارے ابّا جان خود دار اور دیانتدار تھے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے نہ کسی کے آگے سر جھکاتے تھے۔ امّی نے مجھے بتایا ہے کہ میرے ابّا جان نے پولیس کے آگے بھی سر نہیں جُھکایا تھا، اور وہ....." بچہ چُپ ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پھر کیا ہُوا تھا؟" — رجب علی نے پوچھا۔

"نہیں بتاؤں گا" — بچے نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "پھر آپ بھی مجھے غدّار اور ڈاکو کا بچّہ کہیں گے"۔

"نہ بتاؤ بیٹا!" — رجب علی نے پیار سے کہا — "یہ بتاؤ کہ انہوں نے پولیس کے آگے سر نہیں جُھکایا تھا تو انہیں پولیس سے نکال دیا گیا تھا؟"

"پولیس نے انھیں جان سے ہی مار دیا تھا" — بچے کے منہ سے نِکل گیا۔

"وہ پولیس میں تھے؟"

"انسپکٹر تھے" — بچّے نے جواب دیا — "ریٹائر ہو گئے تھے"۔

"کیا نام تھا اُن کا؟"

"عبدالجلیل خان"۔

رجب علی کے سر میں بڑی زور کا دھماکا ہُوا۔ اُسے چکر آ گیا۔ وہ لرز گیا۔ اُس نے بچّے کو بازو سے پکڑا اور اُسے

تقریباً گھسیٹتا اور اپنے ساتھ دوڑاتا لے گیا۔ اُس کے اس انداز میں اور چلنے کی رفتار میں غصّہ تھا۔ بچہ گھبرا گیا۔

✪

رجب علی سکول کے گیٹ میں داخل ہُوا اور پھر سکول کے ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں چلا گیا۔ رجب علی دراز قد، خوش وضع اور خوش شکل آدمی تھا۔ اُسے دیکھ کر ہیڈ ماسٹر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ رجب علی سے ہاتھ مِلا کر اُسے بیٹھنے کو کہا۔

"کیا آپ کے ماسٹر جاہل اور گنوار ہیں؟" — رجب علی نے ہیڈ ماسٹر سے کہا — "اس بچے کا ماسٹر اسے غدّار اور ڈاکو کا بچہ کہتا رہتا ہے اور آج اُس نے اسے کلاس سے نکال دیا ہے"۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا" — ہیڈ ماسٹر نے کہا — "بچوں کے والد آتے ہی رہتے ہیں۔ آپ پہلی بار آئے ہیں"۔

"میرا کوئی بچّہ اس سرائے میں نہیں پڑھتا" — رجب علی نے کہا — "یہ بچّہ میرا ہوتا تو میں اُسے تھرڈ کلاس کے اِس ویٹنگ روم میں داخل نہ کراتا.... میں اپنا تعارف نہیں کراؤں گا.... اس کا باپ عبدالجلیل خان مرحوم میرا دوست تھا۔ اس بچے کے ماسٹر کو بلائیں"۔

بچے نے اپنی کلاس بتائی اور اس ماسٹر کا نام بتایا۔ ہیڈ ماسٹر نے ماسٹر کو بلوا لیا۔ مریل اور مُرجھائے ہُوئے چہرے والا دبلا پتلا سا ماسٹر ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں داخل ہُوا تو وہ غلاموں کی طرح جھک گیا۔

"تم ہو ماسٹر اس کے؟" — رجب علی نے کہا — "میں نے اسے کتابیں لے دی ہیں۔ اگر آج کے بعد اسے غدّار کا بچہ اور ڈاکو کا بچہ کہا تو نہ صرف تمھارے لیے بلکہ تمھارے پُورے خاندان کے لیے بہت بُرا ہو گا.... ہیڈ ماسٹر صاحب! میں اس بدتمیزی کی معافی چاہتا ہُوں"۔

ہیڈ ماسٹر نے اس ماسٹر سے کہا — "کچھ شرم آتی ہے آپ کو قریشی صاحب؟"

"سر!" — ماسٹر نے کہا — "یہ اُس انسپکٹر عبدالجلیل کا بیٹا ہے جو پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ کئی مہینے گزر گئے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا۔ اخباروں میں خبریں آئی تھیں...."

"وہ سب بکواس تھا، جھوٹ تھا" — ملک رجب علی نے گرج کر کہا اور ہیڈ ماسٹر سے مخاطب ہو کر بولا — "میرا تعلق پولیس کے ساتھ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس بچے کا باپ نہ غدار تھا نہ ڈاکو۔ میں آپ کو پوری بات نہیں سنا سکتا۔ وہ ایک ڈرامہ تھا۔ عبدالجلیل خان غداروں کا دشمن تھا لیکن جو ملک غدّاروں کے ہاتھ آ جاتے اُس کے محبّ وطن باشندے غدّار کہلاتے ہیں۔ اس بچّے کا باپ ایسا ہی غدّار تھا جس نے پاکستان کی آن اور سلامتی پر جان قربان کی ہے.... میری پوزیشن ایسی ہے کہ میں آپ کو یہ ڈرامہ اور اس واقعہ کی اصلیّت سنا نہیں سکتا" — اُس نے ایک بار پھر بچے کے ماسٹر کی طرف دیکھا اور اُسے کہا — "سن لیا تم نے بھی؟ اس کا باپ پولیس مقابلے میں نہیں مارا گیا تھا۔ اگر پولیس کے کسی آفیسر کو پتہ چل گیا کہ تم اس بچے کے باپ کو غدار اور ڈاکو کہہ رہے ہو تو رگڑے جاؤ گے۔ دانے کی طرح پس جاؤ گے" — اس نے پوچھا — "تمھاری کلاس کی فیسیں کون لیا کرتا ہے؟"

"میں ہی لیا کرتا ہوں" — ماسٹر نے ڈر سے کانپتے ہوئے کہا۔

"آئندہ اس سے فیس نہ لینا" — رجب علی نے کہا — "اس کی فیس میں خود آ کر دیا کروں گا۔ میں پہلی کو آؤں دس کو آؤں، کسی بھی تاریخ کو آ کر فیس دے جایا کروں گا۔ اس بچے کو کلاس میں لے جاؤ"۔

عبدالجلیل خان کا تیرہ چودہ سال کی عمر کا یہ بچّہ جس کا نام اصغر جلیل خان تھا، حیران و پریشان اپنے خوفزدہ

اور نادم ماسٹر کے ساتھ کلاس روم میں چلا گیا۔ ہیڈ ماسٹر رجب علی کی بارُعب اور دلکش شخصیت اور اُس کی باتوں سے بہت متاثر ہو چکا تھا۔ رجب علی نے کہا تھا کہ اس کا تعلق پولیس کے ساتھ ہے۔ ہیڈ ماسٹر کو خیال آیا کہ یہ شخص انسپکٹر نہیں ہو سکتا۔ ایس۔ پی یا ڈی۔ ایس۔ پی ہو گا۔

رجب علی ہیڈ ماسٹر سے ہاتھ ملا کر چلا گیا تو ہیڈ ماسٹر نے اصغر کے ماسٹر کو پھر دفتر میں بلا لیا اور اُسے اور زیادہ ڈانٹا اور ڈرایا دھمکایا۔

✪

"بیٹا! اُس کا نام پوچھ لینا تھا نا!" —— اصغر سے اُس کی ماں نے کہا۔

"اُس نے ہیڈ ماسٹر کو بھی اپنا نام نہیں بتایا تھا" —— اصغر نے اکتاتے ہُوئے سے لہجے میں کہا —— "میں آپ کو ساری بات سُنا چکا ہُوں۔ میں اُس سے زبردستی تو نام نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اُس نے ہیڈ ماسٹر کو اتنا ہی بتایا تھا کہ میرا تعلق پولیس کے ساتھ ہے۔"

اُس کی ماں سوچ میں پڑ گئی اور اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں بولی —— "کون ہو سکتا ہے؟ اتنے مہینے گزر گئے ہیں۔ آج اُن کا کون سا دوست جاگ اٹھا ہے .... ہو سکتا ہے کسی اور جگہ سے کوئی تبدیل ہو کر آیا ہو .... کوئی ایسا ویسا ہی نہ ہو۔ کوئی جرائم پیشہ نہ ہو۔ میرے بچے کو اُڑا کے ہی نہ لے جاتے۔ اتنے بڑے بچے کو وہ اٹھا کے تو نہیں لے جا سکتا۔ اسے پیار اور پیسے کا جھانسہ دے کر ورغلا لے جاتے گا .... لیکن اصغر کہتا ہے کہ وہ خوبصورت آدمی ہے۔ افسر معلوم ہوتا ہے .... پولیس کا افسر ہو گا؟ .... پولیس کا کوئی افسر میرے بچے کے باپ کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا .... اُس نے میرے بچے کی فیس اپنے ذمے لے لی ہے .... اوہ .... ارشد ہو گا .... نہیں ارشد نہیں ہو سکتا۔ اُس نے اتنے مہینوں سے شکل ہی نہیں دکھائی۔ فاتحہ کے لیے بھی نہیں آیا .... اُس نے بھی جلیل کو ہندوستان کا جاسوس، ڈاکو اور قاتل مان لیا ہو گا" —— اُس نے بڑی لمبی اور جلتی ہُوئی آہ بھری —— "یہ انجام ہونا تھا؟ .... کہاں ہے خدا .... میرا خدا کہاں ہے؟ ... ارشد کہاں ہے؟ طاہرہ کہاں ہے؟ .... کوئی بھی نہیں رہا؟ .... ہمارا کوئی بھی نہیں رہا۔"

جیسی کشش اور جاذبیّت خدا نے عبدالجلیل خان کے قد بُت اور چہرے مُہرے کو دی تھی ایسی ہی جسمانی ساخت اور جاذبیّت اُس کی بیوہ سلمٰی کو عطا ہوئی تھی۔ یہ حُسن روحوں کا پرتو تھا۔ اس میں ایمان کی رونق تھی۔ اُس نے بھی جلال آباد میں طاہرہ کے ساتھ جلوسوں کی قیادت کی اور تحریکِ پاکستان کی سرگرم مجاہدہ رہی تھی۔ عبدالجلیل خان کے ساتھ شادی ہُوئے پانچ چھ سال ہو گئے اور اُس کا یہ بچّہ اصغر ابھی چند مہینوں کا تھا۔ وہ اصغر کو اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر تحریکِ پاکستان کے ہر کام میں شامل ہوتی تھی۔

اب اُس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا —— ماں نہ رہی، باپ نہ رہا، کوئی بھی اپنا نہ رہا۔ خاوند اس طرح مارا گیا۔ اصغر کے بعد دو بچیاں پیدا ہوئیں۔ دونوں زندہ نہ رہیں۔ عبدالجلیل کا ایک بھائی تھا۔ پاکستان میں دونوں بھائیوں کو زمین اور مکان کی الاٹمنٹ ہوئی مگر بھائی نے ایسا ہاتھ پھیرا کہ ساری زمین کا مالک بن بیٹھا۔ اس کی بیوی اچھی عورت نہیں تھی۔ عبدالجلیل نے پولیس میں ہوتے ہوئے اپنے بھائی کے خلاف کچھ نہ کیا۔ سلمٰی سے کہا کہ بھائی کو زمین پیاری ہے تو لے لینے دو۔

دو بھائیوں کو زمین اور ایک عورت نے جُدا کر دیا۔ جدا بھی ایسا کیا کہ عبدالجلیل کی وفات پر نہ بھائی آیا نہ اُس کی بیوی۔ سلمٰی بے آسرا رہ گئی۔ جاننے والوں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے خاوند کے بھائی کے پاس جائے اور اُسے کہے کہ وہ بیوہ اور بے سہارا ہو گئی ہے، کچھ زمین ہی دے دے لیکن سلمٰی نے کہا کہ میرے خاوند کی رُوح کو تکلیف ہو گی۔

سلمٰی نے خودداری اور وقار کو یوں قائم رکھا کہ اڑوس پڑوس کے کپڑے سیتی اور سویٹریں بناتی تھی مگر اُس کے خاوند کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ ہندوستان کا جاسوس اور جرائم پیشہ تھا۔ اس لیے بعض گھروں سے سلمٰی کو کام نہیں ملتا تھا۔ اس وجہ سے آمدنی بہت کم تھی۔ بچے کے سکول کے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے تھے۔

اب اصغر نے اُسے بتایا کہ ایک اجنبی نے اُسے کتابیں، کاپیاں اور پنسلیں لے دی ہیں اور اُس کی فیس بھی اپنے ذمّے لے لی ہے تو وہ پریشان ہو گئی۔ کئی وہم ذہن میں آتے۔ کئی خدشے محسوس ہوتے مگر اس اجنبی نے اپنا ذرا سا بھی سراغ نہیں دیا تھا۔

"اصغر بیٹا!" —— سلمٰی نے کہا —— "مہینہ ختم ہونے والا ہے۔ وہ جب بھی تمھاری فیس دینے آئے اُس سے اُس کا نام پوچھنا اور گھر کا اتا پتا بھی لے لینا۔"

"اگر اُس نے نہ بتایا تو؟"

"کہنا میری امّی بہت پریشان ہے" —— سلمٰی نے کہا —— "کہہ دینا کہ امّی کہتی تھی کہ وہ کوئی ایسا ویسا آدمی ہو گا تمھیں ورغلا کر اغوا کرے گا۔"

سلمٰی خیالوں میں کھو گئی۔ اُسے اپنے خاوند کی موت کی خبر یاد آنے لگی۔ خبر کے الفاظ اُسے زبانی یاد ہو گئے تھے، اور "پولیس مقابلے" کا جسے ہیرو بنایا گیا، اُس کے نام کو تو وہ ساری عمر نہیں بھول سکتی تھی —— "رجب علی ڈی۔ ایس۔ پی ... ملک رجب علی۔"

"قاتل .... میرے مجاہد خاوند کا قاتل" —— اُس نے اپنے آپ سے کہا —— "اگر میں مرد ہوتی تو اس شخص کو ڈھونڈ کر جلیل کا بدلہ لیتی .... اللہ تو ہے .... اللہ تو ہے۔"

سلمٰی کو اپنے بچّے اصغر کے متعلّق خطرہ یہی تھا کہ اُسے اغوا کر لیا جائے گا۔ عبدالجلیل خان کی موت اُس کے دِل پر دہشت بن کر چھا گئی تھی۔ موت تو ہوتی ہی دہشت ناک ہے لیکن عبدالجلیل خان کی موت کچھ اور تھی۔ اُس کی موت کی جو خبر اخباروں میں شائع کرائی گئی تھی وہ زہریلی ناگن کی طرح سلمٰی کے وجُود پر لپیٹ گئی اور اُسے ڈنک مارتی رہتی تھی۔ عبدالجلیل خان کو اچھی طرح جاننے والوں نے بھی اس خبر کو سچ مان لیا تھا کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ سلمٰی کو ذرا سا بھی شُبہ نہیں ہُوا تھا کہ اُس کا خاوند، ڈاکوؤں، قاتلوں اور پاکستان کے دشمنوں کے جاسُوسوں والی خفیہ زندگی بھی گزار رہا تھا۔

ایک سانپ اور تھا جو اُس نے ایک ٹرنک میں بند کر رکھا تھا ـــ یہ سو سو روپے کے نوٹوں کی ایک گٹھی تھی جس پر ایک کاغذ چڑھا ہُوا اور اُس پر دھاگہ بندھا ہُوا تھا۔ یہ رقم پُورے پندرہ ہزار روپے تھی ـــ پاکستان کی عمر کے آٹھویں نویں سال پندرہ ہزار روپے آج کے ایک لاکھ کے برابر تھے۔ اس گٹھی کو وہ ہاتھ بھی نہیں لگاتی تھی۔ اس کا اُسے صرف خیال آتا تھا تو اُس کے خون کی گردش تیز ہو جاتی اور اُس کا پسینہ نکل آتا تھا۔

یہ رقم اُسے حکمران پارٹی کی طرف سے ملی تھی۔ مخالف پارٹیوں نے اُس سے اور کالے تانگے والے کی بیوی سے بیان لے کر اپنے اخباروں میں شائع کیے، دونوں کی تصویریں بھی شائع کیں اور لوگوں سے حکومت کے خلاف مظاہرے کراتے تھے۔ ایک رات سلمٰی کے گھر دو آدمی آئے۔ ساتھ ایک تھانیدار تھا۔ اُنہوں نے اُس کے آگے نوٹوں کی یہ گٹھی رکھی، ساتھ ایک کاغذ رکھا جس پر کچھ لکھا ہُوا تھا۔ تھانیدار نے اُسے کہا کہ اس تحریر پر دستخط کر دے اور پندرہ ہزار روپیہ اٹھا لے۔

اُس نے تحریر پڑھی تو ہکلاتی ہُوئی زبان میں بولی ـــ "نہیں۔ لے جاؤ یہ پندرہ ہزار۔ میں اس تحریر پر دستخط نہیں کروں گی۔ میرا خاوند غنڈہ اور قاتل نہیں تھا۔ وہ ہندوؤں کا ایجنٹ نہیں تھا۔"

تھانیدار اور اُس کے ساتھ کے دو آدمی مُسکرا رہے تھے۔ انہیں سلمٰی کے غُصّے اور احتجاج کی ذرا سی بھی پروا نہیں تھی۔

"تمہیں یہ رقم لینی پڑے گی" ـــ تھانیدار نے اُسے ایسی دھیمی آواز میں کہا جس میں عداوت تھی، چیلنج تھا اور دھمکی بھی۔ اُس نے کہا ـــ "اور تمہیں اس کاغذ پر دستخط کرنے پڑیں گے۔ یہ حکم میرا نہیں۔ میں خود حکم کا بندہ ہُوں۔ یہ حکم بڑی دُور اُوپر سے آیا ہے۔ وہ عبدالجلیل خان جیسے کئی آدمیوں کو غائب کر چکے ہیں۔ بہت سے شاہی قلعے کے تہ خانے میں زندہ درگور ہیں۔ کوئی حکمران اپنے مخالف کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنے مخالفوں کو رام کرنے یا انہیں لاپتہ کرنے والوں کا حکم ہے کہ تم اس تحریر پر دستخط کر دو۔ اگر تم یہ حکم نہیں مانو گی تو تمہارا بیٹا لاپتہ کر دیا جائیگا۔"

سلمٰی پاکستان کی بیٹی تھی۔ وہ پاکستان بنانے والے کی بیوہ تھی۔ پاکستان کے نام پر قربان ہونے والوں کا نام وہ بڑے احترام سے لیا کرتی تھی مگر وہ ماں تھی، اکلوتے اور یتیم بچے کی ماں۔ اس دھمکی نے کہ اُس کے بچے کو لاپتہ کر دیا جائے گا، اُس کی جسمانی اور رُوحانی قوتیں سلب کر لیں۔ وہ تڑپ کر اُٹھی اور دوسرے کمرے میں جا کر اُس نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا، پھر اُسے کمرے میں بٹھا کر دروازہ بند کیا اور باہر سے چٹخنی چڑھا دی۔ وہ تیز قدم چلتی اُس کمرے میں گئی جہاں تھانیدار بیٹھا تھا۔ تھانیدار نے اپنا پین نکال رکھا تھا۔ سلمٰی نے پین اٹھایا اور اس تحریر پر جہاں تھانیدار نے کہا وہاں دستخط کر دیئے۔

"یہ رقم اُٹھا لو" ـــ تھانیدار نے کہا ـــ "اور زبان بند رکھنا۔ پاکستان میں ابھی وہ قانون نافذ نہیں ہُوا جس کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا۔ یہاں اُس کا قانون چلتا ہے جس کی حکومت ہوتی ہے۔"

تھانیدار اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کمرے سے نکل رہا تھا تو سلمٰی نے لپک کر اُس کا بازو پکڑ لیا اور روتے ہُوئے التجا کی ـــ "اب میرا بچّہ محفوظ رہے گا؟"

"اب تمہارا بچّہ بھی محفوظ ہے اور تم بھی محفوظ ہو" ـــ تھانیدار نے اپنائیت کے لہجے میں کہا ـــ "یہ بھی خیال رکھو کہ تم خوبصورت عورت ہو۔ ان سیاسی چکّر بازیوں سے بچو۔ اگر دوسری پارٹیوں کے آدمی تمہیں آ کے پریشان کریں تو مجھے اطلاع دینا۔ میں تمہیں اپنا اتا پتا بتا دیتا ہُوں" ـــ اُس نے سلمٰی کو بتایا کہ وہ اُسے کہاں مِل سکتا ہے۔ اُس نے کہا ـــ "پندرہ ہزار معمُولی رقم نہیں۔ میں ایک بار پھر کہتا ہُوں، زبان بند رکھنا۔"

✪

سلمٰی نے زبان بند رکھی اور اُس نے نوٹوں کی گٹھی اٹھا کر ٹرنک میں بند کر دی تھی۔ اس رقم کو اُس نے اپنے لیے اور اپنے تیرہ چودہ سالہ بچّے کے لیے حرام قرار دے دیا تھا۔ اُس رات وہ بہت روئی تھی۔ حکومت نے اُس کے سہاگ کی قیمت پندرہ ہزار دی تھی اور اس میں اُس کے دستخط کی قیمت بھی شامل تھی جو اُس سے اس تحریر پر کروائے گئے تھے کہ اُس کے خاوند کا میل ملاپ جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ تھا اور گھر میں اُسے مشکوک لوگ ملنے آتے تھے۔ اس تحریر میں یہ بھی تھا کہ سلمٰی کا اخباروں میں جو بیان شائع ہُوا تھا وہ اُس سے دو تین غنڈوں نے اس طرح لکھوایا تھا کہ ایک کے ہاتھ میں ریوالور اور دو کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔

سلمٰی ٹرنک میں رکھی ہُوئی اس رقم سے اس طرح ڈرتی تھی جیسے زہریلا سانپ ہو۔ ٹرنک کھولا تو ڈس لے گا۔ اُس کے بیٹے کو ماسٹر نے اس لیے کلاس سے نکال دیا تھا کہ اُس کے پاس دو کتابیں نہیں تھیں اور اُس نے فیس بھی وقت پر نہیں دی تھی۔

اب اُسے بیٹے نے بتایا کہ ایک آدمی نے اُسے کتابیں، کاپیاں اور پنسلیں خرید دی ہیں اور اُس کی فیس بھی اُس آدمی نے اپنے ذمّے لے لی ہے تو سلمٰی کو پہلا خطرہ یہ نظر آیا کہ تھانیدار کہہ گیا تھا کہ اُس کے بچّے کو اغوا کر لیا جائے گا۔ سلمٰی نے اپنے آپ کو تسلّی دی کہ تین چار مہینے گزر گئے ہیں۔ اگر اصغر کو کسی نے اغوا کرنا ہوتا تو کبھی کا کر چکا ہوتا۔ اس کے علاوہ اُس نے تھانیدار کے کہنے پر دستخط بھی کر دیئے تھے اور اُس نے زبان بھی بند رکھی تھی مگر اُس کا دل خوف سے آزاد نہ ہو سکا۔ وہ اصغر کو سکول سے ہٹانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ بچہ سکول جاتا تھا تو وہ اُس کی واپسی تک پریشان رہتی تھی۔

تین مہینے گزر گئے۔

اصغر نے ماں کو بتایا کہ اُس نے ماسٹر کو فیس دی تو ماسٹر نے کہا کہ اُس کی فیس آ گئی ہے۔ ملک رجب علی ان تین چار مہینوں میں چار پانچ بار سکول میں اصغر سے ملا اور اُس سے پوچھا کہ اُسے کسی کتاب یا کاپی کی ضرورت تو نہیں؟ اُس نے ہر ملاقات میں اصغر کی جیب میں زبردستی تیس چالیس روپے ڈال دیئے۔ ہر بار اصغر نے

اُسے کہا کہ اُس کی امّی بہت پریشان ہے کہ وہ کون ہے جو اُس کے بیٹے پر اتنا مہربان ہے۔ اصغر نے کئی بار رجب علی سے پوچھا کہ وہ اپنا نام اور گھر بتائے لیکن رجب علی نے پیار سے اُسے ٹال دیا۔

ایک روز رجب علی اصغر کے سکول گیا تو ہیڈ ماسٹر نے اُسے بلا لیا۔

"آپ جس بچے کی فیس دیا کرتے ہیں اُس کی ماں میرے پاس آئی تھی"—— ہیڈ ماسٹر نے کہا—"میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ اُسے معلوم ہی نہیں کہ اُس کے بچے کی تعلیم کے اخراجات کون دے رہا ہے۔"

"اور یہ ضروری بھی نہیں کہ اُسے معلوم ہو"—— رجب علی نے کہا—"میری دلچسپی اس بچے کے ساتھ ہے اس کی ماں کے ساتھ نہیں بلکہ میری دلچسپی ہر اُس بچے کے ساتھ ہے جسے ماں باپ اس لیے نہیں پڑھا سکتے کہ ان کے پاس پیسے نہیں۔"

"لیکن یہاں مسئلہ کچھ اور ہے"—— ہیڈ ماسٹر نے کہا—"یہ بچّہ اُس کا اکلوتا بچہ ہے اور اُسے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس کے بچے کو کوئی ورغلا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ بچہ خوبصورت ہے۔ میں نے تسلّی دی ہے بلکہ زبانی ضمانت بھی دی ہے کہ جو صاحب بچے کی فیس اور دیگر اخراجات دے رہے ہیں، وہ معزّز شخصیّت ہیں مگر اس خاتون کو کوئی دھمکی دے گیا تھا کہ اس کے بچے کو اغوا کر لیا جائے گا۔ وہ بات پانچ چھ مہینے پرانی ہو گئی ہے لیکن وہ ماں ہے۔ اُس کے ساتھ بہت بڑا حادثہ ہُوا ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہو گا۔ یہ خاتون ذہنی طور پر نارمل نہیں رہی.... آپ اُسے مِل ہی کیوں نہیں لیتے۔ میں آپ کو اچھی طرح بتا نہیں سکتا کہ وہ کتنی پریشان ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ آدمی مجھے نہ مِلا تو میں اپنے بچے کو سکول سے اٹھا لوں گی۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہونے دوں گا"—— رجب علی نے تڑپ کر کہا—"بچّہ اسی سکول میں رہے گا۔ میں اس کی ماں سے مِلوں گا۔"

"مِل ہی لینا چاہیئے"—— ہیڈ ماسٹر نے کہا—"اس میں حرج ہی کیا ہے!"

"اس خاتون کی طرح میں بھی نارمل نہیں ہوں چوہدری صاحب!"—— رجب علی نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا—"میں اس بچے کی مدد اپنی روح کی تسکین کے لیے کر رہا ہوں۔ اگر میرا ڈاکٹر مجھے یہ راستہ نہ دکھاتا تو بخدا میں پاگل ہو چکا ہوتا"—— وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھا۔ ہیڈ ماسٹر سے ہاتھ ملایا اور یہ کہتا ہُوا باہر نکل گیا—— "میں اُسے مِلوں گا۔ اُس کے گھر چلا جاؤں گا۔"

✪

وہ عبدالجلیل خان کا گھر جانتا تھا۔ چھ مہینوں میں وہ عبدالجلیل کی گلی اور مکان کو نہیں بھُولا تھا۔ اس مکان کی تلاشی لینے وہ پولیس پارٹی کے ساتھ گیا تھا لیکن اندر نہیں گیا، باہر اور ذرا دُور کھڑا رہا تھا۔ تلاشی ایک سب انسپکٹر، دو ہیڈ کانسٹیبلوں اور دو کانسٹیبلوں نے لی تھی۔ یہ تلاشی نہیں تھی بلکہ اندر کچھ اسلحہ رکھنا تھا اور پھر یہ برآمد کرنا تھا۔ پولیس اپنے دو آدمی ساتھ لے گئی تھی جنہیں برآمدگی کے مشیر نامے پر دستخط کرنے تھے۔ رجب علی ذرا دُور کھڑا رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ اُس نے عبدالجلیل کے بیٹے اصغر اور اُس کی بیوی سلمٰی کو نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے صِرف مکان دیکھا تھا۔

اب چھ مہینوں بعد وہ پھر اُسی گلی میں داخل ہُوا۔ وقت رات کا ہی تھا۔ نو بج رہے تھے۔ گلی میں ایک بلب روشن تھا۔ رجب علی بڑی جرأت والا پولیس آفیسر ہُوا کرتا تھا مگر اپنے مقتول کی گلی میں داخل ہُوا تو اُس نے محسوس کیا جیسے وہ ڈر رہا ہے اور اُس کی جرأت گلی کے باہر ہی کہیں رہ گئی ہے۔ روح پر گناہ کا بوجھ آ پڑا لیکن وہ کچھ سوچنے کی بجائے تیز چل پڑا اور عبدالجلیل خان کے دروازے پر دستک دی۔

سلمٰی کسی کے کپڑے سی رہی تھی۔ اصغر سو گیا تھا۔ سلمٰی کے دروازے پر رات کے اس وقت دستک دینے والا کوئی نہ تھا۔ خُون کا رشتہ تو کوئی تھا نہیں۔ کوئی ہمراز اور ہمدرد سہیلی بھی نہیں تھی۔ جب سے اُس کے خاوند کی "پولیس مقابلے میں" مارے جانے کی خبر چھپی تھی، اُس نے محلّے کی عورتوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ عورتیں اُس کے ہاں آتیں اور ہمدردی کی باتیں کرتی تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ یہی عورتیں اُسے ڈاکو، قاتل اور ہندوؤں کے جاسُوس کی بیوہ کہتی ہیں۔ اُس پر بڑے غلیظ الزام تھوپے گئے تھے۔

رات کی دستک نے اُسے پریشان نہ کیا۔ وہ سمجھی کہ کوئی عورت سلائی کے لیے کپڑے دینے یا لینے آئی ہو گی۔ محلّے کی عورتوں کے ساتھ اُس کا یہی کاروباری سا تعلّق رہ گیا تھا کہ سلائی کے لیے وہ اسے کپڑے دیتی تھیں اور وہ درزیوں کی نسبت کم اُجرت پر سِی دیتی تھی۔

اُس نے کواڑ کھولا تو سُن ہو کے رہ گئی۔ اُس کے سامنے ایک دراز قد، خوش شکل اور امیرانہ لباس میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ دونوں پر کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ رجب علی کی زبان اس لیے بند رہی کہ وہ سلمٰی کے خاوند کا قاتل تھا اور سلمٰی کو اس لیے چپ لگ گئی کہ اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ یہ کون ہے اور کیوں آیا ہے۔ بگولے کی طرح کئی وسوسے اور وہم ایک ہی بار اُس کے ذہن میں گھوم گئے۔ محلّے میں اس قسم کی آواز بھی سرگوشیوں میں گھوم گئی تھی کہ سلمٰی کا خاوند جرائم پیشہ تھا اور سلمٰی درپردہ پیشہ کماتی ہے۔ اب اس آدمی کو اپنے دروازے پر دیکھ کر اُسے خیال آیا کہ یہ آدمی اُسے عصمت فروش سمجھ کے ہی تو نہیں آ گیا؟

"نہیں"—— ایک خیال یہ آیا—"عبدالجلیل کے دشمنوں نے کوئی نئی دھمکی بھیجی ہو گی۔"

"میں ہُوں تمھارے بچے کی فیسیں دینے والا"—— رجب علی نے سکوت توڑا—"آج ہیڈ ماسٹر نے بتایا ہے کہ تم مجھے دیکھ کر تسلی کرنا چاہتی ہو کہ میں بچے کو ورغلا نہیں رہا، اور تم پریشان بھی ہو۔ میں تمھاری تسلی کے لیے آیا ہوں۔ میں اندر نہیں آؤں گا۔ تم اکیلی ہو اور یہ محلّہ ہے۔ یہاں ایک سے ایک گھٹیا آدمی رہتا ہے۔"

"دروازے پر کھڑے رہنا بھی تو مناسب نہیں"—— سلمٰی نے کہا۔ اُس کی دلیری عود کر آئی تھی۔ وہ کسی سے ڈرنے والی عورت نہیں تھی مگر اسے ایسی چوٹ پڑی تھی جس نے اسے بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔ اُس نے کہا—"آپ اندر آ جائیں۔"

انہوں نے جب اندر جا کر سو نمبر کے بلب کی روشنی میں ایک دوسرے کو دیکھا تو دونوں پر ایک بار پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ اس لیے کہ سلمٰی کو توقع نہیں تھی کہ یہ اجنبی جو اُس کا درپردہ محسن بن گیا ہے، اتنا وجیہہ اور پُر اثر شخصیّت والا ہو گا اور رجب علی کو اس دھچکے نے خاموش رکھا کہ سلمٰی خوبصورت عورت تھی اور اس خوبصورتی میں جلال اور وقار کی جھلک بڑی نمایاں تھی۔ اس چہرے پر جو اداسی تھی اس میں بھی حُسن تھا اور ایسا تاثر جیسے یہ عورت سراپا روح ہو۔

سلمٰی فرش پر بچھی ہوئی دری پر سلائی کی مشین کے پاس بیٹھ گئی اور اُس نے رجب علی کو کرسی پر بیٹھنے کو کہا لیکن وہ دری پر بیٹھ گیا۔

"آپ کو ہیڈ ماسٹر نے ٹھیک بتایا ہے کہ میں بہت پریشان ہوں"—— سلمٰی نے ملول سی آواز میں کہا

"میں آپ کی اس بات کو تسلیم نہیں کروں گی کہ آپ اتنے سخی اور اتنے برگزیدہ ہیں کہ کسی کے ساتھ نیکی کر کے اس پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ وہ برگزیدہ لوگ دنیا سے اُٹھ گئے ہیں۔ میں انہیں اُن کہانیوں کے فرضی کردار سمجھا کرتی ہوں جو بچّوں کو سُلانے کے لیے سنائی جاتی ہیں.... آپ کون ہیں؟ اصغر کے ابّا کے دوست ہیں؟"

"ہاں!" — عبدالجلیل نے جیسے آہ بھری ہو۔ کہنے لگا — "جلیل میرا دوست تھا۔"

"میں اُس کے سب دوستوں کو جانتی ہوں" — سلمٰی نے کہا — "آپ کا نام؟"

"میرا نام انور علی ہے" — رجب علی نے جھوٹ بولا — "میں امرتسر کے دیہاتی علاقے کا رہنے والا ہوں۔ ہماری بہت بڑی زمینداری تھی۔ میرے بھائی نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ علاقے کا تھانیدار جلیل تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میرا جوان بھائی پھانسی چڑھ رہا ہے، اسے بچا لو ورنہ میری ماں زندہ نہیں رہ سکے گی۔ گواہ موقعہ کے تھے۔ بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ جلیل نے میرے بھائی کو گرفتار تو کر لیا لیکن گواہوں کو بڑی استادی سے گمراہ کر کے مقدمہ اتنا کمزور بنایا کہ میرا بھائی بری ہو گیا۔ جلیل نے اپنی نوکری خطرے میں ڈال دی تھی۔ اس کا ایمان اتنا پکّا تھا کہ میں نے اسے کچھ رقم پیش کی تو اُس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ نیکی کی قیمت نہیں لی جاتی۔"

"آپ پہلے شخص ہیں جس نے اُن کی موت کے بعد انہیں نیک اور ایماندار کہا ہے" — سلمٰی نے آہ جیسا سانس لے کر کہا — "سب اُنہیں ڈاکو اور قاتل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔"

"لوگوں کو حقیقت بتانے والا کوئی نہیں" — رجب علی نے کہا — "اور کسی کی زبان بند نہیں کی جا سکتی۔ خوشنودی خدا کی چاہیے انسانوں کی نہیں.... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں تمہارے خاوند کو کس طرح جانتا تھا۔ تمہارے بیٹے سے جس طرح ملاقات ہُوئی وہ بیٹے نے تمہیں بتایا ہو گا۔ اسے تو میں جانتا ہی نہیں تھا۔ مجھے ذرا سا بھی شک نہیں تھا کہ یہ بچہ جو سکول میں کلاس سے باہر کھڑا رو رہا ہے جلیل کا بچہ ہے۔ یہ اس بچے نے مجھے بعد میں بتایا تھا۔ اس نے جب بتایا تو میں نے اس کے ماسٹر سے کہا کہ آئندہ اس کی فیس میں دیا کروں گا۔ اس بچے کے باپ نے ہمارے خاندان پر جو احسان کیا تھا وہ میں کیسے بھول سکتا ہُوں۔ میں اس احسان کا بدلہ دینے کی کوشش کر رہا ہُوں۔ تم مجھے روکنے کی نہ سوچو۔ میرے ہاتھ نہ روکو۔ دل سے سب خوف اور وہم نکال دو۔ تمہارا بچہ میری حفاظت میں ہے۔ مجھ سے اپنے بچے کا مستقبل نہ چھینو، ورنہ میری روح مر جائے گی۔"

"آپ کے اپنے بچے بھی ہوں گے!"

"نہیں" — رجب علی نے جواب دیا — "خُدا نے سب کچھ دیا ہے، بچہ نہیں دیا۔ بیوی مر گئی ہے۔ میرے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں سوائے سکون کے۔ تنہا ہُوں۔ تمہارے بچے کے ساتھ یہ ذرا سی نیکی کر کے میں اپنی روح کو سکُون دے رہا ہُوں۔"

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کا گھر دیکھ لوں؟" — سلمٰی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"دکھا دوں گا" — رجب علی نے جواب دیا — "کل چل سکو گی؟.... میں تمہیں گھر آ کر نہیں لے جاؤں گا۔ تمہیں ایک جگہ بتا دیتا ہوں۔ وہاں آ جانا۔ میں تمہیں وہاں سے لے جاؤں گا۔ دِن کے وقت۔ اصغر تمہارے ساتھ ہو گا۔"

✪

اگلے روز جب سلمٰی رجب علی کے ساتھ اُس کی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہُوئی تو حیرت سے اُس کی

آنکھیں کھُل گئیں۔ یہ کوٹھی اُس کے تصور سے زیادہ وسیع و عریض اور عالی شان تھی۔ اس کا لان پُورا ایک باغ تھا جس میں ایک مالی کام کر رہا تھا۔ رجب علی اُسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

"میں دیکھ رہا ہُوں کہ تم اس کوٹھی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی ہو" — رجب علی نے کہا — "یہ میرے والد صاحب نے بنائی تھی۔ ہم مشرقی پنجاب میں بہت سی زمین اور جائیداد چھوڑ آئے تھے۔ اتنی ہمیں یہاں مِل گئی تھی۔ یہ سب اس زمین کی آمدنی سے بنی ہے۔ اس کوٹھی میں بڑی رونق ہُوا کرتی تھی۔ ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے ہیں۔ تمہیں حیران اس پر ہونا چاہیے کہ میں یہاں اکیلا کس طرح رہ رہا ہوں.... اوہ.... میں نے اپنی شروع کر دی ہے۔ تم میرے ساتھ یہ دیکھنے آئی ہو کہ میرا رہن سہن کیسا ہے اور میں بردہ فروش تو نہیں؟.... اچھی طرح دیکھ لو مجھے کسی چیز کی کمی نہیں۔"

سلمٰی جھینپ رہی تھی۔ اس محل میں اس پُراثر شخصیّت والے آدمی کے سامنے بیٹھ کر وہ اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کر رہی تھی۔ رجب علی نے جب کہا کہ اچھی طرح دیکھ لو، مجھے کسی چیز کی کمی نہیں، تو سلمٰی کو یوں لگا جیسے رجب علی نے اُس کی غربت پر طنز کی ہو۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" — سلمٰی نے دبی دبی زبان میں کہا — "اتنی بڑی کوٹھیوں میں رہنے والوں کی ہر بات ٹھیک ہوتی ہے۔ میں اپنی سطح پر سوچ رہی تھی۔ میں ماں ہوں انور علی صاحب! اور میں بیوہ ہُوں۔ آپ نے میرے خاوند جلیل کو ایماندار کہا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ اُسے ایک کمرے میں تفتیش کے دوران اتنا مارا گیا تھا کہ وہ مر گیا اور اخباروں میں خبر دی گئی کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔"

"تمھیں کس نے بتایا ہے کہ اُسے کمرے میں مارا گیا تھا؟"

"جلیل کے کچھ خیر خواہ بھی تھے" — سلمٰی نے جواب دیا — "میں اس کا نام نہیں بتاؤں گی جو وہاں موجود تھا۔ میرے خاوند کو قتل کرنے والا ایک ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی تھا۔ اُس نے جلیل کے پہلو میں اتنی زور سے ٹھڈ مارا تھا کہ اُس کے منہ سے خُون نکلا اور وہ مر گیا۔ اس کی تصدیق دوسرے دن اخباروں سے ہو گئی۔ خبر میں اِسی رجب علی کو پولیس مقابلے کا ہیرو بنایا گیا تھا۔"

رجب علی جس نے سلمٰی کو اپنا نام انور علی بتایا تھا، بے چین ہو گیا۔ بے چینی تیزی سے بڑھتی گئی۔ اتنی بڑھی کہ اُس کے چہرے پر پسینہ پھُوٹ آیا۔ سلمٰی اس کی بدلتی کیفیت کو دیکھے اور سمجھے بغیر بولتی جا رہی تھی۔ غصے اور جذبات کی شدّت سے اُس کے دانت پسنے لگے اور آنسو بہنے لگے۔

"ایک ایسے آدمی کو جو پاکستان کا شیدائی تھا اور جس نے پاکستان کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی، سیاسی عداوت میں قتل کر کے اس ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی کو کتنا انعام مِلا ہو گا؟ کیا وہ اس قسم کی شہنشاہی کوٹھی میں رہتا ہو گا؟ میں ایک پولیس انسپکٹر کی بیوہ ہُوں۔ میں جانتی ہُوں اُسے کیا مِلا ہو گا۔ اُسے ایس۔ پی بنا دیا گیا ہو گا اور اُسے اُوپر والوں کی خوشنودی حاصل ہو گئی ہو گی۔ بدبخت بھول گیا ہے کہ اُس کے اُوپر والوں کے اوپر بھی کوئی ہے اور سُکھی وہی رہتا ہے جسے اُس اوپر والے کی خوشنودی حاصل ہو۔"

"اُس ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی نے استعفیٰ دے دیا تھا" — رجب علی نے کہا — "وہ خود اس صدمے بلکہ اس گناہ کو برداشت نہ کر سکا اور اوپر والوں کی خوشنودی اور ایس۔ پی کے عہدے کو ٹھکرا کر وہ گھر چلا گیا ہے۔"

"آپ اُسے جانتے ہیں؟"

"بہت اچھی طرح۔"

"ایک بار، صرف ایک بار مجھے اُس کے پاس لے چلیں" ــــ سلمیٰ نے کہا۔

"کیا کرو گی اُس کے پاس جا کر؟"

"میں عورت ذات، بے بس اور مجبور، کیا کر سکتی ہوں" ــــ سلمیٰ نے کہا ــــ "اُس کے مُنہ پر تھوک کر واپس آجاؤں گی۔"

"سلمیٰ!" ــــ ملک رجب علی نے دُکھی ہوئی سی آواز میں کہا ــــ "میں تمہیں انتقام کے اِس جذبے سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ ایک بات کہوں گا۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرنا۔ تم اب کسی کے مُنہ پر تھوکو، کسی کا منہ نوچو، جلیل کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ایک ہزار آدمیوں کا خون کر دو، جلیل واپس نہیں آسکتا۔ اب توجہ اپنے بچے پر مرکوز کر دو۔ تم اس طرح کی باتیں اس کے ساتھ بھی کرتی ہوگی۔ اُس کے سامنے روتی بھی ہوگی۔ اِس طرح اُس کی شخصیت بڑی کچی بنے گی۔ اُسے مسکراہٹیں دو۔ اُسے جذبہ دو۔ اُسے پاکستان کا بیٹا بننے دو۔"

"کون سے پاکستان کا بیٹا؟" ــــ سلمیٰ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ پاکستان جس کی خاطر تم، میں اور ہم دونوں جیسے لاکھوں مسلمان بے گھر ہُوئے تھے" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "لاکھوں کٹ گئے تھے جس کی خاطر ہماری ستّر ہزار بیٹیاں اغوا ہُوئیں۔"

"کہاں ہے وہ پاکستان؟" ــــ سلمیٰ نے کہا ــــ "وہ پاکستان ابھی نہیں بنا جس کی خاطر ستّر ہزار بیٹیاں اغوا اور بے آبرو ہُوئی تھیں۔ یہ وہ پاکستان نہیں۔ یہ حکمرانی کے بھوکے لوگوں کا ملک ہے جو جانتے ہی نہیں کہ بیٹی کی آبرو مقدّس ہوتی ہے۔ حکمرانی کے اِن بھوکوں نے پوری قوم کو بھوکا مار دیا ہے۔ ہمیں ابھی وہ پاکستان بنانا ہے۔"

ملک رجب علی سلمیٰ کو معمولی سے ذہن کی عورت سمجھتا تھا لیکن اُس کے بولنے کے انداز اور خیالات میں اُسے ایک جذبہ اور دانش نظر آئی۔ رجب علی کو خیال آیا کہ یہ عورت ظاہری حُسن سے زیادہ حسین ہے۔

"آپ کو معلوم نہیں کہ اس پاکستان میں میرے ساتھ کیا سلوک ہُوا ہے" ــــ سلمیٰ نے کہا ــــ "میرے خاوند کو اس جُرم میں قتل کیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جاسوسوں کے خلاف خفیہ محاذ بنا رہا تھا، پھر مجھے ایک تھانیدار نے آکر پندرہ ہزار روپیہ دیا اور میرے بیٹے کو لاپتہ کر دینے کی دھمکی دے کر ایک ایسی تحریر پر دستخط کرا لیے جس کا ایک ایک لفظ بچھو کی طرح زہریلا تھا" ــــ اُس کے آنسو بہنے لگے۔ دوپٹے سے آنسو پونچھ کر بولی ــــ "کیا میں اپنے بچے کو اس پاکستان کا بیٹا بناؤں جس کے حکمرانوں نے مجھے میرا بچہ اغوا کرنے کی دھمکی دی اور کہا کہ میں زبان بند رکھوں گی تو محفوظ رہوں گی؟"

"عبدالجلیل خان کی بیوی کے خیالات اتنے مایوس کن نہیں ہونے چاہئیں" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "کیا تم بھول گئی ہو کہ اُس نے تھانیداری کی وردی میں پولیس ڈیوٹی پر ایک انگریز لیفٹیننٹ کو غائب کر کے اُسے قتل کر دیا تھا؟"

"میں نہیں بھولی انور علی صاحب!" ــــ سلمیٰ نے کہا ــــ "لیکن خیال آتا ہے کہ میرے خاوند کو اس انگریز لیفٹیننٹ کے قتل کی سزا ملی ہے۔ جلیل نے قتل کیا اور قتل ہو گیا۔"

"سلمیٰ!" ــــ رجب علی نے جھنجھلا کر کہا ــــ "ہوش میں آؤ۔ انہیں کوسو اور بد دعائیں دو جنہوں نے پاکستان پر قبضہ کر لیا ہے اور جو ذاتی اور سیاسی مفاد کے لیے پاکستان کو وہ پاکستان نہیں بننے دے رہے۔ اگر خدانخواستہ

پاکستان پر ہمارے دشمن کا قبضہ ہو جائے تو دشمن کے خلاف لڑو گی یا پاکستان کو بُرا بھلا کہہ کر اس سے دست بردار ہو جاؤ گی؟.... ہم اپنے پاکستان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ یہ شہیدوں کی سرزمین ہے۔ یہ پانی پت سے پاکستان تک کے شہیدوں کی سرزمین ہے۔ یہ اُن شہیدوں کا پاکستان ہے جو ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں شہید ہُوئے۔"

سلمیٰ گُم صُم ہو گئی۔

"میں جانتی ہوں" ــــ سلمیٰ نے کہا پھر جھنجھلا کر بولی ــــ "میں بھٹک گئی ہوں انور علی صاحب! کبھی تو ایسے لگتا ہے جیسے میرے خاوند کو نہیں میرے جذبے کو قتل کر دیا گیا ہے، جیسے میرے نظریے پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں.... مجھے ایسے خلاء میں دھکیل دیا گیا ہے جہاں میرا دماغ بھی ایک خلاء بن گیا ہے" ــــ وہ بے قابو ہو کے رو پڑی ــــ "میرا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہیں۔ میں تو پاکستان کو دشمنوں سے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کرنے کا عزم دل میں لیے ہُوئے تھی مگر اپنے بچے کو بچانا مشکل ہو رہا ہے۔"

"اپنے بچے کو محفوظ سمجھو" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "وہ میرا بچہ ہے۔ خُدا کے لیے مجھ پر بھروسہ کرو۔ اگر اسے ورغلانا ہوتا تو کیا میں ان تین مہینوں میں اسے غائب نہیں کر سکتا تھا؟" ــــ رجب علی کو جیسے اچانک کچھ یاد آگیا ہو۔ اُس نے سلمیٰ سے پوچھا ــــ "تمہیں پندرہ ہزار روپیہ دیا گیا تھا۔ اتنی رقم کہاں گئی؟ اتنی جلدی ختم ہو گئی ہے کہ تم نے بچے کو دو کتابیں بھی نہیں لے کر دیں؟"

"اس رقم کو میں نے ٹرنک میں پھینک دیا تھا" ــــ سلمیٰ نے کہا ــــ "پھر اسے نہیں دیکھا۔ یہ رقم مجھ پر حرام ہے۔ یہ میرے سہاگ، میرے ایمان، میرے جذبے اور میرے بچے کی قیمت ہے جو مجھے دی گئی ہے۔ میں نے یہ اس لیے لے لی تھی کہ انہوں نے کہا تھا کہ نہیں لوگی اور اس تحریر پر دستخط نہیں کرو گی تو تمہارا بچہ غائب کر دیا جائے گا.... میں اپنے بچے کے ساتھ بھوکی مر جاؤں گی۔ بچے کو اَن پڑھ رکھوں گی لیکن اس رقم سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گی۔ میرے گھر چل کے دیکھ لیں۔ رقم وہیں رکھی ہے۔ میں نے گنی بھی نہیں۔"

ملک رجب علی نے لپک کر بے ساختہ سلمیٰ کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسی بے ساختگی سے اُس کا ہاتھ پہلے اپنی ایک آنکھ پر پھر دوسری آنکھ پر رکھا۔ سلمیٰ نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھڑایا نہیں۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کا ہاتھ بھیگ گیا تھا۔ یہ رجب علی کے آنسو تھے۔ اُس نے سلمیٰ کا ہاتھ چھوڑ کر رومال اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

رجب علی نے رومال سے اور سلمیٰ نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتے رہے۔ رجب علی کی بڑی لمبی آہ نکل گئی۔

"میں جاؤں؟" ــــ سلمیٰ نے یوں کہا جیسے سسکی لی ہو۔

"کیا میں مطمئن ہو جاؤں کہ تمہیں مجھ پر اعتبار آگیا ہے؟" ــــ رجب علی نے پوچھا۔

سلمیٰ نے یوں سر ہلایا جیسے ہاں بھی کہی ہو اور نہ بھی، یا جیسے وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی ہو۔

"اب تو یہ ہے سلمیٰ! تم مجھے سہارا دو، میں تمہارا سہارا بنوں۔ ہم سب پاکستانی ایک دوسرے کا خیال رکھیں" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "پاکستان اللہ کی سرزمین ہے۔ اسے اللہ بچائے گا۔"

سلمیٰ وہاں سے ایسا تاثر لے کر نکلی جس میں اطمینان اور سکون تھا لیکن وسوسے بھی دل میں موجود رہے۔

✪

چند دنوں بعد ارشد اور طاہرہ غیر متوقع طور پر سلمٰی کے گھر آ گئے۔ ارشد کو رجب علی نے عبدالجلیل کے گھر جانے سے منع کیا تھا۔ اُس بات اور اُس واقعہ کو چھ مہینے گزر گئے تھے۔ ان چھ مہینوں میں لوگ اور ان کے لیڈر عبدالجلیل کو بھول چکے تھے۔ اس عرصے میں کئی عبدالجلیل اقتدار کی سیاست کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ کئی سیکورٹی ایکیٹ میں گرفتار ہُوتے اور جیلوں میں پھینک دیئے گئے تھے۔ چھ مہینے پہلے والی وزارت بھی بدل چکی تھی۔

ارشد اور طاہرہ کو دیکھ کر سلمٰی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بہت دیر تک طاہرہ کے گلے لگ کر روتی رہی۔ طاہر پرویز بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کی عمر آٹھ سال ہو چکی تھی۔ اصغر گھر تھا۔ وہ اور طاہر پرویز آپس میں گھل مل گئے اور کھیل کود میں لگ گئے۔

خاوند کی وفات کے بعد سلمٰی کو پہلی بار دو انسان ملے جن کے ساتھ وہ دل کی ہر بات کر سکتی تھی اور جنہیں وہ دل کے چھالے دکھا سکتی تھی۔ اُس نے سینے میں ․کی ہُوئی ہر بات ارشد اور طاہرہ سے کی، پھر باتیں نہیں سرحد پار لے گئیں۔ باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔

یہ تینوں کوئی نئی بات نہیں کر رہے تھے۔ سیاست جو یہاں رائج ہو چکی اور جڑ پکڑ چکی تھی اس نے عوام کو اُس سطح تک پہنچا دیا تھا کہ جہاں دو چار آدمی جمع ہوتے یہی باتیں کرتے اور حکمرانوں کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ مہنگائی اور جرائم کے روز افزوں اضافے پر کڑھتے اور ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے تھے۔ بعض لوگ لیڈروں کی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ بحث ہوتی اور بحث لڑائی جھگڑے کی صورت بھی اختیار کر جاتی تھی۔ عوام دھڑوں میں تقسیم ہوتے جا رہے تھے۔

ارشد، طاہرہ اور سلمٰی دلوں کا غبار نکال چکے تو سلمٰی نے کہا کہ انور علی نام کا ایک آدمی اُس کے بیٹے کی فیس ادا کرتا ہے اور اسے پیسے بھی دیتا ہے۔ اُس نے ساری بات سُنا دی اور یہ بھی سنایا کہ انور علی اُس کے گھر آیا اور وہ انور علی کے گھر گئی تھی۔

"اس شخص کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر میرے سارے وہم دور ہو گئے تھے" — سلمٰی نے کہا — "لیکن وہم پھر پریشان کرنے لگتے ہیں.... ارشد! تم عقل والے ہو۔ مرد کو مرد ہی سمجھ سکتا ہے۔ میں تمہیں اُس کی کوٹھی کا اتا پتا بتاتی ہُوں۔ کیا تم اُسے مِل کر بتا سکو گے کہ یہ شخص اپنی باتوں جیسا ہی مخلص ہے یا کیسا ہے؟"

"اگر آپ نہ کہتیں پھر بھی میں اس شخص کے متعلق چھان بین کرتا" — ارشد نے کہا — "بچے کا معاملہ ہے اور زمانہ اتنا بدل گیا ہے کہ بھیڑیوں نے بھیڑوں کی کھالیں اوڑھ لی ہیں۔ اب کسی کا چہرہ دیکھ کر کہنا کہ یہ معزّز آدمی ہے بہت بڑی غلطی ہے۔ میں دیکھنے جاؤں گا کہ وہ کون ہے اور اُس کی نیّت کیا ہے۔"

سلمٰی نے اُسے کوٹھی کا ایڈریس بتا دیا۔

✪

کوٹھی کی تلاش مشکل نہیں تھی۔ ارشد نے بڑی جلدی ․․․ ڈھونڈ نکالی اور وہ سڑک پر رُک گیا۔ اتنی بڑی اور اتنی عالیشان کوٹھی اُس کے دل میں شک پیدا کرنے لگی۔ اُس نے سوچا کہ یہ ہندوستان کے کسی مہاراجے کی کوٹھی ہے۔ اس میں رہنے والے سب کچھ ہو سکتے ہیں، کسی غریب آدمی کے ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ اسے خیال آیا کہ اصغر تیرہ چودہ سال کی عمر کا خوبصورت لڑکا ہے۔

کوٹھی کے قریب سے دو آدمی ٹہلتے گزر رہے تھے۔ ارشد ان کے قریب چلا گیا اور ان سے پوچھا کہ یہ کوٹھی کس کی ہے۔

"امرتسر کے علاقے کے ملک اللہ یار خان ہُوا کرتے تھے" — اُسے جواب مِلا — "وہاں بھی بہت بڑے زمیندار تھے، یہاں بھی زمین الاٹ ہو گئی۔ بڑے نیک انسان تھے۔ تھوڑا عرصہ ہُوا فوت ہو گئے ہیں۔"

ارشد ان کے ساتھ چل پڑا اور ویسے ہی باتیں کرنے کے انداز سے اسی کوٹھی کی باتیں پوچھتا گیا۔

"اب ان کا بیٹا یہاں رہتا ہے" — ان آدمیوں نے ارشد کو بتایا — "وہ بھی غریب پرور ہے۔ پولیس میں ڈی۔ ایس۔ پی تھا۔ کہتے ہیں اس نے خود نوکری چھوڑ دی ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ تو معلوم نہیں.... نیک آدمی پولیس میں کہاں رہ سکتا ہے۔"

"نام کیا ہے اس کا؟"

"ملک رجب علی خان!" — ارشد کو جواب مِلا — "بڑا خوبصورت جوان ہے۔ اس کے نوکر بتاتے ہیں کہ جب سے اس نے نوکری چھوڑی ہے یہ بالکل بدل گیا ہے۔ غریبوں کی مالی مدد کرتا ہے اور نوکروں کے بچوں کو اپنے خرچ پر پڑھا رہا ہے۔"

ارشد کے قدم رک گئے اور وہ دو آدمی آگے نکل گئے۔ ارشد ملک رجب علی ڈی۔ ایس۔ پی کا نام سُن حیران و ششدر رہ گیا۔ اُسے خیال آیا کہ قاتل اپنے مقتول کی بیوہ کی مدد کر کے شاید اپنے جرم کا ازالہ کر رہا ارشد کو وہ رات یاد آئی جب رجب علی اُس کے گھر گیا تھا اور اُس نے جرم کا اقبال کرنے کے انداز سے بتایا تھا کہ عبدالجلیل اُس کے ہاتھ سے کس طرح مرا تھا۔ اگر اُس کی ذہنی کیفیت اب بھی ویسی ہی ہے تو سلمٰی کو اس کی نیّت پر شک نہیں کرنا چاہیئے۔

وہ کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ رجب علی باغ نما لان میں ٹہل رہا تھا۔ ارشد کو دیکھ کر وہ تیز قدم اُس تک پہنچا۔

"آپ شاید بھول گئے ہوں گے" — ارشد نے اُس کے ساتھ ہاتھ مِلا کر مسکراتے ہُوئے کہا — "میرا نام ارشد ہے۔ آپ ہمارے ہاں آتے تھے"

"میں واقعی بھُول گیا تھا" — رجب علی نے ہنستے ہُوئے کہا — "تم اشفاق صاحب کے بیٹے ہو نا! میں تمہیں گرفتار کرنے گیا تھا.... اب تو کسی خفیہ تحریک کے چکر میں نہیں ہو ارشد؟"

"تحریک تو کوئی نہیں ملک صاحب!" — ارشد نے کہا — "چکر میں ضرور ہوں۔"

رجب علی نے لان میں ہی کرسیاں منگوا لیں اور وہ بیٹھ گئے۔

"اب کس چکر میں ہو؟" — رجب علی نے کہا — "میں آ․․․ ․․․ے کر تمہارے ابّو سے مِلا تھا۔ میں نے تمہارے ابّو سے ایک بار پھر کہا تھا کہ ارشد کو جذباتی قسم کی تحریکوں سے بچائے رکھیں۔ ہمارا دین اور ہمارا ایمان پاکستان ہے ارشد! تم دیکھ لینا، اس ملک کو اپنی جاگیر سمجھنے والے حکمرانوں کا انجام کیا ہو گا۔ جو آئے گا ذلیل و خوار ہو کر جائے گا۔ 'زندہ باد' کے نعرے لگوا کر آئے گا 'مردہ باد' کے نعرے اُسے کرسی سے اٹھا باہر پھینکیں گے۔ رہے گا نام اللہ کا اور پاکستان کا۔ شرط یہ ہے کہ اپنے بچوں کے خُون میں پاکستان کی محبت اور عظمت

شامل کردو۔ بچّوں کو پاکستانی بناؤ.... تمہارا ایک بچّہ ہے۔ تمہارے اور بچّے بھی ہوں گے۔"

"ملک صاحب!"۔۔۔ ارشد نے کہا۔۔۔"ایک اور بچّہ بھی ہے جو میرے لیے، اور شاید آپ کے لیے بھی مسئلہ بنا ہُوا ہے۔ وہ عبدالجلیل خان کا بچّہ ہے۔"

"کیا ہُوا اس بچّے کو؟"۔۔۔ رجب علی نے اپنے آپ کو جھٹکا دے کر آگے کرتے ہوئے گھبراہٹ کے لہجے میں پوچھا۔۔۔"کیا مسئلہ ہے جلیل کے بچّے کا؟"

"مسئلہ اس کی ماں کا ہے"۔۔۔ ارشد نے کہا۔۔۔"اپنے بچّے کے متعلق وہ بہت حسّاس ہے۔ آپ سے مل چکی ہے پھر بھی اُسے وہم ہے کہ آپ اُس کے بچّے کو ورغلا لیں گے.... آپ نے اُسے اپنا نام انورعلی بتا یا ہے۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ آپ ہوں گے۔"

"اُسے معلوم ہے کہ جلیل پولیس مقابلے میں نہیں، میرے ہاتھوں مرا تھا"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔"اس لیے میں نے اُسے اپنا نام انورعلی بتایا ہے۔"

"آپ کب تک اُس سے اپنا آپ چھپائے رکھیں گے؟"

"میں اُسے ہر روز تو نہیں ملوں گا"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔"اس کا شک رفع کرنا تھا، کر دیا ہے۔ بڑا ہی اچھا ہُوا ہے کہ تم آ گئے ہو۔ تم تو میری نیّت پر شک نہیں کرو گے نا؟.... اُس کا دل قائم رکھنا.... ارشد!۔۔۔

رجب علی اچانک جذباتی ہو گیا۔۔۔"انسان کو ذرا سا رتبہ مل جاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اُس کے ہاتھ میں طاقت آ گئی ہے اور اُس جیسا کوئی نہیں مگر ایک طاقت اُس کی اپنی ذات سے اٹھتی ہے اور اُس کے منہ پر ایسا تھپڑ مارتی ہے کہ انسان کو اپنی اصلیّت نظر آ جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی سلوک خُدا نے میرے ساتھ کیا ہے۔ میں تو ظالموں میں سے تھا ارشد! مگر کسی مظلوم کی ایک آہ یا فریاد نے مجھے میرا اصل چہرہ دکھا دیا ہے۔"

"کیا یہ آپ کی خوش نصیبی نہیں؟"

"یقیناً خوش نصیبی ہے"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔"خُدا نے مجھے صراطِ مستقیم دکھا دی ہے لیکن ارشد! میں نے جو روحانی اذیّت دیکھی ہے وہ خدا کسی کو نہ دکھائے۔ میری نیند اُڑ گئی تھی۔ میں نے جلیل کو اپنے کمرے میں ہر رات دیکھا۔ میں کہیں چلا جا رہا ہوتا تو جلیل میرے راستے میں آ جاتا۔ مقتول نے اپنے قاتل کو ایسی سزا دی ہے جس کی اذیّت عمر قید سے کہیں زیادہ ہے۔ اُس نے مجھے اپنا آپ گہری تاریکی میں بھی دکھایا۔ میں کبھی کبھی شراب پیا کرتا تھا وہ چھوڑ دی۔ ایک روز میں اپنے مقتول کی روح یا بد روح یا اُس کے بھوت سے اتنا تنگ آ گیا کہ اپنے نوکر سے کہا کہ مجھے چرس لا دو۔ چرس آ تو گئی لیکن میرے نوکر نے مجھے پینے نہ دی۔ میں اپنے آپ کو، اپنے شعُور کو نشے میں غرق کر دینا چاہتا تھا لیکن خُدا نے اپنا ہاتھ ایک نوکر کے ہاتھ کی صورت میں آگے بڑھا کر مجھ سے چرس چھین لی۔ میں نے سنا تھا کہ کوئی بے گناہ مارا جائے تو اُس کی رُوح دنیا میں بھٹکتی رہتی ہے اور بد رُوح بن کر زندہ لوگوں کو پریشان کرتی ہے۔ میں جلیل کے واہمے کو بد روح سمجھتا رہا....

"میں اپنے خاندانی ڈاکٹر ذاکر حسین کے پاس گیا۔ اُسے بتایا کہ مجھ سے کیا گناہ ہو گیا ہے اور اب میرا کیا حال ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ڈاکٹر بھی ہیں اور عالم بھی۔ انہوں نے کہا کہ جو کچھ تمہیں نظر آتا ہے یہ تمہاری روح اور تمہارا اپنا ضمیر ہے۔ تم نے ان پر ایک گھناؤنے گناہ کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ گناہ کے بوجھ کو صرف ایک چیز ضمیر سے اتار سکتی ہے۔ یہ ہے اللہ کے بندوں کی محبت اور دکھی انسانوں کا درد۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تم

ظالم تھے، اب مظلوم بن کر مظلوموں کے درد کی دوا بنو....

"ارشد! میں نے یہ نکتہ سمجھ لیا۔ یہ راز پا لیا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی کوٹھی کو دیکھا۔ یہ مجھے اپنے مقبرے کی طرح نظر آئی جیسے مغل بادشاہوں نے مرے ہُوئے بادشاہوں کے مقبرے بنائے تھے۔ یہاں میں اکیلا رہتا ہوں۔ میں نے نیچے دیکھا تو مجھ پر انکشاف ہُوا کہ جنہیں کیڑے مکوڑے سمجھ کر ان پر چلتے رہے ہو یہ تو مجھ جیسے انسان ہیں.... پھر ارشد! مجھے میری اپنی پولیس آسمان سے نوچ کر زمین پر لے آئی۔ وزیروں کی سواری آ رہی تھی۔ میں نے ایسی بہت سی سواریاں گزاری ہیں اور لوگوں کو دھکے دیتے اور انہیں ڈنڈے بھی مارے ہیں۔ استعفیٰ دینے کے بعد ایک روز ایک کانسٹیبل نے مجھے دھکا دے کر سڑک سے فٹ پاتھ پر چڑھا دیا تو میں انسانوں کے روپ میں آ گیا....

"ارشد بھائی! لوگ خُدا کو یاد کرتے ہیں تو اوپر دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں خُدا اوپر ہے.... نہیں.... خُدا اوپر نہیں، نیچے ہے۔ نیچے دیکھ کر چلو تو تمہارے قدم کسی انسان کو، انسان کے کسی بچّے کو روندیں گے نہیں۔ کسی کو تمہاری ٹھوکر نہیں لگے گی۔ کسی کو مسلو گے نہیں، کسی کو کچلو گے نہیں، اور نظریں نیچی رکھو گے تو ٹھوکر بھی نہیں کھاؤ گے.... خدا کو اپنے وہ بندے عزیز ہیں جو گردنیں اکڑا کر چلنے والوں کو نظر نہیں آیا کرتے....

"میں نے خُدا کو غریبوں کے بچوں کے روپ میں دیکھا اور انہیں سینے سے لگا لیا۔ تمہیں سلمیٰ نے بتایا ہو گا کہ اُس کا بیٹا اصغر مجھے کس طرح اتّفاق سے مِلا تھا۔ اگر وہ مجھے یہ نہ بتاتا کہ کس کا بیٹا ہے تو بھی میں اُسے کتابیں اور کاپیاں لے دیتا لیکن اُس نے جب اپنے باپ کا نام بتایا تو میں وہ رجب علی نہ رہا جو کبھی ہُوا کرتا تھا۔ میری روح نے کہا کہ یہ ہے وہ بچہ جو تمہاری روح کی نجات کا سبب بن سکتا ہے۔ میں نے اُسی وقت اس بچّے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔"

ارشد یوں اس کی باتوں میں گم ہو گیا تھا جیسے مسحور ہو گیا ہو، یا علم و فضل کی کسی کتاب میں محو ہو گیا ہو۔ ملک رجب علی ایک کتاب ہی تھی جو ارشد کو اپنا آپ پڑھا رہی تھی۔

"پھر میری روح کو نجات مل گئی"۔۔۔ ملک رجب علی کہہ رہا تھا۔۔۔"اُس روز کے بعد مجھے اپنے مقتول کی نہ روح نظر آئی نہ بد روح، نہ مجھے شراب کی ضرورت محسوس ہُوئی نہ چرس کی۔ مجھ پر جو نشہ طاری ہو چکا تھا اس نے میری روح اور میرے ضمیر کو بڑی بھیانک اذیّت اور بڑی زہریلی تلخی سے آزاد کر دیا.... ارشد!۔۔۔

ملک رجب علی نے آگے ہو کر ارشد سے التجا کے لہجے میں کہا۔۔۔"سلمیٰ کو پتہ نہ چلنے دینا کہ میں اُس کے سہاگ کا قاتل ہُوں۔ اُسے میرا نام نہ بتا دینا۔ تم عقل مند ہو۔ گریجوئیٹ ہو۔ اگر تم بھی مجھے سزا دینا چاہتے ہو تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ سلمیٰ کے بچّے کو اپنا بچہ بنا کر مجھے نجات ملی ہے۔ سکون مِلا ہے۔ اگر مجھے پھر اُسی اذیّت میں پھینک دیا گیا تو میں خود کشی کر لوں گا۔ مجھے نظر آ رہا ہے جیسے یہی میرا انجام ہے۔ خون کا بدلہ خون۔"

"نہیں بتاؤں گا"۔۔۔ ارشد نے کہا۔۔۔"جن حالات میں عبدالجلیل خان آپ کے ہاتھوں مرا ہے اِن حالات کے ذمّہ دار آپ نہیں تھے۔ میں آپ کو قاتل نہیں سمجھتا۔ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ میں لاہور میں رہتا ہی کہاں ہوں۔ دس بارہ دنوں کی چھٹی آیا ہوں پھر راولپنڈی چلا جاؤں گا۔ سلمیٰ سے میری ملاقات ہوتی ہی کہاں ہے۔"

"اُسے تسلی دو"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔"سلمیٰ کو یقین دلاؤ کہ میں اُسے دھوکہ نہیں دے رہا۔ میں اُس کے بچّے کا مستقبل بنا رہا ہُوں۔ دراصل یہ نیکی میں اپنے ساتھ کر رہا ہُوں۔ سلمیٰ کو بتانا کہ میری بیوی مر چکی ہے اور

میرا کوئی بچہ نہیں۔ میں اپنی تنہائی اور خلش کو تسکین دے رہا ہوں۔"

ارشد نے اُس کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ اُس کے راز کو اپنے سینے میں رکھے گا لیکن یہ سوچ اُسے پریشان کر رہی تھی کہ یہ راز کب تک راز رہے گا اور جب یہ راز فاش ہو گیا تو سلمٰی کا ردِّ عمل کیا ہوگا اور پھر رجب علی کیا کرے گا۔

اُس نے اُسی روز سلمٰی کے گھر جاکر اُسے یقین دلایا کہ انور علی کو مخلص اور اپنا محسن سمجھے۔ اُس نے سلمٰی سے کہا کہ انور علی تنہا ہے، نہ بیوی نہ کوئی بچّہ، اس لیے وہ اپنی تسکین کے لیے صرف اصغر کے ہی نہیں، چار اور بچوں کے بھی اخراجات ادا کر رہا ہے۔

☆

سلمٰی کے شکوک رفع ہو گئے اور دل سے وہم اُتر گئے۔ اس نے سکون اور اطمینان کی آہ بھری اور رجب علی کا سراپا اُس کے سامنے آ گیا۔ اُسے رجب علی کی باتیں سنائی دینے لگیں جو اس نے رجب علی کی کوٹھی میں سنی تھیں۔ چونکہ اُس کے ذہن اور دل پر شکوک کی دھند چھائی ہوئی تھی اس لیے اُس نے رجب علی کی باتوں کا اثر کم ہی قبول کیا تھا۔ اب جب کہ شکوک کی دھند چھٹ گئی تھی اُسے وہ باتیں پھر سنائی دینے لگیں۔ اُسے ہر بات اچھی لگی۔ اُسے خیال آیا کہ "انور علی" پُرجلال شخصیت ہے۔ یہاں ہر کوئی قاتل اور لٹیرا نہیں، یہاں مرے ہُوئے دلوں میں جان ڈالنے والے اور جھولی بھرنے والے بھی ہیں۔

سلمٰی کے ہاتھ سلائی کی مشین چلا رہے تھے لیکن اُس کے ذہن میں "انور علی" کا چہرہ نکھر تا آرہا تھا۔ تن تنہا ہو کہ جس پر خاوند کے قتل کی اور اوپر سے آئی ہوئی دھمکی کی دہشت غالب رہتی تھی، انور علی یوں نظر آنے لگا جیسے سمندر میں ڈوبتے ہوئے انسان کو ایک کشتی اپنی طرف بہتی دکھائی دے رہی ہو۔ ایسا آدمی جسم کی شل طاقت جگانے کی اور کشتی کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی ہی کوشش سلمٰی کی ذات میں بیدار ہونے لگی اور وہ کام چھوڑ کر سوچوں میں کھو گئی۔

وہ باوقار خاندان کی بیٹی تھی۔ خاوند ملا تو وہ بھی باوقار ملا۔ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ زبان بند رکھنے کے لیے اور پولیس کی لکھی ہوئی تحریر پر دستخط کرنے کے لیے اُسے جو پندرہ ہزار روپیہ دیا گیا تھا وہ اُس نے ٹرنک میں پھینک دیا تھا۔ چھ مہینے گزر گئے تھے، اس رقم کو اُس نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اب اُس کا وقار اُس سے تقاضا کر رہا تھا کہ وہ اس شخص پر جس نے اپنا نام انور علی بتایا تھا، اپنا بوجھ نہ ڈالے اور اُس کے سامنے غریب اور مظلوم نہ بنے۔

ایک شام رجب علی کھانا کھا کر ٹہلنے کے لیے باہر نکل گیا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں اُس نے ایک تانگہ روکا اور سوار ہو گیا۔ دروازے پر کسی کی دستک نے اُسے خیالوں سے بیدار کر دیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور اُسے شک ہونے لگا جیسے اس دروازے پر اُس نے دستک دی ہے۔ وہ وہاں سے ہٹنے ہی لگا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ اس نے دیکھا۔ اس کا پسینہ نکل آیا۔ وہ ارادہ کر کے نہیں آیا تھا۔ اُسے یاد نہیں آرہا تھا کہ کس طرح وہ اس دروازے تک پہنچ گیا ہے۔

"اوہ.... آپ!"— اُسے سلمٰی کی آواز سنائی دی — "آئیے نا!"

وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ اُس نے اپنی اس ذہنی کیفیت کو چھپانے کے لیے کوئی جھوٹ نہ تراشا۔ ہچکچاہٹ نہ ایکٹنگ کی، خاموشی سے اندر چلا گیا۔ سلمٰی نے دروازہ بند کر دیا۔

"اصغر کہاں ہے؟"— رجب علی نے ایسی آواز میں پوچھا جو اُس کی اپنی نہیں لگتی تھی۔

"ابھی ابھی سویا ہے۔"

"میں یہیں سے واپس نہ چلا جاؤں؟"— رجب علی نے بوجھل آواز میں کہا۔

"آئے کیوں تھے؟"

"آیا کیوں تھا؟"— رجب علی نے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں کہا — "یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔"

"انور علی صاحب!"— سلمٰی نے حیران سا ہو کے پوچھا — "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

وہ اندر چلا گیا اور سلائی کی مشین کے پاس بیٹھ گیا۔ سلمٰی بھی بیٹھ گئی۔

"سلمٰی! مجھے معاف کر دینا"— رجب علی نے کہا — "مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں ارادے سے یہاں نہیں آیا۔ تم تعلیم یافتہ ہو سلمٰی! معلوم نہیں میری ذہنی حالت کو سمجھ سکو گی یا نہیں۔ اگر نہ سمجھ سکو تو مجھے معاف کر دینا۔ میری نیّت پر شبہ نہ کرنا۔"

"میں سمجھنے کی کوشش کروں گی انور علی صاحب!"— سلمٰی نے کہا — "آپ کی نیّت پر مجھے کوئی شبہ نہیں رہا۔ آپ کھوئے کھوئے سے کیوں ہیں؟"

"اگر مجھ پر اعتبار کر سکو تو سچی بات بتا دیتا ہوں"— رجب علی نے کہا — "مجھے اُس وقت پتہ چلا کہ میں تمہارے دروازے پر کھڑا ہوں جب میں اس دروازے پر دستک دے چکا تھا۔ تم کہو گی کہ اتنی دور سے تم تانگے پر آئے ہو گے۔ کیا اتنا فاصلہ تم نے بے ہوشی میں طے کیا ہے؟"

"یہ تو میں ضرور کہوں گی۔"

"میں بے ہوش نہیں تھا"— رجب علی نے کہا — "تانگے والا میرے ساتھ باتیں کرتا رہا تھا۔ اب یاد آتا ہے کہ میں اس گلی میں داخل ہُوا تو میں ہوش میں تھا۔ تم نے دروازہ کھولا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں تمہارے پاس نہیں آیا تھا.... سلمٰی! بات یہ ہے کہ مجھے اتنا بڑا صدمہ ہُوا ہے کہ میری ذہنی حالت کبھی کبھی یہی ہو جاتی ہے۔"

"صدمہ کیسا؟.... کسی کی وفات کا؟.... کسی عزیز....؟"

"نہیں"— رجب علی نے جواب دیا — "یہ تو میرا مستقل روگ ہے۔ ایک ایک کر کے سب مر گئے ہیں۔ مجھ سے نہ پوچھو کہ صدمہ کیا تھا۔ میری روح زخمی ہو گئی ہے۔ ضمیر پر ایک ناسور ہے.... میری ان باتوں سے گھبرا نہ جانا۔ مجھے سیانوں نے بتایا ہے کہ جن کے دل دکھی ہیں اُن کا دکھ بانٹ لو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اپنے بچے کو میرے خلاف نہ کر دینا.... میں جا رہا ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑا ہُوا۔ سلمٰی بھی اٹھی۔ وہ چل پڑا۔ سلمٰی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ ڈیوڑھی میں پہنچے تو وہاں اتنی ہی روشنی تھی جو دوسرے کمرے سے آ رہی تھی۔ سلمٰی اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"میں بچی نہیں انور علی صاحب!"— اُس نے ایسے لہجے میں کہا جس میں طنز نہیں تھی، غصہ نہیں تھا اور اس لہجے میں شک کے اظہار کی بھی جھلک نہیں تھی۔ اُس نے کہا — "آپ میرے محسن ہیں۔ میں نے آپ سے نہیں کہا کہ آپ چلے جائیں لیکن مجھے شکوک میں بھٹکتا چھوڑ کر نہ جائیں.... آپ میرے پاس آتے تھے۔"

"سلمٰی! میں بیداری میں یہاں آیا یا بے خیالی میں، آیا تمہارے پاس ہی تھا"— رجب علی نے کہا —

"لیکن قرآن سے آؤ، میں قسم کھاکر تمھیں یقین دلاؤں کہ میں اِس لیے نہیں آیا تھا کہ تم خوبصورت بیوہ ہو اور میں تنہائی کا مارا ہُوا مرد ہوں جس روز تنہائی سے گھبرا کر آؤں گا اُس روز پہلی بات یہ کہوں گا کہ سلمٰی! تنہائی میں دل نہیں لگتا تھا، تمھارے پاس آگیا ہوں۔"

اُس کے لب و لہجے میں کوئی ایسا تاثر تھا جس نے سلمٰی کے دل میں کوئی شک پیدا نہ ہونے دیا۔ ملک رجب علی نے بے ساختہ سلمٰی کا ہاتھ پکڑ لیا اور رندھی ہُوئی آواز میں بولا — "مجھے معاف کر دینا۔" — اور وہ ڈیوڑھی سے نکل گیا۔

✪

اُس رات رجب علی زیادہ وقت جاگتا رہا۔ کبھی پچھتانے لگتا کہ اُسے وہاں نہیں جانا چاہیئے تھا۔ اُسے جب یہ خیال آتا کہ وہ بے خیالی میں وہاں جا پہنچا تھا تو وہ بے چین ہو جاتا اور پریشان کہ یہ ذہنی کیفیت اُس کے لیے اچھی نہیں۔ وہ سلمٰی کو ذہن سے اتار دینے کی کوشش کرنے لگا لیکن سلمٰی کے خیال سے ہی اُسے تسکین ہوتی تھی۔ رات کے آخری پہر اس کی آنکھ لگی اور خواب میں وہ سلمٰی کو ہی دیکھتا رہا۔

سلمٰی بھی اُلٹے سیدھے خیالوں میں اُلجھی رہی۔ بار بار ایک ہی خیال غالب آتا تھا کہ انور علی اُس کے لیے آیا تھا اور ہو سکتا ہے وہ دولت کے نشے میں ہو لیکن دولت کے نشے والے اس طرح گھبراتے ہوتے نہیں ہوتے۔ وہ روح اور ضمیر کی باتیں نہیں کیا کرتے۔ یہ آدمی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ تنہا ہے دکھی معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے دن جب اصغر سکول چلا گیا تو سلمٰی گھر سے نکل گئی۔ وہ "انور علی" کے گھر جانا چاہتی تھی لیکن فیصلہ نہ کر سکی کہ جائے یا نہ جائے۔ اسی گو مگو کی کیفیت میں وہ بس میں سوار ہُوئی۔ اُس کا ذہن اسی ایک سوال کا جواب ڈھونڈتا رہا — "مجھے وہاں جانا چاہیئے یا نہیں" — اور وہ انور علی کی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ رجب علی کو جب نوکر نے بتایا کہ ایک خاتون آئی ہے تو وہ دوڑتا باہر آیا اور سلمٰی کو اندر لے گیا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے" — رجب علی نے کہا — "میں رات کو سو نہیں سکا۔"

سلمٰی گھبرانے لگی۔

"میں آ تو گئی ہُوں لیکن سمجھ نہیں سکتی کہ مجھے آنا چاہیئے تھا یا نہیں۔"

"تمھیں آنا چاہیئے تھا" — رجب علی نے کہا۔

سلمٰی ایک گھنٹے بعد کوٹھی سے نکلی۔ اُس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی — "یہ کوئی درویش ہے۔ مجھے پھر بھی یہاں آنا چاہیئے۔"

وقت گزرتا چلا گیا۔ رجب علی اور سلمٰی ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہے۔ سلمٰی کے دل سے وہم اور وسوسے نکل گئے تھے۔ رجب علی کی باتیں سُن کر اُسے سکون سا محسوس ہوتا تھا۔ اصغر رجب علی سے بہت بے تکلّف ہو گیا تھا۔ رجب علی نے اصغر کو بائیسکل لے دیا تھا۔ اُس نے سلمٰی سے کہا تھا کہ وہ لوگوں کے کپڑے سینے چھوڑ دے۔ سلمٰی نہیں مانی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ اپنے وقار کو مجروح نہیں ہونے دوں گی۔

اصغر نویں جماعت میں پہنچ گیا۔

سلمٰی نے بڑی خاموشی سے اپنے خاوند کی برسی کی۔ وہ لوگوں کا سلائی کا کام کرتی رہی۔

ایک سال گزر چکا تھا۔ اس ایک سال میں انور علی سلمٰی کے دل میں اُتر گیا۔ رجب علی ہر روز اس کی راہ دیکھنے لگا — پھر وہ وقت آیا کہ دونوں اپنی اپنی تنہائی سے اکتا گئے اور دونوں اُس مقام تک جا پہنچے جہاں انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکیں گے۔

اور ایک روز یوں ہُوا کہ سلمٰی رجب علی کی کوٹھی میں گئی اور سیدھی اُس کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ سویا ہُوا تھا۔ تپائی پر تین چار لفافے پڑے تھے جو ڈاک سے آتے تھے۔ رجب علی سویا ہُوا تھا اس لیے نوکر لفافے تپائی پر رکھ گیا تھا۔ سلمٰی نے تمام لفافوں کے ایڈریس پڑھے۔ ہر لفافے پر نام ملک رجب علی خان لکھا ہُوا تھا۔ ایک لفافے پر لکھا تھا — ملک رجب علی خان سابق ڈی۔ ایس۔ پی۔

اس سے پہلے رجب علی مکمل احتیاط کرتا تھا کہ اُس کے کمرے میں کوئی ایسا کاغذ نہ ہو جس پر اُس کا نام لکھا ہو۔ یہ مسئلہ اُسے ہر وقت پریشان رکھتا تھا کہ اپنے نام کے راز کو وہ کب تک سلمٰی سے چھپاتے رکھے گا، اور کبھی سلمٰی پر یہ راز فاش ہو گیا تو کیا ہو گا۔ اُس نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ سلمٰی کو اپنی اصلیّت بتا دے لیکن وہ جرأت نہ کر سکا۔

اب یہ راز سلمٰی کے ہاتھ آگیا۔ سلمٰی نے تینوں لفافے تین چار بار پڑھے۔ کوٹھی کا نمبر یہی لکھا تھا۔ اُس کا جسم کانپنے لگا۔ اُس کے دانت بجنے لگے۔ اتنے میں رجب علی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور سلمٰی کے ہاتھ سے لفافے لے لیے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"اس کا آپ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟" — سلمٰی نے دھیمی سی آواز میں پوچھا۔ اُس کا چہرہ غصّے اور انتقام سے سرخ ہو گیا تھا۔

"یہ میرا نام ہے" — رجب علی نے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" — سلمٰی نے حیرت زدگی کے عالم میں کہا — "آپ انور علی ہیں نا!"

"نہیں" — رجب علی نے تحمّل سے کہا — "میں ملک رجب علی ہوں۔ سابق ڈی۔ ایس۔ پی۔ تمھارے خاوند کا قاتل۔"

سلمٰی کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اُس کا حسین چہرہ بالکل ہی بدل گیا۔ اب اس چہرے پر حُسن نہیں قہر تھا۔ اُس نے رجب علی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"فریبی۔ دھوکہ باز" — سلمٰی نے دانت پیس کر کہا — "اپنا اصل نام مجھ سے کیوں چھپایا تھا؟"

"میں نے تمھیں کوئی فریب نہیں دیا" — رجب علی نے کہا — "کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ میں نے تمھارے جسم کے ساتھ ہلکی سی دلچسپی کا بھی کبھی اظہار نہیں کیا۔"

"قاتل!.... خونی!" — سلمٰی نے قہر بھری آواز میں کہا — "میرا سُہاگ اجاڑنے والے....!"

"سلمٰی!" — رجب علی نے التجا کی — "مجھے بتانے دو کہ میں نے تمھیں اصل نام کیوں نہیں بتایا تھا۔"

"میں تم پر لعنت بھیجتی ہُوں" — سلمٰی تیز قدم دروازے کی طرف چل پڑی۔ دروازے میں رُک کر بولی — "میرے بیٹے کے ساتھ تمھارا کوئی تعلق نہیں۔ اُس کی فیس نہ دینا.... میں تمھیں ڈھونڈ رہی تھی۔"

"سلمٰی!" — رجب علی اُس کی طرف بڑھا اور بولا — "رُک جاؤ سلمٰی، میری سُن کے جاؤ۔"

سلمٰی چلی گئی اور رجب علی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

سلمیٰ اُس کے گھر سے نکل گئی تو ملک رجب علی یُوں سُن ہو کے رہ گیا جیسے اُس کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ اُس کی نظریں اُس کھُلے دروازے میں رُک گئیں جس سے سلمیٰ نکل کے گئی تھی۔ وہ یوں اُس دروازے کو دیکھتا رہا جیسے سلمیٰ واپس آجائے گی۔ وہ بُت بن گیا جس کے جذبات نہیں ہوتے، احساسات نہیں ہوتے۔

پھر اس بُت میں جان آنے لگی۔ بُت سانس لینے لگا پھر اس بُت کا دماغ بیدار ہونے لگا۔ اس کے جذبات رینگنے لگے اور اس کے احساسات نے انگڑائی لی۔ اُس نے درد کی ایسی ٹیس محسوس کی جیسے ایک کانٹا دل میں اُتر گیا ہو اور دوسرا احساس یہ کہ یہ کانٹا اُسے جینے بھی نہ دے گا مرنے بھی نہ دے گا۔

دروازہ دھندلا گیا۔ کمرے کی ہر ایک چیز اُسے یوں دکھائی دینے لگی جیسے پانی میں ان کے عکس دیکھ رہا ہو۔ یہ اُس کے آنسوؤں میں جھلمل کرتے عکس تھے۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ اس نے آنکھوں کو بند کیا تو آنسو بہ گئے جو اُس نے رومال سے پونچھ ڈالے۔

"کیا خون کا بدلہ خون ہی ہو گا؟" ـــــ اُسے خیال آیا ـــ "کون لے گا مجھ سے یہ بدلہ؟..... سلمیٰ؟..... عبدالجلیل خان کی روح؟..... میں خود؟..... مجھے اپنے آپ کو سزائے موت دینی ہی پڑے گی..... اور کیا لوگ اسے خودکشی کہیں گے؟..... اخباروں میں ایک بار پھر ملک رجب علی کا نام چھپے گا۔ خبریں لکھیں گے کہ یہ وہی رجب علی ہے جو ڈی۔ ایس۔ پی ہُوا کرتا تھا۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے بڑے خطرناک مجرم پولیس مقابلے میں ہلاک کیے تھے" ـــ اس کی آہ نکل گئی ـــ "مرنے کے بعد بھی یہ جھوٹ میرے نام کے ساتھ چپکا رہے گا۔ میرے اعمالنامے میں یہ میرے ساتھ جائے گا۔"

ملک رجب علی نے سلمیٰ کے بیٹے اصغر سے ملاقات سے پہلے جو روحانی اذیّت برداشت کی تھی وہ اُسے یاد آنے لگی اور وہ ڈرنے لگا کہ اب عبدالجلیل خان کا واہمہ یا اُس کی روح اُسے پریشان کرنا شروع کر دے گی۔ وہ تو مطمئن ہو گیا تھا کہ اُس نے گناہ کا کفّارہ ادا کر دیا ہے اور خُدا نے اُس کا کفّارہ قبول کر لیا ہے مگر سلمیٰ نے اُسے یوں دھتکار دیا جیسے کسی قاتل کو پھانسی کی تاریخ کے انتظار میں پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہو۔

سلمیٰ کا اتنا شدید ردِّعمل اُس کے لیے جان لیوا صدمہ تھا لیکن وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں اور وہ اپنے آپ سے شرمسار بھی نہیں جیسے وہ سلمیٰ سے ملنے سے پہلے ہُوا کرتا تھا۔ اب اُس کے وجود میں کوئی ایسی قوت بیدار ہو گئی تھی جو اُس کے پاؤں اکھڑنے نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اپنے دل میں ایک کانٹے کی جو ٹیس محسوس کی تھی وہ بھی اس کے دل نے اپنے اندر جذب کر لی۔ رجب علی کو توقع تھی کہ سلمیٰ کے ردِّعمل کا ردِّعمل اُسے جہنّم میں پھینک دے گا لیکن ایسا نہ ہُوا۔

وہ اپنے آپ پر حیران ہونے لگا اور سوچنے لگا کہ اس کے ضمیر نے اُسے لعنت ملامت کیوں نہیں کی؟ شاید اس لیے کہ اس نے خودکشی کا ارادہ کر لیا ہے؟ شاید اسی لیے ـــ اُس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ خون کا بدلہ خون ہی ہوتا ہے اور اُسے اپنے آپ کو سزائے موت دینی پڑے گی۔

اسے ایک اطمینان تو یہ تھا کہ اُس نے سلمیٰ اور اس کے بیٹے کو دیا تھا، لیا کچھ نہیں تھا۔ اس نے اس بچے کا سکول میں وقار بحال کر دیا تھا۔ سلمیٰ کے ذہن سے بچے کے مستقبل کا بوجھ اتار دیا تھا۔

اور اطمینان اسے یہ بھی تھا کہ سلمیٰ بیوہ تھی، خوبصورت تھی، تنگدست اور اُس کی محتاج تھی لیکن رجب علی نے اُسے کبھی بُری نیّت سے نہیں دیکھا تھا۔ بیوہ اگر محتاج ہو تو وہ اُن لوگوں کو خوبصورت ہی نظر آتی ہے جن کی جیب میں چند روپے ہوتے ہیں سلمیٰ تو تھی ہی خوبصورت۔ رجب علی کے پاس دولت تھی۔ وہ تنہائی کا مارا ہُوا تھا۔ اُس کے جذبات پیاسے تھے۔ وہ پولیس آفیسر رہ چکا تھا۔ انسانوں کو پہچاننا جانتا تھا۔ اس نے سلمیٰ کو اپنے ساتھ بے تکلّف کر بھی لیا تھا لیکن اُس نے اپنی نظروں میں کبھی مَیل نہیں آنے دی تھی۔ سلمیٰ فرشتہ تو نہیں تھی لیکن ملک رجب علی نے اُسے فرشتوں کے آسمان سے کبھی نیچے نہیں آنے دیا تھا۔

☆

رجب علی بلبلا گیا۔ اُسے خیال آیا کہ سلمیٰ یہ نہیں کہہ سکتی کہ رجب علی نے اُس کے بیٹے کی تعلیم کے اخراجات اور دیگر ضروریات اپنے ذمّے لے کر اُس کی عصمت کی بولی دی تھی۔

رجب علی کو گزرے ہُوئے ایک سال کی باتیں اور ملاقاتیں یاد آنے لگیں۔ ہارے ہُوئے لوگ اچھے دنوں کی یادوں میں پناہ لیا کرتے ہیں۔ رجب علی تو شکست خوردہ اور زخمی تھا ـــ سلمیٰ کے ساتھ اس کی ملاقاتیں ایک سال سے کچھ دن اوپر کے عرصے پر پھیلی ہُوئی تھیں۔ وہ سلمیٰ کو اتنی آسانی سے دل سے نہیں اتار سکتا تھا۔ ایک راہ کے راہی تھوڑی دُور اکٹھے چل کے جُدا ہو جاتیں تو اجنبیّت کے باوجود کچھ عرصے تک ایک دوسرے کو یاد رکھتے ہیں۔ سلمیٰ اور رجب علی کا تو ایک سال کا ساتھ تھا۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کو اپنے دل کھول کر دکھائے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ اور درد اپنے سینوں میں ڈالے تھے۔ ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکنیں محسوس کی تھیں۔ ایک دوسرے کو مسکراہٹیں دی تھیں۔ رجب علی نے سلمیٰ کے آنسو پونچھے تھے سلمیٰ نے رجب علی کی آہوں کو اپنے آنسوؤں میں ڈبو دیا تھا۔

ایک وہ ملاقات تھی کہ ملک رجب علی اپنے گھر سے کہیں اور جانے کو نکلا تھا اور بے خیالی میں سلمیٰ کے گھر جا پہنچا تھا۔ پھر سلمیٰ ارادے سے اُس کی کوٹھی میں پہلی بار گئی تھی تو اُس نے پریشان سا ہو کے رجب علی سے کہا تھا ـــ "میں آ تو گئی ہوں لیکن سمجھ نہیں سکتی کہ مجھے آنا چاہیئے تھا یا نہیں" ـــ یہ جھینپ یہ تذبذب اور یہ جھجک دوسری ملاقات میں ہی ختم ہو گئی تھی اور وہ بے تکلفی سے ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگے تھے۔

اُسے ایک ملاقات یاد آئی۔ رجب علی رات کے وقت سلمیٰ کے گھر گیا تھا۔ اصغر سو گیا تھا۔ کچھ دیر سلمیٰ اپنے خاوند عبدالجلیل خان کی باتیں کرتی رہی پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ رجب علی کی طبیعت کی شگفتگی بیدار ہو گئی اور ان کا انداز بے تکلّف دوستوں کا سا ہو گیا۔

"آپ باقی عمر تنہا ہی گزاریں گے؟" ـــ سلمیٰ نے بے تکلّفانہ مسکراہٹ سے پوچھا۔

رجب علی کے ہونٹوں پر آگئی تھی کہ فیصلہ اور ارادہ تو یہی تھا لیکن تم نے میرے فیصلے اور ارادے توڑ ڈالے ہیں، مگر اُس نے جواب دیا ـــ "کبھی سوچا نہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے خواہشیں مر گئی ہیں۔"

"اتنی جلدی؟" ـــ سلمیٰ نے کہا ـــ "مرد تو مرتے مرتے بھی دوسری شادی کی سوچ لیتے ہیں۔"

رجب علی نے بات کا رخ پھیرنے کے لیے کہا — "یہی سوال میں تم سے پوچھوں تو کیا جواب دو گی؟"

سلمیٰ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ اُس کی مسکراہٹ بجھ گئی تھی۔ چہرے کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔ رجب علی نے اُس کی ٹھوڑی تھام کر اُس کا چہرہ اوپر اُٹھایا۔ سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ رجب علی نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا ہُوا ہاتھ ہٹا لیا۔ سلمیٰ کے آنسوؤں نے رجب علی کو ہلا ڈالا کسی نے جیسے اُسے کہا ہو — "اس چہرے کی رونق اور مسکراہٹ کو تم نے قتل کیا ہے۔ اس کے سہاگ کے قاتل تم ہو۔"

رجب علی پر منوں بوجھ آ پڑا اور اس کا سر جھک گیا۔ اُس کے جی میں آئی کہ سلمیٰ کے قدموں میں سر رکھ دے اور اسے کہے کہ میں ہُوں تمھارے خاوند کا قاتل جسے تم ایک بار دیکھنا اور اُس کے مُنہ پر تھوکنا چاہتی ہو، مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

ضمیر پر گناہ کا بوجھ بڑے بڑے جابر، عالم اور عاقل انسانوں کو بھی اتنا کمزور کر دیتا ہے کہ وہ کمزوروں کے آگے شرمسار ہوتا اور سر جھکا لیتا ہے مگر سر کون جھکاتا ہے؟ کوشش گناہ کو چھپاتے رکھنے کی ہوتی ہے۔ دروغ کے پردے ڈالے جاتے ہیں۔ جابر جبر اور تشدد سے، عالم علم کی موم جیسی تفسیروں اور الفاظ سے سجی سجائی دلیلوں سے اور عاقل عقل کی قلابازیوں سے اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرتا ہے اور یوں ایک گناہ کئی گناہوں کو جنم دیتا ہے۔

ملک رجب علی جبر و تشدد کے ڈھنگ بھی جانتا تھا۔ اس کے پاس علم بھی تھا اور عقل بھی، اور یہ عقل پولیس کے سہاگے سے دُھلی ہوئی تھی۔ سو بھیس بدل سکتی تھی مگر رجب علی اُس مقام پر جا پہنچا تھا جہاں انسان اپنے ضمیر کی آواز سُن کر اُسے دبانے کے اُلٹے جتن نہیں کرتا بلکہ اس آواز کو اُبھرنے دیتا ہے، بلند ہونے دیتا ہے کہ اس کا ہر ایک لفظ واضح ہو جائے۔ رجب علی نے ضمیر کی آواز کو روح کی پکار اور اس پکار کو آوازۂ حق جان کر اسے روح کی روشنی بنا لیا تھا۔

وہ سلمیٰ کے آگے وہ انگارے اُگل دینے کو بے قرار ہونے لگا جو اُس نے نگل رکھے تھے یا حاکموں نے اس کے حلق میں ٹھونسے تھے مگر اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ سلمیٰ کے ردِّعمل سے ڈرتا تھا۔ پہلے سلمیٰ نے سر جھکا لیا تھا اب رجب علی کا سر جھک گیا۔ سلمیٰ تو جیسے تڑپ اٹھی ہو۔ اُس نے بے اختیار اور بے ساختہ رجب علی کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا اور کچھ چہرہ اٹھایا کچھ خود جھکی۔

"میں اپنے گھر میں آپ کو اداس نہیں ہونے دوں گی" — سلمیٰ نے اپنی جذباتی آواز میں کہا جو صرف اُس عورت کی ہو سکتی ہے جس کا دل محبت سے اُبل رہا ہو۔ اس نے کہا — "آپ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ آپ کو گھڑی دو گھڑی کی مسکراہٹیں دے سکتی ہوں۔ میں نے اپنی اداس اور یاس آلود دنیا میں چند مسکراہٹیں سنبھال کے رکھی ہوئی ہیں۔ یہ میں اپنے اکلوتے بچے کو دیا کرتی ہوں۔ میں اسے اُداس نہیں دیکھ سکتی۔ میں اپنے اصغر کو آنسوؤں اور آہوں سے محفوظ رکھنے کا عہد کیے ہُوئے ہوں۔ آپ کو بھی میں اصغر ہی سمجھنے لگی ہوں۔ اپنے بچے کے پیار کا کچھ حصّہ تو آپ کو دے ہی سکتی ہوں۔"

"مجھے صلہ نہیں چاہیے سلمیٰ!" — ملک رجب علی نے کہا — "مجھے گھڑی دو گھڑی..... نہیں سلمیٰ! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

سلمیٰ کی اس وارفتگی کا کیا مطلب تھا؟ وہ توصلہ دینے کی باتیں کر رہی تھی مگر رجب علی نے اپنے سینے

پر سِل رکھ لی تھی۔ اُس نے کوئی اوچھی بات نہیں کی تھی۔

☆

"قاتل..... خونی..... فریبی..... دھوکہ باز۔"

رجب علی کے کمرے میں سلمیٰ کی لرزتی کانپتی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔ وہ گرج کر نہیں بولی تھی۔ اُس کی آواز سرگوشیوں سے اونچی نہیں تھی مگر الفاظ اُس کی زبان سے تیروں کی طرح نکلے اور رجب علی کے سینے میں اُتر گئے تھے — اور رجب علی کو ایک اور ملاقات یاد آنے لگی۔

سلمیٰ اُس کی کوٹھی میں آئی تھی۔ اصغر بھی ساتھ تھا اور وہ باہر لان میں پتنگ اڑا رہا تھا۔ رجب علی اور سلمیٰ اسی کمرے میں بیٹھے تھے جہاں رجب علی اکیلا بیٹھا گزرے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔

"مجھے تمھارے گھر بار بار نہیں جانا چاہیے" — ملک رجب علی نے کہا — "لوگ باتیں کرتے ہوں گے۔ تمہیں اُنہوں نے پہلے ہی بدنام کر رکھا ہے۔"

"کرنے دو" — سلمیٰ نے کہا — "اپنے دل اور اپنے ضمیر کی باتیں سننی چاہئیں۔ لوگوں کی باتیں سنیں تو دو قدم بھی نہ چل سکیں۔ جی ہی نہ سکیں۔"

"سلمیٰ!" — رجب علی نے پوچھا — "ہم کیوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے ہیں؟ اس لیے کہ میں....." وہ چپ ہو گیا اور پریشان بھی۔

"اس لیے کہ آپ میرے بیٹے کو مالی مدد دے رہے ہیں" — سلمیٰ نے رجب علی کا جُملہ پورا کرتے ہوئے کہا اور آہ بھر کر بولی — "آپ ایسی بات کہہ سکتے ہیں لیکن میں آپ کو یاد دلانا چاہتی ہوں کہ میں نے ابھی تک پندرہ ہزار کی اُس رقم کو کھول کر نہیں دیکھا جو مجھے اپنے خاوند کی موت کے بعد اس لیے دی گئی تھی کہ میں نے اُس تحریر پر دستخط کر دیئے تھے جو پاکستان کی سیاسی حکومت نے میرے خاوند کو مجرم ثابت کرنے کے لیے لکھی تھی۔"

"میں احسان نہیں جتا رہا سلمیٰ!" — ملک رجب علی نے شرمسار سا ہو کے کہا — "میں کوئی احسان کر بھی نہیں رہا۔"

سلمیٰ جو سنجیدہ ہو گئی تھی ہنس پڑی اور بولی — "محبّت خریدی نہیں جا سکتی انور صاحب!"

سلمیٰ کی ہنسی مسکراہٹ بن گئی۔ رجب علی نے اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ کئی بار دیکھی تھی اور اسے یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ سلمیٰ عام قسم کی عورت نہیں اور اسے روپے پیسے سے نہیں خریدا جا سکتا۔ اگر اس عورت میں وقار نہ ہوتا تو وہ اتنی خوبصورت بھی نہ لگتی۔

اُس روز بھی ملک رجب علی نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ وہ سلمیٰ سے اتنی سی بات بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ پیار اور محبّت کا پیاسا ہے۔

اُسے اور کئی ملاقاتیں یاد آئیں۔ سلمیٰ ہر ملاقات میں پہلے سے زیادہ کھُل جاتی تھی۔ پہلے وہ اپنے خاوند کی باتیں زیادہ کرتی تھی۔ وہ جب بھی رجب علی سے ملتی تو باتوں باتوں میں ایسا ذکر ضرور لے آتی — "جلیل نے ایک بار یوں کہا تھا..... اصغر کے ابّا نے ایک بار....." اور رجب علی عبدالجلیل خان کو عظیم انسان ثابت کرنے کے لیے کئی باتیں گھڑ لیتا تھا۔ اُس نے سلمیٰ کو بتا رکھا تھا کہ عبدالجلیل نے اُس کے بھائی کو قتل کے الزام سے بری کرایا تھا اور ان کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔

تین چار ملاقاتوں کے بعد سلمیٰ خاوند کی باتیں کم کرنے لگی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی اپنے بیٹے کے لیے وقف کر دی تھی۔ بعد کی ملاقاتوں میں سلمیٰ نے عبدالجلیل کا ذکر ترک کر دیا اور وہ رجب علی کے ساتھ زیادہ بے تکلّف ہوگئی مگر اُس نے کبھی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی تھی نہ کوئی ایسی بات کی تھی جس سے رجب علی کو شک ہوتا کہ یہ عورت اس پر مرمٹی ہے۔

کوئی دو مہینے پہلے رجب علی شام کے بعد سلمیٰ کے گھر گیا تھا۔ بہت دیر کی گپ شپ کے بعد وہ جانے کے لیے اٹھا تو سلمیٰ اُس کے ساتھ آئی۔ باہر کے دروازے تک پہنچے تو رجب علی نے دیکھا کہ اُس کا ہاتھ سلمیٰ کے ہاتھ میں تھا اور دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر دونوں بیک وقت چونکے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رجب علی سنجیدہ رہا۔ سلمیٰ کے ہونٹوں پر تبسّم آگیا اور دونوں کے ہاتھ الگ ہو گئے۔

☆

ایک روز ملک رجب علی اپنا ریوالور صاف کر رہا تھا سلمیٰ آگئی۔ اُس نے ایک برتن اٹھا رکھا تھا۔ برتن تپائی پر رکھ دیا۔

"اُس روز آپ نے کہا تھا کہ آپ کا خانساماں کوفتے اچھی طرح نہیں پکا سکتا"۔ سلمیٰ نے کہا — "آپ کے لیے کوفتے پکا کے لائی ہُوں"۔

رجب علی نے خوشی سے اچھلتے ہُوئے برتن کا ڈھکنا اٹھایا۔ ایک کوفتہ منہ میں ڈالا اور تعریفوں کے پُل باندھنے لگا۔

"سچ بتایئے آپ میرا دل رکھ رہے ہیں یا میں نے واقعی کوفتے آپ کی پسند کے پکائے ہیں؟" — سلمیٰ نے کہا۔ "میرے اور آپ کے خانساماں کے کوفتوں میں کیا فرق ہے؟"

"سچ پوچھتی ہو سلمیٰ؟" — رجب علی نے کہا — "فرق یہ ہے کہ یہ کوفتے ایک عورت نے پکائے ہیں اور میں عورت کے ہاتھ کی ہانڈی کو ترس گیا ہُوں۔ پاکستان کے صدر کے باورچی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کوفتے بھی مجھے ان کوفتوں سے بہتر نہیں لگیں گے"۔

"آپ کو کتنی بار کہا ہے کوئی عورت گھر میں لے آئیں" — سلمیٰ نے کہا — "آپ ابھی جوان ہیں"۔

رجب علی نے عادت کے مطابق بات ہنسی میں ٹال دی اور دیوان پر نیم دراز ہوگیا۔ سلمیٰ صوفے پر بیٹھنے کی بجائے اُس کے پاس دیوان پر بیٹھ گئی اور ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اُس کی نظر رجب علی کے ریوالور پر گئی جو تپائی پر رکھا تھا۔ تپائی قریب ہی تھی۔ سلمیٰ نے ریوالور اٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگی۔ اس نے ریوالور کھول لیا اور سیلنڈر ایک طرف کر دیا۔

"تم ریوالور سے واقف ہو" — رجب علی نے کہا — "جو ریوالور سے واقف نہ ہو وہ اسے اس طرح نہیں کھول سکتا"۔

"اصغر کے ابّا کے پاس ہمیشہ ریوالور رہا ہے" — سلمیٰ نے کہا — "انہوں نے مجھے ریوالور کھولنا، اس میں گولیاں ڈالنا اور نکالنا سکھا دیا تھا۔ اُدھر سے ہم پاکستان کو آرہے تھے تو راستے میں جلیل نے مجھے ریوالور فائر کرنا بھی سکھایا تھا۔ میں نے دو گولیاں چلائی بھی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے میں راستے میں مارا جاؤں، پھر یہ ریوالور تمھارے کام آئے گا"۔

سلمیٰ چپ ہو گئی اور اُس کی نظریں ریوالور پر جم گئیں۔ رجب علی نے محسوس کیا کہ سلمیٰ خیالوں کی دنیا میں کہیں دُور نکل گئی ہے۔ سلمیٰ بڑی آہستہ آہستہ واپس آئی اور اتنی ہی آہستہ آہستہ اُس کی گردن رجب علی کی طرف گھومتی گئی۔ اُس کی نظریں رجب علی کے چہرے پر رُک گئیں۔

"وہ وقت یاد ہے آپ کو؟" — سلمیٰ نے سنجیدہ اور متین لہجے میں کہا — "وہ خاک اور خون میں ڈوبا ہُوا وقت؟ جس وقت سے پاکستان نے جنم لیا تھا؟ وہ شعلے اور وہ لاشیں یاد ہیں آپ کو؟ پاکستان شعلوں اور لاشوں میں سے اٹھا تھا.... وہ بڑا ہی ہولناک اور بڑا ہی بھیانک وقت تھا"۔

"ہاں سلمیٰ! میں اُس وقت کو نہیں بھول سکتا"۔

"بھولنے والے بھول گئے ہیں" — سلمیٰ نے کہا — "اُنہوں نے مجھے بیوہ اور میرے بچّے کو یتیم کر دیا ہے۔ اُنہوں نے پھول کو توڑ کر مسل ڈالا ہے...."۔ سلمیٰ کو ہچکی آئی اور اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بڑی لمبی آہ لے کر اور دوپٹے سے آنسو پونچھ کر بولی — "کیا خدا ان پاکستانیوں کو بخش دے گا جنہوں نے مجھ جیسی عورت کو ایک غیر مرد کے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے؟"

رجب علی تڑپ کے اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے سلمیٰ کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور کراہتی ہُوئی سی آواز میں بولا — "مجھے غیر نہ کہو۔ میں نے کبھی بھی نہیں سوچا کہ تم میرے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھو۔ میری نیّت پر شک نہ کرو"۔

"میں نہیں تو نہ جانے کتنی عورتوں کو مجبور کر کے خرید لیا گیا ہے" — سلمیٰ نے کہا۔ اُس کا چہرہ جذبات کے اُبال سے سرخ ہو گیا تھا۔ کہنے لگی — "آج پاکستان کو لاشوں میں سے اٹھانے والے ایک مجاہد کا بچہ محتاج ہو گیا ہے اور اُس کی ماں...."۔

"سلمیٰ!" — ملک رجب علی نے جھنجھلاتے ہُوئے لہجے میں کہا — "چپ ہو جاؤ۔ تم کہنا چاہتی ہو کہ اس محتاج بچے کی ماں بچے کی خاطر ایک غیر مرد کے پاس بیٹھی ہے"۔

سلمیٰ نے جیسے رجب علی کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ اس پر نظریں جمائے ہُوئے تھی۔

"ایک خواہش ہے" — سلمیٰ نے کہا — "مجھے ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی مل جائے اور آپ مجھے یہ ریوالور دے دیں" — اس کا چہرہ اور زیادہ سرخ ہو گیا۔ دانت پیس کر بولی — "میں ریوالور فائر کرنا جانتی ہُوں۔ صرف ایک گولی چلاؤں گی۔ دوسری نہیں۔ میں اُسے تڑپتا اور تڑپ تڑپ کر مرتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ گولی جو اُس کے سینے میں جائے گی وہ میرا سینہ ٹھنڈا کر دے گی"۔

"اپنے بچے کے حال پر رحم کرو سلمیٰ!"

"جلیل کا ریوالور پولیس لے گئی تھی" — سلمیٰ نے رجب علی کی سُنی اَن سُنی کرتے ہُوئے کہا — "اُس کا لائسنس تھا مگر پولیس لے گئی.... آپ اپنا ریوالور چھپا کر رکھا کریں ورنہ میں کسی روز چُرا کر لے جاؤں گی"۔

رجب علی دیوان پر بیٹھا تھا۔ اُس کی ٹانگیں دیوان پر تھیں۔ سلمیٰ اس کے قریب بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں فرش پر تھے۔

"اگر میں کہوں کہ تمھارے خاوند کو میں نے قتل کیا تھا تو...."

سلمیٰ نے ریوالور دیوان پر پھینک کر رجب علی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم کسی کے قاتل نہیں ہو سکتے انور!"—— جذبات کی شدت سے اُس کے مُنہ سے آپ کی بجائے تم نکل گیا—— "ایسی باتیں نہ کیا کرو۔"

اور تم بھی ایسی باتیں ذہن سے نکال دو"—— رجب علی نے کہا اور ایک بازو سلمیٰ کے کندھے پر رکھ کر سے اپنے قریب کر لیا۔

☆

اُسے تمام ملاقاتیں اور باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کے دل پر صدمے کا بوجھ بڑھتا اور ضمیر کا بوجھ گھٹتا جا رہا تھا۔ سلمیٰ نے اُسے فریبی اور دھوکہ باز کہا تھا لیکن اُس نے اس بیوہ کو کوئی فریب دیا تھا نہ اُسے کوئی دھوکہ دیا تھا۔ سلمیٰ جب اس کے ساتھ ہوتی تھی تو کئی بار سلمیٰ پر خود سپردگی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی لیکن رجب علی نے اُسے کبھی یہ کہنے کی جراٗت نہیں کی تھی کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ دو چار مرتبہ وہ بے قابو ہو چلا تھا مگر اس نے اپنے آپ سے لڑ جھگڑ کر اپنے دل میں یقین پیدا کر لیا کہ سلمیٰ فرشتہ ہے۔

کوئی زاہد اور پارسا ہو تو اُسے اپنے بھٹکے ہوئے خیالوں کو راہِ راست پر لانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ رجب علی کا معاملہ کچھ اور تھا۔ اُس نے بھٹکی ہُوئی زندگی گزاری تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو کبھی شریف آدمی نہیں سمجھا تھا۔ وہ شراب کا عادی رہ چکا تھا۔ وہ جب سروس میں تھا تو وہ رشوت میں لڑکیاں بھی قبول کر لیا کرتا تھا۔ وہ اپنے اوپر ہر طرح کا مُوڈ طاری کر سکتا تھا۔ ہر جال بچھانے کی مہارت رکھتا تھا لیکن عبدالجلیل اُس کے ہاتھوں مر گیا تو وہ شرابی کبابی، راشی اور عشرت پسند رجب علی مر گیا۔ سلمیٰ نے خواہ خلوص اور نیک نیّتی سے ہی اُس کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لی تھی لیکن اس خوبصورت عورت نے اُس پرانے رجب علی کو بیدار کر لیا تھا اور اُسے بڑی کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

ملک رجب علی ہر بار آزمائش میں پُورا اُترا مگر سلمیٰ اُسے دھتکار کر چلی گئی تو اُس کے پاؤں کے نیچے زمین ہلنے لگی۔ ایک بیوہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ سلمیٰ اُسے قتل نہیں کرا سکتی تھی۔ وہ اُس کے ریوالور سے اُسے گولی نہیں مار سکتی تھی مگر سلمیٰ چلی گئی تو رجب علی کی دنیا تاریک ہو گئی۔

اُس نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سنبھالا دینے کی کوشش کی کہ اس عورت نے اُس کی اعانت اور نیکی کو قبول نہیں کیا تو نہ کرے۔ وہ اور کیا کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے سلمیٰ کو ذہن سے اتار دینے کی کوشش کی مگر اُس کا دم گھٹنے لگا جیسے کسی کے نظر نہ آنے والے ہاتھوں نے اُس کا گلا دبا لیا ہو۔ اُس کے دل پر گھبراہٹ طاری ہو گئی جو بڑھنے لگی۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ بار بار سر کو جھٹکتا تھا مگر سلمیٰ ذہن سے غائب نہیں ہوتی تھی۔ وہ سٹپٹانے لگا۔

وہ رک گیا جیسے کسی نے اُسے پکارا ہو، یا جیسے اس کے ذہن میں اچانک کوئی خیال آ گیا ہو جو پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اُس نے اس خیال کو بھی جھٹک دینا چاہا مگر ناکام رہا۔ وہ جھنجھلایا اور پھر وہ اندر ہی اندر تڑپنے لگا۔

"سلمیٰ! سلمیٰ!"—— اُس کے دل نے واویلا بپا کر دیا—— "رُک جاؤ سلمیٰ! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے وہ محبت ہے جو میں نے کبھی نہیں کی تھی۔"

اُس نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ وہ صوفے پر گر پڑنے کی طرح بیٹھ گیا۔ کہنیاں گھٹنوں پر اور

سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ جس حقیقت کو اپنے آپ سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اُبھر کر سامنے آ گئی۔ جس چنگاری کو اُس نے سینے میں دبا رکھا تھا وہ بھک سے شعلہ بن گئی—— وہ سلمیٰ کی محبت میں جلنے لگا۔ بے حال ہونے لگا۔

☆

اُسے سلمیٰ کے بیٹے اصغر کا خیال آ گیا۔ اس کا دل یوں ڈوبنے لگا جیسے اس کا اپنا بچہ اُس سے چھین لیا گیا ہو۔ اصغر ذہین اور پیارا بچہ تھا۔ وہ اب نویں جماعت میں تھا۔ اس کے مستقبل کے لیے رجب علی نے کئی منصوبے بنائے تھے۔ اسے تو ماسٹر نے کلاس سے نکال دیا تھا۔ اس کے مستقبل پر سیاہ مہر ثبت ہو گئی تھی لیکن رجب علی اللہ کا ہاتھ بن کر آ گیا اور بچے کا مستقبل محفوظ ہو گیا۔

اب اصغر کی ماں نے اس کا مستقبل پھر تاریک کر دیا تھا۔ وہ رجب سے کہہ گئی تھی کہ میرے بیٹے کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ رجب علی سوچنے لگا کہ محنت مزدوری کرنے والی ماں اپنے بچے کو دس جماعتیں بھی نہیں پڑھا سکے گی۔ ایک ہونہار بچہ چھوٹے سے کسی کارخانے میں یا موٹر سائیکلوں کی ورکشاپ میں کام سیکھنے میں لگ جائے گا جہاں وہ بُری عادتوں کے سوا کچھ بھی نہیں سیکھ سکے گا۔

"میں اس بچے کو اُس کے باپ کی عظمت دوں گا"—— رجب علی کے سینے میں عزم بیدار ہُوا—— "پھر جلیل کی روح مجھے معاف کر دے گی۔"

وہ اٹھ کھڑا ہُوا اور اُس دروازے کی طرف دیکھنے لگا جہاں کچھ دیر پہلے سلمیٰ کھڑی تھی اور اُسے دھتکار کر چلی گئی تھی۔

"میں سلمیٰ کے گھر جاؤں گا"—— ذہن میں ایک اور ارادہ اُٹھا—— "اُسے مناؤں گا۔ اُسے اُس کے بچے کا واسطہ دوں گا۔ وہ مان جائے گی...... نہیں مانے گی۔ سمجھ بوجھ والی خوددار عورت ہے۔ مجھے اپنی دہلیز سے آگے قدم نہیں رکھنے دے گی۔ اگر ایسے ہُوا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ خدا کو شاید یہی منظور ہے کہ میں اپنے آپ کو سزائے موت دوں...... ہاں، مجھے منظور ہے۔ خون کا بدلہ خون!"

☆

کبھی انسان کسی کی محبت میں جلتا ہے کبھی اُسے کسی کی نفرت جلاتی ہے۔ محبت کسی اور سے ہوتی ہے اور نفرت کسی اور سے۔ کسی کی نفرت دل کو جلاتی ہے تو انسان کسی کی محبت کے مرہم سے نفرت کی جھلسن کو سرد کر لیتا ہے۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ایک ہی انسان کے ساتھ محبت بھی ہو اور نفرت بھی۔ محبت اور نفرت ایک ہی انسان پر مرکوز نہیں ہو سکتیں۔ کوئی ایسا کرے تو یہ اُس کا دماغی توازن بگڑنے کا ثبوت ہے، اور اگر ایک ہی انسان سے محبت بھی ہو اور نفرت بھی تو دماغی توازن بگڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ سلمیٰ اسی کیفیت میں مبتلا تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی سے اُسے اتنی نفرت تھی کہ اُسے وہ رجب علی کے ریوالور سے قتل کرنا چاہتی تھی۔ اُس کے سامنے دو رجب علی آ گئے—— ایک ہی صُورت، ایک ہی قد بُت۔ فرق یہ تھا کہ ایک پولیس کی وردی میں تھا اور دوسرا شہری کپڑوں میں۔

رجب علی کی طرح اُسے بھی ایک سال کی ملاقاتیں اور باتیں یاد آنے لگیں۔ ان یادوں میں وہ ایسی باتیں ڈھونڈنے لگی جن میں دھوکے اور فریب کا کچھ ثبوت یا ذرا سا اشارہ مل جاتے۔ اُسے ہر بات الٹی یاد آئی۔ اُس نے ہر بات سے اُلٹے معنی اخذ کرنے کی کوشش کی مگر اُسے کوئی بات یا رجب علی کی کوئی ایسی حرکت

یاد نہ آئی جس سے اُس کی نیت پر وہ شک کر سکتی۔

"مگر وہ قاتل ہے"۔۔۔ اس نے جھنجھلا کر اپنے آپ سے کہا۔۔۔ "اس نے مجھے بیوہ کر کے بھکاری بنا دیا ہے۔ میرے بچے کو اسی نے یتیم کیا ہے"

"کیا اتنا پیارا آدمی قاتل بھی ہو سکتا ہے؟"۔۔۔ اُس کی آنکھوں کے آگے یہ رجب علی آ گیا جو اب ڈی۔ ایس۔ پی نہیں تھا۔۔۔ "نہیں.... یہ انور علی ہے۔ اس نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے"۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس کے دانت غصے سے بجنے لگے۔۔۔ "یہی تھا.... لیکن...."

اس "لیکن" سے بھول بھلیاں شروع ہو گئیں اور وہ ان میں بھٹک گئی۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کس راستے سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ تن تنہا عورت، بیوہ، بے بس اور مجبور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اپنے سہاگ کے قاتل کو اس نے دیکھ لیا تھا۔ وہ محل میں رہتا ہے۔ ایک نادار بیوہ اُس کا بال بھی بیکا کرنے کی جرأت نہیں رکھتی تھی۔

اس بے بسی کے ساتھ اُسے یہ بھی یاد آ گیا کہ وہ اپنے خاوند کے قاتل کے ساتھ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی تھی۔ وہ رجب علی کے ساتھ لگ کر بیٹھا کرتی تھی۔ اُسے سلمٰی نے روح کا سکون اور پیار پیش کیا تھا۔ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا کرتی تھی۔ اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا کرتی تھی اور کبھی کبھی اسے اصغر سمجھ لیا کرتی تھی۔

اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا اور وہ شرمسار بھی ہونے لگی۔ تاسّف بھی تھا اور پچھتاوا بھی۔ اُس پر ہر طرف سے تیر برسنے لگے۔ وہ بے حال ہو گئی اور سر ہاتھوں میں تھام کر بچوں کی طرح بلبلا اٹھی۔ اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ کئی مہینوں سے نہیں روئی تھی۔ رجب علی کے ساتھ، سہارے اور باتوں نے اسے کبھی رونے نہیں دیا تھا۔ آج بند ٹوٹ گیا اور آنسوؤں کا سیل منہ زور ہو کے بہ نکلا۔

اُس نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ چونک کر دیکھا۔ اُس کا بچہ اصغر، سکول سے آ گیا تھا۔

اُس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن آنسو مسکراہٹوں میں چھپ نہیں جایا کرتے۔

"امّی!"۔۔۔ اصغر نے اداسیوں کے مارے ہوئے لہجے میں کہا۔۔۔ "آپ تو مجھے کہا کرتی ہیں کہ جو دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں اُن کی یاد میں رونا نہیں چاہیئے ورنہ انسان اپنی بہتری کی سوچ ہی نہیں سکتا.... آپ ابّو کو رو رہی ہیں نا امّی! کچھ اور تو نہیں ہُوا؟"

"نہ چاند! اور کچھ بھی نہیں ہُوا"۔۔۔ سلمٰی نے کہا۔۔۔ "تیرے ابّو یاد آ گئے تھے۔ اب نہیں روؤں گی"۔۔۔ مگر وہ اپنے آپ پر قابو نہ پا سکی۔

سلمٰی فہم و فراست اور سُوجھ بُوجھ والی عورت تھی۔ وہ اصغر کے سامنے رونے سے اس لیے گریز کیا کرتی تھی کہ بچے کی ذہنی نشوونما پر بُرا اثر پڑے گا۔ بچے کے ساتھ اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس میں مایوسی اور شکست کا تاثر ہوتا۔ بچے کے باپ کے متعلق وہ اسے صحیح بات بتایا کرتی تھی کہ وہ کس طرح مارا گیا تھا۔ اس سے بچے کے دل میں پاکستان کے حکمرانوں اور پولیس کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی لیکن سلمٰی نے اُس کے دل میں پاکستان کی محبت کم نہیں ہونے دی تھی۔ بچے میں اپنے باپ کے اوصاف اور باپ کا ہی قومی جذبہ نکھر آیا تھا۔ بچے نے اپنے آپ ہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ فوج میں جائے گا۔

اصغر کو ماں نے تفصیل سے بتایا تھا کہ اُس کا باپ عبدالجلیل خان اس لیے مارا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کے جاسوسوں کے خلاف محاذ بنا رہا تھا۔ سلمٰی نے اُسے مہر اللہ بخش اور چوہدری اکرم کے نام بھی بتائے تھے اور یہ بھی کہ یہ دونوں سیاسی لیڈر عبدالجلیل کے کیوں دشمن ہو گئے تھے لیکن سلمٰی نے اپنے بچے کے دل میں اپنے سیاسی لیڈروں کے خلاف کوئی دشمنی پیدا نہیں ہونے دی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یہ لوگ ہیں تو خطرناک لیکن اتنے نہیں جتنا ہندو ہے۔ دراصل سلمٰی اپنے بچے کو نفرت کے جذبے سے بچاتی تھی۔ نفرت صرف دشمن کی تھی جو اُس نے بچے کی سوچوں کا حصہ بنا دی تھی۔

اصغر کہا کرتا تھا۔۔۔ "میں بڑا ہو کر فوج میں جاؤں گا اور ہندوؤں کو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ انہیں پاکستان میں اپنے جاسوس بھیجنے کا ہوش ہی نہیں رہے گا"

اُس کے اس جذبے کو رجب علی نے پختہ کر دیا تھا۔ رجب علی نے بچے میں وقار اور خود اعتمادی پیدا کی تھی۔ اصغر تو رجب علی کو ہی اپنا باپ سمجھنے لگا تھا اور وہ اسے اپنا دوست بھی سمجھتا تھا۔ رجب علی کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا۔ اُس نے اصغر کو اپنا بچہ بنا لیا اور تمام تر پیار اُسے دے دیا تھا۔ اصغر جب رجب علی کی کوٹھی میں جاتا تھا تو وہ ہر کمرے میں یوں بھاگتا دوڑتا اور جس چیز کو چاہتا یوں اُلٹ پلٹ کرتا تھا جیسے وہ اسی کوٹھی میں جنا پلا ہو۔

سلمٰی کو روتے روتے ایک سوال پریشان کرنے لگا۔۔۔ "کیا اصغر کو بتا دوں کہ اُس کے باپ کا قاتل رجب علی ہے؟"۔۔۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ اُسے یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ بچے پر اس کا بہت بُرا اثر ہوگا۔ وہ رجب علی کی محبت سے دستبردار نہیں ہوگا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ بچہ اب پندرہ سولہ سال کا ہو گیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ باپ کے خون کا انتقام لینے کے لیے چل پڑے۔

سلمٰی اصغر کی غیر حاضری میں اداس ہوتی یا آنسو بہاتی تھی۔ ڈیوڑھی میں اُس کے قدموں کی آواز سنتے ہی مسکرانے لگتی تھی مگر آج وہ ایسی بے قابو ہوئی کہ اصغر کے بار بار کہنے کے باوجود وہ روتی ہی رہی۔ اُس نے اصغر کو اپنی گود میں ڈال لیا اور وہ اور زیادہ رونے لگی۔

اصغر پریشان ہو گیا۔ وہ اٹھا اور ماں سے یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ ذرا کھیلنے جا رہا ہے۔ سڑک پر جا کر وہ بس میں سوار ہو گیا۔

☆

ملک رجب علی ڈرائنگ روم میں دیوان پر لیٹا بڑے تکلیف دہ خیالوں میں کھویا ہُوا تھا۔ اسے ڈرائنگ رُوم میں قدموں کی آہٹ سنائی دی تو اُس نے اِدھر نہ دیکھا۔ وہ سمجھا خانساماں چائے لے کے آیا ہے۔ چائے کا وقت تھا۔ "السلام علیکم انکل" کی آواز پر وہ چونکا۔ وہ خانساماں نہیں اصغر تھا۔ رجب علی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ حیران بھی ہُوا کہ اصغر کیسے آ گیا ہے۔ کیا ماں کا کوئی پیغام لایا ہے یا.... وہ بدک کر اُٹھ بیٹھا۔ اصغر کے چہرے پر خوشی کا ہلکا سا بھی تاثر نہ تھا۔ وہ دیوان پر بیٹھ گیا۔

"امّی نے کچھ کہا ہے اصغر؟"

"نہیں انکل!"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "آپ میرے ساتھ چلیں۔ امّی رو رو کر اپنا بُرا حال کر رہی ہے۔ وہ ایسے تو کبھی نہیں روتی تھی۔ آج نہ جانے اُسے کیا ہو گیا ہے۔ روتے جا رہی ہے۔ میرے کہنے کا تو اُس پر کوئی اثر نہیں ہُوا"

"تمہیں امّی نے کچھ بھی نہیں بتایا کہ وہ کیوں رو رہی ہے؟"

"نہیں" — اصغر نے جواب دیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ کہنے لگا — "آپ ساتھ چلیں انکل! میں امّی کو روتا نہیں دیکھ سکتا۔"

رجب علی نے کچھ دیر سوچا کہ جاتے یا نہ جاتے لیکن اصغر کے آنسو دیکھ کر اُس نے نتائج کی پروا نہ کی اور اٹھ کھڑا ہُوا۔ کہنے لگا — "چلو اصغر! میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

☆

سلمیٰ کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ دستک دینے کی ضرورت محسوس نہ ہُوئی۔ سلمیٰ کی آنکھیں سُوج گئی تھیں۔ اُس نے اصغر کے ساتھ رجب علی کو اپنے گھر میں دیکھا تو وہ جم کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ اُس کے ہونٹ کانپے۔ اُس کے چہرے پر غصّے کی سرخی آگئی۔ اُس نے اصغر اور رجب علی کو گھور کر دیکھا۔ اصغر کو معلوم تھا کہ اُس کی ماں اور رجب علی میں بے تکلفی ہے۔

"دیکھا انکل!" — اصغر نے کہا — "ہمیں دیکھ کر بھی امّی خوش نہیں ہُوتی" — اور اُس نے اپنی ماں سے کہا — میں انکل کو گھر سے لایا ہوں۔"

"تم مجھے کہہ گئے تھے کہ کھیلنے جا رہے ہو" — سلمیٰ نے اصغر سے کہا — "اور جا پہنچے کہیں اور .... تم نے جھوٹ بولنا بھی سیکھ لیا ہے۔"

"ہوش میں آؤ سلمیٰ!" — ملک رجب علی نے کہا — "بچّے کو پریشان نہ کرو۔ یہ پریشانی میں میرے پاس آگیا۔ اسے میرے پاس ہی آنا چاہیئے تھا" — اُس نے اصغر سے کہا — "میں چائے چھوڑ کر تمھارے ساتھ آگیا ہوں .... یہ لو پیسے اور سموسے لے آؤ" — اُس نے اصغر کو سموسوں کی ایسی جگہ بتائی جو خاصی دُور تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اصغر ذرا زیادہ دیر کے لیے باہر رہے۔

"اس بچے کی زندگی تباہ نہ کرو سلمیٰ" — رجب علی نے کہا اور وہ سلمیٰ کے کہنے کے بغیر چارپائی پر بیٹھ گیا — "میں اس کے کہنے پر آیا ہوں۔"

"اور میں نے تمہیں اسی لیے نہیں کہا کہ نکل جاؤ میرے گھر سے کہ تمہیں اصغر لایا ہے" — سلمیٰ کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

"کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ اس کا باپ میرے ہاتھوں مرا تھا؟"

"نہیں" — سلمیٰ کے لہجے میں حقارت نمایاں تھی — "میری ایک بات اصغر کے آنے سے پہلے سن لو۔ میں اپنے بچے کو نفرت، دشمنی اور انتقام جیسے خطرناک جذبوں سے پاک رکھنا چاہتی ہوں۔ اسے میں یہی بتاتی رہوں گی کہ تم وہ نہیں ہو، تم انور علی ہو۔ میں اس کے ساتھ تمھارے خلاف کوئی بات نہیں کروں گی۔ تم مجھ پر اور میرے بچے پر یہ کرم کرو کہ آہستہ آہستہ اس سے دُور ہٹتے جاؤ۔ یہ جب دیکھے گا میں تمہارے ہاں اور تم میرے ہاں نہیں آ رہے ہو تو اس کی توجہ تم سے ہٹ جائے گی۔ جس طرح میں تمھاری زندگی سے نکل آئی ہوں اسی طرح تم میرے بچے کی زندگی سے نکل جاؤ۔"

"اس کے دل سے میری محبّت کم نہیں ہو سکتی" — رجب علی نے کہا — "اس نے مجھے اپنے باپ کا نعم البدل بنا لیا ہے۔ اس میں محرومی کا احساس پیدا نہ کرو۔"

"میں اپنے بچے کی بہتری دیکھ رہی ہوں۔"

"میں بھی بچے کی بہتری ہی دیکھ رہا ہُوں" — رجب علی نے کہا — "اِس کی فطرت میں تم زہر بھر دو گی۔"

"میں نے کہا ہے کہ میرے بچے سے اپنا اثر ختم کر دو" — سلمیٰ نے کہا — "اور عرض یہ کی ہے کہ آہستہ آہستہ تاکہ میرا بچّہ...."

"اصغر نہ تمھارا بچہ ہے نہ میرا بچہ" — رجب علی نے کہا — "یہ پاکستان کا بچّہ ہے۔"

"تم؟ ....." سلمیٰ نے دانت پیس کر کہا — "تم پاکستان کا نام لیتے ہو؟ پاکستان پر جانیں قربان کرنے والوں کے قاتل کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ پاکستان کو اپنا ملک کہے؟ .... میں ایک بیوہ تم جیسے جاگیردار کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی لیکن تم مجھے اس سے نہیں روک سکتے کہ میں تمہیں دھتکار دوں۔"

اصغر آگیا۔ سلمیٰ نے اُس سے کہا — "بیٹا! تم سکول کا کام کر لو۔ چائے تیار ہو گئی تو تمہیں بلا لوں گی۔"

اصغر کمرے میں چلا گیا۔ سلمیٰ باورچی خانے میں چلی گئی۔ رجب علی بھی باورچی خانے میں چلا گیا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے انتقام نہیں لے سکتیں" — رجب علی نے کہا — "مجھے تمہارا ذرا سا بھی ڈر نہیں، پھر بھی تمھارے پاس آگیا ہُوں۔ میں تم سے جان بخشی نہیں کرا رہا۔ کوئی بات ہے سلمیٰ! کوئی وجہ ہے کہ آگیا ہُوں۔"

سلمیٰ نے اسے گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اس بکواس کا مطلب کیا ہے۔

"میں اصغر سے دور نہیں ہٹ سکوں گا" — رجب علی نے کہا — "اور .... اور .... میں تم سے بھی دُور نہیں ہٹ سکوں گا۔"

سلمیٰ نے اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

"سزا دینا چاہتی ہو تو حاضر ہوں" — رجب علی نے کہا — "جس طرح تم نے کہا ہے کہ میں تمہیں اس سے نہیں روک سکتا کہ تم مجھے دھتکار دو اسی طرح تم مجھے نہیں روک سکتیں کہ تمہاری محبت کو اپنے وجُود میں پالتا اور گُڑھتا رہوں۔"

سلمیٰ نے سر کو جھٹک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی نظروں میں قہر بھی تھا اور حیرت بھی۔

"سلمیٰ!" — اب اُس نے بڑی جاندار اور جذباتی آواز میں کہا — "میری زندگی میں کئی عورتیں آئی ہیں۔ میری بیوی بھی تھی۔ یہ سب تم سے زیادہ خوبصورت تھیں مگر میں محبت کے نام سے ناآشنا رہا۔ وہ جسم کا معاملہ تھا۔ جسے محبت کہتے ہیں وہ تم نے میرے دل میں پیدا کی ہے۔"

"تم پاپی ہو" — سلمیٰ غصے کے غلبے میں اتنا ہی کہہ سکی۔

"میں شرابی بھی تھا" — رجب علی نے کہا — "میں نے تمہارے سامنے اپنی مری ہوئی بیوی کا کبھی نام بھی نہیں لیا تھا۔ وہ ایک جسم تھا جو میرے جسم کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ وہ جسم خاک میں مل گیا ہے۔ میں نے اُس کی یاد کو بھی خاک میں ملا دیا ہے۔ مجھے محبت تم نے دی ہے۔ میں اس حقیقت کو اب چھپا نہیں سکتا.... اور تم اس حقیقت کو مجھ سے چھپا لو، اپنے آپ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکو گی کہ تمھارے دل میں میری محبّت ہے۔"

"اگر ہے تو بھی میں ایک قدم بھی تمھارے ساتھ نہیں چل سکتی" — سلمیٰ نے کہا اور اصغر کو آواز دے کر کہا کہ چائے تیار ہے۔ اُس نے رجب علی سے کہا — "اصغر کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔"

اصغر آیا تو سلمیٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اُس کا قہر اور عتاب غائب ہوگیا۔ چائے کے بعد ملک

رجب علی جانے کے لیے اُٹھا۔ سلمیٰ دروازے تک اُس کے ساتھ گئی۔

"میں صرف یہ کہنے کے لیے تمھارے ساتھ آئی ہوں کہ مجھے اور میرے بچے کو ذہن سے اتار دو۔"
سلمیٰ نے کہا۔

رجب علی نے نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ سلمیٰ نے اُسے دیکھا۔ دونوں خاموش کھڑے رہے۔ سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ تیزی سے گھومی اور اندر چلی گئی۔

☆

ملک رجب علی اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ کبھی وہ یوں محسوس کرنے لگتا کہ اُس کے ذہن اور جسم کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ کبھی اُسے یوں لگتا جیسے اس کا ذہن آگے نکل گیا ہے اور جسم پیچھے رہ گیا ہے۔ اُس نے شام کا کھانا بھی اسی کیفیت میں کھایا تھا۔ اُسے نوکر نے بتایا تھا کہ اس نے کھانا آدھا کھایا ہے۔ نوکر نے اُس سے پوچھا بھی تھا کہ طبیعت ٹھیک تو ہے؟ اُس نے بے خیالی میں کہا تھا "ٹھیک ہوں" ـــ اور نوکر نے خانساماں سے کہا تھا کہ آج ملک صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ رجب علی تو جیسے کھانے پینے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

اُس نے سلمیٰ کی محبت کو لاشعوری طور پر دبا رکھا تھا۔ اپنی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے متعلق ہوتے ہوئے انسان کہتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں۔ وہ ان باتوں کو اپنے آپ سے چھپائے رکھتا ہے مگر رجب علی اس راز کو اپنے آپ سے چھپا نہ سکا کہ سلمیٰ کی محبت نے اُسے وہ رجب علی رہنے ہی نہیں دیا جو کبھی ہُوا کرتا تھا۔ اُس نے سلمیٰ سے ٹھیک کہا تھا کہ اُس نے محبت کا ذائقہ کبھی نہیں چکھا تھا۔ وہ جسم کا بندہ تھا۔ جسم کی آسائش، کیف اور لذّت کو اوّل اور آخر سمجھتا تھا۔ اس میں کبھی کمی بیشی ہو جاتی تو اُس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ ذرا سی کمی کو وہ شراب سے پورا کر لیا کرتا تھا مگر اب سلمیٰ نے اُسے دھتکار دیا تو اس نے اپنی ذات اور اپنے وجود میں ایک مہیب خلا محسوس کیا۔ کبھی تو اُسے بے وزنی کا احساس ہونے لگتا جیسے اُس کے آگے پیچھے، اُوپر نیچے، دائیں بائیں کچھ بھی نہیں اور وہ معلّق ہے اور اُس کا وزن بال کے ایک ٹکڑے جتنا بھی نہیں اور کبھی اُس پر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اوپر نیچے، آگے پیچھے، دائیں اور بائیں، پانی ہی پانی جو کبھی گدلا ہو جاتا کبھی اتنا شفاف کہ اُسے سب کچھ نظر آنے لگتا مگر سب کچھ صرف سلمیٰ تھی۔

اُس کی زندگی میں کئی عورتیں آئی تھیں جن میں سے دو اُسے اتنی اچھی لگی تھیں کہ وہ محسوس کیا کرتا تھا کہ یہ نہ ہوئیں تو کیا ہوگا۔ وہ وقت آ ہی گیا کہ وہ نہ رہیں۔ وہ دوسروں کی بیویاں تھیں۔ رجب علی سروس میں تھا، کسی اور جگہ بھیج دیا گیا۔ اُس نے بس اتنا سا محسوس کیا تھا جیسے اُس کی زندگی کی ریل گاڑی ایک سٹیشن پر رُکی تھی اور اب اگلے سٹیشن پر رُکنے کے لیے دوڑی جا رہی ہے مگر سلمیٰ نے اُس پر یہ کیفیّت طاری کر دی تھی کہ وہ ایک انچ آگے بڑھنے سے معذور ہو گیا تھا۔

"نہیں، سلمیٰ، نہیں" ـــ اُس نے ٹہلتے ٹہلتے رُک کر زیرِ لب کہا ـــ "تم نہ ہوئیں تو میں آگے نہیں چل سکوں گا۔ میرے سفر کی منزل تم ہی ہو۔ میں بڑی دشوار اور کٹھن راہوں پر چلتا تم تک پہنچا ہُوں۔"

محبّت کی اس دیوانگی میں وہ اصغر اور اُس کے باپ عبدالجلیل خان کو نہیں بھُولا تھا۔ اُسے اصغر بار بار یاد آیا۔ اسے سلمیٰ پر غصہ آ گیا کہ اس عورت نے اُس سے اصغر چھین لیا ہے ـــ اور جب اسے عبدالجلیل

خان یاد آیا تو اس نے دل ہی دل میں بلبلا کر کہا ـــ "میرے دوست! اب مجھے اپنا خون بخشو چاہے نہ بخشو لیکن دیکھ لو میں نے تمھاری عزت اور آبرو کو اپنی عزت اور آبرو سمجھا ہے۔ میں نے خیانت نہیں کی... مجھے اپنی جگہ لے لینے دو جلیل! مجھے اپنی رفعتوں تک آ جانے دو۔ مجھے اپنی روح دے دو۔"

اُسے سلمیٰ کی خشمگیں آنکھیں یاد آ گئیں۔ وہ چہرہ اُس کے سامنے آ گیا جس پر نفرت کا گہرا تاثر تھا۔ اُسے قہر بھری سرگوشی سنائی دی ـــ "میرے بچے کی زندگی سے نکل جاؤ... قاتل... خونی... دھوکہ باز... فریبی... تم؟... تم کس منہ سے کہہ رہے ہو کہ تم پاکستانی ہو؟... اس ملک کے ساتھ تمھارا کوئی تعلق نہیں۔"

"نفرت... نفرت... یہ ہے سزا... نہیں۔ میں یہ اذیّت نہیں سہہ سکوں گا۔ مجھے سزائے موت دو۔"

اس کا ذہن صاف ہو گیا۔ خلا پُر ہو گیا۔ وہ پانی سوکھ گیا جس میں وہ ڈوب رہا تھا۔ چہرے غائب ہو گئے اور رجب علی اکیلا رہ گیا۔ یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جس میں انسان بڑا ہی بھیانک اور اپنی زندگی کا آخری فیصلہ کیا کرتا ہے۔

رجب علی تیز قدم چلتے ہوئے اُس میز تک گیا جس کی دراز میں اُس نے ریوالور رکھا ہُوا تھا۔ اس نے ریوالور نکالا۔ اس میں چھ گولیاں ڈالیں اور بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆

اصغر لڑکپن کی گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ سلمیٰ رجب علی کی طرح جاگ رہی تھی۔ روتی بھی رہی تھی۔ اس پر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ اُس نے بھی محسوس کیا تھا کہ اُس کا وزن رہا ہی نہیں اور وہ اُس خلا میں اُڑی جا رہی ہے جس میں اُس کے بے وزن جسم کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

دروازے پر دستک ہُوئی۔ وہ یوں چونکی جیسے کسی نے اُس کے پہلو میں خنجر اتار دیا ہو۔ اُس کا چہرہ لال سُرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اُٹھی اور دروازے کی طرف یوں چل پڑی جیسے بہت تیز چلنا چاہتی ہو اور جیسے چلنا ہی نہ چاہتی ہو۔ ڈیوڑھی میں سے گزر کر اس نے دروازہ کھولا اور لرزتی ہُوئی آواز میں بولی ـــ "کیوں آئے ہو؟"

رجب علی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سلمیٰ کو ایک طرف کر کے اندر چلا گیا اور دروازہ بند کر دیا۔

"میں آیا نہیں سلمیٰ!" ـــ رجب علی نے ایسی آواز سے کہا جو بہت دُور سے آ رہی تھی ـــ "میں جا رہا ہوں۔ پھر کبھی نہیں آؤں گا... تم نے میرا ریوالور دیکھ کر کہا تھا کہ تمھیں ریوالور مل جائے تو اپنے سہاگ کے قاتل کو صرف ایک گولی مارو گی... میں تمھارے لیے ریوالور بھی لے آیا ہوں اور قاتل کو تمھارے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔ یہ لو ریوالور لیکن یہاں نہیں۔ یہاں پکڑی جاؤ گی۔ میں پولیس آفیسر رہا ہوں۔ تمھیں ایسی جگہ لے چلوں گا جہاں پولیس کو صرف میری لاش ملے گی۔ قاتل کا سراغ نہیں ملے گا... آؤ سلمیٰ! مجھے میری زندگی کا آخری سکون دے دو۔"

رجب علی کی آواز میں طنز نہیں تھی۔ چالبازی نہیں تھی۔ بناوٹ نہیں تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ اداکاری نہیں کر رہا۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے کھنڈر کے اندر سے چیتھڑوں جیسے جالوں میں پھنس پھنس کر آ رہی ہو۔ سلمیٰ چپ چاپ کھڑی رہی۔

"میں سمجھتا تھا میں نے گناہ کا کفّارہ ادا کر دیا ہے" ـــ رجب علی نے کہا اور اُس نے سلمیٰ کو بتانا شروع کر دیا کہ اُس نے اپنے مستقبل پر لات مار کر استعفیٰ دے دیا، پھر اُسے عبدالجلیل خان کے والد ہمیں نظر آتے ہے اور پھر اُسے اصغر مل گیا۔ رجب علی نے اس اذیّت ناک دَور کی ہر ایک بات سلمیٰ کو سنائی اور کہا ـــ "میرے

پاس روپیہ پیسہ ہے سکون کے جتنے ذریعے چاہوں خرید سکتا ہوں۔ میں شراب پیا کرتا تھا مگر شراب چھوڑ دی۔ تم آئیں تو میرا سکون آ گیا۔ روح نے پہلی بار وہ مسرّت پائی جو نہ شراب دے سکتی ہے نہ کوئی حسین گناہ.... مگر سلمیٰ! ابدی سکون کے لیے مجھے موت کے راستے پر جانا ہوگا۔ میں آگیا ہوں اس راستے پر۔ صرف فیصلہ اور ارادہ کر لینے سے ہی روح مسرور ہوگئی ہے۔"

"اگر تمھارے دل میں واقعی میری محبّت ہے تو چلے جاؤ"—— سلمیٰ نے رندھی ہُوئی آواز میں کہا——"خدا کے لیے چلے جاؤ.... اور.... اور.... اصغر اگر تمھارے پاس آنا چاہے تو میں.... میں.... اسے نہیں روکوں گی لیکن اس سے دور ہٹنے کی کوشش کرتے رہنا۔"

"میں تم سے بخشش مانگنے نہیں آیا سلمیٰ!"—— رجب علی نے ایسی آواز میں کہا جو دبی ہُوئی تو تھی لیکن اس میں فیصلہ اور عزم تھا——"اب اصغر آئے گا تو کس کے پاس آئے گا۔ اب اُسے میرے پاس آنے سے روک دینا۔ کہنا تمھارا انکل تمھارے ابّو کے پاس خون بخشوانے چلا گیا ہے۔"

سلمیٰ گم صم کھڑی تھی۔ رجب علی کے لب و لہجے نے اس کی زبان گنگ کر دی تھی۔ رجب علی نے اس کا ایک ہاتھ پکڑا اور اس ہاتھ کو آنکھوں سے پھر ہونٹوں سے لگایا۔

"خدا کو یہی منظور تھا"—— رجب علی نے جیسے سسکی لی ہو——"سزائے موت۔ خون کا بدلہ خُون"—— اور وہ ڈیوڑھی سے نکل گیا۔

سلمیٰ وہیں کھڑی رہی جیسے اس کی آنکھ لگ گئی ہو۔ کچھ دیر گزر گئی اور وہ بیدار ہوگئی۔ اُس کے کانوں میں پہلی آواز یہ گونجی——"اب اصغر آئے گا تو کس کے پاس آئے گا.... خدا کو یہی منظور تھا.... خون کا بدلہ خون۔"

گزرے ہوئے ایک سال میں سلمیٰ رجب علی کے اتنا قریب ہوگئی تھی کہ اُس کی فطرت اور شخصیت کی گہرائیوں تک چلی گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شخص محض بات کرنے کی خاطر بات نہیں کیا کرتا۔

ڈیوڑھی میں ایک بگولہ اٹھا جس نے سلمیٰ کو لپیٹ میں لے لیا—— بڑی بھیانک آواز—— سلمیٰ کی دنیا ایک چکر میں، بھنور کی طرح، بڑی تیز گھومنے لگی۔ وہ دوڑتی اندر گئی۔ چادر اُٹھائی اور پھر رک گئی جیسے کسی سوچ نے فیصلہ بدل دیا ہو۔ اُس کی تیزی اور تندی ختم ہوگئی مگر اُس کے ہاتھوں نے چادر اُس کے سر پر ڈال دی۔ اُس نے دوسرے کمرے میں دیکھا۔ اصغر سویا ہُوا تھا۔ سلمیٰ چادر کو اچھی طرح اوڑھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ سڑک پر جاتے ہی اُسے تانگہ مل گیا۔ اُس نے پیسے نہ پوچھے۔ اُسے جہاں جانا تھا وہ تانگے والے کو بتایا اور یہ کہہ کر کہ بہت جلدی میں ہوں، بہت تیز چلنا ہے، تانگے میں سوار ہوگئی۔

☆

ملک رجب علی اُس ذہنی کیفیت کی آخری سٹیج پر پہنچ چکا تھا جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی، یا کم از کم انسان اپنی کوشش سے واپس نہیں آسکتا۔ نفسیات کے عالموں نے اسے ایک لمحے کا پاگل پن کہا ہے۔ قتل اور خودکشی کی وارداتیں اسی ایک لمحے میں ہُوا کرتی ہیں۔

رجب علی اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ ریوالور اُس کے سامنے میز پر پڑا تھا۔ اُس نے لکھتے لکھتے جب یہ الفاظ لکھے——"تمام زرعی زمین جس کے کاغذات موجود ہیں، علی اصغر ولد عبدالجلیل خان مرحوم کے نام کر دی جائے اور یہ کوٹھی سلمیٰ بیوہ عبدالجلیل خان مرحوم کی ملکیّت میں دے دی جائے"—— تو اُس کی آنکھوں سے دو آنسو اس تحریر پر گر پڑے۔ وہ لکھ چکا تھا کہ وہ کیوں خودکشی کر رہا ہے۔ اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ پاکستان کا دشمن پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اُسے ایک ہی صورت میں پاکستان پر فتح حاصل ہوگی کہ پاکستان کے لیڈر در پردہ اُس کے ہاتھ مضبوط کریں اور اپنے دماغ میں اقتدار کے کیڑوں کی پرورش کرتے رہیں۔ وہ وقت بڑی تیزی سے آ رہا ہے۔

اُسے برآمدے میں بڑے تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی لیکن وہ دنیا کی آوازوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اُسے یہ محسوس کرنے کا بھی ہوش نہ تھا کہ ان قدموں کی آہٹ اس کے قریب آ کر رک گئی ہے اور دو آنکھیں اس تحریر کو پڑھ رہی ہیں جس پر اُس کے آنسو گرے ہیں۔

ایک ہاتھ نے لپک کر ریوالور اٹھا لیا۔ تب رجب علی بیدار ہُوا۔ اس نے دیکھا۔ وہ سلمیٰ تھی۔ وہ ہانپ رہی تھی جیسے دوڑتی آئی ہو۔ سلمیٰ نے ریوالور کھولا اور اس کے سلنڈر سے چھ گولیاں نکل کر قالین پر بکھر گئیں۔ اُس نے ریوالور اتنی زور سے پھینکا کہ دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اُس نے وہ کاغذ جس پر رجب علی وصیّت لکھ رہا تھا پھاڑ کر اس کے سی ٹکڑے کر دیے اور یہ ٹکڑے ریوالور کی گولیوں کے ساتھ بکھر گئے۔

سلمیٰ اور رجب علی ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ سلمیٰ کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اُس کا سر ڈولا اور اُس نے سر رجب علی کے سینے پر پھینک دیا۔ رجب علی نے اُسے اپنے بازوؤں کی پناہ میں لے لیا۔ سلمیٰ کا جسم ہچکیوں سے ہل رہا تھا۔ پھر اُس نے رجب علی کے بازوؤں سے نکل کر اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"نہیں نہیں"—— وہ سر کو جھٹک جھٹک کر کہہ رہی تھی——"اپنی محبت کو خودکشی نہیں کرنے دوں گی"—— اور وہ رجب علی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆

وہ ایک خاموش سی تقریب تھی۔ سلمیٰ کے پڑوسیوں کو اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ یہاں سے چلی گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ پہلے چوری چھپے کرتی تھی، اب باقاعدہ پیشہ کرے گی۔ کسی نے کہا کہ پولیس کا ایک ڈی۔ ایس۔ پی اُس کے پاس آیا کرتا تھا۔ اس پر کسی نے کہا کہ پولیس کی مخبر بنے گی۔ پڑوس کے بہت سارے منہ تھے۔ ہر منہ نے اپنی سی کہی۔ سلمیٰ کے چلے جانے کے تیسرے روز سلمیٰ کا مکان فروخت ہوگیا۔ رجب علی نے اس محلّے سے سلمیٰ اور اصغر کا نام و نشان ہی مٹا دیا۔

اور وہ ایک خاموش سی تقریب تھی۔ رجب علی سلمیٰ اور اصغر کو اُن کے سامان سمیت دو روز پہلے اپنی کوٹھی میں لے گیا تھا۔ آج کی تقریب میں ارشد کا باپ اشفاق احمد تھا، ارشد کا بھائی یوسف تھا، اور طاہرہ اور ارشد کو بھی راولپنڈی سے بلوایا گیا تھا۔

ان کے علاوہ ایک نکاح خوان تھا جس نے رجب علی اور سلمیٰ کا نکاح پڑھا۔ اس تقریب میں آنسو مسکراتے اور مسکراہٹیں روتیں اور "مبارک، مبارک" کی پُرمسرّت آوازوں نے آنسوؤں اور مسکراہٹوں کو گلے ملا دیا۔

اس تقریب سے بے نیاز اصغر اور ارشد کا بیٹا طاہر پرویز لان میں بیٹھے ہنس کھیل رہے تھے۔ طاہر پرویز کی عمر نو سال سے کچھ اوپر ہوگئی تھی۔ یہ ان کی دوسری ملاقات تھی۔ طاہر پرویز نے اصغر سے پوچھا کہ وہ پڑھ کر کیا کرے گا۔

"ابھی میری عمر سولہ سال نہیں ہُوئی" — اصغر نے کہا — "سترہ سال کا ہو جاؤں گا تو ابّو مجھے فوج میں بھیج دیں گے۔ میں فوج میں ہی جانا چاہتا ہوں۔"

"میرے ابّو اور امّی بھی مجھے فوجی بنائیں گے" — طاہر پرویز نے کہا — "میں ٹینک چلاؤں گا اور گولیاں چلانے والا ہوائی جہاز بھی چلاؤں گا۔"

اصغر ہنس کے بولا — "ٹینک فوج میں ہوتے ہیں اور ہوائی جہاز ایئر فورس میں۔ تم دونوں میں تو نہیں جا سکتے۔"

طاہر پرویز ابھی بچہ تھا کہنے لگا — "میں کبھی فوج میں رہا کروں گا کبھی ایئر فورس میں۔"

"ٹینک اور ہوائی جہاز سے کس پر گولیاں چلاؤ گے؟"

"ہندوستان پر" — طاہر پرویز نے سبق سنانے کے انداز سے کہا — "امّی نے مجھے بتایا ہے کہ ہندو ہمارے ملک کا اور اسلام کا بہت بڑا دشمن ہے۔ اس نے مجھ جیسے لاکھوں مسلمان بچے مار ڈالے تھے۔ میں ان بچوں کے خون کا بدلہ لوں گا اور جب ہمارا دشمن پاکستان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے گا تو میں اسے اپنے ٹینک کے گولے سے اُڑا دوں گا۔"

۷/۸ راکتوبر ۱۹۵۰ء کی درمیانی رات —

رجب علی اور سلمٰی کی ازدواجی زندگی کی پہلی رات!

سابق ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی کے ضمیر پر جس جرم کا آسیب طاری تھا وہ طاری ہی رہا۔

سلمٰی پر حجاب بھی طاری تھا اور جھینپ بھی۔ یہ احساس اُسے بے چین کیے ہُوئے تھا کہ وہ اپنے خاوند کے قاتل کی بیوی بن گئی ہے۔ کبھی وہ رجب علی کو یوں دیکھتی جیسے وہ اس شخص کے جُرم میں شریک ہو، جیسے دونوں نے مل کر ایک جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ کبھی اُسے رحم طلب نگاہوں سے دیکھتی جیسے اس شخص نے اُسے پناہ میں لے لیا ہو اور اگر اُس نے جرم ہی کیا ہے تو یہ شخص اُسے سزا سے بچا لے گا۔

دونوں مسرور تھے لیکن اُن کی مسرّت اُس مسافر کی مانند تھی جو چلچلاتی دھوپ میں چلا جا رہا ہو۔

"میرا سینہ جل رہا ہے سلمٰی!" — رجب علی نے کہا — "میں یہ انگارے تمھارے آگے اُگل دینا چاہتا ہوں۔ میں تمھیں نہیں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہُوں کہ میں نے تمھاری مجبوری اور کسمپرسی سے فائدہ نہیں اٹھایا اور میں نے...."

"آپ وہ انگارے میری ڈیوڑھی میں اُگل چکے ہیں" — سلمٰی نے کہا — "مجھ میں اب یہ روئیداد سُننے کی ہمّت نہیں.... ایک بار سن لی ہے۔ اب ہمّت اس لیے نہیں کہ اس میں جلیل کا نام بار بار آتا ہے۔ میں ایسے محسوس کر رہی ہوں جیسے میں نے جلیل کو دھوکہ دیا ہے، جیسے میں بھی اُس کے قتل میں شریک ہوں" — اُس نے رجب علی کے چہرے پر نظریں جماتے ہُوئے اور ذرا توقّف سے کہا — "آپ کہتے ہیں کہ آپ نے میرے ساتھ شادی کر کے گناہوں کا کفّارہ ادا کیا ہے لیکن میرے احساسات کچھ اور ہیں۔"

"محبّت بھی ایک وجہ تھی سلمٰی" — رجب علی نے کہا — "لیکن میں نے تمھیں پناہ میں لیا ہے۔ تم نے بیوگی دیکھ لی ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ خاوند کے بغیر عورت کس طرح بدنام ہو جاتی ہے۔ لوگ اُس کی ہر حرکت پر نظر رکھتے ہیں...."

"میرے محلّے والوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میرا یارانہ ایک ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ لگ گیا ہے" — سلمٰی نے کہا — "میں کسی کا منہ بند نہیں کر سکتی تھی۔"

"لوگ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے دوسروں کو گناہگار کہتے ہیں" — رجب علی نے کہا — "تم اتنا نہیں جانتیں جتنا میں جانتا ہوں۔ معاشرے کو جتنا ایک پولیس آفیسر جانتا ہے اتنا ایک گھریلو عورت نہیں جان سکتی۔ تم جیسی خوبصورت بیوہ کو رسوا کر کے وہ بھی خیالوں میں جنسی لذّت حاصل کرتے ہیں۔ طوائفیں اسی معاشرے کی پیداوار ہیں جو 'عصمت فروشی بند کرو' کے نعرے لگاتا رہتا ہے۔ مجھے تم نہ بتاتیں تو بھی میں جانتا تھا کہ تم بدنام ہو رہی ہو۔ آج جو عورتیں تمھیں بدکار اور دریدہ یار اپنے

لگانے والی کہتی رہی ہیں وہ عبدالجلیل خان کو ہوس کی نگاہوں سے دیکھتی رہی ہوں گی۔ عبدالجلیل خان خوبصورت جوان تھا۔ سب اُس کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنا چاہتی تھیں۔ سب کچھ جانتے ہُوئے میں تمہیں اس اذیّت سے نکالنا چاہتا تھا۔"

سلمٰی اس اذیّت کو برداشت کرتی رہی تھی مگر ایک مرد کی پناہ میں آکر اُس نے محسوس کیا کہ یہ اذیّت کس قدر تلخ، زہرناک اور ناقابلِ برداشت تھی۔ اُس نے رجب علی کا ہاتھ پکڑ لیا پھر اپنا سر رجب علی کے سینے پر پھینک دیا، جیسے وہ تھک کر چُور ہو گئی ہو اور اب اکیلے اور بے سہارا چلنے کی ہمّت نہ رہی ہو۔

"..... اور تم اپنے آپ پر ایک جرم کا بوجھ محسوس کر رہی ہو" — رجب علی نے کہا — "اس بوجھ کو اُتار پھینکو۔ شادی کیے بغیر تم اپنے بچّے کو اچھا پہنا اور اچھا کھلا سکتی تھیں مگر اُسے یتیمی اور محرومی کے احساس سے نجات نہیں دلا سکتی تھیں۔ محرومی کا احساسِ اصغر کی شخصیّت اور کردار کی نشوونما روک دیتا۔ اب بچہ سر اونچا کر کے بات کر سکتا ہے۔"

رجب علی کے اپنے ضمیر پر جُرم کا بوجھ پڑا ہُوا تھا مگر اُس نے سلمٰی کے ضمیر سے بوجھ اتارنے کے لیے اتنی زیادہ باتیں کیں تو اُس کا اپنا بوجھ اُتر گیا۔ وہ بولنا جانتا تھا۔ دلائل گھڑنے کے فن کا ماہر تھا اور اُس نے یہ مہارت پولیس میں حاصل کی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا اور سلمٰی کو بھی لیکن اُس نے اس اعتراف کو دہرایا کہ سلمٰی اُس کے دل میں اُتر گئی تھی۔

★

دوسری ازدواجی زندگی کی پہلی رات گزرتی جا رہی تھی۔

"جلیل نے جو تحریک شروع کی تھی، کیا وہ اُسے شروع کرنی چاہیئے تھی؟" — سلمٰی نے آہ بھر کر کہا — "اُس نے اس تحریک پر جان دے دی ہے۔"

"میں اُس کی تحریک کو زندہ کروں گا" — رجب علی نے پُرعزم لہجے میں کہا — "میری روح کو سکون اسی طرح ملے گی کہ جس تحریک کی خاطر وہ میرے ہاتھوں مرا ہے اسے میں زندہ کروں اور اس کے لیے اپنی زندگی وقف کر دوں۔"

"کیا اس سیاست کے خلاف بھی ایک تحریک نہیں چلنی چاہیئے جس نے ہمارے ملک میں اُنہیں بھی حکومت میں شامل کر لیا ہے جو نظریۂ پاکستان کے خلاف تھے؟" — سلمٰی نے پوچھا۔

"عبدالجلیل کی تحریک ہندوستان کے اُن ایجنٹوں اور جاسوسوں کے خلاف تھی جنہیں ہمارے ملک میں پناہ اور تحفّظ حاصل ہے" — ملک رجب علی نے کہا — "غور سے دیکھو تو یہ تحریک اس سیاست کے بھی خلاف ہے جو ہمارے ملک میں رائج ہے۔ یہ اقتدار کی سیاست ہے۔ اقتدار کی خاطر دشمن کو دوست بنانا پڑے تو بنا لیا جاتا ہے۔ دشمن کے کچھ مطالبے ہوتے ہیں جو وہ منوا کر دوست بنتا ہے لیکن یہ مطالبے اپنے ملک کی سلامتی کے خلاف ہوتے ہیں۔ یہ دوستی در پردہ ہوتی ہے۔ یہ مجھ سے پوچھو سلمٰی! ان خفیہ دوستیوں کا تحفّظ پولیس سے کروایا جاتا ہے۔"

"کتنی محبت تھی میرے دل میں پاکستان کی اور اپنی قوم کی....."

"تھی نہ کہو سلمٰی!" — رجب علی نے کہا — "ہے کہو۔ یہ وہی پاکستان ہے جو ہم نے خون کی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے، اور یہ وہی قوم ہے جس نے خون کی قربانیاں دی تھیں۔"

"گیارہ برسوں میں اس قوم کو لوگوں کا ہجوم بنا دیا گیا ہے۔"

"اور ہر فرد اس ہجوم میں اکیلا ہے" — ملک رجب علی نے کہا — "ہجوم میں ہوتے ہُوئے ہر شخص تنہائی محسوس کر رہا ہے۔ اس ہجوم کو مجبور کر دیا گیا ہے کہ اپنے شہیدوں کو دفن کر دے۔ لوگوں نے شہیدوں کو اپنے سینوں میں دفن کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہر شخص چلتا پھرتا مقبرہ بن گیا ہے۔ یہ اس سیاست کا کرشمہ ہے جو ہمارے ملک میں رائج ہے۔"

"انجام کیا ہو گا؟"

"لوگ اُٹھیں گے" — رجب علی نے کہا — "وہ پھر قوم بنیں گے۔"

"میں تو مایوس ہوتی جا رہی ہُوں" — سلمٰی نے کہا — "اقتدار کی خاطر سیاستدانوں کی مسلسل معرکہ آرائی نے قوم کو کیا دیا ہے؟ گیارہ برسوں میں لوگ گیارہ سے زیادہ وزیرِاعظم اور وزارتیں دیکھ چکے ہیں۔ جو بھی آیا وہ پاکستان کو تباہی کے قریب لے گیا۔ قومی وقار اور جذبوں کا لہو سیاسی اقتدار کی قربان گاہ پر ٹپکایا جا رہا ہے۔"

ملک رجب علی اور سلمٰی ہی نہیں، اُن دنوں جہاں دو چار آدمی اکٹھے ہو جاتے یہی باتیں کیا کرتے تھے۔ لوگ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ وہ کرنا بہت کچھ چاہتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اُن کا اپنا ملک اُن کے اپنے حکمرانوں کے ہاتھوں لُٹ رہا ہے اور حکمرانوں کو صرف حکمرانی کے ساتھ دلچسپی ہے ملک کی سلامتی اور بقا کے ساتھ نہیں۔ اپنے ملک کی قیمت صرف قوم جانتی تھی لیکن لیڈرشپ اقتدار پرست ہو گئی اور قوم کا دل کھوکھلے نعروں اور جذباتی تقریروں سے پرچا رہی تھی۔ پہلے وزیر ہوتے تھے پھر ہر وزارت میں ایک نائب وزیر کا اضافہ ہو گیا۔ وزارتیں ٹوٹتے دیر نہیں لگتی تھی۔ آج کا وزیرِاعظم کل نئے وزیرِاعظم کی حکومت کے خلاف جلوس کی قیادت کر رہا ہوتا تھا۔ ایک پریذیڈنٹ سیاست اور سیاسی قیادت کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

عدل و انصاف کو نیلام گھر میں رکھ دیا گیا تھا۔ اب تو پیسے کا کھیل تھا۔ کسمپرسی اور نفسانفسی کی کیفیّت پیدا ہو گئی تھی۔ جذبے پیٹ کے تنور میں جلنے لگے تھے۔ لوگوں کی ذہنیّت بدلنے لگی تھی۔ لوگ اپنی اپنی پسند کے لیڈروں کی زبان میں باتیں کرتے اور اپنی اپنی پسند کی سیاسی پارٹیوں کے جلوسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ان کے لیڈران کے منہ میں جو نعرے دیتے وہ لگاتے تھے۔

یہ ایسا عمل ہے جو انسانوں میں جوش تو بھر دیتا ہے لیکن لائحہ عمل سے محروم رکھتا ہے۔ انسان کچھ نہ کرتے ہُوئے بھی سمجھتے ہیں کہ بہت کچھ کر رہے ہیں۔ وہ چل رہے ہوتے ہیں بلکہ دوڑتے بھی ہیں مگر جا کہیں بھی نہیں رہے ہوتے۔ کولہو کے بیل اور تانگے کے گھوڑے کی کوئی منزل نہیں ہوتی مگر وہ چلتے ہی رہتے ہیں، دوڑتے ہی رہتے ہیں۔

یہی کیفیّت ملّتِ پاکستان کی کر دی گئی تھی۔ قوم لوگ بن گئی تھی۔ ہر آدمی حکومت کو، ہر وزیر اور ہر افسر کو کوستا رہتا تھا۔ ہر محفل میں بے انصافی اور انسانی حقوق کی پامالی کی مثالیں دی جاتیں اور اخباری بیانوں پر تبصرے ہوتے تھے جو تبصرے کم اور کوسنے زیادہ تھے۔ ذہنی انتشار تھا۔ کسی کو کسی پر اعتماد نہ تھا۔ وہ سیاسی فریب کاری کے عروج کا زمانہ تھا جس کے خلاف ایک تحریک کی ضرورت تھی لیکن کوئی تحریک منظم نہیں ہو رہی تھی کیونکہ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ تو پہلے ہی ایک تحریک چلا رہے ہیں۔

قوم مرگئی تھی، افراد زندہ تھے۔

★

ملک رجب علی اور سلمیٰ کی ازدواجی زندگی کی پہلی رات پاکستان کی تاریخ کو اُس راستے پر ڈال دیا گیا جو تباہی کی طرف تو نہیں جاتا لیکن یہ ایک پہاڑی راستہ ہے جس کے ایک طرف اونچی پہاڑیاں اور دوسری طرف دُور نیچے تک گئی ہُوئی ڈھلانیں اور گہری کھائیاں ہوتی ہیں۔ ذرا سا پاؤں غلط پڑ جاتے تو وہ زندگی کا آخری قدم ہوتا ہے۔ گاڑی کو ذرا زیادہ یا ذرا کم موڑ دو تو وہ زندگی کا آخری موڑ بن جاتا ہے۔ گاڑی کے مسافروں پر خوف وہراس طاری رہتا ہے۔

رجب علی اور سلمیٰ نے رات جاگتے اور باتیں کرتے گزار دی تھی۔ سلمیٰ نے رجب علی سے کہا تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہیں سننا چاہتی جس میں اس کے مرحوم خاوند عبدالجلیل خان کا ذکر ہو کیونکہ وہ اپنے ضمیر پر اس جُرم کا بوجھ محسوس کر رہی تھی کہ اُس نے اپنے خاوند کے قاتل کے ساتھ شادی کر کے خاوند کی روح کو دھوکہ دیا ہے لیکن رات جو بھی بات ہُوتی اس میں عبدالجلیل کا ذکر ضرور آ جاتا تھا۔ وہ عبدالجلیل کی خفیہ تحریک کو زندہ کرنے کے منصوبے بھی بناتے رہے تھے، اور فجر کی اذان کے ساتھ ہی اُن کی آنکھ لگ گئی تھی۔

انہیں جاگنے کی کوئی جلدی نہیں تھی سلمیٰ کے بیٹے اصغر کو گذشتہ شام ارشد اور طاہرہ اپنے گھر لے گئے تھے۔ رجب علی اور سلمیٰ کو دیر تک سونا تھا مگر سڑکوں پر گھوم پھر کر اخبار بیچنے والے ہاکروں کی چیخ و پکار نے انہیں جگا دیا۔ ہاکر ایک دوسرے کے پیچھے سائیکلوں پر سوار گزرتے اور چلّاتے جا رہے تھے — "مارشل لاء لگ گیا.... آئین توڑ دیا گیا.... سیاسی پارٹیاں کالعدم قرار دے دی گئیں.... پڑھیے.... آج کی تازہ خبر.... یہ دیکھیے کیا ہوگیا.... سارے ملک میں مارشل لاء لگ گیا.... سیاسی لیڈر بھاگ گئے.... فوج آگئی.... پاکستان میں انقلاب آگیا۔"

ملک رجب علی دوڑتا باہر آیا۔ اُس کے نوکر برآمدے میں کھڑے اخبار پر جھکے ہُوئے تھے خانساماں مارشل لاء کی خبر پڑھ کر سنا رہا تھا اور دوسرے دونوں نوکر خوشی کے دبے دبے نعرے لگا رہے تھے کسی نوکر نے رجب علی کو دیکھ لیا۔

"ملک صاحب!" — ایک نوکر نے اُسے کہا — "سارے ملک میں مارشل لاء لگ گیا ہے۔ یہ دیکھیے۔"

رجب علی نے اخبار ان سے لے لیا اور انہیں کہا کہ وہ اپنے لیے ایک اور اخبار لے آئیں۔ رجب علی نے اخبار کی شہ سرخی دیکھی اور خبر پڑھنے لگا۔ نوکروں نے اُس سے باری باری پوچھا — "ملک صاحب! یہ اچھا ہُوا ہے یا اچھا نہیں ہُوا؟" — مگر وہ خبر میں اتنا محو ہو گیا تھا جیسے اُسے نوکروں کی آواز سنائی ہی نہ دے رہی ہو۔

وہ خبر پڑھ چکا تو نوکروں نے اُس سے پھر پوچھا کہ اب کیا ہوگا؟

"جو ہوگا اچھا ہوگا" — اُس نے جواب دیا اور کہا — "یہ خیال رکھنا کہ مارشل لاء کے خلاف کوئی بات نہ کرنا۔ دو سال کے لیے اندر ہو جاؤ گے.... یہ اچھا ہُوا ہے.... مارشل لاء اچھا نہیں ہُوا کرتا لیکن اب یہی کچھ اچھا ہُوا ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔"

رجب علی اخبار پڑھتے پڑھتے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ سلمیٰ باہر آ رہی تھی۔

"فوج نے حکومت سنبھال لی ہے" — رجب علی نے کہا — "سیاسی پارٹیاں ختم کر دی گئی ہیں سیاست بازی جُرم قرار دے دی گئی ہے۔"

"کیا خیال ہے آپ کا؟" — سلمیٰ نے پُوچھا — "اچھا نہیں ہُوا؟"

"جو آسمان سے گرا کرتا ہے وہ کھجور میں اٹک جاتا ہے" — رجب علی نے کہا — "مگر ہمارے سیاسی لیڈروں نے پاکستان کو آسمان سے ایسا گرایا ہے کہ کھجور میں نہیں اٹکا بلکہ پستیوں میں جا پڑا ہے۔ اللہ پاکستان کو محفوظ رکھے.... ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے کہ فوجی حکومت نجات کا ذریعہ بنے گی یا ہم مارشل لاء سے نجات کی دعائیں مانگیں گے۔ ابھی اسی کو غنیمت سمجھو کہ ملک اُن سیاسی لیڈروں سے آزاد ہو گیا ہے جنہوں نے اسے اپنے درمیان متنازعہ زمین بنا لیا تھا اور اس کی ملکیت پر لڑ رہے تھے۔"

لوگ خوش تھے بعض نے اپنے مکانوں پر چراغاں بھی کی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ فوجی حکومت کیسی ہوتی ہے۔ وہ اسی پر خوش تھے کہ کچھ تو تبدیلی آئی۔ سیاسی لیڈروں اور ان کی سیاسی بازی گری سے لوگ تنگ آ گئے تھے۔ اب وہ سکھ کا سانس لینے لگے، جیسے وہ ڈوب رہے تھے اور انہیں ڈوبنے سے بچا لیا گیا ہو۔ لوگوں کا موضوعِ سخن بدل گیا۔ حالات و واقعات کے متعلق رائے بدل گئی۔

غلط فہمیاں دُور ہو گئیں۔

خوش فہمیوں کا دَور آ گیا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ تبدیلی جو آئی تھی وہ واضح ہونے لگی۔ آئین جو معطل ہو چکا تھا اُس کی جگہ مارشل لاء ریگولیشن آنے لگے۔ پہلے لوگ چوکوں میں کھڑے ہو کر حکومت کو بُرا بھلا کہہ لیتے تھے۔ اب اسے جرم قرار دے دیا گیا۔ نیا انقلاب نئی زنجیریں لے کر آیا۔ اخبار اس نئے سُورج کی پوجا کرنے لگے جو ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی صبح طلوع ہُوا تھا۔ اس سُورج کی تپش بڑی تیز تھی۔ لوگوں کی امیدیں جھلسنے لگی تھیں۔ اخبار نئے دیوتا کے بھجن سنانے لگے۔ سیاسی لیڈر آندھی میں جلتے دئیوں کی مانند بجھ گئے۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

★

ایک سال گزر گیا۔

ریڈیو اور اخبار مژدہ سنانے لگے کہ بے انصافی، رشوت اور دیگر جرائم ختم کر دیئے گئے ہیں ملک میں خوشحالی کا دَور دَورہ ہے — لوگ ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں پوچھنے لگے کہ اخباروں اور ریڈیو والا پاکستان کہاں ہے جو خوشحال ہے اور جہاں کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوتی؟ لوگ ایک اور ہجرت کی تیاری کرنے لگے لیکن اخباروں اور ریڈیو والوں کو بھی اُس پاکستان کا اتا پتا معلوم نہ تھا

اقتدار کے پجاری اور بھی تھے۔ وہ سب کونوں کھدروں میں دبک گئے تھے۔ وہ باہر آ گئے۔ کچھ نکل آئے۔ انہوں نے خاکی وردی والے اس دیوتا کے تیور، عزائم اور انداز بھانپ لیے اور پُوجا پاٹھ کے انداز اور طور طریقے بدل کر اُس کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ اُس کے پاؤں چاٹنے [illegible] رگڑنے اور [illegible] خوشنودی حاصل کر لی۔

دیوتا کے بُت نے اپنے پاؤں میں اتنے زیادہ انسانوں کو سجدہ ریز دیکھا تو وہ اپنی جسامت —

سی کاٹا ہو گیا، اور جب اُس نے اپنی مدح کے بھجن سنے تو اُس کا سَر آسمان سے جا لگا

"تُو ہی ہے وہ جس کی ہم راہ دیکھ رہے تھے"

"لوگ تیرے نام کی مالا جپتے ہیں"

"اب ملک میں کوئی بھوکا نہیں، کوئی ننگا نہیں"

"کوئی چور نہیں.... لوگ راتوں کو دروازے کھول کر سوتے ہیں"

"تُو نے ڈوبی ہُوئی قوم کو زندہ و پائندہ کر دیا ہے"

"تُو نہ ہوتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا"

"یہ دَور جس براہیم کی تلاش میں تھا وہ تُو ہے"

"تو جمہُوریّت کا سُلطان ہے"

"دیکھ ہم نے سرکاری دفتروں میں قائدِ اعظم کی تصویر کے ساتھ تیری تصویر لٹکا دی ہے"

"لوگ قائدِ اعظم کے بعد تیرا نام لیتے ہیں"

"تُو ہمارے خوابوں کی تعبیر ہے"

اقتدار کی سیاست کے سومنات کا یہ بُت ہوا میں معلّق ہو گیا۔ صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں نے اُس کے قدموں میں الفاظ کے پھول نچھاور کیے اور انعام واکرام سے نوازے گئے ـــــ اُندلس کی تاریخ کا وہ باب دُہرایا جانے لگا جب اُندلس کے سلطانوں نے اپنی مدح سرائی کے لیے ادیبوں اور شاعروں کو دربار میں اکٹھا کر لیا تھا۔ شاعر اپنے اپنے گویّے ساتھ لے جاتے جو اُن کا خوشامدانہ کلام دربار میں گا کر سُناتے تھے۔ اُندلس کے آخری دَور کے سُلطانوں نے مدح سرائی کے لیے خزانوں کے منہ کھول رکھے تھے۔ ادیب اور شاعر مدح سرائی کے ایسے ایسے کمالات دکھاتے کہ سلطانوں کے لیے اپنی پہچان محال ہو جاتی۔

اِن خوشامد پرست سُلطانوں، خوشامدیوں، مدح سرا ادیبوں اور شاعروں نے اُس سلطنت اسلامیہ کی جڑیں کھوکھلی کر دیں جسے فتح کرنے کی خاطر اللہ کے سپاہیوں نے کشتیاں جلا ڈالی تھیں کہ واپسی کی آس ہی نہ رہے ـــــ فتح یا موت ـــــ ان مفاد پرستوں نے اسلام کی تاریخ میں پہلے سقوط کا باب لکھ ڈالا ـــــ اب ایک بار پھر وہی عناصر اسلام کی تاریخ کو ایک اور سقوط کی طرف لے جا رہے تھے۔

★

طاہرہ راولپنڈی میں اُسی سکول میں پڑھاتی تھی جس میں اُس کا باپ جمال بیگ پڑھایا کرتا تھا۔ طاہرہ کو یہ نوکری نجمہ نے دلائی تھی اور یہیں اُسے اپنا یہ باپ مِلا تھا جس کے متعلق اُسے یقین تھا کہ اُس نے اُس کے پیدا ہوتے ہی خودکشی کر لی تھی۔

طاہرہ کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ وہ لکیر کی فقیر نہیں تھی نہ وہ تنخواہ کی خاطر اس سکول میں ملازم ہُوئی تھی۔ وہ اپنی کلاس کی بچّیوں اور بچّوں کو بتاتی تھی کہ وہ دنیا میں کیوں آتے ہیں۔ ان کے جینے کا مقصد کیا ہے پڑھنے کا مقصد کیا ہے۔ اُن کی روایات کیا ہیں اور ان روایات کو زندہ رکھنا ان کا سب سے بڑا فرض ہے وہ بچّوں کو وہ باتیں بھی بتاتی تھی جو ان کے کورس میں نہیں تھیں۔ طاہرہ کورس کی پابندی نہیں کرتی تھی۔

وہ اپنی کلاس کے بچوں کو بتاتی تھی کہ ہم نے پاکستان کیوں بنایا اور کِس طرح بنایا ہے۔ کتنا خُون دے کر زمین کا یہ ٹکڑا حاصل کیا ہے۔ وہ ان بچوں کو جب ہجرت کے واقعات سناتی اور انہیں بتاتی کہ ان جیسے بچے کِس طرح ہندوؤں اور سکھوں کی کرپانوں اور برچھیوں سے کٹ گئے تھے اور جو زندہ رہے وہ کِس حال میں پاکستان تک پہنچے تھے تو کلاس پر سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔ بعض بچوں کے آنسو نکل آتے تھے بچّے اُس سے پوچھا کرتے تھے کہ وہ اُن بچوں کے خون کا بدلہ کِس طرح لے سکتے ہیں۔ وہ انہیں بتایا کرتی تھی کہ وہ صحیح معنوں میں پاکستانی بچے بن کر دشمن سے انتقام لے سکتے ہیں۔

"ہندو لیڈر کہتے ہیں کہ پاکستان ہندوستان کا حِصّہ ہے" ـــ طاہرہ اپنی کلاس کے بچوں کو سبق دیا کرتی تھی ـــ "اس لیے پاکستان کو ہندوستان میں شامل کرنا ہے، لیکن بچّو! حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان مسلمانوں کا ملک تھا جو ہمارے بادشاہوں کی لغزشوں اور عیّاشیوں کی وجہ سے انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اب ہندو اس کے مالک بن بیٹھے ہیں اور ہندوستان سے مسلمانوں کا خاتمہ کر رہے ہیں ہمیں سارے ہندوستان کو پاکستان بنانا ہے"

طاہرہ بچوں کو بتاتی تھی کہ قیامِ پاکستان کی جدّوجہد میں بچّوں نے کیا کام کیا تھا۔ وہ انہیں بتاتی تھی کہ ان کا دشمن کون ہے، کب سے دشمن ہے، وہ کیسا ہے اور اس کے عزائم کیا ہیں۔ طاہرہ نے بچّوں میں عسکری روح پیدا کر دی تھی۔

مارشل لاء کا دوسرا سال تھا۔ ایک روز سکول کے پرنسپل نے اُسے اپنے دفتر میں بلایا۔

"مسز طاہرہ ارشد!" ـــ پرنسپل نے کہا ـــ "اب آپ اپنی کلاس کی پڑھائی کو کورس تک ہی محدود رکھیں ان کے ساتھ آلتو فالتو باتیں نہ کیا کریں"

"آلتو فالتو کی وضاحت کر دیں" ـــ طاہرہ نے کہا ـــ "میں نے انہیں جنّوں بھُوتوں اور پریوں کی کہانیاں کبھی نہیں سنائیں"

"میرا مطلب ہے کہ پاکستان جیسے کیسے بھی بنا بن گیا، اسی کی کہانیاں بچوں کو سناتے چلے جانا کچھ اچھا نہیں لگتا" ـــ پرنسپل نے کہا ـــ "آپ انہیں ہجرت کی داستانیں سنا سنا کر ڈرا رہی ہیں"

"آپ کی رائے صحیح نہیں سر!" ـــ طاہرہ نے کہا ـــ "بچوں کے ردِّعمل کو جتنا میں سمجھتی ہُوں اتنا آپ نہیں سمجھتے۔ میرا فرض ہے کہ میں انہیں ان کی تاریخ سناتی رہُوں"

"دوسرے تیسرے گریڈ کے بچّے آپ کی باتیں نہیں سمجھ سکتے مسز طاہرہ!" ـــ پرنسپل نے پریشان سا ہو کے کہا ـــ "آپ انہیں یہ بھی کہتی رہتی ہیں کہ پاکستان کے حکمران اس ملک کو لے ڈوبیں گے اب ایسی باتیں چھوڑ دیں"

کو سُلانا ہے، جگانا نہیں۔ میں آپ سے اور کچھ نہیں کہوں گا۔ اپنی تنخواہ سے اور جس کام کی تنخواہ ملتی ہے اس کام سے مطلب رکھیں۔ کہاں آپ اُس پاکستان کو ڈھونڈنے چلی ہیں جو آپ نے بنایا تھا"

"ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے" ـــ طاہرہ نے کہا ـــ "وہ پاکستان یہیں ہے۔ یہی ہے وہ پاکستان میں اسی کی بقا کی خاطر بچوں کو تیار کر رہی ہُوں۔ میں ایک ورثہ ان کے حوالے کر رہی ہوں۔ اس ورثے میں کچھ روایات ہیں اور پاکستان ہے"

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہیں۔

"آپ نے جو بات کہی ہے یہ میں نے سرحد پار، آزادی سے پہلے جلال آباد میں اُس وقت سمجھ لی

تھی جب میں دسویں جماعت میں پڑھتی تھی" —— طاہرہ نے کہا —— "یہی مسز نجمہ جو آپ کے سکول میں اُستانی ہیں جلال آباد میں میری استانی ہُوا کرتی تھیں۔ ان کی قیادت میں ہم بہت سی مسلمان لڑکیاں جلُوسوں میں شریک ہوتیں اور تحریک کو گھر گھر پہنچانے کا کام کرتی تھیں۔ ہیڈ مسٹرس نے یہی الفاظ جو آپ نے مجھے کہے ہیں انہیں کہے تھے — 'سکول کی گرانٹ بند ہو جائے گی۔ لڑکیوں کو خراب نہ کرو' — میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنی آزاد مملکت میں بھی مجھے یہی الفاظ سُننے پڑیں گے۔ آپا نجمہ نے ہیڈ مسٹرس کو اپنے استعفے کی صُورت میں جواب دیا تھا۔ میں بھی آپ کو اپنے استعفے کی صورت میں جواب دیتی ہُوں۔ آپ کو سرکاری گرانٹ بند ہونے کا خطرہ ہے۔ مجھے پاکستان خطرے میں نظر آرہا ہے"۔

"اپنا رویّہ آپ بدل کیوں نہیں لیتیں؟"

"جسے آپ میرا رویّہ کہہ رہے ہیں یہ میرا ایمان ہے" —— طاہرہ نے کہا —— "میں اپنے ایمان سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ کیا آپ ہندوستان کے لیڈروں کے بیان اخباروں میں نہیں پڑھ رہے؟ ان کی دھمکیاں آپ کے کانوں میں نہیں پڑ رہیں؟ ہندوؤں نے پاکستان کو ختم کرنے کے عزم کو اپنے دھرم میں شامل کر لیا ہے۔ کیا آپ پاکستان کے لیے لڑیں گے؟.... ان بچوں کو لڑنا ہے لیکن یہ اسی صُورت میں اپنے ملک کو بچا سکیں گے کہ ہم ان کو بتا دیں کہ ہمارا دشمن کیا چاہتا ہے اور وہ ہم سے پاکستان کی کتنی قیمت لے چکا ہے"۔

"آپ بہت جذباتی ہیں مسز طاہرہ ارشد!" —— پرنسپل نے کہا —— "میرا مطلب ہے کہ.... دیکھئے نا مسز طاہرہ! میں کہہ رہا ہُوں"۔

"جس کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے اُس کی زبان آپ کی طرح ہکلانے لگتی ہے" —— طاہرہ نے

"اوہ! میں سمجھ گئی ہُوں سر!" —— طاہرہ نے کہا —— "اب حکومت ایسی آگئی ہے جو...."

"جو آپ کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کر لے گی" —— پرنسپل نے طاہرہ کی بات کاٹ کر کہا —— "خدا سے ڈریں یا نہ ڈریں، مارشل لاء سے ڈریں.... مسز طاہرہ ارشد!" —— پرنسپل نے آگے کو ہو کر رازداری سے کہا —— "اب قوم کہا —— "میں سمجھتی ہُوں کہ آپ وہ باتیں کہنے کی کوشش کر رہے ہیں جو آپ کا ضمیر آپ کو کہنے کی اجازت نہیں دے رہا۔ اگر آپ میری بات نہیں سمجھ رہے تو میں آپ کو زیادہ پریشان نہیں کروں گی۔ میں استعفے دے رہی ہُوں"۔

اور وہ پرنسپل کو بوکھلاہٹ کے عالم میں چھوڑ کر اُس کے دفتر سے نکل آئی۔

تھوڑی دیر بعد جمال بیگ پرنسپل کے دفتر میں داخل ہُوا اور دو استعفے اُس کے آگے رکھ دیئے۔ ایک طاہرہ کا دُوسرا اپنا۔

"وہ میری بیٹی ہے" —— جمال بیگ نے کہا —— "میں اُس کے بغیر سکول میں نہیں رہ سکتا۔ آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہُوں کہ ان شاہین بچوں کو خاکبازی کا سبق دے کر آپ بہت بڑا گناہ کر رہے ہیں"۔

★

سلمیٰ کے بیٹے اصغر کی عمر سترہ برس ہو گئی۔ وہ سیکنڈ ایئر میں پہنچ گیا تھا۔ سلمیٰ اُسے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتی تھی لیکن اصغر کا ارادہ کچھ اور تھا۔ اُس نے فوج میں جانے کی ضد شروع کر دی تھی جو ماں نہیں مان رہی تھی۔

"اِسے فوج میں جانا ہے سلمیٰ! اسے فوج میں ہی جانا ہے" —— رجب علی نے کہا —— "میں اُس فوج کی بات کر رہا ہُوں جو پاکستان کو بڑے طاقتور دشمن سے بچائے گی۔ میں اسے ذریعۂ معاش کے لیے فوج میں نوکر نہیں کرا رہا۔ میں اس جیسے ایک درجن بیٹوں کو فارغ بٹھا کر عیش کرا سکتا ہُوں لیکن ہمیں وہ فوج تیار کرنی ہے جو تنخواہ کی خاطر نہیں اپنے قومی وقار کی خاطر لڑے گی"۔

"پھر آپ مجھے پاکستان کی کہانیاں کیوں سناتی رہی ہیں امّی!" —— اصغر نے جھنجھلا کر کہا —— "میں اب کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اب آپ مجھے مُردہ نہیں کر سکتیں"۔

سلمیٰ اُنہی ماؤں میں سے تھی جنہوں نے اپنے ہاتھوں پاکستان بنایا تھا۔ اُس نے اصغر کو پاکستان کی باتیں سُنا سُنا کر جوان کیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ارادے کو دبا نہ سکی اور اُسے فوج میں جانے کی اجازت دے دی۔

اصغر ذہین لڑکا تھا جسمانی لحاظ سے بھی چُست اور صحت مند تھا۔ وہ کمیشن کے لیے منتخب ہو گیا اور ایک روز ٹریننگ کے لیے مِلٹری اکیڈمی میں چلا گیا۔

★

چھ سال اور گزر گئے۔

اپریل ۱۹۶۵ء آگیا۔

پاکستان کی عمر اٹھارہ برس ہو چکی تھی۔

سلمیٰ کا بیٹا اصغر فوج میں کیپٹن تھا۔

طاہر پرویز کی عمر سولہ برس ہونے والی تھی۔

ہندوستان اب بھارت کہلانے لگا تھا۔ اُس کی انٹیلی جنس کے پاس پاکستان کی رپورٹوں کے انبار لگ چکے تھے۔ اس کے جاسُوس پاکستان کے گوشے گوشے میں موجود اور سرگرم تھے۔ صحافت اور سیاست اور ادب میں بھی بھارتی ایجنٹ موجود تھے۔ افسر شاہی بھی بھارتی ایجنٹوں سے پاک نہیں تھی تینوں مسلّح افواج کے ہیڈ کوارٹر بھی بھارت کے جاسوسوں کی نظر میں تھے۔ دس سال پہلے کرن اور رادھا نام کی دو ہندو لڑکیاں جو پاکستان میں عقیلہ اور نسیمہ کہلاتی تھیں اور جن کے یہاں جعلی خاوند بھی تھے، کامے تانگے والے کے ہاتھوں ماری گئی تھیں۔ اُن کی جگہ بھارت کی کئی اور کرنیں اور رادھائیں پاکستان کی "اونچی" سوسائٹی میں آگئیں اور اُنہوں نے یہاں کی نازک رگیں اپنی مُٹھی میں لے لی تھیں۔

۱۹۶۵ء کے ابتدائی دنوں میں بھارت میں ایک کانفرنس بند دروازوں میں منعقد ہُوئی۔ اس میں تینوں مسلّح افواج کے کمانڈر انچیف موجود تھے۔ بھارت کی ملٹری انٹیلی جنس کا ایک میجر جنرل بھی تھا۔ وزیرِ دفاع بھی موجود تھا۔ سیکرٹری دفاع اور متعلقہ محکمے کے مشیر بھی موجُود تھے اور اس کی صدارت اُس وقت کا وزیراعظم کر رہا تھا۔

"یہ ایک تاریخی کانفرنس ہے جس کا ذکر تاریخ میں نہیں آئے گا کیونکہ یہ خفیہ ہے" —— بھارتی وزیراعظم نے کانفرنس سے خطاب کیا —— "پیشتر اس کے کہ ہم پاکستان کے متعلق رپورٹ سنیں اور اس مسئلے پر بحث کریں کہ پاکستان پر فوج کشی کے لیے حالات ہمارے موافق ہیں یا نہیں، میں آپ سے

وہ باتیں کرنا چاہوں گا جو آپ پہلے سے جانتے ہیں۔ میں ان کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں.... پاکستان پر فوج کشی کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اٹھارہ برسوں سے اس کی تیاری کیوں کرتے رہے ہیں؟..... صرف اس لیے کہ پاکستان کو ختم کرنا ہے اور ختم اس لیے کرنا ہے کہ یہ ایک غیر قدرتی تقسیم تھی۔ پاکستان بھارت کا حصہ ہے۔ اسے بھارت میں واپس لانا ہے....

"صرف پاکستان نہیں، ہمارے پیشِ نظر مہا بھارت ہے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ مہا بھارت میں مشرق میں انڈونیشیا، برما اور ملائشیا اور مغرب میں دجلہ اور فرات تک کے ملک شامل ہیں افغانستان پہلے ہی ہمارے زیرِ اثر ہے لیکن اسے ابھی ہم بھارت میں شامل نہیں کریں گے۔ اِسے پاکستان کے خلاف استعمال کرنا ہے۔ اسی لیے ہم نے پختونستان کی تحریک چلائی ہے اور پختونستان کی سرحد اٹک تک رکھی ہے۔ نیپال، بھوٹان اور سکّم وغیرہ کو بھی بھارت میں شامل کرنا ہے۔ ہمارا سب سے پہلا نشانہ پاکستان ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے ملکوں میں صرف پاکستان ہے جو ہمارا مقابلہ کچھ دن کر سکتا ہے۔ اس قوم کی کچھ روایات ہیں اور یہ جنگجو قوم ہے۔ مجھے پُوری اُمّید ہے کہ آپ پاکستان کو شکست دے کر اسے اپنے ملک میں شامل کر لیں گے لیکن اس قوم کی جو فوجی روایات ہیں انہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے....

"بھارت میں اسلام کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہمارے باپو، سورگباشی مہاتما گاندھی کہا کرتے تھے کہ میرے جسم کے دو ٹکڑے کر دو، بھارت ماتا کے دو ٹکڑے نہیں ہونے دوں گا، مگر بھارت ماتا کے دو ٹکڑے اُن کی زندگی میں ہو گئے۔ سورگباشی پنڈت نہرو نے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر بھارت ماتا کی تقسیم پر دستخط کیے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اُنھوں نے کہا تھا کہ میں نے ملک کی تقسیم کو قبول تو کر لیا ہے لیکن میرا ارادہ کچھ اور ہے۔ محمد علی جناح کو پاکستان بنا لینے دو۔ ہم بہت جلد متعدّد ذرائع سے ایسے حالات پیدا کر دیں گے کہ جناح خود میرے پاس درخواست لے کر آئے گا کہ ہمیں ہندوستان میں شامل کر لو....

"ہمیں مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو جی کی روحوں کو خوش کرنا ہے۔ پاکستان کو ختم کرنا ہمارا دھرم ہے اور پاکستان پر فوج کشی دھرم یُد (مذہبی جنگ) ہو گا۔ آج ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ آپ انٹیلی جنس کی رپورٹ سنیں اور بتائیں کہ حملے کے لیے یہ وقت موزوں ہے یا نہیں۔"

★

انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر ہندو میجر جنرل نے کانفرنس میں بتایا کہ پاکستان پر حملے کے لیے اس سے زیادہ موزوں وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جنگی طاقت کے لحاظ سے ہمارے مقابلے میں پاکستان ایسے ہی ہے جیسے شیر کے مقابلے میں بکری۔

اُس وقت بھارت اپنے آپ کو شیر اور ہمیں بکری کہہ سکتا تھا۔ پنڈت نہرو نے بھارت کو جنگی طاقت بنانے کے لیے ایک دلیرانہ ناٹک کھیلا تھا۔ یہ تھا چین کے جنوبی علاقے پر حملہ۔ پنڈت نہرو جانتا تھا کہ وہ شیر کے کچھار میں سر دے رہا ہے۔ ہر قوم حیران تھی کہ پنڈت نہرو جیسے دُور اندیش اور دانشمند سیاست دان نے یہ کیا کیا۔ اُس نے ایک ڈویژن چین جیسی عالمی طاقت کے آگے پھینک دیا۔ اس بھارتی فوج کو اگر چینی فوج کے ہاتھوں نہیں تو اُس برفانی علاقے کی ناقابلِ برداشت صعوبتوں سے مرنا تھا۔ وہ علاقہ تھا ہی چینیوں کا جسے پنڈت نہرو نے بھارت کا علاقہ کہا تھا۔

دو تین دنوں میں بھارت کے اس ڈویژن کے پرخچے اڑ گئے لیکن پنڈت نہرو نے ساری دنیا پر ثابت کر دیا کہ وہ احمق نہیں۔ اُدھر اس نے اپنی فوج چین کی سرحدی چوکیوں پر چڑھا دی، اِدھر واویلا بپا کر دیا کہ یہ دیکھو دنیا والو! چین نے بھارت پر حملہ کر دیا ہے۔ اگر کسی نے ہماری مدد نہ کی تو سارے بھارت پر چین کا قبضہ ہو جائے گا۔

امریکہ، روس، فرانس اور برطانیہ بدک اُٹھے۔ انہوں نے بھارت کے اسلحہ خانے جدید ہتھیاروں اور گولہ بارود سے بھر دیئے۔ اسے لڑاکا بمبار طیارے دیئے۔ توپیں اور ٹینک دیئے۔ نیوی کو جنگی جہاز دیئے اور امریکہ نے بھارت کی فوج کی تنظیمِ نو اور ٹریننگ اپنے ذمّے لے لی۔

بھارت نے دو چار دنوں میں ہی چین کے جنوبی علاقے نیفا میں جو شکست کھائی وہ ایک ضرب المثل اور مذاق بن گئی۔ پنڈت نہرو اور اس کے ساتھی ہندو لیڈر جانتے تھے کہ ایسا ہی ہو گا لیکن اُنھوں نے بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی — تمام بڑی طاقتیں جو چین سے خائف تھیں بھارت کی مدد کو آ گئیں۔ بھارت کی دقیانوسی فوج میں ماؤنٹین ڈویژن بن گئے جو امریکہ نے مسلّح اور تیار کئے۔ اُس کے آرمرڈ (بکتر بند) ڈویژن کو جدید ٹینک مِل گئے۔ اِنڈی پینڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ بن گیا۔ توپ خانے جدید توپوں سے لیس ہو گئے۔ فوج کی تعداد اور طاقت چین کے دشمن ممالک کی جنگی اور مالی امداد سے اتنی بڑھ گئی جس کے مالی بوجھ کا متحمّل بھارت نہیں ہو سکتا تھا۔

پنڈت نہرو کو توقع بہت تھوڑے کی تھی لیکن اتنا مل گیا جو اُس کے تصوّر میں کبھی نہ آیا تھا۔ پنڈت نہرو کا بوڑھا دل خوشی اور توقع سے کہیں زیادہ کامیابی کا دھچکا برداشت نہ کر سکا اور وہ مر گیا لیکن بھارت جنگی طاقت بن گیا۔

بھارت کے ایک ہندو جرنیل (بی۔ ایم۔ کول) نے جو چین کے خلاف لڑا اور اس حال میں واپس آیا تھا کہ اُسے اپنے ڈویژن کی کچھ خبر نہ تھی، ایک کتاب میں لکھا تھا — "چین پر بھارت کے حملے کا مقصد یہ تھا کہ چین کے مخالف ملکوں سے اتنا اسلحہ بارود اکٹھا کر لیا جائے کہ پاکستان کو ایک ہی ہلّے میں ختم کر دیا جائے۔"

★

۱۹۶۵ء کے اوائل کی اس کانفرنس میں بھارت کے انٹیلی جنس کے میجر جنرل نے بتایا کہ پاکستان کے پاس فوج کے پانچ پورے ڈویژن نہیں۔ ابھی تک اس فوج کے پاس شرمن ٹینک ہیں جو چلتے چلتے رُک جاتے ہیں۔ انٹیلی جنس ڈائریکٹر نے بتایا کہ یہ مقابلہ پانچ اور ایک کا ہو گا۔ اُس نے پاک فضائیہ اور بحریہ کی طاقت بھی بتائی۔

"ہمارے پاس طیّارہ بردار بحری جہاز 'وکرانت' ہے" — اُس نے کہا — "میرا خیال ہے کہ کراچی کے ہوائی اڈوں اور بندرگاہ کو تباہ کرنے کے لیے یہی ایئر کرافٹ کیریئر کافی ہے" — اُس نے پاکستان کی جنگی طاقت کے اعداد و شمار پیش کر کے کہا: — "اِس وقت پاکستان پر ایک جرنیل کی حکمرانی ہے۔ کوئی جرنیل حکومت نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے پاکستان میں سیاسی جماعتوں کی حکومت تھی۔ انھوں نے اپنے ملک کی معیشت کو

کھوکھلا کر دیا تھا۔ خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ چونکہ یہ غنڈہ گردی کی سیاست تھی اس لیے غنڈوں کو تحفّظ حاصل رہا۔ اس سے جرائم اتنے بڑھے کہ رات کو لوگ خوفزدگی کی کیفیّت میں سوتے ہیں۔ مہنگائی نے لوگوں کو تنگدست کر دیا ہے۔ اس مارشل لاء نے جمہوریّت کا بھیس بدل لیا ہے اور لوگوں کا گلا گھونٹ دیا ہے ....

"آپ کو شاید یاد ہو گا کہ پاکستان کی سیاست میں اس وقت چند ایک لیڈر ایسے بھی ہیں جو پاکستان کے مطالبے کے سخت خلاف تھے۔ ان میں کچھ کانگرسی تھے، کچھ یونینسٹ پارٹی کے ممبر تھے اور ان میں کچھ مذہبی لیڈر بھی شامل ہیں۔ ہماری قوم نے سکھوں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کا جو قتلِ عام کیا تھا اس سے ڈر کر وہ مسلمان بھی پاکستان چلے گئے جو پاکستان کے خلاف تھے۔ ہماری خوش قسمتی سے یہی لیڈر پاکستان کی سیاست میں شامل ہو گئے، پھر یہی لیڈر پاکستان کی سیاست کے ستون بن گئے ....

"ان کے لیے مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ پاکستان کے لوگ بھارت کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ میرے محکمے کی رپورٹوں کے مطابق وہاں صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان میں جو بھی سیاسی پارٹی اقتدار میں آئی وہ ہمارے لیے اچھی رہی لیکن عوام ہمیں دشمن سمجھتے رہے۔ آج اٹھارہ سال بعد ۱۹۶۵ء میں بھی وہاں کیفیّت یہی ہے کہ حکمران ہماری دوستی کے خواہاں ہیں اور لوگ ہمارے خون کے پیاسے لیکن ان حکمرانوں نے کچھ اپنی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے اور کچھ ہم سے پرانی دوستی نبھانے کے لیے اور کچھ اپنی نااہلی کی وجہ سے اپنی پبلک کا یہ حال کر دیا ہے کہ لوگ پیٹ کے غلام ہو گئے ہیں۔ وہ ہم ہندوؤں کو اب بھی دشمن سمجھتے ہیں لیکن مُفلسی، مسائل اور دیگر حالات نے ان کے جذبے کو سرد کر دیا ہے اب انہیں ہوش نہیں کہ ان کے درمیان ہمارے کتنے جاسوس گھوم پھر رہے ہیں ....

"دس سال گزرے لاہور میں ہماری دو بڑی قیمتی لڑکیاں قتل ہو گئی تھیں۔ یہ ایک خفیہ تحریک کا نتیجہ تھا جو ہمارے جاسوسوں کے خلاف چلی تھی لیکن وہاں کے دو تین افسروں، ایک وزیر اور اسمبلی کے دو جاگیر دار ممبروں نے تحریک شروع کرنے والے کو ذلیل اور رسوا کر کے مار ڈالا۔ تحریک وہیں ختم ہو گئی۔ ہمارے آدمیوں نے وہاں کے سرکاری حلقوں کو اپنی مُٹھی میں لے کر ایسے اقدامات کراتے کہ لوگوں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ پاکستان کا وہ کون سا گوشہ اور کون سا وہ حلقہ ہے جو ہماری زد میں نہیں۔ آپ کو ان رپورٹوں پر اعتبار کرنا چاہیئے۔ حملے کا یہ وقت موزُوں ہے۔"

★

"پاکستان پر حملہ ملٹری ایکشن نہیں پولیس ایکشن ہو گا" ـــ بھارت کی برّی فوج کے کمانڈر انچیف نے کہا ـــ "پاکستان کو فتح کرنے میں اتنا ہی وقت لگے گا جتنا ہم نے حیدر آباد دکن پر قبضہ کرنے میں لگایا تھا۔"

"پاکستان کے آسمانوں میں انڈین ایئر فورس کی حکمرانی ہو گی" ـــ انڈین ایئر فورس کے کمانڈر انچیف نے کہا ـــ "میرے فائٹر پائلٹ پاکستان کے طیّاروں کو زمین سے اُٹھنے کی مہلت ہی نہیں دیں گے۔"

سب نے انڈین نیوی کے کمانڈر انچیف کی طرف دیکھا۔

"مجھے اختلاف ہے" ـــ اُس نے کہا ـــ "دشمن کو اتنا کمزور نہیں سمجھنا چاہیئے۔ میں مانتا ہُوں کہ پاکستان کی جنگی طاقت ہمارے مقابلے میں بہت تھوڑی ہے اور اس کا اسلحہ بہت پرانا ہے، اور میں یہ بھی مان لیتا ہُوں کہ پاکستانی قوم بحیثیت قوم کمزور ہو چکی ہے اور حکمرانوں کے پیدا کردہ حالات نے پاکستانیوں کے جذبے کو مجروح کر دیا ہے لیکن میں اپنی قوم کو بھی جانتا ہُوں کہ اس میں کتنا کچھ جذبہ ہے۔"

"میں اس رائے کی تائید کرتا ہوں" ـــ دفاع کے سیکرٹری نے کہا ـــ "آپ کو کشمیر کی جنگ جو سینتالیس اڑتالیس میں لڑی گئی تھی یاد نہیں رہی۔ ہم نے اپنی پوری ایئر فورس اور زیادہ سے زیادہ فوج استعمال کی تھی پھر بھی ہم پاکستان آرمی کی قلیل نفری کو پیچھے نہیں ہٹا سکے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ پاکستان آرمی برف سے لدی ہُوئی پہاڑیوں پر گرم وردی کے بغیر لڑی تھی۔ اگر فائر بندی نہ ہو جاتی تو آج کشمیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ یہ مت بھُولیے کہ جنگ ہتھیاروں سے نہیں جذبے اور مورال سے لڑی جاتی ہے۔ میں آپ کی اس رائے کی تائید نہیں کر سکتا کہ پاکستان آرمی اور پبلک جذبے سے بالکل ہی خالی ہو گئی ہے۔"

"تو پھر ہمیں دیکھ لینا چاہیئے کہ پاکستان کتنے پانی میں ہے" ـــ برّی فوج کے کمانڈر انچیف نے کہا۔

"یہ آپ کیسے دیکھیں گے؟"

"ہم کسی محدُود علاقے میں پاکستان کو گھسیٹ لیں گے" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "وہاں پتہ چل جائے گا کہ پاکستان آرمی کی لڑنے کی اہلیّت کس سطح پر ہے۔"

"ایسا علاقہ کون سا ہو سکتا ہے؟" ـــ وزیرِ دفاع نے پُوچھا ـــ "کشمیر کے سوا مجھے اور کوئی علاقہ نظر نہیں آتا۔"

"رن کچھ کے متعلق کیا خیال ہے؟" ـــ وزیرِ اعظم نے کہا ـــ "یہ علاقہ متنازعہ ہے۔"

"ہاں" ـــ برّی فوج کے کمانڈر انچیف نے کچھ دیر سوچ کر کہا ـــ "رن کچھ موزُوں رہے گا۔"

"اور رن کچھ اس لیے بھی موزوں رہے گا کہ ہمیں پاکستان کی توجہ کشمیر سے ہٹانی ہے" ـــ وزیرِ اعظم نے کہا اور انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر سے مخاطب ہو کے کہا ـــ "اب آپ انہیں اپنی رپورٹ کا وہ حصّہ سنائیں جو میں نے کہا تھا کہ سب سے آخر میں میرے کہنے پر بتانا۔"

"میں نے اس وقت تک آپ کو یہ بتایا ہے کہ پاکستان کی فوج اور وہاں کے عوام کی کیفیّت کیا ہے" ـــ انٹیلی جنس کے میجر جنرل نے کہا ـــ "یہ کیفیّت ہمارے لیے سازگار ہے اور پاکستان میں یہ کیفیّت پیدا کرنے میں ہمارا ہاتھ بھی ہے مگر وہاں ایک کمانڈو فورس تیار ہو رہی ہے جس میں پاکستان آرمی اور آزاد کشمیر آرمی کے چُنے ہُوئے افسر اور جوان شامل کیے گئے ہیں۔ اس فورس میں آزاد کشمیر کے سابق فوجی بھی شامل کیے جا رہے ہیں اور اس فورس کا رابطہ مقبوضہ کشمیر کے بعض لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کمانڈو فورس کشمیر کے لیے تیار کی جا رہی ہے۔ کشمیر میں اگر پاکستان نے کمانڈو اپریشن شروع کر دیا تو بہت مشکل صُورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔"

"آپ تجربہ کار ہیں" ـــ ڈیفینس سیکرٹری نے جو ریٹائرڈ جنرل تھا اور جس نے جنگِ عظیم دوم بھی لڑی تھی، کہا ـــ "دشمن کو تیاری کی حالت میں پکڑ لینا چاہیئے۔ پیشتر اس کے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی مشترکہ کمانڈو فورس مقبوضہ کشمیر میں اپریشن شروع کر دے، ہمیں کہیں نہ کہیں ایسا وار کرنا چاہیئے کہ پاکستان کو جان کے لالے پڑ جائیں۔"

"آپ نے پاکستان کے متعلق ساری رپورٹ سن لی ہے" ـــ وزیرِ اعظم نے کہا ـــ "میں ایک غیر فوجی ہوں لیکن یہ نکتہ میں بھی سمجھ سکتا ہُوں کہ بعض حالات میں کمزور دشمن ایسا وار کر جاتا ہے کہ طاقتور کو گھٹنوں

بٹھا دیتا ہے۔ پاکستان کی توجہ کشمیر آپریشن سے ہٹانے کے لیے رَن کچھ بڑا اچھا میدان ہے اور اس علاقے کا ہمارا پاکستان کے ساتھ تنازعہ بھی چل رہا ہے۔ اگر ہم نے رَن کچھ میں اپنی فوج بھیج دی تو اقوامِ متحدہ ہم پر یہ الزام عائد نہیں کرسکتی کہ ہم نے پاکستان پر حملہ کیا ہے۔ اس سے ہم دونوں مقاصد حاصل کرسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پاکستان کی جنگی اہلیت اور لڑنے کے جذبے کا پتہ چل جائے گا اور دوسرا یہ کہ پاکستان کی توجہ کشمیر سے ہٹ جائے گی۔"

اس کے بعد کانفرنس میں رَن کچھ پر فوج کشی اور اس کے ممکنہ نتائج کے بعد کے منصوبے پر بحث مباحثہ ہونے لگا۔

★

آزادی (۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) سے پہلے رن کچھ کے علاقے کا شمالی حصّہ سندھ اور بمبئی کے درمیان متنازعہ چلا آرہا تھا۔ یہ علاقہ ڈیڑھ سو میل لمبا اور کہیں بیس اور کہیں پچیس میل چوڑا ہے۔ اس کا بالائی حصّہ جو ۲۴ عرض بلد کے اُوپر ہے بہرحال سندھ کا ہے۔ آزادی کے بعد یہ علاقہ صوبہ سندھ میں شامل کیا گیا لیکن ۱۹۵۶ء میں بھارت نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے تحت اس علاقے کی ملکیّت کا دعویٰ کر دیا۔ اس دعوے میں بھارت کی یہ ہندوانہ ذہنیّت بھی کام کر رہی تھی کہ اس علاقے میں تیل کے زیرِ زمین ذخیرے موجود ہیں۔

۱۹۵۱ء میں دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کی کانفرنس ہُوئی تھی جو ناکام رہی۔ ۱۹۵۶ء میں بھارت کے معاندانہ اور منافقانہ رویّے میں شدّت پیدا ہوگئی۔ ۱۹۵۰ء میں دونوں ملکوں کی ایک اور کانفرنس ہُوئی جو ناکام رہی پھر ایک اور کانفرنس ۱۹۶۰ء میں ہُوئی۔ اس میں اتنی سی کامیابی ہُوئی کہ بھارت اس پر رضامند ہوگیا کہ یہ علاقہ اُس کی ملکیّت نہیں بلکہ متنازعہ ہے۔ اس کے ساتھ یہ طے پایا کہ آخری فیصلہ ہونے تک نہ پاکستان اس علاقے میں چوکیاں قائم کرے نہ بھارت۔

پانچ سال یہ علاقہ متنازعہ کیفیّت میں رہا۔

فروری ۱۹۶۵ء کی ایک صبح پاکستان کے اخباروں کے پہلے صفحوں پر یہ خبر شائع ہوئی ——"بھارت نے رَن کچھ میں اپنی فوج داخل کردی" —— "ہم پاکستان کے چپّے چپّے کا دفاع کریں گے۔"

آل انڈیا ریڈیو سے خبریں نشر ہونے لگیں —— "پاکستان نے رَن کچھ میں ہمارے علاقے پر قبضہ جمار کھا تھا —— بھارت کی بہادر فوج رَن کچھ پر قابض ہوچکی ہے۔"

پاکستان کے لوگوں کو پہلی بار پتہ چلا کہ رَن کچھ نام کا کوئی علاقہ بھی ہے، پھر یہ پتہ چلا کہ یہ علاقہ ریگستان ہے اور ساون بھادوں میں اس کا کچھ حصّہ دلدل بن جاتا ہے لیکن لوگوں نے ایک دھچکہ سا محسوس کیا جیسے وہ گہری نیند سوئے ہوئے تھے اور کسی نے چلتے چلتے انہیں ٹھوکر ماری ہو۔ لوگوں نے انگڑائی لی لیکن ابھی وہ پوری طرح بیدار ہونے کے مُوڈ میں نہیں تھے۔

اخباروں میں خبریں آرہی تھیں۔ بھارت کی فوج نے رَن کچھ کی تین چوکیوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ ان میں ایک چوکی بیار بھیٹ میں جو سب سے بڑی اور قلعہ نما چوکی تھی انڈین آرمی کی خاصی نفری جمع ہوگئی۔ اس سے آگے خنجر کوٹ کا قلعہ تھا۔ بھارتی فوج اس پر قبضہ کر لینے کو بڑھ رہی تھی۔

"جوانو!" —— بیار بھیٹ قلعے میں بھارتی کمانڈر اپنے ٹروپس سے کہہ رہا تھا —— "تم بھارت ماتا کے سپوت ہو۔ سینے پھیلا کر اور گردنیں اونچی کرکے آگے بڑھو۔ یہاں پاکستان کے رینجرز ہیں جو تمہارے سامنے چیونٹیوں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ان کے پاس رائفلیں اور لائٹ مشین گنیں ہیں۔ یہ فوج کے سپاہی نہیں۔ یہ لڑنا نہیں جانتے۔"

"یہ مت سوچنا کہ تم فوج کے سپاہی نہیں" —— پاکستانی رینجرز (انڈس رینجرز) کا کمانڈر خنجر کوٹ کے قلعے سے کچھ دُور اپنے جوانوں سے کہہ رہا تھا —— "آج تم سپاہی بن کر دکھاؤ گے۔ آج تمہارا مقابلہ اس دشمن سے ہے جو خنجر کوٹ کے قلعے کو نہیں تمہارے پُورے ملک کو فتح کرنے کے ارادے سے آیا ہے۔ وہ تمہارے مذہب کا نام و نشان مٹانے کے لیے آیا ہے۔"

"اگر تُم نے پاکستانی رینجرز کو بھگا دیا تو سمجھو کہ تم نے پاکستان کو فتح کرلیا" —— بھارتی کمانڈر کہہ رہا تھا۔

"جوانو!" —— پاکستانی کمانڈر اپنے جوانوں سے کہہ رہا تھا —— "اس لڑائی کو معمولی سی سرحدی جھڑپ نہ سمجھنا۔ اسے محدود علاقے کی بھی لڑائی نہ سمجھنا۔ یہ ہمارے اور ہندوؤں کے مذہبوں کی لڑائی ہے۔ تم سرحدوں کے محافظ ہو۔ قوم تمہارے بھروسے پر گہری نیند سوتی ہے۔ اگر ہمارا دشمن پاکستان میں داخل ہوتا ہے تو ہماری لاشوں سے گزر کر آگے جائے گا۔"

فوج میں اس قسم کی جذباتی تقریریں نہیں کی جاتیں جب دو فوجیں آمنے سامنے آتی ہیں تو انہیں احکام دیئے جاتے ہیں۔ ہدایات دی جاتی ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ دشمن کدھر ہے، کتنی دُور ہے اور اس کا مقابلہ کس طرح کرنا ہے لیکن پاکستان اور بھارت کی جنگ کا پس منظر کچھ اور تھا۔ بھارت اسلام کو نیست و نابُود کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ ہندو اور مسلمان کی عداوت ساری دنیا میں ضرب المثل بنی ہُوئی ہے۔ پاکستانیوں کو ۱۹۴۷ء کے قتلِ عام کا حساب بھی چکانا تھا۔ بھارت کی طرف سے کسی نہ کسی ہندو لیڈر کی زبانی پاکستان کو دھمکیاں ملتی رہتی تھیں۔ اس لیے جوانوں کو جذباتی اور مذہبی لحاظ سے اُبھارنا ضروری تھا۔

بھارتی فوج کے کمانڈروں کو پاکستانی فوج کے مورال اور عسکری اہلیّت کے متعلق یہ بتایا گیا تھا کہ پہلے دھماکے سے ہی بھاگ اٹھے گی۔ اگر بھاگی نہ تو اس میں بھگدڑ اور افراتفری کی کیفیّت ضرور پیدا ہوجائے گی۔

★

بھارتی فوج کی دو انفنٹری کمپنیاں خنجر کوٹ کے قلعے پر قابض ہونے کے لیے بڑھی آرہی تھیں۔ یہ قلعہ دونوں ملکوں کے معاہدے کے مُطابق خالی رکھا گیا تھا مگر بھارت کی دو کمپنیاں اس میں داخل ہونے کے لیے آرہی تھیں۔ پاکستانی کمانڈر نے پاکستان کے وقار پر اپنی اور اپنے رینجرز کی جانیں داؤ پر لگادیں۔ اُس نے بھارتی کمپنیوں کی نفری اور فائر پاور دیکھ لی تھی اور اُسے اپنی نفری اور فائر پاور کا بھی علم تھا۔ اُس نے اپنے مٹھی بھر رینجرز کو حکم دیا کہ بھارتی کمپنیوں کے پہنچنے سے پہلے خنجر کوٹ کے قلعے میں داخل ہوجاؤ۔

رینجرز نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور خنجر کوٹ کے قلعے میں داخل ہو کر مورچے سنبھال لیے۔ بھارتی فوج کی کمپنیوں نے انہیں قلعہ خالی کرنے کو للکارا اور دھمکیاں دیں۔ رینجرز کے کمانڈر نے جواب دیا کہ آگے بڑھو اور قلعہ لے لو۔ چنانچہ کمپنیاں رائفلوں، مشین گنوں اور مارٹر گنوں سے آگ برساتی آئیں لیکن رینجرز کی رائفل اور لائٹ مشین گنوں نے انہیں قلعے کے قریب نہ آنے دیا۔

اس کے بعد بھارتی فوج جدھر سے بھی آگے بڑھی اسے رینجرز کے سمال آرمز نے پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔ بھارت سرکار نے جو فوج رَن کچھ میں بھیجی تھی اس کے وائرلیس سیٹوں پر واویلا بپا تھا۔ اوپر والے چلّا رہے تھے کہ پیش قدمی رک کیوں رہی ہے۔ پیش قدمی کرنے والے کہتے تھے کہ ان کے آگے صرف رینجرز نہیں، پاکستان آرمی کی کچھ یونٹیں آگئی ہیں۔ اوپر والے نیچے والوں کو کوستے تھے کہ انہیں ایک کے دو دو نظر آرہے ہیں۔ پاکستان آرمی کا ابھی دُور دُور تک نشان نہیں ملتا۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ ابھی انڈس رینجرز نے ہی بھارت کی فوج کا راستہ روک رکھا تھا۔ پاک فوج ابھی رینجرز کی مدد کو نہیں آئی تھی۔ بھارتی فوج نے فروری اور مارچ ۱۹۶۵ء کے دوران رَن کچھ کے پاکستانی علاقے پر کہیں قدم جمانے کی بہت کوشش کی لیکن اسے اپنی انٹیلی جنس نے جو رپورٹیں دی تھیں وہ غلط ثابت ہو رہی تھیں۔

★

اپریل ۱۹۶۵ء —

سابق ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی کی کوٹھی میں گہماگہمی تھی۔ سلمیٰ تو بہت ہی خوش تھی۔ اُس کا بیٹا کیپٹن اصغر تین روز کی چھٹی آیا تھا۔ ارشد کا تبادلہ راولپنڈی سے لاہور ہو چُکا تھا۔ سلمیٰ نے اُسے اور طاہرہ کو اصغر کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ دونوں اصغر سے ملنے آئے ہُوئے تھے۔ اُن کے ساتھ ارشد اور عفّت کا بیٹا طاہر پرویز بھی تھا۔ اُس کی عمر سولہ برس ہو چکی تھی۔ اس وقت تک اسے بتا دیا گیا تھا کہ اُس کی ماں عفت تھی جو اُسے جنم دے کر مر گئی تھی لیکن وہ طاہرہ کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ سولہ برس کی عمر میں وہ خوبصورت جوان لگتا تھا۔ اُس کے چہرے پر مردانگی آگئی تھی لیکن لڑکپن کی معصومیت ابھی باقی تھی۔

اصغر تو خاص طور پر خوبصورت جوان نکلا۔ اسے اپنی ماں کا حُسن اور اپنے باپ عبدالجلیل خان کی مردانگی ملی تھی۔ فوجی ٹریننگ نے اُس کے جسم کو پُھرتیلا اور دلکش بنا دیا تھا۔ اُس میں ذہنی مستعدی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کے بولنے کے انداز میں پختگی اور خود اعتمادی آگئی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کمانڈ کر سکتا ہے۔ اُسے ایک عام فوجی افسر کی ٹریننگ کے بعد کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی اور اب وہ کمانڈو فورس میں تھا۔

"اصغر!" — ارشد نے اُس سے پوچھا — "رَن کچھ میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا بھارتیوں نے واقعی ہمارے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا ہے یا ہمارے اخباروں نے کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر رائی کا پہاڑ بنا رکھا ہے؟"

"اخباروں میں جو خبریں آرہی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں" — اصغر نے کہا — "پاکستان اور بھارت کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ ہندوؤں نے اس کی ابتدا رَن کچھ سے کی ہے۔ فوج میں افسروں کو بتا دیا گیا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔"

"کیا ہونے والا ہے بیٹا!" — سلمیٰ نے کہا — "کچھ ہمیں بھی بتا دو نا!"

"امّی جان!" — اصغر نے بڑے پیار سے بچّے کی طرح مُسکرا کر کہا — "میں آپ کو صرف اتنا بتا سکتا ہُوں کہ پہاڑ ٹوٹ پڑیں، آسمان سے آگ برسے...." اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "آپ کا یہ بیٹا کہیں محاذ پر کٹ مرے، آپ کا حوصلہ قائم رہنا چاہیئے۔"

سلمیٰ کا منہ کُھل گیا۔ رجب علی کے ساتھ شادی کیے سات برس گزر گئے تھے۔ اُس نے ایک

بیٹی اور ایک بیٹے کو جنم دیا تھا لیکن اُسے اصغر کے ساتھ دیوانہ وار پیار تھا۔ اس بیٹے کے مُنہ سے کٹ مرنے کے الفاظ سن کر اُس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

"امّی جان!" — اصغر نے کہا — "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ جو سبق مجھے دیتی رہی ہیں وہ آپ خود بھول گئی ہیں؟ ابّا جان کی کہانیاں مجھے آپ ہی نے سُنائی تھیں۔ مجھے آپ ہی نے بتایا تھا کہ پاکستان مجھ جیسے نوجوانوں نے بنایا تھا اور اُسے دشمن سے نوجوان ہی بچائیں گے۔ میں فوج میں افسری کے لیے تو بھرتی نہیں ہُوا تھا.... اب وقت آگیا ہے کہ مائیں اپنے بیٹوں کو پاکستان کی آن پر قربان کر دیں۔"

سلمیٰ بیدار ہو گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"اصغر بیٹا!" — طاہرہ نے کہا — "سلمیٰ آپا تمھاری ماں ہے.... اصغر کی ماں.... یہ ماں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے بیٹے کو گرم ہوا بھی لگے۔ اب جو ماں مُسکرا رہی ہے وہ کیپٹن اصغر کی ماں ہے جس نے اپنے بیٹے کو اس لیے فوج میں بھیجا ہے کہ اپنے اُس ملک کی آن پر جان کی بازی لگا دے جو اُس کے ماں باپ نے بنایا اور اس کی خا نا گھر ور اپنی جائیداد چھوڑ کر ہجرت کی تھی۔"

"اور تمھارا باپ پاکستان کے نام پر قربان ہو گیا ہے" — ملک رجب علی نے کہا — "میں تمھیں بتا چکا ہُوں کہ اُس نے کس طرح اپنی جان کی قربانی دی تھی۔"

"ابّا جان!" — اصغر نے رجب علی سے کہا — "آپ گڑے مُردے کیوں اکھاڑ لیا کرتے ہیں۔ کیا میں نے آپ کو باپ نہیں سمجھا؟ آپ اُس واقعہ کو بھول کیوں نہیں جاتے؟"

"آہ، میرے عزیز بیٹے!" — ملک رجب علی نے آہ لے کر کہا — "میرا ضمیر ابھی مطمئن نہیں ہُوا۔ میرا کفّارہ ابھی ادا نہیں ہُوا۔ اب شاید وقت آگیا ہے۔"

"میں اصغر سے پوچھ رہی تھی کہ کیا ہونے والا ہے" — سلمیٰ نے کہا — "آپ اپنی لے بیٹھتے ہیں۔"

"میں آپ کو بتا نہیں سکتا امّی جان!" — اصغر نے کہا — "یہ فوجی راز ہیں۔ ہندو حکومت ہمیں للکار رہی ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہندو ہمیں کمزور سمجھ رہے ہیں۔ انہوں نے چین کے ساتھ جنگ کو بہانہ بنا کر بے اندازہ جنگی طاقت بنا لی ہے لیکن ہمارے حکمران سیاست بازیوں میں لگے رہے اور دفاعی طاقت نہ بنائی۔ اس کمی کو ہمیں جذبے اور ٹیکٹکس کی خوبیوں سے پُورا کرنا ہو گا۔"

طاہر پرویز اصغر کو دیکھتا اور اس کی باتیں سنتا رہا۔

"اصغر بھائی جان!" — طاہر پرویز نے کہا — "مجھے بھی فوج میں بھرتی کرا دیں نا!"

"لیکن تمھاری عمر ابھی کم ہے" — اصغر نے کہا — "ایک سال انتظار کر لو.... کیوں خالہ طاہرہ! اسے آپ فوج میں ہی بھیجیں گے نا؟"

"پالا کس لیے ہے؟" — طاہرہ نے کہا — "پاکستان اِن سیاسی گِدّھوں کا تو نہیں۔ پاکستان ہمارا ہے۔ ہم نے بنایا ہے۔"

★

ارشد، طاہرہ اور طاہر پرویز جا چکے تھے۔ سلمیٰ باورچی خانے میں تھی۔ اصغر ملک رجب علی کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔

"ابّا جان!" — اصغر نے کہا — "میں آپ کو بھی نہیں بتا سکتا کہ کیا ہونے والا ہے، سوائے اس کے کہ دشمن ہمیں کمزور سمجھ رہا ہے اور ہم دشمن کو بہت جلدی سمجھائیں گے کہ اس کا فیصلہ کہ کون کمزور اور کون طاقتور ہے، توپیں، ٹینک اور طیّارے اور فوجوں کی افراط نہیں کر سکتی۔ یہ فیصلہ جرأت اور جذبہ کیا کرتا ہے۔ ہمارا دشمن کیل کانٹے سے لیس ہو چکا ہے اور اُس نے رن کچھ کے تنازعہ کو بہانہ بنایا ہے۔ میں جس فورس میں ہوں اس کا میدان کوئی اور ہے۔ میں کمانڈو ہُوں۔ کمانڈو دشمن کے ملک میں جا کر، یا دشمن کے عقب میں لڑا کرتا ہے۔ کمانڈو واپس آنے کے لیے نہیں جایا کرتا۔ مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ امّی جان کے دل کو مضبُوط رکھنا آپ کا کام ہے۔"

"وہ تمہیں جانے سے روک نہیں سکتی" — رجب علی نے کہا — "لیکن وہ ماں ہے۔ بہرحال میں اُسے سنبھالے رکھوں گا۔"

"ابھی مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کہاں بھیجا جائے گا" — اصغر نے کہا — "جہاں کہیں بھی بھیجا گیا میں اس کی اطلاع آپ کو نہیں دوں گا۔ مجھے تین روز کی چھٹی اس لیے دی گئی ہے کہ آپ سے اور امّی جان سے مل لوں۔ شاید ہماری یہ ملاقات آخری ہو..... میں ایسی باتیں امّی جان کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ آپ بھی نہ کریں۔"

"نہیں کروں گا" — رجب علی نے کہا — "میں تم سے یہی کہوں گا کہ اپنے باپ کی رُوح کو شرمسار نہ کرنا۔ کمانڈو کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا لیکن یہ نہ بھُولنا کہ تمہیں خدا دیکھ رہا ہوگا۔ بزدل نہ بن جانا۔ اللہ تمہیں زندہ واپس لائے۔ کامیاب واپس لائے۔"

تین روز چھٹی گزار کر اصغر چلا گیا۔

★

"پاکستانیوں میں بیداری شروع ہو چکی ہے" — رن کچھ میں تیسرے مہینے بھی کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکنے کے بعد بھارتی ہائی کمانڈ کی ایک اور کانفرنس میں بھارتی انٹیلی جنس کا وہی میجر جنرل کانفرنس کو بتا رہا تھا — "پاکستان سے جو رپورٹیں اب آئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اخباروں میں یہ خبر چھپتے ہی کہ بھارت نے رن کچھ میں پاکستانی علاقے میں فوج داخل کر دی ہے، پاکستان کا بچّہ بچّہ نیند سے جاگ اُٹھا ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ رن کچھ میں کیا ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ پاکستان کے حکمران بھارت کے ساتھ پُرامن تعلّقات رکھنے کے خواہش مند ہو سکتے ہیں، پاکستانی قوم میں بھارت کی دشمنی کم نہیں ہُوئی.....

"یہی کیفیّت پاکستان آرمی میں پائی جاتی ہے۔ اس کے پاس ہتھیاروں اور نفری کی کمی ہے لیکن مورال اتنا مضبُوط ہے کہ رن کچھ میں ہماری فوج کے داخلے کے ساتھ ہی بارکوں میں بے چینی شروع ہو گئی ہے اور یونٹوں کی نقل و حرکت بھی شروع ہو گئی ہے۔"

"وہ تو ہونی ہی تھی" — برّی فوج کے کمانڈر انچیف نے کہا — "سرحدوں پر ذرا سی گڑبڑ ہو تو قریبی چھاؤنی میں نقل و حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ آپ خود میجر جنرل ہیں۔ آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے۔ میں اب بھی کہتا ہُوں کہ پاکستان پر حملہ محض پولیس ایکشن جیسا ہوگا۔ میں تین گھنٹوں کے اندر اندر تمام مزاحمت کو کچل کر لاہور میں داخل ہو جاؤں گا۔ رکاوٹ صرف بی۔ آر۔ بی نہر کی ہے۔ وہ میرے ٹروپس ایک نالی

سمجھ کر پھلانگ جائیں گے۔"

"محترم جنرل!" — انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر نے کمانڈر انچیف سے کہا — "میں مسلّح افواج کی آنکھیں اور کان ہُوں۔ آنکھیں اور کان جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ جھوٹ انسان بولا کرتا ہے۔ اپنے آپ کو فریب اور خوش فہمیوں میں انسان مبتلا کیا کرتا ہے مگر آنکھیں جو دیکھتی ہیں اور کان جو سنتے ہیں اس سے آپ فرار حاصل نہیں کر سکتے۔ کریں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ پاکستانیوں کو ہم نے امن اور غربت میں دیکھا تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ اس قوم کا جذبہ مر گیا ہے۔ پاکستانی اب بھی غربت میں ہیں لیکن قومی جذبے اور حُبّ الوطنی کے جذبے سے وہ مالا مال ہیں۔ پاکستان کے معاملے میں وہ اتنے حسّاس ہیں کہ اپنے بچے قربان کرنے پر آ گئے ہیں۔ رن کچھ میں صرف رینجرز نے ہماری پلٹنوں کو روکا ہُوا ہے۔ ہم نے فروری کے پہلے ہفتے میں وہاں اپریشن شروع کیا تھا۔ اب اپریل کا پہلا ہفتہ ہے۔ ہمارے ٹروپس نے فروری میں جن خالی چوکیوں پر قبضہ کیا تھا ان سے آگے وہ ایک قدم نہیں بڑھ سکے۔"

"اور پاکستان ایک چال اور چل گیا ہے" — ڈیفینس سیکرٹری نے کہا — "پاکستان اور آزاد کشمیر فوج کی پوری کی پوری کمانڈو بٹالین مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو چکی ہے اور اس نے وہاں اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا ہے۔"

"میرے پاس رپورٹیں آ چکی ہیں" — برّی فوج کے کمانڈر انچیف نے کہا — "اور میں نے اس کے مطابق احکامات جاری کر دیئے ہیں۔ ہم انہیں جلدی صاف کر دیں گے۔"

"یہ بھی خیال رکھیں کہ انٹیلی جنس کی رپورٹیں کیا کہتی ہیں" — انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر نے کہا — "آزاد کشمیر اور کشمیر کے اُس حصّے کے لوگ جو ہمارے پاس ہے، کمانڈو پارٹیوں کو مدد اور پناہ دے رہے ہیں۔ آپ کس کس کو صاف کریں گے؟ ابھی تو ایک بٹالین ہے جو ہمارے (مقبوضہ کشمیر) علاقے میں داخل ہو کر کسی دشوار گزار علاقے میں چھپ گئی ہے۔ ہمیں ان کمانڈو پارٹیوں کا بھی کچھ بندوبست کرنا ہے جو آزاد کشمیر سے آتی اور مشن پورا کر کے واپس چلی جاتی ہیں۔ میری رپورٹوں کے مطابق پاکستان کی اس کمانڈو فورس کی نفری پانچ ہزار ہے اور کشمیر میں کمانڈو اور گوریلا اپریشن کو انہوں نے 'اپریشن جبرالٹر' کا نام دیا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ جبرالٹر کو مسلمان جبل الطارق کہتے ہیں۔ ان کے جرنیل طارق نے جب سپین پر چڑھائی کی تھی تو اسی مقام پر اس نے اُتر کر کشتیاں جلا ڈالی تھیں کہ واپسی کا خیال ہی ذہن سے نکل جائے۔ اب پاکستان کے مسلمانوں نے طارق کی روایت کو زندہ کرنے کے لیے بڑا دلیرانہ اپریشن شروع کیا ہے۔"

"یہ تو آپ کا کام ہے کہ کشمیر سے پاکستانی کمانڈو فورس کو نکالنا ہے" — بھارتی وزیرِاعظم نے کہا — "غور اس پر کریں کہ جس پاکستان کو آپ کمزور سمجھتے تھے اس نے کتنا دلیرانہ اقدام کیا ہے، اور جس قوم کو ہم جذبے سے خالی سمجھتے تھے وہ بیدار ہو گئی ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ پاکستان کے لوگ اپنی فوج کی مدد کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں آپ کو سوچنا ہے کہ کیا کرنا چاہیئے۔ میں ذاتی طور پر اسے اپنی شکست سمجھوں گا کہ رن کچھ سے اپنے ٹروپس کو واپس بلا لیا جائے۔"

"ہم رن کچھ میں مزید فوج بھیجیں گے" — برّی فوج کے کمانڈر انچیف نے کہا — "آپ اُن معاہدوں کو بھول جائیں جو آپ نے پاکستان کے ساتھ کبھی کیے تھے۔ ہم رن کچھ کے متنازعہ علاقے میں داخل ہُوئے ہیں اور پاکستان نے کشمیر کو متنازعہ علاقہ سمجھ کر وہاں اپنی کمانڈو فورس داخل کر دی ہے۔ یہ جنگ

ہے۔ اس کے لیے ہم تیار ہیں۔ رَن کچھ سے ٹروپس واپس نہیں آئیں گے۔ وہاں اور ٹروپس جائیں گے۔ پاکستان اپنے انجام کے راستے پر چل پڑا ہے۔ ہم اسے بہت جلدی انجام تک پہنچا دیں گے۔ آپ نقشے سے پاکستان کو مٹا دیں۔"

★

رَن کچھ میں بھارت نے اچانک صُورتِ حال سنگین کر دی۔ ۱۹۶۲ء میں بھارت نے چین کے دُشمن ممالک سے اسلحہ بارود اکٹھا کرنے کے لیے نیفا کے محاذ پر چین سے جو لڑائی مول لی تھی اس میں اُس نے اپنا نمبر پچاس پیرا بریگیڈ لڑایا تھا۔ اسے انڈین آرمی کا بہترین لڑاکا بریگیڈ تسلیم کیا جاتا تھا۔ بھارت نے اپریل ۱۹۶۵ء میں اس بریگیڈ کو طیّاروں کے ذریعے رَن کچھ میں ۸۴ عرض بلد کے قریب کھاورا کے مقام پر اتار دیا۔ بھارت کا دوسرا بریگیڈ نمبر اکتیس انفنٹری تھا۔ اسے احمد آباد سے تھوڑے سے نوٹس پر رَن کچھ لا کر ۲۴ عرض بلد سے بھی آگے کریم شاہی اور وِجوکوٹ کے علاقے میں ڈیپلائے کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ مشرقی علاقے میں بھارت نے اپنا نمبر ۶۷ بریگیڈ پھیلا دیا۔ ۲۴ عرض بلد کے اُوپر پاکستان تھا۔ بھارت نے پاکستانی علاقے میں یہ دو بریگیڈ ڈیپلائے کیے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بھارت پاکستان کو بہت ہی کمزور ملک سمجھتا تھا۔

ان تینوں بریگیڈوں کی مجموعی نفری بیس ہزار تھی۔ ان کی پشت پناہی کے لیے درمیانہ اور بڑی توپوں کی رجمنٹیں اور ٹینک بھی تھے۔ یہ مکمل جنگی اہتمام تھا اور اس سے ہندو ذہنیت اور عزائم کا پتہ چلتا تھا۔ یہ اہتمام رَن کچھ کی چند ایک متنازعہ چوکیوں کی خاطر نہیں تھا۔ ہندو بھیڑیا پاکستان کو بھیڑ بکری سمجھ کر اٹھارہ برسوں کی تیاریوں سے چیرنے پھاڑنے اور اسے ہضم کرنے آیا تھا۔

پاکستان کے حکمران نے جب دیکھا کہ معاملہ سنگین نظر آتا ہے تو اُس نے اپنی ہائی کمان کو فوری کارروائی کا حکم دیا۔ فوری طور پر جو فوج بھیجی گئی اس کا دشمن سے تناسب ویسا ہی تھا جیسے ایک خونخوار کُتے کے مقابلے میں ایک بلّی کو اتار دیا گیا ہو۔ بھارتیوں کے پاس نفری کی افراط کے علاوہ جدید اسلحہ اور ٹرانسپورٹ کی فراوانی تھی۔

بھارت نے ساری دنیا کو گواہ بنانے کے لیے کہ اس نے اپنے علاقے میں فوج رکھی ہے اور پاکستان نے اس پر حملہ کر دیا ہے، خوب واویلا بپا کیا جسے سُن کر دوسرے ممالک کے بہت سے اخباری نامہ نگار اور جنگی مبصر رَن کچھ میں اکٹھے ہو گئے۔ ان سب نے جب دونوں فوجوں کا تناسب دیکھا تو انہوں نے فیصلہ دے دیا کہ پاک فوج ایک دن بھی میدان میں نہیں ٹھہر سکے گی۔

پاکستانی قوم نے اپنی فوج کو ابھی میدانِ جنگ میں نہیں دیکھا تھا۔ اپنی فوج کی حکومت دیکھی تھی اور اس کے متعلق کچھ اور ہی رائے قائم کی تھی۔ قوم دم بخود تھی۔ وہ ہندو سے شکست کھانے کے تصوّر کو بھی قبول نہیں کر سکتی تھی۔ یہ پہلی کھلی جنگ تھی۔ دشمن نہ صرف طاقتور اور تعداد میں چھ گنا تھا بلکہ اس نے مورچے بھی کھود لیے تھے اور نہایت تیزی سے پکّے بنکر بھی بنا لیے تھے۔

★

۹ اپریل ۱۹۶۵ء —— پاکستان کی تاریخ کا ایک یادگار دن!

ہندوؤں کی فوج نے وِجوکوٹ کے مقام پر پاک فوج پر فائر کھول دیا۔ یہ دونوں فوجوں کا پہلا تصادم تھا۔ یہ قیامت کا فائر تھا۔ درمیانہ اور بڑی توپوں کی گولہ باری کے دھماکوں سے زمین اور آسمان پھٹے جا رہے تھے۔ وہاں کسی انسان کا ٹھہرنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ ہندوؤں کو نفری اور اسلحہ کی افراط پر بھروسہ اور اس کا غرور تھا۔ پاکستانیوں کے پاس اللہ اور رسولؐ کا نام، پاکستان زندہ باد اور یا علی کے نعرے تھے۔

غیر ملکی نامہ نگار یہ تماشہ دیکھ رہے تھے اور وہ اب یہ دیکھنے کے منتظر تھے کہ پاکستانی جیالے نفسا نفسی کے عالم میں بھاگیں گے یا ان کی لاشوں کے پرخچے اڑ رہے ہوں گے مگر یہ عجوبہ، یہ معجزہ سب نے دیکھا اور بعد میں اپنے اپنے اخباروں کے ذریعے ساری دنیا کو دکھایا کہ پاک فوج کے جوان اپنے افسروں کی قیادت میں اور رینجرز کے دوش بدوش گولہ باری کے گرد و غبار میں گولیوں کے مینہ میں پیچھے کو بھاگنے کی بجائے آگے کو نکل گئے۔

اُنہوں نے تکبیر کے نعرے لگا کر بھارتی مورچوں پر ہلّہ (چارج) بول دیا۔ بھارتی مورچوں سے نکل ـــنے پر مجبُور ہو گئے۔ جب اسلام اور ہندومت کھُلے میدان میں پنجہ آزما ہُوئے تو ہندو بے انداز اسلحہ، چند ایک ٹینک اور بہت سے مرے ہوئے اور زخمی ساتھیوں کو چھوڑ کر پسپا ہو گئے۔

۹ر سے ۲۷ر اپریل تک انڈین آرمی کے یہ چُنے ہُوئے بریگیڈ ٹیکٹکس اور پوزیشنیں بدل بدل کر حملہ آور ہُوتے۔ انہیں تازہ دم کمک بھی پہنچائی گئی لیکن پاک فوج اور رینجرز نے انہیں کہیں بھی پاؤں جمانے نہ دیتے۔ ایک جنگی مبصّر نے کہا تھا کہ پاکستانی وسیع پیمانے کی کمانڈو طرز کی لڑائی لڑے۔ ان قلیل تعداد پلاٹونوں کے حملے شب خُونوں کی طرز کے تھے۔ یہ جنگ وہی سپاہی لڑ سکتے ہیں جن کے دلوں میں اپنے ملک، اپنے مذہب اور اپنی قوم کی محبّت جنون کی صورت اختیار کر گئی ہو۔

پاک فوج نے پاکستان کی تاریخ کے پہلے ہیرو پیدا کر دیئے۔

سب سے زیادہ خونریز معرکہ بیار بھیٹ کے مقام پر لڑا گیا جو پاکستانی مجاہدوں کے لیے نہیں بلکہ بھارتی سورماؤں کے لیے خونریز تھا۔ بیار بھیٹ قلعہ نما چوکی تھی جس میں بھارتیوں کی بہت سی نفری تھی اور یہ اُن کا ایک مضبُوط مورچہ تھا۔ پاک فوج نے اس پوزیشن پر حملہ کیا۔ توقع نہیں تھی کہ بھارتی یہ مورچہ چھوڑ دیں گے لیکن بیس دنوں کی ناکامیوں اور جانی نقصان نے ان کے حوصلے توڑ دیئے تھے۔ اُنہوں نے مقابلہ تو کیا لیکن وہ کامیاب پسپائی کے لیے لڑ رہے تھے۔ وہ قلعے سے نکلنے لگے اور پاکستانیوں کی گولیوں اور سنگینوں کا نشانہ بننے لگے۔

آخر بھارت کے دو بریگیڈ اکٹھے آگے بڑھنے لگے۔ پاکستانی کمانڈر نے یہ چال چلی کہ اپنے ٹروپس کو ان دونوں بریگیڈوں کے درمیان لے جانے اور ان کا آپس میں رابطہ توڑنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ بھارتی کمانڈر اس کی یہ چال بھانپ گئے۔ تب پتہ چلا کہ بھارتی ایک ڈویژن کو بھی لائے ہُوئے ہیں۔ اُس وقت تک پاک فوج کی نفری ایک بریگیڈ ہو گئی تھی۔ اس بریگیڈ نے دیکھا کہ انڈین آرمی کا ڈویژن آگے بڑھ رہا ہے تو کمانڈر نے ایسی چال چلی کہ اس ڈویژن کو گھیرے میں لے لیا۔

قریب تھا کہ بھارت کا یہ پورا ڈویژن پاکستانیوں کے ہاتھوں صاف ہو جاتا، بھارتی حکمرانوں نے اپنی مخصوص چال چلی۔ اُنہوں نے پاکستان کے حکمرانوں کو پیغام بھیجا ـــ "ہم فائر بندی کے لیے تیار ہیں۔ رَن کچھ

متنازعہ علاقہ ہے۔ ہم مل بیٹھ کر بات کریں گے۔"

پاکستانی حکمرانوں نے "بخش دو" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے دشمن کے ڈویژن کو چھوڑ دیا۔

میدانِ جنگ میں ہندوؤں کے فوجی ٹرک، بیشمار اسلحہ، ایمونیشن کے بکس، لاشیں اور جنگی ساز و سامان بکھرا ہوا تھا۔ بھارتی اپنی فوج نکال لے گئے۔

بھارت کے وزیرِ اعظم نے فائر بندی کی بھیک مانگ کر فائر بندی کرالی اور کھیم کرن کے ڈاک بنگلے میں اخباری نمائندوں سے کہا — "اب ہم پاکستان کو اپنی مرضی کے میدان میں گھسیٹ کر لڑائیں گے۔"

بھارت کا مشہور بکتر بند ڈویژن جو ہمیشہ جھانسی میں رہتا تھا، جالندھر میں آگیا۔ انڈین آرمی کے دوسرے ڈویژن بھی سرحد کے قریب آنے لگے۔

پاکستان میں کہیں ایک لیفٹیننٹ کرنل نے سلمیٰ کے بیٹے کیپٹن اصغر سے ہاتھ ملایا پھر اُسے گلے لگالیا۔ رات اندھیری تھی چند ایک جوان ذرا پرے کھڑے تھے۔

"سب کچھ تمہیں بتا دیا گیا ہے" — لیفٹیننٹ کرنل نے کیپٹن اصغر سے کہا — "تم جانتے ہو کہاں جا رہے ہو، کیوں جا رہے ہو..... اور یہ بھی کہ تمہاری واپسی کا امکان کم ہے لیکن میرے عزیز! قومیں تم جیسے نوجوانوں کے لہو اور جان کے نذرانوں سے زندہ اور باوقار رہا کرتی ہیں..... جاؤ، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

"خدا حافظ!"

"فی امان اللہ!"

رات تاریک تھی۔ پہاڑیوں نے اور پہاڑیوں پر دامن سے چوٹی تک، کھڑے چیل اور دیودار کے لمبے لمبے درختوں نے رات کو سیاہ کالا کر رکھا تھا۔

رات سرد تھی۔ برف پوش چوٹیوں اور وادیوں میں سے گزر کر آنے والی ہوا کے تھپیڑے یخ تھے۔ ساون کی گھٹائیں رات سے زیادہ کالی تھیں۔ انہیں برسنا تھا کسی بھی لمحے برسنا تھا۔

اتنی تاریک اور اتنی یخ رات کو مسافر سفر پر نہیں نکلا کرتے۔ تاریکی راستہ نہیں دکھاتی اور سرد ہوائیں چلنے نہیں دیتیں لیکن اکیس آدمی کشمیر کی ان وادیوں میں سفر پر نکل گئے تھے اور وہ ایک قطار میں چلے جا رہے تھے۔ جہاں وادی مڑتی تھی، سب سے آگے والا آدمی رک جاتا اور اپنے پیچھے آنے والے ہر آدمی کو دیکھتا۔ سب سے آخر والا آدمی جب اُس کے سامنے سے گزر جاتا تو وہ دبے پاؤں تیز تیز چلتا سب سے آگے چلا جاتا۔

مسافر گپ شپ لگاتے جایا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اس طرح سفر جلدی کٹ جاتا ہے اور تھکن نہیں ہوتی مگر یہ اکیس آدمی آپس میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہوتی تو وہ اُس کے کان میں سرگوشی میں کہتا تھا۔ کبھی وہ اتنی تیز چلنے لگتے جیسے ان کی منزل چند قدم دُور رہ گئی ہو، اور کبھی وہ اتنی آہستہ چلنے لگتے جیسے انہیں کوئی جلدی نہ ہو۔

وہ جو سب سے آگے تھا وہ رک گیا۔ سب رک گئے۔

"نائب صوبیدار صاحب!" — اُس نے کہا — "دس منٹ آرام کر لیں" — اُس نے اپنے ایک اور ساتھی سے پوچھا — "وہ ٹیکری کتنی دور ہے؟"

"پندرہ منٹ اور....." — اُسے جواب ملا — "آرام کر لیں؟"

وہ جو سب سے آگے تھا وہ میرِ کارواں تھا — وہ کیپٹن اصغر تھا — انسپکٹر عبدالجلیل خان مرحوم اور سلمیٰ کا بیٹا۔ وہ وردی میں نہیں تھا۔ اُس نے ملیشیا کی شلوار اور قمیض پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پشاوری چپل تھی جس کے تلوے ٹائر کے تھے۔ چلنے سے آواز نہیں دیتے تھے۔ اُس کے کندھوں پر کپتانی کے تین ستارے بھی نہیں تھے۔ وہ کیپٹن لگتا نہیں تھا۔

اُس کے ساتھ اُس کی کمانڈو بٹالین کا نائب صوبیدار محمد اسلم خان اور سترہ جوان تھے۔ ان میں ایک حوالدار، دو نائیک، دو لانس نائیک اور باقی سب سپاہی تھے اور دو سویلین تھے۔ یہ دونوں آزاد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ یہ سب ایک ہی لباس میں ملبوس تھے۔ اُنہوں نے ..... جیسے ہتھیار اٹھا رکھے تھے۔ ان کی منزل ایک، عزم ایک اور اُن کا دشمن ایک ہی تھا۔

وہ مقبوضہ کشمیر کی سرحد میں داخل ہو چکے تھے اور ذرا اُس سے .... بڑھ گئے تھے۔ وہ موت کے مسافر تھے۔ انہیں مارنا تھا، مرنا تھا، تباہ کرنا تھا۔ انہیں واپس آنے کی کوشش کرنی تھی لیکن واپسی ضروری نہیں تھی۔

✪

کیپٹن اصغر اپنی بیس آدمیوں کی کمانڈو پارٹی سے ذرا الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی پارٹی کو بٹھانے کے لیے ایسی جگہ منتخب کی تھی جہاں ایک چٹان نے ہوا کو روک رکھا تھا۔

آسمان چمک کر بجھ گیا اور دُور ہلکی ہلکی گرج سنائی دی۔ کیپٹن اصغر نے تاریک آسمان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں دعا کی کہ آج رات مینہ نہ برسے مگر اُسے اُمّید نہیں تھی کہ اُس کی یہ دعا قبول ہوگی، پھر بھی اس کے دل میں خوف نہیں تھا۔ ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ موت کے خطرے کو قبول کر لینے والے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والے بارش سے نہیں ڈرا کرتے۔

"اصغر!" — اُس کے کان میں جیسے کسی نے سرگوشی کی ہو — "یہ بھی بھلا مرنے کی عمر ہے؟ یہ تو ہنسنے کھیلنے کی عمر تھی۔"

اُس نے سر کو یوں ہلکا سا جھٹکا دیا جیسے کسی نے اُس کے ساتھ بے مزہ سا مذاق کیا ہو یا جیسے اس سرگوشی کو وہ سننا نہ چاہتا ہو۔

"اصغر بیٹا!" — چھٹی کے آخری روز بوقتِ رخصت ماں نے اُس سے پوچھا تھا — "پھر کب آؤ گے؟ راولپنڈی دُور تو نہیں۔ ہفتے کی شام آ سکتے ہو۔ اتوار کی شام چلے جانا۔"

مقبوضہ کشمیر کی سرد ہواؤں میں اُسے ماں کی یہ آواز سنائی دی تو اُس نے اپنے جسم میں ہلکا سا لرزہ محسوس کیا جیسے زلزلے کے ہلکے سے جھٹکے سے زمین ہلی ہو، مگر ایک اور آواز نے اُسے سنبھال لیا:

"میں تم سے یہی کہوں گا کہ اپنے باپ کی روح کو شرمسار نہ کرنا" — رجب علی نے اُسے کہا تھا — "کمانڈو کو ایکشن میں دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا لیکن یہ نہ بھولنا کہ تمہیں خُدا دیکھ رہا ہوگا۔ بزدل نہ بن جانا۔ اللہ تمہیں زندہ واپس لائے۔ کامیاب واپس لائے۔"

"آمین" — مقبوضہ کشمیر کی ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھے اصغر کے ہونٹوں سے "آمین" ایک سرگوشی کی طرح نکلا۔

کشمیر کے ساون کی ہوا جھکڑ بنتی جا رہی تھی۔ کبھی تو اس کی آواز بڑی لمبی "شاں شاں" بن جاتی اور کبھی یہ آواز سیٹیوں میں بدل جاتی۔ اس کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دُور کی گرج سنائی دیتی اور آسمان آنکھ جھپکنے کی طرح چمک کر تاریک ہو جاتا۔ اصغر کو بتایا گیا تھا کہ کشمیر کی بارش موسلا دھار ہوتی ہے۔ اس کے سامنے ٹھہرنا آسان نہیں ہوتا لیکن بارش سے اپنے ارادے کو متاثر نہ ہونے دینا۔

اصغر اُس موسلا دھار بارش کے آثار دیکھ رہا تھا لیکن اس میں سے اُس نے ایک امید افزا اور کار آمد پہلو نکال لیا۔ یہ تھی گھٹاؤں کی چمک۔ یہ چمک اُسے راستہ دکھا سکتی تھی۔ تارگیٹ دکھا سکتی تھی۔ روشنی راؤنڈ کا کام دے سکتی تھی۔

✪

تیز و تند ہواؤں کی شاں شاں اور سیٹیوں میں اُسے کبھی اپنی ماں کی، کبھی اپنے سوتیلے باپ ملک رجب علی کی اور کبھی اپنے کمانڈنگ آفیسر کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ماں کی آواز سب سے پیاری تھی مگر وہ نہیں سُننا چاہتا تھا کیونکہ یہ آواز اُسے پیچھے کو گھسیٹتی تھی۔ ملک رجب علی کی آواز اُسے اچھی لگتی تھی کیونکہ یہ آواز اُس کی پیٹھ ٹھونکتی تھی، پھر بھی اُس نے کوشش کی کہ یہ آواز بھی نہ سُنے۔ اس وقت جب وہ ایسی جگہ پہنچ چکا تھا جہاں کی چوٹیوں پر دشمن مورچہ بند تھا اور وادیوں میں دشمن کی گشتی پارٹیوں سے تصادم کا ڈر تھا اور جہاں تارگیٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی زخمی یا شہید ہونے کا امکان روشن تھا اُسے اپنے کمانڈنگ آفیسر کی آواز اچھی لگ رہی تھی:

"کمشن ایک اعزاز ہے جو قوم اپنے نوجوان افسروں کو دیا کرتی ہے" — اُس کے کمانڈنگ آفیسر نے اصغر جیسے آٹھ نوجوان افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ان میں پانچ نئے نئے کیپٹن بنے تھے اور تین لیفٹیننٹ تھے — "تمہیں ثابت کرنا ہے کہ تم اس اعزاز کے قابل ہو مگر یہ ثبوت باتوں سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے تمہیں اپنے خون کی قربانی دینی ہوگی۔ اپنے آپ کو ٹانگوں سے، بازوؤں یا آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے محروم کرنا ہوگا۔ جان قربان کرنی ہوگی۔"

اصغر نے مقبوضہ کشمیر کی ٹھنڈی زمین پر ٹانگیں لمبی کر دیں اور اُس نے انگڑائی لی۔ اس انگڑائی میں تھکن نہیں تھی، نئی زندگی تھی۔ اُس نے نئی توانائی کی ایک لہر اپنے جسم میں محسوس کی۔ اُسے اپنے کمانڈنگ آفیسر کی آواز اور زیادہ صاف سنائی دینے لگی:

"تم اخبار ہر روز دیکھتے ہو" — کمانڈنگ آفیسر نے کہا تھا — "اپنے دشمن کے عزائم سے تم واقف ہو لیکن اخبار ادھوری اور سُنی سنائی سنایا کرتے ہیں۔ میں تمہیں انٹیلی جنس کی خبریں سناتا ہوں۔ رَن کچھ میں دشمن کو بہت بڑی شکست ہوئی ہے۔ ہمارے صدر کو فائر بندی قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہمارا صدر جنرل ہے۔ اُسے جنگ کی صورتِ حال کا علم تھا۔ یہ صورتِ حال ہمارے حق میں تھی لیکن ایک شخص کی حکومت میں یہی خرابی ہوتی ہے کہ وہ ڈکٹیٹر نہ ہو تو بھی ڈکٹیٹر شپ کا مظاہرہ ہو ہی جاتا ہے....

"تم نے اخباروں میں پڑھا تھا کہ بھارت کے وزیرِاعظم نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہمیں اپنی مرضی اور اپنی پسند کے محاذ پر لڑائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مرضی کا محاذ کھول لیا ہے۔ یہ ہے کشمیر کا ٹیٹوال سیکٹر جو بڑا ہی دشوار گزار اور لڑنے کے لیے مشکل علاقہ ہے تمہیں معلوم ہے کہ انڈین آرمی نے اس سیکٹر میں ہماری بعض پوسٹوں پر بے خبری میں حملے کر کے ان پوسٹوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ بلند پوسٹیں فوج کے لیے بڑی کار آمد ہیں چونکہ یہ چوٹیوں پر ہیں اس لیے یہ جس کے قبضے میں آ جاتیں وہ اس علاقے کا حاکم ہوتا ہے مگر ہم انڈین آرمی کو وہاں کا حاکم نہیں بننے دیں گے....

"دشمن نے اتنے مشکل محاذ کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ اُس کے پاس ماؤنٹین (پہاڑی) ڈویژن ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ تم سب فوجی افسر ہو۔ تم جانتے ہو کہ ماؤنٹین ڈویژن کیا ہوتا ہے اور اسے کہاں استعمال کیا جاتا ہے۔ تم سویلین نہیں ہو، فوجی ہو۔ تمہیں ٹریننگ میں سب کچھ بتایا اور سکھایا گیا ہے۔ میں تم سے امید رکھتا ہوں کہ تم یہ نہیں سوچو گے کہ ماؤنٹین ڈویژن کا مقابلہ ماؤنٹین ڈویژن ہی کر سکتا ہے.... میرے نوجوان دوستو! صرف ایک انفنٹری بریگیڈ، صرف ایک انفنٹری بٹالین...." کمانڈنگ آفیسر چپ ہو گیا۔ اُس نے آٹھوں افسروں کو باری باری دیکھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر بولا — "صرف ایک سیکشن پورے ماؤنٹین ڈویژن کا مُنہ پھیر سکتی ہے۔ یہ پہاڑی علاقے کی لڑائی ہے۔ تم جانتے ہو پہاڑی علاقے کی لڑائی کیسے لڑی جاتی ہے"

کمانڈنگ آفیسر نے اپنے سامنے بیٹھے پانچ نوجوان افسروں میں سے سب سے چھوٹی عمر کے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھا اور منجھے ہوئے استاد اور تجربہ کار باپ کی طرح مسکرا کر بولا — "بتاؤ بلّو! تم پہاڑی لڑائی

کس طرح لڑو گے۔ تمھارے علاقے میں صرف ایک بٹالین چوٹیوں پر مورچہ بند ہے۔ حملہ کرنے والا پورا ڈویژن ہے۔"

"سر!۔۔۔ لیفٹیننٹ امجد جسے سب بلّو کہتے تھے، بولا۔۔۔ "میں کمانڈو ہوں۔ میں کمانڈو اپریشن تجویز کروں گا۔"

"کیوں؟۔۔۔ کمانڈنگ آفیسر نے پوچھا۔۔۔ "تمھارے تارگیٹ کیا ہوں گے؟"

"ندی نالوں کے پُل"۔۔۔ بلّو نے جواب دیا۔۔۔ "پورا ماؤنٹین ڈویژن ایک ہی بار یعنی اکٹھا ہماری بٹالین اور اونچی پوسٹوں پر حملہ نہیں کرے گا۔ وہ بے تحاشہ گولا باری کرے گا اور ایک ایک یا دو دو پلاٹونوں سے یا ایک ایک کمپنی سے ہماری پوسٹوں پر حملہ کرے گا۔ ان حملہ آور ٹروپس کو وہ کمک، ایمونیشن اور دیگر مدد دے گا۔ میں کمانڈو اپریشن سے اُس کی یہ سپلائی لائن کاٹ دوں گا۔ گوریلا اپریشن اور سنائپنگ بھی کی جاتے گی۔"

"مطلب یہ کہ پہاڑی علاقے میں تم دشمن کا بے دھڑک چلنا پھرنا بند کر دو گے"۔۔۔ کمانڈنگ آفیسر نے کہا۔۔۔ "اور دشمن کے سر پر ہر وقت خطرہ بن کر منڈلاتے رہو گے۔"

"یس سر!"

"ہاں بلّو! تم اب کمانڈو اپریشن کے لیے جاؤ گے"۔۔۔ کمانڈنگ آفیسر نے کہا۔۔۔ "دشمن نے جس زعم میں مبتلا ہو کر ہمیں کشمیر کے انتہائی دشوار علاقے میں للکارا ہے، ہم کمانڈو اپریشن سے اُس پر یہ ثابت کریں گے کہ اُس کے ماؤنٹین ڈویژن اور اُس کے توپ خانے کی افراط اور اُس کے ایمونیشن کے انبار ایک خوش فہمی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔"

✪

"اصغر بیٹا!"۔۔۔ کشمیر کی ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھے ہوتے اصغر کو اپنے کمانڈنگ آفیسر کے لیکچر کے ساتھ اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔۔۔ "رن کچھ کی جنگ پھیل تو نہیں جاتے گی؟ تمھاری یونٹ رن کچھ میں تو نہیں جا رہی؟"

اصغر تین روز کی چھٹی آیا ہوا تھا۔ وہ ہنس پڑا اور اپنی ماں کو اُس نے اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگایا اور اُسے زور سے بھینچا۔ سلمٰی نے پہلی بار اپنے اصغر بیٹے کے جسم کی سختی اور اس کے پٹھوں کی طاقت محسوس کی۔ اُسے خیال آیا کہ اُس کا بیٹا اب ویسا نہیں رہا کہ لپک کر اسے اٹھا لے گی اور گود میں لٹا لے گی یا چھپا لے گی۔ اب اصغر بیٹا اُس کا محافظ تھا۔ پاکستان کی ہر ماں کا اور پاکستان کی عصمت کا محافظ تھا۔۔۔ اور اب اصغر صرف اُس کا بیٹا نہیں رہ گیا تھا۔

"میں فوج میں کپتانی اور کرنیلی کی خاطر تو بھرتی نہیں ہوا اماں جان!"۔۔۔ اصغر نے ہنستے ہوتے کہا تھا۔۔۔ "ابّو کیوں کہا کرتے تھے کہ میں تم کو پاکستان ورثے میں دوں گا؟ آپ نے اپنی جوانی میں پاکستان بنایا تھا۔ اب میں جوان ہو گیا ہوں۔ اگر اپنے ماں باپ کے مقدّس ورثے کو دشمن سے بچانے کے لیے مجھے کسی بھی محاذ پر جانا پڑا تو کیا آپ کو دکھ ہو گا؟"

ماں اپنی جان قربان کر دیا کرتی ہے اپنے بیٹے کو گرم ہوا بھی نہیں لگنے دیتی۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ سب سے بڑی قربانی شہید کی ماں کی ہوتی ہے۔ بیٹے کے ہاتھ میں گرنیڈ دیکھ کر ماں کے دل میں یہ خواہش بڑی زور سے تڑپتی ہے کہ اُس کا بیٹا پھر چھوٹا سا ہو جاتے اور ماں اُس کے ہاتھ سے گرنیڈ لے کر اُسے گیند

دے دے۔

اب اصغر گیند کی عمر سے نکل کر گرنیڈوں کی دنیا میں چلا گیا تھا۔ سلمٰی نے اُسے پاکستان کی ساری کہانی سنا دی تھی۔ ہجرت اور مہاجروں کے قتلِ عام کے ہولناک قصّے بھی سناتے تھے اور یوں پاکستان کا تقدّس اُس کے خون اور اُس کی روح میں شامل کر دیا تھا، مگر آج جب اُس کا بیٹا محافظِ وطن کے روپ میں اُس کے سامنے کھڑا تھا تو وہ اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کر رہی تھی۔

"مجھے دکھ نہیں ہو گا بیٹا!"۔۔۔ سلمٰی نے اصغر سے کہا تھا۔۔۔ "لیکن میں ماں ہوں.... میں نے تمھیں پاکستان پر قربان کر دیا ہے لیکن ایک ماں کو اپنے بیٹے کے ساتھ وہ ساری باتیں کر لینے دو جو وہ ممتا کی ماری کرنے جو رہی ہے۔"

اصغر کو کشمیر کی گھٹاؤں کی گرج اور چمک میں ممتا کی ماری ماں کی ساری باتیں یاد آنے لگیں اور وہ محسوس کرنے لگا جیسے اُس کی سوچیں، اُس کے خیال اور اُس کا عزم ڈگمگانے لگا ہے اور اُسے افسوس سا ہونے لگا کہ وہ شہید ہو گیا تو اُس کی ماں اُس کے غم میں مر جاتے گی۔

✪

اصغر نے ذہن کا رخ بدل دیا۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ کچھ بھی نہ سوچے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کا جوش و خروش ماند پڑ جاتے اور تارگیٹ پر آ کر جذبہ لڑکھڑا جاتے۔

اُسے اپنے کمانڈنگ آفیسر کا لیکچر یاد آنے لگا اور اُسے اچانک خیال آیا کہ اس لیکچر کے بعد اُس کا ایک ساتھی لیفٹیننٹ نثار مقبوضہ کشمیر میں دو پُل تباہ کر کے اپنی جان پر کھیل چکا ہے۔ ایک صوبیدار اور ایک نائب صوبیدار اپنے اپنے تارگیٹ پر شہید ہو چکے ہیں۔ بڑے خوبرو جوان دشمن کے ماؤنٹین ڈویژن کا منہ پھیرنے کے لیے اپنی ماؤں کے جگر چاک کر چکے ہیں اور وہ مائیں اب شہیدوں کی مائیں کہلاتی ہیں۔

کیپٹن اصغر ان افسروں اور جوانوں سے جو مشن پورا کر کے واپس آتے تھے پوچھا کرتا تھا کہ شہید کس طرح شہید ہوتے ہیں اور اُنھوں نے اپنا مشن کس طرح پورا کیا ہے۔ وہ اسے تفصیلات سنایا کرتے تھے۔ یہ تفصیلات اُس کے خون میں جوش پیدا کرتی تھیں۔ ایک ساتھی کی موت دوسروں کے جذبوں کو نئی زندگی دے جاتی تھی۔

"بلّو نے ٹھیک جواب دیا ہے کہ وہ پہاڑی علاقے میں اپنی جنگی طاقت کی کمی کو گوریلا اور کمانڈو اپریشن سے پورا کرے گا"۔۔۔ کمانڈنگ آفیسر نے کہا تھا۔۔۔ "بلّو نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ تم سب کچھ سمجھتے ہو۔ تمھیں کمانڈو ٹریننگ میں جو سبق دیے گئے تھے میں انھیں دُہرا رہا ہوں۔ تمھیں بتایا جا چکا ہے کہ کشمیر میں ندی نالوں پر چھوٹے چھوٹے پُل ہیں جنھیں تباہ کر دیا جاتے تو فوجوں کا آپس میں رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ سپلائی لائن کٹ جاتی ہے۔ پُل وہی اہم نہیں ہوتے جو میدانی علاقوں میں دریاؤں پر تعمیر کیے ہوتے ہوتے ہیں۔ ایسے پُلوں کو طیّاروں سے آسانی سے تباہ کیا جا سکتا ہے لیکن پہاڑی علاقے کے چھوٹے چھوٹے پُل ہوا بازوں کے لیے اتنا چھوٹا تارگیٹ ہوتے ہیں جن پر ٹھکانے کی بمباری اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی ہوتا ہے کہ طیارے کو اتنے چھوٹے تارگیٹ کو بمباری سے تباہ کرنے کے لیے بہت کم بلندی پر لانا پڑتا ہے مگر ندی کے دونوں طرف کی پہاڑیوں پر طیّارہ شکن گنیں موجود ہوتی ہیں جو کم بلندی پر آتے ہوتے طیّارے کو آسانی سے نشانہ بنا سکتی ہیں۔ اگر یہ گنیں نہ بھی ہوں تو تیز رفتار

حملے سے اُٹھتے اور گھومتے وقت طیّارہ پہاڑیوں سے ٹکرا سکتا ہے....

مرندی کے دونوں طرف اونچی پہاڑیاں کھڑی ہیں۔ ندیاں دور نیچے ہیں۔ اِدھر اُدھر آنے جانے کے لیے چھوٹے چھوٹے پل ہیں۔ ایک پُل کو توڑ دینے سے آمدورفت لمبے عرصے کے لیے رُک جاتی ہے .... تمہیں چند ایک پُل اڑا کر دشمن کی سپلائی لائن توڑنی ہے۔ پُلوں کے علاوہ اور بھی بہت سے ٹارگیٹ ہیں. مثلاً کہیں ایمونیشن کا ذخیرہ ہے۔ دشمن کی کوئی اہم پوسٹ وغیرہ۔"

✪

اچانک کیپٹن اصغر کو دھچکا سا لگا۔ اُسے ایک اور آواز سنائی دی۔ اس آواز پر وہ چونک اٹھا۔ اُس نے تاریکی میں اِدھر اُدھر یوں دیکھا جیسے شمیم اُس کے قریب کہیں موجُود ہو۔

"واپس آجاؤ گے نا اصغر؟" ــــ یہ شمیم کی التجا تھی جیسے اصغر کی زندگی اور موت اُس کے اپنے ہاتھ میں ہو۔

اصغر پر اُس وقت بھی رقّت طاری ہوگئی تھی جب شمیم نے اُسے واپس آجانے کے لیے کہا تھا اور آج رات شمیم سے بہت دور مقبوضہ کشمیر کی ایک وادی میں بیٹھے ہُوتے بھی اُس پر رقّت طاری ہوگئی۔

شمیم اُسے چار پانچ مہینے پہلے راولپنڈی میں ملی تھی۔ شمیم اٹھارہ انیس برس کی بڑی خوبصورت اور کسی اونچے گھرانے کی لڑکی تھی۔ ان کی پہلی ملاقات نیشنل پارک میں ہُوئی تھی۔ اصغر وہاں گھومنے پھرنے گیا تھا۔ اُس نے کشتی لی اور اکیلا ہی چپّو مارنے لگا۔ اُس کے قریب سے ایک کشتی گزری۔ اس میں دو لڑکیاں تھیں اور کشتی کھینے والا پارک کا ملازم تھا۔ کشتی میں بیٹھی ایک لڑکی نے اصغر کو نظر بھر کر دیکھا۔ اصغر نے اُسے دیکھا۔ نظروں نے نظروں کو گرفتار کر لیا۔

اصغر ایسا تو نہ تھا لیکن اُس نے اپنی کشتی کا رخ موڑ دیا اور چپّو تیزی سے چلانے لگا۔ اس کی کشتی لڑکیوں کی کشتی کے قریب چلی گئی۔ اُس لڑکی نے نظریں اصغر پر جما دیں اور اصغر اُسے دیکھتا رہا۔ دونو لڑکیاں کھِل کھِلا کر ہنسیں۔ اصغر جھینپ گیا اور وہ اپنی کشتی کنارے پرے لے گیا۔

لڑکیوں کی کشتی بھی کنارے سے جا لگی۔ اصغر کشتی سے نکل کر جا رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں اس کے قریب سے گزریں۔ اصغر نے انہیں دیکھا۔

"تم ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہے ہو؟" ــــ اُس لڑکی نے اصغر سے کہا جو اُسے اچھی لگی تھی۔ "ہمیں گھور گھور کر کیوں دیکھتے ہو؟"

اصغر سمجھ گیا کہ لڑکی شوخ اور شرارتی ہے۔ وہ مُسکرایا اور بولا کچھ بھی نہیں۔

"اگر ہمارا پیچھا کیا تو پولیس کو بلا لوں گی" ــــ لڑکی نے غصّے سے کہا۔ "جانتے نہیں ہو حکومت کس کی ہے؟"

اصغر کی ہنسی نکل گئی۔

"ہنستے کیوں ہو؟" ــــ لڑکی نے پُوچھا۔ "کسی کالج میں پڑھتے ہو یا آوارہ پھرتے رہتے ہو؟"

"کاکول اکیڈمی میں پڑھتا رہا ہُوں" ــــ اصغر نے مسکراتے ہُوئے کہا۔ "آوارہ پھرنے کی فُرصت نہیں ملتی۔ فوج میں ہوں .... کیپٹن اصغر .... یہ میرا نام ہے۔"

اب وہ لڑکی ہنس پڑی ــــ اور تھوڑی دیر بعد وہ پارک کے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

اُس لڑکی نے اپنا نام شمیم بتایا۔

ان کی دوسری ملاقات بھی نیشنل پارک میں ہی ہُوئی۔ اب شمیم اکیلی آئی تھی۔ وہ امیر باپ کی بیٹی تھی اپنی کار پر آئی تھی۔

"میں نے اُس روز تمہیں آوارہ کہا تھا" ــــ شمیم نے کہا۔ "لیکن میری عادتیں دیکھو تو تم مجھے آوارہ کہو گے۔"

"میں ابھی کوئی رائے نہیں دے سکتا" ــــ اصغر نے کہا۔ "ابھی یہی کہہ سکتا ہُوں کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ پہلی بار تمہیں کشتی میں دیکھا تو ایسے لگا جیسے میں تمہیں بچپن سے جانتا ہُوں۔ ماں کے بعد تم پہلی عورت ہو جس نے مجھے معلوم نہیں کیسی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔"

"لگتا ہے جیسے میں بھی ایسی ہی زنجیروں میں جکڑی گئی ہوں" ــــ شمیم ہنستے ہنستے سنجیدہ ہوگئی۔ کہنے لگی ــــ "اصغر! ایک بات بڑی صاف کہہ دیتی ہُوں۔ مجھے کچھ اور نہ سمجھ لینا۔ تم فوجی ہو۔ تمھاری زندگی اور تمھارے خیالات کچھ اور ہوں گے۔ میں وقتی دوستی سے گھبراتی ہوں۔ تم جیسے نوجوانوں سے چھیڑ خانی کرنا میرا شغل ہے لیکن کسی کے ساتھ دوستی کی بات کرنے کو کبھی جی نہیں کیا۔ تم پہلے آدمی ہو جس کے پاس یوں بیٹھی ہوئی ہُوں۔ میں نے تو اُن کے بھی مذاق اڑائے ہیں جن کے ماں باپ میرا رشتہ لینے آتے تھے۔ اپنی شوخی اور شرارت پسندی کی وجہ سے میں بدنام بھی ہوگئی ہوں مگر میں وہ کلی ہوں جس کی خوشبو ابھی کسی نے نہیں سونگھی .... اگر میرے ساتھ کھیلنا ہے تو ابھی بتا دو۔ پھر اُس روز کی طرح ہم اپنی اپنی کشتیوں میں بیٹھ جائیں گے اور دُور دُور سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں گے۔"

"میں نے کبھی کسی لڑکی کے ساتھ بات نہیں کی تھی" ــــ اصغر نے کہا ــــ "تم پہلی لڑکی ہو جس کے پاس اتنی بے تکلفی سے بیٹھا ہُوا ہوں .... اور تم آخری لڑکی ہو گی۔"

پھر وہ ملتے رہے اور ایک دوسرے میں جذب ہوگئے۔ شمیم کی شوخیاں اور شرارتیں اصغر کی ذات تک محدود ہوگئیں۔ اب اُس کا شغل یہی رہ گیا کہ ایک ملاقات کے بعد اگلی ملاقات کا انتظار کرتی رہے۔

پھر اُن کی آخری ملاقات ہُوئی جس نے شمیم کی رہی سہی شوخیاں بھی ختم کر دیں۔

"شمیم! تم نے کہا تھا کہ تم وقتی دوستی سے گھبراتی ہو۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ تم فوجی ہو۔ تمھاری زندگی اور تمھارے خیالات کچھ اور ہوں گے" ــــ اصغر نے کہا ــــ "میں تمہیں چھوڑ نہیں رہا لیکن تم اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لو کہ ہماری دوستی وقتی تھی۔"

شمیم نے گھبرا کر اُس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"زندہ رہا تو ثابت کروں گا کہ یہ دوستی وقتی نہیں تھی" ــــ اصغر نے کہا ــــ "میں فوجی ہُوں۔ تم جانتی ہو کہ رن کچھ میں دشمن ہم سے بُری طرح پٹ گیا تھا۔ اب اُس نے کشمیر میں ہماری پوسٹوں پر حملہ کر دیا ہے اور وہ مزید فوج ٹیٹوال سیکٹر میں جمع کر رہا ہے۔"

"تم اُس محاذ پر جا رہے ہو؟" ــــ شمیم نے بجھے بجھے سے لہجے میں پوچھا۔

اصغر نے اُسے یہ نہ بتایا کہ وہ کمانڈو ہے اور ایک بہت بڑے کمانڈو اپریشن میں شامل ہے۔ اُس نے شمیم کو اتنا ہی بتایا کہ وہ کشمیر کے محاذ پر جا رہا ہے۔ شمیم نے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں

لے لیے اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

"مجھے آنسوؤں سے رخصت کرو گی یا دعاؤں سے؟" — اصغر نے کہا — "میں کرائے کا فوجی نہیں ہوں شمیم! اپنے ملک کا محافظ ہوں۔ تمہاری عصمت کا محافظ ہوں۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ جائیں گی اصغر!" — شمیم نے کہا اور رندھی ہوئی آواز میں پوچھا —

"واپس آجاؤ گے نا اصغر!"

اصغر پر ایسی رِقّت طاری ہوئی کہ وہ بول نہ سکا۔

✪

"یہ قربانی بھی دینی ہوگی؟" — اصغر کو خیال آیا — "جان دینا آسان ہے" — سیاہ کالی رات میں اُسے شمیم کا چہرہ نظر آیا۔ شوخ اور شرارتی چہرہ اداس تھا۔ آنکھیں بھیگی ہوئیں اور ہونٹ بند۔ اصغر کو اُس کی آواز سنائی دی — "واپس آجاؤ گے نا اصغر!"

"سر!" — اُسے اپنے نائب صُوبیدار کی آواز سنائی دی — "چلنا چاہیئے۔ زیادہ آرام کیا تو ٹھنڈے جسم بیکار ہو جائیں گے۔"

"بارش آتے گی" — کیپٹن اصغر نے کہا۔

"آنے دو سَر!" — نائب صُوبیدار نے کہا — "ابھی تو گولیوں کا بھی مینہ برسے گا۔"

اصغر ہنس پڑا اور پھر اپنی ہنسی پر وہ حیران ہُوا۔

"چلیے نائب صوبیدار صاحب!" — اصغر نے کہا — "اور آپ میرے ساتھ رہیں۔"

پارٹی پہلے کی طرح چل پڑی۔

"آپ کے بیوی بچے ہیں صاحب؟" — اصغر نے نائب صوبیدار سے پوچھا۔

"جی سَر!" — نائب صوبیدار نے جواب دیا — "بیوی ہے۔ دو بچے ہیں۔ ایک پانچ سال کا ہے دوسرا دو سال کا۔"

"آپ دو مشن کر چکے ہیں" — اصغر نے کہا — "آپ کو اپنے بیوی بچے تو یاد آتے ہوں گے۔"

"سَر! آپ کیپٹن ہیں میں نائب صوبیدار ہوں" — نائب صوبیدار نے کہا — "عہدے کے لحاظ سے بھی تعلیم کے لحاظ سے بھی آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ آپ میرے کمانڈر ہیں۔ سر! میں بات کرتے ڈرتا ہوں کہ آپ کی گستاخی نہ ہو جائے۔ آپ کی جوانی ابھی ابھی شروع ہوئی ہے۔ شاید آپ کے خیالات کچھ اور ہوں۔ میری عمر بتیس سال ہو گئی ہے.... سر! فوج میں ایک لفظ سکھایا جاتا ہے، مورال۔ ہم جنگلی اور دیہاتی لوگ مورال کا مطلب نہیں جانتے۔ ہم اسے غیرت کہا کرتے ہیں۔"

"اسلم صاحب!" — اصغر نے نائب صوبیدار سے کہا — "کیا آپ کو شک ہے کہ میری عمر کے جوان آدمی میں غیرت نہیں ہوتی؟"

"میں آدمی کی بات نہیں کر رہا سَر!" — نائب صوبیدار نے کہا — "میں افسر کی بات کر رہا ہوں۔ افسر اور آدمی میں کچھ فرق ہوتا ہے۔"

اصغر کی ہنسی نکل گئی۔

"آپ ناراض نہ ہونا سر!" — نائب صوبیدار نے کہا — "آپ پہلی بار کمانڈو اپریشن کر رہے ہیں میں دو اپریشن کر چکا ہوں۔ میں بھی افسر ہوں لیکن میں جب دشمن کے علاقے میں داخل ہوتا ہوں تو میں آدمی بن جاتا ہوں اور جب دشمن سامنے آتا ہے تو میں بڑا ستھرا آدمی بن جاتا ہوں.... صرف میں نہیں سر! میں یہ نہیں کہہ رہا کہ صرف میں شیر اور دلیر ہوں۔ کمانڈو مشن پر یا محاذ پر جو پاکستانی آتے گا وہ میری طرح کا آدمی بن جائے گا، لیکن شرط یہ ہے سر! کہ اُس میں غیرت ہو، اور جب غیرت جاگ اٹھتی ہے تو اپنے بیوی بچے دماغ سے اتر جاتے ہیں سَر!.... معافی چاہتا ہوں سر! ایک بات پوچھوں گا.... آپ کو گھر کے لوگ.... میرا مطلب ہے ابّا، امّی، بہن، بھائی یاد آ رہے ہیں؟"

اصغر بھول گیا کہ وہ کیپٹن ہے اور اسلم نائب صُوبیدار ہے۔ اُسے اسلم کی باتیں اتنی اچھی لگیں کہ اُس نے اسلم کا بازو پکڑ لیا۔

"ہاں صاحب!" — اُس نے کہا — "تھوڑی سی دیر کے لیے امّی یاد آئی تھی اور کوئی نہیں یاد آیا۔ میں اکیلا بیٹا ہوں.... اور اسلم صاحب! میں فوج میں افسری کے لیے بھرتی نہیں ہُوا۔"

"میں اُس ماں کے پاؤں چوموں گا جس نے جگر کا جو ایک ہی ٹکڑا تھا وہ پاکستان کی فوج کو دے دیا ہے" — نائب صوبیدار اسلم نے کہا — "اگر آپ.... اگر آپ.... میں آپ کے گھر ضرور جاؤں گا.... اگر ہم دونوں واپس آ گئے تو۔"

"ہاں اسلم صاحب!" — اصغر نے کہا — "اگر میں زندہ واپس نہ آسکا تو میرے گھر ضرور جانا اور میری امّی کو بتانا کہ خدا نے تمہاری قربانی قبول کر لی ہے، اور میری امّی کو بتانا کہ تمہارے جگر کا ٹکڑا کس طرح دشمن پر بجلی بن کر گرا تھا.... نائب صُوبیدار صاحب! میں صرف مرنا نہیں چاہتا۔ مارنا اور مرنا چاہتا ہوں۔ میں اُس پُل کا دھماکہ سن کر مروں گا.... میں اب آدمی ہوں، افسر نہیں۔"

"سَر!" — نائب صوبیدار نے کہا — "وطن کی لاج آپ جیسے نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے....!"

اُس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اندھیرے میں ان کے پاس کوئی آیا۔

"آپ بہت اونچی بول رہے ہیں" — اُس نے انہیں کہا — "آگے دشمن کی دو پوسٹیں آ رہی ہیں ہمیں ان کے درمیان سے اور نیچے سے گزرنا ہے۔ پٹرول (گشتی سنتری) بھی ہوگی۔ اب مجھے آگے ہو جانے دیں۔"

وہ کشمیر کا رہنے والا ایک سویلین عبدالرحمٰن تھا۔ مقبوضہ کشمیر کا رہنے والا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں وہاں سے اس حال میں ہجرت کر کے آیا تھا کہ اُس کے سارے گاؤں کو ڈوگروں نے جلا دیا اور اُن سب مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا تھا جو بھاگ نہیں سکے تھے۔ عبدالرحمٰن اپنے ایک دودھ پیتے بچے کو اٹھاتے وہاں سے نکل آیا تھا۔ اُسے انتقام لینے کے لیے اٹھارہ برس انتظار کرنا پڑا تھا۔

اس پارٹی کے ساتھ دوسرا گائیڈ عطا اللہ تھا۔ وہ بھی مقبوضہ کشمیر کا رہنے والا تھا۔ وہ بھی وہاں سے خون کی ندی میں بہتا آزاد کشمیر میں آیا تھا اور یہ خون اس کے سینے پر جم گیا تھا۔

عبدالرحمٰن اور عطاء اللہ مقبوضہ کشمیر کی وادیوں کے بھیدی تھے۔ ۱۹۶۵ء کا کمانڈو اپریشن شروع ہوتے ہی وہ کمانڈو پارٹیوں کے گائیڈ بن گئے تھے۔ اس سے پہلے وہ مقبوضہ کشمیر سے اِدھر آنے والوں کو سرحد پار کراتے تھے اور اِدھر کے پیغام سرینگر تک دے آتے تھے۔ وہ ہوا کو سونگھ کر بتا دیتے تھے کہ موسم میں کیا تبدیلی آنے والی ہے۔ اب وہ کیپٹن اصغر کی پارٹی کو لے جا رہے تھے۔

کیپٹن اصغر کو یہ مشن دیا گیا تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے اندر دو پہاڑیوں کے درمیان سے ایک ندی گزرتی تھی۔ ندی بہت نیچے تھی۔ پاٹ تنگ تھا اور اس کی کیفیت سیلابی رہتی تھی۔ اب تو ساون کا موسم تھا مینہ برستا ہی رہتا تھا اس لیے تمام ندی نالے چڑھے رہتے تھے۔ اس ندی پر ایک پُل تھا۔ ایک پہاڑی کے ساتھ ساتھ بل کھاتا ہوا کشادہ راستہ تھا جو فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہ راستہ ندی کے اس پُل سے گزر کر دوسری پہاڑی کے ایک درّے میں چلا جاتا اور آگے پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ ٹیٹوال سیکٹر کی اُن پوسٹوں تک جاتا تھا جو آزاد کشمیر کی تھیں لیکن ان پر انڈین آرمی نے حملہ کر کے قبضے میں لے لیا تھا۔ یہ تو بٹین ڈویژن کے ٹروپس تھے۔ انہیں اب کمک اور رسد دی جا رہی تھی۔ انہیں مستحکم کر کے دشمن کو آگے بڑھنا تھا۔ ندی کا صرف ایک پل تباہ کر دینے سے ان پوسٹوں کا اُن کے ڈویژن سے رشتہ توڑا جا سکتا تھا۔

کیپٹن اصغر کو یہ پُل نقشے پر دکھایا گیا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے اُسے دو گائیڈ دیے گئے تھے اور ایک نائب صوبیدار ساتھ بھیجا گیا تھا جو دو کمانڈو مشن کر چکا تھا۔ اس پُل کے متعلق جو معلومات ملی تھیں ان میں اہم یہ تھی کہ پُل کے دونوں طرف پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر دو مشین گن پوسٹیں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں لائٹیں بھی تھیں۔ ان میں سے پُل پر نظر رکھی جاتی تھی۔

کیپٹن اصغر کے مشن سے پہلے کمانڈو اپریشن شروع ہو چکا تھا۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کے کمانڈو جانباز متعدد پُل تباہ کر چکے تھے۔ اُنہوں نے ملٹری کنوائیوں پر بھی شبخون مارے تھے۔ کئی اور جگہوں پر بھی تباہی مچائی تھی۔ بھارتیوں کو توقع نہیں تھی کہ پاکستانی یوں بھی کریں گے۔ ایسا ہو گیا تو ان پر دہشت طاری ہو گئی۔ اُنہوں نے حفاظتی انتظامات زیادہ مضبُوط کر لیے۔ رات کی گشتی پارٹیوں میں اضافہ کر دیا اور پُلوں کے دونوں طرف مشین گن پوسٹیں بنا کر ان میں سرچ لائٹیں رکھ دیں۔ دن کے دوران ہیلی کاپٹر اُڑتے اور وادیوں کو دیکھتے تھے۔

یہ پُل جسے تباہ کرنے کے لیے کیپٹن اصغر جا رہا تھا چند ایک نہایت اہم پُلوں میں سے تھا۔ یہ تو شہ رگ تھی۔ اس کے دونوں طرف جو مشین گن پوسٹیں تھیں ان میں سرچ لائٹیں بھی تھیں۔ رات کو وقفے وقفے سے سرچ لائٹیں روشن ہوتیں اور ان کی روشنی پُل پر اور اردگرد گھومتی پھرتی اور ایک دو منٹ بعد بجھ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ پُل کے دونوں سروں پر ہر وقت دو سنتری کھڑے رہتے تھے۔

ان حفاظتی انتظامات میں پُل کو تباہ کرنا ناممکن تھا۔ نیچے سیلابی ندی تھی۔ پل کی بلندی پچاس فٹ کے لگ بھگ تھی اور اس کی لمبائی کم و بیش چالیس گز تھی۔

✪

کیپٹن اصغر اپنے پہلے مشن پر جا رہا تھا۔ اپنی پارٹی کے ساتھ وہ مقبوضہ کشمیر کے دشوار اور خطرناک علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ گھٹائیں جو دُور گرجتی سنائی دیتی تھیں قریب آگئی تھیں۔ ان کی چمک اب اور تیز ہو گئی تھی۔ چمکتی تھیں تو گھاس بھی نظر آجاتی تھی۔ یہ پارٹی اپنے آپ کو اس خطرے کے لیے تیار کر رہی تھی کہ آگے بلندیوں پر دشمن کی دو پوسٹیں تھیں اور اس پارٹی کو ان کے درمیان میں سے گزرنا تھا۔ یہ پارٹی اس وادی میں داخل ہو چکی تھی۔

گھٹائیں اتنی زور سے چمکیں کہ سارا ماحول پلک جھپکنے کی طرح روشن ہو کر تاریک ہو گیا۔ چیل اور دیودار کے پیڑ نیچے سے اوپر تک گنے ہوتے تھے۔ پوسٹیں اوپر تھیں۔ خطرہ پیٹرول کا تھا۔ اچانک گھٹائیں پھٹ پڑیں۔ اس قدر تیز بارش جیسے کنکریوں کی بوچھاڑیں پڑ رہی ہوں۔

"سر!۔۔۔ نائب صوبیدار اسلم نے کیپٹن اصغر سے کہا۔۔۔ "آپ بارش رکنے کا انتظار تو نہیں کریں گے؟.... اگر ہم رُک گئے تو تار گیٹ تک پہنچتے صبح ہو جائے گی۔ میں گائیڈوں کو آگے بھیج رہا ہُوں۔ یہ پیٹرولوں کی مُشک لے لیا کرتے ہیں۔"

"نہ صاحب! ہم رکیں گے نہیں"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے کہا۔۔۔ "صرف ایک گائیڈ کو میں اپنے ساتھ آگے لے جاؤں گا۔"

"آپ خود آگے جائیں گے سر؟"۔۔۔ نائب صوبیدار نے پوچھا۔۔۔ "یہ کام گائیڈوں کا ہے۔"

"یہ کام آپ کا یا میرا ہونا چاہیئے"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "گائیڈ سویلین ہیں۔ پکڑے گئے تو اپنی جان بچانے کے لیے ہمیں دھوکہ دے سکتے ہیں۔"

"پھر میں آگے جاؤں گا"۔۔۔ نائب صوبیدار نے کہا۔

"نہیں"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "میں جاؤں گا۔ اگر میں مارا گیا یا پکڑا گیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر آپ ہمارے ساتھ نہ رہے تو بہت فرق پڑے گا کیونکہ جو تجربہ آپ کا ہے وہ میرا نہیں۔"

کیپٹن اصغر عبدالرحمٰن کو ساتھ لے کر آگے چلا گیا۔ بارش چلنے نہیں دے رہی تھی۔ ہوا تیز تھی۔ سردی اتنی بڑھ گئی کہ دانت بجتے محسوس ہوتے تھے۔ عبدالرحمٰن کشمیری تھا اور وہ انہی علاقوں اور انہی موسموں میں محنت و مشقّت کرتا رہا تھا اس لیے وہ اس بارش سے مانوس تھا۔ کیپٹن اصغر آرام اور آسائش میں جوان ہُوا تھا۔ جب سے اُس کی ماں نے سابق ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی کے ساتھ شادی کی تھی وہ محل جیسی کوٹھی میں رہا تھا۔ رجب علی نے اُسے شہزادہ بنا کے رکھا تھا۔ ماں نے اُسے سینے سے لگا کر جوان کیا تھا۔

ماں کا یہ شہزادہ دشمن کے علاقے میں موسلا دھار بارش میں ٹھٹھر رہا تھا۔ پاؤں کیچڑ میں دھنس رہے تھے۔ وہ اپنے گھر کو نہیں بلکہ سیدھا موت کے مُنہ میں جا رہا تھا۔ بارش اور جھکڑ کے تھپیڑوں اور نالوں میں موت کی چیخیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس بارش میں چلنا پُل کو تباہ کرنے جتنا دشوار اور خطرناک ہے۔ اُس نے اپنا دھیان بارش سے ہٹا لیا۔

اُسے اپنے کمانڈنگ آفیسر کی ایک اور موقعہ کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اصغر کا ایک ساتھی لیفٹیننٹ مقبوضہ کشمیر میں ایک مشن پر گیا اور وہیں شہید ہو گیا تھا۔ اس کی پارٹی کے چند جوان بھی شہید ہو گئے تھے۔ اس موقعہ پر کمانڈنگ آفیسر نے نوجوان افسروں کو ایک لیکچر دیا تھا:

"خُدا کے سوا انہیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا"۔۔۔ کمانڈنگ آفیسر نے کہا تھا۔۔۔ "وہ راستے سے ہی واپس آجاتے اور کہہ دیتے کہ موسم اتنا خراب ہو گیا تھا کہ وہ آگے نہیں جا سکے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ مشن مکمل کر آتے ہیں لیکن اُنہوں نے اپنی جانیں قربان کر کے ثابت کر دیا ہے کہ انہیں جو حکم ملا تھا اس کی تعمیل کر آتے ہیں۔ اس حکم کو وہ خدا کا حکم سمجھے تھے۔ وہ اللہ کا نام لے کر آتش نمرود میں کُود گئے تھے۔"

کیپٹن اصغر کا کمانڈنگ آفیسر کبھی جذباتی نہیں ہوا تھا لیفٹیننٹ نثار جیسے خوبرو اور جوان سال آدمی کی شہادت نے اُسے جذباتی بنا دیا تھا۔ اُس کے آنسو نکل آتے تھے۔

"وہ اپنے ہاتھوں لگائے ہوئے ڈائنامیٹ سے پُل کے ساتھ ہی اُڑ گئے ہیں" — اس اُدھیڑ عمر لیفٹیننٹ کرنل نے جذبات کے غلبے سے لرزتی آواز میں کہا تھا — "ان کی لاشیں نہ ملیں، جنازے نہ اُٹھے اور قبریں نہ بنیں۔ ان کی ہڈیاں مقبوضہ کشمیر کی مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گی۔۔۔ میرے نوجوان دوستو! وہ بڑے ہی دلیر تھے۔ بہت ہی غیور تھے جو وطن کی قربان گاہ پر قربان ہو گئے ہیں۔ وہ تمہارے لیے شجاعت کا ایک معیار قائم کر گئے ہیں۔ ایک نئی روایت چھوڑ گئے ہیں تمہیں اس معیار اور روایت کو زندہ رکھنا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں کی بارش اور وہاں کے ندی نالے اور وہاں کے دشوار گزار راستے تمہیں روک لیں۔"

✪

کیپٹن اصغر کو اپنا ساتھی لیفٹیننٹ نثار شہید اور دوسرا ساتھی لیفٹیننٹ امجد شہید یاد آ گئے۔ اُس کا سینہ تن گیا۔ ٹھٹھرتا ہُوا جسم گرم ہو گیا اور وہ گائیڈ عبدالرحمٰن کے ساتھ چلتا گیا۔ بارش اور تیز ہو گئی اور پہاڑیوں سے بہہ کر آنے والا پانی وادی کو ندی بنانے لگا۔ پانی اُس کے ٹخنوں سے اوپر آ گیا۔ عبدالرحمٰن نے اصغر کے کان میں کہا کہ ایک پوسٹ دائیں طرف اوپر ہے۔

بجلی بار بار چمکتی تھی مگر اب بارش کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔ بارش اور جھکڑ کے شور میں دور اوپر سے آواز آئی — "اُوپر آ جاؤ اوئے! چار ول اوپر آ جاؤ۔ ٹھنڈ میں مر جاؤ گے۔"

کیپٹن اصغر اور عبدالرحمٰن ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ پوسٹ والے اپنے گشتی سنتریوں کو اوپر بلا رہے ہیں۔ اصغر انتظار کرتا رہا کہ سنتری کدھر سے آتے ہیں، یا جس کسی کو اوپر بلایا جا رہا ہے وہ کون ہے۔

چند منٹ انتظار کے بعد اُسے شڑاپ شڑاپ کی آواز سنائی دی بجلی چمکی تو سامنے والی پہاڑی کے ساتھ ساتھ اُسے چار سپاہی جاتے نظر آئے۔ ایک جگہ رک کر وہ اُوپر چڑھنے لگے۔ انہوں نے بلند آواز سے کسی کو گالیاں دیں اور قہقہے بھی لگائے۔ کیپٹن اصغر نے خنجر نما چاقو کھول کر اپنے ہاتھ میں رکھا ہُوا تھا۔ کمانڈو گولی نہیں چلایا کرتے۔ راستے میں دشمن کا کوئی جوان انہیں دیکھ لے تو چاقو یا خنجر سے یا اُس کا گلا گھونٹ کر اُس کا کام تمام کیا کرتے ہیں۔

کیپٹن اصغر نے عبدالرحمٰن سے کہا کہ وہ پیچھے جائے اور ساری پارٹی کو ساتھ لے آئے۔ عبدالرحمٰن جانتا تھا کہ پارٹی کو کس طرف سے لانا ہے۔

پارٹی ایک قطار میں پہاڑی کے ساتھ ساتھ آ گئی اور سب آگے چل پڑے۔ بہت آگے گئے تو پہاڑیاں ایک دوسری سے دور ہٹ گئیں۔ یہ میدان تھا لیکن ہموار نہیں تھا۔ بارش کا زور ٹوٹتا نظر نہیں آتا تھا۔

کیپٹن اصغر نے نائب صوبیدار سے کہا کہ ہر ایک جوان سے معلوم کرو کہ وہ ٹھیک ہے؟

اسے رپورٹ ملی کہ سب ٹھیک ہیں۔ بارش نے جہاں مشکل پیدا کر دی تھی وہاں یہ فائدہ بھی دے رہی تھی کہ دشمن جہاں تھا وہیں دبکا ہُوا تھا اور پٹرولیں نہیں تھیں۔ انہیں پوسٹوں میں بلا لیا گیا تھا، پھر بھی پارٹی

ے پاؤں چل رہی تھی۔ چلتے چلتے عبدالرحمٰن نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ دوسری پوسٹ وہاں اوپر ہے۔

تمام پارٹی کو بتا دیا گیا کہ اوپر دشمن کی پوسٹ ہے۔ سب پہاڑی کے ساتھ ہو کر چلنے لگے اور دو یلن فرلانگ آگے گئے تو اچانک بڑے تیز و تند پانی میں داخل ہو گئے۔ پانی گہرا تو نہیں تھا۔ گھٹنوں تک ہی تھا لیکن اتنا تیز کہ پاؤں نہیں جمتے تھے۔ نائب صوبیدار اسلم نے سب سے کہا کہ ایک دوسرے کے بازو یں بازو پرو لو اور اکٹھے پانی میں چلو۔ گائیڈوں نے بتایا کہ یہ کوئی ندی نالہ نہیں۔ بارش کا پانی گزرنے کا راستہ ہے۔ ایسا شور سنائی دے رہا تھا جیسے جیٹ ہوائی جہاز سر کے اوپر سے گزر رہا ہو۔

"قریب ہی بہت اونچی زمین ہے" — ایک گائیڈ نے بتایا — "اُوپر کا پانی آبشار کی طرح گر رہا ہے ارش رک جائے گی تو کچھ دیر بعد آبشار بند ہو جائے گی۔ ہم جہاں سے گزر رہے ہیں، یہ جگہ گہرائی میں ہے۔"

پوری پارٹی ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈالے زنجیر کی طرح بڑے تیز پانی میں سے گزر گئی۔ ائیڈوں نے بتایا کہ اب تارگیٹ تک دشمن کا کوئی خطرہ نہیں، البتہ راستے کی دشواریاں بہت ہیں۔

✪

دشمن کا ماؤنٹین ڈویژنوں کا غرور توڑنے کے لیے پاکستان اور آزاد کشمیر کی ماؤں کے بیٹے تمام دشواریاں عبور کر گئے۔ انہیں باد و باراں کے بے رحم تھپیڑے نہ روک سکے۔ گھٹاؤں کا چمکتا ہُوا عتاب اُن کے عزم کو ہلا نہ سکا۔ آبشاروں کا قہر اُن کے راستے کی رکاوٹ نہ بن سکا۔ وہ دلدل میں دھنسے، پھسلے، گرے، ایک دوسرے کے سہارے اُٹھے اور یوں ہنستے مسکراتے چلتے چلے گئے جیسے پکنک پر جا رہے ہوں۔

اُن کے ایمان مضبوط اور ذہن صاف تھے۔ انہیں احساس تھا کہ قوم جو اُس وقت گہری نیند سوئی ہوئی ہے وہ انہی کے بھروسے پر سوئی ہوئی ہے۔ گائیڈوں نے جب انہیں بتایا کہ تارگیٹ قریب آ رہا ہے تو بارش سے بھیگے ہوئے سرد جسم جیسے تر و تازہ ہو گئے ہوں۔

بارش کا زور تھمنے لگا۔ گھٹاؤں کی چمک ابھی باقی تھی۔ بارش کا شور کم ہُوا تو ایک غُراتا ہُوا شور سنائی دینے لگا۔ یہ کہیں نیچے تھا۔ گائیڈوں نے بتایا کہ یہ ہے وہ ندی جس کے پُل کو ہم تباہ کرنے جا رہے ہیں۔

"بائیں طرف کوئی نہ جائے" — ایک گائیڈ نے کہا — "ذرا سا پاؤں پھسلا تو سیدھے ندی میں جاؤ گے۔ اِس وقت ندی اتنی گہری اور اتنی تیز ہے کہ زندہ نہیں رہنے دے گی۔"

گائیڈ نے بات ابھی پوری ہی کی تھی کہ پارٹی میں کسی نے گھبرا کر کہا — "میرا ہاتھ پکڑ لو۔۔۔ اوہ۔۔۔ میں گیا" — اور کسی اور کی آواز آئی — "وہ گیا۔ حیدر نیچے چلا گیا ہے۔"

سپاہی حیدر کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ ذرا سی دیر اُس کی آواز سُنائی دی۔ ندی کا شور اتنا بلند تھا کہ حیدر کے پانی میں گرنے کی آواز نہ آئی — فرض نے ایک قربانی لے لی تھی۔ کیپٹن اصغر نے گائیڈوں سے پوچھا کہ حیدر کو بچایا جا سکتا ہے؟

"جو گر پڑا ہے اُسے بھول جائیں" — عبدالرحمٰن نے کہا — "ندی کی طرف جُھک کر بھی نہ دیکھنا۔ وہ بے چارا گیا۔۔۔ ہمیشہ کے لیے گیا۔"

"یہ اچھا شگون نہیں ہے سر!" — نائب صوبیدار نے کہا۔

"ہم ہندو نہیں ہیں نائب صوبیدار صاحب!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "ہم سب کو مرنا ہے۔ اپنے اُوپر

وہم طاری نہ کرو۔ پہلے سب حیدر کے لیے فاتحہ پڑھو پھر اپنی کامیابی کے لیے دُعا کرو۔"

نصف میل آگے گئے تو گائیڈوں نے بتایا کہ پُل کی حفاظت کے لیے اس طرف والی پوسٹ کہاں ہے۔ اصغر نے پارٹی کو وہیں روک لیا۔ اُسے جو بریفنگ دی گئی تھی اس کے مطابق اُسے پہلے مشین گن پوسٹ پر شبخون مارنا تھا۔ مخبروں نے صحیح رپورٹ دی تھی کہ دونوں پوسٹوں میں کتنی کتنی نفری ہے اور اُن کی ساخت کیا ہے۔ ساخت یوں تھی کہ چیل اور دیودار کے تنوں سے دیواریں بنائی گئی تھیں۔ یہ تنے اتنے موٹے تھے کہ توپ کا گولہ بھی ان سے پار نہیں ہو سکتا تھا۔ موٹے اور لمبے تنے زمین کے متوازی اُوپر نیچے رکھے گئے تھے اور کچھ تنے عمودی رکھ کر انہیں لوہے کے لمبے کابلوں سے مضبوط کیا گیا تھا۔ ان میں سے دیکھنے کے لیے اور مشین گنوں اور رائفلوں کے فائر کے لیے چوڑے سوراخ رکھے گئے تھے۔ چھتیں بھی دیودار کے تنوں کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ کنکریٹ جتنے مضبوط بنکر تھے۔ اُن کے ارد گرد خاردار تار تھے۔

کیپٹن اصغر نے اپنی پارٹی کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ دس جوانوں کی پارٹی کو اِدھر والی پوسٹ پر اِس طرح حملہ کرنا تھا کہ دشمن قبل از وقت بیدار نہ ہو۔ نائب صوبیدار اس پارٹی کا کمانڈر تھا۔ چار جوانوں کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ ایسی پوزیشن لیں گے کہ ندی کے پار والی مشین گن پوسٹ سے فائرنگ شروع ہوگی تو یہ چاروں جوابی فائر کریں گے۔ اُن کے پاس دو لائٹ مشین گنیں تھیں اور گرینیڈ بھی۔

کیپٹن اصغر نے تین جوانوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ ان کے پاس ڈائنامیٹ اور سٹین گنیں تھیں اور گرینیڈ سب کے پاس تھے۔ دونوں گائیڈوں کو پیچھے بھیج دیا گیا۔ انہیں ایکشن میں شامل نہیں ہونا تھا۔ اُن کا فرض ادا ہو چکا تھا۔ اُن کے فرض کا دوسرا حصہ یعنی پارٹی کو واپس لے جانا، ایکشن کے بعد شروع ہوتا تھا۔

کیپٹن اصغر نے پارٹیوں کو رخصت کرنے سے پہلے کہا ـــ "میرے دوستو! یہ سوچ لو کہ تمہیں خدا دیکھ رہا ہے۔ اپنے اپنے دل میں وہی حلف اُٹھاؤ جو تم ایک بار اُٹھا چکے ہو اور اپنے خدا سے وعدہ کرو کہ تم اُس کی ذات کو دھوکہ نہیں دو گے۔ اپنی اُن ماؤں بہنوں کو یاد کرو جنہیں اٹھارہ سال پہلے کشمیر کی اس زمین پر اور مشرقی پنجاب میں ذلیل و خوار کیا گیا تھا۔ مسجدوں اور قرآن کی بے حرمتی کو یاد کرو۔ اپنے دشمن کو اپنے ذہن میں لاؤ جو پاکستان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے اسلام کا نام و نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اپنے خون میں غیرت کا جوش پیدا کرو اور سوچ لو کہ ہماری مائیں بہنیں اور بچے ہمارے بھروسے پر سو رہے ہیں اور وقار کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اپنے دل میں یہ یقین پیدا [illegible] خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم کسی انسان کے حکم سے نہیں خدا کے حکم سے یہاں آئے ہیں۔ یہ اسی خدا کی کرم نوازی ہے کہ ہمیں دشمن کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لیے اتنی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ہے۔ عہد کرو، کامیابی یا موت!" ـــ اُس نے آخر میں کہا ـــ "اور اپنے دوست حیدر کو یاد کرو جو تمہارے سامنے ندی میں شہید ہو گیا ہے۔ اُس کی رُوح تمہیں دیکھ رہی ہے۔"

بارش پھر تیز ہو گئی تھی۔ پارٹی کیپٹن اصغر کے ارد گرد کھڑی تھی۔ سب کے جسم ٹھٹھر رہے تھے۔ تھکن سے ہڈیاں دُکھ رہی تھیں۔ ہتھیاروں پر ہاتھ اکڑ گئے تھے لیکن جذبے تر و تازہ تھے۔ اصغر کے چند ایک الفاظ نے اُن کے خون کو گرمانا شروع کر دیا تھا۔

اُس رات پاکستان اور آزاد کشمیر کے لوگ بڑی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ان کے اکیس بیٹے تھکے ٹوٹے، ٹھٹھرتے جسموں کو قوم کی آن کی قربان گاہ کی طرف لے گئے۔ چلنے سے پہلے انہوں نے ہاتھ ملائے۔ کسی

کو معلوم نہیں تھا کہ وہ جس طرح اکٹھے آئے ہیں اسی طرح اکٹھے واپس جا سکیں گے یا نہیں، یا اُن میں سے کون کون زندہ واپس جا سکے گا، اُن میں سے کون اتنا زخمی ہو جائے گا کہ چل نہیں سکے گا اور دشمن اُسے بڑی اذیت ناک موت مارے گا، یا وہ دشمن سے بچنے کے لیے کیڑوں کی طرح جھاڑیوں میں رینگتا پھرے گا اور جانے کس طرح اپنی جان خدا کے حضور پیش کرے گا۔

لیکن وہ اپنی زندگی اور موت کے متعلق سوچ ہی نہیں رہے تھے۔ اُن کے سامنے وہ عہد تھا جو انہوں نے اپنے خدا سے کیا تھا اور اُن کے دل و دماغ پر اپنا مشن طاری تھا۔ پُل تباہ کرنا ہے۔ دشمن کے کسی ایک آدمی کو یہاں زندہ نہیں رہنے دینا۔

✪

گائیڈوں نے اچھی طرح بتا دیا تھا کہ اِدھر والی پوسٹ کہاں ہے اور کدھر سے اُوپر جا سکتے ہیں۔ نائب صوبیدار اسلم اپنی پارٹی کو ساتھ لے کر اُدھر کو چل پڑا۔ مشین گن پوسٹ نے اپنی نشاندہی خود ہی کر دی۔ اس کی سرچ لائٹ جلی اور اس کی روشنی ایک بڑی لمبی اور بہت موٹی لکیر کی طرح بارش میں اِدھر اُدھر حرکت کرنے لگی۔ اِس سے نیچے پُل تھا۔ روشنی نے پُل بھی دکھا دیا۔

نائب صوبیدار کے اشارے پر اُس کی دس جوانوں کی پارٹی بجلی کی سرعت سے بیٹھ گئی۔ روشنی اُن کے اوپر سے گزر گئی، پھر بجھ گئی۔ وہ اُٹھے اور چل پڑے مگر یہ چلنا ایسا نہیں تھا جیسے سڑکوں اور راستوں پر چلا کرتے ہیں۔ کشمیر کی پہاڑیاں پتھریلی نہیں مٹی کی ہیں۔ بارش میں پاؤں جما کر اُوپر جانا بڑا ہی مشکل ہوتا ہے۔

اُوپر سے پاؤں پھسل جائے تو کوئی درخت گرنے والے کو روک لے تو اتفاق کی بات ہے۔ ورنہ وہ شخص قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے آ رہتا ہے۔

ان جانبازوں نے ہتھیار اور کچھ سامان بھی اُٹھا رکھا تھا۔ جسموں کے ساتھ ایمونیشن اور گرینیڈ بندھے ہوئے تھے۔ یہ بوجھ ایک مسئلہ تھا۔ تمام جوان ایک دوسرے کو سہارا دے رہے تھے اور درختوں کا سہارا بھی لیتے تھے ـــ بارش پہلے کی طرح موسلا دھار ہو گئی۔ پاؤں پھسلتے تھے۔ نائب صوبیدار اسلم نے دھیمی آواز میں کلمۂ طیبّہ کا وِرد شروع کر دیا۔ وہ سب ایک زنجیر کی طرح چلے جا رہے تھے۔ سب نے اپنے نائب صوبیدار کے ساتھ آواز ملائی اور لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ گنگنانے لگے۔ یہ مقدس گونج بارش اور تیز ہوا کے شور میں دشمن تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ان دس جانبازوں کو اُس [illegible] نے ایسی قوت دی کہ وہ محسوس کرنے لگے جیسے اب ان کے پاؤں پھسل نہیں رہے اور گھٹاؤں کا عتاب اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

نائب صوبیدار اب اوپر نہیں بلکہ ڈھلان کے ساتھ ساتھ آگے کو چل پڑا۔ اُس کی پارٹی اُس کے ساتھ پروئی ہوئی تھی۔ کلمۂ طیبّہ کی گونج جاری تھی۔ چلتے چلتے اُسے اپنے پیٹ اور سینے پر کانٹے سے چُبھے۔ اس نے اپنی پارٹی کو خاموش کرا دیا اور ہاتھ آگے کر کے کانٹے محسوس کیے۔

"تار ہے" ـــ اُس نے سرگوشی کی ـــ "کٹر نکالو۔"

دوسرے لمحے دو جوان آگے ہو کر کٹروں سے تار کاٹنے لگے۔ تار گھنے تھے۔ مشین گن پوسٹ تار سے بمشکل پندرہ قدم دُور تاروں میں گھری ہوئی تھی۔ اچانک سرچ لائٹ جل اُٹھی اور اُس کی روشنی اِدھر آ گئی نائب صوبیدار نے سٹین گن تیار رکھی ہوئی تھی۔ سرچ لائٹ کی روشنی اِدھر آئی ہی تھی کہ نائب صوبیدار نے

اس پر سٹین گن کی لمبی بوچھاڑ فائر کی۔ روشنی بجھ گئی۔ سرچ لائٹ ٹوٹ گئی تھی۔

پوسٹ سے مشین گن فائر ہوئی۔ جانبازوں میں سے کسی کی "آخ" سنائی دی۔ کوئی زخمی ہو گیا تھا۔ باقی سب بکھر گئے اور لیٹ گئے۔ تاریں کاٹنے والے تاریں کاٹتے رہے۔ تمام جانبازوں نے مشین گن سے نکلتے ہوئے شرارے دیکھ کر ان پر سٹین گنیں فائر کیں۔ دشمن کی پوسٹ سے ایک روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ دشمن خاصا احمق تھا۔ روشنی راؤنڈ کی روشنی میں پوسٹ صاف نظر آ گئی۔ تار کٹ رہے تھے۔ راستہ بنتا جا رہا تھا۔

✪

ندی کے پار والی پوسٹ کے ساتھ اِدھر والی پوسٹ کا رابطہ ٹیلیفون کے ذریعے تھا یا وائرلیس سیٹوں کے ذریعے۔ اُس پوسٹ کی سرچ لائٹ جل اُٹھی۔ روشنی کا رُخ اِس طرف تھا لیکن بارش اتنی زیادہ تھی کہ روشنی یہاں تک آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اِدھر والی پوسٹ نے اُس پوسٹ کو بتا دیا ہو گا کہ اِدھر پوسٹ کے اردگرد فائر کرے۔ چنانچہ اُدھر سے مشین گنوں کی بوچھاڑیں آنے لگیں۔ ایک اور جانباز کو گولی لگ گئی اور وہ گر پڑا۔

اُدھر والی پوسٹ پر فائرنگ کے لیے جن چار جانبازوں کو موزوں پوزیشن پر بھیجا گیا تھا انہوں نے سرچ لائٹ اور مشین گنوں کی نالیوں سے نکلنے والے شرارے دیکھے تو لائٹ مشین گنوں سے فائر کھول دیا۔

کیپٹن اصغر اپنے تین جوانوں کے ساتھ اسی صورتِ حال کا منتظر تھا۔ وہ ان جوانوں کے ساتھ پُل کی طرف دوڑ پڑا۔ دو مرتبہ اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ گرا۔ وہ اُٹھا اور پُل کے قریب چلا گیا۔ وہ فضا میں اُڑتی گولیوں کے نیچے تھا۔ دونوں پوسٹوں سے ایک ایک روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ کیپٹن اصغر نے اُن کی روشنی میں دیکھا کہ پُل کے دونو سنتری پُل کے اس طرف والے سرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے پوزیشن لے رکھی تھی۔

کیپٹن اصغر نے اپنے ایک جوان کے کان میں کچھ کہا۔ وہ سنتریوں پر سٹین گن فائر کر سکتے تھے لیکن اس لیے فائر نہ کیا کہ دشمن کی پوسٹوں کو پتہ چل جائے گا کہ پُل پر بھی کوئی ہے۔

کیپٹن اصغر اور اُس کے جوان نے چاقو نکال لیے جن کے بلیڈ خنجروں کی طرح تھے۔ دونو پیٹ کے بل رینگتے ہوتے سنتریوں کے پہلو میں چلے گئے۔ سنتری وہیں بیٹھے رہے۔ بارش کا زور ٹوٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔ کیپٹن اصغر اور اُس کا جوان اور آگے رینگ گئے۔ اُن کے اُوپر سے گولیاں گزر رہی تھیں۔ انہیں سنتری اندھیرے میں دو ڈھیریوں کی طرح دکھائی رہے تھے۔ اصغر اور جوان اُٹھے اور ایک ہی بار ایک نے ایک سنتری کی پیٹھ میں اور دوسرے نے دوسرے سنتری کی پیٹھ میں چاقو اتار دیئے۔ دونو سنتری اُٹھے۔ دونو نے اتنی زور سے اور اتنی بلند آوازیں نکالیں جو ساری وادی میں سنائی دی ہوں گی۔ چاقو پیٹھوں سے نکل کر پیٹوں میں اُترے تو دونوں گر پڑے اور خاموش ہو گئے۔

سامنے والی پوسٹ سے روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ اس کی روشنی پُل کے عین اوپر آئی۔ سرچ لائٹ بھی جلی لیکن کیپٹن اصغر کی پارٹی کی ایک لائٹ مشین گن نے اس پر فائر کر کے اسے توڑ دیا۔ کیپٹن اصغر نے اپنے دوسرے دو جوانوں سے کہا کہ ڈائنامیٹ لاؤ۔

ڈائنامیٹ آ گیا لیکن سامنے والی پوسٹ کی ایک مشین گن نے پُل پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ڈائنامیٹ پُل کے درمیان میں لگانا تھا لیکن آگے جانا خودکشی کے برابر تھا۔ پھر بھی دونوں جوان بیٹھ کر اور پاؤں

پر سرکتے پُل کے وسط تک چلے گئے۔ اُوپر سے مشین گن کی بوچھاڑ آئی جو پُل کے درمیان کہیں لگی۔

کیپٹن اصغر نے دونوں جوانوں کو پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ایک بار پھر پکارنے کا بھی جواب نہ ملا تو اصغر دوڑتا گیا اور ان جوانوں تک پہنچ گیا۔ دیکھا کہ دونوں اوندھے پڑے ہیں۔ اس نے دونوں کو ہلایا۔ دونوں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکے تھے۔ اِدھر اُدھر ہاتھ سے ٹٹولا۔ اُسے ڈائنامیٹ ایک لاش کے نیچے پڑا ملا۔

کمانڈو پارٹی کی لائٹ مشین گنوں نے اکٹھے فائر کر کے سامنے والی مشین گن کو خاموش کر دیا مگر یہ مشین گن دو جانبازوں کو شہادت کی نیند سُلا چکی تھی۔ اصغر نے اپنے تیسرے جوان کو آواز دی۔ وہ آیا تو اصغر نے اُسے کہا کہ وہ اُس کی ایک ٹانگ کو مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھے بیٹھے اپنے پاؤں پُل کے اُٹھے ہوتے کنارے پر جما لے۔

وہ پیٹ کے بل لیٹ گیا اور ندی کی طرف پُل سے آگے کو سرکا۔ اُس کا دھڑ ناف تک پُل سے باہر چلا گیا۔ نیچے سیلابی ندی کا شور بڑا ہی ہیبت ناک تھا۔ اوپر سے موسلا دھار بارش اور جھکڑ۔ اِدھر جس پوسٹ پر نائب صوبیدار نے ہلّہ بولا تھا وہاں گرنیڈوں کے دھماکے ہو رہے تھے۔ جانباز تار کاٹ کر آگے چلے گئے اور ایک جوان نے مشین گنوں کے چوڑے سوراخ سے گرنیڈ اندر پھینکا تھا۔ نائب صوبیدار بنکر کے دروازے کی طرف گیا اور ایک گرنیڈ اُس نے اندر پھینکا۔

کیپٹن اصغر کی ایک ٹانگ اُس کے جوان نے بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اور اُس نے ٹانگیں لمبی کر کے ایڑیاں پُل کے کنارے جما رکھی تھیں۔ اصغر بہت نیچے جُھک گیا تھا اور وہ ہاتھوں سے ٹٹول کر ڈائنامیٹ رکھنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔

اُسے ایک جگہ مِل گئی جہاں اُس نے ڈائنامیٹ رکھ دیا۔ جیب سے سگریٹ لائٹر نکالا اور بتّی کو آگ لگا دی۔ وہ تیزی سے اوپر اُٹھا اور بولا — "پیچھے کھینچو" — اپنے جوان کی مدد سے وہ پیچھے آ گیا۔ قریب ہی اُس کے دو جوانوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اُس نے دونو کی سٹین گنیں اُٹھا لیں اور دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"دوستو! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہیں دفن نہیں کر سکا" — اور وہ اپنے جوان کو ساتھ لے کر دوڑ پڑا۔ اب ڈائنامیٹ کو پھٹنا تھا۔

دوڑتے دوڑتے وہ گِرا۔ اُٹھا۔ اُس کا جوان بھی گرا۔ کیپٹن اصغر نے اُسے بھی اُٹھایا۔ اُس نے بلند آواز سے کہا — "خبردار.... آڑ لے لو۔"

سیکنڈ گزرنے لگے۔ اصغر نے ایک جگہ بیٹھ کر دیکھا۔ اُسے ڈائنامیٹ کی بتّی کا شرارہ نظر آ رہا تھا —— اور پھر موسلا دھار بارش اور جھکڑ سے ٹھٹھرتی ہوئی سیاہ کالی رات ایک مہیب شعلے سے چمکی اور دہشت طاری کر دینے والے دھماکے سے کانپ گئی — پُل کے پرخچے اُڑ گئے۔

پارٹی کچھ دُور آ کر اکٹھی ہوئی مگر پوری نہیں تھی۔ دو تو پُل کے ساتھ اُڑ گئے تھے۔ ایک پہلے ہی ندی کی نذر ہو گیا تھا۔ چار جوان نائب صوبیدار کی پارٹی سے کم تھے۔ انہیں آوازیں دی گئیں مگر کوئی جواب نہ ملا۔ سات جوان قربان ہو گئے تھے۔ کیپٹن اصغر نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ سب کے ہاتھ اُٹھے۔ وہ لاشیں اُٹھا کر نہیں لا سکتے تھے۔ لاشوں کے بغیر واپس آنے کے لیے انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو تیار کیا۔ وہ وہاں رُک نہیں سکتے تھے۔ یہی ان جانبازوں کی زندگی تھی۔ یہی اُن کے لیے حکم تھا کہ ساتھیوں کی لاشیں جہاں گریں وہیں پڑی رہنے دو۔

"وقت تھوڑا رہ گیا ہے صاحب!" ــــ ایک گائیڈ نے کہا ــــ "اب راستے میں دشمن بیدار ہوگا۔"
پارٹی واپس چل پڑی۔

ساون کی اُس رات آسمان میں بڑی زور کا دھماکہ ہُوا۔ یہ ایک بھیانک کڑک تھی۔ کیپٹن اصغر کی ماں سلمٰی ہڑبڑا کر جاگ اٹھی۔ رات آدھی گزر گئی تھی۔ سلمٰی نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ کر بلند آواز سے کہا ــــ "اصغر!"

سلمٰی کا خاوند رجب علی اُس سے دُور نہیں تھا۔ ایک ہی پلنگ تھا۔ رجب علی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے ٹیبل لیمپ جلایا۔ دیکھا سلمٰی دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے، آنکھیں پوری طرح کھولے، سخت گھبراہٹ اور خوفزدگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور اُس کے منہ سے بے اختیار آوازیں نکل رہی تھیں ــــ "یا اللہ۔ یا اللہ!"

"کیا ہُوا سلمٰی!" ــــ رجب علی نے اُسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہُوئے کہا ــــ "خواب میں ڈر گئی ہو؟"

آسمان ایک بار پھر پھٹا۔ پہلے کی طرح ایک اور کڑک، ایک اور دھماکہ ــــ سلمٰی رجب علی کے ساتھ لپٹ گئی اور چہرہ اُس کے سینے میں چھپالیا۔

"تم تو کانپ رہی ہو سلمٰی!" ــــ رجب علی نے اُسے اپنے ساتھ اور زیادہ بھینچتے ہُوئے کہا ــــ "بجلی کڑکی ہے، مینہ برس رہا ہے۔"

"اصغر کہاں ہے؟" ــــ سلمٰی نے سر اٹھا کر رجب علی سے کہا ــــ "معلوم نہیں کہاں ہوگا... کہیں باہر نہ ہو... شاید اپنے کمرے میں ہی ہو۔ اکیلا ہوگا۔"

"اوہ سلمٰی!" ــــ ملک رجب علی نے اپنا گال اُس کے سر پر دبا کر بڑے پیار سے کہا ــــ "وہ اکیلا ہی ہوگا لیکن تمہاری طرح ڈرتا نہیں ہوگا... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم ایسی بزدل ماں تو نہ تھیں!"

"بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا ہے" ــــ سلمٰی نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا ــــ "آسمان سے مینہ بھی برس رہا ہے۔ شرارے بھی برس رہے ہیں۔ اصغر اپنے سات آٹھ دوستوں کے ساتھ معلوم نہیں کہاں جا رہا ہے۔ ان سے چلا نہیں جاتا۔ معلوم نہیں کیچڑ ہے یا کیا ہے کہ اصغر اور اُس کے دوستوں کے پاؤں اٹھتے نہیں۔ قدم آگے نہیں بڑھتے... پھر... پھر" ــــ سلمٰی کی آواز خوف سے دبنے لگی۔ اُس نے رُک رُک کر کہا ــــ "پھر بڑی زور کا دھماکہ ہوتا ہے... آسمان سے آگ کا بہت بڑا گولہ بڑی تیزی سے آتا ہے اور سیدھا... سیدھا... نہیں نہیں... ایسا نہیں ہوسکتا" ــــ اُس نے روتے ہُوئے کہا ــــ "نہیں ہوسکتا ایسے۔"

"صاف کہہ دو کہ آگ کا گولہ اصغر پر گرتا ہے" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "ایسے کہہ دو گی تو دل سے دہشت اُتر جائے گی" ــــ اُس نے جھنجھلا کر کہا ــــ "دل اتنا کمزور نہ کرو سلمٰی! اصغر جہاں کہیں ہے خیریت سے ہے۔ خُدا کو یاد کرو۔ اصغر کے لیے دعا کرو... اور دیکھو۔ خواب میں کسی زندہ عزیز کو مرا ہُوا دیکھو یا

اُسے کسی مصیبت میں پڑا ہُوا دیکھو تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اُس کی عمر لمبی ہے اور وہ جہاں کہیں ہے بڑے مزے میں ہے۔"

"آپ سو جائیں" ـــ سلمٰی نے کہا ـــ "میں نفل پڑھوں گی۔"

"ضرور پڑھو" ـــ رجب علی نے کہا ـــ "لیکن میں سو نہیں سکوں گا۔"

"سنیئے" ـــ سلمٰی نے رجب علی کا چہرہ اپنے ہاتھ سے اپنی طرف کرتے ہُوئے کہا ـــ "اتنے دنوں سے اصغر کی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ خط بھی نہیں آیا اُس کا۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ ہفتے کی رات آجایا کرو اور اتوار کی شام چلے جایا کرو۔ دو اتوار گزر گئے ہیں۔ وہ نہیں آیا۔ آپ صبح راولپنڈی چلے جائیں"

"ہو سکتا ہے وہ راولپنڈی نہ ہو۔"

"یہ تو پتہ چل جائے گا نا، وہ کہاں ہے" ـــ سلمٰی نے منّت سماجت کے لہجے میں کہا ـــ "اُس کی خیر خیریّت تو معلوم ہو جائے گی۔"

ساون کی بارش نے چھت پر ایسا شور بپا کر رکھا تھا جیسے لوہے کے پُل سے بڑی لمبی ریل گاڑی گزر رہی ہو۔ اس کے ساتھ گھٹاؤں کی دھماکہ نما گرج اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے بجلی کی کڑک جیسے رجب علی کی کوٹھی کے لان میں توپیں داغی جا رہی ہوں۔ رجب علی کی باتوں سے سلمٰی کا دل ذرا مضبوط ہوتا تھا تو گرج اور کڑک اُس کا حوصلہ پھر توڑ دیتی تھی۔ کبھی تو وہ یوں تن جاتی جیسے باہر نکل جائے گی اور اپنے بیٹے اصغر کو ڈھونڈتی پھرے گی۔

"آپ صبح راولپنڈی چلے جائیں" ـــ اُس نے پھر التجا کی ـــ "آپ نہیں جائیں گے تو اور کون جائے گا؟"

"میں ہی جاؤں گا سلمٰی! میں ہی جاؤں گا" ـــ رجب علی نے اُسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا "لیکن یہ نہ بھولو کہ وہ فوج کا کیپٹن ہے اور تم جانتی ہو فوج کا کیا کام ہوتا ہے۔ اصغر کو رن کچھ کے محاذ پر نہیں بھیجا گیا۔ کل انڈیا حملہ کر دیتا ہے تو اصغر کو گھر لے آؤ گی؟ اُسے کہو گی کہ جنگ ختم ہو جائے تو چلے جانا؟"

"نہیں.... نہیں" ـــ سلمٰی نے بڑی پختہ آواز میں کہا ـــ "میں اُسے محاذ پر جانے سے نہیں روکوں گی۔ میں اُسے اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کروں گی اور اُسے کہوں گی کہ اپنے باپ کے پاکستان پر اپنی جان قربان کرنے سے ڈر نہ جانا۔ میں اپنے سینے پر پتھر رکھ لوں گی مگر تمہاری قبر کے پتّھر پر شہید کا لفظ دیکھ کر مجھے سکون آجائے گا۔"

"ایک طرف تمہارا یہ جذبہ دوسری طرف تمہاری یہ جذباتی حالت" ـــ رجب علی نے کہا ـــ "اگر اصغر یہاں لاہور چھاؤنی میں ہوتا تو تم دوڑ کر اُس کے پاس جا پہنچتیں اور اُس کے جذبے کو تباہ کر دیتیں۔"

رجب علی کو معلوم تھا کہ اصغر کمانڈو ہے اور کشمیر میں کمانڈو اپریشن شروع ہو چکا ہے۔ رجب علی کو یقین تھا کہ اصغر نے اتنے دنوں سے خط نہیں لکھا اور دو اتوار آیا بھی نہیں تو وہ ضرور مقبوضہ کشمیر میں مشن پر چلا گیا ہے۔

"اور ہو سکتا ہے...." اُس نے اپنے آپ سے کہا ـــ "اور یہ امکان ہے کہ اصغر زخمی ہو کر پکڑا گیا ہو یا شہید ہو گیا ہو.... اگر ایسی سرکاری اطلاع آگئی تو...."

○

کیپٹن اصغر ملک رجب علی کا کچھ نہیں لگتا تھا۔ یہ رشتہ یہیں تک تھا کہ رجب علی اصغر کی ماں کا خاوند تھا۔ خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن رجب علی نے ماں بیٹے کے ساتھ روح کا رشتہ قائم کر لیا تھا۔ وہ اصغر کے باپ کا قاتل تھا۔ وہ اس گناہ کا کفّارہ ادا کر رہا تھا۔ اصغر کو اپنا سگا بیٹا کہہ کر اور اُسے سگے باپ کا پیار اور شفقت دے کر رجب علی کو روحانی سکون ملتا تھا۔ سلمٰی کو تو اُس نے اپنی روح میں سمو لیا تھا۔ سلمٰی خوبصورت عورت تھی۔ رجب علی کو اُس کے جسمانی حُسن نے بھی ایسا متاثر کیا تھا کہ وہ اپنے ماضی کو اور اپنے گناہوں کو بھول گیا تھا۔ سلمٰی کے خاوند عبدالجلیل کے قتل نے رجب علی کو نیا انسان بنا دیا تھا۔ سلمٰی اور اصغر نے تو اُسے یہ خون معاف کر دیا تھا مگر رجب علی نے اپنے آپ کو معاف نہیں کیا تھا۔ وہ سلمٰی اور اصغر کے لیے جان تک قربان کرنے کا عہد کیے ہُوئے تھا۔

اب سلمٰی اُسے کہہ رہی تھی کہ وہ اصغر کی خیر خیریّت معلوم کرنے کے لیے راولپنڈی چلا جائے تو وہ اُسے ٹالنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا نہ یوں سوچ رہا تھا کہ اصغر اُس کا سوتیلا بیٹا ہے۔ خیریّت سے نہ ہُوا تو کیا ہو جائے گا۔ اُسے جب خیال آیا کہ اصغر کمانڈو مشن پر چلا گیا ہو گا اور اس پُرخطر مشن میں وہ زخمی بھی ہو سکتا ہے، شہید بھی اور وہ پکڑا بھی جا سکتا ہے تو اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔

"مجھے جذبے سے خالی نہ سمجھیں" ـــ سلمٰی نے کہا ـــ "میرے دس بیٹے ہوتے تو سب کو پاکستان پر قربان کر دیتی۔ انڈیا، بھارت، ہندوستان، ہندو، یہ ایسے الفاظ ہیں جن کے لیے میں اپنے کان بند کر دینا چاہتی ہوں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی لفظ میرے کانوں میں پڑتا ہے تو میں اپنے خون میں اُبال محسوس کرتی ہوں۔ کبھی تو غصّے اور نفرت سے میرے دانت بجنے لگتے ہیں.... لیکن.... میں نے خواب ایسا دیکھا ہے۔"

آسمان نے ایک اور توپ داغی پھر گھٹائیں بڑی زور سے گرجیں۔ چھت پر کئی ریل گاڑیاں دوڑنے لگیں۔ سلمٰی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"آپ کل راولپنڈی چلے جائیں" ـــ سلمٰی نے خوفزدہ آواز میں کہا ـــ "معلوم نہیں اصغر کہاں ہے۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ میں اُسے ایک بار دیکھ لوں۔ میں نہ دیکھ سکوں تو آپ دیکھ آئیں۔"

"اُٹھو" ـــ رجب علی نے کہا ـــ "تم نفل پڑھو اور دعا کرو کہ اصغر بیٹا جہاں کہیں بھی ہے خیریت سے ہو اور اللہ اُسے کامیابی عطا فرمائے۔"

سلمٰی اُٹھی۔ وضو کر کے آئی اور مصلّٰے بچھا کر نفل پڑھنے لگی۔ رجب علی پلنگ پر بیٹھا اُسے دیکھتا رہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس کے سامنے سلمٰی جیسی بے شمار مائیں آ گئی تھیں۔

"آج رات نہ جانے کتنی ماؤں کے بیٹے گھٹاؤں کی اس گرج میں، بجلی کی اس کڑک میں اور مقبوضہ کشمیر کی طوفانی بارش میں پھسلتے، گرتے، کیچڑ میں دھنستے اپنے وطن کے نام پر موت سے معرکہ آرا ہوں گے" ـــ رجب علی کو خیال آیا ـــ "کون جانے ان میں سے کون آئے گا اور کون ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا؟"

وہ پلنگ پر بیٹھا تھا۔ اُس کی نظر اپنے بازوؤں پر گئی۔ بازوؤں کے پٹھے مضبوط تھے۔ جوانی کے آخری دَور نے ان بازوؤں کو جیسے اور زیادہ مضبوط بنا دیا تھا۔ سلمٰی کو دیکھ کر وہ اور زیادہ جوان ہو جایا کرتا تھا۔ اُس نے سلمٰی کو دیکھا جو رکوع و سجود میں مصروف تھی۔ اس دلکش جسم نے رجب علی کے ڈھلتے شباب میں نئی روح

نئی تازگی اور نیا ولولہ پھونک دیا تھا۔

"کیا مرد کا جسم عورت کے لیے ہوتا ہے؟" ـــــ اُسے خیال آیا ـــــ "کیا جسم صرف اس لیے بنا ہے کہ لذّت حاصل کرے اور لذّت مہیّا کرے؟ لوگ اسی لیے جسم کو تندرست و توانا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تا دیر لذّت کا سرچشمہ بنا رہے.... اور رکوع و سجود میں جھکتا اور اٹھتا یہ جسم.... سلمیٰ کا جسم.... ہاں بڑا دلکش ہے مگر اس جسم نے ایک اور جسم کو جنم دیا ہے اور وہ جسم آج اپنی توانائی اپنے وطن پر صرف کر رہا ہے۔ وہ لذّت سے، اُمنگوں سے اور کسی دلکش جسم کے لمس اور وصال سے بے نیاز ہے۔"

ایک اور دھماکہ آسمان میں ہُوا مگر رجب علی کو یوں لگا جیسے بجلی کا دھماکہ اُس کے اپنے سینے میں ہُوا ہو۔ اُس نے دونوں بازو اپنے آگے کیے۔ پھر ہاتھوں سے ان کی مضبوطی اور توانائی کو محسوس کیا۔

"کس کام کے ہیں یہ بازو؟" ـــــ اُس نے اپنے آپ سے کہا ـــــ "اصغر جیسے نوجوان اس وقت کہاں ہوں گے۔ میں اس وقت کہاں ہوں" ـــــ اُسے اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا ـــــ "میں قوم کے کس کام آیا؟ کیا حق ہے میرا کہ میں اس محل میں اس نرم بستر میں بیٹھا ہُوں؟ کیا کیا ہے میں نے اِس عمر تک؟ گناہگاروں کو بخشا اور بے گناہوں کی ہڈی پسلی ایک کر کے اقبالِ جرم کراتے" ـــــ اُسے عبدالجلیل یاد آگیا۔

وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے خون میں جوش آگیا تھا۔ وہ بے چین ہوگیا۔ اُسے احساس تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر نے مقبوضہ کشمیر میں جو کمانڈو اپریشن شروع کیا ہے، یہ دونوں ملکوں کی جنگ کا باعث ضرور بنے گا۔ بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بنائے ہوئے تھا۔ مقبوضہ کشمیر میں کمانڈو اپریشن کی کامیابیوں کی تفصیلات پاکستان کے اخباروں میں شائع ہو رہی تھیں۔ ان میں مصلحتاً یہ کہا جاتا تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں نے بھارتی فوج کے خلاف گوریلا اپریشن شروع کر دیا ہے۔

ان خبروں سے پتہ چلتا تھا کہ کمانڈو جانبازوں نے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کو مفلوج کر دیا ہے اور اُس کے لیے ذرائع آمد و رفت ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ فوجی اہمیّت کے پُل تباہ ہو چکے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ تباہ ہو رہے تھے۔ گولہ بارود کے ذخیرے اُڑا دیئے گئے تھے۔ حد یہ کہ کمانڈو پارٹیاں سرینگر تک پہنچ گئی تھیں اور ارد گرد کی فوجی چوکیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ملٹری کنوائے روک دیئے گئے تھے کیونکہ کنوائے کمانڈو اپریشن سے محفوظ نہیں تھے۔ ان پر بڑے دلیرانہ اور تباہ کن شب خون مارے گئے تھے۔

ملک رجب علی اتنی سی بات سمجھ سکتا تھا کہ بھارت مقبوضہ کشمیر کو بچانے کے لیے پاکستان پر پُوری جنگی طاقت سے حملہ کرے گا اور بڑی سخت جنگ ہوگی۔

"ہونی چاہیئے" ـــــ رجب علی نے سوچا ـــــ "ہونی چاہیئے۔ ہندو کو اپنی جنگی طاقت پر ناز ہے۔ اُس کا یہ ناز اور یہ مان توڑنا ضروری ہے، لیکن میں کس کام آؤں گا؟ میرے بازو کیا تیر ماریں گے؟.... مجھے کچھ کرنا ہے۔ قوم کے ہر فرد کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔"

گھٹائیں ایک بار پھر گرجیں۔ رجب علی نے اُوپر دیکھا۔ سلمیٰ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ اُس نے ہاتھ اور اوپر کر دیئے۔

○

گھٹاؤں کی یہ گرج ایسی تھی جیسے تین چار مارٹر گنیں یکے بعد دیگرے فائر ہُوتی ہوں۔ کیپٹن اصغر اور اُس کی پارٹی پلک جھپکتے زمین پر لیٹ گئی۔

"سر! بادل گرجے ہیں" ـــــ نائب صوبیدار اسلم نے کہا ـــــ "کشمیر کے بادل جب گرجنے پہ آتے ہیں تو اسی طرح گرجا کرتے ہیں.... ہم رکیں گے نہیں۔ رات تھوڑی رہ گئی ہے۔"

"بارش چلنے نہیں دے رہی" ـــــ کیپٹن اصغر نے اٹھتے ہُوئے کہا ـــــ "لیکن یہ صحیح معنوں میں بارانِ نعمت ہے۔ دشمن پوسٹوں میں دبکا ہُوا ہے اور پٹرولیں بھی باہر نہیں آرہیں۔"

پھر بھی وہ علاقہ دشمن کا تھا۔ وہ تو جیسے بھیڑیوں کا جنگل تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کہاں بھیڑیئے بے خبری میں حملہ کر دیں۔ بارش پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی اور گھٹائیں بڑے قہر سے گرجنے بھی لگی تھیں۔ کیپٹن اصغر بہت خوش تھا کہ وہ اپنے پہلے ہی مشن میں کامیاب رہا اور کامیابی سے واپس آرہا تھا۔ وہ مشن پر بیس آدمی لایا تھا اور تیرہ کو واپس لے جا رہا تھا۔ ان میں تین زخمی تھے۔ اُن کے پٹھوں میں سے گولیاں گزری تھیں۔ ہڈیاں محفوظ تھیں۔ ان کے زخموں پر فیلڈ پٹیاں باندھ دی گئی تھیں اور ان کے ساتھی انہیں سہارا دے کر اور کہیں کندھوں پر اٹھا کر لا رہے تھے۔

کیپٹن اصغر تینوں سے باری باری کئی بار پوچھ چکا تھا کہ وہ زیادہ تکلیف تو محسوس نہیں کر رہے؟

"اگر تکلیف اور درد زیادہ ہے تو آپ کیا کر سکتے ہیں؟" ـــــ ایک نے کہا تھا ـــــ "سر! آپ کیوں بار بار پوچھتے ہیں؟ میں بالکل ٹھیک ہوں سر!"

"زخم ہے تو درد بھی ہوگا سر!" ـــــ دوسرے زخمی نے کہا تھا ـــــ "پُل کا دھماکہ یاد آتا ہے تو درد ختم ہو جاتا ہے" ـــــ اور اُس نے درد کو دباتے ہُوئے قہقہہ لگایا تھا۔

تیسرے زخمی کو ساتھی باری باری پیٹھ پر اٹھا کر لا رہے تھے۔ اُس کے کولہے میں سے گولی گزر گئی تھی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے تین چار مرتبہ کہا تھا کہ وہ نکل جائیں اور اُسے پھینک دیں۔

"سر! میں اپنے دوستوں کے لیے اتنا بوجھ نہیں بننا چاہتا" ـــــ اُس نے کیپٹن اصغر سے کہا تھا ـــــ "میری وجہ سے آپ تیز نہیں چل رہے۔ آپ نکل جائیں سر! میرے سر میں گولی مار دیں۔ میں دشمن کا قیدی نہیں بنوں گا۔"

"ہم تمہیں زندہ واپس لے جائیں گے عابد!" ـــــ کیپٹن اصغر نے اُسے کہا تھا ـــــ "تم زندہ رہو گے اور پھر یہاں آؤ گے۔"

ابھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان تیرہ میں سے کون اپنے بیس تک زندہ پہنچے گا۔ تنگ وادیاں سیلابی ندیاں بن گئی تھیں۔ پانی کہیں گھٹنوں تک تھا، کہیں ٹخنوں سے کچھ اوپر اور کہیں گھٹنوں سے بھی اوپر تھا۔ پانی تیز بھی تھا اور بہت ٹھنڈا بھی۔ وہ کئی گھنٹوں سے موسلا دھار بارش میں جا رہے تھے۔ جسم اکڑنے لگے تھے۔ نائب صوبیدار اسلم نے کیپٹن اصغر کو ہنستے ہوئے کہا تھا "سر آپ کے بھی دانت بج رہے ہیں؟"

کیپٹن اصغر ہنس پڑا تھا۔ تب اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُس کے جبڑے اُس کے اپنے قابو میں نہیں رہے۔ جبڑے جہاں کانوں کے ساتھ ملتے ہیں وہاں درد اٹھنے لگا تھا۔ کیپٹن اصغر جیسے جوان اور نائب صوبیدار اسلم جیسے سخت جان آدمی کی پسلیاں دُکھنے لگی تھیں۔ چلنے کی رفتار بہت سست تھی۔

اُس وقت سلمیٰ نفل پڑھ رہی تھی اور چار نفل پڑھ کر دعا کرتی تھی۔ گھٹاؤں کے جو دھماکے اُس کے سر پر ہو رہے تھے ویسے ہی گرجدار دھماکوں میں اُس کا بیٹا دشمن کے علاقے سے زندہ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس پر بجلیاں لپک رہی تھیں۔ باد و باراں کے تھپیڑے اُس کا راستہ روک رہے تھے۔ کیچڑ اور سیلابی وادیاں اُس کے قدم جکڑ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان اور زمین نے دشمن کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ دشمن تو بلندیوں پر پوسٹوں میں دبکا ہُوا تھا۔ کمانڈو پارٹی کو روکنے کا کام گھٹائیں اور آسمان کر رہا تھا۔

سلمیٰ کے سر پر گھٹائیں گرجتی تھیں تو اس کے منہ سے اللہ کا نام پھر اپنے بیٹے کا نام نکلتا تھا۔ بیٹے لی مدیاں بھ... ے دکھنے لگی تھیں۔

ماں کے آنسو بہنے لگے تھے۔

مقبوضہ کشمیر میں بھی وہی خُدا تھا جو لاہور میں تھا۔

ماں کو معلوم نہیں تھا کہ بیٹا کہاں ہے۔ ماں نے محسوس کر لیا تھا کہ بیٹا کسی مشکل میں ہے۔

بیٹے کے دل سے ماں نکل گئی تھی۔ اُسے رجب علی بھی یاد نہ رہا۔ شمیم بھی اُس کے دل سے اُتر گئی تھی۔

"نائب صوبیدار صاحب!" کیپٹن اصغر نے پوچھا ــ "آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے، ہم صبح سے پہلے دشمن کے علاقے سے نکل جائیں گے؟"

"اگر ہمت ایسے ہی قائم رہی تو اللہ نکال لے جائے گا" ــــ نائب صوبیدار نے جواب دیا۔

"کمال یہ ہو کہ ان تین زخمیوں میں سے کسی کو پیچھے نہ چھوڑیں۔"

"نہیں چھوڑیں گے سر!" ــــ نائب صُوبیدار نے کہا ــ "لیکن سر! میں آپ کو بتا دوں کہ ایسی ظالم بارش کا میرا پہلا تجربہ ہے۔ میں ایسے طوفان میں پہلے کبھی نہیں پھنسا تھا۔"

○

سلمیٰ نے اپنے دل پر ایسا ہَول پہلے کبھی محسُوس نہیں کیا تھا۔ خواب میں یوں ڈر جانے کا تجربہ اُسے پہلی بار ہُوا تھا۔ اصغر کی اتنی سروس میں سلمیٰ نے اُسے خواب میں کبھی یوں نہیں دیکھا تھا کہ اُس پر آسمان سے آگ کا گولہ گر رہا ہو۔

"ایک دوسرے کو مضبُوطی سے پکڑ لو" ــــ پارٹی کے گائیڈ عبدالرحمٰن نے کہا ــ "آگے ندی ہے۔ پانی کمر تک جائے گا۔ پاؤں اچھی طرح جمانا۔ دل مضبوط رکھنا۔ اللہ نکال دے گا۔"

ماں کی آنکھیں اشک بہا رہی تھیں۔ وہ رجب علی کی اس تسلی کو قبول نہیں کر رہی تھی کہ اصغر جہاں کہیں ہے خیریت سے ہے۔ اُس نے ہاتھ پھیلا رکھے تھے جو اُس نے جوڑ دیئے۔ اُس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ اب وہ زبان سے بول بھی نہیں سکتی تھی۔

کیپٹن اصغر کی پارٹی ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے ایک دیوار کی طرح سیلابی ندی سے گزر رہی تھی۔ زخمی عابد ایک جوان کے کندھے پر تھا۔ وہ سیلاب اور طوفان سے زیادہ بلند آواز سے بولا ــــ "میرے دوستو! میرے بوجھ سے آزاد ہو جاؤ۔ مجھے گنہگار نہ کرو۔ مجھے سیلاب میں پھینک دو۔ تم سب نکل جاؤ۔ مجھے اللہ کے حوالے کرو۔"

کیپٹن اصغر نے اُس سے زیادہ بلند آواز میں کہا ــ "بکومت عابد! دعا کرو سب نکل جائیں۔ تمھاری یہ مدد

بہت ہے۔ ہماری مدد کرو۔ دعا کرو۔"

اُدھر سلمیٰ نے سسکی لے کے کہا ــ "میرے اللہ ... میرا بیٹا!"

اِدھر زخمی عابد نے گلا پھاڑ کر مخصوص فوجی نعرہ لگایا ــــ "بولو نعرۂ حیدری۔"

تیرہ آدمی گھٹاؤں کی طرح گرجے ــ "یا علیؑ۔"

ندی نے آخری ہلّہ بولا اور انسانوں کی اِس زنجیر کو توڑنے کی کوشش کی مگر اُدھر اللہ اور اِدھر علیؑ کے نام سے زنجیر کے پہلے دو آدمی ندی سے نکل گئے۔ انہوں نے کنارے پر پاؤں جما لیے مگر اُن کے ساتھی آگے ہی آگے ہوتے گئے۔ سیلاب کا زور بہت تند تھا۔ کچھ آگے جا کر تمام پارٹی نکل گئی۔

"خطرے سے نکل آئے ہیں" ــ گائیڈ نے کہا ــ "اب دشمن کی دو پوسٹیں رہ گئی ہیں جو اتنی اونچی ہیں کہ ہمیں نہیں دیکھ سکیں گی۔"

ملک رجب علی نے دیکھا کہ سلمیٰ مصلّے سے اُٹھ نہیں رہی اور وہ روئے چلی جا رہی ہے تو اُس نے اُٹھ کر سلمیٰ کو مصلّے سے اُٹھایا۔

"اپنے آپ کو سنبھالو سلمیٰ!"

"کچھ سکون آ گیا ہے" ــ سلمیٰ نے کہا ــ "خدا نے میری سُن لی ہے۔"

ایک ماں کی آہوں نے طوفانِ باد و باراں کا زور توڑ دیا۔

"میں صبح راولپنڈی جا رہا ہوں" ــ رجب علی نے کہا ــ "اصغر کی خبر لے آؤں گا۔"

○

ملک رجب علی پہلی ریل گاڑی سے راولپنڈی چلا گیا۔ وہاں اُسے کسی ہوٹل میں ٹھہرنا تھا لیکن پنڈی کے ریلوے سٹیشن پر اُسے اپنا ایک پُرانا دوست ملک ناصر مل گیا۔ وہ مشرقی پنجاب کا رہنے والا تھا۔ وہاں اس کا وسیع آبائی زمینداره تھا۔ کچھ زمین اُس کے باپ دادا کو انگریزوں نے دی تھی اس لیے وہ انگریزوں کو مائی باپ سمجھتا تھا۔ اُس نے اپنے باپ دادا سے یہی سبق لیا تھا کہ انگریز قوم عبادت کے قابل ہے اور انگریز ہمارا اَن داتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کا وہ دشمن تھا۔ "لے کے رہیں گے پاکستان" ــ کا وہ مذاق اُڑایا کرتا تھا۔

اُس وقت وہ جوان تھا۔ اُس نے اپنے مزارعوں اور نوکروں چاکروں سے کہہ رکھا تھا کہ کسی نے پاکستان کا نام بھی لیا تو اُسے بھُو کا مار دوں گا۔ وہ عیّاش نوجوان تھا۔ رجب علی اُس وقت سب انسپکٹر تھا اور وہ ملک ناصر کے علاقے کے تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او تھا۔ رجب علی بھی کم عیّاش نہیں تھا۔ ملک ناصر کی خاندانی روایات اور رواج میں اپنے علاقے کے تھانیدار کی خاطر تواضع اور خوشامد بھی شامل تھی۔ ملک ناصر نے رجب علی کو دوست بنا لیا تھا۔ وہ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ ملک ناصر جسے چاہتا چُھڑا لیتا اور جسے چاہتا حوالات میں بند کرا دیتا تھا۔

جس پاکستان کا وہ مذاق اُڑایا کرتا تھا وہ اُس کا مذاق اُڑانے کے لیے معرضِ وجود میں آ گیا۔ اُس کے خاندان کے مائی باپ بوریا بستر لپیٹ کر چلے گئے اور اُس کے خاندان کو ہندوؤں اور سکھوں کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔ اُس کے باپ اور دوسرے بزرگوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے کہا کہ ہم تو شروع سے پاکستان کے خلاف تھے۔ ہم ہندوستان میں رہیں گے مگر ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمان کا خون بہانا تھا۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ کوئی مسلمان پاکستان کے حق میں تھا یا خلاف۔ اِن کفّار نے جب مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کیا تھا تو انہوں نے کسی بھی مسلمان سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کانگرسی ہے، یونینسٹ ہے، نیشنلسٹ ہے یا مسلم لیگی ہے۔

ملک ناصر کے ساتھ اُس کے گاؤں کے سِکھ نمبردار نے نیکی کی تھی اور اُس کے سارے خاندان کو اپنی حفاظت میں ریلوے سٹیشن تک پہنچا کر ریل گاڑی میں بٹھا دیا تھا۔ اس سکھ نمبردار پر ملک ناصر کے باپ کے کچھ احسانات تھے۔ اُس نے نمبردار کے بیٹے اور بھانجے کو جو ڈکیتی کی واردات میں پکڑے گئے تھے، تھانے سے ہی چھڑوا لیا تھا۔ جب ملک رجب علی وہاں کے تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او لگا تھا تو ملک ناصر نے اس سکھ نمبردار کی کچھ وارداتوں پر پردہ ڈلوا لیا تھا۔

سکھ نمبردار نے ملک ناصر کے خاندان کو ریل گاڑی پر تو بٹھا دیا تھا لیکن وہ پاکستان تک ریل گاڑی کی حفاظت کا اہتمام نہیں کر سکتا تھا۔ ریل گاڑی مہاجرین سے اَٹی ہوئی تھی۔ چھت پر بھی مسلمان اپنی عورتوں اور بچّوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ راستے میں گاڑی پر دو مرتبہ سکھوں نے ہلّہ بولا تھا۔ فائرنگ بھی ہوتی تھی۔ کئی مہاجرین شہید ہو گئے تھے۔

ملک ناصر اپنے خاندان کے ساتھ ہراساں، بھوکا اور پیاسا پاکستان میں داخل ہُوا تھا۔ یہ خاندان اپنے تمام تر زیورات ساتھ لے آیا تھا۔ نقدی بھی خاصی تھی۔ پاکستان میں آ کر اس خاندان کو اُن لاکھوں مسلمانوں کا ذرّہ بھر غم نہیں تھا جو مشرقی پنجاب میں شہید کر دئیے گئے تھے۔ ملک ناصر پر ہجرت کے سفر کا بھی کچھ اثر نہ تھا۔ اُسے اور اُس کے خاندان کو صرف یہ غم تھا کہ اُن کی بے انداز اراضی اور جائیداد سرحد پار رہ گئی تھی۔

اُدھر سے کئی مسلمان ایسے آئے تھے جو اثر و رسوخ والے تھے۔ ان میں ملک رجب علی جیسے افسر بھی تھے۔ ملک ناصر کے پاس زیورات اور دولت بھی تھی۔ کچھ اثر و رسوخ اور کچھ دولت نے یہ معجزہ کر دکھایا کہ ملک ناصر کے خاندان کو پاکستان میں اُس سے زیادہ اراضی مل گئی جو یہ لوگ مشرقی پنجاب میں چھوڑ آئے تھے۔ پاؤں جم گئے تو انہوں نے یہاں بہت سے مکان اور دکانیں الاٹ کرا لیں۔ یہ خاندان سرکار نوازی میں مہارت رکھتا تھا۔ یہی اس خاندان کی روایت تھی۔ انہوں نے اپنی روایت کو پاکستان میں بھی زندہ رکھا اور پاکستان سرکار کے قدموں میں بیٹھ گئے ــــ اور پھر یہ خاندان پاکستان سرکار بن گیا۔

پاکستان کچھ اور چیز ہے، پاکستان سرکار بالکل ہی مختلف چیز ہے۔ پاکستان کی حکومت جس کے بھی ہاتھ آئی وہ سرکار بن گیا اور اُس نے اپنی پسند کے ملک ناصروں کا ایک گروہ اپنے اردگرد جمع کر لیا۔

○

یہ تھا ملک ناصر جو ملک رجب علی کا دوست تھا۔ رجب علی راولپنڈی ریلوے سٹیشن پر اُترا تو وہاں اُسے ملک ناصر مل گیا۔ دو دوست عرصے بعد ملے تھے۔ ملک ناصر کی کوٹھی اسلام آباد میں تھی۔ اُس نے رجب علی سے کہا کہ وہ اُسے کہیں اور نہیں ٹھہرنے دے گا۔ اپنے پاس رکھے گا۔ اُس نے رجب علی کو اپنی کار میں بٹھایا اور اسلام آباد اپنے گھر لے چلا۔ راستے میں ملک ناصر نے اُسے بتایا کہ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ رجب علی نے پولیس کی نوکری چھوڑ دی ہے۔ رجب علی نے اُسے کہا کہ نوکری سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

"تمھیں نوکری کی ضرورت ہی کیا ہے یار!" ــــ ملک ناصر نے کہا ــ "تم مربعوں اور کوٹھیوں کے مالک ہو۔ آرام سے گھر بیٹھ کے کھاؤ..... کہو، یہاں کیسے آنا ہُوا؟"

"یار! میرا بیٹا فوج میں کیپٹن ہے۔ اُسے....."

"تمھارا بیٹا؟" ــــ ملک ناصر نے حیرت سے پُوچھا ــ "کیا کہہ رہے ہو ملک!"

"میرا ہی سمجھو یار" ــــ رجب علی نے کہا ــ "ایک بیوہ سے شادی کر لی تھی۔ یہ اُس کا بیٹا ہے۔"

ملک ناصر نے قہقہہ لگا کر کہا ــ "معلوم ہوتا ہے بھلے مانس ہو گئے ہو۔ شادی کی کیا ضرورت تھی؟"

ملک رجب علی نے اسے صحیح بات نہ بتائی کہ اُس نے اس بیوہ کے ساتھ کن حالات میں شادی کی ہے۔ جھوٹ مُوٹ کی ایک وجہ بنا دی۔

"یہ بیوہ خوبصورت ہو گی" ــــ ملک ناصر نے کہا۔

"بہت"۔

"اور زمین جائیداد والی بھی ہو گی۔"

"نہیں" ــ رجب علی نے کہا ــ "اُس کا ایک ہی مکان تھا جو مَیں نے بیچ ڈالا تھا۔ غریب تھی۔"

"تم نے سچ بولنا بھی شروع کر دیا ہے؟" ــ ملک ناصر نے پوچھا۔

ملک رجب علی ہنس پڑا اور اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

ملک ناصر نے اُسے اپنی کوٹھی کے ڈرائینگ روم میں بٹھایا۔ ایک بڑی خوبصورت اور جوان لڑکی ڈرائینگ روم میں آئی۔ اُس نے کتابیں اُٹھا رکھی تھیں۔

"آ گئے بیٹی!" ــ ملک ناصر نے اُس سے پوچھا ــ "انہیں پہچانا نہیں؟"

"کیوں نہیں پہچانا" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "ملک رجب علی ہیں نا!"

"اوہ شمیم!" ــــ ملک رجب علی نے حیران سا ہو کے کہا ــ "تم اتنی بڑی ہو گئی ہو؟"

"اب تھرڈ ایئر میں ہے" ــ ملک ناصر نے کہا ــ "پڑھنے میں تو واجبی ہے شرارتیں جتنی چاہو کرا لو" ــ اُس نے شمیم سے کہا ــ "بیٹا! کھانا رکھواؤ۔ تم بھی ہمارے ساتھ کھا لینا۔"

شمیم چلی گئی تو ملک ناصر نے رجب علی سے کہا ــ "خدا نے مجھے بادشاہی دی ہے، دولت دی ہے لیکن اِس ایک لڑکی کے سوا کوئی اور اولاد نہیں دی۔ اس کی ماں کا بہت علاج کرایا ہے۔ ڈاکٹروں نے مایوس کر دیا ہے۔ مَیں تو اپنی اس اکلوتی بیٹی کو دیکھ کر جیتا ہوں۔ یہ شاید اسی کا اثر ہے کہ یہ پڑھنے میں دلچسپی نہیں لیتی۔ سیر سپاٹے اور شرارتوں میں خوش رہتی ہے۔ اسے پڑھا کر کرنا بھی کیا ہے۔ کالج جانے کا اسے شوق ہے جو مَیں پورا کر رہا ہوں۔"

○

کھانے پر شمیم کے علاوہ اس کی ماں بھی تھی۔

"تم یار اپنے سوتیلے بیٹے کی بات کر رہے تھے" ــ ملک ناصر نے رجب علی سے کہا ــ "کیا کہنے لگے تھے اُس کے متعلق؟"

"وہ فوج میں کیپٹن ہے" ــــ رجب علی نے کہا ــ "اُس کی خیر خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔"

"اُس کی یونٹ راولپنڈی میں ہے؟"

"یہی تو مشکل ہے کہ اُس کی یونٹ کا کچھ پتہ نہیں کہاں ہے" ــــ ملک رجب علی نے جواب دیا ــ "وہ کمانڈو ہے اور اُس کمانڈو اپریشن میں شامل ہے جو مقبوضہ کشمیر میں شروع کیا گیا ہے۔ بہت دنوں سے اُس کا خط نہیں آیا۔ اُس کی ماں بہت پریشان ہے۔ اُلٹے سیدھے خواب دیکھتی رہتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس لڑکے سے ملاقات نہیں ہو سکتی لیکن اُس کی ماں نے مجھے مجبور کر کے بھیجا ہے کہ اُس کی خیریت معلوم

کرنے کے لیے راولپنڈی جاؤں۔"

"تم آپریشن جبرالٹر کی بات کر رہے ہو" — ملک ناصر نے کہا "مقبوضہ کشمیر میں جو کمانڈو اور گوریلا آپریشن شروع کیا گیا ہے اُسے 'آپریشن جبرالٹر' کا نام دیا گیا ہے۔"

"بڑا کامیاب جا رہا ہے" — رجب علی نے کہا۔

"آخر ناکام ہوگا" — ملک ناصر نے کہا — "پاکستان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا..... ملک! تم جانتے ہو، انڈیا کے مقابلے میں پاکستان کی حیثیت ہی کیا ہے۔"

"ہمارے پاس جذبہ ہے" — رجب علی نے کہا۔

"تم جذبے سے انڈیا کے ٹینکوں کو توڑ دو گے؟" — ملک ناصر نے طنزیہ لہجے میں کہا — "تمہارا جذبہ انڈیا کے لڑاکا بمبار طیاروں کو گرالے گا؟..... پاکستان کو چاہیئے کہ انڈیا سے دب کر رہے۔"

معلوم ہوتا ہے تمہارے دل سے انگریزوں کے وقتوں والی کدورت نکلی نہیں" — رجب علی نے کہا "تم اُس وقت بھی پاکستان کے خلاف تھے اب بھی خلاف ہی ہو۔"

بھائی جان!" — ملک ناصر کی بیوی نے کہا — "یہ تو دن رات انڈیا کے گُن گاتے ہیں۔"

جانے دو یار!" — ملک ناصر نے کہا — "تم اپنے بیٹے کی بات کرو..... میں جانتا ہوں کمانڈو رجمنٹیں کہاں کہاں ہیں لیکن تم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں تمہیں معلوم کرا دوں گا۔ جی۔ ایچ۔ کیو سے پتہ چل جائے گا... کیا نام ہے لڑکے کا؟"

"کیپٹن اصغر!"

ملک ناصر کی بیٹی شمیم نے چونک کر ملک رجب علی کی طرف دیکھا اور اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا —— "کیپٹن اصغر۔"

"پتہ چل جائے گا" — ملک ناصر نے کہا — "لیکن پاکستان آرمی بڑے خوبصورت جوان ضائع کر رہی ہے۔ پاکستان کو کشمیر سے دستبردار ہو جانا چاہیئے۔"

ملک رجب علی نے اُسے ہنس کر ٹالنا چاہا۔ وہ ملک ناصر اور اُس کے سارے خاندان کو جانتا تھا۔ وہ اس شخص کے ساتھ بحث میں الجھنا بے کار سمجھتا تھا لیکن ملک ناصر پاکستان کے خلاف باتیں کرتا رہا۔

○

اگلے روز ملک ناصر رجب علی کو یہ بتا کر چلا گیا کہ وہ کیپٹن اصغر کے متعلق صحیح اطلاع لینے جا رہا ہے۔ شمیم کالج نہ گئی۔ ملک ناصر چلا گیا تو شمیم ملک رجب علی کے پاس آ بیٹھی۔

"کیپٹن اصغر آپ کا بیٹا ہے؟" — شمیم نے پوچھا۔

"ہاں" — رجب علی نے کہا — "وہ میرا بیٹا ہے۔"

شمیم نے اصغر کا قد بُت اور حلیہ بتایا تو رجب علی نے کہا کہ وہی ہو سکتا ہے۔ اُس نے شمیم سے پوچھا کہ وہ اُسے کس طرح جانتی ہے؟ شمیم نے جھوٹ بولا کہ راولپنڈی میں ایک تقریب میں اُس سے تعارف ہُوا تھا۔

"میں نے کل آپ کی بھی باتیں سُنی ہیں اور اپنے ابّو کی بھی" — شمیم نے کہا — "میرا خیال ہے کہ آپ سچے پاکستانی ہیں۔ آپ جذبے کی بات کرتے ہیں لیکن میرے ابّو انڈیا کے دوست اور پاکستان کے دشمن ہیں۔ حیرت والی بات یہ ہے کہ ابّو کا حکومت پر بھی اثر و رسوخ ہے اور فوج کے جرنیلوں پر بھی۔ مجھے شک ہے کہ میرے ابّو انڈیا کے لیے جاسوسی کر رہے ہیں..... آپ حیران ہو رہے ہیں کہ میں اپنے باپ کے خلاف کتنی خطرناک اور توہین آمیز بات کر رہی ہوں۔"

"تمہارے ابّو کہتے ہیں کہ تم بہت شرارتی ہو" — رجب علی نے کہا — "کیا تم میرے ساتھ بھی شرارت تو نہیں کر رہیں؟ تمہارے ابّو میرے بڑے گہرے دوست ہیں۔"

"ابّو آپ کے دوست ہو سکتے ہیں پاکستان کے نہیں" — شمیم نے کہا — "میں بُری طرح سنجیدہ ہوں۔"

ملک رجب علی ڈی۔ ایس۔ پی رہ چکا تھا۔ وہ ہر اجنبی کو اور ہر نئی اور انوکھی بات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے اور پرکھنے کا عادی تھا۔ وہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ملک ناصر کی شہزادی جیسی بیٹی اور انگریزوں کے پروردہ خاندان کی یہ لڑکی پاکستان کی اتنی خیر خواہ ہو سکتی ہے کہ اپنے باپ کے خلاف اتنی سنگین بات کر گزرے، اور وہ بھی ایک ایسے آدمی کے ساتھ جس کے متعلق وہ نہیں جانتی کہ وہ بھی پاکستان کے خلاف جاسوسی میں ملک ناصر کا ساتھی ہو سکتا ہے۔ رجب علی کو شک ہُوا کہ یہ لڑکی اُس کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی ہے۔ اس خاندان کی شہزادی میں قومی جذبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"تم نے مجھ پر اعتماد کیسے کر لیا ہے شمیم!" — رجب علی نے کہا "تم نے مجھ پر بھی انڈیا کا جاسوس ہونے کا شک کیوں نہیں کیا؟"

"اگر آپ انڈیا کے جاسوس ہوتے تو آپ اپنے بیٹے کو فوج میں نہ جانے دیتے" — شمیم نے کہا "میں جانتی ہوں آپ بہت بڑے زمیندار ہیں۔ اپنے بیٹے کو نوکر کرانے کی آپ کو ضرورت نہیں تھی۔ آپ اصغر جیسے دس بیٹوں کو فارغ بٹھا کر عیش کرا سکتے ہیں۔ اصغر نے مجھے کہا تھا..." — وہ چونک کر چُپ ہو گئی اور اُس کے منہ سے نکل گیا — "اوہ!"

"تمہیں اصغر نے کیا کہا تھا؟"

"میں آپ کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اصغر کے ساتھ میرا کچھ تعلق ہے۔"

"کیسا تعلق؟"

"ایسا تعلق جس نے مجھ جیسی لڑکی کو سنجیدہ بنا دیا ہے" — شمیم نے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے کہا۔ "اُس کے ساتھ میری پہلی ملاقات میری شرارت تھی۔ نیشنل پارک میں اُسے دیکھا، پھر ہم ملتے رہے۔ آپ کسی شک میں نہ پڑ جائیں..... اُس نے آخری ملاقات میں مجھے بتایا تھا کہ وہ کشمیر کے محاذ پر جا رہا ہے۔ میرے آنسو اُسے روک نہیں سکتے تھے۔ اُس نے کہا تھا — 'میں اپنے ملک کا محافظ ہوں تمہاری عصمت کا محافظ ہوں' — مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا بھی نہیں تھا۔ اُسے میں اپنا اور صرف اپنا سمجھتی ہوں اور اپنے ابّو کو اصغر کا اور اپنی عصمت کا دشمن سمجھنے لگی ہوں۔"

"اصغر پاکستان کی عصمت کا محافظ ہے" — رجب علی نے کہا — "اور تمہیں میں اصغر سے کم نہیں سمجھتا..... مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے ابّو کا میل ملاقات کس قسم کے لوگوں کے ساتھ ہے کہ تمہیں اس پر جاسوسی کا شک ہُوا ہے۔"

"میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکتی" — شمیم نے کہا — "ان کے پاس جو لوگ آتے ہیں ان میں دو تین مجھے ہندو لگتے ہیں، اور جو مسلمان آتے ہیں وہ ہندوؤں سے زیادہ خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی فوج کے متعلق کوئی گہرے راز کی بات

معلوم کرنی ہو تو میرے ابّو سے معلوم کر سکتے ہیں۔۔۔ آپ ان سے تو نہیں کہیں گے کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے"؟

"نہ شمیم!" ملک رجب علی نے کہا۔ "تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے تمہیں اس کا صلہ میں نہیں دے سکتا، خدا دے گا۔۔۔ تم نے میرا ایک مسئلہ حل کر دیا ہے۔ میں پریشان تھا کہ خدا نے مجھے جسمانی قوّت دی ہے، سوچنے والا دماغ دیا ہے لیکن میں اپنی قوم کے لیے اور پاکستان کے لیے محض بیکار ہوں۔ ہسپتال میں جا کر خون دینا اور دفاعی فنڈ میں چندہ دینا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں کسی محاذ پر جا کر خون دینا چاہتا ہوں۔۔۔ ایک بات اچھی طرح غور کر لو شمیم! تم ابھی چھوٹی ہو۔ ناتجربہ کار ہو۔ جذباتی ہو۔ خدا کرے اپنے ابّو کے متعلق تمہارا شک صحیح نہ ہو۔ اگر صحیح ہے تو ہو سکتا ہے وہ میرے ہاتھوں کسی مشکل میں پھنس جائیں، گرفتار ہو جائیں، معلوم نہیں کیا ہو جائے، پھر تمہارے جذبات کا رُخ اپنے ابّو کی طرف ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے تم ہی ان کی خفیہ سرگرمیوں پر پردہ ڈال دو۔"

"مجھے اپنے ابّو سے پیار ہے"۔ شمیم نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "یہ باپ بیٹی کا پیار ہے لیکن اصغر مجھے جو جذبہ دے گیا ہے وہ اس پیار پر غالب آ گیا ہے۔ مجھے جاننے والے اور میری سہیلیاں کبھی یقین نہیں کریں گی کہ میں پاکستان کے معاملے میں اتنی جذباتی ہو سکتی ہوں۔ میں کدکڑے اور قہقہے لگانے والی کھلنڈری لڑکی ہوں۔ میں وہاں بھی شرارت سے نہیں ڈرتی جہاں کالج کا کوئی شیطان لڑکا بھی شرارت کی جرأت نہیں کرتا۔ میں ویسی ہی رہوں گی۔ مجھے اپنے آپ کو زندہ رکھنا ہے لیکن میرے خیالوں میں جو انقلاب آ گیا ہے اسے میں دبا نہیں سکتی۔ یہ خود آیا ہے یا اسے اصغر کی محبت لائی ہے۔ اس پر میرا اختیار نہیں۔ کسی قوّت نے مجھے اس انقلاب کے حوالے کر دیا ہے۔۔۔ مجھ پر اعتبار کریں۔"

"ایسے انقلاب کا تجربہ مجھے بھی ہو چکا ہے"۔ رجب علی نے کہا۔ "مسلمان کے لہو میں کوئی ایسا وصف یا کوئی ایسا عنصر ہے جو اُسے مجرم سے مجاہد بنا دیتا ہے۔ اکثر لوگ، خصوصاً ہمارا نوجوان طبقہ، اس مجاہد کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر ذرا سا جھٹکا یا اپنی کوشش مجاہد کو مرنے سے بچا لیتی ہے۔"

باہر کار کی آواز آئی۔

"ابّو آ گئے ہیں"۔ شمیم نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

○

ملک ناصر کیپٹن اصغر کی اطلاع لے آیا تھا۔ اُس نے رجب علی کو بتایا کہ کیپٹن اصغر کی کمانڈو رجمنٹ کا بیس کہاں ہے اور وہاں تک رجب علی نہیں جا سکتا۔ اُس نے بتایا کہ کیپٹن اصغر پہلے کمانڈو مشن پر گیا ہوا ہے۔ ایک دو دنوں تک اُس کی واپسی متوقع ہے۔ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ خیریت سے ہے یا نہیں۔ اُسے گزشتہ رات اپنے ٹارگیٹ پر ہونا چاہئے تھا۔ مقبوضہ کشمیر کے اُس علاقے [illegible] موسم آج کل بہت خراب ہے۔ معلوم نہیں اصغر ٹارگیٹ تک پہنچا بھی ہے یا نہیں۔

"کمانڈو آپریشن کی خبریں تمہیں کون دیتا ہے ناصر؟"۔ ملک رجب علی نے کہا۔ "یہ تو انتہائی خفیہ رکھنے والا آپریشن ہے"۔

"خفیہ"۔ ملک ناصر نے طنزیہ کہا۔ "مجھ سے کیا خفیہ رہ سکتا ہے"؟

"کبھی مجھ سے بھی کوئی بات خفیہ نہیں ہوتی تھی"۔ رجب علی نے کہا۔ "ناصر یار! میں فراغت سے تنگ آ گیا ہوں۔ کوئی کام بتاؤ"۔

"کام بہت ہیں"۔ ملک ناصر نے کہا۔ "کچھ دن میرے پاس ٹھہرو"۔

"وہ تو ٹھہرنا ہی ہے"۔ رجب علی نے کہا۔ "اصغر کی خبر لے کے جاؤں گا۔ تم دو چار دنوں میں معلوم کرا دو گے نا!"

"کیوں نہیں کرا دوں گا"۔ ملک ناصر نے کہا۔ "اِسی بہانے یہیں رہو"۔

ملک رجب علی نے اُسے پولیس کی گہری نظروں سے دیکھا اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چند دِن یہیں رہے گا اور اس شخص کی خفیہ دنیا میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ملک ناصر بھارت کا جاسوس ہے۔

صرف اصغر بیٹا نہیں، جولائی اگست ۱۹۶۵ء میں ہزاروں ماؤں کے اصغر بیٹے مقبوضہ کشمیر کی اُن وادیوں میں موت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے جن وادیوں کے پھولوں میں، گھاس کی پتی پتی میں، مٹی اور پتھروں میں کشمیری مسلمانوں کے خون کی بُو باس رچی بسی ہوئی تھی۔ ڈیڑھ صدی گزر گئی تھی۔ کشمیر کی رگوں سے خون رِس رہا تھا۔ گھٹائیں گرجتی برستی آتی رہیں۔ وادیوں کو بھی ندیاں بناتی رہیں لیکن شہیدوں کے لہو کی بُو کو اس مٹی سے اور اس فضا سے نہ دھو سکیں۔

شہیدوں کے لہو کی مہک برف کی تہوں میں بھی نہیں دب سکی تھی۔

شہیدوں کے لہو کی مہک کو زمین اور پیڑ پودے اپنے آپ میں محفوظ رکھتے ہیں۔ شہیدوں کی روحوں سے زمین نہیں انسان بے وفائی کیا کرتے ہیں۔

قومیں وہی زندہ رہتی ہیں جو اپنے سینوں میں اپنے شہیدوں کو زندہ رکھتی ہیں۔ قومیں وہ بھی زندہ رہتی ہیں جو اپنے وطن کی ناموس پر ذبح ہونے والوں اور زندہ جلا دیئے جانے والوں کو ذہن اور دل سے اُتار دیتی ہیں مگر وہ اپنے دشمن کے قدموں تلے زندہ رہتی ہیں۔ اُن کی عصمت و عفّت کا مالک ان کا دشمن ہوتا ہے۔

کشمیر کی وادیوں میں سے گزرو تو چیل اور دیودار کے لانبے لانبے پیڑوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں اور جب ہوا کے جھونکے تیز و تُند ہو جاتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کشمیر کی وہ مائیں، بہنیں اور بیٹیاں جو ڈوگروں کی درندگی کا شکار ہو گئی تھیں ہچکیاں لے رہی ہوں، بین کر رہی ہوں۔

شہیدوں کے لہو کی مہک نے، اُن کی رُوحوں کی سسکیوں اور ہچکیوں نے اپنے سوتے ہوئے دردمندوں کو بیدار کر لیا تھا۔ روایات نے اپنے مجاہدین کو جگا لیا تھا۔ رَن کچھ میں کفّار کی للکار نے اونگھتے ہوئے مردانِ حُر کو اُٹھا دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اب وہ پاکستان کو اپنی مرضی کے میدان میں گھسیٹ کر لڑائے گا جہاں اُس کی فتح آسان ہو گی لیکن اللہ کے سپاہیوں نے اُسے اُس میدان میں گھسیٹا جو اُس کی مرضی کے خلاف بھی تھا اور جو کبھی اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا۔

یہ تھا آزاد کشمیر فوج اور پاک فوج کا مشترکہ کمانڈو آپریشن، جسے "اپریشن جبرالٹر" کا نام دیا گیا تھا۔

✸

سلمیٰ کے اصغر جیسے پانچ ہزار بیٹوں نے مقبوضہ کشمیر میں وہ قیامت بپا کر دی تھی کہ اگست ۱۹۶۵ء کے وسط تک وہاں بھارت کی فوج کی دو لاکھ سے زیادہ نفری اور اُس کا جدید اسلحہ جو ہندوؤں نے چین سے جنگی نوعیّت کی چھیڑ خانی کر کے چین کے دشمنوں سے اکٹھا کیا تھا، بیکار ہو کے رہ گیا تھا۔ پاکستان کے اخباروں میں کمانڈو اپریشن کی تباہ کاری کی خبریں اِس طرح آتی تھیں کہ کشمیر کے مجاہدین نے ایک پُل اڑا دیا ہے یا بھارتی فوج کے کنوائے پر شب خون مارا ہے۔

بھارت کے اخباروں میں جو اُس وقت پاکستان میں بھی آیا کرتے تھے، اس کے بالکل برعکس

خبریں چھپتی تھیں۔ وہ کمانڈو جانبازوں کو "گھس بیٹھئے" کہتے تھے، یعنی غیر قانونی طور پر مقبوضہ کشمیر کی حد میں گھس آنے والے۔ بھارتی اخبار اپنی قوم کی آنکھوں میں یوں دھول جھونک رہے تھے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر سے کچھ "گھس بیٹھئے" بھارتی کشمیر میں گھس آئے تھے۔ یہ کہیں بھی کامیاب نہیں ہو سکے اور ان میں سے کئی ایک کو پکڑ لیا گیا ہے۔

لیکن بھارت کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں وزیرِاعظم کی منعقد کی ہوئی کانفرنس میں وہ خبریں سُنی اور سنائی جا رہی تھیں جو عوام سے چھپائی جا رہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ مقبوضہ کشمیر کا اتنا بڑا فوجی نقشہ لگا ہُوا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے گاؤں، ذرا ذرا سی ندیاں اور ان پر پُل بھی دکھائے گئے تھے۔ پہاڑیوں پر بھارتی فوج کی جو چھوٹی بڑی پوسٹیں اور پکٹیں تھیں وہ بھی دکھائی گئی تھیں۔ نقشے پر پگڈنڈیاں اور ان سے بھی چھوٹے چھوٹے راستے نظر آتے تھے۔

اس نقشے پر بہت سی جگہوں پر کامن پن اور ہیئر پن کے ساتھ اس کے سائز کے مطابق لال کاغذ کی جھنڈی لگی ہُوئی تھی۔

"یہ جھنڈیاں کیا ظاہر کرتی ہیں؟" — وزیرِاعظم نے پُوچھا۔

"پاکستانی کمانڈو پارٹیوں نے یہ جگہیں تباہ کر دی ہیں" — چیف آف سٹاف نے جواب دیا۔

"کیا تھا یہاں؟"

"زیادہ تر پُل تھے" — چیف آف سٹاف نے جواب دیا اور لمبا پوائنٹر نقشے پر رکھ رکھ کر بتانے لگا — "یہ ایک عارضی کیمپ تھا جہاں ہماری ایک بٹالین تھی۔ کمانڈو پارٹی نے یہاں شب خون (ریڈ) مار کر بٹالین کو بہت زیادہ جانی نقصان پہنچایا ہے۔"

"بہت زیادہ کتنا زیادہ ہے؟" — وزیرِاعظم نے پوچھا۔

"سات سو نفری کی بٹالین میں سے صرف ایک سو گیارہ جوان بچے ہیں" — چیف آف سٹاف نے پوائنٹر جلدی سے ایک اور جگہ پر رکھ کر کہا — "یہاں ہماری ایک کمپنی نے دشمن کی ایک کمانڈو پارٹی کو گھیرے میں لے لیا اور ان میں سے چار کو زندہ پکڑ لیا، سات کو ہلاک کیا اور باقی...."

"مَیں کسی اخبار کا رپورٹر نہیں ہُوں" — وزیرِاعظم نے کہا — "میں وہ حقیقت سننا چاہتا ہوں جو ہم عوام سے چھپا رہے ہیں۔ مجھے یہ بتائیں کہ کشمیر میں ہماری صحیح پوزیشن کیا ہے۔ ان لال جھنڈیوں سے تو میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ پاکستان نے ہمارے کشمیر میں فوجی اہمیّت کا کوئی ٹھکانا سلامت نہیں رہنے دیا۔ کوئی پُل کھڑا نظر نہیں آتا۔ یہ جھنڈیاں بتاتی ہیں کہ ہمارے کشمیر پر پاکستان اور پاک کشمیر کی کمانڈو فورس کا قبضہ ہے۔"

"پوزیشن کچھ ایسی ہی ہے" — چیف آف سٹاف نے کہا — "کشمیر میں ہماری آرمی کی نقل و حرکت بند ہو چکی ہے۔ دشمن کے کمانڈو سری نگر تک بھی پہنچے ہیں۔ مضافات میں دو پوسٹیں تھیں جن میں پچاس پچاس جوان تھے۔ دشمن کے گوریلوں نے ایک ہی رات میں ان دونوں پوسٹوں پر شب خون مارا اور بہت تباہی مچائی ہے۔"

"کیا انہیں سرحد پر روکنے کا کوئی انتظام نہیں ہے؟" — وزیرِاعظم نے پوچھا — "انڈین آرمی اتنی بے بس کیوں ہو گئی ہے کہ آزاد کشمیر سے کمانڈو پارٹیاں آتی اور تباہی مچا کر چلی بھی جاتی ہیں؟"

"ہر ایک کمانڈو پارٹی واپس نہیں جاتی" — چیف آف سٹاف نے جواب دیا — "زیادہ تر نفری ہمارے کشمیر میں داخل ہُوئی تھی اور وہ ابھی تک وہیں چُھپی ہوئی ہے۔ یہ پوری بٹالین ہے جس کی نفری چھ سے سات سو تک ہو سکتی ہے۔ بعض پارٹیاں واپس جانے کے لیے آتی ہیں۔ وہ اپنا مشن پُورا کر کے چھپتی چھپاتی واپس چلی جاتی ہیں۔ انہیں وہاں سے نکلتے کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔"

"اور انہیں ہماری دو لاکھ نفری کی فوج روک نہیں سکتی، پکڑ نہیں سکتی" — وزیرِاعظم نے طنزیہ کہا — "پاکستانی اور کشمیری جن بھوت ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتے.... اور وہ پُوری کی پُوری کمانڈو بٹالین جو آپ کے علاقے میں بلکہ آپ کے ملک میں آکر براجمان ہو گئی ہے وہ کیا بدرُوحوں کا ٹولہ ہے جسے انڈین آرمی ڈھونڈ نہیں سکتی؟"

چیف آف سٹاف نے ایک جرنیل کی طرف دیکھا جس کا تعلق کشمیر کے ساتھ تھا۔

"ہم چونکہ پاکستان پر حملے کا پلان بنا چکے ہیں اِس لیے ہمیں ہر حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیئے خواہ وہ ہماری اپنی ذات اور ہمارے مذہب ہی کے خلاف کیوں نہ ہو" — جرنیل نے کہا۔

"اس کانفرنس میں ہمارا مذہب صرف یہ ہے کہ پاکستان کو ختم کرنا ہے" — وزیرِاعظم نے کہا — "اگر ختم نہ ہو سکے تو جنگی طاقت سے پاکستان کو ایسی پوزیشن میں لانا ہے جہاں ہم اس پر اپنی شرائط مسلّط کر سکیں۔"

"سر!" — جرنیل نے کہا — "ہم اپنا یہ مذہبی فریضہ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ جب تک پاکستان قائم ہے ہمارے باپو مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو جی کی روحیں بے چین رہیں گی لیکن دشمن کو شکست دینے کے لیے جس جذبے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہماری فوج میں بہت کم ہے۔"

"کیا اتنا زیادہ اسلحہ اور اتنا زیادہ ایمونیشن، اتنے زیادہ ٹینک، توپیں اور تین ملکوں سے جمع کیے ہوتے لڑاکا بمبار طیّارے ہوتے ہُوئے بھی جذبے کی ضرورت ہے؟" — وزیرِاعظم نے پُوچھا — "پاکستان کے پاس کیا ہے؟ آپ ہی نے مجھے بتایا ہے کہ پاکستان آرمی کے پاس پُورے پانچ ڈویژن فوج نہیں۔ آپ ہی نے بتایا ہے کہ اُس کی ایئر فورس میں ڈیڑھ سَو سے کم لڑاکا طیارے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں پاکستان کے پاس نیوی نہ ہونے کے برابر ہے.... اور پھر آپ کی انٹیلی جنس مجھے بتاتی رہی ہے کہ پاکستان کے لوگ اپنے حکمرانوں کے ہاتھوں اتنے تنگ ہیں کہ پاکستان پر کوئی بھی افتاد پڑی وہ خاموش اور مُردہ رہیں گے۔"

"سر!" — چیف آف سٹاف نے کہا — "اس سے پہلے ایک کانفرنس میں بات ہو چکی ہے کہ پاکستان کے عوام کے متعلق ہماری انٹیلی جنس کی رپورٹیں غلط ثابت ہُوتی ہیں۔ رَن کچھ اور اَب اُن کے کمانڈو اپریشن نے پاکستانیوں کو جگا دیا ہے لیکن جس قوم کی فوج اتنی کم ہو جتنی پاکستان کی ہے اُس کے جاگنے نہ جاگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا" — اُس نے کشمیر کے جرنیل کی طرف دیکھ کر کہا — "آپ کشمیر کی بات کر رہے تھے۔"

"کشمیر میں پاکستان کے کمانڈو اپریشن کی کامیابی کی ایک وجہ یہ ہے" — جرنیل نے کہا — "

ہمارے ٹروپس میں وہ جذبہ نہیں جو پاکستان اور آزاد کشمیر کی آرمی میں ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ اسلحہ بارود سے جذبے کی کمی کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ایسا ہی ہو لیکن کمانڈو اور گوریلا جوانوں کے خلاف کارروائی کے لیے ذاتی بہادری کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بہادری ہمارے جوانوں میں کم ہے۔ ہمارے ٹروپس بٹالین کی صورت میں اچھے لڑتے ہیں۔ انفرادی لڑائی میں ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ فرق دیکھیں۔ ایک وہ ہیں جو اپنے وطن سے دُور ہمارے علاقے میں روپوش ہیں اور تباہی پھیلا رہے ہیں اور ایک ہمارے ٹروپس ہیں جو اپنے علاقے میں تمام سہُولتیں اور حفاظت میسّر ہونے کے باوجُود انہیں پکڑ نہیں سکتے....

"پاکستانیوں کی کامیابی کی دوسری وجہ کشمیر کے دیہاتی ہیں۔ وہ کمانڈو پارٹیوں کی راہنمائی بھی کرتے ہیں اور انہیں پناہ بھی دیتے ہیں۔ ان کے زخمیوں کو کہیں نہ کہیں چھپا لیتے ہیں اور جب زخمی چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو انہیں اُن کے ڈھکے چھپے بیس تک پہنچا دیتے ہیں یا سرحد پار کرا دیتے ہیں۔ کمانڈو جہاں چھپتے ہیں وہاں یہ دیہاتی انہیں کھانا وغیرہ پہنچاتے ہیں۔"

"میں اس وجہ کو تسلیم کرتا ہُوں" — وزیرِاعظم نے کہا — "دشمن کی کامیابی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ ہماری فوج میں جذبے کی کمی نہیں۔"

"بالکل نہیں سر!" — چیف آف سٹاف نے کہا — "جذبے کی کوئی کمی نہیں۔ یہ کشمیریوں کی بدمعاشی ہے۔ وہ ہمیں دھوکہ دے رہے ہیں۔"

"لیکن سر!" — جرنیل نے کہا — "میں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔"

"کیا آپ ان دیہاتی مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہے ؟" — وزیرِاعظم نے پُوچھا۔

"میں وہاں جو کارروائی کر رہا ہوں اس کی خبریں پاکستان کے اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں" — جرنیل نے کہا — "میں نے وہاں گاؤں کے گاؤں جلا دیئے ہیں۔ گرفتاریاں اتنی کی ہیں کہ انہیں رکھنے کو جگہ نہیں رہی۔ ان کے ساتھ ہم اتنا بُرا سلوک کرتے ہیں جو کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ جس گاؤں کے متعلق شک ہوتا ہے کہ کمانڈو اس کے قریب سے صرف گزرے تھے اُس گاؤں پر ہمارے جوان باقاعدہ حملہ کر دیتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ فوج جب کسی پر حملہ کر دیتی ہیں تو وہاں کیا ہوتا ہے...

"ہم نے وہاں ۱۹۴۷ء کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اُسی طرح کشمیریوں کے قافلے آزاد کشمیر میں اور پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ سب زخمی ہوتے ہیں۔ ان کی عورتیں ہماری فوج کے ہاتھوں جس حالت میں جاتی ہیں وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہم نے سرینگر میں مسلمانوں کے دو محلّے جلا کر راکھ کر دیئے ہیں۔"

"یہ بہترین کارروائی ہے جو کمانڈو اور گوریلا اپریشن کو ناکام کر سکتی ہے" — چیف آف سٹاف نے کہا — "دنیا میں جہاں کہیں بھی اس قسم کا اپریشن ہُوا ہے وہاں اُن دیہاتیوں کو جو گوریلوں کی مدد کرتے تھے ایسے ہی تشدّد سے رام کیا گیا ہے۔"

"ایسا ظلم جائز ہوتا ہے" — وزیرِاعظم نے کہا — "لیکن ہمیں کامیابی کتنی ہوتی ہے ؟"

"اتنی نہیں جتنی ہونی چاہیئے تھی" — جرنیل نے کہا — "تباہ کاری جاری ہے... مسلمان سخت جان قوم ہے۔ ہم نے چھ کمانڈو پکڑے ہیں۔ ان میں ایک کیپٹن ہے۔ وہ اپنے ناموں کے سوا اور کچھ نہیں بتاتے۔ انہیں اذیّتیں دی گئیں، بڑے دل کش لالچ بھی دیئے مگر وہ اپنے بیس کی نشاندہی نہیں کرتے جو انہوں نے کشمیر میں کہیں بنا رکھا ہے۔ میں حیران ہوں کہ وہ ایسی خوفناک اذیّتیں کس طرح برداشت کرتے ہیں جو ہم انہیں دیتے ہیں۔"

*

اس جرنیل نے کانفرنس کو کچھ رپورٹیں پڑھ کر سنائیں۔ کمرے میں سنّاٹا طاری ہو گیا۔ اُس نے بتایا کہ انڈین آرمی کی کس یونٹ کا کتنا جانی نقصان ہُوا ہے۔ ہتھیار کتنے ضائع ہُوتے ہیں۔ گولہ بارود کے کتنے سٹور اور میگزینیں تباہ ہو چکی ہیں۔ اس میں ایک عارضی چھاؤنی کی رپورٹ بھی تھی جس پر پاکستان کی ایک کمانڈو پارٹی نے شب خُون مارا تھا۔ چار یا پانچ بارکوں میں فوجی سوتے ہُوتے تھے۔ چھاپہ ماروں نے بارکوں کے اندر گرینیڈ بھی پھینکے اور سٹین گنوں سے اس طرح بوچھاڑیں فائر کیں جس طرح پانی چھڑکا جاتا ہے۔ اس بٹالین میں سے کچھ خوش قسمت ہی زندہ بچے تھے۔ صبح تک شب خون مارنے والے غائب ہو چکے تھے۔ صرف یہ پتہ چل سکا تھا کہ اس کمانڈو پارٹی کی نفری بیس سے تیس جوان تھی۔

کنوائیوں پر فائرنگ کی رپورٹیں بھی تھیں اور کئی افسر جو محفُوظ جگہوں پر تھے یا محفُوظ سڑکوں پر جا رہے تھے اِکّی دُکّی گولی سے مارے گئے تھے۔ یہ سنائپنگ تھی۔ جرنیل نے بتایا کہ اب مقبوضہ کشمیر میں کوئی بھی سڑک خواہ وہ جنگل میں سے گزرتی ہو یا چھاؤنی میں سے، محفُوظ نہیں رہی۔

بھارتی وزیرِاعظم کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا جیسے اُس میں مزید کچھ سُننے کی تاب نہیں رہی تھی۔

"تو کیا ہمیں پاکستان پر فوراً حملہ نہیں کر دینا چاہیئے ؟" — وزیرِاعظم نے کہا۔

"نہیں" — چیف آف سٹاف نے کہا — "کمانڈو اپریشن کی کامیابی سے کوئی یہ سمجھے کہ اُس علاقے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا ہے تو یہ غلط ہو گا۔ کمانڈو اور گوریلے اپنی فوج کی پیشقدمی کے لیے زمین ہموار کیا کرتے ہیں۔ وہ کسی ملک کے چھوٹے سے خطّے پر بھی قبضہ نہیں کر سکتے۔ قبضہ فوج آکر کیا کرتی ہے۔ اِس وقت صُورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر آرمی نے کسی بھی طرف ایڈوانس نہیں کیا۔ اگر ہم نے اس صورتِ حال میں پاکستان پر حملہ کر دیا تو پاکستان آرمی ہمیں تیار ملے گی۔ ہم اس انتظار میں ہیں کہ پاکستان آرمی کشمیر کی طرف ایڈوانس کرے اور اپنے کمانڈو اپریشن سے فائدہ اٹھانے آئے۔ اُس وقت ہم پاکستان پر بغیر اعلانِ جنگ کے حملہ کر دیں گے۔ ہم نے پلان تیار کر لیا ہے۔ آپ کی اجازت کی ضرورت ہو گی۔ اصولی طور پر ہم بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کر سکتے۔"

"دشمن کا سر کچلنے کے لیے ہمیں اپنے اصولوں پر عمل کرنا ہے" — وزیرِاعظم نے کہا — "بین الاقوامی اصولوں کی پابندی کرنے والے شکست کھایا کرتے ہیں۔ دشمن کے ساتھ معاہدہ اُس وقت کرو جب اپنی پوزیشن کمزور ہو اور جب دیکھو کہ اپنی پوزیشن مضبُوط ہو گئی ہے تو دشمن کو اطلاع دیئے بغیر معاہدے سے منحرف ہو جاؤ... آپ نے دیکھا ہے کہ ہم سرکاری طور پر اخباروں کو یہی بیان دے رہے ہیں کہ کشمیر میں پاکستان بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور اگر پاکستان نے ہمیں

ہوائی کارروائی پر مجبور کر دیا تو ہم کشمیر میں پاکستان کے خلاف لڑیں گے اور اس جنگ کو کشمیر تک محدود رکھیں گے۔ کیا آپ نے کبھی اپنا ریڈیو نہیں سُنا؟ ہم پاکستان کے عوام کو پیار کے سندیس دے رہے ہیں.... آپ مجھے پاکستان پر حملے کے متعلق کچھ بتا رہے تھے۔"

"میں یہ بتا رہا تھا"۔ چیف آف سٹاف نے کہا ۔"کہ جب پاکستان آرمی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر کشمیر میں اُلجھ جائے گی تو ہم پاکستان پر دو سیکٹروں سے حملہ کریں گے۔ ایک حملہ لاہور پر ہو گا جیسا کہ ہمیں توقع ہے کہ لاہور کا دفاع خاصا کمزور ہو گا۔ میں پُورے وثوق سے آپ کو بتا رہا ہُوں کہ ہم پہلے روز ہی لاہور پر قبضہ کر لیں گے۔ اگلا دن ہمیں اپنی پوزیشنیں مستحکم اور قبضے کو مکمل کرنے میں لگے گا۔ اس دوران ہم سیالکوٹ سیکٹر میں جسّڑ کے مقام پر پاکستانیوں کو بڑے حملے کا دھوکہ دے کر اُن کی توجہ اِدھر کر دیں گے اور لاہور کے حملے کے دو روز بعد آرمڈ ڈویژن سے سامبا کی طرف سے سیالکوٹ کی طرف بلٹزر (برق رفتار) قسم کا ایڈوانس کریں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم پاکستان کے دفاعی مورچوں کو بُل ڈوزر کی طرح روندتے ہوئے وزیر آباد تک پہنچ جائیں گے اور جی۔ ٹی روڈ کو اپنی تحویل میں لے کر پاکستان کو دو حصّوں میں کاٹ دیں گے۔ وہاں سے ہمارے ٹروپس لاہور کے دفاع پر عقب سے حملہ کر کے اُن کی شکست کو مکمل کر دیں گے....

"سندھ کو پاکستان سے کاٹنے کے لیے ہم راجستھان سیکٹر سے ایڈوانس کریں گے اور رحیم یار خان پہنچ جائیں گے۔ کراچی کو ہماری نیوی اور ہمارا طیّارہ بردار بحری جہاز 'وکرانت' سنبھال لے گا۔ اس پلان کو ہم ایک ہفتے تک مکمل کر لیں گے۔"

"کیا پاکستانی دوستوں پر آپ کو بھروسہ ہے؟" ـــــ وزیرِ اعظم نے پوچھا ۔"کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اُن کے بھروسے پر پاکستان میں داخل ہو جائیں اور وہ آپ کو دھوکہ دے جائیں۔"

پاکستان کے دوستوں سے وزیرِ اعظم کی مراد بھارت کے پاکستانی ایجنٹ تھے جن کی پاکستان میں کوئی کمی نہیں تھی۔

"سَر! آپ کو پہلے بھی ملٹری انٹیلی جنس کا میجر جنرل اور سنٹرل انٹیلی جنس بیورو کا ڈائریکٹر اور سیکرٹ سروس کا ڈائریکٹر اپنی اپنی مکمل رپورٹیں دے چکے ہیں۔ ان رپورٹوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہُوا۔ میں آپ کو ان کا خلاصہ ایک بار پھر سنا دیتا ہوں۔ پہلے آپ کو بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے عوام اپنے سیاستدانوں کی حکومتوں سے اس قدر تنگ آ چکے ہیں کہ اُن میں قومی کردار اور پاکستان کی محبت ختم ہو چکی ہے سیاستدانوں کا دَور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خان نے ختم کر دیا مگر عوام کا گلا گھونٹ دیا اور ان کی زبانیں بند کر دیں۔ عوام پہلے کی طرح مہنگائی اور بے انصافی اور جرائم کی بھرمار کے مارے ہُوئے ہی رہے لیکن اب یہ کہنا بھی جرم قرار دے دیا گیا کہ عوام غربت اور بے انصافی کا شکار ہیں۔ اب ان کے ذہنوں میں ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے زبردستی ٹھونسا جانے لگا کہ وہ خوش حال ہیں اور ملک ترقی کر رہا ہے۔ چونکہ حکومت جرنیلوں کی تھی اس لیے عوام فوج سے بدظن ہو گئے....

"یہ صورتِ حال ہمارے حق میں تھی۔ کسی بھی ملک کی فوج اپنی قوم کی پشت پناہی کے بغیر نہیں لڑ سکتی۔ دشمن ملک اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے عوام اور اُن کی فوج کے درمیان منافرت پیدا کی جائے۔ اس کے لیے کئی طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جو پاکستان میں ہم

نے بھی استعمال کیے ہیں اور کامیابی حاصل کی ہے۔ اس مہم میں ہماری سیکرٹ سروس نے خاصی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ مجھے نہیں بتایا گیا"۔ وزیرِ اعظم نے کہا ۔"مجھے اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں لوگ ذہنی، سیاسی اور معاشرتی انتشار اور خلفشار کا شکار ہو چکے ہیں اور اس کیفیّت نے ان میں بے عملی پیدا کر دی ہے اور اُن کی ذہنیّت مجرمانہ ہو گئی ہے۔ ایسے حالات عوام کو اسی مقام پر لے آیا کرتے ہیں۔"

"پاکستانی عوام کو اس مقام پر لانے میں ہماری انٹیلی جنس اور سیکرٹ سروس کا بھی ہاتھ ہے" ـــــ چیف آف سٹاف نے کہا ۔"وہاں کے جرائم پیشہ لوگوں سے لے کر اونچے سے اونچے سیاسی لیڈروں تک میں اور ایوب خان کے درباری خوشامدیوں میں کچھ لوگ ہمارے بھی ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے فٹ پاتھی ہوٹلوں سے لے کر وہاں کے سیاسی اور سرکاری حلقوں تک فوجی حکومت کے خلاف بے بنیاد افواہیں پھیلاتے اور لوگوں کا خون گرماتے رہتے ہیں۔ تخریب کاری ہم اپنے آدمیوں سے کرا کے پاکستان کے دو چار بڑے لوگوں کے سَر ڈال دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ پاکستان کے عوام میں ہم نے اُن کی حکومت اور فوج کے خلاف بے اطمینانی اور عدمِ اعتماد پھیلانے میں بہت کامیابی حاصل کر لی ہے....

"پاکستان کے ادبی اور سیاسی حلقوں میں بھی اپنا اثر کام کر رہا ہے جنگ کی صورت میں ہمیں پاکستان کی آرمز اور ایمونیشن، تیل پٹرول اور فوجی سامان لے جانے والی ریل گاڑیوں کے ٹائم پتہ چلتے رہیں گے۔ کسی سٹیشن سے کوئی ریل گاڑی چلے گی تو ہمیں اطلاع مِل جائے گی پھر یہ گاڑی منزل تک نہیں پہنچے گی۔ پاکستانی فوج کی یونٹوں کی نقل و حرکت کا بھی ہمیں پتہ چلتا رہے گا۔"

"یہ جو کہا جا رہا ہے کہ پاکستان کے لوگ رَن کچھ کی جنگ اور کشمیر میں کمانڈو اپریشن کی وجہ سے بیدار ہو گئے ہیں اس کا ہمارے پلان پر کیا اثر پڑے گا؟" ـــــ وزیرِ اعظم نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں"۔ چیف آف سٹاف نے جواب دیا ۔"اگر کچھ اثر پڑا بھی تو اس کا بندوبست ہم اوپر سے کرا دیں گے۔ ہمارے ہاتھ بہت دور تک پہنچ سکتے ہیں۔ وہاں ہر شعبے میں ہمارے دوست موجود ہیں۔ روپوں کے ڈھیر اور عورت مِل کر جادو کے کرتب دکھا سکتے ہیں اور دکھا رہے ہیں.... میں آپ کو بتا سکتا ہُوں کہ پاکستان اور آزاد کشمیر آرمی کشمیر میں کدھر سے داخل ہوں گی۔ وہ چھمب سیکٹر پر حملہ کریں گی۔"

"آپ نے اُدھر کا ڈیفنس مضبُوط کر لیا ہے؟"

"اُدھر کا ڈیفنس ہم نے اتنا مضبوط کر لیا ہے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی اگر ساری کی ساری فوجیں ایک ہی بار آ جائیں تو چھمب اور جوڑیاں کی دفاعی مورچہ بندیوں میں اس طرح پھنس کے ختم ہو جائیں گی جس طرح دلدل میں پھنس کر انسان دھنستا چلا جاتا اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے" ـــــ چیف آف سٹاف نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا ـــــ"پاکستانیوں کے پاس نعرۂ حیدری اور جذبے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ نعروں اور جذبوں سے کنکریٹ کے بنکر نہیں ٹوٹ سکتے۔ پاکستانی جب ہمارے اس ڈیفنس میں پھنس جائیں گے تو مزید ٹروپس اِدھر بھیجیں گے۔ اُن کی طاقت یہیں صرف ہوتی جائے گی پھر ان میں سیالکوٹ لاہور اور راجستھان کی طرف سے ہمارے حملے روکنے اور پاکستان کو بچانے کی نہ ہمّت رہے گی نہ ہوش۔"

"ہمارا مقصد پاکستان کو ختم کرنا ہے" ـــــ وزیرِ اعظم نے کہا ۔"خواہ لڑ کر کریں خواہ پیار اور محبّت کا

دھوکہ دے کر کریں.... آپ چونکہ فوجی نقطۂ نگاہ سے حالات کو دیکھتے ہیں اس لیے آپ ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ میں فوجی امور کو نہیں سمجھتا اس لیے کشمیر میں پاکستانی کمانڈو اپریشن کی خبریں مجھے پریشان کرتی ہیں۔ اگر ہمارے کشمیر کے دیہاتی ان کی مدد کر رہے ہیں تو ان کے خلاف اپنی کارروائی جاری رکھیں۔ اگر آپ کشمیر کے تمام مسلمانوں کو ختم کر دیں گے اور ان کی بستیاں جلا ڈالیں گے تو ہمارے لیے اچھا ہی ہو گا۔ ہمیں وہاں کے مسلمانوں کی نہیں اس زمین کی ضرورت ہے۔ ہمیں کشمیری نہیں کشمیر چاہیئے۔ ان میں سے جو مارے نہیں جا سکتے انہیں خوفزدہ اور ہراساں کر کے پاکستان کی طرف بھگا دو۔ اپنی فوج کے جوانوں سے کہہ دو کہ مسلمانوں پر رحم کرنے کو پاپ سمجھیں۔"

*

اگست ۱۹۶۵ء کے وسط تک مقبوضہ کشمیر میدانِ حشر بن چکا تھا۔ ایک طرف پاکستان اور آزاد کشمیر کی کمانڈو پارٹیوں کے دھماکے تھے جن میں ندیوں کے بڑے اہم پُل، گولہ بارود کے ذخیرے، پہاڑیوں پر پکٹیں اور پوسٹیں اور جنگی ٹھکانے اُڑ رہے تھے، جل رہے تھے، اور دوسری طرف بھارت کی فوج تھی جو اپنی تباہی اور بربادی کا انتقام مقبوضہ کشمیر کے نہتے دیہاتیوں سے لے رہی تھی۔ ان لوگوں پر الزام یہ تھا کہ پاکستانی چھاپہ ماروں کو مدد اور پناہ دیتے ہیں۔

بھارتی فوج جب کسی گاؤں پر حملہ کرتی تھی تو وہاں سے کوئی خوش قسمت ہی زندہ نکل سکتا تھا۔ ان کے مکان لکڑی کے بنے ہوتے تھے اور جو پتھروں اور مٹی کے تھے ان کی چھتیں لکڑی اور گھاس پھونس کی تھیں۔ انہیں آگ کا اشارہ کافی ہوتا تھا۔ کشمیر کی تیز ہوائیں تھوڑی سی دیر میں شعلوں کو پھیلا کر پورے گاؤں کا صفایا کر دیتی تھیں۔ اکثر بچے زندہ جل جاتے یا جلا دیئے جاتے تھے۔ کسی گاؤں میں فوج کی آمد کی خبر قبل از وقت پہنچ جاتی تو وہاں کے لوگ بھاگ اٹھتے اور آزاد کشمیر کا یا سیالکوٹ کی طرف پاکستان کا رُخ کر لیتے تھے۔ اس طرح پاکستان میں پناہ گزینوں کے لہولہان قافلے اُسی طرح آ رہے تھے جس طرح ۱۹۴۷ء میں آتے تھے۔

ان قافلوں میں جو جوان آدمی تھے اُن کے بازو اُن کے جسموں کے ساتھ نہیں تھے۔ بھارتی فوج نے کاٹ پھینکے تھے۔ کئی نوعمر لڑکوں کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔ عورتوں کے پستان کٹے ہوئے تھے۔ بعض ادھیڑ عمر آدمیوں کی آنکھیں نکلی ہوئی تھیں۔ یہ سب پاکستان اور آزاد کشمیر میں مرنے کے لیے آتے تھے۔ ان کے جسم خون سے خالی تھے ——— اور جن خواتین کو ہندوؤں نے کچھ دن اپنے پاس رکھ کے چھوڑا تھا وہ چپ چاپ، آنکھیں پھاڑے ہر کسی کو دیکھتی تھیں کبھی خلاؤں میں ٹکٹکی باندھ لیتی تھیں جیسے وہ کوئی بڑا ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوں۔

پاکستان اپنی تاریخ کے بڑے ہی نازک اور پُرخطر دَور میں داخل ہو چکا تھا۔ بھارت کی سیاسی اور فوجی قیادت خوش تھی کہ پاکستان نے اپنی تباہی کا سامان خود ہی پیدا کر لیا ہے اور اُس نے چار ساڑھے چار ڈویژن فوج کے بل بوتے پر اُس بھارت سے ٹکر لے لی ہے جو جنگی طاقت کے لحاظ سے دیو ہے۔

پاکستان نے اپنے آپ کو بھارت کے خطرے کے علاوہ بڑے سخت امتحان میں ڈال لیا تھا۔ اس کے فوجی لیڈروں نے مقبوضہ کشمیر کو بھارت کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے بڑا ہی دلیرانہ اقدام کیا تھا جو "اپریشن جبرالٹر" کے نام سے مشہور ہوا لیکن یہ اقدام ایسا تھا جس کی تکمیل لازمی تھی۔ اس دلیرانہ اور حیران کن اپریشن میں پاکستان اور آزاد کشمیر افواج کے بڑے خوبرو، نوجوان اور قیمتی افسر اور تجربہ کار جوان جو فوج کی بالائی سمجھے جاتے تھے، شہید ہو رہے تھے، عُمر بھر کے لیے معذور ہو رہے تھے، تار گیٹ کے علاقے میں گرفتار ہو کر دشمن کی قید میں غیر انسانی اذیتیں سہہ رہے تھے۔

اس کے علاوہ ساری دنیا کے جنگی وقائع نگاروں اور مبصّروں کی نظریں اس کمانڈو اپریشن پر لگ گئی تھیں۔ ساری دنیا کو پتہ چل گیا تھا کہ پاکستان نے مقبوضہ کشمیر کو بھارت کے تسلّط سے چھڑانے کے لیے یہ جنگی اقدام کیا ہے اور چونکہ کشمیر کو بھارت اپنی ملکیت سمجھتا ہے اس لیے بھارت پاکستان پر جوابی حملہ کرے گا۔ اس صورتِ حال میں غیر ممالک کے اخبار لکھ رہے تھے کہ پاکستان نے مقبوضہ کشمیر میں یہ اپریشن شروع کیا ہے تو اُس نے اپنے آپ کو بھارت سے لڑنے کے قابل سمجھ کر بھارت کو چیلنج کیا ہے۔ لہٰذا یہ اب پاکستان کے وقار کا مسئلہ بن گیا تھا کہ وہ اپنے اقدام کو انتہا تک پہنچاتے اور اس کے نتائج کو بھی قبول کر کے ان سے نمٹتے۔

اس کمانڈو اپریشن کی جو سزا مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کو مِل رہی تھی اس کی ذمّہ داری بھی پاکستان پر عائد ہوتی تھی۔ پاکستان کے پیچھے ہٹ آنے کی صورت میں پاکستان کو پاکستان کے نام پر تباہ اور خانماں برباد ہونے والوں کی پھٹکار کا سامنا تھا۔ ان مظلوم کشمیریوں کو اب اپنی آزادی صاف نظر آنے لگی تھی۔ اس لیے یہ جانتے ہوئے کہ انہیں بڑی بھیانک سزا ملے گی وہ کمانڈو پارٹیوں کی مدد کرتے تھے۔

پاکستان تاریخ کے دوراہے پر آ رہا تھا۔ ایک راستہ ذلّت و رسوائی کی طرف جاتا تھا اور دوسرا عزّت و وقار کی طرف۔

پاکستان میں بھارت کے جاسوسوں اور اُن کے ایجنٹوں کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئی تھیں۔ فوجی راز بھارت پہنچ رہے تھے۔

*

اسلام آباد میں ملک ناصر ملک رجب علی خان کو بتا رہا تھا کہ کیپٹن اصغر ایک مشن پر مقبوضہ کشمیر گیا ہُوا ہے اور وہاں کا موسم اتنا خراب ہے کہ اصغر کی پارٹی کو شاید اپنا مشن پُورا کیے بغیر واپس آنا پڑے گا۔ اس خبر سے ملک رجب علی کی پریشانی بڑھ گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ مقبوضہ کشمیر سے واپس آنا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا وہاں داخل ہونا۔ وہ تو سلمیٰ کو یہ خبر سنانا چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا بالکل خیریّت سے ہے اور وہ اُسے دیکھ آیا ہے۔

اُس نے ملک ناصر کے ٹیلیفون سے لاہور اپنے گھر کا نمبر ڈائریکٹ ڈائل کیا۔ اُدھر سلمیٰ نے ریسیور اُٹھایا۔ رجب علی نے اُسے بتایا کہ وہ اصغر سے مِل تو نہیں سکا، اس کے دو ساتھی مِل گئے ہیں۔ اُنہوں نے بتایا ہے کہ وہ ایبٹ آباد کے کسی پہاڑی علاقے میں ٹریننگ کیمپ میں ہیں جہاں پکنک کا ماحول ہے۔ اُس کیمپ تک باہر کا کوئی آدمی نہیں جا سکتا۔ فوجی احکام ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"اب اپنے دل کو مضبُوط رکھو سلمیٰ!" ——— رجب علی نے کہا ——— "میں چند دن اسلام آباد میں رُکوں گا اور کوشش کروں گا کہ اصغر سے ملاقات ہو جائے۔ یہ ٹیلیفون نمبر نوٹ کر لو" ——— اُس نے ملک ناصر کا فون نمبر بتا کر کہا ——— "یہ میرے ایک پُرانے دوست ملک ناصر کا نمبر ہے۔ یہ اصغر کے ساتھ میری

ملاقات کا انتظام کرا دے گا۔ بہرحال تم مطمئن رہو۔ اصغر بڑے مزے میں ہے۔"

"جلدی آجانا" ـــ سلمیٰ نے کہا ـــ "تنہائی سے میرا دل گھبرا جائے گا۔"

"یہ تنہائی لمبی ہو سکتی ہے سلمیٰ!" ـــ رجب علی نے کہا ـــ "دل گھبرائے تو طاہرہ کے ہاں چلی جایا کرنا یا اُسے اپنے ہاں بلا لینا۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا.... اصغر سے ملے بغیر واپس نہیں آؤں گا.... اچھا خدا حافظ" ـــ اور اُس نے فون بند کر دیا۔

"کیپٹن اصغر کہاں ملے گا تمہیں؟" ـــ ملک ناصر نے ملک رجب علی سے پوچھا ـــ "وہ آ بھی گیا تو تم اُسے نہیں مل سکو گے۔ معلوم نہیں اُس کا بیس کہاں ہے۔"

"سلمیٰ کو تسلّی دے رہا ہوں یار!" ـــ رجب علی نے کہا ـــ "میں اسی بہانے کچھ دن تمہارے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ ایک ہی جگہ کی قید اور فراغت نے مجھے مُردہ کر دیا ہے۔"

"میں تمہیں زندگی دے سکتا ہُوں" ـــ ملک ناصر نے اُسے معنی خیز نظروں اور شرارتی سی مسکراہٹ سے کہا ـــ "اور میں تمہیں ایسی مصروفیت دے سکتا ہُوں جو تمہیں جنّت میں پہنچا دے گی.... لیکن....!"

"لیکن کیا!" ـــ رجب علی نے کہا ـــ "جو کام بتاؤ گے کروں گا لیکن مجھے اصغر کے متعلّق صحیح اطلاع ملنی چاہیئے۔ میں اُس کے لیے پریشان ہُوں۔"

"صحیح اطلاع لا دوں گا" ـــ ملک ناصر نے کہا ـــ "تم ایک کیپٹن کی اطلاع چاہتے ہو، کہو تو پاکستان آرمی کی پوری پوری رجمنٹوں کی اطلاع لا دوں کہ کہاں کہاں ہیں اور کہاں کہاں جائیں گی۔"

"تم صرف میرے کیپٹن کی اطلاع لا دو" ـــ رجب علی نے کہا۔

*

کیپٹن اصغر کی اطلاع ابھی مخدوش تھی۔ اُسے امید تھی کہ وہ اپنے تیرہ جوانوں کی پارٹی کو صُبح تک دشمن کے علاقے سے نکال لائے گا مگر صبح کا اُجالا نکھرنے تک وہ دشمن کے علاقے میں تھا۔ وہ لوہے کے بنے ہُوئے نہیں گوشت پوست کے انسان تھے۔ وہ گذشتہ دن اور ساری رات موسلادھار بارش میں بھیگتے رہے اور تیز و تُند جھکڑ میں چلتے رہے تھے۔ وہ کیچڑ میں دھنستے گئے اور چڑھے ہُوئے ندی نالوں میں سے گزرے تھے۔ اُن کے جسم اکڑ گئے تھے۔ ہتھیاروں پر اُن کی انگلیاں جم کے اکڑ گئی تھیں۔

مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو کر تار گیٹ تک پہنچتے انہیں ایک دن اور ایک رات لگی تھی۔ دن کو وہ چُھپے رہے یا چُھپ چُھپ کر چلتے رہے تھے۔ شام گہری ہوتے ہی گھٹائیں برسنے لگی تھیں۔ واپسی کی مسافت چند گھنٹوں کی تھی لیکن اُن کے جسم جواب دے گئے تھے۔ اُن کے اعصاب پر پہر لمحے ہیجانی کیفیّت کا، پکڑے جانے، مارے جانے اور مشن کی ناکامی کا بوجھ پڑ رہا تھا۔ اس کیفیت کا بھی جسموں پر بہت بُرا اثر تھا۔ وہ اب رُوح اور جذبے کی قوّت سے چل رہے تھے۔ وہ اب اس لیے قدم گھسیٹ رہے تھے کہ انہیں چلنا تھا اور اس علاقے سے نکلنا تھا۔ گزشتہ روز جو نالے خشک تھے۔ وہ بارش سے سیلابی ندیاں بن گئے تھے۔ وہ ان کے تیز اور یخ پانی میں سے گزرے تھے۔

ان کے ساتھ تین زخمی جوان بھی تھے جن میں سے دو تو چل رہے تھے لیکن انہیں سہارے کی ضرورت تھی، اور تیسرے سے چلا نہیں جاتا تھا۔ جوان اُسے باری باری پیٹھ پر اُٹھا کر لا رہے تھے۔ اس سے پارٹی کی رفتار اور زیادہ سُست ہو گئی تھی۔ دونوں پریشان تھے۔ صبح صاف ہو گئی تھی۔

"صاحب!" ـــ ایک گائیڈ نے کہا ـــ "اب آپ اُس طرح بے فکر ہو کر نہیں چل سکیں گے جس طرح رات کو چلتے آئے تھے۔ سرحد سے ہم ابھی دُور ہیں... آپ نے ایک غلطی کی ہے صاحب!" ـــ گائیڈ نے ذرا دبی دبی آواز میں کہا ـــ "میں پہلے چار پارٹیوں کو اندر لے جا چکا ہوں۔ ان کے افسر ایسے زخمیوں کو ساتھ نہیں لائے تھے جو چل نہیں سکتے تھے۔ آپ زخمی جوانوں کو ساتھ لے آئے ہیں۔ اس طرح آپ باہر نہیں نکل سکیں گے۔"

کیپٹن اصغر نے نائب صوبیدار اسلم کی طرف دیکھا۔

"سر! حکم تو یہی ہے" ـــ نائب صوبیدار اسلم نے کہا ـــ "آپ جو حکم دیں گے۔"

"میں جانتا ہوں حکم کیا ہے صاحب!" ـــ کیپٹن اصغر نے کہا ـــ "اِن زخمیوں کو واپس لے جاتے ہماری پوری پارٹی پکڑی جا سکتی ہے لیکن یہ زندہ ہیں۔ یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ انہوں نے موت کی منزل تک ہمارا ساتھ دیا ہے۔ میں انہیں پھینک نہیں سکتا۔"

سپاہی عابد جو چلنے کے قابل نہیں تھا وہ کئی بار اپنے ساتھیوں سے کہہ چکا تھا کہ وہ اُسے چھوڑ جائیں۔ وہ انہیں اپنے بوجھ سے آزاد کر رہا تھا مگر اُس کے ساتھی باری باری اُسے اٹھائے ہوئے لے جا رہے تھے۔ اس نے آخر کیپٹن اصغر سے کہا تھا کہ وہ نکل جائیں اور اُس کے بوجھ سے آزاد ہو جائیں ورنہ اُس کی خاطر سب مارے جائیں گے لیکن کیپٹن اصغر نے اسے ڈانٹ کر چُپ کرا دیا تھا۔

ساتھیوں کی محبت کے اس جذبے کا نتیجہ صبح کی روشنی کے ساتھ ہی سامنے آگیا تھا۔ رفتار سُست ہونے کی وجہ سے وہ سرحد سے نہیں نکل سکے تھے۔ گائیڈ کیپٹن اصغر سے کہہ چکے تھے کہ اب وہ پکڑے جا سکتے ہیں سرحد سے نکل نہیں سکتے۔ جسم اب تیز حرکت کے قابل نہیں رہے تھے۔ انہیں اب بہت سا آرام اور دھوپ کی تپش حرکت کے قابل بنا سکتی تھی۔ بادل اُڑے جا رہے تھے۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔

*

وہ تنگ سی ایک وادی میں چلے جا رہے تھے جو عام راہوں سے دُور افتادہ تھی۔ ساون کی وجہ سے جھاڑ پات اور گھاس اتنی اونچی ہو گئی تھی کہ جھک کر اس کی اوٹ سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا۔ درختوں کی بھی بہتات تھی۔ پارٹی ایک قطار میں چلی جا رہی تھی۔

انہیں ساتھ والی ٹیکری کے اُوپر سے جس کے ساتھ ساتھ وہ چلے جا رہے تھے ایک آواز سُنائی دینے لگی ـــ "اُوہ.... اُوہ.... اُوہ" ـــ یہ کوئی پرندہ ہو سکتا تھا۔ کسی نے بھی اُدھر نہ دیکھا۔

اب تالی کی آواز آئی اور اس کے ساتھ یہ آواز ـــ "اے۔ اے۔ اے۔"

سب نے اوپر دیکھا۔ ایک نوجوان لڑکا سا، کشمیر کے گڈریوں کے روائتی لباس میں کھڑا ایسے انداز سے اشارے کر رہا تھا جیسے سخت گھبراہٹ میں ہو۔ وہ ٹیکری کے دوسری طرف بھی دیکھتا اور پھر

کمانڈو پارٹی کو اشارے سے کرتا تھا۔ اس نے ہاتھ سے ایسے اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ بیٹھ جاؤ۔ کیپٹن اصغر نے پارٹی سے کہا کہ چھُپ جاؤ اور ایک گائیڈ سے کہا کہ وہ اوپر جا کر اُس سے پوچھے کہ وہ کیا کہتا ہے دونوں گائیڈ اوپر چلے گئے۔

"نائب صوبیدار صاحب!" — کیپٹن اصغر نے نائب صوبیدار اسلم سے کہا۔ "میں پہلی بار آیا ہوں۔ کیا ان لوگوں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کشمیری لڑکا ہمیں دھوکہ دے رہا ہو؟"

"کیا نہیں ہو سکتا صاحب؟" — نائب صوبیدار اسلم نے کہا۔ "پاکستان میں اتنے امیر کبیر لوگ جو ایک ملک کو نقد قیمت دے کر خرید سکتے ہیں اپنے ملک اور اپنے مذہب کے دشمن کے جاسوس ہو سکتے ہیں تو یہ بے چارہ تو اتنا غریب لگتا ہے کہ اس نے کبھی دس روپے کا نوٹ اپنے ہاتھ میں لے کر نہیں دیکھا ہوگا۔ ان لوگوں پر دشمن کی سزا کا بھی خوف ہوتا ہے۔ کمانڈو پارٹیوں کو مدد دینے کی جو سزا انہیں ملتی ہے وہ آپ اپنی آنکھوں دیکھیں تو بے ہوش ہو جائیں۔"

"پھر اس لڑکے کے ساتھ ہم کیا سلوک کریں گے؟"

"پہلے معلوم ہو جاتے کہ یہ کیا کہتا ہے" — نائب صوبیدار اسلم نے کہا۔ "پھر دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے ... ایک بات آپ کو بتا دوں۔ میں نے آپ کے سوال کا پورا جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ لڑکا بہت غریب ہے اور یہ دھوکہ دے سکتا ہے لیکن صاحب! یہ لوگ وفا اور جذبے کے لحاظ سے غریب نہیں۔ اللہ کا جو ڈر اور وطن کی جو محبت اور ایمان کا جو خیال غریبوں میں ہوتا ہے وہ امیروں میں کم ہی نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کو اب پہلی بار اپنے وطن کی آزادی نظر آنے لگی ہے۔ یہ ہمیں اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں۔ یہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ کچھ کرنا ضرور چاہتے ہیں۔ ان کے کرنے کا یہی کام ہے کہ کمانڈو پارٹیوں کو جس قسم کی بھی مدد کی ضرورت پڑے یہ دیں، اور یہ مدد دیتے ہیں۔ ان میں کوئی ایک ایسا نکل آتا ہے جو دھوکہ دیتا ہے۔"

اوپر سے ایک گائیڈ دوڑتا ہوا نیچے آیا۔

"صاحب!" — اُس نے کہا۔ "ہندو فوجی آ رہے ہیں۔ اس لڑکے نے دیکھے ہیں۔ قریب چھوٹا سا گاؤں ہے۔ لڑکا کہتا ہے کہ اوپر آ جاؤ اور پیچھے اُتر جاؤ۔ وہ اوپر کھڑا دیکھتا رہے گا۔"

"اِس پر بھروسہ کریں؟" — نائب صوبیدار اسلم نے پُوچھا۔

"ضرور کریں" — گائیڈ نے جواب دیا — "میں انہیں جانتا ہوں۔ دھوکہ دینے والے لوگ نہیں۔"

*

پہلے نائب صوبیدار اسلم اوپر گیا۔ اُس نے درختوں کی اوٹ میں ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر دُوربین سے دیکھا، پھر اُس نے کیپٹن اصغر کو اشارہ کیا کہ سب اُوپر آ جاؤ۔ ٹیکری زیادہ اونچی نہیں تھی۔ سب ایک دوسرے کے پیچھے اوپر چڑھنے لگے۔ رات کی بارش سے پھسلن تھی۔ زخمیوں کو اُٹھا کر وہ بڑی مشکل سے اوپر گئے۔ کشمیری لڑکا ایک طرف نیچے اُترنے لگا۔ اُس کے اشارے پر سب اُدھر کو اُترنے لگے۔

یہ ٹیکریوں کا علاقہ تھا۔ ان کے درمیان بڑی تنگ جگہ تھی۔ ان کے عقب میں اونچی پہاڑی تھی۔ بادل کے تین چار ٹکڑے اس پہاڑی سے نیچے آ گئے تھے۔ لڑکا انہیں نیچے لے گیا۔ اب زخمیوں کو دو دو جوان مل کر اُٹھاتے تھے۔ پارٹی دو اونچی ٹیکریوں کے درمیان چلی جا رہی تھی۔ درختوں اور ہری گھنی جھاڑیوں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔

چلتے چلتے آگے راستہ بند نظر آیا۔ لڑکا ٹیکری پر چڑھنے لگا۔ اس ڈھلان پر پھسلن اتنی زیادہ تھی کہ ہاتھ بھی نیچے لگانے پڑتے تھے۔ زخمیوں کو ایک ایک جوان نے پیٹھ پر ڈال لیا اور وہ جانوروں کی طرح اوپر چڑھنے لگے۔ جسموں میں جان تو رہی نہیں تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ اس سے جسم اور زیادہ بے کار ہوتے جا رہے تھے۔

اوپر جا کر لڑکا بیٹھ گیا اور اُس نے سب کو اشارہ کیا کہ بیٹھ جائیں۔ ساری پارٹی ڈھلان پر ہی رُک گئی۔ کیپٹن اصغر اور نائب صوبیدار اسلم اُوپر گئے لیکن پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ انہیں دس بارہ جھونپڑے نظر آئے جن میں کچھ لکڑی کے بنے ہوتے تھے اور کچھ پتھروں پر لیپ کی ہوئی دیواروں والے تھے۔ یہ اکٹھے نہیں تھے۔ ایک دو ایک پہاڑی کے دامن میں تھے۔ ایک دو اوپر ڈھلان پر تھے۔ دو تین اور اوپر تھے اور ایک دو اُن سے بھی اُوپر تھے۔ اُن کے سامنے ایک میدان تھا جہاں بکریاں اور مویشی چر رہے تھے۔ چند ایک بچے کھیل رہے تھے۔ دو چار عورتیں بھی تھیں۔ یہ سب آباد گاؤں کی نشانیاں تھیں۔

نائب صوبیدار اسلم نے اپنا سر پیچھے کر لیا اور بولا — "اوٹ میں ہو جائیں سر!" — اُس نے دُوربین کیپٹن اصغر کو دے کر کہا — "سامنے دیکھیں۔"

کیپٹن اصغر کو دُوربین میں چیل اور دیودار کے درختوں میں سے گزرتے ہوئے بھارتی فوجی نظر آئے۔ اُن کی تعداد پچاس ساٹھ کے درمیان تھی۔ ان کے پیچھے چھ خچریں تھیں۔

"پلاٹون لگتی ہے" — کیپٹن اصغر نے کہا۔

"ان کی بٹالین کی نفری ایک ہزار سے زیادہ ہوتی ہے" — نائب صوبیدار اسلم نے کہا — "پلاٹون ہی ہوگی۔"

بچے جو باہر کھیل رہے تھے اور چند عورتیں جو اِدھر اُدھر کچھ کام کر رہی تھیں بچوں کے ساتھ اپنے گھروں کو دوڑ پڑیں۔ پلاٹون اِن سے ڈیڑھ دو سو گز دُور سے گزر رہی تھی۔ اس کے آگے آگے ایک افسر جا رہا تھا۔ اُس نے اِدھر دیکھا تو پلاٹون کو روک کر خود گاؤں کی طرف آ گیا۔ اُس کے ساتھ ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ اور ایک صوبیدار بھی آیا۔ میدان میں آ کر اس میجر نے گاؤں والوں کو پُکارا تو گاؤں کے بیس پچیس مرد دوڑتے ہوئے اُوپر سے نیچے آئے۔

کشمیری لڑکا جو کیپٹن اصغر کے ساتھ تھا وہ کہنے لگا کہ وہ جا کے دیکھتا ہے کہ ہندو افسر گاؤں والوں سے کیا کہہ رہے ہیں لیکن کیپٹن اصغر نے اُسے روک کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ خطرہ تھا کہ لڑکا بھارتی فوجیوں کو بتا دے گا کہ یہاں پاکستان کے فوجی چھُپے ہوتے ہیں۔

ایک گائیڈ نے کشمیری زبان میں لڑکے سے کچھ کہا تو لڑکے کا چہرہ لٹک آیا۔

"صاحب بہادر جی!" — لڑکے نے کیپٹن اصغر سے کہا۔ "تم ہم کو بے ایمان کافر سمجھتے ہو؟ ... یہ کہتا ہے کہ اِدھر بیٹھے رہو۔ تم ہندوؤں کو بتا دو گے۔"

"یہ بکواس کرتا ہے" — کیپٹن اصغر نے کہا۔ "میں نے تمہیں اس لیے روک کر اپنے پاس بٹھا لیا ہے

کہ وہ ہندو فوجی تم پر شک کریں گے اور پوچھیں گے کہ کہاں تھے۔ تم نہیں بتاؤ گے تو تمہیں ماریں گے۔"
اُس نے لڑکے کو اپنے ساتھ لگا کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"نائب صوبیدار صاحب!" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا ــ "ہم کتنی آسانی سے اس پوری پلاٹون کو ختم کر سکتے ہیں .... کیا خیال ہے؟"

"خیال بہت اچھا ہے صاحب!" ــــ نائب صوبیدار اسلم نے کہا ــ "لیکن اس کا نتیجہ بہت خوفناک ہوگا۔ ہمارے لیے بھی اور اس گاؤں کے معصوم لوگوں کے لیے بھی۔ ہو سکتا ہے یہ پلاٹون اپنی بٹالین کی ایڈوانس گارڈ ہو اور اس کے پیچھے پوری بٹالین آ رہی ہو۔ اگر نہ بھی ہو تو اس پلاٹون کو مشین گنوں سے ختم کر کے ہم تو چلے جائیں گے مگر سزا اس گاؤں کو ملے گی۔ گاؤں کا بچہ بچہ انڈین آرمی کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا اور سب سے زیادہ گندی سزا ان کی عورتوں کو ملے گی۔ گاؤں جل جائے گا۔"

"کیا زندگی ہے ان معصوم لوگوں کی" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا ــ "یہ کبھی نہ ختم ہونے والے خوف و ہراس میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ بھی انسان ہیں۔"

"انہیں انسان نہیں سمجھا جاتا صاحب!" ــــ گائیڈ عبدالرحمٰن نے کہا ــ "یہ ہندو افسر انہیں ڈرا رہے ہوں گے اور دیکھ رہے ہوں گے کہ یہاں جوان عورتیں کتنی ہیں۔ اس کے علاوہ گاؤں سے کیا مل سکتا ہے اور یہ لوگ کیسے ہیں .... یہ لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ اذانیں دیتے ہیں لیکن ان فوجیوں نے گاؤں کے قریب اپنی پوسٹ بنا لی تو گاؤں میں سے اذان کی آواز نہیں اُٹھے گی۔"

"اور اگر ہم نے کشمیر کو آزاد نہ کرایا تو وہ وقت بھی آ جائے گا کہ اس خطے میں اذان جرم قرار دے دی جاتے گی" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا ــ "یہ لوگ ہماری مدد کے محتاج ہیں۔ اگر ہم نے ان سے ہاتھ کھینچ لیا تو یہ بہت بڑا گناہ ہوگا۔ خدا ہمیں معاف نہیں کرے گا۔"

"صاحب بہادر جی!" ــــ کشمیری لڑکے نے کہا ــ "ہندو، سکھ اور ڈوگرے فوجی یہاں سے گزرتے ہیں تو ہم کو باہر بلا کر بہت ڈراتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تم لوگوں نے پاکستان کا نام لیا تو سب کو جان سے مار دیں گے اور تمہاری عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب کوئی فوجی ادھر سے گزرے تو اس کو سلام کیا کرو اور وہ جو حکم دے وہ فوراً پورا کیا کرو۔"

"تمہیں کس طرح پتہ چلا تھا کہ ہم پاکستان کے فوجی ہیں؟" ــــ نائب صوبیدار اسلم نے پوچھا۔

"میں پہلے بھی پاکستان کے فوجی دیکھ چکا ہوں" ــــ لڑکے نے کشمیری اردو اور اپنے لب و لہجے میں کہا ــ "ہمارے گاؤں کا دادا ہے نا، اُس نے سب لڑکوں کو بتایا تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجی اس رنگ کی شلوار قمیضوں میں ادھر آتے ہیں اور ہندو فوجیوں کو مار کر چلے جاتے ہیں۔ دادا نے بتایا تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجی بڑے بہادر ہیں۔ وہ پُل تباہ کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی فوجیں دریاؤں اور ندیوں سے نہ گزر سکیں۔ دادا نے ہمیں بہت ساری باتیں بتائی تھیں اور اُس نے کہا تھا کہ اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہا کرو جہاں کہیں پاکستان اور آزاد کشمیر کا کوئی فوجی راستہ بھولا ہُوا یا زخمی نظر آتے اُسے اس طرح چھپا کر گاؤں میں لے آیا کرو کہ کوئی ہندو فوجی نہ دیکھ سکے ....

"دس گیارہ دن گزرے ہیں اور میرے دوست ناجا چار مسلمان فوجیوں کو گاؤں میں لاتے تھے۔ دو کی

ٹانگوں میں گولیاں لگی تھیں۔ دادا نے اور دوسرے لوگوں نے ان کے زخموں پر پٹیاں باندھی تھیں۔ وہ چار پانچ دن ہمارے پاس رہے تھے پھر ایک رات چلے گئے تھے۔ میں تو ویسے ہی آج ادھر اوپر کھڑا تھا۔ میں نے دُور سے ہندو فوجیوں کو دیکھ لیا تھا۔ اِدھر دیکھا تو تم لوگ چھُپ چھُپ کر آ رہے تھے .... تم کو مجھ پر اعتبار نہیں آتا۔ ہم لوگ غریب ہیں نا، اس لیے تم سوچتے ہو کہ ہم لوگ ہندوؤں سے پیسے لے کر تم کو پکڑوا دیں گے۔ ہم لوگ خدا سے بہت ڈرتے ہیں۔"

"ہم بھی اُسی خدا سے ڈرتے ہیں میرے بھائی!" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا ــ "ہمارا تمہارا خدا ایک ہے۔"

*

ایک گائیڈ نے بتایا کہ ہندو افسر جا رہے ہیں۔ کیپٹن اصغر اور نائب صوبیدار اسلم نے اُدھر دیکھا۔ ہندو افسر اپنی پلاٹون سے جا ملے اور پلاٹون آگے چلی گئی۔ نائب صوبیدار اسلم یہ کہہ کر ٹیکری سے اُترنے لگا کہ وہ کہیں سے دیکھے گا کہ یہ پلاٹون کہاں جا رہی ہے۔ ایک گائیڈ جس کا نام عطا اللہ تھا کیپٹن اصغر سے کہنے لگا کہ وہ ٹیکریوں کے پیچھے پیچھے سے گاؤں میں جائے گا اور معلوم کرے گا کہ یہ فوجی کہاں جا رہے تھے۔

"فوجی گاؤں والوں کو نہیں بتایا کرتے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا ــ "اس لڑکے کو جانے دو" ــــ اُس نے لڑکے سے کہا ــ "تم جاؤ اور اپنے دادا کو بتاؤ کہ پاکستان کے فوجی آئے ہیں۔"

لڑکا کودتا پھلانگتا ٹیکری سے اُتر گیا۔ گاؤں کے آدمی اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ عورتیں اور بچے باہر نکل آتے تھے۔ لڑکا دوڑتا چلا گیا اور کہیں غائب ہو گیا۔

بہت دیر بعد میدان میں اور اِدھر اُدھر جتنی بھیڑ بکریاں، چار پانچ گائیں اور دو تین بھینسیں بکھری ہوئی چر چگ رہی تھیں وہ اس ٹیکری کی طرف آنے لگیں جس پر کمانڈو پارٹی چھُپی ہوئی تھی۔ وہ قریب آئیں تو دیکھا کہ اُن کے پیچھے تین عورتیں آ رہی تھیں۔ وہی انہیں ہانک کر لا رہی تھیں۔ مویشی تو نیچے چرنے لگے، عورتیں ایک ایک کر کے اوپر آ گئیں۔ ایک نے ایک گٹھڑی سی اٹھا رکھی تھی اور دو کے پاس مٹی کی ڈولیاں اور مٹی کے پیالے تھے۔ انہوں نے اوپر آ کر گٹھڑی رکھی۔ دوسریوں نے ڈولیاں اور پیالے رکھے اور تینوں کچھ کہے بغیر ٹیکری سے اُتر گئیں۔

گائیڈ عبدالرحمٰن اور عطا اللہ پیٹ کے بل آگے بڑھے۔ انہوں نے گٹھڑی، ڈولیاں اور پیالے گھسیٹ لیے۔ گٹھڑی میں مکئی کی روٹیاں اور مکھن تھا اور ڈولیوں میں لسّی تھی۔

*

سورج غروب ہُوا تو ساری پارٹی ایک جھونپڑے میں فرش پر بیٹھی تھی۔ فرش پر میزبانوں نے کھیس اور چادریں بچھا دی تھیں۔ گاؤں والوں نے زخمیوں کی مرہم پٹی اپنے انداز اور اپنی دوائیوں سے کر دی تھی۔ کمانڈو مہمان کھانا کھا کر قہوہ پی رہے تھے۔ انہیں مصدّقہ اطلاع مل گئی تھی کہ انڈین آرمی کی جو پلاٹون دن کو یہاں سے گزری تھی وہ کم و بیش دس میل آگے چلی گئی ہے۔

گاؤں کا دادا بڑی صاف اُردو بول رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ دن کو ہندو فوجی افسروں نے انہیں باہر بُلا کر کہا تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجی چوری چھپے سرحد کے اندر آ جاتے ہیں اور نقصان کرکے

چلے جاتے ہیں۔ ان ہندو افسروں نے انہیں ڈراتے ہوتے کہا تھا کہ جن کشمیریوں نے اُن کی مدد کی ہے ان کے گھروں کو آگ لگاکر انہیں اس آگ میں زندہ جلا دیا گیا ہے۔ ہندو افسروں نے انہیں یہ بھی کہا تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجی جو شلواریں اور قمیضیں پہن کر ادھر آتے ہیں وہ گاؤں کو بھی لُوٹتے ہیں اور جو لڑکی انہیں اچھی لگے اُسے اُٹھا لے جاتے ہیں، اس لیے کوئی دیہاتی ان کی مدد نہ کرے بلکہ انہیں گرفتار کرایا جاتے اور گرفتار کرانے والے کو نقد انعام ملے گا۔

"میں جانتا ہوں انہوں نے کشمیر میں کتنے گاؤں جلا ڈالے ہیں"— بوڑھے دادا نے کہا— "لیکن ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کی راہ میں گھر جلوانے کا جو انعام اللہ دیتا ہے وہ کوئی بندہ نہیں دے سکتا، لیکن میرے عزیزو! پاکستان اور آزاد کشمیر پر حکومت کرنے والوں تک میری یہ بات پہنچا دینا کہ ہمیں آزاد کراؤ یا اعلان کر دو کہ کشمیر کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ اگر آج ہم ہندوؤں کی حکومت سے کہہ دیں کہ ہم پاکستان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں تو ہماری ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں، مگر ہم تمہارے منہ کی طرف دیکھ رہے ہیں ... ہر کوئی کہتا ہے کہ انسان مرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ کشمیر کے لوگ ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لیے پیدا ہوتے ہیں ....

"ہم مرنے سے نہیں ڈرتے۔ اگر ہم ڈرنے والے ہوتے تو تم سب اس وقت یہاں نہ بیٹھے ہوتے ہندو کی فوج کے پاس اُلٹے لٹکے ہوئے ہوتے۔ تم نہیں جانتے کہ تمہیں یہاں بٹھا کر ہم نے وہ جرم کیا ہے جس کی سزا گاؤں کے بچّے سے بوڑھے تک کی موت ہے لیکن تمہیں پناہ دینے اور سرحد سے صحیح سلامت نکالنے کے لیے سارا گاؤں جاگ رہا ہے۔ گاؤں کے لڑکے گاؤں سے دُور تک پہرے پر گھوم پھر رہے ہیں خطرہ آتا نظر آئے گا تو وہ گیدڑوں کی طرح بولیں گے اور ہم تمہیں ان پہاڑوں میں غائب کر دیں گے۔ ہم تم سے کوئی قیمت نہیں مانگتے۔ ہم ہندو سے آزادی مانگتے ہیں۔ اس کے لیے ہم سے جو بھی قیمت مانگتے ہو ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔ جتنا خون مانگتے ہو ہم دیں گے۔"

"اب کشمیر آزاد ہو کے رہے گا"— کیپٹن اصغر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا— "ہم یہاں تمہاری آزادی کے لیے جانیں قربان کرنے آئے ہیں۔"

"تم ابھی بہت چھوٹے ہو بیٹا!"— دادا نے کہا— "میں نے کچھ اور دیکھا ہے۔ اب بھی ایسے ہی نہ ہو۔"

کیپٹن اصغر اور نائب صوبیدار اسلم نے جذباتی باتیں شروع کر دیں لیکن گاؤں کا دادا جو سارے کشمیر کا دادا لگتا تھا مسکراتا رہا، پھر تھکے ماندے کمانڈو اونگھنے لگے اور سب سو گئے۔

*

ملک رجب علی خان اور ملک ناصر آدھی رات کے وقت ایک دعوت سے واپس آ رہے تھے۔ ملک ناصر ولائتی وِسکی کے نشے میں کچھ نہ کچھ بولتا آ رہا تھا۔ ملک رجب علی نے بھی دو چار گھونٹ پی لی تھی۔ وہ ہوش میں رہنا چاہتا تھا۔ اُسے کچھ سُننا تھا، کچھ دیکھنا تھا۔ چہرے پہچاننے تھے۔ ان چہروں پر نظر نہ آنے والے نقاب تھے۔ اُسے یہ نقاب پہچاننے تھے۔

دعوت کا اہتمام محل جیسی ایک کوٹھی میں کیا گیا تھا۔ مہمان صرف چھ تھے۔ ساتواں میزبان تھا۔ ان سات

میں تین بڑی ہی شوخ اور بہت ہی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ ملک ناصر نے رجب علی کا تعارف کرایا تو سب سے پہلے لڑکیوں نے آگے ہو کر باری باری اُس سے ہاتھ ملاتے، پھر ایک لڑکی نے اُسے تنہا نہ چھوڑا۔ تمام وقت اُس کے ساتھ رہی۔ دوسرے مہمانوں نے بھی رجب علی میں زیادہ دلچسپی لی۔ رجب علی نے اس لڑکی سے نام پتہ پوچھا۔

"شنازی کہہ لیا کریں"— لڑکی نے کہا— "اتا پتہ پُوچھ کے آپ کیا کریں گے ... ملک ناصر نے بتایا تھا کہ آپ بڑے زندہ دل انسان ہیں۔ آئیں، باہر لان میں ذرا ٹہلتے ہیں۔ گلاس اور بوتل وہیں لے چلتے ہیں ملک ناصر نے بتایا تھا کہ آپ بلانوش ہیں۔"

"کبھی تھا"— رجب علی نے کہا— "اب نہیں۔"

"میرے ہاتھ سے بھی نہیں"؟

"نہیں۔"

"میں شاید آپ کو اچھی نہیں لگی"— شنازی نے کہا— "مجھ میں کیا خامی دیکھی ہے آپ نے؟"

"صرف یہ کہ تم میری بیوی نہیں ہو"— رجب علی نے کہا— "میری بیوی تم جیسی جوان نہیں لیکن تم سے زیادہ خوبصورت ہے۔"

"آپ نے دوسری شادی کی ہے نا!"— لڑکی نے کہا— "آپ مُردہ دِل ہو گئے ہیں .... سُنا ہے آپ بہت بڑے زمیندار ہیں۔"

"لاہور میں میری کوٹھی اس کوٹھی سے زیادہ بڑی اور اس سے زیادہ خوبصورت ہے"— رجب علی نے کہا— "میری زمین اتنی ہے جو مجھے کاغذوں میں دیکھنا پڑتا ہے کہ کتنی ہے۔"

لڑکی اُس کے اور قریب ہونے لگی۔ رجب علی پولیس آفیسر رہ چکا تھا۔ اُس نے ایسی باتیں کیں کہ لڑکی جان گئی کہ اس شخص پر اُس کے حسن و جوانی، اس کے ناز و انداز اور اس کی شوخیوں کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا۔ لڑکی اُسے اپنے کسی اور جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ آخر عورت تھی۔ عورت ایسی چوٹ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ اُسے کوئی مرد کہے کہ فلاں عورت کے مقابلے میں تم کچھ بھی نہیں ہو۔

کچھ وقت گزرا تو شنازی ملک رجب علی خان کے جال میں آ گئی اور وہ اُسے لان میں لے گیا۔

"تمہیں ابھی مزید ٹریننگ کی ضرورت ہے"— رجب علی نے کہا۔

"کیسی ٹریننگ؟"

"شنازی!"— رجب علی نے کہا— "میں تمہارا ساتھی ہوں۔ اگر ملک ناصر نے تمہیں میرے متعلق کچھ اور بتایا ہے تو وہ غلط ہے۔ میری فیلڈ کچھ اور ہے۔ وہ تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ میں تمہارا امتحان لیتا رہا ہوں۔ تم نے مجھے مایوس کیا ہے۔"

"میں کہیں بھی ناکام نہیں ہوئی"— لڑکی نے کہا— "ملک ناصر سے پُوچھ لیں"۔

"تمہارا اصلی نام کیا ہے؟"

"شناز یہ ہی اصلی نام ہے"— لڑکی نے کہا— "اب آپ ہمارے ساتھ رہیں گے یا اپنی فیلڈ میں چلے جائیں گے؟"

"کچھ دِن یہیں رہونگا۔۔۔ ملک ناصر نے تمھیں میرے متعلق کیا بتایا تھا؟"

"کہتا تھا کہ یہ شخص کام کا ہے" — لڑکی نے کہا "لیکن پاکستانی ہوگیا ہے۔ اسے اپنے رنگ میں لینا ہے"

رجب علی نے قہقہہ لگایا اور بولا — "ناصر شیطان چیز ہے۔"

"آپ پہلے آدمی ہیں جو میرے دل کو اچھے لگے ہیں" — شازی نے کہا — "یہ بات میرے دل سے نکلی ہے۔ اسے پیشہ ورانہ بات نہ سمجھئے گا۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کوئی ہو جس کے ساتھ دل کی باتیں کیا کروں"

"اگر مجھے سُنانا چاہتی ہو تو سنوں گا" — رجب علی نے کہا — "لیکن آج نہیں۔"

"کیا آپ واقعی بہت بڑے زمیندار ہیں ؟"

"میں نے اپنے متعلق تمہیں کوئی بات غلط نہیں بتائی" — رجب علی نے کہا — "میری بیوی بھی ہے لیکن تم مجھے اپنا ہمدرد اور ہمراز سمجھ سکتی ہو۔"

رجب علی اور ملک ناصر صبح بہت دیر سے جاگے۔ رجب علی نے ناصر سے پہلی بات یہ کہی — "یار! اتنا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟۔۔۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے جس طرح بھی استعمال کرنا چاہو کرو۔ میں کہاں کا سچا پاکستانی ہوں۔"

ملک ناصر نے لپک کر اُسے گلے لگالیا۔

طاہر پرویز بے چین تھا۔ طاہرہ جو اُس کی بے چینی پر خوش ہُوا کرتی تھی اب کچھ پریشان سی ہونے لگی تھی۔ اُس نے اور ارشد نے طاہر پرویز کو کچھ سال پہلے بتا دیا تھا کہ وہ عفّت کا بیٹا ہے اور عفّت اُس کے پیدا ہوتے ہی مرگئی تھی۔ اس انکشاف پر طاہر پرویز کا ردِعمل یہ تھا کہ اُس پر سکتہ سا طاری ہوگیا تھا اور اُس کی نظریں خلاء میں کسی نقطے پر جم گئی تھیں جیسے تصوّر میں اپنی ماں کو دیکھ رہا ہو۔ اُس کی آنکھیں خشک رہیں اور ہونٹ اَدھ کھلے رہے۔

طاہرہ کے آنسو اُمڈ آئے تھے۔ ارشد کی آنکھیں آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں سرخ ہوگئی تھیں۔ ارشد نے لپک کر طاہر پرویز کو اپنے ساتھ لگالیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ طاہر پرویز طاہرہ کے آنسو دیکھ لے۔ طاہر پرویز کی پیٹھ پھرتے ہی طاہرہ نے بڑی تیزی سے اپنے آنسو دوپٹے میں جذب کرلیے تھے۔

طاہر پرویز کی عمر اُس وقت نو دس سال تھی۔ اُس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ابھی اتنا نہیں تھا کہ اس انکشاف پر جو رنج والم سے بھرپور تھا، وہ اپنے ردِعمل کا اظہار کرسکتا مگر دھچکہ اتنا شدید تھا کہ اُس کی زبان پر الفاظ آگئے۔

"ماں اپنی زندگی مجھے دے گئی ہے" — اُس نے کہا تھا۔

"ہم سب نے اپنی اپنی زندگی تمھیں دے دی ہے طاہری!" — طاہرہ نے کہا — "ہم سب میں، تمھارے ابّو، دادا جان، دادی جان، تمھارے لیے زندہ ہیں۔"

طاہر پرویز ارشد کے بازوؤں سے نکل کر طاہرہ کے سینے سے جا لگا جیسے اُس کی مری ہُوئی ماں اپنا پیار اِس سینے میں رکھ گئی ہو۔ یہ محض خیال ہی نہیں تھا۔ اُس کی ماں اپنی تمام تر ممتا طاہرہ کے سینے میں چھوڑ گئی تھی۔ اُس کی موت کے وقت طاہرہ اُس کے پاس نہیں تھی۔ صرف یہ نہیں کہ طاہرہ اتنی دور تھی کہ عفّت کے آخری وقت پہنچ نہ سکی بلکہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

عفّت نے ہسپتال کے لیبر روم میں ارشد سے کہا تھا — "میں زندہ نہیں رہوں گی ارشد! طاہرہ جہاں کہیں ہے اُسے ڈھونڈ لانا اور میرا بچّہ اُسے دے دینا۔"

طاہرہ اُس وقت آئی تھی جب بچہ چھ سات سال کا ہوگیا تھا۔ ارشد اِس عرصے میں اُس کے ذہن میں یہی ڈالتا رہا تھا کہ طاہرہ اُس کی امّی ہے اور وہ آجائے گی۔ پھر طاہرہ آگئی اور اُس نے طاہر پرویز کو ایسا دیوانہ وار پیار دیا کہ بچّے کو یہ پوچھنے کی بھی ہوش نہ رہی کہ امّی! آپ اتنا عرصہ کہاں رہی ہیں؟

ارشد ہوشمند تھا۔ ارشد کا باپ بھی عقلمند تھا۔ اُنہوں نے طاہر پرویز پر پیار کا نشہ طاری کیسے رکھا۔ اتنا زیادہ پیار بچوں کو بگاڑ دیا کرتا ہے۔ ان کی شخصیّت کمزور رہ جاتی ہے۔ بڑے ہوکر بھی وہ بچپنے سے دستبردار نہیں ہوتے۔ ارشد نے اس خطرے کو بھانپتے ہُوئے طاہر پرویز کو اُسی عمر میں پاکستان کی کہانیاں سنانی شروع کردی تھیں جب اُس کی توتلی زبان پاکستان کو پتان کہا کرتی تھی۔ بچہ جُوں جُوں بڑا

ہوتا گیا "پاکستان" اور "مسلمان" اُس کے خون میں شامل ہوتے گئے۔ پھر اُس نے خود پوچھنا شروع کر دیا کہ یہ کیسے ہُوا، وہ کیونکر ہُوا۔ پھر اُس کے ذہن میں دشمن کا تصور واضح ہو کر آ گیا مگر اُس کی ایک فرمائش ایسی تھی جو پوری نہ کی جاسکی۔ اُس نے بچپن میں کہا تھا کہ ابّو! مجھے ہندو دکھلائیں۔

"بیٹا!"— ارشد نے یہ جانتے ہُوئے کہ بچہ اُس کی بات نہیں سمجھ سکے گا، کہا تھا— "ہندو اپنا آپ کبھی خود ہی دکھائے گا"— پھر اُس نے کہا تھا— "ہندو یہاں نہیں ہوتے طاہر!"

"چڑیا گھر میں بھی نہیں؟"

ارشد ہنس ہنس کے دوہرا ہو گیا تھا۔

اور اب طاہر پرویز دانت پیس پیس کر کہنے لگا تھا— "میں ہندو کو بہت قریب سے دیکھوں گا۔"

▼

طاہر پرویز کی بے چینی کا سبب یہی تھا۔ وہ عمر کے سولہویں سال میں داخل ہو چکا تھا۔ رن کچھ کا معرکہ لڑا جا چکا تھا۔ ہندو پاکستان کو اپنی مرضی کے میدان میں لڑانے کی دھمکی دے چکا تھا۔ اصغر کیپٹن بن گیا۔ طاہر پرویز پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اُس نے ارشد کا اور دادا جان کا ناک میں دم کر رکھا تھا کہ اُسے فوج میں بھرتی کرا دیا جائے۔ سب اُسے کہہ چکے تھے کہ اُس کی عمر ابھی پُوری نہیں ہُوتی۔

کشمیر کے کمانڈو اپریشن کی کہانیاں بھی طاہر پرویز کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ لوگ بڑی جذباتی کہانیاں سناتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں ہمارے کمانڈو جانباز شجاعت اور جذبۂ حب الوطنی کے حیران کن مظاہرے کر رہے تھے لیکن لوگوں نے ایسی کہانیاں گھڑ لی تھیں کہ چھاپہ ماروں کو جنّات اور اسی قسم کی مافوق الفطرت مخلوق بنا دیا تھا۔ کشمیر کی عورتوں اور بچوں کے کارنامے بھی سُننے اور سنائے جاتے تھے جو اس قدر جذباتی تھے کہ سننے والوں کے آنسو نکل آتے اور خون کھولنے لگتا تھا۔

طاہر پرویز مٹھیاں بھینچتا، دانت پیستا اور اپنی ہتھیلی پر مُکّے مار کر بات کرتا تھا۔

"امّی!"— ایک روز اُس نے طاہرہ سے کہا— "دادا جان مجھے فوج میں بھرتی کرا سکتے ہیں نہیں کہیں مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔ نہ لے گئے تو میں خود کشمیر چلا جاؤں گا۔"

طاہرہ نے ارشد کو بتایا۔ دونوں نے مل کر اُسے ٹھنڈا کرنے کے لیے بہت کچھ کہا اور اُسے بتایا کہ پاکستان کے لیے اُسی کو اور اُسی جیسے نوجوانوں کو لڑنا ہے لیکن جذبات سے نہیں عقل سے۔

"آپ نے میری عقل میں جو کچھ ڈالا تھا وہ مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا"— طاہر پرویز نے کہا— "مجھے آوارہ چھوڑ دیتے۔ میں گلیوں میں ان لڑکوں کے ساتھ کھیلتا رہتا جو سگریٹ پیتے ہیں، جوّا کھیلتے ہیں فلمیں دیکھتے ہیں، گالیوں کی زبان میں بات کرتے ہیں، سکول سے آزاد ہیں۔"

ارشد اور طاہرہ کے پاس جتنی دلیلیں تھیں انہوں نے دے ڈالیں۔ ان سے طاہر پرویز ٹھنڈا تو ہو گیا لیکن اُس کی بے قراری نہ گئی۔ اُس رات طاہرہ نے اُسے جاگتے اور کروٹیں بدلتے دیکھا تو وہ پریشان ہو گئی۔ اُسے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ لڑکا ابنارمل ہو گیا ہے۔ طاہرہ کو بڑا تلخ خیال آیا کہ طاہر پرویز کو یہ سوچ تنگ نہ کر رہی ہو کہ اُس نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ ایسی محرومی بعض بچوں کے ذہن لاشعور میں اُتر کر انہیں ابنارمل بنا دیا کرتی ہے۔

طاہرہ نے مامتا میں کوئی کمی تو نہیں رہنے دی تھی۔ وہ اپنے بچوں سے زیادہ طاہر پرویز سے پیار کرتی تھی گھر میں اہمیت طاہر پرویز کو ہی دیتی تھی مگر اُس کی یہ بے چینی غیر معمولی سی تھی۔ طاہرہ کا باپ جمال بیگ اُس کے ساتھ رہتا تھا۔ دوسرے دن اُس نے باپ کو بتایا کہ طاہر پرویز پاکستان کے معاملے میں جذباتی ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اُس کی ذہنی حالت یہی رہی تو وہ فوج میں افسر نہیں بن سکے گا۔ طاہرہ نے اپنے باپ کو یہ خطرہ بھی بتایا کہ لڑکا شاید اپنی ماں کے خیال میں اُلجھا رہتا ہے۔

"میں سنبھال لوں گا"— جمال بیگ نے کہا— "خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ پاکستان کے معاملے میں جذباتی ہے کسی کی محبّت کے معاملے میں نہیں۔ اس عمر میں لڑکے فلموں کے ہیرو بن جایا کرتے اور تصوّروں کی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔"

▼

جمال بیگ بھی طاہرہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اُسے ہر بچے سے پیار تھا لیکن طاہر پرویز کے ساتھ اور طاہرہ کے دوسرے بچوں کے ساتھ تو اُسے والہانہ پیار تھا۔ چھوٹے بچوں کے لیے وہ کوٹھی کے لان میں گھوڑا ہی بنا رہتا تھا۔ ایک روز طاہر پرویز اپنے تین چار دوستوں کو ساتھ لے آیا۔ یہ اُس کے ہم جماعت تھے اور اُسی کی طرح جوشیلے اور جذباتی۔ طاہر پرویز جمال بیگ سے متاثر تھا۔ جمال بیگ نے کتابیں تو نہیں پڑھی تھیں، انسان اور حالات پڑھے اور اپنی ذات کا مطالعہ کیا تھا۔ اُس کی باتوں میں علمیت کم اور حقائق زیادہ ہوتے تھے۔

"نانا!"— طاہر پرویز نے جمال بیگ سے کہا— "میں انہیں آپ کے پاس لایا ہوں۔ یہ بھی میری طرح پاکستان پر قربان ہونا چاہتے ہیں۔"

جمال بیگ کو طاہرہ بتا چکی تھی کہ طاہر پرویز ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو گیا ہے اور پاکستان کے علاوہ شاید اپنی ماں کے خیال میں اُلجھا رہتا ہے جمال بیگ نے، اسی کے پیش نظر ان لڑکوں سے بات کی۔

"جذبات کو عقل کی راہنمائی کی ضرورت ہے میرے بچو!"— جمال بیگ نے کہا— "تاریخ اسلام نے ایسے جرنیل پیدا کیے ہیں جنہیں اسلام کے دشمن بھی یاد کرتے ہیں۔ طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، صلاح الدّین ایوبی، محمود غزنوی کے نام تمہاری زبان پر چڑھے ہُوئے ہُوں گے۔"

"ہمیں ان کے کارنامے زبانی یاد ہیں"— ایک لڑکے نے کہا۔

"ایسے کارنامے تم بھی دکھا سکتے ہو"— جمال بیگ نے کہا— "لیکن تمہیں اپنے اندر اُن جیسے اوصاف پیدا کرنے ہوں گے۔ پہلا وصف یہ کہ وہ جذباتی نہیں تھے اور دوسرا یہ کہ وہ قربان نہیں ہونا چاہتے تھے۔"

لڑکوں نے جمال بیگ کو چونک کر دیکھا۔

"ہاں... میں جانتا تھا تم حیران ہو گے"— جمال بیگ نے کہا— "قربان ہونے کا مطلب ہے جان دے دینا... جان دینا کوئی مشکل نہیں مشکل کام جان لینا ہے۔ مورچے کے باہر کھڑے ہو جاؤ۔ دشمن کی گولی آئے گی اور لوگ کہیں گے کہ یہ لڑکا اپنے وطن پر قربان ہو گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ لڑکا ضائع ہو گیا ہے۔ ضرورت یہ تھی کہ یہ لڑکا دشمن کو ڈھونڈتا اور وہ کوشش کرتا کہ مرنے سے پہلے دشمن کے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو مار ڈالتا۔ اگر محمد بن قاسم کو جان قربان کرنے کی جلدی ہوتی تو وہ ہندوستان تک نہ پہنچتا۔"

میدان میں اترنے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ تم نے اپنے وطن اور اپنے مذہب پر جان کی بازی لگادی ہے۔ صرف یہ دیکھو کہ تم جان لے کر بھاگ نہ آؤ بلکہ کوشش کرو کہ بازی جیت لو۔ جان جاتے تو دشمن کی جاتے تمھاری نہ جاتے۔ فتح حاصل کرنے کے لیے جان دینے کی ضرورت پڑے تو دے دو....

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کٹ مرنے کی باتیں کرتے ہو۔ کاٹنے اور مارنے کی بات کرو..... طارق بن زیاد، محمد بن قاسم وغیرہ دشمن کا صفایا کرنے کا عزم لے کر نکلے تھے۔ اُنہوں نے راہنمائی اپنے جذبات سے نہیں اپنی عقل سے لی تھی۔ جذبات میں گرمی ہونی چاہیئے جیسے چنگاری۔ انہیں بھک سے اُڑجانے والا بارود نہ بننے دو۔"

"سکولوں اور کالجوں کے لڑکوں کو لیڈر بارُود بنا دیتے ہیں" — ایک لڑکے نے کہا۔

"سیاسی لیڈر تمھاری اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں جسے جذباتیت کہتے ہیں" — جمال بیگ نے کہا — "وہ گھاگھ ہیں۔ منجھے ہوئے اُستاد ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تم کچھ کرنے کے لیے، کچھ کر گزرنے کے لیے بے تاب ہو اور تم جذباتی ہو۔ وہ تمھارے جذبات کو بھڑکا دیتے ہیں تم سمجھتے ہو کہ اُنہوں نے تمہیں منزل دکھادی ہے، یا دشمن کا وہ قلعہ دکھا دیا ہے جسے سَر کرنا ہے۔ تم جذبات سے اندھے ہو کر ٹوٹ پڑتے ہو۔ ہنگامہ خیز جلوس نکالتے اور توڑ پھوڑ کرتے ہو۔ دو چار روز یہ سلسلہ چلتا ہے پھر تمہیں پتہ چلتا ہے کہ تم کسی منزل پر نہیں پہنچے اور تم نے کوئی قلعہ سَر نہیں کیا۔ یہ تو سیاستدانوں کا اپنا ایک کھیل تھا جو وہ کھیل کر ایک طرف ہو گئے ہیں۔ یہ اُن کی سیاسی مفاد پرستی تھی۔"

"جذبات پھر بھی لازمی ہیں" — طاہر پرویز نے کہا — "یہ لڑکے جو سکول نہیں جاتے، گلیوں میں آوارہ پھرتے رہتے ہیں، آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں، گالی گلوچ کرتے ہیں، لوگوں کے گھروں میں نوکریاں اور چوریاں کرتے ہیں، ان میں ہر برائی ہوتی ہے۔ ان سے آپ توقع نہیں رکھ سکتے کہ یہ پاکستان کے لیے کچھ کریں گے۔ تعداد انہی کی زیادہ ہے۔ ان کے ماں باپ غریب ہیں۔ ان کا ایمان ان کے پیٹ کا پابند ہے۔ یہ جو غلیظ محلّوں اور جھگیوں میں رہتے ہیں یہ پاکستان کے لیے کیا کریں گے۔ ہمیں پریشانی یہ ہے کہ جو کچھ کرنا ہے وہ ہمیں ہی کرنا ہوگا۔ ہمارے پاس تعلیم ہے۔ ہم اتنے اچھے مکانوں میں رہتے ہیں۔"

"تم ابھی بچے ہو نا طاہری بیٹا!" — جمال بیگ نے کہا — "کیا طاہرہ امّی نے اور ابّو نے تمہیں بتایا نہیں کہ پاکستان بنانے والوں میں انہی جیسے لڑکے شامل تھے جو گلیوں میں آوارہ پھرتے، گالی گلوچ کرتے ہیں اور جن کے ماں باپ غریب تھے اور وہ جھگیوں میں رہتے تھے؟ آج ان کے بچے گلیوں میں گالی گلوچ کرتے پھرتے ہیں۔ پہلے وہ ہندوستان کی جھگیوں میں رہتے تھے۔ انہوں نے پاکستان بنایا اور ہندوستان سے آکر پاکستان کی جھگیوں میں رہنے لگے۔ ملک وملّت کی خاطر قربانی کے جذبے کے لیے امیر یا غریب ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ ہُوا یوں تھا کہ آزادی کی جنگ میں غریب اور آوارہ لوگ سب سے آگے تھے۔ اب بھی وہی آگے ہوں گے۔ اِدھر اُدھر سے ہتھیائی ہُوئی دولت والوں اور جاگیروں کے مالکوں کے بیٹے نہ اُس وقت میدان میں نظر آتے تھے نہ اب نظر آئیں گے... کسی کو آوارہ اور بیکار نہ سمجھو۔ وقت آیا تو سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں گے۔ میں نے ایسا ہوتے دیکھا ہے۔"

"ایسا کیونکر ہوتا ہے نانا!" — طاہر پرویز نے پوچھا۔

"یہ نصب العین کا کمال ہے بیٹا!" — جمال بیگ نے کہا — "اُس وقت ہمارے سامنے یہ نصب العین تھا کہ انگریزی راج سے آزادی حاصل کرنی ہے۔ ہندو کی عیاری اور فریبکاری سے بچنا ہے اور اپنی ایک آزاد اسلامی مملکت بنانی ہے۔ یہ ایک محاذ تھا جس پر ہر کوئی جمع ہو گیا تھا۔ رن کچھ کی لڑائی نے ہمیں ایک اور نصبُ العین دے دیا ہے۔ تم دیکھنا کہ یہی آوارہ بدمعاش تمھارے ساتھ ہوں گے۔ کسی کو حقیر نہ سمجھو میرے بچّو! اپنی قوم کو تم گمراہ اور بھٹکا ہُوا نہ سمجھو۔ جس قوم سے منزل چھپالی جائے اور جس سے نصب العین اور قومی مقصد چھین لیا جائے وہ اسی طرح بھٹک جایا کرتی ہے۔"

جمال بیگ نے بڑے پیار سے باتیں کر کے طاہر پرویز اور اُس کے دوستوں کو جذباتی قسم کے جوشیلے پن سے نکال لیا۔

▼

اصغر کی تیرہ جوانوں کی کمانڈو پارٹی مقبوضہ کشمیر کے اُس گاؤں میں جہاں انہیں ایک گڈریا لڑکا لے گیا تھا، گہری نیند سوگئی تھی۔ گاؤں کے جوان آدمی جاگ رہے تھے۔ اُنہوں نے ساری رات گاؤں کے اردگرد گھومتے، بلندی پر جاتے، اُترتے، گاؤں کے قریب سے گزرنے والے راستے پر کبھی اِدھر کبھی اُدھر جاتے اور بھارتی فوجیوں کی مُشک لیتے گزار دی۔

گاؤں کی عورتوں نے دادا کے کہنے پر آدھی رات کے بعد اصغر کی پارٹی کے لیے کھانا تیار کر دیا تھا کیونکہ اصغر نے کہا تھا کہ وہ سحر کی تاریکی میں روانہ ہو جائیں گے۔ پارٹی کو کچھ وقت کے آرام کی ضرورت تھی مگر سحر کی تاریکی چھٹ گئی۔ صبح کی سپیدی نکھر آئی۔ پارٹی کے کسی جوان کو ہوش نہیں تھی۔ سُورج پہاڑیوں پر آگیا تو بھی وہ سوتے رہے۔ وہ لاشوں کی طرح پڑے ہُوتے تھے۔

دادا انہیں جگانے کے لیے وقت پر آگیا تھا لیکن اُن کے خراٹے سُن کر دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ اُسے معلوم تھا کہ ان کے جسم بارش میں اتنی دیر رہنے سے اکڑ گئے ہوں گے اور کیچڑ اور پانی میں رات بھر چل چل کر ان کی ہڈیاں بھی دُکھ رہی ہوں گی۔ دادا نے بڑی آہستہ سے دروازہ بند کر دیا اور دروازے کے باہر بیٹھ گیا۔ وہ سورج کے اجالے کو نکھرتا اور ستاروں کو آسمان میں گم ہوتے دیکھتا رہا۔ جب صبح کی روشنی صاف ہو گئی تو وہ اُٹھا اور کواڑ بڑے آرام سے کھولا۔ اندر کسی کو ہوش نہیں تھی کہ اُن کی روانگی کا وقت گزر گیا ہے اور دن اپنے پُورے خطروں کے ساتھ روشن ہو گیا ہے۔ دادا کواڑ بند کر کے اندر کواڑ کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور اُس کی نگاہیں سوئے ہُوئے جوانوں پر گھومنے لگیں۔

بوڑھے دادا کے مرجھائے ہُوئے گلابی چہرے پر کشمیر کی تاریخ لکھی ہُوئی تھی۔ اُسے اپنے سامنے سوئے ہوئے جوان لاشیں لگ رہے تھے۔ اگر اُس کے سامنے یہ تیرہ جوان لاشیں ہی ہوتے تو بھی وہ حیران نہ ہوتا۔ کشمیر ڈیڑھ سو برسوں سے لاشوں کا دیس بنا ہُوا تھا۔ چلتے پھرتے انسان بھی لاشیں ہی لگتے تھے۔ دادا کو ۱۹۴۷ء کی لاشیں یاد آنے لگیں پھر اُسے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کی جنگِ آزادی یاد آئی۔ اٹھارہ سال پہلے وہ اتنا بوڑھا نہیں تھا۔ اُس کے پاس رائفل نہیں تھی جو اُس کے

پاس کبھی بھی نہیں ہُوئی تھی لیکن وہ اس جنگ میں شریک تھا مگر اس جنگ نے بھی اُسے لاشوں کے سوا کچھ نہ دیا — لاشیں مجاہدین کی، لاشیں بچوں کی، لاشیں بوڑھوں کی، لاشیں عورتوں کی — اُس کا خطّہ غلام ہی رہا۔

"آج تم آتے ہو" — اُس نے دل ہی دل میں اصغر کی سوئی ہُوئی پارٹی سے کہا۔ "کہاں سے آتے ہو تم؟ کہاں کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتا، تم مجھے نہیں جانتے مگر دل دلوں کو جانتے ہیں۔ خون کے رشتوں کو پہچانتے ہیں۔ تم سینوں میں ہمارا درد لے کر آتے ہو۔ ہم تمہارے سینے پر آنے والی گولی اپنے سینے میں لے لیں گے .... سوتے رہو میرے بچو! تمہارے جسم ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ آج تم سانس لے رہے ہو۔ جانے کب تمہارا سانس رک جاتے اور تمہارے لہولہان جسم، خون سے خالی ہو کر جانے کہاں کہاں پڑے ہوں .... تم ستارے ہو۔ ایک ایک کر کے ٹوٹ جاؤ گے اور آخری بار چمک کر اندھیرے آسمان میں گم ہو جاؤ گے .... سوتے رہو، گہری نیند سوتے رہو۔ دن کو تم پر آنے والے ہر خطرے کو ہم اپنے اوپر لیں گے۔ تم میرے بچے ہو۔ میں تمہیں جگاؤں گا نہیں۔ تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ تمہارے چہروں کو اپنی آنکھوں میں سمو لوں گا۔ چلے جاؤ گے پھر جانے کب آؤ گے۔ تمہیں شاید پھر کوئی اِدھر نہیں آنے دے گا۔ دشمن تمہیں راستہ دے دے گا، تمہارے اپنے بادشاہ تمہارا راستہ روک لیں گے، اور تمہارے وہ ساتھی جن کی لاشیں پیچھے چھوڑ چلے ہو اُن کے ناموں پر لکیریں پھر جائیں گی۔ انہیں اُن کے گھر والوں کے سوا کوئی یاد تک نہیں رکھے گا۔"

دادا کی نگاہیں ان پر گھومتی رہیں اور وہ سب اُس کے آنسوؤں میں جھلمل جھلمل کرنے لگے جیسے جھیل میں کسی نے کنکری پھینک دی ہو۔

کیپٹن اصغر کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی دیکھی اور دروازے کی طرف دیکھا تو اُسے دادا بیٹھا نظر آیا۔

"ہمیں جگایا کیوں نہیں؟" — اُس نے دادا سے پوچھا۔

"مت گھبراؤ بیٹا!" — دادا نے التجا کے لہجے میں کہا — "تم پھر یہاں کبھی نہیں آؤ گے۔"

"آنے کی بات بعد میں کرنا پہلا مسئلہ تو یہاں سے جانے کا ہے" — اصغر نے تیز تیز بولتے ہُوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ کہنے لگا — "اس وقت تک ہم بہت دور نکل گئے ہوتے۔"

اصغر نے نائب صوبیدار اسلم کو جگایا۔ وہ بھی گھبرایا ہُوا اُٹھا اور معافی طلب نگاہوں سے اپنے کیپٹن کو دیکھنے لگا۔ اصغر نے اُسے بھی کہا کہ دادا نے انہیں جگایا نہیں۔ نائب صُوبیدار اسلم نے دادا کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

"میں نے تمہیں کوئی دھوکہ نہیں دیا" — دادا نے ملتجی لہجے میں کہا — "تمہیں اتنی ظالم تھکن میں بیہوش پڑے دیکھ کر جگانا مناسب نہ سمجھا۔ گھبراؤ نہیں۔ یہاں سے تم سب کو نکالنا ہمارا فرض ہے .... اگر میں نے تمہارا نقصان کیا ہے تو مجھے معاف کر دینا" — وہ اٹھا — "میں کھانا لے آؤں" — اور وہ باہر نکل گیا۔

اصغر نے اور اسلم نے سب کو جگا دیا۔ اتنے میں تین چار آدمی مکئی کی روٹیاں جن پر مکھن رکھا تھا، اٹھائے ہوئے کمرے میں آئے۔ دودھ آیا پھر قہوہ آیا۔

"کیا تم رات کو ہی جا سکتے ہو؟" — دادا نے پوچھا۔

"دن کو مروانا ہے ہمیں؟" — اصغر نے کہا۔

"ہم تمہیں دن کو بھی نکال سکتے ہیں" — دادا نے کہا — "یہ ہمارا کام ہے۔ ہم گاؤں کے بچے بچے کو تمہاری خاطر مروا دیں گے۔ رات کو ہی جانا ہے تو دن بھر یہیں رہو۔"

"میں تم لوگوں کو خطرے میں نہیں ڈالوں گا" — کیپٹن اصغر نے کہا — "جس طرح کل فوجی افسر یہاں آ گئے تھے آج بھی آ سکتے ہیں۔ ہم اُن کا بہت نقصان کر کے آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں کی فوج گاؤں گاؤں تلاشی لیتی یہاں آ جاتے۔ ہم لڑیں گے مگر سزا تمہیں ملے گی۔ اس گاؤں میں عورتیں ہیں۔ جوان لڑکیاں بھی ہیں۔ ہمیں کسی ایسے راستے پر ڈال دو جدھر فوج نہ ہو۔"

"دونوں زخمیوں کو یہیں چھوڑ جاؤ" — دادا نے کہا — "انہیں اٹھا کے چلو گے تو تیز نہیں چل سکو گے۔ ہم ان کے زخم ٹھیک کر کے آزاد کشمیر میں پہنچا دیں گے۔"

"نہیں دادا!" — اصغر نے کہا — "جس روز یہ پکڑے گئے اُس روز اِس گاؤں پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ ہمیں جانا ہے۔ ہم سب کو جانا ہے۔"

▼

اور وہ چلے جا رہے تھے۔ گاؤں اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ دادا نے دونوں گائیڈوں کو ایک راستہ سمجھا دیا تھا۔ پارٹی اس راستے پر چلی جا رہی تھی۔ وہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ درختوں، جھاڑیوں اور اونچی گھاس سے لدی ہوئی اُونچی نیچی پہاڑیوں اور ٹیکریوں کے درمیان جہاں گھاس میں ڈھکی ہوتی دلدل بھی تھی، وہ گذرتے جا رہے تھے۔ دونوں زخمی جوانوں کو وہ باری باری پیٹھ پر اُٹھاتے ہُوتے چلتے جا رہے تھے۔ دونوں گائیڈ کہتے تھے کہ راستہ مشکل ہے لیکن محفوظ ہے اور سرحد دُور نہیں مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ اُن کے تعاقب میں بھارتی فوج کی پُوری پلاٹون آ رہی ہے اور یہ کمانڈو پلاٹون ہے۔

اگر صرف پُل ہی اُڑتا تو بھارتی برداشت کر لیتے۔ مقبوضہ کشمیر میں کئی پُل اڑ چکے تھے۔ یہاں تو پُل کے ساتھ اصغر کی پارٹی پُل کی دونوں پوسٹوں کو بھی تباہ کر آئی تھی۔ تباہی کی کہانی سنانے کے لیے صرف تین سپاہی زندہ رہ گئے تھے۔ وہ علاقہ جس بریگیڈ کی ذمہ داری میں تھا اُس کے کمانڈر نے غصے سے تھوک اُڑاتے ہُوئے حکم دیا تھا کہ پاکستانی ہیلی کاپٹروں پر نہیں آتے ہوں گے۔ وہ پیدل آئے تھے راستے میں ندی نالے بھی ہیں اور ساری رات بارش برستی رہی ہے۔ وہ اتنی تیز نہیں چل سکے ہوں گے کہ یہاں سے نکل گئے ہوں۔

وہ بھی آخر فوجی تھے۔ انہوں نے اندازہ کر لیا کہ کمانڈو پارٹی کے آنے اور واپس جانے کا ممکنہ راستہ کون سا ہو سکتا ہے۔ بریگیڈ کمانڈر نے پنتالیس جوانوں کی کمانڈو پلاٹون تعاقب میں روانہ کر دی۔ یہ تازہ دم پلاٹون تھی۔ کمانڈو چُنے ہوتے ہیں پھرتیلے، طاقتور اور تیز دوڑنے والے جوان ہوتے ہیں بھارتی فوج کے یہ پنتالیس جوان کودتے پھلانگتے آ رہے تھے۔ وہ دادا کے گاؤں کے قریب سے گزرنے

اگلے نوان کے کمانڈر نے جو کیپٹن تھا پلاٹون کو روک لیا اور حکم دیا کہ اس گاؤں کے ہر فرد کو باہر نکال لاؤ۔ بچوں کو بھی لے آؤ۔

فوجی دوڑے گئے اور گھروں میں گھس کر مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی دھکیلتے گھسیٹتے، لاتیں اور گھونسے مارتے باہر لے آتے۔

"جھوٹ بولو گے تو کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے"— کیپٹن نے کہا —"گاؤں کو آگ لگا کر سب کو زندہ آگ میں پھینک دیں گے.... رات کو یا ابھی ابھی یہاں سے پاکستان کے فوجی گزرے تھے۔ وہ کس راستے سے گئے ہیں؟"

دادا آگے آگیا اور بولا —"یہاں سے پاکستان یا آزاد کشمیر کا کوئی فوجی نہیں گزرا۔ کل آپ کی فوج کے بہت سے آدمی یہاں سے گزرے تھے۔ رات کو گزر گئے ہوں تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔"

"تم سب بدمعاش ہو"— ہندو کیپٹن نے کہا —"تم غدار ہو۔ تمہاری سزا صرف یہ ہے کہ تم سب کو گولی مار دی جائے"— اُس نے آگے بڑھ کر سات آٹھ سال کی عمر کے ایک بچے کو پکڑ لیا ور ریوالور نکال کر گاؤں والوں سے مخاطب ہُوا —"فوراً بتا دو، ورنہ اس بچے کے سر میں گولی مار دوں گا"— اُس نے ریوالور کی نالی بچے کے سر کے ساتھ لگا دی۔

بچّے کی ماں چیختی چلاّتی بچّے کی طرف دوڑی۔ بچہ رونے لگا۔ دادا نے بچّے کی ماں کا راستہ رک لیا اور ہندو کیپٹن کی طرف گھوما۔

"کیا تم لوگوں میں یہی بہادری رہ گئی ہے کہ معصوم بچوں کو گولیاں مارتے پھرتے ہو؟"— دادا نے ہندو کیپٹن سے کہا —"ہم جانتے ہیں کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجی یہاں آتے ہیں اور بہت نقصان کر کے چلے جاتے ہیں۔ تم چھ چھ فٹ کے جوان اُن کے سامنے آنے سے ڈرتے ہو اور جب وہ واپس چلے جاتے ہیں تو ہمارے بچوں کو گولیاں مارنے آجاتے ہو۔ تم میں اتنی ہمت نہیں اپنے ہتھیار ہمیں دے دو۔ ہم تمہیں پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجیوں کی لاشیں دکھائیں گے۔ تم یہاں ہم پر رعب جمانے کے لیے اِس لیے رُک گئے ہو کہ پاکستانی سرحد پار کر جائیں تو پھر آگے جاؤ۔ تم اُن کا مقابلہ کرنے سے گھبراتے ہو۔"

ہندو کیپٹن جوان تھا۔ جوانی کے جوش میں آگیا۔ اُس نے بڑے غصے سے بچّے کے سر سے ریوالور کی نالی ہٹالی اور اُسے ایسا دھکا دیا کہ بچہ دُور جا پڑا۔

"ہم تمہیں بتائیں گے کہ پاکستانی کتنے بہادر ہیں"— کیپٹن نے کہا —"اگر ہمیں پتہ چل گیا کہ تم نے ان کی مدد کی تھی تو اپنے گاؤں کو بچا نہیں سکو گے۔"

اُس نے اپنی کمانڈو پلاٹون کو آگے چلنے کا حکم دیا اور بوڑھے دادا کو گھورتا ہُوا وہاں سے چل پڑا۔

▼

کیپٹن اصغر کی پارٹی کی رفتار معمولی تھی۔ گائیڈ کہہ رہے تھے کہ اب سمجھو کہ نکل گئے۔ بھارتی فوج کی کمانڈو پلاٹون بہت تیز جا رہی تھی لیکن کسی اور راستے سے۔ پلاٹون کے صوبیدار نے تیرہ چودہ سال کی عمر کے ایک کشمیری لڑکے کو دیکھا۔ وہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر نیچے یا اُوپر جانے کی بجائے

آگے ہی آگے دوڑا جا رہا تھا۔ ہندو صوبیدار نے اُسے رکنے کو پکارا۔ لڑکے نے اُدھر دیکھا مگر رکا نہیں۔ وہ درختوں کے تنوں کا سہارا لے لے کر آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ وہ بلندی پر تھا اور دُور بھی تھا۔

"کیوں بلاتے ہیں اُسے؟"— کیپٹن نے صوبیدار سے پُوچھا۔

"سر!"— صوبیدار نے جواب دیا —"یہ نہ سمجھیں کہ وہ ہمارے ڈر سے بھاگا جا رہا ہے۔ مجھے کچھ شک ہو رہا ہے۔"

صوبیدار نے اُسے پھر آواز دی مگر وہ نہ رُکا۔ دوڑتا ہی گیا۔ صوبیدار نے ایک جوان سے رائفل لی اور لڑکے کو شِست میں لے کر گولی چلا دی۔ لڑکا گھٹنوں کے بل گرا لیکن فوراً اُٹھ کر آگے کو چل پڑا۔ اب اُس سے چلا نہیں جاتا تھا۔

اُس وقت کیپٹن اصغر کی پارٹی اسی پہاڑی کے دامن میں جا رہی تھی۔ اِن جانبازوں نے گولی کی آواز سُنی تو وہ ایک دوسرے سے ذرا دُور رہ کر جھاڑیوں اور گھاس کی اوٹ میں ہو گئے۔ اُن کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ہر طرف دیکھتے جا رہے تھے کسی بھی طرف سے دشمن کے آجانے کا خطرہ تھا۔ کسی نے اوپر دیکھا۔ ایک لڑکا اُترتا آ رہا تھا۔

"صوبیدار صاحب!"— ہندو کیپٹن نے کہا —"کیا حاصل ہُوا اس لڑکے کو گولی مار کر؟ اب اگر دشمن کہیں قریب ہُوا بھی تو چھُپ گیا ہو گا یا رفتار تیز کر کے نکل گیا ہو گا۔"

"سر! میں اس لڑکے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کسی پاکستانی فوجی کو دیکھا ہو گا"— [صوبیدار] نے کہا —"پھر اس کی دلیری دیکھیں سر! ہم نے پُکارا اور اُس نے حکم عدولی کی۔ ایک مسلمان گڈریے کو ہم ایسی بدتمیزی کی اجازت نہیں دے سکتے۔ انہیں رائفلوں کی نالیوں کے آگے رکھیں گے تو یہ ٹھیک رہیں گے، نہیں تو پاکستان کے ساتھی بن جائیں گے۔"

"وہ اُوپر سے غائب ہو گیا ہے"— کیپٹن نے کہا —"اُسے گولی لگی تھی لیکن آپ نے گولی ضائع کی ہے۔"

"چل کے دیکھتے ہیں"— صوبیدار نے کہا۔

▼

لڑکا اوپر سے نیچے آگیا تھا لیکن بالکل نیچے نہیں آیا تھا۔ ذرا اُوپر ہی گر پڑا تھا۔ بھارتی کمانڈو پلاٹون اُسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لڑکا بلند آواز سے کچھ کہہ رہا تھا، کیپٹن اصغر نے اپنے ایک گائیڈ عطا اللہ سے کہا کہ وہ لڑکے کے پاس جائے۔ شاید ہمیں کچھ بتا رہا ہو۔ عطا اللہ دوڑا گیا۔ پارٹی آگے چلتی گئی۔

عطا اللہ کچھ وقت بعد تیز دوڑتا آیا۔

"کیپٹن صاحب!"— اُس نے قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا —"راستہ بدلنا پڑے گا۔ دشمن کی شاید پوری پلاٹون آ رہی ہے۔ لڑکا کہتا ہے چالیس پچاس آدمی ہیں"— اُس نے وہ سمت بتائی جدھر سے بھارتی آ رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگا —"لڑکا زندہ نہیں رہے گا۔ اُس کے کندھے میں سے گولی گزر گئی ہے۔ ہندوؤں نے اُسے دیکھ لیا تھا اور اُسے

گولی ماردی۔ یہ اُسی گاؤں کا لڑکا ہے جہاں ہم رات گذار آئے ہیں۔ اُس نے بڑی تیزی سے بول کر بتایا ہے کہ ہندو فوجیوں نے گاؤں کے سب آدمیوں، عورتوں اور بچّوں کو باہر اکٹھا کر کے کچھ کہا تھا۔ اُس وقت یہ لڑکا گاؤں سے دُور ایک ٹیکری پر تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ہم اِدھر آ رہے ہیں۔ وہ ہمارے پیچھے دوڑا اور اُوپر ہی اُوپر آتا گیا تاکہ ہم اُسے کہیں نظر آجائیں۔ یہاں آکر اسے گولی لگی۔ یہ پھر بھی دوڑتا رہا اور نیچے آتے ہوتے گِر پڑا.... دیکھا کیپٹن صاحب! کشمیر کے لوگ کیسے ہیں! یہ لوگ دھوکہ کھا لیتے ہیں دھوکہ دیتے نہیں۔"

اب کیپٹن اصغر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"نائب صوبیدار صاحب!"— کیپٹن اصغر نے اسلم سے کہا ـ"اگر میرا حکم چل سکتا ہے تو مَیں اس لڑکے کو اُٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"ایسا سوچیں بھی نہیں سَر!"— نائب صوبیدار اسلم نے کہا ـ"کشمیر کا یہ پہلا بچّہ نہیں جو ہندوؤں کی گولیوں کا نشانہ بنا ہو۔ اب تک ہزارہا بچّے کشمیر کی زمین پر قربان ہو چکے ہیں.... باتوں کا وقت نہیں ہے سَر! آگے کی زمین ٹھیک نہیں۔ دشمن اگر آ ہی گیا تو اُسے بلندیاں مل جائیں گی اور ہم کُھلے میدان میں ہوں گے۔ آڑ ناقص ہے۔ آرٹمست چھوڑیں.... اور دعا کریں کہ دشمن اِدھر اُدھر ہو جائے اور ہم اُسے نظر نہ آئیں۔"

کیپٹن اصغر پر جذباتیت طاری ہو چکی تھی۔ اُس کے تھکے تھکے چہرے پر عتاب کی سُرخی آگئی تھی۔ وہ جیسے اس تجربہ کار نائب صوبیدار کی بات سُن ہی نہیں رہا تھا۔

"مَیں اِس لڑکے کے خون کا انتقام لوں گا"— اُس نے کہا ـ"آنے دو دشمن کو!"

"کیپٹن اصغر صاحب!"— نائب صوبیدار اپنے عہدے کو جیسے بھُول گیا ہو ـ"ہوش میں آئیں۔ اگر آپ ہمیں غلط حکم دیں گے تو کمانڈ مَیں خود لے لوں گا.... ہمیں دشمن پر ایک اور ضرب لگانے کے لیے زندہ رہنا ہے۔ ہم کسی اور مشن پر پھر یہاں آئیں گے۔ ہمارا ٹارگیٹ اِن چند ایک ہندوؤں سے زیادہ بڑا ہوگا... اور صاحب! مَیں آپ جیسے نوجوان کیپٹن کو فضول ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ وہ کشمیری لڑکا جو گولی کھا کر بھی ہمیں خبردار کرنے یہاں تک آگیا ہے وہ میرا بیٹا ہے۔ وہ ہم سب کا بیٹا ہے۔ میرے سینے میں بھی اس کا درد ہے۔"

کیپٹن اصغر کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو بہہ نکلے پھر وہ ایک ثانیے میں کمانڈو کیپٹن بن گیا، مگر بڑا قیمتی وقت ضائع ہو گیا تھا۔

بھارتی فوج کی کمانڈو پلاٹون اپنے صوبیدار کی راہنمائی میں اِدھر ہی آگئی تھی۔ انہیں کشمیری لڑکا نظر آگیا۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ صوبیدار نے اُسے ٹھوکر ماری تو وہ لڑھکتا ہُوا نیچے جا پڑا۔ صوبیدار نے نیچے آکر اُسے پاؤں سے سیدھا کیا۔

"پاکستان کے فوجی اِدھر سے گزرے ہیں؟"— صوبیدار نے لڑکے سے پُوچھا۔

"صوبیدار صاحب! یہ مر گیا ہے"— ہندو کیپٹن نے کہا۔

اِس پلاٹون کا ایک جوان دوڑتا آیا۔ اُس نے رپورٹ دی ـ"دشمن نظر آگیا ہے۔"

وہ کمانڈو پلاٹون تھی جو تلاشں کرنے کی ترتیب میں جا رہی تھی۔ کچھ جوان آگے تھے، کچھ ٹیکریوں پر ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ کیپٹن اور صوبیدار پیچھے اور درمیان تھے۔ آگے اور اُوپر اُوپر جانے والوں نے کیپٹن اصغر کی پارٹی کے کسی ایک جوان کو دیکھ لیا تھا۔

▼

کیپٹن اصغر اور نائب صوبیدار اپنی پارٹی کو چھُپا رہے تھے۔ لائٹ مشین گن یا سٹین گن کا برسٹ فائر ہُوا۔ سپاہی عابد جو اِس قدر زخمی تھا کہ چل نہیں سکتا تھا ایک سپاہی کی پیٹھ پر تھا۔ وہ ابھی آڑ میں نہیں ہوئے تھے۔ گولیوں کی بوچھاڑ دونوں کے جسموں سے پار ہو گئی۔ دونوں کبھی نہ اُٹھنے کے لیے گر پڑے۔

یہ پارٹی بھی کمانڈو تھی۔ اب وہ چھُپ بھی رہے تھے اور دیکھ بھی رہے تھے کہ دُشمن کدھر سے آتا ہے۔

"دشمن نظر آئے تو حکم کا انتظار مت کرو"— نائب صوبیدار اسلم نے کہا ـ"ایمونیشن بچا کر فائر کرنا۔"

"خون کے ایک ایک قطرے کا انتقام لینا جوانو!"— کیپٹن اصغر نے کہا۔

"خاموش سَر!"— نائب صوبیدار نے کہا —"اتنا اونچا نہ بولیں۔"

چار بھارتی کمانڈو ایک ٹیکری پر پوزیشن لے رہے تھے۔ ایک پاکستانی کمانڈو نے جس کے پاس لائٹ مشین گن تھی، ایک لمبا برسٹ فائر کیا اور چاروں ہندوؤں کو ختم کر دیا۔ دونوں طرف تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔ وہ ایک پوزیشن میں نہیں رہتے تھے۔ بندروں کی طرح کُودتے پھلانگتے پوزیشنیں بدلتے اور فائر کرتے تھے۔ بھارتی تعداد میں زیادہ تھے۔ وہ کیپٹن اصغر کی پارٹی کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ پاکستانیوں کی طرف سے فائر کم آتا تھا کیونکہ ایمونیشن تھوڑا تھا۔

"نکلنے کی بھی کوشش کرو سَر!"— نائب صوبیدار اسلم نے کہا۔

"سب سے کہہ دو۔"

"سب جانتے ہیں"— نائب صوبیدار اسلم نے کہا ـ"مَیں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ ہم جم کر نہیں لڑ سکتے، نہ جم کر لڑنا چاہیئے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

وادی گرنیڈوں کے دھماکوں سے گونجنے لگی۔ کیپٹن اصغر کی پارٹی کے دو اور آدمی شہید ہو گئے۔ یہ دوسرا زخمی جوان تھا جو پوزیشن بدلنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے ساتھ جو جوان تھا وہ بھی شہید ہو گیا۔ پھر پارٹی بکھر گئی۔ ان کا اکٹھا رہنا ضروری نہیں تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ کمانڈو اپریشن میں ایسی صورتِ حال پیدا ہو جایا کرتی ہے، پھر ہر جوان اپنا کمانڈر خود ہوتا ہے۔

یہ صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی اور جوان اپنے کیپٹن اور نائب صوبیدار کی کمان سے آزاد ہو گئے تھے۔ وہ اُس وقت فائر کرتے تھے جب انہیں دشمن کا کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ بھارتیوں کے پاس ایمونیشن کی افراط تھی اِس لیے وہ اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے اور گرنیڈ بھی پھینک رہے تھے۔ یہ ایمونیشن کا مینہ تھا جو بڑے وسیع علاقے کو زد میں لیے ہوئے تھے۔ اس میں

سے زندہ نکلنا ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔

"یا علیؑ" کے نعرے سنائی دینے لگے۔ نائک غلام عباس کی سٹین گن کی آخری میگزین بھی خالی ہوگئی۔ اس کے پاس ایک لمبا چاقو رہ گیا تھا جو ہر کمانڈو کے پاس ہوتا ہے۔ وہ ایک ٹیکری پر تھا۔ ایک گرنیڈ اُس سے کچھ فاصلے پر گرا۔ اس کے تین چار ٹکڑے اُس کے ایک پہلو میں اُتر گئے اور دو اُس کے منہ پر لگے۔ اُس کے کپڑے خون سے لال ہوگئے اور جسم بڑی تیزی سے خون سے خالی ہونے لگا۔ وہ ایک طرف کو رینگتا گیا۔

وہ ٹیکری کی چوٹی تھی۔ اُس نے نیچے دیکھا۔ سات آٹھ گز نیچے اُسے ہندو کیپٹن پیٹ کے بل لیٹا نظر آیا۔ اُس کے ساتھ دو جوان تھے۔ نائک غلام عباس خون کی کمی کی نقاہت اور پہلو اور چہرے پر درد کی شدید ٹیسیں محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے چاقو کھول لیا۔ اُٹھا اور چھلانگ لگا دی۔ وہ ہندو کیپٹن کی پیٹھ پر گرا۔ کیپٹن تو اسی سے ہی اُٹھنے کے قابل نہ رہا۔ اُس کے ساتھ کے دونوں جوان ابھی دیکھ ہی رہے تھے کہ یہ کیا ہُوا ہے کہ غلام عباس کا چاقو ایک ہندو سپاہی کی پیٹھ میں دل کے مقام پر اُتر گیا۔ وہ لڑھکتا ہُوا نیچے چلا گیا۔

دوسرے ہندو کمانڈو کے پاس لائٹ مشین گن تھی جسے اُٹھا کر وہ نائک غلام عباس کی طرف گھُوما لیکن غلام عباس نے یا علیؑ کا نعرہ لگا کر اُس پر اس طرح حملہ کیا کہ ہاتھ مشین گن پر مار کر اُسے پرے کیا اور دوسرے لمحے اُس کا چاقو اس ہندو جوان کے سینے میں دُور اندر تک چلا گیا۔

اُس نے چاقو ہندو کے سینے سے نکالا۔ ہندو کیپٹن نے کروٹ بدل لی تھی۔ ریوالور اُس کے ہاتھ میں تھا۔ فاصلہ ایک گز بھی نہ تھا۔ کیپٹن نے ریوالور کی دو گولیاں چلائیں۔ وہ ابھی اُٹھا نہیں تھا۔ نائک غلام عباس اُس کے اُوپر گرا۔ ابھی ہوش میں تھا۔ چاقو پر اُس کی گرفت ابھی مضبوط تھی۔ اُس کی زندگی کے دو چار منٹ ہی باقی تھے۔ اُس نے کیپٹن کے پیٹ میں اِس طرح چاقو مارنا شروع کر دیا جیسے اُس کا قیمہ کر دینا چاہتا ہو۔ آخری بار اُس نے چاقو کیپٹن کے سینے میں مارا اور اُس میں چاقو نکالنے کی طاقت نہ رہی۔ اُس کا سَر آگے کو جُھکا پھر وہ کیپٹن کے اُوپر گر پڑا ــــ وہ آخری معرکہ لڑ کر اپنے خدا کے حضور جا چکا تھا۔

▼

نائب صوبیدار اسلم کیپٹن اصغر کے ساتھ تھا۔ وہ بھی بچ نکلنے کے لیے ایک دوسرے سے الگ الگ ہو سکتے تھے لیکن اسلم اصغر کو اکیلا چھوڑنے میں خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اصغر نے اسلم سے کہا کہ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اپنے جوان کہاں کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں۔

"آپ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے سَر!" ــ نائب صوبیدار اسلم نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا ــــ "مَیں آپ کو بتاتا ہوں۔ ہماری آدھی نفری شہید ہو چکی ہو گی، اور مجھے یقین ہے کہ دشمن کی بھی آدھی نفری ختم ہو چکی ہو گی۔ میں اپنے جوانوں کو جانتا ہوں .... میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ جوش میں نہ آئیں۔ ہوش سے کام لیں۔"

"ٹھہرو صاحب!" ــ کیپٹن اصغر نے کہا۔ "وہ دیکھو.... گرنیڈ نکالو.... مجھے دے دو۔"

وہ دونوں بلندی پر بڑی اچھی آڑ میں پیٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ نیچے تین بھارتی کمانڈو ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے جا رہے تھے۔ کیپٹن اصغر نے نائب صوبیدار اسلم سے گرنیڈ لے لیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"مت اُٹھو سَر!" ــ اسلم نے چلا کر کہا۔ "لیٹ کر گرنیڈ پھینک دو۔ وہ دُور نہیں نیچے ہیں۔"

اصغر کھڑا رہا۔ جذبات کے جوش میں اُس نے پن نکالی اور گرنیڈ نیچے پھینک دیا۔ وہ پھر بھی نہ لیٹا۔ وہ ان تین ہندوؤں کو تڑپتے اور مرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اسلم نے اُس کی ٹانگ کھینچی مگر وہ نہ بیٹھا۔

گرنیڈ اُن تینوں کے درمیان پھٹا۔ تینوں اِدھر اُدھر گرے۔ تینوں تڑپنے لگے۔ ایک کو اُس نے دیکھا۔ اُس کی ایک ٹانگ جسم سے الگ ہو گئی تھی۔ اصغر نے یا علیؑ کا نعرہ لگایا اور جوش سے بازو اُوپر اُٹھائے۔ وہ ایک اور نعرہ لگانے لگا تو نعرہ منہ میں ہی رہا۔ وہ دائیں کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ خون اُبل کر نکلنے لگا ــــ اُسے کسی بھارتی کمانڈو نے دیکھ لیا اور اُس پر گولی چلا دی تھی۔ اصغر خوش قسمت تھا کہ دشمن کے اس کمانڈو کے پاس سٹین گن یا لائٹ مشین گن نہیں تھی۔

"آپ نے میری نہ سُنی" ــــ اسلم نے کہا اور اُسے وہاں سے گھسیٹنے لگا۔

"مروں گا نہیں صاحب!" ــــ اصغر نے کہا۔ "ہنسلی ٹوٹ گئی ہے۔"

وہاں دوسری گولی کا آنا لازمی تھا لیکن اُن کے پیچھے بڑے سائز کے پتھر اور درخت تھے۔ اسلم اصغر کو گھسیٹ کر پتھروں کے پیچھے لے گیا اور اوٹ سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس کے پاس ریوالور کے علاوہ سٹین گن بھی جو ایک شہید کی تھی۔ تین میگزینیں باقی تھیں۔ اصغر کے زخم پر فیلڈ پٹی لپیٹنی بھی ضروری تھی اور دشمن پر نظر رکھنی اور زیادہ ضروری تھی۔ اصغر حوصلے میں تھا۔

نائب صوبیدار اسلم کو سامنے کی ڈھلان سے ایک بھارتی حوالدار بڑی تیزی سے اُترتا نظر آیا۔ اسلم اُسے دیکھتا رہا۔ ہندو حوالدار اُسے نہ دیکھ سکا۔ وہ نیچے گیا اور اس ٹیکری پر چڑھنے لگا جس پر اصغر اور اسلم تھے۔ اُس نے شاید اسلم کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ سمجھتا ہو گا کہ اصغر اکیلا ہی تھا جسے اُس نے مار لیا ہے۔ ٹیکری زیادہ بلند نہیں تھی۔ حوالدار چڑھتا آیا۔ آٹھ دس قدم کا فاصلہ رہ گیا ہو گا کہ نائب صوبیدار اسلم اُٹھا اور سٹین گن کا برسٹ فائر کیا۔ ہندو حوالدار گرا اور قلابازیاں کھاتا نیچے چلا گیا۔

اسلم نے اپنی فیلڈ پٹی نکالی اور اصغر کے زخم پر رکھ دی۔ گولی پیچھے سے آئی اور ہنسلی (کالر بون) کے ذرا اُوپر سے نکل گئی تھی۔ نائب صوبیدار اسلم نے آگے اور پیچھے کے زخموں میں فیلڈ پٹی بھر دی اور کیپٹن اصغر کی فیلڈ پٹی لے کر اس پر لپیٹ دی۔

"نائب صوبیدار صاحب!" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا۔ "آپ جا سکتے ہیں۔ کمانڈو اپریشن سے زخمی کو نہیں اُٹھانا چاہیئے۔ آپ نکل جائیں" ــــ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

نائب صوبیدار اسلم پر رِقت طاری ہو گئی۔

"آپ اُٹھ سکتے ہیں سَر!" ــ اسلم نے کہا۔ "آپ چل سکتے ہیں۔ مَیں آپ کے ساتھ رہوں گا۔"

"آپ مجھ سے زیادہ قیمتی ہیں صاحب!" ــ کیپٹن اصغر نے کہا۔ "مَیں ابھی رنگروٹ ہوں۔"

گولیاں چل رہی تھیں مگر پہلے جتنی نہیں۔ اصغر اور اسلم نے دھماکوں سے اندازہ لگایا کہ فائر کدھر اور کتنی دُور ہو رہا ہے۔ اسلم کو تجربہ تھا۔ وہ اُس بھارتی کو مار چکا تھا جس نے اصغر کو زخمی کیا تھا۔ اسلم نے اصغر کو اُٹھایا اور دونوں ٹیکری سے اُترنے لگے۔

کیپٹن اصغر تیز چلنے کی کوشش کرتا تو زخم درد کرتے اور خون زیادہ بہنے لگتا تھا۔ آہستہ چلنا خطرناک تھا لیکن وہاں چلنا کم اور اترنا اور چڑھنا زیادہ تھا۔ وہ درد کو برداشت کرتا رہا۔ نائب صوبیدار اسلم اُس سے بار بار کہتا تھا کہ وہ چل نہ سکتا ہو تو وہ اُسے اُٹھا لے لیکن کیپٹن اصغر ہر بار مسکرا کر کہتا کہ وہ چل سکتا ہے اور چلتا ہی رہے گا۔

اُس نے اُس وقت بھی یہی کہا کہ وہ چلتا ہی رہے گا جب کوشش کے باوجود وہ مسکرا نہ سکا اور نائب صوبیدار اسلم اُسے اس شکل میں نظر آیا جیسے گہری دُھند میں چیل کے درخت کا صرف تنا دکھائی دے رہا ہو۔ اُس نے آنکھیں ملیں تو چیل اور دیودار کے بے شمار درخت ایک دوسرے کے پیچھے اور ایک دوسرے کے اُوپر کھڑے یوں ہلتے نظر آئے جیسے بڑی زور کا زلزلہ آیا ہو۔ اُس نے اپنی سرگوشی سُنی۔ "نائب صوبیدار صاحب!" — پھر وہ اپنی اور پرائی سرگوشیوں، گولیوں اور گرنیڈوں کی دُنیا سے لاتعلق ہو گیا۔

▼

اُس نے بڑی اونچی آواز میں کہا — "نہیں نائب صوبیدار صاحب! نہیں۔ مَیں کسی زخمی کو پیچھے نہیں چھوڑ سکتا۔"

اُسے آواز سُنائی دی — "کیا ہُوا صاحب!.... سر لیٹ جائیں۔"

اُس نے دھکّہ دے کر کہا — "آپ مجھے حکم نہیں دے سکتے نائب صوبیدار صاحب! مَیں اُس کشمیری لڑکے کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اُسے مَیں اپنے کندھے پہ...."

اُسے کوئی بڑی زور سے جھنجھوڑ رہا تھا پھر کسی نے اُسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ چُپ ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں، اُسے حقیقت دکھائی دینے لگی۔ وہ ایک کمرے میں بستر پر بیٹھا تھا۔ ایک نرسنگ اردلی خاکی وردی میں ملبوس اُس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اصغر اپنی گردن کے پچھلے حصے پر کسی کے سانسوں کی تپش محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے پیچھے دیکھا تو دائیں کندھے میں اُسے درد محسوس ہُوا۔ اُسے ایک چہرہ نظر آیا۔ وہ ایک جواں سال عورت کا چہرہ تھا۔

"امّی!" — کیپٹن اصغر کے ہونٹوں سے سرگوشی پھسل گئی — "آپ یہاں؟.... اوہ!" — اُس نے ہنسنے کی بڑی کوشش کی لیکن ہنس نہ سکا۔

اُسے ایسی ہنسی سُنائی دی جس میں موسیقی تھی۔ عورت کا چہرہ اُس کے سامنے آ گیا۔

"پیچھے نہ دیکھیں" — عورت نے کہا — "یُوں.... سامنے دیکھیں۔ گردن گھمانے سے ٹانکے کُھل جائیں گے.... مجھے امّی کہہ کر آپ حیران اور شرمسار سے کیوں ہو گئے ہیں؟"

"ہاں سسٹر!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "مَیں تمھیں امّی سمجھا تھا۔ شاید تم نے بُرا مانا ہو۔ تم میری عمر کے آدمی کی امّی نہیں ہو سکتیں لیکن.... سسٹر! میں تمھیں اپنی امّی سمجھتا ہوں۔"

"میرا اچھا کپتان!" — جواں سال اور خوبرو نرس نے اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر ماں کے سے پیار سے لہجے میں کہا — "تم پر مجھ جیسی سینکڑوں مائیں قربان ہو جائیں۔ نائب صوبیدار اسلم تمھاری شجاعت کی کہانی سُنا چکا ہے.... تم تیسرے روز ہوش میں آئے ہو۔ گزشتہ رات تمھیں خون دیا جاتا رہا ہے.... تم واپس اپنے مشن پر چلے گئے تھے؟"

"ہاں سسٹر!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "یہ کونسی جگہ ہے؟"

"مظفر آباد" — نرس نے جواب دیا — "ایک دو دنوں میں آپ کو راولپنڈی سی۔ ایم۔ ایچ میں بھیج دیں گے۔ یہاں افسروں کے کمرے کم ہیں.... آپ کی کالر بون بچ گئی ہے۔ اس پر گولی کی ذرا سی رگڑ لگی ہے۔"

"نائب صوبیدار اسلم کہاں ہے؟"

"انہیں کل صبح ڈسچارج کر دیا گیا تھا" — نرس نے کہا — "وہ جس طرح آپ کو آزاد کشمیر میں لائے ہیں وہ کبھی انہی سے سُننا۔ اپنی ایک بارڈر پوسٹ پر آ کر وہ گر پڑے تھے۔ آپ اُن کی پیٹھ پر تھے۔ آپ بے ہوش تھے۔ آپ کو اور نائب صوبیدار صاحب کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال لایا گیا تھا۔ آپ کے جسم میں خون ختم ہو چکا تھا۔ آپ کی نبض اتنی آہستہ چل رہی تھی کہ ڈاکٹر مایوس ہو گئے تھے۔ نائب صوبیدار صاحب کی جسمانی حالت تھکن، بھوک اور پیاس کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی۔ وہ آپ کو بہت جلدی ہسپتال تک پہنچانے کی کوشش میں تھے۔ آپ کا بوجھ اُٹھائے ہوئے وہ کہیں رُکے نہیں۔ اُن کے پاؤں ٹخنوں سے اُوپر تک سُوج گئے تھے۔ خدا کا شُکر ہے کہ وہ ایک دن اور رات میں ہی سنبھل گئے۔"

کیپٹن اصغر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بھارت کے اخباروں اور ریڈیو نے واویلا بپا کر رکھا تھا۔ اخباروں کے پہلے صفحوں پر پاکستان اور آزاد کشمیر کے کمانڈو آپریشن کی خبریں شہ سُرخیوں سے شائع ہوتی تھیں لیکن خبروں کے متن بتاتے تھے کہ مقبوضہ کشمیر میں یہ آپریشن بُری طرح ناکام ہو رہا ہے۔ بھارتی فوج نے ہمارے چند ایک کمانڈو جوانوں کو زندہ پکڑ لیا تھا۔ ان کی تصویریں بھارتی اخباروں میں چھپتی ہی رہتی تھیں۔ ان خبروں میں بھارت کے اُن فوجیوں کا ذکر نہیں ہوتا تھا جنہیں کمانڈو پکڑ کر لے آئے تھے۔

یہ خبریں جو بھارت کے اخباروں میں چھپتی تھیں، بھارت سرکار کی اپنی گھڑی ہوئی ہوتی تھیں۔ بھارتی عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا رہی تھی۔ اگست ۱۹۶۵ء کے آخر تک مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج عملاً مفلوج ہو چکی تھی۔ یونٹوں کی نقل و حرکت بند ہو گئی تھی۔ کشمیر بھارت کے ہاتھ سے پھسل رہا تھا۔

بھارت کے سرکاری حلقوں میں خصوصاً وزارتِ دفاع کے ایوان میں، بھونچال کے شدید جھٹکے محسوس کیے جا رہے تھے۔ پاکستان کو اپنی پسند کے میدان میں لڑانے والوں کے خواب کمانڈو جانبازوں کے گرینیڈوں سے مقبوضہ کشمیر کی وادیوں میں تباہ و برباد ہو گئے تھے مگر بھارت کے ایوانوں میں کوئی خوف اور کوئی مایوسی نہیں تھی۔ فوجی لیڈر اطمینان اور تحمّل سے دیکھ اور سوچ رہے تھے اور اپنی فوجوں کو پاکستان کی سرحد پر بہت تھوڑے وقت پر پہنچنے اور حملہ کرنے کے لیے سرحد کے ساتھ ساتھ جمع کر رہے تھے۔

"پاکستان کے حکمران خودکشی کی کوشش کر رہے ہیں" ــــ یہ ایک آواز تھی جو بھارت کی وزارتِ دفاع اور افواج کے ہیڈکوارٹروں میں سنائی دیتی تھی اور امیدوں اور خوابوں کو تر و تازہ کرتی تھی۔ تینوں افواج کے کمانڈر انچیف بھارتی وزیرِاعظم کو یقین دلا چکے تھے ــــ "جس دن ہم نے پاکستان پر حملہ کیا اس شام پاکستان آپ کا ہو گا۔"

ان حلقوں میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جن کی رائے مختلف تھی۔ اُن کی نظر اُس تباہی کی ایک ایک تفصیل پر تھی جو پاکستان اور آزاد کشمیر کے مٹھی بھر کمانڈو جانبازوں نے بپا کی تھی اور مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کی عملداری ختم کر دی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جس فوج کے کمانڈو اس حیران کُن حد تک بے خوف، ذہین اور پھُرتیلے ہیں وہ فوج قلیل تعداد میں بھی اپنے ملک کو بچا لے گی۔

★

"ہم اپنے ملک کو بچا لیں گے" ــــ کیپٹن اصغر نرس سے کہہ رہا تھا ــــ "تم ٹھیک کہتی ہو سسٹر! مقبوضہ کشمیر کو بچانے کے لیے بھارت یہ چال ضرور چلے گا کہ پاکستان پر حملہ کر دے لیکن ہم تیار ہیں" ــــ وہ جذباتی لہجے میں بولا ــــ "تم نے انہیں نہیں دیکھا سسٹر! وہ جو مقبوضہ کشمیر میں جاتے ہیں انہیں خُدا کے سوا کوئی نہیں دیکھتا۔ تم نے میرے زخمیوں کو نہیں دیکھا۔ تم تصوّر میں نہیں لا سکتیں سسٹر! زخمی دشمن کی زمین پر پڑا ہے اور اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا ہے کہ مجھے یہیں چھوڑ دو اور تم نکل جاؤ۔"

"میں نے وہاں جا کے نہیں دیکھا" ــــ جواں سال نرس نے کہا ــــ "تم جیسے جانبازوں کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے میرے پاس آنے والے تم پہلے زخمی نہیں ہو۔ وہ ہوش میں ہوتے ہیں تو کوئی بات نہیں سناتے۔ بیہوشی میں وہ اپنے ٹارگیٹ پر ہوتے ہیں۔ گرینیڈ پھینکتے ہیں۔ فائر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پُکارتے ہیں۔ وہ جس طرح اپنے جسم کو اکڑاتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے ٹارگیٹ پر قہر بن کر ٹوٹے ہوں گے" ــــ نرس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے کہا ــــ "میرے ہاتھوں سے اُن کا خُون دھل گیا ہے لیکن ایسے لگتا ہے جیسے ان کا خون میرے خون میں شامل ہو گیا ہے۔ باہر لان میں دیکھنا کیسے کیسے پھُول ہیں۔ میں جس پھُول کو سونگھتی ہُوں مجھے اس میں اپنے وطن کے سرفروشوں کے خُون کی بُو محسوس ہوتی ہے۔"

"کیا ہمارے بعد آنے والے اس بُو کو زندہ رکھیں گے؟" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا۔

"تمھارے بعد آنے والے؟"

"ہاں سسٹر!" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا ــــ "تم حیران کیوں ہو گئی ہو؟ ایک روز اس کمرے میں اسی پلنگ پر کوئی اور زخمی لیٹا ہُوا ہو گا اور وہ تمہیں بتاتے گا کہ ایک نوجوان کیپٹن کمانڈو مشن پر شہید ہو گیا ہے۔ وہ پہلے مشن پر زخمی ہُوا تھا.... ہم اپنے وطن کی قربان گاہ پر کھڑے ہیں سسٹر! میں سوچتا ہوں کہ ہمارے بعد یہ قربان گاہ ویران تو نہیں ہو جائے گی؟"

نرس عورت تھی۔ وہ چپ چاپ اصغر کو دیکھتی رہی پھر اُس کی آہ نکل گئی۔

"تمہیں ملنے کوئی نہیں آیا" ــــ نرس نے پوچھا ــــ "دوسرے زخمیوں کے رشتہ دار اور دوست اطلاع ملتے ہی آ جاتے ہیں۔ راولپنڈی میں تمہارا کوئی عزیز نہیں؟"

"اوہ!" ــــ جیسے کیپٹن اصغر کو کچھ یاد آ گیا ہو کہنے لگا ــــ "سسٹر! ٹیلیفون پر کسی کو میری اطلاع دے سکتی ہو؟"

"بتاؤ نا!" ــــ سسٹر نے پوچھا ــــ "میں فون کر دوں گی۔"

"ٹیلیفون ڈائریکٹری مل جائے گی؟"

"میں لاتی ہوں۔"

★

اسلام آباد میں ملک ناصر کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو شمیم دوڑی گئی اور ریسیور اٹھایا۔

"ہاں ہاں" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں ہی شمیم ہوں .... میں جانتی ہوں اُسے" ــــ اُس کی آواز کانپنے لگی ــــ "کیوں .... کہاں ہے وہ .... خُدا کے لیے جلدی بتائیں وہ کہاں ہے....؟" اُس کے ہاتھ سے ریسیور گرنے لگا تھا۔ اُس نے کہا ــــ "اُس کی حالت کیسی ہے؟ .... کمرہ نمبر سولہ؟ .... وہ ہوش میں ہے نا؟ .... میں ابھی آتی۔"

ملک ناصر اور ملک رجب علی کہیں باہر نکل گئے تھے۔ شمیم نے ماں کو بتایا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ہاں جا رہی ہے وہ دوڑتی باہر نکلی۔ اپنی کار میں بیٹھی اور کار کوٹھی سے نکل گئی۔

سی۔ ایم۔ ایچ کے کمرہ نمبر سولہ کا دروازہ آہستہ سے کھُلا۔ کیپٹن اصغر کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اُس نے اپنے ماتھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا اور جاگ اُٹھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور

شمیم اُس سے لپٹ گئی، پھر اُس کے سر سے پاؤں تک یوں ہاتھ پھیرنے اور ٹٹولنے لگی جیسے کوئی بچہ گر پڑے تو ماں اُسے اٹھا کر دیکھتی ہے کہ بچّے کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔

"منہ گھبراؤ شمیم!" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا ــــ "صرف ایک زخم ہے۔ موت کے مُنہ سے نکل آیا ہوں۔"

"کشمیر گئے تھے؟"

اصغر نے مُسکرا کر سر ہلایا۔ شمیم اور زیادہ جذباتی ہو گئی ــــ اور پھر وہ جذبات میں ہی ڈوبتے چلے گئے۔ شمیم کی لانبی لانبی انگلیاں اصغر کے بالوں میں رینگ رہی تھیں۔ ان انگلیوں کے لمس نے اصغر کو تھکن کا ایسا احساس دلا دیا جیسے اس کی ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں اور وہ بڑی ٹھنڈی اور پُرسکون منزل میں آ کر گر پڑا ہو۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ شمیم کی سانسوں کی تپش نے اسے مخمور کر دیا۔

یہ احساس نہیں تھا، یہ حقیقت تھی کہ وہ بہت تھک گیا تھا۔ وہ دو قدم چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ شمیم نے اُس کی پیشانی کو ذرا سا سہلایا اور اُس کی انگلیاں اصغر کے بالوں میں آہستہ آہستہ رینگنے لگیں اور شمیم کا ریشمی دوپٹہ اصغر کے گالوں کو چھُونے لگا تو اُسے اونگھ آ گئی اور اُس کا سر ڈھلک گیا۔

"امّی جان!" ــــ وہ دھیمے دھیمے بڑبڑانے لگا ــــ "میں کشمیر کے اُس بچّے کو اپنے گھر لے آؤں گا.... امّی جان!.... بادل گرجتے ہیں.... دادا.... دادا نہیں امّی جان! وہ لڑکا مرا نہیں ہو گا.... میں اُسے یہاں لے آؤں گا.... آپ.... آپ اُسے کہا کرنا یہ میرا اصغر بیٹا ہے.... میں کسی زخمی کو پیچھے نہیں....

اُس نے سر زور زور سے ہلایا ــــ "نہیں چھوڑ سکتا" ــــ اور اُس کی آنکھ کھُل گئی۔

اُس نے سب سے پہلے شمیم کی آنکھیں دیکھیں جو آنسوؤں سے شفاف جھیلیں بن گئی تھیں۔

"میں سو گیا تھا شمیم؟"

"سو جاؤ" ــــ شمیم نے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لینے کی سر توڑ کوشش کرتے ہُوئے کہا ــــ "تم سو جاؤ۔ میں ساری رات تمھارے پاس بیٹھی رہوں گی۔"

"میں سو گیا تو وہیں چلا جاؤں گا جہاں گھٹائیں گرجتی اور گولیوں کا مینہ برستا ہے" ــــ اصغر نے مُسکراتے ہُوئے کہا ــــ "تم یہاں بیٹھی کیا کرو گی؟.... باتیں کرو۔ کوئی بات سناؤ۔"

"تم نیند میں امّی کو یاد کر رہے تھے" ــــ شمیم نے کہا ــــ "کشمیری لڑکا کون ہے جسے تم اپنے گھر لانا چاہتے ہو؟.... کیا تم اپنے دادا کو یاد کر رہے تھے؟"

اصغر نے اُسے تفصیل سے سنایا کہ دادا کون اور کشمیر کا لڑکا کون ہے۔

"دادا وہ نسل ہے جو ایک روایت پیچھے چھوڑ کر جا رہی ہے" ــــ اصغر نے کہا ــــ "اور لڑکا وہ نسل ہے جو اس روایت کو زندہ رکھنے کے لیے خون کے نذرانے دے رہی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لڑکا جو ہندوؤں کی گولیوں سے شہید ہو گیا تھا اسی دادا کا پوتا ہو۔ ان میں خون کا رشتہ نہ ہو لیکن شمیم! دشمن جب وطن کی ناموس پر ہاتھ ڈالتا ہے تو ہم وطن خون کے ایک ہی رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔ میں نے اُس لڑکے کو دیکھا بھی نہیں لیکن ایک اٹل حقیقت کی طرح محسوس کرتا ہوں کہ اُس نے میری ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔"

"اور خون کے اُن رشتوں کو کیا کہو گے جو وطن کے دشمنوں کے ماں جائے بن جاتے ہیں؟" ــــ شمیم نے کہا ــــ "میں جانتی ہوں تم میری بات نہیں سمجھے۔ حیران نہ ہو اصغر! میں تمھیں دو خبریں سنانا چاہتی تھی لیکن تمھاری جذباتی حالت دیکھ کر چپ رہی۔"

"میری جذباتی حالت کی پرواہ نہ کرو شمیم!" ــــ اصغر نے کہا ــــ "اس حالت نے مجھے ایک عظیم حقیقت دکھا دی ہے۔ میں بالکل نارمل ہوں۔ کہو، کیا خبر ہے۔ فوراً سناؤ۔"

"تمھارے ابّا جان میرے گھر میں ہیں" ــــ شمیم نے کہا ــــ "اور میرے ابّا جان ہندوستان کے جاسوس ہیں۔"

کیپٹن اصغر یوں پلنگ کے سہارے سے ہٹ کر آگے ہو گیا جیسے کسی نے اُس کی پیٹھ میں خنجر اُتار دیا ہو۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"میں جانتی تھی تمھارا ردِّعمل یہی ہو گا" ــــ شمیم نے اپنے آنچل سے اصغر کے ماتھے سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا ــــ "اب پوری بات سنو۔"

"وہ میرا باپ نہیں ہے" ــــ اصغر نے خلا میں دیکھتے ہُوئے کہا ــــ "تمھیں شاید معلوم نہیں۔"

"معلوم ہے" ــــ شمیم نے کہا ــــ "وہ مجھے بتا چکے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے میری ماں بہت بڑے دھوکے کا شکار ہو گئی ہے" ــــ اصغر نے دبے دبے عتاب سے کہا ــــ "اگر ایسی بات ہے تو ملک رجب علی میرے ہاتھوں ختم ہو گا۔"

"اوہ.... پاگل!" ــــ شمیم نے کہا ــــ "تم کیا سمجھ بیٹھے ہو۔ میری بات تو سن لو۔"

اصغر خلا سے نکل کر شمیم کی طرف متوجہ ہُوا۔ شمیم نے اُسے ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے بتایا کہ ملک رجب علی شمیم کے باپ ملک ناصر کا پرانا دوست ہے۔ اتفاق سے ریلوے سٹیشن پر ان کی ملاقات ہو گئی اور ملک ناصر رجب علی کو اپنے گھر لے آیا۔ شمیم نے اصغر کو تفصیل سے سنایا کہ اُس نے کس طرح ملک رجب علی کو بتایا تھا کہ ملک ناصر ہندوستان کا جاسوس ہے۔

"تمھارے ابّا جان ہمارے گھر میں صرف اس لیے رُکے ہوتے ہیں کہ وہ میرے ابّو کو ان کے گروہ کے ساتھ پکڑنا چاہتے ہیں" ــــ شمیم نے کہا ــــ "میں تمھارے ابّو کو بتاؤں گی کہ تم سی۔ ایم۔ ایچ میں ہو۔ اپنے ابّو کو بتایا تو وہ پوچھیں گے کہ تمھارا اصغر کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

"کیا تم اپنے ابّو کو بتا نہیں سکتیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں؟"

"نہیں" ــــ شمیم نے جواب دیا ــــ "میرے ابّو ہمیں اس سوسائٹی میں لے گئے ہیں، یا یُوں کہو کہ ہمیں اس سوشل مقام تک لے گئے ہیں جہاں محبت اور چاہت کے معنی بدل جاتے ہیں۔"

"کیا تم نے اس معنی کو قبول نہیں کیا؟"

"قبول کر لیا تھا" ــــ شمیم نے کہا ــــ "لیکن میں محبت کے معنی نہیں سمجھی تھی.... اب تم اپنے ابّو کی طرح کہو گے کہ میں کس طرح تسلیم کروں کہ ایک بیٹی اپنے باپ کے خلاف ہو سکتی ہے.... میں اس کا یہی جواب دے سکتی ہوں کہ تمھاری محبت نے مجھے اپنے باپ کا دشمن بنا دیا ہے۔ میں اور کچھ نہیں جانتی۔ میری ذات میں ایک انقلاب آیا ہے جسے میں نے قبول کر لیا، یا اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

میں کھلنڈری لڑکی تھی جسے لوگ مغرب زدہ اور آوارہ کہا کرتے ہیں.... میں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔"

"یہ وصف مسلمان کے خون میں ہے" ___ اصغر نے کہا ___ "منزل نہ ہو تو مسافر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ میں نے تمہیں ایک منزل کے نشان دکھا دیئے ہیں.... لیکن شمیم! میں سپاہی ہوں فلاسفر نہیں۔ اصل بات مجھے میرے ابو بتائیں گے۔ انہیں بتا دو کہ میں یہاں ہوں۔ اپنے ابو کو تم نہ بتانا میرے ابو بتا دیں گے۔"

"کیا یہ ہمارے لیے اچھا نہیں کہ ہم دونوں کے ابو دوست ہیں؟" ___ شمیم نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

"نہیں" ___ اصغر نے کہا ___ "شمیم! اگر تمہارے دل میں واقعی میری محبت ہے تو اپنے ابو کو دل سے اتار دو اور میرے ابو کو بھی۔ میں جس مقام پر آ پہنچا ہوں وہاں محبت کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر میرے فرض نے مطالبہ کیا تو میں محبت کی قربانی دینے سے گریز نہیں کروں گا۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ میں یہ قربانی کس طرح دے سکوں گا لیکن دینی ہوگی" ___ اُس نے شمیم کا ہاتھ پکڑ لیا اور جذباتی لہجے میں بولا ___ "ہر حال میں میرا ساتھ دو گی؟"

شمیم نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور یہ ہاتھ پہلے اپنی آنکھوں سے لگایا پھر اس ہاتھ کو چوما اور پھر اُس کی نشیلی آنکھیں جن میں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی نوجوانی کی چمک تھی، اصغر کی آنکھوں کی طرف بڑھنے لگیں۔ اصغر نے ان آنکھوں کو دیکھا۔ آنکھیں پھیل رہی تھیں۔ پھیلتی چلی گئیں۔ پھر جیسے وہ جھیل میں جھانک رہا ہو۔ چھوٹی سی چیز بھی آنکھوں کے ساتھ لگ کر ساری دنیا کو چھپا لیتی ہے۔ اصغر کو یوں لگا جیسے وہ ڈوب گیا ہو ___ اُس نے اپنے ماتھے پر، گالوں پر اور اپنے ہونٹوں پر تپتی ہوئی نمی محسوس کی۔

"تم ابھی تک شک میں ہو؟" ___ اصغر کو ساز کے تار کی طرح تھرکتی سرگوشی سنائی دی ___ "میری جان کی قربانی لو گے تو بہت معمولی ہوگی۔"

★

شمیم جب کوٹھی میں داخل ہوئی تو ملک رجب علی کے کمرے میں گئی۔ رجب علی کے پاس شمیم کا باپ ملک ناصر بیٹھا ہوا تھا۔

"ہیلو بیٹی!" ___ ملک ناصر نے کہا ___ "دیکھو آج تمہارا انکل کتنا خوش ہے۔ اس کا بیٹا کشمیر سے واپس آ گیا ہے۔"

"مبارک ہو انکل!" ___ شمیم نے انجان بن کر کہا ___ "کہاں ہے؟ آپ اُسے مل آئے ہیں؟"

"سی۔ ایم۔ ایچ میں ہے" ___ رجب علی نے کہا ___ "کچھ زخمی ہے.... تمہارے ابو نے معلوم کرایا ہے۔ اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی۔ صبح جاؤں گا۔"

"اُس کی امّی کو آپ نے اطلاع دے دی ہے انکل؟"

"ابھی نہیں" ___ رجب علی نے کہا ___ "سوچ رہا ہوں اُسے اطلاع دوں یا نہ دوں۔ اُس نے اپنے بیٹے کو ہسپتال میں دیکھا تو اس پر بہت بُرا اثر ہوگا۔"

"تم یہیں رہو ملک!" ___ ملک ناصر نے کہا ___ "اپنی بیوی کو فون کر دو کہ اصغر کی اطلاع مل گئی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے اور وہ دو چار دنوں میں راولپنڈی آ رہا ہے۔ بیوی سے کہو کہ اصغر کے آنے پر تم اُسے

لاہور سے بلا لو گے۔"

"ابو!" ___ شمیم نے ملک ناصر سے پوچھا ___ "آپ کو کس نے بتایا ہے کہ کیپٹن اصغر سی۔ ایم۔ ایچ میں ہے؟"

"اُس کی یونٹ کے کسی اور افسر کا نام لو" ___ ملک ناصر نے کہا ___ "میں تمہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں ہے۔"

شمیم نے ملک رجب علی کی طرف دیکھا۔ رجب علی کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ ملک ناصر کمرے سے نکل گیا۔ شمیم رجب علی کے پاس بیٹھی رہی۔

"میرا خیال تھا کہ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ اصغر سی۔ ایم۔ ایچ میں زخمی پڑا ہے" ___ شمیم نے رجب علی سے کہا ___ "لیکن میرے ابو کو پہلے ہی پتہ چل گیا ہے۔"

"تمہیں کس طرح معلوم ہوا تھا؟"

"اصغر نے نرس سے فون کرایا تھا" ___ شمیم نے کہا ___ "آپ اور ابو گھر نہیں تھے۔ میں وہیں سے آ رہی ہوں۔ میں ابو کو نہیں بتا سکتی۔"

ملک رجب علی نے بیتاب ہو کر پوچھا کہ اصغر کیسا ہے اور زخموں کی حالت کیا ہے۔ شمیم نے اُسے اصغر کی جسمانی اور ذہنی حالت بتائی اور اُسے تسلی دی کہ اصغر جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ شمیم نے اُسے یہ بھی بتایا کہ اُس نے اصغر کو بتا دیا ہے کہ رجب علی یہیں ہے اور یہ بھی کہ ملک ناصر ہندوستان کا جاسوس ہے۔

"آپ نے دیکھا کہ میرے ابو کہاں کی خبر لے آتے ہیں؟" ___ شمیم نے کہا۔

"اگر تمہارا باپ کمانڈو اپریشن کے پردوں کے پیچھے جھانک سکتا ہے تو یہ بہت خطرناک آدمی ہے" ___ ملک رجب علی نے کہا ___ "میں اس کے پورے گروہ کو پکڑوا دوں گا۔"

"آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"میں انڈیا کا جاسوس بن گیا ہوں" ___ رجب علی نے کہا ___ "مجھ سے اور کچھ نہ پوچھنا۔"

★

جب سورج طلوع ہوا ملک رجب علی کیپٹن اصغر کے پاس بیٹھا تھا۔ ملک ناصر اور شمیم کے متعلق باتیں ہو چکی تھیں۔ اصغر رجب علی کو اپنے مشن کی روئیداد سنا چکا تھا۔

"اصغر!" ___ رجب علی نے کہا ___ "کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ شمیم تمہارے راستے کی چٹان بن جائے؟"

"میں شمیم کو بتا چکا ہوں کہ میرے فرض نے مطالبہ کیا تو میں اس کی محبت قربان کر دوں گا" ___ اصغر نے کہا ___ "ابّا جان! میں اپنی پارٹی کے ان شہیدوں کو نہیں بھول سکتا جنہیں میں وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ میں ان شہیدوں کا قیدی ہوں۔ میں اُن کے حکم کا پابند ہوں۔ اپنے شہیدوں کو بھول جانے کو میں بہت بڑی غداری سمجھتا ہوں۔"

"شمیم کی باتوں سے مجھے یقین تو آتا ہے کہ وہ تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے" ___ ملک رجب علی نے کہا ___ "لیکن اصغر بیٹا! تم ابھی کمسن اور نادان ہو۔ تم پر جذبات کا غلبہ ہے۔ میں نے پولیس کی سروس کی ہے۔ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ جو میں سوچ سکتا ہوں وہ تم نہیں سوچ سکتے۔ ایک بات کہتا ہوں جو شاید تمہیں اچھی نہ لگے لیکن دل میں پاکستان کی اور اپنی پارٹی کے شہیدوں کی محبت

ی قندیل جلا کر میری بات پر غور کرنا.... شمیم تمہارے دل میں اُتر گئی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بڑی گہری اُتری ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ خنجر نہ ہو جو تم نے اپنے ہاتھوں اپنے دل میں اتار لیا ہو۔ شمیم انڈیا کے جاسوس کی بیٹی ہے۔ اس گھرانے میں مجھے کسی بھی چیز میں پاکستانیّت نظر نہیں آتی۔ ملک ناصر بڑی خوشی اور فخر سے کہتا ہے کہ اُس کی بیٹی شوخ اور شرارتی ہے۔ تمہارے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات اُس کی شرارت تھی۔ تم نے اُسے بتایا کہ تم پاک فوج کے کیپٹن ہو تو وہ تمہاری ہو کے رہ گئی۔"

"شمیم مجھے دھوکہ نہیں دے سکتی" ــــ اصغر نے کہا۔

"وہ قوم سراپا دھوکہ ہے جس کا ملک ناصر جاسوس اور ایجنٹ ہے" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "ملک ناصر نام کا مسلمان ہے۔ اس کی ذہنیت ہندوؤں جیسی ہے۔ ہندوؤں کی طرح وہ اپنی بیٹی کو استعمال کرنے میں عار محسوس نہیں کرے گا۔"

"آپ یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتے ابّاجان!" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا۔

"مجھے شک ہے" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "یقین صرف ملک ناصر کے متعلق ہے کہ وہ ہمارے دشمن کا بڑا خطرناک ایجنٹ ہے۔ معلوم نہیں کس ذریعے سے اُسے پتہ چلا تھا کہ تم مشن سے واپس آ گئے ہو اور سی۔ ایم۔ ایچ میں ہو.... بہرحال میں اُس کے گروہ میں شامل ہو گیا ہوں اور ایک بڑی خوبصورت لڑکی کے ساتھ میرا دوستانہ ہو گیا ہے۔ اُسے یقین آ گیا ہے کہ میں اُس کے گروہ کا آدمی ہوں.... تم یہ خیال رکھنا کہ ملک ناصر سے ملاقات ہو تو جذباتی نہ ہو جانا۔ ایسا اشارہ تک نہ ملے جس سے ظاہر ہو کہ تمہیں کچھ شک ہے۔"

"میں ہسپتال سے فارغ ہوں تو اُمّی سے میں خود فون پر بات کروں گا" ــــ اصغر نے کہا ــــ "انہیں یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں زخمی ہو گیا تھا۔"

★

ملک رجب علی کو اپنے رِنگ میں شامل کرنے کے لیے ملک ناصر نے ایک بڑی خوبصورت لڑکی شازی کو استعمال کیا تھا مگر شازی رجب علی کو اپنے طلسم میں گرفتار کرنے کی بجائے اُس کے طلسم میں گرفتار ہو گئی۔ رجب علی نے اُسے کہا تھا کہ وہ بھارت کا جاسوس ہے اور اس کا رِنگ الگ ہے۔ رجب علی گھاگھ آدمی تھا۔ اُس نے شازی سے اگلوا لیا تھا کہ وہ ملک ناصر کے رِنگ کی رکن ہے۔ شازی کچھ کم چالاک نہیں تھی لیکن رجب علی نے اُس پر ایسا تاثر طاری کر دیا تھا کہ شازی بیساختہ کہہ اٹھی تھی ــــ "آپ پہلے آدمی ہیں جو میرے دل کو اچھے لگے ہیں۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کوئی ہو جس کے ساتھ دل کی باتیں کیا کروں۔"

جس روز رجب علی اصغر سے مِل کر آیا اُسی روز اُسے شازی کا پیغام مِلا کہ وہ اُسے ملنے کو بیتاب ہے اور وہ تنہائی میں ملنا چاہتی ہے۔ اُس نے ملاقات کی جگہ بھی بتائی۔ شام گہری ہوئی تو رجب علی شمیم کی کار لے کر وہاں چلا گیا۔ شازی اُس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُسے کار میں بٹھایا اور شکر پڑیاں جا رُکے۔ شازی کے کہنے پر وہ اُوپر چلے گئے۔ بلندی پر سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ساون کی بھیگی بھیگی چاندنی رومان جگا رہی تھی۔

"تنہائی کی ملاقات کا کوئی خاص مقصد ہے؟" ــــ رجب علی نے پوچھا۔

"اپنے اس کام سے ہٹ کر باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے" ــــ شازی نے کہا ــــ "آپ کو بُرا تو نہیں لگا؟"

"نہیں شازی!" ــــ رجب علی نے اپنائیت سے کہا ــــ "میں ایک بات کہہ دوں تم کچھ جذباتی معلوم ہوتی ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ جذباتیّت تمہیں پکڑوا دے گی۔"

"میں جذباتی نہیں تھی" ــــ شازی نے کہا ــــ "آپ کو دیکھ کر معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

"میں اُس عمر سے بہت دُور نکل آیا ہُوں جہاں مجھے بھی کسی کو دیکھ کر کچھ ہو جایا کرتا تھا" ــــ رجب علی نے ہنستے ہوئے کہا ــــ "اب تو بال بھی سفید ہو رہے ہیں۔"

"عُمر کے اتنے زیادہ فرق کے باوجود میرا دل آپ سے ملنے کو بیتاب رہتا ہے" ــــ شازی نے کہا ــــ "ایسے لگتا ہے جیسے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے.... آپ مجھے کیوں اچھے لگتے ہیں؟"

"اِس لیے کہ میں بہت بڑا زمیندار ہوں" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "پہلی ملاقات میں تم نے مجھ سے بن مرتبہ پوچھا تھا کہ میں واقعی بڑا زمیندار ہُوں؟"

"نہیں" ــــ شازی نے کہا ــــ "ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے بڑے بڑے دولتمندوں کے بیغام مل چکے ہیں۔ میں نے آپ میں معلوم نہیں کیا دیکھا ہے۔"

"تم نے مجھ میں انڈیا کا جاسوس دیکھا ہے" ــــ رجب علی نے ہنسی مذاق کے انداز سے کہا۔

اس کے بعد وہ ہنسی مذاق کے مُوڈ میں ہی رہا اور شازی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ عصمت فروش عورتوں کو اور اپنے ملک کے خلاف جاسوسی کرنے والی شازی جیسی لڑکیوں کو صرف پیسے اور عیش و عشرت کے ساتھ دلچسپی ہوتی ہے۔ شازی کو پتہ چل گیا تھا کہ رجب علی سونے کے انڈے دینے والی مُرغی ہے۔ وہ جوانی ڈھل جانے کے بعد بھی خوبرو اور پُرکشش تھا اور وہ شگفتہ مزاج تھا۔

"شازی!" ــــ رجب علی نے اُس کے ساتھ کھیلتے ہوئے کہا ــــ "اگر تم نے اپنی جذباتیّت کا کچھ علاج نہ کیا تو پکڑی جاؤ گی۔ تم جوان ہو اور بہت خوبصورت ہو شازی! اگر تم پکڑی گئیں تو بہت بُرا ہو گا۔"

"میرے ساتھ اور بُرا کیا ہو گا" ــــ شازی نے کہا ــــ "میں اچھی تو نہیں۔ آپ مجھے نہ جانے کیا سمجھ رہے ہیں۔"

"کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"بٹالہ" ــــ شازی نے کہا ــــ "میں بٹالہ میں پیدا ہوئی تھی۔"

"ماں باپ ہیں؟"

"امّی ہیں" ــــ شازی نے جواب دیا ــــ "ابّو مر گئے تھے میرے بچپن میں ہی مر گئے تھے۔"

"کیا نام تھا؟"

"چوہدری شاکر علی۔"

ملک رجب علی کو دھچکہ سا لگا اور شازی سے اُس کی ماں کا نام پُوچھا۔

"یہاں وہ بیگم ادریس کہلاتی ہے"۔۔۔ شازی نے کہا ۔۔"اُس کا نام آسیہ ہے۔"

ملک رجب علی چونک پڑا۔ اُس نے شازی سے اُس کی عمر پوچھی۔

"میری عمر۔۔۔!" ۔۔۔ شازی نے سوچ کر کہا ۔۔"تیئس سال ہو چکی ہے۔"

اُس وقت رجب علی کا ایک بازو شازی کی کمر کے گرد لپٹا ہُوا تھا اور شازی کا سر رجب علی کے کندھے پر تھا۔ اُس کے نرم و ملائم بالوں کو ہوا کے تیز جھونکے رجب علی کے گالوں پر بکھیر رہے تھے اور رجب علی عمرِ رفتہ میں چلا گیا تھا۔ یہ تین نام، بٹالہ، چوہدری شاکر علی اور آسیہ، دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح اُس کے جسم کے ساتھ لگے اور وہ تڑپ کر شازی سے الگ ہو گیا۔

"کیوں؟" ۔۔۔ شازی نے گھبرا کر پوچھا ۔۔"کچھ نہیں شازی! کچھ نہیں۔۔۔۔ تم باتیں کرو۔ دل کی ساری باتیں کرو۔ مَیں نہیں سُنوں گا تو اور کون سُنے گا!"

★

شازی بولتی رہی اور رجب علی ہُوں، ہاں کرتا رہا۔ وہ اب شکرپڑیاں پر نہیں، سرحد پار بٹالہ کے ایک بڑے گاؤں میں پہنچ گیا جب وہ جوان تھا اور اس گاؤں کے تھانے کا سب انسپکٹر انچارج تھا۔ اپنے باپ کے اثر و رسوخ سے وہ اے۔ ایس۔ آئی بھرتی ہُوا اور تھوڑے سے ہی عرصے میں سب انسپکٹر بنا دیا گیا تھا۔ آگے اُس کی قابلیّت تھی اور زبان کا جادو جس نے اُسے شہرت اور لوگوں میں مقبولیت دی تھی۔ اُس زمانے میں دیہاتی علاقے کے تھانیدار کو علاقے کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار تھانیدار کو خوش رکھنے کا ہر طریقہ اختیار کرتے تھے۔

ملک رجب علی کے علاقے میں چوہدری شاکر علی بہت بڑا زمیندار تھا۔ اُس نے رجب علی کو دوست بنا لیا تھا۔ اُسے علاقے کے تھانیدار کی دوستی کی کچھ زیادہ ہی ضرورت تھی کیونکہ وہ صرف شرابی کبابی ہی نہیں تھا بلکہ اُس کے گہرے تعلقات نامی گرامی ڈکیتوں اور بردہ فروشوں کے ساتھ تھے۔ کبھی کبھی کوئی لڑکی اغوا ہو کر اُس کے ہاں کچھ دنوں کے لیے چھپائی جاتی تھی۔ چوہدری شاکر علی بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اپنے آپ کو جوان سمجھتا تھا۔

اُن دنوں ملک رجب علی بھی عیش و عشرت کو ہی جینے کا مقصد سمجھا کرتا تھا۔ چوہدری شاکر علی اُسے عیش و عشرت کا سامان مہیّا کرتا رہتا تھا۔ چوہدری شاکر کی ایک ہی بیوی تھی جس کی جوانی ڈھل گئی تھی۔ اُس نے دو بچّوں کو جنم دیا اور دونوں ایک ایک سال زندہ رہ کر مر گئے تھے۔ پھر اُس کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

بٹالہ میں انگریزوں کا پروردہ اور انگریزوں کے گُن گانے والا ایک اور خاندان تھا۔ انگریزوں کی خوشامد اور خوشنودی کو یہ خاندان مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ اس خاندان کی ایک لڑکی جس کا نام آسیہ تھا اتنی خوبصورت نکلی کہ رشتے کے امیدواروں کی قطار لگ گئی لیکن بولی جو چوہدری شاکر علی نے دی وہ کوئی اور امیدوار نہ دے سکا۔

آسیہ صرف خوبصورت نہیں تھی، وہ شوخ اور شرارتی تھی۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں اُس نے شغل کے طور پر تین چار چاہنے والوں سے اظہارِ محبت کیا اور اُن سب کے لیے سراب بن کر انہیں خوب چکّر دیئے۔ دو کو آپس میں ٹکرا دیا اور یہ تماشہ اُس نے خود بھی دیکھا اور اپنی سہیلیوں

کو بھی دکھایا۔ وہ ملتی ملاتی کسی ایک سے بھی نہیں تھی۔ ایسا تو اُس نے کئی بار کیا کہ اپنے دو چاہنے والوں کو کوئی جگہ اور وقت بتا کر کہا کہ وہ آجائے گی۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ پہنچ گئے۔ دوسرے دن آسیہ نے دونوں کو الگ الگ کہا کہ وہ وہاں گئی تھی لیکن اُس نے دُور سے دیکھا کہ وہاں فلاں بھی کھڑا تھا۔

قدرت اُسے تماشہ بنانے پر آئی تو چوہدری شاکر علی کو سامنے لے آئی جس کی عمر پچاس کے قریب پہنچ رہی تھی اور اُس کی پہلی بیوی زندہ تھی۔ ماں باپ نے آسیہ سے کہا کہ وہ اُسے چوہدری شاکر علی سے بیاہ رہے ہیں۔ آسیہ سُن ہو کے رہ گئی پھر وہ بم کی طرح پھٹی اور ماں باپ کو وہ سنائیں کہ وہ دبک گئے۔ ذرا ٹھنڈی ہوئی تو ماں اُسے الگ لے گئی۔

"بیٹی! چند برسوں کی بات ہے"۔۔۔ ماں نے اُسے کہا ۔۔"اُس کی جائیداد دیکھو۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں۔ ساری جائیداد تمہاری ہے۔۔۔۔ چوہدری شاکر بوڑھا نہیں ہو گیا۔ مرد اور گھوڑا مرتے دم تک جوان رہتے ہیں۔ تم خود ہوشیار ہو، عقل والی ہو۔ جائیداد پر قبضہ کرو پھر اپنی پسند کی شادی کر لینا۔ چند برسوں میں تم بُوڑھی تو نہیں ہو جاؤ گی۔ اٹھارہ انیس سال تو تمہاری عمر ہے۔"

آسیہ پھر بھی نہ مانی۔ وہ جذبات کو جائیداد پر قربان کرنے پر آمادہ نہ ہو سکی۔ اُس کا باپ جابر قسم کا آدمی تھا۔ اُس نے آسیہ کو قتل کی دھمکی دی اور ماں اُسے سبز باغ دکھاتی رہی۔ آسیہ کو پتہ چل گیا تھا کہ اُس کے باپ نے چوہدری شاکر سے نقد رقم طے کر لی ہے۔

آسیہ نے اپنے آپ کو ایسے جال میں اُلجھا ہُوا پایا جس سے نکلنا ممکن نہ تھا۔ اُس نے رضامندی کا اظہار نہ کیا اور انکار بھی نہ کیا ۔۔۔ اور اُسے ڈولی میں بٹھا کر چوہدری شاکر علی کے حوالے کر دیا گیا۔

★

ملک رجب علی کو یہ شادی اچھی طرح یاد تھی۔ وہ بھی بارات کے ساتھ گیا تھا۔ شبِ عروسی سے اگلی رات چوہدری شاکر نے اپنے خاص دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ اس ضیافت میں کھانا کم اور شراب زیادہ چلی تھی۔ انبالہ سے دو گانے والیاں بلائی گئی تھیں۔ ملک رجب علی بھی مدعو تھا۔

رجب علی نے آسیہ کو پہلے بھی دیکھا تھا۔ اب اُس نے چوہدری شاکر کے ہاں زیادہ ہی جانا شروع کر دیا تھا۔ آسیہ اُس کے سامنے آجاتی اور ہنستے مسکراتے ایک دو باتیں کر جاتی تھی۔ رجب علی نے معلوم کرایا تھا کہ بوڑھے چوہدری اور نوجوان آسیہ کی کیسے گزر رہی ہے۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ چوہدری شاکر تو دیوانہ ہو ہی گیا ہے، آسیہ چوہدری کے اُن خاص اور خفیہ آدمیوں پر بھی چھا گئی ہے جن کی بدولت چوہدری کا رعب داب قائم ہے۔

پھر آسیہ اس علاقے کی شہزادی کہلانے لگی۔ اس دوران اُس کی ملاقات رجب علی سے ہوئی۔ اُس نے بے تکلفی اور بے باکی سے رجب علی کے ساتھ باتیں کیں۔ رجب علی بھانپ گیا کہ یہ عام قسم کے ذہن کی لڑکی نہیں۔

ابھی ایک ہی سال گزرا تھا کہ ایک روز اطلاع ملی کہ چوہدری شاکر علی کی پہلی بیوی مر گئی ہے۔ وہ صرف تین دن بیمار رہی تھی۔ معدے اور سینے میں جلن بتاتی تھی۔ تین دنوں میں تین ڈاکٹروں نے باری باری دیکھا اور دوائیاں دیں مگر وہ جانبر نہ ہو سکی۔

ملک رجب علی جنازے پر گیا تو وہاں ایک ہنگامہ بپا تھا۔ مرنے والی کے بھائی اور چچیرے تائے لاٹھیاں اور کلہاڑیاں اُٹھائے کھڑے تھے۔ کہتے تھے کہ اسے زہر دے کر مارا گیا ہے اور زہر آسیہ نے دیا ہے۔ رجب علی نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے کہا کہ وہ تھانے رپورٹ درج کرانے آ رہے ہیں۔ چوہدری شاکر سے کہیں کہ میّت جنازے کے لیے نہ اٹھائے ورنہ ہم اُوپر جا کر درخواست دیں گے اور قبر سے لاش نکلوا کر پوسٹمارٹم کرائیں گے۔

اِن لوگوں نے تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرائی اور شک میں آسیہ، چوہدری شاکر اور ان کے دو خاص آدمیوں کے نام لکھوا دیئے۔ ملک رجب علی مجبور ہو گیا۔ وہ اِن لوگوں کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ چوہدری شاکر بہت پریشان تھا۔ اُس نے رجب علی کو پیغام بھیجا کہ وہ اِن لوگوں کی نہ سُنے، یہ لوگ شرارت کر رہے ہیں۔ اُس کی بیوی بیماری سے مری ہے۔ چوہدری شاکر نے پیغام کے ساتھ "منہ مانگا نذرانہ" دینے کی پیشکش کی تھی۔ رجب علی کو شک تھا کہ اگر اس عورت کو زہر ہی دیا گیا ہے تو یہ چوہدری نے دیا ہو گا۔ آسیہ کے حُسن و جوانی کا جادو ہی ایسا تھا۔

رجب علی نے لاش قبضے میں لے کر پوسٹمارٹم کے لیے بٹالہ بھیج دی لیکن رپورٹ میں تین چار دن لگ جانے کی توقع تھی کیونکہ معدے، جگر وغیرہ کے اجزا کا معائنہ لاہور ہوتا تھا۔ اِس دوران رجب علی نے چوہدری شاکر، آسیہ اور دو ملازموں کو شاملِ تفتیش کر لیا لیکن ایف۔ آئی۔ آر نہ بنائی۔ اس نے آسیہ کو تھانے بُلا لیا۔ ابھی ایسی کوئی ضرورت تو نہیں تھی لیکن اُس دَور میں رجب علی شریف نہیں ہُوا کرتا تھا۔ وہ آسیہ کو اپنے قریب لانا چاہتا تھا۔ آسیہ نڈر ہو کر آئی جیسے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں نہیں بلکہ رجب علی سے دوستانہ ملاقات کے لیے آئی ہو۔ اُس وقت رجب علی کی عمر تیئس چوبیس سال تھی۔

★

"دیکھو آسیہ"! ــــ رجب علی نے اُسے کہا ــ "کوئی گڑبڑ ہے تو مجھے بتا دو۔ چوہدری شاکر کے مجھ پر کچھ احسان ہیں۔ مجھے اندر اندر بتا دو۔"

"دیکھو ملک!" ــــ آسیہ نے ایسے بات کی جیسے رجب علی اُس کا ملازم ہو۔ اُس نے کہا ــ "لمبے چکر میں مت پڑو۔ چوہدری بے قصور ہے۔ اُسے کچھ پتہ نہیں۔ چوہدرانی زہر سے مری ہے ... اور ملک! اُسے مَیں نے زہر دیا تھا۔ زہر دینے والے نے کہا تھا کہ چوتھے، پانچویں، حد ساتویں روز مر جائے گی۔ کوئی ڈاکٹر اس کی بیماری کو نہیں سمجھ سکے گا۔ اگر مرنے کے بعد اس کے پیٹ کی چیر پھاڑ ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو پتہ نہیں چلے گا کہ اسے زہر دے کر مارا گیا ہے۔"

آسیہ نے ملک رجب علی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور انگلیاں اُس کی انگلیوں میں اُلجھا لیں۔ آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ اُس کے ہونٹوں پر نشیلی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ہونٹ نیم وا ہو گئے۔

رجب علی کی زندگی میں نہ جانے کتنی آئیں اور گزر گئی تھیں مگر ایک بھی ایسی نہ تھی جس نے اُسے یوں سُن کر لیا ہو جس طرح آسیہ نے کر لیا تھا۔

"نقد بھی دوں گی" ــــ آسیہ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ نشے میں ہو ــ "مَیں جانتی ہوں مَیں تمہارے دل کو بہت اچھی لگتی ہوں۔ مَیں اُن نظروں کو پہچانتی ہوں جن سے تم دیکھا کرتے تھے...

جس آدمی پر تمہیں شک ہو کہ میرے اُس کے ساتھ تعلقات ہیں اُسے میرے سامنے لے آؤ۔ مَیں بدنہیں بدنام ہوں۔ میرے جسم کو صرف میرا خاوند جانتا ہے۔ کوئی اور مائی کا لال یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ خاوند بوڑھا ہے تو کیا ہُوا۔ غیر مردوں کو میں بندروں کی طرح اپنے اشاروں پر نچایا کرتی ہوں۔ تمہارے پاس خود آ گئی ہوں۔"

آسیہ رجب علی پر ایک نشے کی طرح طاری ہو گئی۔ آسیہ ایک نایاب ہیرا تھی جو صرف رجب علی کو ملا۔

پھر ایسے ہی ہُوا جیسے آسیہ کہتی تھی کہ زہر دینے والے نے کہا تھا کہ کسی ڈاکٹر کو پتہ نہیں چلے گا کہ یہ عورت زہر سے مری ہے۔ لاہور سے ماہرین کی رپورٹ آئی جس میں انہوں نے کسی بیماری کا نام لکھ دیا۔ انہوں نے لکھا کہ کوئی ناموافق چیز کھانے سے معدے سے زہر اُٹھتا ہے۔ اگر اس کا فوری طور پر صحیح علاج نہ کیا جائے تو تین چار دنوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔

رجب علی نے چوہدری شاکر اور آسیہ کو بتایا کہ پوسٹ مارٹم میں زہر ثابت ہو گیا ہے۔ چوہدرانی کے لواحقین کو اُس نے بتا دیا کہ رپورٹ کیا آئی ہے اور یہ قتل کا کیس نہیں۔ اُدھر آسیہ کو وہ اشاروں پر نچاتا رہا اور بتاتا رہا کہ اُس نے اپنی نوکری کو خطرے میں ڈال کر پوسٹمارٹم رپورٹ دبا کر رکھی ہوئی ہے۔ آسیہ بہت ہوشیار لڑکی تھی لیکن پولیس کی بھول بھلیاں اور تاریک غاروں سے واقف نہیں تھی۔

"خوش نہ ہونا ملک کہ میں مجبور ہو کر تمہاری داشتہ بن گئی ہوں" ــــ ایک روز آسیہ نے اُسے کہا ــ "تم میرے دل کو اچھے لگتے ہو ... میرا خیال تھا کہ میرے بطن سے کوئی بچّہ پیدا نہیں ہو گا لیکن مَیں اب تمہارے بچّے کو جنم دوں گی۔"

اس سے چار پانچ ماہ بعد رجب علی کو اِس تھانے سے ہٹا کر دوآبے کے کسی تھانے میں بھیج دیا گیا۔

★

رجب علی شازی کے پاس بیٹھا آسیہ کے تصوّر میں گُم ہو گیا تھا۔ شازی کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھی اور رجب علی کا ایک ہاتھ کبھی اُس کے بالوں پر چلا جاتا کبھی اُس کی پیٹھ پر پھرنے لگتا۔ ساون کی نمی نے چاندنی کو پُوری طرح شفّاف کر رکھا تھا۔ رجب علی نے شازی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ یہ آسیہ کا چہرہ تھا۔ آنکھوں میں آسیہ کی جوانی والا طلسماتی تاثر تھا۔

دوسرے تھانے میں جا کر وہ آسیہ کے تصوّروں میں کھویا رہتا۔ اُس نے آسیہ کے گاؤں جانے کی بہت کوشش کی لیکن دوآبے کا یہ علاقہ ڈکیتی، رہزنی اور قتل کے لیے مشہور تھا۔ اتنے کیس آتے تھے کہ رجب علی کو سونے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔

دو اڑھائی سال بعد رجب علی کا تبادلہ مزید دُور ہو گیا، پھر وہ سب انسپکٹر سے انسپکٹر ہو گیا اور اُسے اور دُور بھیج دیا گیا۔ پانچ چھ سال بعد اُسے بٹالہ کے علاقے کا ایک سب انسپکٹر ملا۔ اُس نے بتایا کہ چوہدری شاکر کو مرے دو سال ہو گئے ہیں۔ آسیہ نے اُس کی تمام جائیداد اُس کے مرنے سے پہلے اپنے نام لکھوالی تھی اور اب آسیہ اُس علاقے پر حکمرانی کرتی ہے۔

دو اور سال گزر گئے۔ رجب علی کو کسی سرکاری کام سے دو چار دنوں کے لیے امرتسر جانا پڑا اور اُسے اتفاق سے آسیہ تانگے میں جاتی نظر آگئی۔ وہ رُک گئی اور تانگے سے اُتر آئی۔ اُس کے ساتھ سات سال کے لگ بھگ عمر کی ایک بچّی تھی جس کے دُودھ کے دانت گرے ہوئے تھے۔ بڑی پیاری بچی تھی۔

"اپنی بیٹی کو نہیں پہچانا؟" — آسیہ نے کہا — "یہ تمہاری نشانی ہے۔ بڑے پیار سے پال رہی ہوں۔"

"کیسے گزر رہی ہے؟"

"اکیلے!" — آسیہ نے کہا — "کبھی آ کے دیکھو۔ نوکر چاکر غلاموں کی طرح سجدے کرتے ہیں" — اُس نے تین ایسے آدمیوں کے نام لیے جو اُس علاقے کے بدمعاش اور جرائم پیشہ تھے۔ اُس نے کہا — "وہ میرے باڈی گارڈ ہیں۔ ... غلط نہ سمجھنا ملک! اُن کا وظیفہ لگا رکھا ہے۔ وہ بھی میرے غلام ہیں۔ تم انہیں جانتے ہو۔ سارا علاقہ اُن سے ڈرتا ہے۔"

رجب علی جلدی میں تھا۔ زیادہ باتیں نہ ہو سکیں پھر ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے اور پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔

"آپ کھوئے کھوئے کیوں ہیں؟" — شازی نے اُس سے پُوچھا اور جیسے اُسے اچانک یاد آگیا ہو۔ اُس نے کہا — "آپ ہمارے آدمی ہیں۔ میری امّی کو آپ جانتے ہوں گے۔"

"جانتا ہوں" — رجب علی نے کہا — "لیکن میری فیلڈ تم لوگوں سے مختلف ہے اس لیے عرصے سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ مَیں اُسے ملنا چاہوں گا۔"

"ابھی چلے چلیں۔"

اور رجب علی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ شکرپڑیاں سے اُترے اور کار میں بیٹھ کر ایک عام سی کوٹھی کے پورچ میں جا رُکے۔ شازی رجب علی کو ایک کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک عورت بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔

"امّی!" — شازی نے کہا — "یہ ہیں ملک رجب علی۔"

عورت نے سر اُٹھایا اور اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھی۔ رجب علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"اس عمر میں بھی تم اُسی طرح حسین ہو" — رجب علی نے کہا — "یہاں مَیں تمہیں بیگم ادریس نہیں کہوں گا آسیہ! .... مجھے آسیہ ہی کہنے دو۔"

آسیہ نے شازی کی طرف دیکھا اور بولی — "تم جاؤ شازی! مَیں تمہیں بُلا لوں گی" — شازی چلی گئی تو آسیہ نے رجب علی سے کہا — "بیٹھو ملک!" — اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ بولی — "اپنی بیٹی کو پہچانا ہے یا نہیں؟"

"اب پہچان لیا ہے" — رجب علی نے کہا۔

"کیا ہو اب؟" — آسیہ نے پُوچھا — "ڈی۔ ایس۔ پی یا ایس۔ پی؟"

"کچھ بھی نہیں" — رجب علی نے کہا — "تمہارا ساتھی ہوں لیکن تمہیں معلوم نہیں۔ میری فیلڈ دوسری اور رنگ دوسرا ہے۔"

"ملک!" — آسیہ نے سنجیدگی اور قدرے رُعب سے کہا — "اگر دھوکہ بن کر آئے ہو تو بہت بڑا دھوکہ کھاؤ گے.... اور یاد رکھنا کہ شازی تمہاری اپنی بیٹی ہے۔"

"اوہ آسیہ!" — ملک رجب علی نے شگفتہ لہجے میں کہا — "اتنی سنجیدگی؟ اتنا شک؟.... میں پولیس کا نہیں تمہارا آدمی ہوں۔ تمہارا ساتھی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔"

"ملک اللہ یار خان کے بیٹے کو میں اپنا وفادار ساتھی سمجھ ہی نہیں سکتی" — آسیہ نے کہا۔

"تم میرے والد صاحب کو جانتی ہو؟" — ملک رجب علی نے صوفے پر بیٹھتے ہُوئے کہا۔

"مَیں کیسے نہیں جانتی!" — آسیہ نے کہا۔

"تم مجھے جانتے ہُوئے بھی نہیں جانتیں" — ملک رجب علی نے کہا — "تم بھول گئی ہو کہ میں اپنے باپ سے کس قدر مختلف ہُوا کرتا تھا.... لیکن آسیہ! اتنی پرانی باتوں کو بھُول جاؤ۔ یہ دیکھو کہ میں آج کیا ہوں۔ ہم دونوں، تم اور میں دریا کے ایک ہی پتن پر کھڑے ہیں۔ ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ اکٹھے تیریں گے، اکٹھے ڈوبیں گے۔"

آسیہ کو دیکھ کر رجب علی کو وہ آسیہ یاد آگئی جس نے اپنے آپ کو رشوت کے طور پر پیش کیا تھا۔ رجب علی کو وہ وقت یاد آگیا تھا جب آسیہ نے اپنے آپ کو اُس کی ملکیت میں دے دیا تھا — وہ ایک بُوڑھے خاوند کی نوجوان بیوی تھی۔ وہ اپنی سوکن کی قاتل تھی۔ اُس کے سامنے عمر قید تھی — اور وہ رجب علی کے رحم و کرم پر تھی مگر اب وہ آسیہ یوں بات کر رہی تھی جیسے رجب علی اُس کے رحم و کرم پر ہو۔

"میری ایک بات غور سے سن لو ملک!" — آسیہ نے کہا — "مجھے تم سے کوئی ڈر نہیں میں اپنے آپ کو اور اپنی بیٹی کو گرفتاری سے بچانے کی کوشش نہیں کروں گی، میں تمہیں بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تم جس راستے سے یہاں تک پہنچے ہو اُسی راستے سے واپس چلے جاؤ۔"

"تمہیں یہ شک کیوں ہو رہا ہے کہ میں تمہیں گرفتار کرنے...."

"ملک رجب علی خان!" — آسیہ نے اُسے یُوں ٹوک دیا جیسے رجب علی ملزم یا مشتبہ ہو — "تمہاری بات بعد میں سنوں گی، پہلے میری سن لو۔ میں تمہارے دل سے وہ ساری خوش فہمیاں اور وہ سارے شکوک نکال دینا ضروری سمجھتی ہُوں جو تمہیں یہاں لے آئے ہیں۔"

اتنی خود اعتمادی؟ اتنی جرأت؟ — رجب علی کو یوں لگا جیسے آسیہ کے نقش و نگار بدل گئے ہوں۔ اس عمر میں بھی اُس کے چہرے پر جوانی کے آثار اس حد تک موجُود تھے کہ اُس کی عمر دھوکہ دیتی تھی لیکن اب اُس کا یہ انداز دیکھ کر رجب علی کو وہ نوجوانی سے بھی زیادہ حسین نظر آنے لگی۔ وہ دبک سا گیا۔ وہ اس گروہ کو جسے رِنگ کہا جاتا ہے، پکڑنے کے لیے ہی ملک ناصر کے ذریعے اس گروہ میں شامل ہو گیا تھا مگر آسیہ کی باتیں اور اُس کا یہ بے خوف اور پُر اثر انداز دیکھ کر اُس نے محسوس کیا کہ وہ آسیہ کو نہیں پکڑ سکے گا اور اُسے یہ احساس بھی ہُوا کہ جاسوس اُن مجرموں جیسے نہیں ہوتے جن کے ساتھ رجب علی کا واسطہ پڑتا رہا ہے۔ آسیہ کی خود اعتمادی اور جرأت نے اُسے ہِلا کے رکھ دیا۔

"میں تمہاری جرأت کی تعریف کروں گا آسیہ!" — رجب علی نے اُسے کہا — "لیکن مجھ پر اعتبار کرو، میں نے پولیس سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اب...."

آسیہ نے عجیب سی ہنسی سے کہا — "جرأت.... کوئی بُزدل ایسے لوگوں میں جا بیٹھے جو اپنی

کمزوریوں پر ناز اور فخر کرتے ہوں تو وہ بزدل بہادر ہو جاتے گا۔ اُس میں جرأت آجائے گی.... تم بزدل اُسے کہتے ہو جس میں دلیری نہ ہو۔ میں بزدل اُسے کہتی ہوں جسے اپنی کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے۔ میں اتنی دلیر نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ ایک عورت میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی جتنی تم مجھ میں دیکھ رہے ہو۔ عورت اپنا گھر برباد کر سکتی ہے۔ میری طرح چوری چھُپے اپنے خاوند اور اپنی سوکن کو زہر دے سکتی ہے لیکن وہ ایک ملک کی جڑیں نہیں کاٹ سکتی جس طرح میں تمھارے ملک کی کاٹ رہی ہُوں۔"

"خاوند کو بھی زہر دے سکتی ہے؟" — رجب علی نے کہا — "تم نے تو اپنی سوکن کو زہر دیا تھا!"

"اپنے خاوند کو بھی میں نے زہر دے کر مارا تھا" — آسیہ نے یوں کہا جیسے اُس نے انسان کی بجائے دو مکھیاں ماری ہوں — "تم اُس وقت کسی اور تھانے میں چلے گئے تھے۔ خاوند کو میں نے کبھی احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اُسے بُوڑھا سمجھتی ہُوں بیں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر اُسے اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ جوان ہے اور میں اُس پر دل و جان سے فدا ہوں.... ملک رجب علی! اس حقیقت سے تم انکار نہیں کرو گے کہ عورت اور شراب جب اکٹھے ہو جاتے ہیں تو تم جیسے زہریلے ناگوں کا بھی زہر بے اثر ہو جاتا ہے اور ناگ پھن پھیلا کر جھومنے لگتے ہیں میرے خاوند جیسے بوڑھے آدمی تو اس نشے کو فوراً قبول کرتے اور اپنے ہاتھوں زہر کا پیالہ پی لیتے ہیں۔"

آسیہ بول رہی تھی اور رجب علی پر جیسے نشہ طاری ہو گیا تھا۔ آسیہ نے اُسے ہپناٹائز کر لیا تھا۔

"اُس بوڑھے پر جس نے مجھے میرے ماں باپ سے خرید کر بیوی بنا لیا تھا، میں نے ایک رات اپنا اور شراب کا ایسا نشہ طاری کیا کہ اُس نے جھومتے ہُوئے لڑکھڑاتی زبان میں کہانیوں والے بادشاہوں کی طرح کہا — 'مانگ کیا مانگتی ہے' — میں نے کہا — 'ساری جائیداد' — اور دو روز بعد تمام جائیداد' زمین، مکان وغیرہ کی ملکیت بدل گئی۔ اب مالک آسیہ تھی — سیاہ کی بھی سفید کی بھی — میں نے اِسی روز کے لیے اپنے جذبات کو تنور میں ڈالا تھا۔ ان کی راکھ سے جس آسیہ نے جنم لیا وہ ایک خوبصورت ڈائن تھی۔ میں نے خاوند کی شراب میں وہی زہر ڈال دیا جو اُس کی پہلی بیوی کو دیا تھا۔ دو روز بعد اس کا اثر شروع ہو گیا۔ میں تیسرے روز بٹالہ سے ڈاکٹر گردھاری لعل کو یہ بتا کر گھر لائی کہ میرا خاوند دیسی شراب پی پی کر تباہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے اُسے اچھی طرح دیکھا اور مجھے الگ کر کے کہا کہ اس شخص نے شراب سے اپنا جگر جلا لیا ہے اور اس کا بچنا مشکل ہے....

"ڈاکٹر نے میرے خاوند کی تسلی کے لیے دوائیاں دے دیں جو میں نے خاوند کو تھوڑی تھوڑی دیں تاکہ وہ صحت یاب نہ ہو جائے۔ وہ چار روز بعد مر گیا۔ میں نے جس دیوانگی سے اس کی تیمارداری کی اس کے چرچے سارے گاؤں میں ہُوئے۔ لوگ کہتے تھے کہ بے چاری رات رات خاوند کے ساتھ جاگتی ہے۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے سو گیا۔"

"اُس کے رشتہ داروں نے شور نہیں مچایا تھا کہ مرنے والے کو زہر دیا گیا ہے؟"

"نہیں" — آسیہ نے کہا — "سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ زیادہ شراب پینے سے جگر جل گیا ہے۔"

"اس کے بعد کیا ہُوا تھا؟" — رجب علی نے پُوچھا — "تم نے اکیلے زندگی کس طرح گزاری؟"

"میں تمھیں بیان نہیں دے رہی ملک!" — آسیہ نے کہا — "میں دلیری اور بزدلی کی بات کر رہی تھی اور میں تمھیں بتا رہی تھی کہ میں تم سے کیوں نہیں ڈرتی.... مجھ میں اتنی جرأت نہیں جتنی تم سمجھتے ہو۔ میری جرأت یہ ہے کہ پاکستان کے حاکموں کی رگیں کمزور ہیں۔ تم پولیس آفیسر رہ چکے ہو۔ تم نے ایک وقت مجھ پر احسان کیا تھا۔ میں نے احسان کی قیمت ادا کر دی تھی پھر بھی تمھیں کام کی ایک بات بتا دیتی ہوں۔ تم چھوٹے چھوٹے جاسوسوں کو گرفتار کر سکتے ہو جو دراصل سمگلر ہوتے ہیں۔ وہ سرحد کے قریب قریب کی اطلاعیں حاصل کرتے ہیں مگر تم میری سطح کے جاسوسوں کو ہاتھ نہیں ڈال سکتے کیونکہ ہمیں تمھارے اوپر والوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ میری کوٹھی کی تلاشی لے سکتے ہو۔ تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ میرے سینے میں جو کچھ ہے اسے تمھارا قانون دیکھ نہیں سکتا، پکڑ نہیں سکتا۔"

"تم نے مجھے بچہ سمجھ لیا ہے" — رجب علی نے کہا — "میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ذرا میری بھی سن لو۔"

"سُنوں گی ملک!" — آسیہ نے کہا — "تمھاری سن کر تمھیں یہاں سے رخصت کروں گی... میں کہہ رہی تھی کہ اپنے ملک کو جاسوسوں سے پاک کرنا چاہتے ہو تو اپنے حاکموں اور وزیروں سے کہو کہ اپنا ایمان پکّا کریں۔ تم شاید نہیں جانتے کہ تمھارے باپ نے اور اٹھارہ سال پہلے کے بالوں اور اُن کے بیٹوں اور بیٹیوں نے پاکستان تو بنا لیا ہے لیکن اس کی حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں آئی وہ پاکستانی بننے کی بجائے صرف حاکم بنے۔ وہ بادشاہ بن گئے۔ چونکہ بادشاہ عیش و عشرت کیا کرتے ہیں اس لیے وہ عیش و عشرت میں پڑ گئے۔"

"اور وہ عورت اور شراب کے رسیا ہو گئے" — ملک رجب علی نے اُس کی بات مکمل کر دی۔

"دولت" — آسیہ نے کہا — "اصل چیز دولت ہے۔ دولت ہے تو سب کچھ ہے۔ ہر نشہ دولت سے خریدا جا سکتا ہے.... تم مجھے گرفتار کر کے اپنا فرض ادا کر دو گے لیکن اوپر جا کر تمھاری دیانتداری اور فرض شناسی کو دولت بیکار کر دے گی.... تم بڑی طاقتوں کے اشاروں پر ناچنے والے بھکاری جنگ کی باتیں کرتے ہو۔ تم نے کشمیر میں کمانڈو اپریشن شروع کر رکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کامیاب ہو۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجی جانیں قربان کر رہے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کسی قوم نے اتنے دلیر فوجی پیدا نہیں کیے جتنے دلیر پاکستان اور آزاد کشمیر نے پیدا کیے ہیں لیکن وطن کی آن پر قربان ہونے والے یہ فوجی نہیں جانتے کہ وہ ایک تلوار کی مانند ہیں جس کا دستہ حکمرانوں کی مُٹھی میں ہے اور حکمران اُن کی مٹھی میں ہیں جن کا وہ دیا کھاتے ہیں۔ حکمران جب چاہیں گے اس تلوار کو نیام میں ڈال لیں گے۔"

"لیکن پاکستانی قوم ایسی تلوار نہیں جو کسی اور کی مرضی سے نیام میں چلی جائے" — رجب علی نے کہا۔

"بہت جذبہ ہے تمھاری قوم میں" — آسیہ نے کہا — "یہ میں دیکھ رہی ہوں۔ ہندوستان کے حکمران اسی خطرے سے ڈرتے ہیں۔ خود پاکستان کے حکمران اپنی قوم کے جذبے سے پریشان ہیں مگر قوم بے بس ہے۔ قوم کو گمراہ کیا جاتا ہے۔"

"تم اتنی عقلمند کس طرح ہو گئی ہو آسیہ؟"

"مردوں نے عقل دی ہے ملک!" — آسیہ نے کہا — "دراصل میں عقلمند نہیں، تم مرد بے عقل ہو۔ خولصورت عورت مردوں کی عقل پر چھا جایا کرتی ہے.... ایک اور بات بتا دوں ملک! وعظ اور لیکچر نہ شروع کر دینا کہ تم مسلمان کی اولاد ہو، اسلام کی بیٹی ہو اور تم ہندوؤں کے حق میں ایک اسلامی ملک کی جڑیں کاٹ رہی ہو.... مجھ پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ مجھے تم پر ہنسی بھی آئے گی اور غصّہ بھی۔ جس شوخ، چنچل اور نوجوان لڑکی کو تم پچاس سال کی عمر کے شرابی کبابی کے ہاتھ بیچ ڈالو تو اُس کے جذبات کے ساتھ اُس کا دین اور ایمان بھی مر جاتا ہے۔ اُس پر کسی عالم کا وعظ اور کسی عامل کا تعویذ کوئی اثر نہیں کرتا۔ ناگن کی طرح اُس کے اندر زہر بھر جاتا ہے۔ تم جانتے ہو ملک! ماں تقدّس اور عقل و دانش کی دیوی ہوتی ہے۔ ہر بیٹی اپنی ماں

کی پوجا کرتی ہے۔ بیٹی خُدا کے حکم کی خلاف ورزی کر گزرتی ہے لیکن ماں کی ہر بات کو وہ حکم کا درجہ دیتی اور اس کی تعمیل کرتی ہے۔ میرے باپ نے میری نقد قیمت وصول کی اور ماں نے مجھے کہا کہ تمھارا خاوند بوڑھا ہے۔ کچھ سالوں بعد مر جائے گا پھر اُس کی ساری جائیداد تمھاری ہوگی، اور تم اپنی پسند کے کسی آدمی کے ساتھ شادی کر لینا....

"اور ملک رجب علی! تمھاری کوئی بیٹی ہوتی تو تمھیں معلوم ہوتا کہ خُدا اور رسولؐ کے بعد بیٹی اپنے باپ کو درجہ دیا کرتی ہے۔ میں انہی بیٹیوں میں سے تھی جو اپنے باپ کو اپنا محافظ اور دنیا کا سب سے بہادر اور عقلمند آدمی سمجھا کرتی ہیں مگر میرے باپ نے اپنے ہاتھوں مجھے اُس آدمی کے قدموں میں پھینک دیا جسے تم نے دیکھا تھا۔ پھر ہُوا کیا؟ مجھے سبق کیا ملا؟ صرف یہ کہ دھوکہ کھاؤ اور دھوکہ دو۔ ماں نے مجھے فریب کاری کے راستے پر ڈالا۔ باپ نے کچھ کہے بغیر مجھے سبق دیا کہ باپ ہو یا خاوند سب فریب اور حرص ہے۔ میں نے یہ گناہ کیا کہ اپنے خاوند کی پہلی بیوی کو زہر دے دیا۔ میں نے تمھیں بتا دیا تو تم نے کہا کہ آہ آسیہ! تم نے بڑا بھیانک جرم کیا ہے۔ آؤ ایک بڑا خولصورت گناہ کرتے ہیں۔ تمھارا یہ گھناؤنا جرم اس کے سائے میں گم ہو جائے گا....

"تم سے مجھے یہ سبق ملا کہ میں اتنی خولصورت ہُوں اور مجھ میں اتنی دلکشی ہے کہ میں قتل بھی بخشوا سکتی ہوں اور میں تھانیداروں کو شیشے میں اتار سکتی ہُوں۔ تم غیر مرد تھے نا ملک! میری ازدواجی زندگی میں پہلے غیر مرد تم ہی تھے۔ عورت قتل کر سکتی ہے، قتل ہو سکتی ہے لیکن عصمت کا موتی کسی غیر مرد کے قدموں میں نہیں پھینک سکتی، خاوند چاہے کیسا ہی ہو.... تم نے میری یہ جھجک دُور کر دی اور مجھے صاف بچا لیا۔ میں نے اپنی سوکن سے اور اپنے خاوند سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ سوچ لیا تھا لیکن ایسی سوچ کو دل میں نہیں آنے دیا تھا کہ اپنے جذبات کی تسکین کے لیے کسی اپنے جیسے خوبرو جوان کے ساتھ چوری چھُپے یارانہ گانٹھ لوں۔ مجھے چاہنے والے ملے تھے۔ میرے خاوند کے دو بھتیجوں اور ایک بھانجے نے مجھے آنکھوں سے، اشاروں سے، مسکراہٹوں سے اور ادھوری ادھوری، گول گول باتوں سے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس بڈھے کھوسٹ کے ساتھ کب تک جلتی رہو گی۔ ان میں سے ایک نے تو مجھے صاف لفظوں میں محبت کی دعوت دی تھی....

"یہ تینوں خولصورت جوان تھے مگر ان سے مجھے نفرت سی ہو گئی تھی۔ میں اب مزید فریب نہیں کھانا چاہتی تھی۔ اب میری باری تھی کہ میں فریب دوں۔ میں بہت شوخ، شرارتی اور چنچل لڑکی ہُوا کرتی تھی لیکن

میں جب کسی کے قتل کی خبر سنتی تھی تو میں کانپ جایا کرتی اور کئی کئی دن میری طبیعت ٹھکانے نہیں آیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی میں خواب میں ڈر جایا کرتی تھی مگر میں نے دو انسانوں کو قتل کر دیا اور مجسّم فریب بن کر اتنی زیادہ جائیداد کی مالک بن گئی۔ کسی ماں نے کبھی جاسوس، ڈاکو، ٹھگ یا پیشہ ور دھوکے باز کو جنم نہیں دیا۔ مجھ پر جو بیتی ہے، اس پر غور کرو تو سمجھ جاؤ گے کہ اسلام کی بیٹی ایک اسلامی ملک کی جڑیں کیوں کاٹ رہی ہے"۔

"میرا کوئی مذہب نہیں ملک! یہ بھی نہ سمجھنا کہ میں ہندوؤں کی وفادار اور مسلمانوں کی دشمن ہوں۔ تم چاہو تو میں مسلمانوں کی وفادار اور ہندوؤں کی دشمن بن جاؤں گی۔ حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ میں ہندوستان کی ہو کے رہ گئی۔ میں اِدھر آ جاتی تو میری ذہنیت مجرمانہ ہی رہتی۔ جاسوس نہ بنتی کچھ اور بن جاتی۔ مجھ سے خیر اور برکت کی توقع نہ رکھو ملک! مجھ میں جذبات نہیں رہے۔ میں انسان نہیں رہی۔ تمھیں اپنے ملک سے محبت ہوگی۔ میرے دل میں کسی ملک کی محبت نہیں۔ اپنی بیٹی کے سوا مجھے کسی سے پیار نہیں"۔

ملک رجب علی ہنس پڑا اور بولا — "اگر تمھیں اپنی بیٹی سے پیار ہے تو اس پیار میں میرا حصّہ بھی ہے۔ شازی میری بیٹی ہے"۔

"نہ ملک!" — آسیہ نے کہا — "بیٹی کو تم سے پیار ہوگا۔ خون نے خون کو پہچان لیا تھا"۔

"کیا تم اسے بتاؤ گی کہ یہ میری بیٹی ہے؟"

"میں نے ابھی سوچا نہیں" — آسیہ نے کہا — "میں نے ابھی کچھ بھی نہیں سوچا ملک! میں نے اسے اس لائن پر ڈالا تو ہے لیکن لڑکی جذباتی ہے۔ میں اسے واپس بھیج دوں گی۔ اسے تو میری طرح پتھر ہونا چاہیئے تھا لیکن اس نے تمھیں سمجھے بغیر اپنا آپ ظاہر کر دیا ہے" — آسیہ نے آہ بھری اور چپ ہو کر ملک رجب علی کو دیکھنے لگی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور اُس نے پوچھا — "تم اپنی بیٹی کو گرفتار کرو گے؟"

ملک رجب علی اُٹھ کھڑا ہُوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر ٹہل کر رُک گیا اور نظریں آسیہ پر گاڑ دیں۔

"میں کسی کو بھی گرفتار نہیں کروں گا" — ملک رجب علی نے کہا — "لیکن میں اپنی بیٹی کو ہندوستان نہیں جانے دوں گا"۔

"اگر تم واقعی ہندوستان کے جاسوس ہو تو خود ہندوستان نہیں جاؤ گے؟"

"ہمیشہ کے لیے تو نہیں جاؤں گا" — رجب علی نے جواب دیا — "میرا مستقل ٹھکانہ لاہور میں ہے۔ وہی میرا اڈہ ہے۔ میں ہندوستان گیا تو چند دنوں کے لیے جاؤں گا۔ اپنی بیٹی کو نہیں جانے دوں گا"۔

"پاگل نہ بنو ملک!" — آسیہ نے کہا — "شازی سے دُور رہنا۔ تم اپنا کام کرو۔ ہمیں پکڑوا دو۔ اپنی بیٹی کی عزت کا خیال ہے تو چلے جاؤ اور ہمیں بھول جاؤ"۔

○

ملک رجب علی کے لیے یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ اُسے اس گروہ کو پکڑوانا تھا لیکن شازی اُس کے لیے ایسی دیوار بن گئی تھی جسے گرانا اُس کے بس میں نہیں تھا۔

"کیا ملک ناصر نے تمھیں میرے متعلّق کچھ نہیں بتایا؟"

"میں چار پانچ دنوں سے اُسے ملی نہیں" — آسیہ نے جواب دیا — "میں پرسوں واپس آئی ہُوں"۔

"اُس سے پوچھتی رہنا میں کون ہوں اور کیا ہُوں" — ملک رجب علی نے کہا — "میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ میں تمہارے گروہ میں کس طرح شامل ہُوا ہُوں۔ میں نے شازی کو غلط بتایا ہے کہ میری فیلڈ دوسری ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ لڑکی جذباتی ہے۔ میں اسے کہہ بھی چکا ہُوں کہ اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دے ورنہ بہت بُرا نقصان اٹھائے گی۔"

رجب علی نے عبدالجلیل خان سے بات شروع کی کہ کس طرح اُس نے عبدالجلیل کو ایذا رسانی سے مار ڈالا تھا۔ اُس نے رادھا اور کرن کے قتل کی واردات سُنائی۔ عبدالجلیل کی بیوی سلمٰی سے ملاقات اور شادی کا قصّہ سنایا۔ سلمٰی کے بیٹے کیپٹن اصغر کا ذکر کیا اور آخر میں ملک ناصر سے اپنی ملاقات کی تفصیل سُنا کر کہا کہ وہ اس کے رنگ میں شامل ہوگیا ہے۔ یہ روئیداد اُس نے کچھ جھوٹی باتیں شامل کر کے اور ایسے انداز سے سنائی جیسے وہ پاکستان سے نالاں ہے اور وہ اس ملک کے خلاف جاسوسی کر کے مسّرت اور سکون محسوس کرے گا۔ وہ ڈی۔ ایس۔ پی رہ چکا تھا۔ رنگ آمیزی اور فریب کاری میں مہارت رکھتا تھا۔ اُس نے آسیہ کو متاثر کر لیا۔

"اب تم مِل گئی ہو" — اُس نے کہا — "اور اپنی بیٹی مل گئی ہے۔ اب تو مجھے اس کام میں روحانی سکون ملے گا۔ مجھ پر شک کر کے میرا دل نہ توڑو آسیہ! مجھے اس راستے پر ڈال دو۔ میرا نام ملک ناصر نے ہندوستانی سفیر کو بھیج دیا ہے۔"

"اگر تم ہماری انٹیلی جنس کے آدمی ہو اور اگر تم اس کام کی کچھ سُوجھ بُوجھ رکھتے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ اس کام میں ہر کسی پر شک کرنا لازمی ہے" — آسیہ نے کہا — "تم کہو گے کہ میں نے اتنی زیادہ باتیں بیکار کی ہیں نہیں ملک! میں نے ایک بھی بات بیکار نہیں کی۔ ایک تو یہ کام ایسا ہے کہ ہر کسی پر شک کرنا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ میری فطرت ایسی بن گئی ہے کہ میں ہر نئے مرد کو شک کی نگاہوں سے دیکھتی ہُوں اور جب کوئی مرد میرے جال میں آجاتا ہے تو یوں سمجھو کہ ایک مکھی مکڑی کے جالے میں آگئی ہے.... تم ابھی مجھے وہی آسیہ سمجھ رہے ہو جو ایک بوڑھے شرابی جاگیردار کی بیوی تھی۔"

"ہاں آسیہ!" — رجب علی نے مُسکرا کر کہا — "تم مجھے وہی آسیہ لگتی ہو.... نوجوان، خوبصورت.... تمہارے جسم کی بُو میرے وجُود میں ابھی تک موجُود ہے۔ تمہاری عمر آگے بڑھ گئی ہے اور تم بہت پیچھے رہ گئی ہو آسیہ!"

آسیہ کے ہونٹوں پر عجیب سی مُسکراہٹ آگئی۔ اس مُسکراہٹ میں مسّرت جیسا کوئی تاثر نہیں تھا باقی ہر تاثر اس میں موجُود تھا۔ طنز کا بھی، تلخی کا بھی، شاید اس میں غصہ بھی تھا۔

"اب نہیں ملک!" — اُس نے رجب علی سے کہا — "اب کاروبار ہی کاروبار ہے.... جس عورت کے ساتھ تم نے شادی کی ہے، کیا نام بتایا تھا؟.... سلمٰی.... اس کے ساتھ تمہیں واقعی محبّت ہے؟"

"ہاں آسیہ!" — رجب علی نے جواب دیا — "اُس سے مجھے دلی محبت ہے۔"

"کیا تم اُسے بتا رہے ہو کہ تم ہندوستان کی انٹیلی جنس کے لیے کام کر رہے ہو؟"

"اُسے بتانے نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا" — رجب علی نے جھوٹ بولا — "وہ سیدھی سادی عورت ہے۔ میری ذاتی سرگرمیوں کے ساتھ اُسے کوئی دلچسپی نہیں۔ اُسے معلوم ہے کہ میری

بے شمار زمین ہے اور ساری آمدنی اسی سے آتی ہے۔ اُس کا جوان بیٹا ہے، کیپٹن اصغر، وہ اسی کے تصوّر میں کھوئی رہتی ہے۔ میرے آگے کوئی رکاوٹ نہیں" — اُس نے مزید جھُوٹ بولا — "میں اگر اپنی کوٹھی میں اڈہ بنا لوں گا تو بھی میری بیوی کو پتہ نہیں چلے گا۔ اُسے اللہ میاں کی گائے سمجھو آسیہ!"

آسیہ ملک رجب علی کے اندازے سے کہیں زیادہ چالاک، ہوشیار اور مکّار تھی مگر رجب علی نے اپنی زبان کا جادو چلایا اور جہاں ضرورت محسوس ہُوئی وہاں جھوٹ بولے تو آسیہ کی گردن سانپ کی طرح سپیرے کے ہاتھ میں آگئی۔

○

"تم نے ٹریننگ کہاں سے لی تھی؟" — ملک رجب علی نے پوچھا۔

"ٹریننگ بہت بعد کی بات ہے" — آسیہ نے کہا — "صرف ٹریننگ سے اس کام میں کوئی آدمی مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کام کے لیے خاص قسم کے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرا ذہن ایسا نہیں تھا۔ وہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرا ذہن کس طرح بنا تھا۔ مختصر یہ کہ مجھے فریب دیا گیا اور میں فریب کار بن گئی۔"

"خاوند کے مرنے کے بعد تم پر کیا گزری تھی" — رجب علی نے پوچھا — "تم نے اکیلے زندگی کس طرح گزاری تھی؟"

آسیہ نے آہ بھری اور بولی — "انسان نیکی کرنے پر اُتر آئے تو وہ لوگوں کو حیران کر سکتا ہے، اور اگر انسان بدی پر اُتر آئے تو بدی کی بھی کوئی حد نہیں۔ میں نے جب اپنے خاوند کو بھی زہر دے دیا تو میری حالت یہ ہوگئی کہ رات کو میں خوف سے کانپنے لگتی تھی۔ کئی راتیں ایسی آئیں کہ آنکھوں میں کٹ گئیں۔ شازی چھوٹی سی تھی۔ اسے میں اپنے سینے سے چپکا لیا کرتی تھی لیکن اسے میں نے کبھی محسوس تک نہ ہونے دیا کہ میں خوف سے مری جا رہی ہوں۔ میری ماں آئی ہوتی تھی۔ باپ بھی آگیا تھا۔ دونوں آٹھ دس دن میرے پاس رہے۔ ان دنوں میں نہ ڈری....

"میں نے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو میرے دِل میں نفرت کا طوفان اُمڈ آیا۔ وہ تنہائی میں میرے پاس آیا تو میں بے قابو ہوگئی۔ میں نے اُسے کہا — 'میں مگرمچھ کے آنسو سُنا کرتی تھی۔ آج دیکھ لیے ہیں۔ کیا لینے آئے ہو یہاں' — اُس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ بولا — 'کیا کہہ رہی ہو آسیہ بیٹی! میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ اپنے سینے سے لگا کے رکھوں گا' — میں نے کہا — 'اب مجھے کسی اور کے پاس بیچنے کا ارادہ ہے؟ میں ایک بار بک چکی ہُوں۔ آپ میری قیمت وصول کر چکے ہیں۔ میں نے اپنی قیمت وصول کر لی ہے۔ اس میں آپ کا کوئی حصّہ نہیں۔ آپ یہاں کچھ دن رہ کر چلے جائیں۔ میں سب کے سامنے آپ کی بے عزّتی نہیں کروں گی'....

"میری ماں نے خوب مکّاری دکھائی۔ عورتوں کے سامنے میرے گلے لگ کر ایسی روئی اور ایسے بَین کیے جیسے وہ خود بیوہ ہوگئی ہو لیکن رات کو اُس نے میرے پاس تنہا بیٹھ کر کہا — 'بیٹی! اللہ کا شکر ادا کر۔ بڑی جلدی تیری جان بخشی ہوگئی ہے۔ میں نے کہا نہیں تھا کہ یہ بڈھا مر جائے گا اور تُو جوان رہے گی۔ جائیداد اپنے قبضے میں کر لینا اور پھر اپنی پسند کا کوئی اپنے جیسا خاوند دیکھ لینا۔ دیکھ میری بات کتنی جلدی پوری ہُوتی ہے....

"اس کے بعد میری ماں نے اس قسم کی باتیں شروع کر دیں جیسے اپنے خاوند کی جائیداد کی مالک میں نہیں بلکہ میری ماں ہے اور میں اس جائیداد کی آمدنی ماں کو دیا کروں گی۔ باتوں باتوں میں وہ جاگیردارنی بن گئی۔ جب اُس نے کہا کہ اپنی سوکن کے زیورات مجھے دے دو، میں چھپا کر گھر لے جاؤں گی تو میرا دماغ پھر گیا۔ مجھے تو احساس ہی نہ رہا کہ یہ میری ماں ہے۔ میں نے کہا — 'تم ماں نہیں ڈائن ہو۔ کیا تم نے میری قیمت وصول نہیں کر لی تھی؟ جس روز تم نے مجھے اس بڈھے کے حوالے کر دیا تھا اُس روز تم سب میرے لیے مر گئے تھے۔ اب تم میری ہمدردی کے لیے نہیں اس جائیداد کے لیے آتے ہو جو میں نے خاوند سے حاصل کی ہے۔ میں نے ابّا سے بھی یہی کہا ہے تمہیں بھی یہی کہتی ہوں کہ اب آئی ہو، پھر یہاں نہ آنا'....

"ماں نے بہت پینترے بدلے، زبان کے کرتب دکھائے لیکن میں نے اُسے کہہ دیا کہ تم میرے ساتھ نہیں میری قبر کے ساتھ باتیں کر رہی ہو۔ مُردے کسی کی نہیں سُنا کرتے.... وہ غصّے سے بھری ہُوئی میرے گھر سے گئی۔ میرا باپ یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ آسیہ! تم عورت ذات ہو۔ دھوکہ کھاؤ گی۔ تمہارے خاوند کے رشتہ دار تمہیں اس جائیداد اور دولت پر سانپ بن کر نہیں بیٹھنے دیں گے۔ کوئی مشکل آن پڑے تو میرے گھر کا دروازہ کھلا رہے گا۔ میرے سوا تمہارے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں....

"وہ ٹھیک کہہ گیا تھا۔ میرے خاوند کے قریبی رشتہ داروں نے مجھے جائیداد کے معاملے میں پریشان کرنا شروع کر دیا۔ کبھی مجھے قانونی چارہ جوئی کی دھمکیاں ملتیں کبھی دو بزرگ آجاتے اور مجھے نصیحت کرتے کہ میں جائیداد کا کچھ حصہ اپنے خاوند کی پہلی بیوی کے باپ کو دے دوں جو ضعیف العمر ہو چکا تھا۔ یہاں سے میں راتوں کو ڈرنے لگی۔ میں جان گئی کہ جائیداد اور گھر میں جو زیورات ہیں یہ مجھے مروا دیں گے۔ ایک ڈر یہ بھی تھا کہ یہ لوگ میری بچی کو اٹھا لے جائیں گے....

"میرے لیے ایک پریشانی اور پیدا ہو گئی۔ میرے خاوند کے دو بھتیجے اور ایک بھانجا تھا جن کا میں پہلے ذکر کر چکی ہوں۔ تینوں خوبصورت جوان تھے اور میری دوستی کے خواہاں تھے۔ اُنہوں نے ہمدردوں کے بہروپ میں میرے پاس آنا شروع کر دیا۔ ان میں سے جو بھی آتا مجھے کہتا کہ وہ میری زمینوں کی دیکھ بھال کرے گا کیونکہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں ان کی نیّت سمجھتی تھی۔ دو چار مرتبہ میں اپنی مجبوریوں کی وجہ سے پھسل چلی تھی۔ مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت تھی لیکن میرے اندر سے ایک آواز آتی تھی کہ آسیہ! تم ایک مرد کے آگے جھک گئیں تو تمہیں ہر مرد کے آگے جھکنا پڑے گا۔ ان سے دامن بچا کے رکھنا...

"تم جانتے ہو ملک! عورت ایک بار پھسل جائے تو اُس کے پاؤں کوئی نہیں جمنے دیتا۔ میرے خاوند کے دونوں بھتیجوں اور بھانجے کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ میرا ان کے ساتھ خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں بوڑھے خاوند کی جوان بیوی اور اب بیوہ ہوں اس لیے میں اپنے جیسے کسی جوان آدمی کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ میں نے انہیں ٹھکرایا نہیں۔ ان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی۔ گاؤں میں ایک عورت تھی جو تھی تو ایک غریب سے کسان کی بیوی لیکن اونچی ذاتوں کے امیر کبیر آدمیوں کو انگلیوں پر نچا لیتی تھی۔ خُدا نے اُسے چہرے اور جسم میں کشش اور زبان میں جادو کا اثر دیا تھا۔"

"وہ بی مستانی تو نہیں تھی؟" — رجب علی نے پوچھا۔

"وہی تھی" — آسیہ نے کہا — "وہ بی مستانی ہی تھی۔ تم اُسے جانتے ہو؟"

"میں جب تمہارے علاقے کے تھانے میں تھا تو وہ میری مُخبر تھی" — رجب علی نے کہا — "وہ تو آسمان سے تارے توڑ لاتی اور زمین کی ساتویں تہہ سے بھید نکال لاتی تھی۔"

"میرے خاوند کے ساتھ اُس کا تعلق اُس وقت سے تھا جب وہ نوجوان تھی" — آسیہ نے کہا — "میں جب اس گھر میں آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے خاوند اور اُس کی پہلی بیوی پر رعب جھاڑا کرتی تھی حالانکہ اُس کی حیثیت نوکرانیوں جیسی تھی۔ میرے خاوند کے ساتھ اُس کا تعلق خفیہ سا تھا۔ میرے ساتھ وہ پیار کی باتیں کیا کرتی تھی۔ میں جب بیوہ ہو گئی تو بی مستانی میرے گھر میں اُسی طرح آتی رہی جس طرح پہلے آیا کرتی تھی۔ اب وہ میری مُٹھی چاپی کرنے لگی۔"

"میں جانتا ہوں تم کیا کہنے لگی ہو" — رجب علی نے مُسکرا کر کہا — "یہ تو ایسی عورتوں کا پیشہ ہوتا ہے۔ وہ ..."

"نہیں ملک!" — آسیہ نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا — "تم نے غلط سمجھا ہے۔ وہ تم جیسے کسی عاشق کے پیغام نہیں لاتی تھی.... ایک روز اُس نے مجھے کہا — 'یہ تین آدمی جو تمہارے گھر میں آتے ہیں تمہیں بدنام کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی لیکن ان کا تمہارے گھر آنا جانا لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ تمہارا چلن ٹھیک نہیں رہا' — میں نے اُسے بتایا کہ میں انہیں گھر میں آنے سے روک نہیں سکتی۔ ڈرتی ہوں کہ وہ مجھے پریشان کریں گے۔ اُس نے کہا کہ وہ ان کا بندوبست کر دے گی....

"تین روز بعد پتہ چلا کہ میرے خاوند کے ایک بھتیجے اور اُس کے بھانجے کی لڑائی ہو گئی ہے۔ دوسرا بھتیجا اپنے بھائی کی مدد کو پہنچا، پھر دونوں خاندانوں کے آدمی نکل آئے۔ اس لڑائی میں تین چار آدمی زخمی ہو گئے اور دونوں خاندانوں میں عداوت شروع ہو گئی۔ لڑائی بظاہر معمولی سی بات پر ہُوئی تھی لیکن اصل وجہ صرف بی مستانی کو معلوم تھی جو اُس نے بعد میں مجھے بتائی۔ اُس نے ایک کو دوسرے کے متعلق کہا کہ وہ کہتا پھر رہا ہے کہ آسیہ کی دوستی اُس کے ساتھ ہے اور آسیہ نے دوسرے کی بڑی بے عزتی کی ہے۔ دوسرے کو بھی اُس نے یہی بتایا۔ اس پر وہ معمولی سی کسی بات پر آپس میں ٹکرا گئے۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے تینوں کی بیویوں کے کانوں تک اپنی اُستادی سے یہ بات پہنچائی — 'تمہارے خاوند نے آسیہ کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے اور آسیہ نے اس کی بے عزتی کر کے گھر سے نکال دیا ہے' — اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ تینوں کے گھروں میں بھی لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے....

"ان کا میرے گھر میں آنا ختم ہو گیا.... میں نے تمہیں تفصیل سے نہیں بتایا کہ بی مستانی نے یہ کارنامہ کس طرح کیا تھا۔ اُس کے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے مردوں سے بچنے کے لیے داؤ پیچ اور پینترے بتا دیئے۔ اُس نے کہا — 'مرد اپنے آپ کو عورت کا حاکم سمجھتا ہے لیکن عورت ایک مُسکراہٹ اور آنکھ کے ایک اشارے سے مرد کو اپنے قدموں میں گرا سکتی ہے.... تم جیسی خوبصورت لڑکی تو بڑے بڑے حاکموں کو اپنے پیچھے پیچھے پھرا سکتی ہے' — اُس نے مجھے یہ مسکراہٹیں اور اشارے بتا دیئے۔ میں اُسے پیسے بھی دیا کرتی اور کپڑے بھی دیا کرتی تھی۔ اتنا اُسے کبھی کسی گھر سے

نہیں ملا تھا۔ وہ میری ملازمہ بھی بن گئی، مشیر بھی اور محافظ بھی....

"میرے خاوند نے تین، چار غنڈے بدمعاش بھی اپنے اثر میں رکھے ہُوتے تھے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ اس شخص کی زندگی کس طرح گزرتی تھی اور اُس کے بازو کتنے لمبے اور ہاتھ کہاں تک پہنچتے تھے۔ مجھے معلوم ہے، وہ تھانے میں جو بھی تھانیدار اور چھوٹا تھانیدار آتا تھا ان کا وہ وظیفہ لگا دیتا تھا"

"مجھے یاد ہے" — ملک رجب علی نے کہا — "اُس نے میرا بھی ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو مجھے اور میرے تھانے کے اے۔ ایس۔ آئی کو باقاعدگی سے پہنچ جاتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کاہنا ڈاکو اپنا مال کبھی کبھی تمہارے خاوند کی حویلی میں رکھا کرتا اور جب کاہنا دیکھتا کہ خطرہ ٹل گیا ہے اپنا مال اُٹھا لے جاتا تھا۔"

"میں کاہنے، ڈاکو کی ہی بات کرنے لگی تھی" — آسیہ نے کہا — "تمہیں یاد ہو گا کہ وہ کس پائے کا آدمی تھا۔ لوگ اُس سے ڈرتے بھی تھے اور اُس کی عزّت بھی کرتے تھے۔"

"کاہنا میرا بھی یار تھا" — رجب علی نے کہا — "اُسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص ڈاکو ہے۔"

"میری حفاظت اِس کاہنے نے کی جسے لوگ ڈاکو کہتے تھے" — آسیہ نے کہا — "وہ تھا ہی ڈاکو۔ میرے خاوند کے مرنے کے تین مہینے بعد آیا اور بہت رویا۔ وہ رات کے وقت آیا تھا۔ مَیں اُسے دیکھ کر ڈر گئی لیکن اُس نے میرا ڈر دُور کر دیا۔ کہنے لگا — 'تمہیں مَیں نے دو تین بار ہی دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھے ڈاکو ہی سمجھتی ہو گی لیکن اس وقت مجھے سگے بھائی کا درجہ دے دو۔ میرے لیے خوبصورت لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ تمہارا خاوند میرا دوست نہیں بھائی تھا۔ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ مَیں تمہیں کیا دے سکتا ہوں۔ خدا نے تمہیں سب کچھ دے رکھا ہے۔ مَیں اپنا حق ادا کرنے آیا ہوں۔ کوئی خدمت، کوئی کام مجھے بتاؤ'....

"مَیں نے اُسے کچھ بھی نہ بتایا۔ مَیں اُس سے کیا خدمت کرا سکتی تھی؟ یہی کیا کم تھا کہ اُس نے مجھے بہن کہا تھا۔ اُس کے آنسو گواہی دے رہے تھے کہ اُس نے مجھے دل سے بہن کہا ہے۔ اُس نے جب دیکھا کہ مَیں سوائے شکریہ ادا کرنے کے کوئی بات نہیں کہہ رہی تو اُس نے کہا — 'تم میری بات نہیں سمجھ سکی آسیہ! میں بات صاف کہہ دیتا ہوں۔ تم جیسی خوبصورت بیوہ جس کا کوئی والی وارث نہ ہو اُسے کوئی سکون اور عزّت سے جینے نہیں دیا کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ جائیداد کی مالک اب تم ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ دوسری شادی کب کر رہی ہو' — مَیں نے کہا کہ ابھی کوئی ارادہ نہیں۔ اُس نے کہا — 'اگر تمہیں گاؤں کے کسی آدمی سے خطرہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ وہ تمہارے سائے سے بھی دُور بھاگے گا'....

"مَیں اُس کا مطلب سمجھ گئی۔ یہی میرا مطلب تھا۔ مَیں نے اُسے خاوند کے بھتیجوں اور بھانجے کے اور دو اور آدمیوں کے نام بتا دیئے۔ میں نے اُسے کہا — 'کاہنے! مَیں کسی مرد کے ساتھ دوستی کی خواہش نہیں کروں گی۔ تم نے مجھے بہن کہا ہے تو بہن اپنے بھائی کو دکھا دے گی کہ وہ اپنی عزّت بچا کر رکھتی ہے' — کاہنے نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور یہ کہہ کر چلا گیا — 'تمہاری طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا'....

"اور مَیں نے دیکھا کہ میں نے کاہنے کو جن آدمیوں کے نام بتائے تھے وہ مجھ سے دُور ہٹ گئے بہت

بعد میں پتہ چلا کہ کاہنا نمبردار کو اور گاؤں کے دو سِکھ زمینداروں کو اور کچھ سرکردہ آدمیوں کو دھمکی دے گیا تھا کہ چوہدری شاکر علی کے گھر کی طرف کسی نے مَیلی نظر سے دیکھا تو اُس کا گھر برباد ہو جائے گا"

○

آسیہ نے لمبی سانس لے کر کہا — "وہ وقت تمہیں یاد ہے ملک! ڈاکوؤں اور بدمعاشوں میں بھی کچھ اخلاق تھا۔ آج زمانے کو کیا ہو گیا ہے۔ جسے دیکھو وہ کسی نہ کسی طریقے سے ڈاکہ ڈال رہا ہے۔ شکل سے مومن لیکن اعمال مجرموں والے ہیں.... کاہنا شاید اب بھی ڈاکو ہی ہو گا۔ مَیں اپنے ماں باپ کو بھول گئی ہوں، کاہنے کو یاد رکھتی ہوں۔"

"وہ زندہ نہیں" — رجب علی نے کہا — "پاکستان بننے سے دو تین مہینے پہلے پکڑا گیا تھا۔ ڈکیتی کی وارداتیں تو اُس کے نام تھیں ہی، اُس کے خلاف نو آدمیوں کے قتل کے کیس پولیس کے رجسٹر میں لکھے ہوئے تھے۔ صرف چار مہینے کیس چلا اور اُسے پھانسی دے دی گئی۔"

"اوہ" — آسیہ کو صدمہ ہُوا جس کے تاثرات اُس کے چہرے پر بھی آ گئے۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ ہاتھوں سے آنکھیں پونچھ کر بولی — "اس شخص نے میری تن تنہا زندگی سے خوف اور خدشے نکال دیئے تھے۔ وہ کبھی کبھار آتا تھا۔ میری اور شازی کی خیریت پُوچھ کر اور تسلّی کر کے اور تسلّی دلا سے دے کر چلا جاتا تھا۔"

"پھر ماں باپ کے ساتھ کبھی ملاقات نہیں ہوئی؟"

"میں اپنے باپ کے مرنے پر بھی نہیں گئی" — آسیہ نے جواب دیا — "ایک آدمی اطلاع دینے آیا تھا۔ مَیں نے اُس کے ہاتھ ماں کے لیے دو ہزار روپیہ بھیج دیا اور ساتھ کہہ دیا کہ میں نہیں آؤں گی۔ اگر ماں میں ذرا سی بھی غیرت ہوتی تو یہ رقم واپس میرے منہ پر مارتی لیکن اُس نے یہ رقم رکھ لی۔ تم جانتے ہو ملک! اُس وقت کے دو ہزار روپے آج کے آٹھ ہزار کے برابر تھے.... مَیں نے اتنی باتیں کبھی نہیں کی تھیں۔ آج تمہیں دیکھا ہے تو وہ سارا زمانہ میرے سامنے آ گیا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے میرے سینے میں ایک بند باندھا ہُوا تھا۔ وہ ٹُوٹ گیا ہے۔"

ملک رجب علی کے ہونٹوں پر تبسّم آ گیا۔ وہ اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا تھا۔ اُس نے پتھروں کا بنا ہُوا بڑا مضبوط بند توڑ لیا تھا۔ اُس کی زبان کا جادُو ہی کچھ ایسا تھا کہ آسیہ جو اپنے آپ کو بڑا مضبوط پتھر کہتی تھی، موم ہو گئی تھی۔ شازی کمرے میں آ گئی۔

"امّی! آپ نے کیا کہانیاں شروع کر دی ہیں اور مجھے الگ بٹھا دیا ہے" — شازی نے کہا — "مَیں بھی یہیں بیٹھوں گی"

"نہ میری اچھی بیٹی!" — آسیہ نے بڑے پیار سے کہا — "بہت ضروری باتیں کر رہی ہوں۔ سمجھا کرو نا!"

شازی بُرا سا منہ بنا کر سمجھ گئی۔ وہ ماں کے پاس نہیں رجب علی کے پاس بیٹھنے کو بے تاب ہو رہی تھی لیکن ماں نے اُسے پھر دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

"کبھی خیال آتا ہے کہ شازی اِس لائن میں کامیاب رہے گی" — آسیہ نے کہا — "اور کبھی اِس پر جذبات ایسے طاری ہو جاتے ہیں کہ اسے اپنی زبان اور اپنی حرکتوں پر قابو نہیں رہتا۔ کیا تم اسے اس کام کے قابل سمجھتے ہو؟"

"نہیں" — رجب علی نے کہا "تم اپنی بات سُناؤ آسیہ! شادی کیا کرے گی اور کیا نہیں کر سکے گی، یہ بعد میں سوچ لیں گے۔"

"میری بات بڑی لمبی ہے ملک!" — آسیہ دُکھی ہوئی سی ہنسی ہنس پڑی۔ کہنے لگی — "اب میں اعتراف کر رہی ہوں تو بہتر ہے کہ تم میرے دل کو بہت اچھے لگتے تھے۔ میری ازدواجی زندگی میں تم پہلے غیر مرد آئے تھے۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ میں نے تمہیں محبت کا سرچشمہ سمجھ لیا تھا۔ میرے جذبات پیاسے مر رہے تھے۔ آج تمہیں دیکھا ہے تو اپنے جن جذبات اور احساسات کو میں مار چکی تھی وہ جی اُٹھے ہیں۔ تم سنتے رہنا ملک! تم تحمّل سے سُنتے رہنا۔"

"سُن رہا ہوں آسی!" — رجب علی نے پیار بھرے لہجے میں کہا — "یاد ہے تمہیں، میں نے تمہیں اس کمرے کی تنہائی میں آسی کہا تھا؟"

آسیہ نے آہ بھری اور کہنے لگی — "تمہیں دیکھ کر سب کچھ یاد آ گیا ہے.... میں کاہنے ڈاکو کی بات کر رہی تھی۔ اُس نے مجھے تحفّظ دیئے رکھا۔ اس کے علاوہ میرے خاوند کے دو اور خاص آدمی تھے جو تھے تو ملازم لیکن گاؤں والے جانتے تھے کہ وہ پکّے بدمعاش اور پولیس کی محفل کے آدمی ہیں۔ وہ ہر ڈھنگ کھیلنا جانتے تھے۔ زمین کے نیچے سے بھی وار کیا کرتے تھے۔"

"وہ اَچھو اور کرما ہوں گے۔"

"ہاں، وہی" — آسیہ نے کہا — "اگر تم انہیں جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ کیسے تھے اور کیا کر سکتے تھے۔ انہوں نے میرا ساتھ غلاموں کی طرح دیا۔ مجھے وہ شہزادی سمجھتے تھے۔ میں نے دراصل اُن کی وفاداری خریدی تھی۔ انہیں میں اُس سے زیادہ دیتی تھی جو انہیں میرے خاوند سے ملا کرتا تھا۔ کرمے نے اپنی بیٹی کی شادی کی تو آدھا خرچ اُسے میں نے دیا تھا۔ اُن کی شراب میرے ذمّے تھی۔ وہ میرے ایسے محافظ بن گئے تھے کہ جانیں قربان کرنے پر تیار رہتے تھے۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہُوا کہ میری طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا تھا لیکن مجھے کوئی شریف عورت بھی نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے کاہنے کی داشتہ بھی کہا جاتا اور یہ بھی کہ میرے کئی خاوند ہیں۔ یہ باتیں گاؤں میں ہوتی تھیں جو بی مستانی اور دو اور عورتوں کے ذریعے مُجھ تک پہنچتی تھیں۔ میرے سامنے ایسی بات کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی۔ میرے مزارعے مُجھ سے بہت خوش تھے۔ میں اُنہیں اُن کے حق سے زیادہ دیا کرتی تھی۔ میں نے انہیں بڑی سختی سے کہہ رکھا تھا کہ مجھے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر یا جُھک کر سلام نہ کیا کریں لیکن وہ تو میرے آگے سجدے کرنے کو بے تاب رہتے تھے....

"مجھے پتہ چلا کہ مُجھ پر ایک پیر سے تعویذ بھی کروائے گئے ہیں اور مجھے نقصان پہنچانے کے لیے میری کھیتیوں میں بھی تعویذ دبائے گئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ دیہات میں لوگ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے کیا کیا درپردہ حرکتیں کرتے ہیں۔ وہ سب حرکتیں میرے خلاف ہوئیں اور میں روز بروز شیر اور دلیر ہوتی گئی۔ عورت بدکار ہو تو وہ لوگوں کے سامنے جانے اور بات کرنے سے ڈرتی ہے کہ کوئی آدمی کھری بات کہہ کر شرمسار کر دے گا۔ مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں تھا۔ میں گاؤں میں سر اُونچا کر کے چلا کرتی تھی۔ کوئی آدمی میری دوستی کا دعوٰے نہیں کر سکتا تھا۔ لوگ مجھے عجیب عورت کہنے لگے۔ بعض کہتے تھے کہ آسیہ

کو کسی کامل پیر کی دُعا ملی ہوئی ہے کہ مردوں کی طرح سینہ تان کر چلتی ہے اور بعض کہتے تھے کہ کسی پیر کی بددُعائی ہوئی ہے ورنہ اتنی خوبصورت اور جوان عورت کی اب تک دوسری شادی ہو چکی ہوتی لیکن اس کے قریب سے بھی کوئی نہیں گزرتا....

"قریب سے گزرنے والے بہت تھے ملک! اچھے آدمیوں نے بھی شادی کے پیغام بھیجے تھے۔ میں نے ایک بھی قبول نہ کیا۔ میرے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ میرے اُمیدوار میرے ساتھ نہیں میری جائیداد کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ دراصل میرے دماغ میں کوئی سیدھی سوچ آتی ہی نہیں تھی۔ میرے محافظ جرائم پیشہ لوگ تھے۔ میری اپنی سوچیں مجرمانہ ہو گئی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ مجھے جو کوئی بھی دیکھتا ہے اُس کے ذہن میں جُرم آتا ہے۔ جوان، خُوبصورت اور دولت مند بیوہ کو جو چند سال کسی بُوڑھے خاوند کی بیوی رہ چکی ہو، دیکھ کر کسی بھی مرد کے دماغ میں خلوص کی سوچ نہیں آ سکتی۔ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ یہ عورت پیاس سے مری جا رہی ہے اس لیے یہ کسی بھی تنومند آدمی کے جال میں آ جائے گی۔ مجھے اپنے آپ کو اور اس بیٹی کو اِن بھیڑیوں سے بچانا تھا اِس لیے مجھے پکّے مجرموں کا سہارا اور تحفّظ خریدنا پڑا۔ بی مستانی اور اُس جیسی دو اور عورتیں میری خاص ہمدرد تھیں۔ وہ مجھے چالاکی اور ہوشیاری کی باتیں سُناتی رہتی تھیں....

"پھر مجھے ایک اور شہزادے کا پیغام ملا۔ وہ نانک گڑھ کا رہنے والا تھا۔ شاید تم اُسے بھی جانتے ہو گے۔ تم اُس علاقے میں رہ چکے ہو۔ خواجہ کبیر کے نام سے مشہور تھا۔ خاصا پائے کا زمیندار تھا۔"

"وہ تو اُس وقت اچھا خوبصورت جوان تھا" — ملک رجب علی نے کہا — "جس وقت کی تم بات کر رہی ہو اُس وقت اُس کی عمر تیس اور پینتیس سال کے درمیان ہو گی۔ میں اُسے جانتا تھا۔ اُس کا باپ انگریزوں کی پُوجا کرنے والا اور ہندوؤں کا دوست تھا۔ وہ مر گیا تو خواجہ کبیر باپ کے راستے پر چل پڑا۔ آزادی سے پہلے وہ پنجاب اسمبلی کا ممبر بھی رہ چکا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ یونینسٹ پارٹی کی طرف سے الیکشن میں پھر کھڑا ہُوا اور ہار گیا تھا کیونکہ مسلمانوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دیئے تھے۔"

"وہی خواجہ کبیر" — آسیہ نے کہا — "میں ایک روز اپنی زمینیں دیکھنے گئی۔ وہ گھوڑے پر سوار میرے قریب سے گزرا اور رُک گیا۔ ہم دونوں نے اس سے پہلے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یہ آدمی اچھا لگا۔ عمر کے لحاظ سے بھی اچھا تھا۔ ایک دو باتیں ہوئیں تو اُس نے کہا — 'اچھا.... تو وہ تم ہو۔ چوہدری شاکر علی کی بیوہ.... میں نے تمہاری بہت سی باتیں سُنی ہیں' — میں نے کہا — 'یہی سنا ہو گا کہ آسیہ نے بہت سے خاوند رکھے ہوئے ہیں اور وہ کاہنے ڈاکو کی داشتہ ہے' — وہ ہنس کر بولا — 'نہیں۔ اس کے اُلٹ سُنا ہے۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے بتانے والوں نے بتایا ہے کہ تم شیر کی بچّی ہو اور کوئی مرد تمہاری آنکھ میں آنکھ نہیں ڈال سکتا۔ میرے دل میں بدی نہیں آسیہ! میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔ تم چاہے کتنی ہی دلیر ہو لیکن عورت ہو اور اکیلی ہو۔ مجھے اپنا خادم اور ہمدرد سمجھو۔ کسی ایک کا نام لو جو تمہیں بدنام کرتا ہو۔ خدا کی قسم اُس کی لاش نہیں ملے گی' — میں نے کہا — 'یہ کام میں خود بھی کر سکتی ہوں' — اُس نے کہا — 'میں اس کے عوض کچھ نہیں مانگوں گا آسیہ! آزما لو۔ اگر مجھے تمہاری وہ ضرورت ہوئی تو پہلے نکاح پڑھاؤں گا' — میں نے کہا — 'میں چاہوں یا نہ چاہوں؟' — اُس نے کہا — 'دِل سے چاہو گی تو'....

"ایسی اور بھی باتیں ہوئیں اور وہ چلا گیا۔ دوسرے ہی روز اُس کا پیغام آگیا۔ میں نے عزت سے انکار کر دیا۔ اُس کا ایک اور پیغام آیا کہ ایک ملاقات ہونی چاہیئے، میری نیّت بُری نہیں۔ ... میں نے تمہیں بتایا ہے کہ یہ شخص مجھے اچھا لگا تھا۔ میری کچھ زمین گاؤں سے سات آٹھ میل دُور تھی۔ میں نے خواجہ کبیر کو وہاں بلایا اور ہماری بڑی لمبی ملاقات ہوئی۔ اُس کی پہلے ہی ایک بیوی تھی اور چھوٹے چھوٹے دو بچے۔ وہ کہتا تھا کہ اُس کی بیوی شکل کی بھی بہت اچھی اور عقل کی بھی بہت اچھی ہے۔ مجھے وہ دوسری بیوی بنانا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُس عورت کو نہیں اُجاڑوں گی جو اپنے خاوند کو چاہتی ہے اور خاوند اُسے چاہتا ہے ..... وہ تمہاری طرح بہت اچھی اور پیاری باتیں کیا کرتا تھا۔"

"پکّا استاد تھا" — رجب علی نے کہا — "اوچھی حرکتیں کرنے والا آدمی نہیں تھا لیکن بڑا گہرا اور گھاگھ تھا۔"

"ہاں، وہ ایسا ہی تھا" — آسیہ نے کہا۔ "اُس نے کہا کہ شادی نہ کرو صرف ملتی رہا کرو۔ میں نے اُسے کہا کہ ملا کروں گی لیکن اس طرح جس طرح دو سہیلیاں یا دو دوست ملا کرتے ہیں۔ تم مجھے عورت نہ سمجھنا اور میں تمہیں مرد نہیں سمجھوں گی۔ ... اگر میں تمہیں اِن ملاقاتوں کی کہانی سُنانے لگوں تو آج کی رات اسی میں گزر جائے گی۔ بس اتنا سُن لو کہ خواجہ کبیر کے ساتھ میں ایک اور ہی دُنیا میں داخل ہو گئی۔ ہماری دوستی گہری ہو گئی لیکن ملک! تم یقین نہیں کرو گے کہ اُس نے اپنی نیّت میں کبھی فتور نہ آنے دیا نہ اُس نے مجھے محسوس ہونے دیا کہ وہ مرد ہے اور میں عورت ہوں ....

"ایک بار ہم دِلّی چلے گئے اور ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ میں تو کنوئیں کا مینڈک تھی۔ ریل گاڑی کے فسٹ کلاس ڈبے کے اتنے لمبے سفر اور اتنے عالیشان ہوٹل نے میرے ذہن اور دِل کے دریچے اور در کھول دئیے جو اس عمر تک بند پڑے تھے۔ دیسی شراب میرے گھر میں موجود رہتی تھی مگر اس کی بدبُو سے مجھے متلی آنے لگتی تھی۔ بدبُو کے علاوہ شراب کا تعلق میرے بُوڑھے خاوند کے ساتھ بھی تھا اس لیے مجھے یہ اور زیادہ بُری لگتی تھی۔ میں کا ہنے، اَچھُوا ور کرمے کے لیے دو تین بوتلیں ہر وقت گھر میں رکھتی تھی لیکن ان بند بوتلوں سے بھی مجھے نفرت تھی.....

"دِلّی کے ہوٹل کے ایک کمرے میں جو دو جڑے ہوئے پلنگ پڑے تھے مجھے بڑے ہی اچھے لگ رہے تھے۔ خواجہ کبیر نے لیمن کی بوتلیں منگوا کر مجھے اُن میں جانے کیا پلا دیا کہ میں بادلوں میں اُڑنے لگی۔ یہ دنیا مجھے بہت خوبصورت لگنے لگی اور خواجہ کبیر کو میں دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت آدمی سمجھنے لگی.... صبح جب آنکھ کھلی تو لگا جیسے بڑا ہی حسین خواب دیکھا ہے۔ خواجہ کبیر ساتھ والے پلنگ پر سویا ہُوا تھا۔ میرا ذہن بیدار ہُوا تو خیال آیا کہ یہ خواب نہیں بڑی حسین حقیقت تھی — خواجہ کبیر نے مجھے وہسکی پلا دی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ شراب ہر گُناہ کی ترغیب دیتی ہے وہ رات سچ ثابت ہو گیا تھا۔ میری اور خواجہ کبیر کی دوستی سہیلیوں والی نہیں رہی تھی۔ وہ مرد تھا، میں عورت تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ مجھے ذرا سا بھی افسوس نہ ہُوا....

"ہم آٹھ دن دِلّی رہے۔ خوب سیر کی۔ وہیں خواجہ کبیر نے میری ملاقات دو ہندوؤں سے کرائی۔ وہ کانگرس کے لیڈر یا منتظم تھے۔ پھر تین ہندو لڑکیوں سے ملاقات ہوئی جو تعلیم یافتہ تھیں اور بہت ہی خوبصورت.... ہم واپس آئے تو خواجہ کبیر کے ساتھ میری ملاقاتیں زیادہ ہونے لگیں۔ کبھی ہم بٹالہ جاتے، کبھی امرتسر،

کبھی جالندھر اور ہم شہر شہر گھومتے پھرتے لیکن اب یہ سیر سپاٹا نہیں تھا۔ خواجہ کبیر، اُس کے ہندو دوستوں اور ہندو لڑکیوں نے مجھے سیاسی تخریب کاری میں استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ ۱۹۴۶ء کے الیکشن آ رہے تھے اور مسلمان پاکستان کے نعرے لگا رہے تھے۔ ہر مسلمان کی زبان پر تین نام رہتے تھے — پاکستان، قائدِاعظم اور مُسلم لیگ — کانگرسی ہندو مسلمانوں کو کانگرس کی طرف گھسیٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دولت لُٹا رہے تھے۔ دیہات میں رواج تھا کہ پوری کی پوری برادری اپنے بزرگوں کے کہنے پر ووٹ دیتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ بااثر مسلمانوں کو اپنے اثر میں لیا جائے۔ میں نے ہندو لڑکیوں کے ساتھ ایسے تین بااثر آدمیوں کو اپنے حُسن، اداؤں اور دیگر حرکتوں سے شیشے میں اُتار لیا تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے دو لیڈر مُسلم لیگ کی طرف جا رہے تھے۔ دونوں کو اپنے طلسم میں گرفتار کیا اور مُسلم لیگ میں جانے سے روکا...

"میں اب برائے نام مسلمان رہ گئی تھی۔ میں تو مسلمانوں کی جڑیں کاٹ رہی تھی۔ میں نے ہندو لڑکیوں کے ساتھ مل کر پاکستان کے بہت سے مخالف پیدا کیے۔ وہ پاکستان بن جانے تک پاکستان کے مخالف رہے۔ ان میں سے دو کو میں نے پاکستان میں وزارتوں کی کُرسیوں پر بیٹھے دیکھا....

"پاکستان بن گیا اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہُوا وہ تمہیں یاد ہو گا۔ ایک کانگرسی لیڈر نے پہلے ہی مجھے دِلّی پہنچا دیا تھا۔ وہاں میں شازی کے ساتھ ہندوؤں کی حفاظت میں رہی۔ انہیں میری خدمات بہت ہی پسند آئی تھیں۔ چند مہینوں بعد مجھے اور دو اور ہندو لڑکیوں کو ہندوستان کی انٹیلی جنس کے سپرد کر دیا گیا۔ وہاں ہمیں ایسی ٹریننگ دی گئی جو مجھے بڑی اچھی لگی۔ جب ٹریننگ پُوری ہو گئی تو مجھے آزمائش کے لیے پاکستان میں داخل کیا گیا۔ یہاں ہندوستان کا سفارت خانہ تھا اور جاسوس بہت تھے۔ مجھے تحفظ حاصل تھا۔ میں پہلی آزمائش میں پُوری اُتری....

"میں واپس ہندوستان گئی۔ ایک سال بعد مجھے پھر پاکستان میں داخل کیا گیا.... اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ شازی بھی جوان ہو گئی۔ میں نے اِسے بھی اسی راستے پر ڈال دیا۔ اب پاکستان کے سرکاری حلقے میرے سامنے ننگے پڑے ہیں۔ ہمیں جس جس سے خطرہ ہو سکتا ہے اُس پر میرا طلسم طاری ہے۔"

"اب سوال یہ ہے کہ شازی کو بتا دیا جائے کہ میں اُس کا باپ ہوں؟" — ملک رجب علی نے پُوچھا۔

"نہیں" — آسیہ نے جواب دیا — "نہ بتانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر بُرا اثر پڑے۔"

رجب علی جب آسیہ کے گھر سے ملک ناصر کے گھر کو جا رہا تھا، اُسے یہی ایک خیال پریشان کر رہا تھا کہ شازی اُس کی بیٹی تھی اور وہ جس مشن پر پاکستان آئی تھی اس کے لیے شازی کو ایسی قُربانی بھی دینی تھی جو کسی بیٹی کا غیرت مند باپ سوچ بھی نہیں سکتا۔ رجب علی نے اس رِنگ کو گرفتار کرانے کا تہیّہ کر رکھا تھا مگر شازی کا کیا بنے گا؟

"شازی کو اس رِنگ سے کس طرح نکالا جائے؟" — رجب علی سوچتا جا رہا تھا۔ اُسے کوئی طریقہ، کوئی راستہ سُوجھتا نہیں تھا۔

ملک رجب علی جب ملک ناصر کی کوٹھی میں داخل ہُوا تو بھی اُس کے ذہن پر شازی سوار تھی اور جب وہ اپنے کمرے میں صوفے پر گر پڑنے کے انداز سے بیٹھ گیا تو اُس کے ذہن اور اعصاب کے لیے شازی آسیب بن گئی۔

"بتا دوں اُسے؟" ــــ وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا اور اُس کے ذہن میں بھنور اُٹھنے لگے۔ اتنی مضبوط شخصیت کا آدمی جذبات کے بھنور میں ایسا بے بس ہو گیا کہ وہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ وہ صرف سوچ نہیں رہا بلکہ بول رہا ہے۔

"کسے کچھ بتانا چاہتے ہو ملک!" ــــ ملک ناصر کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

رجب علی ہنس پڑا۔ اس غیر ارادی ہنسی نے اُسے سنبھال لیا۔ وہ پولیس کے ڈھنگ جانتا تھا۔ زبان کے کرتب دکھا سکتا تھا۔

"اپنی بیوی کی سوچ رہا ہوں یار!" ــــ رجب علی نے شگفتہ لہجے میں کہا ــــ "بھلی عورت ہے۔ سوچتا ہوں اُسے بتا دوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اُسے فون پر اصغر کے متعلق بتا رہا ہُوں کہ وہ اپنی رجمنٹ میں ہے اور خیریت سے ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں اصغر کی خاطر اسلام آباد میں رُکا ہُوا ہُوں۔ مجھے یہاں نہ جانے کتنے دن رکنا پڑے۔"

"اُسے نہ بتاؤ" ــــ ملک ناصر نے کہا ــــ "اگر چاہو تو میں تمہیں لاہور کا کام دے دیتا ہُوں، لیکن میرے ساتھ رہو تو زیادہ بہتر ہے۔ ہمارے امتحان کا وقت آ رہا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کا کمانڈو اپریشن پاکستان کی ہائی کمانڈ اور حکومت کی توقع سے کہیں زیادہ کامیاب ہے اور یہ اپریشن وقت سے پہلے کامیاب ہو گیا ہے۔ اب اگر پاکستان نے وہ کارروائی جو کمانڈو اپریشن کے بعد کی جاتی ہے صحیح جنگی طریقے سے کی تو سمجھو کشمیر گیا پاکستان کی جھولی میں..... سچ پوچھو تو کشمیر بھارت کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ پاکستان نے چھمب سیکٹر میں بھارت کی دفاعی قلعہ بندیوں پر گولا باری شروع کر دی ہے۔"

"کیا انڈیا جوابی کارروائی نہیں کرے گا؟" ــــ ملک رجب علی نے پُوچھا۔

"ضرور کرے گا" ــــ ملک ناصر نے جواب دیا ــــ "میرا خیال ہے کہ بھارتی اس انتظار میں ہیں کہ پاک اور آزاد کشمیر فوج چھمب سیکٹر یا کسی بھی سیکٹر میں داخل ہوں تو جوابی حملہ کیا جائے۔ میری اطلاع کے مطابق پاکستان اور آزاد کشمیر کی مشترکہ فوج چند دنوں میں مقبوضہ کشمیر پر حملہ کرے گی۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہُوں کہ کھُلی جنگ شروع ہونے والی ہے۔ اس صورت میں میرے سپرد دو بڑے اہم مشن ہیں۔ ان کے لیے تو مجھے تمہاری ضرورت شاید نہ پڑے کیونکہ تم اس لائن میں اناڑی ہو۔ راولپنڈی میں تمہارے کرنے کے کام موجُود ہیں۔ تمہیں راہنمائی کی بھی ضرورت ہو گی جو تمہیں میں ہی دے سکتا ہوں۔"

"تم بہتر سمجھتے ہو" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "مجھے جیسے کہو گے میں ویسے ہی کروں گا۔"

"جو مال ہم نے یہاں رکھا ہُوا ہے وہ لاہور میں نہیں" ــــ ملک ناصر نے شیطانی مُسکراہٹ سے اور آنکھ

مار کر کہا ــــ "شازی نام کی ایک لڑکی سے تمہاری ملاقات ہو چکی ہے۔ کہو، کیا چیز ہے۔ ابھی کچی ہے۔ اپنے کام کو سمجھتی ہے لیکن اس میں ابھی غلط قسم کے جذبات موجُود ہیں۔ ہمارے ساتھ ہندو لڑکیاں بھی ہیں لیکن جو بات شازی میں ہے وہ کسی اور لڑکی میں نہیں۔"

ملک رجب علی کے دل میں خنجر سا اُتر گیا۔ اُسے ملک ناصر پر غصہ نہ آیا۔ ملک ناصر کو تو معلوم نہیں تھا کہ شازی رجب علی کی بیٹی ہے۔ رجب علی کو اتنا دکھ ہُوا کہ اُس نے چاہا کہ ملک ناصر کمرے سے نکل جائے اور وہ دروازہ بند کر کے روئے اور خوب روئے۔ ملک ناصر نے شازی کے متعلق جو بات شروع کی تھی وہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھی۔

"کہاں گم ہو گئے ہو ملک؟" ــــ ملک ناصر نے اُسے ہلا کر پوچھا۔

ملک رجب علی نے مُسکرا کر کہا کہ وہ لاہور اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ملک ناصر کچھ نہ کچھ بول رہا تھا اور رجب علی اس سوچ میں گم ہو گیا کہ شازی کو بدی کے اس جال سے کیسے نکالے۔ اُسے یہ سوچ بھی آئی کہ ملک ناصر نے اگر شازی کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت کی تو وہ ملک ناصر کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

◇

کیپٹن اصغر ابھی سی۔ ایم۔ ایچ میں تھا۔ اُس کا زخم بڑی اچھی رفتار سے ٹھیک ہو رہا تھا۔ ابھی اُسے کچھ دن اور ہسپتال میں رہنا تھا۔ ملک رجب علی اُس کے پاس بیٹھا ہُوا تھا اور اُسے بتا رہا تھا کہ اُس نے ابھی تک سلمٰی کو نہیں بتایا کہ اصغر زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا ہے۔

"میں ہسپتال سے فارغ ہوں تو میں خود ہی اُن کے ساتھ ٹیلیفون پر بات کروں گا" ــــ اصغر نے کہا ــــ "میں ڈاکٹروں کے پیچھے پڑا ہُوا ہوں کہ مجھے جلدی فارغ کریں۔"

"تمہیں ماں کے پاس جلدی پہنچنا چاہیئے۔"

"نہیں ابّا جان!" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا ــــ "مجھے اپنی بٹالین میں جلدی پہنچنا چاہیئے۔ میرے ساتھی تین تین چار چار کمانڈو مشن کر چکے ہیں لیکن میں پہلے ہی مشن میں زخمی ہو کر یہاں آن گرا۔ دو اور کمانڈو آفیسر زخمی ہو کر آئے ہیں۔ وہ اپنے مشن کی باتیں سُناتے ہیں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔"

"یہی وجہ ہے کہ تمہارا زخم جلدی ٹھیک نہیں ہو رہا" ــــ ملک رجب علی نے کہا ــــ "خون کو ٹھنڈا رکھو۔ تمہیں جوہر دکھانے کا موقع ملے گا۔ دونوں ملکوں میں کھلی جنگ ہو گی۔"

"ہم اس امتحان میں پُورے اتریں گے" ــــ اصغر نے کہا ــــ "میں اپنے ساتھی افسروں اور جوانوں کو دیکھ چکا ہُوں۔ کھلی جنگ میں ہمیں ساری دنیا دیکھے گی۔"

"میں جو خطرہ محسوس کر رہا ہوں وہ بھارتی انٹیلی جنس اور سیکرٹ سروس کا ہے" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "میں نے دیکھا ہے کہ بھارتی جاسوس ہمارے حکومتی اور فوجی حلقوں میں دور اوپر تک پہنچ گئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ آدھی جنگ انٹیلی جنس جیتا کرتی ہے۔"

"اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ کا دوست ملک ناصر انڈیا کا ایجنٹ ہے تو ملٹری یا سول انٹیلی جنس کو بتا دیں" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا ــــ "آپ سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کسی مصلحت کے پیشِ نظر اپنی انٹیلی جنس کو نہیں بتانا چاہتے تو میں بتا دیتا ہوں۔"

"ابھی چپ رہو" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "میں پورا گروہ دیکھ لوں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ ملک ناصر مجھ سے

ابھی بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ اُسے چھپانا چاہیئے ورنہ وہ اناڑی ہے۔ میں پردوں کے پیچھے دیکھ رہا ہوں۔ میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتا۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن جلد بازی کر جائے"—— اصغر نے کہا۔

"میں دشمن کو اس محاذ پر کامیاب نہیں ہونے دوں گا"—— رجب علی نے کہا —— "اگر مجھے رپورٹ کرنی ہوتی تو سرکاری حلقوں میں کئی بڑے افسروں تک میں پہنچ سکتا ہوں لیکن اصغر بیٹا! کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انڈیا کے ایجنٹ کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ انہیں یہاں تحفّظ اور تعاون حاصل ہے۔ کم از کم اس ملک ناصر کے گروہ کو میں خود پکڑوں گا اور ایسے وقت پکڑوں گا جب ان کے بچ نکلنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہوں گے۔"

"میں جانتا ہوں آپ پولیس کے ڈی۔ ایس۔ پی رہ چکے ہیں"—— اصغر نے کہا —— "لیکن جاسُوس کو پکڑنا بڑا ہی مختلف کام ہے۔ یہ کام اپنی انٹیلی جنس کے حوالے کریں۔"

"مجھے بھی کچھ کرنا ہے اصغر!"—— ملک رجب علی نے کہا —— "مجھے ایک گناہ کا کفّارہ ادا کرنا ہے۔ کفّارہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے ملک اور اپنے مذہب کے لیے کچھ کروں۔"

"ابّا جان!"—— اصغر نے جھنجھلا کر کہا۔ "اب آپ آگے کو کیوں نہیں چلتے؟ پیچھے کیوں دیکھے جا رہے ہیں؟ بھول جائیں اُس ماضی کو جو آپ کے آج کے لیے آسیب بنا ہُوا ہے۔ بعض اوقات آپ ابنارمل ہو جاتے ہیں۔"

ملک رجب علی ایسی ہنسی ہنس پڑا جیسے وہ ہنسانہ ہو بلکہ اُس نے کچھ کہا ہو۔ اُس نے اصغر کے جواں چہرے کو نظر بھر کے دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں داد وتحسین اور پیار تھا۔

"میں اِس دن کے انتظار میں تھا جب تم اس طرح عقل کی باتیں کرنے لگو گے جیسی اب کی ہیں"—— رجب علی نے کہا —— "اب میں تمہیں اپنا بیٹا نہیں دوست کہوں گا۔ تم اب مرد کے جذبات کو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو گئے ہو لیکن تم ابھی کسی گنہگار کے جذبات کو نہیں سمجھ سکتے۔ اُس گنہگار کے جذبات کو تو تم بالکل ہی نہیں سمجھ سکتے جس نے توبہ کر لی ہو لیکن کوئی ایک گناہ اُس کے اعصاب کا آسیب بن گیا ہو۔"

"میرے ابّا جان آپ کے ہاتھوں مرے تھے"—— کیپٹن اصغر نے کہا —— "یہ آپ کی ڈیوٹی تھی آپ کی نیّت نہیں تھی۔ آپ نے سروس سے استعفیٰ دے کر اپنا مستقبل تباہ کر دیا ہے۔ آپ آئی۔ جی نہ بنتے تو ڈی۔ آئی۔ جی کے عہدے تک ضرور پہنچتے..... میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ آپ سے گِلہ کروں۔ میری امّی نے آپ کو دل سے چاہا ہے۔ پھر آپ....!"

"تم دونوں مجھے طعنے دیتے، میرے مُنہ پر تھوکتے، مجھ سے نفرت کرتے تو میری جذباتی کیفیت یہ نہ ہوتی جو آج ہے"—— رجب علی نے کہا —— "تم نے خون معاف کر کے اور مجھے محبت دے کر مجھ پر یہ فرض عائد کر دیا ہے کہ میں گناہ کا کفّارہ ادا کر کے محبت کی قیمت ادا کروں۔ میری ساری جائیداد کی مالک تمہاری ماں ہے۔ وارث تم ہو لیکن یہ اقدام مجھے تسکین نہیں دے سکا۔"

"میں نے اتنی جائیداد کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی"—— اصغر نے کہا —— "میرے اور اپنے درمیان اس طرح کی لکیر نہ کھینچیں کہ ہمیں آپ کو دیا ہُوا قرض واپس لینا ہے۔ اب پاکستان اور بھارت کے درمیان جو لکیر ہے اس کی بات کریں۔ یہ لکیر خطرے میں آگئی ہے۔ اگر آپ کا بس چلتا ہے تو میرے ڈاکٹر سے کہیں

کہ مجھے ہسپتال سے چھٹی دے دے۔ میں چل پھر سکتا ہوں۔ بھاگ دوڑ سکتا ہوں۔ میں ہر لحاظ سے فٹ ہوں۔"

"ڈاکٹر بہتر سمجھتے ہیں بیٹا!"—— رجب علی نے کہا۔ "ڈاکٹروں کو فیصلہ کرنے دو..... شمیم آتی ہے؟"

"وہ کالج میں حاضری لگوا کر میرے پاس آجاتی ہے"—— اصغر نے کہا —— "وہ تو بہت ہی جذباتی ہے۔"

"اپنے باپ کے متعلق کیا کہتی ہے؟"

"وہ تو یوں سمجھیں کہ باپ کی جانی دشمن ہو گئی ہے"—— اصغر نے جواب دیا —— "کہتی ہے میرے ابّو کو گرفتار کراؤ۔"

"پھر بھی محتاط رہنا"—— رجب علی نے کہا —— "یہ تمہاری محبت کا اثر ہے۔ باپ آخر باپ ہے۔"

◇

اِدھر انسانوں کے جذبات نقطۂ عروج پر پہنچ رہے تھے۔ اُدھر دونوں ملکوں کی عداوت بھی عروج پر پہنچ رہی تھی۔ یہ عداوت دراصل دو ملکوں کی نہیں دو مذہبوں کی اور دو نظریات کی ایسی عداوت تھی جسے مل بیٹھ کر ختم کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ملک ناصر نے ٹھیک کہا تھا کہ مقبوضہ کشمیر بھارت کے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہماری تاریخ میں سنہری الفاظ میں لکھی جائے گی کہ پاکستانی توپ خانے نے بھارت کے چھمب سیکٹر کی قلعہ بندیاں تباہ کر دی تھیں۔ بھارت کے اُس وقت کے وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری نے یہ جو کہا تھا کہ وہ پاکستان کو اپنی مرضی کے میدان میں گھسیٹ کر لڑائے گا اُس کے لیے ایک ایسا مذاق بن گیا تھا جس سے وہ چھپتا پھرتا تھا۔ پاکستان کی ہائی کمانڈ نے بھارت کی ہائی کمانڈ کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔

بھارتی ہائی کمانڈ میں کھلبلی مچ گئی تھی اور واویلا بپا تھا لیکن اناڑی وہ بھی نہیں تھے۔ وہ پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ کشمیر پر حملہ بھارت پر حملہ سمجھا جائے گا۔ ان کے پاس پلان موجود تھا۔ پاکستان نے اگر بھارت کی گردن ہاتھ میں لی تھی تو بھارت نے پاکستان کے پیٹ میں گھونسہ مار کر اپنی گردن چھڑانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔

بھارت نے پلان کے مطابق اپنی فوجوں کی نقل و حرکت شروع کر دی اور پاکستان پر حملے کے مقامات پر فوجوں کو پہنچا دیا۔ بھارت کا مشہور آرمرڈ ڈویژن جو ہمیشہ جھانسی میں رہتا تھا سیالکوٹ کے قریب پہنچ گیا۔

پاکستان تاریخ کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ اب پاکستانیوں کے پاس یہی ایک نعرہ ہونا چاہیئے تھا —— "فتح یا موت"—— بھارت بہت بڑا ملک ہے۔ بھارتی بہت دور پیچھے تک ہٹ سکتے ہیں۔ پاکستانیوں کے لیے پیچھے ہٹنے کو ایک انچ بھی جگہ نہیں۔ اب پاکستان کو اپنے پلان پر قائم رہنا ہی تھا، ورنہ دوسری صورت یہ قبول کرنی تھی کہ پاکستان نقشے سے مٹ گیا ہے۔

حالات جتنی تیزی سے بدلتے جا رہے تھے ملک ناصر گھر سے اتنا ہی غائب رہنے لگا تھا۔ ملک رجب صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ ملک ناصر اپنی سرگرمیاں اُس سے چھپا رہا ہے اور وہ کچھ پریشان بھی ہو رہا تھا کہ وہ ملک ناصر کی سرگرمیوں سے باخبر کس طرح ہو گا۔ وہ اس شش و پنج میں گھرا بیٹھا تھا کہ شازی آگئی۔ وہ کچھ پریشان سی تھی۔ ملک رجب علی جذبات سے ایسا مغلوب ہُوا کہ اُس نے شازی کو گلے لگا لیا۔ یہ ایک باپ کے جذبات کا اظہار تھا لیکن شازی رجب علی کو ایک مرد سمجھتی تھی —— ایک بڑا ہی پیارا مرد جسے دل کے دکھ دکھائے جا سکتے تھے اور جو محبت کے قابل تھا —— محبت عمر کا فرق مٹا دیا کرتی ہے۔ وہ تو خون کی کشش تھی جسے شازی کوئی اور ہی محبت سمجھ بیٹھی۔ وہ تڑپ کر رجب علی کے بازوؤں سے نکل آئی۔

"کیا آپ کو مجھ سے دلی محبّت ہے؟" — شازی نے جذباتیّت سے لرزتی ہُوئی آواز میں پوچھا — "یا کیا آپ میرے ساتھ کھیل رہے ہیں؟ میری زندگی یہی ہے ناکہ اپنے جذبات کو اِس لیے قربان کر دوں کہ میری ماں عیش کر سکے اور جن کے ہاتھ میں ایک ملک کے راز ہیں وہ عیش کر سکیں"۔

"مجھے تم سے وہ محبت ہے شازی! جو شاید ہی کبھی کسی نے کِسی کے ساتھ کی ہوگی" — ملک رجب علی نے کہا — "اور یہ تمھاری آنکھوں میں آنسو کیسے ہیں؟"

"یہ آنسو اِس لیے ہیں کہ میں آپ کو نہ جانے کیا سمجھ بیٹھی ہوں اور آپ معلوم نہیں کیا ہیں" — شازی نے کہا — "ہوں تو میں بھی ایک دھوکہ ہی مگر میں محسوس کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے دھوکہ دیا تو وہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہوگا"

"کیا تم مجھے ایک فریب سمجھتی ہو؟" — ملک رجب علی نے پُوچھا۔

"آپ بال بال فریب ہیں" — شازی نے کہا — "جو شخص اپنا ایمان بیچ کر اپنی قوم کو دھوکہ دے سکتا ہے وہ فریب نہیں تو اور کیا ہے۔ میں خود بھی تو ایک فریب ہوں ملک صاحب! مگر آپ میں اور مجھ میں ایک فرق یہ ہے کہ آپ اُس عمر کو پہنچ گئے ہیں جہاں انسان اپنے جذبات کو مار سکتا ہے اور میں اس عمر میں ہُوں جہاں جذبات انسان کو مار دیا کرتے ہیں۔ میں مر گئی تھی لیکن معلوم نہیں مجھے کیا ہُوا کہ آپ کو دیکھ کر میرے جذبات اُبل آئے"۔

ملک رجب علی پریشان ہو گیا۔ شازی جیسی کمسن لڑکی کو سنبھالنا اُس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مشکل یہ پیش آگئی تھی کہ بار بار اُس کے ہونٹوں پر یہ آجاتی تھی — "شازی تم میری بیٹی ہو۔ تم میرا خون ہو" — وہ اپنی بیٹی کو اپنے سینے میں چھپا لینے کو بیتاب ہونے لگا۔ اُس کے دو بچّے پیدا ہوتے تھے دونوں مر گئے تھے یہ ایک خلش تھی جو اُسے کبھی کبھی بے چین کر دیا کرتی تھی لیکن وہ جاسُوسوں کی اس دنیا میں آپہنچا تھا جہاں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اُس نے دل پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ابھی شازی کو نہیں بتائے گا کہ وہ کیا کشش ہے جو اُسے گھسیٹ کر لے آئی ہے۔

"شازی!" — رجب علی نے بڑے پیار سے اُس سے پوچھا — "تم دل کی بات صاف الفاظ میں کیوں نہیں کہہ دیتیں تمہیں دھوکہ دے کر مجھے بھارت سے کوئی انعام نہیں ملے گا۔ مجھے ہر لحاظ سے اپنا سمجھو، کہو، دل کی بات کہو"۔

"میں سمجھ نہیں سکتی کہ آپ کی غیرت کو کس طرح بیدار کر دوں" — شازی نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا — "میں اگر آپ سے کہوں کہ مجھے پناہ میں لے لیں، اِس غلاظت سے مجھے نکال لیں تو مجھے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ میں ایک مسلمان کی بیٹی ہُوں۔ اب کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں جس قوم کی بیٹی ہوں میں اُسی کو ڈس رہی ہوں میں جانتی ہُوں آپ مجھ پر ہنسیں گے۔ میں یہ بھی جانتی ہُوں کہ جب پورے گروہ میں سے ایک جاسُوس غدّاری کرتا ہے تو اُسے گولی مار دی جاتی ہے۔ مجھے صرف یہ بتا دیں کہ مجھے آپ گولی ماریں گے یا میں اپنے آپ کو خود ہی ختم کر لوں"۔

ملک رجب علی پولیس کے اس اصول سے واقف تھا کہ ہر کسی کو شک کی نگاہوں سے دیکھو۔ جاسُوسی تو ایسا کام ہے کہ کسی پر یقین اور اعتبار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اُسے خیال آیا کہ شازی سے یہ ایکٹنگ کروا کر ملک ناصر اُس کا امتحان ہی تو نہیں لے رہا؟ لڑکی تو کمسن تھی لیکن وہ لڑکی کی ماں کو جانتا تھا۔ اس ماں نے لڑکی کو یقیناً پُختہ کار بنا دیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ بھی خیال آیا کہ اس عمر کی لڑکی کیا اتنی خوبی سے ایکٹنگ کر سکتی ہے کہ وہ پلا

آنسو بہانے شروع کر دے؟ اس شک کی بنا پر ملک رجب علی نے پولیس کا طریقہ کار استعمال کیا اور لڑکی کو پتہ چلے بغیر اُس کے دل کی باتیں اُگلوانے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ لڑکی پگھلتی جا رہی ہے اور اُس کے مطلب کی باتیں اُگلنے لگی ہے۔

"ماں نے مجھے کہا ہے کہ تیار ہو جاؤ" — شازی نے کہا — "کہتی تھی کہ پاکستان کے دو بہت بڑے افسروں کو ہاتھ میں لینا ہے۔ میرے ساتھ دو ہندو لڑکیاں بھی ہوں گی جن کے نام مسلمانوں جیسے ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اُن سے کیا کام لینا ہے..... مَیں نے یہ کام پہلے بھی کیا ہے لیکن اب میرا دل ساتھ نہیں دیتا۔ میں نے پہلے کبھی اِدھر دھیان نہیں دیا تھا۔ چند دنوں سے میری کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ صبح بہت سویرے میری آنکھ کُھل جاتی ہے اذان کی آواز سنتی ہُوں تو یُوں لگتا ہے جیسے میں خدُا کو دھوکہ دے رہی ہُوں۔ یہ آواز مجھے بڑی مقدّس اور بڑی پیاری لگتی ہے۔ چند دنوں کی بات ہے۔ میں باہر اکیلی گھوم پھر رہی تھی۔ میں نے ایک نوجوان لڑکی دیکھی جس نے شادی کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اُس کے ہاتھوں پر مہندی ابھی تک تر و تازہ تھی۔ اُس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان تھا۔ وہ ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے جا رہے تھے۔ میرے دل میں کانٹا سا چُبھا کہ میں دلہن نہیں بن سکوں گی۔ کوئی ایسا مرد نہیں ہوگا جسے میں اپنا کہہ سکوں گی۔ جب سے آپ سے مِلی ہوں میں محسوس کرنے لگی ہوں کہ آپ میرا ہاتھ تھام سکیں گے"۔

"کیا تم مجھے بھی اس کام سے ہٹانا چاہتی ہو؟" — ملک رجب علی نے پوچھا۔

"نہیں" — شازی نے کہا — "میں آپ کو کیسے روک سکتی ہُوں۔ مجھے کیا حق ہے کہ مَیں کسی کو روکوں۔ میں صرف یہ محسوس کرنے لگی ہُوں کہ آپ مجھے اس کام سے ہٹا کر مجھے پناہ میں لے سکتے ہیں"۔

"کیا تم نے کبھی ملک ناصر سے ایسی بات کی ہے؟"

"نہیں" — شازی نے کہا — "وہ ایک پتھر ہے۔ وہ جسموں کا سوداگر ہے۔ اُسے اپنی بیٹی کا پتہ نہیں کہ وہ کہاں جاتی ہے، کیا کرتی ہے۔ مجھے وہ جن نظروں سے دیکھتا ہے ان نظروں میں پیار نہیں ایک حیوان نظر آتا ہے۔ اگر میں اس سے بات کروں گی تو وہ مجھے وہی سزا دلائے گا جو ایک غدّار جاسوس کو دی جاتی ہے"۔

"تو تمہیں یہ کس طرح پتہ چلا ہے کہ میں فرشتہ ہوں؟" — رجب علی نے کہا — "میں بھی تو اُسی جیسا ایک مرد ہُوں"۔

"نہیں" — شازی نے کہا — "میں آپ کو اُس جیسا نہیں سمجھتی۔ میں شکرپڑیاں کی تنہائی میں آپ کے بہت قریب بیٹھی رہی لیکن آپ نے اُس قسم کی کوئی حرکت یا بات نہیں کی جس سے پتہ چلتا کہ آپ بھی ملک ناصر جیسے ہیں۔ میں سمجھ نہیں سکتی کہ میں نے ایسا کیوں محسوس کیا ہے" — شازی نے بیتاب ہو کر رجب علی کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہُوئے کہا — "ملک صاحب! مجھے کہہ دیں کہ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے یا دروازہ بند کر دیں اور مجھے اُن عورتوں جیسی ایک عورت سمجھیں جو معلوم نہیں کتنی آپ کی زندگی میں آچکی ہوں گی"۔

ملک رجب علی نے سوچا کہ یہ ایکٹنگ نہیں ہو سکتی۔ اس عمر میں لڑکی اتنی چالاک نہیں ہو سکتی۔

"دیکھو شازی!" — رجب علی نے اُسے بڑی سنجیدگی سے کہا — "میں اس گروہ سے نکل نہیں سکتا نہ کوئی ایسا ارادہ ہے لیکن تمھیں اس سے بچا سکتا ہوں۔ اِس کے لیے مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کیا کام ہے جو تم سے لیا جائے گا تاکہ میں تمھاری جگہ کسی اور کو بھیج دوں"۔

"اگر میں یہ آپ کو بتا دوں تو کیا آپ اپنے وعدے پر قائم رہیں گے؟" — شازی نے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ آپ مجھے چوری چھپے لاہور اپنے گھر بھیج دیں؟"

"تمہیں چھپانا میرا کام ہے" — رجب علی نے کہا — "تم مجھے وہ کام بتاؤ جو تم سے لیا جائے گا۔"

"میں آپ کو بتا دوں گی۔"

شازی جب چلی گئی تو روکنے کے باوجود رجب علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُسے بہت خوشی ہوئی کہ شازی میں غیرت موجود ہے اور وہ وہی کچھ سوچ رہی ہے جو رجب علی نے خود سوچا تھا۔

◇

"امی جان! میں آپ کو کہہ چکی ہوں کہ جس کام میں میرا دل ساتھ نہیں دے رہا وہ میں کیسے کر سکوں گی" — شازی اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔

"شازی بیٹی! ایسی باتیں نہ کرو" — آسیہ نے اُسے کہا — "ہم یہ کام نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے ہم ماں بیٹی اب اس جال سے نکل نہیں سکتیں۔ ہم مجبور ہیں.... ہم محتاج ہیں.... اور پھر یہ مجبوری ایسی بھی نہیں کہ ہمارے کام کا صلہ کوئی اور لے جائے گا۔ جو صلہ ہمیں ملے گا ذرا اُسے تصور میں لاؤ۔ دلّی جیسے شہر میں محل جیسی ایک کوٹھی ہماری منتظر ہے۔ آمدنی اتنی جیسے ہم شہزادیاں ہوں۔ پھر تمہاری شادی ہو گی۔ میں تمہارے لیے تم جیسا خوبصورت دولہا لاؤں گی.... یہ کام ہم نے ہمیشہ کے لیے تھوڑے ہی کرنا ہے۔ دونوں ملکوں کی جنگ بار بار تھوڑے ہی ہو گی۔"

"لیکن وہ کام کیا ہے" — شازی نے پوچھا — "کیا یہ کوئی بہت اہم کام ہے؟"

"ہاں بہت اہم" — آسیہ نے کہا — "پاکستان نے مری اور اسلام آباد کی پہاڑیوں میں کہیں ایسا ریڈار نصب کیا ہے جو بڑی وسیع فضا کو اور بہت دُور تک دیکھ سکتا ہے۔ یہ پتہ نہیں چل رہا کہ وہ ریڈار ہے کہاں! اِس ریڈار کو راستے سے ہٹانا ہے۔ سُنا ہے کہ ایئر فورس یہ کام نہیں کر سکے گی کیونکہ اردگرد کی پہاڑیوں پر طیارہ شکن گنیں موجود ہیں جو فضا سے نظر نہیں آ سکتیں۔ ہمیں یہ پتہ چل چکا ہے کہ یہ اطلاع ہمیں کہاں سے مل سکتی ہے۔ دو آفیسر ہیں۔ اُن تک رسائی ہو چکی ہے۔ اُنہیں اندھا کرنا ہے۔ تم جانتی ہو یہ کیسے کیا جاتا ہے۔ تمہارے ساتھ دو ہی ہندو لڑکیاں ہوں گی جو یہاں مسلمان ناموں سے جانی پہچانی جاتی ہیں تم اُنہیں جانتی ہو۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔"

شازی کو یہی معلوم کرنا تھا کہ مشن کیا ہے۔ وہ اُسے پتہ چل گیا۔ اُس نے اپنا رویہ فوراً بدل لیا اور ماں سے کہا کہ میں جاؤں گی اور یہ کام کروں گی۔

◇

دوسرے دن رجب علی آسیہ کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ آسیہ نے شازی کو کہیں بھیج دیا تھا۔ رجب علی نے آسیہ سے پوچھا کہ اُس نے اُسے کیوں بلایا ہے۔

"بہت ہی ضروری بات کرنے کے لیے میں نے تمہیں بلایا ہے" — آسیہ نے کہا — "میں تم سے توقع رکھوں گی کہ یہ بات اپنے آپ تک رکھنا۔ اِس میں میرا نہیں تمہاری اپنی بیٹی کا نفع نقصان ہے.... کیا تم نے شازی کو بتا دیا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی ہے؟"

"نہیں" — رجب علی نے کہا — "میری اُس سے ملاقات ہوئی ہی نہیں۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ لڑکی کا ذہن بڑی تیزی سے بدلتا جا رہا ہے" — آسیہ نے کہا — "اس نے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔ اب اُس نے ایک نئے مشن سے بالکل ہی انکار کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھے دھوکہ دے رہے ہو۔ شازی پر تمہارا اثر معلوم ہوتا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ آئندہ شازی سیکرٹ سروس کا کوئی کام نہیں کرے گی۔ اِس سے مجھے شک ہوتا ہے کہ تم نے اُسے ایک باپ کی حیثیت سے منع کر دیا ہے۔ میرے ساتھ وہ تمہاری باتیں یُوں کرتی ہے جیسے اپنی کسی عزیز سہیلی کی بات کر رہی ہو۔"

"یہ تمہارا شک ہے کہ میں نے اُسے روکا ہے۔ میں چاہتا ضرور ہوں کہ وہ اِس کام میں استعمال نہ ہو۔"

"اور تم جانتے ہو کہ اِس کا نتیجہ کیا ہو گا؟" — آسیہ نے کہا — "ملک ناصر نے تمہیں بتا دیا ہو گا کہ ہمارا گروہ کتنا اہم ہے۔ ہم اسلام آباد میں بیٹھے ہیں۔ اِسی سے اِس گروہ کی اہمیت کا اندازہ کر لو۔ اِس گروہ کے کسی فرد کی غدّاری اُسے سیدھا موت کے مُنہ میں لے جائے گی۔ تم مرد ہو ملک! میں ہزار چالاکی کروں لیکن میں عورت ہوں۔ شازی نے مُنہ پھیرا تو یہ لوگ اُسے انڈیا لے جا کر چکلے میں بٹھا دیں گے۔ اگر انہیں رحم آیا تو اِسے جان سے مار کر لاش انڈیا کے کسی دریا میں بہا دیں گے۔"

ملک رجب علی نے یقین کر لیا کہ یہ لوگ اُس کا امتحان نہیں لے رہے۔ شازی واقعی اپنے اِس ارادے کے متعلق سنجیدہ اور پختہ ہے۔ وہ یہی سُننا چاہتا تھا۔ اُس نے آسیہ کو تسلّی دی کہ وہ شازی کو اِس لائن سے نکلنے نہیں دے گا اور جہاں تک ممکن ہو سکا اُسے اپنا رشتہ بھی نہیں بتائے گا۔

"ملک!" — آسیہ نے جذبات سے دبی دبی آواز میں کہا — "میری زندگی یوں سمجھو کہ ختم ہو چکی ہے۔ مجھے اِس بیٹی کا غم کھائے جا رہا ہے۔ میں نے جو زندگی گزاری ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ یہی لائن مجھے اچھی لگی۔ اِسی پر بیٹی کو ڈال دیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اِس کا یہی مستقبل بہتر رہے گا۔ تم خود اِسی لائن کے آدمی ہو۔ اگر بیٹی تمہارے حوالے کر دوں تو بھی خطرہ ہے۔ نہ جانے تم کب پکڑے جاؤ پھر میری بیٹی کا کیا بنے گا۔ میں اسے اپنے ساتھ انڈیا لے جاؤں گی جہاں یہ کم از کم مُجرم تو نہیں ہو گی۔"

ملک رجب علی اُس کی ہاں میں ہاں ملا کر وہاں سے نکل آیا۔

◇

ملک رجب علی ملک ناصر کی کوٹھی میں پہنچا تو نوکر نے اُسے ایک ٹیلی فون نمبر دیا کہ یہاں سے کسی خاتون کا فون آیا تھا۔ رجب علی نے اُسی وقت وہ نمبر ملایا تو پتہ چلا کہ شازی نے کہیں سے فون کیا تھا۔ شازی نے اُسے اتنا ہی کہا کہ شام ساڑھے سات بجے وہیں آ جانا۔

شام ساڑھے سات بجے رجب علی اور شازیہ ایک بار پھر شکر پڑیاں کی سرسبز بلندی پر بیٹھے تھے اور شازی اُسے بتا چکی تھی کہ وہ مشن کیا ہے جس کے لیے اُسے استعمال کیا جا رہا ہے۔

"اب بتائیں میں کیا کروں" — شازی نے پُوچھا — "میں نے ماں سے بھی کہہ دیا تھا کہ میں نہیں جاؤں گی لیکن اُس نے مجھے اتنا ڈرایا ہے کہ میں اکیلی فیصلہ نہیں کر سکتی کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔"

ملک رجب علی گہری سوچ میں کھویا رہا۔

"ملک صاحب!" — شازی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "آپ چُپ کیوں ہو گئے ہیں؟ آپ کی مردانگی کہاں چلی گئی ہے؟"

ملک رجب علی اُسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ اُسے اب یقین ہو چکا تھا کہ اُس کا امتحان نہیں لیا جا رہا اور شازی کوئی دھوکا یا فریب نہیں دے رہی۔ اب اُسے شاید شازی کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا لیکن شازی فوراً جواب مانگ رہی تھی۔

"ملک صاحب! آپ کہاں کھو گئے ہیں" — شازی نے غصیلی اور روتی ہوئی سی آواز میں کہا — "اگر میری جگہ آپ کی بیٹی ہوتی تو آپ کیا کرتے؟ کیا اُس وقت بھی آپ کی غیرت اسی طرح سو جاتی؟"

رجب علی اس طرح چونکا جیسے گھاس کے کسی کیڑے مکوڑے نے اُسے کاٹ لیا ہو۔ اُس نے شازی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"مجھے اپنی بیٹی تو نہیں بنا سکتے آپ" — شازیہ نے کہا — "میں اس حق سے محروم ہو چکی ہوں۔ مجھے آپ اپنی بیوی تو بنا سکتے ہیں۔ میں آپ کی بیوی بن جاتی ہوں۔ شرط یہ ہے کہ مجھے یہاں سے نکال لے جائیں"۔

رجب علی بم کی طرح پھٹا — "شازیہ! کیا بکواس کرتی ہو۔ بیٹی بیوی نہیں بن سکتی۔ میں بیٹی کو کسی کے حوالے نہیں کر سکتا"۔

"کیا آپ مجھے اپنی بیٹی بنا لیں گے؟" — شازی نے پُوچھا — "کیا میں اپنے آپ کو اس قابل سمجھوں؟"

رجب علی آخر انسان تھا، پتھر تو نہیں تھا۔ جذبات نے اُس کے ضمیر کو اور اُس کی رُوح کو کچل کر رکھ دیا۔ وہ اندر سے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ بات جو وہ خود نہیں کہنا چاہتا تھا کسی قوت نے کہلوا دی۔

"شازی! تم ہو ہی میری بیٹی" — رجب علی نے کہا۔ اُس کی آواز رندھیائی ہوئی تھی۔

شازی نے دونوں ہاتھ اُس کے مُنہ پر پھیرے تو اُس کے ہاتھوں نے رجب علی کے چہرے پر نمی محسوس کی۔

"آپ رو رہے ہیں؟" — شازی نے گھبرائی ہوئی آواز میں پُوچھا — "کچھ مجھے بھی سمجھائیں"۔

ملک رجب علی نے اُسے پُوری تفصیل سے سمجھا دیا۔ اس دوران شازی کے ہاتھ اُس کی گردن کے گرد لپٹتے گئے اور اُس کے گال رجب علی کے گال کے ساتھ جا لگے۔

"تمہاری ماں بے قصور ہے شازی!" — رجب علی نے کہا — "وہ ایک فریب کا شکار ہوئی تھی اور وہ بڑا ہی حسین فریب تھا۔ تم یہ نہ سوچنا کہ تم ایک گناہ کی پیداوار ہو۔ ماں سے نفرت نہ کرنا۔ میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہو کر سکتی ہو۔ میں پاپی ہوں"۔

"مجھے کسی سے نفرت نہیں" — شازی نے سسکیوں کے درمیان کہا — "مجھے اس کام سے نفرت ہے جس میں میری ماں نے مجھے ڈال دیا ہے۔ مجھے اس سے بچائیں۔ آپ میرے باپ ہیں۔ اپنی بیٹی کو پناہ میں لے لیں"۔

ملک رجب علی اُسے پناہ میں لینے کا فیصلہ تو کر ہی چکا تھا لیکن اُس نے اپنے لیے یہ دشواری پیدا کر لی تھی کہ وہ بھارتی انٹیلی جنس کے اس پورے گروہ کو پکڑوانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ وہ شازی کو وہاں سے فوراً نہیں نکال سکتا تھا۔ اُس نے شازی کو یقین دلایا کہ وہ کچھ دن اور برداشت کرے۔ اُسے اس غلیظ کام سے نکال لیا جائے گا۔

"سُنا ہے آپ کا بیٹا کیپٹن ہے اور وہ ہسپتال میں پڑا ہے" — شازی نے کہا — "کیا میں اپنے بھائی کو دیکھ سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں!" — رجب علی نے کہا — "مَیں تمہیں کل وہاں لے چلوں گا لیکن اُسے یہ نہ بتانا کہ تم میری بیٹی ہو۔ میں کہوں گا کہ تم میرے ایک دوست کی بیٹی ہو اور تمہیں زخمی فوجیوں کو دیکھنے کا شوق ہے.... اور یاد رکھو بیٹی! اپنی ماں کو نہ بتانا کہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ تم میری بیٹی ہو"۔

◇

دوسرے دن اصغر نے ملک رجب علی کے ساتھ ایک بڑی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو دیکھا تو وہ حیران ہُوا کہ یہ کون ہے۔ رجب علی نے اُسے بتایا کہ یہ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے۔

"کیا آپ کمانڈو اپریشن میں زخمی ہوئے تھے؟" — شازی نے اصغر سے پُوچھا۔

"ہاں" — اصغر نے کہا — "اگر کمانڈو اپریشن کے زخمی دیکھنے کا شوق ہے تو ساتھ والے کمروں میں اور اِدھر ایک وارڈ میں جا کر دیکھو۔ ہم تو وہ خوش نصیب ہیں جنہیں ہمارے ساتھی اُٹھا لائے ہیں۔ اُنہیں تصوّر میں لاؤ جو زخموں سے تڑپتے وہیں رہ گئے ہیں۔ تم سب جب گہری نیند سوئے ہوئے تھے وہ تمہاری آبرو کی خاطر جانیں قربان کر رہے تھے"۔

اصغر تو اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گیا۔ باقی بات ملک رجب علی نے سُنائی کہ ان نوجوانوں نے کمانڈو اپریشن کس طرح کامیاب کیا ہے۔ شازی کی آنکھیں ٹھہرتی جا رہی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ رو پڑے گی اور اصغر سے لپٹ جائے گی۔ اتنے میں نرس کمرے میں آئی۔

"سسٹر!" — اصغر نے شازی کی طرف اشارہ کر کے نرس سے کہا — "انہیں ذرا ساتھ والے کمروں اور وارڈ میں گھما پھرا لاؤ۔ یہ زخمیوں کو دیکھنے آئی ہیں"۔

نرس اُسے لے گئی اور کم و بیش نصف گھنٹے بعد واپس لائی۔ شازی کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اُس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اُس نے آتے ہی کہا — "چلئے، مجھے گھر لے چلیں" — اُس نے اصغر کو دیکھا۔ اصغر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ شازی اس مسکراہٹ کی تاب نہ لا سکی۔ ملک رجب علی اصغر سے رخصت ہُوا اور شازی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

"کیا دیکھا ہے کمروں میں اور وارڈ میں؟" — ملک رجب علی نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے شازی سے پُوچھا — "کچھ کچھ گھبرائی گھبرائی سی لگتی ہو"۔

شازی کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے کہا — "گھر نہ چلیں۔ کہیں اور لے چلیں۔ نیشنل پارک.... میں شہر کے شور و شر سے دُور نکل جانا چاہتی ہوں"۔

رجب علی اُسے شہر سے دُور نیشنل پارک کے اُس حصّے میں لے گیا جہاں درخت زیادہ اور لوگ کم ہوتے ہیں۔

◇

"اپنے بیٹے کو زخمی دیکھ کر بھی آپ اپنے اُس دشمن کے جاسوس بنے ہوئے ہیں جس نے آپ کے اتنے خوبصورت بیٹے کو زخمی کیا اور اس کے کئی ساتھیوں کو مار ڈالا ہے؟" — شازی نے کہا — "میں تو پہلے ہی اس ذلیل پیشے سے بھاگنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ حیران ہوں کہ آپ کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے!"

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم نے دیکھا کیا ہے؟"

"میں نے اصغر جیسے نوجوان اور خوبصورت لفٹیننٹ اور کیپٹن دیکھے ہیں" — شازی نے کہا — "وارڈ میں

ایک سے ایک جوان دیکھا ہے۔ ان میں دو دونوں آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکے ہیں۔ ایک کمسن لفٹیننٹ کی ایک ٹانگ کولہے سے کٹ چکی ہے۔ ایک سپاہی کا دایاں ہاتھ کلائی سے غائب ہے۔ ایک حوالدار کو دیکھا جس کا چہرہ بھی پٹیوں میں لپٹا ہُوا ہے۔ کہتے ہیں جھلس گیا ہے۔ بعض زخمیوں کے جسموں پر کئی کئی زخم ہیں۔ میں نے ان سب کو ہنستے اور مسکراتے دیکھا۔ ایک نے کہا ــ "ہمیں دیکھنا ہے تو دشمن کے سامنے دیکھنا۔ یہاں آپ کیا دیکھنے آئی ہیں! دعا کریں ہم جلدی ٹھیک ہو جائیں۔ ہم وہیں جائیں گے جہاں سے زخمی ہو کر آئے ہیں"۔

"تم ڈر کیوں گئی ہو؟" ــ رجب علی نے پوچھا۔

"ڈری نہیں اباجان!"

"نہ نہ نہ" ــ ملک رجب علی نے کہا ــ "مجھے اباجان کہنے کی عادت نہ ڈالو۔ ملک صاحب ہی کہتی رہو۔ یہ تو میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ تم میری بیٹی ہو"۔

"میں ڈری نہیں" ــ شازی نے کہا ــ "ان زخمیوں کو دیکھ کر میرے اندر ایک بڑے ہی گھناؤنے جرم کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے انہیں میں نے زخمی کرایا ہے اور جو وہیں رہ گئے ہیں اُن کو میں نے قتل کرایا ہے۔ میں ان کے دشمن کی جاسوس ہوں۔ جاسوس کا کام یہی ہوتا ہے کہ اپنی فوج کو اِدھر کی ایسی معلومات دے کہ اپنی فوج اِس ملک کی فوج کو تباہ کر دے..... یہ تو ایسے لگتا ہے جیسے سب میرے بھائی ہوں..... میں اب جاسوسی نہیں کر سکتی۔ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو انہی جیسا ہوتا۔ میرا اگر کوئی خاوند ہو گا تو وہ بھی انہی جیسا ہو گا۔ اگر میں نے بیٹا جنا تو وہ بھی جوان ہو کر انہی جیسا ہو گا"۔

"میں تم میں یہی احساس پیدا کرنا چاہتا تھا" ــ ملک رجب علی نے کہا۔

"آپ کا احساس کیوں مر گیا ہے ملک صاحب!" ــ شازی نے کہا ــ "آپ اپنے بیٹے کے دشمن کیوں ہو گئے ہیں؟ کیا آپ اِس مجرمانہ پیشے سے نکل نہیں سکتے؟"

ملک رجب علی سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ وہ مسکرا بھی نہ سکا۔ شازی نے اُسے کندھے سے پکڑ کر بڑی زور سے جھنجھوڑا۔

"آپ چُپ کیوں ہیں ملک صاحب؟" ــ شازی نے ایسے لہجے میں کہا جو نارمل نہیں لگتا تھا۔ اُس نے پوچھا ــ "کیا آپ واقعی میرے باپ ہیں؟"

دل سے نکلی ہوئی بات اثر رکھتی ہے۔ کبھی واعظ گھنٹوں کے حساب سے بولتا ہے تو سننے والوں پر کچھ اثر نہیں ہوتا، کبھی کوئی آدمی راہ چلتے کوئی بات کہہ جاتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ایک کتاب کھول کر رکھ گیا ہو۔ شازی نے اُسے لیکچر نہ دیا، بڑی مختصر سی بات کہی لیکن اُس کے الفاظ سلگتے ہوئے انگاروں کی طرح رجب علی کے ضمیر پر جا پڑے۔

"میں واقعی تمہارا باپ ہوں شازی!" ــ ملک رجب علی نے یوں کہا جیسے وہ کہنا نہ چاہتا ہو ــ "اور میں جاسوس نہیں ہوں"۔

"پھر ملک ناصر اور میری ماں کے ساتھ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"جاسوسی" ــ ملک رجب علی نے جواب دیا ــ "میں اُن کی جاسوسی کر رہا ہوں۔ میں انہیں پکڑاؤں گا اور تم میری مدد کر سکتی ہو۔ تمہارے بچ نکلنے کی یہی ایک صورت ہے کہ یہ پورے کا پورا گروہ پکڑا جائے، ورنہ یہ تمہیں زندہ

نہیں چھوڑیں گے۔ انہیں میں پکڑوا سکتا ہوں لیکن تمہاری مدد کے بغیر یہ ممکن نہیں"۔

"مجھے بتائیں میں کیا مدد کر سکتی ہوں" ــ شازی نے کہا ــ "میں مدد کروں گی"۔

"تم اپنی ماں کے کہنے کے مطابق اُن افسروں سے ملو جن سے ریڈار کے متعلق معلوم کرنا ہے" ــ رجب علی نے کہا ــ "اُن کے نام، محکمے اور عہدے معلوم کرو۔ اپنی ماں سے پوچھو کہ اس کام میں اور کون کون شامل ہے۔ یہ بھی معلوم کرو کہ ریڈار کہاں ہے اور اسے کس طرح تباہ کیا جائے گا..... یہ تمہارا آخری مشن ہو گا۔ احتیاط یہ کرنا کہ تمہاری ماں کو ذرا سا بھی شک نہ ہو کہ تمہاری نیّت بدل گئی ہے"۔

"آپ شاید جانتے نہیں کہ یہ کام جو آپ نے مجھے بتایا ہے یہ کوئی مشکل کام نہیں" ــ شازی نے کہا اور طنزیہ سے لہجے میں کہنے لگی ــ "مرد بڑی ہی کمزور چیز ہے۔ مجھ جیسی عورت کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے"۔ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ اُس نے ملک رجب علی کو ترستی ہوئی اور پیاسی نگاہوں سے دیکھا اور التجا کی ــ "کیا میں کسی ایک آدمی کی بیوی بن سکوں گی؟ مجھے صرف دو آدمی پیارے لگتے ہیں اور انہی دو آدمیوں کو میں احترام کے لائق سمجھتی ہوں... باپ اور خاوند..... باپ تو مل گیا ہے"۔

"خاوند بھی مل جائے گا" ــ رجب علی نے کہا ــ "بھائی بھی مل جائے گا..... جو چاہو گی مل جائے گا"۔

◇

ملک رجب علی اپنے آپ میں نہ رہا۔ کبھی اُسے خیال آتا کہ وہ جُوا کھیل رہا ہے اور یہ کھیل ایسا ہے جو اُس نے پہلے کبھی نہیں کھیلا۔ وہ ہار جانے کے تصور سے پریشان ہو جاتا۔ کبھی اُسے خیال آتا کہ شازی اُس کی اصلیت سے پردہ اُٹھا دے گی اور ملک ناصر اُسے قتل کرا کے لاش غائب کر دے گا۔

وہ اِن سوچوں میں ڈوب ڈوب کر اُبھر رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی شخصیت کا ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ رہا ہو لیکن اس کے عزم کی جو سنجیدگی اور پاکیزگی تھی وہ اُسے سہارا دے رہی تھی۔ اسی کیفیت میں نوکر نے اسے بتایا کہ ایک صاحب آئے ہیں کیپٹن اصغر اپنا نام بتاتے ہیں۔ رجب علی دوڑتا ہُوا باہر گیا۔ اصغر نے اُسے بتایا کہ ہسپتال سے اُسے چھٹی مل گئی ہے لیکن وہ لاہور نہیں جا سکے گا کیونکہ اُسے ہر روز مرہم پٹی کے لیے ہسپتال جانا پڑے گا۔ رجب علی نے اُسے کہا کہ تم اپنی ماں کو یہیں سے ٹیلیفون کر لو اور اُسے بتا دو کہ میں ذرا سا زخمی ہو گیا تھا اور اب ٹھیک ہوں۔

لاہور سلمیٰ کی کوٹھی میں طاہرہ، ارشد، طاہر پرویز اور جمال بیگ آئے بیٹھے تھے۔ سلمیٰ تنہا تھی اور اصغر کے لیے پریشان رہتی تھی، اس لیے طاہرہ اکثر اُس کے پاس آتی جاتی رہتی تھی۔ اُس روز یہ سب ہی اُس کے پاس جا بیٹھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، سلمیٰ نے دوڑ کر ریسیور اُٹھایا۔ اصغر کی آواز سُن کر وہ اُچھل پڑی۔ سب ہی ٹیلیفون کے گرد جمع ہو گئے۔

"اصغر کا فون تھا" ــ سلمیٰ نے ریسیور رکھ کر خوشی اور رنج کے ملے جلے لہجے میں کہا ــ "وہ کچھ زخمی بھی ہے۔ کہتا ہے اب ٹھیک ہوں۔ مجھے ابھی روانہ ہو جانا چاہیے" ــ وہ چپ سی ہو گئی اور بولی ــ "لیکن میں تو کبھی گھر سے بھی نہیں نکلی۔ میں اکیلی کیسے جاؤں گی۔ راولپنڈی اسلام آباد تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے"۔

"میں آپ کے ساتھ چلا چلتا" ــ ارشد نے کہا ــ "لیکن چھٹی ملنی بڑی مشکل ہے"۔

"میں چلا جاؤں ابّو!" ــ طاہر پرویز نے کہا۔

"نہ بیٹا!" ــ ارشد نے کہا ــ "یہ تمہارا کام نہیں"۔

سب نے جمال بیگ کی طرف دیکھا۔

"ہاں! ہاں!" — جمال بیگ نے کہا — "مجھے ہی جانا چاہیے۔ چلو سلمیٰ بیٹی! تیاری کرو۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ کیا تمہیں اُس گھر کا کوئی اتا پتہ معلوم ہے؟"

"ہاں پتہ تو معلوم ہے مجھے" — سلمیٰ نے کہا — "شاید اب گاڑی کا تو کوئی وقت نہیں ہوگا۔ بس پر جانا پڑے گا۔ ورنہ ملک صاحب سٹیشن پر آجاتے۔"

◇

ماں بیٹے کی ملاقات بڑی ہی جذباتی تھی۔ ماں بیٹے کے زخم پٹیاں کھول کر دیکھنا چاہتی تھی۔ اُسے بڑی مشکل سے قائل کیا گیا کہ زخم معمولی ہیں لیکن سلمیٰ پر جذبات کا غلبہ بڑا ہی شدید تھا۔ اتنے میں شمیم آگئی۔ وہ بڑے تپاک سے سلمیٰ سے ملی۔ جب شمیم کمرے سے نکل گئی تو رجب علی نے سلمیٰ کو اپنے قریب کر لیا۔

"کیوں مری جا رہی ہو سلمیٰ!" — رجب علی نے شگفتہ سے لہجے میں کہا — "دیکھو میں نے تمہارے لیے کتنی پیاری بہو تلاش کر لی ہے۔"

"کون سی بہو؟"

"یہ جو تم نے ابھی دیکھی ہے" — رجب علی نے کہا — "میں شمیم کی بات کر رہا ہوں۔ تمہارے بیٹے پر تو یہ مٹی تھی۔"

اصغر کچھ دیر ٹھہر کر چلا گیا۔ سلمیٰ کے چہرے پر رونق عود کر آئی۔ شمیم نے بڑے تپاک اور پیار سے سلمیٰ اور جمال بیگ کے لیے الگ الگ کمرے صاف کروا دیئے اور انہیں دکھا دیئے اور اُس نے انہیں کہا کہ اتنی جلدی اب واپس جانے کی نہ سوچنا۔

اگلی صبح رجب علی کی آنکھ ابھی کھلی ہی تھی کہ جمال بیگ اُس کے پاس آ بیٹھا۔ اُس کے چہرے پر تذبذب اور اضطراب کے آثار تھے۔

"کہئے رات کیسے گذری؟" — رجب علی نے اس سے پوچھا۔

"ہاں گذر ہی گئی ہے" — جمال بیگ نے کہا — "معلوم نہیں آپ مجھے اچھی جانتے ہیں یا نہیں۔ میں سنکی سا آدمی ہوں۔ زندگی کچھ ایسے ہی گذر گئی ہے۔ مجھ میں ایک بہت بڑی خامی ہے کہ آپ ذرا سا دائیں یا بائیں دیکھیں گے تو میں آپ کو بتا دوں گا کہ آپ نے اُدھر کیوں دیکھا ہے۔ آپ پولیس والے بال کی کھال اتارا کرتے ہیں۔ یہی خرابی مجھ میں ہے۔"

"کیوں کیا بات ہے؟" — رجب علی نے پوچھا — "کیا دیکھ لیا ہے آپ نے؟"

"سیلانی سا آدمی ہوں" — جمال بیگ نے کہا — "آدھی رات کے بعد آنکھ کھل گئی اور عادت کے مطابق میں باہر نکل گیا۔ اسلام آباد کی فضا بڑی پیاری لگی۔ چاندنی بڑی شفاف تھی۔ کوٹھی کا لان بہت خوبصورت لگا۔ لاہور بھی ایسے ہی کیا کرتا ہوں۔ آدھی رات کو راوی کے کنارے جا ٹہلتا ہوں۔ طاہرہ بیٹی روکتی ہے۔ میں سنس کے ٹال دیتا ہوں۔"

"آپ یہاں کی بات کریں نا" — رجب علی نے قدرے جھنجھلا کر پوچھا۔

"یہ کوٹھی محل جیسی بڑی ہے" — جمال بیگ نے کہا — "میں اس آخری کونے والے کمرے کے قریب سے گذرا تو ایسے لگا جیسے ریڈیو پر کوئی ڈرامہ چل رہا ہو لیکن خیال آیا کہ رات کے ایک بجے کون سا ریڈیو چلتا ہے۔ کھڑکی

ذرا سی کھلی تھی۔ میرے کانوں میں آواز پڑی — 'پاکستان کو آدھی شکست تو ہم دیں گے۔ باقی کمانڈو ہی توقع ہے' — میں چونک کر رُک گیا۔ پھر کسی کی آواز آئی — 'ریڈار کے متعلق تو بات ہو چکی ہے۔ اسے کمانڈو ایکشن سے ہی تباہ کیا جائے گا' — کوئی اور بولا — 'کل تک ہمیں صحیح پتہ چل جائے گا کہ ریڈار مری سے کتنا دور ہے اور کس جگہ ہے'۔۔۔

"پھر ایک عورت کی آواز آئی کہ بات ہو چکی ہے اب چھٹی کرو۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔ میں دوڑ کر باڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ کمرے میں سے چار آدمی اور دو عورتیں نکلیں۔ باہر ایک لمبوتری کار کھڑی تھی۔ وہ سب اُس میں بیٹھے۔ ملک ناصر نے انہیں رخصت کیا۔ کار چلی گئی۔"

ملک رجب علی کو دھچکا سا لگا لیکن اُسے یہ خیال بھی آگیا کہ وہ جمال بیگ کو اعتماد میں لے یا نہ لے۔ جمال بیگ نے اُسے کوئی انوکھی خبر نہیں سنائی تھی۔ وہ جانتا تھا یہ کیا ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ جمال بیگ کو اعتماد میں لینا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اُس نے جمال بیگ کو ٹالنے کے لیے کچھ گول مول سی باتیں کیں۔

"ملک صاحب!" — جمال بیگ نے اُس کی کلائی کو اپنی مٹھی میں لے لیا اور کہا — "آپ جانتے ہیں یہ سب کیا ہے لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ جسے آپ ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ اتنی جلدی ٹلنے والا انسان نہیں۔ میں نے اور بھی کئی باتیں سنی ہیں۔ مجھے کوئی یقین نہیں دلا سکتا کہ یہ لوگ پاکستان کے حق میں گپ شپ لگا رہے تھے۔"

"میاں جی!" — رجب علی نے کہا — "کیا ہم اپنے میزبان سے یہ کہیں کہ تم انڈیا کے جاسوس ہو؟ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا۔"

"آپ میزبان کی بات کر رہے ہیں" — جمال بیگ نے کہا — "طاہرہ میری عزیز بیٹی ہے۔ میں کہتا ہوں طاہرہ میری زندگی ہے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہو جائے کہ طاہرہ انڈیا کی جاسوس ہے تو میں اُس کی گردن کاٹ دوں گا اور پولیس سٹیشن جا کر کہوں گا کہ میں نے ایک عورت کو قتل کر دیا ہے۔"

رجب علی پریشان ہو گیا کہ اِس بوڑھے کو کیسے ٹالا جائے۔ اُس نے جمال بیگ سے تھوڑی سی ترش کلامی بھی کی۔

"ملک رجب علی!" — جمال بیگ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا — "میں تمہارے ماضی کے ایک ایک لمحے سے واقف ہوں۔ تم نے ایک آدمی کو قتل کر کے اُس کی بیوی سے شادی کر لی۔ تمہیں پتہ نہیں کہ میں بھی قاتل ہوں۔ میں پکڑا نہیں گیا۔ تم مجھے پاگل سمجھ سکتے ہو لیکن میری کیفیت یہ ہے کہ مجھے پکڑنے والا پولیس مین میری ذات میں موجود ہے۔ میں اُس کا ہر روز سامنا کرتا ہوں۔ اُس سے بھاگتا بھی ہوں لیکن ملک! میری عقل میرے ہاتھ میں ہے۔ میں سمجھوں گا کہ اِس شخص کو قتل ہونا چاہیے تو میں اُسے قتل کر کے رہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اِن لوگوں کے ساتھی ہو۔ اتنے دنوں سے یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ جواب دو ملک! مجھے جواب دو! ورنہ میں پولیس سٹیشن چلا جاؤں گا۔ میں یہاں سے ٹیلی فون کر کے پولیس کو بُلا سکتا ہوں۔"

رجب علی کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ اُسے کوئی راہِ فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ بوڑھا پتھر ہے جسے موم نہیں کیا جا سکتا۔ جمال بیگ نے اُسے مجبور اً کر دیا کہ وہ اس راز سے پردہ اُٹھا دے۔ اس کی تجربہ کار نگاہوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ یہ بوڑھا گنوار نہیں۔ آخر اُس نے جمال بیگ کو بتا دیا کہ وہ جاسوسوں کے ایک بڑے ہی خطرناک اور مضبوط گروہ کے درمیان بیٹھا ہے اور اس نے گروہ کو جھانسہ دے رہا ہے کہ وہ بھی ان کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔ رجب علی نے جمال بیگ کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

"آپ سلمیٰ کو ساتھ لے کر لاہور چلے جائیں" — رجب علی نے کہا — "میں اس گروہ کو پکڑوا کر آؤں گا۔ شاید خود پکڑا جاؤں۔ کیسے پکڑوں گا یہ ابھی بتا نہیں سکتا۔ معلوم نہیں حالات کیا پلٹا کھا جائیں۔"

"میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا" — جمال بیگ نے کہا۔ "مجھے بوڑھا نہ سمجھیں۔ مجھے کمزور نہ سمجھیں۔ میں نے ساری عمر عورت کے بغیر گزار دی ہے۔ میرے جسم کی طاقت محفوظ ہے۔ کبھی آپ کو بتاؤں گا میں کیا تھا، کیا بنا اور اب کیا ہوں! میرے دامن پر ایک بے گناہ اور معصوم عورت کے خون کے داغ ہیں۔ ان داغوں کو میرا اپنا خون مٹا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو میرے خون کی ضرورت ہو۔ آپ کی ضرورت دراصل پاکستان کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی قربان گاہ پر خون کا نذرانہ دوں گا تو بڑے سکون سے جان دے دوں گا اور خدا کے حضور سرخرو ہو کر جاؤں گا۔"

"پھر آپ میرے ساتھ ہی رہیں" — رجب علی نے کہا۔ "مجھے کسی کے ساتھ کی ضرورت تو ہے لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ شاید آپ ہی اچھا ساتھ ثابت ہوں۔"

ایک آدھ دن بعد رجب علی اور شازی پھر شکر پڑیاں کی سرسبز بلندی پر بیٹھے تھے اور شازی اُسے بتا رہی تھی کہ یہ ریڈار مری سے کتنی دُور کس سمت اور کس مقام پر ہے۔ اُس کی اطلاع کے مطابق یہ ریڈار مری کے درختوں اور سبزہ زار میں اتنا ڈھکا چھپا تھا کہ نشاندہی کے باوجود انڈین ائیر فورس اسے تباہ نہیں کر سکتی تھی۔ ریڈار کی حفاظت کے لیے قریبی پہاڑی کی چوٹی پر پاکستان ائیر فورس کے آبزرور ونگ کی ایک پوسٹ بنائی گئی تھی جس میں چھوٹی اور بڑی طیارہ شکن گنیں موجود تھیں۔

اس چوکی کو ریڈار پہلے ہی خبردار کر دیتا تھا کہ فلاں سمت سے دشمن کے طیارے آ رہے ہیں۔ ان طیارہ شکن گنوں کے علاوہ انتظام ایسا کیا گیا تھا کہ دشمن کے طیارے قریب آنے سے پہلے پشاور سے طیارے بلائے جا سکتے تھے۔

شازی نے رجب علی کو بتایا کہ پاکستان میں اور جہاں کہیں بھی ریڈار نصب ہیں، وہ جگہیں انڈین ائیر فورس کو معلوم ہیں۔ یہ واحد ریڈار ہے جو جموں اور سری نگر کے ہوائی اڈوں سے آنے والے لڑاکا بمبار طیاروں کا حملہ بے کار کر سکتا ہے لیکن اسے طیاروں سے تباہ نہیں کیا جا سکتا۔

شازی نے بتایا کہ انہیں کمانڈو قسم کی کارروائی سے تباہ کیا جائے گا۔ شازی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے تباہ کرنے والے بھارت سے آئیں گے یا یہاں موجود ہیں۔ پلان بنانے والوں نے کہا تھا کہ صرف دو گرینیڈ ٹھکانے پر پڑ گئے تو ریڈار بے کار ہو جائے گا۔

شازی نے بتایا کہ طے یہ ہوا ہے کہ جونہی پاکستان حملہ کرے یہ ریڈار تباہ کر دیا جائے۔ اب شازی نے ایک کاغذ رجب علی کو دیا جس پر اُس نے ریڈار کا مقام اور راستہ بنا رکھا تھا۔

"میں آپ کو ریڈار پر حملے کا وقت نہیں بتا سکوں گی" — شازی نے کہا۔ "دن بھی نہیں بتا سکوں گی۔ یہ یقین سے بتا سکتی ہوں کہ یہ پارٹی ملک ناصر کی گاڑی میں جائے گی۔ وقت رات کا ہو گا۔ ملک ناصر خود ساتھ ہو گا لیکن ملک ناصر پیچھے سڑک پر رہے گا۔ ملک ناصر کی گاڑی اس لیے لے جائی جا رہی ہے کہ اس شخص کا بہت دُور تک اثر و رسوخ ہے۔ اس کی گاڑی کو کوئی بھی شک کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ ملک ناصر پر نظر رکھیں اور پلان بنائیں کہ آپ انہیں کس طرح پکڑوا سکتے ہیں۔"

"شازی!" — ملک رجب علی نے اُس کے سر کو چوم کر کہا۔ "تم نے میری بیٹی کا نہیں، پاکستان کی بیٹی کا کردار ادا کیا ہے۔ اِس کا صِلہ تمھیں میں نہیں دے سکتا۔ خدا دے گا۔"

"پکڑے جانے کی صورت میں تو میری ماں بھی پکڑی جائے گی" — شازی نے کہا۔ "کیا آپ اُسے بچا لیں گے؟"

"خود ہی سوچو شازی" — رجب علی نے کہا۔ "اگر یہ ماں تمھارے ساتھ رہی تو کیا تم اپنے آپ کو گناہوں سے بچا سکو گی؟ تمھاری ماں سرتاپا گناہ اور فریب ہے۔ اگر تم پاکیزہ زندگی چاہتی ہو تو تمھیں کچھ قربانی دینی ہو گی۔ اپنی ذات سے ماں کی ذات کو نوچ پھینکو۔ تم میری پناہ میں ہو۔"

"ہاں میں قربانی دینے کے لیے تیار ہوں" — شازی نے کہا۔

دوسرے دن ملک رجب علی کی کار مری کی طرف جا رہی تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر اُس نے وہ کاغذ رکھا ہوا تھا جس پر شازی نے کچھ لکیریں ڈال دی تھیں۔ خاصی بلندی پر جا کر اُس نے کار روک لی اور اُس کی نظریں پہاڑیوں کے دامن سے چوٹی تک کھوجنے لگی۔ نیچے اُسے جو وادی نظر آ رہی تھی وہ ویسی ہی تھی جیسی شازی نے بنائی تھی۔ دُور ایک چوٹی پر اُسے ہلکی سی چمک نظر آئی۔ اُس نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ وہاں کچھ تھا۔ وہ ریڈار ہی ہو سکتا تھا۔

بائیں سمت کی پہاڑی کی چوٹی پر اُس نے دیکھا۔ وہاں بھی اُسے کچھ آثار نظر آئے جیسے وہ پاکستان ائیر فورس کی آبزرور ونگ کی چوٹی ہو۔ اُسے یقین ہو گیا کہ شازی نے غلط نہیں بتایا۔ وہ اس سوچ میں کھو گیا کہ بوقتِ ضرورت فوج کی مدد حاصل کرے یا وہ خود کچھ کر سکے گا۔

ملک رجب علی کو یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ شازی نے اُسے جو علاقہ بتایا تھا وہاں کی دو چوٹیوں پر کچھ ہے لیکن اُسے یہ یقین نہیں تھا کہ وہاں ریڈار اور آبزرورِ نگ کی پوسٹ ہے۔ وہ آگے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ سڑک پر ایسی جگہ کھڑا تھا جو خاصی بلند تھی۔ نیچے وادی تھی۔ وہ سڑک سے نیچے نہیں اُتر سکتا تھا۔

وہ کار میں بیٹھا اور کار سٹارٹ کر کے اسلام آباد کی طرف موڑ دی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس ریڈار کو تباہ کار جاسوسوں سے بچانے کے لیے اُس نے کوئی سکیم نہیں بنائی۔ کوئی پلاننگ نہیں کی اور اس کے ساتھ طاہرہ کے باپ جمال بیگ کے سوا کوئی بھی نہیں۔ جمال بیگ بُوڑھا اور ناتجربہ کار تھا۔ وہ جذبات کی زبان میں بات کرتا تھا۔ رہ رہ کر دماغ اسی پر آکر رُک جاتا تھا کہ وہ ملٹری انٹیلی جنس کو بتا دے۔

تھک ہار کر اُسے یہی ترکیب موزوں نظر آئی کہ جن سرکاری محکموں کا یہ کام ہے اُنہی کو بتا دے، لیکن اُسے لاہور والی دو ہندو لڑکیاں رادھا اور کرن یاد آگئیں جو یہاں نسیمہ اور عقیلہ کے ناموں سے جانی پہچانی جاتی تھیں، انہیں وہ ذاتی طور پر جانتا تھا اور وہ اُن لوگوں کو بھی جانتا تھا جو دشمن کی اِن دو بیٹیوں کے طلسم میں گرفتار تھے۔ وہ کوئی عام اور گمنام شہری نہیں بلکہ ایسے لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں ملک و ملّت کی قسمت تھی اور جن کے سینوں میں ملک کے قیمتی راز تھے۔

اُس وقت ملک رجب علی ڈی۔ ایس۔ پی تھا اور اُسی مشینری کا ایک کل پُرزہ جسے رادھا اور کرن جیسی لڑکیاں اپنے ڈھب پر چلاتی تھیں، اس لیے اُس نے محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ اور اُس کے اُوپر والے کیسے گھناؤنے جُرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اب جب کہ اُس کی ذات میں انقلاب آگیا تھا اور اُس نے اپنے آپ کو اپنے ضمیر کے حوالے کر دیا تھا اور اُس کی روح کو خُدا نے اپنے نُور سے منوّر کر دیا تھا اُسے بڑی شدت سے محسوس ہونے لگا تھا کہ اُس نے عبدالجلیل کو ہی قتل نہیں کیا بلکہ وہ پُوری قوم کو قتل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ یہ احساس بڑا ہی تلخ اور اذیتناک تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ انتہائی اہم افسر اور وزیر دولت، عورت اور شراب کی بدولت دشمن کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں تو ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ملک ناصر کے گروہ اور اس کے عزائم کی نشاندہی کرے تو اوپر بیٹھا ہُوا کوئی ایک افسر یا وزیر اس گروہ پر پردہ ڈال دے اور گروہ اپنے کام میں لگا رہے۔

یہ اُس کا وہم تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس پر کسی دشمن کا طلسم طاری نہیں تھا۔ فوجی اپنے اُن فوجی بھائیوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے تھے جو مقبوضہ کشمیر میں جانیں اور خون قربان کر رہے تھے۔ ملک رجب علی کا مسئلہ نفسیاتی تھا جو اسی کا مسئلہ تھا لیکن اس سے واقف نہیں تھا۔ یہ ایک احساس تھا جو کانٹے کی طرح اُس کے دل میں اُتر گیا تھا۔ یہ ضمیر کا ردِّ عمل تھا۔ اُس نے ایک ایسے آدمی کو قتل کیا تھا جو محبِّ وطن پاکستانی تھا۔ وہ پاکستان کے دشمن کے پاکستانی دوستوں کا دوست رہا اور پولیس میں اپنے عہدے کو اُن کی منشاء کے مطابق استعمال کرتا رہا تھا۔ وہ اب اپنے ہاتھوں اُس دشمن کے دل میں خنجر اتارنا چاہتا تھا۔ وہ بے چین اور بے قرار رہتا تھا۔ اُسے نجات کی یہی صورت نظر آتی تھی کہ دشمن کو اپنے ہاتھوں ختم کرے یا خود ختم ہو جائے۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے جس میں انسان لاشعوری طور پر اپنے آپ کو سزا دینا چاہتا ہے یا کوئی کارنامہ کر کے اپنے آپ کو معاف کرنے

کا جواز پیدا کرنے کی یا ہیرو بننے کی کوشش کرتا ہے۔

انسان کتنا ہی دانشمند، کتنا ہی عالم کیوں نہ ہو وہ اپنی نفسیات کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہوتا ہے۔ ملک رجب علی کا دماغ اوسط درجہ انسان کے دماغ سے کہیں زیادہ اچھا تھا۔ اُس نے پولیس کی نوکری کی تھی۔ وہ اوسط درجہ آدمی کی نسبت زیادہ بہتر سوچ سکتا تھا لیکن ہر انسان کی طرح وہ بھی ذہن لاشعور کا قیدی تھا۔ اس حد تک مجبور اور بے بس کہ اُسے یہ خیال آتا ہی نہیں تھا کہ وہ اکیلا جاسوسوں اور تخریب کاروں کے گروہ کے خلاف کچھ نہیں کر سکے گا۔

●

وہ جب ملک ناصر کی کوٹھی میں داخل ہُوا ملک ناصر برآمدے میں کھڑا کسی سوچ میں گُم تھا۔ رجب علی کار سے نکلا تو ملک ناصر نے اُس کی طرف دیکھا لیکن ملک ناصر کی مُسکراہٹ غائب تھی جو رجب علی کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر آ جایا کرتی تھی۔

"پاکستان نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی ہے"۔۔۔ ملک ناصر نے آگے بڑھ کر رجب علی سے کہا۔

"کیا ہُوا؟"

"پاکستان اور آزاد کشمیر کی فوجوں نے کشمیر کے چھمب سیکٹر پر حملہ کر دیا ہے"۔۔۔ ملک ناصر نے کہا۔۔۔ "ابھی ابھی ریڈیو سے خبر سُنی ہے"۔

ملک ناصر رجب علی کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ اُدھر سے سلمیٰ دوڑی آئی۔ اُس نے بھی رجب علی کو وہی خبر سنائی جو وہ ملک ناصر سے سن چکا تھا۔ سلمیٰ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"بھابی!"۔۔۔ ملک ناصر نے سلمیٰ کو وہاں سے اُٹھانے کے لیے کہا۔۔۔ "آپ جائیں کھانا تو لگوا دیں۔ نوکر بڑے سُست ہیں"۔

"بھارت کا مسئلہ حل ہو گیا ہے"۔۔۔ ملک ناصر نے رجب علی سے کہا۔۔۔ "پاکستان اب دو دن کا مہمان ہے۔ جنگی قوت کے لحاظ سے بھارت پاکستان کے لیے دیو ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا کہ پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج نے سرحد پر کہیں بھی چھیڑ خانی کی بھارت پاکستان پر حملہ کر دے گا اور اپنی پوری جنگی طاقت سے حملہ کرے گا"۔

"تقریباً کتنے ڈویژن ہوں گے؟"

"بیس سے کم نہیں ہوں گے"۔۔۔ ملک ناصر نے جواب دیا۔۔۔ "پاکستان کو دو دنوں میں کچل کر رکھ دینے کے لیے بھارت کا آرمرڈ ڈویژن ہی کافی ہے۔ پاکستان کے پاس ہے کیا؟ پانچ ڈویژن بھی پُورے نہیں۔ پاکستان کی ایئر فورس میں کیا ہے؟.... پرانے زمانے کے سیبر طیّارے۔ کیا یہ طیّارے انڈین ایئر فورس کے جدید اور تیز رفتار طیّاروں کا مقابلہ کر سکیں گے؟"

"پھر ہمارا کام تو آسان ہو جائے گا"۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔۔۔ "بھارت پاکستان پر کب حملہ کرے گا؟"

"بہت جلد"۔۔۔ ملک ناصر نے جواب دیا۔۔۔ "اب کسی بھی صبح تم خبر سنو گے کہ لاہور پر بھارت کی فوج قابض ہو گئی ہے.... ہمارا کام آسان نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا کام کرنا ہے"۔

ملک رجب علی اُس کی زبان سے سننا چاہتا تھا کہ ایک ریڈار کو تباہ کرنا ہے لیکن ملک ناصر کی زبان سے ایسی کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔

"اگر سبوتاژ کا کوئی کام ہو تو مجھے بتانا" ــــ رجب علی نے کہا۔

ملک ناصر نے اُسے چونک کر دیکھا لیکن مُسکرا دیا۔ بولا کچھ بھی نہیں۔ وہ جاسوسی کے میدان کا شاہسوار تھا کچا نہیں تھا کہ ایک نئے آدمی کو اتنا نازک راز دے دیتا۔

"سبوتاژ ہمارا کام نہیں" ــــ ملک ناصر نے کہا۔

"ناصر! مُجھے کچھ بتاؤ" ــــ رجب علی نے ایسے جوشیلے لہجے میں کہا جیسے وہ انتقام لینا چاہتا ہو ــــ "میں دیکھ رہا ہُوں کہ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتے میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ میرے دل میں پاکستان کی محبت ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان نے مجھے کیا دیا ہے؟ میں آج آئی۔جی نہیں تو ڈی۔آئی۔جی ضرور ہوتا لیکن مُجھے استعفیٰ دینا پڑا۔ جو بھی سیاسی پارٹی اقتدار میں آئی اُس نے میرے ہاتھوں اپنے مخالفین کو کسی جرم کے بغیر گرفتار کرایا۔ میں نے انہیں جو اذیتیں دیں ان سے بعض مر بھی گئے۔ میرا ضمیر برداشت نہ کر سکا.... چاپلوسی خوشامد جھوٹ.... اس کے باوجُود اوپر والوں نے مجھے شک و شبہہ کی نظروں سے دیکھا۔ مجھے مجبور ہو کر استعفیٰ دینا پڑا۔ میرے انتقام کا وقت آگیا ہے ناصر! مجھے کچھ بتاؤ۔ پاکستان کی کوئی نازک رگ مجھے دکھا دو، پھر دیکھنا میں اس ملک کا کیا حشر کرتا ہُوں۔ مجھے کوئی معاوضہ نہیں چاہیئے۔ میں انعام نہیں مانگتا۔"

ملک رجب علی کا یہ داؤ بھی نہ چل سکا۔ اُسے توقع تھی کہ اس قسم کی جوشیلی اور جذباتی باتوں سے ملک ناصر کے ہونٹوں کی مہر توڑ لے گا لیکن ملک ناصر رجب علی کی توقع سے کہیں زیادہ محتاط اور مضبُوط ثابت ہُوا۔ وہ یوں مسکراتا رہا جیسے رجب علی کی ہنسی اُڑا رہا ہو۔

"دیکھو ملک!" ــــ ملک ناصر نے کہا ــــ "تم اس لائن میں ابھی بچے ہو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ جھے م پر عبار ہے۔ میں تمہیں ایک آدمی کے ساتھ لگا دوں گا۔ جنگ کی صورت میں راولپنڈی سے ایمونیشن، تیل پٹرول اور دیگر جنگی سامان کی ریل گاڑیاں چلیں گی۔ ان گاڑیوں کو راستے میں تباہ کرانا ہوگا۔ وہ آدمی تمہیں ٹریننگ دے گا۔ راولپنڈی ریلوے سٹیشن سے مال گاڑیوں کی روانگی کا وقت معلوم کر کے بھارت کی انٹیلی جنس کو بذریعہ وائرلیس اطلاعیں دینی ہوں گی۔ وہاں سے طیّارے آئیں گے اور گاڑی کو راستے میں تباہ کر دیں گے۔"

"میں یہ کام کر سکوں گا" ــــ رجب علی نے کہا۔

"تمہارے کرنے کا ایک کام اور ہے" ــــ ملک ناصر نے کہا ــــ "یہ صحیح ہے کہ پاکستان کے پاس فوج بھارت کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ پاکستان کے لوگ حُبّ الوطنی اور حرّیت کے جذبے سے پھٹے جا رہے ہیں۔"

"یہ تو رن کچھ کی لڑائی میں پتہ چل گیا تھا" ــــ ملک رجب علی نے کہا ــــ "ہم اس قوم کو مرا ہُوا سمجھتے تھے مگر رن کچھ میں دونوں ملکوں کی فوجوں کا تصادم ہُوا تو پتہ چلا کہ پاکستانی قوم مری ہُوئی نہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ زندہ و بیدار ہے۔"

"یہ ایک خطرہ ہے" ــــ ملک ناصر نے کہا ــــ "اگر انڈین آرمی لاہور میں داخل ہوگئی تو لاہور کا ہر ایک مکان قلعہ بن جائے گا۔ بچّہ بچّہ لڑے گا اور انڈین آرمی کو لاہور میں چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ انڈین آرمی کے پاس اسلحہ ایمونیشن تو بہت ہے لیکن مورال نہیں۔ انڈین آرمی صرف وہاں کامیاب ہو سکتی ہے جہاں، اُسے راستہ بڑا صاف مِل جائے اور کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اگر پاک فوج پیچھے ہٹ آئی تو شہری آگے

بڑھے جائیں گے لیکن ہمارا مشاہدہ کچھ اور ہے۔ رن کچھ میں صرف ایک بریگیڈ نے بھارت کے ایک ڈویژن کو وہ مار دی تھی کہ شاستری کو ہاتھ کھڑے کرنے پڑے....

"مقبوضہ کشمیر میں پاکستان اور آزاد کشمیر کا کمانڈو اپریشن دیکھ لو۔ ان چند ایک انسانوں نے وہ تباہی مچائی ہے جیسے وہاں جن بھُوت پھر گئے ہوں۔ ساری دنیا دنگ رہ گئی ہے۔ وہاں انڈین آرمی کی تعداد کم و بیش دو لاکھ ہے لیکن یہ تعداد بیکار ہو کے رہ گئی ہے.... کرنے والا کام یہ ہے کہ پاکستان کے لوگوں کا جذبہ توڑنا ہے۔ یہ کام ہو رہا ہے۔ تم یہ کام کامیابی سے کر سکتے ہو۔ تمھیں جاننے والے لوگ تم سے فوراً متاثر ہوں گے اور تمھاری ہر بات کو سچ مانیں گے کیونکہ تم ڈی۔ایس۔پی رہ چکے ہو اور سوسائٹی میں تمھارا مقام خاصا اونچا ہے۔ تم زبان کا جادو چلانا جانتے ہی ہو۔"

"تم مجھے ففتھ کالم میں شامل کرنا چاہتے ہو" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "یہ کوئی مشکل کام نہیں۔"

"کسی ہوٹل میں جا بیٹھو" ــــ ملک ناصر نے کہا ــــ "کسی محفل میں چلے جاؤ۔ کسی ایسے آدمی سے بات کرو جو بات آگے چلانے کا عادی ہو۔ ہر جگہ ایسی افواہیں پھیلاؤ جو قابلِ یقین ہوں۔ زور اس پر دینا ہے کہ انڈین آرمی لاہور میں داخل ہو گئی ہے اور پاک فوج بھاگ رہی ہے۔"

"یعنی مجھے یہ مشہور کرنا ہے کہ ہماری فوج بھارتی فوج کے مقابلے میں ٹھہرنے کے قابل نہیں" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "اور بھارت ایک دیو کی طرح چلا آرہا ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ بھارت اور پاکستان کے لوگ افواہ ساز اور افواہ پسند ہیں" ــــ ملک ناصر نے کہا ــــ "تم انہیں ذرا سی بات بتاؤ تو یہ چند ایک آدمیوں میں گھوم پھر کر بتنگڑ بن جاتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی کمزوری ہے جس سے ہم فائدہ اٹھائیں گے۔ تم ایک چنگاری رکھ دو پھر دیکھنا کہ جنگل کو آگ کس طرح لگتی ہے.... میں تمہیں اچھی طرح سمجھا دیتا ہوں۔"

ملک ناصر نے اُسے ففتھ کالم کے کام اور طریقہ کار پر لیکچر دیا اور اُسے کہا کہ وہ اس کام کی ابتدا کر دے۔ ملک رجب علی ریڈار کے متعلق کچھ سننے کو بیتاب تھا مگر ملک ناصر نے ایسی کوئی بات نہ کی۔

●

وہ یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کا دن تھا۔

چھمب سیکٹر میں بھارتیوں نے جو دفاعی انتظامات کر رکھے تھے اسے کوئی ٹینک ڈویژن ہی توڑ سکتا تھا۔ ایک تو قلعہ بندیاں تھیں جن میں ملگوتیاں، چک پنڈت، مناور، جھنڈہ، پھوڑا اور برسالہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اچھے خاصے مضبُوط قلعے تھے۔ اِن کے علاوہ کنکریٹ کے بنکر تھے جن میں بعض دو منزلہ تھے۔ انہیں توپوں اور ٹینکوں کے گولے بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔ زمین کے نیچے بھی دفاعی انتظامات تھے۔ یہ گلیاں سی تھیں جو زیرِ زمین اِدھر اُدھر چلی جاتی تھیں۔ ضرورت کے مطابق جوان ایک بنکر سے دوسرے بنکر تک اور ایک مورچے سے زمین کے اندر ہی اندر دوسرے مورچے تک جا سکتے تھے۔

ایسے مضبُوط اور بھارتیوں کے دعوے کے مطابق ناقابلِ تسخیر دفاع میں بھارت نے بے شمار فوج بھر رکھی تھی۔ توپ خانہ تھا اور ٹینک بھی تھے اس دفاع کو فضائی تحفظ دینے کے لیے جمّوں اور پٹھانکوٹ کے ہوائی اڈوں پر انڈین ایئر فورس کے لڑاکا بمبار طیّارے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

مقبوضہ کشمیر میں پاکستان اور آزاد کشمیر کے کمانڈو جانبازوں نے وقت سے بہت پہلے کامیابی حاصل کر لی تھی جو معمولی نہیں تھی۔ تمام یونٹیں بارکوں اور کیمپوں میں قید ہو کے رہ گئی تھیں۔ چھاپہ ماروں نے جنگی اہمیت کے تمام پل تباہ کر دیئے تھے۔ سڑکیں فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے محفوظ نہیں رہی تھیں۔ بلندی کی کوئی پوسٹ سلامت نہیں رہی تھی۔

اگست اور ستمبر ۱۹۶۵ء کے دو مہینے پاکستان اور کشمیر کی تاریخ کا ایک درخشاں اور یادگار باب ہے۔ پاکستانیوں کو پہلی بار احساس ہُوا تھا کہ کشمیر پاکستان کا مسئلہ ہے اور پاکستانیوں کو پہلی بار اپنے جذبے کے جوہر دکھانے کا موقعہ ملا تھا۔ بھارت نے جوابی دار یُوں کیا کہ اگست کے وسط میں آزاد کشمیر کے علاقے بھارت گلی اور درّہ حاجی پیر (ٹیٹوال سیکٹر) پر شدید گولا باری شروع کر دی۔ ۲۵ اگست کے آخری بارہ گھنٹوں میں یہ گولا باری اتنی شدید تھی کہ بارہ گھنٹوں میں بھارتی توپ خانے نے ۲۰ ہزار گولے فائر کیے۔

۲۶ اگست ۱۹۶۵ء کو انڈین آرمی کے پورے بریگیڈ نے آزاد کشمیر کی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ ایک چوکی پر آزاد کشمیر فوج کی صرف ایک کمپنی جس کی نفری صرف ایک سو تھی مورچہ بند تھی۔ ان ایک سو جوانوں نے ایک بھی گولی فائر نہ کی جب دشمن اتنے قریب آ گیا کہ اُس کی آنکھوں کی سفیدی صاف نظر آتی تھی آزاد کشمیر کے مجاہدوں نے اُس پر گولیوں اور گرینیڈوں کا مینہ برسا دیا۔ دشمن کئی لاشیں اور ہتھیار وغیرہ پھینک کر پسپا ہو گیا۔

۲۷ اگست کو بھارتیوں نے سکیم بدل کر رات ایک بجے حملہ کیا۔ اب کے وہ دائیں اور بائیں سے اُوپر آئے۔ معرکہ خونریز تھا۔ اُدھر پورا بریگیڈ جسے ڈویژن کے توپ خانے کی گولا باری حاصل تھی، اِدھر صرف ایک سو جوان جن میں دو کل کے حملے میں شہید اور پانچ شدید زخمی ہو چکے تھے۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ ۲۶ جوان شہید ہو گئے۔

درّہ حاجی پیر اور بے ڈوری کی چوکیوں پر انڈین آرمی نے بریگیڈ کی نفری سے حملے کیے۔ اس کے ساتھ اِس قدر گولا باری کی کہ آزاد کشمیر کے یہ مٹھی بھر جوان شہید ہوتے، زخمی ہُوئے اور جو دو چار بچ گئے تھے وہ دو چار دن مقابلہ کر کے آخر پیچھے ہٹ آئے۔

بھارتیوں نے یہ تو نہ سوچا کہ اُنہوں نے کتنی زیادہ قوت سے کتنی تھوڑی سی نفری کو شکست دی ہے اور یہ تو ابھی ابتدا ہے۔ اُنہوں نے اس کو انتہا سمجھا اور نشے سے سرشار پاکستان کی سرحد کے اندر گولا باری شروع کر دی جس کا نشانہ ایک معصوم سے سرحدی گاؤں اعوان شریف ضلع گجرات کے بے ضرر دیہاتی بنے۔ ہندو نے مسلمان کی غیرت کو چیلنج کر دیا تھا۔

پاک فوج میدان میں آ گئی چونکہ بھارتیوں کے حملے سیدھے پاکستان پر آتے نظر آ رہے تھے اس لیے پاک فوج کی بلوچ اور پنجاب رجمنٹیں چھمب کی طرف بھیج دی گئیں۔

یہ تھا وہ محاذ جسے بھارت کے اُس وقت کے وزیرِاعظم لال بہادر شاستری نے اپنی مرضی کا محاذ کہا تھا اور جسے اُس نے اپنے فوجی لیڈروں کے کہنے کے مطابق پہاڑی ڈویژنوں کے لیے بہترین محاذ سمجھا تھا۔ بھارت کے فوجی لیڈر جانتے تھے کہ پاکستان کے پاس ایک بھی پہاڑی ڈویژن نہیں۔

۳۰ اگست ۱۹۶۵ء کو بھارتیوں نے پونچھ کی شمالی پہاڑیوں میں گولا باری شروع کر دی۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج کی رات اُن پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے اور پاکستانی انہیں اُن کی مرضی کے محاذ پر نہیں

بلکہ اپنی مرضی کے میدان میں لڑائیں گے۔ بھارتی یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ وہ پونچھ کے شمالی علاقے پر قابض ہو کر باغ کی وادی پر قبضہ کر لیں گے جہاں سے وہ آزاد کشمیر کو آسانی سے قبضے میں لے لیں گے۔ پاک فوج کے دو بریگیڈ جن کے ساتھ ایک بریگیڈ آزاد کشمیر کا تھا، ۳۱/۳۰ اگست کی رات گجرات سے آگے نکل گئے تھے۔ پاکستانی توپ خانے نے گولا باری شروع کر دی تھی جس نے چھمب کے سیمنٹ اور لوہے کے مضبوط بنکروں اور قلعہ بندیوں کو ہلا ڈالا تھا۔ سحر کی تاریکی میں ہمارے تینوں بریگیڈ برق رفتار پیش قدمی کر گئے۔

●

یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح کو تاریخ پاکستان کے ایک درخشندہ باب کی سرخی لکھ دی گئی۔ چھمب کا سورج اُبھر رہا تھا۔ انڈین آرمی کے غرور اور بھارتی حکمرانوں کی نخوت اور رعونت کا سورج پاکستانی توپ خانے کی گولا باری کے گرد و غبار، ٹینکوں اور پیادہ جوانوں کی یلغار کی گرد میں غروب ہو رہا تھا۔ دن کے ساڑھے دس بجے تک چھمب کی قلعہ بندیاں ـــــ ملگوتیاں، چک پنڈت، مناور، جھنڈا، پھورا اور برسالہ ـــــ غازیوں کے قدموں تلے روندی جا چکی تھیں۔ پورے جال جو بھارتیوں کا مضبوط مورچہ بلکہ قلعہ تھا، خالی ہو رہا تھا کیونکہ بھارت کے دفاعی دستوں کے محاصرے میں آ جانے کا خطرہ نظر آنے لگا تھا۔ بھارت کے فرانسیسی ٹینک ہمارے دستوں کو روکنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے لیکن پاکستانیوں نے رُخ بدل کر دیوا پر حملہ کر دیا اور تھوڑی سی دیر میں اِس اہم اور مضبوط مقام پر بھی قبضہ کر لیا۔

ذرا بھارتی فوج کا حساب لگائیں جو تین بریگیڈوں کے آگے اپنے ٹینک، توپیں، مارٹر اور مشین گنیں، پٹرول اور ہر طرح کے ایمونیشن کے بکسوں اور لاشوں کے ڈھیر پھینکتی بھاگی چلی جا رہی تھی ـــــ انڈین آرمی کا نمبر دس یونٹین (پہاڑی) ڈویژن ـــــ نمبر ایک سو اکانویں انڈین بریگیڈ گروپ اور نمبر ترانوے انڈین انفنٹری بریگیڈ ـــــ چھمب جوڑیاں کی فضا میں وائرلیس سیٹوں پر ایک واویلا سنائی دیا۔ یہ انڈین آرمی کے ایک شکست خوردہ کمانڈر کی دہائی تھی جو وہ اپنی ہائی کمان کو دے رہا تھا۔ وہ گھبرائی ہُوئی آواز میں کہہ رہا تھا ـــــ "وہسکی بھیجو.... وہسکی بھیجو"

شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے ـــــ "وہسکی" آ گئی لیکن یہ بوتلوں کی شکل میں نہیں بلکہ چار ویمپائر لڑاکا بمبار طیّاروں کی شکل میں تھی۔ وہسکی بھیجو کا مطلب یہ تھا کہ فضائی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ خفیہ الفاظ تھے جو بھارتی ہائی کمان نے سُنے اور چار جدید لڑاکا بمبار طیارے چھمب کی فضا میں بھیج دیتے۔ اُنہوں نے نہایت اطمینان سے پاک اور آزاد کشمیر ٹروپس پر آگ اگلنی شروع کر دی۔ ہمارے طیارہ شکن توپچیوں نے ان کا مقابلہ کیا مگر طیّارے کا مقابلہ طیّارہ ہی کر سکتا ہے۔

پاک فضائیہ کے دو شہباز گجرات پر اُڑ رہے تھے۔ انہیں ایک آواز سنائی دی ـــــ "دشمن کے طیّارے ہمارے مورچوں پر فائرنگ کر رہے ہیں" ـــــ دونوں شہباز تاریخ پاکستان کا پہلا فضائی معرکہ لڑنے کے لیے چھمب کے آسمان میں پہنچ گئے۔ اب وہاں چار ویمپائر ہی نہیں دو کینبرا طیّارے بھی اُڑ رہے تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دو سیبر طیّارے چار ویمپائروں اور دو کینبرا جیسے برتر اور تیز تر طیّاروں کا مقابلہ کر سکیں گے مگر شہبازوں نے جان کی بازی لگا دی۔ پاک فوج دیکھ رہی تھی۔ بھارت کی فوج دیکھ رہی تھی ـــــ خدا دیکھ رہا تھا ـــــ آسمان میں مشین گنوں کے دھماکے سنائی دینے لگے اور ویمپائر یکے بعد دیگرے بم کی طرح پھٹنے لگے۔

چاروں ویمپائروں کے پرخچے چھمب کی فضا میں بکھر کر زمین پر دُور دُور جا گرے۔ کینبرا طیّارے اپنے چار ساتھیوں کا حشر دیکھ کر کھسک گئے ۔۔۔ وہسکی کی بوتل چکنا چور ہو گئی۔

بھارت کا فضائی قوت کا غرور بھی چکنا چور ہو گیا۔

●

رجب علی کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ پاک فوج کو چھمب کے محاذ پر کتنی کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اُس نے ریڈیو آن کیا اور آل انڈیا ریڈیو دلّی کا سٹیشن لگایا۔ چند منٹ بعد وہاں کوئی تبصرہ نشر ہونا شروع ہوا جو پاکستانی حملے سے تعلق رکھتا تھا۔ اِن تبصرے نے اُسے مایوس کر دیا کیونکہ مبصّر کہہ رہا تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی فوجوں نے چھمب پر جو حملہ کیا تھا وہ پسپا کر دیا گیا ہے اور پاکستانی بہت سے ٹینک اور توپیں پیچھے چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔

وہ ملک ناصر کے کمرے میں گیا اور اُسے بتایا کہ پاک آرمی کی تو بڑی گت بنی ہے۔ ملک ناصر نے قہقہہ لگایا۔

"دیکھو ملک!" ۔۔۔ ملک ناصر نے کہا ۔۔۔ "آئندہ خیال رکھو کہ آل انڈیا ریڈیو شکست کو فتح کہا کرتا ہے۔ تم نے رن کچھ کے متعلق آل انڈیا ریڈیو کی خبریں شاید نہیں سنی تھیں۔ اُدھر انڈین آرمی کا پورا ڈویژن پاکستان کے ایک بریگیڈ کے گھیرے سے نکلنے کے لیے پسپا ہو رہا تھا لیکن آل انڈیا ریڈیو کہہ رہا تھا کہ پاکستان آرمی کا بریگیڈ بُری طرح بھاگ رہا ہے۔ تم سبھی خبریں مجھ سے سنا کرو۔ میرے پاس ایک ایک منٹ کی رپورٹ آتی ہے۔ اِسے کہتے ہیں کامیاب پروپیگنڈا۔ تم یہ فن آل انڈیا ریڈیو سے سیکھو۔ جسے پاکستانی جھوٹ کہتے ہیں وہ بھارت کا ایک ہتھیار ہے ....

"چھمب کی کیفیت یہ ہے کہ حملے سے پہلے پاک آرمی کا توپخانہ ہر رات چھمب سیکٹر کے قریب پہنچ جاتا تھا اور بے تحاشہ گولا باری کر کے صبح طلوع ہونے سے پہلے وہاں سے غائب ہو جاتا تھا۔ چھمب کا دفاع پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ وہاں جو کچھ رہ گیا ہے وہ پاکستانیوں کے قبضے میں ہے۔ بھارت کے ٹروپس تیزی سے پیچھے ہٹ رہے ہیں اور پاکستانی آگے بڑھ رہے ہیں۔ اِس کیفیت میں ہم پر بڑی زبردست ذمہ داری عائد ہوتی ہے .... تم جاؤ آرام کرو۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

ملک رجب علی جب اپنے کمرے میں آیا تو جمال بیگ اُس کے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

"کچھ پتہ چلا کہ یہ لوگ کیا کریں گے؟" ۔۔۔ جمال بیگ نے رجب علی سے پوچھا اور کہنے لگا ۔۔۔ "خدا خیر کرے پاکستان نے ایک دیو کو چھیڑ دیا ہے۔"

"اب اللہ مالک ہے جو ہو گا سو ہو گا" ۔۔۔ رجب علی نے کہا۔

وہ دونوں بہت دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ رجب علی پر واضح ہو گیا کہ جمال بیگ عقل بھی رکھتا ہے اور جذبہ بھی اور شاید وہ اُس کا بڑا مضبوط سہارا بن سکے گا۔ رجب علی نے جمال بیگ کو بتا دیا کہ وہ مری کی پہاڑیوں میں گیا تھا اور یہ دیکھ آیا ہے کہ وہ ریڈار کہاں ہے جسے یہ لوگ تباہ کرنا چاہتے ہیں۔

جمال بیگ نے اُسے کہا کہ وہ اُسے پوری تفصیل سے سمجھا دے کہ یہ کیا سلسلہ ہے اور ہم کیا کر سکتے ہیں۔ رجب علی نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا سوائے اس عزم کے کہ وہ اس گروہ کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ جمال بیگ کی نفسیاتی کیفیت بھی رجب علی سے ملتی جلتی تھی، اس لیے اُس نے ویسا ہی مشورہ دیا جو پہلے ہی رجب علی کے ذہن میں تھا۔

اُسی شام جب ملک ناصر کہیں باہر نکل گیا تھا شمیم رجب علی کے کمرے میں آ گئی۔

"اب آپ کے امتحان کا وقت آ گیا ہے" ۔۔۔ شمیم نے بڑی سنجیدگی سے کہا ۔۔۔ "میں دیکھ رہی ہوں کہ میرا باپ صبح سے بے چین اور پریشان ہے۔ اِس وقت تک وہ درجنوں کے حساب سے ٹیلیفون کر چکا ہے۔ اُس کے چند ایک ٹیلیفون تو میں نے سنے ہیں۔ پہلا جملہ یہ کہتا ہے ۔۔۔ 'گائے کھل گئی ہے' .... اپنی اپنی جگہ ہشیار رہنا ۔۔۔ اِس کے بعد وہ ایسی باتیں کرتا رہا جیسے یہ شخص گائے بھینسوں کا کاروبار کرتا ہے .... اصغر ٹھیک ہو گیا ہے۔ اُسے کہیں آگے نہ بھیج دیں۔"

"آگے بھیج دیا تو کیا ہو گا؟" ۔۔۔ رجب علی نے ذرا سخت سی آواز میں کہا۔

شمیم کا سر جھک گیا۔ رجب علی نے اُس کی ٹھوڑی تھام کر اُس کا سر اُوپر کیا۔ شمیم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"شمیم!" ۔۔۔ رجب علی نے کہا ۔۔۔ "اصغر کے پاؤں کی زنجیر نہ بن جانا۔ زندہ قوموں کے بیٹے عشق و محبت کے لیے زندہ نہیں رہا کرتے۔ انہیں وطن کی قربان گاہ پر اپنی جان کا اور اپنے خون کا نذرانہ دینا ہوتا ہے۔"

"میں اپنے وطن کے لیے کیا قربانی دے سکتی ہوں؟" ۔۔۔ شمیم نے پوچھا۔

"تم اصغر کو قربان کر دو" ۔۔۔ رجب علی نے کہا ۔۔۔ "اگر تم اصغر کے راستے میں نہ آئیں تو یہ بھی تمہاری بہت بڑی قربانی ہو گی۔"

شمیم کی نظریں رجب علی کے چہرے پر جم گئیں اور اُس کی آنکھوں نے آنسو پی لیے۔

"اور ابھی معلوم نہیں تمہیں اور کیسی قربانی دینی پڑے گی" ۔۔۔ رجب علی نے کہا۔

شمیم نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم جانتی ہو میں یہاں کیوں رکا ہوا ہوں" ۔۔۔ رجب علی نے کہا ۔۔۔ "میں بتا نہیں سکتا کہ جیت کس کی اور ہار کس کی ہو گی۔ اگر تمہارے ڈیڈی ہار گئے تو ...."

"میں جانتی ہوں پھر کیا ہو گا" ۔۔۔ شمیم نے رجب علی کی بات کاٹتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں اب ہر قربانی کے لیے تیار ہوں .... کیا آپ نے سلمیٰ باجی کو بتا دیا ہے کہ آپ یہاں کیوں رکے ہوئے ہیں؟"

"نہیں" ۔۔۔ رجب علی نے کہا ۔۔۔ "اُسے نہیں بتاؤں گا۔"

●

وہ دن گزر گیا۔ ملک ناصر شام سے پہلے گھر سے نکل گیا۔ رجب علی اور جمال بیگ نے اُسے دیکھا اور جب اُس کی کار بڑی ہی تیزی سے کوٹھی سے نکل گئی تو رجب علی اور جمال بیگ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ملک ناصر کے جانے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی ضروری کام سے گیا ہے۔

"اس شخص سے آپ کوئی راز لے سکیں گے؟" ۔۔۔ جمال بیگ نے رجب علی سے پوچھا۔

"بیگ صاحب!" ۔۔۔ رجب علی نے سنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا ۔۔۔ "کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ میری بعض حرکتیں ایسے لگتی ہیں جیسے میں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہوں۔"

"اگر آپ اپنا دماغی توازن درست کرنے بیٹھ گئے تو آپ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے" ۔۔۔ جمال بیگ نے کہا ۔۔۔ "عزم اور جذبے والے پاگل ہی ہوا کرتے ہیں۔"

سلمیٰ آ گئی اور دونوں خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد اصغر آ گیا۔ وہ جوش سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ ہیجانی کیفیت میں باتیں کرتا تھا۔ سلمیٰ اُس کی بلائیں لینے لگی۔ رجب علی کو موقع مل گیا۔

کہ اُسے ایک دوست کے ہاں جانا ہے۔ اُس نے شمیم کی کار لی اور نکل گیا۔

جب وہ آسیہ کی کوٹھی میں داخل ہُوا تو کار کی آواز پر شازی دوڑتی باہر نکلی۔ رجب علی نے کار سے نکل کر اُس سے پوچھا کہ اُس کی ماں گھر ہے؟

"ملک ناصر آیا تھا"— شازی نے اُسے بتایا— "امّی کو ساتھ لے گیا ہے.... آج سے ان لوگوں کی سرگرمیاں بڑی تیز ہو گئی ہیں.... آپ اندر چلیں۔ آج خدا سے کچھ اور مانگتی تو وہ بھی مل جاتا۔ امّی مجھے اکیلا چھوڑ گئی ہیں۔ میں کہتی تھی کہ آپ آجائیں یا آپ کا فون ہی آجائے"

"میں آیا ہی تمہارے پاس ہوں"— رجب علی نے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہوئے کہا— "آج مجھے تمہاری ہی ضرورت تھی۔ ملک ناصر مجھے اندھیرے میں رکھ رہا ہے۔ مجھے ٹال رہا ہے"

"آپ پر ابھی کوئی بھی بھروسہ نہیں کرے گا"— شازی نے کہا— "انٹیلی جنس والے تو اپنے باپ پر بھی بھروسہ نہیں کیا کرتے۔ آپ کو کچھ پتہ چلے گا تو مجھ سے، صرف مجھ سے"

"میں یہی بات کرنے آیا ہوں"— رجب علی نے کہا— "مجھے ریڈار کے متعلق ان لوگوں کے پروگرام کی تفصیل کب مل سکے گی؟"

"پرسوں صبح"— شازی نے کہا— "کل رات ہماری کوٹھی میں پارٹی ہو رہی ہے۔ ملک ناصر بھی ہو گا اور پاکستان کے وہ دو افسر بھی ہوں گے جو ریڈار کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ ریڈار کو تباہ کرنے میں مدد دیں گے۔ میں آپ کو ان کے نام بتا دوں گی"

●

اگلے چار دن تک شازی اُسے کچھ نہ بتا سکی سوائے اس کے کہ ریڈار کو اب کسی بھی روز تباہ کر دیا جائے گا اور اس پارٹی میں صرف چار آدمی ہوں گے۔

ان چار دنوں میں پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج کے تین بریگیڈ بھارت کی دفاعی قلعہ بندیوں اور بنکروں کو روندتے ہوئے آگے چلے گئے تھے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز ان کے راستے میں دریائے توی آ گیا۔ بھاگتے ہوئے دشمن کے چند ایک ٹینک اور ٹرک دریا میں پڑے تھے۔ انہیں چلانے والے انہیں دریا میں پھینک کر بھاگ گئے تھے۔ بھاگتے ہوئے دشمن نے دریا کے پار اپنا توپ خانہ پوزیشن میں کر کے دریا کے اِدھر والے کنارے پر ایسی شدید گولا باری شروع کر دی جیسے اُس نے پاکستان اور آزاد کشمیر کے مجاہدوں کے سامنے آگ کی دیوار کھڑی کر دی ہو۔

اس قدر شدید گولا باری جس میں زمین کا ایک انچ بھی محفوظ نہیں تھا اور اس سے آگے دریا دو ایسی رکاوٹیں تھیں جو کسی بھی جری اور کثیر تعداد فوج کو روک لیا کرتی ہیں اور حملے کے پلان دھرے رہ جاتے ہیں۔ ان دو رکاوٹوں کے ساتھ ایک رکاوٹ پاکستان کے اُس وقت کے حکمران نے کھڑی کر دی۔ وہ اس طرح کہ جو ڈویژن کمانڈر اتنے مضبوط دفاع کو اتنے کم عرصے میں توڑ کر خلاف توقع اتنی تیز پیش قدمی کر رہا تھا اُسے حکم ملا کہ وہ ڈویژن کی کمان چھوڑ دے، دوسرا جرنیل کمان لینے آرہا ہے۔

ایسے وقت جب دشمن پسپا ہو رہا ہو اور اپنی پیشقدمی پلان کے مطابق ہو رہی ہو، کمان میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی لیکن پاکستان کا باوا آدم نرالا تھا۔ ایک خود ساختہ فیلڈ مارشل پاکستان کا باوا آدم بنا بیٹھا تھا جو ملک کا حکمران

بھی تھا اور افواج کی ہائی کمانڈ کو اُس نے اپنے پاؤں تلے رکھا ہُوا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ چھمب کے محاذ پر مطلوبہ کامیابی تقریباً حاصل کر لی گئی ہے تو اُس نے اس کا سہرا اپنے ایک خوشامدی جرنیل کے سر باندھنے کے لیے اُسے اس ڈویژن کی کمان لینے کے لیے بھیج دیا۔

پہلے جرنیل نے بہت واویلا بپا کیا کہ اس صورتِ حال میں جب دشمن پسپا ہو رہا ہے کمان میں ردّوبدل نہ کیا جائے کیونکہ تمام تر صورتِ حال کو وہی بہتر سمجھتا ہے اس کے علاوہ کمان دینے اور لینے میں بڑا قیمتی وقت ضائع ہو جائے گا مگر اس بادشاہ نے ویسے ہی احکام دیئے جیسے دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر نے اپنے جرنیلوں کو روس کے محاذ پر دیئے اور شکست کھا کر اپنے ملک کو تباہ کرا لیا تھا۔

چھمب سیکٹر میں ڈکٹیٹر شپ کی تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ ڈویژن کی کمان لینے دینے میں تیرہ گھنٹے ضائع ہو گئے۔ ان تیرہ گھنٹوں میں دشمن نے پیچھے جا کر دفاعی مورچے مضبوط کر لیے۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کے افسر اور جوان مایوس ہو گئے۔ وہ دشمن کی گولا باری میں ہی دریا پار کرنے کو بے تاب تھے۔ ان کی بیتابیوں میں انتقام کا جذبہ کارفرما تھا۔ انتقام لینے کے لیے انہیں اٹھارہ سال انتظار کرنا پڑا تھا۔

ان ٹروپس میں آزاد کشمیر کے وہ جوان بھی تھے جو، ۱۹۴۷ء میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور مقبوضہ کشمیر سے اس حال میں بھاگ کر آئے تھے کہ ان کے مکانوں کو آگ لگا دی گئی تھی۔ ان کے خاندانوں کے کئی کئی افراد کو اُن کے سامنے قتل کیا گیا تھا۔ ان کی بہنوں اور ماؤں کو ڈوگرے اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ ان میں کئی بچے تن تنہا، پاپیادہ، روتے بلبلاتے، پاؤں سوجے ہُوتے، نیم غشی کی حالت میں آزاد کشمیر اور پاکستان میں آئے تھے۔

پاک فوج میں بہت سے جوان ایسے تھے جنہوں نے بچپن میں مشرقی پنجاب میں اپنوں کو سکھوں کی کرپانوں سے کٹتے اور جوان لڑکیوں کو بے آبرو اور اغوا ہوتے دیکھا تھا۔ وہ ان بھیانک اور آسیبی یادوں کے ساتھ جوان ہوتے تھے۔ ان کے اندر انتقام کا لاوا رُکا ہُوا تھا۔

آزاد کشمیر اور پاکستان کے ان جوانوں کو اپنے حکمرانوں کی پالیسیوں اور حکام کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ہی وہ جانتے تھے کہ فوج سیاسی حکمرانوں کا ہتھیار ہوتی ہے جب چاہا نیام سے نکال لیا، جب چاہا نیام میں ڈال لیا۔ فوج سے توقع رکھی جاتی ہے کہ اپنا مورال بلند رکھے، افسروں اور جوانوں کے جذبات کا خواہ کیسا ہی حال ہو۔

یہ ٹروپس جو دریائے توی کے کنارے رُکے کھڑے تھے، وہ جنگی مبصّروں اور فنِ حرب و ضرب کو سمجھنے والوں کی نگاہ میں نفری اور ہتھیاروں کے لحاظ سے اس قابل نہیں تھے کہ بھارت کے اتنے مضبوط مورچوں میں جدید اسلحہ سے لیس پوزیشن لیے ہُوئے ڈویژنوں کو یوں پسپا کر سکتے جس طرح بھارتی پسپا ہُوئے تھے۔ یہ اسلام کے ان بیٹوں کا جذبہ تھا جس نے گوشت پوست کے ان انسانوں کو ٹینک بنا دیا تھا۔ مردانِ حُر مردانِ آہن بن گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندو اُن کا اور اُن کے مذہب کا اور اُن کے ملک کا ایسا دشمن ہے جو ہمیشہ دشمن رہے گا اور وہ اسلام دشمنی کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہے۔

یہ افسر اور جوان دریائے توی کے قریب اوپر والوں کو کوس رہے تھے جو دریا میں کود جانے کا حکم نہیں دے رہے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ اُن کی ہائی کمانڈ پر ایک آمر کا آسیب طاری ہے جس نے

جنگی صورتِ حال کی، ڈویژن کمانڈر اور اُس کے ٹروپس کے جذبے اور بھڑکے ہوئے جذبات کی پرواہ نہ کرتے ہُوئے کمان تبدیل کردی ہے اور یہ ایسا احمقانہ فیصلہ ہے جو فتح کو شکست میں بدل سکتا ہے۔

●

پاک فوج کے توپ خانے نے اپنے فضائی دیدبانوں کے ذریعے دشمن کے توپ خانے کی پوزیشنیں معلوم کرلیں اور گولا باری شروع کردی۔ شام ساڑھے پانچ بجے پاکستان کے ایک بریگیڈ کو دریا پار کرنے کا حکم ملا۔ ٹروپس اسی حکم کے منتظر تھے۔ حکم ملتے ہی وہ آگ کے دریا میں کود گئے اور شام ساڑھے سات بجے اپنے تینوں بریگیڈ دریا پار کر گئے۔

دشمن اور زیادہ بوکھلا گیا۔ ایک جگہ بھارتی توپ خانے کی اکتیس فیلڈ توپیں گولا باری کر رہی تھیں۔ پاکستانی توپ خانے کا ایک لیفٹیننٹ کرنل اتنا دور آگے نکل گیا کہ دشمن کی ان توپوں کے قریب جا پہنچا۔ اُس نے وائرلیس پر اپنے توپ خانے کو فائر آرڈر دیا۔ اس پر گولوں کی بوچھاڑ سیدھی دشمن کی توپوں کے اردگرد پڑی۔ بھارتی توپچی اکتیس اچھی بھلی توپیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پاکستانی لیفٹیننٹ کرنل نے اچھل کر نعرہ لگایا۔ وہ دشمن کی پوزیشنوں کے قریب تھا۔ اُدھر سے مشین گن فائر ہوئی جس کی گولیاں ہمارے لیفٹیننٹ کرنل کے ایک بازو کی ہڈی کو توڑتی اور ایک ٹانگ کو چیرتی گزر گئیں۔ وہ بے ہوش ہوگیا لیکن اپنے ٹروپس اتنی تیز پیش قدمی کر رہے تھے کہ جلدی پہنچ گئے اور اپنے لیفٹیننٹ کرنل کو جھاڑیوں میں سے اٹھا کر پیچھے بھیج دیا۔ وہ آج بھی زندہ ہے۔

۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھی پیشقدمی کی رفتار میں فرق نہ آنے دیا گیا۔ بھارتی ٹینکوں نے گھوم پھر کر اور توپ خانے نے بے تحاشہ گولا باری کر کے پاکستان اور کشمیر کے بیٹوں کو روکنے کی کوشش کی مگر دشمن الٹے پاؤں پیچھے ہٹتا گیا۔ اُس نے اپنے فضائی بیڑے کی بھی مدد حاصل کی مگر آسمان سے برستے ہُوئے راکٹ اور بم اور مشین گنوں کی بوچھاڑیں اللہ کے سپاہیوں کو نہ روک سکیں۔

ایک بار انڈین ایئر فورس کے چھ نیٹ طیارے اپنی پسپا ہوتی فوج کے قدم جمانے کے لیے آئے۔ ادھر سے پاک فضائیہ کے دو سٹار فائٹر (ایف ۱۰۴) پہنچ گئے۔ چھ کے چھ نیٹ طیارے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ اِن میں سے ایک کا پائلٹ ایسا بوکھلایا کہ وہ اپنے اڈے کا رخ ہی بھول گیا۔ پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے اُسے گھیرے میں لے لیا اور اُسے پسرور (سیالکوٹ سیکٹر) میں لا اتارا۔ اس کے پائلٹ کا نام سکواڈرن لیڈر برج پال سنگھ تھا۔

۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز بھارتیوں کا ایک اور مضبوط مورچہ راستے میں آگیا۔ یہ ٹروٹی کا مقام تھا اور یہ جوڑیاں کا دفاع تھا۔ یہ علاقہ بلند تھا۔ دشمن نے اس بلندی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہاں سے ٹینک اور توپیں قیامت کی گولا باری کر رہی تھیں۔ ہمارے ٹروپس کے سامنے چھوٹی چھوٹی نہروں کی رکاوٹیں تھیں۔ اوپر سے دشمن آگ برسا رہا تھا۔ اللہ کے نام لیواؤں کے لیے یہ بڑا ہی کڑا امتحان تھا۔ پاکستانی ٹینک پوزیشنیں بدل بدل کر ٹروٹی کے دفاع کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شام کے پانچ بج گئے۔ پاک فضائیہ کی مدد لی گئی۔

اُوپر سے شاہباز بم اور راکٹ برسا رہے تھے، نیچے اپنی دو پلٹنیں دشمن کے اس بے حد مضبوط اور خطرناک مورچے کے ایک پہلو میں پہنچ گئیں۔ معرکہ شدّت اختیار کرتا گیا۔ شاہبازوں نے

اس مورچے کے عقب میں بہت بڑا شکار مارا۔ یہ ٹینک تھے، توپیں اور گاڑیاں تھیں۔ یہ کمک تھی جو ٹروٹی کے مورچے کو جا رہی تھی۔

دشمن پر پاکستان کے جانبازوں نے بڑھ چڑھ کر حملے کیے۔ دشمن پریشان ہوگیا۔ اپنے اُکھڑتے قدموں کو سنبھالنے کے لیے اُس نے مورچوں سے نکل کر دو جوابی حملے کیے جو اُسے بہت مہنگے پڑے۔ وہ بے شمار قیدی، لاشیں اور اسلحہ ایمونیشن پھینک کر پسپا ہوگیا۔

یہ جوڑیاں کا دفاع تھا جو ریزہ ریزہ ہُوا تو پاکستانی توپخانے کے گولے اکھنور میں گرنے لگے۔ اکھنور کشمیر کا وہ دروازہ تھا جو بھارت کے لیے بند کرنا تھا۔ اس صورت میں کشمیر میں بھارت کی جو فوج تھی وہ بھارت سے کٹ کر رہ جاتی اور یہ تمام نفری پاکستان کی قیدی ہوتی۔

پاکستان اور آزاد کشمیر افواج کی اس کامیابی نے نئی دِلّی کے در و دیواریوں ہلا دئیے جیسے پاکستانی توپوں کے گولے اکھنور میں نہیں نئی دِلّی میں پھٹ رہے ہوں۔ کمانڈو اپریشن کی کامیابی نے بھارتی ہائی کمانڈ کو پہلے ہی چونکا رکھا تھا۔ اب پاکستان اور آزاد کشمیر کے ٹروپس اکھنور کے قریب جا پہنچے تو حکومتی اور فوجی حلقوں میں بھونچال آگیا۔

بھارتی ہائی کمانڈ میں بڑے اچھے دماغ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے اس صورتِ حال کے لیے جو پاکستان نے بھارت کے لیے پیدا کر دی تھی پلان تیار کر رکھا تھا۔ پلان تھا — پاکستان پر اتنی زیادہ طاقت سے حملہ کہ کشمیر پر پاکستان کی گرفت ڈھیلی ہو جائے۔

۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کی شام ساڑھے چار بجے آل انڈیا ریڈیو کا پروگرام روک کر اعلان کیا گیا۔ "یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔ علاقہ نمبر ایک میں ایک دو دنوں میں دو جگہوں پر سخت بارش ہوگی" — اس اعلان کو دہرایا گیا۔ کچھ دیر بعد پھر پروگرام کو روکا گیا اور اعلان کیا گیا — "علاقہ نمبر ایک کے لیے آج کوئی وارننگ نہیں ہے" — اس اعلان کو بھی دہرایا گیا۔

یہ اعلان ملک رجب علی نے بھی سُنے۔ اُسے شک ہُوا کہ یہ کسی خاص اعلان کے خفیہ الفاظ ہیں اور "دو جگہوں پر سخت بارش" کا مطلب کچھ اور ہے۔ وہ اسی سوچ میں کھویا ہُوا تھا کہ جمال بیگ اُس کے کمرے میں آیا۔

"ملک صاحب!" — جمال بیگ نے فاتحانہ لہجے میں کہا — "کل تک اکھنور پر ہمارا قبضہ ہو جائے گا اور کشمیر بھارت سے کٹ جائے گا۔"

"ایک دو دنوں میں بھارت پاکستان پر بڑا طاقتور حملہ کرے گا" — رجب علی نے کہا — "آل انڈیا ریڈیو سے ابھی ابھی ایک پُراسرار اعلان ہُوا ہے جو عوام کے لیے موسم کا حال نہیں بلکہ یہ ایک کوڈ (خفیہ) پیغام ہے جو انڈین آرمی کو دیا گیا ہے۔"

بعد میں پتہ چلا کہ یہ واقعی خفیہ پیغام تھا جو فوج کو دیا گیا تھا۔ علاقہ نمبر ایک غالباً لاہور تھا۔ "دو جگہوں" سے مراد واہگہ اور قصور تھا۔ اس سے ایک ہی روز پہلے بھارت کے وزیرِ دفاع چاون نے کہا تھا — "ہماری فوجیں دلیری سے لڑ رہی ہیں۔ ہم نے (پاکستان کے خلاف) مناسب کارروائی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"ملک ناصر کہاں ہے؟" — جمال بیگ نے پُوچھا۔

"کل شام سے غائب ہے" — ملک رجب علی نے جواب دیا — "وہ اب غائب ہی رہے گا۔"

"ریڈار کو تباہ کرنے والی پارٹی کے پروگرام کا کچھ پتہ چلا؟" — جمال بیگ نے پُوچھا۔

"نہیں" — رجب علی نے جواب دیا — "اس لڑکی (شازی) نے بہت کوشش کی ہے لیکن یہ پروگرام اتنا خفیہ رکھا جا رہا ہے کہ اس رِنگ کے افراد کو بھی کچھ پتہ نہیں چلنے دیا جا رہا۔ یہ یقین ضرور ہے کہ اس ریڈار کو چار آدمیوں کی پارٹی تباہ کرے گی اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ملک ناصر اس پارٹی کے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"آپ گھومنے پھرنے کے مُوڈ میں نہیں؟" — جمال بیگ نے پوچھا — "چلئے، اُوپر کو نکل چلتے ہیں۔ مجھے بھی وہ جگہ یا وہ علاقہ دکھا دیں جہاں آپ کہتے ہیں کہ ریڈار ہے۔"

●

شمیم کی کار موجود تھی۔ ملک رجب علی اپنا ریوالور ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ اُس شام بھی اُس نے قمیض کے نیچے بیلٹ باندھ کر اس میں ریوالور ڈال لیا۔ اُس نے شمیم سے کار کی چابی لی اور سلمیٰ کو بتایا کہ ذرا باہر جا رہا ہے۔

وہ کار کو پہاڑیوں کی طرف لے گیا۔ اُس کا ارادہ اس طرف سے مری روڈ پر جانے کا تھا۔ اسلام آباد سے کچھ دُور گئے تو رجب علی نے ایک کار دیکھی جو پہاڑیوں کے اندر جا رہی تھی۔ نیلے رنگ کی وہ کار ملک ناصر کی لگتی تھی۔ اُس نے کار اُس رُخ پر کر لی۔ نیلی کار پہاڑیوں کے اندر جا چکی تھی۔ ملک رجب علی کو شک سا ہوا۔ اُسے شازی کے الفاظ یاد آنے لگے — "گاڑی ملک ناصر کی استعمال ہو گی۔"

رجب علی نے اپنی کار روک لی اور جمال بیگ سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ آئے۔ دونوں پیدل چل پڑے۔ ملک رجب علی نے جمال بیگ کو بتایا کہ یہ کار جو پہاڑیوں میں غائب ہو گئی ہے ملک ناصر کی ہے۔ ان پہاڑیوں میں اس کار کا کیا کام؟

ملک رجب علی اور جمال بیگ تیز چلتے پہاڑیوں میں چلے گئے۔ انہیں کار کی آواز سُنائی دے رہی تھی لیکن کار نظر نہیں آتی تھی۔ وہ جگہ کار کے چلنے کے قابل نہیں تھی۔ پتھریلی جگہ تھی اور درخت بھی خاصے تھے۔ ملک رجب علی سامنے والی ٹیکری پر چڑھ گیا۔ ہریالی بہت تھی۔ گھاس اور جھاڑیاں اونچی تھیں۔ چھوٹے بڑے درخت بھی تھے۔ ملک رجب علی ٹیکری پر جا کر بیٹھ گیا۔ جمال بیگ کو بھی اُس نے بٹھا لیا۔ آگے اس ٹیکری سے بلند ٹیکریاں تھیں اور ان سے آگے پہاڑی تھی۔

ملک رجب علی کی نظروں نے سارا علاقہ دیکھ لیا۔ کار نظر نہ آئی۔ اس کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ رجب علی اس ٹیکری سے اُتر گیا اور سامنے والی ٹیکری پر چڑھ گیا۔ وہ اب ہانپ رہا تھا۔ جمال بیگ بوڑھا تھا لیکن وہ جوانوں کی طرح ٹیکریوں سے اُترتا اور چڑھتا تھا اور پتھروں پر اُس کے قدم پھسلتے ڈگمگاتے نہیں تھے۔

اس ٹیکری پر بھی رجب علی بیٹھ گیا اور ہر سُو دیکھا۔ کار کی آواز بند ہو گئی تھی۔ دُور اُسے درختوں کی اوٹ میں کار نظر آ گئی۔ اس میں سے پانچ آدمی نکلے۔ ایک آدمی پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں

کو کچھ بتا رہا تھا۔ دو تین منٹ بعد اس آدمی کے ساتھ سب نے ہاتھ ملائے۔ وہ وہیں کھڑا رہا، چار پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ پانچواں آدمی کار میں بیٹھنے کے لیے مُڑا۔

"وہ رہا ملک ناصر!" — رجب علی نے کہا۔

"وہی ہے" — جمال بیگ نے کہا۔

ملک ناصر کار میں بیٹھا اور کار چل پڑی۔ یہ جگہ پہاڑیوں، ٹیکریوں، درختوں اور جھاڑی نما پیڑوں میں ڈھکی چھپی تھی۔ اس جگہ کوئی سَیر کے لیے بھی نہیں آتا ہو گا۔ رجب علی کے لیے اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"یہ وہی پارٹی ہے" — جمال بیگ نے کہا — "واپس چل کر پولیس کو اطلاع دیتے ہیں۔"

"اتنے میں یہ اپنا کام کر جائیں گے" — رجب علی نے کہا — "انہیں صرف ہم دونوں روک سکتے ہیں۔"

"میں آپ کا ساتھ دوں گا" — جمال بیگ نے کہا — "لیکن خالی ہاتھ ہوں۔"

"میرے پاس ریوالور ہے" — رجب علی نے کہا — "اگر میں خالی ہاتھ ہوتا تو بھی ان لوگوں کے پیچھے چلا جاتا..... بیگ صاحب! یہ ہمارا فرض ہے۔"

"ہم فرض ادا کریں گے ملک صاحب!" — جمال بیگ نے کہا — "چلئے، میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

نیلی کار ان کے نیچے سے گزری۔ رجب علی نے ملک ناصر کو اچھی طرح پہچان لیا۔

●

رجب علی اور جمال بیگ جب اس ٹیکری سے اُترے تو دونوں نے پہلی بار روحانی سکون محسوس کیا جیسے ضمیر سے کسی نے بوجھ اُتار پھینکا ہو۔ دونوں پر خاموشی طاری ہو گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو نہ کوئی مشورہ دیا نہ ہدایت۔ دونوں نے موت کو قبول کر لیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ رجب علی سمجھ گیا کہ یہ پارٹی رات کے اندھیرے میں ریڈار والی پہاڑی ٹک پہنچے گی۔ وہ دونوں اس پارٹی سے پہلے پہاڑی تک پہنچنے کی کوشش میں تھے۔ وہ ایسے علاقے ں چلے گئے جہاں پہاڑیاں، درخت اور گھاس تھی۔ انہیں دو آدمی نظر آئے۔ دو ادھر اُدھر ہو گئے تھے۔ وہ ہاڑیوں کے اندر اندر جا رہے تھے۔ کچھ فاصلہ رکھ کر رجب علی اور جمال بیگ چلتے گئے۔

جب سورج غروب ہُوا تو وہ پہاڑیوں اور ٹیکریوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گئے۔ انہیں دوسرے آدمیوں کی بھی جھلک نظر آئی اور غائب ہو گئی۔ خاصا آگے گئے تو رجب علی کو وہ چوٹی نظر آنے لگی جس اس نے چار پانچ روز پہلے جھلک دیکھی تھی۔ اُس چوٹی تک پہنچنے کے لیے کم و بیش دو گھنٹے کار تھے۔

رجب علی اور جمال بیگ ایک ڈھلان پر جا رہے تھے۔ ہلکا سا زنّاٹہ سنائی دیا اور کوئی چیز پیٹھ کی طرف ب علی کے کندھے میں اُتر گئی۔ رجب علی رُک گیا۔

"خنجر ہے ملک صاحب!" — جمال بیگ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا اور اُس کے کندھے

سے خنجر نکال لیا۔
دونو بیٹھ کر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئے۔ رجب علی نے ریوالور نکال لیا۔ جمال بیگ نے اُسے کہا کہ اُس کے کندھے سے بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے۔
"بہہ جانے دو"۔۔۔ رجب علی نے بے پرواہی سے کہا ۔۔"اب یہ نہ دیکھو ہم زخمی ہیں یا مُردہ۔ آپ کو خنجر مل گیا ہے۔ اُن کے پاس ریوالور یا سٹین گنیں ضرور ہوں گی لیکن وہ اس ڈر سے گولی نہیں چلائیں گے کہ کوئی آ جائے گا اور وہ پکڑے جائیں گے۔"
سامنے والی ٹیکری کی ڈھلان پر دوسرے دو آدمی چھُپ چھُپ کر جا رہے تھے۔ رجب علی نے ریوالور سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ ایک آدمی رُکا۔ ایک طرف کو جھکا اور گر پڑا۔ رجب علی دوسرے آدمی پر گولی چلانے لگا تھا کہ اپنے پیچھے اُسے پتھر لُڑھکنے کا شور سُنائی دیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ پیچھے دیکھتا، دو بازوؤں نے اُسے جکڑ لیا۔ وہ اُٹھا اور اُس نے جھٹکے سے آگے کو جھک کر پھر بیٹھ کر اُوپر کو جھٹکا دیا۔ اُس کے گھُٹنے پیچھے لگ گئے لیکن جس آدمی نے اُسے پکڑ لیا تھا وہ اُس کے سَر کے اُوپر سے قلابازی لگا کر آگے جا پڑا۔ وہ ڈھلان تھی۔ وہ آدمی لُڑھکتا نیچے گیا۔
رجب علی نے اُس پر ریوالور فائر کیا۔ وہ آدمی نیچے جا کر آہستہ آہستہ اُٹھا۔ رجب علی نے ایک اور گولی فائر کی۔ وہ آدمی گرا پھر اُٹھ نہ سکا۔ سامنے سے سٹین گن فائر ہوئی۔ رجب علی کو یوں لگا جیسے اُس کی ٹانگ کٹ کر جسم سے الگ ہو گئی ہو۔ سٹین گن کی نہ جانے کتنی گولیاں اُس کی ران سے گزر گئی تھیں۔ رجب علی گر پڑا۔ اُس ٹانگ پر وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ اُسے چکر آنے لگے۔

اِدھر ایک آدمی جمال بیگ کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے وار بچا رہے تھے۔ وہ جگہ لڑنے کے قابل نہیں تھی۔ ڈھلان تھی۔ رجب علی نے اس تخریب کار پر دو گولیاں چلائیں لیکن اتنی قریب ہونے کے باوجود گولیاں ضائع گئیں کیونکہ وہ شخص پینترے سے بدل رہا تھا۔ وہ جوان آدمی تھا اور جمال بیگ بوڑھا لیکن وہ اُس جوان سے زیادہ پھرتیلا تھا۔
جمال بیگ کا پاؤں ایک پتھر پر آیا اور وہ سنبھل نہ سکا۔ وہ گر رہا تھا کہ تخریب کار کا خنجر جمال بیگ کے پہلو میں اُتر گیا۔ رجب علی نے سنبھل کر ریوالور سیدھا کیا اور گولی چلائی۔ وہ آدمی پیچھے ہٹ کر گرا لیکن گرتے گرتے اُس نے خنجر جمال بیگ پر اتنی زور سے پھینکا کہ جمال بیگ کے سینے میں اُتر گیا۔
رجب علی نے ریوالور میں مزید گولیاں ڈالیں اور اس توقع پر سب کی سب ہوا میں فائر کر دیں کہ ریڈار اور آبزورڈنگ کی پوسٹ تک آواز پہنچ جائے گی اور وہاں سے کوئی آ جائے گا۔
وادیاں تاریک ہونے لگی تھیں لیکن ابھی نظر کام کرتی تھی۔ رجب علی کا خون بہت زیادہ بہہ رہا تھا اور اُس کی آنکھوں کے سامنے سے دھندلے بادل گزرنے لگے تھے۔ وہ اِردگرد کی آوازوں سے بے خبر ہوتا جا رہا تھا۔ جمال بیگ کو اُس نے پُکارا لیکن اُسے جواب نہ ملا۔
کیا جمال بیگ شہید ہو گیا ہے؟
رجب علی کو شہادت نظر آنے لگی۔۔۔ اُس نے اطمینان اور سکون کی آہ لی۔

عنایت اللہ
خاکی وردی لال لہو
شہرۂ آفاق ناول ''طاہرہ'' کا دوسرا حصّہ
2
مکتبہ داستان

خاکی وردی لال لہو

جلد دوم

شہرۂ آفاق ناول ''طاہرہ'' کا دوسرا حصہ

عنایت اللہ

واحد تقسیم کار

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور۔

فون: 7352332، 7232336 فیکس: 7223584

www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

"خاکی وردی لال لہو" کی دوسری جلد پیش کی جا رہی ہے جس میں یہ طویل داستان مکمل ہو گئی ہے۔

اس داستان کا تعارف اس کی پہلی جلد میں پیش کر دیا گیا ہے۔ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سوائے اس کے کہ اس کہانی کو ناول اور افسانہ ہی نہ سمجھ لیجئے گا۔ یہ پاکستان بنانے والوں کی، پاکستان پر حکومت کرنے والوں کی، پاکستان کو بچانے والوں کی اور پاکستان کے وقار کو بنگال کی ندیوں میں ڈبو دینے والوں کی کہانی ہے یہ جنگوں کی روئیداد ہے۔ ایک وہ جنگیں تھیں جو خاکی وردی والوں نے لڑیں اور وردی لہو سے لال کر لی اور دوسرے وہ معرکے ہیں جو پاکستان کے اقتدار پرست حکمرانوں نے کرسی کے لیے لڑے اور تاریخ اسلام کو سقوطِ غرناطہ سے سقوطِ ڈھاکہ تک پہنچایا۔

"خاکی وردی لال لہو" میں آپ کو وہ اسباب و علل ملیں گے جنہوں نے پاکستان کو آدھا کیا تھا اور اس سوال کا جواب بھی ملے گا کہ مشرقی پاکستان میں ہماری شکست سیاسی تھی یا فوجی!

ایک تاریخ ہے جو "طاہرہ" اور "خاکی وردی لال لہو" کی دونوں جلدوں میں بیان کر دی گئی ہے۔

ناول کو خشک اور بے مزہ نہیں ہونے دیا گیا۔ بعض مناظر اور کردار آپ کے جذبوں کو بھڑکا دیں گے اور آپ کے جذبات کو ایسے شدید جھٹکے دیں گے کہ آپ اپنے آنسوؤں کو روک نہیں سکیں گے۔

اس ناول میں ایک پیغام ہے جو آنے والی نسلوں تک پہنچانا آپ کا فرض ہے۔

عنایت اللہ
مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

اسلام آباد تک اِن گولیوں کے دھماکوں کی آوازیں نہ پہنچ سکیں لیکن بند وادی میں یہ دھماکے ریڈار اور اس کی حفاظتی پوسٹوں تک یوں پہنچے جیسے توپیں فائر ہوتی ہوں۔ ان پوسٹوں کو پہلے سے خبردار کر دیا گیا تھا کہ ہر وقت چوکنّے اور چوکس رہیں کیونکہ سبوتاژ کا خطرہ ہر وقت موجود ہے۔ پوسٹوں والے دوربینوں سے آسمان کو کھوجتے رہتے تھے۔ وہ زیادہ تر ہوائی حملے کا خطرہ محسوس کرتے تھے۔ گولیوں کے ان دھماکوں نے اُنہیں چونکا دیا لیکن رات کے وقت وہ پوسٹوں سے باہر جا کر نہیں دیکھ سکتے تھے کہ گولیاں کہاں فائر ہوتی ہیں۔ آبزرور ونگ کی پوسٹ رائفلوں اور مشین گنوں سے بالکل تیار ہو گئی اور اس کے انچارج نے روشنی راؤنڈ فائر کرنے والا پستول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سب کے کان رات کی آہٹیں سننے میں لگ گئے لیکن فائرنگ کے بعد ایسا سکوت طاری ہو گیا جیسے یہاں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد اُنہیں کسی گاڑی کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز ان کے لیے عجیب نہیں تھی۔ کبھی کبھی اُن کا اپنا ٹرک یا کوئی جیپ سامان وغیرہ لے کر آیا کرتی تھی لیکن آج رات اُنہوں نے کان اس گاڑی کی آواز پر لگا دیئے۔ وہ دیکھ تو نہیں سکتے تھے صرف کانوں سے اندازہ کر رہے تھے کہ ٹرک کدھر جا رہا ہے۔ چند منٹ بعد یہ آواز بھی خاموش ہو گئی۔

یہ ٹرک اُنہی کا تھا۔ اس میں پوسٹ کے لیے کوئی سامان اور آبزرور ونگ کے پانچ سات آدمی پوسٹ پر ہی جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایئر فورس کا ایک فلائٹ لیفٹیننٹ تھا۔ پوسٹ کی طرف جو بھی گاڑی جاتی تھی وہ رات کو جاتی تھی تاکہ پوسٹ کی نشاندہی نہ ہو سکے۔ گاڑی کہیں نیچے رک جاتی اور آدمی اُوپر چلے جاتے تھے۔

ٹرک پتھروں پر اُچھلتا جا رہا تھا۔ دو پہاڑیوں کے درمیان ٹرک نے موڑ کاٹا تو اس کی روشنی میں ایک آدمی دوڑتا نظر آیا۔ گولیوں کی آواز ٹرک والوں نے بھی سُنی تھی۔ ڈرائیور نے فلائٹ لیفٹیننٹ کے حکم سے ٹرک کی رفتار تیز کر دی تھی۔ آبزرور ونگ کے اس فلائٹ لیفٹیننٹ نے ریوالور نکال لیا تھا۔ اس فائرنگ نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔ اُسے ریڈار اور آبزرور ونگ کی حفاظتی پوسٹیں خطرے میں نظر آ رہی تھیں۔

وہ آدمی جو ٹرک کی روشنی میں بھاگتا نظر آ رہا تھا، وہ بمشکل پچیس تیس قدم دُور تھا۔ فلائٹ لیفٹیننٹ ٹرک سے کُود گیا اور بھاگتے ہوئے آدمی کی طرف اس طرح ریوالور فائر کیا کہ گولی اُسے نہ لگے۔ ساتھ ہی للکارا کہ رک جاؤ۔

اُس آدمی نے رک کر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کوئی چیز پرے پھینک دی۔ ٹرک رک گیا تھا۔ ٹرک میں سے آبزرور ونگ کے تمام آدمی جو سٹین گنوں سے مسلح تھے کُود آئے اور اپنے فلائٹ لیفٹیننٹ کے پیچھے گئے۔ سب دوڑتے ہوئے اس آدمی تک پہنچے۔ وہ تیس تنیس سال کی عمر کا ایک آدمی تھا۔ فلائٹ لیفٹیننٹ نے اس سے پوچھا کہ اس نے اُدھر کیا پھینکا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ خود ہی دیکھ لو۔

اسلام آباد تک اِن گولیوں کے دھماکوں کی آوازیں نہ پہنچ سکیں لیکن بند وادی میں یہ دھماکے ریڈار اور اس کی حفاظتی پوسٹوں تک یوں پہنچے جیسے توپیں فائر ہُوتی ہوں۔ ان پوسٹوں کو پہلے سے خبردار کر دیا گیا تھا کہ ہر وقت چوکنّے اور چوکس رہیں کیونکہ سبوتاژ کا خطرہ ہر وقت موجُود ہے۔ پوسٹوں والے دُوربینوں سے آسمان کو کھوجتے رہتے تھے۔ وہ زیادہ تر ہوائی حملے کا خطرہ محسوس کرتے تھے۔ گولیوں کے ان دھماکوں نے اُنہیں چونکا دیا لیکن رات کے وقت وہ پوسٹوں سے باہر جا کر نہیں دیکھ سکتے تھے کہ گولیاں کہاں فائر ہُوئی ہیں۔ آبزرور وِنگ کی پوسٹ رائفلوں اور مشین گنوں سے بالکل تیار ہو گئی اور اس کے انچارج نے روشنی راؤنڈ فائر کرنے والا پستول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سب کے کان رات کی آہٹیں سننے میں لگ گئے لیکن فائرنگ کے بعد ایسا سکُوت طاری ہو گیا جیسے یہاں کچھ بھی نہیں ہُوا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد اُنہیں کسی گاڑی کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز ان کے لیے عجیب نہیں تھی۔ کبھی کبھی اُن کا اپنا ٹرک یا کوئی جیپ سامان وغیرہ لے کر آیا کرتی تھی لیکن آج رات اُنہوں نے کان اِس گاڑی کی آواز پر لگا دیئے۔ وہ دیکھ تو نہیں سکتے تھے صرف کانوں سے اندازہ کر رہے تھے کہ ٹرک کدھر جا رہا ہے۔ چند منٹ بعد یہ آواز بھی خاموش ہو گئی۔

یہ ٹرک اُنہی کا تھا۔ اس میں پوسٹ کے لیے کوئی سامان اور آبزرور وِنگ کے پانچ سات آدمی پوسٹ پر ہی جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایئر فورس کا ایک فلائٹ لیفٹیننٹ تھا۔ پوسٹ کی طرف جو بھی گاڑی جاتی تھی وہ رات کو جاتی تھی تاکہ پوسٹ کی نشاندہی نہ ہو سکے۔ گاڑی کہیں نیچے رک جاتی اور آدمی اُوپر چلے جاتے تھے۔

ٹرک پتھروں پر اُچھلتا جا رہا تھا۔ دو پہاڑیوں کے درمیان ٹرک نے موڑ کاٹا تو اس کی روشنی میں ایک آدمی دوڑتا نظر آیا۔ گولیوں کی آواز ٹرک والوں نے بھی سُنی تھی۔ ڈرائیور نے فلائٹ لیفٹیننٹ کے حکم سے ٹرک کی رفتار تیز کر دی تھی۔ آبزرور وِنگ کے اس فلائٹ لیفٹیننٹ نے ریوالور نکال لیا تھا۔ اس فائرنگ نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔ اُسے ریڈار اور آبزرور وِنگ کی حفاظتی پوسٹیں خطرے میں نظر آ رہی تھیں۔

وہ آدمی جو ٹرک کی روشنی میں بھاگتا نظر آ رہا تھا، وہ بمشکل پچیس تیس قدم دُور تھا۔ فلائٹ لیفٹیننٹ ٹرک سے کُود گیا اور بھاگتے ہُوئے آدمی کی طرف اِس طرح ریوالور فائر کیا کہ گولی اُسے نہ لگے۔ ساتھ ہی للکارا کہ رُک جاؤ۔

اُس آدمی نے رُک کر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہُوئی کوئی چیز پرے پھینک دی۔ ٹرک رُک گیا تھا۔ ٹرک میں سے آبزرور وِنگ کے تمام آدمی جو سٹین گنوں سے مسلّح تھے کُود آئے اور اپنے فلائٹ لیفٹیننٹ کے پیچھے گئے۔ سب دوڑتے ہوئے اس آدمی تک پہنچے۔ وہ تیس بتیس سال کی عمر کا ایک آدمی تھا۔ فلائٹ لیفٹیننٹ نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے اُدھر کیا پھینکا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ خود ہی دیکھ لو۔

فلائیٹ لیفٹیننٹ نے وہاں جا کے دیکھا۔ ایک فلائٹ سارجنٹ جس کے پاس ٹارچ تھی دوڑا گیا اور ٹارچ روشن کی، وہاں ایک سٹین گن پڑی ہوئی تھی جس میں میگزین لگی ہوئی تھی میگزین الگ کی تو اُس کے وزن سے پتہ چلا کہ اس میں سے آدھے سے زیادہ راؤنڈ فائر ہو چکے ہیں۔ اس آدمی کی جامہ تلاشی لی گئی۔ اُس نے قمیض کے اندر چھ بھری ہوئی میگزینیں باندھ رکھی تھیں۔

"تم کون ہو؟" ـــ فلائیٹ لیفٹیننٹ نے اُس سے پوچھا ـــ "اور یہ فائرنگ کس نے کی تھی؟"

وہ بُت بنا کھڑا رہا۔

"صاحب نے کیا پوچھا ہے؟" ـــ فلائیٹ سارجنٹ نے اُسے بارعب آواز میں کہا ـــ "فوراً جواب دو۔"

اُس کے ہونٹ سِلے رہے لیکن اُس کے چہرے پر گھبراہٹ یا ڈر کا ہلکا سا بھی تاثر نہ تھا۔

"بولو گے نہیں؟" ـــ فلائیٹ لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

"نہیں" ـــ اُس نے جواب دیا اور اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"سر!" ـــ فلائیٹ سارجنٹ نے کہا ـــ "آپ پیچھے ہٹ جائیں میں اِسے اِسی کی سٹین گن سے ختم کر دیتا ہوں۔"

"نہیں!" ـــ فلائیٹ لیفٹیننٹ نے کہا ـــ "میں اسے اتنی جلدی اس دنیا سے آزاد نہیں ہونے دوں گا۔ میں اس کا وہ حال کروں گا کہ مرے گا بھی نہیں اور جیئے گا بھی نہیں.... ٹرک سے رسّی نکالو۔ اس کے پاؤں سے رسّی باندھ کر ٹرک کے پیچھے باندھ دو اور ٹرک چلا دو۔"

فلائیٹ سارجنٹ اور دو اور آدمیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ ایک آدمی ٹرک سے رسّی لانے کو دوڑ پڑا۔

"رک جاؤ ذرا" ـــ اُس نے کہا اور پوچھا ـــ "وعدہ معاف گواہ بناتے ہو؟ سب بتا دوں گا۔"

"ہاں!" ـــ فلائیٹ لیفٹیننٹ نے کہا ـــ "یہ بات کہو ہم نے تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا لیا۔ سچ بولو اور چُھٹی کرو۔ یہ اتنی فائرنگ کس نے کی ہے؟"

"ہم نے!" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "یہ ہماری پارٹی تھی۔"

"کیسی پارٹی؟.... کس کی پارٹی؟" ـــ فلائیٹ لیفٹیننٹ نے پوچھا ـــ "یہ کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہو سکتی۔"

"یہ انڈیا کی پارٹی ہے" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "ہم ریڈار کو تباہ کرنے جا رہے تھے۔"

"کیا تم ہندو ہو؟"

"نہیں میں مسلمان ہوں" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "میرا نام قیصر ہے۔"

"ہاں۔ اب بتاؤ۔"

"ہم چار آدمی ریڈار کو گرینیڈوں سے تباہ کرنے آتے تھے" ـــ قیصر نے کہا ـــ "ہمارے پاس سٹین گنوں کے علاوہ گرینیڈ بھی تھے لیکن ہم پر کسی نے ریوالور سے فائرنگ کی۔ وہ دو آدمی تھے معلوم نہیں کون تھے۔ ہم نے اُن پر فائرنگ کی۔ میرا خیال ہے کہ تین میرے ساتھی اور وہ دونوں، سب مر گئے ہیں۔ میں اکیلا بچا ہوں۔"

"اُن کی لاشیں کہاں ہیں؟" ـــ فلائیٹ لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

○

پہلے وہ فلائیٹ لیفٹیننٹ اور اُس کی پارٹی کو ایک ٹیکری پر لے گیا جہاں اُس کے ساتھی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ لاش کے قریب ایک سٹین گن تھی۔ لاش کی جامہ تلاشی لی گئی تو اُس کی پتلون کی دونوں جیبوں سے ایک ایک گرینیڈ برآمد ہوا۔ اس لاش کو نیچے اٹھا لاتے۔ ساتھ والی ٹیکری کے دامن میں اُس کے ایک اور ساتھی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے پاس بھی سٹین گن اور دو گرینیڈ تھے۔ قیصر فلائیٹ لیفٹیننٹ کو اس ٹیکری کے اُوپر لے گیا، وہاں تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

"یہ لاش میرے ساتھی کی ہے" ـــ قیصر نے بتایا ـــ "ان دونوں کو میں نہیں جانتا۔ انہوں نے ہی ہم پر فائرنگ کی تھی۔"

فلائیٹ سارجنٹ نے تینوں کی نبضیں محسوس کیں۔ ان میں دو زندہ تھے ـــ یہ تھے رجب علی اور طاہرہ کا باپ جمال بیگ ـــ رجب علی کا ریوالور ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ ان تینوں کو اٹھا کر نیچے لائے۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو کہ یہ دو تمہارے ساتھی نہیں تھے؟" ـــ فلائیٹ لیفٹیننٹ نے قیصر سے پوچھا۔

"میں جب یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ تین میرے ساتھی تھے تو ان دونوں کے متعلق مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں" ـــ قیصر نے کہا ـــ "یہ دو کوئی سچے پاکستانی ہیں۔ یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے کہ یہ کون ہیں۔"

ان سب کو ٹرک میں ڈال کر اور قیصر کو ٹرک میں بٹھا کر فلائیٹ لیفٹیننٹ نے حکم دیا کہ ٹرک واپس لے چلو۔ اُس نے اپنے آپریٹر سے وائرلیس سیٹ لیا اور اپنی پوسٹ کے ساتھ رابطہ قائم کر کے بتایا کہ میں آیا تھا اور واپس جا رہا ہوں۔ نیچے ایک حادثہ ہو گیا ہے تم لوگ چوکنے رہنا خطرہ ٹل گیا ہے۔ پھر بھی....

ٹرک اسلام آباد کی پہاڑیوں سے نکل کر اسلام آباد کی چوڑی سڑکوں پر انتہائی رفتار پر جا رہا تھا۔

یہ اُن معرکوں میں سے ایک تھا جن کا ذکر تاریخوں میں نہیں آیا کرتا۔ ایسے معرکے میدانِ جنگ سے دور وہ لوگ لڑا کرتے ہیں جن کا کوئی نام اور کوئی مقام نہیں ہوتا لیکن آدھی جنگ جیتنے والے یہی لوگ ہوتے ہیں۔ کشمیر کے کمانڈو آپریشن میں جانیں قربان کرنے والوں کو تاریخ کبھی نہیں پہچانے گی۔ تاریخ مقبوضہ کشمیر کے اُن گڈریوں اور مفلس اور غلامی کے مارے ہوئے نادار اور مسکین کشمیریوں کو بھی نہیں پہچانے گی جو پاکستان اور آزاد کشمیر کے چھاپہ مار جوانوں کو اپنی رہنمائی میں ہدف تک لے جاتے رہے اور انہیں پناہ دیتے رہے۔ اِس کی پاداش میں بھارتیوں نے اُن کے گھر جلا ڈالے، اُن کی مستورات کی بے حرمتی کی اور ان کے زندہ بچوں کو آگ میں پھینک دیا۔ تاریخ صرف اُن جرنیلوں کو پہچانتی ہے جو سکیمیں بناتے ہیں اور نام اُن حکمرانوں کا روشن ہوتا ہے جو اِن سکیموں کی منظوری دیتے ہیں۔

رجب علی اور جمال بیگ انہی گمنام سرفروشوں میں سے تھے۔

○

سی۔ ایم۔ ایچ میں داخل ہوتے ہی وہاں کے عملے میں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ پانچوں لاشوں کو اتارا گیا۔ ڈاکٹروں نے تین کے متعلق فیصلہ دیا کہ یہ مر چکے ہیں۔ رجب علی اور جمال بیگ کی نبضیں

ابھی تک چل رہی تھیں۔

"یہ دونوں ابھی زندہ ہیں"—— میجر ڈاکٹر نے کہا—"شاید کچھ دیر اور زندہ رہیں گے۔"

"انہیں زیادہ دیر زندہ رکھنا ہے"—— فلائیٹ لیفٹیننٹ نے کہا—"یہ انڈیا کے آدمی ہیں۔ ہمارے ایک بڑے ہی اہم تارگیٹ کو تباہ کرنے گئے تھے۔ ایک کو ہم نے زندہ پکڑ لیا ہے۔ ان کے پورے گروہ کو پکڑنے کے لیے ان دو کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔"

دونوں کو ایک ہی بار آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ فلائیٹ لیفٹیننٹ نے ملٹری پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس کو ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع دے دی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دونوں محکمے اسی اطلاع کے انتظار میں تیار بیٹھے تھے۔ ذراسی دیر میں دو فوجی گاڑیاں سی۔ ایم۔ ایچ میں پہنچ گئیں۔ قیصر کو ان افسروں کے حوالے کر دیا گیا جو ملٹری پولیس اور انٹیلی جنس کی ان پارٹیوں کے ساتھ آئے تھے۔ فلائیٹ لیفٹیننٹ نے مختصراً بتایا کہ اُس نے اس آدمی کو کہاں سے اور کس طرح پکڑا ہے

"دیکھو قیصر بھائی!—— ملٹری انٹیلی جنس کے ایک میجر نے اُسے کہا—"جو اقبالی بیان تم بعد میں دو گے وہ فوراً دے دو۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ اور فوراً بتاؤ کہ ہم فوری طور پر کہاں چھاپہ ماریں جہاں تمہارے گروہ کا انچارج ہمیں مل جائے۔"

فلائیٹ لیفٹیننٹ نے اس میجر سے کہا—"میں نے اسے وعدہ معاف گواہ بنالیا ہے۔"

"ہاں ہاں!—— ملٹری انٹیلی جنس کے میجر نے کہا—"یہ تو ہمارا قانون اور ہمارا اخلاق ہے کہ جو سب سے پہلے اقبالِ جرم کرتا ہے اور نشاندہیاں کرتا ہے وہ ہمارا وعدہ معاف گواہ ہوتا ہے۔ قیصر بھائی کو ہم بڑی عزت سے رکھیں گے۔"

قیصر بھائی ان افسروں کے جھانسے میں آگیا۔ اُس نے سب سے پہلے ملک ناصر کے گھر کا پتہ دیا۔ میجر نے اور کوئی بات سنے بغیر قیصر کو اپنی جیپ میں بٹھایا اور ملٹری پولیس کے آفیسر سے کہا کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ اُس نے فلائیٹ لیفٹیننٹ سے کہا کہ اُسے اگر کسی زیادہ اہم ڈیوٹی پر نہ جانا ہو تو وہ سی۔ ایم۔ ایچ میں موجود رہے اور اپنی یونٹ کو اطلاع دے دے کہ وہ کہاں ہے اور یہاں کیوں ہے؟

○

ملک ناصر کا چین اور سکون ختم ہو چکا تھا۔ وہ اِن چار تخریب کاروں کو اپنی کار میں اسلام آباد کی پہاڑیوں میں اُتار آیا تھا۔ اُسے پوری توقع تھی کہ یہ چاروں ریڈار کو تباہ کر آئیں گے۔ اُس نے حالات اور خطروں کا جائزہ لے لیا تھا۔ حالات ان کے حق میں تھے۔ بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اُس کے اندازے کے مطابق ان آدمیوں کو اڑھائی گھنٹوں میں واپس اُس کی کوٹھی میں پہنچ جانا تھا۔ انہیں اپنے اپنے طور پر پیدل واپس آنا تھا لیکن وقت خاصا زیادہ گزر گیا تھا۔ اب جُوں جُوں وقت گزرتا جا رہا تھا ملک ناصر کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

اُس کی بے چینی کا یہ عالم تھا کہ اپنے کمرے میں بیٹھتا، ایک دو منٹ بعد اٹھتا باہر جاتا اور کوٹھی کے بڑے گیٹ تک جا کر واپس آجاتا۔ کھانے پر بھی وہ ایسی ہی بے چینی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اُس کی بیوی نے اُس سے پوچھا بھی کہ وہ آج کچھ پریشان نظر آتا ہے۔ اُس نے ہنس کر جواب دیا تھا کہ اُسے کیا پریشانی ہو سکتی ہے!

یہ شمیم نے محسوس کیا تھا کہ وہ غیر معمولی طور پر پریشان ہے۔ کھانے کے بعد شمیم نے چوری چھپے اُس پر نظر رکھی۔ اُس نے دیکھا کہ ملک ناصر ایک جگہ ٹِک کر بیٹھتا ہی نہیں تھا۔

سلمیٰ بھی لاہور سے آئی ہوئی تھی۔ وہ رجب علی کے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ رجب علی شمیم کی گاڑی لے گیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ تھوڑی دیر بعد واپس آجائے گا۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ جمال بیگ بھی اُس کے ساتھ گیا تھا۔ شمیم اُسے کئی بار کہہ چکی تھی کہ وہ بچے نہیں، آ ہی جائیں گے لیکن سلمیٰ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ آدھی رات ہونے کو آئی تھی۔ سلمیٰ اپنے کمرے میں رجب علی اور جمال بیگ کے انتظار میں جاگ رہی تھی اور شمیم اپنے کمرے میں جاگ رہی تھی۔ اُسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ اپنے باپ پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اُس نے کھڑکی میں سے ایک بار پھر جھانکا۔ اُسے اپنا باپ برآمدے میں کھڑا نظر آیا۔ وہ کوٹھی کے باہر والے گیٹ تک چلا گیا۔ کچھ دیر وہاں رُکا پھر لان میں آکر ٹہلنے لگا۔ اُس کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ شمیم سے رہا نہ گیا۔ وہ باہر چلی گئی۔

"تم ابھی سوئی نہیں؟"—— ملک ناصر نے شمیم کو لان میں اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"یہی میں آپ سے پوچھنے آئی۔ ۔ ل کہ آپ ابھی تک کیوں نہیں سوتے؟"

ملک ناصر نے ایسے لہجے میں جواب دیا جیسے اُس کی زبان کانپ رہی ہو۔

"ابّو!—— شمیم نے کہا—"میں آپ سے ایک بات کہنے آئی ہوں.... اِس راستے سے آپ ہٹ کیوں نہیں آتے جس نے آپ کا سکون اور چین تباہ کر رکھا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟"—— ملک ناصر نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا—"تم نیند میں تو نہیں؟"

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں"—— شمیم نے کہا—"میں آپ کی بیٹی ہوں۔ خُدا کے بعد میں آپ کو سمجھتی ہوں۔ آپ نے مجھے جو پیار دیا ہے اور جس طرح مجھے شہزادی بنا کر رکھا ہے اور مجھ پر کوئی پابندی نہیں عائد کی، اس سے مجھے اپنا یہ فرض یاد آتا ہے کہ میں آپ کو اُس راستے سے روکوں جو بڑی گہری اور اندھیری کھائی میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ ذرا اپنی حالت دیکھئے کہ آپ کس اذیت میں مبتلا ہیں۔ آپ کسی ایسے آدمی کا یا کسی ایسی خبر کا انتظار کر رہے ہیں جسے شاید آنا ہی نہیں۔"

"شمیم بیٹی!—— ملک ناصر نے کہا—"تم پر اس وقت نیند کا غلبہ ہے۔ جاؤ سو جاؤ۔"

"ایک ریڈار تباہ ہو جانے سے پاکستان تباہ نہیں ہو جائے گا"—— شمیم نے کہا۔

ملک ناصر یوں بدکا جیسے شمیم نے اُس کے سینے میں خنجر اُتار دیا ہو۔ اُس کے ہونٹ کانپے لیکن زبان جیسے اکڑ گئی ہو۔ اُس نے سر کو جھٹک کر شمیم کی طرف دیکھا۔ لان کی دو جلتی ہوئی بتیوں میں ملک ناصر کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ کے علاوہ قہر اور عتاب تھا۔

"اس سے پہلے کہ پاکستان کی بیٹی اپنے جاسوس باپ کے ہاتھوں قتل ہو جائے، بیٹی یہ فرض سمجھتی ہے کہ باپ کو اُس آگ سے نکال لے جس میں اُس نے اپنے آپ کو کھڑا کر رکھا ہے"—— شمیم نے کہا—"آپ ایک درخت کا پتّا ہیں۔ آپ اس درخت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ درخت سے جو پتّا ٹوٹ کر گر پڑتا ہے وہ سُوکھ کر مٹی میں مل جاتا ہے.... آپ کا انجام درخت سے ٹوٹے ہوئے پتّے جیسا ہی ہوگا۔"

ملک ناصر کو اپنی بیٹی سے اتنا پیار تھا کہ اُسے اس نے کبھی کسی بات سے روکا ٹوکا نہیں تھا۔ شمیم کی کار الگ تھی۔ اُس کی ماں اور ملک ناصر نے اپنے آپ کو شمیم کی خواہشوں اور فرمائشوں کا پابند کر رکھا تھا۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ شمیم خطرناک حد تک شوخ اور شرارتی ہو گئی تھی۔ کالج میں وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے داخل ہوئی تھی کہ کالج کی فضا اور وہاں کا ماحول شرارتوں کے لیے موزوں تھا۔ خدا نے اُسے شکل و صورت اور جسمانی کشش ایسی دی تھی کہ اُسے جو بھی دیکھتا وہ دیکھتا ہی رہ جاتا۔ ان میں سے جو اپنے آپ کو شمیم جیسا امیر اور حسین سمجھتے تھے، انہیں وہ اپنے پیچھے لگا لیتی اور انہیں سارے کالج کے لیے تماشہ بنا دیتی تھی۔ ایسے لڑکوں کے لیے اُس سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ پروفیسر اور لیکچرار بھی اُسے دیکھ کر ایک طرف ہٹ جاتے تھے۔

شرارتوں کی حد تک وہ کالج میں مشہور بھی تھی بدنام بھی لیکن کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ شمیم کے ساتھ اُس کے درپردہ مراسم ہیں یا شمیم اُسے چاہتی ہے۔ صرف اصغر تھا جس کی محبت میں وہ گرفتار ہوئی تھی لیکن اصغر کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات شرارت ہی تھی۔ یہ شرارت ایسی زنجیر بن گئی کہ وہ اصغر کی ہی ہو کے رہ گئی۔ اگر وہ چال چلن کی ایسی ویسی ہوتی اور اُسے اپنی عصمت کا خیال نہ ہوتا تو اُس کے دل میں ایسی محبت کا جذبہ بوجود ہی نہ ہوتا جو محبت اُسے اصغر سے ہو گئی تھی۔ اس محبت کی جڑیں روح میں تھیں اور روح پاک تھی۔ روح کی اس پاکیزگی نے شمیم کے کردار کو ایسا اُبھارا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ بیباکی سے دو ٹوک باتیں کرنے پر اُتر آئی۔

"شمیم!" — ملک ناصر نے اب باپوں والے رعب سے کہا — "یہ میری غلطی ہے کہ تم اتنی منہ پھٹ ہو گئی ہو۔ تم یہ بھی بھول گئی ہو کہ میں تمہارا باپ ہوں"۔

"باپ بن کر دکھائیں ابو!" — شمیم نے کہا — "پاکستان کی ایک بیٹی کا باپ بن کر دکھائیں.... نہیں .... آپ کو یاد نہیں رہا کہ مسلمان بیٹی کا باپ کیسا ہوتا ہے۔ آپ کو میری عزّت اور عصمت کا ذرّہ برابر احساس نہیں رہا"۔

"میں تمہاری بکواس کب تک سنوں گا"۔ — ملک ناصر نے دانت پیس کر کہا — "یا مجھے یہ بتا دو کہ تمہاری کھوپڑی میں یہ بکواس کس نے ڈالی ہے"۔

"ابو!" — شمیم نے تحمل سے کہا — "مجھ سے آپ کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ آپ کسی کے انتظار کی اذیّت میں مبتلا ہیں۔ یہ سزا ہے جو آپ کو مل رہی ہے۔ آپ نہیں سوئیں گے تو مجھے بھی نیند نہیں آئے گی۔ میں جانتی ہوں آپ کیوں نہیں سو رہے اس لیے میرے دل کو اور زیادہ تکلیف ہو رہی ہے"۔

"تم یہاں سے چلی جاؤ شمیم!" — ملک ناصر نے کہا — "تم نے مجھے اور زیادہ پریشان کر دیا ہے"۔

"لیکن آپ میری پریشانی کو نہیں سمجھے" — شمیم نے کہا — "میں بات اور صاف کر دیتی ہوں.... اگر پاکستان پر ہندوؤں کا قبضہ ہو بھی گیا تو وہ آپ کو کسی صوبے کا گورنر نہیں بنائیں گے۔ وہ آپ کو غدار اور ناقابلِ اعتماد شخص سمجھیں گے۔ آج جس طرح یہاں آسیہ اپنی بیٹی شازی کو استعمال کر رہی ہے بالکل اسی طرح ہندو مجھے استعمال کریں گے۔ وہ کہیں گے، ہم نے تمہارے باپ کو دولت کی تھیلیاں دی ہیں، تم ہماری ملکیّت ہو"۔

ملک ناصر نے غصے کا اظہار زمین پر پاؤں مار کر کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ شمیم خراماں خراماں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سلمیٰ اُس کے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔

"شمیم! کیا کروں!" — سلمیٰ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا — "ملک صاحب نے یوں تو کبھی بھی نہیں کیا کہ تھوڑی سی دیر کے لیے جائیں اور آدھی رات تک نہ آئیں.... شمیم! میرا دل اس طرح بھی کبھی نہیں دھڑکا تھا جس طرح آج دھڑک رہا ہے۔ اللہ خیر کرے میں اتنا تو کبھی نہیں گھبرائی تھی"۔

شمیم نے اپنی مخصوص ہنسی ہنستے ہوئے اس کی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کی لیکن سلمیٰ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ شمیم اُسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

○

ملک ناصر اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ پہلے تو اُسے یہ پریشانی تھی کہ اُس نے ریڈار کو تباہ کرنے کے لیے جو چھاپہ مار بھیجے تھے وہ واپس نہیں آئے تھے۔ اب اس کی پریشانی میں شمیم نے اضافہ کر دیا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ شمیم کو کیسے پتہ چلا ہے کہ وہ ہندوستان کا ایجنٹ ہے۔

ایک گاڑی کی آواز آئی۔ سلمیٰ نے اچھل کر کہا — "وہ آ گئے"۔ وہ اور شمیم باہر کو دوڑیں۔ اُدھر سے ملک ناصر دوڑتا باہر آیا۔ سلمیٰ اور شمیم کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ یہ گاڑی شمیم کی کار نہیں بلکہ ایک فوجی جیپ اور ایک فوجی ٹرک ہے۔

سلمیٰ اور شمیم کو تو مایوسی ہوئی لیکن ملک ناصر نے دو فوجی گاڑیاں دیکھیں تو اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ جیپ میں قیصر بھی تھا۔ اُس نے ملک ناصر کو دیکھتے ہی میجر سے کہا — "یہ ہے ملک ناصر۔ یہ ہمیں اپنی نیلی کار میں وہاں تک چھوڑ آیا تھا"۔

انٹیلی جنس کا میجر جیپ کے رکنے سے پہلے ہی جیپ سے کُودا اور ملک ناصر کے قریب جا کر پوچھا — "آپ ہیں ملک ناصر؟"

"جی، فرمائیے" — ملک ناصر نے کہا — "میں ہی ملک ناصر ہوں"۔

میجر نے قیصر کو اپنے پاس بلا کر ملک ناصر سے کہا — "اسے آپ جانتے ہوں گے!"

ملک ناصر کی زبان ہکلانے لگی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ تسلیم کرلے کہ وہ قیصر کو جانتا ہے یا انکار کر دے۔

"ہم آپ کے گھر کی تلاشی لیں گے" — میجر نے کہا۔

"آپ وارنٹ ساتھ لائے ہیں؟" — ملک ناصر نے کہا — "آپ شاید میری سوشل پوزیشن سے واقف نہیں۔ تلاشی کے وارنٹ کے بغیر میں آپ کو تلاشی نہیں لینے دوں گا"۔

میجر نے پیچھے دیکھا اور بولا — "صوبیدار صاحب! پوری کوٹھی کی تلاشی لیں" — اُس نے سلمیٰ اور شمیم کی طرف دیکھ کر کہا — "لیڈیز! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ضروری نہیں کہ میں آپ کو حراست میں لے لوں گا لیکن آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا" — اُس نے ملک ناصر کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا — "انہیں اپنے ساتھ رکھو"۔

"ذرا ٹھہریئے" — ملک ناصر نے میجر سے کہا — "اِدھر آئیں۔ میری ایک بات سن لیں" — میجر اُس کے ساتھ پرے چلا گیا۔ ملک ناصر نے کہا — "تلاشی نہ لیں۔ بولیں کیا پیش کروں.... کیش دوں گا جتنا آپ مانگیں گے.... آپ کی اس پوری پارٹی کو الگ الگ دوں گا"۔

"کیا آپ مجھے پورے پاکستان کی قیمت دے سکتے ہیں؟" — میجر نے کہا — "کیا آپ جانتے

ہیں پورے پاکستان کی قیمت کیا ہے؟.... لیکن ملک صاحب! اس وقت آپ جو کچھ بھی مجھے پیش کریں گے اسے میں پاکستان کی قیمت سمجھوں گا مگر میں اپنے ملک کا سودا نہیں کرسکتا۔"

ملک ناصر بہت چالاک آدمی تھا۔ اُس نے زبان کے داؤ چلائے اور الفاظ کے پینترے بدلے۔

"مگر آپ تلاشی سے گھبراتے کیوں ہیں؟" ۔۔۔ میجر نے پوچھا ۔۔۔ "ہمیں اپنا شک رفع کرنے دیں۔ ہم کچھ لیے بغیر چلے جائیں گے.... ملک صاحب! میں فوج کا افسر ہوں۔ اس وقت پاکستان کو کوئی سیاسی لیڈر اور کوئی سویلین یا فوجی ڈکٹیٹر انڈیا سے نہیں بچا سکتا۔ اپنے ملک کو صرف فوج بچا سکتی ہے۔ آپ مسلمان ہیں.... برائے نام مسلمان.... آپ ہندوؤں کے دوست ہیں۔ یعنی آپ میرے ملک کے دشمن ہیں۔ اور اسے ہر فوجی ذاتی دشمنی کہتا ہے۔ انڈیا میرے ملک کے خلاف نہیں میرے خلاف لڑ رہا ہے۔ ہم اُس مسلمان کو تو بخش ہی نہیں سکتے جو اپنے ملک اور اپنی قوم سے غداری کر رہا ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایک فوجی اتنی اچھی باتیں کرسکتا ہے" ۔۔۔ ملک ناصر نے کہا ۔۔۔ "مجھے بات کرنے کا موقع دیں۔"

"نہ ملک صاحب!" ۔۔۔ میجر نے نرم سے لہجے میں کہا ۔۔۔ "میں اُن شہیدوں سے غداری نہیں کرسکتا جو مقبوضہ کشمیر میں کمانڈو آپریشن میں شہید ہوتے ہیں اور انہیں جو چھمب سیکٹر میں شہید ہوئے ہیں اور انہیں جو رن کچھ میں شہید ہوئے ہیں۔ میرے عہدے کے فوجی افسر محاذ پر لڑ کٹ رہے ہیں اور میں اسلام آباد کی ایک اتنی خوبصورت کوٹھی میں کھڑا ہوں۔ میں اُن کے آگے شرمسار نہیں ہونا چاہتا۔"

"میجر صاحب!" ۔۔۔ ملک ناصر نے بڑے رعب سے کہا ۔۔۔ "کیا آپ نے کبھی ایک لاکھ روپیہ ہاتھ میں لے کے دیکھا ہے؟"

"آج دیکھوں گا" ۔۔۔ میجر نے کہا۔

○

ملٹری انٹیلی جنس اور ملٹری پولیس کے تمام آدمی کوٹھی کی تلاشی لے رہے تھے۔ اُنہوں نے پولیس کا قانونی طریقہ اختیار نہ کیا کہ دو گواہوں کو ساتھ رکھتے جو قابلِ اعتراض اشیاء کی برآمدگی کے مشیر نامے پر دستخط کرتے۔ ملٹری والوں نے ٹرنک اور اٹیچی کیس بھی کھلوا کر اور خالی کر کے دیکھے۔ وہ چھت پر بھی گئے۔ اُنہوں نے چمنیاں بھی دیکھیں۔

ملٹری انٹیلی جنس کے میجر نے پہلی بار ایک لاکھ روپیہ اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ یہ رقم ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ یہ رقم ملک ناصر کو تین چار روز پہلے ہندوستانی سفارت خانے سے ملی تھی جو اُسے ریڈار کی تباہی کے لیے خرچ کرنی تھی۔ اُسے چاروں چھاپہ ماروں کو اس میں سے معاوضہ اور انعام دینا تھا اس میں سے اُسے کچھ رقم اخراجات زیادہ دکھا کر مارنی بھی تھی۔

ایک کمرے میں سے جو مقفل تھا ایک وائرلیس سیٹ برآمد ہوا تھا۔ ملک ناصر کے بریف کیس میں سے بڑے کام کے خفیہ کاغذات برآمد ہوئے تھے۔

"کیا آپ اپنے باقی گروہ کی نشاندہی کریں گے؟" ۔۔۔ میجر نے ملک ناصر سے پوچھا۔

"اگر میں نشاندہی کردوں تو اس سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟" ۔۔۔ ملک ناصر نے پوچھا۔

"آپ کی ہڈی پسلی سلامت رہے گی" ۔۔۔ میجر نے جواب دیا ۔۔۔ "آپ محل جیسی کوٹھی میں رہنے والے

ہیں۔ آپ سختیاں جھیلنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ہم جتنے دن، جتنے مہینے بلکہ جتنے سال آپ کو اپنی قید میں زیرِ تفتیش رکھیں گے ہمیں کوئی قانون اور کوئی کورٹ حکم نہیں دے سکتی کہ آپ کو چھوڑ دیا جائے یا آپ کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ میں آپ کو صاف الفاظ میں بتا دیتا ہوں کہ ہم ہر وقت آپ کو اذیت دیتے رہیں گے۔ آپ بار بار بے ہوش ہوں گے۔ ہوش آنے پر ایذا رسانی کا سلسلہ نئے سرے سے شروع ہوگا.... اور اگر آپ تمام نشاندہیاں کردیں گے تو آپ کی سزا میں کچھ تخفیف ہوسکتی ہے.... بولیں ہم اور کہاں چھاپہ ماریں؟"

ملک ناصر گہری سوچ میں کھو گیا۔

"ملک صاحب!" ۔۔۔ میجر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔۔۔ "آپ کا وطن پاکستان ہے انڈیا نہیں۔ اگر آپ انڈیا کے ساتھ وفادار رہنا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو روکیں گے نہیں لیکن ہم آپ کو پاکستانی بنا دیں گے مگر اُس وقت تک آپ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جائیں گے۔ آپ کا جسم پاکستان کے لیے بیکار ہوچکا ہوگا۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ ہمارے پاس آپ کا ایک آدمی موجود ہے۔ ہم آپ کے گروہ کے آخری آدمی تک پہنچ جائیں گے۔"

ملک ناصر کی بیوی اور دو نوکروں کو بھی باہر لے آئے تھے۔

"یہ تین عورتیں آپ کی کیا لگتی ہیں؟"

وہ میری بیوی ہے" ۔۔۔ ناصر نے جواب دیا ۔۔۔ "وہ میری بیٹی ہے اور وہ میرے ایک دوست کی بیوی ہے۔"

"وہ دوست کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں" ۔۔۔ ملک ناصر نے جواب دیا ۔۔۔ "شام کو میری بیٹی کی گاڑی لے کے نکل گیا تھا۔ واپس نہیں آیا۔"

"آپ کا ساتھی ہے؟"

"نہیں" ۔۔۔ ملک ناصر نے جواب دیا ۔۔۔ "دوست ہے۔ کچھ دنوں سے آیا ہُوا ہے۔"

"اپنی بیٹی کی طرف دیکھیں" ۔۔۔ میجر نے کہا ۔۔۔ "اسے بھی ہم حراست میں اور زیرِ تفتیش رکھیں گے۔"

ملک ناصر نے چونک کر میجر کی طرف دیکھا۔

"اسے چھوڑ دیں" ۔۔۔ ملک ناصر نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا ۔۔۔ "ان تینوں عورتوں کا میری خفیہ سرگرمیوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

"جن کا تعلق ہے اُن کی نشاندہی کردیں" ۔۔۔ میجر نے کہا ۔۔۔ "میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ان تینوں خواتین کو آج رات ہی چھوڑ دوں گا۔ اپنے ہیڈکوارٹر میں ضرور لے جاؤں گا۔ ان کی عزت کا پورا خیال رکھوں گا.... بولیں ملک صاحب! جلدی بولیں۔"

○

شازی اور اُس کی ماں آسیہ گہری نیند سوئی ہوئی تھیں۔ پہلے آسیہ کی آنکھ کھلی۔ دروازے کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ شازی کی بھی آنکھ کھل گئی۔ آسیہ باہر نکلی۔ اُس پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ میجر اور صوبیدار اُسے کچھ کہے بغیر اندر چلے گئے۔ اس کوٹھی کی بھی تلاشی لی گئی لیکن کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔

آسیہ اور شنازی کو حراست میں لے کر ملک ناصر اور قیصر کو ان کے سامنے کھڑا کیا گیا۔

"آجاؤ آسیہ!" ۔ ملک ناصر نے یوں کہا جیسے اُس نے آہ بھری ہو ۔ "اِس بدبخت نے غدّاری کی ہے۔"

انٹیلی جنس کے صوبیدار نے مشین گن کی طرح قہقہہ لگایا اور بولا ۔ "میجر صاحب اُتنا آپ نے اِغداروں میں بھی غدّار ہوتے ہیں۔"

میجر نے ملک ناصر کے فون سے اپنے ہیڈکوارٹر کو رپورٹ دے دی تھی اور وہاں سے ایک لیفٹیننٹ کرنل آگیا تھا۔ اُس نے ملک ناصر اور آسیہ کی کوٹھیوں کو سربمہر کر کے سنتری کھڑے کر دیئے۔

ان سب کو سی ۔ ایم ۔ ایچ لے گئے۔ رجب علی اور جمال بیگ کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ دونوں میں سے ایک ہوش میں آگیا ہے۔ اُس کی ٹانگ کی ہڈی کئی ٹکڑوں میں ٹوٹ گئی تھی۔ مشین گن کا پورا برسٹ اس ٹانگ میں سے گزر گیا تھا۔ ہڈی کو جوڑ تو دیا گیا تھا لیکن ڈاکٹروں نے بتایا کہ ٹانگ کولہے کے قریب سے کاٹنی پڑے گی۔

ملٹری پولیس اور انٹیلی جنس کے افسر اُس کمرے میں گئے جہاں اس زخمی کو رکھا گیا تھا۔ اُس سے پوچھا گیا کہ وہ کون ہے؟

"میرا نام ملک رجب علی ہے"۔ رجب علی نے بڑی ہی نحیف آواز میں کہا اسلام آباد میں ملک ناصر رہتا ہے۔ میں اس کی کوٹھی کا نمبر بتاؤں گا۔ فوری طور پر اُس کے گھر چھاپہ مار وہ کچھ دیر خاموش رہا کیونکہ اُس سے مسلسل بولا نہیں جاتا تھا۔ اُس نے کہا ۔ "میں ابھی پورا بیان دینے کے قابل نہیں۔ مجھے کوئی عام شہری نہ سمجھیں۔ میں پولیس میں ڈی۔ ایس۔ پی رہ چکا ہوں۔ اسلام آباد میں ایک اور کوٹھی ہے جس میں آسیہ نام کی ایک عورت رہتی ہے۔ اُس کی بیٹی بھی ہے جس کا نام شنازی ہے۔ یہ لڑکی بھی اس گروہ میں شامل تھی لیکن میں نے اسے اپنا جاسوس بنا لیا تھا۔ اس گروہ کی نشاندہی اِسی لڑکی نے کی تھی۔ ایک بیٹی ملک ناصر کی بھی ہے اُس کا نام شمیم ہے۔ آپ سُن کر حیران ہوں گے کہ اس بیٹی نے اپنے باپ کے خلاف مُخبری کی اور مجھے اِس کے گروہ کا سراغ دیا تھا۔ میں ان لوگوں کو تارگیٹ کے بالکل قریب سے پکڑنے کے لیے ملک ناصر کے گھر موجود رہا اور اُس کے گروہ کا فرد بنا رہا۔ وہاں میری بیوی بھی ہے اُس کا نام سلمیٰ ہے۔ مَیں نے اُسے نہیں بتایا تھا کہ آج شام میں کہاں جا رہا ہوں۔ مجھ پر ایک مہربانی کریں اُسے فوراً اطلاع دیں کہ میں ہسپتال میں پڑا ہوں۔ میرا ایک بیٹا کمانڈو رجمنٹ میں کیپٹن ہے۔ زخمی ہو کر آیا تھا اور اسی ہسپتال میں کچھ دن گزار گیا ہے۔ وہ یہیں ہے۔"

"ہم ان دونوں کوٹھیوں میں رہنے والوں کو گرفتار کر کے لے آئے ہیں"۔ انٹیلی جنس کے میجر نے کہا ۔ "آپ کی بیوی بھی ساتھ ہے ... یہ دوسرا زخمی کون ہے؟"

"کیا وہ زندہ ہے؟" ۔ رجب علی نے پُوچھا۔

"زندہ ہے" ۔ میجر نے جواب دیا ۔ "لیکن ابھی بے ہوش ہے۔"

"میں آپ کو لاہور کا ایک ٹیلی فون نمبر دیتا ہوں" ۔ رجب علی نے کہا ۔ "کیا آپ یہ کرم کریں گے کہ وہاں طاہرہ اور ارشد کو اطلاع دے دیں کہ جمال بیگ صاحب یہاں ہسپتال میں زخمی پڑے ہیں۔"

"ہاں ۔ ضرور اطلاع دیں گے۔"

"اگر یہ شخص فوج میں ہوتا تو آپ اِسے نشانِ حیدر دیتے" ۔ رجب علی نے کہا ۔ "یہ میرے ساتھ

سال ہاتھ ریڈار پر حملہ کرنے والے گروہ کو پکڑنے گیا تھا۔"

"آپ ڈی۔ ایس۔ پی رہ چکے ہیں" ۔ میجر نے کہا ۔ "اگر آپ کو پہلے علم تھا کہ ایک گروہ ہے جو ہمارے یار کو تباہ کرے گا تو آپ نے فوج کو اطلاع کیوں نہ دی؟"

رجب علی کے ہونٹوں پر کرب ناک سی مسکراہٹ آگئی۔ اُس نے آہ بھری اور کہا ۔ "میں آپ کے اس وال کا اور بہت سے اور سوالوں کا تفصیلی جواب دوں گا۔ اس وقت آپ اتنا سمجھ لیں کہ یہ میرے ضمیر اور میری زون کا معاملہ تھا۔ میرے جسم سے آدھا خون نکل گیا ہے۔ میں زیادہ بول نہیں سکتا۔ ڈاکٹر سے کہیں کہ وہ مجھے اپنی پوری داستان سُنانے کے لیے کچھ دیر کے لیے زندہ رکھے۔ میں خدا سے زندگی کے کچھ اور لمحے مانگ لوں گا۔"

ملک ناصر نے بھی تصدیق کر دی کہ رجب علی نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک کہا ہے لیکن ناصر نے یہ بھی کہا کہ میں اپنے آپ کو بہت چالاک اور ہوشیار سمجھا کرتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ رجب علی بڑا گھاگ ڈی۔ ایس۔ پی رہ چکا ہے۔ یہ میرا سرحد پار کا دوست ہے لیکن اس نے دوستی کے پردے میں میری چالاکی اور اُستادی میں پانی ڈال دیا۔ اس نے بڑی اُستادی سے مجھ سے بڑے قیمتی راز لے لیے تھے۔

○

صبح دس گیارہ بجے تک رجب علی کے متعلق بات صاف ہو چکی تھی کہ وہ اور جمال بیگ اس چھاپہ مار گروہ کو پکڑنے کے لیے گئے تھے۔ دراصل جمال بیگ ریڈار والی پہاڑی دیکھنا چاہتا تھا۔ رجب علی اُسے اُس کی خواہش کے مطابق لے گیا تھا اور رجب علی یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس پہاڑی پر راستہ کون سا جاتا ہے۔ اللہ نے اُن کی مدد کی کہ اُن کا تصادم اِن چھاپہ ماروں سے ہو گیا۔

شمیم، اُس کی ماں اور سلمیٰ کے متعلق بھی شبہ صاف ہو چکا تھا۔ سلمیٰ کو اپنے خاوند کی خفیہ سرگرمیوں کا علم نہیں تھا اور شمیم کی ماں ملک ناصر کی خفیہ سرگرمیوں سے واقف نہیں تھی۔ شمیم کے متعلق ملٹری پولیس اور انٹیلی جنس نے تسلیم کر لیا تھا کہ یہ لڑکی اپنے باپ کی اِن سرگرمیوں سے واقف تھی اور رجب علی کے ساتھ مل کر اُسے پکڑوانا چاہتی تھی۔

سلمیٰ کا بیٹا کیپٹن اصغر بھی اطلاع ملنے پر سی۔ ایم۔ ایچ میں آگیا تھا۔ اُس نے بھی ملٹری پولیس کو بتایا تھا کہ شمیم نے اُسے بتا دیا تھا کہ اُس کا باپ انڈین ایجنٹ ہے۔

"تم کیپٹن ہو" ۔ میجر نے اُسے کہا ۔ "تم نے ہمیں قبل از وقت اطلاع کیوں نہ دی؟"

"مجھے میرے ابّو نے روک دیا تھا"۔ کیپٹن اصغر نے جواب دیا ۔ "میرے ابّو نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ اس گروہ کو پکڑ لیں گے۔ یہ کہتے تھے کہ اِس گروہ کی نشاندہی قبل از وقت کر دی گئی تو خطرہ ہے کہ گروہ زیرِ زمین چلا جائے گا۔ اس گروہ کا ہاتھ دُور اُوپر تک پہنچا ہُوا ہے۔"

آسیہ نے فوراً ہی اقبالِ جرم کر لیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ میں نہ ہندوستانی ہوں نہ پاکستانی۔ پاکستان کی انٹیلی جنس چاہے تو مجھے اپنے کام میں استعمال کر سکتی ہے لیکن میں یہ یقین نہیں دلا سکتی کہ میں ڈبل ایجنٹ نہیں بنوں گی۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو آپ کو اپنی زندگی کی کہانی سناؤں گی۔ پھر آپ خود ہی کہیں گے کہ ہاں اس عورت کا دین دھرم ہو ہی نہیں سکتا۔ میں صرف یہ التجا کروں گی کہ میری بیٹی کی عزت کی حفاظت کی جائے۔

"تمہاری بیٹی کے متعلق ہمیں شہادت مل چکی ہے"۔ میجر نے کہا "ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ تمہاری وجہ سے اس گروہ میں رہی، ورنہ وہ تمہاری زنجیریں توڑ رہی تھی اور ملک رجب علی کے اثر میں چلی گئی تھی۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ تمہیں اور ملک ناصر کو پکڑوانے میں تمہاری بیٹی کا کتنا ہاتھ ہے۔ تم اب اس کا غم نہ کرو یہ اب ہماری بیٹی ہے۔ تمہارا مستقبل جیل خانے کی اندھیری کوٹھڑی میں گم ہو چکا ہے۔ تمہاری بیٹی کا مستقبل روشن اور باوقار ہوگا

دن بھر ملٹری پولیس اور انٹیلی جنس اپنے ہیڈ کوارٹر میں بیانات قلمبند کرتی رہی۔ قیصر اور ملک ناصر نے کچھ اور لوگوں کی نشاندہی کی۔ شازی نے پاکستان کے اُن افسروں کے نام بتائے جو ملک ناصر کی شراب و کباب کی ضیافتوں میں شریک ہوتے تھے اور جن کو ہاتھ میں لینے کے لیے شازی نے اُن کے ساتھ راتیں گزاری تھیں۔ آسیہ نے بات یہیں پر ختم کر دی کہ صرف اپنے متعلق بیان دوں گی کسی اور کا نام نہیں لوں گی۔

شام تک کچھ اور لوگ جن میں سول اور ائیر فورس کے دو تین افسر بھی شامل تھے، ملٹری انٹیلی جنس کی حراست میں آگئے۔ ایک انکشاف یہ ہُوا کہ ان چار چھاپہ ماروں میں جو ریڈار کو تباہ کرنے گئے تھے ایک ہندو تھا اور وہ انڈین آرمی کا میجر تھا۔ اُس نے ان چھاپہ ماروں کو شکار کھیلنے کے بہانے مارگلہ کی پہاڑیوں میں لے جا کر ریڈار پر شب خون مارنے کی ٹریننگ دی تھی۔

مقبوضہ کشمیر میں ہماری کمانڈو فورس نے اپنی جانیں قربان کر کے اور اپنے آپ کو ساری عمر کے لیے معذور کر کے انڈین آرمی کو بارکوں میں قید کر دیا تھا۔ کمانڈو آپریشن ابھی تک جاری تھا۔ جہاں تک فوجی نقل و حرکت کا تعلق تھا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ کشمیر پر ہمارے کمانڈو جانبازوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ وہ اب اس انتظار میں تھے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی فوج مقبوضہ کشمیر پر قبضہ مکمل کرنے کے لیے آ رہی ہے۔

چھمب سیکٹر میں پاکستانی توپوں کے گولے چھمب کے اندر گر رہے تھے۔ پاکستان کی ہائی کمانڈ نے چھمب سیکٹر میں ڈویژن کی کمانڈ میں جو تبدیلی کی تھی، اس میں تیرہ گھنٹے ضائع ہو گئے تھے۔ ان تیرہ گھنٹوں میں انڈین آرمی نے چھمب کا دفاع مضبوط کر لیا تھا۔ اس سے ہمارے ٹروپس کا کام بہت مشکل ہو گیا تھا، پھر بھی ہمارے افسر اور جوان چھمب کے دفاع کو توڑنے کے لیے جانیں قربان کر رہے تھے۔

یہ وہ جنگ تھی جسے ساری دنیا دیکھ رہی تھی۔ ایک جنگ ملک رجب علی اور جمال بیگ نے لڑی تھی جسے ملٹری پولیس اور انٹیلی جنس کے سوا کسی نے نہ دیکھا۔ اس جنگ کا دوسرا معرکہ ملٹری پولیس اور انٹیلی جنس لڑ رہی تھی۔ اِس کے افسر اور جوان زمین کے نیچے سے جاسوسوں اور تخریب کاروں کو نکال رہے تھے۔

○

رات خاصی گزر چکی تھی جب رجب علی نے ڈاکٹر کو بُلا کر کہا کہ وہ پورا بیان دینے کے قابل ہو گیا ہے۔ اُسے مسلسل خون دیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کو جوں ہی پتہ چلا کہ یہ شخص اور جمال بیگ محبِ وطن ہیں اور انہوں نے یہ کارنامہ کیا ہے تو ڈاکٹروں، نرسوں اور ہسپتال کے دیگر عملے نے اُن کی دیکھ بھال اُنہیں پیر و مرشد مان کر کرنی شروع کر دی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ رات تک رجب علی کے جسم میں اتنی طاقت آگئی کہ وہ بیان دینے کے قابل ہو گیا۔

وہ ملٹری انٹیلی جنس کے ایک لیفٹیننٹ کرنل کو بیان دے رہا تھا جب کرنل کو ملٹری پولیس کے ایک سپاہی نے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ لاہور سے کچھ مہمان زخمیوں کو دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ رجب علی نے کرنل سے کہا کہ انہیں وہ آنے کی اجازت دے دے۔

وہ ارشد اور طاہرہ تھے اور اُن کے ساتھ ان کا نوجوان بیٹا طاہر پرویز بھی تھا۔ طاہرہ نے رجب علی سے پہلی بات یہ پوچھی کہ میرے ابّا جان کہاں ہیں؟ کرنل نے اُسے بتایا کہ وہ ابھی غشی میں ہیں، اس لیے ڈاکٹروں نے اُن کے کمرے میں جانے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ ارشد اور طاہرہ چونکہ بہت پریشان تھے اس لیے رجب علی نے انتہائی مختصر الفاظ میں بتا دیا کہ اُس نے اور جمال بیگ نے کیا معرکہ لڑا ہے۔

"تمہارے پاکستان کے لیے" — رجب علی نے کہا۔ "ارشد! طاہرہ! تمہارے پاکستان کے لیے"۔

سلمیٰ اور شمیم بھی ابھی تک وہیں تھیں۔ ملک ناصر کی کوٹھی جو سربمہر کر دی گئی تھی، شام کو کھول دی گئی تھی کیونکہ ملک ناصر نے مکمل اقبالی بیان دے دیا تھا۔ کوٹھی سے مزید کچھ نہیں برآمد کرنا تھا۔

شمیم اور اس کی ماں سلمیٰ، طاہرہ، ارشد اور طاہر پرویز کو اپنی کوٹھی میں لے گئیں۔ ان سب کو ٹیکسی میں اسلام آباد تک جانا پڑا کیونکہ ملک ناصر کی وہ کار ضبط ہو چکی تھی جس میں وہ چھاپہ ماروں کو پہاڑیوں کے اندر تک چھوڑ آیا تھا۔ شمیم کی کار بھی ملٹری پولیس کے قبضے میں تھی کیونکہ یہ اُس جگہ سے برآمد ہوئی تھی جہاں چھاپہ ماروں سے معرکہ لڑا گیا تھا۔ رجب علی اور جمال بیگ اِسی کار میں وہاں تک گئے تھے۔

شازی کو ملٹری پولیس نے گواہ کی حیثیت سے ابھی تک اپنے ساتھ رکھا ہُوا تھا۔

اگلے دو دن یہ سب لوگ سی۔ ایم۔ ایچ رجب علی اور جمال بیگ کو دیکھنے جاتے رہے۔ جمال بیگ ابھی تک غشی میں تھا۔ طاہرہ اور ارشد اُسے دیکھ بھی نہیں سکے تھے۔ اُسے مسلسل خون دیا جا رہا تھا مگر ایک زخم کچھ ایسا بے ڈھب تھا کہ اس کے راستے خون رِستا تھا۔ تیسرے دن کی شام تھی۔ طاہرہ اور ارشد مایوس ہو کر سی۔ ایم۔ ایچ سے واپس جانے لگے تھے کہ جمال بیگ کو وہ اُس روز بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک کرنل ڈاکٹر اور ایک میجر ڈاکٹر دوڑے آئے اور جمال بیگ کے کمرے میں چلے گئے اور انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔ ایک نرس دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور دوڑتی ہوئی واپس آئی۔ اُس نے ایک ٹرے اُٹھا رکھی تھی جس میں کچھ دوائیاں اور مرہم پٹی وغیرہ کا سامان تھا۔ طاہرہ اور ارشد وغیرہ اس امید پر رُک گئے کہ ڈاکٹر انہیں جمال بیگ سے ملنے کی یا صرف دیکھنے کی اجازت شاید دے دیں گے۔

تقریباً نصف گھنٹہ بعد کرنل ڈاکٹر باہر آیا۔ اُس نے پُوچھا کہ طاہرہ کون ہیں؟ جب طاہرہ آگے ہوئی تو کرنل نے کچھ بوجھل سی آواز میں کہا کہ آپ اندر جا سکتی ہیں۔ طاہرہ بڑی تیزی سے اندر چلی گئی۔ جمال بیگ کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ طاہرہ نے آگے بڑھ کر کہا "ابّا جان" — جمال بیگ نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے ہاتھ اُوپر کیا اور طاہرہ نے اپنا سر نیچے کیا۔ جمال بیگ نے ہاتھ طاہرہ کے سر پر پھیرا۔

"ابّا جان! کیسے ہیں آپ؟"

"طاہرہ بیٹی!" — جمال بیگ نے اس طرح کہا جیسے وہ بہت دُور کھڑا بول رہا ہو۔ "میں نے ساری عمر جس سکون کی تلاش میں بھٹکتے گزاری ہے وہ آج نصیب ہُوا ہے۔ میں خدا سے اپنے گناہوں کی سزا مانگ رہا تھا لیکن خدا نے مجھے انعام دیا ہے.... طاہرہ بیٹی! اِس سے بڑا اور انعام کیا ہو سکتا ہے کہ خدا اپنے وطن کے دفاع کی ذمہ داری سونپے اور اس میں کامیابی عطا فرمائے۔ رجب علی اگر زندہ ہے تو وہ تمہیں ساری داستان سُنا دے گا۔ میں سُرخرو ہو کر جا رہا ہوں"۔

طاہرہ پر ایسی رقّت طاری تھی کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ جمال بیگ کچھ اور کہنے ہی لگا تھا کہ اُس نے ایک

لمبا سانس لیا اور اُس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ طاہرہ کے سینے سے ویسی ہی چیخ نکلی جیسی پشاور میں اپنے سہاگ کی موت پر نکلی تھی۔ ڈاکٹروں کو معلوم ہو گیا تھا کہ جمال بیگ کا آخری وقت آن پہنچا ہے اِسی لیے انہوں نے طاہرہ کو اندر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ جمال بیگ نے صرف طاہرہ کو بُلایا تھا۔

عین اُسی وقت اپریشن تھیٹر میں رجب علی کی ٹانگ کاٹی جا رہی تھی۔ ان دو تین دنوں میں ہڈی جُڑنے کی بجائے خراب ہو گئی تھی سلمٰی اور شمیم آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑی تھیں۔ جب رجب علی کو باہر لایا گیا تو وہ اتنا کچھ ہوش میں تھا کہ سب کو پہچانتا تھا۔ اُسے فوراً کمرے میں لے گئے۔ سلمٰی اور شمیم سٹریچر کے ساتھ ساتھ گئیں سلمٰی نے کمرے میں جا کر آنسوؤں کی روانی میں رجب علی سے کہا کہ آپ کی ٹانگ کٹ گئی ہے۔

رجب علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ غنودگی کے لہجے میں بولا "آج میرے گناہ معاف ہو گئے ہیں۔ آج مجھے وہ اطمینان ملا ہے جس میں خدا کی خوشنودی شامل ہے"— اُس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی اور اُس کے چہرے پر بڑی پیاری رونق آگئی۔

اتنے میں ارشد آیا اور اُس نے بتایا کہ جمال بیگ صاحب فوت ہو گئے ہیں۔

رجب علی کی مسکراہٹ اور چہرے کی رونق بجھ گئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ملٹری انٹیلی جنس کا میجر جنرل بھی سی۔ ایم۔ ایچ میں آگیا۔ اُس نے جمال بیگ کی میّت کو سلیوٹ کیا پھر اس کا دایاں ہاتھ اٹھا کر اس مُردہ ہاتھ کو چُوما۔

"آپ کے شہید باپ کو صلہ تو خدا دے گا"— میجر جنرل نے طاہرہ سے کہا "لیکن آرمی انہیں انعام دے گی۔ ان کا کارنامہ معمولی نہیں۔ ہم ریڈار خود نہیں بناتے۔ یہ امریکہ کا دیا ہوا ریڈار ہے۔ اگر یہ تباہ ہو جاتا تو صرف ایک ریڈار کا نقصان نہ ہوتا۔ یہ ہم لوگ ہی جانتے ہیں کہ دشمن کے بمبار طیارے پاکستان کو کتنا نقصان پہنچاتے"۔

"اگر میرے والد صاحب زندہ رہتے تو بڑے سے بڑا انعام بھی قبول نہ کرتے"— طاہرہ نے کہا— "میں آپ کی ممنون ہوں لیکن میں اپنے شہید باپ کا کوئی انعام قبول نہیں کروں گی۔ میں ان کی روح کو تکلیف نہیں پہنچاؤں گی"۔

میجر جنرل کی نظریں طاہرہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں کی لطیف سی جنبش اور چہرے کا تاثر بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن جذبات اور رقّت اُسے بولنے نہیں دے رہے۔ اُس نے طاہر پرویز کی طرف دیکھا۔ وہ خوبرو لڑکا تھا۔ قد کاٹھ بھی دل کو بھاتا تھا۔

"یہ آپ کا؟ ....."

"بیٹا ہے"— طاہرہ نے میجر جنرل کا سوال پورا ہونے سے پہلے ہی کہا— "پڑھتا ہے لیکن فوج میں جانے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ کمیشن کے امتحان کے لیے ابھی اس کی عمر پوری نہیں ہوئی"۔

"سر!"— طاہر پرویز نے کہا— "میں افسر بننے کے لیے فوج میں نہیں جانا چاہتا۔ اپنے ملک کے لیے لڑنا چاہتا ہوں"۔

"جس روز تم سترہ سال کے ہو جاؤ اُس روز میرے پاس آجانا"— میجر جنرل نے اپنا نام بتا کر کہا— "تین چار مہینوں کی بات ہے۔ میں تمہیں جی۔ ایچ کیو میں ملوں گا"۔

طاہر پرویز کی آنکھوں میں جو آنسو آگئے تھے وہ خشک ہو گئے۔

جمال بیگ کی میّت لاہور لے جانے کے لیے سی۔ ایم۔ ایچ کی ایک ایمبولینس طاہرہ اور ارشد کو دے دی گئی۔ وہ میّت کو ایمبولینس میں رکھوا کر لاہور روانہ ہو گئے۔

ایمبولینس لاہور کی طرف دوڑی جا رہی تھی اور طاہرہ کا ذہن دُور پیچھے چلا گیا تھا۔ یادیں اُسے بچپن اور لڑکپن تک لے گئیں جب اُسے بتایا گیا تھا کہ اُس کا باپ اُس کے بچپن میں مر گیا تھا۔ وہ تصوروں میں اپنے باپ کے خدوخال اور قد بُت آراستہ کرتی رہتی تھی پھر اُسے راولپنڈی میں جمال بیگ کے ساتھ پہلی ملاقات یاد آئی لیکن اُس وقت وہ جمال بیگ نہیں جوزی بابا تھا۔ پھر جوزی بابا کے چہرے سے نقاب اُٹھا تو اس نقاب کے پیچھے طاہرہ کو اپنا باپ مِل گیا۔

یہیں راولپنڈی میں اُسے اپنا باپ ملا تھا۔ آج اُس کا باپ راولپنڈی پر قربان ہو گیا تھا۔

راولپنڈی..... راولپنڈی..... یہ شہر طاہرہ کے سینے پر نقش ہو گیا تھا۔ راولپنڈی سے وہ دُلہن بن کر پشاور گئی تھی اور بیوہ ہو کر واپس راولپنڈی آئی تھی۔ راولپنڈی میں اُسے ارشد ملا تھا جس سے کبھی نہ ملنے کی اُس نے قسم کھا رکھی تھی۔ راولپنڈی میں ہی وہ ایک بار پھر دُلہن بنی اور اب راولپنڈی سے اپنے باپ کی لاش لے کر جا رہی تھی۔

راستے میں رہ رہ کر اُس کی نظریں اپنے شہید باپ کے چہرے پر جم جاتی تھیں۔ اُس نے دو بار اپنے باپ کی سرد پیشانی کو چُوما۔

"ارشد!" — طاہرہ نے کہا — "تم نے میرے ابّو کے چہرے پر سکون کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ اب دیکھو۔ لگتا ہے ابّو مسکرا رہے ہیں۔"

ارشد نے سر ہلایا لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔

*

میّت رات کو لاہور پہنچی۔

اس رات کے بطن سے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی تاریخی سحر نے جنم لیا۔

جمال بیگ شہید کی میّت کو آخری غسل دے کر کفن میں لپیٹ دیا گیا تو باہر سے آوازیں آنے لگیں — "ہندوستان نے حملہ کر دیا ہے.... بھارتی فوج آ رہی ہے.... ہندو لاہور میں داخل نہیں ہو سکتا.... ہندوؤں کو موت ہماری سرحد کے اندر لے آئی ہے۔"

تعزیت اور جنازے کے لیے جو لوگ آتے بیٹھے تھے، وہ باہر سڑک پر آ گئے۔ یہی ایک آواز سُنائی دیتی تھی — "ہندوستان نے حملہ کر دیا ہے۔"

ارشد اور اُس کے باپ کو سب نے کہا کہ معلوم نہیں کچھ دیر بعد کیا ہو جائے، جنازہ فوراً اُٹھاؤ۔

جب جنازہ اٹھا تو فضا میں ایک دھماکہ ہُوا۔ سب نے اُوپر دیکھا۔ پاک فضائیہ کا ایک طیارہ ایک ہندوستانی طیّارے کا تعاقب کر رہا تھا۔ یہ پاکستانی طیّارے کا سُپرسانک دھماکہ تھا جو رفتار آواز کی رفتار تک پہنچنے سے ہُوا تھا۔ ایسے لگا جیسے پاکستان کے اس لڑاکا طیارے نے جمال بیگ شہید کی میّت کو سلامی دی ہو۔

جمال بیگ اسی جنگ کا شہید تھا۔ اُس کا جب جنازہ اُٹھا اُس وقت تک سرحد پر نہ جانے پاکستان کے کتنے بیٹے شہید ہو چکے تھے۔ انڈین آرمی نے سحر کے اڑھائی بجے حملہ کر دیا تھا۔ رینجرز بے خبری میں مارے گئے۔ اُنہوں نے لاہور کے ڈویژن ہیڈکوارٹر کو اطلاع دے دی کہ ہندوستان نے وسیع پیمانے پر حملہ کر دیا ہے اور اس کی فوج تیزی سے لاہور کی طرف بڑھ رہی ہے۔

سورج ابھی طلوع نہیں ہُوا تھا جب ہندوستان کے طیاروں نے دھونکل، گکھڑ اور راہوالی کے ریلوے سٹیشنوں پر بمباری کی۔ ایک مسافر گاڑی راہوالی سٹیشن پر کھڑی تھی۔ ہندوستانی ہوا بازوں نے اس گاڑی پر بمباری اور فائرنگ کی۔ گاڑی میں ایک نوجوان لڑکی شہید ہو گئی۔ بہت سے مسافر زخمی ہوئے۔

توپوں کے دھماکوں میں جمال بیگ شہید کا جنازہ پڑھا گیا اور میّت کو قبر میں اُتارا گیا۔ لوگ بڑی تیزی سے قبرستان سے نکلے۔ سب پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ ابھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ محاذ کی صورتِ حال

ا ہے۔

*

محاذ کی صورتِ حال پاکستان کے لیے مخدوش تھی۔ لاہور کے دفاع کے لیے صرف ایک ڈویژن تھا۔ اس ایک ڈویژن کی ذمہ داری میں جو محاذ تھا وہاں ہندوؤں کے تین ڈویژنوں نے حملہ کیا تھا۔ دوسرے دن ہندوستان کا ایک پیرا بریگیڈ بھی اس محاذ پر آ گیا تھا۔ ان ڈویژنوں اور پیرا بریگیڈ کو کمک اور دیگر امداد دینے کے لیے ایک ڈویژن امرتسر کے مضافات میں تیار کھڑا تھا۔

ہندوؤں کی ساڑھے تین سو توپوں کے مقابلے میں پاکستانی ڈویژن کی صرف ایک سو توپیں تھیں۔

ہندوستان کے حملہ آور لشکر میں تین جرنیل تھے اور چوتھا جرنیل کور کمانڈر تھا۔ ادھر صرف ایک جرنیل تھا۔ اُدھر نو بریگیڈیئر تھے اور ادھر صرف تین تھے۔

ہندوؤں کے جس لشکر نے لاہور پر حملہ کیا تھا اُس کی صرف پیادہ نفری ۳۵ ہزار تھی۔ اس میں ٹینکوں اور ان کی نفری کی تعداد شامل نہیں۔

انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف نے اعلان کیا تھا کہ وہ نو بجے لاہور کے جم خانہ کلب میں فتح کا جشن منائے گا۔

اُس نے دوسرا اعلان یہ کیا — "ہم لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی اسّی فیصد نفری مروا دیں گے۔"

ہندوستان اب بھارت کہلانے لگا تھا اور اس کے لیڈر بھارت کو مہا بھارت بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے جس میں انڈونیشیا سے لے کر دریائے دجلہ اور فرات تک کے ممالک شامل ہیں۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح پاکستان پر اپنی زیادہ سے زیادہ جنگی طاقت سے حملہ بھارتیوں کے اسی منصوبے کی ایک اہم کڑی تھا۔ اس یلغار کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی مشترکہ کمانڈو فورس نے کشمیر میں انڈین آرمی کی کم و بیش دو لاکھ نفری کو اس حد تک مفلوج کر کے رکھ دیا تھا کہ مقبوضہ کشمیر کمانڈو فورس کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اس خطّے کو جسے بھارت اپنا اٹوٹ انگ کہتا تھا، کمانڈو فورس سے چھڑانے کے لیے بھارت کے پاس یہی ایک ترکیب تھی کہ پاکستان پر حملہ کر دے۔

یہ تو ایک جواز تھا جو بھارتیوں کو مل گیا، برہمن تو پاکستان کو روزِ اوّل سے ہی بھارت میں مدغم کرنے کا تہیّہ کر چکے تھے۔ اس عزم کی تکمیل کے لیے اُنہوں نے اٹھارہ سال تیاری کی تھی چین کے ساتھ جنگ چھیڑ کر بڑی طاقتوں سے بے اندازہ اسلحہ بارود اکٹھا کر لیا تھا۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح بھارت کے کمانڈر انچیف نے نو بجے تک لاہور پر قبضہ کرنے کا جو اعلان کیا تھا یہ اُس نے بڑ نہیں ہانکی تھی۔ بھارت کے پاس جو جنگی طاقت تھی اس کے بل بوتے پر اس بھارتی کمانڈر نے یہ بھی کہا تھا کہ لاہور پر حملہ محض پولیس ایکشن ہو گا یعنی لاہور پر جو فوج کشی کی جائے گی اُس کے راستے میں کوئی مزاحمت نہیں ہو گی۔

اُس کی یہ بڑ بھی خالی دھمکی نہیں تھی۔ اپنی طاقت کے علاوہ اُسے معلوم تھا کہ اس خوفناک طاقت کے مقابلے میں پاکستان کے پاس کچھ بھی نہیں۔

بھارت نے اُسی روز سیالکوٹ سیکٹر میں جسڑ کے مقام پر حملہ کیا جو ایک دھوکہ تھا۔ پاک فوج کے جرنیلوں کو بھارت کا بکتر بند ڈویژن پریشان کر رہا تھا۔ اس کے متعلق پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کہاں ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ کسی ملک پر حملہ کیا جائے اور ٹینک ڈویژن کو استعمال نہ کیا جائے۔ بھارت کے

اس ڈویژن کو بھی حملے میں شریک ہونا تھا لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

اس ڈویژن کا مستقل ہیڈ کوارٹر جھانسی تھا۔ رن کچھ کی لڑائی میں اسے جھانسی سے پنجاب میں کہیں لے آئے تھے۔ رن کچھ کی لڑائی کے بعد یہ واپس جھانسی نہیں گیا تھا۔ بھارت کے فوجی اور سیاسی لیڈروں کو اپنے اس آرمرڈ ڈویژن پر جس کے ٹینکوں کو "سیاہ ہاتھی" کہا جاتا تھا، بہت ناز تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ان کا یہ ڈویژن پاکستان کی فوج کو بُل ڈوزر کی طرح کچلتا ہُوا آگے چلا جائے گا۔

خیال یہی تھا کہ اس ڈویژن کو سیالکوٹ کے محاذ پر استعمال کیا جائے گا۔ وہ علاقہ ہموار اور میدانی ہونے کی وجہ سے ٹینکوں کی پیشقدمی اور جنگ کے لیے موزوں تھا لیکن ۶ ستمبر کا دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ بھارت اپنے بکتر بند ڈویژن کو سامنے نہ لایا۔

۷ ستمبر کے روز پاک فوج کے ایک بریگیڈیئر کو جس کا بریگیڈ سیالکوٹ سیکٹر میں مورچہ بند تھا، سرحد پار شمال مشرق میں سامبا کے جنگلاتی علاقے میں کچھ شک ہُوا۔ اُس نے پاک فضائیہ سے مدد مانگی۔ تین طیارے اُس کے اوپر فضا میں آ گئے۔ اُس نے ان شاہبازوں کو وائرلیس پر سامبا کے علاقے میں راکٹ اور گنیں فائر کرنے کو کہا۔

شاہبازوں نے ایک دوسرے کے پیچھے ایک جنگل میں راکٹ فائر کیے۔ جنگل سے بہت بڑے شعلے اُٹھے اور وہاں مسلسل دھماکے ہونے لگے۔ سیاہ دھوئیں کی گھٹائیں اٹھیں —— وہاں تھا دشمن کا بکتر بند ڈویژن —— شاہبازوں نے بھی بتایا کہ وہاں گھنا جنگل ہے جس میں آرمرڈ ڈویژن چھپا ہُوا ہے۔

یہ تو پتہ چل گیا کہ دشمن کا آرمرڈ ڈویژن سامبا میں ہے اور اسے سیالکوٹ سیکٹر میں استعمال کیا جائے گا لیکن اتنے طاقتور ڈویژن کے حملے کو روکنے کے لیے پاک فوج کے پاس جو ٹینک تھے وہ بہت ہی کم تھے۔ دشمن کی بکتر بند قوّت چھ گنا سے بھی کچھ زیادہ تھی۔

*

بھارت نے اکیس ڈویژنوں سے حملہ کیا اور اتنے طاقتور، ایسے اچانک اور اتنے شدید حملے کو روکنے کے لیے پاکستان کے پاس صرف پانچ ڈویژن تھے جن میں پانچواں ڈویژن مکمل نہیں تھا۔ اس کی نفری آدھے ڈویژن کے لگ بھگ تھی۔ بھارت کا فضائی بیڑہ پاک فضائیہ سے چار گنا زیادہ طاقتور تھا۔ بھارتیوں کے پاس اُس وقت ... یدا ور تیز رفتار طیارے تھے۔ بھارت کے بحری بیڑے کے ساتھ پاک بحریہ کا تو کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ بھارت کے بحری بیڑے میں ایک طیارہ بردار بحری جہاز بھی تھا جس کے متعلق بھارتیوں نے کہا تھا کہ صرف اس سے وہ پاک بحریہ کو تباہ کر کے کراچی پر قبضہ کر لیں گے۔

اُس وقت پاکستان کی عمر اٹھارہ سال ہو چکی تھی۔ ان اٹھارہ سالوں میں پاکستان پر آٹھ حکمران حکومت کر چکے تھے اور اب نواں حکمران فوجی جرنیل تھا۔ ملک میں مارشل لاء تو نافذ نہیں تھا لیکن کیفیّت مارشل لاء والی ہی تھی۔ ان تمام حکمرانوں سے کوئی ایک بھی اس سوال کا جواب دینے کو تیار نہیں تھا کہ ہمارا دشمن اٹھارہ سال ہمیں دھمکیاں دیتا رہا اور جنگی طاقت بنتا رہا تو پاکستان کو اسلحہ بارود اور دیگر جنگی سازوسامان اور نفری کے لحاظ سے کیوں اتنا کمزور رکھا گیا۔ فوجی حکمران کو حکومت کرتے سات سال گزر چکے تھے۔ جرنیل ہوتے ہوئے اُس نے پاکستان کو جنگی طاقت سے محروم رکھا۔

اِن سیاسی اور فوجی حکمرانوں نے قوم کو مہنگائی اور عدم مساوات کی چکّی میں پیس ڈالا تھا۔ لوگوں کو معاشی بدحالی اور دیگر مسائل میں اُلجھا کر اُس پستی تک پہنچا دیا گیا تھا جہاں قوم افراد میں بٹ کر ریزہ ریزہ ہو جایا کرتی ہے۔ افراد مویشی بن جاتے ہیں جن کے زندہ رہنے کا واحد مقصد پیٹ بھرنا رہ جاتا ہے۔

ان حالات میں جو سیاستدانوں اور ایک فوجی حکمران نے پیدا کر دیئے تھے، قوم بدکرداری، قانون شکنی، غیر مانہ طرزِ زندگی اور رشوت خوری کو جائز قرار دے چکی تھی۔ جنہوں نے کردار اور صداقت کو سینے سے لگائے رکھا وہ مفلس اور تنگدست رہے۔

۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات تک پاکستان جرائم، خصوصاً سمگلنگ میں عالمی مقام حاصل کر چکا تھا۔

پاکستانی قوم کی یہ کیفیّت بھی بھارتیوں کے لیے ایک قوّت بن گئی تھی۔ رن کچھ کی لڑائی سے پہلے بھارتی انٹیلی جنس نے اپنے سیاسی اور فوجی لیڈروں کو پاکستان کے سیاسی اور معاشرتی احوال و کوائف کی اور پاکستان کے لوگوں پر ان کے اثرات کی ایک طویل اور جامع رپورٹ پیش کی تھی۔ اس میں بڑے وثوق سے کہا گیا تھا کہ پاکستان کے عوام معاشی بدحالی اور لاقانونیّت سے اس قدر تنگ آ چکے ہیں کہ پاکستان پر حملے کی صورت میں وہ اپنی فوج کا ساتھ نہیں دیں گے بلکہ وہ محسوس ہی نہیں کریں گے کہ ان کے ملک پر ان کے دشمن نے حملہ کر دیا ہے تو انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس رپورٹ میں یہ رائے دی گئی تھی کہ یہ قوم نیم مردہ ہے، لہٰذہ پاکستان پر حملے کا اور اسے بھارت میں مدغم کرنے کا یہ وقت موزوں ہے۔

بھارتی لیڈروں نے رن کچھ میں اپنی اور پاکستان کی جنگی اہلیت پرکھنے کے لیے لڑائی چھیڑی اور پاکستان کے فوجیوں اور شہریوں کا رّدِعمل دیکھا تو انہیں اُس رپورٹ پر شک سا ہونے لگا تھا جو انہیں ان کی انٹیلی جنس نے دی تھی۔ پھر انہوں نے مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کے کمانڈو آپریشن پر پاکستانیوں کا رّدِعمل دیکھا تو وہ چونکے۔ انہیں پاکستانی قوم میں زندگی کے آثار نظر آ رہے تھے لیکن بھارت کا کمانڈر انچیف اور اُس کے تین چار جرنیل پُورے وثوق سے کہتے تھے کہ پاکستانی قوم کی حیثیت سے مر چکے ہیں۔ وہ اب ڈرے سہمے اور اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرنے والے لوگ ہیں جو اُسی کا ساتھ دیں گے جو انہیں کھانے کو دو روٹیاں دے دے گا۔

اِن خوش فہمیوں میں مبتلا ہو کر بھارتیوں کو اپنی فتح یقینی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے سوچا ہی نہیں کہ جنگ کا پانسہ پلٹ بھی سکتا ہے۔ انہوں نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز ہی آل انڈیا ریڈیو سے یہ خبر سُنا دی کہ انڈین آرمی نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس خبر کی تصدیق بھارت کے دوست برطانیہ نے اپنے نشریاتی ادارے بی۔بی۔سی سے نشر کر دی۔

*

جس وقت آل انڈیا ریڈیو اور بی۔بی۔سی لاہور پر انڈین آرمی کے قبضے کی خبر نشر کر رہے تھے اُس وقت انڈین آرمی کے یہ تین ڈویژن جنہوں نے لاہور سیکٹر پر حملہ کیا تھا، ابھی بی۔آر۔بی نہر تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ لاہور کے دفاع میں لڑنے والے صرف ایک ڈویژن نے حملہ اس طرح روک لیا تھا کہ بی۔آر۔بی سے دُور پرے سے سرحد تک وسیع میدان بھارتیوں کی لاشوں سے اَٹ گیا تھا۔ ان لاشوں میں زخمی بھی تڑپ رہے تھے۔ اُنہیں اُٹھانے کے لیے کوئی آگے نہیں آتا تھا۔

بھارتی لیڈروں کے خواب لاہور کی دہلیز پر چکنا چُور ہو گئے تھے۔

اس حملے میں جو شدّت اور جو تندی و تیزی تھی وہ پہلے روز ہی ختم ہو چکی تھی لیکن بھارتیوں کے پاس ابھی بہت طاقت تھی۔ بے اندازہ نفری تھی۔ اُن کے پاس اسلحہ بارود اور جنگی ساز و سامان اتنا زیادہ تھا کہ وہ میدان جنگ میں جو کچھ پھینک کر پسپا ہوتے تھے وہ انہیں پیچھے سے فوراً مل جاتا تھا۔

اقوام عالم دم بخود تھیں۔ تاریخ دم بخود تھی۔ جنگی امور کے عالمی ماہرین سوچ رہے تھے کہ پاک فوج اور کتنے دن اتنے طاقتور دشمن کو روکے رکھے گی۔ سب کو پاکستان نقشے سے صاف ہوتا نظر آ رہا تھا۔ پاک فوج کے سرفروش جانوں کی بازی لگا کر اپنے ملک کا دفاع کر رہے تھے۔ وہ ایک معجزہ دکھا رہے تھے۔ اُن کے جسم نہیں اُن کی رُوحیں لڑ رہی تھیں ورنہ وہاں تو ایک اور دس کا مقابلہ تھا۔

اگر پاک فوج کے ایک ایک افسر اور ایک ایک جوان کی شجاعت، جذبۂ حبُ الوطنی اور شوقِ شہادت کا ذکر کیا جائے تو یہ داستان کہیں ختم ہونے میں نہ آئے گی۔ ان میں جو زخمی ہوتا تھا وہ پیچھے آنے سے انکار کر دیتا تھا۔ کسی کا ایک ہاتھ کٹ گیا، کسی کی ٹانگ توپ کے گولے کے ٹکڑے نے کاٹ دی، کسی کے پیٹ میں گولی لگی تو جب تک وہ ہوش میں رہا اُس نے پیچھے آنے سے انکار کیا۔ جنہیں بے ہوشی میں اُٹھا کر ہسپتال لے آئے وہ ہوش میں آتے ہی اُٹھ کھڑا ہُوا اور چلّانے لگا کہ اُسے مورچے سے کیوں اُٹھا لائے ہیں۔ ہسپتال میں اُن پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

پاک فوج کا ہر فرد یہ سمجھ کر لڑ رہا تھا کہ اپنے مقدّس وطن کو دشمن سے بچانے کے لیے وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ افسر اور جوان میدانِ جنگ کے ڈسپلن میں رہتے ہوئے بھی انفرادی بلکہ ذاتی جنگ لڑ رہے تھے۔ ہر افسر اور ہر جوان صحیح معنوں میں آگ بگولہ ہو گیا تھا جیسے بھارتی لیڈروں نے اُسے للکارا اور حملہ کر کے اُس کے وطن کی توہین کی ہو۔

لیکن جنگ کے ماہرین کی نظر حقائق پر تھی۔ وہ پاک فوج کے جذبے کو دیکھ رہے تھے لیکن وہ اس حقیقت کو بھی دیکھ رہے تھے کہ انسان آخر گوشت پوست کا بنا ہُوا ہے۔ ایک مقام پر آ کر وہ جسمانی طور پر شل ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت میں وہ جذبے کے زور پر نہیں لڑ سکتا — مگر وہ لڑ رہے تھے۔ انہوں نے دنیا سے اور اپنی زندگی سے رشتہ توڑ لیا تھا۔

پاک فضائیہ کی حیثیت بھارت کے فضائی بیڑے کے مقابلے میں فلائنگ کلب سے زیادہ نہیں تھی۔ پاکستان کے ہوابازوں کے پاس سیبر طیّارے تھے جو اُس وقت تک قدیم کہلانے لگے تھے۔ پاک فضائیہ نے انہی طیّاروں سے پہلے روز ہی بھارت کا پٹھانکوٹ کا ہوائی اڈہ اور وہ تمام طیّارے جو وہاں موجود تھے تباہ کر دیئے تھے۔

*

پاک افواج کے متعلق بھارت کے سیاسی اور فوجی لیڈر جن خوش فہمیوں میں مبتلا تھے وہ جنگ کے پہلے روز کی شام تک رفع ہو چکی تھیں۔ اب ان کے سامنے پاکستان کے عوام کے متعلق وہ رپورٹ تھی جس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان کے لوگ اپنی فوج کا ساتھ نہیں دیں گے اور وہ قومی وقار سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔

خود پاکستانیوں کی پاکستانیوں کے متعلق یہی رائے تھی کہ جذبے سیاسی فریب کاریوں کی نذر ہو چکے

اِن مگر ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح چشمِ فلک نے کچھ اور ہی نظارہ دیکھا۔ جنگ کے پہلے ہی دھماکے نے پاکستانی قوم کے تنِ نیم مُردہ میں وہ رُوح پھونک دی جو چودہ سو سال پہلے کفّار نے بدر کے میدان میں دیکھی تھی۔

اُدھر محاذوں پر پاک فوج نے سیالکوٹ، لاہور، قصور اور بیدیاں کو بدر، حنین، قادسیہ اور یرموک کی لڑی میں پرو دیا تھا، اِدھر عوام کے جذبۂ ایثار، اخوّت اور حُبُ الوطنی نے ساری دنیا کو حیران کر دیا۔ لاہور کے کسی شہری کے چہرے پر خوف و ہراس نہیں تھا۔ ہر چہرہ جذبے اور عتاب سے تمتما رہا تھا۔ انہوں نے نئے دور کی جنگ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ آج کی جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے۔ وہ لڑائی کو گلی محلے کی لڑائی سمجھتے تھے۔ اُن کے ہاتھ جو ہتھیار لگا، کلہاڑی، لاٹھی، چھُری، چاقو، شکاری بندوق، ریوالور، وہ اُٹھا کر سرحد کی طرف دوڑ پڑے۔

انہیں ملٹری پولیس نے محاذ سے دُور روک لیا لیکن اُن پر قابو پانا محال ہو گیا۔ انہیں پتہ چلا کہ کہیں خون لیا جا رہا ہے جو زخمی فوجیوں کو دیا جائے گا۔ وہ وہاں جا پہنچے۔ ان میں خواتین بھی تھیں۔ وہ فوجی ہسپتالوں میں چلی گئیں اور محاذ کے زخمیوں کی دیکھ بھال میں لگ گئیں۔

آج ہم جن آوارہ نوجوانوں کو ہپّی کہتے ہیں اُس وقت یہ ٹیڈی کہلاتے تھے۔ ان کے انداز یہی تھے جو آج کل ہیں۔ وہ اپنی روایات، اپنے مذہب اور اپنے کلچر سے بیگانہ تھے۔ ان کا اخلاق اور شرم و حیا مغرب میں گُم ہو گیا تھا۔ انہیں مسلمان اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے تھے۔ بزرگ ان سے مایوس ہو چکے تھے۔ قوم ان سے نالاں تھی لیکن ۶ ستمبر کی صبح یہی گم کردہ راہ نسل کسی کی راہنمائی کے بغیر اس راہ پر آ گئی جو وطن کے دفاع کی طرف جاتی تھی۔

آج حالات نے ایسا رنگ اختیار کر لیا ہے کہ کل کی حقیقت آج افسانہ لگتی ہے لیکن کہہ دینے سے یا فرض کر لینے سے حقیقت افسانہ نہیں بن سکتی۔ روایات حقیقت کے روپ میں ہمیشہ زندہ رہا کرتی ہیں۔ روایات مسلمانوں کے لہو میں رچی بسی ہوئی ہیں۔ ملّی جذبہ مسلمان کی فطرت کا لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر مسلمان مکمل مسلمان نہیں رہتا۔ یہ مسلمان نوجوان جنہیں ہم ٹیڈی کہتے تھے نصب العین سے بیگانہ کر دیئے گئے تھے۔ سیاستدانوں نے انہیں اقتدار کی معرکہ آرائی کے لیے کرائے کے سپاہی بنا لیا تھا۔

نوجوانی عمر کا وہ حصّہ ہے جس میں نوجوان لہو گرم کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ قومی سرگرمی نہ سہی سیاسی ہنگامہ آرائی ہی سہی۔ اُنہیں جب قومی سطح کی سرگرمیوں سے بیگانہ کر دیا گیا تو ان کے جسموں نے مغربی ناچ ناچنا شروع کر دیا۔ اُن کی نظروں سے منزل اوجھل کر دی گئی لیکن اُن کے جسم متحرک رہے اور قدم اُٹھتے چلے گئے۔ وہ خواہ گمراہ ہی تھے لیکن نوجوان اپنے قدم روک نہیں سکتا۔ وہ چلتا نہیں دوڑتا ہے۔

اِن احوال و کوائف میں جن میں معاشرتی بھی تھے، سیاسی بھی، نفسیاتی اور مذہبی بھی تھے، نوجوانوں کو اسی راہ پہ جانا تھا جسے آوارگی اور بداخلاقی کی راہ کہتے ہیں۔ جن نوجوانوں کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے بارہا کہا تھا کہ پاکستان طلباء اور طالبات نے بنایا ہے، وہ بھی نصب العین ملنے سے پہلے آوارہ اور مغرب زدہ ہی تھے لیکن انہیں جب منزل دکھا دی گئی اور اُنہیں جب یہ نعرہ دے دیا گیا "لے کے رہیں گے پاکستان — بٹ

کے رہے گا ہندوستان . . . پاکستان کا مطلب کیا — لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ" — تو اِنہی آوارہ نوجوانوں نے اپنے آباؤ اجداد کی روایات کو زندہ کر دیا۔ یہی لڑکے اور لڑکیاں انگریز اور ہندو کے متحدہ محاذ پر بجلی بن کر گرے اور اُنہوں نے پاکستان بنا کے دکھا دیا۔

اٹھارہ برسوں بعد کے نوجوان بھی آوارہ اور مغرب کے فیشن میں رنگے ہوئے بداخلاق نوجوان تھے لیکن جنگِ ستمبر کے پہلے دھماکے نے اُن کے سامنے ایک بڑا ہی مقدّس نصب العین رکھ دیا — یہ تھا اُس پاکستان کا دفاع جو اٹھارہ سال پہلے ان ہی جیسے نوجوانوں نے جان اور لہو کی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔ اُنہیں کسی نے وعظ اور لیکچر نہ دیا۔ مسلمان کی فطرت اور تب و تابِ جاودانہ اُنہیں اُن جگہوں پر لے گئی جہاں اُن کی ضرورت تھی۔

سیالکوٹ کے ٹرنک بازار اور ساتھ کے محلّے پر بم گرے تو سب سے پہلے ملبے کے نیچے سے زخمیوں اور لاشوں کو نکالنے کے لیے جو پہنچے وہ یہی ٹیڈی لڑکے اور لڑکیاں تھے۔ اِن لڑکیوں کے بال کٹے ہوئے تھے۔ اُن کے سروں پر دوپٹے نہیں تھے۔ ان کی قمیضیں اور شلواریں اس قدر تنگ تھیں کہ مستور ہوتے ہوئے بھی وہ عریاں لگتی تھیں لیکن اُن کے کٹے ہوئے بال مٹی سے اَٹ گئے تھے۔ اُن کے تنگ لباس زخمیوں کے لہو سے لال ہو گئے تھے۔ وقت آدھی رات کا تھا۔ سول ڈیفنس کے عملے کے پہنچنے سے پہلے قوم کے یہ آوارہ بچّے زخمیوں کو ہسپتال پہنچا چکے تھے۔ پھر وہ سوئے نہیں۔ وہ اردگرد کے ہراساں لوگوں کے حوصلے بڑھاتے رہے۔

مثالیں ہزار دی جا سکتی ہیں لیکن راز ایک ہی ہے جو قائدِاعظم نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا کہ نوجوان قوم کی قوّت ہیں۔ قائدِاعظم نے کہا تھا کہ تحریکِ پاکستان میں اِن نوجوانوں نے ہمارے پہلوؤں کو اس قدر محفوظ اور مضبوط رکھا کہ ہم نے اپنی منزل غیر متوقع طور پر قبل از وقت پالی۔

*

اور وہ جو لاٹھیاں کلہاڑیاں لے کر محاذوں کی طرف اُٹھ دوڑے تھے اور جنہوں نے کئی کئی بار خون دے کر اپنے جسم خون سے خالی کر دیئے تھے، یہ وہی عوام تھے جن کے متعلق انڈین انٹیلی جنس نے رپورٹ دی تھی کہ مر چکے ہیں اور اب ان کی نظر میں پاکستان کی قدر و قیمت ختم ہو چکی ہے۔ ان میں مفلس اور تنگ دست بھی تھے، روزانہ اُجرت پر کام کرنے والے مزدور بھی تھے۔ اِن میں وہ بھی تھے جن کا پیشہ بھیک مانگنا تھا۔ ان میں چرسی بھی تھے، افیمی بھی تھے۔ اِن میں تنگ و تاریک گلیوں میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح رہنے والے لوگ بھی تھے۔

وہ بھکاری بُڑھیا بھی انہی عوام میں سے تھی جس کے گھر میں چند سیر آٹے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ یہی آٹا لے کر بنک میں دفاعی فنڈ میں جمع کروانے کے لیے لے گئی تھی۔ یہ ایک نہیں کئی بھکاری تھے۔ اُس وقت تک مانگ مانگ کر اُنہوں نے جو پیسے اکٹھے کیے تھے وہ بنکوں میں لے گئے تھے۔ آج یہ افسانہ لگتا ہے لیکن تاریخ اُس وقت کو کبھی فراموش نہیں کرے گی جب کئی والدین نے اپنی بیٹیوں کے مکمل جہیز فوج کے حوالے کر دیئے تھے۔

یہ سیاسی فریب کاری اور مالی اور معاشرتی مسائل کے مارے ہوئے عوام تھے جنہوں نے اپنے سامنے یہ حقیقت رکھ لی تھی کہ پاکستان کسی صدر، کسی وزیرِاعظم، کسی وزیر اور کسی سیاستدان کی جاگیر نہیں، یہ مملکتِ خداداد ہے جس کی مالک اور وارث وہ قوم ہے جسے ایک خاص طبقے نے عوام کا نام دے رکھا ہے۔

پاکستان میں ایک طبقہ خواص کا بھی تھا جن کے لیے پاکستان سونے کی کان تھی۔ ان کے لیے پاکستان کوٹھیوں

اور بنگلوں کی چند ایک کالونیوں کا مجموعہ تھا۔ جاگیریں اُن کی، دولت اُن کی اور سیاسی لیڈرشپ اُن کی تھی۔

۶ ستمبر کے روز جب عوام محاذوں کی طرف دوڑے جا رہے تھے، کاروں کا ایک قافلہ لاہور سے محاذوں کی اُلٹی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ تاریخ اِس منظر کو بھی کبھی نہیں بھولے گی کہ دریائے راوی کے پُل پر اِن کاروں کی اتنی بھیڑ لگ گئی تھی کہ ٹریفک جام ہو گئی تھی۔ ہر کار کاروں کے ہجوم سے پہلے دریا سے پار نکل جانے کی کوشش میں تھی۔ اِن کاروں میں نقدی اور زیورات تھے۔ یہ کوٹھیوں اور بنگلوں کے مکین تھے جو زر و جواہرات کو ہی زندگی سمجھتے تھے۔ وہ پاکستان کو نہیں اپنی دولت کو بچانے کے لیے جی۔ ٹی روڈ پر راولپنڈی کی سمت بھاگے جا رہے تھے۔ اِن کے لیے قرآن کی یہ سرزمین تنگ ہو گئی تھی۔ وہ جہاں بھی گئے خوف و ہراس اُن کے ساتھ گیا۔

وہ پاکستان میں پناہیں ڈھونڈتے پھرے لیکن پاکستان جن کا تھا اُنہوں نے جو کچھ بھی پاس پلّے تھا، اپنی جانیں بھی، اپنا لہو بھی وطن کی قربان گاہ پر رکھ دیا۔ پاک فوج نے جب اپنی پیٹھ پر قوم کا ہاتھ محسوس کیا تو اُن کے جذبوں میں نئی تازگی آ گئی۔

یہ تھی وہ قوّت جس نے ساڑھے چار ڈویژنوں سے اکیس ڈویژنوں کا دم خم ۶ ستمبر کی شام کو ہی توڑ دیا۔

*

طاہرہ کی زندگی ایک بار پھر غم و فکر اور پریشانیوں کی وادی میں داخل ہو گئی۔ اُس کا باپ بے شک شہید ہُوا تھا لیکن وہ اُس کا باپ تھا جو اُسے پچیس برس کی عمر میں ملا تھا اور چند دن اُس کا ہمسفر رہ کر دُنیا سے اُٹھ گیا تھا۔ دوسرا غم پاکستان کا تھا۔ وہ جذبے اور حوصلے والی عورت تھی لیکن وہ عورت تھی۔ اُسے اپنی نوجوانی کے وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ جلال آباد میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے ہیڈکوارٹر والی حویلی میں داخل ہوئی تھی۔ پھر وہ وقت جب اُس نے ہزاروں مردوں کے جلوس میں چند جملوں کی تقریر کر کے اس ہجوم کو آتش فشاں بنا دیا تھا۔ اسے پولیس نے پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اُسے وہ تمام خطرے یاد آئے جن میں وہ کُود گئی تھی۔ اُسے اپنی عمر کی وہ لڑکیاں اور وہ لڑکے یاد آئے جن کے لیے "لے کے رہیں گے پاکستان" ایمان کا ایک رکن بن گیا تھا۔

پھر طاہرہ کو وہ بھیانک سفر یاد آیا جو اُس نے جلال آباد سے واہگہ تک کیا تھا۔ اُسے لاشوں کے انبار، کھیتوں میں بکھری ہوئی لاشیں، عورتوں کی عصمت بریدہ برہنہ لاشیں، بچّوں کے کٹے ہوئے جسم اور مسلمانوں کے جلتے ہوئے مکان یاد آئے۔ آج وہی ہندو اور وہی سکھ جنگی طاقت کے بل بوتے پر پاکستان کو بھیڑ بکری سمجھ کر طاہرہ کے وطن کی دہلیز پر آن پہنچے تھے۔

"ارشد!" — طاہرہ نے عجیب دیوانگی کی سی کیفیت میں کہا — "تم مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہو کہ ہم پاکستان کو بچا لیں گے؟"

"یہ سوال تم ایک درجن مرتبہ مجھ سے پوچھ چکی ہو" — ارشد نے اُسے کہا — "ہم پاکستان کو بچا لیں گے۔ تم اکیلی نہیں۔"

"خدا سے مجھے یہی ایک گلہ ہے کہ مجھے عورت کے روپ میں کیوں دُنیا میں بھیجا تھا" — طاہرہ نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پوچھا — "طاہر پرویز کہاں ہے؟"

ارشد ہنس پڑا اور بولا — "پاکستان کو بچانا چاہتی ہو اور اپنے بیٹے کو ڈھونڈ رہی ہو؟ وہ جانتا ہے کہ فوج

سے باہر رہ کر اُسے کیا کرنا ہے۔ وہ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے چلا گیا ہے۔"

"میں اپنے یہ دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہوں"۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔۔۔ "مجھے صرف یہ غم ہے کہ طاہر پرویز جذبات میں آکر اپنے آپ کو ضائع نہ کر دے۔ میں اُسے کسی صحیح طریقے سے وطن کی قربان گاہ پر پیش کروں گی۔"

اِس کے بعد طاہرہ کو طاہر پرویز نہ ملا اور طاہر پرویز جب بھی گھر آیا تو اُسے طاہرہ نہ ملی۔ طاہرہ لاہور کے فوجی ہسپتال میں محاذ کے زخمیوں کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھی۔

*

انڈین آرمی وہیں تھی جہاں جنگ کے پہلے روز تھی البتہ اُس کے جاسوس پاکستان کی نازک رگوں میں اُترے ہوئے تھے لیکن قوم کچھ ایسے انداز سے چوکس اور بیدار ہو گئی تھی کہ جہاں اُنہیں کسی پر ذرا سا بھی شک ہوتا تھا اُسے گھسیٹ کر تھانے پہنچا دیتے تھے۔ جاسوسوں کا انتہائی خطرناک گروہ تو وہ تھا جسے جمال بیگ اپنی جان اور رجب علی اپنی ایک ٹانگ قربان کر کے گرفتار کروا چکا تھا۔

راولپنڈی میں ایک بند کمرے میں اس گروہ کے افراد کے بیانات قلمبند کیے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے آسیہ کا بیان لیا گیا۔

"میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ میں کسی کا نام نہیں لوں گی اور اپنے رِنگ کے کسی ٹھکانے کی نشاندہی نہیں کروں گی"۔۔۔ آسیہ نے کہا۔۔۔ "میں آخر مسلمان ہوں اور آپ کو اسلام کے ناطے سے یہ بتانا اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ مجھے اور میرے تمام ساتھیوں کو سزائے موت دے کر آپ پاکستان کو کم از کم جاسوسوں سے نہیں بچا سکتے۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں، اب پھر کہتی ہوں کہ میرا کوئی وطن نہیں ہے۔ میں نہ ہندوستان کی وفادار ہوں نہ پاکستان کی۔ اگر آپ مجھے اس سے زیادہ اُجرت دیں گے جو مجھے انڈیا سے ملتی ہے تو میں آپ کے لیے جاسوسی کروں گی لیکن میں یہ یقین نہیں دلا سکتی کہ میں دوغلی جاسوسی نہیں کروں گی۔"

"غور سے سن لو خاتون!"۔۔۔ بیان لینے والے بریگیڈئر نے کہا۔۔۔ "دو باتیں ذہن سے نکال دو۔ ایک یہ کہ تم نے اگر کہہ دیا ہے کہ تم اپنے کسی ساتھی کی اور اپنے رِنگ کے کسی ٹھکانے کی نشاندہی نہیں کرو گی تو ہم اسی پر قناعت کر لیں گے۔ ہمیں اپنے وطن کی عزت عزیز ہے۔ تمہاری عزت ہمارے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ ایک آبرو باختہ اور ایمان فروش عورت کی خاطر ہم اپنے وطن کو فراموش نہیں کر سکتے۔ تم ہمارے پاؤں میں بیٹھ کر کہو گی کہ آؤ میرے ساتھ میں تمہیں اپنے ہر ٹھکانے پر لے چلوں گی۔ ہم تمہارا وہی حشر کریں گے جو سرحدوں پر تمہاری انڈین آرمی کا ہو رہا ہے....

"اور دوسری بات یہ ذہن میں رکھ لو کہ ہم تمہاری یہ پیشکش قبول نہیں کر سکتے کہ تم پاکستان کے لیے جاسوسی کرو گی۔ پاک فوج عورتوں کے کندھوں پر رائفلیں رکھ کر فائر نہیں کیا کرتی۔ پاکستانی ابھی اتنے بے غیرت نہیں ہوئے کہ وہ عورتوں کو استعمال کریں۔ ہاں اب کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔"

آسیہ کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں طنز بھی تھی اور اُداسی کی جھلک بھی۔ اُس نے کہا۔۔۔ "ہاں، میں جانتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ کیسا سلوک کریں گے لیکن میں چاہتی ہوں کہ جب آپ کے ہاتھوں مر جاؤں تو آپ اتنا تو کہہ سکیں کہ یہ عورت کتنی قیمتی نشاندہی کر گئی ہے.... غور سے سنو بریگیڈیر صاحب! آپ فوجی بڑے سیدھے لوگ ہوتے ہیں۔ آپ لڑنا جانتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی قوم سوئے ہوئے شیر کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی ہے لیکن آپ اور آپ کے عوام

کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کے جذبوں کے ساتھ ایک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ فوج کی نظر اپنے دشمن پر ہوتی ہے لیکن فوج کو لڑانے والوں کی نظر اپنی کرسی پر ہوتی ہے۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ جنگ جو سرحدوں پر لڑی جا رہی ہے یہ چند دن کا کھیل ہے۔ اُن اونچے ایوانوں کی دیواروں سے کان لگا کر کبھی سنو۔ پھر تمہاری مشین گنوں کا رُخ کسی اور طرف ہو جائے گا۔ کل نہیں تو دس بارہ روز بعد فائر بندی ہو جائے گی۔ پھر وہ ملک جو آپ کو بھیک دے رہے ہیں اور وہ ملک جو انڈیا کو روٹی اور راکٹ دے رہے ہیں، وہ اپنے مفادات کے مطابق جنگ بندی کرا کے دونوں ملکوں کے حکمرانوں کو گلے ملا دیں گے۔ قوم کا جذبہ کچھ اور ہوتا ہے، حکمران کی ضرورت کچھ اور ہوتی ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اقتدار پرست حکمران دشمن کو دوست کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔"

آسیہ نے اپنی گذری ہوئی زندگی کی ایک ایک تفصیل سنائی اور کہا کہ اُس کی فطرت سے انسانیت کا پیار اور ایمان اُسی روز نکل گئے تھے جس روز اُسے اُس کے باپ نے ایک بوڑھے کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ہے تمہارا خاوند۔

"جاسوس کہاں پیدا ہوتے ہیں اور کیوں پیدا ہوتے ہیں؟"۔۔۔ آسیہ نے کہا۔۔۔ "جاسوس وہ بنتا ہے اور کامیاب غدار وہ ہوتا ہے جس کا گھر پیسوں سے بھرا ہوا ہو اور وہ کہے کہ اتنے ہی پیسے اور ہونے چاہئیں۔ اِن بڑے جاسوسوں کے گروہ اُن عوام میں مل جاتے ہیں جو مہنگائی، معاشرتی بے انصافی اور تنگ دستی کا شکار ہوتے ہیں۔ آپ کے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو بے حد امیر ہیں اور جو نیم فاقہ کش ہیں۔"

"ہم نے تمہیں یہاں لیکچر یا وعظ کے لیے نہیں بلایا"۔۔۔ بریگیڈئر نے میز پر مکّہ مارتے ہوئے کہا۔۔۔ "فلاسفر بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہم تمہارا اقبالی بیان سننا چاہتے ہیں۔ اقبالی بیان نہیں دو گی تو بھی ہمیں تمہارے رِنگ کی پوری داستان معلوم ہو جائے گی۔ تمہاری اپنی بیٹی اِس کیس میں وعدہ معاف گواہ ہے۔ ہم تمہیں آج رات بارہ بجے تک مہلت دیتے ہیں۔ اگر اپنے رِنگ کی پوری کارگذاری اور مختلف ٹھکانوں کی نشاندہی پیش کر دو گی تو ہم سے اچھے سلوک کی توقع رکھ سکتی ہو ورنہ رات بارہ بجے کے بعد تمہاری چیخیں نئی دہلی تک نہیں پہنچ سکیں گی۔"

بریگیڈئر نے کمرے کے باہر کھڑے ملٹری پولیس کے حوالدار کو بلایا اور کہا۔۔۔ "ملک ناصر کو اندر لے آؤ۔"

ملک ناصر کو جب اندر لایا گیا تو اُس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ پاؤں گھسیٹ رہا تھا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کبھی پکڑا بھی جائے گا اور جب پکڑا جائے گا تو اُسے کوئی اپنا دوست نہیں سمجھے گا اور اُس پر کوئی رحم نہیں کرے گا۔

"ملک ناصر!"۔۔۔ بریگیڈیر نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔۔۔ "تم اپنا جُرم جانتے ہو کتنا سنگین ہے۔ میں تمہیں کوئی لالچ نہیں دوں گا، کوئی دھمکی نہیں دوں گا اور کوئی بیان بھی نہیں لوں گا۔ اپنے پورے رِنگ کو بے نقاب کر دو۔ ان پاکستانیوں کے نام اور ایڈریس بھی بتا دینا جو تمہارے رِنگ میں تھے۔ میں تمہیں سوچنے کا بہت وقت دوں گا۔ اگر تم یہ خواب دیکھ رہے ہو کہ ہم تمہیں سول کورٹ میں پیش کریں گے اور تم روپے پیسے کے زور پر بری ہو جاؤ گے تو یہ خواب دیکھنے چھوڑ دو۔ تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔"

ملک ناصر نے شکست خوردہ انداز سے سر ہلایا پھر اُس نے سر جھکا لیا۔

"بیان دو گے؟"

"دوں گا"— ملک ناصر نے یوں جواب دیا جیسے آہ بھری ہو۔

"کیا اپنے پورے رنگ کی نشاندہی کر دو گے؟"

"کروں گا"— ملک ناصر نے بڑا لمبا سانس چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔

بریگیڈیئر اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے اپنے افسروں کو اشارہ کیا کہ اسے لے جائیں۔

*

بھارت کے اُس وقت کے وزیراعظم لال بہادر شاستری نے جنگ کے تیسرے ہی روز اقوامِ متحدہ میں کہہ دیا کہ وہ اسی وقت فائر بندی کے لیے تیار ہے مگر جس کمبل کو وہ ہاتھ ڈال چکا تھا، اب وہ کمبل اسے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ شاستری برہمن تھا۔ پاکستان کو کمزور سمجھ کر منوسمرتی کے ایک اشلوک کے مطابق بھیڑیئے کی طرح جھپٹ پڑا تھا اور جب اُس نے دیکھا کہ اُس کا شکار الٹا جھپٹ پڑا ہے تو برہمن اسی اشلوک کے مطابق خرگوش کی طرح بھاگ رہا تھا۔

اُس کی انٹیلی جنس کی یہ رپورٹ کہ پاکستانی قوم مردہ ہو چکی ہے اور یہ قوم اپنی فوج کا ساتھ نہیں دے گی، غلط ثابت ہو چکی تھی۔ پاکستانی قوم اور فوج قرآن کے الفاظ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی تھی۔

برہمن کے بھاگ نکلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگ کے پہلے اور دوسرے روز انڈین آرمی کی جو نفری لاہور سیکٹر میں زخمی ہوئی تھی، اسے پیچھے لے جاکر اور ریل گاڑی میں بھر کر دلّی بھیج دیا گیا۔ ان زخمیوں کی تعداد چند سو نہیں کئی ہزار تھی۔ یہ گاڑی دلّی دن کے وقت پہنچی۔ دلی بہت بڑا ریلوے سٹیشن ہے۔ پلیٹ فارموں پر مسافروں کا ہجوم رہتا ہے۔ جب زخمیوں کی ملٹری سپیشل ریل گاڑی دلّی سٹیشن پر رُکی تو زخمی کراہ رہے تھے۔ ڈبوں کی کھڑکیوں میں سے زخمی باہر دیکھ رہے تھے۔ مسافر جو پلیٹ فارموں پر موجود تھے دوڑے آتے اور پیشتر اس کے کہ فوج مسافروں کو اس گاڑی سے دور ہٹاتی، زخمیوں نے مسافروں کو بتانا شروع کر دیا کہ لاہور سیکٹر میں انڈین آرمی کا کیا بُرا حال ہو رہا ہے۔

ہندو فتنہ پرداز اور جنگ پسند ہے جنگجو نہیں۔ اسے ذرا سی خراش آجاتے اور خون کے دو قطرے پھوٹ آئیں تو ہندو ایسا واویلا بپا کرتا ہے جیسے اس کی شہ رگ کٹ گئی ہو۔

یہ جو لاہور سیکٹر سے زخمی ہو کر دلّی پہنچے تھے، وہ معمولی زخمی نہیں تھے۔ بعض کے تو اعضا ہی کٹ کر محاذ پر رہ گئے تھے۔ زخم تو تھے ہی، اُن پر جو دہشت طاری تھی، اس سے ان کی زبانیں ہکلا رہی تھیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کئی زخمیوں نے روتے ہوئے دلّی ریلوے سٹیشن کے مسافروں سے کہا— "ہمیں لاہور لے جاکر مروا دیا ہے۔"

بعض زخمیوں نے بتایا کہ اُنہیں یہ تو بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ لاہور پر حملہ کرنا ہے۔ اُنہیں کہا گیا تھا کہ لاہور جا رہے ہیں اور لاہور پر قبضہ کرنا ہے۔ اُنہیں اس خوش فہمی میں بھی مبتلا کیا گیا تھا کہ پاکستان کی فوج کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہو گی کیونکہ یہ فوج بہت کمزور ہے۔

زخمیوں نے دلّی والوں کو یہ بھی بتایا کہ یہ تو زخمی ہیں جو زندہ واپس آ گئے ہیں، اس سے زیادہ نفری ماری گئی ہے اور ماری جا رہی ہے۔

شام تک دلّی کے گلی کوچوں، کوٹھیوں اور بنگلوں کی کالونیوں میں اس خبر نے خوف و ہراس پھیلا دیا کہ بھارت کی فوج پاکستان کی سرحد پر کٹ رہی ہے۔ زخمیوں کی گاڑی دلّی پہنچنے تک دلّی والے جشن منانے کی کیفیت میں تھے۔ انہیں آل انڈیا ریڈیو نے جنگ کی پہلی شام ہی خبر سنا دی تھی کہ انڈین آرمی لاہور شہر میں گھوم پھر رہی ہے۔ اس کی تصدیق برطانیہ کے ریڈیو بی بی سی نے بھی کر دی تھی مگر زخمیوں کی ریل گاڑی نے جشن کی کیفیت پر موت کی دہشت طاری کر دی۔

تاریخ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرے گی کہ ان زخمیوں کا پھیلایا ہوا خوف و ہراس شہریوں تک ہی محدود نہ رہا، حکومت بھی اس سے بچ نہ سکی۔ اس کے زیرِاثر نئی دلّی سے حکومت کے اہم محکموں کے دفاتر بھارت کے دور اندر الٰہ آباد کو منتقل ہونے شروع ہو گئے۔ روپے پیسے والے ہندو دلّی سے نکلنے لگے۔

صرف دلّی کے نہیں تمام تر بھارت کے ہندوؤں نے اپنی ذہنیت کا ایک مظاہرہ اور بھی کیا۔ وہی ہندو جو بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے اور انہیں اچھوت سمجھتے تھے، اب مسلمانوں کو ہاتھ جوڑ کر اور "مہاراج جی" کہہ کر سلام کرتے تھے۔ ان ہندوؤں کا اپنے ریڈیو پر اعتبار اٹھ گیا تھا۔ وہ ریڈیو پاکستان سنتے تھے اور وہ ایک دوسرے سے پوچھتے پھرتے تھے کہ محاذوں کی صحیح صورتحال کیا ہے۔ خوف اُنہیں بولنے نہیں دیتا تھا لیکن ان کے چہروں سے اور انداز سے اپنی حکومت سے بیزاری ٹپکتی تھی۔

دو چار دنوں میں ہی پاکستان کے شہریوں اور فوجیوں نے ثابت کر دیا کہ پاکستان تر نوالہ نہیں اور پاکستانی اپنے ملّی وقار پر جانیں قربان کرنا جانتے ہیں۔

*

بھارت کے وزیراعظم نے فائر بندی کا جو واویلا بپا کر دیا تھا، اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ بھارت کو اپنے بکتر بند ڈویژن پر بڑا ہی ناز تھا۔ اس ڈویژن کے جو ٹینک تباہ ہوئے اور جو افسر پکڑے گئے تھے، ان سے آپریشن آرڈر برآمد ہوئے جو بھارتی ہائی کمان نے اپنے ڈویژنوں، بریگیڈوں اور یونٹوں کو جاری کیے تھے۔

اس آپریشن کو بھارتیوں نے "آپریشن نیپال" کا نام دیا تھا۔ اس کے مطابق انڈین آرمی کے نمبر ایک بکتر بند ڈویژن کو لاہور پر حملے سے اڑتالیس گھنٹے بعد سیالکوٹ سیکٹر پر "بُل ڈوزر کی طرح" یلغار کرنی تھی۔ اس آپریشن آرڈر میں لکھا گیا تھا کہ سیالکوٹ شہر پر حملے کا دھوکہ دیا جائے گا اور بکتر بند ڈویژن کے تیز رفتار ٹینک پاک آرمی کے مورچوں کو کچلتے اور روندتے ہوئے چونڈہ کے راستے آگے نکل جائیں گے اور شاہراہِ پاکستان (جی۔ ٹی روڈ) کو گوجرانوالہ اور وزیر آباد کے درمیان کاٹتے ہوئے چناب تک کے علاقے میں پہنچیں گے۔

بھارتی ہائی کمانڈ نے اپنے "آپریشن نیپال" کی کامیابی کا عرصہ بہتّر (۷۲) گھنٹے مقرر کیا تھا۔

بھارتیوں کو بجا طور پر توقع تھی کہ اُن کا "آپریشن نیپال" اتنے کم عرصے میں کامیاب ہو جائے گا۔ انہیں معلوم تھا کہ پاکستان کے پاس صرف ڈیڑھ سو ٹینک ہیں۔ بھارت نے نو ٹینک رجمنٹوں سے حملہ کیا

تھا۔ ہر رجمنٹ میں ۶۴ ٹینک تھے۔ اس حساب سے ٹینکوں کی تعداد ۵۷۶ تھی۔ یہ کُل تعداد نہیں تھی جنگ میں جتنے ٹینک تباہ ہوتے تھے اُتنے ہی نئے ٹینک آجاتے تھے۔ اس طرح چونڈہ کی ٹینکوں کی جنگ میں بھارت نے کم وبیش ایک ہزار ٹینک استعمال کیے تھے۔

انڈین آرمی کے ان ٹینکوں کے ساتھ دو انفنٹری ڈویژن، ایک مؤنٹین ڈویژن اور ایک موٹر بریگیڈ تھا۔ اس بکتر بند اور پیادہ لشکر کی نفری پچاس ہزار تھی۔ اسے امدادی اور حفاظتی گولاباری دینے کے لیے توپ خانے کی ۶۴ بیٹریاں تھیں۔ ہر بیٹری میں چھ سے آٹھ توپیں تھیں۔ یعنی توپوں کی تعداد پانچسو کے لگ بھگ تھی۔ فضائی تحفظ اور آتشیں چھاتہ مہیا کرنے کے لیے بھارت کا جدید فضائی بیڑہ تھا۔

اس ہیبت ناک لشکر کا حملہ روکنے کے لیے پاک فوج کے پاس بمشکل ڈیڑھ سو ٹینک تھے۔ ان میں کئی ایک پرانی قسم کے شرمن ٹینک تھے جو ٹریننگ کے استعمال کے قابل تھے ٹینکوں کی جنگ کے قابل نہیں تھے۔ ٹینک رجمنٹوں کی اور پیادہ نفری ملاکر نو ہزار بنتی تھی۔ ان نو ہزار سرفروشوں کو پچاس ہزار بکتر بند اور پیادہ لشکر کا حملہ روکنا تھا۔

بھارت نے یہ حملہ اپنے پلان کے مطابق لاہور پر حملے سے اڑتالیس گھنٹے بعد ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح کیا — اور حملہ پورے بکتر بند ڈویژن سے کیا — پہلے روز پاکستان کی صرف ایک ٹینک رجمنٹ اور گوشت پوست کے پیادہ انسانوں نے لوہے کے آگ اُگلتے "سیاہ ہاتھیوں" کا مقابلہ کیا اور دشمن پر ثابت کر دیا کہ وہ بہتّر گھنٹوں کے اندر سیالکوٹ سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔

اس کے بعد چونڈہ، بدیانہ، پھلورا اور جیسوراں کا وسیع میدان ٹینکوں کی ایک تاریخی جنگ کا میدانِ جنگ بن گیا۔ اسے ٹینکوں کی جنگ کہا گیا ہے لیکن یہ بھارت کے ٹینکوں اور پاکستان کے انسانوں کی جنگ تھی۔ پاکستان کا جو ٹینک تباہ ہو جاتا تھا اُس کی جگہ کوئی ٹینک نہیں آتا تھا۔ نہ ٹینکوں کی کمی پوری ہوتی تھی نہ انسانوں کی۔

میلوں وسیع میدان ٹینکوں کی اڑائی ہوئی گرد اور گولاباری کے گرد وغبار اور جلتے ٹینکوں کے سیاہ دھوئیں میں چھپ گیا تھا۔ سُورج طلوع ہوتا اور گرد وغبار میں اپنا سفر پورا کر جاتا تھا۔ اگر موت کا کوئی رنگ ہے تو وہ سورج کی روشنی کا رنگ تھا — پھیکا سا رنگ جس میں سیاہی مائل سرخی کی آمیزش تھی۔

اس گرد وغبار میں بھارت کے ٹینک رخ بدل بدل کر پاکستان کی دفاعی پوزیشنوں پر حملے کرتے تھے اور پاکستان کے جیالے سپوت ان کے قریب جا جاکر ان پر راکٹ لانچر فائر کرتے تھے۔ پاکستان کا ایک ایک ٹینک چار چار پانچ پانچ ٹینکوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔

اس گرد وغبار میں انسان ٹینکوں تلے کچلے جا رہے تھے جسموں کے پرخچے اُڑ رہے تھے۔ روز بروز اپنی اور دشمن کی پوزیشنیں گڈمڈ ہوتی جا رہی تھیں۔ وہاں گھوم پھر کر لڑنے والی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ توپخانہ اگلے مورچوں سے پیچھے ڈھکی چھپی پوزیشنوں میں ہوتا ہے لیکن چونڈہ کی جنگ میں ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آئیں کہ توپ خانے کی بعض بیٹریاں دشمن کے ٹینکوں کے آمنے سامنے جاکر لڑیں۔

یہ جذبے اور جنگی قوت کی جنگ تھی۔ پاکستانیوں کے پاس جذبہ اور بھارتیوں کے پاس جنگی قوت تھی۔ پاکستانیوں کو اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔ بھارتیوں کو اپنی جنگی قوت پر ناز تھا۔

پاکستانیوں نے جنگِ قادسیہ کی یاد تازہ کر دی جس میں زرتشت زِرہ پوش ہاتھی مسلمانوں کو کچلنے کے لیے لائے تھے۔ قادسیہ میں بھی کفّار اور مسلمانوں کی جنگی طاقت اور نفری کا یہی تناسب تھا جو ستمبر ۱۹۶۵ء میں چونڈہ میں تھا۔ قادسیہ میں پیادہ مسلمانوں نے کفّار کے زرہ پوش ہاتھیوں کی سُونڈیں کاٹ ڈالیں اور کفّار کے لشکر کو شکست فاش دی تھی۔

چونڈہ کے میدانِ جنگ میں جو پھیلتا چلا جا رہا تھا، بھارتیوں کو پہلی شکست یہ ہُوئی کہ بہتّر گھنٹے کبھی کے گزر چکے تھے مگر دشمن کا "آپریشن نیپال" ابھی اُس راستے سے بہت دُور تھا جو سیالکوٹ سے گزر کر گوجرانوالہ اور وزیرآباد کے درمیان شاہراہِ پاکستان تک جاتا تھا۔

*

بھارتیوں کے ٹینک تباہ ہوتے چلے جا رہے تھے اور ان کی جگہ نئے ٹینک آ رہے تھے۔ بھارتیوں کے حملوں کی شدّت قہر بنتی جا رہی تھی۔ وہ "آپریشن نیپال" کی کامیابی کے لیے ٹینکوں اور انسانوں کی بے دریغ قربانی دے رہے تھے۔ اُن کے پاس گولہ بارود کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ پاکستانیوں پر صحیح معنوں میں آگ برسا رہے تھے۔

۱۳ ستمبر تک چونڈہ کی جنگ تنور بن گئی تھی جس میں انسان جل رہے تھے۔ پاکستانی ٹینکوں کی کمی کو ٹینک شکار پارٹیوں کے ذریعے پورا کر رہے تھے۔ چند ایک جوانوں کی پارٹیاں رات کو دشمن کے مورچوں کے پیچھے اُس جگہ تک چلی جاتی تھیں جہاں ٹینک کھڑے ہوتے تھے۔ انہیں راکٹ لانچروں سے تباہ کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ شب خون بڑا ہی دلیرانہ اقدام تھا۔ دشمن کے مورچوں کے عقب میں جاکر تباہی مچانا اور زندہ واپس آجانا بڑا ہی محال تھا۔ اس میں بہت سے جوانوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں لیکن اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔

چونڈہ کی ٹینکوں کی جنگ ایک عنوان ہے جس سے شجاعت اور جذبہ حب الوطنی کی اتنی ہی سچی اور ولولہ انگیز داستانوں نے جنم لیا جتنے افسر اور جوان اس جنگ میں لڑے تھے۔ ان کے جسم نہیں ان کی روحیں لڑ رہی تھیں۔ انسان مسلسل کئی دن اور راتیں، ایک لمحہ آرام کیے بغیر نہیں لڑ سکتا لیکن پاک فوج لڑی اور جوانوں نے میڈیکل سائنس کو حیرت میں ڈال دیا۔

۱۹ ستمبر کے روز بھارتیوں کے بکتر بند ڈویژن کی حالت یہ تھی کہ رجمنٹوں کے بچے کھچے ٹینک اکٹھے کر کے ایک پوری رجمنٹ نہیں بنتی تھی۔ دشمن کا "آپریشن نیپال" چونڈہ کے میدان میں تباہ وبرباد ہو چکا تھا۔ یہ آپریشن کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ کا بیکار سا مجموعہ بن گیا تھا جسے بھارت کے بکتر بند ڈویژن کے افسر اپنے تباہ شدہ ٹینکوں میں ہی پھینک گئے تھے۔

۱۹ ستمبر کا دن وہ وقت تھا جب پاک فوج کو دشمن پر جوابی حملہ کرنا تھا۔ پاکستان کے ڈویژن کمانڈر نے جس نے اتنی قلیل نفری سے بھارت کے بکتر بند ڈویژن کو چکنا چُور کر دیا تھا، جوابی حملے کا پلان بنایا اور ہائی کمانڈ سے کہا کہ اُسے حملے کی اجازت دی جائے۔ اُس نے یقین دلایا کہ دشمن کے پاس پلّے کچھ نہیں رہا اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کے قابل نہیں۔

پاکستان کی ہائی کمانڈ صرف ایک آدمی تھا جو ملک کا صدر بھی تھا، افواج کا سپریم کمانڈر بھی تھا اور جو آمرِ مطلق تھا اور وہ سیاسی لیڈری کا دعویٰ بھی کرتا تھا۔ اُس نے چونڈہ سیالکوٹ سیکٹر میں دشمن پر جوابی حملے کا

پلان نامنظور کر دیا اور دلیل یہ دی کہ سرحد پار کر کے کسی کے ملک میں لڑنا ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔

صرف جرنیل نہیں، اُس کے بریگیڈیئر اور یونٹوں کے کمانڈر بھی جوابی حملے کے لیے تیار تھے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ بھارتیوں کو بھارت کے اندر جتنی دور تک چاہیں دھکیل کر لے جا سکتے ہیں لیکن وہ پٹھانکوٹ پر قبضہ کر کے وہیں رُک جائیں گے۔ اس سے کشمیر بھارت سے کٹ جائے گا۔

اس خودساختہ فیلڈ مارشل اور سپریم کمانڈر نے چھمب سیکٹر میں ایک بڑی ہی نقصان دہ حماقت کی تھی۔ اُس نے اس کیفیت میں کمانڈ تبدیل کر دی تھی جب پاکستان اور آزاد کشمیر کے ٹروپس بڑی کامیاب پیش قدمی کر رہے تھے اور دشمن بڑی بُری حالت میں پسپا ہو رہا تھا۔ سکیم یہ تھی کہ اکھنور پر قبضہ کر کے کشمیر کو بھارت سے کاٹ دیا جائے۔ مقبوضہ کشمیر میں انڈین آرمی کی جو ڈیڑھ دو لاکھ فوج تھی اُسے کمانڈو فورس نے نقل و حرکت سے معذور کر رکھا تھا۔ مقبوضہ کشمیر کشمیریوں کے ہاتھ آگیا تھا مگر پیش قدمی کرتے ہوئے ٹروپس کو روک کر کمانڈ تبدیل کرنے میں جو تیرہ گھنٹے ضائع کر دیئے گئے، اس عرصے میں دشمن نے اکھنور کے دفاع کو مضبوط کر لیا۔ اب ہمارے ٹروپس آگے بڑھے تو پیش قدمی ناممکن نظر آنے لگی۔ پھر دشمن نے لاہور اور تیسرے روز سیالکوٹ سیکٹر پر حملہ کر دیا۔

اب چونڈہ کے میدان میں دشمن کے آہنی اور آتش فشاں غرور کو پاکستان کے مجاہدین سرفروش نے اُسی کے خون میں ڈبو دیا تو کشمیر کو بھارت سے کاٹنے کا ایک موقع پیدا ہو گیا۔ وہ یہ تھا کہ دشمن کے پیچھے پیچھے بکتر بند اور پیادہ ڈویژنوں پر حملہ کر کے پٹھانکوٹ پر قبضہ کر لیا جائے لیکن آمریت اپنی تمام لعنتوں کے ساتھ راستے میں حائل ہو گئی۔ دشمن پاکستان کی سرحد کے اندر بیٹھا زخم چاٹتا رہا اور پاک فوج دانت پیستی رہی —— سانپ اس قدر زخمی تھا کہ بھاگنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا لیکن اسے بھاگنے اور پھر کبھی آکر ڈسنے کا موقع دے دیا گیا۔

*

قوم خون اور مال کی قربانیاں دے رہی تھی۔ دیہات کے لوگوں نے آپس کی دشمنیاں ملتوی کر دی تھیں۔ اُن کی ذہنیتوں میں انقلاب آگیا تھا۔ اُنہوں نے اپنے دشمنوں کو خون معاف کر دیئے تھے۔ چور اچکّوں نے بھی اپنا مجرمانہ کاروبار روک دیا تھا۔

تمام محاذوں پر پاک فوج دشمن پر چھا گئی تھی۔ دشمن نے دریائے بیاس تک کا علاقہ خالی کر دیا تھا۔ جالندھر خالی ہو گیا۔ فیروزپور سے ہندو اور سکھ بھاگ گئے تھے۔ پٹھانکوٹ اور گورداسپور خالی ہو رہے تھے۔

فضا میں پاک فضائیہ کی حکمرانی تھی۔ انڈین ایئر فورس پاکستان کے مٹھی بھر شاہبازوں کے ہاتھوں اس قدر نقصان اٹھا چکی تھی کہ پاکستان کی فضا میں انڈین ایئر فورس کا کوئی طیارہ نظر نہیں آتا تھا۔ ١٠ ستمبر کے روز بھارت کے تین طیارے لاہور کی فضا میں آئے۔ پاک فضائیہ کے تین شاہباز جو قصور سیکٹر پر اُڑ رہے تھے، لاہور پر آ گئے۔ لاہور کے تاریخی شہر کی فضا میں ایک تاریخی معرکہ لڑا گیا۔ شاہبازوں نے انڈین ایئر فورس کے دو طیارے گرا لیے۔

پاک بحریہ نے سومنات کے قریب دوارکا میں بھارتی نیوی کا گولا بارود کا ذخیرہ اور دیگر سامان کا بہت بڑا گودام ساحل کے قریب جا کر بحری جہازوں کی توپوں سے تباہ کر دیا۔ پاک بحریہ جنگ کے پہلے

روز اس دلیرانہ انداز سے کھلے سمندر میں نکل گئی کہ انڈین نیوی کے جنگی جہاز سامنے ہی نہ آتے۔

پاکستان کی ساڑھے چار ڈویژن فوج نے، مختصر سی فضائیہ اور بحریہ نے بھارت کا حملہ نہ صرف روک دیا بلکہ اس کے اکیس ڈویژنوں، لڑاکا بمبار طیاروں اور جنگی بحری جہازوں کو بڑے لمبے عرصے تک اٹھنے کے قابل نہ چھوڑا۔

پاکستان "اللہ اکبر" اور "پاکستان زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ ایک بے مایہ اور اپنے حکمرانوں کے ہاتھوں فریب خوردہ قوم نے جسے انڈین انٹیلی جنس نے نیم مُردہ قوم کہا تھا، اُس دشمن کی کمر توڑ ڈالی جو پاکستان کو بھارت میں مدغم کرنے کے جنون میں اٹھارہ برسوں میں جنگی دیو بن گیا تھا۔

لیکن ——

جب اسلام اور پاکستان کا دشمن گھٹنے ٹیک چکا تھا اور مقبوضہ کشمیر پر اس کے پنجے کی گرفت بالکل ڈھیلی پڑ چکی تھی اور جب پاکستان کی فوج، فضائیہ اور بحریہ اُسے اس حالت میں لے آئی تھیں کہ اُس سے اپنی شرطیں منوائی جا سکتی تھیں، فائر بندی کر دی گئی۔

غم و غصّے کی لہر ساری قوم میں دوڑ گئی لیکن اس اعلان نے سب کو خاموش رکھا کہ تاشقند میں روس کے حکمرانوں کی نگرانی میں پاکستان اور بھارت کے حکمرانوں کی کانفرنس ہو گی۔ ملک میں ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے —— "ہمارے حکمران بھارت سے اپنی شرطیں منوائیں گے.... جنگ پھر شروع ہو جائے گی.... ہم ہندو سے سن سنتالیس کا حساب چکائیں گے۔"

مگر ——

قوم کے جذبوں پر رُوس کی برف ڈال دی گئی۔ تاشقند میں ایک میز پر جیتی ہوئی بازی ہار دی گئی....

اور اسے اعلانِ تاشقند کہا گیا۔

قرآن کا فرمان ہے، شہیدوں کو مردہ نہ کہو۔

حکمران نے فرمان جاری کیا، شہیدوں کو دفن کر دو۔

جنگِ ستمبر کا ذکر ممنوع قرار دے دیا گیا۔

ریڈیو پاکستان سے ہندو کو "ہمسایہ ماں جایا" کہا گیا۔

جنگی ترانے ممنوع قرار دے دیئے گئے۔

سارے ملک پر، قوم کے بچے بچے پر ایک سوال زہریلی بھڑوں کی طرح منڈلانے اور بھنبھنانے لگا —— "ایسا کیوں ہُوا؟ ایسا کس نے کیا؟ ہمارے پاؤں میں دشمن کی گری ہوئی تلوار دشمن کو کیوں دے دی گئی ہے؟"

اور گلی کوچوں سے بھی، سکولوں، کالجوں اور دفتروں سے بھی، پاکستان کی مٹی سے بھی اور ہواؤں سے بھی آوازیں اٹھنے لگیں —— "ہم ہندو کو دوست نہیں کہیں گے.... ہمیں اعلانِ تاشقند منظور نہیں.... ہندو نے سن سنتالیس میں ہماری ستر ہزار بیٹیاں اغوا کر لی تھیں۔ اب وہ سرحدی دیہات سے ہماری بیٹیوں کو اٹھا لے گیا ہے.... شہیدوں کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا۔"

*

ان آوازوں میں قہر بھرتا چلا گیا۔ پھر یہ آوازیں نعرے بن گئیں اور پھر یہ نعرے سڑکوں پر آ گئے ___ یہ طلباء کے جلوس تھے جو اعلانِ تاشقند کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ لاہور کے طلباء کا جلوس شاہراہِ قائدِ اعظم پر گورنر ہاؤس کی طرف جا رہا تھا۔ قوم کے یہ بچے گورنر ہاؤس کو آگ نہیں لگانا چاہتے تھے۔ گورنر ہاؤس کو لوٹنے کا بھی ان کا ارادہ نہ تھا۔ وہ گورنر تک اپنے جذبات پہنچانا چاہتے تھے مگر آمریت پوری آب و تاب اور پورے غیض و غضب سے عمل میں لائی جا رہی تھی۔ فرمانِ زباں بندی جاری ہو چکا تھا۔ قوم کے جذبے اُن بڑی طاقتوں کے قدموں میں پھینک دیئے گئے تھے جنہیں ہمارے حکمرانوں نے اپنا اَن داتا بنا رکھا تھا۔ پاکستانی قوم کو اپنے مِلّی وقار اور اپنی آزادی کے تحفّظ اور اپنے ملک کے دفاع کے لیے ان بڑی طاقتوں کا محتاج بنا دیا گیا تھا۔

آمریت یہ برداشت نہیں کیا کرتی کہ اپنے ملک سے اُس کے خلاف آوازا ٹھے۔ یہ آواز خواہ برحق ہو۔ کلمۂ حق آمریّت کے کانوں پر گراں گزرتا ہے۔ طلباء کا جلوس گورنر ہاؤس کی طرف جا رہا تھا اِسے ریگل چوک میں روک لیا گیا۔ لڑکوں نے پولیس کی رکاوٹ کو ہٹانے کے لیے اینٹوں اور پتھروں کا استعمال کیا۔ پولیس نے آنسو گیس کے گولے فائر کرنے شروع کر دیئے۔

وہی لاہور جو اپنی بڑی توپوں "شیرنی" اور "رانی" کے دھماکوں سے گونجتا، گرجتا رہتا تھا، اب آنسو گیس کے گولوں سے لرز رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اپنی اُن توپوں کا رُخ جو دشمن پر قہر برساتی رہتی تھیں، اپنی قوم کی طرف ہو گیا ہو۔ آنسو گیس کے گولوں سے اُن پاکستانیوں کے بھی آنسو بہ نکلے جو گیس کی زد سے دُور تھے۔ لاہور کی غیور فضا اشک بار ہو گئی۔

لڑکوں کے جلوس کو صرف منتشر ہی نہ کیا گیا بلکہ انہیں گھیر گھیر کر ان میں سے جتنے ہاتھ آئے انہیں پولیس کی گاڑیوں میں ڈال کر لے گئے۔ ان میں سے بعض کو جن پر لیڈر شپ کا شُبہ تھا، شاہی قلعے کے تہ خانے میں لے گئے۔ باقی کو حوالاتوں میں رکھ کر زدوکوب کیا گیا۔

*

ارشد دفتر سے جلدی گھر آ گیا۔ وہ شاہراہِ قائدِ اعظم کا ہنگامہ دیکھ آیا تھا۔ اُس نے آتے ہی اپنے بیٹے طاہر پرویز کے متعلق پوچھا۔

"ابّا جان اُسے دیکھنے چلے گئے ہیں" ___ طاہرہ نے کہا۔ وہ بہت پریشان تھی ___ "تھوڑی دیر ہُوئی ابّا جان (ارشد کا باپ) گھر آئے اور کہنے لگے کہ مال روڈ پر لڑکوں پر فائرنگ ہو رہی ہے۔ طاہر گھر نہیں آیا تھا۔ ابّا جان اُسے ڈھونڈنے چلے گئے ہیں۔"

ارشد دوڑتا باہر نکل گیا۔ طاہرہ دوڑتی ہوئی کوٹھی سے نکلی اور باہر والے گیٹ میں جا کھڑی ہُوئی۔ ارشد کی ماں اور اُس کی بھابی نکل آئیں۔ ان کے قریب سے لوگ گزر رہے تھے۔ وہ مال روڈ کے ہنگامے کی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ یہ لوگ غم و غصّے اور احتجاج سے پھٹے جا رہے تھے۔ تینوں عورتیں ہر گزرنے والے کو دیکھتی اور کان کھڑے کر کے سنتی تھیں۔ گزرنے والے ایک ایک دو دو فقرے پیچھے چھوڑ جاتے تھے:

"یہ بھی ہونا تھا۔ اپنے ملک میں یہ بھی ہونا تھا۔"

"ابھی تو شہیدوں کا خون بھی خشک نہیں ہُوا۔"

"سب سیاست ہے جی، سب سیاست ہے۔ دیکھا کہ اپنی کرسی خطرے میں ہے تو مشین گنوں کے منہ انڈیا سے موڑ کر اپنی رعایا کی طرف کر دیئے۔"

"لاہور سے ابھی بارُود کی بُو نہیں نکلی اور کہتے ہیں کہ اپنے دشمن کو دوست بنا لو۔"

"یہی مال روڈ تھی جہاں ۴۷-۱۹۴۶ء میں انہی جیسے طالب علم تحریکِ پاکستان کے جلوس نکالتے تھے اور انگریزوں کی پولیس نے ان پر لاٹھیاں برسائی اور گولیاں چلائی تھیں۔"

لوگ طاہرہ کے سامنے سے گزرتے رہے۔ طاہرہ اُن کی باتیں سنتی رہی۔ سُورج آگے بڑھتا گیا۔ طاہرہ، ارشد کی ماں اور بھابی ارشد، اُس کے بیٹے اور اُس کے باپ کی راہ دیکھتی رہیں۔ آخر تھک ہار کر اندر چلی گئیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا جب ارشد اور اُس کا باپ واپس آئے۔ طاہر پرویز اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ ارشد کے باپ نے اپنے اثر و رسوخ سے معلوم کر لیا تھا کہ طاہر پرویز گرفتار ہو چکا ہے اور اُسے ایک تھانے میں لے گئے ہیں۔ ارشد اور اُس کا باپ وہاں چلے گئے۔ تھانیدار نے اُنہیں بتایا کہ طاہر پرویز ولد ارشد اسی حوالات میں ہے لیکن ملنے کی اجازت نہیں۔

"حوالات میں کیوں؟" ___ طاہرہ نے تڑپ کر پوچھا ___ "اُس نے کیا جُرم کیا ہے؟"

"اُس نے پاکستان کے بادشاہ کا فرمان ماننے سے انکار کیا ہے" ___ ارشد نے جلے کٹے لہجے میں کہا ___ "اُس نے اعلانِ تاشقند کی بے حُرمتی کی ہے۔"

طاہرہ پر خاموشی طاری ہو گئی جیسے اُسے سکتہ ہو گیا ہو۔ ارشد کی ماں کے آنسو بہنے لگے۔

"میرے طاہری کا اب کیا بنے گا؟" ___ ارشد کی ماں نے روتے ہُوئے پوچھا۔

"صرف تمہارا طاہری نہیں، آج نہ جانے کتنے طاہری حق اور صداقت کی آواز زبان پر لانے کے جرم میں حاکمِ وقت کے ظلم اور تشدّد کا نشانہ بنے ہوتے ہیں" ___ ارشد کے باپ نے کہا ___ "حوصلہ قائم رکھو۔ اللہ مالک ہے۔"

*

اعلانِ تاشقند پر وہی پاکستانی خوش تھے جو بھارت کے ایجنٹ تھے، اور وہ زر پرست تاجر خوش تھے جن کی ناجائز منافع خوری بند ہو گئی تھی۔ ان کے سوا ہر ایک پاکستانی بھڑکا ہُوا تھا۔ جنگ ختم ہونے کی سب سے زیادہ خوشی فوجیوں کو ہونی چاہیئے تھی۔ اُنہوں نے سترہ دن اور رات ایک لمحہ آرام کیے بغیر جنگ لڑی تھی۔ اُن کے جسم ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ اُن کی ہڈیاں دُکھ رہی تھیں۔

اُن کی ذہنی اور جذباتی حالت اور زیادہ مخدوش تھی۔ اُنہوں نے اپنے شہید ساتھیوں کے جسموں کے پرخچے اڑتے دیکھے تھے لیکن اُن پر دہشت طاری نہیں ہُوئی۔ اُنہوں نے یہ نہ سوچا کہ جنگ جاری رہی تو اُن کے بازو، ٹانگیں اور سر جسموں سے کٹ کر گیدڑوں اور گدھوں کی غذا بن جائیں گے۔ انہیں یہ خیال بھی نہ آیا کہ وہ عمر بھر کے لیے معذور، بیکار اور اندھے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کی بجائے وہ جذبۂ انتقام سے پھٹے جا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اُن کا خونی دشمن پہلی بار ان کے سامنے آیا تھا اور ہماری حکومت نے اُسے مکمل تباہی سے بچا لیا ہے۔

ان فوجیوں میں کیپٹن اصغر بھی تھا۔ وہ جنگ میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے زخم تو ٹھیک ہو گئے تھے لیکن کندھے کے قریب پیٹھ پر جو زخم آیا تھا اس سے کوئی اہم رگ کٹ گئی تھی۔ وہ اپنے بازو میں کھچاؤ سا محسوس کرتا تھا۔ ریوالور، رائفل، سٹین گن وغیرہ پر اُس کے اس ہاتھ کی گرفت پوری نہیں آتی تھی۔ وہ ہر روز سی۔ ایم۔ ایچ جاتا اور ایک نرسنگ سپاہی نیورو سرجن کی ہدایت کے مطابق اُس کے کندھے، پیٹھ اور بازو کی مالش کرتا تھا۔ اُس نے ڈاکٹروں کی بہت منّت سماجت کی تھی کہ اُسے محاذ کے لیے فِٹ لکھ دیں لیکن ڈاکٹروں نے یہ ذمہ داری قبول نہ کی۔

اصغر دانت پیستا اور تڑپتا رہا۔ اُس جیسے جتنے کیپٹن اور لیفٹیننٹ کسی نہ کسی وجہ سے محاذ پر نہیں جا سکے تھے وہ سب مٹھیاں بھینچتے، غصّے سے اپنا خون جلاتے اور بڑے افسروں کی منّتیں کرتے تھے کہ انہیں محاذ پر بھیجا جائے۔ جب راولپنڈی پر بم گر رہے تھے تو یہ نوجوان افسر عسکری جذبے اور غصّے سے پھٹے جا رہے تھے۔ وہ تڑپتے رہے اور جنگ ختم ہو گئی۔

ملک رجب علی کی ٹانگ کاٹ دی گئی تھی۔ اُسے اب کم و بیش تین مہینے ہسپتال میں رہنا تھا۔ سلمٰی وہیں تھی۔ اس کی راتیں ہسپتال میں رجب علی کے کمرے میں گزر رہی تھیں۔ رجب علی خوش تھا۔ بہت ہی خوش تھا کہ اُس نے ملک و ملّت کی آبرو کی خاطر اپنے جسم کی قربانی دے کر اپنے گناہ بخشوا لیے ہیں۔ پہلے روز جب اُس کی ٹانگ کاٹ کر آپریشن تھیٹر سے کمرے میں لایا گیا تھا تو سلمٰی اتنی روئی تھی کہ اُس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

"سلمٰی!" — رجب علی نے اُسے کہا — "اللہ کی ذات نے مجھے بہت بڑا انعام دے دیا ہے۔ مجھے جو روحانی مسرت عطا ہوئی ہے، اس سے بڑا انعام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ آج جلیل مرحوم نے بھی مجھے خون معاف کر دیا ہے۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ ڈرتا ہوں تمھارے آنسو میری روح سے مسرت کو دھو ڈالیں گے۔ اب مجھے تمھاری مسکراہٹوں کی ضرورت ہے۔ میں لنگڑا نہیں ہُوا۔ اللہ کے نام پر ٹانگ کٹوا کر میں زندگی کے سیدھے راستے پر چلنے کے قابل ہو گیا ہوں۔"

کیپٹن اصغر ہر شام رجب علی کے پاس آیا کرتا اور خاصا وقت اُس کے ساتھ گزارتا تھا۔ رجب علی نے اصغر سے دو تین مرتبہ کہا تھا — "اصغر یار! دل پر یہ بوجھ نہ ڈال لینا کہ باپ لنگڑا ہو گیا ہے" — اُس کے دوست اسے دیکھنے آتے تو افسوس کرتے تھے۔ رجب علی نے ہر دوست سے کہا تھا — "افسوس نہ کرو۔ میں لنگڑا تو نہیں ہو گیا۔"

جس شام اعلانِ تاشقند کا اعلان ہُوا اور کہا گیا کہ اس معاہدے کے مطابق دونوں ملک اپنی فوجیں سرحدوں سے ہٹا لیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ بند کر دیں گے، اس شام اصغر ملک رجب علی کے پاس گیا اور بولا — "ابّا جان! آج آپ لنگڑے ہو گئے ہیں۔"

رجب علی ٹرانسسٹر پاس رکھے اعلانِ تاشقند کی خبر سن رہا تھا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس نے آہ بھر کر اصغر سے کہا — "ہمارا حساب کتاب اپنے اللہ کے ساتھ ہے، صدرِ مملکت کے ساتھ نہیں۔"

سلمٰی نے تین مہینوں سے آنسو روک رکھے تھے۔ اُس شام اُس کے اشکوں کے بند ٹوٹ گئے۔

*

ایک تانا بانا اور بھی تھا جو کیپٹن اصغر کے ارد گرد بُنتا تنتا جا رہا تھا۔ ملک ناصر کی بیٹی کو اصغر سے محبت نہیں عشق تھا۔ وہ اصغر کو دیوانہ وار چاہتی تھی۔ اس محبّت پر اُس نے اپنی طبیعت کی شوخی اور شرارت پسندی قربان کر دی تھی۔ اصغر کی خاطر اُس نے اپنے باپ کو پکڑوا دیا تھا۔ دشمن کے جاسوس کی بیٹی پاکستان کی بیٹی بن گئی تھی۔ وہ اصغر کو اپنی ملکیّت سمجھتی تھی مگر اُس کی کوٹھی میں چار پانچ مہینوں سے اُس جیسی نوجوان، اُسی جیسی حسین اور شوخ لڑکی رہ رہی تھی — وہ آسیہ کی بیٹی شنازی تھی۔

شنازی نے بھی پاکستان کی خاطر، یا رجب علی کی خاطر یہ قربانی دی تھی کہ اپنی ماں کے خلاف گواہی دی تھی اور اُس نے ان دو تین پاکستانی افسروں کو پکڑوا دیا تھا جن پر اس نے اپنے حسن وجوانی کا طلسم طاری کر کے بڑے قیمتی راز لیے تھے اور پھر ان افسروں کو اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ وہ ملک ناصر کے جاسوسی رنگ میں شامل ہو گئے تھے۔

اپنی ماں کو پکڑوا دینا جب کہ دنیا میں ماں کے سوا اُس کا اپنا کوئی بھی نہ تھا، معمولی سا ایثار نہ تھا، اب وہ بن تنہا، بے آسرا اور بے سہارا رہ گئی تھی۔ شمیم نے اُسے اپنی کوٹھی میں رکھ لیا اور اصغر اس کی دلجوئی کی خاطر اُسے اپنے قریب رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اصغر کی جذباتی کیفیّت نارمل نہیں رہی تھی وہ جلدی صحت یاب ہو کر ایک اور کمانڈو مشن پر جانا چاہتا تھا مگر نہ جا سکا۔ وہ کسی محاذ پر لڑنے کو بیتاب تھا۔ اُس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ پھر فائر بندی ہو گئی۔ اُس کی جذباتی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اکثر شک ہوتا تھا کہ وہ نارمل نہیں کبھی اپنے آپ میں گم ہو جاتا اور اس کیفیّت میں اُس کے ساتھ کوئی بات کرتا تو وہ جھنجھلا کر بولتا تھا۔

اعلانِ تاشقند نے تو اُسے نفسیاتی مریض بنا دیا۔ وہ نوجوان اور ذہین تھا۔ ہو سکتا ہے سیاست کا تقاضہ یہی ہو کہ دشمن کے ساتھ تصادم کی کیفیّت ختم کر کے دوستی کا معاہدہ کرنا ضروری ہو مگر اصغر سیاست کو سمجھنے اور قبول کرنے کی عمر میں نہیں تھا۔ اُس کے ساتھی اُس کے سامنے شہید ہو گئے تھے۔ وہ ان کی لاشیں نہیں لا سکا تھا۔ دشمن نے اُس کے ملک پر اس نیّت سے حملہ کیا تھا کہ اس ملک کو بھارت میں شامل کر لیا جائے۔ اس دشمن کے ساتھ وہ فیصلہ کُن معرکہ لڑنے کا تہیّہ کیے ہُوئے تھا — اُس پر جذبات کا غلبہ تھا۔

اُس کی ماں بھی راولپنڈی میں تھی۔ اُس کا زیادہ تر وقت ہسپتال میں گزرتا تھا لیکن رہتی شمیم کی کوٹھی میں تھی۔ اُس نے اصغر کو بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ جذبات سے نکل کر عقل سے سوچے۔ بعض حقائق بہت ہی تلخ ہوتے ہیں لیکن ان کا ایک ہی علاج ہوتا ہے کہ انہیں قبول کر لیا جائے مگر اصغر سوجھ سمجھ اور عقل کی سرحد سے آگے چلا گیا تھا۔

اصغر سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ ایک روز وہ شمیم کے ہاں گیا تو اُس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ وہ سب سے پہلے اپنی ماں کے کمرے میں گیا۔ سلمٰی نے اُس کے ہاتھ میں سگریٹ دیکھ کر حیرت سے پوچھا، بیٹا! تم سگریٹ پینے لگے ہو؟

"میں بہت پریشان ہوں امّی!" — اصغر نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا — "آج آپ نے میرے ہاتھ میں سگریٹ دیکھا ہے، کل آپ اس ہاتھ میں شراب کی بوتل دیکھیں گی..... مجھے شہید وں

کی روحیں پریشان کرتی ہیں۔"

وہ کیپٹن تھا لیکن سلمٰی کے لیے بچّہ تھا۔ سلمٰی تیزی سے اٹھی اور اصغر کے منہ پر زنّاٹے دار تھپڑ مارا۔

"شراب؟" ——— سلمٰی نے تھپڑ مار کر کہا ——— "میں تمھارے ہاتھ میں سگریٹ برداشت نہیں کر سکتی اور تم نے شراب کا نام لیا ہے؟..... شہید اور شراب کا کیا تعلق ہے؟" ——— اُس نے اصغر کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر پاؤں تلے مسلتے ہوئے کہا ——— "تم بھول گئے ہو تم کس باپ کے بیٹے ہو۔ تم بھول گئے ہو تم پاکستان کی فوج کے کیپٹن ہو..... ہوش میں آ اصغر! سنبھال اپنے آپ کو۔"

اصغر صوفے پر بیٹھ گیا اور اُس نے سر نیچے پھینک کر چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ سلمٰی اُس کے پاس بیٹھ گئی اور اُس کا سر اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اُس نے دیکھا، اصغر رو رہا تھا۔

"تمھیں شکست نہیں ہوئی" ——— سلمٰی نے کہا ——— "تم فاتح ہو، تمھاری فوج فاتح ہے۔ دشمن پر تمھاری دھاک بیٹھ گئی ہے۔ اگر تم اعلانِ تاشقند کو شکست سمجھتے ہو تو یہ تمھارے حکمران کی شکست ہے۔ اگر تم اپنے آپ کو شکست خوردہ سمجھتے ہو تو تمھیں دشمن نے نہیں، اپنے بادشاہ نے اور اُس کی سیاست نے شکست دی ہے۔"

*

کمرے کا دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ شازی نے گزرتے ہوئے اصغر کو دیکھ لیا۔ وہ اندر آ گئی اور اصغر کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

"پھر وہی بات اصغر!" ——— شازی نے پیاری سی بے تکلّفی سے ایک ہاتھ اصغر کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا ——— "میں تو کہتی ہوں کہ اللہ نے تمھیں بچا لیا ہے۔ یہ جنگ جسے تم اپنے وطن اور اپنے مذہب کی جنگ سمجھتے تھے، یہ سیاسی بازی گروں کا کھیل تماشہ تھا۔ اپنی جوانی کو روگ نہ لگاؤ اصغر! وہ وقت آئے گا جب تم اپنے وطن کی جنگ لڑو گے۔ ہندوؤں کو جتنا میں اسی عمر میں جان گئی ہوں اتنا تم نہیں جانتے۔ ہندو مسلمان کے ساتھ دوستی نہیں کیا کرتا دوستی کا معاہدہ کیا کرتا ہے۔ ایک روز ہندو تمھیں خود للکارے گا۔"

سلمٰی ڈیڑھ ایک مہینے سے دیکھ رہی تھی کہ اصغر کو اس ذہنی کیفیّت سے صرف شازی نکال سکتی ہے۔ شازی نوجوان تھی۔ لگتا تھا اس عمر میں وہ تجربہ کار نہیں ہو سکتی لیکن وہ اپنی ماں جتنی ہوشیار تھی۔ ماں نے اُسے مردوں کی نفسیات سمجھنے کی تربیت اس وقت شروع کر دی تھی جب وہ کمسن تھی۔ وہ اب پتھروں کو پھاڑ کر ان میں سے راز نکال لیا کرتی تھی۔ اصغر کو اکھڑی ہوئی ذہنی حالت سے یا ذہنی اذیّت سے اُس نے چند مرتبہ نکالا تھا اور یہ کام اس کے لیے مشکل نہ تھا۔

اصغر کے معاملے میں وہ مخلص اور دیانتدار تھی۔ اصغر کے ساتھ اُس کا کوئی ذاتی مطلب نہ تھا۔ یہ ایک دلچسپی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اصغر شمیم کا ہے لیکن اصغر جب نارمل ذہنی حالت میں نہیں ہوتا تھا تو شمیم اُسے بہلانے اور نارمل حالت میں لانے کے لیے ذرا سی بھی کوشش نہیں کرتی تھی، بلکہ دو تین مرتبہ اُس نے اصغر سے خفگی کے لہجے میں کہہ دیا تھا کہ میرے پاس آنا ہوتا ہے تو یُوں منہ بسور کر نہ آیا کرو۔ میں تمھاری مسکراہٹوں کا اور تمھارے کِھلے ہوئے چہرے کا انتظار کیا کرتی ہوں۔

شازی کا انداز کچھ اور تھا۔ سلمٰی نے دیکھا کہ اصغر آج رو بھی رہا ہے اور اُس نے سگریٹ پینے بھی شروع کر دیے ہیں تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ شازی آ گئی تو سلمٰی کو خوشی ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ شازی اصغر کو بہلا لے گی۔

"شازی بیٹی!" ——— سلمٰی نے اُٹھتے ہوئے کہا ——— "تم اس کا موڈ درست کرو، میں چائے بنا کر لاتی ہوں" ——— اور وہ کمرے سے نکل گئی۔

"امّی معلوم نہیں کیا سمجھ رہی ہیں" ——— اصغر نے کہا ——— "تم جانتی ہو مجھے کیا غم کھا رہا ہے۔ میں بے قابو ہو جاتا ہوں۔ میں اپنے کنٹرول سے نکل جاتا ہوں۔ ہم نے اتنے خوبصورت جوان کمانڈو آپریشن میں مروا کر مقبوضہ کشمیر لے لیا تھا مگر..."

"اصغر!" ——— شازی نے اُس کے گالوں کو اپنے کنول کے پھُولوں جیسے ہاتھوں میں لے کر اور اُس کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب کر کے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ——— "میں جتنی دیر تمھارے پاس ہوں تم کمانڈو آپریشن اور مقبوضہ کشمیر سے نکل آؤ۔ اپنے شباب کی بے فکری زندگی میں واپس آ جاؤ۔ میری آنکھوں میں دیکھو..... میری آنکھوں میں اپنا چہرہ دیکھو..... دیکھو تم کتنے خوبصورت ہو۔"

اصغر نے شازی کی آنکھوں میں دیکھا۔ دونوں کے منہ ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ ان کی سانسیں ٹکرا رہی تھیں۔ شازی کی پُر شباب آنکھیں شفّاف جھیلوں کی مانند تھیں جن میں اصغر کو اپنا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

"تم تھک کر شَل ہو چکے ہو" ——— شازی نے کہا ——— "سستا لو۔ تمھیں فیصلہ کن جنگ لڑنی ہے۔ مجھے دیکھو۔ کیا ہے میری زندگی۔ میرا باپ وہ ہے جو میری ماں کا خاوند نہیں۔ ماں ہی ماں تھی۔ میں نے اُسے پاکستان پر قربان کر دیا ہے۔ میں نے تمھیں اور محاذوں کے بہت سے زخمیوں کو دیکھا تھا۔ میں نے شاید اپنی ماں کی محبّت ان پر قربان کر دی ہے لیکن اپنے ذہن کو میں نے ٹھکانے رکھا ہُوا ہے۔ میں جوان ہوں۔ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو لیکن اپنے آپ پر میرا اتنا کنٹرول ہے کہ تمھارے اور شمیم کے درمیان کبھی نہیں آؤں گی۔ تمھارے دکھ اپنے سینے میں ڈال کر اپنی مسکراہٹیں تمھیں دے دوں گی۔ شمیم تمھیں مسکراتا ہُوا دیکھنا چاہتی ہے۔"

اصغر کا سر اپنے آپ لڑھک کر شازی کے کندھے پر جا پڑا اور شازی کے چند ایک بال اصغر کے گال کو سہلانے لگے۔ سلمٰی چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں آئی تو نہ شازی چونکی نہ اصغر نے گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ان کی نیّتیں صاف تھیں۔

وہ چائے پی رہے تھے کہ نوکرانی نے آکر شازی سے کہا کہ چھوٹی بی بی اسے یاد کر رہی ہے۔ شازی چائے کی پیالی آدھی چھوڑ کر چلی گئی۔

*

وہ جب شمیم کے کمرے میں گئی تو اُس نے دیکھا کہ شمیم کے چہرے پر کوئی اور ہی تاثر ہے۔ اُس کا چہرہ ملول تھا اور اس ملال میں شاید غصہ بھی تھا۔ شازی اُس کے پاس بیٹھ گئی اور پوچھا کہ وہ کیوں اداس ہے۔

"اپنے دل کا ماتم کر رہی ہوں" ——— شمیم نے کہا ——— "میری بات غور سے سُن لو شازی! میں نے

تمہیں پناہ دی ہے۔ تمہیں اصغر نہیں دے دیا۔ میں نے تمہیں اپنے گھر میں رکھا ہے۔ اس گھر سے تمہیں نکال بھی سکتی ہوں لیکن میں ایسی گھٹیا حرکت نہیں کروں گی۔ بات سیدھی سی یہ ہے کہ میرے اور اصغر کے درمیان آنے کی کوشش نہ کرو۔"

"کس غلط فہمی میں پڑ گئی ہو شمیم!"

"میں جو دیکھ رہی ہوں وہ کہہ رہی ہوں" — شمیم نے تحکمانہ لہجے میں کہا — "میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں میں تمہیں خوش فہمیوں سے نکالنا چاہتی ہوں.... میں تمہیں آج ساتویں مرتبہ اصغر کے ساتھ ایسی حالت میں دیکھ رہی ہوں جو میں برداشت نہیں کر سکتی۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو شمیم!" — شازی نے پُرخلوص اور نرم لہجے میں کہا — "تم اچھی طرح سمجھتی ہو کہ اصغر کو جب اپنے شہید ساتھی یاد آتے ہیں تو اُس کی جذباتی حالت کیا ہو جاتی ہے۔ تم ماں باپ کی لاڈلی بیٹی ہو۔ تم ہنسنا ہنسانا جانتی ہو۔ اصغر جب نارمل ذہنی حالت میں نہیں ہوتا تو تم اُس سے دُور دُور رہتی ہو۔ اُس وقت تمہیں اُس کے قریب ہونا چاہیے۔ اس خیال سے وہ اپنے آپ کو ذہنی اذیّت میں مبتلا کر لیتا ہے کہ شہیدوں کا خون کس کھاتے میں گیا....."

"اور تم چونکہ مردوں کے جذبات کے ساتھ کھیلنا جانتی ہو اس لیے اُس کے دل پر قبضہ کرنے کے لیے اُس کی اس ذہنی کیفیّت سے فائدہ اٹھاتی ہو" — شمیم نے طنزیہ کہا — "تم میرے گھر میں رہ کر میرا گھر لُوٹ رہی ہو۔"

"معلوم ہوتا ہے تم عقل کی بات کہنے اور سننے کے موڈ میں نہیں ہو شمیم!" — شازی نے کہا — "تم مجھے اپنے گھر کا رعب دے رہی ہو۔ تم نے کہا ہے کہ تم مجھے اپنے گھر سے نکالنے کی گھٹیا حرکت نہیں کرو گی لیکن تم مجھے ایسی باتیں کہہ چکی ہو جو اس حرکت سے زیادہ گھٹیا ہیں۔"

"یہ سوچ لو کہ میں نے تمہیں گھر سے نکالنے کی گھٹیا حرکت کر دی تو کہاں جاؤ گی" — شمیم نے کہا — "ہے کوئی تمہارا یہاں؟"

"ایک نہیں سینکڑوں ہیں" — شازی نے کہا — "تم سے تو میں اچھی ہوں جسے اس ملک میں جاسوسی کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن میں اس ملک کی محبّت میں گرفتار ہو گئی۔ تمہاری باتیں سُن کر مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ میں نے اپنی ماں کو پکڑوا کر غلطی کی ہے۔ میری ماں نے پاک آرمی کی انٹیلی جنس کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم کس جنگ کی بات کرتے ہو، یہ چند دنوں کا کھیل ہے۔ ہمارا جادو اُوپر تک چلتا ہے کل نہیں تو پرسوں فائر بندی ہو جائے گی اور اسی انڈیا کو تم دوست کہو گے.... پھر میری ماں ہی سچی تھی نا!"

"میں کسی انڈیا اور کسی پاکستان کی بات نہیں کر رہی" — شمیم نے کہا — "میں اصغر کی بات کر رہی ہوں۔ تم اس پر قبضہ کر رہی ہو۔"

"تم گندے ذہن کی لڑکی ہو" — شازی نے کہا — "تمہیں اصغر سے محبّت ہے۔ اُس کے جسم سے محبت ہے.... میرے لیے اصغر جسم نہیں۔ وہ بیشمار شہیدوں کی روحوں کا مجموعہ ہے۔ اُس کے ساتھ دھوکہ ہُوا ہے۔"

"فلاسفر نہ بنو شازی!" — شمیم نے دوٹوک لہجے میں کہا — "میں آئندہ تمہیں اصغر کے ساتھ نہ دیکھوں۔"

"اگر میں تمہارا حکم ماننے سے انکار کر دوں تو؟"

"تم نہیں جانتیں میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں" — شمیم نے کہا — "میں تمہیں غائب کروا سکتی ہوں۔ تم بے گھر اور بے سہارا لڑکی....."

شازی کے طنزیہ قہقہے نے شمیم کو چُپ کرا دیا۔

"پاگل نہ بنو شمیم!" — شازی نے بڑے تحمل سے کہا — "تمہارے لمبے ہاتھ اس کوٹھی سے باہر نکلیں گے تو میری آنکھ کے ذرا سے اشارے سے کٹ جائیں گے۔ تم شاید بھول گئی ہو کہ میں کون ہوں اور کیسی پُراسرار دنیا سے آئی ہوں۔ میں بے گھر نہیں۔ میں بے سہارا بھی نہیں۔ پاکستان میں میرے بہت سے گھر ہیں، بیشمار سہارے ہیں۔ تمہارے باپ کے گروہ کی گرفتاری سے انڈیا کے وہ سارے ایجنٹ نہیں پکڑے گئے جو پاکستان میں موجود ہیں۔ میں جب چاہوں تمہیں اغوا کروا سکتی ہوں۔ تمہاری چچوڑی ہوئی برہنہ لاش اسلام آباد کی ان پہاڑیوں میں اُسی جگہ پڑی ہوگی جہاں تمہارے باپ کی کمانڈو پارٹی پکڑی گئی تھی۔ دیکھنے والوں کو صاف پتہ چلے گا کہ مرنے سے پہلے تمہارے ساتھ کیا سلوک ہُوا ہے لیکن خدا کے سوا کسی کو یہ پتہ نہیں چلے گا کہ اس جرم کے مجرم کون ہیں۔"

شمیم کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ شازی اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

ملک رجب علی کو سی۔ ایم۔ ایچ راولپنڈی میں پانچ مہینے گزر گئے تھے۔ اُس کی کٹی ہوئی ٹانگ کا زخم ٹھیک ہو گیا تھا۔ اُسے مصنوعی ٹانگ لگائی گئی تھی لیکن اُس جگہ ذرا تکلیف ہوتی تھی جہاں سے ٹانگ کاٹی گئی تھی۔ وہاں سے تھوڑا سا گوشت اور نکال لیا گیا تھا۔ یہ زخم بھی ٹھیک ہو چکا تھا۔ اب ٹانگ یہی تکلیف دیتی تھی کہ رجب علی کو اس پر اچھی طرح چلنا نہیں آتا تھا۔ اُسے اب اس وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا جہاں معذور فوجیوں کو مصنوعی ٹانگوں پر چلنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

رجب علی کو اپنی ٹانگ کٹ جانے کا نہ صرف یہ کہ افسوس نہیں تھا بلکہ وہ خوش اور مطمئن تھا۔ اُس نے سلمٰی سے کہا تھا ——"میں لنگڑا نہیں ہوا۔ اللہ کے نام پر ٹانگ کٹوا کر میں زندگی کے سیدھے راستے پر چلنے کے قابل ہو گیا ہوں"—— پھر بھی، اگر اُس کے دل میں افسوس کا ذرا سا بھی شائبہ رہ گیا تھا تو اس وارڈ میں آکر وہ بھی صاف ہو گیا۔ وہاں مختلف محاذوں کے معذور فوجی مصنوعی ٹانگوں پر چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بعض کی دونوں ٹانگیں کولہوں سے کٹی ہوئی تھیں۔ وہاں ایسے بھی تھے جو ایک بازو اور ایک ٹانگ سے محروم ہو گئے تھے۔ ان میں سپاہی بھی تھے، عہدیدار بھی اور سردار بھی یعنی نائب صوبیدار، صوبیدار اور صوبیدار میجر۔ وہ عمر بھر کے لیے معذور ہو چکے تھے۔ رجب علی کو معلوم تھا کہ ان میں کوئی بھی اُس کی طرح جاگیردار نہیں۔ ان کا اب کوئی مستقبل نہیں رہ گیا تھا۔ بعض سپاہی ابھی نوجوان تھے لیکن وہ اِس طرح ہنس کھیل رہے تھے جیسے یہ سب تندرست اور توانا ہو کر ہسپتال سے فارغ ہونے والے ہوں۔

جوں ہی وہ اُس وارڈ میں پہنچا، وارڈ کے تمام معذور اُس کے اِرد گرد جمع ہو گئے۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اُس کی یونٹ کون سی ہے۔ کوئی اُس سے یہ پُوچھتا کہ وہ کون سے محاذ پر تھا۔ اُس نے جب بتایا کہ وہ سویلین ہے اور وہ جاسوسوں کے محاذ پر لڑا ہے تو تمام فوجی اُس کا یوں احترام کرنے لگے جیسے وہ اُن سے برتر انسان ہو۔

اُس نے اپنی کہانی بالکل مختصر سنائی کیونکہ وہ ہیرو نہیں بننا چاہتا تھا۔ دوسروں سے اُس نے تفصیلی کہانیاں سنیں لیکن اُس نے دیکھا کہ وہ بھی بات مختصر کرتے ہیں تاکہ سننے والے کو یہ شک نہ ہو کہ یہ شخص ہیرو بننا چاہتا ہے۔ ہر کہانی شجاعت اور جذبۂ ایثار سے بھرپور تھی۔ رجب علی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اُس کی رگوں میں کچھ خون فاسد رہ گیا تھا جو نکل گیا ہے۔

شام کو ایک کرنل ڈاکٹر وارڈ میں آیا تو رجب علی کو اس نے اُسی وارڈ کے ساتھ ایک الگ کمرے میں منتقل کر دیا۔ اُس نے جب دونوں کٹی ہوئی ٹانگوں والوں کو مصنوعی ٹانگوں پر آسانی سے چلتے دیکھا تو وہ اُٹھ کر اس طرح چلنے لگا جیسے اس کی مصنوعی ٹانگ بھی مصنوعی نہ تھی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ یہ لوگ جذبے کے زور پر مصنوعی ٹانگوں پر اتنی آسانی سے چل رہے ہیں۔ اب اُسے امید ہو گئی تھی کہ ہسپتال سے جلدی چھٹی مل جائے گی۔

اگلے ہی روز شازی اُس کے پاس آئی۔ شازی کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر رونق آ گئی لیکن اُس نے دیکھا کہ اُسے دیکھ کر شازی کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ آ جایا کرتی تھی، وہ غائب تھی۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ شازی کی آنکھیں کچھ سرخ ہیں۔

"کیوں شازی!"—— رجب علی نے شازی کو اپنے پاس پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا——"آج شاید تمہیں اپنی ماں یاد آ رہی ہے"۔

"ہاں"—— شازی نے سر ہلا کر ایسے کہا جیسے اُس نے آہ بھری ہو——"ایسے لگتا ہے جیسے آج مجھے ماں یاد آ رہی ہے۔ بات ہی کچھ ایسی ہے"۔

"کوئی خاص بات؟"—— رجب علی نے قدرے گھبراہٹ کے لہجے میں پوچھا۔

شمیم نے اصغر کے پاس سے اُٹھا کر اور اپنے پاس بلا کر اُسے جو کچھ کہا تھا اور جو دھمکیاں دی تھیں، وہ اُس نے رجب علی کو سُنا ڈالیں۔ شمیم کی دھمکیوں کے جواب میں جو دھمکیاں شازی نے اُسے دی تھیں، وہ بھی اُس نے رجب علی کو سنائیں۔ رجب علی گہری سوچ میں کھو گیا اور اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہو گئے۔

"ابّا جان!"—— شازی نے کہا——"میں نے پاکستان کے لیے جو کچھ کیا ہے، اُسے دہرانا نہیں چاہتی۔ آپ کو صرف یہ یاد دلاؤں گی کہ دنیا میں میرا واحد سہارا میری ماں تھی لیکن میں نے اس سہارے کو جیل کی کوٹھڑی میں پھینک دیا ہے۔ میں کسی سے کوئی انعام نہیں مانگتی۔ کبھی شک ہوتا ہے کہ میں اُس وقت پاگل ہو گئی تھی جب میں نے اپنی ماں کا نقاب اٹھا کر اُسے گرفتار کرایا تھا یا اب پاگل ہو گئی ہُوں۔ میں نے اُس وقت سوچا تک نہ تھا کہ ماں کو گرفتار کرا کے میرا ٹھکانہ کہاں ہو گا۔ آج یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ اصغر کے ساتھ مجھے شمیم والی محبّت نہیں ہے مجھے جس پیار کی تشنگی جلاتی رہتی تھی، وہ مجھے آپ سے مل گیا ہے۔ بیٹی کو باپ کا پیار مل جائے تو اس پر وہ اپنا سہاگ بھی قربان کر دیا کرتی ہے"۔

"کیا میرے ساتھ یہ باتیں تم ضروری سمجھتی ہو؟"—— رجب علی نے پوچھا اور اُسے یقین دلانے کے لیے کہا——"میں نے تم پر کوئی الزام عائد نہیں کیا"۔

"ہاں میں یہ باتیں کہہ دینا ضروری سمجھتی ہوں"—— شازی نے کہا——"آپ کے دل میں بھی یہ شک پیدا ہو سکتا ہے کہ میں اصغر کو شمیم کی طرح چاہتی ہوں لیکن ایسا نہیں۔ میں نے اصغر کے زخمی ساتھیوں کو ہسپتال میں دیکھا تھا۔ میرے جذبات اُمڈ آئے تھے۔ اصغر کو بھی میں ویسا ہی ایک سرفروش مجاہد سمجھتی ہوں۔ یہ سب تھکے ہُوئے اور افسردہ مجاہد ہیں۔ اصغر ضرورت سے زیادہ افسردہ اور پژمُردہ ہو گیا ہے۔ میں مرد کی نفسیات کو سمجھتی ہوں۔ مجھے یہی ٹریننگ دی گئی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ عورت جسے مرد کی کمزوری کہا جاتا ہے، مرد کی بہت بڑی قوّت بھی بن سکتی ہے۔ تھکے ہارے اور افسردہ مرد کو عورت کا لمس تر و تازہ کر دیا کرتا ہے۔ یہ لمس ماں کا بھی ہو سکتا ہے۔ بہن کا، بیٹی کا اور کسی خوبصورت اور جوان لڑکی کا بھی۔ میں نے اصغر کو تنہائی میں اپنے ساتھ نہیں لگایا تھا۔ اصغر کی امّی بھی ہمارے پاس بیٹھی تھیں۔ میں اصغر کی ذہنی کیفیّت کو نارمل حالت میں لانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میں آپ کو یہ صاف الفاظ میں

بتا سکتی ہُوں کہ میں اصغر سے اور اصغر جیسے کسی بھی آدمی سے جس نے اپنے ملک کے لیے کچھ کیا ہو یا کوئی قربانی دی ہو، جذباتی تعلق نہیں توڑ سکتی۔"

"میں سمجھتا ہوں شازی!" — رجب علی نے جھنجھلا کر کہا — "میں سب سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین دلانے کی کوشش نہ کرو۔ تمھارے جذبات کو مجھ سے زیادہ سمجھنے والا اور کوئی نہیں۔"

"لیکن مجھے بے آسرا اور بے گھر لڑکی کہا گیا ہے" — شازی نے غصیلی اور جذباتی آواز میں کہا اور اُس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رجب علی نے اُسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ شازی سسک سسک کر رونے لگی۔

"اگر پاکستان کی ایک لڑکی نے اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر تمہیں کوئی اوچھی بات کہہ دی ہے تو اُسے سارے پاکستان کی آواز نہ سمجھو" — رجب علی نے کہا — "میں جانتا ہوں کہ اصغر کو وہ دل و جان سے چاہتی ہے لیکن میں اُس کی اوچھی اور چھچھوری باتوں کو کبھی برداشت نہیں کروں گا۔ تم برداشت کرو۔ اپنے آپ کو بے آسرا اور بے ٹھکانہ نہ سمجھو۔ کیا تم اس وہم میں مُبتلا ہو گئی ہو کہ تمھارا باپ تمہیں راولپنڈی میں اکیلا چھوڑ کر لاہور چلا جائے گا؟ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ چند دنوں کی بات ہے۔ میں ہسپتال سے جلدی فارغ ہو جاؤں گا۔"

"میں نے اپنے جذبات پر اپنی ماں کو قربان کر دیا ہے" — شازی نے کہا — "میں یہ قربانی بھی دے سکتی ہوں کہ اپنا وجود شمیم اور اصغر کے درمیان سے ہٹا لوں۔"

رجب علی نے بڑی مُشکل سے اُسے اس جذباتی کیفیّت سے نکالا اور اُسے یقین دلایا کہ اُس کا وجُود بے قیمت نہیں جسے وہ اُٹھا کر کہیں پھینک دے۔ وہ آخر رجب علی کی بیٹی تھی۔ رجب علی نے اُسے دل کی گہرائیوں سے باپ کا پیار دیا تھا۔ رجب علی کی دو چار باتوں سے اس کے جذبات اور اُس کا پیار شازی پر غالب آ گیا۔

"شازی بیٹی!" — رجب علی نے اُسے کہا — "تم انسانوں کو اپنے سانچے میں ڈھا لنے کا فن جانتی ہو۔ شمیم کو اپنی زبان کے جادُو میں لے آؤ اور کچھ دن گزار لو۔"

"مجھے جادو چلانے کی ضرورت ہی کیا ہے" — شازی نے کہا — "زبان کا جادُو وہ چلاتے ہیں جن کے دلوں میں کچھ اور ہوتا ہے۔ میرے دل میں کوئی فریب نہیں۔ اب آپ نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا ہے تو میں اس کے سارے وہم اور وسوسے دھو ڈالوں گی۔"

۷

جب شازی رجب علی کے پاس پہنچی تھی، اس سے کچھ دیر پہلے اصغر نے دیکھا کہ شازی کو شمیم نے بلایا تھا لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ اس کی چائے کی پیالی اصغر کے سامنے پڑی تھی۔ اصغر نے نوکر کو آواز دی۔ نوکر آیا تو اُس نے اُسے کہا کہ شازی کو بلا لاتے، وہ شمیم کے کمرے میں ہو گی۔ نوکر نے بتایا کہ شازی شمیم کے کمرے سے نکل کر کہیں باہر چلی گئی ہے۔ اصغر اٹھا اور شمیم کے کمرے میں چلا گیا۔

"شازی کہاں گئی ہے؟" — اصغر نے پوچھا

"تم نے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ میں کہاں تھی؟" — شمیم نے قدرے تلخ لہجے میں کہا — "جاتے ...اری موجود تھی تو تم نے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ شمیم کہاں ہے؟"

"شمیم میں شازی کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔"

"اصغر میں اپنے متعلق بات کر رہی ہُوں" — شمیم نے بھڑک کر کہا — "شازی کے متعلق تم فکرمند ...تے ہو، میں نہیں۔"

شمیم شوخ، شرارتی، بے فکری اور کھلنڈری لڑکی تھی۔ یہ تو اصغر کی محبت نے اُسے بدل ڈالا تھا۔ اصل میں وہ اپنے آپ کو شہزادی سمجھتی تھی۔ اِدھر اصغر کی ذہنی کیفیّت دگرگوں تھی۔ اُسے شمیم کا ...یم کو اس کا انداز اچھا نہ لگا۔

"میں نے اپنے باپ کو تم پر قربان کر دیا ہے" — شمیم نے بھڑکی ہُوئی آواز میں کہا۔

"مجھ پر نہیں" — اصغر نے اُس سے زیادہ تلخ لہجے میں کہا — "پاکستان پر اور صرف پاکستان پر... لیکن ...ے یہ بتاؤ کہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"

"ہوا یہ ہے کہ اب میری جگہ شازی آ گئی ہے" — شمیم نے کہا — "تمہیں اس کی بناوٹی محبت ...اچھی لگی ہے۔ ماں نے اسے یہی ٹریننگ دی ہے کہ مردوں کو اپنے جال میں کس طرح پھانسا ...تا ہے۔"

"شمیم!" — اصغر نے فوجیوں کی طرح گرج کر کہا — "میں فوجی ہُوں، کسی فلم کا ہیرو نہیں کہ کسی کے ...ہوئے مکالمے بولوں گا۔ مجھے صاف الفاظ میں بتاؤ کہ تم کس وہم میں مبتلا ہو گئی ہو اور تمہیں کیا سوچ ...ان کر رہی ہے۔ میں تمہیں صاف الفاظ میں بتا دیتا ہوں کہ میں شازی کے کردار کے خلاف کچھ ...میں سنوں گا۔"

"میں تم جیسے کپتانوں کو خرید سکتی ہُوں" — شمیم نے کہا — "تمہارا دماغ میں نے خراب کیا ہے! ایک آوارہ لڑکی مجھے دھمکی دے گئی ہے کہ وہ مجھے اغوا اور قتل کرا دے گی۔"

"کیا اُس نے کسی اشتعال کے بغیر یہ دھمکی دی تھی؟" — اصغر نے پوچھا۔

"یہ اُس سے پوچھنا" — شمیم نے کہا — "جس کے سینے کے ساتھ اپنا سر لگا کر تم زیادہ ...ون محسوس کرتے ہو وہی تمہیں بتا سکتی ہے مجھے کیا ہُوا ہے۔"

اصغر نے آہ سی بھری اور دھیمی سی آواز میں بولا — "رقابت کا جذبہ کتنے حسین چہروں کو بگاڑ دیتا ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں تم کیا محسوس کر رہی ہو۔ تم میرے چہرے پر اداسی نہیں دیکھ سکتیں لیکن تم نے کبھی ...سے یہ بھی نہ پوچھا کہ میں کیوں اداس ہوں۔ تمہیں میرا وہ چہرہ اچھا لگتا ہے جس پر مُسکراہٹ ہو۔ شازی ...تی ہے کہ فائر بندی سے میری ذہنی کیفیّت کیا ہو گئی ہے۔ وہ میرے چہرے سے اُداسی کو ...ہونے کی اور میرے بھڑکے ہُوئے فوجی جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ تم یقین نہیں ...رو گی کہ اُس نے مجھے کہا تھا کہ وہ مجھے تمھارے لیے خوش رکھنا چاہتی ہے... تمہیں حق حاصل ہے ...اُس سے جواب طلبی کرو لیکن مجھے چیلنج نہ کرو۔ میں صرف عشق و محبّت کے لیے پیدا نہیں ہُوا۔ شاید

آگے چل کر مجھ میں کوئی تبدیلی آجائے لیکن میری موجودہ ذہنی کیفیت یہ ہے کہ رومان پرستی کو میں بُرا سمجھتا ہوں۔ میرے شہید ساتھیوں کا ابھی خون بھی خشک نہیں ہُوا۔ تمھاری قدروقیمت صرف میں جانتا ہُوں تم نے پاکستان کی سلامتی پر اپنے باپ کو قربان کر دیا ہے۔ شازی نے اپنی ماں کی اور اپنے مستقبل کی قربانی دی ہے۔ میں اُس کی قدروقیمت کو بھی نہیں بھول سکتا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہُوں کہ تمہاری محبت پر کوئی ڈاکہ نہیں ڈالے گا..... کیا اب بتاؤ گی کہ شازی کہاں گئی ہے ؟"

"معلوم نہیں"___ اب کے شمیم نے قدرے نرم اور سنبھلی ہُوئی آواز میں کہا ___"اُس کے ساتھ میری تُرش کلامی ہو گئی تھی اور وہ غصّے میں نکل گئی ہے"

"یوں کہو کہ تم نے اُسے گھر سے نکال دیا ہے"___ اصغر نے کہا اور وہ فوجیوں کی طرح پیچھے کو مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔

۷

اصغر نے اپنی ماں سلمٰی کو ساتھ لیا، شمیم کی کار میں بیٹھا اور دونوں سی۔ ایم۔ ایچ رجب علی کے کمرے میں جا پہنچے۔ شازی وہاں سے جا چکی تھی۔ رجب علی نے اُسے ٹھنڈا کر کے سمجھا دیا تھا کہ شمیم کے ساتھ وہ کیسا رویّہ رکھے۔ اصغر نے آتے ہی رجب علی سے پوچھا کہ شازی یہاں آئی تھی ؟ رجب علی نے اُسے بتایا کہ وہ آئی تھی اور تھوڑی دیر گزری چلی گئی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین ہو گیا ہے"___ رجب علی نے اصغر سے کہا۔

"معاملہ کیا ہے ؟"___ سلمٰی نے پریشان سا ہو کے پوچھا اور کہنے لگی ___"اس لڑکے کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہاں سے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور صرف اتنا کہا، چلو ہسپتال۔ بخدا میں تو ڈر گئی کہ ہسپتال سے آپ کی کوئی ایسی ویسی اطلاع آئی ہے۔ راستے میں اس سے پوچھتی رہی مگر اس نے صرف ایک بار کہا ___"ابّو کو نہیں دیکھنا ؟"___ پھر اس نے جو کوئی اور بات کی ہو۔ یہاں آکر آپ کو اچھا بھلا دیکھا تو میری جان میں جان آئی.... اس لڑکے کو آپ ہی کچھ سمجھائیں۔ سارے پاکستان کو اس اکیلے نے اپنے سر پر اُٹھا رکھا ہے"

"یہ معاملہ کچھ اور ہے امّی!"___ اصغر نے جھنجلاتے ہُوئے لہجے میں کہا ___"آپ نے دیکھا تھا کہ شازی ہمارے ساتھ چائے پی رہی تھی تو نوکر نے اُسے کہا تھا کہ اُسے شمیم بلا رہی ہے۔ کچھ دیر بعد آپ نے کہا تھا کہ شازی کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اور وہ شمیم کے پاس بیٹھ گئی ہے۔ میں شمیم کے کمرے میں گیا تو پتہ چلا کہ شازی کہیں باہر نکل گئی ہے۔ شمیم کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی آپس میں تکرار ہو گئی تھی۔ شمیم نے معلوم نہیں اُسے کیا کہہ دیا کہ شازی وہاں سے نکل گئی"

"کچھ سمجھی ہو سلمٰی!"___ رجب علی نے کہا ___"لڑکیاں دو ہیں اور تمھارا بیٹا ایک ہی ہے۔ شمیم کو شک ہے کہ شازی نے تمھارے بیٹے پر قبضہ کر لیا ہے۔ شمیم نے شازی کو بڑی اوچھی باتیں کہی ہیں"___ رجب علی نے سلمٰی اور اصغر کو وہ تمام باتیں سنائیں جو شازی اُسے سنا گئی تھی۔ شازی کا جو ردِعمل تھا وہ بھی رجب علی نے سنایا اور رجب علی نے شازی کو جس طرح ٹھنڈا کیا تھا وہ بھی سنایا۔

"تو کیا آپ شازی کو واقعی لاہور لے چلیں گے اور اپنے گھر رکھیں گے ؟"___ سلمٰی نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ کسی کی جوان بیٹی کو اپنے گھر رکھنا بڑی نازک ذمہ داری ہے"

"وہ کسی اور کی بیٹی نہیں"___ رجب علی نے کہا ___"وہ میری اپنی بیٹی ہے"

"ہاں ہاں!"___ سلمٰی نے کہا ___"یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ اُسے اپنی بیٹی سمجھتے ہیں۔ میں دل و جان سے شازی کی قدر کرتی ہُوں۔ وہ ہندوستان کی جاسوس تھی لیکن اس نے پاکستان کی خاطر قربانی دی ہے۔ کوئی بیٹی اپنی ماں کی قربانی نہیں دے سکتی۔ ایسی لڑکی کو اپنی بیٹی بنا لینا...."

"سلمٰی!"___ رجب علی نے اُس کی بات کاٹ دی لمبی آہ بھری اور اصغر کی طرف دیکھا ___"اصغر بیٹا! تم جانتے ہو ناکہ میں شریف آدمی نہیں ہُوا کرتا تھا.... سلمٰی! میں نے تمہیں اپنا ماضی کھول کر دکھایا تھا یہ ایک بڑی گندی کتاب کی کہانی تھی جس کا میں نے تمہیں ایک ایک لفظ پڑھ کر سنایا تھا.... کیوں سنایا تھا؟ .... میں تمھارے آگے اقبالِ جُرم کرنا چاہتا تھا۔ یہ بہت سے کانٹے تھے جو میرے ضمیر میں اُتر گئے تھے۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ اپنے پیار کے ہاتھوں سے یہ کانٹے نکال دو۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا کہ خُدا سے میں بخشش مانگ لوں گا۔ گناہوں کی بخشش کے عوض میں نے خُدا کو اپنی جان پیش کی تھی۔ خُدا نے میرے جسم کا ایک حصّہ قبول کیا اور مجھے نئی زندگی عطا کی...."

"ابّا جان!"___ اصغر بول پڑا ___"فوج نے میری عادت بگاڑ دی ہے۔ فوج میں دوٹوک اور مختصر بات کی جاتی ہے۔ آپ اصل بات پر کیوں نہیں آجاتے جس کے لیے آپ اتنی لمبی تمہید باندھ رہے ہیں؟"

"تم بدتمیز ہو گئے ہو اصغر!"___ سلمٰی نے اصغر کو ڈانٹ دیا ___"ابّو کو بات کرنے دو"

"اب اسے یُوں نہ ڈانٹا کرو سلمٰی!"___ رجب علی نے مُسکرا کر کہا ___"یہ اب کیپٹن ہے سٹوڈنٹ نہیں.... اصغر! میں تمہید اس لیے باندھ رہا تھا کہ میں تمہیں ایسی بات بتانے لگا ہوں جو سُن کر شاید تم دونوں کو دھچکا لگے.... شازی کو میں بیٹی بنا نہیں رہا بلکہ وہ ہے ہی میری بیٹی! میں ہی اس کا باپ ہُوں۔ فرق یہ ہے کہ اس کی ماں آسیہ میری بیوی نہیں تھی۔ یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب میں شہزادہ ہُوا کرتا تھا...."___ اُس نے سلمٰی اور اصغر کو اپنے اور آسیہ کے تعلقات اور شازی کی پیدائش کی واردات پوری تفصیل سے سُنا ڈالی، پھر وہ سلمٰی اور اصغر کے چہروں پر ان کا ردِعمل پڑھنے لگا۔

دونوں کے چہروں پر کوئی نمایاں ردِعمل نہیں تھا۔ وہ رجب علی کو اس کے بدلے ہُوئے رُوپ میں دیکھ رہے تھے۔ رجب علی کبھی کبھی اپنے گناہ آلود ماضی کو لے بیٹھتا تھا تو ماں بیٹا اُسے روک دیا کرتے تھے۔ اب تو رجب علی کی جیسے شکل و صورت ہی بدل گئی تھی۔ دونوں کو ذرا سا بھی دھچکا محسوس ہُوا۔

"اس لڑکی نے میری محبت کی خاطر اتنی بڑی قربانی دی ہے"___ رجب علی نے کہا ___"اور اُس نے یہ قربانی اس توقع پر دی ہوگی کہ میں جو اس کا باپ ہوں، اُسے پناہ میں لے لوں گا...."

اصغر پھٹ کر بولا ___"وہ ہماری پناہ میں رہے گی۔ اگر وہ آپ کی بیٹی نہ ہوتی تو بھی ہم اُسے اپنی پناہ میں رکھتے"

"اگر وہ ہمارے پاس رہی تو شمیم اور زیادہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جائے گی"___ سلمٰی نے کہا ___ "ہم اُسے بھی تو نظر انداز نہیں کر سکتے"

"وہ میں سنبھال لوں گا"___ اصغر نے کہا ___"اگر شمیم نے اُسے یہ کہا ہے کہ شازی بے گھر اور بے آسرا ہے تو میں شمیم سے تعلق توڑ لوں گا"

"یہ بھی بڑی زیادتی ہوگی" — سلمیٰ نے کہا۔

"امّی ذرا سمجھنے کی کوشش کریں" — اصغر نے قدرے غصیلی آواز میں کہا — "میں دیکھ رہا ہوں کہ شمیم کو مجھ سے محبت ہے اور شازی کے دل میں مجھے پاکستان کی محبت نظر آرہی ہے۔ شازی نے مجھے ایک بار بھی نہیں کہا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔"

"اگر تم ایسی بات کرتے ہو" — سلمیٰ نے اصغر سے کہا — "تو تم یہ نہیں سوچ سکتے کہ شازی نے اپنے باپ کی محبت سے مغلوب ہو کر اپنی ماں کو قربان کیا ہے۔"

"نہیں سلمیٰ!" — رجب علی نے کہا — "یہ میں اچھی طرح دیکھ چکا ہوں کہ شازی کے دل میں پاکستان کی محبت اتنی زیادہ اُتر گئی ہے کہ میں اگر کبھی بھٹک گیا تو پاکستان پر وہ مجھے بھی قربان کر دے گی.... سلمیٰ! تم انسانی فطرت کو نہیں سمجھتیں۔ شازی ابنارمل لڑکی ہے۔ بعض انسان اچھائی اور نیکی میں ابنارمل ہو جاتے ہیں اور لوگ اُنہیں بھی پاگل کہنے لگتے ہیں۔"

تینوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ شازی کو وہ اپنے ساتھ لاہور لے جائیں گے اور اصغر شمیم کی غلط فہمی دور کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ رجب علی کو اچانک ایک خیال آگیا۔

"شازی کی زندگی کے ایک پہلو پر تم دونوں کی نظر نہیں گئی" — رجب علی نے کہا — "تمھاری نظر جا بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ ان پہلوؤں کو صرف پولیس آفیسر دیکھ سکتے ہیں۔ اگر ملٹری اور سینٹرل انٹیلی جنس والے اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کر رہے تو شازی ان کی نظر میں ہے۔ اگر تم باہر جا کر انسانوں کو غور سے دیکھو تو تمہیں ایک آدمی ایسا ضرور نظر آئے گا جس کی نظریں میرے گھر پر لگی ہوئی ہوں گی یہ آدمی یا ایسا ہی ایک اور آدمی شمیم کی کوٹھی کے اردگرد گھومتا پھرتا رہتا ہوگا۔ انٹیلی جنس کی نظر میں شازی جاسوسی کی مجرم ہے۔ وعدہ معاف گواہ بن جانے سے صرف سزا نہیں ملتی لیکن اس کا ریکارڈ جو پولیس یا انٹیلی جنس کے پاس ہوتا ہے وہ صاف نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے علاوہ شازی ایک ایسے ملک کی جاسوس تھی جسے میں جاسوسی اور انٹیلی جنس کا ماہر کہوں گا۔ ہندوستانی سیکرٹ سروس کے تیجے ہمارے ملک میں گھرے اُترے ہوتے ہیں۔ شازی کسی بھی وقت اغوا یا قتل ہو سکتی ہے۔"

"اور ایسا ہوگا" — اصغر نے کہا — "میں نے اس پہلو پر پہلے غور کیا ہی نہیں تھا۔ شازی کے معاملے میں ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔"

اصغر جب وہاں سے نکلا تو اس کے ذہن پر صرف شازی سوار تھی۔

➤

اگلے ہی روز شمیم کی کوٹھی میں جو ملک ناصر جاگیر دار کی کوٹھی مشہور تھی، قیامت بپا ہو گئی۔ یہ قیامت ایک سرکاری چپڑاسی کاغذ کے ایک پرزے کی صورت میں لایا تھا۔ یہ ایک سرکاری چٹھی تھی جو حکومت کی طرف سے ملک ناصر کی بیوی کو لکھی گئی تھی۔ چٹھی انگریزی زبان میں تھی جو ملک ناصر کی بیوی نہیں پڑھ سکتی تھی۔ شمیم نے چٹھی پڑھی۔ اُس کے ہاتھ کانپے اور اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی ماں کے پاس گئی۔ اُس نے پہلے اپنی ماں کو دیکھا۔ پھر سوچا

کہ یہ اطلاع ماں کو دوں یا نہ دوں۔

"کیا ہے بیٹا!" — شمیم کی ماں نے اُس سے پوچھا — "کسی کا خط آیا ہے؟"

"ابو کو سزائے موت ہو گئی ہے" — شمیم نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں" — ملک ناصر کی بیوی نے جھپٹا مار کر چٹھی شمیم کے ہاتھ سے چھین لی اور بولی — "ایسا نہیں ہو سکتا۔ ناصر کو کوئی پھانسی نہیں دے سکتا۔"

اُدھر سے سلمیٰ دوڑی آئی۔ اتفاق سے اصغر بھی وہاں موجود تھا۔ شازی بھی وہیں تھی۔ وہ بھی آگئی۔ چند لمحوں بعد محل جیسی یہ کوٹھی شمیم کی ماں کی چیخوں سے لرزنے لگی۔ شمیم نے ہی اپنے باپ کو پکڑوایا تھا لیکن وہ بھی ہچکیاں لے لے کے رونے لگی۔

کسی کی سزا کی اطلاع یوں نہیں دی جاتی۔ عدالت میں مقدمے کی سماعت کے بعد ایک روز مقدمے کا فیصلہ سنا دیا جاتا ہے لیکن بھارت کے جاسوسوں اور تباہ کار تخریب کاروں کا جو گروہ پکڑا گیا تھا یہ کوئی معمولی گروہ نہیں تھا۔ اس میں پاکستان کے مختلف محکموں کے چھ افسر بھی شامل تھے۔ اس گروہ کے ہاتھ بڑی دُور تک پہنچے ہوئے تھے۔ جاسوسی کے علاوہ اُنہوں نے کمانڈو کارروائی بھی کی تھی۔ اس گروہ کے کیس کی سماعت ایک سپیشل ٹریبونل کے حوالے کی گئی تھی جس کی کارروائی خفیہ رکھی گئی تھی۔ اس میں شازی کو وعدہ معاف گواہ کے طور پر لیا گیا تھا شمیم کو بطورِ گواہ پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملک ناصر کے خلاف شہادت بڑی مضبوط اور ناقابلِ تردید تھی۔ ٹریبونل نے ایسا فیصلہ سنایا جس میں کیس پر نظرِ ثانی اور رحم کی اپیل کی گنجائش نہ رکھی گئی۔ فیصلہ صدرِ مملکت کے حوالے کر دیا گیا جس نے اس کی توثیق کر دی اور صرف ایک دن کا وقفہ دے کر تیسرے دن پھانسی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔

ملک ناصر اور بھارت کے اس کمانڈو کو جو کمانڈو آپریشن کے دوران زندہ پکڑ لیا گیا تھا، موت کی سزا دی گئی کیونکہ طاہرہ کا باپ جمال بیگ اُن کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور رجب علی کی ٹانگ کٹ گئی تھی اور یہ ایک مسلّح جنگی کارروائی تھی۔ شازی کی ماں آسیہ کو جاسوسی کے الزام میں چودہ سال اور دو اور دفعات کے تحت دس دس سال سزائے قید دی گئی اور فیصلے میں لکھا گیا کہ یہ سزائیں یکے بعد دیگرے بھگتی جائیں گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جیل سے آسیہ مر کر ہی نکلے گی۔ پاکستان کے جو چھ افسر ملک ناصر کی نشاندہی پر پکڑے گئے تھے، انہیں سات سات سال سزائے قید دی گئی۔

سرکاری اطلاع صرف ملک ناصر کی بیوی کو بھیجی گئی کیونکہ اُسے اپنے خاوند سے ملاقات کا حق دیا گیا تھا۔ ملاقات کے لیے صرف ایک دن تھا۔

▼

ملک ناصر کی بیوی ایک سیدھی سادی دیہاتن تھی۔ تھی تو وہ بھی جاگیر دار خاندان کی لیکن طبعاً اللہ میاں کی گائے تھی۔ ملک ناصر نے اُسے برائے نام بیوی اور بے تاج ملکہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔ اس عورت نے ملک ناصر کی زندگی میں جھانکنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اُن عورتوں میں سے تھی جو خاوند کی زندگی میں اپنے آپ کو سہاگن اور خاوند کے مرنے کے بعد بیوہ سمجھتی ہیں اور اُن کے لیے زندگی اندھیر ہو جاتی ہے۔ اب اُسے خاوند کی سزائے موت کی اطلاع ملی تو اُس کے ذہن پر یہی ایک بات جم کے

رہ گئی کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے اور اُسے پھانسی کے تختے پر چڑھانے والے یہ لوگ ہیں جو کئی مہینوں سے، اُس کی کوٹھی میں رہ رہے ہیں۔

اُس نے اچانک چیخنا چلاّنا شروع کر دیا۔ اپنے مُنہ پر دو ہتّڑ مارنے لگی۔ پھر اُس نے بال نوچ ڈالے۔ شمیم، سلمیٰ، شازی اور اصغر نے اُس کے ہاتھ پکڑے اور اُس پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن اُس پر ہسٹیریا کی قسم کے دورے کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اُس کے بازوؤں میں بے پناہ طاقت آ گئی تھی۔

یہی عورت تھی جب کوٹھی کی تلاشی ہُوتی تھی اور ملک ناصر اُس کے سامنے گرفتار ہُوا تھا تو اُس نے کہا تھا کہ میں ملک صاحب کو کہتی رہتی تھی کہ ان بدمعاش آدمیوں کو گھر میں نہ آنے دیا کریں اس نے متکبّرانہ لہجے میں یہ بھی کہا تھا کہ ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دو دو چار چار ہزار روپیہ پولیس والوں کے ہاتھوں میں گیا تو وہ ہاتھ جوڑ کر ملک صاحب سے معافی بھی مانگیں گے اور گھر چھوڑ جائیں گے۔ اُسے شمیم نے بھی اندھیرے میں رکھا تھا۔ شمیم نے اُسے پتہ ہی نہیں چلنے دیا تھا کہ یہ کیس پولیس کا نہیں اور جن کے ہاتھوں میں یہ کیس گیا ہے وہ کسی کے آگے ہاتھ جوڑا نہیں کرتے بلکہ اس قسم کے مجرموں کے ہاتھ اور گردنیں کاٹ دیا کرتے ہیں مگر ملک ناصر کی بیوی کو اپنی دولت پر، اپنی جاگیر پر اور ملک ناصر کے اثر و رسوخ پر اس قدر ناز تھا کہ اُس نے کبھی کرید کر یہ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی کہ ملک صاحب کِس چکر میں پھنسے ہُوئے ہیں۔ اس میں اس کے روایتی دیہاتی پن کا عمل دخل بھی تھا۔

اب اُس کے سر پر بم گرا کہ ملک صاحب پرسوں پھانسی چڑھ رہے ہیں تو اُس کے جاگیردارانہ غرور کو اس قدر شدید جھٹکا لگا کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھی۔ وہ ذرا سی خاموش ہُوئی، اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا پھر اچانک دھماکے کی طرح پھٹی۔

"تم نے ..... تم سب نے ....." اُس نے کانپتی ہُوئی انگلیاں ان سب کی طرف کر کے اور دانت پیس کر کہا ـــ "میرے خاوند کو تم سب نے پھانسی دلائی ہے۔ تم نے مجھے بیوہ کیا ہے" ـــ وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ سلمیٰ اُس کے قریب تھی۔ اُس نے سلمیٰ کی گردن اپنے ایک ہاتھ میں لے لی اور چلاّ کر کہا ـــ "نکل جاؤ میرے گھر سے ..... سب نکل جاؤ" ـــ شمیم کی طرف دیکھ کر اُس نے کہا ـــ "تم بھی نکل جاؤ۔ تم نے میری کوٹھی میں بلا رانے لگا رکھے ہیں۔"

اُس کا ایک ہاتھ ابھی تک سلمیٰ کی گردن پر تھا۔ سلمیٰ کی آنکھیں اُبل کر باہر نکلی آ رہی تھیں۔ اصغر نے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی ماں کو چھڑانے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے یہ بازو لوہے کا ہو گیا ہو۔ سلمیٰ کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ اصغر جوان آدمی تھا۔ اُس نے پُوری طاقت سے ملک ناصر کی بیوی کے بازو پر تلوار کی طرح ہاتھ مارا۔ اس سے اس عورت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور سلمیٰ نے اپنی گردن چھڑا لی۔ اس عورت پر شدید قسم کے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔

شمیم دوڑی گئی اور ایک ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا۔ ڈاکٹر کہیں قریب ہی تھا۔ چند منٹوں میں آ گیا۔ شمیم اُسے بتا چکی تھی کہ اُس کی ماں کی یہ حالت کیوں ہُوئی ہے۔ سب نے مِل کر شمیم کی ماں کو جکڑا اور ڈاکٹر نے

اُسے ایک انجکشن لگا دیا۔ فوراً بعد شمیم کی ماں کا جسم ڈھیلا پڑتے پڑتے بے حس ہو گیا اور اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ کل دوپہر تک یہ اسی طرح نیند میں پڑی رہیں گی۔ گھبرانا نہیں انہیں دو دن اسی حالت میں رکھنا پڑے گا۔ کل جب ان کی آنکھ کھلے تو ان کے منہ میں یہ دو گولیاں ڈال دینا۔ [illegible]ی کے عالم میں لے لیں گی۔

۷

شمیم کی ماں اُس دن اور اس وقت بھی گہرے اثر میں بے ہوش پڑی تھی جب ملک ناصر کی لاش گاؤں میں پہنچی۔ ان کے جو عزیز رشتے دار راولپنڈی میں یا قریب تھے، وہ پہنچ گئے تھے انہیں اسی روز شمیم نے اطلاع دے دی تھی جس دن اُسے سرکاری چٹھی ملی تھی۔ ملک ناصر کے خون کے رشتہ داروں نے آکر اپنا ہی ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ وہ شمیم سے جواب طلبی کر رہے تھے کہ اُس نے انہیں ملک ناصر کی گرفتاری کے فوراً بعد اطلاع کیوں نہ دی۔ یہ سب اُونچے درجے کے زمیندار تھے۔ اسمبلیوں کا ممبر بننا یا اپنے آدمیوں کو ہر الیکشن میں کھڑا کرنا اپنا جائز حق سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انہیں گرفتاری کے فوراً بعد پتہ چل جاتا تو وہ ملک ناصر کو چھڑا لیتے۔ ان میں ہر آدمی بڑھ چڑھ کر ڈھینگیں مار رہا تھا۔

ملک ناصر کی بیوی کے خون کے رشتے دار اور زیادہ گڑبڑ پھیلا رہے تھے۔ ان کی بیٹی بیہوش پڑی تھی۔ ان تمام رشتہ داروں کو کوئی بھی نہیں بتا رہا تھا کہ ملک ناصر گرفتار کس طرح ہُوا۔ شمیم نے انہیں اتنا ہی بتایا کہ اُسے بھی اچھی طرح معلوم نہیں سوائے اس کے کہ ملک ناصر جاسوسی میں پکڑا گیا تھا اور اس کے ساتھ چند اور آدمی بھی پکڑے گئے تھے۔ انہوں نے سلمیٰ، اصغر اور شازی کے متعلق پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ یہ کون لوگ ہیں کیونکہ ارد گرد کی کوٹھیوں والے بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ ملک ناصر کے رشتے دار سلمیٰ وغیرہ کو بھی ملک ناصر کے ملنے والوں میں سے سمجھتے رہے۔ اگر انہیں ذرا سا بھی اشارہ مل جاتا کہ ملک ناصر کو سزائے موت دلانے والے یہ لوگ ہیں تو دیہات کے یہ زمیندار اور جاگیردار جو اپنے آپ کو پاکستان کا بے تاج بادشاہ سمجھتے تھے، ان سب کو قتل کر ڈالتے۔

اسی روز ملک ناصر اور اُس کی بیوی کے رشتے دار اور برادری والے ملک ناصر کی لاش گاؤں لے گئے۔ ملک ناصر کی بیوی کو انجکشن اور گولیوں کی بے ہوشی کے عالم میں ایک کار میں ڈال کر ساتھ لے جایا گیا۔ شمیم بھی چلی گئی۔ اصغر نے شمیم سے کہا کہ امّی اور ابّو بھی شاید دو چار دنوں تک لاہور چلے جائیں گے۔ شمیم پر اُس وقت کچھ اور ہی کیفیت طاری تھی۔ اُس نے شازی کا ذکر ہی نہ کیا کہ وہ کہاں رہے گی۔

لاش کے نکل جانے کے بعد سلمیٰ، اصغر اور شازی ملک رجب علی کے پاس گئے اور اُسے بتایا کہ ملک ناصر کی لاش اُس کے گاؤں چلی گئی ہے۔ ایک روز پہلے رجب علی کو اصغر نے بتا دیا تھا کہ ملک ناصر کو سزائے موت ہو گئی ہے۔ رجب علی نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہ کیا جیسے کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔ رجب علی نے انہیں بتایا کہ دو تین دنوں تک اُسے ہسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا کیونکہ وہ اب مصنوعی ٹانگ پر بڑے اطمینان سے چل سکتا ہے۔ اُس نے شازی سے کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ لاہور جائے گی۔

۷

لاہور میں طاہرہ اور ارشد اپنے بیٹے طاہر پرویز کے لیے پریشان رہتے تھے۔ یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی تھانے کی حوالات میں ہے یا جیل میں۔ طاہر پرویز اعلانِ تاشقند کے خلاف مظاہرے میں بہت سے لڑکوں کے ساتھ گرفتار ہو گیا تھا۔ آخر ایک روز طاہر پرویز رہا ہو کر آ گیا۔ طاہرہ اور ارشد نے اُسے باری باری سینے سے لگایا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ طاہر پرویز کا رنگ اڑا ہُوا تھا اور اس پر گھبراہٹ سی طاری تھی۔ اُس نے رہائی پر ذرا سی بھی خوشی کا اظہار نہ کیا۔ وہ نمایاں طور پر کھویا کھویا نظر آ رہا تھا۔

"کیوں بیٹا!" ارشد نے اُس سے پوچھا "معلوم ہوتا ہے پولیس نے تمہیں مارا پیٹا ہے یا تم بہت ہی تکلیف میں رہے ہو۔"

طاہرہ نے لپک کر اُس کی قمیض اٹھائی اور اُس کا جسم دیکھنے لگی۔ اُسے مار پیٹ کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔

"نہیں امّی!" طاہر پرویز نے کہا "مجھے کسی نے سختی سے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ دو روز ہمیں تھانے کی حوالات میں رکھا گیا تھا۔ لڑکوں سے حوالات بھر گئی تھی۔ تیسرے روز ہمیں جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں ہمیں حوالاتی قیدیوں میں رکھا گیا تھا۔ مجھے اس کے سوا کوئی اور تکلیف نہیں ہوئی کہ میں جیل میں پڑا تھا۔ میں نے اس قید کو ذرا سا بھی محسوس نہیں کیا۔ وہاں کم و بیش تیس لڑکے میرے ساتھ قید تھے۔ ہم کوئی جرم کر کے تو گرفتار نہیں ہُوئے تھے۔"

"پھر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟" ارشد نے پوچھا اور کہا "تم مرد ہو یار! ہم نے تو پولیس کی لاٹھیاں کھائی تھیں۔"

طاہر پرویز کو دیکھ کر گھر کے تمام افراد اُس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ارشد کے باپ کی عمر ستّر برس ہو چلی تھی۔ اپنے پوتے کو دیکھ کر اُس کے آنسو نکل آئے۔ طاہر پرویز کو اُس نے گلے لگایا مگر رِقّت نے اُسے کچھ کہنے نہ دیا۔ دادی نے اُس کے سر اور چہرے پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی، پھر ارشد کے بڑے بھائی نے پھر بڑے بھائی کی بیوی نے اُسے گلے لگایا۔ بچّوں نے تو باقاعدہ بھنگڑہ ناچنا شروع کر دیا تھا لیکن طاہر پرویز کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ بھی نہ آئی۔

"کیوں طاہری!" ارشد کے باپ نے کہا "گھبرائے گھبرائے کیوں ہو؟ تمھاری ماں نے اور تمھارے باپ نے تو..."

"ہم بھی اس سے یہی پوچھ رہے تھے" طاہرہ نے ارشد کے باپ کی بات کاٹتے ہُوئے کہا "یہ کچھ بتا رہا تھا... تم کیا بات کر رہے تھے طاہری؟"

طاہر پرویز نے آہ بھری اور کہنے لگا "میں نے کچھ ایسی باتیں سُنی ہیں جنہوں نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو جس تھانے کی حوالات میں بند کیا گیا تھا وہاں کا تھانیدار حوالات کے دروازے پر آ کھڑا ہُوا۔ ہم سب نے اُس پر ہُوٹنگ شروع کر دی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ جب ہم چیخ چلّا کر چپ ہو گئے تو اُس نے کہا ۔ 'مجھے گالی گلوچ کر کے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ خاموش کھڑے رہ کر میں حکومت کی حکم عدولی کر رہا ہُوں۔ ہمیں زبانی حکم ملا

ہے کہ مظاہروں اور جلوسوں میں سے کچھ لڑکوں کو پکڑ کر تھانوں میں ایسی پھینٹی لگائیں کہ جب وہ باہر نکلیں تو اپنے سکولوں اور کالجوں میں سب کو بتائیں کہ اور جو جی میں آئے کرنا، جلوس نہ نکالنا۔ ہمیں ان الفاظ میں یہ حکم ملا ہے کہ جلوس نکالنے والے لڑکوں کا جلوس نکال دو لیکن میں نے تمہیں سیدھا حوالات میں بند کر دیا ہے'...

"اُس کی اس بات پر لڑکوں نے پھر ہُوٹنگ شروع کر دی لیکن ہم میں جو چار پانچ سنجیدہ لڑکے تھے اُنہوں نے لڑکوں کو چُپ کرایا اور تھانیدار سے پوچھا کہ وہ حکومت کے حکم پر عمل کیوں نہیں کر رہا؟ اُس نے جواب دیا ۔ 'کیونکہ تمھاری عمر کا میرا اپنا ایک بیٹا اسی قسم کی کسی حوالات میں بند ہے۔ وہ دیال سنگھ کالج کا سٹوڈنٹ ہے۔ تم شاید یقین نہیں کرو گے کہ میں نے نہ صرف یہ کہ اُسے روکا نہیں بلکہ اُسے اکسایا تھا کہ وہ اعلانِ تاشقند کے خلاف لڑکوں کے مظاہروں میں شامل ہو۔ میں اچھی طرح جانتا ہُوں کہ میں نے اپنی نوکری کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ جس دن اُوپر والوں کو پتہ چلا کہ میرا بیٹا بھی حکومت کے خلاف مظاہروں میں شریک ہُوا تھا، اُس دن مجھے پولیس کی نوکری سے سبکدوش کر دیا جائے گا لیکن مجھے یقین ہے کہ جس حوالات میں وہ ہے وہاں کا تھانیدار کسی کو پتہ نہیں چلنے دے گا۔ اُس تھانیدار نے مجھے ٹیلیفون پر بتا دیا تھا کہ تمھارا بیٹا میرے تھانے میں آیا ہے اور میں اُسے چھوڑ رہا ہوں لیکن میں نے اُسے کہا تھا کہ وہ کسی فرشتے کا بیٹا نہیں ہے۔ اِس وقت وہ پاکستان کا بیٹا ہے۔ وہ پاکستان کے دشمن کے خلاف نعرے لگا رہا ہے۔ بہرحال اُس تھانیدار نے کہا ہے کہ وہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دے گا کہ وہ میرا بیٹا ہے'....

"ہم سب پر اوس پڑ گئی۔ ہمیں چُپ دیکھ کر تھانیدار نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔ پھر اُس نے حوالات کی سلاخوں کے ساتھ مُنہ لگا کر بڑی دھیمی آواز میں ہمیں کہا ۔ 'میرے بچّو! پولیس کو گالیاں نہ دیا کرو۔ کل تم میں سے کوئی وزیر یا افسر بن جائے گا تو ہم اُس کا حکم مانیں گے۔ پولیس کے جو فرائض ہوتے ہیں وہ ہمارے ذہنوں سے اُتار دیئے گئے ہیں۔ پاکستان میں پولیس کی ڈیوٹی صرف یہ رہ گئی ہے کہ جو حکمران تخت پر بیٹھا ہُوا ہے اُس کے خلاف کہیں سے آواز نہ اُٹھے۔ اگر کہیں سے آواز اُٹھے تو اُسے خاموش کر دیا جائے۔ میری طرح بہت سے تھانیدار ہیں جو ایک طرف یہ ڈیوٹی دے رہے ہیں اور دوسری طرف وہ ویسے ہی پاکستانی ہیں جیسے تم ہو'....

"ہم نے اُسے کہا کہ اگر وہ اتنا ہی سچا پاکستانی ہے تو وہ استعفےٰ کیوں نہیں دے دیتا۔ اُس نے مجبور سے لہجے میں کہا ۔ 'اگر میں نوکری چھوڑ دوں تو میرے ایک بیٹے کو کالج چھوڑنا پڑے گا اور دو بیٹوں کو سکول چھوڑنا پڑے گا۔ میں نے اپنے بچّوں کے مستقبل کے لیے اپنا ایمان گروی رکھ دیا ہے۔ اب میں یہ جھوٹی رپورٹ دوں گا کہ میرے تھانے میں اتنے لڑکے لائے گئے تھے اور میں نے سب کو کانسٹیبلوں سے پٹوایا ہے' ۔ اور وہ اپنے دفتر میں چلا گیا۔"

اس تھانیدار کو مزید امتحان میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہ ہُوئی کیونکہ اگلے ہی روز اُوپر سے

حکم آگیا کہ مظاہروں میں جو لڑکے پکڑے گئے ہیں اور تھانوں کی حوالاتوں میں بند ہیں، ان سب کو جیل کی حوالات میں بھیج دیا جائے۔ وجہ یہ تھی کہ شہر کے تھانوں کی حوالاتوں میں اخلاقی جرائم کے ملزموں کو رکھنے کی جگہ نہیں رہی تھی حوالاتیں لڑکوں سے بھر گئی تھیں۔ طاہر پرویز کو بھی اس حکم کے تحت جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا تھا۔ ان لڑکوں کے خلاف کوئی مقدمہ قائم نہ کیا گیا۔ انہیں صرف دہشت زدہ کر کے رہا کر دینا تھا۔ اصل اذیت میں اُن چند ایک لڑکوں کو ڈالا گیا تھا جو سٹوڈنٹ لیڈر تھے۔ وہ نہ کسی حوالات میں تھے نہ جیل میں۔ کوئی نہیں جانتا تھا وہ کہاں ہیں۔

✪

"جب ہم جیل میں گئے تو وہاں کی فضا بڑی کھُلی تھی۔ رات کو بیرک میں سوتے تھے۔ باہر تالے لگ جاتے تھے"— طاہر پرویز نے بتایا— "صبح ہوتے ہی دروازے کھل جاتے اور ہم جیل کے اندر حوالاتیوں کے احاطے میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ وہاں مجھ پر کچھ اور انکشافات ہُوئے۔ بیرک پر ایک تو باوردی سنتری ہوتا تھا اور ایک قیدی نمبردار۔ لمبی قید کے کسی پرانے قیدی کو قیدیوں پر نمبردار بنا دیا کرتے ہیں جیل میں اگلے ہی دن اس نمبردار نے ہمیں اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ بھی اعلانِ تاشقند پر بھڑکا ہُوا تھا۔ اُس نے جب کہا کہ قیدیوں نے بھی جنگ میں بھرپور حصّہ لیا تھا تو ہم میں سے کچھ لڑکے ہنس پڑے کہ یہ شخص کیسا جھوٹ بول رہا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے۔ بعد میں جیل کے سنتریوں اور چند اور سزا یافتہ قیدیوں نے بھی ہمیں بتایا کہ کھیم کرن کے محاذ پر چھوٹی چھوٹی نہروں اور کھڈوں کے کنارے گولہ باری سے ٹوٹ پھوٹ جاتے اور پانی دُور دُور تک پھیل جاتا تھا۔ اس سے فوجیوں کو اور خاص طور پر ٹینکوں کو چلنے میں بہت دشواری ہوتی تھی....

"لاہور جیل کے قیدیوں کو علی الصبح ٹرکوں میں کھیم کرن کے محاذ پر لے جاتے تھے اور قیدی کھڈوں وغیرہ کے ٹوٹے ہوئے کناروں پر مٹی ڈال دیتے تھے بعض اوقات فوجی گاڑیاں دلدل میں پھنس جاتیں تو قیدی انہیں دھکا لگا کر باہر نکال دیتے تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُن پر کوئی پہرہ نہیں ہوتا تھا محاذ پر جا کر یہ دُور دُور بکھر جاتے تھے۔ یہ سب سزا یافتہ تھے کئی بار ایسے بھی ہُوا کہ دشمن کے جہاز آگئے اور اُنہوں نے راکٹ یا بم برسائے یا دشمن کے توپ خانے کے گولے وہاں تک پہنچنے لگے جہاں قیدی کام کر رہے ہوتے تھے۔ اس صُورتِ حال میں قیدی اِدھر اُدھر بھاگ جاتے تھے لیکن شام کو سب اکٹھے ہو جاتے اور گنتی پوری ہوتی تھی۔ ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کوئی قیدی فرار ہو گیا ہو....

"ایک وارڈر نے ہمیں سنایا کہ ایک شام قیدی واپس جیل میں آئے تو ایک قیدی کم تھا۔ کاغذوں میں لکھ لیا گیا کہ وہ گولہ باری میں مارا گیا ہے یا بھاگ گیا ہے۔ اُس روز بڑی شدید اور بہت زیادہ گولہ باری ہوتی تھی۔ توقع یہی تھی کہ بہت سے قیدی مارے گئے ہوں گے لیکن سب زندہ واپس آگئے سوائے اس ایک کے۔ رات کے پچھلے پہر وہ قیدی جو کم تھا وہ اکیلا ہی آگیا۔ وہ گولہ باری سے بچنے کے لیے کہیں چھُپ گیا تھا۔ گولہ باری ختم ہُوئی تو سُورج غروب ہونے والا

تھا جب وہ واپس کام کی جگہ آیا تو قیدی جا چکے تھے۔ وہ وہاں سے پیدل چل پڑا۔ چونکہ قصور جنگ کی زد میں تھا، اس لیے وہاں سے کوئی سواری نہیں مل سکتی تھی۔ قصور خالی تھا۔ وہ پیدل ہی لاہور کی طرف چل پڑا۔ چھ سات میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اُسے ایک فوجی ٹرک لاہور کی طرف جاتا نظر آیا جو اُس کے اشارے پر رُک گیا۔ اُس نے فوجیوں کی منّت سماجت کی کہ وہ قیدی ہے اور اُس کے ساتھی واپس جا چکے ہیں اس لیے اُسے بھی جیل پہنچا دیا جائے۔ فوجی اُسے ٹرک میں بٹھا کر جیل کے دروازے پر چھوڑ گئے....

"ابّو جان! یہ تو مجھے یقین تھا کہ قوم کا بچّہ بچّہ اپنے ملک کو دشمن سے بچانے کے لیے بیدار ہو گیا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ جن لوگوں کو ہم سوسائٹی کے دُھتکارے ہُوئے انسان سمجھتے تھے وہ بھی اتنے سچے پاکستانی بن گئے ہوں گے۔"

"بیٹا، وہ اس لیے چور، راہزن اور ڈاکو بنے ہیں کہ سوسائٹی نے انہیں دُھتکار دیا تھا"— ارشد کے باپ نے کہا— "انسان کا جذبہ مرا نہیں کرتا۔ اسے وقتی طور پر دبایا جا سکتا ہے اب بھی اس جذبے کو دبانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہم جب آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، اُس وقت چرسی بھنگی اور چھوٹے چھوٹے جرائم کرنے والے بھی ہمارے ساتھ تھے۔ جو کام اُنہوں نے کیے ہیں وہ ہم مہذّب لڑکے نہیں کر سکتے تھے۔ اپنی ماں سے پوچھو۔ ایک جلوس کی قیادت اسی نے کی تھی۔ وہ جلوس اتنا بڑا تھا کہ اسے روکنے کے لیے فوج بلائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک انگریز لیفٹیننٹ تھا جسے مسلمانوں نے وہیں غائب کر دیا تھا اور رات کو قبرستان کے تکیے پر رہنے والے ملنگوں نے اُسے قتل کر کے اُس کی لاش دفن کر دی تھی۔"

"مسلمان اُس وقت اپنے جذبے سے دستبردار ہوتا ہے جب اُس کا گھر دولت سے بھر جاتا ہے"— طاہرہ نے کہا۔

"جس مٹی کے بنے ہُوئے انسان جیل میں سزائیں بھگتتے دیکھ آئے ہو، وہ مٹی بڑی زرخیز ہے"— ارشد نے کہا— "یہ تو ہم ہیں جنہوں نے اُس مٹی کو کسی اور سانچے میں ڈھال لیا ہے۔"

"دو تین دن بعد ہمارا قیدی نمبردار اُس قیدی کو ساتھ لے آیا جو اکیلا پیچھے رہ گیا اور واپس آگیا تھا"— طاہر پرویز نے کہا— "اُس قیدی نے ہمیں اپنا وہ کارنامہ یا واقعہ نہ سنایا۔ اس کی بجائے اُس نے کہا— "اگر مجھے اُس وقت یہ پتہ چل جاتا کہ یہ جنگ ہماری نہیں، یہ حکمرانوں کی جنگ ہے اور یہ ایک سیاسی کھیل تماشہ ہے تو میں جیل میں واپس آنے کی بجائے کراچی کی طرف نکل جاتا پھر میں دیکھتا مجھے کون پکڑتا ہے لیکن اُس وقت یہی ایک دھن سوار تھی کہ میں اگر اِدھر اُدھر ہو گیا تو معلوم نہیں پاکستان کا کیا بنے گا"— وہ اتنی سی بات کہہ کر چلا گیا۔"

✪

طاہر پرویز نوجوان تھا۔ اُس کے چہرے پر لڑکپن کے آثار ابھی باقی تھے لیکن اُس کے انداز اور اُس کے بولنے کے لہجے سے یُوں پتہ چلتا تھا جیسے اُس نے عمر کے تجربے اور عقل و دانش کے بہت سے مدارج طے کر لیے ہوں۔ وہ جوشیلا لڑکا تھا۔ اتنا سنجیدہ کبھی نہ ہُوا تھا جتنا اب تھا۔ اب

اُس کے جذبوں میں سنجیدگی اور متانت آگئی تھی۔

"اور امّی!"۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔"میں نے ہندوستان کا ایک جاسوس بھی دیکھا ہے۔ وہ پاکستانی ہے۔ اُسے عمر قید دی گئی تھی۔ پانچ چھ سال گزار چکا ہے۔ ایک روز وہ ہمارے وارڈ میں آگیا۔ جیل میں اُسے کوئی پڑھنے لکھنے کا کام دیا گیا تھا۔ وہ ہمارے نام پتے لکھنے آیا تھا۔ ہمیں قیدی نمبردار نے بتایا کہ اُسے جاسوسی کے الزام میں سزا ملی ہے۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ وہ واقعی جاسوس ہے؟ اُس نے بلا جھجک کہا کہ دشمن کا جاسوس ہونا کوئی بُری بات نہیں۔ وہ اب بھی اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ اُس نے پاکستان کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ اُسے قید کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اُس کے گھر والوں کو بہت پیسے مل رہے ہیں جو اُس کی قید ختم ہونے تک ملتے رہیں گے۔۔۔۔

"ہم نے اُس سے بہت سی باتیں پُوچھیں۔ اُس نے کہا۔۔۔'میرے پیشے اور فن کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ میں تمہیں جو بات بھی بتاؤں گا وہ صحیح ہوگی اور جو بات صحیح ہوگی وہ اتنی کڑوی ہوگی کہ تم برداشت نہیں کر سکو گے اور کہو گے کہ یہ جھُوٹ ہے۔ میں تمہیں کام کی ایک دو باتیں بتا دیتا ہوں۔ ضروری نہیں کہ تم بھارت سے لڑائیاں ہی لڑتے رہو۔ یہ جذبہ جو ستمبر کی جنگ میں پاکستانیوں میں پیدا ہو گیا تھا، اگر اسے زندہ رکھا جائے تو بھارت تمہارے سامنے کبھی سر نہ اُٹھا سکے۔ بھارت کی تو ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ پاکستانیوں میں قومی جذبہ پیدا نہ ہو مگر تمہارے اپنے حکمران بھی یہی چاہتے ہیں کہ قوم نیم مُردہ رہے اور وہ اطمینان سے حکومت کر سکیں۔ تمہیں کیوں جیلوں میں بند کر دیا گیا ہے؟ صرف اس لیے کہ تم اپنے دشمن کے مقابلے میں زندہ و بیدار رہنا چاہتے ہو۔ ایسے جوشیلے اور وطن پرست عوام اپنے حکمرانوں کے لیے بھی خطرہ بن جایا کرتے ہیں'۔۔۔۔

"ابّو! میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ شخص کس طرح ہماری اور ہمارے حکمرانوں کی نفسیات اور ذہنیّت کو سمجھتا ہے۔ بیشک وہ پاکستانی ہی ہے لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اُسے نفسیات اور سیاست کے ماہرین نے ٹریننگ دی ہے۔ وہ دراصل ہمارے دماغ بھی خراب کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ کچھ باتیں سچی بھی کہہ رہا تھا۔ اُس نے کہا۔۔۔'بھارت کو پُوری اُمید تھی کہ وہ پاکستان پر قبضہ کر لے گا اور پاکستان بھارت کا حصّہ بن جائے گا لیکن پاکستانیوں نے مُعجزہ کر دکھایا۔ اب بھارت پاکستان کو دوسرے طریقوں سے کمزور کرے گا جن میں ایک یہ ہے کہ تم جیسے کچّے ذہنوں کو اتنا پراگندہ کر دیا جائے گا کہ تم آج جو جذبہ لیے ہُوئے اپنی حکومت کے خلاف مظاہرے کر رہے ہو، تمہارے اندر موجُود ہی نہیں رہے گا'۔۔۔۔

"ہم نے اُس سے پوچھا کہ وہ طریقے کیسے ہوں گے۔ وہ ہنس پڑا۔ اُس نے کہا۔۔۔'یہی تو وہ راز ہے جو ہم تمہیں نہیں بتائیں گے۔ وہ وقت جلدی آ جائے گا جب تم جیسے نوجوان ۔۔۔ بھارت زندہ باد ۔۔۔ کا نعرہ لگائیں گے۔ تم ہندو اور یہودی کی عقل تک نہیں پہنچ سکتے۔ طاقت جو ہندو اور یہودی کی نوجوان اور حسین لڑکیوں میں ہے اُس کا مقابلہ تمہارے ٹینک اور توپ خانے نہیں کر سکتے۔

اس وقت بھارت کے جاسوسی نظام کا ایک اور شعبہ تمہارے اندر سرگرم ہے جسے ففتھ کالم کہا جاتا ہے۔ ایک طرف بھارت کا یہ شعبہ تم جیسے نوجوانوں کو بھڑکا رہا ہے، دوسری طرف ہمارے آدمی ایسے سرکاری احکام نافذ کروا رہے ہیں جو پاکستانیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیں گے۔ ستمبر میں تم لوگوں نے صرف ایک کامیابی حاصل کی ہے کہ عوام میں اور فوج میں بڑا گہرا جذباتی تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ بھارت کا ففتھ کالم اپنے طریقوں سے اس تعلق کو توڑ رہا ہے۔ آگے چل کر تم دیکھو گے کہ عوام مظاہرے کریں گے تو ان کے خلاف تمہارے اپنے سیاسی لیڈر فوج لے آئیں گے تاکہ پاکستان کے عوام اور فوج میں جو محبّت پیدا ہو گئی ہے وہ ختم ہو جائے۔ اس کے پیچھے بھارت کا ہاتھ ہو گا۔ بھارت یہ خفیہ عمل شروع کر چکا ہے۔ تم دیکھو گے کہ پاکستان کے ٹکڑے ایک ایک کر کے الگ ہوتے جائیں گے'۔"

طاہر پرویز یہ باتیں سنا رہا تھا اور اُس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"پاکستان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا بیٹا!"۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔۔۔"یہ ان حکمرانوں کی جاگیر نہیں۔ یہ شہیدوں کی سرزمین ہے۔ اس کے ساتھ جس نے بھی بیوفائی اور غدّاری کی وہ بہت بُرے انجام کو پہنچے گا۔ یہ پاکستان تمہارا ہے۔ یہ تم جیسے نوجوانوں نے بنایا تھا۔"

رات کو ارشد اور طاہرہ نے طاہر پرویز کو اُس وقت کے قصّے سنا کر جب وہ خود نوجوان تھے اُس کی پریشانی دُور کر دی اور اُس کے جذبے کو تر و تازہ کر دیا۔

"ابّو!"۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔"کمیشن کے لیے میری عمر اب پُوری ہو گئی ہے۔ میں درخواست دے دوں؟"

"ہاں بیٹا!"۔۔۔ طاہرہ بولی۔۔۔"تمہیں فوج میں ہی جانا ہے۔"

اگلی شام رجب علی، سلمیٰ اور شازی لاہور آ گئے۔ اصغر اب ٹھیک ہو چکا تھا۔ وہ اپنی یونٹ میں چلا گیا۔ ارشد اور طاہرہ کو اطلاع ملی تو وہ طاہر پرویز کو ساتھ لے کر دوڑے گئے۔ طاہرہ بیتابی سے رجب علی کے گلے لگ گئی۔ شازی سے ارشد اور طاہرہ پہلے راولپنڈی میں مل چکے تھے۔ جب وہ رجب علی سے ملنے گئے تھے۔ رات دیر تک وہ کہانیاں اور کارنامے سنتے اور سناتے رہے۔ طاہرہ کی تمام تر محبّت اور دلچسپیاں شازی پر مرکوز تھیں۔

"ارشد اور طاہرہ!"۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔۔۔"تم دونوں شازی کے معاملے میں بہت جذباتی معلوم ہوتے ہو۔ تمہیں اس سے زیادہ جذباتی ہونا چاہیئے لیکن احتیاط سے کام لینا۔ شازی پر دو نظریں لگی ہوتی ہیں۔ ایک تو اپنی انٹیلی جنس ہے اور دوسری بھارت کی سیکرٹ سروس۔ شازی ان دونوں کی نظر میں مُجرم ہے۔ یہ تو صرف میں جانتا ہوں یا اب تمہیں پتہ چلا ہے کہ شازی کے جذبے اور احساسات کیا ہیں لیکن پاکستان کے قانون کی نظر میں یہ جاسوسی کی مجرم ہے۔ اسے سزا اس لیے نہ دی گئی کہ یہ وعدہ معاف گواہ تھی۔ پاکستان کے قانون اور انٹیلی جنس کا یہ شُبہ بجا ہے کہ یہ لڑکی اپنے اس جرم کو دُہرا بھی سکتی ہے۔ ہمارے دشمن کی انٹیلی جنس تو اسے اغوا یا قتل کرنے کی پوری کوشش کرے گی کیونکہ شازی ایک راز ہے جس میں نہ جانے دشمن کے کتنے راز پوشیدہ ہیں۔

"آپ یہ راز شازی کے سینے سے نکال کر اپنی انٹیلی جنس کے آگے کیوں نہیں رکھ دیتے؟" — ارشد نے پوچھا۔

"میں نے اپنے سینے میں کوئی راز نہیں رہنے دیا" — شازی بولی "میں جو کچھ جانتی تھی، وہ میں نے ملٹری انٹیلی جنس کو بتا دیا تھا۔ مجھے اپنا سینہ نہیں اپنی روح اور اپنے ضمیر کو صاف کرنا تھا۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں شازی کے متعلق ضرورت سے زیادہ چوکنّا رہنا چاہیئے" — رجب علی نے کہا — "میں اسے زیادہ باہر نہیں نکلنے دوں گا۔"

✪

جنگِ ستمبر کے ہنگامے لوگوں کے دلوں میں سمٹ گئے تھے لیکن جنگِ ستمبر ایک جذبہ بن گئی تھی۔ یہ جذبہ انگاروں کی طرح ابھی تک دہک رہا تھا۔ تاشقند کی برف اس جذبے کو سرد نہیں کر سکی تھی۔ صرف اتنی تبدیلی آئی تھی کہ مظاہرے اور ہنگامے سرد پڑ گئے تھے لیکن ملک ناصر کے گاؤں میں جنگِ ستمبر ایک اور ہی ہنگامہ بپا کر گئی تھی۔

ملک ناصر کو دفن ہوتے چند دن گزر گئے تھے۔ اُس کی بیوی جو اسلام آباد میں اُس کی لاش دیکھ کر دماغی توازن کھو بیٹھی تھی اور ڈاکٹر نے اُسے بڑا تیز انجکشن دے دیا تھا، اب حقیقت کی طرف آنے لگی تھی۔ اُسے ابھی تک ذہنی سکون کی گولیاں دی جا رہی تھیں۔ ان گولیوں نے اُس کے ذہن کو دبا لیا اور حقیقی سوچوں کو بیدار کر دیا تھا۔ اب وہ سوچتی تھی، پوچھتی تھی اور دوسروں کو سوچنے پر اور جواب دینے پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اُس کے ہر ایک سوال کا جواب دیں۔ اپنی بیٹی شمیم کے کسی بھی جواب پر وہ مطمئن نہیں تھی۔

ملک ناصر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اُس کا خاندان معمولی حیثیت کا خاندان نہیں تھا۔ یہ ایک جاگیر دار خاندان تھا۔ اردگرد کے دس بارہ دیہات کی حیثیت ایک ریاست کی سی تھی جس پر ملک ناصر کے خاندان کی حکمرانی تھی۔ اس خاندان نے انگریزوں سے جاگیریں حاصل کی تھیں اور پاکستان کو اسمبلیوں کے کئی ایک ممبر دیئے تھے۔ سیاست کو سمجھے بغیر یہ لوگ سیاست کے کھلاڑی تھے۔ ایسے خاندان کے ایک سرکردہ فرد کا پھانسی چڑھ جانا کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جسے چند دنوں بعد لوگ بھول جاتے۔ ہر ایک گاؤں پر جو اس خاندان کی رعایا میں شامل تھا، سنّاٹا طاری تھا۔ لوگ ڈرتے پوچھتے بھی نہیں تھے کہ ملک ناصر نے کسے قتل کیا ہے کہ اُسے پھانسی چڑھا دیا گیا ہے۔

کوئی غریب اور گمنام آدمی پھانسی چڑھ جاتے تو جہاں جہاں تک خبر پہنچتی ہے سنسنی پھیل جاتی ہے اور فضا میں ایک سوالیہ نشان منڈلانے لگتا ہے جنہیں اصل بات کا پتہ نہیں چلتا وہ خود کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔ یہ تو ملک ناصر تھا۔ لوگ سوالیہ نشان بنے ہوئے کھُسر پھُسر کرتے تھے۔ ملک ناصر کے لواحقین نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ اُن کے دیرینہ دشمنوں نے انتقام لینے کے لیے پھندا بنایا اور ملک ناصر کو بے گناہ سزائے موت دلا دی لیکن لوگ اس کہانی پر یقین نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ خاندان کسی کے پھندے میں آنے والا نہیں تھا۔ یہ تو قتل کرنے اور دوسروں کو پھانسی چڑھوانے والا خاندان تھا۔ آباؤ اجداد سے لے کر ملک ناصر تک یہ خاندان معلوم نہیں اپنے کتنے دشمنوں کو قتل کر کے لاشیں غائب کر چکا تھا۔

اخباروں میں اتنی سی ہی خبر چھپی تھی کہ بھارت کے جاسوسوں اور تخریب کاروں کا ایک گروہ پکڑا گیا ہے۔ پھر یہ خبر چھپی تھی کہ ایک سپیشل ٹریبونل نے اس گروہ کے دو آدمیوں کو سزائے موت اور باقی سب کو مختلف میعاد کی سزائیں دی ہیں مصلحتاً مجرموں کے نام نہیں لکھے گئے تھے۔ گاؤں میں یہ تو کوئی بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتا کہ ملک ناصر کو جاسوسی کے جُرم میں سزائے موت دی گئی ہے۔ اُس کے لواحقین کو سرکاری طور پر بتایا گیا تھا کہ وہ بھارت کا جاسوس تھا لیکن اُس کے گھر کا کوئی فرد یہ تسلیم نہیں کرتا تھا۔

یہ خاندان جیسا کیسا بھی تھا، اس پر بھارت نوازی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا تھا جب ستمبر کی جنگ لڑی جا رہی تھی تو اس خاندان نے گندم کے ٹرک بھر کر فوج کو دیئے تھے۔ نئی رضائیاں اور بے اندازہ رقم دفاعی فنڈ کے حوالے کر دی تھی۔ اس خاندان کی جنگی خدمات اور ایثار کو معاشرتی اور سرکاری سطح پر کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

✪

ملک ناصر کے خاندان کے افراد جہاں بیٹھتے اور جس سے بھی ملتے ان نامعلوم لوگوں کو گالیاں اور انتقام کی دھمکیاں دیتے جنہوں نے نہ جانے کیسی سازش کر کے ملک ناصر جیسے آدمی کو پھانسی چڑھوا دیا تھا۔ صرف شمیم تھی جس نے صرف ایک بار کہا تھا کہ ابّو بھارت کے جاسوس تھے۔ اس کے بعد اُس کی زبان بند ہو گئی تھی بلکہ زبان گھونسوں، تھپڑوں اور لاتوں سے بند کر دی گئی تھی۔ پہلے ماں نے اُس کا مُنہ اور اُس کے بال نوچے تھے اور جب اس کے چچوں اور تایا کو پتہ چلا تو اُنہوں نے اپنے رواج کے مطابق اُس کی خوب پٹائی کی تھی۔

شمیم کی پٹائی کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ وہ اپنے مرے ہوئے باپ کو بھارت کا جاسوس کہتی تھی بلکہ بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس کی ماں نے اپنے اور ملک ناصر کے بھائیوں کو بتا دیا تھا کہ شمیم نے اسلام آباد والی کوٹھی میں معلوم نہیں کس کس کو رکھا ہوا تھا۔ ماں نے جذبات اور بیوگی کے غم کی شدّت میں یہاں تک کہہ ڈالا تھا کہ باپ نے اس لڑکی کو اتنا سر چڑھا رکھا تھا کہ وہ یہ بھی نہیں دیکھتا تھا کہ گھر میں لڑکی کے کچھن کیا ہیں۔

یہ تو پہلے ایک دو دنوں کی باتیں ہیں جب ملک ناصر کی لاش گاؤں میں پہنچی تھی۔ کچھ دن گزر گئے تو ملک ناصر کی بیوی حقیقی زندگی میں واپس آنے لگی۔ وہ ہوش میں آتے ہی کسی کو بتائے بغیر قبرستان چلی گئی اور ملک ناصر کی قبر پر گر کر بے تحاشہ روئی۔ آنسوؤں نے سیلاب کی طرح بہہ کر اُسے پوری طرح بیدار کر دیا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح قبرستان سے گھر آئی اور آتے ہی اُس نے ہنگامہ بپا کر دیا۔ وہ شمیم پر برس پڑی۔ شمیم چوبارے کے کمرے میں جا چھپی۔ اُس کی ماں نے اس قدر اودھم مچایا کہ نوکر چاکر دوڑے گئے اور اُس کے اور ملک ناصر کے بھائیوں کو بلا لاتے۔ یہ عورت اُن کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔

بڑی مشکل سے اُسے ٹھنڈا کیا گیا۔ کسی نے کہا کہ شہر سے ڈاکٹر کو بلا لیتے ہیں۔

"نہیں" — ملک ناصر کی بیوہ نے گرج کر کہا — "مجھے اب کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ میں پوری

طرح ہوش میں آچکی ہوں۔ اس چڑیل کو میرے سامنے لاؤ جس نے میرے شیر جیسے خاوند کو پھانسی کے تختے تک پہنچایا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" — شمیم کے تایا نے پوچھا اور کہا — "نام لو اُس کا، ہم اُسے تمھارے سامنے گولی ماریں گے۔"

"تم اُسے گولی نہیں مارو گے" — ملک ناصر کی بیوہ نے کہا — "وہ جب زندہ تھا تو مجھے ہی گولی مارتا تھا، اپنی بیٹی کو کچھ نہیں کہتا تھا۔ مرنے والے کا سارا پیار اسی بیٹی کے لیے تھا۔ میں تو پرانی جوتی کی طرح کونے کے ایک کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ اس بیٹی کو باپ نے کالج میں کیا داخل کرایا کہ بیٹی نے مجھے اپنی نوکرانی سمجھ لیا کیونکہ میں اَن پڑھ ہُوں۔ آج اُس بیٹی نے اپنے باپ کو قبر میں اتار رہا ہے۔ اس نے مجھے بھی پتہ نہیں چلنے دیا کہ کیا ہو رہا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا ورنہ میں تمھیں اطلاع دے دیتی۔"

گھر کے تمام مرد اس کے پیچھے پڑ گئے کہ ان پہیلیوں کی بجائے سیدھی بات کرو۔ ان مردوں کی آنکھوں میں خون اُترا ہُوا تھا۔ اس خاندان کی تاریخ میں قتل بیشمار کیے گئے تھے لیکن پھانسی یہ پہلا آدمی چڑھا تھا۔ آخر شمیم کی ماں اُنہیں بتانے لگی کہ وہ اسلام آباد کی کوٹھی میں کیا کچھ دیکھتی رہی ہے۔ اُس نے ملک رجب علی کا نام لیا اور بتایا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اُن کے گھر مہینوں رہا ہے۔ اُس کا ایک بیٹا فوج میں کپتان ہے۔ وہ کبھی کبھی کوٹھی میں آیا کرتا اور شمیم اُسے اپنے کمرے میں لے جا کر دروازہ بند کر لیتی تھی۔ ملک رجب علی کی بیوی کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ اچھے چال چلن کی عورت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ شمیم کی ماں وہاں جو کچھ دیکھتی رہی تھی وہ اُس نے بڑھا چڑھا کر اس طرح بیان کیا جیسے ان سب نے ملک ناصر کو کسی سازش کے جال میں پھانس رکھا تھا اور وہاں بدکاری ہوتی رہی ہے۔

"یہ تمھاری غلطی ہے" — شمیم کے بڑے ماموں نے کہا — "تم نے ہمیں پہلے کیوں نہ بتایا؟ ہم اتنا عرصہ تمھیں دیکھنے بھی نہ آسکے۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے بھاگ اس طرح پھُوٹ جائیں گے" — ملک ناصر کی بیوی نے اپنے سینے پر دوہتڑ مارتے ہُوئے کہا — "میری وہاں سُنتا ہی کون تھا۔ مرنے والے نے ایک کار اور ڈرائیور مجھے دے رکھا تھا اور یہ اجازت کہ جہاں جی چاہے گھوم پھر آیا کرو۔"

"یہ ملک رجب علی کون تھا؟" — ملک ناصر کے بڑے بھائی نے پُوچھا۔

"تم سب اُسے جانتے ہو" — شمیم کی ماں نے کہا — "پاکستان بننے سے پہلے وہ اُدھر ہمارے علاقے میں تھانیدار رہ چکا ہے۔ یہاں آکر ڈی۔ ایس۔ پی ہو گیا تھا۔ اب پنشن پر آگیا ہے۔ اُدھر بھی ملک ناصر کے ساتھ اُس کی بڑی گہری یاری تھی۔"

"اوہ!" — بیک وقت تین چار آدمیوں نے کہا — "وہ رجب علی۔ ملک اللہ یار خان کا بیٹا، وہ تو ہمارا بھی یار تھا۔"

"پھر تم اُس سے پوچھو" — شمیم کی ماں نے کہا — "وہ سب کچھ جانتا ہے آج کل لاہور میں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے" — شمیم کے تایا نے کہا — "گلبرگ میں اُس کی کوٹھی ہے۔ میں ایک مرتبہ وہاں گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اُس نے دوسری شادی کر لی تھی۔"

سب نے فیصلہ کیا کہ شمیم سے کچھ نہ پوچھا جائے اور اس کی کسی بات پر اعتبار بھروسہ بھی نہ کیا جائے۔ شمیم کا تایا، ایک چچا اور ایک ماموں اُسی وقت لاہور کو روانہ ہو گئے۔

✪

ملک رجب علی کوٹھی کے لان میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ ایک کار کوٹھی میں داخل ہُوئی۔ اس میں سے تین آدمی نکلے۔ رجب علی کرسی سے اُٹھا۔ وہ ان تینوں کو جانتا تھا۔ دو ملک ناصر کے بھائی اور ایک اُس کی بیوہ کا بھائی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ کیوں آئے ہیں۔ اُن کے چہروں پر غم اور دکھ کی سنجیدگی تھی۔ ملک رجب علی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ نہ آئی۔ وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

"ملک ناصر تو آپ کا بڑا گہرا دوست تھا" — ملک ناصر کے بڑے بھائی نے رجب علی سے کہا — "آپ اُس کے جنازے پر بھی نہ آئے۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ اُس روز راولپنڈی میں تھے جب جیل سے ملک ناصر کی لاش آئی تھی۔"

"میں اُس وقت ہسپتال میں تھا" — ملک رجب علی نے کہا اور اپنی مصنوعی ٹانگ سے پتلون اُوپر کو سرکائی — "میری ٹانگ کٹ چکی ہے مصنوعی ٹانگ سے چلنا مشکل تھا، ورنہ میں ضرور آتا۔"

"ٹانگ ایکسیڈنٹ میں ضائع ہُوئی ہے؟"

"جی ہاں!" — ملک رجب علی نے جواب دیا — "ایکسیڈنٹ میں.... اسی ایکسیڈنٹ نے ملک ناصر کو پھانسی کے تختے تک پہنچایا ہے۔"

"ملک صاحب!" شمیم کے ماموں نے کہا — "یہ قصّہ کیا ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ ملک ناصر بھارت کا جاسوس تھا اور اُسے اسی جرم میں سزائے موت ہوئی ہے؟"

"جی ہاں!" — ملک رجب علی نے جواب دیا — "اُسے اسی جرم میں سزائے موت ہوئی ہے۔"

"آپ کس طرح یقین سے کہہ سکتے ہیں؟" — شمیم کے ماموں نے کہا — "ملک ناصر آپ کا تو دوست تھا۔ کیا آپ بھی اُسے بدنام کرتے ہیں؟"

"اگر میری ٹانگ نہ کٹ جاتی تو آپ کی طرح میں بھی یقین نہ کرتا کہ ملک ناصر جاسوس تھا" — ملک رجب علی نے کہا — "اُس نے اپنے کیے کی سزا پا لی ہے۔ اب نہ کریدیں کہ اُس نے کیا کیا تھا۔"

"ہم کریدنے کے لیے تو آئے ہیں" — ملک ناصر کے بڑے بھائی نے کہا — "ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ کو ساری بات معلوم ہے.... ملک صاحب! آپ ہمارے خاندان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہماری بے عزّتی ہو رہی ہے۔ لوگ ہمارے خاندان کو ہندوؤں کا جاسُوس کہہ رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ یہ الزام غلط ہے۔"

"آپ سب کو بتا دیں کہ یہ الزام غلط ہے" — ملک رجب علی نے کہا — "آپ عقل والے لوگ ہیں۔ ملک ناصر اپنے گناہ اور اپنی نیکیاں اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ لوگوں کا کیا ہے! کچھ دن

اور باتیں کر کے چُپ ہو جائیں گے۔ سچی بات میں نے آپ کو بتا دی ہے۔ اس سے زیادہ نہ سنیں تو بہتر ہے۔ آپ کو دُکھ ہو گا۔"

"آپ نے ہمیں سچّی بات بتا دی ہے تو ایک دو سچّی باتیں ہم سے بھی سُن لیں" ـــ ملک ناصر کی بیوہ کے بھائی نے کہا ـــ "ہمیں صرف یہ بتا دیں کہ ملک ناصر کے خلاف مُخبری کس نے کی تھی۔ ہمیں اُس کا اَتا پتہ بتا دیں۔"

"اُسے کیا کہیں گے آپ؟"

"کہیں گے کچھ بھی نہیں" ـــ ملک ناصر کے چھوٹے بھائی نے کہا ـــ "کچھ کہے بغیر اُسے غائب کر دیں گے۔ اُس کی لاش کا نشان بھی نہیں ملے گا۔"

"اگر مُخبری کرنے والا ہمارے خاندان کا کوئی فرد ہُوا تو وہ بھی زندہ نہیں رہے گا" ـــ ملک ناصر کی بیوہ کے بھائی نے کہا۔

"ملک رجب!" ـــ ملک ناصر کے بڑے بھائی نے کہا ـــ "آپ ہمارے خاندان کی اُونچ نیچ سے واقف ہیں۔ آپ خود عزّت دار ہیں۔ میں آپ کو اپنا اصل مسئلہ بتاتا ہوں۔ ملک ناصر کی بیوی بیوگی کے صدمے کو برداشت نہیں کر سکی۔ راولپنڈی میں ملک ناصر کی لاش دیکھتے ہی وہ پاگل ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے آکر اُسے انجکشن دیا جس نے اُسے اگلے دن تک بیہوش رکھا۔ پھر اُسے ہم ڈاکٹر کی لکھی ہُوئی گولیاں دیتے رہے۔ اب وہ ہوش میں آگئی ہے۔ اُس نے سب سے پہلے اپنی بیٹی پر حملہ کیا ہے۔ کہتی ہے کہ اسے گولی مار دو، اِس نے مجھے بیوہ کیا ہے۔"

"آپ شمیم کی بات کر رہے ہیں؟"

"جی! شمیم کی" ـــ ملک ناصر کے بڑے بھائی نے کہا ـــ "ہماری بیوہ بھابی کہتی ہے کہ آپ اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ملک ناصر کی کوٹھی میں رہے ہیں۔ وہ آپ کے بیٹے اور اپنی بیٹی کے متعلق بھی کچھ اُلٹی سیدھی باتیں کرتی ہے..... آپ میرا اشارہ سمجھ لیں ملک رجب! ہمیں صرف یہ بتا دیں کہ اپنے باپ کو پکڑوانے میں شمیم کا ہاتھ ہے؟ یہ بھی بتائیں کہ آپ کا بیٹا شمیم کے ساتھ الگ کمرے میں بیٹھا رہتا تھا؟"

✪

ملک رجب علی سمجھ گیا کہ یہ تینوں کس نیّت سے آتے ہیں۔ وہ اس خاندان کو سرحد پار سے جانتا تھا۔ ان پر جاگیر کا نشہ سوار تھا۔ کسی اپنے یا غیر کو قتل کرا دینا ان کے ہاں رواج تھا۔ وہ انگریز کا قانون تھا جسے توڑنا اور سزا سے بچنا آسان نہیں تھا لیکن یہ لوگ سزا سے بچ جاتے تھے۔ پاکستان کے قانون کو تو اُنہوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ ملک رجب علی جانتا تھا کہ اُنہیں ذرا سا بھی شُبہ ہو گیا کہ ملک ناصر کو پکڑوانے میں شمیم کا ہاتھ ہے تو یہ اُس کی لاش غائب کر دیں گے اور اگر انہیں یقین ہو گیا کہ شمیم اصغر کو چاہتی تھی تو اصغر کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ شمیم کو ملک رجب علی بہرحال بچانا چاہتا تھا۔ اُس کا یہ کارنامہ معمولی نہیں تھا کہ اُس نے اپنے باپ کو پکڑوا دیا اور دشمن کے جاسوسوں کا ایک بڑا مضبوط گروہ توڑ دیا تھا۔

"آپ کہتے ہیں ملک ناصر کی بیوہ اب ہوش میں آئی ہے" ـــ رجب علی نے کہا ـــ "آپ بڑے سیدھے لوگ ہیں۔ وہ اگر پہلے سے زیادہ پاگل نہیں ہُوئی تو پہلے سے بہتر بھی نہیں ہُوئی۔ یہ بات کہ شمیم نے اپنے باپ کو پکڑوایا تھا، کوئی پاگل انسان ہی کہہ سکتا ہے۔ شمیم کو اپنے باپ سے جو پیار تھا وہ آپ نے دیکھا ہو گا۔ باپ بیٹی ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ کیا آپ مان لیں گے کہ اس لڑکی نے اپنے باپ کے خلاف زبان کھولی ہو گی؟..... اگر اس نے باپ کو پکڑوایا ہوتا تو عدالت میں اس کا بیان نہ لیا جاتا؟ اُس کا بیان کسی عدالت میں نہیں ہُوا۔"

"ملک صاحب!" ـــ ملک ناصر کے بڑے بھائی نے ملک رجب علی سے پوچھا ـــ "آپ اتنا عرصہ وہاں کیا کرتے رہے ہیں؟ آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ جس ایکسیڈنٹ میں آپ کی ٹانگ ضائع ہوئی ہے اسی ایکسیڈنٹ نے ملک ناصر کو پھانسی کے تختے تک پہنچایا ہے؟"

"ملک رجب علی!" ـــ ملک ناصر کے دوسرے بھائی نے کہا ـــ "ہم آپ سے پوچھنے آئے ہیں کہ یہ سب کیا چکر تھا اور یہ کیا ڈرامہ کھیلا گیا ہے۔ ہمارا بھائی ضائع ہو گیا ہے۔ یہ گھونٹ اتنا کڑوا ہے کہ ہم اسے نگل نہیں سکتے۔ ہم تہہ تک پہنچیں گے۔ آپ کو سب معلوم ہے۔ آپ کو بتانا پڑے گا۔"

"ملک صاحب!" ـــ شمیم کے ماموں نے بڑے رُعب سے کہا ـــ "ہمیں کہیں نہ کہیں سے اصل بات معلوم ہو ہی جائے گی، پھر ہماری اور آپ کی دوستی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ آپ ہمیں جانتے ہیں کہ جس کے ساتھ ہم دوستی ختم کر دیتے ہیں اُس کے عزیز رشتہ دار باقی عمر پچھتاتے رہتے ہیں..... آپ ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ آپ کے لیے بہتر یہی ہے کہ پردہ اُٹھا دیں۔"

"اگر میں کچھ بھی نہ بتاؤں تو میرے عزیز رشتہ دار باقی عمر پچھتاتے رہیں گے؟" ـــ ملک رجب علی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"اگر آپ دوستی ختم کرنا چاہتے تو پھر جو مولا کو منظور ہو گا وہ ہو کر رہے گا" ـــ ملک ناصر کے بڑے بھائی نے کہا ـــ "ہماری دشمنی بڑی مہنگی ہے ملک صاحب! سوچ لیں۔"

✪

ملک رجب علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اُس کی نظریں تینوں کے چہروں پر گھوم گئیں۔

"میں تمہارے دلوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا" ـــ رجب علی نے کہا ـــ "میں نے سوچا تھا کہ ملک ناصر کے گناہوں کو اُس کی قبر میں دفن رہنے دیں لیکن آپ پر کوئی اور ہی نشہ سوار ہے میں آپ لوگوں کو اس غلط فہمی سے نکالنا چاہتا ہُوں کہ میرے عزیز رشتہ دار باقی عمر پچھتاتے رہیں گے۔ میں اس دھمکی کا جواب دے لوں تو آپ کو ملک ناصر کی پھانسی کی کہانی سناؤں گا..... ہاں، میں آپ سب کو اور آپ کے خاندان کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ لوگ مجھے اور میرے خاندان کو بھُولے نہیں ہوں گے۔ جب آپ لوگ مجھے غائب کرنے کا بندوبست کریں گے تو مجھ سے پہلے آپ میں سے کوئی آدمی غائب ہو جائے گا۔"

"وہ دیکھا جائے گا"۔۔۔ ملک ناصر کے بڑے بھائی نے کہا۔ اب اُس کے لہجے میں دوستی کا رنگ نہیں تھا۔

"میں آپ کو پولیس کا رُعب نہیں دے رہا۔ میں اب پولیس میں نہیں ہُوں"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "لیکن میرے ہاتھ میں پولیس سے زیادہ طاقت ہے۔ میں آپ سب کے دماغوں میں یہ ڈال دوں کہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے سوچ لینا کہ جس پر ہاتھ ڈال رہے ہو اُس کا نام رجب علی ہے"۔

ان لوگوں کو وہ رجب علی یاد تھا جو سرحد پار تھانیدار ہُوا کرتا تھا۔ اس کے خاندان کو بھی یہ لوگ جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ رجب علی قتل اور اغوا کرانے کی اور بڑے سخت وار کے مقابلے میں اس سے زیادہ سخت وار کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور اس آدمی پر وار کرنا خطرناک ہو گا۔ یہ سوچ کر وہ ذرا ٹھنڈے ہو گئے۔

"اب سنو کہ ملک ناصر کو پھانسی کی سزا کیوں ہُوئی ہے؟"۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔۔۔ "وہ ہندؤوں کا جاسوس تھا اور اُسے اُس کے اپنے آدمیوں نے پکڑوایا ہے"۔

تینوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ملک رجب علی نے ان کے چہروں پر باری باری نگاہ ڈالی۔ ان میں سے کوئی بھی نہ بولا۔

"میں پولیس سروس کو مدّت ہوئی چھوڑ چکا ہوں لیکن تھوڑا عرصہ ہُوا، مجھے سروس میں واپس لیے بغیر گورنمنٹ نے مجھے سی۔ آئی۔ ڈی کی یہ ڈیوٹی دے دی تھی کہ ملک میں بھارت کے جاسوس پھیل گئے ہیں، اُنہیں پکڑنا ہے"۔۔۔ رجب علی نے جھُوٹ بولا۔۔۔ "میری بیوی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں یہ ڈیوٹی کر رہا ہوں۔ اسلام آباد میں اتفاق سے ملک ناصر سے ملاقات ہو گئی۔۔۔"

رجب علی نے کچھ جھوٹ بولا، کچھ سچ سنایا اور پورا واقعہ سُنا دیا۔ اُس نے ایک جھُوٹ یہ بولا کہ وہ اتفاق سے اپنے ایک بزرگ دوست (جمال بیگ) کے ساتھ اسلام آباد کی پہاڑیوں کے اندر چلا گیا اور وہاں اُسے بھارتی کمانڈو نظر آ گئے۔ وہ ایک ریڈار کو تباہ کرنے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ اُس کی اور اُس کے دوست کی ٹکر ہو گئی۔ رجب علی نے تفصیل سے سنایا کہ وہ کس طرح زخمی ہُوا اور اُس کا دوست کس طرح مارا گیا۔ ملک رجب علی نے بتایا کہ کس طرح ایک بھارتی کمانڈو کو زندہ پکڑ لیا گیا جس نے ملک ناصر اور پاکستان کے چند اور افسروں کی نشاندہی کر کے پکڑوا دیا۔ ملک ناصر کے گھر کی تلاشی لی گئی۔ وہاں سے ایسی چیزیں برآمد ہُوئیں جن سے ثابت ہو گیا کہ وہ اس گروہ کا سردار تھا۔

"وہ آپ کا گہرا دوست تھا"۔۔۔ ملک ناصر کے بڑے بھائی نے کہا۔۔۔ "آپ چاہتے تو اُسے بچا سکتے تھے"۔

"مجھے بے ہوشی میں اٹھا کر ہسپتال میں لے گئے تھے"۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔۔۔ "میں تیسرے چوتھے روز ہوش میں آیا تھا۔ پھر میری ٹانگ کاٹ دی گئی۔ باہر کا مجھے علم ہی نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے، سوائے اس کے کہ ملک ناصر کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میری بھی گواہی ہُوئی تھی۔ میں نے ملک ناصر کو بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایسے آدمی کو سزا ملنی چاہیئے تھی"۔

تینوں خاموشی سے اٹھے اور چل پڑے۔

"میں آپ کو ایک بار پھر خبردار کرتا ہوں کہ کسی سے انتقام لینے کی نہ سوچنا"۔۔۔ ملک رجب علی نے انہیں روک کر کہا۔۔۔ "آپ کا خاندان حکومت کی نظروں میں مشتبہ بن چکا ہے۔ اب آپ کی وہ عزت نہیں رہی جو ہُوا کرتی تھی"۔

✪

ملک ناصر اور اُس کی بیوی کے بھائیوں نے اُس کی بیوی کا یہ شک رفع کر دیا کہ شمیم نے اپنے باپ کو پکڑوایا تھا لیکن شمیم کے معاملے میں ماں کا دل صاف نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شمیم اپنی ماں کو نوکروں جتنی اہمیّت بھی نہیں دیا کرتی تھی کیونکہ وہ اَن پڑھ تھی۔ اسلام آباد کی جدید طرز کی کوٹھی اور کوٹھی کے مغربی ماحول میں رہ کر بھی اس عورت کے ذہن سے دیہات کا رہن سہن، طور طریقے اور رسم و رواج نہیں نکلے تھے۔ چھوٹی اور بڑی گیارھویں کا ختم شریف وہ باقاعدگی سے دلاتی تھی اور شمیم اُسے ہر بار ٹوکتی اور ناک چڑھاتی تھی۔

ایسی کچھ اور باتیں تھیں جو ماں بیٹی کے درمیان خلیج بن گئی تھیں۔ یہ خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ ماں کو شمیم کی آزاد خیالی، شوخیاں اور غیر مردوں کے ساتھ بے تکلّف ہو جانا بہت بُرا لگتا تھا۔

"میں مان لیتی ہوں کہ شمیم نے اپنے باپ کے خلاف کچھ نہیں کیا"۔۔۔ ایک روز ماں نے ملک ناصر کے بھائیوں سے کہا۔۔۔ "لیکن میری ایک بات مان لو۔ اس لڑکی کی شادی فوراً کر دو۔ میری اس بات کو جھٹلانے کی کوشش نہ کرنا کہ لڑکی آوارہ ہو چکی ہے اور اس کا دل شہر کی کوٹھی میں اٹکا ہُوا ہے۔ اب اس کے سر پر باپ بھی نہیں رہا۔ میں اسے لگام نہیں ڈال سکوں گی"۔

ملک ناصر کے چہلم تک گھر میں ماتم کی فضا رہی۔ شمیم بھی دبی دبی رہی لیکن گھر میں کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ اس لڑکی نے اپنے سینے میں کیسا تُند و تیز طوفان دبا رکھا ہے اور دبائے ہُوئے طوفان شمیم جیسی لڑکیوں کو پاگل کر دیا کرتے ہیں۔ شمیم کے بزرگوں نے اُسے پاگل کر دینے کا انتظام جلد ہی کر دیا۔ چہلم سے اگلے روز شمیم نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اسلام آباد اپنے کالج جانا چاہتی ہے۔ اتنی لمبی غیر حاضری سے اُس کا نام کٹ چکا ہو گا۔

"نہیں"۔۔۔ ماں نے حاکمانہ لہجے میں کہا۔۔۔ "اب کالج کو دماغ سے نکال دو۔ اسلام آباد سے ہمارا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ تم جہاں کی خاک ہو، اب اُسی میں خاک ہو گی۔ میں صرف چہلم کا انتظار کر رہی تھی۔ ہم تمھاری شادی کا انتظام کر رہے ہیں۔ اگلے چاند تک تُو اپنے گھر جا چکی ہو گی"۔

"یہ خاک تمھاری ہے"۔۔۔ شمیم نے کہا۔۔۔ "اس میں تم نے دفن ہونا ہے۔ میں نہ اَن پڑھ ہوں نہ تم جیسے اَن پڑھوں میں رہنا چاہتی ہُوں"۔

ماں کا دماغ پہلے ہی اُکھڑا ہُوا تھا۔ وہ تو سُلگتی ہُوئی ایک چنگاری تھی جسے شمیم کی اتنی سی پھونک نے شعلہ بنا دیا۔ ماں کی چیخ و پکار سُن کر شمیم کے چچے ماموں وغیرہ دوڑے آئے۔ شمیم کی ماں نے اُنہیں بتایا کہ کیا بات ہُوئی ہے۔ ملک ناصر کے بڑے بھائی نے وہی نادر شاہی حکم سنا دیا جو ماں پہلے ہی سنا چکی تھی۔

شمیم خاموش ہو گئی۔ اُس نے خاموشی کے سوا کسی اور ردِّعمل کا اظہار نہ کیا۔ شمیم اُن لڑکیوں میں

سے نہیں تھی جو بزرگوں کے فیصلوں کو زہر کا پیالہ سمجھ کر چپ چاپ پی لیتی ہیں۔ وہ شوخی، شرارت پسندی اور دلیری کے لحاظ سے ابنارمل لڑکی تھی۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنی محبّت پر اپنے باپ کو قربان کر دیا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ گاؤں میں وہی ہو گا جو اُس کے بزرگ چاہیں گے۔ اُس کے احتجاج اور آہ و بکا کی کوئی پروا نہیں کرے گا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان لوگوں کے پاس الفاظ اور دلائل جلدی ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ اپنی بات لاتوں اور گھونسوں سے منواتے ہیں۔

اُس نے ایسا رویّہ اختیار کیا جیسے اُس نے بزرگوں کے فیصلے کو مان لیا ہو۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی جب اُس نے کمرے کا دروازہ بند کیا تو اُسے اس طرح گھٹن محسوس ہُوئی جیسے اُسے بڑے ہی تنگ اور تپتی ہُوئی سلاخوں والے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ پہلے وہ روئی اور بہت روئی۔ پھر اُس کے اندر سے شعلہ اُٹھا جس نے اُس کے آنسو خشک کر ڈالے۔ اُس پر ایسی ذہنی کیفیّت طاری ہو گئی جس نے اُس کی عقل کو مفلوج کر دیا۔ اُس کی فطرت میں جو خودسری اور سرکشی تھی وہ اُبھر آئی۔ اُس کے ذہن میں اصغر آ گیا۔ پھر اُس کی تمام سوچیں بگولے کی طرح اصغر کے گرد گھومنے لگیں۔

✪

اگلی صبح جب شمیم اپنے کمرے سے نکلی تو اُس کے آنسو خشک تھے اور اُس کے انداز اسی طرح بدلے بدلے سے تھے جیسے اُس نے اپنے بزرگوں کا فیصلہ دل و جان سے قبول کر لیا ہو۔ ماں کے ساتھ اُس نے پیار سے باتیں کیں اور اُس سے پوچھا کہ اُس کی شادی کس کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ ماں نے اُسے بتا دیا۔ شمیم نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ ماں خوش ہو گئی کہ بیٹی کو لڑکا پسند آ گیا ہے۔

شمیم کے تایے اور چچوں نے خاص طور پر دیکھا کہ شمیم کا ردِّعمل کیا ہے۔ شمیم انہیں بھی ہنسی خوشی مِلی اور ظاہر کیا کہ وہ بہت ہی خوش ہے۔ اُس کی ماں نے بھی ان لوگوں کو بتایا کہ لڑکی نے اِن کا فیصلہ سعادت مند بچیوں کی طرح قبول کر لیا ہے۔ اس طرح شمیم نے سب کا اعتماد حاصل کر لیا لیکن دیہات کے یہ لوگ جو دولت اور جاگیر کے زور پر اپنے آپ کو ارسطو اور افلاطون سمجھتے تھے جان نہ سکے کہ اس نوجوان لڑکی نے اپنے دامن میں کیسے کیسے طوفان سمیٹ لیے ہیں۔

ملک ناصر کے بڑے بھائی نے اُسے گلے لگا لیا اور وہ اتنا رویا کہ اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ اُس نے شمیم سے کہا کہ باپ نے اُسے جتنا پیار دیا تھا، اُسے اُس سے زیادہ پیار ملے گا۔

"تایا جان!" — شمیم نے بڑی پیاری سی التجا کی — "آپ کے کہنے پر میں اب کالج نہیں جاؤں گی لیکن میری بہت سی چیزیں اور کتابیں اسلام آباد کوٹھی میں پڑی ہیں۔ ابُو کی میّت کے ساتھ ہم بڑی جلدی میں نکل آئے تھے۔ میں وہاں سے کوئی چیز اُٹھا نہ سکی۔ مجھے گاڑی اور ڈرائیور دے دیں تو میں اسلام آباد سے اپنی چیزیں لے آؤں۔ میں فوراً آ جاؤں گی۔"

اُسے اجازت مِل گئی۔ ڈرائیور اُن کے اپنے گاؤں کا بوڑھا سا آدمی تھا جو ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد اور ذہین تھا۔ اُس کے ساتھ گھر کے کسی اور آدمی کے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

دوسرے روز شمیم اس ڈرائیور کے ساتھ اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئی۔ راستے میں بوڑھے ڈرائیور نے ملک ناصر کا کوئی پرانا قصّہ چھیڑ دیا۔ وہ شمیم پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اُسے ملک ناصر

کی موت کا بہت دُکھ ہے لیکن شمیم جو مشین کی طرح ہوں ہاں کیے جا رہی تھی، خیالوں میں کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔ اُس نے ایک دن اور ایک رات کمرے میں بند رہ کر جو کچھ سوچا تھا وہ اُسے عملی جامہ پہنانے کے طور طریقے سوچ رہی تھی۔ اُس نے باقاعدہ پلان تیار کیا تھا۔ اسلام آباد سے کتابیں اور کچھ چیزیں لانا ایک بہانہ تھا۔ وہ خطرات کو پسند کرنے والی لڑکی تھی۔ اُس نے پلان بنایا تھا وہ خطروں سے بھرپور تھا۔ وہ دلیر اور جرأت مند تو تھی لیکن اس کی زندگی تجربات سے خالی تھی۔ اس میں ابھی عمر اور عقل کی پختگی نہیں آئی تھی۔ اُس نے جو کچھ سوچا تھا وہ جذبات کے غلبے میں سوچا تھا۔ ان سوچوں میں احتجاج اور انتقام کا نمایاں تأثّر تھا۔ وہ اپنی راہ خود بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن وہ سمجھ نہ سکی کہ اُس نے اپنے پلان کی بنیاد عقل پر نہیں جذبات اور احساسات پر رکھی ہے۔

ڈرائیور کی زبان اُس وقت بھی چل رہی تھی جب گاڑی اسلام آباد کوٹھی کے پورچ میں جا کر رُک گئی تھی۔ وہاں جو نوکر تھے وہ دوڑے آئے۔ شمیم نے رسمی طور پر اُن سے خیر خیریت پوچھی۔

وہ جب کوٹھی میں داخل ہوئی تو اُسے یوں لگا جیسے کوٹھی میں بدرُوحیں گھوم پھر رہی ہوں جن کی موجودگی کا احساس تو ہوتا ہے لیکن وہ نظر نہیں آتیں۔ وہ تمام کمروں میں گھوم گئی۔ ہر کمرے میں اُسے اصغر کی موجُودگی کا احساس ہُوا۔ خیالوں کے ریلے میں بہتے ہُوئے اُسے دو چار مرتبہ ایسے محسوس ہُوا جیسے اصغر ساتھ والے کمرے میں بیٹھا ہے۔ اُس کے قدم اس کمرے کی طرف اُٹھنے لگے لیکن قدم رُک گئے اور اس احساس سے اس کا خُون اُبلنے لگا کہ شازی اصغر کے پاس بیٹھی ہو گی۔ وہ بڑے غصیلے انداز سے چلتی اس کمرے میں گئی تو اُس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ پھر وہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے بدرُوحیں مِل کر اُسے اس کوٹھی سے نکال رہی ہوں۔ وہ صاف طور پر محسوس کر رہی تھی کہ کوئی اُسے دھکے دے دے کر باہر نکال رہا ہے۔

اُسے وہاں سے کوئی ضروری کتاب یا چیز نہیں لینی تھی لیکن اُس نے یوں ہی پانچ سات کتابیں اٹھا لیں۔ نوکروں کو بلا کر اُنہیں کہا کہ ریڈیوگرام اور ریکارڈ پلیئر گاڑی میں رکھ دیں۔ یہ چیزیں گاڑی میں رکھوا کر اُس نے ڈرائیور سے کہا کہ فوراً واپس چلو۔ راستے میں تھوڑی دیر کے لیے لاہور بھی رُکنا ہے۔ اپنی ایک سہیلی کو اُس کی ضروری کتابیں واپس کرنی ہیں۔

✪

شمیم جب لاہور پہنچی تو سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ اُس نے گاڑی ملک رجب علی کی کوٹھی کے سامنے جا رُکوائی۔ وہ یہاں پہلی بار آئی تھی لیکن گلبرگ اُس کے لیے نئی اور اجنبی جگہ نہیں تھی۔ اُسے رجب علی کی کوٹھی کا نمبر اور اس کے قریب کی بڑی بڑی نشانیاں معلوم تھیں۔

"میں یہاں دو اڑھائی گھنٹے رُکوں گی" — شمیم نے ڈرائیور سے کہا — "تم سب سے پہلے داتا دربار جاؤ۔ میرا بھی سلام داتا تک پہنچا دینا۔ مغرب کی نماز وہیں پڑھنا یا شاہی مسجد چلے جانا۔ کھانا کسی ہوٹل میں کھا لینا اور آٹھ بجے یہاں آ جانا" — اُس نے ڈرائیور کو کھانے کے لیے خاصے پیسے دے دیئے۔

شمیم کو داتا تک سلام پہنچانے کی ضرورت نہیں تھی نہ اُسے اس سے دلچسپی تھی کہ ڈرائیور کہاں

نماز پڑھے۔ وہ ڈرائیور کو وہاں سے چلتا کرنا چاہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ ڈرائیور رجب علی، اُس کی بیوی سلمٰی اور شازی کو بڑی اچھی طرح جانتا پہچانتا ہے۔ یہ سب کئی مہینے اسلام آباد والی کوٹھی میں رہے تھے اور وہاں یہی ڈرائیور ہوتا تھا۔ ڈرائیور کو رجب علی کی کوٹھی سے چلتا کرنے کا یہ طریقہ اچھا تھا کہ اُس نے داتا دربار اور بادشاہی مسجد کا نام لیا۔ ڈرائیور کی باچھیں کھل گئیں۔

"اللہ آپ کا بھلا کرے چھوٹی بی بی!" — بوڑھے ڈرائیور نے ہاتھ جوڑ کر شمیم سے کہا — "میں تو آپ سے خود کہنا چاہتا تھا کہ مجھے داتا دربار جانے کی اجازت دے دیں۔ میں نے بیس نفل مانے ہوتے ہیں جو دربار میں پڑھنے ہیں۔"

ڈرائیور چلا گیا۔

رجب علی، سلمٰی اور شازی شمیم کو دیکھ کر بہت حیران ہوتے۔ شمیم نے اُنہیں بتایا کہ وہ اسلام آباد گئی تھی اور واپسی پر ملک رجب علی کو دیکھنے کے لیے رُکی ہے۔ وہ دراصل یہ دیکھنے گئی تھی کہ شازی ملک رجب علی کے ساتھ رہتی ہے یا اُسے یہ لوگ اپنے ساتھ نہیں لائے۔ شازی کو وہاں دیکھ کر اُسے دھچکا سا لگا اور اُس نے جب اُسے خوش و خرّم دیکھا تو اُس کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ اُس نے اصغر کے متعلق پُوچھا تو اُسے بتایا گیا کہ وہ اپنی یونٹ میں چلا گیا ہے اور یونٹ کہیں آزاد کشمیر میں ہے۔

شمیم اپنے آپ پر قابو نہ پا سکی۔ اُس نے شازی کے ساتھ دو چار باتیں کرنا ضروری سمجھا۔ شازی کو الگ لے جانے کا بہانہ یہ ڈھونڈا کہ اُس سے پُوچھا کہ اُس کا کمرہ کون سا ہے۔ شازی نے بڑے اشتیاق سے اُسے کہا کہ آؤ تمہیں اپنا کمرہ دکھاؤں۔ شمیم اُٹھ کر اُس کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلی گئی۔ شازی بڑے شوق سے اُسے کمرے کی ڈیکوریشن دکھانے لگی لیکن شمیم شازی کو دیکھ رہی تھی۔

"شازی!" — شمیم نے دروازہ بند کرتے ہوتے کہا — "اصغر کے ساتھ دوستی کیسی چل رہی ہے؟... میں تمہارا کمرہ دیکھنے نہیں آئی۔ تمہیں دو چار باتیں کہنے اور کچھ سُننے آئی ہوں۔"

"کیا اور بھی کچھ کہنا باقی ہے؟" — شازی نے پوچھا — "میرا خیال تھا کہ تمہیں جو کچھ کہنا تھا وہ اسلام آباد میں کہہ چکی ہو۔"

"میں نے اسلام آباد میں جو کچھ کہا تھا وہ غصّے میں کہا تھا" — شمیم نے کہا — "اب کچھ باتیں خلوص اور ہمدردی سے کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہو شمیم!" — شازی نے اُسے بٹھاتے ہُوتے کہا — "دِل کا سارا غبار نکال لو۔ تم نے اپنے گھر میں مجھ پر غصّہ جھاڑا تھا۔ اب تم میرے گھر میں ہو۔ گالی دو گی تو بھی تمہاری عزّت کروں گی۔"

"تمہارا گھر؟" — شمیم نے ایسے لہجے میں کہا جس میں حیرت کم اور طنز زیادہ تھی — "میں تمہیں اس خوش فہمی میں سے نکالنا چاہتی ہُوں کہ پرائے گھر کو اپنا گھر نہ سمجھو۔ تمہارا کوئی گھر نہیں شازی! تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اصغر کو تم اپنا نہیں بنا سکو گی اور ملک رجب علی کو ایک زمانہ جانتا ہے کہ تم جیسی حسین لڑکیوں کا شکاری ہے۔"

"کوئی باپ اپنی بیٹی کا شکاری نہیں ہو سکتا" — شازی نے بڑے تحمّل سے کہا۔

"باپ؟" — شمیم نے پہلے جیسے طنزیہ لہجے میں کہا — "کسی اور کی بات کرو تو شاید میں مان لوں لیکن رجب علی کسی کو منہ بولی بیٹی بنانے والا شخص نہیں۔"

"میں اُسی زمانے میں پیدا ہُوئی تھی جب یہ رجب علی کسی کو منہ بولی بیٹی نہیں بنایا کرتا تھا" — شازی نے کہا — "تم یقیناً سُن کر حیران ہو جاؤ گی کہ میں رجب علی کی بیٹی ہوں۔ میں اپنی ماں کے خاوند کی بیٹی نہیں۔ جب ملک رجب علی اور میری ماں کی اسلام آباد میں پہلی ملاقات ہوئی تھی تو میری ماں نے رجب علی کو بتا دیا تھا کہ شازی تمہاری بیٹی ہے۔ تم مجھے ناجائز اولاد کہہ سکتی ہو لیکن ملک صاحب نے مجھے اپنی بیٹی کا درجہ دے کر اپنی پناہ میں لیا ہے۔ یہ ان کے ہی پیار کا کرشمہ تھا کہ میں نے اپنی ماں اور اُس کے پورے گروہ کو پکڑوا کر سزا دلا دی۔ اس راز سے اصغر اور اُس کی امّی بھی واقف ہیں۔"

شمیم کی آنکھیں یوں کھل گئیں جیسے کبھی بند نہ ہوں گی۔ اُس کے ہونٹ اَدھ کُھلے رہ گئے۔

"حیران مت ہو شمیم!" — شازی نے کہا — "زندگی میں اس سے بھی زیادہ حیران کُن واقعات ہوتے ہیں۔ بچھڑے ہُوتے مسافر برسوں بعد زندگی کے کسی چوراہے پر مل جاتے ہیں..... شمیم! تمہیں اس کے ساتھ دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے کہ میں کس کی بیٹی ہُوں۔ تمہاری دلچسپی اصغر کے ساتھ ہے۔ تم نے پوچھا ہے کہ اصغر کے ساتھ دوستی کیسی چل رہی ہے۔ اس کا جواب سُن لو۔ میں نے اصغر کو اُس نظر سے نہیں دیکھا تھا جس کا تمہیں شک ہے لیکن اسلام آباد میں تم نے مجھے ایک دھتکاری ہُوئی، بے آسرا اور بے ٹھکانہ لڑکی سمجھ کر چیلنج کیا تھا کہ میں تم دونوں کے درمیان سے ہٹ جاؤں ورنہ میرا انجام بہت بُرا ہو گا۔ میں نے دھمکی کے جواب میں دھمکی دی تھی۔"

"میں اب وہی دھمکی دُہرانے آئی ہُوں" — شمیم نے کہا — "تم نے شاید دیکھ لیا ہو گا کہ میں ضدّی اور ڈھیٹ لڑکی ہوں۔ میں جو حاصل کرنے کا ارادہ کر لوں وہ حاصل کر کے ہی رہتی ہوں۔ میں تمہیں آخری بار کہتی ہُوں کہ اصغر کو مجھ سے چھیننے کی غلطی نہ کرنا۔ میں تمہیں صاف الفاظ میں بتا دیتی ہوں کہ میں نے اپنے باپ کو اصغر کی محبت پر قربان کیا ہے۔ میرے دل میں پاکستان کی اتنی محبّت نہیں۔"

"شمیم!" — شازی نے کہا — "ہم ساری رات اگر بیٹھی رہیں تو ایک دوسری کو یوں ہی دھمکیاں دیتی رہیں گی۔ تمہیں جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکی ہو۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں کہہ چکی ہوں۔ ہم دونوں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ آؤ بات یہیں پر ختم کر دیں کہ تم مجھے اُس راستے سے ہٹانا چاہتی ہو جو تمہیں اصغر تک پہنچاتے گا اور میں کہتی ہُوں کہ میں تمہارے راستے سے نہیں ہٹوں گی۔ میں تمہیں صاف الفاظ میں بتا دیتی ہُوں کہ اصغر ملک رجب علی کا ہے، سلمٰی کا ہے اور اصغر میرا ہے مگر اصغر اپنا اُسے سمجھے گا جس کے دل میں پاکستان کی محبّت ہے..... کیا تم رات ہمارے پاس رُکو گی؟ رُک جاؤ تو اچھا ہے۔"

"نہیں" — شمیم نے کہا — "میں جا رہی ہوں۔ اب میری اور تمہاری ملاقات ایسے حالات میں ہو گی جو تمہیں پسند نہیں آئیں گے۔"

شمیم اُٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

✪

شمیم کی نئے ماڈل کی کار اُس کے گاؤں کی طرف اندھیرے کو چیرتی، اڑی جارہی تھی۔ بوڑھے ڈرائیور نے دو مرتبہ اُسے کہا تھا کہ اُس نے داتا صاحب کو اُس کا سلام پہنچا دیا ہے۔ ڈرائیور نے یہ بھی کہا تھا کہ چھوٹی بی بی، میں نے آپ کے لیے بہت دعائیں مانگی ہیں، مگر شمیم کے ذہن میں نہ کوئی داتا تھا نہ کسی داتا کا دربار۔ وہ دعاؤں کی دنیا سے بہت دُور نکل گئی تھی۔ اُس کے سینے میں جو لاوا دہک رہا تھا، اُس پر شازی نے تیل ڈال دیا تھا۔ شمیم اب انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کر سوچ رہی تھی۔ اُسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ ڈرائیور کیا کہہ رہا ہے اور گاڑی کدھر جارہی ہے اور کس رفتار پر جارہی ہے۔ غصّے سے اُس کی مٹھیاں خود ہی بند ہو رہی تھیں۔ بار بار وہ شازی کی لاش دیکھ رہی تھی۔ ایک خیال اُس کے ذہن پر کندہ ہوتا جارہا تھا کہ اصغر ملے نہ ملے، شازی کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

اُس نے اصغر تک پہنچنے کا جو راستہ اپنے ذہن میں منتخب کیا تھا وہ صرف کٹھن اور دشوار گزار ہی نہیں تھا بلکہ بھیانک خطروں اور جُرم و گناہ کی تاریکیوں میں سے بھی گزرتا تھا۔ اگر وہ عقل سے سوچتی، حالات جو پیدا ہو گئے تھے، اُن کا جائزہ ٹھنڈے دل سے لیتی تو شاید کوئی سہل راستہ اُسے نظر آجاتا لیکن انتقامی جذبات نے اُس کا دماغی توازن متزلزل کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی سوچیں نتائج تک پہنچ ہی نہ سکیں۔

وہ جب اپنے گاؤں میں پہنچی تو رات آدھی گزر چکی تھی۔ گھر میں داخل ہُوئی تو اُس کی ماں نے اُسے حیرت سے دیکھا اور کہا کہ وہ اتنی رات گئے آئی ہے۔

"رات اسلام آباد رُک جاتیں"۔۔۔ ماں نے کہا۔۔۔"آج ہی واپس آنے کی کیا پڑی تھی!"

"اب وہاں جی نہیں لگتا"۔۔۔ شمیم نے بڑے پیار سے لہجے میں کہا۔۔۔"اِدھر آپ میری شادی کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ اب گاؤں سے باہر رہنا اچھا نہیں لگتا۔"

باقی رات اُس نے بے چینی میں گزاری۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے دو آدمی باری باری اور کبھی اکٹھے آتے۔ یہ دونوں آدمی اُس کے رشتے کے امیدوار تھے۔ ایک ماجد تھا دوسرا صغیر۔ اُس کی نظر میں دونوں ایک جیسے تھے۔ وہ اُسی کے گاؤں اور برادری کے بڑے خوبصورت جوان تھے۔ اگر پسند تھے تو دونوں ہی پسند تھے لیکن وہ دونوں میں سے کسی کو بھی پسند نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اب ایک بڑا بھیانک ڈرامہ کھیلنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

اُس کی ماں اور تائے وغیرہ نے صغیر کو رشتہ دے دیا۔ ماجد کو اُنہوں نے اس لیے پسند نہ کیا کہ اُس کے چال چلن میں کچھ عیب تھے۔ ان لوگوں کے ہاں شراب نوشی اور عورت بازی کوئی عیب نہ تھا لیکن ماجد کا اُٹھنا بیٹھنا تکیئے کے ملنگوں کے ساتھ بھی تھا۔ وہاں وہ جُوا کھیلنے جاتا اور چرس کا کش بھی لگا لیتا تھا۔ پکّے مجرموں کے ساتھ بھی اُس کا یارانہ تھا۔ اُس کا باپ مر چکا تھا۔ دو بھائی اُس سے چھوٹے تھے۔ مربعوں کے حساب سے اُس کی زمین تھی۔ برادری کے بزرگ اُسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے لیکن اُسے کسی اچھے بُرے کام سے روکنے ٹوکنے کی جرأت کوئی نہیں کرتا تھا۔ وہ خود سر اور سرکش تھا۔ اُس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال ہو گئی تھی۔ ابھی تک اُس نے

شادی نہیں کی تھی۔ اُسے صرف شمیم پسند آئی تھی۔ اُس نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ وہ شمیم کا رشتہ مانگے۔ ملک ناصر کی زندگی میں اُس کی بیوی کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ ملک ناصر نے ماجد کی ماں کو جواب دیا تھا کہ شمیم کالج میں پڑھتی ہے اور شہر میں رہتی ہے۔ وہ گاؤں کے ماحول میں رہنا پسند نہیں کرے گی۔ اُس وقت صغیر کے ماں باپ کو بھی یہی جواب دیا گیا تھا لیکن اب شمیم نے کچھ اس انداز سے حالات اپنے خلاف کر لیے تھے کہ اُس کی شادی جلدی کرنی پڑی۔ اِن حالات میں صغیر ہی موزوں تھا۔

✪

یہی دو آدمی شمیم کی نظروں کے سامنے گھومتے پھرتے رہے۔ ماجد کے متعلق اُسے کچھ باتیں یاد آئیں۔ تین سال پہلے وہ موسمِ بہار کی چھٹیاں گزارنے گاؤں آئی تھی۔ ایک روز وہ اکیلی سبزیوں والے باغیچے کی طرف جارہی تھی کہ راستے میں اُسے ماجد مل گیا۔ ماجد اسی برادری کا آدمی تھا۔ وہ شگفتہ مزاجی کی بدولت لڑکیوں اور لڑکوں میں خاصا مقبول تھا۔ شمیم اُسے دیکھ کر مسکرا دی۔ ماجد کے ہونٹوں پر پہلے ہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ دونوں رُک گئے اور اُنہوں نے ایک دوسرے سے خیر خیریت پوچھی۔ شمیم میں اپنی عمر کی گھریلو لڑکیوں جیسا حجاب نہیں تھا اور وہ ماجد کو جانتی بھی تھی۔

"ماجد! اب تم شادی کر لو"۔۔۔ شمیم نے اُسے ہنستے ہُوئے کہا۔۔۔"تم اب اکیلے گھومتے پھرتے اچھے نہیں لگتے۔"

ماجد بھی ہنسا لیکن اُس کی ہنسی میں ہنسی مذاق والا تأثر نہیں تھا۔ اُس نے آہ بھری۔

"شمیم!"۔۔۔ ماجد نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔۔۔"اگر تم میرے لیے کوئی لڑکی پسند کر لو تو میں اُس کے ساتھ شادی کر لوں گا لیکن وہ میری پسند نہیں ہو گی۔"

شمیم کُھل کر ہنسی اور بولی۔۔۔"اپنی پسند مجھے بتا دو اور دو روز بعد شادی کر لو۔"

"میری پسند شاید تمہیں اچھی نہ لگے"۔۔۔ ماجد نے اور زیادہ سنجیدہ لہجے میں کہا۔۔۔"کیونکہ میں تم لوگوں کی نظروں میں اچھا آدمی نہیں ہُوں۔"

"کیوں؟"۔۔۔ شمیم نے پوچھا۔۔۔"تمھاری پسند مجھے کیوں اچھی نہ لگے گی؟"

"اگر بُرا لگے تو مجھے معاف کر دینا"۔۔۔ ماجد نے کہا۔۔۔"اور اگر جی میں آئے تو دو گالیاں دے کر چلی جانا۔ پھر میں تمھارے راستے میں کبھی نہیں آؤں گا۔"

"اوہ!"۔۔۔ شمیم کی جیسے آہ نکل گئی ہو۔ اُس کی ہنسی اور مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اُس کا سر جُھک گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے سر اٹھایا اور بولی۔۔۔"میں سمجھ گئی ہُوں لیکن میں گالیاں نہیں دوں گی نہ مجھے بُرا لگا ہے۔"

"پھر میں اپنی ماں کو تمھارے گھر بھیجوں؟"۔۔۔ ماجد نے پوچھا اور کہا۔۔۔"تم بھی سوچ لو۔ تم اب شہری لڑکی ہو۔ کالج میں پڑھتی ہو۔ میں کوئی ایسا اَن پڑھ تو نہیں لیکن ہُوں دیہاتی۔"

شمیم وہاں سے خاموشی سے چلی گئی۔ ماجد کی ان باتوں کا اُس نے کوئی زیادہ اثر قبول نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کے ماں باپ ماجد کو اُس کا رشتہ نہیں دیں گے۔ پھر ہُوا بھی ایسے ہی

تھا کہ ماجد کی ماں نے شمیم کی ماں کے ساتھ بات کی تو شمیم کے ماں باپ کی طرف سے اُسے جواب ملا کہ شمیم کالج میں پڑھتی ہے اور شہر میں رہتی ہے۔ وہ گاؤں کے ماحول میں رہنا پسند نہیں کرے گی۔ شمیم کو اس جواب کا کوئی افسوس نہیں ہُوا تھا نہ ہی اُس نے ماجد کو اپنے ذہن پر سوار کیا تھا۔

آج کمرے میں تنہا بیٹھ کر جب وہ اُکھڑے ہُوئے جذبات اور انتقامی جذبے کی بھٹی میں جل رہی تھی، اُسے ماجد یاد آنے لگا۔ اُسے یاد آیا کہ وہ جب کبھی گاؤں میں آئی، ماجد اُسے مِلا۔ ماجد نے محبّت کا اظہار تو کبھی بھی نہ کیا تھا لیکن شمیم کو آج یاد آ رہا تھا کہ وہ محبّت اُس کی جوان آنکھوں میں چمک دمک رہی تھی۔

ماجد کی یاد اُمید کی ایک کِرن بن کر شمیم کی نیم تاریک دنیا میں داخل ہُوئی۔ اُس نے سوچا کہ ماجد اُس کے کام آ سکتا ہے۔

✪

شمیم اپنے گاؤں کی اور اپنے خاندان کی اس چھوٹی سی ریاست کی شہزادی تھی۔ اُسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اگلے ہی روز وہ خراماں خراماں اپنے باغیچے کی طرف جا رہی تھی۔ اُس کی نظریں ماجد کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن اُسے ماجد کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے کچھ وقت باغیچے میں گزارا۔ جب واپس آنے لگی تو اُسے ماجد نظر آ گیا۔ وہ باغیچے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ شمیم تیز قدم چلتی دوسری طرف سے اُس کے راستے میں چلی گئی۔ ماجد شمیم کو دیکھ کر مسکرایا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ نہیں رُکے گا لیکن شمیم نے اُسے روک لیا۔ وہ جہاں کھڑے تھے وہ جگہ درختوں اور پودوں کی اوٹ میں تھی۔

"میں اب تمہارے راستے میں نہیں آنا چاہتا تھا"۔۔۔ ماجد نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے کہا۔

"نہیں"۔۔۔ شمیم نے کھُل کر مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔ "تم نہیں میں تمہارے راستے میں آئی ہوں..... تمہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ میری شادی صغیر کے ساتھ ہو رہی ہے"۔

"مبارک ہو"۔۔۔ ماجد نے کہا۔۔۔ "میں بہت خوش ہوں"۔

"جھُوٹ نہ بولو ماجد!"۔۔۔ شمیم نے کہا۔۔۔ "تم خوش نہیں ہو نہ میں خوش ہوں۔ مبارک دینی ہے تو میری ماں کو اور میرے تایا کو دو۔ یہ شادی اُن کے حُکم سے ہو رہی ہے۔ اگر مجھے گاؤں میں ہی شادی کرنی ہے تو میں صغیر کو بالکل پسند نہیں کرتی"۔

"تمہاری قسمت میں جو لکھا تھا تمہیں مِل گیا ہے"۔۔۔ ماجد نے کہا۔۔۔ "قبول کر لو"۔

"نہیں، نہیں"۔۔۔ شمیم نے جھُنجھلاتے ہُوئے لہجے میں کہا۔۔۔ "اگر میری پسند ناپسند کی پوچھتے ہو تو میری پسند تم ہو۔ صغیر سے مجھے معلوم نہیں کیوں چڑ ہے۔ میں اُسے ایک دن کے لیے بھی قبول نہیں کر سکوں گی..... جس طرح تم نے میری محبّت کو اپنے دل میں چھپا کر رکھا ہُوا ہے اسی طرح میں تمہاری محبّت کو اپنے سینے میں دفن کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں لیکن اب جب مجھے ایک ایسے آدمی کے حوالے کیا جا رہا ہے جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا، تمہاری محبّت دبی ہوئی آگ کی طرح بھڑک اُٹھی ہے"۔

"میں تمہارا رشتہ منسوخ نہیں کرا سکتا"۔۔۔ ماجد نے کہا۔۔۔ "اس کے علاوہ حکم کرو۔ اگر میں تمہاری

کچھ مدد کر سکتا ہوں تو ضرور کروں گا، خواہ میری جان چلی جائے"۔

"مجھے جانتے ہو نا ماجد!"۔۔۔ شمیم نے کہا۔۔۔ "میں پہاڑوں سے ٹکر لینے والی لڑکی ہوں۔ میں نے ایسا حکم اپنے باپ کا بھی کبھی نہیں مانا تھا جو میری مرضی کے خلاف ہوتا تھا۔ میں تمہیں صاف بتا دیتی ہوں کہ تم اگر حوصلہ کرو تو میں تمہارے ساتھ یہاں سے بھاگ جاؤں گی"۔

اُس نے ماجد کے چہرے پر اُس کا رّدِ عمل پڑھنے کی کوشش کی۔ ماجد کے چہرے پر حیرت کا تأثر تھا۔ اُس کے ہونٹ کانپے مگر کچھ کہہ نہ سکے۔

"ڈر گئے ہو ماجد؟"۔۔۔ شمیم نے اُس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور کہنے لگی۔۔۔ "تم کسی سے ڈرنے والے نہیں۔ گاؤں اور برادری کے بڑے بڑے جابر آدمی اور بزرگ تم سے ڈرتے ہیں۔ اس ڈر کو چھپانے کے لیے وہ کہتے ہیں کہ ماجد اچھا آدمی نہیں۔ صرف میں جانتی ہوں کہ تم کتنے اچھے آدمی ہو۔ مجھے تم جیسا خاوند چاہیئے جس کے سینے میں شیر کا دل ہو۔ میں اپنے خاوند کو اپنا غلام بنانا نہیں چاہتی، میں اُس کی غلام بننا چاہتی ہُوں لیکن وہ اس قابل ہو کہ میں اُس کی غلامی کروں۔ میں صرف تمہیں اس قابل سمجھتی ہُوں"۔

شمیم نے پہلے ماجد کا ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھا ہُوا تھا۔ بات کرتے کرتے وہ اُس کے اور قریب ہو گئی پھر اُس کے ساتھ لگ گئی۔ اکثر لڑکیاں حسین اور نوجوان ہوتی ہیں لیکن شمیم کے حُسن میں کچھ ایسا تأثر تھا جو نظروں کو گرفتار کر لیتا تھا۔ اُس کے جسم کی ساخت اور اُس کا سیدھا کھڑا قد ماجد کے ہوش و حواس گم کرنے لگا۔ اُس نے شمیم کی پیٹھ اپنے سینے کے ساتھ لگا لی۔ شمیم کے اُڑتے ہوئے دو چار بال ماجد کے پُرشباب گالوں سے لگے تو وہ اس سے کہیں زیادہ دلیر ہو گیا جیسا اُسے سمجھا جاتا تھا۔

"میں تمہارے لیے آگ میں کُود جاؤں گا"۔۔۔ ماجد نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی طرف گھمایا اور پرجوش لہجے میں بولا۔۔۔ "کہو، میرے ساتھ کب اور کہاں چلو گی؟"

ماجد شمیم کے طلسم میں گرفتار ہو چکا تھا۔ کچھ جذباتی اور رومانی باتوں اور حرکتوں کے بعد وہ حقیقی دنیا میں واپس آئے۔ ماجد نے پوچھا کہ کہاں جائیں گے۔

"اسلام آباد والی کوٹھی میری ہے"۔۔۔ شمیم نے کہا۔۔۔ "تمہاری اپنی جائداد موجُود ہے۔ میں اپنی جائداد میں سے پورا حِصّہ لے سکتی ہوں۔ میں بالغ ہُوں۔ میں عدالت میں بیان دے دوں گی کہ میں نے اپنی مرضی سے اس شخص کے ساتھ شادی کی ہے"۔

"کیا تم اپنے خاندان کو بھول گئی ہو؟"۔۔۔ ماجد نے کہا۔۔۔ "وہ ہم دونوں کو قتل کر دیں گے"۔

"بزدل نہ بنو ماجد!"۔۔۔ شمیم نے کہا۔۔۔ "اپنی حفاظت کا انتظام میں ایسا کروں گی کہ کوئی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ میرے ابّو کا جو اثر و رسُوخ تھا اُس سے میں اب بھی پورا فائدہ اٹھا سکتی ہوں۔ میں اپنے خاندان کے تمام آدمیوں کی نیک چلنی کی ضمانتیں پہلے ہی لے لوں گی"۔

"یہاں زیادہ دیر کھڑا رہنا ٹھیک نہیں"۔۔۔ ماجد نے کہا۔۔۔ "پھر مجھے کہاں مِل سکتی ہو؟"

"یہاں، کل اسی وقت آ جانا"۔

ماجد چل پڑا۔ اب اس کی چال بدلی بدلی سی تھی شمیم اُسے جاتا ہُوا دیکھتی رہی۔ اُسے اطمینان ہو گیا تھا کہ یہ شخص اُس کے منصوبے کو کامیاب کر دے گا جو اُس نے کمرے کی تنہائی میں بیٹھ کر تیار کیا تھا۔ اس کے لیے وہ ماجد کو رشوت کے طور پر اپنا آپ بھی دینے کو تیار تھی۔

✪

دوسرے روز اسی باغیچے میں وہ اس سے زیادہ بہتر اور محفوظ جگہ بیٹھے تھے۔ شمیم کے چہرے پر اُداسی تھی۔ ماجد نے اُس سے اُداسی اور پریشانی کی وجہ پوچھی تو شمیم اور زیادہ اداس ہو گئی۔

"معلوم ہوتا ہے اب تم ڈر گئی ہو" ــــ ماجد نے کہا ــــ "اگر ایسی بات ہے تو مجھے ابھی بتا دو"

"رات کو ابّو مجھے اس طرح یاد آئے تھے جیسے وہ میرے کمرے میں موجود ہوں" ــــ شمیم نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "کمرے میں مجھے اُن کی آواز سنائی دیتی رہی ــــ شمیم! تم نے میرے خون کا بدلہ ابھی تک نہیں لیا ــــ ابّو نے یہ بھی کہا ــــ کاش میرا ایک بیٹا ہوتا! ــــ ماجد! میں نے قسم کھائی تھی کہ میں اپنے باپ کے خون کا انتقام لوں گی لیکن میں لڑکی ہوں۔ اگر میں مرد ہوتی تو میرے باپ کی قاتلہ گلبرگ کی ایک کوٹھی میں زندہ سلامت موجود نہ ہوتی۔ میں نے رات کو ابّو کی روح سے وعدہ کیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ ابّو کے خون کا بدلہ لے کر شادی کروں گی"

"کیا تمھارے ابّو قتل ہوئے تھے؟" ــــ ماجد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا ــــ "انہیں سزائے موت نہیں ہوئی تھی؟"

"ہوئی تو سزائے موت ہی تھی" ــــ شمیم نے کہا ــــ "لیکن میں اسے قتل کہتی ہوں۔ یہاں کسی کو بھی معلوم نہیں کہ میرے ابّو کا جرم کیا تھا۔ وہ بے گناہ پھانسی چڑھ گئے ہیں۔ ایک وزیر کے ساتھ اُن کی ٹکر ہو گئی تھی۔ کوئی غریب سا آدمی کسی طرح مر گیا یا اُسے مارا گیا اور اس وزیر نے میرے ابّو کو اس آدمی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرا دیا۔ یہ سازش اتنی مضبوط بنائی گئی کہ میرے ابّو کا اثر ورسوخ بیکار ہو گیا۔ کیس جب عدالت میں گیا تو میرے ابّو کو اطمینان تھا کہ وہ اس جھوٹے الزام سے بری ہو جائیں گے لیکن عدالت میں ایک بڑی خوبصورت لڑکی کو ان کے خلاف پیش کر دیا گیا۔ اس لڑکی نے انتہائی بے بنیاد اور بیہودہ بیان دیا۔ اُس نے کہا کہ میرے ابّو نے اُس پر دست درازی کی تھی اور اُس کے کپڑے پھاڑ ڈالے تھے۔ اتفاق سے یہ آدمی اُدھر سے گزرا تو اُس نے اس لڑکی کو بچانے کی کوشش کی۔ میرے ابّو نے اس آدمی کو قتل کر دیا۔ اس لڑکی کے بیان کی تائید میں جھوٹے گواہ پیش کیے گئے۔ ایک ڈاکٹر کو بھی پیش کیا گیا جس نے اپنی رپورٹ پیش کی کہ لڑکی پر تشدد کیا گیا ہے.... مختصر یہ کہ اس لڑکی کے بیان پر میرے ابّو کو سزائے موت دے دی گئی۔ سازش اس قدر مضبوط تھی کہ اپیلوں کا وقت بھی نہ دیا گیا۔ دو دن بعد میرے ابّو کو پھانسی دے دی گئی۔ اگر یہ لڑکی بیان نہ دیتی تو میرے ابّو اس جھوٹے الزام سے بری ہو جاتے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ لڑکی اب گلبرگ میں ہے۔ میں اُسے دیکھ آئی ہوں۔ اُس کے ساتھ باتیں بھی کی ہیں۔ اُس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ مجھے خراب کرائے گی"

"کہاں ہے وہ؟" ــــ ماجد نے بھڑک کر پوچھا۔

"میں اُسے اپنے ہاتھوں قتل کرنا چاہتی تھی" ــــ شمیم نے کہا ــــ "لیکن یہ کام مجھ سے نہ ہو سکا ماجد! تم میری قسم پوری کر سکتے ہو؟ اگر کر دو تو باقی عمر میں تمھارے ساتھ ہنسی خوشی گزار سکوں گی، نہیں تو میرے ابّو کی رُوح مجھے ہر وقت بے چین اور شرمسار رکھے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تمھارے پاؤں پکڑ کر تم سے معافی مانگوں اور تمہیں کہوں کہ ماجد! مجھے تمہاری بننے دو۔ مجھے حق حاصل نہیں کہ میں اپنی پسند کے آدمی کی بیوی بنوں"

"میں تمہیں ساری عمر کی خوشیاں دوں گا" ــــ ماجد نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا ــــ "مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے۔ پھر یہ خبر سن لینا کہ وہ کہیں بھی نہیں ہے"

"نہیں" ــــ شمیم نے کہا ــــ "تم اسے اُٹھا کر یہاں لے آؤ۔ میں اُسے خود قتل کروں گی۔ تم یہ کام کر بھی سکتے ہو، کروا بھی سکتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارے ہاتھ میں اس قسم کے آدمی ہیں"

"میرے ہاتھ میں آدمی ہیں یا نہیں" ــــ ماجد نے پُرعزم لہجے میں کہا ــــ "میں تمھاری قسم پوری کروں گا۔ اُسے اُٹھا کر یہاں لے آؤں گا"

شمیم نے ماجد کے عزم کو اور زیادہ پختہ کرنے کے لیے اپنا سر اُس کے کندھے پر پھینک دیا۔ ماجد نے اُسے اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ شمیم نے چہرہ اُس کی طرف کیا اور دونوں کی سانسیں ٹکرانے لگیں۔ ماجد مخمور ہو گیا۔

"شمیم!" ــــ اُس نے سرگوشی کی ــــ "اپنے کسی اور دشمن کا نام لو۔ اُس کے خون سے تمھارے پاؤں دھوؤں گا"

ماجد مدہوش ہوتا گیا، شمیم ہوش میں آتی گئی۔ اُس نے اپنے حسن کی شراب سے ماجد کو درندہ بنا دیا۔ ماجد نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر اتنی زور سے بھینچا کہ اُس کی پسلیاں چرچرانے لگیں۔

شمیم نے ماجد کو بڑی مشکل سے مدہوشی سے بیدار کیا اور اُسے حقیقت کی طرف لائی۔

"مجھے لاہور کی اُس کوٹھی کا نمبر بتاؤ" ــــ ماجد نے کہا ــــ "کوٹھی کس جگہ ہے۔ لڑکی کا نام اور حلیہ بتاؤ"

"وہاں ایک ہی لڑکی ہے" ــــ شمیم نے کہا ــــ "اُس کا نام شازی ہے۔ گھر میں صرف ایک آدمی ہے.... ملک رجب علی۔ وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اُس کی ایک ہی ٹانگ ہے۔ دوسری مصنوعی ہے۔ اُس کی بیوی ہے۔ گھر میں اور کوئی نہیں"

شمیم نے ماجد کو شازی کا حلیہ بتایا اور کوٹھی کے کمرے سمجھا کر اُسے بتایا کہ شازی کا کمرہ کہاں ہے۔ پھر اُس نے کوٹھی کی نشانیاں اور محل وقوع بتایا۔

"وہ کوٹھی؟" ــــ ماجد نے نعرہ لگانے کے لہجے میں کہا ــــ "اُس کے قریب، صرف دو کوٹھیاں چھوڑ کر میرے ایک دوست کی کوٹھی ہے۔ وہ بہت بڑے زمیندار کا بیٹا ہے۔ وہاں صرف عیش و عشرت کے لیے رہتا ہے۔ اگر وہ وہیں ہُوا تو میں تمھارا کام بڑی آسانی سے کر سکوں گا۔ وہاں کوٹھی [illegible] اُسے میرا یار اپنا ہمدرد بنا لیتا ہے"

"لڑکی کو یہاں لاکر رکھو گے کہاں؟"

"تھوڑی جگہیں ہیں؟" ___ ماجد نے کہا ___ "کہو تو ایک درجن ہاتھی چھپا دوں... کسی مزارعے کے گھر چھپا دوں گا پھر وہاں سے بھی غائب ہو جائے گی۔"

ماجد نے اُسے پھر اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ شمیم نے خود سپردگی کی کیفیّت میں سکون آمیز آہ بھری۔

"میرے ابّو کی رُوح خوش ہو جائے گی" ___ شمیم نے کہا ___ "اور ماجد! میں تمھارا دامن خوشیوں سے بھر دوں گی۔"

نسوانی حُسن کا جادو چل گیا۔ شمیم کا جھوٹ اور فریب کام کر گیا۔ ماجد جب وہاں سے چلا تو اس کے قدم یوں ڈگمگا رہے تھے جیسے مَے خانے سے پی کے نکلا ہو۔

✪

اور جب وہ اگلی شام لاہور اپنے دوست کی کوٹھی میں داخل ہُوا تو بھی وہ نشے کی سی کیفیّت میں تھا۔ اُس کا دوست وہیں تھا جو ماجد سے لپٹ گیا اور کچھ دیر لپٹا ہی رہا۔ وہ ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے۔ وہ جب کبھی ملتے تو کئی پیالے خالی ہوتے اور کئی پیالے ٹوٹتے تھے۔

رات کو جب وہ ولائتی وہسکی کی بوتل اور چرغے سامنے رکھ کے بیٹھے تو ماجد نے اپنے دوست کو بتایا کہ وہ لاہور کیوں آیا ہے۔ اُس نے شمیم کی محبّت کا ذکر جُھوم جُھوم کر کیا۔ پھر اُسے کوٹھی کا نمبر بتایا اور اپنا مُدعا پوری تفصیل سے بیان کیا۔

"ملک رجب علی کی کوٹھی؟" ___ دوست نے کہا ___ "یار! اُس کی تو ٹانگ کٹ گئی ہے۔ وہ پولیس میں ڈی۔ ایس۔ پی ہُوا کرتا تھا۔ یہ ساتھ ہی اُس کی کوٹھی ہے۔ تم جس لڑکی کی بات کر رہے ہو اُسے میں نے دو بار دیکھا ہے۔ بہت پیاری چیز ہے۔ تمھاری کچھ لگتی تو نہیں؟"

"نہ یار!" ___ ماجد نے کہا ___ "میری کچھ لگتی تو میں اُسے اغوا کرنے آتا؟"

"پھر یہ سُن لے ماجو!" ___ دوست نے کہا ___ "وہ ایک رات یہاں رہے گی۔"

"دس راتیں اپنے پاس رکھنا" ___ ماجد نے کہا ___ "مجھے یہ بتاؤ کہ آدمی اپنے لاؤں؟ پھر یہ بتاؤ کہ یہ کام کس طرح ہو گا؟"

"آدمیوں کی کیا کمی ہے؟" ___ دوست نے کہا ___ "آدمی میرے ہوں گے۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ لڑکی شام کے بعد باہر نکلتی ہے یا نہیں۔ پہلے طریقہ سوچنا ہے کام مشکل نہیں۔"

"یہ کام ہو جائے تو میری زندگی سنور جائے گی" ___ ماجد نے کہا۔

"یہ خیال رکھنا ماجو!" ___ اُس کے دوست نے کہا ___ "شمیم کے ساتھ جب گاؤں سے نکلو گے تو سیدھا اسلام آباد نہ چلے جانا۔ مارے جاؤ گے۔ میرے پاس آجانا۔ نکاح یہاں پڑھاؤں گا۔ عدالت میں شمیم کے بیان کرا دوں گا اور پولیس کی حفاظت کا پورا انتظام کراؤں گا۔"

وہ آدھی رات کے بعد تک پیتے رہے اور شازی کے اغوا کی سکیمیں بناتے رہے۔ ماجد کو اُس کے دوست نے بتایا کہ شازی کے متعلق اُس کی بھنگن معلومات لاتے گی۔

صبح وہ بہت دیر سے اُٹھے۔ ماجد نے نوکر کو بھیج کر اپنی بھنگن کو بُلوایا۔ بڑی چالاک اور ہوشیار عورت تھی۔ ماجد کے دوست کے پیغام اُس کی دوست لڑکیوں تک وہی پہنچایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ نئے شکار کی خبر بھی لایا کرتی تھی۔ وہ جب صاف ستھرے کپڑے پہن کر نکلتی تھی تو کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ بھنگن ہے۔

"ملک رجب علی کی کوٹھی میں تم کام کرتی ہو؟" ___ بھنگن آئی تو ماجد کے دوست نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں جی!" ___ بھنگن نے جواب دیا۔

"وہاں ایک لڑکی ہے" ___ ماجد کے دوست نے کہا ___ "کوئی دو مہینوں سے یہاں ہے۔ پہلے نہیں تھی۔"

"اب بھی نہیں ہے" ___ بھنگن نے کہا۔

"کیا بکواس کرتی ہو" ___ ماجد کے دوست نے کہا ___ "وہ نہیں ہے؟"

"وہ پرسوں سے غائب ہے" ___ بھنگن نے کہا ___ "ملک رجب علی اور اُس کی بیوی سخت پریشان ہیں۔ ملک صاحب بھاگ دوڑ کر رہے ہیں میں نے انہیں ٹیلیفون پر کسی سے بات کرتے سنا ہے وہ غصّے میں کہہ رہے تھے ___ 'مجھے ڈر ہے کہ لڑکی اب تک قتل ہو چکی ہو گی یا سرحد پار پہنچا دی گئی ہو گی۔ خُدا کے لیے تیز حرکت کریں' ___ میں نے ملک صاحب کی بیگم سے پوچھا کہ شازی بی بی کہیں نظر نہیں آ رہی تو بیگم نے کہا کہ اُس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔"

ماجد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اِن جاگیرداروں کے لیے جنہوں نے سارے پاکستان کو اپنی جاگیر بنالیا تھا کسی کی بہو بیٹی کو اغوا کر کے غائب کر دینا اور قتل کر کے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک دینا محض کھیل تھا۔ پولیس ان کی تھی، کچہریاں ان کی تھیں، پاکستان ان کی ریاست تھی کیونکہ دولت ان کی اور قیادت ان کی تھی۔

جاگیرداروں کے بیٹے ماجد کے لیے شازی کا اغوا کوئی ناممکن مہم نہ تھی۔ گلبرگ میں اُس کے دوست محض عیش و عشرت کے لیے رہتے تھے۔ میلوں پھیلی ہوئی اُن کی اراضی سونا اگلتی تھی اور یہ سونا شراب اور عیاشی میں بہہ رہا تھا۔ اِن دوستوں نے ماجد سے کہا تھا کہ ایک لڑکی کا اغوا کوئی مشکل کام نہیں مگر شازی پہلے ہی غائب ہو چکی تھی۔

ملک رجب علی نے علاقے کے تھانے میں شازی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔ اُس نے تھانیدار کو بتایا تھا کہ گمشدہ لڑکی کوئی عام سی لڑکی نہ تھی۔ رجب علی نے تھانیدار کو شازی کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا اور یہ سب کچھ اس لیے بتایا تھا کہ تھانیدار لڑکی کی تلاش میں کوتاہی نہ کرے۔

رجب علی نے ملٹری انٹیلی جنس اور سنٹرل انٹیلی جنس بیورو کو بھی شازی کی گمشدگی کی اطلاع دے دی۔ جسے بھی اطلاع ملی اُس نے پہلی بات یہ کہی کہ لڑکی کو انڈین سیکرٹ سروس نے اغوا کیا ہے ملک رجب علی کا بھی یہی خیال تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس کا صرف ایک لیفٹیننٹ کرنل تھا جس کی سوچ سب سے مختلف تھی۔

"بھارتی انٹیلی جنس والے اس لڑکی کو اب کیا کریں گے؟" ـــــ اس لیفٹیننٹ کرنل نے اپنے بریگیڈیئر سے کہا ـــــ "یہ لڑکی اب اُن کے کام کی نہیں رہی۔ وہ اناڑی تو نہیں۔ اُنہیں معلوم ہے کہ لڑکی تمام راز بے نقاب کر چکی ہے۔ ایسی لڑکی کو وہ انڈیا لے جا کر از سرِ نو اپنا ایجنٹ تو نہیں بنائیں گے۔"

"وہ لڑکی کو سزا دیں گے" ـــــ بریگیڈیئر نے کہا ـــــ "اُسے وہ بھارت کی کسی جیل میں ڈال دیں گے یا اُسے قتل کر دیں گے۔"

یہ سب قیاس آرائیاں تھیں۔ انٹیلی جنس اور پولیس شازی کی تلاش میں پوری طرح سرگرم ہو گئی تھی لیکن سب سے زیادہ پریشان صرف دو آدمی تھے۔ ایک رجب علی جس کی شازی بیٹی تھی اور دوسرا ماجد جو شازی کو اغوا نہیں کر سکا تھا اور خالی ہاتھ شمیم کے پاس جا رہا تھا۔

"تم ڈر گئے ہو ماجد!" ـــــ شمیم نے اُسے کہا ـــــ "کہہ دو تم ڈر گئے ہو۔ وہ لڑکی کہیں نہیں جا سکتی۔"

ماجد نے اپنے گاؤں جا کر شمیم کو اُس کے باغ میں بتایا تھا کہ شازی اغوا سے پہلے ہی غائب تھی شمیم نہیں مان رہی تھی۔

"پھر میرے ساتھ لاہور چلو" ـــــ ماجد نے اُسے کہا ـــــ "خود اُس کوٹھی میں جا کر دیکھو کہ شازی وہاں ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اُسی رات شازی مجھ سے لے لینا۔"

شمیم چاہتی تو یہی تھی کہ خود لاہور جاتے اور دیکھے کہ شازی وہاں ہے یا نہیں لیکن اب اُس کا گاؤں سے باہر جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ اُس کے پاس کوئی بہانہ نہ تھا۔ اُس کی شادی ہونے والی تھی۔ وہ بڑی تکلیف دہ وہم میں کھو گئی۔ اُس کے ذہن میں یہی ایک خیال اٹک گیا کہ شازی اور اصغر کی شادی سادگی اور خاموشی سے کر دی گئی ہے اور شازی اصغر کے ساتھ چلی گئی ہے۔ شمیم کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے معلوم کراتی کہ شازی کہاں ہے۔

اُسے شازی کے گم ہو جانے کا غم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو چاہتی ہی یہی تھی کہ شازی کہیں گم ہو جائے لیکن اُس کی پریشانی یہ تھی کہ اُس کے ساتھ اصغر بھی گم ہو گیا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں گم سر جھکائے چل پڑی۔

"شمیم!" ـــــ اُسے ماجد کی آواز سنائی دی۔

وہ نہ رُکی۔ اُسے جب دوسری بار ماجد نے پکارا تو وہ رُکی اور گھوم کر ماجد کی طرف دیکھا۔ ماجد آہستہ آہستہ چلتا اُس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"تم تو بہت ہی پریشان ہو گئی ہو" ـــــ ماجد نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

شمیم نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

"تم چلے جاؤ ماجد!" ـــــ شمیم نے دبی دبی آواز میں اُس سے کہا ـــــ "کوئی دیکھ نہ لے۔"

"پہلے تم نے کبھی نہیں کہا تھا کہ کوئی دیکھ لے گا" ـــــ ماجد نے کہا۔

شمیم نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، اُس کے ہونٹ ذرا سے ہلے لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ پیچھے کو مڑی اور چلی گئی۔ ماجد اُسے دیکھتا رہ گیا۔

اُسی شام کو ماجد پھر شمیم کے باغیچے کے قریب سے گزرا لیکن اُسے شمیم نظر نہ آئی۔ اگلی صبح بھی اُس نے شمیم کو باغیچے سے کچھ دور کھڑے ہو کر دیکھا۔ شمیم باغیچے میں نہیں تھی۔ ماجد بہت دیر تک باغیچے کے راستے ہی میں کھڑا رہا لیکن اُسے شمیم نظر نہ آئی۔ ماجد نے اپنی اُس خاص نوکرانی کو جو اُس کے خفیہ پیغام لے جایا کرتی تھی، شمیم کے پاس زبانی پیغام کے ساتھ بھیجا کہ کل صبح اپنے باغیچے میں آ جانا۔

نوکرانی گئی اور پیغام کا یہ جواب لائی کہ شمیم شاید نہ آ سکے۔ ماجد کو اس جواب نے بڑا پریشان کیا۔ ماجد کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شمیم نے اُسے اپنا آلۂ کار بنایا تھا لیکن شمیم نے جس انداز سے اپنے حسن و جوانی کا جادو ماجد پر چلایا تھا، اُسے ماجد دلی محبت سمجھ بیٹھا تھا۔ شمیم جیسی شوخ اور حسین لڑکی کی محبت سے خواہ وہ جھوٹی ہی ہو، ماجد کے لیے دستبردار ہونا ممکن نہ تھا لیکن شمیم اس کے لیے چھلاوہ بن گئی۔

★

چار پانچ دن گزر گئے۔ ایک روز شمیم کے تایا نے اُسے بلایا اور اپنے کمرے میں لے جا کر بٹھا لیا۔ تایا نے شمیم کو ڈاک کا ایک لفافہ دیا جو کھلا ہوا تھا۔ لفافے پر شمیم کا نام اور ایڈریس لکھا ہوا تھا۔

"یہ پڑھو" ـــــ تایا نے شمیم سے کہا ـــــ "اور مجھے بتاؤ یہ کیا ہے؟"

شمیم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافے میں سے کاغذ نکالا۔ تہیں کھولیں اور پہلے یہ دیکھا کہ یہ کس نے لکھا ہے۔ نیچے اصغر کا نام لکھا تھا۔ اصغر نے "ڈیئر شمیم" یا "پیاری شمیم" نہیں تھا بلکہ صرف شمیم لکھا تھا۔ خط میں لکھا تھا:

مجھے جب اطلاع ملی کہ شازی لاپتہ ہے تو سب سے پہلے میرا دھیان تمہاری طرف گیا۔ میں تین روز کی چھٹی لے کر لاہور آیا اور معلوم کیا کہ شازی کس طرح غائب ہوئی ہے۔ میرے اس سوال کا جواب کوئی بھی نہ دے سکا۔ یہاں سب کا خیال ہے کہ شازی کو انڈین سیکرٹ سروس نے اغوا کیا ہے اور اس کا انجام یہی ہوگا کہ اُسے قتل کر دیا گیا ہوگا یا قتل کر دیں گے لیکن میں ان لوگوں کے اس خیال سے متفق نہیں۔

میں فوجی ہوں اس لیے تمہید کے بغیر بات کرتا ہوں اور صاف بات کرنے کا عادی ہوں۔ میں تمہیں صاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ شازی کو تم نے اغوا کروایا ہے۔ میں یہ شک اس بنا پر کر رہا ہوں کہ تم نے دو تین مرتبہ کہا تھا کہ تمہیں پاکستان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں بلکہ تمہیں مجھ سے محبت ہے اس کے علاوہ تم نے شازی کے ساتھ ایسی باتیں کی تھیں جن سے تمہاری نیت اور تمہارے ارادوں کا پتہ چلتا تھا۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ شازی کے اغوا سے ایک دو دن پہلے تم یہاں پر آئی تھیں اور تم نے شازی کو پھر وہی دھمکیاں دی تھیں جو تم اُسے اسلام آباد میں دے چکی تھیں۔ تمہارے جانے کے بعد شازی نے ہر وہ بات جو تم نے اُس سے کی تھی، میری امی کو بتا دی تھی۔

میرا شک اس بنا پر بھی پختہ ہوتا ہے کہ تم اُس خاندان کی لڑکی ہو جو اپنے آپ کو پاکستان کا شاہی خاندان سمجھتا ہے۔ تمہارے ہاں قتل اور اغوا کوئی جرم نہیں اور تم لوگ قانون کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہو۔ شازی کو اغوا کروانا تمہارے لیے مشکل نہیں تھا۔ تم میرے اس سوال کا جواب کبھی نہ دے سکو گی کہ تم لاہور ہمارے گھر کیا لینے آئی تھیں؟ اس سوال کا جواب میرے پاس ہے۔

میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ شازی کو اگر تم نے اغوا کروایا ہے اور اگر شازی ابھی تک زندہ ہے تو اُسے لاہور بھیج دو۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ مجھے اُسی روز سے تمہاری صورت سے نفرت ہو گئی تھی جس روز تم نے اسلام آباد میں شازی کے ساتھ دھمکی آمیز اور اوچھی باتیں کی تھیں۔

میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔ مجھے اس پتے پر جواب دینا۔

اصغر

خط کے نیچے اصغر نے اپنی یونٹ کا ایڈریس لکھا تھا۔

★

"کیا یہ وہی اصغر ہے جس کا میں نے پہلے بھی نام سُنا ہے؟" — تایا نے شمیم سے پوچھا — "یہ

تایا ملک رجب علی کا بیٹا ہے۔"

شمیم کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور اُسے چکر آنے لگے تھے۔

اُس کا تایا گرج کر بولا — "تم نے سُنا میں نے کیا پوچھا ہے؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں" — شمیم نے رندھیائی ہوئی آواز میں سر زور زور سے ہلاتے ہوئے جواب دیا — "تایا جان! مجھے کچھ پتہ نہیں۔ یہ سب کیا ہے۔"

شمیم ایک عورت تھی۔ اُس پر جو چوٹ پڑی تھی اُسے کوئی عورت سہہ نہیں سکتی۔ عورت جوابی وار کرتی ہے۔ اُس کا یہ وار ناگن کے ڈنک کی طرح بھی ہو سکتا ہے اور زخمی شیرنی کے جھپٹے کا بھی۔ اصغر نے شمیم کے خوابوں پر تاریک رات جیسی سیاہی پھیر دی تھی۔ اُس نے اپنے باپ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا تھا لیکن وہ اپنے جذبات کا خون برداشت نہ کر سکی۔ اس کے ساتھ اُس پر یہ بے بنیاد الزام کہ اُس نے شازی کو اغوا کروایا ہے۔ شمیم نے اصغر پر جوابی حملے کا پہلا وار کیا۔

"تایا جان!" — شمیم نے کہا — "یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے مجھے یتیم کر دیا ہے۔ ملک رجب علی اور اس کا یہ بیٹا کیپٹن اصغر اور شازی نام کی یہ بدمعاش لڑکی اور ملک رجب علی کی یہ دوسری بیوی جو بڑی بدمعاش عورت ہے، یہ سب میرے ابّو کو دوستی کے جال میں پھنساتے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ ان لوگوں کے درمیان کیا کچھ ہوتا رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے ابّو پر ہندوستان کی جاسوسی کا جھوٹا الزام لگا اور آج ابّو قبر میں پڑے ہیں۔"

"تو کیا میں یہ سمجھوں کہ یہ خط تمہیں بلیک میل کرنے کے لیے لکھا گیا ہے؟" — تایا نے پوچھا۔

"معلوم یہی ہوتا ہے" — شمیم نے جواب دیا۔

"دیکھ لڑکی!" — تایا نے دبدبے سے کہا — "مجھے شک ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ تمہارا بھی کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔ تمہاری ماں اب بھی کہتی ہے کہ اپنے ابّو کے خلاف کارروائی میں تم بھی شامل تھیں۔"

"تایا جان!" — شمیم نے جھنجھلا کر کہا — "اس صدمے نے امّی کا دماغ بُری طرح ماؤف کر دیا ہے۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ کبھی کچھ اور کبھی کچھ کہتی ہیں۔ انہیں تو ہر انسان اپنا دشمن نظر آتا ہے۔"

تایا بڑے غصے سے اُٹھا، خط شمیم کے ہاتھ سے لیا اور باہر نکل گیا۔ اُس نے اپنے بھائیوں کو بلایا اور یہ خط انہیں دکھلایا۔ جس جس نے خط پڑھا وہ جل اٹھا۔ ہر اک کی زبان سے یہی نکلا کہ ملک رجب علی کے پورے خاندان کو اڑا دو۔

"ٹھنڈے دل سے سوچو" — شمیم کے تایا نے کہا — "یہ کوئی گورکھ دھندا ہے۔ بڑک مار کر ہم اس کا حل تلاش نہیں کر سکتے۔"

اُنہوں نے سر جوڑے بہت دیر بحث مباحثہ کرتے رہے آخر یہ فیصلہ کیا کہ یہ خط محفوظ رکھا جائے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ یہ خط ہمیں ملا ہی نہیں جب کبھی ضرورت پیش آئی تو یہ خط سامنے لے آئیں گے۔

"ہاں، میں نے بھی یہی سوچا تھا" — شمیم کے تایا نے کہا — "ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ

ملک رجب علی کی پہنچ بڑی دُور تک ہے اور اُس کا یہ بیٹا اصغر فوج میں کپتان ہے۔ تم جانتے ہو کہ ستمبر کی جنگ کی وجہ سے فوجیوں کی زیادہ سُنی جاتی ہے۔ ملک رجب علی کے خاندان کو غائب کر دینا ہمارے لیے کوئی مشکل نہیں لیکن ابھی ہماری پوزیشن ذرا کمزور ہے۔ اگر ملک رجب علی یا اُس کے بیٹے کی طرف سے ہمارے خلاف کوئی ہِل جُل ہوئی یا پولیس نے یہاں چھاپہ مارا تو پھر دیکھ لیں گے۔"

"مجھے اپنی اس بھتیجی پر بھی اعتبار نہیں" ——— شمیم کے ایک چچا نے کہا ——— "شہر میں جا کر لڑکی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جس طرح ہمارا بھائی شہزادہ تھا، اِسی طرح اُس نے اپنی بیٹی کو شہزادی بنا کر رکھا۔ اس کی شادی فوراً ہو جانی چاہیئے۔"

★

اصغر نے یہ خط ملک رجب علی اور اپنی ماں کو بتائے بغیر شمیم کو لکھا تھا۔ اُس کے اِس شک پر کہ شازی کو شمیم نے اغوا کروایا ہے، ان دونوں نے اتفاق نہیں کیا تھا۔ ملک رجب علی کو پورا یقین تھا کہ شازی کو ہندوستانیوں نے یا ہندوستانیوں کے پاکستانی ایجنٹوں نے اغوا کروایا ہے۔ ملک رجب علی کی جذباتی حالت خاصی اُکھڑی ہُوئی تھی۔ اگر اس کی ایک ٹانگ مصنُوعی نہ ہوتی تو وہ شازی کی تلاش میں سارے پاکستان میں گھوم جاتا۔ اُس کے پاس ٹیلیفون تھا، جس کا ریسیور ہر وقت اُس کے کان سے لگا رہتا تھا۔ شازی کا کوئی سراغ نہیں مِل رہا تھا۔ کیپٹن اصغر تین دن کی چھٹی کے بعد واپس اپنی یونٹ میں چلا گیا تھا۔

شمیم کی شادی کا دن مقرر ہو گیا۔ اصغر کا خط اُس شمیم کے لیے جو شوخ، چلبلی، شرارت پسند اور ہنسنے کھیلنے والی شمیم تھی، موت کا پروانہ تھا۔ یہ شمیم جس کی شادی کا دن مقرر ہُوا تھا، ایک زندہ لاش تھی جس کے حُسن میں صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ یہ حُسن اداس ہو گیا تھا۔ اُس کا تمام تر خاندان اُس کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اُس گاؤں میں لڑکے والے بھی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ صغیر کا خاندان شمیم کے خاندان جتنی حیثیت رکھتا تھا۔ اِدھر بیٹی اکلوتی تھی، اُدھر بیٹا اکلوتا تھا۔ جاگیروں کی دولت اُڑ رہی تھی۔ نوکر اور مزارعے بھی خوش تھے لیکن شمیم کے سینے میں صفِ ماتم بچھی ہُوئی تھی۔ اُس نے اصغر کی محبت اور اپنے جذبات کی گلی سڑی ہڈیاں اور خون اپنے وجُود میں کہیں دفن کر دیا تھا۔ اُس کی سہیلیاں جب اُسے چھیڑتی تھیں تو اُس کے ہونٹوں پر ہاری ہُوئی ملول سی مسکراہٹ آجایا کرتی تھی۔

شادی سے دو روز پہلے شمیم صبح سویرے اپنی ماں کو بتا کر اپنے باپ کی قبر پر چلی گئی۔ ملک ناصر کی قبر کو مرمر کی خوشنما اور چمکتی ہُوئی سِلوں سے دلفریب بنایا گیا تھا۔ بھارت کے اس بیحد خطرناک پاکستانی جاسوس کی قبر پر بڑا ہی شاندار کتبہ لگایا گیا تھا جس پر اُس کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں لکھی گئی تھیں۔

شمیم اس قبر پر پہلے بھی آتی تھی اور فاتحہ پڑھ کر چلی گئی تھی مگر اس روز وہ قبر کے پاس بیٹھی اور پھر بازو پھیلا کر قبر پر لیٹ گئی۔ روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ آنسوؤں کا یہ عالم جیسے وہ قبر کو آنسوؤں سے دھوڈالے گی۔

"ابُو مجھے معاف کر دینا" ——— شمیم نے قبر پر ہاتھ پھیر کر کہا ——— "ابُّو مجھے بخش دینا۔ میں نے آپ

کو قبر میں اتارا ہے۔"

وہ بہت دیر قبر پر روتی رہی اور اپنے ابُّو سے معافیاں مانگتی رہی۔ وہ جب وہاں سے اُٹھی اور چلی تو اُس کے کندھے یوں آگے کو جھکے ہُوئے تھے جیسے وہ جوانی کی اسی عمر میں ضعیف بڑھیا ہو گئی ہو۔ وہ اس طرح آہستہ آہستہ چل رہی تھی جیسے اپنے باپ کے گناہوں کا بوجھ بھی اُس نے اپنے ضمیر پر ڈال لیا ہو۔

مر کر بھی ان جاگیرداروں نے اپنے آپ کو عوام کی قبروں سے یوں بلند و بالا رکھا تھا کہ عام قبرستان میں ہی زمین کا ایک حصّہ الگ کر لیا تھا۔ وہاں ہرے بھرے درخت بھی تھے، پھُول دار پودے بھی تھے اور قبروں کے درمیان اینٹوں سے پختہ بنے ہُوئے راستے بھی تھے۔ ہر قبر خوشنما تھی۔

شمیم آہستہ آہستہ اپنے خاندان کے قبرستان میں ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں خوشنما بیلیں درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اُسے سرگوشی سی سنائی دی ——— "شمیم!" ——— اُس نے بغیر چونکے اُدھر دیکھا۔ گھنی بیلوں کی اوٹ میں ماجد کھڑا تھا۔ شمیم اُس کے پاس جا رُکی۔

"میں تمہیں ادھر آتا دیکھ کر آیا ہوں" ——— ماجد نے کہا۔

"اب دُور سے ہی دیکھ لیا کرو" ——— شمیم نے ایسی آواز میں کہا جو اُس کے جذبات کی طرح کُچلی اور مَسلی ہُوئی تھی۔

"اور تمہارے وہ وعدے؟"

"بھول جاؤ اُن وعدوں کو ماجد!" ——— شمیم نے کہا ——— "وہ شمیم مر گئی ہے۔ میں نے اُسے دفن کر دیا ہے۔"

"میں اُسے زندہ کر سکتا ہوں" ——— ماجد نے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر کہا کہ شمیم صغیر کو پسند نہیں کرتی۔ کہنے لگا ——— "اب بھی وقت ہے آؤ یہاں سے چلے چلیں۔ ہم کسی کے محتاج نہیں ہوں گے۔ میں اگر شازی کو اغوا نہیں کر سکا تو کیا ہُوا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر شازی میرے سامنے آگئی تو میں اُس کی لاش تمہارے قدموں میں رکھ دوں گا۔"

شمیم نے اُسے ٹالنے کے لیے بہت کچھ کہا لیکن ماجد خوش فہمیوں کی دلفریب بھُول بھلیوں سے نہیں نکل رہا تھا۔ شمیم کی جذباتی کیفیّت ایسی تھی کہ اُس کا مزاج اُکھڑ گیا۔ اُس نے ماجد کو وہ بات کہنے کا فیصلہ کر لیا جو وہ نہیں کہنا چاہتی تھی۔

"ماجد!" ——— شمیم نے دو ٹوک لہجے میں کہا ——— "میرے دل میں تمہاری محبّت کبھی بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنا انتقام لینے کے لیے تمہیں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اگر تم شازی کو اغوا کر کے لے بھی آتے تو میں تمہیں یہی جواب دیتی جو اب دے رہی ہُوں۔"

ماجد بھی اِسی بادشاہ خاندان کا فرد تھا اور وہ بدمعاشوں کی منڈلی میں بھی بیٹھتا تھا۔ وہ بھڑک اُٹھا۔

"میں شازی کو تو اغوا نہیں کر سکا، تمہیں غائب کر سکتا ہوں" ——— ماجد نے کہا ——— "تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔ میں تم سے بڑا خوفناک انتقام لے سکتا ہوں۔ تمہارے گھر والوں کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ تم کہاں ہو۔"

"میں چاہتی ہی یہی ہوں کہ کوئی مجھے قتل کر کے میری لاش غائب کر دے" ——— شمیم نے

ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا — "اگر مجھے چیلنج کرتے ہو تو میں تمہیں یہ تماشہ بھی دکھا سکتی ہوں۔ تمہاری لاش غائب نہیں ہو گی۔ گاؤں میں پڑی ہوئی ملے گی۔ اس کا پوسٹ مارٹم ہو گا اور پھر دفن ہو جائے گی۔"

شمیم جو اپنے آپ پر منوں بوجھ اٹھائے آہستہ آہستہ چلتی یہاں تک پہنچی تھی، بڑی تیز رفتار سے وہاں سے چل پڑی۔ اُس کی چال میں شاہانہ جلال اور قہر تھا۔ چند قدم چل کر وہ رُکی اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ماجد وہیں کھڑا تھا۔

"اور سُنو" — شمیم نے شہزادیوں کے رعب سے بڑی جاندار آواز میں ماجد سے کہا — "آئندہ اس طرح میرے راستے میں نہ آنا۔ میں کسی لوفر بدمعاش کے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتی" — اُس نے اپنی گردن کو شاہانہ سا خم دیا اور چلی گئی۔

ماجد وہیں کھڑا اُسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ اپنی توہین برداشت کرنے والا آدمی نہیں تھا لیکن وہ شمیم کے تایا اور چچوں کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس نے اپنے دل پر ویسی ہی ایک سِل رکھ لی جیسی سِلوں سے یہ لوگ اپنی قبریں پکی کروایا کرتے تھے۔

★

شمیم اور صغیر کی شادی اُن شادیوں کی طرح ہوئی جن کی یاد دُولہا دلہن کی اگلی نسلوں تک زندہ رہتی ہے۔ شمیم کی ڈولی پر پانچ پانچ اور دس دس روپوں کا مینہ برسایا گیا لیکن شمیم ڈولی میں یوں بیٹھی تھی جیسے تابوت میں بند ایک لاش جا رہی ہو۔

شمیم اپنے دُولہا صغیر کو بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ صغیر ماجد کے بالکل اُلٹ فطرت کا آدمی تھا۔ اُس کی شکل و صورت اور قد بُت میں جاذبیت تھی۔ اُس کی طبیعت میں شگفتگی بھی تھی۔ سوائے اس کے کہ شمیم کسی اور کو چاہتی تھی، اُس کے پاس اور کوئی ایسی وجہ نہیں تھی کہ وہ صغیر کو پسند نہ کرے۔ اُس نے جب حجلۂ عروسی میں صغیر کو دیکھا تو اُسے اصغر بہت یاد آیا اور اس کے ساتھ ہی اُسے صغیر پر ترس بھی آیا۔ صغیر نے اُس کے ساتھ ویسی ہی دو چار باتیں کیں جیسی ہر دُولہا پہلی رات اپنی دلہن سے کرتا ہے۔

"آپ نے میرے خلاف اور میرے متعلق بہت کچھ سنا ہو گا" — شمیم نے صغیر سے کہا — "وہ ایک طوفان تھا جو آیا اور ہمارے خاندان کا چین سکون اور وقار اڑا کر لے گیا۔ میں آپ سے نہیں پوچھوں گی کہ آپ نے میرے متعلق کیا کچھ سنا ہے۔ اس میں کچھ غلط بھی ہو گا، کچھ صحیح بھی ہو گا۔ میں آپ کو صرف یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ آج رات سے میں وہ شمیم نہیں ہوں جو ہُوا کرتی تھی۔ ہماری ازدواجی زندگی میں آپ کا حکم چلے گا۔ صرف ایک درخواست کروں گی کہ کسی وقت میرے چہرے پر اُداسی دیکھیں تو اسے غلط نہ سمجھ لیں۔ آپ کے دل میں ایسا خیال نہ آئے کہ میں شاید آپ سے ناخوش ہوں۔"

صغیر نے سکون اور اطمینان کی آہ بھری جیسے وہ شمیم سے یہی کچھ سننا چاہتا تھا۔

ازدواجی زندگی کی پہلی صبح جب شمیم نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو اُسے اپنے آپ کو پہچاننے میں کچھ دشواری سی ہُوئی۔ اُس کے ہونٹوں سے سرگوشی پھسل گئی — "اصغر کی شمیم مر گئی ہے۔"

اصغر کی شمیم تو مر گئی تھی لیکن شازی کے متعلق ابھی تک پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ زندہ ہے یا ماری جا چکی ہے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس اور سول پولیس کی کوششیں ذرا سی بھی کامیاب نہیں ہُوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے شازی کو زمین نے نگل لیا ہو یا وہ فضا میں تحلیل ہو گئی ہو۔ ملٹری انٹیلی جنس کا بریگیڈیئر اب بھی کہتا تھا کہ یہ انڈین سیکرٹ سروس کا کام ہے لیکن اس کا کرنل وثوق سے کہتا تھا کہ انڈیا کے ایجنٹ جن بھوت نہیں کہ وہ اس طرح ایک لڑکی کو اٹھا کر سرحد پار لے جائیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب جنگِ ستمبر کا جذبہ ابھی تر و تازہ تھا۔ شہیدوں کا خون ابھی خشک نہیں ہُوا تھا۔ پاکستانیوں کی آنکھوں میں جذبات کی شدّت سے امڈے ہُوئے آنسوؤں کی نمی ابھی باقی تھی۔ بھارت کے ایجنٹ ابھی سرحد کے اِدھر اُدھر آنے جانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

★

اصغر کی بٹالین آزاد کشمیر میں تھی۔ شازی کو لاپتہ ہُوئے بیس روز گزر چکے تھے۔ اصغر کی جذباتی کیفیّت ایسی دگرگوں ہو گئی تھی کہ اُس کے کمانڈنگ آفیسر نے دو مرتبہ اُسے کہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالے۔ اُس وقت اصغر کمپنی کمانڈر تھا۔ اگر اس کے کمانڈنگ آفیسر کو اصغر کے اس جذباتی خلفشار کے باعث کا پتہ نہ ہوتا تو وہ اُسے باقاعدہ وارننگ دیتا۔

ایک روز اُس کی عمر کا ایک میجر اصغر کے پاس آیا۔ وہ توپ خانے کا میجر منیر تھا۔ اس سے پہلے اُن کی کبھی ملاقات نہیں ہوتی تھی۔

"فرمائیے سر!" — کیپٹن اصغر نے میجر منیر سے کہا — "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"نہ یار!" — میجر منیر نے کہا — "لکھنوی بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں بھی تمہاری طرح فوجی ہوں۔ ایک عجیب مسئلہ لے کر آیا ہوں۔ معلوم نہیں، تمہارا ردِّعمل کیا ہو گا لیکن مجھے تمہارے برادرانہ تعاون کی شدید ضرورت ہے۔"

"آپ حکم کریں سر!" — اصغر نے کہا۔

"اپنے کمرے میں چلو" — میجر منیر نے کہا۔

اصغر اسے اپنے بنکر میں لے گیا۔ وہ کوئی کمرہ نہیں تھا۔ یونٹ خاصے وسیع علاقے میں ڈیپلائے تھی۔

"شازی نام کی ایک لڑکی کو تم شاید جانتے ہو گے" — میجر منیر نے کہا۔

"ہاں سر!" — کیپٹن اصغر نے شدّت سے چونک کر کہا — "کیا ہُوا اس لڑکی کو؟ کہاں ہے وہ؟ آپ اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"حوصلہ کرو یار! حوصلہ کرو" — میجر منیر نے شگفتہ سے لہجے میں کہا — "وہ لڑکی میرے پاس ہے۔"

"آپ کے پاس؟" — اصغر نے اچھل کر اور میجر منیر کی طرف جھک کر پوچھا — "وہ آپ کے پاس کیسے پہنچی ہے؟"

"یہی بتانے آیا ہُوں" — میجر منیر نے کہا، پھر اُس کا سر جھک گیا۔ جب اُس نے سر اُٹھایا تو اُس کی آہ نکل گئی — "میں وہ لڑکی تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں لیکن تمہارا تعاون نہ ہُوا تو میرا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔ میں تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ وہ لڑکی جس طرح میرے پاس آئی تھی، اُسی طرح

میں اُسے واپس بھیج رہا ہوں۔ اُس کے ساتھ کوئی اُلٹی سیدھی حرکت نہیں ہُوئی سوائے اس کے کہ میں نے اُسے اپنے پاس رکھا جسے قانون کی زبان میں حبس بیجا کہتے ہیں۔"

"سر آپ مجھے پریشان کر رہے ہیں"۔ کیپٹن اصغر نے کہا۔

"تم میرے فوجی بھائی ہو کیپٹن اصغر!"۔ میجر منیر نے کہا۔ "اگر تم سویلین ہوتے تو میں یوں تمھارے پاس نہ آتا نہ تم سے تعاون کی درخواست کرتا، نہ اس وقت تک شازی زندہ ہوتی... ستمبر کی جنگ سے بہت پہلے کی بات ہے۔ میں اُس وقت اپنے جی او سی کا اے۔ ڈی سی تھا۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ اس جی۔ او سی کا ڈویژن کتنے اہم محاذ پر تھا۔ شازی مجھے اُن دنوں میری ایک گرل فرینڈ کے ذریعے ملی تھی۔ یہ لڑکی مجھے اتنی اچھی لگی کہ مجھ جیسا آوارہ اور عیّاش آدمی مسلمان کا بچّہ بن گیا۔ تم نہیں جانتے ہو گے کہ میں کس خاندان کا فرد ہُوں۔ میں تم پر رُعب نہیں جما رہا، اپنا تعارف کرا رہا ہُوں۔ میں ایک نواب خاندان سے تعلق رکھتا ہُوں۔ اپنے خاندان کی روایت کو برقرار رکھنے کے لیے میں فوج میں آ گیا ہُوں ورنہ جو تنخواہ میں فوج سے لے رہا ہُوں اتنی تنخواہ پر میں صرف اپنے جیب خرچ سے چھ آدمی ملازم رکھ سکتا ہُوں۔ میرے خاندان کا اثر ورسوخ تھا کہ مجھے جی۔ او۔ سی نے اپنا اے۔ ڈی سی بنا لیا....

"اگر تم میری فیملی بیک گراؤنڈ کو جان گئے ہو تو تمھیں یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں کس قدر عیّاش آدمی تھا۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ میں نے جب شازی کو دیکھا تو سب سے پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ معلوم نہیں کیوں میرے دل سے آواز آئی کہ میری شادی اسی لڑکی کے ساتھ ہوگی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شازی پہلی ملاقات میں ہی میرے ساتھ اس طرح بے تکلّف ہوگئی جیسے ہم دونوں اکٹھے کھیل کر جوان ہوتے ہوں۔ میں نے شازی کے انداز میں والہانہ پن اور بیباختگی دیکھی۔ مجھے عورتوں کی کیا کمی تھی۔ یہ تو میری ہابی تھی لیکن شازی نے مجھ پر کچھ ایسا تاثر طاری کر دیا کہ مجھے اپنی گرل فرینڈ جو شازی کے ساتھ آئی تھی، بُری لگنے لگی....

"جب شازی جانے لگی تو میں نے اُسے پھر ملنے کو کہا۔ اُس نے کہا کہ وہ اتنی آزاد نہیں نہ وہ اتنا میل ملاقات پسند کرتی ہے۔ میں نے اُس سے التجا کی۔ اُس کے دل میں رحم پیدا ہو گیا اور تین چار روز بعد وہ مجھے اکیلی ملی یقین کرنا کیپٹن اصغر میرے دل میں کوئی غلط خیال نہ آیا۔ میرے ذہن میں ایسی پاکیزگی سی آ گئی جس سے میں ناآشنا تھا۔ ہم کچھ دیر اکٹھے رہے۔ مجھ جیسے آدمی کی جذباتی حالت یہ ہو گئی تھی جیسے یہ لڑکی کسی نواب فیملی کی ہے اور میں اس کا دربان ہُوں۔ وہ جب چلی گئی اور میں اپنے آپ میں آیا تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی بھی آئی اور تعجّب بھی ہُوا کہ میں اس لڑکی کا غلام بنا جا رہا ہوں۔"

"سر! آپ نے بڑی لمبی کہانی شروع کر دی ہے"۔ اصغر نے کہا۔ "میں یہ سُننے کو بیتاب ہوں کہ شازی اغوا کس طرح ہوئی اور آپ تک کس طرح پہنچی؟"

"تمھیں اتنا ہی بے صبر ہونا چاہیے جتنا ہو رہے ہو"۔ میجر منیر نے کہا۔ "لیکن میں پورا پس منظر بیان نہیں کروں گا تو تمھارے دل میں کئی شکوک اور شبہات پیدا ہوں گے۔ مجھے بات لمبی ہی کرنے دو۔ مجھے تمھاری ہمدردی کی ضرورت ہے۔ شازی تمھاری ہے اور وہ تمھیں واپس مل رہی ہے، مجھے

بات پوری کرنے دو۔"

اصغر کی بیتابی کچھ کم ہو گئی۔

★

"شازی مجھے ملتی رہی"۔ میجر منیر نے اپنی داستان سُناتے ہُوئے کہا۔ "لیکن اُس نے ایسا باوقار انداز اختیار کیے رکھا کہ میں اُسے ایک نایاب ہیرا سمجھتا رہا۔ وہ کوئی عام سی قسم کی لڑکی نہیں تھی جو ہم جیسے فوجی افسروں کے ساتھ دوستانہ گانٹھنے کے جتن کرتی رہتی ہیں۔ اُس نے مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بھی نہ دیا۔ میں نے جب اُسے بتایا کہ میں فلاں خاندان کا فرد ہوں تو وہ ذرا سا بھی مرعوب نہ ہُوئی....

"میں نے ایک روز اُسے شادی کے لیے کہا۔ اُس نے کہا کہ زندگی کے متعلق اتنا اہم فیصلہ کرنے کے لیے اُسے بہت وقت چاہیے۔ مختصر یہ کہ اُس نے مجھے اپنا غلام بنا لیا۔ ایک روز باتوں باتوں میں اُس نے بچّوں کے سے اشتیاق سے کہا کہ وہ میرے جی۔ او سی سے ملنا چاہتی ہے۔ کہنے لگی کہ میں نے کبھی کسی جرنیل کے ساتھ بات نہیں کی۔ ویسے ہی خیال آتا ہے کہ دیکھوں یہ جرنیل کیسے ہوتے ہیں۔ وہ کہتی تھی کہ میں تاریخ میں جرنیلوں کی باتیں پڑھتی ہوں تو یہ لوگ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگتے ہیں....

"میں ایک روز اُسے اپنے جی۔ او سی کے پاس لے گیا اور اُسے کہا کہ یہ لڑکی کسی جرنیل کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے شازی کو بتایا کہ دیکھ لو، یہ ہیں ہمارے جرنیل جنہیں ہم جی۔ او۔ سی کہتے ہیں اور ان کا عہدہ میجر جنرل ہے۔ تم شاید اُس میجر جنرل کو جانتے ہو گے کہ وہ مسلمان قسم کا آدمی ہے۔ شازی کے ساتھ تو وہ بڑی اچھی باتیں کرتا رہا لیکن اگلے روز اُس نے میرے پہلے سلیوٹ کا جواب دے کر میری جو گت بنائی وہ میں ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اُس نے مجھے یہاں تک کہا کہ تمھیں یہ حرام کاری چھوڑنی پڑے گی یا فوج۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کر رہا ہوں۔ میرا جرنیل اور زیادہ بھڑک اُٹھا۔ کہنے لگا کہ یہ لڑکی مجھے کسی بڑے ہی معزّز خاندان کی معلوم ہوتی ہے۔ تم جیسا آوارہ آدمی اس کے قابل نہیں....

"اس کے بعد شازی نے مجھے کئی بار کہا کہ میں اُسے اپنے جی۔ او سی سے ملواؤں کیونکہ وہ اُسے بہت اچھا لگا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ پہلے تو اُس نے مجھے صرف گالیاں دی تھیں۔ اب اگر میں تمھیں اس کے پاس لے گیا تو وہ مجھے مُرغا بنا کے جوتے مارے گا۔ شازی نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ بڑا سخت جرنیل ہے اور مجھے یقین ہے کہ دشمن کے لیے وہ ایک آفت ثابت ہو گا لیکن عادات اور مزاج کے لحاظ سے اُسے یہاں کی جامع مسجد کا خطیب ہونا چاہیے....

"اس کے بعد میں نے دیکھا کہ شازی نے میرے ساتھ ملنا کم کر دیا لیکن وہ جب بھی ملی، میں نے اُس کی وارفتگی میں کمی نہ دیکھی۔ بخدا میں نے اپنی گرل فرینڈ اور دوسری آشنا لڑکیوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ شازی مجھ پر ہر وقت نشے کی طرح سوار رہنے لگی۔ وہ میری سوچوں اور میرے خوابوں پر غالب آ گئی تھی۔"

اصغر کی ہنسی نکل گئی۔ میجر منیر چُپ ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں۔ اُس نے آپ سے ملنا کیوں کم کر دیا تھا"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "وہ انڈیا کے ایک بڑے مضبوط اور بڑے خطرناک جاسوسی رِنگ کی لڑکی تھی۔ اُس نے آپ پر اپنا طلسم طاری کر کے آپ کے میجر جنرل کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے خود دیکھ لیا اور آپ سے بھی معلوم کر لیا کہ یہ میجر جنرل ہوش مند آدمی ہے اور ہاتھ نہیں آئے گا تو اُس نے آپ سے ملنا کم کر دیا لیکن آپ کو اُس نے اپنے اثر میں رکھا"۔

"اثر میں بھی یہاں تک رکھا کہ میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ ہمارا ڈویژن جنگ کی صورت میں کون سے محاذ پر ہو گا"۔۔۔ میجر منیر نے کہا۔۔۔ "میں تمہیں کیا بتاؤں اصغر بھائی! اُس نے مجھے مدہوش سا کر کے کچھ نازک معلومات بھی مجھ سے لے لی تھیں۔ یہ تو مجھے ستمبر کی جنگ کے بعد پتہ چلا تھا کہ یہ لڑکی انڈیا کی جاسوس ہے۔ اس کے باوجود میرے دل میں اُس کی محبّت کم نہ ہوئی"۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ ہمارا ڈویژن بڑے نازک محاذ پر چلا گیا"۔۔۔ میجر منیر نے کہا۔۔۔ "تمہیں معلوم ہے ہمارا ڈویژن کہاں لڑا تھا.... اعلانِ تاشقند کے بعد ہمارا ڈویژن واپس چھاؤنی میں آ گیا۔ اپنی انٹیلی جنس کے ایک میجر نے جو میرا دوست ہے، مجھے بتایا کہ انڈیا کا ایک جاسوسی رِنگ توڑا گیا ہے۔ میں نے اس میجر سے شازی کا نام سُنا تو میں چونکا۔ اُس نے مجھے یہ سارا واقعہ سُنا دیا اور مجھے شازی کی اصلیّت کا پتہ چلا۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ اپنا یہ رِنگ شازی نے توڑا ہے اور اُس نے اپنی ماں کو بھی گرفتار کرا دیا ہے۔ چونکہ میرا یہ میجر دوست انٹیلی جنس میں تھا اس لیے اُس سے مجھے شازی کے متعلق ہر بات اور اُس کی ہر حرکت معلوم ہوتی رہی۔ مجھے جاسوسی کے اس رِنگ کے لیڈر ملک ناصر کی کوٹھی کا ایڈریس مِل گیا اور یہ خبر بھی ملی کہ شازی وہاں رہتی ہے اور پاکستان میں اُس کا کوئی عزیز اور کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اس سے اُس کے ساتھ میری دلچسپی اور گہری ہو گئی۔ میں نے اُس وقت تمہارا نام نہیں سُنا تھا....

"مجھ سے تفصیلات نہ پوچھنا اصغر! میرے ذرائع بڑے مضبوط اور بڑے کام کے ہیں۔ میں شازی سے ملا۔ خدا کی قسم، میں نے عقیدت اور احترام سے اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چُومے اور آنکھوں سے لگائے۔ پاکستان کے لیے اُس نے جو کارنامہ کر دکھایا اور جو قربانی دی تھی، وہ میں نہیں دے سکا، وہ تم نہیں دے سکے، ایسی قربانی کون دے سکتا ہے اصغر!....

"میں نے شازی سے کہا کہ شازی! تمہارا یہاں کوئی ٹھکانہ نہیں۔ میں تمہیں ٹھکانہ دوں گا۔ وہاں تم شہزادی ہو گی۔ وہاں تمہاری حکمرانی ہو گی۔ اُس وقت شازی نے مجھے کہا۔۔۔ 'میرے دل میں آپ کی وہ محبّت کبھی بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ میں کیا تھی۔ آپ کی گرل فرینڈ نے مجھے بڑی معصومیّت سے آپ سے ملوایا تھا لیکن میں معصوم نہیں تھی۔ مجھے آپ کے ڈویژن کمانڈر کو اپنے جال میں لینا تھا مگر وہ میرے کام کا آدمی نہیں تھا'۔۔۔ پھر شازی نے مجھے کہا کہ میں اُسے دل سے اتارنے کی کوشش کروں....

"اصغر یار! اگر وہ مجھے دھتکار دیتی، بے رُخی سے پیش آتی یا مجھے ملنے سے ہی انکار کر دیتی تو میں

اُسے دل سے اتار دیتا لیکن اُس نے ایسے پیار سے باتیں کیں اور اُس کے ہونٹوں پر ایسا تبسّم تھا جس نے مجھے اُس سے دُور لے جانے کی بجائے اور زیادہ اپنی طرف کھینچا۔ تم اس تاثر کی شدّت کا اندازہ اس سے کرو کہ مجھ جیسا آدمی جو محبّت اور وفا بدلتے رہنے کا کھلاڑی تھا، رو پڑا۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ 'شازی! میں تمہیں ایک ٹھکانہ پیش کرنے آیا تھا مگر تم نے مجھے بے ٹھکانہ کر دیا ہے'۔۔۔ اُس نے آہ لے کر کہا۔۔۔ 'مجھے معاف کر دینا منیر! میں مجبور ہوں'....

"وہ مجبور تھی یا نہیں، اُس نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں نے اُس کی محبّت کو وہسکی میں ڈبو دینے کی کوشش کی بہت جتن کیے مگر شازی کو دل سے نہ اتار سکا۔ اگر اُس کے ساتھ میرا تعلق جسمانی ہوتا تو اُسے بھول جانا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ وہ تو میری روح میں اُتر گئی تھی۔ وہ جب لاہور چلی گئی تو ایسے لگا جیسے میرا جسم پیچھے رہ گیا ہے اور میری روح لاہور چلی گئی ہے۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اُس پر اپنی انٹیلی جنس کی خفیہ نگرانی ہے۔ انٹیلی جنس کے میجر دوست نے مجھے ملک رجب علی کا ایڈریس اور فون نمبر دیا تھا....

"میں نے دو بار اپنی گرل فرینڈ سے شازی کو فون کرایا اور اُس کے ساتھ بات کی۔ گرل فرینڈ سے میں فون اس لیے کراتا تھا کہ تمہارے ڈیڈی یا ممی کو شک نہ ہو۔ جب شازی ریسیور لیتی تھی تو میں بات کرتا تھا۔ میں نے اُسے وہی کچھ کہا جو پہلے بھی کہہ چکا تھا اور اُس نے بھی مجھے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکی تھی لیکن اب بھی اُس نے بے رُخی یا بیگانگی کا اظہار نہ کیا۔ صاف پتہ چلتا تھا جیسے اُسے میرے ساتھ دلی ہمدردی ہے اور میں نے ذرا سا اور زور دیا تو وہ میری بات مان جائے گی...

"اُس کے اس انداز کا اثر تھا کہ میں نے ایک خطرناک ارادہ کر لیا۔ تم جانتے ہو کہ ہم فوجی خطرے مول لینے کے قائل اور عادی ہوتے ہیں۔ میں نے آخری مرتبہ اس کے ساتھ فون پر بات کی اور اُسے کہا کہ میں لاہور آ رہا ہوں، میرے ساتھ ایک آخری ملاقات کر لے پھر میں اس کے ساتھ کبھی بات نہیں کروں گا۔ اُس نے کہا کہ وہ مجھے ضرور ملے گی لیکن رات کو اُس وقت جب ابّو اور امّی سو جائیں گے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ کوٹھی کے پچھواڑے باہر آ کر ملے گی، اس سے آگے نہیں جائے گی۔ اُس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں آئندہ اُسے اس طرح ملنے کے لیے نہیں کہوں گا....

"میں نے گاڑی لی اور دو دوستوں کو ساتھ لیا اور لاہور چلا گیا۔ دوستوں کو تمہاری کوٹھی سے کچھ دُور اتار دیا اور میں اکیلا گاڑی لے کر تمہاری کوٹھی کے پچھواڑے والی سڑک پر جا رُکا.... اصغر یار! بڑی غضب کی کوٹھی بنائی ہے تمہارے ڈیڈی نے۔ وہ تو پورا محل ہے"۔

اصغر نے ہنس کر کہا۔۔۔ "سر! آپ مجھے یہ بتائیں، آپ اس محل سے ایک شہزادی کو اُٹھا کس طرح لائے تھے؟"

"دماغ کی خرابی تھی یار!"۔۔۔ میجر منیر نے اُکتائے ہوئے سے لہجے میں کہا۔۔۔ "میں نے تو پینا پلانا چھوڑ دیا تھا۔ شازی مجھ پر ایک نشہ بن کر طاری ہو گئی تھی.... رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ باہر آ گئی۔ اُس نے پہلی بات یہ کہی کہ میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتی لیکن میں کسی کے ساتھ بیوفائی بھی نہیں کروں گی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اُس نے ہلکی سی ہنسی سے کہا کہ وہ آپ

نہیں ہیں۔ اُس نے کہا کہ ابُو اور امّی سوتے ہوتے ہیں پھر بھی میں بہت جلدی واپس چلی جاؤں گی۔ میں جس ارادے سے گیا تھا اس کے مطابق میں نے اُسے کہا کہ یہاں کوئی دیکھ لے گا، یہ ساتھ میری گاڑی کھڑی ہے، دو چار منٹ کے لیے چلو گاڑی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ وہ گاڑی تک نہیں جا رہی تھی لیکن میری منت سماجت پر گاڑی میں آگئی۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر بٹھا لیا اور گاڑی سٹارٹ کر کے میں نے یکلخت رفتار تیز کر دی۔ آگے میرے دونوں دوست میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ شازی سخت غصّے کے عالم میں مجھے بُرا بھلا کہہ رہی تھی اور میں اُسے تسلّی دے رہا تھا کہ ذرا آگے جا کر واپس آجائیں گے.....

"میں نے جوں ہی گاڑی دوستوں کے پاس روکی، وہ فوراً گاڑی میں بیٹھے اور ایک نے پیچھے سے طے شُدہ سکیم کے مطابق شازی کے اوپر کپڑا ڈال دیا اور میں نے گاڑی چلا دی.... اغوا کی یہ بڑی سنگین واردات ہے کیپٹن اصغر! نہ تم مجھے معاف کر سکتے ہو نہ سول کا قانون نہ فوج کا۔ اگر تم معاف کر دو تو قانون کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔"

"میجر منیر!"— کیپٹن اصغر نے غضب ناک انداز سے میجر کی کلائی اپنے ہاتھ میں اس طرح پکڑی جیسے اُس کی ہڈی توڑ دے گا، اور بولا— "آپ اور قانون جائیں جہنّم میں۔ مجھے شازی چاہیئے۔ کہاں ہے وہ؟"

"شازی تمھیں ویسی ہی ملے گی جیسی تمتیں پہلی بار ملی تھی"— میجر منیر نے کہا— "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اُس کے ساتھ میرا تعلق جسمانی تھا ہی نہیں۔ میں اپنی روح کے ہاتھوں مجبور تھا۔ میں تمہارے پاس اس لیئے آیا ہوں کہ تم مجھے کورٹ مارشل سے بچا سکتے ہو۔"

"آپ مجھے یہ بتائیں کہ اُسے آپ واپس کیوں کر رہے ہیں؟"

"اُسے تم محبت کی انتہا کہہ سکتے ہو"— میجر منیر نے کہا— "اِس قسم کی لڑکی کو قتل کر کے لاش غائب کر دینا میرے لیے اور میرے دوستوں کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔"

"قتل کرنے کی ضرورت کیا تھی؟"— اصغر نے پوچھا— "اور آپ اُسے زندہ کیوں واپس کر رہے ہیں؟"

"یہی تو میں تمہیں بتانے آیا ہوں"— میجر منیر نے کہا— "اپنے غصّے کو ذرا ٹھنڈا کرو.... ہُوا یوں کہ میں نے شازی کو اپنے ایک دوست کے ہاں رکھا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے یہ دونوں دوست میری ہی طرح آزاد اور حرام کار ہیں لیکن شازی کو اُنہوں نے ایک بہن کا درجہ دیئے رکھا ہے۔ انہوں نے اس امانت میں خیانت نہیں کی۔ میں تو اس لڑکی کی پُوجا کرتا تھا۔ کوئی ایسی طاقت میرے اندر اُتر آئی تھی جو مجھے ڈراتی تھی کہ شادی کے بغیر اس لڑکی کے جسم کو بُری نیت سے ہاتھ نہ لگانا....

"شازی بڑی حوصلے والی لڑکی ہے۔ اُس نے ڈر اور خوف کا ذرا سا بھی اظہار نہ کیا۔ میں اس وقت سمجھا کہ اس لڑکی میں وہ کون سا جادو ہے جو تہوں میں چھُپے ہوئے راز نکال لاتا ہے۔ میرے دوست کے ہاں پہنچ کر اُس نے مجھے گالی نہیں دی غصّہ نہ کیا اور احتجاج بھی نہ کیا۔ اس نے بڑی خود اعتمادی سے کہا— 'منیر! تمہیں میرا صرف جسم ملا ہے، شازی کہیں اور ہے۔ کیا کرو گے اس جسم کو جو تمہیں لگتا

تو دلکش ہے لیکن تمہارے لیے نفرت اور حقارت کا ایک بُت ہے۔ کھیل لو اس بُت کے ساتھ جس طرح ناداں بچّہ بے جان کھلونے کے ساتھ کھیلا کرتا ہے'....

"مجھے غصّہ آنا چاہیے تھا۔ میں فلموں والا ڈاکو یا پرانے زمانے کا بادشاہ ہوتا تو میں شازی کو باندھ کر ہنٹر مارتا اور قہقہے لگاتا لیکن مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم بے جان ہو گیا ہو اور یہ جان اس لڑکی کی مٹھی میں بند ہو گئی ہو۔ تب میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے جس کے مقابلے میں تم مجھے اتنا حقیر سمجھتی ہو۔ اُس نے جواب دیا— 'وہ بھی تمہاری طرح ایک پاکستانی کیپٹن ہے'— پھر اُس نے تمہارا نام لیا۔ میں نے تمہارا اتا پتا پوچھا تو اُس نے بتا دیا۔ اُس نے کہا کہ میں اُسے چھوڑ دوں کیونکہ اُس کے ابُو اور امّی بہت پریشان ہوں گے۔ میں نے اُسے کہا میں نے سنا تھا کہ یہاں تمہارا کوئی نہیں۔ تم ملک رجب علی کو ابُو کس طرح کہہ رہی ہو؟ اُس نے جواب دیا— 'میں تمہیں کوئی کہانی نہیں سناؤں گی۔ ملک رجب علی میرا باپ ہے اور اصغر کی ماں کو میں اپنی ماں سمجھتی ہوں'....

"میں نے جب دیکھا کہ یہ لڑکی نفرت کے سوا کوئی بات نہیں کر رہی تو مجھے غصّہ آگیا۔ میں نے اُسے قتل کی دھمکی دی۔ اُس نے لطیف سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر کہا— 'یہ نہ کہو کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ ساتھ یہ بھی کہو کہ تم مجھے جی بھر کے خراب کرو گے پھر قتل کرو گے'— میں اُسے کہنے ہی لگا تھا کہ میں یا میرے دوست اُسے خراب نہیں کریں گے لیکن وہ بول پڑی۔ کہنے لگی— 'تم اس خاکی وردی کی توہین کر رہے ہو۔ اپنے آپ کو پاکستان آرمی کا میجر کہنا چھوڑ دو۔ میں نے اپنے اغوا تک تمہارا احترام صرف اس لیے کیا ہے کہ تم پاکستان آرمی کے افسر ہو۔ کیا تم جنگ میں زخمی ہوتے تھے یا اپنے ڈویژن کمانڈر کے اے۔ ڈی۔ سی بن کر اُس کے ساتھ سائے کی طرح ان مورچوں سے دُور پیچھے پھرتے رہے ہو جہاں تم جیسے جوان اور ماؤں کے خوبصورت بیٹے اپنے خون میں نہا رہے تھے۔ تم اُس وقت شراب کے نشے میں اپنے میس میں بدمست پڑے تھے جب اصغر اپنے جانباز ساتھیوں کے ساتھ مقبوضہ کشمیر میں کمانڈو آپریشن کے لیے گیا تھا۔ کیا تم جانتے ہو کہ اُن کی لاشیں کہاں ہیں جو مقبوضہ کشمیر میں گئے تھے؟ میں نے وہ زخمی راولپنڈی سی ایم۔ ایچ میں دیکھے ہیں۔ میں نے اُن کی باتیں سُنی ہیں۔ جن کے بازو اور ٹانگیں کٹ گئی ہیں، میں نے اُن کی بھی باتیں سُنی ہیں۔ تم جانتے ہو نا کہ میں کتنی خطرناک جاسوسن تھی لیکن میں جب زخمیوں کے وارڈ میں سے نکلی تو میں جاسوس نہیں تھی۔ اپنی ماں مجھے ایک ڈائن کے روپ میں نظر آنے لگی۔ میں نے اصغر سے کہا تھا کہ اگلے مشن پر مجھے بھی مقبوضہ کشمیر لے چلنا'....

"اصغر بھائی! میں نے اپنے جسم میں ایسی حرارت محسوس کی جیسے میرا خون اُبل رہا ہو۔ شازی نے عجیب سے لہجے میں کہا— 'بولو منیر! بولو .... تم نے کیا کیا ہے۔ شراب پی ہے؟ عورت بازی کی ہے؟ وردی سے نکلو اور اپنے باپ کے نوابی محل میں چلے جاؤ۔ مجھے تمہاری فوج کے زخمیوں اور شہیدوں نے بھارت کی جاسوس سے پاکستان کی بیٹی بنایا ہے۔ تم تو پاکستان کے چہرے پر ایک سیاہ داغ ہو'— پھر مجھے ہوش نہیں کہ وہ کیا کچھ کہتی رہی۔ جس طرح اُس نے کہا تھا کہ جاسوس شازی مر گئی ہے اسی طرح نواب زادہ منیر احمد خان شازی کے ہاتھوں قتل ہو گیا، پیچھے یہ میجر منیر رہ گیا جو تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔"

★

کچھ دیر کے لیے میجر منیر اور اصغر کے درمیان بڑا گہرا سکوت طاری ہوگیا میجر منیر کا سر جھک گیا تھا۔ اصغر اُسے دیکھ رہا تھا۔ میجر منیر نے سر اُٹھایا تو اصغر نے اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے جو میجر منیر نے ہتھیلیوں سے پونچھ ڈالے۔ اُس نے کیپٹن اصغر کی طرف دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر ہاری ہُوئی سی مُسکراہٹ آگئی۔

"کیا مجھ جیسا آدمی ایک لڑکی کے ہاتھوں اتنا مجبور ہوسکتا ہے"۔۔۔ میجر منیر نے بڑی گہری آہ بھر کر کہا۔۔۔ "یہ اتنے دن شازی جو میرے پاس رہی وہ تم یوں سمجھ لو کہ بڑا ہی حسین ایک بُت تھا اور میں اس بُت کے قدموں میں بیٹھا اُس کی عبادت کرتا رہا۔ اُس نے دو چار مرتبہ کہا کہ مجھے چھوڑ دو یا مجھے قتل کر دو۔ میں نے اُسے کہا کہ چھوڑ دوں گا، قتل نہیں کرسکوں گا۔ اتنے دن اپنے پاس رکھ کر میں نے دیکھ لیا کہ یہ لڑکی جان کی قیمت پر بھی تمہارے ساتھ بے وفائی نہیں کرنا چاہتی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے تمہارے حوالے کر دوں لیکن یہ فیصلہ میں نے نہیں کیا تھا۔ بخدا ایسے لگتا تھا جیسے اس لڑکی نے مجھے ہپناٹائز کر کے مجھ سے یہ فیصلہ کرایا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا تو تم پر شک کیا جاسکتا ہے کہ تم کسی اور چکر میں خود ہی کہیں غائب ہوگئی تھیں۔ تمہارے پاس اس الزام کا جواب نہ ہوگا۔ اُس نے کہا کہ مجھے کیپٹن اصغر کے حوالے کر دو ....

"میرے عزیز دوست! میں نے اپنا سینہ کھول کر تمہارے آگے رکھ دیا ہے۔ میرے ساتھ چلو اور شازی کو لے آؤ۔ میری صرف یہ درخواست ہے کہ مجھے کورٹ مارشل سے بچا لو۔ میں صرف اغوا کا مجرم ہوں"۔

"لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے پوچھا۔۔۔ "جہاں تک میرا تعلق ہے، میں آپ کو بچا لوں گا۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟ میرے ابو بڑے سخت آدمی ہیں اور اس کے ساتھ خطرہ یہ ہے کہ شازی کے لاپتہ ہونے کی رپورٹ ملٹری اور سول انٹیلی جنس اور سول پولیس کو دے دی گئی تھی۔ انہیں کس طرح مطمئن کیا جائے گا"۔

"اس کے کئی طریقے ہیں"۔۔۔ میجر منیر نے کہا۔۔۔ "صرف ایک طریقہ سمجھ میں آتا ہے لیکن مجھے اقبالِ جُرم تو بہر حال کرنا پڑے گا۔ طریقہ یہ ہے کہ میں اپنی انٹیلی جنس کے بریگیڈیئر کو یہی داستان جو تمہیں سنائی ہے، سنا دوں گا"۔

"شازی اگر کوئی عام پاکستانی لڑکی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے کہا۔۔۔ "شازی کے متعلق آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ انٹیلی جنس والے اس پر یہ شک کریں گے کہ وہ شاید جاسوسی کے ہی چکر میں پھر کہیں نکل گئی تھی"۔

"مجھے امید ہے کہ میں شک کرنے والوں کو قائل کرسکوں گا"۔۔۔ میجر منیر نے کہا۔۔۔ "تم اپنے ابّو کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرنا"۔

"وہ میں پوری کوشش کروں گا"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے کہا۔۔۔ "وہ پرانے ڈی۔ ایس۔ پی ہیں۔ وہ یا تو مجھے جوتے مارنے شروع کر دیں گے یا میری مان جائیں گے"۔

★

اصغر کے لیے یہ خوشی کیا کم تھی کہ اُسے شازی مل گئی تھی۔ وہ تو سمجھا تھا کہ شازی کو قتل کیا جاچکا ہے۔ اس نے اُسی وقت کوئی جھوٹا سچا بہانہ پیش کر کے پانچ دن کی چھٹی لے لی اور اسی وقت آزاد کشمیر کی بلندیوں سے اُتر کر اسلام آباد کی ترائی میں چلا آیا۔ میجر منیر اُسے اُس شاہانہ کوٹھی میں لے گیا اس کے ایک کمرے میں شازی نظر بند تھی۔ شازی میجر منیر کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوتے دوڑ کر اصغر کے گلے لگ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے۔ اُس نے کوئی شکایت نہ کی۔ اصغر سے الگ ہوکر اُس نے میجر منیر کی طرف دیکھا لیکن وہاں میجر منیر نہیں تھا۔ اصغر دوڑ کر باہر گیا۔ میجر منیر برآمدے میں کھڑا تھا۔ اصغر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"جاؤ اصغر!"۔۔۔ میجر منیر نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔۔۔ "تم جیت گئے ہو۔ میں صرف اپنی درخواست دُہراؤں گا کہ مجھے بچانے کی کوشش کرنا۔ میں خود جو کچھ کرسکا کروں گا.... تم میری گاڑی لو اور دونوں ابھی لاہور چلے جاؤ۔ یہاں میرے پاس گاڑی ہے"۔

★

شام کے وقت جب اصغر اور شازی لاہور اپنی کوٹھی میں داخل ہوئے تو ملک رجب علی لان میں بیٹھا تھا۔ وہ اس طرح اُٹھ کر چلا جیسے بھول گیا ہو کہ اُس کی ایک ٹانگ مصنوعی ہے۔ وہ گرنے لگا تو اُسے چھڑی ہاتھ میں لینے کا خیال آیا۔ اُس نے اصغر کی ماں کو آوازیں دیں۔ شازی دوڑ کر ملک رجب علی کے گلے لگ گئی۔ رجب علی اور سلمٰی سراپا سوال بنے ہوتے تھے۔ شازی کو اصغر کے ساتھ دیکھ کر نہ جانے کیسے کیسے شکوک اور شبہات اُن کے ذہنوں میں آتے۔

راولپنڈی سے لاہور آتے ہوتے شازی نے اصغر کو وہی داستان سنائی تھی جو میجر منیر اُسے سنا چکا تھا۔ اُس نے اصغر کو یقین دلایا کہ میجر منیر نے محبّت کے اظہار کے سوا اور کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی۔ "میرے خیال میں یہ شخص اگر پاگل نہیں ہُوا تو نفسیاتی مریض ضرور ہوگیا تھا"۔۔۔ شازی نے اصغر کو بتایا تھا۔۔۔ "سچی بات ہے کہ مجھے اس شخص پر ترس آنے لگا تھا۔ بعض اوقات وہ میرے اشاروں پر ناچنے لگتا تھا"۔

شازی کو ماں نے اور ماں کو انڈین سیکرٹ سروس کے استادوں نے ٹریننگ ہی یہی دی تھی کہ پتھروں کو موم کس طرح کیا جاتا ہے اور اکھڑ مردوں کو انگلیوں پر کس طرح نچایا جاتا ہے۔ اگر شازی اس فن اور اس کمال سے بے بہرہ ہوتی تو وہ کبھی کی طوائف بن چکی ہوتی۔

اصغر نے ملک رجب علی اور اپنی ماں کو میجر منیر کی سنائی ہوئی داستان سنا ڈالی اور رجب علی سے کہا کہ وہ اس میجر کو کورٹ مارشل سے بچانا چاہتا ہے۔ رجب علی اتنا ڈھیلا آدمی نہیں تھا کہ وہ میجر منیر کو اغوا کی اتنی سنگین واردات بخش دیتا لیکن شازی اس کی بیٹی تھی جس کے متعلق اُس نے اس حقیقت کو قبول کرنا شروع کر دیا تھا کہ اسے سرحد پار پہنچا دیا گیا یا اس کی لاش پاکستان کی مٹی میں ہی کہیں غائب کر دی گئی ہے۔ اس طرح بیٹی کو زندہ سلامت دیکھ کر وہ اتنا خوش ہُوا کہ اُس نے اصغر سے کہا کہ وہ میجر منیر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہونے دے گا۔

آٹھ دس دنوں تک لاہور میں ملک رجب علی اور راولپنڈی میں میجر منیر بھاگتے دوڑتے

رہے۔ شازی کو انٹیلی جنس کے بریگیڈیئر کے پاس جانا پڑا تاکہ وہ یقین کرلے کہ اُسے جو کچھ بتایا گیا ہے وہ صحیح ہے۔ اس بھاگ دوڑ اور ان کوششوں کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ کاغذوں کا پیٹ کسی طور بھر دیا گیا ور ایک سنگین واردات فائلوں میں دفن ہوگئی۔ اصغر اپنی یونٹ میں واپس پہنچ گیا تھا۔

ڈیڑھ دو ماہ بعد اصغر کو ملک رجب علی کا خط ملا کہ وہ چھٹی لے کر آتے کیونکہ اُس کا خیال ہے ،در دوستوں نے بھی مشورہ دیا ہے کہ اصغر اور شازی کی شادی کر دی جائے۔ اصغر چھٹی لے کر آگیا اور اُن کی شادی کر دی گئی۔ چند ایک قریبی دوستوں کو مدعو کیا گیا تھا جن میں طاہرہ، ارشد اُن کا بیٹا طاہر پرویز، ارشد کا باپ اور اس گھر کی عورتیں شامل تھیں۔

جب شازی کوٹھی کے ایک کمرے میں دلہن بنی بیٹھی تھی اور باہر نکاح پڑھا جا رہا تھا اُس وقت طاہرہ شازی کے پاس موجود تھی۔ شازی کو طاہرہ نے اپنے ہاتھوں دُلہن بنایا تھا۔

"شازی!"— طاہرہ نے جذباتی سے لہجے میں اُسے کہا — "تمہاری ایک زندگی ختم ہوگئی ہے اور دوسری زندگی شروع ہوئی ہے۔ تمہاری پہلی زندگی کچھ اور تھی۔ مجھے ایسا ڈر تو نہیں کہ وہ زندگی تمہاری فطرتِ ثانی بن گئی ہوگی لیکن راہی کو چھوڑی ہوئی منزل کبھی یاد آہی جاتی ہے۔"

"وہ شازی اب زندہ نہیں ہے خالہ جان!"— شازی نے کہا — "میں آج پیدا ہوئی ہوں"

"تم بہت پیاری ہو شازی!"— طاہرہ نے کہا — "مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تمہارے ساتھ بہت باتیں ہو چکی ہیں۔ اب ایک بات کرنی ہے۔ اصغر کی بیوی بن کر اُس کے پاؤں کی زنجیر نہ بن جانا۔ یہ نہ بھولنا کہ وہ پاکستان کا محافظ ہے۔ میں نے تمہیں اپنے ماضی کی داستان سنائی تھی اور تمہیں بتایا تھا کہ ہم نے پاکستان کی کیا قیمت ادا کی تھی۔ ہم پاکستان کی بیٹیاں ہیں ہمیں وہ بچے پیدا کرنے ہیں جو پاکستان کے محافظ ہوں گے۔"

"آپ مجھے یہ باتیں کیوں یاد دلا رہی ہیں؟"— شازی نے مسکرا کر کہا — "میں آپ کا کوئی سبق نہیں بھولی۔"

"مجھے ایک خدشہ نظر آرہا ہے"— طاہرہ نے کہا — "خدا نے تمہیں بہت زیادہ انعام دیا ہے۔ تمہیں اصغر مل گیا ہے۔ یہ کوٹھی نہیں، یہ محل ہے جہاں تم شہزادی ہوگی۔ ملک صاحب کی زمین اتنی ہے جس کا حساب کتاب انہیں خود بھی معلوم نہیں۔ تم اس شاہانہ ماحول میں کھو جاؤگی۔ اس میں تحلیل ہو جاؤگی ..... مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ یہ محل اور یہ بے حساب زمین پاکستان کی ہے جس میں شہیدوں کا لہو رچا بسا ہوا ہے اور اس میں تم جیسی بیٹیوں کی عصمتوں کا خون بھی شامل ہے۔ اس زمین پر چلتے ہوئے یہ نہ بھول جانا کہ تم اس مٹی کی بیٹی ہو۔ تمہارے جب بچے پیدا ہوں گے، انہیں تم اس مقدّس وطن کی دہلیز پر قربان کرنے کے لیے پالوگی۔"

شازی نے طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اُس کا سر جھک گیا اور اُس کے آنسو اُس کے اور طاہرہ کے ہاتھوں پر گرنے لگے۔ اُس نے سر اُٹھایا تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ لگتا تھا جیسے اُس کے آنسو مسکرا رہے ہوں۔

ارشد اور عفّت کا بیٹا طاہر پرویز جو طاہرہ کے ہاتھوں میں جوان ہوا تھا، کاکول اکیڈمی میں ینگ کے لیے جا رہا تھا۔ کیپٹن اصغر اور شازی کی شادی سے کچھ دن پہلے وہ آرمی کمیشن کے لیے سلیکٹ ہو گیا تھا۔

یہ طاہرہ اور ارشد کے خوابوں کی تعبیر تھی۔

طاہر پرویز بھی یہی خواب دیکھتے جوان ہوا تھا۔ ان خوابوں سے خون ٹپکتا تھا۔ طاہر پرویز پاکستان ں پیدا ہوا تھا۔ اُس نے پاکستان کو معرضِ وجود میں آتے نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے سرحد پار ے آنے والے مسلمانوں کے ہراساں قافلے نہیں دیکھے تھے جو آگ میں سے گزر کر، خون پر پھسلتے، لاشوں سے ٹھوکریں کھاتے، سکھوں کی کرپانوں اور ہندوؤں کی برچھیوں سے لہولہان وتے پاکستان تک پہنچے تھے لیکن ارشد اور طاہرہ نے ان قافلوں کے ہولناک قصّے اُسے یسے انداز سے سُناتے تھے کہ طاہر پرویز کو کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ ارشد اور طاہرہ کی طرح اور ن جیسے لاکھوں مسلمانوں کی طرح پاکستان میں آیا تھا۔

ارشد اور طاہرہ نے طاہر پرویز کے ذہن میں پاکستان کی وہ قیمت نقش کر دی تھی جو ہندوستان کے مسلمانوں نے ادا کی تھی۔ اُسے بتایا تو گیا تھا کہ ہندو مسلمان کا اور پاکستان کا ایسا دشمن ہے کہ س کی دوستی دشمنی سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے لیکن اُسے ہندو کی دشمنی کا صحیح اندازہ ستمبر ۱۹۶۵ء لی جنگ میں ہوا تھا۔ اُس نے سرحدی دیہات کے اُن لوگوں کو دیکھا تھا جو ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح بھاگ کر لاہور پہنچے تھے۔ طاہر اُن کے ریفیوجی کیمپ میں گیا تھا۔ اُس نے کئی پناہ گزینوں سے پوچھا تھا کہ بھارت کے فوجیوں نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

ان لوگوں نے جب اُسے بتایا تھا تو اُس نے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ خون جو سرحد پر بہہ رہا ہے وہ خون اُس کے دماغ کو چڑھ رہا ہے اور وہ محاذ پر جا کر نہ لڑا تو اُس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ جب اُس نے دیکھا کہ وہ محاذ پر نہیں جا سکتا اور دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ُسے للکار نہیں سکتا تو وہ پھر کبھی ریفیوجی کیمپ میں بھی نہ گیا۔

"ہمارے گاؤں کی تمام جوان لڑکیوں کو بھارتی فوجی اپنے ساتھ لے گئے ہیں"۔

"ہمارے گاؤں کے دس جوان آدمیوں کو بھارتی فوجیوں نے باہر کھڑا کر کے اُن پر مشین گن فائر کی تھی"۔

"بیٹیوں کو باپوں کے سامنے اُٹھایا گیا"۔

"بیٹوں کو ماؤں کے سامنے گولیوں سے چھلنی کیا گیا"۔

"ہندو فوجیوں نے گاؤں کی مسجدوں کے اندر جا کر قرآن مجید کی بے حُرمتی کی"۔

طاہر پرویز میں اور زیادہ سننے کی ہمت نہیں تھی۔ یہ تو اُس کے سینے پر نقش تھا کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوا ور سکھ ستّر ہزار مسلمان لڑکیوں کو اٹھا لے گئے تھے۔ اس میں اُن خواتین کی تعداد شامل نہیں جن کی برہنہ لاشیں مشرقی پنجاب کے کھیتوں میں پڑی ملی تھیں لیکن ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز ہندو طاہر پرویز کے وطن کی دہلیز پھلانگ کر وطن کے صحن سے پاکستان کی بیٹیوں کو اٹھا کر لے گیا تھا۔

جس روز طاہر پرویز کو کاکُول اکیڈمی میں پہنچنے کی اطلاع ملی تھی، اُس روز اُسے اپنی دادی پر اتنا غصہ آیا تھا کہ وہ اُس کی دادی نہ ہوتی تو نہ جانے وہ کیسا جواب دیتا۔ دادی نے خوشی کا اظہار کرتے ہُوئے کہا کہ میرا بیٹا کرنیل اور جرنیل بنے گا۔ طاہر کو یہ بات بہت بُری لگی تھی۔

”نہیں دادی امّاں!“ ــــ اُس نے غصّے کو دبا کر کہا تھا ــــ ”میں پاکستان کا سپاہی بننے جا رہا ہُوں۔ میرے دماغ میں افسری کا کیڑا نہ ڈالیں۔ دعا کریں خدا میری وہ مُراد پوری کرے جس کے لیے میں فوج میں جا رہا ہُوں۔“

کیپٹن اصغر اور شازی کی شادی پر وہ گیا تھا۔ اُس وقت وہ کاکُول کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ اصغر کے ساتھ اُسے بہت پیار تھا۔ اصغر نے اُسے اپنے کمانڈو مشن کی تفصیلات سنائی تھیں جو سُن کر طاہر اور زیادہ بھڑک اٹھا تھا اور اُس نے کچھ جذباتی باتیں کی تھیں۔ اُس نے کہا تھا ــــ ”شوقِ شہادت مجھے گھر بیٹھنے نہیں دیتا۔“

”سُن پٹھے!“ ــــ کیپٹن اصغر نے اُسے کہا تھا ــــ ”جب ٹریننگ کے بعد لفٹیننٹی کی وردی پہن کر کسی یونٹ میں جاؤ گے تو یہ جذباتی باتیں اور سوچیں گھر میں چھوڑ جانا۔ وہاں جذبات نہیں عقل چلتی ہے۔ ان جذبات سے تمہیں صرف یہ فائدہ پہنچے گا کہ تمہیں یہ یاد رہے گا کہ تمہارا دشمن کون ہے اور جب تم جنگ میں جاؤ گے تو تمہارے ذہن میں جنگ کا مقصد واضح ہوگا.... اور یہ شوقِ شہادت فوجی افسر کے لیے اور ہر جوان کے لیے بڑا خطرناک جذبہ ہے۔ ایسی جذباتی باتیں شہری کیا کرتے ہیں جو محاذ سے دُور ہوتے ہیں۔ وہ اُن ناول نگاروں کے تاریخی ناول پڑھا کرتے ہیں جنہوں نے تاریخ کا کبھی مطالعہ نہیں کیا اور وہ نہ اُس دَور کے جنگی احوال اور اصولوں کو سمجھتے ہیں نہ انہیں یہ علم ہے کہ آج کی جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے۔“

”شوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد تو لازمی ہے“ ــــ طاہر پرویز نے کہا تھا۔

کیپٹن اصغر نے اُسے کئی دلیلیں دے کر سمجھایا تھا کہ وردی پہن لو تو شوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد کا تصوّر بدل جاتا ہے۔

”شہری لوگ جنہیں ہم فوجی سویلین کہتے ہیں، جنگ میں مارے جانے والے کو شہید کہتے ہیں“ ــــ اصغر نے طاہر سے کہا تھا ــــ ”اور وہ کہتے ہیں کہ وہ سیدھا بہشت میں جائے گا لیکن فوج میں ہم دیکھتے ہیں کہ مرنے سے پہلے اُس نے دشمن کے کتنے آدمی مارے اور دشمن کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ اگر کوئی فوجی شہادت کا شوق دل میں لیے جنگ میں مورچے سے نکل کر کھڑا ہو جائے اور دشمن کے لیے بڑا آسان ٹارگیٹ بن جائے تو ہم اس کی لاش گھسیٹ کر پیچھے پھینک دیتے ہیں..... دیکھ طاہری! تم فوج میں افسر بنو گے، تم بہت سے سپاہیوں کے لیڈر ہو گے۔ اگر تم شوقِ شہادت سے لڑو گے تو اپنی پوری پلاٹون یا پوری کمپنی کو مروا دو گے۔ اگر میں شوقِ شہادت کے جوش سے

مقبوضہ کشمیر میں کمانڈو مشن پر جاتا تو پہلے روز ہی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ میں شہید ہونے کے لیے نہیں ایک ٹارگیٹ تباہ کرنے گیا تھا۔ قوم مجھے اس لیے تنخواہ نہیں دیتی کہ میں محاذ پر جا کر خودکُشی کر لوں..... دشمن کو مارنے کے لیے اور دشمن کا سر کچلنے کے لیے تمہیں زندہ رہنا ہے لیکن جان بچا کر بھاگنا بھی نہیں۔ مشن کی تکمیل میں تمہاری جان کی ضرورت پڑے تو جان دے دو۔“

▼

پھر وہ دن آگیا جب طاہر پرویز کاکول جانے کے لیے رخصت ہو رہا تھا۔ کیپٹن اصغر اپنی یونٹ میں جا چکا تھا۔ ملک رجب علی، سلمیٰ اور شازی اُسے رخصت کرنے ارشد کے گھر آئے تھے۔

”ہم نے تمہیں اِسی دن کے لیے پالا تھا“ ــــ طاہرہ نے گذشتہ رات اُسے کہا تھا ــــ ”میں اِس وقت تمہاری عمر کی تھی جب ہم نے حصولِ پاکستان کی جنگ لڑی تھی۔ یہ روئیداد تمہیں زبانی یاد کرا چکی ہوں۔ یہ ایک ورثہ تھا جو میں نے اور تمہارے ابّو نے تمہارے حوالے کر دیا ہے۔ اس کی پاسبانی تمہیں کرنی ہے۔ ہم نے اپنی نوجوانی کا حق ادا کر دیا تھا۔ تمہیں اپنی نوجوانی کا حق ادا کرنا ہے۔“

”ابھی تمہیں اور بھی جنگیں لڑنی ہیں طاہری!“ ــــ ارشد نے کہا تھا ــــ ”جب تک پاکستان زندہ ہے اور جب تک ہندو زندہ ہے، زمین کے اس خطّے میں امن نہیں آسکتا۔ یہاں انسانوں کا خُون بہتا رہے گا۔ ہندو کہتا ہے کہ پاکستان ہندوستان کا حصّہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہندوستان پاکستان کا حصّہ ہے اور ہم پورے ہندوستان کو پاکستان بنائیں گے۔“

”جب کبھی ملک پر ستمبر ۱۹۶۵ء والا وقت آجائے تو یہ سمجھ کر لڑنا کہ یہ تمہارے ابّو اور تمہاری امّی کا پاکستان ہے“ ــــ طاہرہ نے کہا اور اُس کے آنسو نکل آئے۔ رندھیائی ہوئی آواز میں بولی ــــ ”آج تمہاری ماں زندہ ہوتی تو اُسے کتنی خوشی ہوتی۔“

طاہر پرویز ایک روز پہلے اپنی ماں، عفّت کی قبر پر گیا تھا۔ وہ طاہرہ کے باپ جمال بیگ کی قبر پر بھی گیا تھا۔ جمال بیگ جنگِ ستمبر کا شہید تھا۔ اس قبر کو وہ خانقاہ اور کسی برگزیدہ پیر و مُرشد کے مزار جیسی اہمیّت دیتا تھا۔

وقتِ رخصت ملک رجب علی نے اُسے بہت دیر گلے لگائے رکھا تھا اور پھر اُسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کیا۔ رجب علی کے ہونٹوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔

”طاہری بیٹے!“ ــــ رجب علی نے کہا تھا ــــ ”میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اس ملک کی آبرو پر جب میری ٹانگ کٹ گئی تھی تو مجھے کیسا روحانی سکون ملا تھا..... اپنے جسم کو اپنی ملکیّت نہ سمجھنا۔ ضرورت پڑے تو اسے کٹوا لینا۔ اللہ پاک کی قسم، میں نے ایک ٹانگ کٹوا کر زندگی کے حقیقی راستے پر چلنا سیکھا ہے..... جاؤ عزیز! جاؤ، ہم تمہیں خُدا کے سپرد کرتے ہیں۔“

شازی کی نظریں طاہر پرویز پر جمی ہُوئی تھیں اور وہ سب سے الگ کھڑی تھی۔ طاہر پرویز بڑا خوبصورت نوجوان تھا۔ اُس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیّت تھی۔ اُس کا جسم پھرتیلا اور مستعد تھا۔ شازی اُسے دیکھ رہی تھی اور طاہر کا چہرہ کئی چہروں میں تبدیل ہو رہا تھا۔ شازی کو اولپنڈی

کے فوجی ہسپتال میں پہنچ گئی تھی جہاں کیپٹن اصغر زخمی پڑا تھا۔ اُس نے وارڈ میں جاکر کمانڈو آپریشن کے کئی زخمیوں کو دیکھا تھا۔ وہ سب جوانی کی عمر میں تھے۔ ان میں نوجوان بھی تھے۔

وہ سب چہرے شازی کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ ہر چہرہ طاہر پرویز کا چہرہ تھا۔ ان میں وہ بھی تھے جن کی ایک ایک ٹانگ جسم سے کاٹ دی گئی تھی۔ ایک کا دایاں بازو کندھے سے کاٹ دیا گیا تھا۔ ایک کی دونوں آنکھیں ہمیشہ کے لیے اندھی ہو گئی تھیں۔ شازی کی زندگی میں جو انقلاب آیا تھا وہ اِسی وارڈ میں آیا تھا۔ اس وارڈ میں داخل ہونے تک وہ کچھ اور تھی اور جب اس وارڈ سے نکلی تو وہ یہ شازی تھی جو طاہر پرویز کے چہرے پر نظریں جمائے ہُوئے تھی۔ اُسے کمانڈو آپریشن کے زخمی یاد آنے لگے تھے۔ اُسے یوں نظر آنے لگا جیسے اُس وارڈ کے ہر بستر پر طاہر زخمی پڑا تھا۔ اُس کی ٹانگیں بھی نہیں تھیں، بازو بھی کٹے ہوئے تھے اور اُس کی دونوں آنکھیں اندھی ہو گئی تھیں۔

شازی بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ چہرے اور اُس کے رنگ میں اتنی کشش تھی کہ وہ طاہر پرویز کی عمر کی لگتی تھی لیکن اُس نے لپک کر طاہر کو گلے لگا لیا اور اُس کا ماتھا چُوم لیا۔ جذبات کی شدّت اتنی کہ اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ دیکھنے والے کیا کہیں گے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رِقّت کا یہ عالم کہ اُس نے طاہر کو خُدا حافظ بھی نہ کہا۔ سب سے الگ ہٹ کر جا کھڑی ہُوئی اور مُنہ پھیر کر دوپٹے سے آنسو پونچھ ڈالے۔

ارشد اور طاہرہ ریلوے سٹیشن تک اُس کے ساتھ گئے اور جب ریل گاڑی چل پڑی تو ارشد اور طاہرہ کو دُور تک طاہر پرویز کا ہِلتا ہُوا ہاتھ نظر آتا رہا۔

۷

شازی جب اپنے گھر آئی تو وہ بہت ہی اُداس تھی۔ وہ تو اُسی رات سے اُداس نظر آنے لگی تھی جس رات اُسے بہت ہی خوش ہونا چاہیئے تھا۔ وہ اُس کی ازدواجی زندگی کی پہلی رات تھی لیکن وہ ٹھکانہ مِل گیا تھا جس کا شمیم نے اُسے طعنہ دیا تھا کہ اُسے کہیں بھی نہیں ملے گا مگر وہ اس طرح اُداس ہو گئی تھی جیسے اصغر کے ساتھ اُسے زبردستی بیاہ دیا گیا ہو۔ اصغر نے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ شازی خوش نہیں اور وہ اپنے آپ میں بھی نہیں۔

”امّی یاد آرہی ہے شازی؟“ —— اصغر نے اُس سے پُوچھا تھا۔

”صرف امّی نہیں اصغر!“ —— شازی نے اصغر کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بڑے پیار سے کہا تھا —— ”معلوم نہیں آج کیا کچھ یاد آرہا ہے۔“

”اپنے ماضی کو ازدواجی زندگی کی دہلیز سے باہر پڑا رہنے دو“ —— اصغر نے کہا —— ”آج سے ہماری جو زندگی شروع ہو رہی ہے اسے ناگوار یادوں کے آسیب سے بچائے رکھو۔ اگر دل پر کوئی اور بوجھ ہے تو مجھے بتاؤ اور اگر کوئی ایسا دُکھ ہے جو تمہیں آج بہت پریشان کر رہا ہے تو اُسے میرے سینے میں ڈال دو۔“

شازی نے بڑی لمبی آہ بھری اور وہ اصغر کی چمکتی ہُوئی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ اُس کے

ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی وہ بھی دکھوں سے بوجھل سی لگتی تھی۔

”ہاں اصغر!“ —— شازی نے کہا —— ”ایک بوجھ ہے جو شاید تم بھی میرے ضمیر سے نہ اُتار سکو.... تم میرے ماضی سے واقف ہو۔ آج تم جذبات کے نشے میں مدہوش ہو کچھ دنوں بعد یہ نشہ کم ہونا شروع ہو جائے گا۔ پھر سب سے پہلا دُکھ جو تم محسوس کرو گے وہ یہ ہو گا کہ تمہیں کنواری دُلہن نہیں مِلی۔“

اصغر یوں چونکا جیسے شازی نے اُس کے جسم کے ساتھ بجلی کے دو ننگے تار لگا دیئے ہوں۔

”خُدا کے لیے شازی، خدا کے لیے!“ —— اصغر نے جھنجھلا کر کہا —— ”مجھے اتنا ذلیل اور گھٹیا انسان نہ سمجھو۔ میں نے تمہیں اُسی صورت میں قبول کیا ہے جس صورت میں تم تھیں۔ تمہارے متعلق سب کچھ جانتے ہُوئے میں نے تمہیں قبول کیا ہے۔“

”لیکن تم شمیم کو چاہتے تھے“ —— شازی نے کہا —— ”نہ میرے دل میں تمہاری وہ محبت تھی جو شمیم کے دل میں تھی، نہ تم نے کبھی مجھے اُس محبت کی نظر سے دیکھا تھا۔ وہ کوئی اور جذبات تھے جنھوں نے مجھے اور تمہیں ایک رشتے میں پرو دیا تھا۔ خیال آتا ہے کہ ایک نہ ایک دن تمہیں شمیم یاد آئے گی یا کبھی وہ تمہارے راستے میں آجائے گی۔ پھر تم پچھتاؤ گے۔“

”جن جذبات نے مجھے اور تمہیں ایک رشتے میں پرو دیا ہے وہ جذبات شمیم کے سینے میں نہیں تھے“ —— اصغر نے کہا —— ”اُس نے پاکستان کی محبّت کو میری محبّت پر قربان کر دیا تھا۔ اگر وہ مجھے پاکستان پر قربان کر دیتی تو میری رُوح بھی اُس کی پُوجا کرتی رہتی لیکن وہ بہت اوچھی ثابت ہُوئی۔“

شازی کی بے چینی اُس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی جو خاص طور پر سجائے ہُوئے اس کمرے میں نہ جانے کِس کے تعاقب میں بھٹک رہی تھیں۔

”شازی!“ —— اصغر نے اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر مُلتجی لہجے میں کہا —— ”ازدواجی زندگی کی پہلی رات بہت جلد گزر جایا کرتی ہے۔ ان حسین لمحوں کو ماضی کے تاریک سمندر میں نہ پھینکو۔ میں تمہارا ہوں۔ مر کر بھی تمہارا رہوں گا۔“

”میں کس کی ہُوں!“ —— شازی نے اپنا گال اصغر کے گال کے ساتھ دباتے ہُوئے خودسپردگی کی کیفیّت میں کہا —— ”میں بھی تو تمہاری ہوں.... لیکن.... لیکن اصغر! میں صاف طور پر محسوس کر رہی ہوں کہ میری آج کی خوشیوں کو کوئی ڈس رہا ہے۔ زہر سا ہے جو میرے جذبات کی رگوں میں اُترتا جا رہا ہے“ —— شازی اس طرح اصغر کے ساتھ لگ گئی جیسے اُس کے وجود میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اُس نے جذبات کی شدّت سے لرزتی ہُوئی آواز میں کہا —— ”مجھے اپنے سینے میں چھپا لو اصغر! مجھے اُس پناہ میں رکھو جہاں مجھے کوئی نہ دیکھ سکے.... چاہو تو مجھے دھتکار دو۔“

اصغر جوانی کی ابتدائی عمر میں تھا اور وہ دوٹوک انداز میں بات کرنے والا فوجی تھا۔ جذبات تو اُس میں بھی تھے لیکن عقل ابھی خام تھی۔ وہ ماہرِ نفسیات تو نہ تھا۔ وہ جھنجھلا اُٹھا۔

”تم پاگل ہو شازی، تم پاگل ہو“ —— اصغر نے ایسے اکتاتے ہُوئے لہجے میں کہا جس

کہ تم ایک وہم کا شکار ہو رہی ہو۔"

"پھر مجھ پر کرم کرو اصغر!" ——— شازی نے صُلح جُو لہجے میں کہا ——— "تم پرسوں جا رہے ہو۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تمھارے بغیر اُداس ہی رہوں گی۔"

"میرے ابّو اور امّی تمھیں اُداس نہیں رہنے دیں گے" ——— اصغر نے کہا ——— "میرے ابُو تو دراصل تمھارے ابّو ہیں اور میری امّی سراپا پیار ہیں۔"

"لیکن جو باتیں میں تمھارے ساتھ کر سکتی ہوں وہ میں ابُو اور امّی کے ساتھ نہیں کر سکوں گی۔"

"تم ضرور الٹی الٹی باتیں ہی کرو گی؟" ——— اصغر نے اپنائیت کے لہجے میں کہا ——— "ان کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہنا..... اور خُدا کے لیے شازی! آج کی رات مجھے پریشان نہ کرو اور اپنے آپ کو اس وہم سے آزاد کرو جو تم نے اپنے آپ پر طاری کر رکھا ہے۔ آج میں اتنے خوشنما کمرے میں، اتنے نرم و گداز بستر پر تمھارے پاس بیٹھا ہوں۔ صرف کل کی رات ہے۔ پرسوں میں پھر آزاد کشمیر کی کسی پہاڑی پر پتھروں پر ٹھوکریں کھا رہا ہوں گا۔"

شازی کی ہنسی نکل گئی۔ اُس نے اصغر کا سر اپنے پُرشباب سینے پر ڈال لیا اور اُس کے بالوں میں یُوں ہاتھ پھیرنے لگی جیسے ماں نے اپنے بچے کو گود میں لے لیا ہو۔

▼

ازدواجی زندگی کی پہلی صبح شازی بہت ہی خوش تھی۔ اصغر اُس سے بھی زیادہ خوش تھا۔ ملک رجب علی اور سلمیٰ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ ازدواجی زندگی کا پہلا دن ہنستے کھیلتے گزر گیا۔ رات کو جب اصغر اور شازی اپنے کمرے میں جا بیٹھے تو شازی پر پھر گزشتہ رات والی کیفیت طاری ہو گئی۔ اصغر نے اُسے اِس کیفیّت میں سے نکال لینے کے لیے وہی باتیں کہیں جو وہ پہلی رات کہہ چکا تھا۔

"کیا ایسی کوئی صورت نہیں بن سکتی کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو؟" ——— شازی نے پوچھا۔

"اتنی جلدی نہیں" ——— اصغر نے جواب دیا ——— "اور تمھیں شاید یہ پتہ نہ ہو کہ میں کسی اور کے ساتھ شادی کر لیتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن تمھارے ساتھ شادی کر کے میں نے اگر کوئی خطرہ مول نہیں لیا تو بھی میں انٹیلی جنس کی نظر میں آ گیا ہوں کیونکہ تم ابھی تک انٹیلی جنس کی نگرانی میں ہو لیکن یہ کوئی ایسی وجہ نہیں کہ میں تمھیں اپنے ساتھ چھاؤنی میں نہ رکھ سکوں، مگر تم جانتی ہو کہ میں اس وقت کسی چھاؤنی میں نہیں۔ میں آزاد کشمیر کے فارورڈ ایریا میں ہوں۔"

"کیا میں باقی عمر پاکستان کی انٹیلی جنس اور سی۔ آئی۔ ڈی کی نگرانی میں گزاروں گی؟" ——— شازی نے دُکھے ہُوئے سے لہجے میں پوچھا ——— "کیا اتنی بڑی قربانی دے کر بھی میں مُشتبہ رہوں گی؟"

"نہیں" ——— اصغر نے کہا ——— "کچھ وقت تک تمھیں مشتبہ سمجھا جاتا رہا ہے لیکن اب تم پر جو نظر رکھی جا رہی ہے وہ ایک طرح کا پہرہ ہے۔ پہرہ اس لیے کہ خطرہ ہے کہ انڈین سیکرٹ سروس تمھیں اغوا کرنے کی کوشش کرے گی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے وہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔"

"مجھے ڈر ہے اصغر!" ——— شازی نے اُکتائے ہُوئے سے لہجے میں کہا ——— "کہ میں تمھارے بغیر نہ صرف یہ کہ خوش نہیں رہ سکوں گی بلکہ میرا دل اور میرا ضمیر بڑے ہی بے رحم شکنجے میں جکڑا رہے گا۔"

"آخر کیوں! آخر کیوں؟" ——— اصغر نے جھنجلا کر کہا ——— "تم بچّی نہیں ہو۔ تمھارا ذہن کچا بھی نہیں۔ پھر یہ بھی سوچو کہ میں تمھیں اپنے ساتھ لے ہی جاؤں تو ابّو اور امّی کیا کہیں گے۔"

"ہاں، یہ تو ہے" ——— شازی نے کہا ——— "مجھے کچھ دن اور ابّو کے ساتھ رہنا چاہیئے.... لیکن اصغر! میں نہیں سمجھتی کہ میں کیا محسوس کر رہی ہوں سوائے اس کے کہ میں محسوس کرتی ہوں کہ بڑی وزنی ایک سِل ہے جو میرے وجود پر یا میری ذات پر کسی نے رکھ دی ہے.... جانے دو اصغر! جانے دو۔ میں تمھیں اب پریشان نہیں کروں گی۔ دل میں جو آتی ہے وہ تمھیں کہہ دیتی ہوں۔ اب نہیں.... اب نہیں۔"

دوسرے دن جب اصغر گھر سے چلا تو جہاں ملک رجب علی کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی وہاں سلمیٰ اور شازی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شازی کے چہرے پر اداس سی التجا کا تاثر تھا۔

"امّی جان!" ——— اصغر نے بڑے شگفتہ لہجے میں سلمیٰ سے کہا ——— "اس کا خیال رکھنا۔ یہ بڑی بیوقوف لڑکی ہے۔"

▼

اصغر کے جانے کے بعد شازی کی جذباتی حالت ٹھیک نہ رہی۔ دوپہر کھانے کے وقت سلمیٰ اُسے بلانے گئی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سلمیٰ ہنس پڑی۔ وہ سمجھی کہ یہ اصغر کی جدائی کے آنسو ہیں۔ سلمیٰ نے اُسے مذاق کے رنگ میں بہلانے کی کوشش کی مگر شازی کے آنسو بہہ نکلے، سلمیٰ نے اُسے کہا کہ چلو تمھارے ابّو کھانے پر انتظار کر رہے ہیں۔

"میری طبیعت بھری بھری سی ہے امّی جان!" ——— شازی نے کہا ——— "کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔"

"میرے کہنے پر نہیں چلو گی تو تمھارے ابّو آ جائیں گے" ——— سلمیٰ نے کہا ——— "انہیں یہاں تک آنے میں کتنی تکلیف ہو گی۔ وہ تمھارے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے۔"

شازی فوراً اُٹھی۔ اُسے احساس تھا کہ ملک رجب علی کو ایک مصنوعی ٹانگ کے ساتھ چلنے میں دقّت ہوتی ہے۔ وہ اپنے باپ کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"یہ نہیں آ رہی تھی" ——— سلمیٰ نے رجب علی سے کہا ——— "کہتی ہے میری طبیعت بھری بھری ہے"

"نہ بیٹی!" ——— رجب علی نے شازی سے کہا ——— "جذبات کو اپنے اوپر اتنا بھی غالب نہ کرو کہ کھانے پینے سے منہ موڑ لو۔ اِسے دیکھو۔ یہ اصغر کی ماں ہے اور اصغر اس کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اِس نے دل پر پتھر رکھ لیا ہے۔"

"دل پر پتھر رکھنا پڑتا ہے بیٹی!" ——— سلمیٰ نے کہا ——— "تم تو عقل والی لڑکی ہو.... ہمارے ساتھ دل نہیں لگتا تمھارا شازی؟"

"کیوں نہیں لگتا امّی جان!" ——— شازی نے کہا ——— "لیکن بات صرف اصغر کی نہیں.... کہتے ہیں کہ کسی پر شر شرار کا اثر ہو جاتا ہے یا کسی پر کالے جادو کا اثر ڈال دیا جاتا ہے۔ میں ایسے ہی محسوس کرتی ہوں کہ مجھ پر کوئی ایسا ہی اثر ہو گیا ہے۔ کیا آپ اس پر یقین رکھتے ہیں؟

"ہاں" — سلمیٰ نے کہا — "ایسا ہوتا ہے۔ نظرِ بد کا بھی اثر ہوتا ہے، مگر یہاں تمہارا کوئی عزیز رشتہ دار تو ہے نہیں جس نے تم پر تعویذ یا جادو کرا دیا ہو۔ دشمن ایک دوسرے کے خلاف ایسی کارروائیاں کیا کرتے ہیں۔"

"تم کیا محسوس کرتی ہو؟" — رجب علی نے پوچھا۔

"اسے آپ دورہ سمجھ لیں ابّو!" — شازی نے کہا — "ہماری شادی ہو گئی تو میں خوش رہی لیکن جوں ہی اصغر میرے پاس آیا، مجھ پر کوئی ایسا اثر ہو گیا جیسے میرے دل پر خوف کا قبضہ ہو گیا ہو، ذہن ایک ہی جگہ چکر کھانے لگا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ کوئی شر شرار مجھ میں داخل ہو گیا ہے۔ اتنی بے چینی کہ کمرے سے بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔ اصغر میرے لیے اجنبی نہ تھا۔ اس نے میرے ساتھ بہت باتیں کیں پھر میرا ذہن ٹھکانے آیا۔"

"اب پھر ویسا ہی اثر محسوس کر رہی ہو؟" — رجب علی نے پوچھا۔

"اصغر کے چلے جانے کو تو میں نے بُری طرح محسوس کیا ہے" — شازی نے کہا — "لیکن کوئی ایک گھنٹہ پہلے پھر رات والا دورہ پڑ گیا۔ وہی خوف اور بے چینی۔ امّی جان مجھے کھانے کے لیے بلانے گئیں تو جی میں آئی کہ کہیں بھاگ جاؤں۔"

سلمیٰ نے تو بات ہنسی مذاق میں ٹال دی لیکن ملک رجب علی سنجیدہ ہو کر سوچ میں کھو گیا۔

▼

شازی کو اصغر کا پہلا خط اُس وقت ملا جب وہ اسی دورے کی کیفیت میں تھی۔ یہ خط محبت سے لبریز تھا۔ اصغر نے تین بار لکھا تھا کہ شمیم کو، اپنی ماں کو اور ماضی کو ذہن سے دھو ڈالو۔ خط خاصا طویل تھا۔ شازی اُسی وقت جواب لکھنے بیٹھ گئی۔ اُس نے دل کا غبار کاغذ پر اُگل دیا۔ اُس نے اپنے وہی وہم اور خوف اصغر کو لکھ ڈالے جو وہ اُسے زبانی سنا چکی تھی۔ اُس نے اصغر سے التجا کی کہ وہ اُسے اپنے ساتھ رکھے۔

جواب لکھ کر اُسے سکون محسوس ہُوا۔ نوکر لفافہ لیٹر بکس میں ڈال آیا جوں ہی نوکر نے آکر بتایا کہ وہ خط لیٹر بکس میں ڈال آیا ہے، شازی کی پھر وہی حالت ہو گئی۔

"اصغر بہت پریشان ہو گا" — اُسے یہ خیال پریشان کرنے لگا — "مجھے یہ سب کچھ نہیں لکھنا چاہیئے تھا۔"

آٹھ دس دنوں بعد ملک رجب علی کو اصغر کا خط ملا۔ رجب علی نے خط پڑھا تو شازی کو بلایا اور اصغر کا خط اُس سے پڑھوایا۔ خط پڑھ کر شازی نے رجب علی کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔

"گھبراؤ نہیں بیٹی!" — ملک رجب علی نے پیارے سے انداز سے کہا — "اپنی جس جذباتی کیفیت کو تم دورہ یا شر شرار کہتی ہو اسے میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہُوں۔ انسانی فطرت کو جتنا میں سمجھتا ہوں اتنا تم نہیں سمجھ سکتیں۔ تم ابھی کم عمر ہو۔ سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تم پر نہ کسی نے کوئی جادو یا تعویذ کیا ہے نہ یہ شر شرار کا اثر ہے۔ سلمیٰ ان باتوں کو مانتی ہے۔ وہ مجھے دو

تین بار کہہ چکی ہے کہ میں تمہیں کسی عامل یا کسی پیر فقیر کے پاس لے جاؤں۔ اُس کا خیال ہے کہ شمیم آخر دیہات کی لڑکی ہے، اُس نے کوئی ایسی پُراسرار کارروائی کی ہو گی۔ میں تمہیں ایسے کسی وہم اور چکر میں نہیں پڑنے دوں گا....

"میں کہہ رہا تھا کہ میں انسانی فطرت کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میں نے سائیکالوجی اور فلاسفی کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ میں نے انسانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ بعض ایسے لوگوں کو میں نے فریب دہی اور نوسر بازی کے جرائم میں گرفتار کیا ہے جنہیں لوگ معاشرے کے بڑے ہی معزّز افراد سمجھتے تھے۔ میں نے وارداتوں میں ایسے لوگوں کو مشتبہ ٹھہرایا ہے جو شکل و صورت سے اور اعمال سے بدمعاش لگتے تھے لیکن قریب سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ ان کی فطرت بڑی پاک ہے۔ میں نے اُن قاتلوں سے تفتیش کی ہے جنہوں نے بڑی دلیری سے قتل کیے تھے اور لوگ کہتے تھے کہ یہ تو جن بھوت ہیں لیکن میرے سامنے آئے تو پتہ چلا کہ یہ تو ریت کی ڈھیریاں ہیں۔ انسان کی فطرت جرم کا سوچ لیتی ہے، جُرم کر بھی لیتی ہے لیکن اُس کے لاشعوری ردِّعمل کو نہیں سنبھال سکتی۔ انسانی فطرت کی یہی وہ خوبی یا خامی ہے کہ قاتل جب اقبالِ جرم کرتا ہے تو وہ ایک سکون اور روحانی اطمینان محسُوس کرتا ہے۔"

رجب علی ایسے پُراثر لب و لہجے میں بول رہا تھا کہ شازی مسحور سی ہوتی چلی جا رہی تھی اور وہ کچھ سکون سا بھی محسوس کرنے لگی تھی۔

"یہی کیفیت تم پر طاری ہو گئی ہے" — رجب علی کہہ رہا تھا — "تمہاری زندگی میں جو انقلاب آیا ہے وہ ایسا شدید دھچکا ہے جس نے تمہارے احساسات اور سوچوں کو تہ و بالا کر ڈالا ہے۔ اس وقت تم دو حصّوں میں بٹ گئی ہو۔ ایک حصّہ تمہیں کہہ رہا ہے کہ نہیں، تم نے اچھا نہیں کیا لیکن شعوری طور پر تم فخر کرنا چاہتی ہو کہ تم نے جو کارنامہ اور ایثار کر دکھایا ہے یہ اور کوئی نہیں کر سکتا....

"یہ ہے بھی صحیح۔ تم جتنا فخر کرو کم ہے لیکن اس ردِّعمل کو سنبھالنا تمہارے لیے دشوار ہو رہا ہے جو اس انقلاب کی وجہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اصغر نے ٹھیک لکھا ہے کہ شازی سے کہو کہ وہ اپنے ماضی کو ذہن سے اتار دے.... دیکھو بیٹی! ماضی ایک آسیب ہے جو حال پر جب طاری کر لیا جاتا ہے تو مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ میرا ماضی تمہاری گزری ہُوئی زندگی سے بہت زیادہ ناپاک اور گھناؤنا تھا لیکن میں نے اس سے چھٹکارا پا لیا ہے۔"

"آپ پختہ عمر میں ہیں ابّو!" — شازی نے بے بسی کے سے عالم میں کہا — "اور آپ کو زندگی کا تجربہ بھی ہے۔ میں تو ابھی یہ بھی سمجھ نہیں سکی کہ وہ کون سی پُراسرار اور تخریبی قوت ہے جس نے مجھ پر قابو پا لیا ہے۔ آپ کی اتنی پیاری باتوں سے مجھے بڑا ہی سکون مل رہا ہے لیکن میں جب اپنے کمرے میں جاؤں گی تو مجھ پر پھر وہی کیفیت طاری ہو جائے گی" — شازی چپ ہو گئی، پھر تڑپ کر بولی — "کچھ سمجھ نہیں آتی ابّو!.... مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا، میں اصغر کو خوشیاں دینا چاہتی ہوں لیکن میری وجہ سے وہ پریشان ہو رہا ہے۔"

"تم ایسی بھی بچّی اور نادان نہیں ہو کہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکو" — رجب علی نے کہا — "اس دنیا

میں تمھارا کوئی ہمدرد اور مخلص تھا تو وہ تمھاری ماں تھی۔ جوانی تک تم اس کی گود میں پلی ہو۔ تمھاری طرح کی کوئی بیٹی اپنے آپ کو اپنی ماں کے وجُود سے نوچ کر پرے نہیں پھینک سکتی۔ میرا خیال ہے کہ سائیکالوجی کے سکالروں کے لیے بھی تمھارا یہ اقدام یا یہ انقلاب حیران کُن ہوگا۔ میں اتنی گہرائی میں نہیں جا سکتا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تم نے ایسی ذہنی کیفیت میں اپنے اندر یہ انقلاب پیدا کیا ہے جسے میں ابنارمل کیفیت کہوں گا..... شازی بیٹی! یہ نہ سمجھ لینا کہ میں کتابوں میں پڑھی ہُوئی باتیں کر رہا ہوں۔ خُدا گواہ ہے کہ میں نے اس مسئلے پر کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ میں یہی روزمرہ کی چلتی پھرتی زندگی کی باتیں کر رہا ہُوں۔ شادی کی رات تم پر یہ کیفیت اس لیے طاری ہوتی تھی کہ لڑکی کی شادی کی خوشی جتنی ماں کو ہوتی ہے اتنی باپ کو نہیں ہوتی، بھائیوں کو نہیں ہوتی۔ اُس رات تم نے اپنی ماں کی ضرورت محسوس کی ہوگی۔ تم نے نادانستہ طور پر یہ بھی سوچا ہوگا کہ تمھارا کوئی میکہ نہیں۔ شادی کے پہلے روز دُلہن کی آنکھوں سے جو آنسو ٹپکتے ہیں وہ افسوس کے کم اور خوشی کے زیادہ ہوتے ہیں..... میں ابھی تمھیں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ اس نئی زندگی میں اس طرح گھل مِل جاؤ کہ تمھارا ماضی تنکوں کی طرح اڑ کر تمھاری ذات سے علیحدہ ہو جائے۔"

شازی جب وہاں سے اٹھی تو اُس کی مزاجی کیفیت بالکل نارمل ہو چکی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

▼

شازی کے ہونٹوں پر یہ مُسکراہٹ اپنے باپ کی باتوں نے پیدا کی تھی لیکن وہ اپنے کمرے میں گئی تو کچھ دیر بعد اُس کی جذباتی کیفیت میں پھر تلاطم کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اُس کی نظریں اصغر کی تصویر پر جم گئیں اور اُس کا ذہن آہستہ آہستہ پیچھے کو چل پڑا۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے ذہن کو روک لے اور اپنے ساتھ رکھے لیکن تلاطم میں تُندی آتی گئی۔

اُس نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ اُس نے بڑی آہستہ آہستہ سر گھمایا تو اُسے سلمٰی کا مُسکراتا ہُوا چہرہ نظر آیا۔

"جاؤ بیٹی!"۔۔۔ سلمٰی نے اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔۔۔ "گاڑی لے جاؤ اور کہیں گھوم پھر آؤ۔ ڈرائیور تمھارے انتظار میں کھڑا ہے۔"

"نہیں امّی جان!"۔۔۔ شازی نے مسکراتے ہُوئے کہا۔۔۔ "باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"اِس قید سے نکلو شازی!"۔۔۔ سلمٰی نے بڑی پیاری سی جھنجلاہٹ سے کہا۔۔۔ "نکلو اس قید سے اور ان مردوں کی جُدائی کے غم میں اتنا نہ گھُلو۔ وہ ہے تو میرا بیٹا لیکن ان مردوں کے جذبات دو چار مہینوں میں ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں..... چلو اٹھو۔ جاؤ انارکلی چلی جاؤ۔ یہاں ساتھ ہی مین مارکیٹ ہے، وہاں چلی جاؤ۔ اُس روز تم کہہ رہی تھیں کہ کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔ جاؤ شاپنگ کر آؤ۔"

سلمٰی کے انداز میں ایسی اپنائیت تھی کہ شازی اپنے انکار پر قائم نہ رہ سکی۔ وہ پرس اُٹھا کر باہر نکل گئی۔ اُس نے سلمٰی سے کہا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ چلے لیکن سلمٰی نے اُسے یہ کہہ کر اکیلے بھیج دیا تھا کہ وہ آزادی سے گھومے پھرے۔

شازی پردے میں جوان نہیں ہُوئی تھی اور وہ دیہاتن بھی نہیں تھی۔ آزادی سے گھومنے پھرنے کی وہ عادی تھی۔ راہ جاتی لڑکیوں کو چھیڑنے والے نوجوانوں سے وہ ڈرنے اور جھینپنے والی لڑکی نہیں تھی لیکن اُس نے خود ہی اپنے گرد زنجیریں لپیٹ لی تھیں۔ وہ اس سے پہلے چند مرتبہ جاسوسی کے سِلسلے میں لاہور آ چکی تھی۔ اُس کی ماں کو انارکلی بازار بہت پسند تھا۔ شازی جب اپنی کوٹھی سے نکلی تو اُس نے ڈرائیور سے کہا۔۔۔ "انارکلی چلو۔"

گاڑی نیلا گنبد کے سامنے جا رُکی۔ شازی اپنی گاڑی سے نکلی۔ اُس سے دس بارہ قدم دُور ایک اور کار کا دروازہ کھُلا اور شازی جیسی ہی ایک بڑی خوبصورت اور بڑے دل کش قد کاٹھ کی لڑکی نکلی۔ اُس نے شازی کو دیکھا۔ شازی نے اُسے دیکھا۔ شازی نے جو قدم انارکلی کی طرف اُٹھایا تھا وہ وہیں جا پڑا جہاں سے اُٹھا تھا اور ایک ایسی رَو شازی کے سارے وجود میں پھر گئی جس نے اُس پر سکتے کی سی کیفیت طاری کر دی ۔۔۔ وہ شمیم تھی۔

شمیم کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر جواں سال آدمی تھا جس نے بوسکی کی شلوار اور قمیض پہن رکھی تھی اور اُس کے پاؤں میں زری جوتی تھی۔ وہ لباس اور انداز سے امیر کبیر زمیندار یا جاگیر دار لگتا تھا۔

شمیم آہستہ آہستہ شازی کی طرف چل پڑی۔ شازی کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے ہوں۔ وہ شمیم کا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی۔ بھاگ نکلنے کی بھی اُس میں سکت نہ رہی۔ اُس کی نظریں شمیم کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ شمیم کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی ۔۔۔ وہ غصّے میں ہے؟..... رعونت سے بات کرے گی؟..... طعنے دے گی؟..... دھمکی دے گی؟۔۔۔ شازی کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ شمیم کے چہرے پر اُس نے ایسا تاثر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"مبارک ہو شازی!"۔۔۔ شمیم نے ہاتھ شازی کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا۔۔۔ "تم جیت گئیں..... میرا جبر اور میرا غرور میرے سامنے آیا..... شادی ہو گئی نا تمھاری؟..... اصغر کیسا ہے؟ خوش تو ہے نا؟..... اُسے خوش رکھنا..... مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تمھاری اور اصغر کی شادی ہو گئی ہے۔"

شمیم دبی دبی سی زبان میں اتنی ساری باتیں کہہ گئی اور شازی کی نظریں اُس کے چہرے پر جمی رہیں۔ اُس نے صرف اتنا کیا کہ شمیم نے اُس کی طرف جو ہاتھ بڑھایا تھا وہ شازی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"آؤ میرے ساتھ"۔۔۔ شمیم نے اُس کا بازو پکڑتے ہُوئے کہا۔۔۔ "میں تمھیں کوئی تحفہ دینا چاہتی ہوں۔ اپنی پسند کا تحفہ لے لو۔"

"تم مجھے تحفہ دے چکی ہو شمیم!"۔۔۔ شازی نے ایسی آواز میں کہا جس میں ہلکا سا لرزہ تھا۔ کہنے لگی۔۔۔ "کوئی عورت کسی عورت کو ایسا تحفہ نہیں دے سکتی۔"

اُنہیں آواز سنائی دی ۔۔۔ "شمیم..... آ جاؤ۔ اب آ جاؤ۔"

"کون ہیں یہ صاحب؟"۔۔۔ شازی نے پوچھا۔

"میرا خاوند ہے"۔۔۔ شمیم نے جواب دیا۔

"کیسا ہے؟"

"جیسا دیکھ رہی ہو"۔۔۔ شمیم نے کہا۔۔۔ "اس میں خرابی یہ ہے کہ جاگیر داروں کا بیٹا ہوتے

ہوتے بھی شریف آدمی ہے اور خوبی یہ ہے کہ میرا خاوند ہے۔"

"مجھے کوستی ہوگی" — شازی نے ملول سی مسکراہٹ سے کہا — "میرے نام سے بھی تمہیں گھن آتی ہوگی۔"

شمیم ایسی ہنسی ہنس پڑی جس میں مسرت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

"وہ شمیم مرگئی ہے" — شمیم نے کہا — "نکاح پڑھنے والوں نے اُس شمیم کا گلا گھونٹ کر اُس کی لاش ڈولی میں رکھ دی تھی جس شمیم نے تمہیں دھمکیاں دی تھیں۔"

شمیم کے خاوند کی گرجدار آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ وہ شمیم کو بلا رہا تھا۔

"میں نے اسے قبول کرلیا ہے" — شمیم نے کہا — "میرا جسم میری گزری ہوئی زندگی کا مزار ہے.... خدا حافظ شازی! خوش رہو۔"

اور شمیم اپنے خاوند کی طرف چلی گئی۔

▼

شازی جب اپنے گھر واپس آئی تو اُس نے سلمیٰ کو صرف دکھانے کے لیے جو اُوٹ پٹانگ شاپنگ کی تھی وہ سلمیٰ کے آگے رکھ دی اور بڑی تیز تیز چلتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سلمیٰ نے محسوس کرلیا کہ شازی اپنے آپ میں نہیں۔ اُس نے یہ نہ دیکھا کہ شازی کیا کچھ خرید لائی ہے۔ وہ شازی کے پیچھے اُس کے کمرے میں چلی گئی۔ شازی پلنگ پر اوندھے منہ پڑی تھی۔

"شازی!" — سلمیٰ نے پیار سے سے رُعب سے کہا۔ اُس کے لہجے میں ماں کی ممتا کی جھلک بھی تھی۔ اُس نے شازی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "اُٹھو میرے سامنے بیٹھو۔"

شازی اُٹھی اور اُس نے سلمیٰ کا سامنا کیا۔ سلمیٰ نے دیکھا کہ شازی کی آنکھیں خشک نہیں تھیں۔

"پھر وہی بات!" — سلمیٰ نے اُس کے گال پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا — "میں نے تمہیں باہر اس لیے تو نہیں بھیجا تھا کہ منہ بسور کر واپس آؤ۔"

"امّی جان!" — شازی نے بڑے ہی سنجیدہ لہجے میں کہا — "اپنی اس حالت کی ایک وجہ تو آج مجھے معلوم ہوگئی ہے۔"

"کیا ہے وہ وجہ؟"

"آج شمیم ملی تھی" — شازی نے کہا — "اگر وہ مجھے پہلے کی طرح دھمکی دے دیتی، بے ٹھکانہ ہونے کا طعنہ دے دیتی یا یہ کہہ دیتی کہ اصغر میرا ہے اور میں اُسے حاصل کر کے رہوں گی تو میرے جسم میں جان آجاتی اور میں اچھی بھلی ہوجاتی۔ میں اُسے کہتی، آؤ شمیم اصغر کو مجھ سے چھین کے دیکھ لو، لیکن امّی جان! شمیم کو میں نے جس رنگ میں دیکھا ہے اور اُس نے جس انداز سے میرے ساتھ مختصر سی دو باتیں کی ہیں، ان سے میرے ضمیر پر ایک ایسا بوجھ آپڑا ہے جو شاید پہلے ہی میرے ضمیر پر موجود تھا۔"

"کیا ہوا شازی؟" — سلمیٰ نے اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا — "کچھ مجھے بھی سمجھاؤ۔ اکیلی نہ جلتی کڑھتی رہو۔"

"میں نے چوری کی ہے امّی جان!" — شازی نے کہا — "میں نے ڈاکہ ڈالا ہے.... میں نے اصغر کی محبت چرائی ہے۔ وہ شمیم کو چاہتا تھا لیکن اصغر کی جو محبت شمیم کے دل میں تھی وہ پاگل پن کی حالت تک پہنچی ہوئی تھی، مگر شمیم نے مجبور ہو کر ایک ایسے خاوند کو قبول کرلیا ہے جو کسی پہلو اُس کی پسند کا نہیں۔"

"میں تمہاری ساری بات سمجھ گئی ہوں" — سلمیٰ نے کہا — "تم نے اپنے اوپر ایک وہم طاری کر رکھا ہے۔ تم پریشان اُس صورت میں ہوتیں جب ہم تمہیں زبردستی اصغر کے گلے میں ڈال دیتے۔ اصغر نے خود تمہیں پسند کیا ہے.... یوں کہو کہ اصغر ابھی تک شمیم کو چاہتا ہے اور اُس نے تمہاری طرف توجہ نہیں کی۔"

"امّی جان!" — شازی نے بے بسی کے لہجے میں کہا — "یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میرے ضمیر پر ایسا بوجھ ہے جیسے میں نے بہت بڑا جُرم کیا ہے۔"

شازی کا سر جُھک گیا۔ پھر اُس نے سر اُٹھا کر سلمیٰ کو دیکھا اور کچھ دیر دیکھتی ہی رہی۔

"کہو، کہو" — سلمیٰ نے کہا — "تم کچھ کہنا چاہتی ہو جو تم زبان پر لانے سے ڈرتی ہو۔ مجھے اپنی ماں نہ سمجھو، ایک ہمراز سہیلی سمجھ لو۔ میں تمہیں کہہ چکی ہوں کہ تم یہاں تنہا نہیں.... تمہیں شاید معلوم ہوگا کہ میں نے اپنے خاوند کے قاتل کے ساتھ شادی کی ہے۔"

شازی نے چونک کر سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ سراپا سوال اور حیرت بن گئی۔

"ہاں شازی!" — سلمیٰ نے کہا — "یہ کہانی تمہیں کسی وقت سنادوں گی۔ اس وقت یہی بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ کچھ حالات ہوتے ہیں، کچھ جذبات ہوتے ہیں جو انسان کو ایسے کام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جو وہ نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے بھی اس نئی زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کرتے کچھ وقت لگا تھا، کچھ جدّوجہد کرنی پڑی تھی۔"

"امّی جان!" — شازی نے حیرت سے پوچھا — "آپ نے یہ فیصلہ کس طرح کرلیا تھا؟"

"یہی سوال میں تم سے پوچھتی ہوں" — سلمیٰ نے کہا — "تم نے اصغر کو اور چند ایک زخمیوں کو دیکھ کر اپنی ماں کو گرفتار کرانے کا فیصلہ کس طرح کرلیا تھا؟.... تم نے کیوں فوراً مان لیا تھا کہ ملک رجب علی صاحب ہی تمہارے باپ ہیں؟"

"میں جواب نہیں دے سکوں گی" — شازی نے کہا — "یہی سمجھتی ہوں کہ مجھ سے یہ فیصلہ ہوگیا تھا۔"

"ہاں، یہی بات ہے" — سلمیٰ نے کہا — "بعض فیصلے ہوجاتے ہیں، یا یوں کہہ لو کہ بعض فیصلے اپنے آپ تم پر مسلّط ہوجاتے ہیں.... جو ہوگیا، اچھا ہوگیا۔ اب جو کچھ بھی ہو، اُس کا سامنا کرو۔ میں جب ملک صاحب کی بیوی بن کر اس کوٹھی میں آئی تھی تو میں اکیلی تھی۔ مجھے سمجھانے والا کوئی نہ تھا۔ تم اکیلی نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

▼

شازی نے آہ بھری اور بولی — "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ کچھ اور بھی ہے جو مجھے تنہائی میں پریشان

کرتا رہتا ہے۔ میں نے اصغر سے کہا تھا کہ ایک نہ ایک دن اُسے افسوس ہوگا کہ اُسے کنواری دُلہن نہیں ملی۔ کبھی کبھی یہ خلش بھی ہوتی ہے کہ میں اپنے باپ کی بیٹی نہیں ہُوں۔ میرا شجرۂ نسب مجھے شرمسار کرتا ہے۔ کبھی مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگتی ہے کہ میرا وجود ناپاک ہے۔ میں ایک گناہ کی پیداوار ہوں اور مجرمانہ ماحول میں پرورش پائی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری وہ فطرت کبھی ناگن کے پھن کی طرح اُٹھ کھڑی ہو اور میری اتنی پیاری ازدواجی زندگی کو ڈس لے۔"

"میں اس کے سوا تمہیں اور کیا کہہ سکتی ہوں کہ وہ گناہ تمہارا نہیں تھا جس کی تم پیداوار ہو۔ اُس مجرمانہ ماحول کو اب ذہن سے اتار دو جس میں تم نے پرورش پائی ہے" —— سلمیٰ نے کہا —— "خدا کو یاد کیا کرو۔ نماز پڑھا کرو۔ جس خُدا نے تمہیں اُس زندگی سے نکالا ہے وہ اِس زندگی میں بھی تمہاری مدد کرے گا۔"

شازی کو سلمیٰ کی باتوں سے کچھ سکون آ تو گیا لیکن وہ محض وقتی تھا۔ شازی ایک ایسے نفسیاتی رّدِعمل میں اُلجھ کر رہ گئی تھی جو سیلابی دریا کے بھنور سے کم نہ تھا۔ اپنے ماضی کو دُھتکار دینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ اپنی گزری ہوئی زندگی پر لعنت بھیجنا بھی آسان ہوتا ہے لیکن یادوں کا ماضی سے رشتہ توڑ لینا شازی جیسے نوعمر ذہنوں کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ ایک جرم کا احساس اُس کے ضمیر کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ ایک خلش کو محسوس کر رہی تھی لیکن اُسے پُوری طرح سمجھ نہیں رہی تھی۔ ذہن لاشعور کی اتھاہ اور تاریک کھائیوں میں سے کوئی چیز باہر نکال لینا نفسیات کے ڈاکٹر کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہوتا لیکن بات جب ڈاکٹر کے پاس پہنچتی ہے اُس وقت تک مریض کا دماغی توازن پاگل پن کی حد تک بگڑ چکا ہوتا ہے۔

ایک روز اُس نے اپنی اس کیفیّت کا علاج یہ سوچا کہ سلمیٰ اور رجب علی کو بتا کر طاہرہ کے ہاں چلی گئی۔ طاہرہ کو یہ لڑکی بڑی پیاری لگتی تھی۔

"نئی زندگی کیسی لگی شازی؟" —— طاہرہ نے اُسے چھیڑتے ہُوئے پوچھا —— "اصغر کے ساتھ دو راتیں کیسی گزریں؟"

"اچھی گزریں خالہ!" —— شازی نے جواب دیا —— "لیکن ایسے لگتا ہے جیسے کوئی بڑا ہی منحوس سایہ میرے اُوپر پڑا ہُوا ہے۔"

"کیوں؟" —— طاہرہ نے حیران سا ہو کر پُوچھا —— "ایسی کیا بات ہے؟ اصغر تو تم پر جان چھڑکتا ہے۔"

شازی نے اپنے سینے کا تمام غبار طاہرہ کے سامنے رکھ دیا۔

"اگر میں تمہیں اپنی زندگی کی کہانی سنا دوں تو تمہارا دماغ ٹھکانے آجائے گا" —— طاہرہ نے کہا —— "معلوم ہوتا ہے تمہارے ذہن نے تمہاری زندگی کی اتنی بڑی تبدیلی کو ابھی قبول نہیں کیا.... یہ تو تمہیں معلوم ہے نا، کہ میرے ابّاجان جمال بیگ مرحوم تمہارے ابّو کے ساتھ زخمی ہُوتے تھے اور ہسپتال میں شہید ہو گئے تھے لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ یہ باپ مجھے اُس وقت مِلا تھا جب میں شادی کر کے بیوہ بھی ہو چکی تھی۔ میں نے اُنہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ پھر میری زندگی نے کیا کیا رنگ دیکھے، انہیں میں یاد نہیں کرنا چاہتی۔ میں تمہیں اپنی ایک سہیلی کی کہانی ضرور سناؤں گی.... میں نے اپنے سینے سے دل نکال کر اپنی سہیلی کو دے دیا تھا۔ اُس کا نام عفّت تھا۔ طاہر پرویز میرا نہیں، اُس کا بیٹا ہے۔ ارشد میرا نہیں اُس کا خاوند تھا۔"

شازی اُسی طرح چونکی جس طرح سلمیٰ کی یہ بات سُن کر بدک گئی تھی کہ اُس نے اپنے خاوند کے قاتل کے ساتھ شادی کی ہے۔

"کہانی تو میں تمہیں پھر کبھی سناؤں گی" —— طاہرہ نے کہا —— "مجھے اپنی یہ سہیلی عفّت جب یاد آتی ہے تو آج بھی میں لہُو کے آنسو روتی ہوں۔ اب تم نے جس طرح اپنی ذہنی کیفیّت بیان کی ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے عفّت میرے سامنے بیٹھی بول رہی ہو۔ وہ بھی ایسے ہی وہم کا شکار ہوگئی تھی جس میں تم اُلجھی ہوئی ہو۔ اُس نے اپنے لیے کچھ اور مسائل کھڑے کر لیے تھے۔ تم نے اپنے آپ کو پریشان رکھنے کا کوئی اور جواز ڈھونڈ نکالا ہے لیکن مرض دونوں کا ایک ہے۔ ہم اُسے ڈاکٹروں کے پاس لے گئے تھے۔ نفسیات کے ایک ڈاکٹر کو ہم نے عفّت کے علاج کے لیے مستقل رکھ لیا تھا، مگر اُس کے وہم ایسے نفسیاتی مرض کی صُورت اختیار کر گئے کہ اُس کا اعصابی نظام تباہ ہو گیا، پھر اُس کے دل پر اثر ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُس نے طاہر پرویز کو جنم دیا اور مر گئی۔"

"کیا میرا بھی یہی انجام ہوگا خالہ؟" —— شازی نے پوچھا —— "مجھے کچھ بتائیں.... میری حالت تو ایسی ہو گئی ہے جیسے کسی شر شرار کا آسیبی اثر ہو گیا ہو۔"

"میں تمہیں کوئی علاج نہیں بتا سکتی" —— طاہرہ نے کہا —— "میں تمہیں اس ذہنی کیفیّت کے نتائج بتا سکتی ہُوں جو تم نے اپنے اُوپر طاری کر رکھی ہے۔ تم ایک فوجی کی بیوی ہو۔ فوجی جب گھر آتا ہے تو وہ سکون چاہتا ہے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو نہ بدلا تو ہو سکتا ہے فوجی گھر آنا ہی چھوڑ دے۔"

"نہیں" —— شازی نے تڑپ کر کہا —— "ایسا نہیں ہوگا۔ میں اصغر کو سکون دوں گی۔"

▼

شازی جب طاہرہ کے ہاں سے لَوٹی تو وہ خوش و خرم نظر آ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں طاہرہ کے یہ الفاظ بہت دن گونجتے رہے —— "ہو سکتا ہے فوجی گھر آنا ہی چھوڑ دے" —— ایک طرف تو اپنے ضمیر پر وہ اس طرح کا بوجھ محسوس کر رہی تھی کہ اُس نے شمیم اور اصغر کی محبّت پر ڈاکہ ڈالا ہے لیکن وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اصغر کو ذرا سا بھی دُکھ پہنچے۔ اُس نے اُسی وقت اصغر کو خط لکھا جس میں اُس نے بڑی امید افزا باتیں لکھیں اور یہ بھی لکھا کہ کچھ دن کی چھٹی لے کر آجاؤ۔

اُسی رات طاہرہ سلمیٰ کے ہاں آئی اور اُسے بتایا کہ شازی کو اُس نے کس کیفیّت میں دیکھا ہے۔

"میں پوری کوشش کر رہی ہُوں کہ شازی کو ازدواجی زندگی میں رواں کر دوں" —— سلمیٰ نے کہا۔

"آپ کو یہ کوشش کرنی ہی پڑے گی" —— طاہرہ نے کہا —— "میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ یہ بڑی قیمتی لڑکی ہے اور دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ اس نے اپنی جو جذباتی کیفیت مجھے بتائی ہے اس سے میں پریشان ہو گئی ہُوں۔ اس کی باتیں سن کر مجھے اپنی سہیلی یاد آگئی ہے۔ میں نے آپ کو آ

کی ساری باتیں اور اُس کی نفسیاتی حالت بتائی تھی۔ میں ڈرتی ہُوں کہ وہی حادثہ آپ کے گھر نہ ہو جائے؛

"اللہ مالک ہے" ـــ سلمٰی نے کہا ـــ "میں دل کی گہرائیوں سے کوشش کر رہی ہوں کہ کسی حادثے تک نوبت نہ پہنچے لیکن طاہرہ! میں ماں ہوں۔ میں نے اگر اصغر کو کسی ذہنی اذیّت یا پریشانی میں دیکھا تو میں بتا نہیں سکتی کہ شازی کے ساتھ میرا رویّہ اور سلوک کیا ہو گا۔"

طاہرہ اپنی ذہنیت اور فطرت کے مطابق سلمٰی کو اس پر قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ جو قربانی شازی نے دی ہے، اس کے لیے کچھ قربانی ہمیں بھی دینی پڑے گی ورنہ اس لڑکی نے بڑے پُرخطر راستے دیکھے ہیں۔ اگر اُس کے ساتھ ذرا سی بھی بے رُخی یا بدسلوکی ہُوئی تو وہ کسی ایسے راستے پر نکل جائے گی جو وہ چھوڑ آئی ہے۔

خُدا نے ایسا بندوبست کر دیا کہ سلمٰی کے کسی امتحان میں پڑنے کا امکان ہی ختم ہو گیا۔ شازی کے خط کے جواب میں اصغر نے شازی کو لکھا کہ اُسے مشرقی پاکستان میں ایک بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں پوسٹ کر دیا گیا ہے اور شازی اُس کے ساتھ جانے کے لیے تیار رہے۔

▼

جب شازی بوئنگ طیّارے میں سے ڈھاکہ کے ہوائی اڈّے پر اُتری تو سب سے پہلے جو چیز اُس نے محسوس کی وہ مشرقی پاکستان کی ہوا تھی جو مغربی پاکستان سے بالکل مختلف محسوس ہوتی تھی۔ شازی نے اپنے آپ میں خوشگوار سی تبدیلی محسوس کی۔ اُسے اسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ وہاں کے لوگ مختلف تھے۔ اُن کی زبان مختلف تھی لیکن ایک رشتہ ایسا تھا کہ وہاں اجنبیّت نہیں تھی۔ یہ رشتہ اس سبز پرچم کی بدولت قائم تھا جو ڈھاکہ ایئرپورٹ کی پیشانی پر بڑی شان سے لہرا رہا تھا۔ طیّارہ جب بھارت کے اوپر سے گزر رہا تھا تو اصغر نے شازی سے کہا تھا ـــ "وہ ملک تمھارے قدموں کے نیچے ہے جس نے تمھیں پاکستان میں اس لیے بھیجا تھا کہ وہ پاکستان کو اپنے قدموں تلے روند ڈالے۔"

شازی مسکرا دی تھی اور اُس نے اصغر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا تھا جن میں پیار چھلک رہا تھا۔ اصغر کا چہرہ شازی کے چہرے کے بہت ہی قریب چلا گیا۔ شازی نے جب اصغر کی طرف منہ موڑا تو اُن کی سانسیں ٹکرانے لگیں۔

"تم عظیم ہو شازی!" ـــ اصغر کے ہونٹوں سے بیساختہ سرگوشی پھسل گئی۔

شازی کی مسکراہٹ میں جو مسرّت تھی وہ خمار بن گئی۔ اس خمار کا اثر اُس کی آنکھوں میں بھی جھلکنے لگا۔ شازی نے اچانک اپنا چہرہ پیچھے کر لیا اور اُس کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ اُس نے اصغر کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"مجھے کچھ یاد آ گیا ہے اصغر!" ـــ شازی نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا ـــ "مشرقی پاکستان انڈین انٹیلی جنس کے ایجنٹوں سے بھرا پڑا ہو گا۔ معلوم نہیں تم جانتے ہو یا نہیں کہ انڈیا والے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے کاٹنا چاہتے ہیں۔"

"کہاں کی باتیں کرتی ہو شازی!" ـــ اصغر نے فوجی لہجے اور انداز سے بات کرتے ہوئے کہا ـــ "ستمبر کی جنگ میں ہم نے ان ہندوؤں کی فوج کا جو بُرا حال کیا ہے اسے وہ ساری عُمر نہیں بُھولیں گے۔ وہ تو اپنی آنے والی نسلوں کو وصیّت کر جائیں گے کہ پاکستان کے مُنہ نہ آنا۔"

شازی عجیب سے طریقے سے ہنس پڑی اور اُس نے اصغر کے چہرے کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔

"تمھاری زبان مشین گن کی طرح چلتی ہے" ـــ شازی نے ہنستے ہُوئے کہا ـــ "اور تم جیٹ طیّارے میں بیٹھ کر بھی اس طرح بات کرتے ہو جیسے پریڈ گراؤنڈ میں کیا کرتے ہو گے۔ تم شاید اُس مُلک کی ذہنیت کو نہیں جانتے جس نے مجھے جاسوسی کی ٹریننگ دی تھی۔ میں جو بات کہہ رہی ہُوں یہ میرا قیاس یا میری رائے نہیں۔ میں تمھیں انڈیا کی پلاننگ بتا رہی ہُوں۔ مجھے اور میری ماں کو جب خفیہ طریقے سے پاکستان میں داخل کیا گیا تھا اُس وقت مجھ جیسی چار پانچ بنگالی لڑکیوں کو مشرقی پاکستان میں بھیج دیا گیا تھا۔ ہمیں ایک ہندو بریگیڈیئر نے بڑا لمبا لیکچر دیا تھا۔ اُس نے بڑے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ انڈیا مغربی پاکستان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا، مشرقی پاکستان بڑا آسان شکار ہو گا۔ اُس نے کہا تھا کہ انڈیا مشرقی پاکستان کو حملے کے بغیر ختم کر دے گا....

"اُس نے اپنے لیکچر میں ہمیں کہا تھا کہ انڈیا کی اس پلاننگ کی کامیابی کے لیے زمین ہموار کرنے کی ذمّہ داری تمھاری ہو گی۔ جو کام تم کر سکتی ہو وہ فوج کے تین چار ڈویژن بھی نہیں کر سکتے۔ بنگال کی ایک ہندو لڑکی نے اُس سے پوچھا تھا، انڈیا کی پلاننگ کیا ہے۔ بریگیڈیئر ہنس پڑا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ پُورا پلان کسی کو بتایا نہیں جا سکتا۔ میں تمھیں ایک مثال دیتا ہوں۔ وہ تم سمجھ جاؤ۔ مگرمچھ کسی انسان یا جانور کو جب شکار کرتا ہے تو اُسے فوراً نگل نہیں لیتا۔ اُسے مار کر پانی کے قریب مٹّی میں دبا دیتا ہے۔ چند دنوں بعد اُس کا شکار گلنے سڑنے لگتا ہے اور نرم ہو جاتا ہے پھر مگرمچھ اسے مٹّی سے نکال کر نگل لیتا ہے.... بریگیڈیئر نے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان کو پہلے نرم کرنا ہے تاکہ یہ نگلا جا سکے، اسے چبانا نہ پڑے۔ یہ مثال دے کر بریگیڈیئر احمقوں کی طرح ہنس پڑا تھا لیکن وہ احمق نہیں تھا۔ وہ بڑے بڑے دانشمندوں کو احمق بنانے والا اُستاد تھا.... مشرقی پاکستان کو بھیجی جانے والی لڑکیاں مغربی بنگال کی رہنے والی تھیں۔ تم اُنہیں دیکھو تو مجھے بھول جاؤ۔ تم نے کبھی بنگال کا جادُو سنا ہو گا۔ یہ جادو ان لڑکیوں کی آنکھوں میں، اُن کے انداز میں اور اُن کی زبان میں تھا۔ میں زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ صرف اتنا پورے وثوق سے کہتی ہُوں کہ پاکستان کے لیڈروں کو مشرقی پاکستان کے متعلق بہت ہوشیار اور چوکنّا رہنا پڑے گا۔"

▼

اصغر نے شازی کو تین چار مہینے اپنے ایک میجر دوست کے بنگلے میں رکھا۔ پھر اُسے بھی بنگلہ مِل گیا اور وہ آزادی سے رہنے لگے۔ اصغر اُس بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے سٹاف میں تھا جو اُس وقت جیسور میں تھا۔ ان تین چار مہینوں میں وہ اپنی پوسٹ پر اس قدر مصروف رہا کہ شہر میں گھومنے پھرنے کا اور شازی کو سیر سپاٹا کرانے کا اُسے وقت نہ مِلا۔

پنجاب میں گھر کے لیے اچھا نوکر ڈھونڈنا محال تھا لیکن مشرقی پاکستان میں انسانوں کی ارزانی کا یہ

عالم تھا کہ اُدھر اصغر اور شازی اپنے نئے بنگلے میں گئے، ادھر بنگالی عورتوں کی قطار لگ گئی ہر عورت نوکری مانگتی تھی۔ شازی کو کسی نوکر یا نوکرانی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اصغر کو فوج نے اردلی دے رکھا تھا۔ شازی نے ویسے ہی نوکری کے لیے آنے والی عورتوں میں سے تین چار سے پوچھا کہ وہ تنخواہ کتنی لیں گی۔ ہر عورت نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ اُسے اتنے چاول روزانہ مل جائیں جن سے وہ اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ بھر سکے۔ دو تین ایسی تھیں جن کا اپنا کوئی مکان ہی نہ تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ کھانے کو دے دو اور وہ بنگلے کے برآمدے میں سو جایا کریں گی۔

شازی نے اردلی سے کہا کہ وہ بنگلے کے سامنے اور پیچھے پودے لگانے کے لیے کھدائی کا بندوبست کرے۔ صرف دو آدمیوں کی ضرورت تھی لیکن ایک درجن بنگالی اکٹھے ہو گئے۔ وہ سب دو وقت کی روٹی کے لیے کام کرنے آئے تھے۔ وہ شازی کو یوں دیکھتے تھے جیسے وہ اُن کے ملک کی شہزادی ہو۔ شازی کے دل کو تکلیف سی ہونے لگی۔ یہ اُس ملک کے باشندے تھے جس ملک پر اُس نے اپنی ماں قربان کر دی تھی۔

شازی پر اس دُکھ اور دلی تکلیف کا یہ اثر ہُوا کہ لاہور میں اُسے جو دورہ سا پڑتا تھا وہ بالکل ختم ہو گیا۔ وہ اُن کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"اتنی غربت؟" — رات کو اُس نے اصغر سے کہا — "کیا تم ان زندہ لاشوں سے توقع رکھتے ہو کہ یہ 'پاکستان زندہ باد' کا نعرہ لگائیں گے؟ مجھے انڈین سیکرٹ سروس نے جو ٹریننگ دی تھی، اس میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ بھُوکے اور ننگے عوام اپنے ملک کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے اصغر! یہ لوگ اُن بستیوں میں جا پڑے ہیں جہاں انسانوں کی سوچیں اور اُن کے نظریے پیٹ میں چلے جاتے ہیں۔ اُن میں اور مویشیوں میں صرف یہ فرق رہ جاتا ہے کہ ان انسانوں کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔"

"یہ لوگ پسماندہ ہیں شازی!" — اصغر نے کہا — "اور یہ بچے بہت پیدا کرتے ہیں.... تم نے ابھی باہر نکل کر نہیں دیکھا۔ یہ لوگ کیڑوں مکوڑوں کی طرح سڑکوں پر گھومتے پھرتے اور فٹ پاتھوں پر لیٹے ہُوئے نظر آئیں گے۔"

"تم کبھی وقت پر گھر آؤ تو میں باہر نکلوں" — شازی نے کہا۔

"خود ہی چلی جایا کرو" — اصغر نے کہا — "ذرا آگے جا کر دیکھنا یہ خطّہ کتنا حسین ہے۔"

اگلی ہی شام جب سُورج غروب ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا، شازی فوجی بنگلوں کے علاقے سے باہر نکل گئی۔ ساتھ والی سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے۔ شازی اُن بنگالی مسلمانوں کو بڑے غور سے دیکھتی تھی جو پھٹی پرانی بنیان اور دھوتی میں ملبوس تھے۔ وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں تھے۔

شازی کی نظریں سڑک کے پار چلی گئیں۔ ایک بڑی خوبصورت لڑکی جس کی عمر شازی جتنی تھی، ایک آدمی کے ساتھ پیدل جا رہی تھی۔ لڑکی بنگالی تھی لیکن آدمی بنگالی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ کوٹ پتلون میں تھا۔ ٹائی بھی باندھ رکھی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر تھا۔ وہ لباس اور ڈیل ڈول سے

ایسا معلوم ہوتا تھا۔

شازی اُس لڑکی کو دیکھتی رہی۔ اچانک اُسے اُسی قسم کا دھچکہ لگا جیسا اُسے لاہور نیلا گنبد کے سامنے شمیم کو دیکھ کر لگا تھا۔ اُس لڑکی کے قدم رُکنے لگے اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا — وہ لڑکی اُن بنگالی لڑکیوں میں سے تھی جنہیں مشرقی پاکستان میں "زمین ہموار" کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

اُس لڑکی کے ساتھ جو آدمی تھا، اُس نے شازی کی طرف دیکھا۔ شازی ایسی بوکھلائی کہ عقل سے کام لینا بھول گئی اور وہیں سے واپس آ گئی۔ وہ لڑکی اور آدمی اِدھر ہی آ رہے تھے جدھر شازی کا بنگلہ تھا۔ شازی تیز چلتی اپنے بنگلے کے پھاٹک میں آ رُکی اور اُس نے پیچھے دیکھا۔ وہ لڑکی اپنے ساتھی کے ساتھ قریب آ گئی تھی اور اُس کے ہونٹوں سے مُسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ شازی بنگلے کے اندر چلی گئی۔

"اصغر!" — رات کو اُس نے اصغر سے کہا — "میں نے آج اُن بنگالی لڑکیوں میں سے ایک کو دیکھا ہے جنہیں مشرقی پاکستان میں داخل کیا گیا تھا۔"

"تمہیں اُس کا تعاقب کرنا چاہیئے تھا" — اصغر نے کہا — "تمہیں دیکھنا چاہیئے تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔"

"میں کچھ بھی نہ سوچ سکی" — شازی نے کہا — "میرا خیال ہے کہ وہ حیران ہُوئی تھی کہ میں اِس بنگلے میں کیا کر رہی ہوں۔ اب میرا تعاقب ہو گا اور یہ تعاقب بڑا خطرناک ہو گا اصغر!"

اصغر پریشان ہوگیا۔

پریشانی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شازی اپنے تعاقب اور شاید اغوا کا خطرہ محسوس کر رہی تھی، دوسری وجہ زیادہ اہم تھی۔ اصغر چاہتا تھا کہ شازی کا ماضی بھولی بسری کہانی بن جائے۔ شازی اپنے ماضی کو اپنے ذہن پر سوار کیے ہوئے تھی۔ اس کے اثرات یہ تھے کہ لاہور میں شادی کے بعد اُس پر دَورے کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اصغر مشرقی پاکستان میں آکر اس لیے خوش ہُوا تھا کہ یہاں کا ماحول پنجاب سے بہت ہی مختلف تھا۔ یہاں کے لوگ مختلف اور یہاں کی ہوائیں مختلف تھیں۔ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو شازی کو اُس کے ماضی کی یاد دلاتی۔ یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ یہ لڑکی کس کی بیٹی ہے اور کون سے خاندان سے ہے، مگر ایک بنگالی لڑکی کی صُورت میں اُس کا ماضی یہاں بھی موجُود تھا۔

"اِس کا کچھ انتظام کرنا پڑے گا" — اصغر نے کہا اور کچھ دیر سوچ کر پوچھا — "انڈیا کے جاسوسوں کو تم بہتر جانتی ہو۔ کیا وہ ایسی جرأت کر سکتے ہیں کہ کسی کو یا فوج کے کسی افسر کی بیوی کو اغوا کر لیں؟"

"کیا نہیں ہوسکتا؟" — شازی نے کہا — "تم دشمن ملک میں جاکر اُن پُلوں کو تباہ کر سکتے ہو جن کی حفاظت کے لیے اتنی فوج موجود ہوتی تھی تو کیا ہمارا دشمن یہاں سے ایک لڑکی کو اغوا نہیں کرا سکتا؟ مغربی پاکستان کی بات کچھ اور ہے، مشرقی پاکستان میں انڈیا کے جاسُوسوں اور تخریب کاروں کو تحفّظ حاصل ہے کیونکہ یہاں بیشمار ہندو آباد ہیں۔ لاہور میں ہماری دو جاسوس لڑکیوں رادھا اور کرن کو کسی نے قتل نہیں کر دیا تھا؟ .... ایسا کام تو انڈیا میں جاکر پاکستان کے جاسوس بھی کر سکتے ہیں۔"

"کیا اس بنگالی لڑکی کو معلوم ہوگا کہ تم نے راولپنڈی میں جاسوسی کا ایک رِنگ پکڑوایا ہے؟" — اصغر نے پوچھا۔

"اگر اسے معلوم نہیں تو معلوم ہو جائے گا" — شازی نے کہا — "مغربی پاکستان میں بھارتی انٹیلی جنس نے اپنے تمام ایجنٹوں کو اطلاع کر دی ہوگی کہ شازی نام کی لڑکی سے بچ کر رہیں۔ ہو سکتا ہے اُنھوں نے اِدھر بھی اطلاع بھیج دی ہو۔"

"مجھے یہاں کی انٹیلی جنس سے بات کرنی پڑے گی" — اصغر نے کہا — "اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہر وقت خطرے میں رہو گی۔ تمہارے پاس ریوالور ہونا چاہیئے۔"

▼

میجر سمیع الدّین کیپٹن اصغر کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بریگیڈ میجر تھا۔ وہ بنگالی تھا۔ قدوقامت عام بنگالیوں سے اونچا اور مضبوط تھا اور اُس کے گندمی رنگ میں جاذبیّت تھی۔ جسم کا پُھرتیلا اور عقل کا تیز تھا۔ اصغر جب بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں آیا تھا تو میجر سمیع نے اُس کے سلوٹ کا جواب اُٹھ کر اور اصغر سے بغل گیر ہو کر دیا تھا۔ اصغر کے یہاں آنے سے پہلے اُس کی کہانیاں پہنچ گئی تھیں۔ ایک تو اُس کے کمانڈو

ایکشن کی کہانیاں تھیں مقبوضہ کشمیر میں جس کسی نے بھی کامیاب کمانڈو مشن کیے تھے اُسے فوج میں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اصغر اُس سنسنی خیز ڈرامے کا بھی اہم کردار تھا جو شازی نے کھیلا تھا۔ جیسور کے اس بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں یہ خبریں پہلے ہی پہنچ گئی تھیں کہ شازی نے اصغر کی حمایت میں اپنی ماں کو پکڑوا کر اپنا رِنگ توڑ دیا تھا۔ ایک قصّہ یہ بھی یہاں پہنچا تھا کہ شمیم نام کی ایک لڑکی نے اصغر کی محبّت میں اپنے باپ کو پکڑوا دیا تھا — اور یہ بھی کہ اصغر کے باپ نے بھارتی تخریب کاروں سے ایک ریڈار بچایا اور اپنی ٹانگ کٹوالی تھی۔

کیپٹن اصغر جب یہاں آیا تو بریگیڈ کمانڈر تک تمام افسروں نے اُسے گھیر لیا اور اُس سے شمیم اور اُس کے باپ، شازی اور اُس کی ماں اور ان کی گرفتاری وغیرہ کی کہانی سنی تھی۔ ان میں بنگالی میجر سمیع الدّین اصغر پر جیسے فریفتہ ہو گیا تھا۔ اُس کی بیوی اور تین بچّے اُس کے ساتھ رہتے تھے۔ اُس نے اصغر اور شازی کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا تھا۔

میجر سمیع کی بیوی عام سی قسم کی بنگالن تھی۔ رنگ سانولا اور نقش و نگار بالکل عام۔ اُس کے مقابلے میں میجر سمیع وجیہہ اور خوبرو تھا۔ اُس کی بیوی اُردو بول سکتی تھی۔ وہ مغربی پاکستان کی چھاؤنیوں میں رہ چکی تھی لیکن شازی کے سامنے وہ دبی دبی رہی۔ سوائے مسکرانے کے اُس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔

کیپٹن اصغر کو میجر سمیع بہت اچھا لگا اور وہ پہلے روز ہی دوست بن گئے تھے۔ اب شازی نے اصغر کو اس پریشانی میں ڈال دیا کہ اُسے ایک جاسوس لڑکی نے دیکھ لیا ہے تو اصغر نے میجر سمیع سے بات کی۔

"خطرہ ہے بھائی!" — میجر سمیع نے اصغر سے کہا — "مشرقی پاکستان انڈیا کے جاسوسوں سے بھرا پڑا ہے۔ اُن کے لیے یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں .... میں تمہیں اپنی انٹیلی جنس کے میجر انور سے ملوا دوں گا۔ وہ پٹھان ہے۔ اپنے کام میں بہت تیز ہے۔"

میجر سمیع نے اُسی وقت میجر انور کو فون کیا اور اُسے کہا کہ پُوری بات کیپٹن اصغر سے سُن لینا۔

▼

کیپٹن اصغر نے انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں جاکر میجر انور کو پوری بات سنا دی۔ میجر انور دوسرے افسروں کی طرح اصغر اور شازی کی کہانی پہلے بھی سُن چکا تھا۔

"کیپٹن اصغر!" — میجر انور نے اُس کی بات سن کر کہا — "ہم یہاں بہت پریشان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اسلام آباد پر برف پڑی ہُوئی ہے۔ ہم یہاں سے رپورٹیں بھیجتے ہیں اور ایسے مشورے بھی دیتے ہیں کہ پاکستان گورنمنٹ کو اور ہماری ہائی کمان کو کیا کارروائی کرنی چاہیئے لیکن کوئی کارروائی نہیں ہوتی۔ ہم کسی جاسوس کو پکڑتے ہیں تو اُسے جیل میں بند کر دیا جاتا ہے اور یہ معاملہ سِول کورٹ کے حوالے کر دیا جاتا ہے، پھر ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہُوا ہے۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ مشرقی پاکستان بھارتی جاسُوسوں سے بھرا پڑا ہے؟" — کیپٹن اصغر نے پوچھا — "اور یہ کہاں تک صحیح ہے کہ یہاں ہندوؤں کی آبادی خطرناک حد تک زیادہ ہے؟"

"تم شاید تسلیم نہ کرو کیپٹن اصغر"— میجر انور نے کہا— "کہ یہاں ہندوؤں کی آبادی صرف زیادہ ہی نہیں بلکہ جدھر دیکھو ہندو چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یونیورسٹی میں، سکولوں اور کالجوں میں، صنعت اور تجارت میں، سوشل ویلفیئر کے اداروں میں، ساہوکارہ کے کاروبار میں، غرض پورا مشرقی پاکستان ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اور اُن کی گرفت مضبوط ہوتی جارہی ہے۔ سمگلنگ بھی ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔"

"سر!— کیپٹن اصغر نے کہا— "یہ تو اچھا ہے کہ یہ کالا کاروبار ہندو ہی کرتے ہیں۔"

"تم نہیں سمجھتے"— میجر انور نے کہا— "سمگلنگ سے ایک تو جاسوسوں کو تقویت ملتی ہے دوسرا بڑا نقصان مشرقی پاکستان کی معیشت کو ہو رہا ہے۔ مثلاً یہاں سے وہ چیزیں انڈیا کو جارہی ہیں جو نہیں جانی چاہئیں اور وہ چیزیں آرہی ہیں جو نہیں آنی چاہئیں۔ ان سمگلروں کے خلاف ایک بار وسیع پیمانے پر ملٹری ایکشن ہو چکا ہے لیکن سمگلنگ جاری ہے۔ ہمیں مصدقہ رپورٹیں ملی ہیں کہ انڈین آرمی کے تربیت یافتہ کمانڈو اور گوریلے مشرقی پاکستان میں بنگالی مسلمانوں کے بہروپ میں آتے چلے جارہے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا سر!— کیپٹن اصغر نے کہا— "کہ انڈیا والے ہم سے زیادہ تیز ہیں۔"

"نہیں کیپٹن اصغر!— میجر انور نے کہا— "یہ بات نہیں ہے۔ دراصل ہماری پالیسی بہت کمزور ہو گئی ہے یا پالیسی پر عمل کرنے والے کوتاہی پر اُتر آتے ہیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں انڈیا کی کمانڈو فورس کہاں تھی؟"

کیپٹن اصغر انٹیلی جنس کے اس میجر کے پاس اپنا مسئلہ لے کر گیا تھا لیکن اس میجر نے جب مشرقی پاکستان کی زیرِ زمین صورتِ حال سنائی تو اصغر اپنا مسئلہ بھول گیا۔ اُسے اپنے کمانڈو مشن یاد آنے لگے۔ انڈین آرمی کی پوری پوری بٹالین اُس کے دس آدمیوں کو نہیں پکڑ سکی تھی اور وہ ٹارگیٹ تباہ کر کے واپس آگیا تھا۔ اب اُسی دشمن کے کمانڈو اُس کے ملک میں ایسے طریقے سے داخل ہو رہے تھے کہ وہ انہیں روک نہیں سکتا تھا۔

"سر!— اُس نے میجر انور سے کہا— "ہماری حکومت آخر سوچ کیا رہی ہے؟"

"وہ اپنی کرسی کے دفاع کو اور زیادہ مضبوط کرنے کی سکیمیں سوچ رہی ہے"— میجر انور نے کہا— "اس وقت ملک کا صدر فوجی ہے لیکن اُس کی سوچ فوجی نہیں، سیاسی ہو گئی ہے، اور تم جانتے ہو کہ ہمارے ملک میں پاور پالیٹکس چلتی ہے جسے اچھی قسم کی اُردو بولنے والے اقتدار کی سیاست کہتے ہیں۔"

"میں تو یہ سمجھا ہوں سر!"— کیپٹن اصغر نے کہا— "کہ فوجی جب سیاست کے میدان میں اُتر آتا ہے تو وہ نہ فوجی رہتا ہے نہ سیاست دان بن سکتا ہے.... لیکن سر! یہ تو ملک کی سیاست ہے۔ میرے مسئلے کا حل کیا ہوگا؟"

"تمہارا مسئلہ ملک کے مسئلے کے ساتھ وابستہ ہے"— میجر انور نے کہا— "اسی لیے میں تمہیں یہ ساری بیک گراؤنڈ بتا رہا ہوں تاکہ تم بھی اپنے مسئلے کو اس بیک گراؤنڈ میں دیکھو۔ اگر غور کرو تو

محسوس کرو گے کہ انڈیا کے ان ایجنٹوں اور تخریب کاروں کو بالواسطہ ہماری اپنی حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے.... اقتدار کی سیاست میں کسی پارٹی کو دشمن قوم کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنا پڑے تو وہ پارٹی اس سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ ہمیں ایسی رپورٹیں بھی ملی ہیں کہ یہاں کے ایک دو لیڈر یا ایک لیڈر کے زیر اثر جو لیڈر ہیں، وہ انڈیا کے ساتھ ساز باز کر رہے ہیں.... بہرحال یہ سیاسی معاملے ہیں۔ تمہاری پریشانی کا حل یہ ہے کہ میں اپنے بریگیڈیئر سے بات کروں گا۔ ایک مشورہ تو اسے دوں گا کہ تمہیں ایک اردلی اور دے دیا جائے جس کے پاس ریوالور یا سٹین گن ہو۔ وہ بظاہر سویلین لباس میں اردلی ہوگا لیکن وہ درحقیقت تمہارا اور تمہاری بیوی کا محافظ ہوگا۔ تمہارے کوارٹر کے آگے پیچھے سنتری کھڑے کرنا تو اچھا نہیں لگتا۔ باقی احتیاط تم خود سوچ سکتے ہو.... کیپٹن اصغر!"— میجر انور نے ذرا دبے ہوئے لہجے میں کہا— "اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک مشورہ دوں۔ کیا تم اپنی مسز کو کاؤنٹر انٹیلی جنس کے لیے استعمال کرنا پسند کرو گے؟"

"میرا خیال ہے وہ نہیں مانے گی"— کیپٹن اصغر نے جواب دیا— "وہ تو جاسوسی کے نام سے بھی بدک جاتی ہے۔"

"یہ میری اپنی سوچ تھی"— میجر انور نے کہا— "سرکاری طور پر ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے ذاتی جذبے کے تحت یہ بات کہہ دی ہے۔"

"اگر بات ذاتی جذبے کی ہو"— کیپٹن اصغر نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا— "تو ایسٹ پاکستان میں ایک بھی ہندو نظر نہ آتے۔ ہم فوجی وہ تلوار ہیں جس کا دستہ کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اس تلوار کو نیام سے نکال لیتا ہے اور جب چاہتا ہے نیام میں ڈال لیتا ہے۔"

"کیپٹن اصغر!— میجر انور نے لمبی سانس لے کر کہا— "اگر تم مشرقی پاکستان کی اندرونی حالت کے متعلق انٹیلی جنس رپورٹیں پڑھو اور اپنی حکومت کا برف جیسا ردِعمل دیکھو تو تمہیں وہ دن نظر آجاتے گا جب اس سرزمین پر یہ تلوار نیام سمیت ہمارے دشمن کے ہاتھ میں ہوگی۔ اگر ہماری حکومت نے بہت تیزی سے حرکت نہ کی تو ہمیں وہ دن دیکھنا ہی پڑے گا۔"

میجر انور نے کیپٹن اصغر کو دو چار ہدایات دیں اور کچھ احتیاطی تدابیر بتائیں۔

▼

دو دنوں بعد اصغر کو ایک اور اردلی مل گیا۔ اس کے پاس سٹین گن تھی جسے وہ ہر وقت ہاتھ میں نہیں بلکہ ایسی جگہ رکھتا تھا جہاں تک وہ ضرورت کے وقت ایک منٹ میں پہنچ سکے۔ وہ پنجابی تھا۔ اس کے علاوہ اصغر کو اجازت مل گئی کہ وہ ایک ریوالور اپنے گھر رکھ لے۔ اُس نے ریوالور میں چھ گولیاں ڈال کر گھر میں رکھ لیا۔

جیسور میں ایک ہندو تاجر کا مکان تھا وہ یہیں کا رہنے والا تھا۔ اُسے یہاں کے معاشرتی تجارتی اور سیاسی حلقوں میں قابلِ احترام مقام حاصل تھا۔ اُس کا مکان اُس کی امارت کا مظہر تھا۔ رات کو اُس کے ایک کمرے میں دو آدمی اور دو عورتیں بیٹھی ہوتی تھیں۔ ان میں ایک وہ بنگالی لڑکی تھی جس نے شازی کو دیکھا تھا۔ اُس کا نام کرشنا کماری تھا اور اُسے کرشی کہتے تھے جس شام کرشی نے شازی کو دیکھا تھا، یہ اُسی رات کا واقعہ ہے۔ اس ہندو کا مکان بھارتی انٹیلی جنس کا ایک خفیہ اڈہ تھا اور اُس

بات کو ان لوگوں کی میٹنگ تھی۔

کرشنی بتا چکی تھی کہ اُس نے ایک مسلمان لڑکی دیکھی ہے جس نے اُس کے ساتھ ٹریننگ کی تھی۔ اُسے شاید پنجاب میں بھیجا گیا تھا۔ یہ چھ سال پہلے کی بات تھی۔ کرشنی کو اس کا نام یاد نہیں رہا تھا کیونکہ وہ زیادہ عرصہ اکٹھی نہیں رہ سکی تھیں۔

"وہ کوئی اور بھی ہو سکتی ہے"۔۔۔ کرشنی کے ایک ساتھی نے کہا تھا۔

"وہ کوئی اور نہیں"۔۔۔ کرشنی نے کہا تھا۔۔۔ "یہ مجھے یقین ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ گھبرائی بھی اتنی کہ چلتے چلتے پیچھے کو مڑی اور ایک فوجی بنگلے میں چلی گئی۔ وہ کسی فوجی افسر کا بنگلہ ہے۔"

"اگر وہ کرشنی کو دیکھ کر گھبرا نہ جاتی تو ہمیں شک نہ ہوتا"۔۔۔ اُس ادھیڑ عمر آدمی نے کہا جو اُس وقت کرشنی کے ساتھ تھا جب اُس نے شازی کو دیکھا تھا۔۔۔ "اپنی سیکرٹ سروس کے کسی آدمی یا عورت کی مشرقی پاکستان میں موجودگی کوئی عجوبہ نہیں۔ مشرقی پاکستان پر ہمارا راج ہے۔ ہم اس لڑکی کے متعلق پریشان نہیں۔ شک اس لیے ہوا ہے کہ وہ کرشنی کو دیکھ کر گھبرا گئی بلکہ بھاگ گئی تھی۔ اس کے متعلق اگر شک رفع کر لیا جائے تو اچھا ہے۔"

"تمہیں تو اُس کا نام بھی معلوم نہیں"۔۔۔ کسی نے کہا۔

"وہ میں معلوم کر سکتی ہوں"۔۔۔ کرشنی نے کہا۔۔۔ "اگر اسے کسی خاص مشن پر بھیجا گیا ہے تو وہ الگ بات ہے۔ میں اُدھر جاؤں گی جہاں میں نے اُسے دیکھا تھا۔"

٧

میجر سمیع الدین اور اصغر کی دوستی بہت گہری ہو گئی تھی۔ میجر سمیع دوسری تیسری شام اصغر کے بنگلے میں جاتا اور کچھ وقت وہاں گزارتا تھا۔ شازی کا تو وہ بہت احترام کرتا تھا۔ وہ زندہ دل اور خوش مزاج آدمی تھا۔

"ہم آپ کے ہاں آئیں گے"۔۔۔ ایک روز شازی نے اُسے کہا۔

"میرے ہاں آ کر کیا کرو گے!"۔۔۔ میجر سمیع نے مایوسی کے لہجے میں کہا۔۔۔ "اپنے ہاں تو میں خود جانے سے گھبراتا ہوں۔"

اصغر اور شازی نے حیران سا ہو کے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ دراصل چونک پڑے تھے۔ میجر سمیع چپ ہو گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر اُداس سی مسکراہٹ آ گئی۔

"ہماری بھابی لڑائی جھگڑا کرتی ہے؟"۔۔۔ شازی نے پوچھا۔

"اگر لڑائی جھگڑا کرے تو شاید میں خوش رہوں"۔۔۔ میجر سمیع نے کہا۔۔۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ اس میں اتنی جان پڑے کہ اُس کا دماغ تیز ہو اور اُس کا جسم حرکت کرے۔ بچے پیدا کرنے کے سوا اُس میں کوئی خوبی نہیں۔ وہ تو چلتی پھرتی لاش ہے۔ میں نے اُسے کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یوں سمجھو کہ میرے گھر میں ماتم کی فضا بنی رہتی ہے۔ میں فوجی ہوں۔ دن بھر ہنسی خوشی کام کرتا ہوں مگر گھر میں داخل ہوتے ہی میں تھکا ہارا مزدور بن جاتا ہوں جس کی ایک ہی ضرورت ہے کہ چارپائی ملے تو اُس پر گر پڑے اور سو جائے۔"

"آپ بھابی کو باہر نکالا کریں"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے کہا۔

"وہ اُس وقت بھی باہر نہیں نکلتی تھی جب ہمارا ایک بھی بچہ نہیں تھا۔ اب تو چار بچے ہیں"۔۔۔ میجر سمیع نے کہا۔۔۔ "وہ خوش رہنا جانتی ہی نہیں۔ مجھے کیا خوش رکھے گی۔ تم دونوں نے اُسے دیکھا ہے۔ کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ وہ ناراض لگتی تھی؟ وہ پسند نہیں کرتی کہ گھر میں کوئی آئے۔"

میجر سمیع الدین ہنسنے کھیلنے والا آدمی تھا۔ ہنسی مذاق پسند کرتا تھا لیکن اُس نے اپنے گھر کی بات شروع کی تو معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کا سینہ دکھوں سے بھرا پڑا ہے۔ اصغر اور شازی کو افسوس ہو رہا تھا۔

"اب کیا ہو سکتا ہے!"۔۔۔ اصغر نے کہا۔

"دوسری شادی"۔۔۔ میجر سمیع نے کہا۔

اصغر اور شازی نے یوں چونک کر اُسے دیکھا جیسے اچانک بیدار ہو گئے ہوں۔

"یہ تو زیادتی ہو گی بھائی جان!"۔۔۔ شازی نے کہا۔

"میں اُسے کہہ چکا ہوں کہ اُس نے اپنے آپ کو نہ بدلا تو مجھے کوئی اور راستہ سوچنا پڑے گا"۔۔۔ میجر سمیع نے کہا۔۔۔ "لیکن اُس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ذرا غور کرو۔ اگر میں مزدور، کسان یا دکاندار ہوتا تو میں دل پر پتھر رکھ کر اپنے آپ کو سمجھا لیتا کہ میری قسمت میں یہی لکھا تھا.... مجھے آگے بڑھنا ہے۔ میں لیفٹیننٹ کرنل بنوں گا۔ مجھے بریگیڈیئر بننا ہے.... تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں بڑے سے بڑا افسر بننا چاہتا ہوں اور میری بیوی میرے عہدے کے مطابق ہونی چاہیے۔ نہیں، میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔ مجھے ملٹری لیڈر بننا ہے۔ مجھے اپنے ملک کے لیے لڑائیاں لڑنی ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ فوجی تعلیم و تربیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہی عورت میری بیوی رہی تو میرا دماغ مر جائے گا۔ میری صلاحیتیں مر جائیں گی.... میری بیوی ایک دلدل ہے اور میں اس میں دھنس گیا ہوں۔ میں ترقی کے راستے پر چل ہی نہیں سکتا۔"

"کیا آپ نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے؟"۔۔۔ شازی نے پوچھا۔

"کر لیا ہے"۔۔۔ میجر سمیع نے جواب دیا۔۔۔ "بلکہ زندگی کی ایک ساتھی مل بھی گئی ہے۔ تم اُسے دیکھو گے تو کہو گے ہاں سمیع! تمہاری بیوی یہی ہونی چاہیے۔"

"آپ کے رشتہ داروں میں سے ہے؟"

"نہیں"۔۔۔ میجر سمیع نے جواب دیا۔۔۔ "یہ محبت کا رشتہ ہے۔ وہ مجھے اُس سے کہیں زیادہ چاہتی ہے جتنا میں اُسے چاہتا ہوں۔ وہ خوبصورت ہے شازی بھابی! اور تمہاری طرح شوخ اور زندہ مزاج ہے۔"

"آپ اُسے ملتے رہتے ہوں گے!"

"میں اُسے تم سے بھی ملواؤں گا"۔۔۔ میجر سمیع نے کہا۔۔۔ "تین چار مرتبہ آفیسرز میس میں بھی آ چکی ہے، بلکہ میں چاہوں گا کہ تم دونوں اُسے ملو اور مجھے بتاؤ کہ وہ کیسی ہے.... میں اُسے میس میں مدعو کر دوں گا۔"

"ہم اُسے اور آپ کو اپنے گھر میں مدعو کر لیتے ہیں"۔۔۔ اصغر نے کہا۔

"مَیس میں ٹھیک رہے گا"۔۔۔ میجر سمیع نے کہا۔۔۔ "دوسرے افسروں کی بیویاں بھی ہوں گی"۔

میجر سمیع چلا گیا تو اصغر اور شازی سے مِلنے انٹیلی جنس کا میجر انور آگیا۔ اُس نے شازی سے پوچھا کہ وہ بنگالن اُسے پھر نظر آئی ہے یا نہیں۔

"نہیں"۔۔۔ شازی نے کہا۔۔۔ "میں کہیں باہر گئی ہی نہیں"۔

"کیپٹن اصغر اور بھابی جان!"۔۔۔ میجر انور نے کہا۔۔۔ "میجر سمیع الدّین آپ کا شاید گہرا دوست بن گیا ہے۔ ابھی ابھی وہ یہاں سے گیا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کے ساتھ اُس کی بے تکلفی پیدا ہو چکی ہے۔ اُس کے خلاف میرے پاس کوئی شہادت اور ثبوت موجود نہیں۔ میں تم دونوں کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ میجر سمیع کو دو ہاتھ دُور رکھنے کی کوشش کرو"۔

"کیوں؟"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے پوچھا۔۔۔ "اچھے کردار کا آدمی نہیں؟"

"یہ بھی کسی حد تک ٹھیک ہے"۔۔۔ میجر انور نے کہا۔۔۔ "چار بچّوں کا باپ ہو کر ایک لڑکی کو ساتھ لیے لیے پھرتا ہے لیکن میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔ کسی بھی بنگالی افسر پر بھروسہ نہ کرنا۔ بنگالی افسروں پر ہندوؤں کا جادو چل گیا ہے۔ وہ اب پاکستان سے آزاد ہونے کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی وفاداری مشکوک ہوتی جا رہی ہے"۔۔۔ میجر انور جانے کے لیے اٹھا اور بولا۔۔۔ "بھابی! آپ گھبرائیں نہیں۔ ہم آپ کی حفاظت کے لیے کچھ اور انتظام بھی کر رہے ہیں"۔

میجر انور کے جانے کے بعد اصغر اور شازی میجر سمیع الدّین کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ اُسے وہ بُرا آدمی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنی بیوی کو دھتکار رہا ہے۔

۷

دوسرے ہی دن میجر سمیع نے کیپٹن اصغر سے کہا کہ وہ اور شازی شام کا کھانا اُس کے ساتھ آفیسرز مَیس میں کھائیں۔

شام گہری ہو جانے کے بعد آفیسرز مَیس میں بہت رونق تھی۔ دو تین آفیسر اپنی بیویوں کو ساتھ لائے تھے۔ اصغر شازی کے ساتھ مَیس میں پہنچا تو میجر سمیع نے اُن کا استقبال کیا۔ وہ اُس لڑکی کو ساتھ لایا تھا جس کے ساتھ وہ شادی کر رہا تھا۔ وہ کہیں اور بیٹھی ہوئی تھی۔ میجر سمیع انہیں وہاں لے گیا۔ صوفے پر بیٹھی ہوئی ایک بڑی ہی خوبصورت بنگالی لڑکی اٹھی۔

"ان سے مِلو صفیہ!"۔۔۔ میجر سمیع نے بنگالی لڑکی سے کہا۔۔۔ "یہ ہے کیپٹن اصغر اور یہ اس کی بیوی شازی ہے"۔

شازی صفیہ کو دیکھ کر چکرا گئی اور اُس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔۔۔ وہ صفیہ نہیں کرشنا کماری تھی جسے کرشی کہتے تھے لیکن میجر سمیع کے لیے وہ صفیہ تھی۔ کرشی نے گرمجوشی سے شازی سے ہاتھ ملایا لیکن شازی کا ہاتھ برف کی مانند یخ تھا۔ ایک ہی بار شازی کے ذہن میں بے شمار خیال آ گئے۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"تم دونوں بیٹھ کر گپ شپ لگاؤ"۔۔۔ میجر سمیع نے کرشی اور شازی سے کہا۔۔۔ "ہم آتے ہیں"۔

"ہم شاید چھ سال بعد ملی ہیں"۔۔۔ کرشی نے کہا اور پوچھا۔۔۔ "اتنا عرصہ کہاں رہیں؟"

"میں انڈیا سے آ رہی ہوں"۔۔۔ شازی نے جواب دیا۔۔۔ "مغربی پاکستان گئی تھی لیکن وہاں سے مجھے جلدی واپس بلا لیا گیا تھا"۔

مَیس میں خاصا شور شرابہ تھا۔ ریڈیو بھی چل رہا تھا۔ کرشی اور شازی اتنی دھیمی آواز میں باتیں کر رہی تھیں جو شور میں دبتی جا رہی تھی۔ شازی اسی میدان کی لڑکی تھی۔ اُس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا اور فیصلہ کر لیا کہ اس ہندو لڑکی کو راز دے گی نہیں بلکہ اُس سے راز لے گی۔ یہ عقل کی لڑائی تھی۔

"یہاں کس طرح آئی ہو؟"۔۔۔ کرشی نے پوچھا اور سرگوشی میں بولی۔۔۔ "مجھے صفیہ کہنا۔ میں تمھارا نام بھول گئی تھی۔۔۔۔ شازی۔۔۔۔ ہاں، شازی۔۔۔ سمیع نے تمھارا نام لیا تو یاد آگیا"۔

"میں کیپٹن اصغر کی بیوی بن کر آئی ہوں"۔۔۔ شازی نے کہا۔۔۔ "مجھے بڑا ہی مشکل کام دیا گیا ہے۔ کام نہ پوچھنا۔۔۔ میجر سمیع تو تمہیں اپنی محبوبہ سمجھ رہا ہے اور شادی کے خواب دیکھ رہا ہے۔۔۔۔۔ کچھ حاصل ہوا؟"

"بہت کچھ"۔۔۔ کرشی نے کہا۔۔۔ "سمیع بریگیڈ میجر ہے۔ بڑے کام کی آسامی ہے۔۔۔۔ تم اُس روز مجھے دیکھ کر بھاگ کیوں اٹھی تھیں؟"

"تمھارے ساتھ ایک آدمی تھا"۔۔۔ شازی نے کہا۔۔۔ "میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کس قدر احتیاط کرنی ہے۔ تم تو اپنے رنگ کے ساتھ ہو۔ میں اکیلی ہوں۔ میری کوئی پناہ نہیں"۔

"لیکن کسی نہ کسی کے ساتھ تو تمھارا رابطہ ہوگا"۔۔۔ کرشی نے کہا۔

"وہ سیاسی لیڈر ہے"۔۔۔ شازی نے کہا۔۔۔ "اُس کا نام نہ پوچھنا"۔

میجر سمیع اور کیپٹن اصغر آ گئے۔ کرشی اور شازی ہنسی مذاق کے موڈ میں آگئیں۔ اِسی موڈ میں اُنہوں نے کھانا کھایا اور چاروں مَیس سے نکل گئے۔

۷

"اصغر!"۔۔۔ شازی نے گھر جا کر کہا۔۔۔ "میں تمہیں ایسی بات بتانے لگی ہوں جو سُن کر تم چکرا جاؤ گے۔۔۔۔ میجر سمیع کی بنگالن دوست مسلمان نہیں ہندو ہے۔ اِس کا نام صفیہ نہیں کرشنا کماری ہے اور یہ وہی لڑکی ہے جسے میں نے دیکھا تھا"۔

اصغر پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے شازی کو دیکھنے لگا۔

"میں جانتی تھی تم اسی طرح حیران ہو گے"۔۔۔ شازی نے کہا۔۔۔ "لیکن میرے لیے یہ کوئی عجوبہ نہیں۔ ایسی ملاقاتیں کبھی کبھی ہو جاتی ہیں۔ ایک بار دلّی میں میری امّی کے سامنے پاکستان کا ایک جاسوس آگیا تھا۔ میری امّی اُسے اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کی جانتی تھی۔ میری امّی اُسے ایک ہوٹل میں لے گئی تھی۔ اِس پاکستانی نے اُس کے ساتھ ایسی باتیں کی تھیں جن سے اُسے شک ہو گیا تھا کہ وہ پاکستان کا جاسوس ہے۔ امّی اُسے پکڑوانا چاہتی تھی لیکن وہ زیادہ چالاک اور تیز نکلا۔ وہ باتھ رُوم میں جانے کے بہانے اٹھا اور امّی ہوٹل کے ٹیلیفون سے اپنے چیف کو اطلاع دینے چلی گئی مگر اُسے وہ پاکستانی پھر کہیں نظر نہ آیا"۔

اصغر کے ذہن میں ایک ہی بار اتنے خیال آ گئے کہ وہ پریشان ہو گیا۔ اُس کی زبان اور دماغ کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

"گھبراؤ نہیں"۔۔۔ شازی نے کہا۔۔۔ "یہ میری فیلڈ ہے۔ میرا دماغ حاضر ہے۔ میں نے اُسے بتایا ہے کہ میں ایک ایسے خفیہ مشن پر ہوں جو یہاں کے جاسوسوں کو بھی نہیں بتایا جا سکتا۔ میں نے اُسے بتایا ہے کہ اس مشن کے لیے میں نے تمہارے ساتھ شادی کی ہے۔ جب مشن مکمل ہو جائے گا تو میں تمہیں چھوڑ کر کھسک جاؤں گی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ہندو بنگالن میجر سمیع الدّین کو دھوکہ دے رہی ہے"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے کہا۔

"بالکل دھوکہ"۔۔۔ شازی نے کہا۔۔۔ "اُس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ میجر سمیع سے بہت کچھ حاصل کر چکی ہے اور جو کچھ رہ گیا ہے وہ بھی حاصل کر لے گی۔"

"اسے میں فوراً پکڑوا دوں گا"۔۔۔ اصغر نے کہا۔

"نہیں"۔۔۔ شازی نے کہا۔۔۔ "ایسے نہیں ہوتا۔ ایک جاسوس کو نہیں پکڑا جاتا۔ اُسے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اُس کے راز کا کسی کو علم نہیں پھر خفیہ طریقوں سے اُس کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ اس طرح اُس کے رنگ کے کئی افراد نظر آجاتے ہیں پھر ان سب کو پکڑ لیا جاتا ہے لیکن یہ کامیابی اتنی سہل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے اُستادوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جاسوس اتنے کچے نہیں ہوتے۔"

"پہلے تو میں میجر سمیع کو خبردار کر دوں۔"

"یہ بھی نہیں"۔۔۔ شازی نے کہا۔۔۔ "پہلے میجر انور کے ساتھ بات کریں گے۔ تمہیں یاد نہیں میجر انور نے کیا کہا تھا؟.... اُس نے کہا تھا کہ پاک آرمی کے بنگالی افسروں پر ہندو کا جادو چل گیا ہے اور وہ اب پاکستان سے آزاد ہونے کی باتیں کرتے ہیں۔ میجر انور نے میجر سمیع کے متعلق ہمیں خاص طور پر خبردار کیا تھا۔"

"تم کیا یہ کہنا چاہتی ہو کہ میجر سمیع کو معلوم ہے کہ یہ لڑکی ہندو ہے اور جاسوس ہے؟"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے پوچھا۔

"صرف یہ نہیں"۔۔۔ شازی نے کہا۔۔۔ "بلکہ سمیع اس لڑکی کے رنگ کا باقاعدہ ایجنٹ ہو گا۔ بیشک مجھے کرشنی نے یہ بتایا ہے کہ وہ میجر سمیع کو دھوکے میں رکھے ہوئے ہے لیکن مجھے شک ہے.... بہتر ہے تم میجر انور سے بات کرو۔ میں اپنے طور پر اس لڑکی کے ساتھ رابطہ قائم رکھوں گی اور کہیں اور کا سراغ مل گیا تو میں اس رنگ کو توڑنے کی پوری کوشش کروں گی۔"

کیپٹن اصغر نے مقبوضہ کشمیر میں جا کر جس دلیری سے کمانڈو مشن پورے کیے تھے وہ جذبۂ حب الوطنی اور فرض شناسی کے بے مثال کارنامے تھے۔ اس نے اپنی عسکری ذہانت کا کمال دکھایا تھا لیکن جاسوسی کے میدان میں جب شازی اس کی ہر بات کو رد کر کے اپنی رائے دیتی تھی تو اُس کے سامنے اصغر طفلِ مکتب لگتا تھا۔ شازی جاسوسی کے نام سے بھی بدکنے لگی تھی لیکن جب دشمن کی ایک جاسوس لڑکی اس کے سامنے آئی تو شازی کا وہ جذبہ بیدار ہو گیا جس نے اُس کے ہاتھوں اُس کی ماں کو گرفتار کرا دیا تھا۔

"اصغر!"۔۔۔ شازی نے اصغر کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔۔۔ "میں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے وطن کی مٹی پر دشمن کے کسی جاسوس کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ میں یہ زیرِ زمین جنگ لڑوں گی۔"

اصغر نے دیکھا کہ شازی کے چہرے پر سُرخی آ گئی تھی جو جذبات کی تپش کا پتہ دیتی تھی۔ اُس کے سینے میں اسلام کی بیٹی جاگ اٹھی تھی۔

"میجر انور کو گھر بلالو"۔۔۔ شازی نے کہا۔۔۔ "میں اُس کے ساتھ بات کروں گی۔ میجر سمیع کو ہم یہ تاثر دیئے رکھیں گے کہ تمہاری محبوبہ ہر لحاظ سے تمہارے قابل ہے۔"

▼

میجر انور شام کے وقت اصغر کے ہاں آیا۔ اصغر نے اُسے فون کیا تھا کہ وہ کھانا اُس کے ساتھ کھائے۔ کھانے کے دوران شازی نے اُسے کرشنا کماری کے متعلق تمام تر تفصیلات بتائیں۔ میجر انور نے پورے انہماک سے سنیں۔

"سر! مجھے ایک بات بتائیں"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے میجر انور سے کہا۔۔۔ "کیا یہ ممکن ہے میجر سمیع انڈیا کا ایجنٹ ہو؟"

"میں نے تمہیں کیا بتایا تھا!"۔۔۔ میجر انور نے کہا۔۔۔ "میں نے تمہیں میجر سمیع سے خبردار کیا تھا۔ ثبوت کے بغیر تو میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ میجر سمیع کو اس بنگالن کی اصلیت کا پتہ ہے یا نہیں یا سمیع دشمن کا ایجنٹ ہے۔ یہ تو سراغرسانی کا معاملہ ہے۔ ہم اپنا کام کریں گے لیکن میں تمہیں ایک بار پھر بتا دوں کہ کسی بنگالی افسر پر بھروسہ نہ کرنا۔ البتہ ظاہر داری کے تعلقات ضرور رکھنا۔ اب تمہیں احتیاط یہ کرنی ہے کہ میجر سمیع کو پتہ نہ چلنے دینا کہ تمہیں اُس کی دوست کی اصلیت معلوم ہو گئی ہے۔"

میجر انور انہیں اس سلسلے میں کچھ اور باتیں بتا کر چلا گیا۔

دوسرے دن کیپٹن اصغر نے میجر سمیع کو روزمرّہ کی طرح سیلوٹ کیا اور اسی طرح خیر خیریت پوچھی جیسے ہر روز پوچھا کرتا تھا اور اُس سے یہ بھی پوچھا کہ صفیہ کیسی ہے۔

"ارے بھائی!"۔۔۔ میجر سمیع نے کہا۔۔۔ "میری بھابی نے بتایا نہیں کہ اُسے صفیہ پسند آئی ہے یا نہیں؟"

"سر!"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے شگفتہ سے لہجے میں جواب دیا۔۔۔ "شازی تو صفیہ کی تعریفیں کرتی رہتی ہے۔ کہتی ہے کہ میرا بھائی اسی لڑکی کے ساتھ اچھا لگے گا۔"

اُس روز اصغر میجر سمیع کو اس طرح دیکھتا رہا جیسے وہ کوئی عجیب و غریب چیز ہو یا جیسے وہ اچھے بھلے انسان سے کسی پُراسرار مخلوق کے روپ میں آ گیا ہو۔ اصغر کے ذہن میں ایک سوال کلبلاتا رہا تھا۔۔۔ "انسان اپنے ایمان سے کس طرح دست بردار ہو جاتا ہے؟"۔۔۔ اُسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس روز دفتر میں وہ مشین کی طرح کام کرتا رہا۔ ذہن اُس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

میجر سمیع روزمرّہ کی طرح تین چار مرتبہ اصغر کے پاس گیا اور مختصر سی گپ شپ کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ روزمرّہ کی طرح میجر سمیع نے اصغر کو اپنے دفتر میں چائے کی پیالی کے لیے

بلا لیا۔ اصغر مشینی آدمی کی طرح اُس کے پاس جا بیٹھا۔ چائے کے دوران اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میجر سمیع کی نظریں جب اصغر سے ہٹ کر کسی اور طرف ہو جاتی تھیں تو اصغر اُس کے چہرے پر نظریں گاڑ لیتا تھا۔ اصغر کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میجر سمیع انڈیا کا ایجنٹ ہے۔ اُس کے دِل میں میجر سمیع کی ہمدردی جاگ اٹھی کہ اتنا اچھا آدمی ایک ہندو لڑکی کے فریب میں آیا ہُوا ہے۔

"سر!" — اصغر نے اس طرح کہا جیسے اُس کے مُنہ سے اچانک نِکل گیا ہو۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ سمیع بھائی، تم انڈیا کی ایک جاسوس کے جال میں پھنس گئے ہو لیکن اُس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ہاں، بولو بولو" — میجر سمیع نے زندہ دلانہ لہجے میں اصغر سے کہا — "تم کیا کہنے لگے تھے؟"

"ہاں سر!" — اصغر نے اصل بات حلق سے نیچے اُتار کر کہا — "سُنا ہے ایسٹ پاکستان انڈین انٹیلی جنس کی گرفت میں آیا ہُوا ہے"۔

"تم نے ٹھیک سنا ہے" — میجر سمیع نے جواب دیا — "ایسٹ پاکستان کے لوگ انڈیا کا اثر زیادہ قبول کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بھوک کے ننگے لوگ ہیں۔ انہیں اُس حد تک پہنچایا جا چکا ہے جہاں وطن کے جذبے مر جاتے ہیں اور انسان حیوان بن جاتے ہیں۔ اگر ہمارا ملک انڈین انٹیلی جنس کی گرفت میں آ گیا ہے تو اس میں بنگالیوں کا کوئی قصور نہیں۔ اس کے ذمّہ دار مغربی پاکستان کے لیڈر ہیں..... کیا تم نے کبھی سُنا ہے کہ پاکستان کا پریذیڈنٹ ایسٹ پاکستان میں کبھی آیا ہے؟..... تم کہو گے کہ کئی بار آیا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ جس طرح وہ آتا ہے، اس سے نہ آتے تو زیادہ اچھا ہے۔ ایسٹ پاکستان صرف ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں نہیں۔ اصل ایسٹ پاکستان وہ ہے جہاں انسان بھوک سے مرتے ہیں اور جہاں انسان سیلابوں میں مرتے ہیں اور جہاں کے انسانوں کو سمندری طوفان اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان پاکستانیوں نے اپنے ملک کے صدر کو کبھی نہیں دیکھا۔ یہاں کے لوگ پاکستان کے صدر کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسے غلامی کے دَور میں ہمارے لیے برطانیہ کا شہنشاہ ہُوا کرتا تھا"۔

"تو کیا اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے دشمن کے جاسوسوں کو اپنے ملک میں بلا لیا جائے؟" — اصغر نے کہا — "دشمن آخر دشمن ہے"۔

"تم ابھی بہت چھوٹے ہو اصغر!" — میجر سمیع نے کہا — "کسی بھی ملک کے سب سے بڑے دشمن اُس کے بھُوکے ننگے عوام ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے پاکستان بنایا تھا، وہ مرتے ہیں تو انہیں کفن بھی نصیب نہیں ہوتا لیکن جب کوئی افسر مرتا ہے، خواہ وہ اپنے دشمن کا ایجنٹ ہی کیوں نہ ہو اُس کے تابوت پر پاکستان کا جھنڈا ڈالا جاتا ہے"۔

میجر سمیع نے کچھ ایسی باتیں کہہ دیں جن سے اصغر کو یقین ہو گیا کہ میجر سمیع انڈیا کا ایجنٹ ہے اور اُس نے ایک ہندو لڑکی کو اپنی منگیتر بنا کر اپنے ساتھ چپکا رکھا ہے۔ اُس روز کے بعد اصغر نے میجر سمیع کے ساتھ ظاہر داری کے تعلقات رہنے دیے۔

۷

دو روز بعد اصغر شام کے وقت ویسے ہی آفیسرز میس میں چلا گیا۔ میجر سمیع پہلے ہی وہاں موجود

تھا۔ اصغر کو دیکھ کر وہ اُس کے پاس دوڑا آیا۔ وہ تو اصغر کو دیکھ کر پہلے کی طرح بہت خوش ہُوا لیکن اصغر کے چہرے پر جو مسکراہٹ آئی اُس میں نفرت سی چھُپی ہوئی تھی۔ اس شخص سے اُسے گھن آنے لگی تھی۔ پھر اصغر نے ظاہر داری کا اچھا مظاہرہ کیا۔

"سر!" — اصغر نے کہا — "ہماری ہونے والی بھابی آ رہی ہے؟"

"نہیں بھائی!" — میجر سمیع نے کہا "میں اُس کے پاس جا رہا ہوں..... آؤ بیٹھو بھائی، گپ شپ لگاؤ"۔

وہ الگ ہو کر بیٹھ گئے۔

"ہماری موجودہ بھابی کا کیا حال ہے سر!" — اصغر نے پوچھا۔

"ارے بھائی، بھابی کا حال کیا پوچھتے ہو!" — میجر سمیع نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا — "ہم چاول مچھلی کھانے والے لوگ ہیں۔ تم لوگ تو ہمیں پانی کے کیڑے سمجھتے ہو"۔

"نہ سر!" — اصغر نے کہا — "میں نے کبھی ایسی بات سوچی بھی نہیں"۔

"اپنے لیڈروں سے پوچھنا" — میجر سمیع نے کہا — "اگر ہمارے پاس پٹ سن نہ ہو تو تم لوگ ہمیں بھوکا مار دو"۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کے دل میں ہمارے خلاف بہت سی شکایتیں ہیں" — اصغر نے کہا۔

"تم میرے بھائی ہو اصغر!" — میجر سمیع نے کہا — "ہمیں مغربی پاکستان کے بادشاہوں کے خلاف شکایتیں ہیں"۔

"اِدھر کے لیڈر وہ شکایتیں رفع کیوں نہیں کراتے؟" — اصغر نے پوچھا۔

"ہمارے لیڈروں کو بھی تم لوگ اپنا غلام سمجھتے ہو" — میجر سمیع نے کہا — "لیکن میرے بھائی! تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ ہم دونوں آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔

"سر! میں بہت پریشان ہوں" — اصغر نے جھنجھلا کر کہا — "یہ سُن سُن کر میں تنگ آ گیا ہوں کہ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کو کھا گیا ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ میں اسے بیہودہ بکواس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا"۔

"اصغر بھائی!" — میجر سمیع نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایسے تحمّل سے کہا جس میں طنز نمایاں تھی — "یہ بالکل سچ ہے۔ ہم بھُوکے مرتے ہیں اور پنجابی عیش کرتا ہے۔ اِدھر کے لوگ جب یہ کہتے ہیں کہ پنجابی اور پٹھان ہم پر حکومت کرنے کے لیے آتے ہیں تو وہ غلط نہیں کہتے"۔

"کیا یہاں کے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ پاکستان کا دفاع کرنے والے پنجابی اور پٹھان ہی ہیں؟"

"اگر چور اور ڈاکو کسی گھر کی حفاظت کریں تو ہم اُنہیں کیپٹن اور میجر نہیں کہیں گے، اُنہیں چور اور ڈاکو ہی کہیں گے" — میجر سمیع نے کہا — "اگر میں تمہاری بات مان بھی لوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ ایسٹ پاکستان کے ہر ایک بنگالی نے تمہاری بات مان لی ہے"۔

"آپ پنجابی اور پٹھان کو چور اور ڈاکو کہتے ہیں" — اصغر نے غصّے سے بے قابو ہو کر کہا — "لیکن پنجابی اور پٹھان دشمن کے جاسوسوں کو اپنے گھروں میں نہیں رکھتے"۔

"تم ہم پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو" ــــ میجر سمیع نے بڑے گرم لہجے میں کہا ــــ "یہاں کسی بنگالی سے یہ بات کہو گے تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا.... دیکھو اصغر بھائی! میں نے تمہیں اپنا بھائی کہا ہے لیکن میں تمہیں یہ بھول جانے کی اجازت نہیں دوں گا کہ میں میجر ہوں اور تم کیپٹن ہو۔ یہ بھی یاد رکھو کہ میں بریگیڈ میجر ہوں"۔

اصغر کا جوان خون کھول اٹھا۔ وہ عہدوں کی اُونچ نیچ کو بھول گیا۔ وہ جوان بھی تھا اور فوجی بھی۔ اس کی دُور اندیشی جواب دے گئی۔ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔

"جو بریگیڈ میجر دشمن کا ایجنٹ ہو اور دشمن کی جاسوس لڑکی کو اپنے ساتھ لئے پھرتا ہو اور کہے کہ یہ میری منگیتر ہے، میں اُسے ہندو سے بدتر سمجھتا ہوں" ــــ اصغر نے غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "میں اُس شخص کو اپنا بھائی نہیں کہہ سکتا"۔

میجر سمیع بجھ کر رہ گیا۔ اُس کی نظریں اصغر کے چہرے پر جم گئیں۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے اُس کی زبان سے اب ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔ اصغر چونک اُٹھا۔ اُسے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ میجر الله اور شازی نے اُسے خاص طور پر کہا تھا کہ میجر سمیع کو پتہ نہ چلے کہ اُس کا راز ہم پر فاش ہو چکا ہے۔

"تم کس کی بات کر رہے ہو؟" ــــ میجر سمیع نے دھیمی سی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں سر! کچھ نہیں" ــــ اصغر نے اُسے ٹالنے کے انداز میں کہا ــــ "معلوم نہیں غصّے میں میرے منہ سے کیا نکل گیا ہے۔ آپ کو پنجاب اور سرحد کے خلاف ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں تھیں!"

میجر سمیع بچہ نہ تھا۔ اُس نے کیپٹن اصغر کا بازو پکڑا اور اُسے باہر چلنے کو کہا۔ اصغر کے مُنہ سے وہ بات نکل گئی تھی جو اُسے زبان پر نہیں لانی چاہیے تھی لیکن کمان سے نکلا ہُوا تیر واپس نہیں آسکتا تھا۔ میجر سمیع اُسے باہر لان میں اُس جگہ لے گیا جہاں اور کوئی نہ تھا۔

"تمہارے منہ سے یہ بات ویسے ہی نہیں نکلی" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "تم نے یہ بات میرے متعلق کہی ہے۔ اگر میرے متعلق نہیں تو تمہیں بتانا پڑے گا کہ تمہارا اشارہ کس کی طرف ہے"۔

"اگر میں بتا دوں تو کیا آپ میرا کورٹ مارشل کرائیں گے؟" ــــ اصغر نے اپنا رُعب قائم رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کیا کروں گا" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "تمہاری بات بے معنی اور بے بنیاد نہیں۔ میں جانتا ہوں، اور شاید میں نے ہی تمہیں بتایا تھا کہ ایسٹ پاکستان انڈیا کے جاسوسوں سے بھر گیا ہے۔ تم کسی ایسے افسر کو جانتے ہو جو انڈیا کا ایجنٹ ہے اور اب مجھ سے چھپا رہے ہو"۔

"اگر میں بتا دوں تو آپ کیا کریں گے؟"

"تم دیکھ لو گے کہ میں کیا کروں گا" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "انڈیا کا ایک جاسوس مجھے دکھا دو۔ پھر دیکھنا، میرا ریوالور اُس پر کس طرح خالی ہوتا ہے"۔

"کیا آپ صفیہ پر اپنا ریوالور خالی کریں گے؟" ــــ اصغر نے پوچھا۔

"صفیہ پر کیوں؟"

"صفیہ پر اس لیے کہ وہ صفیہ نہیں کرشنا کماری ہے" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا۔

"کیا بکواس کرتے ہو" ــــ میجر سمیع نے غصیلی آواز میں کہا۔

"اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ بھی انڈیا کے ایجنٹ ہیں تو اپنا ریوالور مجھ پر خالی کر دیں گے؟"

"تم نے کیسے کہہ دیا کہ صفیہ کرشنا کماری ہے" ــــ میجر سمیع نے پوچھا۔

"کیا آپ کبھی اُس کے گھر گئے ہیں؟" ــــ کیپٹن اصغر نے پوچھا ــــ "کیا آپ اُس کے ماں باپ سے کبھی ملے ہیں؟"

"نہیں" ــــ میجر سمیع نے اب ایسی آواز میں کہا جس میں غصہ خاصا کم تھا ــــ "میں نے اُس سے کبھی پوچھا ہی نہیں کہ اُس کا گھر کہاں ہے"۔

"جس پر حسن کا جادو چلتا ہے اُس کی یہی حالت ہوتی ہے" ــــ اصغر نے کہا ــــ "آج رات آپ اُس سے ملیں اور اُس سے پوچھیں کہ اُس کا گھر کہاں ہے اور اُس کا باپ کیا کام کرتا ہے"۔

"میں نے کبھی پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "وہ کہتی تھی کہ وہ گھر سے آجائے گی اور ہم شادی کر لیں گے۔ وہ کوئی موقع محل ڈھونڈ رہی ہے"۔

"آپ سے وہ بہت سے فوجی راز لے چکی ہے" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا ــــ "باقی جو رہ گئے ہیں وہ جب آپ اُسے دے دیں گے تو پھر آپ اُسے ڈھونڈتے پھریں گے"۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم نے اُسے کس شہادت پر ہندو لڑکی کہہ دیا ہے" ــــ میجر سمیع نے پوچھا۔

"شازی سے بڑھ کر اور بڑی شہادت کیا ہو سکتی ہے!" ــــ کیپٹن اصغر نے کہا ــــ "میں نے آپ کو بتایا تھا کہ شازی کو ایک ایسی لڑکی نے دیکھ لیا ہے جس نے جاسوسی کی ٹریننگ شازی کے ساتھ کی تھی۔ آپ نے مجھے انٹیلی جنس کے میجر انور کے پاس بھیجا تھا۔ اُس شام آپ نے ہمیں میس میں مدعو کیا تو شازی اور وہ لڑکی الگ جا بیٹھی تھیں۔ شازی نے اُسے بتایا کہ اُس نے جاسوسی کے ایک مشن کی تکمیل کے لیے میرے ساتھ شادی کی ہے۔ شازی نے ایسی ہوشیاری سے اُسے اعتماد میں لیا کہ اُس نے شازی کو اپنے ملک کی جاسوس سمجھ کر بتا دیا کہ وہ آپ کو محبت اور اپنے حسن وجوانی کے دھوکے میں راز حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے ہوئے ہے.... سر! میں نے آپ پر بہت بڑا اور توہین آمیز الزام لگایا ہے لیکن آپ میں اگر پاکستان کی ذرا سی بھی محبت رہ گئی ہے تو میرا کورٹ مارشل کرانے سے پہلے دیکھ لیں کہ جس کے ساتھ آپ شادی کر رہے ہیں وہ واقعی صفیہ ہے یا کرشنا کماری ہے"۔

میجر سمیع پر خاموشی طاری ہو گئی اور اُس کا سر جھک گیا۔ وہ اس طرح آہستہ آہستہ بولنے لگا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

"یہ غلط نہیں ہو سکتا" ــــ وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ــــ "محبّت میں فوجی باتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی.... اُس نے مجھ سے باتیں پوچھی تھیں"۔

"ہاں اصغر!" ــــ میجر سمیع نے اصغر سے کہا ــــ "اُس نے مجھ سے ہمارے بریگیڈ کے متعلق کچھ ایسی باتیں پوچھی تھیں جو اُسے نہیں پوچھنی چاہئیں تھیں۔ کوئی جواز نہ تھا" ــــ اُس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور بولا ــــ "اوہ خدا!.... او میرے خدایا!.... میں حیران ہُوا کرتا تھا کہ پاک آرمی کے افسر جاسوس لڑکیوں کے جال میں کس طرح آجاتے ہیں۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو میری حیرت ختم ہو گئی ہے۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ عورت کا جادو کس طرح چلتا ہے.... کیا تمہیں شک ہے کہ میں بھی انڈیا کا ایجنٹ ہوں؟"

"بڑا پکّا شک ہے سر!" ــــ اصغر نے کہا ــــ "آپ بڑے قابل اور ذہین افسر ہیں۔ آپ کو

یہ تو دیکھ لینا چاہیے تھا کہ یہ لڑکی کس مسلمان باپ کی بیٹی ہے۔"

"میں قابل اور ذہین ہوں یا نہیں، میں نہیں جانتا" — میجر سمیع نے کہا — "میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں پاکستانی ہوں۔ اگر پاکستان کی سلامتی کے لیے مجھے اپنی ماں کا خون بہانا پڑا تو میں اُسے بھی ذبح کر دوں گا..... یہ بات اور کسے معلوم ہے؟"

"میجر انور کو" — اصغر نے جواب دیا — "میجر انور اور شازی نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ کو پتہ نہ چلنے دوں کہ آپ کا اور صفیہ کا راز ہم پر فاش ہو چکا ہے لیکن آپ نے مجھے ایسا غصہ دلایا کہ یہ بات میرے منہ سے نکل گئی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میجر انور کو پتہ نہ چلے کہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔"

"اچھا ہوا کہ تمہارے منہ سے یہ بات نکل گئی ہے" — میجر سمیع نے کہا — "میجر انور کیا کرے گا۔ میں اُس سے پہلے وہ کارروائی کروں گا جو ہماری انٹیلی جنس نہ جانے کتنے دنوں بعد کرے گی۔"

"کیا کریں گے آپ؟"

"میں اس لڑکی کو یہ تو نہیں کہوں گا کہ تم جاسوس ہو" — میجر سمیع نے کہا — "میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"نہ سر!" — اصغر نے کہا — "اگر آپ اُسے گولی مار دیں گے تو اُس کے رِنگ کے باقی افراد زمین کے نیچے چلے جائیں گے۔ اُن سب کو پکڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس لڑکی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ اُس کا راز فاش ہو چکا ہے۔"

"تم نے اچھا کیا ہے کہ مجھے بتا دیا ہے" — میجر سمیع نے دھیمی سی آواز میں کہا اور اصغر کو خدا حافظ کہے بغیر سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ چل پڑا۔ چند قدم جا کر رُک گیا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا اور بولا — "میں تم پر یہ ثابت کروں گا کہ میں سچا پاکستانی ہوں" — وہ پھر آہستہ آہستہ چلتا اصغر کے پاس آ گیا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا — "مجھے ہندو سے اپنے بھائی کے خون کا انتقام لینا ہے۔

کلکتہ میں مسلمانوں کے ایک جلوس پر جو تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں نکالا گیا تھا، ہندوؤں نے حملہ کر دیا تھا۔ اس میں جو مسلمان شہید ہوئے، اُن میں میرا ایک بھائی بھی تھا۔ تم نہیں جانتے اصغر! میرے خاندان نے تحریکِ پاکستان میں کتنا خون دیا ہے۔ ہندو کے ساتھ مجھے اُس خون کا حساب برابر کرنا ہے۔ کلکتہ میں ہندوؤں کے ہاتھوں جو مسلمان شہید ہوئے تھے، وہ سب میرے بھائی تھے۔"

وہ اصغر کے کندھے پر تھپکی دے کر چل پڑا۔ اصغر اُسے دیکھتا رہا۔ وہ سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ اصغر سوچنے لگا کہ فتح کس کی ہوگی — محبت کی یا شہیدوں کے خون کی!

میجر سمیع الدین تو آہستہ آہستہ چلتا کیپٹن اصغر کی نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن اصغر وہیں کھڑا رہا۔ اُس کے دل پر بڑا ہی ناگوار سا بوجھ آن پڑا۔ میجر سمیع نے جو باتیں کی تھیں اُن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سچا پاکستانی ہے اور ہندو کو اپنا دشمن سمجھتا ہے لیکن اصغر کو خیال آ گیا کہ جاسوس اداکاری میں اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ اصل اور نقل کی تمیز ناممکن ہو جاتی ہے۔ کیپٹن اصغر کو پچھتاوا ابھی ہوا کہ میجر سمیع کی بات پر مشتعل ہو کر اُس نے وہ بات کہہ دی تھی جو اُسے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ انٹیلی جنس کے میجر انور

نے اُسے بڑی سختی سے منع بھی کیا تھا۔ اُسے اب یہ خدشہ بھی نظر آ رہا تھا کہ میجر سمیع کو اُس نے چوکس کر دیا ہے اور اب میجر سمیع اپنے اوپر اور دبیز پردہ ڈال لے گا۔

کیپٹن اصغر کے ذہن میں یہ سوال کلبلانے لگا کہ اب وہ کیا کرے۔ سوچ سوچ کر اُسے یہی ایک جواب ملتا تھا کہ وہ میجر انور کو بتا دے کہ اُس سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اُسے شازی کا بھی خیال آیا لیکن جو کارروائی میجر انور کر سکتا تھا وہ شازی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر جانے کی بجائے میجر انور کے پاس چلا گیا۔ میجر انور چونکہ اکیلا تھا، اس لیے میس کے ساتھ ہی ایک کمرے میں رہتا تھا۔ میجر انور اُسے کمرے میں مل گیا۔

"آؤ لڑکے!" — میجر انور نے خوشدلی سے کہا اور پوچھا — "کیا بات ہے، تمہارا چہرہ لال ہوا کیوں ہے؟"

"سر!" — کیپٹن اصغر نے اپنے آپ کو کرسی پر پھینکتے ہوئے کہا — "بہت بڑی غلطی کر آیا ہوں۔ میجر سمیع نے ابھی ابھی میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پنجابیوں اور پٹھانوں کے خلاف ایسی بیہودہ باتیں کیں کہ میں اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔"

"اور تم نے اُسے کہہ دیا کہ تم انڈیا کے جاسوس ہو!" — میجر انور نے اُس کی بات پوری کرتے ہوئے کہا — "یہی کہنا چاہتے ہو نا!"

"ہاں سر!" — کیپٹن اصغر نے ملزموں کی طرح دبی ہوئی آواز میں جواب دیا — "میں نے اُسے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جس لڑکی کو تم ساتھ لیے پھرتے ہو، وہ صفیہ نہیں کرشنا کماری ہے۔"

"بعض لوگ اُلّو ہوتے ہیں" — میجر انور نے کہا — "لیکن تم اُلّو کے پٹھے ہو..... میں پٹھان ہوں۔ اگر کوئی مشکوک آدمی پٹھانوں کی ماں بہنوں کو گالی دے گا تو بھی میں اپنے آپ کو قابو میں رکھوں گا، کیونکہ میں انٹیلی جنس کا آدمی ہوں۔ تم جیسے جذباتی لڑکے بڑے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ تم نے انڈیا کے ایک ایجنٹ کو چوکنا کر دیا ہے۔"

"نہیں سر!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "میجر سمیع مجھے انڈیا کا ایجنٹ نہیں لگتا۔ میں آپ کو لفظ بلفظ وہ ساری باتیں سناتا ہوں جو میں نے اُسے اور اُس نے مجھے کہی ہیں۔"

کیپٹن اصغر نے اُسے وہ پوری گفتگو سنا دی جو اُس کے اور میجر سمیع کے درمیان ہوئی تھی۔

"پھر بھی تمہیں احتیاط کرنی چاہیے تھی" — میجر انور نے کہا — "اب مجھے اپنے بریگیڈیر صاحب کو پوری رپورٹ دینی ہوگی۔ تم اب یہ احتیاط کرنا کہ شازی کہیں اکیلی باہر نہ نکلے۔ میں کل تمہیں کچھ بتا سکوں گا۔ تم میجر سمیع کے ساتھ دوستی پکی رکھنا۔ ہمیں اب اُس کے ساتھ ایک آدمی لگانا پڑے گا لیکن خیال رکھنا کہیں اُسے یہ نہ کہہ دینا کہ تم انڈیا کے ایجنٹ ہو اور ہم نے تمہارے پیچھے ایک آدمی لگا رکھا ہے۔"

"نہیں سر!" — کیپٹن اصغر نے ہنستے ہوئے کہا — "میں ایسا اُلّو بھی نہیں ہوں۔"

"میں نے تمہیں اُلّو نہیں کہا تھا" — میجر انور نے کہا — "میں نے اُلّو کا پٹھا کہا تھا۔"

★

میجر سمیع اصغر کو میس کے لان میں کھڑا چھوڑ کر سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ چلا گیا۔ وہ اسی طرح

آہستہ آہستہ چلتا میس سے دُور نکل گیا، اور وہ اپنے بنگلے سے بھی دُور نکل گیا۔ بے شمار سوچیں اُس کے ذہن میں زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ اُس نے اپنے آپ کو فریب دینے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی۔ سوچوں اور خیالوں کے ہنگامے میں اُسے کیپٹن اصغر کی آواز بار بار سنائی دیتی تھی — "صفیہ کرشنا کماری ہے" — کبھی اُسے محسوس ہوتا جیسے اُسے سنگسار کیا جا رہا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

"سمیع الدّین!" — اُسے اپنی آواز سنائی دی — "اگر وہ کرشنا کماری ہے تو اُسے تمھاری سرزمین پر زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔"

اُس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ قدم اور تیز ہو گئے۔

"نہ سر!" — اُسے اصغر کی آواز سنائی دی — "آپ اُسے گولی مار دیں گے تو اُس کے رِنگ کے باقی افراد زمین کے نیچے چلے جائیں گے..... اس لڑکی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ اُس کا راز فاش ہو چکا ہے۔"

اُس کے قدم رُک گئے۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ چھاؤنی سے دُور نکل گیا تھا۔ اُس نے

اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیئے اور اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اُس نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو اس فیصلے پر پہنچا کہ کل ہی وہ سوچ سمجھ کر کرشی سے معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ اُس کی اصلیت کیا ہے۔ اس فیصلے نے اُسے تسکین سی دی اور وہ واپس آ کر اپنے گھر چلا گیا۔

دروازے پر اُس کا اَردلی اُس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُس نے اردلی سے کہا کہ وہ اب چلا جائے۔ میجر سمیع کپڑے بدل کر سونے کے کمرے میں گیا۔ اُس کی بیوی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ میجر سمیع لیٹ جانے کی بجائے اپنی سوئی ہوئی بیوی کے پاس کھڑا ہو گیا اور اُس کی نظریں اُس کے چہرے پر جم گئیں۔ اُسے اپنی بیوی کی شکل و صورت بدلی بدلی سی نظر آئی۔ یہ صورت اُسے کچھ اچھی لگنے لگی۔

"اس عورت میں یہ ایک خوبی تو ہے کہ یہ میرے ملک کے دشمن کی جاسُوس نہیں" — اُس نے اپنے آپ سے کہا اور اُس کی آہ نکل گئی۔

وہ کچھ دیر اپنی بیوی کو دیکھتا رہا اور آہستہ آہستہ اپنے پلنگ کی طرف آ کر نہایت آہستگی سے پلنگ پر بیٹھا اور لیٹ گیا۔ اُس نے سو جانے کی کوشش تو بہت کی لیکن اُسے نیند نہ آئی۔

رات کروٹیں بدلتے گزر گئی۔

★

میجر سمیع اپنی بیوی کے ساتھ اتنی ہی بات کیا کرتا تھا جتنی بہت ضروری سمجھتا تھا، ورنہ میاں بیوی کے درمیان خاموشی کی خلیج حائل رہتی تھی۔ اگر اس گھر میں بچّے نہ ہوتے تو یہ گھر ایک مقبرے کی طرح خاموش رہتا لیکن اُس صبح میجر سمیع نے اپنی بیوی کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں اور اُس کی بیوی کے چہرے پر حیرت بھی آئی اور رونق بھی۔ میجر سمیع بچّوں کے ساتھ بھی ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ وہ جب ناشتے سے فارغ ہو کر دفتر جانے کے لیے چلا تو اُس نے گھوم کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اُسے خیال

ا یہ عورت بدصورت تو نہیں۔ اس خیال نے اسے تسکین سی دی اور اُس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اُس کے اعصاب پر نہ جانے کتنی مدّت سے بڑا ہی ناگوار سا بوجھ پڑا رہا ہے اور اُس کے اعصاب ٹوٹتے رہے ہیں۔ اُس نے ایک زمانے کے بعد اپنی بیوی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی۔

وہ جب بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں اپنی کُرسی پر بیٹھا تو اُس کے اعصاب پر وہ بوجھ آن پڑا جو رات کیپٹن اصغر نے اُس پر پھینکا تھا۔ کرشی کی محبت کو وہ اتنی آسانی سے دل سے نہیں نکال سکتا تھا۔ یہ ایک بڑی خوبصورت زنجیر تھی جسے وہ توڑنا چاہتا تھا لیکن اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے اُسے دُکھ سا ہوتا تھا۔ اُسے یہ بھی دکھ ہوتا تھا کہ اُسے ایک لڑکی نے بیوقوف بنایا ہے۔ یہ دکھ اس خیال سے صدمہ بن گیا کہ اُس ہندو لڑکی نے اُس کی ذات کو نہیں، اُس کے ملک کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے۔

اردلی اُس کی میز پر چائے کی پیالی رکھ کر جا چکا تھا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میجر سمیع نے ایک فائل کھولی لیکن اُس نے فائل کو یوں بند کر دیا جیسے غلطی سے اُس نے سانپ کی پٹاری کھول لی ہو۔ اس فائل کی ایک دو باتیں وہ کرشی کو بتا چکا تھا۔ وہ اس قدر مضطرب اور پریشان ہو گیا کہ اُس نے اُسی طرح کسی سہارے کی ضرورت محسوس کی جس طرح کوئی ڈوبتا انسان تنکوں کی طرف لپکتا ہے۔

"نہیں" — اُسے خیال آیا — "کیپٹن اصغر نے غلط کہا ہوگا۔ وہ ابھی ناتجربہ کار ہے۔"

اس خیال نے اُسے تھوڑا سا سہارا دیا لیکن تلخی کی ایک اور لہر آئی اور اُس کے ہاتھ سے یہ سہارا چھوٹ گیا۔ اُس نے لپک کر ٹیلیفون پر ہاتھ رکھا، رسیور اٹھایا اور ایک نمبر ملانے لگا۔

"صفیہ ہیں؟" — اُس نے پوچھا۔

کرشنا کماری نے اُسے یہ ٹیلیفون نمبر دے رکھا تھا۔ میجر سمیع نے کبھی پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ یہ نمبر ہے کہاں۔ یہ اس ہندو لڑکی کے حُسن اور ناز و ادا کا طلسم تھا جو اُس پر ہر وقت طاری رہتا تھا۔

"ہیلو صفیہ!" — میجر سمیع نے کہا — "کیسی ہو؟ ..... ہاں ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں..... آج آ رہا ہوں..... اُدھر ہی" — اور اُس نے رسیور رکھ دیا۔

★

دن کے پچھلے پہر جب میجر سمیع اُس جگہ پہنچا جہاں اُس نے کرشنا کماری کو آنے کے لیے کہا تھا تو وہاں کرشنا کماری پہلے سے موجود تھی۔ اُن کی اکثر ملاقاتیں یہیں ہُوا کرتی تھیں۔ کالا کلوٹا، مریل سا ایک نیم برہنہ بنگالی ملّاح دوڑا آیا۔ اُس نے جُھک کر میجر سمیع کو سلام کیا اور بھیک مانگنے کے لہجے میں بولا — "صاحب! کشتی؟"

"ہاں ہاں" — میجر سمیع نے کہا — "کدھر ہے؟"

وہ جب بھی یہاں آتے، اسی ملّاح کی کشتی پر سیر کے لیے جایا کرتے تھے۔ آج بھی وہ خراماں خراماں ندی کے تین پر جا رُکے۔ لاش نما ملّاح کشتی لے آیا۔ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور کشتی بنگال کی اس ندی میں تیرنے لگی۔ میجر سمیع پر خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی میں اُس نے ایک طوفان کو

سمیٹ رکھا تھا۔ کشتی کا ملاّح چھوٹے سے بادبان کو ہوا کے رُخ میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بادبان کھولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کشتی ندی کے بہاؤ کے ساتھ جا رہی تھی لیکن وہ اپنی سواریوں کو دکھا چاہتا تھا کہ اُن کے لیے وہ کتنی مشقّت کر رہا ہے۔ یہی دو سواریاں اُس کی اَن داتا تھیں۔ اُسے دس بارہ بچّوں کے پیٹ ان جیسی سواریوں کی بخشش سے بھرنے تھے۔

کشتی پتن سے کچھ دُور نکل گئی۔ کرشنا کماری نے میجر سمیع کی طرف دیکھا۔ میجر سمیع ملاّح کو دیکھ رہا تھا جو ان کی طرف پیٹھ کیے مستول کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے؟" — کرشنا کماری نے میجر سمیع سے پوچھا — "اتنے خاموش کیوں ہو؟"

میجر سمیع نے اُس کی طرف دیکھا اور آہ بھری۔

"میں اس ملاّح کو دیکھ رہا ہُوں" — میجر سمیع نے دُکھیاری سی آواز میں کہا — "اِس ایک شخص کے فاقہ کش اور مشقّت کے مارے ہُوئے وجُود میں مجھے سارا بنگال نظر آرہا ہے۔ یہ شخص پورے بنگال کی صحیح تصویر ہے۔ یہ شخص اپنی اُس دھرتی پر بھُوکا مر رہا ہے جو دھرتی سونا اُگلتی ہے۔ چاول پیدا کرنے والی سرزمین پر بسنے والے چاول کے دانے دانے کو ترس رہے ہیں۔"

"تم جانتے ہو کیوں؟" — کرشنا کماری نے پوچھا۔

"ہاں صفیہ!" — میجر سمیع نے کہا — "میں جانتا ہُوں۔ ہمیں بھُوکا مارا جا رہا ہے۔ ہمیں غلام بنایا جا رہا ہے۔ ہم پر پنجابی اور پٹھان حکومت کر رہے ہیں۔"

"تمہیں آج یہ کیسے خیال آگیا؟" — کرشنا کماری نے کہا — "پہلے تم نے کبھی ایسی بات نہیں کہی تھی"

"رات کو مَیس میں پنجابی افسرؤں کے ساتھ کچھ جھک جھک ہو گئی تھی" — میجر سمیع نے کہا — "اُنھوں نے مجھے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جیسے وہ ہمارے آقا ہوں اور جب چاہیں ہمیں بھوکا ماردیں۔ اُنھوں نے بنگالی افسرؤں کو انڈیا کا دوست کہا ہے۔"

"کیا انڈیا کی دوستی جُرم ہے؟" — کرشنا کماری نے پوچھا۔

"میں نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا" — میجر سمیع نے کہا — "لیکن اب میں اپنے آپ کو اور بنگال کو اتنا مجبور سمجھنے لگا ہُوں کہ ہمیں انڈیا کی دوستی قبول کرنی پڑے گی .... خدا کی قسم، صفیہ! میں تو ان پنجابیوں اور پٹھانوں کے خلاف خانہ جنگی کی بھی سوچ چکا ہوں لیکن ہماری دو بنگال رجمنٹیں پنجاب کی اتنی زیادہ فوج کے خلاف کس طرح لڑ سکیں گی۔"

"ہاں" — کرشنا کماری نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اُسے انڈیا کے ساتھ کوئی خاص دل چسپی نہ ہو — "دو بنگالی رجمنٹیں کچھ نہیں کر سکیں گی لیکن ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ میں خود کچھ دنوں سے یہی محسوس کر رہی تھی جو تم نے کہہ دیا ہے۔ میں تمھارے ساتھ اس لیے بات نہیں کرتی تھی کہ تم کہو گے مسلمان کی بیٹی ہو کر اپنے ملک کے خلاف باتیں کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ خانہ جنگی میں تباہی آتی ہے۔ آزادی تو مل جاتی ہے لیکن ملک تباہ ہو جاتا ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ پرانے مکان کو گرا کر اس پر نئی عمارت کھڑی کی جائے" — میجر سمیع نے کہا — "ویسٹ پاکستان ہمیں کھا گیا ہے .... ہمیں نہ رُک جائیں؟"

"کشتی کنارے سے لگاؤ" — کرشنا کماری نے ملاّح سے کہا۔

★

کشتی سے اُتر کر وہ ایک ایسی جگہ جا بیٹھے جہاں ہر طرف سبزہ زار، جھاڑیاں اور چھوٹے چھوٹے درخت تھے۔ اتنی حسین جگہ اور اتنی دل کش لڑکی کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر بھی میجر سمیع کی مزاجی کیفیّت وہی رہی۔ کرشنا کماری نے اُسے رومانی کیفیّت میں گھسیٹنے کے لیے بڑی پیاری حرکتیں کیں لیکن میجر سمیع میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

"تم خانہ جنگی اور انڈیا کی دوستی کی بات کر رہے ہو" — کرشنا کماری نے کہا — "میں دیکھ رہی ہُوں کہ آج اس معاملے میں تم اس قدر سنجیدہ بلکہ پریشان ہو کہ تم میری موجودگی کو بھی نظرانداز کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ چلو میں اسی موضوع پر تمھارے ساتھ بات کرتی ہُوں۔ میں تمھارے سامنے ایک حقیقت رکھتی ہوں۔ یہ جذبات کا معاملہ نہیں۔ فرض کر لو کہ تم جتنے بنگالی افسر یہاں ہو، انڈیا کو درپردہ دعوت دیتے ہو کہ وہ کسی نہ کسی بہانے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دے تو کیا تمھارا یہ بریگیڈ جیسور کی سرحد کا دفاع کر سکے گا؟ دفاعی پلان کی فائل ضرور تمھارے پاس ہوگی۔ مجھے بتاؤ کہ وہ پلان کیا ہے؟ کیا حملے کی صُورت میں مغربی پاکستان سے فوراً دو چار ڈویژن پہنچ جائیں گے؟ کیا اس پلان میں لکھا ہے کہ بوقتِ ضرورت ہوائی جہازوں کی سپورٹ کتنے وقت میں پہنچ جائے گی؟ .... جب تک تم یہ ساری چیزیں دیکھ نہ لو، تمھیں خانہ جنگی کی اور بھارت کی جنگی مدد کی بات نہیں کرنی چاہیئے۔"

میجر سمیع نے نظریں اُس کے چہرے پر جما دیں اور اُس کے ہونٹوں پر تبسّم سا آگیا۔ اُس نے کرشنا کماری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"صفیہ!" — میجر سمیع نے کہا — "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم فوج اور جنگ کے متعلق اتنی باریک باتیں بھی جانتی ہو۔ تمھیں یہ باتیں کس نے بتائی ہیں؟ ایسی باتیں فوجی افسروں کی بیویاں بھی نہیں جانتیں۔ معلوم ہوتا ہے مجھ سے پہلے تمھاری دوستی کسی کرنل یا بریگیڈیئر کے ساتھ رہی ہے۔"

"نہیں" — کرشنا کماری نے اپنی مخصوص مُسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہُوئے کہا — "تم میری پہلی اور آخری محبّت ہو۔"

میجر سمیع نے اس بات کو اور آگے نہ چلایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ باتوں باتوں میں کرشنا کماری نے اُس سے ایک اور فوجی نوعیّت کی بات پوچھی جو کسی شہری کے دماغ میں نہیں آسکتی تھی۔

"صفیہ!" — میجر سمیع نے عجیب سی سنجیدگی سے کہا — "آج میں تمھیں وہ بات کہہ دیتا ہُوں جو تم سمجھتی ہو کہ میرے دماغ میں نہیں آتی ہوگی۔ یہ بات سننے سے پہلے یہ ذہن میں رکھ لو کہ میں یہ بات پاکستان آرمی کے میجر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بنگالی افسر کی حیثیت سے کہوں گا۔ یہ میرا اور تمھارا راز ہے۔ خُدا کے سوا اسے کوئی نہیں جان سکے گا .... تم انڈیا کی ایجنٹ ہو۔"

"نہیں" — کرشنا کماری نے کہا — "تمھیں یہ شک کیوں ہُوا ہے؟"

"شک نہیں" — میجر سمیع نے کہا — "یقین کہو۔ مجھے یقین ہے۔"

"کب سے؟"

"تین چار مہینوں سے" — میجر سمیع نے جواب دیا۔

"اگر تم سچے پاکستانی ہو تو تم نے میرے ساتھ دوستی کیوں لگا رکھی؟"

"اِس لیے کہ میں سچا پاکستانی نہیں سچا بنگالی ہُوں" — میجر سمیع نے کہا — "اور میں انڈیا کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ ہماری نجات کی پہلی اور آخری امید انڈیا ہے۔ میں نے تمھارا راز اس لیے تمھارے سامنے نہ رکھا کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس فیلڈ میں تم کہاں تک طاق ہو لیکن میں نے تم میں کچھ کمزوریاں دیکھی ہیں۔ میری جگہ اگر کوئی سچا پاکستانی ہوتا تو وہ چند دنوں میں ہی تمھارے جال سے نکل جاتا اور تم یہاں کسی جیل خانے میں بند ہوتیں۔ مجھے جتنی محبت تم سے ہے اتنی ہی اپنی اس دھرتی سے ہے۔ یہ دھرتی پنجابیوں اور پٹھانوں کی نہیں، یہ دھرتی میری ہے، یہ تمھاری دھرتی ہے۔ یہ اس ملّاح کی دھرتی ہے جو ہمارے انتظار میں ندی کے کنارے اس امید پر بیٹھا ہے کہ ہم اسے چند ٹکے دیں گے"

"میں نے پوچھا تھا تمھیں مجھ پر شک کس طرح ہُوا تھا؟" — کرشنا کماری نے پوچھا۔

"تم نے آج کی طرح مجھ سے ایک دو ایسی فوجی باتیں پوچھی تھیں جو بریگیڈ یا ڈویژن ہیڈکوارٹر میں کام کرنے والے بعض افسروں کو بھی معلوم نہیں ہوتیں" — میجر سمیع نے کہا — "کسی شہری کے دماغ میں ایسے سوال آ ہی نہیں سکتے۔ تم سمجھتی رہی ہو کہ میں تمھارے ہاتھوں میں کھیل رہا ہوں لیکن میں تمھیں انڈین ایجنٹ سمجھ کر اور اپنے آپ کو بنگال کا سچا بیٹا جان کر پورے خلوص سے راز کی باتیں بتا تا رہا ہُوں۔ میں خوش تھا کہ یہ راز انڈیا جا رہے ہیں"

"تم انڈیا کے باقاعدہ ایجنٹ کیوں نہیں بن جاتے؟" — کرشنا کماری نے پوچھا — "اپنے وطن کی آزادی کے علاوہ ایک تو تمھیں میں مِل جاؤں گی اور دوسرے تمھیں دولت بھی بیشمار مِلے گی۔... میں تمھاری خاطر مسلمان ہو جاؤں گی"

"تو کیا تم مسلمان نہیں ہو؟"

"نہیں" — کرشنا کماری نے کہا — "میں تمھیں یہ راز بھی دے دیتی ہوں کہ میں صفیہ نہیں کرشنا کماری ہوں لیکن خیال رکھنا، مجھے صفیہ ہی کہتے رہنا، اور یہ بھی خیال رکھنا کہ تمھارے ساتھ میری محبت سچّی محبت ہے۔ اس کا میرے اس کام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں"

"میں ابھی فیصلہ نہیں کر سکا کہ میں انڈیا کا باقاعدہ ایجنٹ بن جاؤں یا نہیں" — میجر سمیع نے کہا — "مجھے دولت کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں۔ میری دل چسپی یہ ہے کہ مجھے میرا بنگال مِل جائے اور تم مِل جاؤ"

"باقاعدہ ایجنٹ بن جاؤ تو اس سے مجھے بہت سہولت مل جائے گی" — کرشنا کماری نے کہا — "تمھارا رابطہ براہِ راست چیف کے ساتھ ہو جائے گا۔ اس سے میں ایک خطرے سے بچ جاؤں گی۔ تم دیکھ رہے ہو کہ تمھارے ساتھ میل ملاقات میں ایک خطرہ ہے۔ میں کہیں بھی پکڑی جا سکتی ہوں... لیکن باقاعدہ ایجنٹ بننے کے لیے تمھیں کچھ مراحل میں سے گزرنا پڑے گا۔ پھر منظوری بھی بڑی دُور سے آئے گی۔ بہرحال یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ تم جانتے ہو کہ احتیاط کتنی ضروری ہوتی ہے"

سورج غروب ہو چلا تھا۔ وہ اُٹھے اور ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے کشتی میں آ بیٹھے۔

رات میجر سمیع الدّین انٹیلی جنس کے میجر انور کے کمرے میں بیٹھا تھا۔

"اور تم نے یہ بھی یقین کر لیا ہے کہ وہ ہندو ہے؟" — میجر انور نے میجر سمیع کی ساری بات سن کر پوچھا — "اور کیا اُس نے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ صفیہ نہیں کرشنا کماری ہے؟"

"ہاں بھائی، ہاں" — میجر سمیع نے جھنجھلا کر جواب دیا — "تمھیں سب کچھ بتا چکا ہُوں۔ اُس نے میرے پُوچھے بغیر بتا دیا تھا کہ وہ صفیہ نہیں، کرشنا کماری ہے" — میجر سمیع نے بڑی لمبی آہ لی اور بولا — "سالا ایک محبّت کیا تھا، وہ بھی جاسوس نِکلا"

"تم اپنی محبت جاری رکھو" — میجر انور نے کہا — "اب صورت ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ بریگیڈ کمانڈر کو بھی رپورٹ دینی پڑے گی اور تمھیں میرے بریگیڈیر صاحب کے پاس بھی جانا پڑے گا"

"نہ بھائی نہ" — میجر سمیع نے بنگالی اُردو میں کہا — "وہ سالا میرا کورٹ مارشل کرا دے گا"

"وہ میں نہیں ہونے دوں گا" — میجر انور نے کہا — "تم یہی کہنا کہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ انڈین ایجنٹ ہے اور تم یقین کرنے کے لیے اُس کے ساتھ لگے رہے ہو۔ تمھارا یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ تم نے ایک رِنگ کا دروازہ کھول لیا ہے"

"کیا دروازہ کھول لیا ہے بھائی!" — میجر سمیع نے کہا — "ہمارا محبّت والا دروازہ بند ہو گیا ہے"

"اُسے کھُلا رکھو" — میجر انور نے کہا — "اور ایک بات کا خیال رکھنا کہ کیپٹن اصغر کو یہ راز نہ دے دینا۔ وہ جذباتی لڑکا ہے پہلے بھی وہ غلطی کر چکا ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ تم سچّے پاکستانی ہو..... تم اب جاؤ۔ میں صبح تمھیں کچھ نہ کچھ اطلاع دوں گا"

اگلے روز میجر سمیع الدّین کو انٹیلی جنس والوں کا بلاوا آیا۔ وہ فوراً پہنچا۔ انٹیلی جنس کا بریگیڈیر اُس کا منتظر تھا۔ میجر سمیع الدّین کو وہ تمام کہانی جو اُس نے گذشتہ رات میجر انور کو سنائی تھی، بریگیڈیر کو بھی سنانی پڑی اور بریگیڈیر کے بے شمار سوالوں کے جواب دینے پڑے۔

اڑھائی تین گھنٹوں بعد میجر سمیع اپنے بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں پہنچا تو اُسے بریگیڈ کمانڈر نے بلا لیا۔ بریگیڈ کمانڈر کو انٹیلی جنس والوں نے اطلاع دی تھی۔ میجر سمیع کو وہی کہانی اپنے بریگیڈ کمانڈر کو بھی سنانی پڑی۔ اُس سے فارغ ہو کر اپنی کرسی پر آ کر بیٹھا تو کرشنا کماری کا فون آ گیا۔ اُس نے میجر سمیع کو کِسی اور جگہ مِلنے کو کہا اور اُسے وقت بھی بتایا۔ وہ چھوٹا سا ایک ہوٹل تھا جس میں عام طور پر فوجی افسر اور اُن کی بیویاں جایا کرتی تھیں۔

سورج غروب ہوتے ہی میجر سمیع اس ہوٹل میں پہنچ گیا۔ دو چار منٹ بعد کرشنا کماری بھی آ گئی۔ میجر سمیع نے رسمی طور پر کافی کا آرڈر دے دیا۔ کرشنا کماری نے اُسے کہا کہ وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے۔

"کل شام چار بجے تم تین سے کشتی میں بیٹھ کر اُسی جگہ پہنچ جانا جہاں ہم جا کر بیٹھا کرتے ہیں" — کرشنا کماری نے کہا — "تم وہاں ٹہلتے رہنا۔ ایک آدمی جسے تم عام سا کسان سمجھو گے، آہستہ آہستہ چلتا تمھارے قریب سے گزرے گا اور کہے گا — 'آج شاید مینہ برسے گا' — تم کہو گے — 'مینہ کے کوئی آثار تو نہیں' — وہ رُک جائے گا اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہے گا — 'کون کہہ سکتا ہے کیا ہو جائے!' [illegible] ائے گا اور تم بھی جواب میں مُسکرانا۔ پھر وہ تم سے جو کچھ پوچھے، اُس کا جواب اپنی سمجھ بُوجھ

کے مطابق دینا۔"

"وہ کیا پُوچھے گا؟" —— میجر سمیع نے پوچھا۔

"یہ ایک قسم کا ٹیسٹ ہوگا" —— کرشنا کماری نے جواب دیا —— "میں بتا نہیں سکتی، وہ کیا پوچھے۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں، تم تو ہم میں سے ہی ہو۔"

★

اگلے روز کرشنا کماری کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچنے کے لیے میجر سمیع الدّین اپنے بنگلے سے نکلا۔ وہ جب اصغر کے بنگلے کے سامنے سے گزرا تو اصغر اور شازی برآمدے میں کرسیاں رکھ کر بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے۔ میجر سمیع کو دیکھ کر وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میجر سمیع جو اُن سے کچھ دُور سڑک پر جا رہا تھا، ان کی طرف آ گیا لیکن بیٹھا نہیں۔ اُس نے کہا کہ وہ کسی کام سے جا رہا ہے۔

"سر!" —— اصغر نے پوچھا —— "آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟"

میجر سمیع نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر پیاری سی تھپکی دی اور بولا —— "بڑے بھائی چھوٹے بھائیوں سے ناراض نہیں ہُوا کرتے۔"

"کیوں بھائی جان!" —— شازی نے پوچھا —— "اُس کے متعلق کیا بنا؟"

"ٹھیک بنے گا" —— میجر سمیع نے ہنستے ہُوئے کہا —— "بالکل ٹھیک بنے گا مجھ سے کچھ نہ پوچھو..... اصغر نے غلط بات نہیں کہی تھی..... بس ہم سے اور کچھ نہ پوچھنا۔"

وہ چلنے لگا تو شازی بول پڑی —— "بھائی جان! ہم آپ سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ آپ کی باتیں میں سمجھ سکتی ہوں، اصغر صاحب نہیں سمجھ سکتے۔ میں آپ کو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جہاں کہیں میری ضرورت پڑے مجھے بتا دینا۔"

"بتائیں گے میری بہن!" —— میجر سمیع نے اُس کے سر پر آہستہ سے تھپکی دیتے ہُوئے کہا —— "اپنی بہن کو ضرور بتائیں گے۔"

میجر سمیع چلا گیا۔ اُس نے میجر انور کو بتا دیا تھا کہ کرشنا کماری کے ساتھ اُس کی ایک مُلاقات ہو چکی ہے اور آج وہ چار بجے فلاں جگہ جا رہا ہے۔

میجر انور نے اُس علاقے کے فوجی نقشے پر وہ جگہ دیکھ لی اور اس پر نشان لگا لیا تھا۔

میجر سمیع ندی کے تین پر پہنچا تو وہی مریل سا ملاّح اُس کے پاس دوڑا آیا اور جھک کر سلام کیا، پھر بھکاریوں کی طرح پوچھا —— "کشتی؟" —— میجر سمیع سر ہلا کر اُس کے ساتھ چل پڑا اور اُس کی کشتی میں جا بیٹھا۔ ملاّح نے غلاموں کی طرح پھیکی سی مسکراہٹ سے پوچھا —— "بیگم صاحب نہیں آیا؟" —— میجر سمیع نے ہنس کر جواب دیا اور اُسے چلنے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد میجر سمیع نے کشتی ایک جگہ رُکوائی اور ملاّح کو انتظار کرنے کا کہہ کر جنگل میں غائب ہو گیا۔ وہ اُس جگہ ٹہلنے لگا جہاں وہ کرشنا کماری کے ساتھ آ کر بیٹھا کرتا تھا۔ وہ کوئی عام گزرگاہ نہیں تھی۔ وہاں میجر سمیع الدّین اور کرشنا کماری جیسے جوڑے ہی جایا کرتے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ [illegible] سے یہ خطرہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں سے ایک گولی آئے گی اور اُس کے جسم سے پار ہو جائے گی

اُس نے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ اُسی حلیے اور اُسی لباس کا آدمی جیسا کرشنا کماری نے بتایا تھا، اُس کی طرف آ رہا تھا۔ میجر سمیع نے منہ پھیر لیا۔ وہ آدمی اُس کے ساتھ آ مِلا۔ تب میجر سمیع نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ میجر سمیع کے قریب سے گزرا۔

"آج مینہ برسے گا" —— اُس آدمی نے گزرتے گزرتے کہا۔

"مینہ کے کوئی آثار تو نہیں" —— میجر سمیع نے کہا۔

"کون کہہ سکتا ہے کیا ہو جائے!" —— اُس آدمی نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا اور میجر سمیع کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

میجر سمیع نے بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔

"میجر سمیع الدّین؟" —— اس آدمی نے پوچھا —— "بریگیڈ میجر؟"

میجر سمیع نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ انڈین ایجنٹ کیوں بننا چاہتے ہیں؟" —— اُس آدمی نے میجر سمیع سے پوچھا۔

میجر سمیع نے مغربی پاکستان کے خلاف باتیں شروع کر دیں اور وہی کچھ کہا جو وہ دو روز پہلے کرشنا کماری سے کہہ چکا تھا۔ اُس نے بنگال کو بنگالیوں کی سرزمین کہا، پنجابیوں اور پٹھانوں کو اُس نے غیر ملکی غاصب کہا، پھر مشرقی بنگال کی آزادی اور خانہ جنگی کی باتیں کیں۔ وہ جوں جوں بولتا گیا، اُس کی آواز میں جوش، قہر اور غضب آتا گیا۔

"آپ لوگ مجھے انڈین ایجنٹ نہ بنائیں" —— میجر سمیع نے غصیلے جوش میں کہا —— "مجھے گولی مار دیں۔ میں اپنے ذاتی فائدے کی نہیں، مشرقی بنگال کی آزادی کی بات کر رہا ہوں لیکن ہم انڈیا کی مدد کے بغیر آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔"

"آپ کیا ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ آپ کے دِل کی آواز ہے؟" —— اُس آدمی نے پوچھا۔

"کیا یہ ثبوت کافی نہیں" —— میجر سمیع نے کہا —— "کہ میں تین چار مہینوں سے کرشنا کماری کی اصلیّت جانتا ہُوں لیکن میں نے اُسے گرفتار کرانے کی بجائے اُس کی حفاظت کی اور دانستہ بیوقوف بن کر اُسے قیمتی معلومات دیتا رہا..... کیا میں آپ کو گرفتار نہیں کرا سکتا لیکن نہیں کراؤں گا۔ میں آپ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ آپ کا ٹھکانہ کون سا ہے" —— میجر سمیع نے اپنے کوٹ کی اندر والی جیب میں ہاتھ ڈالا اور میگزین والا چھوٹا پستول نکال کر اُسے دکھایا اور کہا —— "میں آپ کو گولی مار سکتا ہوں لیکن میں یہ پستول اس لیے نہیں لایا..... آپ جب چلے جائیں گے تو میں اس چٹان پر کھڑا ہو کر دیکھتا رہوں گا۔ کسی نے آپ کی طرف غلط نیّت سے بڑھنے کی کوشش کی تو میں اُسے گولی مار دوں گا۔"

اُس آدمی کا چہرہ بے تاثر تھا جیسے اُسے میجر سمیع کی کوئی بات سمجھ ہی نہ آئی ہو۔ وہ میجر سمیع کو دیکھتا رہا۔

"پستول جیب میں ڈال لیں" —— اُس نے کہا اور اپنے انداز سے کچھ ایسی باتیں شروع کر دیں جو میجر سمیع کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھ سکا۔

وہ آدمی بھارتی جاسوسوں کا اُستاد تھا۔ اس اُستادی کی اُسے تنخواہ تو ملتی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو لازم نہیں سمجھتا تھا۔ یہ اس کا پیشہ نہیں، اُس کا دھرم تھا اور اُس کی زندگی کا مشن۔ وہ ہندو تھا جس کے دِل

میں مسلمانوں کی نفرت بھری ہوتی تھی۔ مسلمانوں کو ڈنک مارنا وہ اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اُسے کتنا معاوضہ ملتا ہے اور اُسے اس سے بھی کوئی غرض نہیں تھی کہ میجر سمیع اور اس جیسے پاکستان آرمی کے بنگالی افسروں پر بھارت کو کتنی دولت لٹانی پڑے گی۔ اُسے مسجد کی جگہ مندر بنانا تھا۔

وہ گھاگھ اُستادوں کی طرح میجر سمیع الدّین کو ٹھونک بجا کر دیکھ رہا تھا اور میجر سمیع جو جواب دیتا تھا، اُسے اتنی غور سے سنتا تھا جیسے میجر سمیع کی ذات میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میجر سمیع کی حالت اُس ملزم جیسی ہوگئی جس سے تھانیدار پوچھ گچھ کر رہا ہو۔ وہ چڑ گیا۔

"کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"—— میجر سمیع نے جھنجھلا کر کہا —"کیا میں آپ کے اعتماد کے قابل نہیں ہوں؟"

"میجر سمیع الدّین!"—— اُس ہندو نے ہنس کر کہا —— "میں یہی دیکھنے کی کوشش کر رہا ہُوں کہ آپ جھوٹ بول سکتے ہیں یا نہیں۔ میں چاہتا ہُوں کہ آپ جھوٹ بولیں۔ میں یہ بھی دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کتنی جلدی اپنی خود اعتمادی سے دستبردار ہوتے ہیں۔ ہمیں جھوٹا اور فریب کار آدمی چاہیئے"۔

"یہ تو ٹریننگ کی بات ہے"—— میجر سمیع نے کہا —— "میں اپنے مشن کے ساتھ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں آپ کو فریب نہیں دے سکتا۔ جھوٹ اور فریب کاری کی جہاں ضرورت پڑے گی وہاں آپ مجھے جھوٹا اور فریب کار پائیں گے"۔

کچھ اور باتیں کہہ سُن کر اس آدمی نے ہاتھ بڑھایا۔ میجر سمیع نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہ ہاتھ مِلا کر چل پڑا۔ جاتے جاتے اُس نے کہا کہ اُسے اِطلاع مِل جائے گی۔

میجر سمیع اُسے دکھانے کے لیے قریب ہی ایک ٹیکری پر جا چڑھا۔ وہ ہندو ٹیکری سے گھوم کر چلا گیا۔ تھوڑی دور جا کر وہ بنگال کے سبزہ زار میں غائب ہوگیا۔ میجر سمیع ٹیکری سے اُترنے لگا تو اُسے دو آدمی نظر آئے جو اُدھر ہی جا رہے تھے جدھر ہندو چلا گیا تھا۔ یہ دونوں آدمی بنگالی معلوم ہوتے تھے۔ میجر سمیع ٹیکری سے اتر آیا اور ندی کی طرف چل پڑا۔

★

میجر سمیع ندی کے پتن سے سیدھا میجر انور کے کمرے میں گیا اور اُسے اس ہندو کے ساتھ ملاقات کی تمام تر روئیداد سُنا دی۔ میجر انور نے اُسے کہا کہ آئندہ بھی ان لوگوں کے ساتھ رابطہ اور کوئی بات چیت ہو تو فوراً بتا دیا کرے۔

میجر سمیع کے جانے کے بعد میجر انور اپنے دفتر میں چلا گیا۔ اُسے کسی کا انتظار تھا۔ اُس نے وہاں کام کرنے والے دو تین آدمیوں سے پوچھا کہ کوئی اُسے ملنے تو نہیں آیا۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی آ گئے۔ میجر انور کو اِنہی کا انتظار تھا۔ انہیں وہ اپنے دفتر میں لے گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

یہ وہی دو آدمی تھے جو میجر سمیع کو اُس وقت نظر آئے تھے جب وہ ہندو جاسوس کو رخصت کر کے ٹیکری پر چڑھا تھا۔ میجر سمیع انہیں نہیں جانتا تھا۔ انہیں وہ اسی علاقے کے کوئی مزدور کسان سمجھا تھا لیکن یہ دو آدمی میجر انور نے بھیجے تھے۔ انہیں نقشہ دکھا کر بتایا گیا تھا کہ وہ اس جگہ کے

ارد گرد اس طرح موجُود رہیں کہ انہیں کوئی دیکھ نہ سکے۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہاں انہیں بریگیڈ میجر، میجر سمیع گھومتا پھرتا نظر آئے گا۔ جب وہ آدمی چلا جائے تو دونوں چھُپ چھُپ کر اُس کا تعاقب کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں جاتا ہے۔

رات کو یہ دونوں آدمی میجر انور کو رپورٹ دینے آئے تھے۔ میجر انور نے اُنہیں دفتر آنے کو کہا تھا۔ اُنہوں نے جو کچھ دیکھا، میجر انور کو سُنا دیا۔ وہ چونکہ کچھ دُور چھُپ کر میجر سمیع اور ہندوستانی جاسوس کو دیکھ رہے تھے اس لیے ان کی باتیں نہ سُن سکے۔ میجر سمیع اور ہندو جاسوس جتنی دیر باتیں کرتے رہے وہ وقت اُنہوں نے آخری سیکنڈ کی حد تک نوٹ کر لیا تھا۔

اُنہوں نے بتایا کہ میجر سمیع کا ملاقاتی جب اُس سے رخصت ہُوا تو دونوں خاصا فاصلہ رکھ کر اُس کے پیچھے گئے۔ اُنہوں نے میجر سمیع کو ایک ٹیکری پر کھڑے دیکھا۔ ہندو جاسوس جس راستے پر گیا، ان آدمیوں نے وہ راستہ نقشے پر بتایا۔ ندی جس پُل سے اُس نے پار کی وہ پُل بھی نقشے پر دکھایا۔ پھر خاصا فاصلہ طے کر کے وہ شہر میں داخل ہُوا۔ یہ آدمی اُس کے پیچھے پیچھے رہے اور اُنہوں نے وہ مکان دیکھا جس میں وہ آدمی داخل ہُوا تھا۔

★

پاکستان آرمی کی انٹیلی جنس کے ان دو آدمیوں نے ہندو جاسوس کو جس مکان میں داخل ہوتے دیکھا تھا، یہ وہی مکان تھا جس میں کرشنا کماری نے اپنے رِنگ کے چیف کو شازی کے متعلق رپورٹ دی تھی۔ اُس رات جس وقت میجر انور اپنے آدمیوں سے رپورٹ لے رہا تھا، اس مکان میں کرشنا کماری کے جاسوسی رِنگ کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ جو جاسوس میجر سمیع الدّین سے مِلا تھا، اُس نے اپنی رپورٹ اِس طرح دی کہ میجر سمیع پر اعتماد کیا جا سکتا ہے لیکن ذرا اور احتیاط کی ضرورت ہے۔

"میں اُسے پوری طرح قابلِ اعتماد سمجھتی ہوں"—— کرشنا کماری نے کہا۔

"تمھاری رائے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کرشی!"—— رِنگ کے چیف نے کہا —"تم ابھی اُس عمر میں ہو جہاں جذبات کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہُوں کہ میجر سمیع کے معاملے میں تم کچھ جذباتی بھی ہو۔ میجر سمیع کو ابھی مزید آزمائش میں ڈالنے کی ضرورت ہے"۔

ایک آدمی کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس نے کسی کا نام لے کر کہا کہ آیا ہے۔ اُسے کہا گیا کہ اُسے فوراً اندر لے آؤ۔

"اچھا ہے تم سب یہاں موجود ہو"—— نووارد نے کمرے میں داخل ہوتے ہُوئے کہا —— "بڑی ضروری رپورٹ آئی ہے"۔

"کیا ہے؟"

"جس شازی کے متعلّق ہم نے پاکستان ڈیسک سے رپورٹ مانگی تھی وہ آگئی ہے"—— اُس آدمی نے زبانی رپورٹ سناتے ہُوئے کہا —"اس لڑکی نے اسلام آباد میں سیکرٹ سروس کے ایک رِنگ کو توڑا ہے۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنی ماں کو بھی گرفتار کروایا ہے۔ اسلام آباد اور مری کے درمیان ایک ریڈار کو تباہ کرنے کا مشن تھا۔ یہ مشن اس لڑکی کی وجہ سے ناکام ہُوا جس میں ہمارے

دو تین آدمی مارے گئے۔ اب یہ لڑکی کیپٹن اصغر نام کے ایک فوجی افسر کی بیوی بن کر جیسور میں آگئی ہے۔ اس لڑکی کے متعلق دلّی سے حکم آیا ہے کہ اسے اغوا کر کے دلّی بھیجا جائے تاکہ اُسے اپنے ایجنٹ کے تحت سزا دی جا سکے۔ اگر اغوا ناممکن ہو یا سرحد پار کرانا ناممکن ہو تو اس لڑکی کو قتل کر دیا جائے لیکن پوری کوشش یہ کی جائے کہ لڑکی زندہ دلّی پہنچائی جا سکے۔"

میٹنگ پر سنّاٹا طاری ہو گیا۔ کرشنا کماری کا رنگ اُڑ گیا کیونکہ وہ اپنا آپ شازی کے سامنے بے نقاب کر چکی تھی۔

"ناممکن کیوں؟" —— رنگ کے چیف نے کہا —— "اغوا ناممکن نہیں اور سرحد پار کرانا بھی ناممکن نہیں، مشرقی پاکستان ہمارا اپنا علاقہ ہے۔ ہم اُسے مسلمانوں کے ہاتھوں اٹھوا کر سرحد پار کرا دیں گے۔"

"میں یہ کام میجر سمیع سے کرا سکتی ہوں" —— کرشنا کماری نے کہا۔

رنگ کے چیف نے کرشنا کماری کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ماتھے پر شکن آ گئے۔ وہ کچھ دیر اسی حالت میں رہا جیسے بڑی گہری سوچ میں کھو گیا ہو۔

"ہوں" —— اُس نے اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز میں کہا —— "مشورہ اچھا ہے لیکن آرمی کا ایک میجر اپنے ساتھی افسر کی بیوی کو اغوا نہیں کرے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میجر سمیع اس لڑکی کو کسی بہانے اپنے ساتھ ایسی جگہ لے آئے جہاں ہمارے آدمی موجود ہوں اور وہ لڑکی کو اٹھا لائیں۔ اس طریقۂ کار میں میجر سمیع کو بتا دیا جائے کہ ہم اس لڑکی کو اغوا کریں گے۔ اُسے اعتماد میں لینا ضروری ہے۔"

"یہیں قتل کر دینے سے کچھ حاصل نہ ہو گا" —— اُس ہندو جاسوس نے کہا جو میجر سمیع سے ملا تھا —— "اِس لڑکی کو دلّی بھیجا جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہو گا کہ اسے جب سزا دی جائے گی تو ہمارے دوسرے ایجنٹ عبرت حاصل کریں گے اور اُنہیں یہ پتہ چل جائے گا کہ دنیا کے کسی کونے میں بیٹھ کر وہ غدّاری کریں گے تو وہ سزا سے بچ نہیں سکیں گے۔"

"کرشی!" —— چیف نے کرشنا کماری سے کہا —— "ہم ابھی اغوا کا پلان بنا لیتے ہیں۔ تم کل میجر سمیع سے بات کرو۔ لڑکی کو باہر لانے کا کام وہ کرے گا۔ اُسے کہہ دینا کہ اُس نے دھوکہ دیا تو وہ زندہ نہیں رہے گا اور اُس کے بچّوں کو بھی اس طرح قتل کیا جائے گا کہ قاتلوں کا سراغ نہیں ملے گا۔ اُسے یہ بھی کہہ دینا کہ یہ ویسٹ پاکستان نہیں۔ ایسٹ پاکستان پر ہماری حکمرانی ہے۔ تمہاری حکومت کو زمین کے اُوپر کچھ نظر نہیں آتا، زمین کے نیچے اُسے کیا نظر آئے گا۔"

★

اگلی رات میجر سمیع میجر انور کے کمرے میں بیٹھا تھا۔

"میں نے تو تمہاری بات سن لی ہے" —— میجر انور نے کہا —— "یہ معاملہ بڑا سنگین ہے۔ چلو ابھی بریگیڈیئر صاحب کے ہاں چلتے ہیں۔ اس پُورے رنگ کو پھانسنے کے لیے یہ بڑا اچھا پھندہ ہے لیکن جہاں تک میں انٹیلی جنس کی جنگ کو سمجھتا ہُوں، اس پھندے میں ہم خود بھی پھنس سکتے ہیں۔"

وہ اُسی وقت انٹیلی جنس کے بریگیڈیئر کے ہاں چلے گئے۔

"مجھے پوری بات سناؤ" —— بریگیڈیئر نے میجر سمیع سے کہا —— "میں تمہیں ایک بات بتا دیتا ہوں۔ ایک بریگیڈ کی انٹیلی جنس میں ایک میجر کافی ہوتا ہے لیکن جیسور کی انٹیلی جنس ایک بریگیڈیئر کے ہاتھ میں ہے۔ تم بریگیڈ میجر ہو۔ تم جانتے ہو کہ جیسور سرحدی علاقہ ہے اس لیے یہاں کی گیریزن کو وہ اہمیت حاصل ہے وہ ڈھاکہ کو بھی حاصل نہیں۔ دشمن یہاں جو بھی کارروائی کرے گا، وہ بڑی ہی سنگین اور بہت ہی خطرناک ہو گی۔ یہاں دشمن کی زیرِ زمین سنگین اور خطرناک کارروائیاں شروع ہو گئی ہیں اس لیے مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔ میں نے یہ بات تمہیں اس لیے بتائی ہے کہ تم دشمن کے کسی نقطہ کو بھی اور معمولی سے معمولی حرکت کو بھی غیر اہم نہ سمجھو.... کرشنا کماری کے ساتھ اور پھر اُس کے ہوتے آدمی کے ساتھ تمہاری جو ملاقاتیں ہوئی ہیں، وہاں تک کی رپورٹ میرے پاس محفوظ ہے۔ ایک گھر کی نشاندہی ہو چکی ہے۔ اب آگے سناؤ کیا ہُوا ہے۔"

"سر! تازہ رپورٹ یہ ہے" —— میجر سمیع نے کہا —— "کل کرشنا کماری مجھے ملی تھی۔ میں اُسے یقین دلا چکا ہوں کہ میں انڈین ایجنٹ اگر نہیں بنا تو بھی میں انڈین ایجنٹ ہوں۔ کرشنا کماری نے مجھے کہا کہ شازی کو اغوا کرنا ہے اور یہ کام مجھے کرنا ہے۔ اُنہوں نے مجھے یہ کام سونپا ہے کہ میں شازی کو پکنک کے بہانے اُسی جگہ لے جاؤں جہاں میری اور کرشنا کماری کی ملاقاتیں ہُوا کرتی ہیں.... سر! یہ لوگ بڑے ہی ذہین ہیں۔ جو بات مجھے سوچنی چاہیئے تھی وہ اُنہوں نے خود ہی سوچ کر مجھے ایک طریقہ بتا دیا۔ اُنہوں نے کرشنا کماری کی زبانی کہلوایا ہے کہ میں اپنے بیوی بچوں کو پکنک کے لیے لے جاؤں اور کیپٹن اصغر اور شازی کو پکنک پر مدعو کر دوں۔ یہ لوگ خود ہی سمجھ گئے ہیں کہ شازی اکیلی میرے ساتھ باہر نہیں جائے گی۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ پکنک کے دوران میں اصغر کو باتوں باتوں میں عورتوں سے دُور لے جاؤں اور عورتوں کو الگ بیٹھا رہنے دوں۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ میں اصغر کو کس طرف لے جاؤں۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ باقی کام اُن کا اپنا ہو گا۔ اُنہوں نے مجھے یہ تسلی بھی دی ہے کہ میری بیوی اور میرے بچّوں کو ذرا سا نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ کرشنا کماری نے مجھے کہا ہے کہ یہ میری آزمائش ہے۔ اگر میں اس میں پُورا اُترا تو مجھے ایک تو باقاعدہ اس رنگ میں شامل کر لیا جائے گا اور دوسرے مجھے بہت بڑی رقم دی جائے گی۔"

"تم نے کیا کہا ہے؟" —— بریگیڈیئر نے پوچھا۔

"سر!" —— میجر سمیع نے جواب دیا —— "میں آپ سے ہدایت اور حکم لیے بغیر اُنہیں کوئی وعدہ نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے فوراً ایک بہانہ سوچ لیا۔ میں نے کرشنا کماری سے کہا کہ میں کیپٹن اصغر سے بات کر لوں کہ وہ آنے والے اتوار کو پکنک کے لیے فارغ ہو گا یا نہیں.... کرشنا کماری کو یہ بات اچھی لگی۔ وہ کہنے لگی کہ کل ٹیلیفون پر مجھے صرف اتنا کہہ دینا —— 'اگلے سنڈے' —— اور اُس نے وقت صبح دس بجے کا بتایا تھا۔"

"ٹھیک ہے سمیع!" —— بریگیڈیئر نے کہا —— "کل تم اُسے کہہ دو —— 'اگلے سنڈے دس بجے' —— اصغر اور شازی کو ہم خود بتائیں گے کہ اُنہیں کیا کرنا ہے۔ تم اپنی بیوی سے بات نہ کرنا۔ شازی کی بات کچھ اور ہے۔ میں اُس لڑکی سے مِل چکا ہُوں۔ وہ صحیح معنوں میں سیکرٹ سروس کی لڑکی ہے اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ جوابی حملہ کرنے کی ذہانت اور ہمّت بھی رکھتی ہے.... تم جا سکتے ہو

سمیع!..... انور، تم کچھ دیر میرے پاس بیٹھو۔"

میجر سمیع جانے کے لیے اُٹھا۔

"سمیع!" ــــ بریگیڈیئر نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکتے ہوئے کہا ــــ "میں بریگیڈ کمانڈر نہیں، انٹیلی جنس کا بریگیڈیئر ہوں۔ میری نظر زمین کے نیچے تک چلی جاتی ہے۔ میں نے ابھی تک تمہیں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کہی لیکن یہ معاملہ اتنا سنگین ہے کہ میں تمہیں ایک بات کہہ دینا چاہتا ہوں..... میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا کہ تمھارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم اس رِنگ کے ممبر نہیں ہو اور تم ہمیں دھوکہ نہیں دو گے؟"

"سر!" ــــ میجر سمیع نے کہا لیکن کچھ بول نہ سکا۔ اُس نے گھونٹ سا نگلا اور چُپ رہا۔

"کہو سمیع!" ــــ بریگیڈیئر نے کہا ــــ "بیٹھ جاؤ۔ میں جانتا ہوں میری بات تمہیں اچھی نہیں لگی لیکن میں تمہیں پھر یاد دلاتا ہوں کہ میں انٹیلی جنس کا افسر ہوں۔ مجھے بال کی کھال اتارنی پڑتی ہے۔"

"سر!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "میں آپ کی کسی بات سے ناراض نہیں ہوں۔ اگر آپ مجھے بنگالی افسر سمجھ کر مشکوک سمجھتے ہیں تو میں آپ کو روک نہیں سکتا۔"

"نہیں سمیع، نہیں" ــــ بریگیڈیئر نے پُرزور آواز میں کہا ــــ "کم از کم مجھ پر یہ الزام نہ لگاؤ۔ خُدا کی قسم، بنگال کے ایک بچّے کی خاطر میں اپنی جان دے دوں گا۔ میں نے تمہیں اپنے اعتماد میں لیا ہے۔"

"تھینک یو سر!" ــــ میجر سمیع نے کہا ــــ "میرے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں کہ میں سچّا پاکستانی ہوں۔ میں قرآن ہاتھ میں لے کر قسم کھانے کا قائل نہیں۔ آپ کو وقت اور میرا ایکشن بتائے گا کہ میں غدّار ہوں یا سچا پاکستانی..... ایک فوجی کی زبان سے جذباتی باتیں بھی اچھی نہیں لگتیں لیکن....."

میجر سمیع اچانک خاموش ہو گیا۔ اس نے گھونٹ سا نگلا اور بریگیڈیئر کی طرف دیکھا۔ میجر سمیع کی پُرشباب آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اُس کے چہرے کا رنگ بھی بدلتا جا رہا تھا۔ اُس نے قدرے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "انڈیا کے اس سپائی رِنگ کے ساتھ میری لڑائی میری ذاتی لڑائی ہے" ــــ اُس نے دایاں پاؤں فرش پر مارتے ہوئے کہا ــــ "یہ دھرتی میرے شہید بھائی کی دھرتی ہے۔ ۱۹۴۶ء کے آخر میں میرا بھائی اس دھرتی کے حصول کی خاطر شہید ہوا تھا۔ یہ پاکستان میرے خاندان نے بنایا تھا۔ میری رگوں میں پاکستانی خون ہے" ــــ میجر سمیع کی آواز بلند ہوتی چلی گئی ــــ "اگر آپ بریگیڈیئر نہ ہوتے تو معلوم نہیں میں اس سوال کا کیا اور کس طرح جواب دیتا کہ میں انڈین ایجنٹ ہوں یا نہیں..... میں آپ کو یقین نہیں دلا سکتا۔ میرا ایکشن آپ کو یقین دلائے گا" ــــ میجر سمیع اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کچھ دیر اور بیٹھو سمیع!" ــــ بریگیڈیئر نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا ــــ "تم کچھ جذباتی ہو گئے ہو۔ میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ کچھ دیر اور بیٹھو۔"

"نہیں سر!" ــــ میجر سمیع نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ "آپ حکم دیتے ہیں تو رُک جاتا ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اپنے جذبات پر پُورا پُورا قابو ہے۔ آپ کو یقین دلانے کے لیے کچھ باتیں جذباتی رنگ میں میرے مُنہ سے نکل گئی ہیں۔"

"بیٹھ جاؤ یار!" ــــ بریگیڈیئر نے دوستانہ بے تکلّفی سے کہا ــــ "کافی پی کر جانا۔"

★

دو دن اور گذر گئے۔ ان دو دنوں میں میجر سمیع نے کرشنا کماری کو بتا دیا تھا کہ وہ شازی کو اگلے اتوار پکنک پر مقررہ جگہ لا رہا ہے۔ اصغر اور شازی کو میجر انور نے بتایا تھا کہ وہ دونوں میجر سمیع کے ساتھ پکنک پر جائیں گے۔ انٹیلی جنس کے بریگیڈیئر نے بریگیڈ کمانڈر کو پوری رپورٹ دے دی تھی اور بریگیڈ کمانڈر نے اس رِنگ کو پکڑنے کا پلان بنا لیا تھا جس میں بارہ کمانڈو جوان بھی شامل کیے گئے تھے۔ اب اصغر اور شازی کو آخری ہدایات دینا باقی تھیں۔ دن کے وقت شازی کو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بلانا مناسب نہیں تھا کیونکہ بھارت کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے۔ وہ شازی کو بریگیڈ کمانڈر کے دفتر میں جاتا دیکھ کر اپنا پلان بدل ڈالتے۔ بریگیڈ کمانڈر کے ساتھ شازی کی ملاقات کا موزوں اور محفوظ وقت رات کا تھا اور وہ بھی بریگیڈ کمانڈر کے بنگلے میں۔

رات کے نو بج رہے تھے جب شازی اور اصغر بریگیڈ کمانڈر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ بریگیڈ کمانڈر، انٹیلی جنس کا بریگیڈیئر، میجر انور اور میجر سمیع بھی وہاں موجود تھے۔

"شازی!" ــــ بریگیڈ کمانڈر نے کہا ــــ "تمہیں سب کچھ بتایا جا چکا ہے۔ اب آخری ایک دو باتیں بتانی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم اُس صورتِ حال میں گھبراؤ گی نہیں..... گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔ ہمارے جوان وہیں اُن آدمیوں کو پکڑ لیں گے۔"

"وہیں؟" ــــ شازی نے پوچھا۔

"اور کہاں؟" ــــ بریگیڈ کمانڈر نے کہا ــــ "وہ تمہیں اغوا کرنے آئیں گے۔ ہمارے آدمی قریب ہی چھپے ہوتے ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے تم ہماری بات سمجھ نہیں سکیں یا تم کچھ اور سوچ رہی ہو۔"

"جی ہاں" ــــ شازی نے کہا ــــ "میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جو آدمی مجھے اغوا کرنے آئیں گے وہ انڈیا کے کمانڈو ہوں گے یا مشرقی پاکستان کے رہنے والے آدمی ہوں گے جو یہ کام کرانے پر کریں گے۔ انہیں آپ پکڑ لیں یا مار ڈالیں، وہ رِنگ محفوظ رہے گا جسے آپ توڑنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد رِنگ کو توڑنا ہے۔"

"تم نے جو سوچا ہے وہ بتا دو" ــــ بریگیڈ کمانڈر نے ایسے لہجے میں کہا جیسے استاد نے ازراہِ مذاق کسی شاگرد سے کہا ہو کہ یہ سوال مجھے تم سمجھا دو میں نہیں جانتا۔

"آپ بریگیڈیئر ہیں" ــــ شازی نے کہا ــــ "آپ نے جو پلان بنایا ہے وہ یقیناً بہت اچھا ہو گا لیکن اس سے دشمن کا رِنگ نہ ٹوٹا تو اس کی اچھائی مشکوک ہوگی۔"

"شازی بیٹی!" ــــ بریگیڈ کمانڈر نے شفقت سے کہا ــــ "دراصل پلان تو کچھ اور ہونا چاہیے تھا جس سے پورا رِنگ ہمارے ہاتھ آجاتا لیکن ہم تمہیں خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ ہم نے سوچا تو یہ تھا کہ تمہیں اغوا ہونے دیا جاتے اور جونہی وہ لوگ اس اطمینان سے اپنے ٹھکانے پر پہنچیں کہ اُن کی کارروائی کامیاب ہے، اُن پر شبخون مارا جائے لیکن ہم تمہیں اتنے کڑے امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ تم آخر لڑکی ہو۔"

"میں جو کچھ بھی ہوں" ــــ شازی نے پُرعزم آواز میں کہا ــــ "میں اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا چاہتی ہوں۔ آپ کس خطرے کی بات کرتے ہیں۔ یہی نا کہ وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گے، تو مار ڈالیں۔ کیا میری جان اس ملک سے زیادہ قیمتی ہے؟ آپ صرف یہ دیکھیں کہ جب وہ مجھے اپنے ٹھکانے پر لے

جائیں تو آپ فوراً شبخون ماریں۔ میں اپنی جان بچانے کی خود کوشش کروں گی۔"

"تو کیا تم اغوا ہونا چاہتی ہو؟" ـــــ انٹیلی جنس کے بریگیڈیئر نے پوچھا۔

"اگر میں اغوا نہیں ہوں گی تو آپ کی کارروائی بے کار جائے گی" ـــــ شازی نے کہا ـــــ "وہ مجھے اغوا کرنے آئیں گے، وہ خالی ہاتھ نہیں آئیں گے۔ وہاں ریوالور فائر ہوں گے۔ شاید سٹین گنیں بھی ہوں۔ کچھ آدمی اُن کے مارے جائیں گے، کچھ آپ کے مارے جائیں گے۔ ایک دو زخمیوں کو آپ پکڑ لیں گے تو پھر کیا ہو گا!.... کچھ بھی نہیں .... آپ مجھے اغوا ہونے دیں۔"

"شازی!" ـــــ بریگیڈ کمانڈر نے کہا ـــــ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قسم کی فوجی کارروائیوں کو بھی سمجھتی ہو۔"

"میں ایسی ہی کارروائیوں کی فضا میں پل کر جوان ہوئی ہوں" ـــــ شازی نے کہا ـــــ "آپ کو شاید معلوم ہو گا ہی کہ انڈیا والے اپنے جاسوسوں اور تخریب کاروں کو کتنی سخت اور کتنی زیادہ ٹریننگ دیتے ہیں۔ آپ کرشنا کماری سے پوچھیں۔ وہ ان کارروائیوں کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو گی۔"

"کیوں اصغر!" ـــــ بریگیڈ کمانڈر نے پوچھا ـــــ "کیا تم اپنی بیوی کو اس خطرے میں جانے کی اجازت دے دو گے؟"

"کیوں نہیں سر!" ـــــ کیپٹن اصغر نے جواب دیا ـــــ "ہمیں ملک کا فائدہ سوچنا ہے۔"

دونوں بریگیڈیئر اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد ڈرائنگ روم میں آئے اور بریگیڈ کمانڈر نے انہیں بدلا ہوا پلان سمجھایا۔

★

ایک وہ جنگ ہے جو فوجیں لڑتی ہیں۔ تاریخ میں انہی جنگوں کا تفصیلی یا مختصر ذکر آتا ہے۔ ایک معرکے ہیں جو لڑے تو زمین پر ہی جاتے ہیں لیکن انہیں زیرِ زمین کہا جاتا ہے۔ اتنے خفیہ کہ تاریخ کو نظر نہیں آتے لیکن اتنے اہم کہ یہ نہ لڑے جائیں تو فوجیں ہار جاتی ہیں۔ یہ زیرِ زمین معرکہ لڑنے والا ایک آدمی سرحد پر لڑنے والی پوری بٹالین کا کام کرتا ہے۔ تاریخوں میں ان معرکوں کا ذکر کم ہی آتا ہے۔ شازی، میجر سمیع، کیپٹن اصغر اور پاکستان آرمی کے صرف بارہ کمانڈو جوان ایسا ہی ایک معرکہ لڑنے جا رہے تھے۔

اتوار کی صبح تھی۔ میجر سمیع، اُس کی بیوی، چاروں بچے، کیپٹن اصغر اور شازی اُس جگہ بیٹھے تھے جہاں میجر سمیع اور کرشنا کماری کی ملاقاتیں ہُوا کرتی تھیں۔ دس بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے میجر سمیع اور کیپٹن اصغر اُٹھ کھڑے ہوتے ہوئے میجر سمیع نے اپنی بیوی اور شازی سے کہا کہ تم دونوں کھانے پینے کا سامان نکالو، ہم گھوم پھر کر آتے ہیں۔

وہ دونوں ٹہلتے ٹہلتے دُور نکل گئے۔ اُن دونوں کے پاس ریوالور تھے بتیس بور کا میگزین والا چھوٹا سا پستول شازی نے اپنے نیفے میں اُڑس رکھا تھا۔

اچانک آٹھ آدمی جھاڑیوں میں سے نکلے اور اُنہوں نے میجر سمیع کی بیوی اور شازی کو گھیرے میں لے لیا میجر سمیع کی بیوی ڈر گئی۔ اتنی ڈری کہ اُس کے مُنہ سے آواز بھی نہ نکلی۔

"تمہارا نام شازی ہے!" ـــــ ایک آدمی نے شازی سے کہا ـــــ "تم نہایت خاموشی سے اُٹھو

اور ہمارے ساتھ چل پڑو۔ خود نہیں چلو گی تو ہم تمہیں اُٹھا کر لے جائیں گے، یہاں تمہاری چیخ و پکار کوئی نہیں سُنے گا۔"

شازی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے اپنے چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے تاثرات پیدا کر لئے۔

"میں اکیلی لڑکی اتنے سارے آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی" ـــــ شازی نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ـــــ "لیکن ایک التجا ضرور کروں گی کہ اس عورت کو ہاتھ نہ لگانا۔ میں جانتی ہوں تم مجھے کیوں اپنے ساتھ لے جا رہے ہو اور میرا انجام کیا ہو گا۔"

"ہمیں صرف تمہاری ضرورت ہے" ـــــ ایک آدمی نے کہا ـــــ "چلو .... اور یہ سُن لو کہ راستے میں تم نے کہیں بھی شور شرابہ کیا تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔"

شازی اُن کے ساتھ چل پڑی۔ پلان کے مطابق اُسے مزاحمت کرنی ہی نہیں تھی ورنہ وہ لوگ اُسے اُٹھا لیتے اور اُس کے نیفے میں اُڑسا ہُوا پستول بے نقاب ہو جاتا جس کا نتیجہ نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ لوگ جب نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میجر سمیع کی بیوی کی چیخیں بلند ہوئیں اور وہ سمیع اور اصغر کو پکارنے لگی۔ اُسے نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ کیا ناٹک کھیلا جا رہا ہے میجر سمیع اور اصغر دوڑے آئے میجر سمیع نے اپنی بیوی کو تسلّی دلاسہ دیا اور کہا کہ وہ چپ رہے، اُنہیں معلوم ہے کیا ہو رہا ہے۔

★

مشرقی پاکستان کی زمین کے خدوخال ایسے ہیں کہ انسان دو چار قدم پرے جا کر لاپتہ ہو جاتا ہے جھاڑیاں گھنی ہیں۔ بونے بونے درخت اور اُن کی پھیلی ہوئی شاخیں کچھ دیکھنے نہیں دیتیں۔ سبزے سے اٹی ہوئی ٹیکریاں اور چٹانیں مُجرموں اور مفروروں کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہیں۔

وہ آٹھ آدمی ایک ایسی جگہ جا رُکے جہاں دلدل زیادہ تھی اور وہاں سے کسی کے گذرنے کا امکان بہت کم تھا۔ اُنہوں نے شازی کو بنگال کا بنا ہوا ایک کھیس دیا اور اُسے کہا کہ وہ اسے اپنے اوپر اس طرح اوڑھ لے کہ اُس کی صرف آنکھیں نظر آئیں۔ شازی نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ اُن آٹھ آدمیوں میں سے چار آدمی آگے نکل گئے۔ جب وہ کچھ دُور چلے گئے تو باقی چار آدمی شازی کو اپنے ساتھ لے کر چل پڑے۔ اُن میں سے ایک آدمی نے شازی کا بازو پکڑ لیا۔ شازی نے جھٹکے سے اپنا بازو اُس سے چھڑا لیا۔

"میرے جسم کو ہاتھ مت لگاؤ" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔ بھاگوں گی نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کہاں اور کیوں لے جایا جا رہا ہے۔"

اس کے بعد کسی نے اُس کے جسم کو ہاتھ نہ لگایا۔ ان میں سے کسی نے بھی اُس کے ساتھ کوئی فالتو بات نہ کی۔ اُنہیں شاید حکم ہی ایسا ملا تھا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ صرف ضروری بات کریں۔

اُنہیں معلوم نہ تھا کہ مشرقی پاکستان کے جس جنگل میں وہ چُھپ چُھپ کر چلے جا رہے ہیں، وہاں ڈھکی چھپی آنکھیں اُنہیں دیکھ رہی ہیں اور یہ آنکھیں اُن کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی ہیں۔ آگے ایک جگہ پانی جمع تھا۔ وہاں غریب سا ایک آدمی جس نے بنگالی دھوتی باندھ رکھی تھی جس کے اوپر صرف ایک بنیان تھی، پانی کے کنارے کھڑا دو بکریوں کو پانی پلا رہا تھا۔ اُس نے ان چار آدمیوں اور اُن کے ساتھ کھیس میں لپٹی ہوئی ایک عورت کو دیکھا تو یوں مُنہ پھیر لیا جیسے اُسے اُن لوگوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ ہو لیکن اس

کی تمام تر دلچسپیاں اپنی بکریوں کی بجائے اُن کے ساتھ وابستہ تھیں۔ وہ سب آگے نکل گئے تو وہ بکریوں کو ساتھ لیے اُن کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

چار آدمی جو آگے چلے گئے تھے، وہ ندی تک پہنچ گئے جہاں ایک لانچ کھڑی تھی۔ وہ اس میں سوار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد یہ چار آدمی بھی پہنچ گئے جن کے ساتھ شازی تھی۔ وہ بھی لانچ میں سوار ہو گئے۔ شازی کو اُنہوں نے سیٹ پر بٹھانے کی بجائے فرش پر بٹھا دیا اور لانچ چل پڑی۔

سامنے والے کنارے پر اس لانچ سے دو اڑھائی فرلانگ آگے ایک موٹر بوٹ کھڑی تھی جس میں دو آدمی کھڑے تھے۔ جب شازی کو اغوا کرنے والوں کی لانچ چلی تو وہ موٹر بوٹ بھی چل پڑی وہ اس لانچ کے آگے آگے جا رہی تھی۔ لانچ کی رفتار تیز ہو گئی اور موٹر بوٹ کی رفتار سست پڑ گئی۔ ندی خاصی چوڑی تھی۔ لانچ موٹر بوٹ سے کچھ دور ہٹ کر گذری۔ لانچ میں بیٹھے ہوئے ہر ایک آدمی نے موٹر بوٹ کی طرف دیکھا لیکن موٹر بوٹ والوں نے اُن کی طرف نہ دیکھا۔

لانچ تقریباً تین میل دُور ایسی جگہ رُکی جو ویران تھی۔ وہ سب اُتر گئے اور شازی کو اتار کر ساتھ لے گئے۔ موٹر بوٹ لانچ کے قریب سے گذر کر آگے چلی گئی۔ جب لانچ والے آدمی وہاں سے غائب ہو گئے، تو موٹر بوٹ واپس آ گئی۔

★

وہ مکان جہاں جاسوسوں کے اس رِنگ کی میٹنگ ہُوا کرتی تھی، شہر سے ذرا باہر کی طرف تھا۔ اُس کے ارد گرد اور اُس کے ساتھ ملے ہوئے مکان بھی تھے۔ پاکستان انٹیلی جنس والوں کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ مکان اس رِنگ کا خفیہ اڈہ ہے اس لیے اُنہوں نے اسی پر نظر رکھی لیکن اُن کی گہری نگرانی اور تعاقب ان لوگوں پر مرکوز تھا جو شازی کو لے جا رہے تھے۔ وہ کہیں اور بھی جا سکتے تھے۔ اپنی انٹیلی جنس کا اندازہ صحیح نکلا۔ اُس مکان سے کچھ دُور جا کر چھ آدمی اِدھر اُدھر ہو گئے۔ شازی کے ساتھ صرف دو آدمی رہ گئے اور وہ اُس مکان میں داخل ہو گئے۔ دو چار منٹ کے وقفے سے باقی آدمی بھی ایک ایک کر کے اُس مکان میں چلے گئے۔

وہ مکان مغربی پاکستان کی حویلیوں کی ساخت کا تھا۔ جب آخری آدمی اندر چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا تو اُس مکان کے دائیں اور بائیں طرف والے مکانوں کی چھتوں پر پانچ چھ آدمی نظر آئے۔ جاسوسوں کے مکان کی چھت اونچی تھی، اوپر فصیل تھی۔ دونوں طرف دو سیڑھیاں آ لگیں جب ان سیڑھیوں پر آدمی چڑھے تو فصیل کے اوپر سے ایک سر نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی اُوپر سے ایک ریوالور فائر ہُوا اور سیڑھی پر چڑھنے والا سب سے آگے والا آدمی سیڑھی سے لڑھکتا نیچے آ پڑا۔ گولی اُس کے کندھے میں سے گذر گئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھنے والے پاکستان آرمی کے کمانڈو تھے، وہ پیچھے ہٹ آئے۔ اُن میں ایک نے گرینیڈ نکال کر بڑے مکان کی چھت پر پھینکا۔ پھر یوں ہُوا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ فصیل سے فائر آنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے حویلی میں جتنے آدمی تھے، سب اوپر آ گئے ہوں۔ کمانڈو ساتھ والے مکانوں کی چھتوں پر بڑی اچھی پوزیشنوں پر چلے گئے۔ نیچے چار آدمی مکان کا دروازہ فوجی کلہاڑیوں سے توڑنے لگے۔

اس آبادی کے لوگوں کی چیخ و پکار بلند ہوئی۔ عورتیں اور بچے گھروں سے چیختے چلاّتے نکلے اور اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ تمام آبادی میں بھگدڑ مچ گئی۔ دونوں طرف کے فائر میں شدّت پیدا ہو گئی۔

★

اندر ایک تو یہ آٹھ آدمی تھے جنہوں نے شازی کو اغوا کیا تھا۔ اس رِنگ کا چیف بھی موجود تھا۔ اس کے ساتھ چار پانچ ساتھی بھی تھے جو اس رِنگ کے اہم افراد تھے۔ کرشنا کماری بھی وہیں تھی۔ ایک آواز سنائی دی کہ اس لڑکی کو ختم کر دو لیکن چیف نے روک دیا اور کہا کہ ہم دیوار توڑ کر ساتھ والے مکان میں چلے جائیں گے، لڑکی کو زندہ رہنے دو۔

دو آدمی شازی کو دھکیلتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے۔ وہاں سے اگلے کمرے میں لے گئے اور جب اُس کی طرف پیٹھ کر کے کمرے سے نکلنے لگے تو شازی نے اپنا پستول نکال لیا۔ اس کی میگزین میں گیارہ گولیاں تھیں۔ اُس نے یکے بعد دیگرے دو فائر کر کے دونوں آدمیوں کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ دو چار منٹ بعد کمرے کا دروازہ کھُلا اور کرشنا کماری دوڑتی ہوئی آئی۔

"شازی!" —— کرشنا کماری نے کہا —— "ڈرنا مت، تم زندہ رہو گی"۔

وہ جب شازی کے قریب آئی تو شازی نے پستول جو اپنے پیچھے کر رکھا تھا، سامنے کیا اور گولی چلا دی۔ کرشنا کماری ایک دو سیکنڈ کھڑی رہی، پھر اُس کا سر ڈولا اور اُس کی ٹانگیں دوہری ہو گئیں اور وہ دھڑام سے گر پڑی۔

چھت پر اور باہر اتنی زیادہ فائرنگ تھی کہ شازی کے پستول کے دھماکے کسی کو سنائی نہ دیے۔ وہ اس کمرے سے نکل گئی اور اگلے کمرے کے بند دروازے کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے ایک کواڑ ذرا سا کھولا۔ صحن میں اُسے ایک آدمی نظر آیا۔ شازی نے اُس کے کولہے کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ وہ اُسے صرف زخمی کرنا چاہتی تھی۔ وہ آدمی چکر کھا کر گر پڑا۔ شازی نے کواڑ بند کر دیا۔

شازی کو صحن میں ایک آواز سنائی دی —— "ایمونیشن ختم ہو رہا ہے" —— پھر اُسے ایک اور آواز سنائی دی —— "نیچے آؤ، اُدھر کی دیوار توڑو اور نکل جاؤ۔ لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانا"۔

اتنے میں دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ اُدھر سے کسی انفنٹری بٹالین کی ایک کمپنی آ گئی جس نے پلان کے مطابق اس آبادی کو گھیرے میں لے لیا۔ کمانڈو اس مکان کی چھت پر چڑھنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے باقی کمانڈو اندر آ گئے۔

معرکہ ختم ہو چکا تھا لیکن دشمن نے شازی کو قتل کرنا ضروری سمجھا۔ ایک آدمی اپنے چیف کے حکم سے دوڑتا ہُوا اس کمرے میں داخل ہُوا۔ شازی کواڑ کے پیچھے ہو گئی۔ جوں ہی وہ آدمی اگلے کمرے کی طرف گیا، شازی نے پیچھے سے گولی چلا دی۔ وہ آدمی اگلے کمرے کے دروازے کے ساتھ ٹکرایا اور گر پڑا۔ باہر دشمن کے جو آدمی بچ گئے تھے، وہ ہتھیار ڈال رہے تھے۔

کمانڈو تمام کمروں میں گھوم گئے۔ ایک نے شازی سے اس کا نام پوچھا۔ اُس نے اپنا نام بتایا تو کمانڈو نے کہا، اب باہر آ جاؤ۔ شازی فاتحانہ چال چلتی باہر نکلی۔

اس مکان سے لاشوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ برآمد ہُوا جس میں جدید آلات بھی تھے۔ رِنگ کے چیف کے ساتھ اُس کے اہم افراد بھی پکڑے گئے۔ جن آدمیوں نے شازی کو اغوا کیا تھا،

وہ تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔
جب ان لوگوں کو ہتھکڑیاں لگا کر باہر لایا جا رہا تھا تو کیپٹن اصغر پاگلوں کی طرح دوڑتا اندر آیا۔ اُسے دیکھ کر شازی اُس کی طرف دوڑی اور وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

"ایسٹ پاکستان میں ہمارا ایک رنگ ٹوٹ گیا ہے۔"
ایک قہقہہ —— طنزیہ اور زہریلا قہقہہ۔
"بنگلے پاکستانی خوش ہو رہے ہوں گے کہ اُنہوں نے جیسور میں ہمارا ایک رنگ توڑ دیا ہے۔ اِن بدبختوں کو معلوم نہیں کہ ان کا پُورا ایسٹ پاکستان ہمارے رنگ میں آچکا ہے۔"
ایک اور قہقہہ۔
"اور اِس رنگ میں ہم مغربی پاکستانیوں کو اُسی طرح نچائیں گے جس طرح سرکس کے رنگ میں رنگ ماسٹر سدھائے ہُوئے جانوروں کو نچایا کرتا ہے۔"
یہ دِلّی کی آوازیں تھیں جو بھارت کی انٹیلی جنس کے اُس شعبے سے اُٹھ رہی تھیں جس کا تعلق مشرقی پاکستان کے ساتھ تھا۔ زمین دوز تخریب کاری کے بہترین دماغ اس شعبے میں اکٹھے کر لیے گئے تھے۔ ان میں رُوس کی سیکرٹ سروس "کے۔جی۔بی" اور اسرائیل کی "موساد" کے اُستاد بھی شامل تھے۔
یہودیوں کے گورو بِن گوریَن نے کہا تھا کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اس لیے پاکستان اسرائیل کے وجود کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ بن گوریَن نے کہا تھا کہ پاکستان اور عرب کا رشتہ اسلام اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وجہ سے بڑا مضبُوط ہے، لہٰذا پاکستان اسرائیل کا دشمن نمبر ایک ہے اور اسے ختم کرنا ضروری ہے۔
اسرائیلیوں نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک فوج کی لڑنے کی اہلیّت اور پاکستانی قوم کا جذبۂ ایثار اور حبّ الوطنی کا جنون دیکھ لیا تھا اور ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا تھا کہ اس قوم کو شکست دینا ممکن نہیں۔ جس قوم کا سپاہی دس کا مقابلہ کر سکتا ہو اُسے شکست دینا ممکن نہیں ہُوا کرتا لیکن یہودیوں اور ہندوؤں نے پاکستانیوں کو شکست دینے کے دوسرے طریقے سوچ لیے تھے۔ بابائے اسرائیل بِن گوریَن نے کہا تھا کہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی جو نفرت ہے، اسے پاکستان کی تباہی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے اسرائیلیوں کو اس کا طریقہ یہ بتایا تھا کہ پاکستان کے خلاف بھارت کو اسرائیل کا اڈہ بنایا جائے۔

بھارت اسرائیل کا اڈہ بن چکا تھا۔ اسرائیل نے جنگل کی لڑائی اور گوریلا آپریشن کا ایک ماہر جرنیل بھارت کو دے دیا تھا جس کا نام جنرل جیکب تھا۔ بھارت نے اسے اپنی ایسٹرن کمانڈ میں شامل کر لیا تھا جنرل جیکب مشرقی پاکستان جیسے دلدلی اور جنگلاتی علاقے میں جس میں چھوٹی بڑی ندیوں کا جال بچھا ہُوا تھا، گوریلا اور کمانڈو آپریشن لڑانے کا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔
جن دنوں شازی کے دلیرانہ اقدام سے بھارتی جاسوسوں اور تخریب کاروں کا ایک رنگ ٹوٹا اور ایک اڈہ بے نقاب ہُوا تھا، اُس وقت تک پاکستان کے اُس وقت کے صدرِ مملکت کے کہنے

مطابق، مشرقی پاکستان میں پچاس سے اسّی ہزار تک بھارتی فوج کے تربیّت یافتہ کمانڈو داخل ہو چکے تھے۔ ان کی کیفیّت ویسی ہی تھی جیسے کسی تندرست انسان کے خون میں مہلک جراثیم داخل ہو گئے ہوں اور ان کا کوئی علاج نہ ہو۔

جب جیسور کے واقعہ کی رپورٹ کلکتہ میں بھارت کی ایسٹرن کمانڈ سے ہوتی ہوئی دِلی پہنچی تو وہاں کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ اس پر معمول کے مطابق کاغذی کارروائی ہوئی اور عام سی قسم کی ہدایات جاری کر دی گئیں جن میں ایک یہ تھی کہ جیسور کے ٹوٹے ہوتے رِنگ کا نعم البدل تیار کیا جائے۔

مشرقی پاکستان میں شاید کہیں اور بھی بھارت کا کوئی جاسوسی رِنگ ٹوٹا ہو لیکن زیادہ تر رِنگ بنتے پھیلتے اور مضبُوط ہوتے گئے۔ ہمارے سیاستدان اقتدار کی معرکہ آرائی میں مصرُوف تھے۔ مغربی پاکستان سیاسی ہنگاموں اور مظاہروں کی لپیٹ میں آیا ہُوا تھا۔ ایک آمر کی بساط اُلٹائی جا رہی تھی اور سیاسی لیڈر اپنی اپنی بساط بچھانے کو ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ رُوس اور امریکہ اپنے اپنے مفاد کے مطابق پاکستان کی سیاست میں نقد بازی لگاتے چلے جا رہے تھے۔ یہ پیسہ سٹوڈنٹ لیڈروں میں بے دریغ تقسیم ہو رہا تھا اور طلباء سے ہنگامے اور مظاہرے کرائے جا رہے تھے۔

ایک طرف سے روٹی، کپڑے اور مکان کے نعرے بلند ہو رہے تھے، دوسری طرف اسلام اسلام کے نعرے تھے۔ قوم دائیں اور بائیں بازو میں تقسیم ہوتی جا رہی تھی۔ اسلام پسندی ایک طنز اور "روٹی کپڑا اور مکان" ایک نظریہ بنتا جا رہا تھا۔ ہر طرف فریب ہی فریب تھا — اور بھارت مشرقی پاکستان میں اپنے قدم جماتا چلا جا رہا تھا۔ ڈھاکہ جو مسجدوں کا شہر تھا اِندرا دیوی کے بے شمار ہاتھوں کی گرفت میں بڑی تیزی سے آتا چلا جا رہا تھا۔ وہاں کے لیڈر بھارت کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ پاکستان کی قسمت کچے دھاگے سے لٹک رہی تھی۔

جیسور کا رِنگ ٹوٹے ہوئے بہت سا وقت گزر چکا تھا۔ وہ ایک پرانی بات ہو گئی تھی۔ مغربی پاکستان کے لیڈروں نے مشرقی پاکستان کے مصدقہ غدّار شیخ مجیب الرحمٰن کو غدّاری کے جرم سے آزاد کرا لیا تھا۔ مفادات قومی نہیں، ذاتی صورت اختیار کر چکے تھے۔

اور ملک میں ایک اور مارشل لاء لگا دیا گیا۔ امریکہ نے اپنے پٹے ہوئے مُہرے کی جگہ ایک اور مُہرہ آگے کر دیا۔ اب مارشل لاء مشرقی پاکستان کو نہیں بچا سکتا تھا۔ یہ مارشل لاء ملک کو بچانے کے لیے نافذ ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک سیاسی چال تھی۔ ملک کے حالات ایسے ہو گئے تھے کہ فوج کو مشرقی اور مغربی سرحدوں پر ہونا چاہیے تھا لیکن آدھی فوج شہروں میں آ گئی اور خوشامدیوں اور درباریوں کی فوج ایوانِ صدارت میں جمع ہو گئی۔ قوم کو اس موسیٰؑ کی ضرورت تھی جو طلسمِ سامری کو توڑ دیتا مگر قیادت اسی سامری طلسم میں گرفتار ہو گئی۔ پھر قوم کو یہی ایک آواز سنائی دینے لگی — "مشرقی پاکستان میں سب خیریت ہے"۔

قوم کو تو فریب دے دیا گیا مگر اُن فوجیوں کے لیے جو مشرقی پاکستان میں صورتِ حال دیکھ رہے تھے یہ فریب محض بیکار تھا۔ وہ وہاں جو کچھ دیکھ رہے تھے اُس سے قوم کو بے خبر رکھا جا رہا تھا۔ اُس وقت ضرورت یہ تھی کہ وہاں فوج میں اضافہ کیا جاتا مگر یہ اضافہ بھارت اپنی فوج میں کر رہا تھا۔

جیسُور کا واقعہ پرانا ہو چکا تھا جب اصغر کو لاہور سے رجب علی کا خط مِلا۔ رجب علی نے لکھا تھا —

"عزیز بیٹے! تمھاری خیریّت کی اطلاع ملتی رہتی ہے اور میں خیریّت کی اطلاع دیتا رہتا ہوں۔ تمھاری ترقی کی اطلاع پر مجھے اور تمھاری امّی کو دلی مسرّت ہوئی۔ ہم دونوں کی طرف سے مبارک باد قبول کرو۔ میں اُمید رکھوں گا کہ تمہیں احساس ہو گا کہ کیپٹن سے میجر بن کر تمھاری ذمّہ داریوں میں کتنا اضافہ ہُوا ہے۔ کل رات سے میری طبیعت کچھ بے چین ہے۔ اس بے چینی کی وجہ گھریلو نہیں ملکی حالات ہیں۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو ملک اور قوم سے کاٹ نہیں سکتا لیکن میں ملک کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ مغربی پاکستان کے اخبار دیکھو تو لگتا ہے جیسے مشرقی پاکستان میں امن و امان ہے مگر امن و امان کا نام و نشان نہیں۔ گنوار اور بے علم ہونا ایک خوش قسمتی ہے۔ میں اس معاملے میں بدنصیب ہوں۔ میں پولیس میں رہ چکا ہوں اس لیے میری نظر پردوں کے پیچھے اور زمین کے نیچے چلی جاتی ہے۔ ہمارے سیاسی لیڈروں میں اتحّاد نہیں، نفاق ہے اور بھارت اس صُورتِ حال سے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ میں زیادہ تفصیلات نہیں لکھ رہا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ جہاں جھوٹ کی حکمرانی ہوتی ہے وہاں سچ بولنا بہت بڑا جرم ہوتا ہے۔ میں یہاں انٹیلی جنس کے افسروں سے ملتا ملاتا رہتا ہوں۔ وہ بہت پریشان ہیں۔ اُن کی رپورٹوں کے مطابق اب میدانِ جنگ مشرقی پاکستان ہو گا لیکن میرے عزیز بیٹے! یہ جنگ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے بہت مختلف ہو گی۔ ہو سکتا ہے یہ یک طرفہ جنگ ہو۔ میں تمہیں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح تم نے ۱۹۶۵ء میں مقبوضہ کشمیر میں کمانڈو مشن کیے تھے اُس جذبے کو برقرار رکھنا۔ تم اکیلے پاکستان کو نہیں بچا سکو گے لیکن جو فرض قوم نے تمہیں سونپا ہے وہ اسی طرح ادا کرنا جس طرح پہلے کر چکے ہو۔ تم نے لکھا ہے کہ میجر بن کر تم ایسٹ پاکستان میں ہی کسی انفنٹری بٹالین میں جا رہے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اب تم ایک کمپنی کی قیادت کرو گے۔ میں اتنا ہی کہوں گا کہ تمھاری قیادت دانشمندانہ اور جارحانہ ہونی چاہیے....

"طاہر پرویز بھی ٹریننگ ختم کر کے مشرقی پاکستان آ رہا ہے۔ یہ خط ملنے تک اُس کی چھٹی پوری ہو جائے گی اور وہ لاہور سے روانہ ہو چکا ہو گا۔ وہ پنجاب رجمنٹ میں جا رہا ہے۔ وہ وہاں پہنچتے ہی تمہیں اطلاع دے گا۔ لڑکا جوشیلا ہے۔ خدا کرے وہ کہیں تمھارے قریب ہی ہو۔ میں نے طاہر پرویز میں بڑی اچھی تبدیلی دیکھی ہے۔ وہ اپنے آپ کو لیفٹیننٹ نہیں، پاکستان کا مجاہد سمجھتا ہے۔ یہ اُس کے ماں باپ کی تربیّت کا اثر ہے"۔

اصغر نے یہ خط گھر آ کر شازی کو دیا۔ شازی نے خط پڑھا اور اُس نے اصغر کی طرف دیکھا۔ شازی کے چہرے پر اداس سی سنجیدگی تھی۔

"کیوں شازی!" — اصغر نے پُوچھا — "کسی گہری سوچ میں کھو گئی ہو"۔

شازی نے آہ بھری اور خط ایک طرف رکھ دیا۔

"کہتے ہیں قربانی رائیگاں نہیں جاتی" — شازی نے کہا — "لیکن کچھ ایسے نظر آ رہا ہے جیسے اس زمین پر شہیدوں کا خون رائیگاں جائے گا"۔

"تم نے جو قربانی دی تھی وہ اگر کسی اور ملک میں کوئی لڑکی دیتی تو اُسے انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا جاتا" — اصغر نے کہا — "اور اُسے اتنی اہمیّت دی جاتی کہ وہ تاریخ کی ایک شخصیّت بن جاتی۔ یہاں تو..."

"یوں مت کہو اصغر!" — شازی نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا — "میں حیران ہوں کہ یہ

بات تم نے کہی ہے۔ مجھے اگر انعام کا لالچ ہوتا تو انڈیا سے مجھے جو انعام مل رہا تھا، وہ پاکستان پچاس برسوں میں بھی نہیں دے سکتا۔ انعام کی خاطر لڑنے والے اور کسی لالچ میں قربانیاں دینے والے بڑی جلدی ہتھیار ڈال دیا کرتے ہیں۔ میں صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ جس تیزی سے انڈیا کی سیکرٹ سروس مشرقی پاکستان میں پھیلتی چلی جا رہی ہے، اتنی ہی تیزی سے پاکستان کی گورنمنٹ بے پروا اور بے نیاز ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کبھی سوچتی ہوں کہ میں نے اپنی ماں کو کسی غلط قربان گاہ پر تو قربان نہیں کر دیا؟"

"نہیں شازی!" — اصغر نے کہا — "شہیدوں کا لہو رائیگاں نہیں جاتا۔ مشرقی پاکستان کی زمین میں تیتو میر کا خون بھی شامل ہے اور پاکستان کی بنیادوں میں اُن بنگالیوں کا خون بھی شامل ہے جو سیّد احمد شہیدؒ کی قیادت میں صوبہ سرحد میں جا کر سکھّوں اور انگریزوں کے خلاف لڑے تھے" — اصغر نے پریشان اور بے چین سے لہجے میں کہا — "ایسی باتیں نہ سوچو شازی! کبھی کبھی میں پریشان ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ ہم دونوں ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ یہ باتیں دانشمندوں کے سوچنے کی ہیں جو ہم سوچنے بیٹھ جاتے ہیں ہمیں علم سے نہیں، عمل سے واسطہ رکھنا چاہیئے۔ جوانوں میں یہی خرابی ہوتی ہے کہ وہ جذبات سے سوچتے ہیں ہمیں حکم ماننا ہے اور اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ وہ ہم کر رہے ہیں۔"

"طاہر پرویز آ رہا ہے" — شازی نے کہا — "اُس کے آنے کا پتہ چلے تو اُسے فوراً گھر لے آنا۔ بچّہ ہے، یہاں تنہائی محسوس نہ کرے۔"

۞

پی۔ آئی۔ اے کا بوئنگ طیّارہ بھارت کے اُوپر اُڑا جا رہا تھا۔ اُس کی منزل ڈھاکہ تھی۔ بھارت نے ابھی مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان یہ ہوائی راستہ بند نہیں کیا تھا۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ طاہر پرویز اس طیّارے میں مشرقی پاکستان جا رہا تھا۔ اُس کی سیٹ شیشے کے ساتھ تھی جہاں سے وہ نیچے دیکھ سکتا تھا۔ طیّارے کی بلندی اتنی زیادہ تھی کہ زمین کے خدوخال آڑی ترچھی لکیروں کی طرح نظر آ رہے تھے جیسے یہ کسی علاقے کا فوجی نقشہ ہو۔ زمین کے بعض رنگ صاف نظر آتے تھے۔ ہرا بھی مٹیالہ بھی۔

"کیا یہ دھرتی اسی طرح ہمارے پاؤں کے نیچے آ سکتی ہے؟" — طاہر پرویز کو خیال آیا۔

"آ سکتی ہے" — طاہر پرویز کو جواب ملا — "ہمیں پاکستان ادھورا ملا ہے طاہری بیٹے! پورے ہندوستان کو پاکستان بنانا ہے۔ یہ محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کی سرزمین ہے۔ یہ حیدر علی اور ٹیپو شہید کی سرزمین ہے۔"

طاہر پرویز کو طاہرہ کی باتیں سنائی دینے لگیں۔ وہ ٹریننگ ختم کر کے سات دنوں کی چھٹی گھر آیا تھا۔ گھر میں خوشیاں آ گئی تھیں۔ ارشد اور طاہرہ اُسے دیکھ کر جیسے پھر سے جوان ہو گئے تھے۔ وہ اُسے اُس کی ماں عفّت کی قبر پر لے گئے تھے۔ طاہر پرویز نے فاتحہ پڑھی اور قبر پر ہاتھ پھیرا تھا لیکن وہ طاہرہ کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ ارشد اُسے بتاتا بھی یہی رہا تھا۔

"تم افسر بعد میں ہو، پہلے تم پاکستان کے محافظ ہو" — طاہرہ نے اُسے مشرقی پاکستان کو روانگی سے ایک روز قبل کہا تھا — "جب ہم تمھاری طرح نوجوان تھے تو ہم نے بہت بڑی طاقت کو شکست دے کر پاکستان بنایا تھا۔"

بوئنگ طیّارہ بھارت کے اُوپر اڑا جا رہا تھا۔ جیٹ طیّارے کی دبی دبی گونج میں طاہر پرویز کو طاہرہ کی ٹھہری ٹھہری آواز سنائی دے رہی تھی۔ طاہرہ نے اُسے پاکستان کی کہانی پہلی بار نہیں سنائی تھی مگر ایک روز پہلے طاہرہ نے اُسے کئی بار سنائی ہوئی کہانی ایک بار پھر سنائی تو طاہر پرویز نے اپنے خون میں عجیب سا جوش محسوس کیا تھا۔

"یہ تم جیسے بچّوں کے خون سے لکھی ہوئی داستان ہے طاہری!"

طاہر پرویز نے زمین سے نظریں ہٹا کر دائیں طرف دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی اخبار پڑھ رہا تھا۔ اُس نے طاہر پرویز کی طرف دیکھا اور مُسکرایا۔

"آپ شاید حال ہی میں ٹریننگ کر کے واپس آئے ہیں" — اس آدمی نے طاہر پرویز کے کندھے پر سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدے کا نشان اور اس کی عمر دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں" — طاہر پرویز نے جواب دیا — "میں ابھی ابھی کاکول سے پاس آؤٹ ہو کر آ رہا ہوں اور اپنی یونٹ میں جا رہا ہوں۔"

"تو یہ آپ کی پہلی یونٹ ہو گی" — اس ادھیڑ عمر نے فدویانہ مُسکراہٹ سے کہا۔

"جی ہاں۔"

"سر، میں ایک عرض کروں" — اس شخص نے کہا — "ایسٹ پاکستان میں آرمی کا اور کوئی کام نہیں۔ تمام یونٹیں مارشل لاء ڈیوٹی کر رہی ہیں۔ آپ کو بھی شہر میں کوئی ڈیوٹی دی جائے گی۔ آپ کو چونکہ ابھی تجربہ نہیں اس لیے میں آپ سے عرض کرتا ہوں۔ ایسٹ پاکستان میں سب سے زیادہ مظلوم لوگ مغربی پاکستان کے تاجر اور سرمایہ دار ہیں یعنی جنہوں نے یہاں آ کر کاروبار میں سرمایہ لگایا ہے۔ ایسٹ پاکستان کے لوگ تو بھوکے اور ننگے ہیں۔ ہم فوجیوں سے یہی ایک عرض کرتے ہیں کہ مغربی پاکستان کے تاجروں کے سرمائے کا تحفظ کریں۔"

"آپ میرے بزرگ ہیں" — طاہر پرویز نے کہا — "آپ مجھے یہ نصیحت کیوں نہیں کرتے کہ سرمایہ جائے جہنم میں، اپنے ملک کا تحفظ کرو۔"

"سر!" — اُس آدمی نے کہا — "میں نے پہلے ہی عرض کر دی ہے کہ آپ کو ابھی تجربہ نہیں.... اگر سرمایہ محفوظ نہ ہوا تو ملک کس کام کا!"

"میرا خیال ہے کہ آپ اپنی ہی بات کریں" — سیکنڈ لیفٹیننٹ طاہر پرویز نے مسکراتے ہوئے کہا — "میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں لیکن آپ میری بات نہیں سمجھ سکے۔"

"سر!" — مغربی پاکستان کے اس تاجر نے کہا — "سرمایہ نہیں ہو گا تو آپ کو تنخواہ کہاں سے ملے گی" — اُس نے طاہر پرویز کی طرف جھک کر رازداری کے لہجے میں کہا — "یہ بنگالی ہمیں بڑے مہنگے پڑ رہے ہیں۔ اگر ہم لوگ اس خطّے سے دستبردار ہو جائیں تو کیا قیامت آ جائے گی؟"

"اگر خدانخواستہ آپ مغربی پاکستان سے بھی دست بردار ہو جائیں تو قیامت پھر بھی نہیں آئے گی" — طاہر پرویز نے بُردباری سے کہا — "میرا خیال ہے آپ وہ قیامت بھول گئے ہیں جو تحریکِ پاکستان کے مجاہدین پر ٹوٹی تھی اور اُن کے لہو کے صدقے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ میں اُس وقت پیدا

نہیں ہُوا تھا.... کیا آپ کا گھر نہیں جلا تھا؟ کیا آپ کا گھر نہیں لُٹا تھا؟ کیا آپ کی کوئی بیٹی اغوا نہیں ہوئی تھی؟

"اللہ محفوظ رکھے" — اُس آدمی نے قدرے فخریہ لہجے میں کہا — "ہم پہلے ہی پاکستانی علاقے کے رہنے والے تھے۔ ہمارا کچھ نہیں گیا"

"تو آپ یوں کہئے" — طاہر پرویز نے کہا — "کہ آپ کو پاکستان مفت مل گیا تھا۔ اُس وقت بھی آپ کو اپنے سرمائے کا غم ہوگا، آج بھی آپ کو اپنے سرمائے کا غم ہے"

"نہیں سر!" — مغربی پاکستان کا یہ تاجر کھسیانا سا ہوکر بولا — "میں کہہ رہا تھا کہ آپ کو مارشل لاء ڈیوٹی دی جائے گی...."

"اگر مارشل لاء ڈیوٹی کے ساتھ مجھے کچھ اتھارٹی بھی دی گئی تو میں آپ جیسے سرمایہ داروں کو شوٹ کر دوں گا" — طاہر پرویز نے نوجوانوں جیسے جوشیلے لہجے میں کہا — "مجھے ایسٹ پاکستان کی دلدل اور وہاں کے جنگل عزیز ہیں، آپ کا سرمایہ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا.... آپ وہاں کس جگہ ہوتے ہیں؟"

تاجر گھبرا گیا۔ اُس نے طاہر پرویز کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور غلاموں کی طرح بناوٹی ہنسی ہنسنے لگا۔

"سر!" — اُس نے کہا — "میں صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ میں قومی جذبہ کتنا ہے اور آپ کا مورال کیسا ہے"

"جب جذبہ اور مورال دیکھنے کا وقت آئے گا، اُس وقت آپ اپنے سرمائے کے ساتھ مغربی پاکستان پہنچ چکے ہوں گے" — طاہر پرویز نے کہا — "میں پہلے ہی سُن چکا ہُوں کہ مغربی پاکستان کے کاروباری لوگ اِدھر سے سرمایہ نکال کر مغربی پاکستان لا رہے ہیں"

تاجر کچھ کہہ رہا تھا لیکن طاہر پرویز شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔

"یہ خیال رکھنا طاہری!" — طاہر پرویز کو طیّارے کی ہلکی ہلکی گونج میں طاہرہ کی آواز سنائی دی — "ان اکیس بائیس برسوں میں لوگوں نے پیسے کو نظریۂ پاکستان بنا لیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی رَو میں بہہ جاؤ۔ پاکستان ہے تو پیسہ ہے۔ پاکستان کی قیمت قارون کے خزانوں سے بھی زیادہ ہے تمہارے لہو کے چند قطرے پاکستان کی عظمت کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ بیکار ہے وہ جسم جس کا کوئی وقار نہیں۔ وہ قوم ہمیشہ غلام رہتی ہے جو پیسے کو اپنا دین مذہب بنا لے"

ایسا ہی ایک بے وقار انسان طاہر پرویز کے پہلو میں بیٹھا ہُوا تھا مگر طاہر پرویز اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ طیّارہ بھارت کی زمین پر اپنے پر پھیلائے اُڑا چلا جا رہا تھا۔

❁

"تمہارا خواب آخر پورا ہو ہی گیا طاہری!" — میجر اصغر نے طاہر پرویز سے کہا۔

طاہر پرویز میجر اصغر کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اُس کے پہنچنے سے دو دن قبل میجر اصغر کو اسی بٹالین میں بھیج دیا گیا تھا جس میں طاہر پرویز کی پوسٹنگ ہُوئی تھی۔ میجر اصغر نے اُسے اپنی کمپنی میں لے لیا تھا۔ شازی طاہر پرویز کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئی تھی۔

"بھائی جان! مجھے ایک بات پریشان کر رہی ہے" — طاہر پرویز نے کہا۔

"پہلے میری ایک پریشانی رفع کرو طاہری!" — اصغر نے کہا — "پھر میں تمہاری پریشانی کا کچھ علاج کروں گا.... گھر میں مجھے بھائی جان کہہ لیا کرو۔ گھر سے باہر...."

"سر کہا کروں گا بھائی جان!" — طاہر پرویز نے ہنستے ہوئے کہا — "کاکول میں ڈسپلن کے سوا اور سیکھا ہی کیا ہے"

"ہاں اب بتاؤ" — اصغر نے پوچھا — "تمہاری پریشانی کیا ہے؟.... ایک پریشانی تو میں بتاتا ہوں۔ گھر سے اتنی دور آکر امّی اور ابّا یاد آتے ہوں گے"

"نہیں" — طاہر پرویز نے ہنستے ہوئے کہا — "میں اب کوئی ایسا بچّہ بھی نہیں.... جہاز میں مغربی پاکستان کے ایک بزنس مین کے ساتھ تبادلۂ خیالات ہُوا تھا" — اُس نے مغربی پاکستان کے اس تاجر کی ساری باتیں اصغر کو سنائیں۔

"تم نے صرف ایک بزنس مین کی باتیں سنی ہیں" — اصغر نے کہا — "مغربی پاکستان کے ہر اُس بزنس مین کی ذہنیت یہی ہے جس کا کاروبار ایسٹ پاکستان میں ہے۔ یہ لوگ تو ہیں ہی مغربی پاکستانی جو یہاں صرف کاروبار کے لیے آتے بیٹھے ہیں، یہاں ایک اور نسل آباد ہے جو مشرقی پاکستان کی شہری ہے لیکن اس نے یہاں کے تہذیب و تمدّن اور احوال و کوائف کو قبول نہیں کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہار اُڑلیسہ وغیرہ سے ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے یہاں آتے تھے اور بنگالیوں نے انہیں پناہ دی تھی۔ ان کی تیسری نسل پیدا ہو چکی ہے لیکن ان لوگوں نے اپنی بستیاں الگ بسا رکھی ہیں اور اپنے آپ کو بنگالیوں سے برتر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک بنگالی زبان اس لیے نہیں سیکھی کہ یہ زبان بائیں سے دائیں لکھی جاتی ہے اس لیے اُن کے نظریے کے مطابق یہ زبان غیر اسلامی ہے....

"میں تمہیں یہی باتیں بتانا چاہتا تھا بنگالیوں کے ساتھ مغربی پاکستانی جو سلوک کرتے چلے آتے ہیں، اب اُس کا ردِّعمل ظاہر ہو رہا ہے۔ انڈیا اس صورتِ حال کو اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ یہاں ہندوؤں کی آبادی بے شمار ہے۔ یہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں ہندوؤں کا غلبہ ہے اِس کا اثر یہ ہے کہ یہاں کی وہ قیادت جسے مؤثر اور فعّال کہا جا سکتا ہے ہندوؤں کے ہاتھ میں کھیل رہی ہے"

"تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ بنگالیوں کے دلوں میں مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی ہے" — طاہر پرویز نے کہا۔

"نہیں" — اصغر نے کہا — "میں تمہیں ایک عجیب بات بتاتا ہوں کہ نفرت کا وجود صرف شہروں میں ہے۔ شہروں کے علاوہ اور کہیں بھی چلے جاؤ، یہ بنگالی جو بھوکے اور ننگے ہیں پاکستان کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں کرتے۔ وہ مغربی پاکستان کے خلاف جو کچھ بھی کہنا چاہیں کہہ گزرتے ہیں لیکن پاکستان کے نام پر وہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں، اِس لیے یہ خیال رکھنا کہ یہاں کے کسی بھکاری کو بھی حقیر نہ سمجھنا۔ پاکستان کے حصول میں بنگالی مسلمان کا خون بھی شامل ہے۔ یہ کبھی نہ سمجھنا کہ یہ بنگالی ہیں اور تم پنجابی ہو۔ بنگالی اور سب کچھ ہو سکتا ہے، غدّار نہیں ہو سکتا۔ غدّار مغربی پاکستان میں بھی موجود ہیں، ویسے ہی مشرقی پاکستان میں بھی ہیں۔ یہاں اگر غدّار ہیں تو وہ سیاسی لیڈروں میں ہیں یا تمہیں شہریوں میں کچھ غدّار نظر آئیں گے۔ آگے جو کچھ ہو گا وہ تم دیکھتے رہنا"

❁

آگے جو کچھ ہُوا وہ بڑا ہی ہیبت ناک تھا۔ اچانک سمندری طوفان آ گیا۔ یوں سمجھئے کہ سمندر خشکی پر چڑھ آیا!

اور کئی میل خشکی پر چلا گیا۔ لہروں کے راستے میں جو کچھ بھی آیا، انسان تھا یا حیوان، درخت تھا یا مکان خس و خاشاک کی طرح بہتا چلا گیا۔ جب سمندر کی یہ بپھری ہوئی موجیں سمندر کو واپس گئیں تو انسانوں اور حیوانوں کو اپنے ساتھ ہی لے گئیں۔ مشرقی پاکستان میں دریائی سیلاب اور سمندری طوفان ایک معمول کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہ طوفان اُن چند ایک طوفانوں میں سے تھا جنہیں انسان کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔ مرنے والوں کی تعداد بیس لاکھ سے چالیس لاکھ تک بتائی جا رہی تھی۔

بڑی طاقتوں نے امدادی مشن بھیجے۔ دوسرے ملکوں نے بھی امداد بھیجی۔ وہاں جو بھی جاتا تھا وہ سوچتا تھا کہ امداد کسے دیں۔ امداد کے جو مستحق تھے ان کی لاشیں سمندر اپنے ساتھ لے گیا تھا لیکن لاشیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سمندر سب کو اپنے ساتھ نہ لے جا سکا۔ درخت جڑوں سے اُکھڑ گئے تھے۔ کسی جھونپڑے کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ لاشیں درختوں کی شاخوں میں اٹکی ہوئی تھیں۔ امدادی پارٹیوں کے لیے یہی ایک کام رہ گیا تھا کہ وہ ان لاشوں کو سپردِ خاک کر دیں۔ کسی کا جنازہ نہ پڑھا گیا، کفن نہ پہنایا گیا۔ لاشیں اکٹھی کی جانے لگیں۔

پاک فوج کو بھی اس ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا۔ اصغر اور طاہر پرویز کی بٹالین کی ایک پلاٹون کو بھی امدادی ٹروپس کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ طاہر پرویز اس پلاٹون کا کمانڈر تھا۔ وہ اس جذبے سے جا رہا تھا کہ آفت زدہ لوگوں کو محفوظ مقامات تک پہنچائے گا۔ اُس نے اپنی پلاٹون کو ہدایات بھی ایسی ہی دی تھیں کہ متاثرہ لوگوں کی مدد اس طرح کریں جیسے وہ اپنے سگے بہن بھائی ہوں مگر وہ متاثرہ علاقے میں پہنچا تو اُسے چکر آنے لگے۔ وہاں دُور دُور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں جو سُوج گئی تھیں۔ امدادی ٹروپس کے کمانڈر نے طاہر پرویز سے کہا تھا کہ اپنے سب جوانوں سے کہو، اپنے ناک اور منہ پر پٹیاں باندھ لیں اور لاشیں ایک جگہ اکٹھی کر دیں۔ اُسے بتایا گیا کہ ناک اور منہ پر باندھنے والی پٹیاں اور لاشیں گھسیٹنے والا سامان کہاں سے ملے گا۔

طاہر پرویز جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اُس نے ہدایات اور احکامات دینے والے لیفٹیننٹ کرنل کی پوری بات سُن کر صرف اتنی سی سرگوشی کی تھی —"یس سر!"— اپنی پلاٹون کے جوانوں کو احکام دیتے وقت اُس کی آواز رِقّت میں دب گئی تھی۔

"یہ پاکستانی تھے"— اُس نے اپنے آپ سے کہا —"انہیں کس کے گناہوں کی سزا ملی ہے!"

اُس کے جوان اس ناگوار کام میں لگ گئے۔ طاہر پرویز نگرانی کرتا اور سوچتا رہا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دَور میں ان مظلوم انسانوں کو سمندری طوفانوں کے رحم و کرم پر کس نے پھینکا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ دنیا کے کئی اور ملک مشرقی پاکستان کی طرح قدرت کی ان بے رحمیوں کا شکار رہے ہیں جن میں ہالینڈ، چین اور جاپان سرِفہرست ہیں۔ ان قوموں نے سمندر کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر کے اپنے ساحلی علاقوں کو محفوظ کر لیا ہے اور سیلابی دریاؤں کو بھی لگام ڈال لی ہے مگر ہمارا رویّہ یہ ہے کہ سمندری طوفان اور سیلاب آتے ہیں اور ہم ترقی یافتہ ملکوں کے آگے امداد کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔

۞

یہ کام ایک دن میں مکمل ہونے والا نہیں تھا۔ فوج کے الگ خیمے نصب تھے۔ دوسری امدادی پارٹیوں کے کیمپ بھی جابجا لگے ہوئے تھے۔

اگلی صبح سیکنڈ لیفٹیننٹ طاہر پرویز اپنی پلاٹون کو لے کر لاشیں اکٹھی کرنے کے کام پر چلا گیا۔ اُس کی پلاٹون جب اس بھیانک کام میں مصروف ہو گئی تو وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک ٹیکری کے پیچھے چلا گیا۔ ایک جگہ ۱۰۔۱۱ ماہ کی عمر کے ایک بچے کی برہنہ لاش پڑی تھی۔ طاہر پرویز نے یہاں لاشوں کے سوا کچھ بھی نہ دیکھا تھا۔ اُس کا دل ایک ہی دن میں پتھر ہو گیا تھا لیکن یہ ننھی مُنّی لاش دیکھ کر پتھر موم کی طرح پگھل گیا۔ وہ لاش کے پاس رک گیا اور اُس کی نظریں اس معصوم چہرے پر جم گئیں جواب مردہ ہو چکا تھا۔ طاہر پرویز لاش کے قریب بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا کہ میں بھی پیدا ہُوا تھا، یہ بھی پیدا ہُوا تھا۔ یک لخت خیالوں کا ہجوم سمندری طوفان کی طرح اُس کے ذہن میں آ گیا۔ بچے کی لاش اُس کے آنسوؤں کے دھندلکے میں غائب ہو گئی۔ وہ بھول گیا کہ وہ فوجی ہے اور اُسے جذباتی نہیں ہونا چاہیئے۔

کچھ دیر بعد اُس نے ہاتھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔ بچّے کی لاش اُسے ایک بار پھر دکھائی دینے لگی۔ وہ ابھی تک لاش کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ لاش پر ایک سایہ لہرایا اور وہیں ساکن ہو گیا۔ طاہر پرویز نے چونک کر اُوپر دیکھا۔ وہ اُسی کی عمر کی ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کے ناک اور منہ پر سفید کپڑا بندھا ہُوا تھا۔ طاہر پرویز اٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ ایک لڑکی کو اس ہولناک ماحول میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"آپ بنگالی تو نہیں؟"— لڑکی نے مُنہ سے کپڑا ہٹا کر بنگالی لب و لہجے میں پوچھا۔

"میں پنجابی ہوں"— طاہر پرویز نے جواب دیا۔

"پھر آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟"— لڑکی نے ایسی مسکراہٹ سے پوچھا جس میں مسّرت نہیں طنز تھی اور اس مسکراہٹ میں نہ جانے کتنے شکوے سمٹے ہُوئے تھے۔

"میں پنجابی بعد میں ہوں"— طاہر پرویز نے کہا —"سب سے پہلے میں پاکستانی ہوں۔ مجھے ایسے نہیں کہنا چاہیئے تھا کہ میں پنجابی ہُوں.... آپ یہاں کیسے؟ عورت کا یہاں کیا کام؟"

"میں تھرڈ ایئر کی سٹوڈنٹ ہوں"— لڑکی نے جواب دیا —"کالج کی بہت سی لڑکیاں اور لڑکے امدادی کام کے لیے آئے ہیں"

"لیکن یہاں ہم کس کی امداد کریں؟"— طاہر پرویز نے دُکھی لہجے میں کہا۔

"ان کی امداد کا وقت گزر چکا ہے"— لڑکی نے جواب دیا —"اب ہم ان کی یہی مدد کر سکتے ہیں کہ انہیں گِدّھوں اور درندوں سے بچانے کے لیے دفن کر دیں"

"آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں بنگالی نہیں ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟"— طاہر پرویز نے لڑکی سے پوچھا اور اُسے خاموش دیکھ کر کہنے لگا —"مجھے یہاں آئے ابھی چند دن ہُوئے ہیں لیکن میں نے یہاں ذرا سی بھی اجنبیّت محسوس نہیں کی۔ میرے اور آپ کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے لیکن آپ کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہم میں ذرا سی بھی دُوری نہیں۔ یہ بچّہ میرا ہے۔ ابھی ابھی مجھے ایسے لگا تھا جیسے یہ میری لاش ہو۔ میں اس معصوم کے لیے کچھ نہیں کر سکا، کچھ نہیں کر سکتا...."

طاہر پرویز کی آواز رقّت میں دب گئی اور آنسو جو اُس نے پونچھ ڈالے تھے، وہ ایک بار پھر اُمڈ آئے۔

"آپ سچّے پاکستانی ہیں"— لڑکی نے کہا —"لیکن مرد کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے"

"یہ بے بسی کے آنسو ہیں"— طاہر پرویز نے کہا اور اچانک بیدار ہو گیا۔ ہونٹوں پر مُسکراہٹ لا کر

بولو — "میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے جوانوں کو دیکھنا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔"

طاہر پرویز وہاں سے چلنے لگا تو اُس نے دیکھا کہ یہ بنگالی لڑکی اُس کے چہرے پر نظریں گاڑے بڑی غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اُس کی نظروں سے آزاد نہ ہو سکا۔ لڑکی کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ طاہر نے محسوس کیا جیسے یہ لڑکی کچھ کہنا چاہتی ہے یا کچھ بھی نہ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"میں جا رہا ہوں" — طاہر پرویز نے ایسے انداز سے کہا جیسے وہ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

لڑکی نے ہلکی سی آہ بھری اور سر کو لطیف سی جنبش دی۔ طاہر پرویز وہاں زیادہ دیر رک نہیں سکتا تھا۔ وہ خدا حافظ کہہ کر چل پڑا۔ جب وہ ٹیکری سے گھومنے لگا تو اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لڑکی وہیں کھڑی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ طاہر پرویز کے قدم رک گئے۔ تب لڑکی نے ہاتھ اُوپر کیا اور آہستہ سے ہاتھ ہلایا۔ طاہر پرویز نے جواب میں ہاتھ ہلایا اور ٹیکری کی اوٹ میں چلا گیا۔

◆

طاہر پرویز ایک جذبے کے تحت فوج میں شامل ہوا تھا۔ وہ پاکستان کے دشمنوں کو ختم کرنا یا دشمنوں کو ایسی شکست دینا چاہتا تھا کہ پاکستان کی سرحدوں کی طرف کوئی میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ وہ تصوّرات میں جنگ لڑا کرتا تھا۔ اُس نے تصوّرات میں کئی بار پاکستان کے دشمن کی فوج کی لاشیں دیکھی تھیں۔ وہ لاشیں دیکھنے کو بے تاب رہتا تھا مگر جو لاشیں اُسے دیکھنے کو ملیں وہ دشمن کی نہیں تھیں۔ وہ پاکستانیوں کی لاشیں تھیں۔ وہ اس دشمن کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا جس نے لاکھوں پاکستانیوں کی جانیں لے لی تھیں۔

جب اُسے خیال آیا کہ ابھی ابھی ایک بنگالی نے اُسے کہا ہے کہ آپ پنجابی ہیں تو آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں تو اُس نے اپنے دل میں درد کی ٹیس سی محسوس کی۔ اُسے پاکستانی ہوتے ہوئے پاکستان کی سرزمین پر غیر ملکی اور بیگانہ کہا جا رہا تھا۔

"نہیں" — اُس نے اپنے آپ سے کہا — "ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں یہاں اجنبی اور بیگانہ نہیں۔ مجھے ان بنگالیوں سے محبت ہے۔ میں یہ لاشیں احترام سے دفن کروں گا۔"

"سر!" — اُس کی اپنی پلٹون کے حوالدار نے اُسے سیلوٹ کر کے کہا — "کرنل صاحب کہتے ہیں کام اور تیز کرو۔ لاشیں زیادہ ہیں۔ گہرے گڑھے کھودنے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی سی زمین کھودو اور لاشیں گھسیٹ کر ان میں پھینکو اور مٹی ڈالتے جاؤ۔"

سیکنڈ لیفٹیننٹ طاہر پرویز کے دل پر چوٹ پڑی مگر وہ جذبات کا نہیں حکم کا پابند تھا۔ اُس نے حوالدار کی بات سن لی اور اُسے کہا کہ کرنل صاحب کے حکم پر عمل کرو۔ وہ خود اپنے جوانوں کی نگرانی کرنے لگا۔ اُس کے سامنے سے دو عورتوں کی لاشیں گزر گئیں۔ اُس نے دونوں کے چہرے غور سے دیکھے۔ اُسے ایسے لگا جیسے دونوں لاشوں کے چہرے ایک جیسے تھے اور یہ اُس بنگالی لڑکی جیسے تھے جو اُسے بچے کی لاش پر ملی تھی۔

ایک اور عورت کی لاش!

یہ لاش گرے ہوئے ایک درخت کی ٹہنیوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ اُس کے جوان لاش نکالنے کے لیے ٹہنیاں توڑ رہے تھے

ں۔ طاہر پرویز اُسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور حقیقی دنیا سے اُس کا تعلق ٹوٹ گیا۔ اُسے ایسے لگا جیسے ں کے ہونٹوں پر اُداس سی مسکراہٹ آئی اور ایک لمحہ بعد غائب ہو گئی ہو۔ طاہر پرویز نے اس عورت ے مُردہ چہرے کو اور زیادہ غور سے دیکھا۔

"اب تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟" — لاش کے ہونٹ ہلے — "گدھوں اور درندوں سے بچانے ے لیے مجھے دفن کر دو۔"

طاہر پرویز نے یہ چہرہ پہچان لیا اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھا۔ یہ اُس نوجوان بنگالی لڑکی کا چہرہ ا جو بچے کی لاش پر اُسے ملی تھی۔ بڑا خوبصورت اور صحت مند چہرہ تھا۔ طاہر پرویز کو یوں لگا جیسے ایک لا سا اُس کے سینے سے اُٹھ کر اُس کے حلق میں اٹک گیا ہو۔ جس لڑکی کو اُس نے اُسی روز زندہ دیکھا تھا، اُس کی لاش اُس کے سامنے پڑی تھی۔ وہ اندر ہی اندر تڑپ اُٹھا اور اُسے ایسا دھچکہ لگا کہ وہ بیداری کے ڈراؤنے خواب سے حقیقت کی دنیا میں آ گیا لیکن وہ اُسی وقت اُس لڑکی کو دیکھنے کو بیتاب ہو گیا۔ س نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے فوجیوں کے سوا اور کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا اور ایک طرف چل پڑا۔ اُسے دو سویلین بنگالی آتے دکھائی دیئے۔ وہ اُن کے راستے میں جا رکا۔ اُن دونوں نے اُسے سلام کیا۔

"سنا ہے کالج کے سٹوڈنٹس بھی آئے ہوئے ہیں" — طاہر پرویز نے اُن سے پوچھا — "وہ کہاں ہیں؟"

"وہ جو اُونچی ٹیکری ہے" — ایک بنگالی نے اُسے بتایا — "اُس کے پیچھے امدادی کیمپ ہے۔ وہاں اُن لوگوں کو رکھا گیا ہے جو زندہ بچ گئے ہیں۔ بعض زخمی ہیں۔ بہت سے بیمار ہیں۔ کالج کے لڑکے اور لڑکیاں اس کیمپ میں زخمیوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کرتی اور جو ٹھیک ہیں انہیں کھانا دیتی ہیں.... وہاں ڈاکٹر بھی ہیں۔"

طاہر پرویز نے اُدھر دیکھا۔ وہ ٹیکری کم و بیش ایک میل دُور تھی۔ مگر وہ فوج کے احکام کا پابند نہ ہوتا تو اُسی وقت اُس ٹیکری کے عقب میں پہنچ جاتا۔

◆

اگلے روز اُسے موقع مل گیا۔ وہاں سے کچھ سامان لانا تھا۔ اُسی کو حکم ملا کہ اپنے جوان ساتھ لے جائے اور مطلوبہ سامان لے آئے۔ وہ ٹیکری کے پیچھے گیا تو وہاں اُسے چھوٹے بڑے خیموں، قناتوں اور شامیانوں کا ایک شہر نظر آیا۔ وہ اس شہر میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک تو وہ لوگ تھے جو بھاگ دوڑ رہے تھے اور کچھ ایسے تھے جو چُپ چاپ اُکڑوں بیٹھے تھے۔ انہوں نے جو کپڑے پہن رکھے تھے، وہ صاف بتا رہا تھا کہ ان کے اپنے نہیں اور یہ بنگال کا لباس نہیں۔ اُن کے چہروں پر دہشت اور غم [illegible] بچوں کے ساتھ تھے۔ وہ اس تباہی کی داستان سنانے کے لیے زندہ رہ گئے تھے مگر ایسے لگتا تھا جیسے وہ گونگے اور بہرے ہوں۔ خوف و ہراس نے انہیں زندہ لاشیں بنا ڈالا تھا۔

طاہر پرویز کی نظریں خیموں کی اس وسیع بستی کے ایک ادھ حصے پر چلی گئیں۔ وہاں قناتیں اور شامیانے لگے ہوئے تھے۔ ان پر جھنڈے اور لمبے کپڑوں پر بڑے موٹے حروف میں [illegible] پارٹیوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ ایک بنگالی نے بتایا تھا کہ یہ سیاسی پارٹیوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔

”زندہ انسانوں کو فریب دینے والے ان کی لاشوں کی خدمت کرنے آئے ہیں“۔۔۔ طاہر پرویز نے اپنے آپ سے کہا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

وہ اُس طرف چلا گیا جدھر فوجیوں نے اپنا ہیڈکوارٹر بنا رکھا تھا۔ وہاں سے اُس نے سامان لیا اور واپس چل پڑا۔ وہ کیمپ سے نکل رہا تھا جب اُسے اپنے پیچھے کسی کے دوڑتے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ اُس نے پیچھے دیکھا اور اُس کے قدم رُک گئے۔ وہی بنگالی لڑکی جو اُسے ایک روز پہلے ملی تھی اُس کی طرف دوڑی آ رہی تھی۔

”میں نے دُور سے آپ کو دیکھا تھا“۔۔۔۔ لڑکی نے کہا۔۔۔۔ ”آپ جا رہے ہیں؟“

طاہر پرویز کہنے لگا تھا کہ میں تمہیں ہی دیکھنے آیا تھا اور میں اتنی جلدی جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اُس نے کہا۔۔۔ ”سامان لینے آیا تھا .... جا رہا ہوں .... آپ یہاں ہوتی ہیں؟“

”ہاں!“۔۔۔۔ لڑکی نے پُرتپاک لہجے میں کہا۔۔۔ ”میں یہیں ہوتی ہوں۔ سٹوڈنٹس کا کام یہیں ہے کل میں لاشیں دیکھنے کے لیے اُدھر گئی تھی“۔

طاہر پرویز خوبرو نوجوان تھا۔ اُس میں نوجوانی کے جذبات تھے۔ اُس کے خون میں وہی جوش تھا جو تندرست و توانا نوجوانوں میں ہُوا کرتا ہے۔ وہ ڈھیلا ڈھالا نہیں، چاک و چوبند تھا، چابی والے مینڈک کی طرح پھُدکنے والا نوجوان تھا مگر لڑکیوں کے ساتھ بے تکلف ہونے کی اُس نے کبھی نہیں سوچی تھی۔ ارشد اور طاہرہ نے اُس کے دل کو مُردہ نہیں ہونے دیا تھا بلکہ اُسے ہنسنا کھیلنا سکھایا تھا۔ ارشد اُسے بتایا کرتا تھا کہ طاہرہ نوجوانی میں کیسی تھی۔ کتنی خوبصورت تھی کتنی شوخ، چلبلی، کتنی ذہین مگر کیسے جذبوں سے سرشار تھی۔ طاہرہ کا یہ خاکہ طاہر پرویز کے ذہن میں نقش ہو گیا تھا اور وہ پاکستان کی ہر لڑکی کو طاہرہ سمجھتا تھا یا طاہرہ کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ شازی کو وہ طاہرہ کا صحیح عکس سمجھتا تھا۔ اب مشرقی پاکستان کے آفت زدہ علاقے میں اُس نے اس بنگالی لڑکی کو دیکھا تو اس میں اُسے طاہرہ کا پَرتو نظر آیا۔

”میں نے آپ کا نام نہیں پوچھا تھا“۔۔۔ طاہر پرویز نے لڑکی سے کہا۔

”صبیحہ شمس“۔۔۔ لڑکی نے جواب دیا۔۔۔ ”شمس میرے والد صاحب کا نام ہے .... شمس الحق .... آپ کا نام؟“

”طاہر پرویز“۔

پھر دونوں چُپ ہو گئے جیسے اُن کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ ہو، یا کہنے کو اتنا زیادہ ہو کہ فیصلہ نہ کر سکتے ہوں کہ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں اور بات کہاں سے شروع کریں۔ دونوں کی نظریں زمین پر چلی گئیں، پھر ایک ہی بار دونوں کی نظریں اوپر اٹھیں اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر آپس میں اُلجھ گئیں۔ دونوں نے نظروں کے تصادم کا دھچکہ محسوس کیا۔ ایک بار تو دونوں سُن ہو گئے لیکن صبیحہ کی لطیف سی ہنسی نے دونوں کو سنبھال لیا۔ طاہر پرویز نے محسوس کیا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

”کل آپ کے آنسو دیکھ کر میں رات کو بھی پریشان رہی“۔۔۔ صبیحہ نے ہنسی کو سنجیدگی میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ ”میں پریشان ہو گیا تھا، آنسو نکل آتے، آپ آنسو دیکھ کر پریشان ہو گئیں .... اپنا کوئی مر جاتا ہے تو آنسو نکل ہی آتے ہیں“۔

”میری پریشانی یہ تھی کہ آپ نے ہمیں اپنا سمجھا ہے“۔۔۔ صبیحہ نے کہا۔

اپنائیت کے اظہار کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کچھ آنکھیں کہہ دیتی ہیں، کچھ زیرِلب تبسم کہہ گذرتا ہے اور دل کی بات جو زبان پر نہیں لائی جاتی وہ چہرے اپنے تاثرات کے ذریعے بیان کر دیتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت صبیحہ اور طاہر پرویز پر طاری تھی مگر ایسی نہیں جیسی مرد پر عورت کو دیکھ کر اور عورت پر اپنی پسند کے مرد کو دیکھ کر طاری ہُوا کرتی ہے۔

صبیحہ اور طاہر پرویز نے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہ کیں۔ قسمیں نہ کھائیں پھر بھی دونوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے کو کچھ عرصے سے جانتے ہیں یا کم از کم ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں۔

”آپ شاید جلدی میں ہیں“۔۔۔ صبیحہ نے کہا۔

”ہاں، میں جلدی میں ہوں“۔۔۔ طاہر پرویز نے مُسکراتے ہوئے کہا اور اُس کے مُنہ سے نکل گیا۔۔۔ ”کہیں تو کسی وقت آ جاؤں گا“۔۔۔ یہ کہہ کر وہ چونک پڑا۔

”ضرور آئیں“۔۔۔ صبیحہ نے اشتیاق سے کہا۔۔۔ ”فوج کے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں ... آپ کب آئیں گے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا“۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ ”کسی وقت آ نکلوں گا .... آپ کے بھائی ہیں؟“

”دو ہیں“۔۔۔ صبیحہ نے جواب دیا۔۔۔ لیکن .... ہیں تو میرے بھائی .... لیکن ....“

”ٹھیک نہیں؟“

”بالکل ٹھیک نہیں“۔۔۔ صبیحہ نے کہا اور وہ مغموم سی ہو گئی۔

”پڑھتے نہیں؟“۔۔۔ طاہر پرویز نے پوچھا۔۔۔ ”آوارہ تو نہیں ہو گئے؟“

”پڑھتے بھی ہیں۔ آوارہ بھی نہیں ہوئے“۔۔۔ صبیحہ نے کہا اور آہ لے کر بولی۔۔۔ ”وہ پاکستان کے خلاف ہو گئے ہیں“۔

”پاکستان کے خلاف؟“

”ہاں!“۔۔۔ صبیحہ نے کہا۔۔۔ ”بلکہ پاکستان کے دشمن .... یہ ہندو کا اثر ہے۔ چھوٹا بھائی فرسٹ ایئر میں ہے اور بڑا بی۔ اے کر چکا ہے۔ چھوٹے بھائی کے کالج میں دو پروفیسر ہندو ہیں۔ وہ ہندو مذہب کی تبلیغ ایسے دلچسپ انداز سے کرتے ہیں کہ نوعمر لڑکے اس کا اثر قبول کر لیتے ہیں۔ بڑا بھائی دو ہندو لڑکیوں کے جال میں پھنسا ہُوا ہے۔ دونوں کہتے ہیں کہ پنجابی اور پٹھان ہمارے دشمن ہیں اور ہندو ہمارے دوست ہیں .... آپ جلدی میں ہیں۔ وہ آپ کی گاڑی ہے؟“

”ہاں!“۔۔۔ طاہر پرویز نے بے خیالی سے کہا۔۔۔ ”وہ میرا انتظار کر رہے ہیں“۔

وہ اس طرح اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا جیسے اُسے گھسیٹ کر لے جایا جا رہا ہو اور وہ آگے نہ جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ صبیحہ اُس کے ساتھ چل پڑی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ طاہر پرویز پریشان ہو گیا ہے اور وہ جانا نہیں چاہتا۔

”یہاں کے بڑے شہروں میں کالجوں کے طلباء کی ذہنی حالت یہی ہو گئی ہے جو میں نے اپنے بھائیوں کی بتائی ہے“۔۔۔ صبیحہ نے کہا اور ذرا دیر سوچ کر بولی۔۔۔ ”آپ کو شاید یہ بات بُری لگی ہے کہ میں نے کہا ہے کہ پنجابی اور پٹھان ہمارے دشمن ہیں“۔

"مجھے دشمن کہہ لیں" — طاہر پرویز نے کہا "کسی سے پنجابی اور پٹھان کو دشمن کہہ لیں، مجھے نہیں لگے گا لیکن جب یہ سنتا ہوں کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کو اپنا دشمن سمجھتا ہے تو میں جل اٹھتا ہوں .... آپ کیا سمجھتی ہیں؟"

"پھر آئیں گے نا آپ؟"

"اب تو ضرور آؤں گا"۔

"پھر میں آپ کو ساری باتیں سناؤں گی"۔

"دشمن سمجھ کر؟"

صبیحہ نے نظریں جھکا لیں پھر آہستہ آہستہ اُس کا سر اٹھا اور اُس کی نظریں طاہر پرویز کے چہرے پر جم گئیں جس پر نوجوانی کی چمک دمک میں لڑکپن کے آثار بھی ہویدا تھے۔ صبیحہ نے سر ہلایا۔ وہ اُسے دشمن نہیں سمجھتی تھی۔

"یہ چھوکرے چھوکرے لفٹین جہاں جاتے ہیں پہلے عشق بازی کرتے ہیں" — طاہر پرویز کے پلاٹون حوالدار نے اپنے جوانوں سے کہا۔ وہ گاڑی کے پاس کھڑے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔

"بنگال کے جادو سے کوئی نہیں بچ سکتا" — ایک لانس نائیک نے کہا۔

"بہت خوبصورت لڑکی ہے" — حوالدار نے کہا۔ "بنگال کے حسن کا جواب نہیں"۔

"ہمارا صاحب اس سے زیادہ خوبصورت ہے" — ایک جوان نے کہا۔

"چلو گاڑی میں بیٹھو" — حوالدار نے کہا — "صاحب آ رہا ہے"۔

جب طاہر پرویز کا فوجی ٹرک چلا تو صبیحہ نے ہاتھ ہلا کر طاہر پرویز کو خدا حافظ کہا۔

۞

"بنگالی ہے؟" — صبیحہ کو ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"نہیں" — صبیحہ نے یہ دیکھے بغیر کہ وہ کس کے سوال کا جواب دے رہی ہے، زیرِ لب کہا — "پاکستانی ہے" — اور اُس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ لڑکی اُس کی ہم جماعت تھی اور وہ ہندو لڑکی تھی۔

"وہ پاکستانی ہی ہوگا" — لڑکی نے غصیلی طنز سے کہا — "میں پوچھتی ہوں یہ بنگالی ہے؟ .... بنگالی لگتا نہیں"۔

"میں کہہ چکی ہوں، نہیں، نہیں" — صبیحہ نے غصّے سے کہا — "یہ پنجابی ہے .... ہاں پنجابی ہے۔ یہ مجھے کل بھی ملا تھا، آج بھی ملا ہے، کل پھر ملے گا" — اُس نے ہندو لڑکی کو قہر کی نظروں سے گھور [illegible] اں سے چل پڑی۔

لڑکی نے اُسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

"بڑے بھائی کو بھی یہی جواب دو گی؟" — ہندو لڑکی نے پوچھا۔

"میں مسلمان ہوں" — صبیحہ نے کہا — "ہندو نہیں کہ جھوٹ بولوں۔ میں ہندو لڑکیوں کی طرح مسلمان لڑکوں کو پھنساتی نہیں پھرتی۔ مجھے تمہاری مکتی باہنی کی ضرورت نہیں"۔

ہندو لڑکی غصّے میں آنے کی بجائے مسکرانے لگی۔ اُسے ٹریننگ ہی ایسی ملی تھی۔

"چلو پھر" — ہندو لڑکی نے کہا — "تمہارا بھائی تمہارے انتظار میں کھڑا ہے۔ اُس نے تمہیں اس پنجابی کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا ہے۔ اُس نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ تمہیں بلا لاؤں"۔

صبیحہ اور زیادہ غصے میں آ گئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی چل پڑی۔

امدادی کیمپوں میں ریلیف کے کاموں کے لیے لڑکے بھی آتے ہوتے تھے۔ صبیحہ کا بڑا بھائی [illegible] نہیں [illegible]۔ وہ پہلے ہی آ گیا تھا۔ صبیحہ کو دیکھنے آیا تو صبیحہ اُسے طاہر پرویز کے ساتھ کھڑی پھر اس کے ساتھ [illegible] تک جاتی نظر آئی۔

"کون تھا وہ؟" — بڑے بھائی نے صبیحہ سے پوچھا۔

"لفٹیننٹ ہے" — صبیحہ نے بے رخی سے جواب دیا — "پنجابی ہے۔ پاکستانی ہے، ہندو نہیں، مسلمان ہے"۔

"تمہارا دماغ دن بدن خراب ہوتا جا رہا ہے" — بھائی نے کہا — "میں آئندہ تمہیں کسی پنجابی کے ساتھ نہ دیکھوں"۔

"میں دل سے اتار رہی ہوں کہ تم میرے بڑے بھائی ہو" — صبیحہ نے کہا — "میں تمہیں یہ حق نہیں دے سکتی کہ مجھ پر حکم چلاؤ۔ میں اس لفٹیننٹ سے پھر بھی ملوں گی [illegible]"۔

"پھر یہ لیفٹیننٹ ہمارا پہلا شکار ہوگا" — بھائی نے کہا۔

صبیحہ نے اس طرح چونک کر اپنے بھائی کی طرف دیکھا جیسے بھائی نے اُس کے دل [illegible] خنجر اتار دیا ہو۔

بھائی نے اور کچھ نہ کہا۔ وہاں سے چلا گیا اور ریلیف کیمپ کے [illegible]

مشرقی پاکستان کی وہ رات نمی سے ڈھلی ہوئی تھی۔ بارہویں کا بیضوی چاند نتھے تلوں کی طرح چمک رہا تھا۔

صبیحہ کی آنکھیں چاند سے زیادہ شفّاف تھیں۔ یہ ایک نوجوان بنگالن کی آنکھیں تھیں جو اپنے اندر بنگال کا سحر سمیٹے ہوئے تھیں۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ طاہر پرویز ان آنکھوں کے طلسم میں کھو گیا تھا۔

صبیحہ اور طاہر پرویز ایک دوسرے میں گم ہو گئے تھے۔ چاہنے والے اور دلوں کا سودا کرنے والے راتوں کو وہاں جا بیٹھتے ہیں جہاں پھولوں کی مہک اور ہرے بھرے پیڑ پودوں سے گزرتی ہوا کی ہلکی ہلکی سائں سائں ہوتی ہے مگر ایک حسین بنگالن اور ایک خوبرو پنجابی کے دل وہاں مل رہے تھے جہاں پھولوں کی مہک نہیں، پھُولی ہوئی لاشوں کا تعفّن تھا۔ وہاں پیڑ بھی تھے، پودے بھی تھے مگر ان کے پتّے نہیں تھے۔ وہ بھی لاشوں کی مانند تھے۔ ان کی سوکھی ٹہنیوں سے ہوا کے جھونکے گزرتے تھے تو سائں سائں کی زبان سے رومان نہیں جگاتے تھے، سسکیاں لیتے تھے جیسے کوئی دکھیاری بیوہ اُجڑے ہوئے آنگن میں گھٹنوں میں سر دیئے سسک سسک کر رو رہی ہو۔

مشرقی پاکستان کی وہ رات اشکبار تھی۔

کبھی ایسے لگتا جیسے سمندری طوفان میں ڈوب جانے والی ماؤں کی روحیں اپنے بچوں کو ہر جا ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ ان کے قدموں کی سرسراہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔ کبھی ایسے جیسے مر جانے والوں کی روحیں سرگوشیوں میں مشرقی پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کر رہی ہوں۔

"کوئی بات نہیں کرو گی صبیحہ؟"

طاہر پرویز کی دھیمی سی آواز نے صبیحہ کو جیسے بیدار کر دیا ہو۔ تب اُس نے اپنی نیم وا آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ اُس کے ہاتھ کی انگلیاں طاہر کی انگلیوں میں اُلجھی ہوئی ہیں اور اُس کا دوسرا ہاتھ طاہر پرویز کے بازو پر رینگ رہا ہے۔

"تمہیں اتنا ہی اُداس ہونا چاہیئے" — طاہر نے کہا — "میں تمھارے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے نہیں آیا.... کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اس طرح تنہائی میں مجھ سے نہیں ملنا چاہتی تھیں؟"

"نہیں" — صبیحہ نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا — "میں آنا نہ چاہتی تو آتی ہی نہ۔ کہو گے تو ساری رات یہیں تمھارے پاس بیٹھی رہوں گی.... لیکن...." اُس نے طاہر پرویز کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا اور چپ ہو گئی۔

"لیکن کیا؟" — طاہر پرویز نے کہا — "تم کیا محسوس کر رہی ہو؟ چُپ چُپ کیوں ہو؟"

"آج تیسرا دن ہے مجھے چُپ لگی ہوئی ہے" — صبیحہ نے طاہر پرویز کی ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی آہستہ

آہستہ رگڑتے ہوئے کہا — "میں تمہیں یہ بات نہیں بتانا چاہتی تھی لیکن بتا دوں تو اچھا ہے" — اُس نے آہ بھری اور کہنے لگی — "اُس روز تم کیمپ میں سامان لینے آئے تھے تو میں نے تمہیں دیکھ لیا اور روک لیا تھا۔ اسی وقت میرا بڑا بھائی مجھے دیکھنے آ گیا اور اُس نے مجھے تمھارے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا۔ تم چلے گئے تو میں اُس کے پاس گئی۔ اُس نے مجھ سے تمھارے متعلق پوچھا۔ میں نے بتا دیا کہ تم سیکنڈ لیفٹیننٹ ہو اور پنجابی ہو۔ بھائی نے مجھے حکم دیا کہ میں آئندہ تمھارے ساتھ یا کسی بھی پنجابی کے ساتھ بات نہ کروں۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُس کا کوئی حکم نہیں مانوں گی۔ اُس نے مجھے ایسی دھمکی دی جس نے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہے۔"

"دل پر اتنا اثر نہ لو صبیحہ!" — طاہر پرویز نے کہا — "دھمکی خالی الفاظ ہوتے ہیں.... اگر بڑا بھائی تمہیں میرے ساتھ بات کرنے سے روکتا ہے تو اُس کا کہا مانو۔ وہ بڑا بھائی ہے۔ میں اُس محبّت کا قائل نہیں جو آنکھوں سے شرم و حیا اور چھوٹے بڑے کی تمیز دھو ڈالے۔"

"سوال تمھارا اور میرا نہیں" — صبیحہ نے کہا — "نہ ہی ہماری محبت کا مسئلہ ہے۔ مجھے میرے بھائی نے چیلنج کیا ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ کس نظریئے کا آدمی ہے۔ اُس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تم سے نہ ملوں۔ اُس نے دراصل یہ کہا ہے کہ میں کسی بھی پنجابی سے نہ ملوں۔ بلکہ اُس نے یہ کہا ہے کہ میں پاکستان کی محبّت کو دل سے نکال دوں" — صبیحہ ذرا سا چُپ ہوئی پھر اُس نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا طاہر کا ہاتھ طاہر کی ران پر پٹخ کر جوشیلی اور جذباتی آواز میں کہا — "تم میری نظروں میں ایک خوبصورت نوجوان نہیں ہو۔ اپنے بھائی کے اس چیلنج اور اس دھمکی کے بعد میں تمہیں پنجاب کی، سرحد کی، سندھ اور بلوچستان کی، سارے پاکستان کی ایک مقدّس علامت سمجھنے لگی ہوں۔"

طاہر ذہین نوجوان تھا لیکن اس قسم کی صورتِ حال اس کے لیے نئی اور پیچیدہ تھی۔ اُسے اور کچھ نہ سوجھی، اس نے صبیحہ سے پوچھا کہ اُس کے بھائی نے کیا دھمکی دی ہے۔

"اُس نے کہا ہے کہ تمھارا یہ پنجابی دوست ہمارا پہلا شکار ہو گا" — صبیحہ نے کہا۔

"میں فوجی ہوں صبیحہ!" — طاہر پرویز نے کہا — "مجھے اپنا ڈر نہیں۔ میں ان دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں۔ مجھے تمھاری عزت اور تمھارے وقار کا خیال ہے۔ تم میری پابند نہ رہو۔ اپنے بڑے بھائی کا احترام دل سے نہ نکلنے دو۔"

"تم اسے احترام کہتے ہو" — صبیحہ نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا — "میں اُس بھائی پر لعنت بھیجتی ہوں جو اپنے ملک اور اپنے مذہب کے دشمن کے ہاتھ میں کھیل رہا ہو.... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں طاہر! اُس کی دھمکی کو تم کھوکھلے الفاظ نہ سمجھنا۔ تمہیں شاید ابھی تک کسی نے بتایا نہیں کہ یہاں غیر بنگالیوں کے قتلِ عام کا پروگرام بن چکا ہے۔ اس پروگرام میں ہندو پیش پیش ہیں اور ان نوجوانوں کی قیادت بھی انہی کے ہاتھ میں ہے۔ ان لوگوں کے لیے تمھارا قتل کوئی مشکل بات نہ ہو گی۔"

طاہر پرویز ہنس پڑا اور بولا — "میں بچّہ تو نہیں صبیحہ، کہ وہ مجھے اُٹھا کر لے جائیں گے۔"

طاہر کی ہنسی صبیحہ کی پریشانی اور اعصابی کھچاؤ کو کم نہ کر سکی۔ طاہر پرویز کو معلوم تھا کہ مشرقی پاکستان

خانہ جنگی کی طرف جا رہا ہے۔ اُسے اُس کے کمانڈنگ آفیسر نے تفصیل سے بتایا تھا کہ حالات کس قدر خطرناک رخ بدلنے والے ہیں۔ فوجی افسروں کو خصوصی ہدایات دی گئی تھیں اور انہیں کچھ احتیاطی تدابیر بھی بتائی گئی تھیں۔ ان ہدایات اور احتیاطی تدابیر سے طاہر پرویز صرف یہ سمجھ سکا تھا کہ مشرقی پاکستان میں جو کچھ بھی ہو، فوج خاموش تماشائی ہو گی۔ طاہر پرویز کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ کالجوں میں جو غیر بنگالی طلبا ہیں انہیں بنگالی سٹوڈنٹ مار پیٹ کر بھگا رہے ہیں اور بہت سے طلبا، جو دوسرے صوبوں سے یہاں آتے ہوئے تھے، مشرقی پاکستان سے چلے گئے ہیں یا انہوں نے کالج جانا چھوڑ دیا ہے۔

"مجھے تم سے ملنے سے باز نہیں آؤں گی طاہر!" ——صبیحہ نے کہا اور التجا کے لہجے میں بولی——
"خدا کے لیے تم اپنے آپ کو بچا کر رکھنا۔"

طاہر نے دیکھا کہ صبیحہ کی پلکوں پر دو ستارے چمک رہے تھے۔ چاندنی میں اُس کے آنسو اُس کی آنکھوں سے زیادہ روشن تھے۔ طاہر نے بازو لمبا کر کے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"تم جیسی جرأت مند لڑکی کو اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے" —— طاہر پرویز نے کہا اور جیب سے رومال نکال کر اُس کے آنسو پونچھ ڈالے۔

"پھر ملو گے نا طاہر!" —— صبیحہ نے جذبات اور پیار سے مخمور لہجے میں پوچھا۔
"ملوں گا صبیحہ! ضرور ملوں گا۔"

❁

لاشوں کو سپردِ خاک کرنے کا کام چند دنوں میں ختم ہو گیا۔ جو بنگالی طوفان سے بچ گئے تھے انہیں اِدھر اُدھر بھیج دیا گیا۔ کالجوں کے طلباء کیمپ سمیٹ کر چلے گئے۔ سیاسی پارٹیاں بھی بوریا بستر لپیٹ گئیں۔ فوج بھی بیرکوں میں چلی گئی۔

لاہور کی وہ وسیع و عریض کوٹھی جو راوی روڈ پر "آشا بھون" کے نام سے مشہور تھی اور جہاں طاہر پیدا ہوا تھا، اب "طاہر منزل" کہلاتی تھی۔ ارشد اور طاہرہ نے بڑے پیار سے "آشا بھون" کی جگہ سنگِ مرمر کی نئی پلیٹ لگائی تھی جس پر طاہر منزل لکھا تھا۔ ارشد کے بڑے بھائی یوسف کے بچے بھی تھے لیکن سب نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ عفت کی یاد میں کوٹھی اُس کے بچے کے نام سے منسوب کی جائے۔

اُس روز طاہر منزل کا ماحول مُسکرا رہا تھا۔ ڈاکیا طاہر پرویز کا خط پھینک گیا تھا لیکن خط پڑھا تو فضا مُلول ہو گئی۔ طاہر پرویز نے مشرقی پاکستان میں سمندری طوفان کی تباہی کی تفصیلات ایسے الفاظ میں لکھی تھیں کہ جس نے خط پڑھا وہ افسردہ ہو گیا۔ طاہر پرویز نے لاشوں کی حالت بھی لکھی تھی۔ اُس نے لکھا تھا:

"...... سیلاب پنجاب میں بھی آتے ہیں لیکن اتنا نقصان نہیں کرتے۔ مشرقی پاکستان میں جو تباہی میں نے دیکھی ہے وہ آپ تصور میں بھی نہیں لا سکتے۔ اگر فوجی اور طلباء نہ جاتے تو لاشیں اٹھانے اور دفن کرنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان بنگالیوں کو خدا نے بھی دل سے اُتار دیا ہے۔ یہ بھی انسان تھے لیکن انسانوں نے انہیں انسان نہ سمجھا ...... اس سمندری طوفان کی تباہ کاری ختم نہیں ہوئی۔ یہاں کے حالات جو خطرناک کروٹ بدل چکے ہیں وہ پورے مشرقی پاکستان کو سمندری

طوفان کی طرح تباہ کر کے رہیں گے۔ یہاں سیاسی پارٹیاں تو بہت ہیں لیکن مقبول عام پارٹی شیخ مجیب الرحمٰن کی ہے۔ یہاں بیس لاکھ بنگالیوں کی لاشوں پر الیکشن لڑا جا رہا ہے۔ پروپیگنڈہ ایسا کیا جا رہا ہے جیسے ان بھوکے ننگے بنگالیوں کو پنجابیوں نے ڈبویا ہے ......"

طاہر پرویز کا خط خاصا طویل تھا۔ اس خط میں درد تھا، کرب اور اضطراب تھا۔

❁

ارشد اور طاہرہ اُسی روز ملک رجب علی اور سلمیٰ سے ملنے چلے گئے۔ طاہر نے اصغر اور شازی کے متعلق بھی کچھ لکھا تھا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ اصغر کا بھی خط آیا ہے۔ سلمیٰ نے طاہرہ کو بتایا کہ شازی امید سے ہے، بچے کی ولادت میں بمشکل ایک مہینہ باقی ہے۔ اصغر نے لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان کے حالات ایسے ہیں کہ چھٹی نہیں مل سکتی۔ وہ شازی کو لاہور بھیجنا چاہتا تھا لیکن شازی کی اس جسمانی حالت کے پیشِ نظر اس کا اکیلے جانا ٹھیک نہیں تھا۔

"ہم سوچ رہے ہیں کہ ہم دونوں چلے جائیں اور شازی کو ساتھ لے آئیں" —— سلمیٰ نے کہا۔
"سوچ نہیں رہے" —— ملک رجب علی نے کہا —— "ہم دونوں جا رہے ہیں۔"
"میرے دل میں یہ خواہش ایک عرصے سے تڑپ رہی ہے کہ مشرقی پاکستان بھی دیکھوں" —— طاہرہ نے کہا —— "جس پاکستان کی خاطر قوم کا اتنا خون بہ گیا تھا، وہ پورا پاکستان دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے" —— طاہرہ نے جذباتی سی آہ بھری اور بولی —— "بڑھاپے میں لوگ حج کی خواہش کرتے ہیں لیکن میرا دل تڑپتا ہے کہ اُس پاکستان کا کوچہ کوچہ گھوم پھر کر دیکھوں جو ہم نے اپنے ہاتھوں بنایا تھا، پھر عمر کے جو چند دن رہ جائیں وہ خانہ کعبہ میں جا کر گزار دوں۔"

"سوچتی کیا ہو!" —— ملک رجب علی نے کہا —— "ہم دونوں جا رہے ہیں، تم دونوں بھی ساتھ چلو۔ اصغر کا اپنا کوارٹر ہے۔ وہاں کچھ دن رہیں گے اور شازی کو ساتھ لے کر واپس آجائیں گے ...... کیوں ارشد! چھٹی لے لو اور چلو چلیں۔ ہوائی جہاز سے جائیں گے۔"

بات جو جذبات اور خواہشات سے شروع ہوئی تھی حقیقت کا رنگ اختیار کر گئی۔ طاہرہ اور ارشد نے بھی مشرقی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ بھی ہُوا کہ بچوں کو ساتھ نہیں لے جائیں گے۔

تین روز بعد طیارہ انہیں اٹھائے بھارت کے اوپر سے گزر رہا تھا۔

❁

اصغر اور طاہر کو بذریعہ تار اطلاع مل چکی تھی کہ یہ لوگ فلاں فلائیٹ سے آ رہے ہیں۔ دونوں نے انہیں ڈھاکہ سے اپنے کیمپ تک لانے کے لیے چھٹی لے لی تھی۔ وہاں سے ڈھاکہ بہت دور تھا۔ وہی مشرقی پاکستان کا ایئرپورٹ تھا۔ دونوں ڈھاکہ پہنچ گئے۔

دو ہی روز پہلے صبیحہ طاہر پرویز سے ملنے اُس کے کیمپ میں آگئی تھی۔

یہ خیموں والا کیمپ نہیں تھا نہ ہی یہ چھاؤنی تھی۔ انگریزوں نے جنگِ عظیم کے دوران کچھ بیرکیں بنائی تھیں جن میں ایک بٹالین سما سکتی تھی۔ انہیں کیمپ کہا جاتا تھا کیونکہ یہ باقاعدہ چھاؤنی نہیں تھی

تھی۔ مشرقی پاکستان میں بھی مارشل لاء نافذ تھا اس لیے یونٹوں کو اس قسم کے پکّے کیمپوں میں بھیج دیا گیا تھا۔ یہ کیمپ جس میں طاہر پرویز کی بٹالین تھی، آبادی سے ڈیڑھ ایک میل دور جنگل میں تھا اور درمیان میں ایک پکّی سڑک تھی۔

اتوار کا دن تھا۔ طاہر پرویز کو کسی نے اُس کے کمرے میں آکر بتایا کہ ایک بنگالی لڑکی اُسے ملنے آئی ہے۔ طاہر پرویز دوڑتا باہر گیا۔ صبیحہ آفیسرز میس کے برآمدے میں کھڑی تھی۔ طاہر پرویز اُسے اپنے کمرے میں لے آیا لیکن وہاں بٹھانے کی بجائے اسے اصغر اور شازی کے کوارٹر میں لے گیا۔ اُس نے اس سے پہلے میجر اصغر کو صبیحہ کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اب اُس کا تعارف کرایا اور اصغر اور شازی کو بتایا کہ صبیحہ کون ہے اور اسے کہاں ملی تھی۔

شازی تو صبیحہ کے ساتھ بے تکلّف ہوگئی لیکن اصغر کی مزاجی کیفیّت کچھ اور ہوگئی تھی۔ وہ کبھی صبیحہ کو اور کبھی طاہر پرویز کو غور سے دیکھتا اور سنجیدہ اتنا کہ اسے کسی کی بات پر ہنسنا پڑتا تو اس کی ہنسی بھی سنجیدہ ہوتی تھی۔ وہ صبیحہ کو دیکھ کر خوش نہیں ہُوا تھا۔ شازی ہنسنا ہنسانا جانتی تھی۔ وہ اداکاری بھی کر سکتی تھی۔ اُس کے انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے وہ بہت خوش ہے کہ صبیحہ اُس کے گھر آئی ہے۔

اصغر اور شازی، طاہر اور صبیحہ کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے یا نہیں، وہ بہرحال یہ سمجھ رہے تھے کہ ان دونوں کی ملاقات اتفاقیہ ہُوئی ہے اور دونوں اُس محبت کے رشتے میں بندھ گئے ہیں جو فلموں میں دکھائی جاتی ہے اور جس پر نہ جانے کب سے ناول اور افسانے لکھے جا رہے ہیں لیکن صبیحہ نے بات شروع کی تو اصغر اور شازی کو جیسے دھچکہ لگا ہو۔ صبیحہ شاید یہ بات نہ کرتی لیکن شازی نے مذاق میں کچھ کہہ دیا جس کے جواب میں صبیحہ کو بولنا پڑا۔

"تم دونوں کتنے اچھے لگ رہے ہو صبیحہ!" — شازی نے کہا — "میں تو گُڈی گُڈے کا بیاہ کروں گی"

صبیحہ پہلے تو چونکی جیسے اُسے یہ مذاق اچھا نہ لگا ہو۔ طاہر پرویز ہنس پڑا اور صبیحہ کی بھی ہنسی نکل گئی۔ صبیحہ بے تکلّفی سے بات کرنے والی بلکہ جرأت سے بولنے والی لڑکی تھی۔ وہ شرمائی نہیں۔

"طاہر کو میں نے پہلی بار دیکھا تو میرے دل میں یہ خواہش نہیں تھی جو آپ نے ظاہر کی ہے" — صبیحہ نے سنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا — "طاہر نے آپ کو بتایا ہے کہ یہ ایک بچّے کی لاش کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی شکل وصورت سے صاف نظر آتا تھا کہ یہ بنگالی نہیں۔ مجھے غصہ آگیا تھا میں اسے کہنا چاہتی تھی کہ ہمارے بچّے مر چکے ہیں، اب کیا لینے آتے ہو؟ جاؤ، ہم اپنے بچوں کو خود دفن کر لیں گے۔ یہ بچّے ہمارے ہیں، تمہارے کیا لگتے ہیں؟ .... اس نے سر اٹھایا تو میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ میرا غصّہ پگھل گیا۔ میں نے پھر بھی اس کے ساتھ طنزیہ بات کی۔ اس نے میری طنز کے جواب میں ایسی باتیں کیں کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے پاکستان ایک ماں ہے اور ہم دونوں کو اس ماں نے جنم دیا ہے"

"لیکن یہاں تو غیر بنگالیوں کو غیر ملکی سمجھا جا رہا ہے" — میجر اصغر نے کہا — "بلکہ غیر بنگالیوں کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی ہے"

"میں پاکستانی گھرانے کی لڑکی ہوں" — صبیحہ نے کہا — "میں پہلے پاکستانی ہوں، اس کے بعد بنگالی۔ میرے ماں باپ کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ میں پاکستان میں پیدا ہوئی تھی.... میں جب سمجھنے بوجھنے کی عمر کو پہنچی تو امّی اور ڈیڈی نے مجھے سنانا شروع کر دیا تھا کہ انہوں نے پاکستان کس طرح حاصل کیا تھا اور ۱۹۴۷ء میں مغربی بنگال میں کتنے لاکھ مسلمانوں کو ہندوؤں نے قتل کر دیا تھا"

صبیحہ نے جب تحریکِ پاکستان، مسلمانوں کے قتلِ عام اور مغربی بنگال اور ملحقہ صوبوں سے مشرقی پاکستان کو مسلمانوں کی ہجرت کی وہ روئیداد سنائی جو اُسے اُس کا باپ سناتا رہا تھا تو اصغر، شازی اور طاہر کو ایسے لگا جیسے سلمیٰ، طاہرہ اور ارشد انہیں مشرقی پنجاب کی ہولناک کہانیاں سنا رہے ہوں۔

"میرے ڈیڈی اور امّی سچے پاکستانی ہیں" — صبیحہ نے تحریکِ پاکستان میں اپنے باپ اور اپنی ماں کے کارنامے سنا کر کہا — "میں آپ سب کو اپنے گھر بلاؤں گی۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ اُن کے دلوں میں پاکستان کی اور ہر پاکستانی کی کتنی محبت ہے.... میرے دو بھائی باغی ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کا اثر قبول کر لیا ہے۔ ہو سکتا ہے ڈیڈی انہیں گھر سے نکال دیں"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارے بھائی تمہارے ڈیڈی کو ہی گھر سے نکال دیں" — میجر اصغر نے کہا — "مجھے معلوم ہے کہ ہندوؤں کا اثر مشرقی پاکستان کی رگوں میں اُتر گیا ہے۔ یہاں وہ بنگالی بھی محفوظ نہیں جو پاکستان کے حامی ہیں اور پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں"

"میرے ڈیڈی کاروباری آدمی ہیں" — صبیحہ نے کہا — "بڑی اچھی پوزیشن کے مالک ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایسے آدمی ہیں جنہیں آپ غنڈے بدمعاش کہہ سکتے ہیں۔ ڈیڈی کسی کی طرف اشارہ کر دیں تو یہ آدمی اُسے غائب کر دیں گے"

اصغر نے صبیحہ کو بتایا کہ طاہر پرویز کی ماں طاہرہ اور اس کے باپ ارشد نے حصولِ پاکستان کے جہاد میں کیسے کارنامے کیے تھے۔ پھر اصغر نے صبیحہ کو شازی کے ایثار کی داستان سنائی، پھر یہ سنایا کہ شازی نے یہاں آکر کس طرح بھارت کے جاسوسوں اور تخریب کاروں کا بڑا مضبوط رِنگ تڑوایا اور ان کا ایک خفیہ اڈہ تباہ کرایا ہے۔

صبیحہ نے شازی کے چہرے پر اس طرح حیرت زدہ نظریں گاڑ دیں جیسے بیٹھے بیٹھے شازی کی شکل وصورت بدل گئی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی، شازی تک گئی اور اُس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ شازی نے اُس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور اُس کا سر اپنے کندھے کے ساتھ لگا لیا۔ صبیحہ عقیدت سے شازی کے ساتھ لگی رہی۔ چند لمحوں بعد وہ یکلخت شازی سے الگ ہو کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"لیکن.... لیکن" — اُس کی زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ چُپ ہو گئی پھر اچانک بولی — "لیکن مشرقی پاکستان بہت بڑے خطرے میں آگیا ہے.... کیا ہمارے جذبے اور حب الوطنی مشرقی پاکستان کو بچا سکے گی؟ میرے ڈیڈی اور امّی ہر وقت پریشان رہتے ہیں۔ ڈیڈی

ایک کہا کرتے ہیں کہ یہاں اپنی فوج بہت تھوڑی ہے۔ انڈیا مشرقی پاکستان پر ہاتھ صاف کر جائے گا۔ مغربی پاکستان سے فوج آنی چاہیے۔ معلوم نہیں کیوں نہیں آتی!

اصغر اور طاہر پرویز کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ بھارت کی فوج کو مشرقی پاکستان کی سرحد کے قریب بھی نہیں آنے دیں گے۔

"اوہ!" — صبیحہ نے اپنی گھڑی دیکھی تو چونک کر بولی — "اتنا وقت گزر گیا ہے؟ ..... مجھے جانا چاہیے۔"

"جاؤ طاہر بھیا!" — شازی نے طاہر پرویز سے کہا — "صبیحہ کے ساتھ جاؤ۔ اتنی دور اکیلی کیسے جائے گی۔"

"میں اکیلی نہیں باجی!" — صبیحہ نے کہا — "یہ ساتھ ہی چھوٹی سی آبادی ہے۔ میری دو سہیلیاں وہاں اپنے رشتہ داروں کے ہاں آئی تھیں۔ میں اُن کے ساتھ جاؤں گی" — وہ جانے کے لیے اٹھی اور بولی — "آپ سب میرے گھر آئیں گے؟ میرے ڈیڈی اسا آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"آئیں گے صبیحہ!" — شازی نے کہا — "ضرور آئیں گے۔"

●

"کہاں کے چکر میں پڑ گئے ہو طاہری!" — صبیحہ کے جانے کے بعد اصغر نے طاہر پرویز سے کہا — "بنگالیوں کو تمہارے خلاف ایک بہانہ مل جائے گا۔"

"کوئی چکر نہیں بھائی جان!" — طاہر پرویز نے کہا — "آپ کو بتا دیا ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ میری ملاقات کس طرح ہوئی تھی۔ صبیحہ کی باتیں آپ نے سنی ہیں۔"

"پہلی ملاقات اسی طرح ہوا کرتی ہے طاہری!" — میجر اصغر نے کہا — "تم فلمیں دیکھتے رہتے ہو۔ بعض فلموں میں ایک جوان آدمی اور ایک خوبصورت لڑکی کی راہ جاتے کسی وجہ سے ٹکر ہو جاتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے لیکن لڑائی لڑائی میں پیار ہو جاتا ہے اور ایک فلمی سٹوری بن جاتی ہے۔ قبرستان میں بھی پہلی ملاقات ہوا کرتی ہے اور کسی دکان پر ہم"

"میں فلمی ہیرو نہیں بنوں گا بھائی جان!" — طاہر نے کہا۔

"شمیم کے چکر میں تم کیوں پڑ گئے تھے اصغر؟" — شازی نے مسکراتے ہوئے کہا — "تم کہتے تھے کہ وہ تو کوئی حور ہے جو تم دونوں کے دلوں میں ایک جیسا تھا۔"

"جس روز شمیم نے مجھے کہا تھا کہ اس کے دل میں پاکستان کی محبت اتنی نہیں جتنی میری ہے میں نے اسی روز اُسے دل سے اُتار دیا تھا" — اصغر نے کہا۔

"جس روز صبیحہ نے مجھے ایسی بات کہی میں اُسے دل سے اتار دوں گا" — طاہر نے کہا۔

"مجھے ڈر ہے بنگالی تمہیں زمین میں نہ اتار دیں" — اصغر نے کہا — "شمیم کا معاملہ اور تھا۔ وہ پنجاب میں تھا یہ بنگال ہے۔ مجھے صبیحہ کے بھائیوں کی طرف سے خطرہ نظر آتا ہے۔"

کل کہنے لگو کہ شادی اسی کے ساتھ کرنی ہے۔ یہ یاد رکھنا کہ تمہارے تایا یوسف کی بیٹی جوان ہو گئی ہے اور سارے خاندان کی نظریں اسی پر لگی ہوتی ہیں۔ لڑکی صبیحہ جیسی خوبصورت ہے اور تمہیں دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ طاہرہ خالہ میرے ساتھ بات کر چکی ہیں۔ چچا ارشد کی بھی یہی خواہش ہے۔ انہیں مایوس نہ کرنا۔"

"میں نے شادی کی تو ابھی سوچی ہی نہیں" — طاہر پرویز نے کہا — "تایا یوسف کی بیٹی عصمت کو میں نے کبھی بھی اپنی بیوی کے روپ میں نہیں دیکھا۔"

"لیکن وہ تمہیں خاوند کے روپ میں دیکھ رہی ہے" — شازی نے کہا۔

طاہر پرویز نے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدہ سا تاثر آ گیا۔

●

دو روز بعد ملک رجب علی، ارشد، سلمیٰ اور طاہرہ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اُترے۔ اصغر، شازی اور طاہر پرویز ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ طاہرہ طاہر پرویز کی ماں نہیں تھی، رجب علی اصغر کا باپ نہیں تھا لیکن طاہرہ نے طاہر پرویز کو اور رجب علی نے اصغر کو بازوؤں میں لے کر گلے لگایا تو بازو شکنجے بن گئے۔ طاہرہ اصغر کی پسلیاں ٹوٹنے لگیں۔ سلمیٰ اور طاہرہ کے بوسے ایسے بے اختیار تھے جیسے دونوں لڑکوں کو چاٹ لیں گی۔

طاہرہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر اُس کی نظریں فضا میں گھومنے لگیں جیسے فضا میں کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ اُس نے فضا کو سونگھا۔

"کس قدر پیاری فضا ہے!" — طاہرہ نے سکون کی آہ لیتے ہوئے کہا — "ایک ہزار میل دور ایسا لگتا ہے جیسے اپنے گھر سے نکل کر ساتھ والے گھر میں آ گئے ہوں" — اُس کے چہرے پر ذرا سی اداسی آ گئی۔ اس نے اصغر سے پوچھا — "ابھی کتنی دور جانا ہے؟"

"بہت دور" — اصغر نے جواب دیا — "ریل گاڑی جلدی پہنچا دے گی۔"

"میں جلدی نہیں پہنچنا چاہتی" — طاہرہ نے جذباتی لہجے میں کہا — "میرا تو جی چاہتا ہے کہ پیدل سارے مشرقی پاکستان میں گھوم جاؤں۔"

اصغر نے کہا کہ وہ مشرقی پاکستان کی ..... اور تھا جس میں غیر بنگالی بے خوف گھوما پھرا کرتے تھے لیکن اُس نے ایسی بات نہ کی۔ وہ طاہرہ کے جذبات کا کُشت و خون کرنے سے ڈر گیا۔

"خالہ!" — اصغر نے کہا — "اگر آپ مشرقی پاکستان کی سیر کرنا چاہتی ہیں تو ہم کچھ دور تک ریل گاڑی میں جائیں گے اور وہاں سے آگے موٹر بوٹ پر چلے جائیں گے۔ یہ دریاؤں اور ندیوں کی سرزمین ہے۔ یہاں کے ..... سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں۔ یہاں کے جنگل نشہ سا طاری کر دیتے ہیں۔"

"لیکن بنگالی بہت ..... رہتے ہیں" — ملک رجب علی نے کہا — "کیوں ارشد! طاہرہ کو کچھ سمجھاؤ۔"

"بات جو آپ نے کی ہے وہ میں بھی نہیں سمجھنا چاہتا" — ارشد نے آہ بھر کر کہا — "طاہرہ کو میں کیا سمجھاؤں گا۔ ..... باتوں کو پہلے اپنے ٹھکانے پر پہنچیں۔"

وہ سب کچھ دور تک ریل گاڑی میں گئے۔ زیادہ تر سفر لانچ میں کیا۔ طاہرہ پر ایسی کیفیت طاری رہی جیسے اُس پر مشرقی پاکستان کی بُو باس کا خمار طاری ہو گیا ہو۔ وہ سب سے لاتعلق رہی۔ اُس کے ہونٹوں سے یہ سرگوشی کئی بار پھسل گئی ——"یہ وہی پاکستان ہے جو ہم نے بنایا تھا۔ یہ ہمارا دشمن نہیں ہو سکتا۔"

اُس کی یہ سرگوشی رجب علی نے بھی سُنی، ارشد نے بھی سُنی، اصغر اور طاہر پرویز بھی سن رہے تھے۔ اُن کا ردِ عمل اُن کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ یہ کربناک سے تاثرات تھے جو سب کے چہروں پر چھا گئے تھے لیکن اُنہوں نے طاہرہ سے کچھ بھی نہ کہا۔

"طاہرہ بہت جذباتی عورت ہے" —— رجب علی نے کہا۔

"جنہوں نے اپنے ہاتھوں پاکستان بنایا اور اپنے خون سے پاکستان کی تاریخ کا پہلا باب لکھا تھا، وہ آج صرف جذباتی نہیں، پاگل ہوتے جا رہے ہیں" —— ارشد نے کہا اور وہ طاہرہ کو دیکھنے لگا —— تھوڑی دیر بعد اُس نے سسکی سی لے کر کہا —— "مجھے وہ وقت یاد ہے ملک صاحب!.... ایک ایک لمحہ یاد ہے۔ مجھے طاہرہ کا وہ جوش اور جذبہ بھی یاد ہے۔ اُس وقت یہی جذبہ بنگالیوں میں بھی تھا، ہم جیسی قربانیاں انہوں نے بھی دی تھیں.... میں نہیں بھول سکتا ملک صاحب! کیا آپ میں اتنی جرأت ہے کہ طاہرہ سے کہیں کہ بھول جاؤ اُس وقت کو جب تم نے انگریزوں اور ہندوؤں سے ٹکر لی تھی؟ کیا آپ اسے کہہ سکتے ہیں کہ اُن لاشوں کو بھول جاؤ جو ہم پاکستان کے راستے میں بکھیرتے آئے تھے؟ کیا آپ اُن ستّر ہزار مسلمان لڑکیوں کو بھول سکتے ہیں جو ۱۹۴۷ء میں اغوا ہو گئی تھیں؟"

ملک رجب علی نے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس نے ارشد کو دیکھا۔ پھر اُس کی نظریں طاہرہ پر چلی گئیں اور وہاں سے دریا میں تیرنے لگیں۔ وہ ارشد اور طاہرہ کے ساتھ آنکھ نہیں ملا سکتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اُس کا کوئی نقصان نہیں ہُوا تھا، اُس نے کوئی قربانی نہیں دی تھی، وہ ہندوؤں اور انگریزوں کے کیمپ کا آدمی تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں اُس نے پاکستان کی آن پر ایک ٹانگ کٹوا کر گناہوں کا کفّارہ ادا کر دیا تھا لیکن جب بھی بات تحریکِ پاکستان کی اور ہجرت کی ہوتی تھی، ملک رجب علی کا سر جھک جاتا تھا۔

وہ رات گئے اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ اُن کے کھانے کا انتظام میجر اصغر کے ایک دوست نے کیا تھا۔ اگلی شام اصغر اور طاہر کی بٹالین کا کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل ارشاد آ گیا۔ وہ جنگِ ستمبر کا ستارۂ جرأت تھا۔ اُس وقت کمپنی کمانڈر ہُوا کرتا تھا۔ اُس کی کمپنی نے اُس کی قیادت میں ٹینکوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اصغر کے باپ نے ۱۹۶۵ء میں اسلام آباد کی پہاڑیوں میں ایک ریڈار کو بھارت کی کمانڈو پارٹی سے بچایا تھا اور اُس کی ایک ٹانگ کٹ گئی تھی۔ کرنل ارشاد بڑی عقیدت سے رجب علی کو ملنے آیا تھا۔ طاہرہ اور شازی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ جب کرنل ارشاد ملک رجب علی کے سامنے آیا تو ٹھٹھک کر رک گیا اور اُس کی نظریں ملک رجب علی کے چہرے

پر جم گئیں۔

"سر! یہ ہیں میرے والد صاحب!" —— اصغر نے ملک رجب علی کی طرف اشارہ کر کے اپنے کمانڈنگ آفیسر سے کہا۔

ملک رجب علی نے ہاتھ کرنل ارشاد کی طرف بڑھایا لیکن کرنل ارشاد جہاں آ کر رکا تھا وہیں کھڑا رہا۔ وہ اس قدر حیرت زدہ تھا کہ اُس نے یہ بھی نہ کیا کہ اخلاقاً رجب علی سے ہاتھ ملا لیتا۔ اُس نے اصغر کی طرف دیکھا۔

"میجر اصغر!" —— کرنل ارشاد نے کہا —— "میں سمجھ نہیں سکا۔ ملک صاحب کا کوئی بیٹا نہیں تھا" —— وہ چُپ ہو گیا۔ اُس نے رجب علی کی طرف دیکھا اور پوچھا —— "کیا آپ وہ رجب علی نہیں جو آزادی سے پہلے پولیس انسپکٹر ہُوا کرتے تھے؟.... میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ آپ وہی رجب علی ہیں۔"

"خدا کے بندے!" —— رجب علی نے شگفتہ سے لہجے میں کہا —— "میں وہی رجب علی ہوں.... آگے ہو کر ہاتھ تو ملاؤ۔ کولہے تک میری ایک ٹانگ مصنوعی ہے۔ میں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔"

کرنل ارشاد جیسے حیرت زدگی سے نکل آیا ہو۔ اُس نے آگے بڑھ کر ملک رجب علی سے ہاتھ ملایا لیکن اس مصافحے میں عقیدت مندی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ملک رجب علی نے کرنل ارشاد کو اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔

"سر!" —— میجر اصغر نے کرنل ارشاد سے کہا —— "میرے والد صاحب کا نام عبدالجلیل خان تھا۔ وہ بھی آزادی سے پہلے مشرقی پنجاب میں پولیس انسپکٹر ہُوا کرتے تھے۔ وہ فوت ہو گئے تو میری امّی نے ملک صاحب کے ساتھ شادی کر لی۔"

"انسپکٹر عبدالجلیل؟" —— کرنل ارشاد نے چونک کر کہا —— "کیا تم اُن کے بیٹے ہو؟ میں اُنہیں بھی جانتا تھا۔ وہ تو صحیح معنوں میں مردِ مومن تھے۔"

"میں کافر تو نہیں کرنل صاحب!" —— ملک رجب علی نے ہنس کر کہا اور پوچھا —— "آپ مجھے کس طرح جانتے ہیں؟"

"آپ کو تو میں ساری عمر نہیں بھول سکتا" —— کرنل ارشاد نے کہا —— "آپ نے میرے باپ کو تھانے میں بلا کر ایسی اذیّتیں دی تھیں جن سے اُن کا دماغی توازن بگڑ گیا اور وہ باقی عمر اسی حالت میں گزار گئے۔ مرتے دم تک وہ گھر کے کسی فرد کو پہچان نہ سکے۔"

"کون تھے وہ؟" —— رجب علی نے پوچھا —— "کیا نام تھا اُن کا؟"

"وہ ایک گمنام انسان تھا" —— کرنل ارشاد نے جواب دیا اور اپنے گاؤں کا نام لے کر کہا —— "دیہات میں اُس کی کوئی ایسی پوزیشن نہیں تھی کہ اُس شخص کو کوئی یاد رکھتا۔ ہماری برادری میں ایک آدمی خاندانی دشمنی کی بنا پر قتل ہو گیا تھا۔ مقتول کا خاندان روپے پیسے اور اثر و رسوخ والا تھا۔ قاتل کو سب جانتے تھے اور اُسے آپ نے گرفتار بھی کر لیا تھا لیکن مقتول کے لواحقین نے آپ کی جھولی صرف اس لیے بھر دی تھی کہ قاتل کے تمام قریبی رشتہ داروں کو تھانے میں بلا کر ذلیل و خوار کیا جاتے۔ ان بے گناہوں اور بدنصیبوں میں میرا باپ بھی تھا۔ آپ نے اُسے سات آٹھ دن تھانے میں رکھا۔

اُس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں یہ چھ سات روز کتنا رویا تھا۔ پھر آپ نے میرے باپ کو چھوڑ دیا لیکن وہ اس حالت میں واپس آیا کہ اُس کا دماغ بیکار ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ تین چار سال زندہ رہا۔"

"مجھے یاد نہیں" ـــ ملک رجب علی نے دبے دبے سے لہجے میں کہا ـــ "میں آپ کو جھٹلاؤں گا بھی نہیں۔ میں نے ایسے ہی کیا ہوگا جیسے آپ نے بتایا ہے.... میری زندگی کا وہ دور ایسا تھا کہ آپ مجھ پر کوئی بے بنیاد الزام تھوپیں گے تو میں اسے بھی تسلیم کر لوں گا۔ اب میں معافی مانگنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔"

"کرنل صاحب!" ـــ ارشد بول پڑا ـــ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ خدا ملک صاحب کو سزا دے تو وہ سزا انہیں مل چکی ہے۔ کولہے تک ان کی ٹانگ کٹ گئی ہے۔ اگر آپ دوسرا پہلو دیکھیں تو حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کو بہت بڑے نقصان سے بچانے کے لیے اپنا آپ قربان کر دیا تھا لیکن خدا نے صرف ایک ٹانگ کے عوض ان کے سارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ میں بھی ملک صاحب کے ماضی سے واقف ہوں لیکن اب میں انہیں اپنا پیر و مرشد مانتا ہوں۔"

"ہاں۔ یہ آپ نے ٹھیک کہا" ـــ کرنل ارشاد نے یک لخت بیدار ہوتے ہوئے کہا ـــ "خدا نے اگر انہیں بخش دیا ہے تو میں کون ہوتا ہوں بد دُعا دینے والا!" ـــ اُس نے لپک کر ملک رجب علی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا ـــ "ملک صاحب! میں معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے ماضی کو سامنے رکھ کر کچھ گستاخی کی ہے۔ میں فوجی ہوں اور بٹالین کمانڈر ہوں۔ میں اس حیثیت میں صرف اُسے دشمن کہتا ہوں جو میرے ملک کا دشمن ہے۔"

فضا میں جو تکدّر پیدا ہو گیا تھا وہ صاف ہو گیا اور اُس قبیح صُورتِ حال کے متعلّق باتیں ہونے لگیں جو مشرقی پاکستان میں پیدا ہو چکی تھی اور روز بروز خراب ہوتی چلی جا رہی تھی۔

"ان حالات میں یہاں اتنی ہی مزید فوج کی ضرورت ہے جتنی پہلے یہاں موجُود ہے" ـــ کرنل ارشاد نے کہا ـــ "پھر ایسٹ پاکستان انڈیا کے حملے سے محفوظ ہو سکتا ہے۔"

"کرنل ارشاد!" ـــ ملک رجب علی نے تجربہ کار جرنیل کے پختہ لہجے میں کہا ـــ "آپ ویسٹ پاکستان کی ساری فوج یہاں لے آئیں، تمام کی تمام ایئر فورس اور نیوی بھی لے آئیں، پھر بھی آپ ایسٹ پاکستان کو نہیں بچا سکیں گے.... میں اپنی افواج کی اہلیّت یا نااہلی کی بات نہیں کر رہا میں اُس سیاست کی بات کر رہا ہوں جو پاکستان میں چل پڑی ہے۔ یہ اقتدار کی سیاست ہے میں پاکستان انٹیلی جنس کا آدمی نہیں لیکن اس محکمے کے ساتھ میرا کچھ تعلق ہے۔ آپ یہ نہ کہا کریں کہ انڈیا حملہ کرے گا۔ انڈیا حملہ کر چکا ہے اور اُسے آدھی کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔ ویسٹ پاکستان میں سیاسی لیڈر اپنی بداعمالیوں کے ہاتھ ننگی کا ناچ ناچ رہے ہیں۔ وہ ایسٹ پاکستان کی علیحدگی پسندی کو ہوا دے رہے ہیں۔"

بہت دیر تک وہ اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ جب کرنل ارشاد جانے کے لیے اُٹھا تو اُس نے ملک رجب علی کے ساتھ نہ صرف جھک کر مصافحہ کیا بلکہ سیدھے ہو کر رجب علی کو سلیوٹ کیا۔

دو روز بعد صبیحہ میجر اصغر کے گھر آ گئی۔ اصغر اور طاہر پرویز اپنی ڈیوٹی پر گئے ہوئے تھے۔ شازی نے اس کا تعارف سلمیٰ، طاہرہ، ملک رجب علی اور ارشد سے کرایا۔ صبیحہ طاہرہ سے اس طرح ملی کہ پہلے اس کے پاؤں چھوئے پھر اُس کے گلے لگ گئی۔ شازی نے سب کو بتایا کہ صبیحہ طاہر کو کہاں ملی تھی۔ صبیحہ نے اپنے ماں باپ کے متعلق بتایا کہ انہوں نے پاکستان کی خاطر کیا کیا قربانیاں دی ہیں۔

طاہر آفیسرز میس میں ایک کمرے میں رہتا تھا۔ اصغر ڈیوٹی سے فارغ ہو کر طاہر کو اپنے ساتھ لے آیا۔ صبیحہ نے ان دونوں سے پہلی بات یہ کہی کہ وہ ان سب کو اپنے گھر بلانا چاہتی ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کو طاہرہ اور شازی کے متعلق سب کچھ بتا چکی تھی۔ اُنہوں نے صبیحہ سے کہا کہ وہ کبھی آئیں تو انہیں گھر بلائیں گے۔

اگلے ہی روز صبیحہ نے اپنے ایک نوکر کے ہاتھ دعوت نامہ بھیج دیا۔ اس کے مطابق وہ سب صبیحہ کے گھر چلے گئے۔ صبیحہ کا باپ اور اُس کی ماں پنجاب کے ان مہمانوں سے یوں والہانہ انداز سے ملے جیسے وہ بڑی لمبی مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ یہ اسلام اور پاکستان کا رشتہ تھا جو بڑا ہی مضبوط تھا۔ وہ بچھڑے ہُوئے بہن بھائیوں کی طرح ملے اور اُس دَور کے قصّے سننے اور سنانے لگے جب قوم ایک نعرے پر متحد ہو گئی تھی ـــ "بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔"

قربانیاں جو مغرب میں دی گئی تھیں وہ مشرق کے مسلمانوں نے بھی دی تھیں۔ انگریز اور ہندو کی طرف سے جو قیامت مغرب کے مسلمانوں پر ٹوٹی تھی وہ مشرق کے مسلمانوں نے بھی جھیلی۔ صبیحہ کی ماں نے جب سنایا کہ اُس نے کالج کی لڑکیوں کے ساتھ حصولِ پاکستان کے لیے کیا کیا کام کیے تھے تو طاہرہ کو یوں لگا جیسے وہ وہی کہانی سن رہی ہو جس کی کردار وہ خود تھی۔ یہ اُس کے اپنے جہاد کی روئیداد تھی۔ صبیحہ کے باپ نے تحریکِ پاکستان میں اپنا رول سنایا تو ارشد کو یہ اپنی کہانی لگی۔

"اور اب کیا ہو گیا ہے؟" ـــ ارشد نے کہا ـــ "بھائی بھائی کا دشمن کیوں ہو گیا ہے؟"

"نہیں ہُوا" ـــ صبیحہ کے باپ نے کہا ـــ "بھائی بھائی کا دشمن نہیں ہُوا۔ ہُوا یہ ہے کہ بھائیوں کے درمیان وہ دشمن آ گیا ہے جو اِن دونوں کا مشترکہ دشمن ہے۔ یہ وہ دشمن ہے جسے دونوں بھائی کچل اور مَسل ڈالنا چاہتے ہیں مگر بھائی مجبور اور بے بس ہیں۔"

"انگریزوں کے دَور میں ہماری مجبوری اور بے بسی انتہا پر تھی" ـــ ملک رجب علی نے کہا ـــ "لیکن ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہُوتے تھے۔"

"اُس وقت ہماری لیڈر شپ مخلص تھی" ـــ صبیحہ کے باپ نے کہا ـــ "ہمارے لیڈر صرف لیڈر تھے اور اُن کا نصب العین تھا حصولِ پاکستان۔ پاکستان مل گیا تو لیڈر حکمران بن گئے۔ انہوں نے اپنے اوپر حکومت کا نشہ طاری کر لیا۔ اقتدار کو انہوں نے اپنا نصب العین بلکہ اپنا ایمان بنا لیا ہے۔ جب لیڈر حکمران بن جاتے ہیں تو قوم قوم نہیں رہتی، محکوم یعنی رعایا بن جاتی ہے۔ پاکستان میں اقتدار پرستی کی جنگ ایسی شروع ہوئی کہ قوم پس کے رہ گئی۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ قوم کی کوئی آواز نہیں رہی۔ قوم کا جذبہ وہی ہے جو ہُوا کرتا تھا مگر لیڈر شپ کی ضرورت کچھ اور ہے۔ یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے لیڈر قومی وقار کو بھی داؤ پر لگانے سے دریغ نہیں کرتے۔ حصولِ اقتدار کے

اس جوتے میں ہمارے لیڈروں نے دشمن کے ساتھ بھی درپردہ سازباز کرلی ہے۔ ہم نے انگریزوں کی بادشاہی سے ٹکرلے لی تھی اور مجاہد کہلاتے تھے لیکن اپنی حکومت سے ٹکر لو تو باغی اور غدار کہا جاتا ہے۔"

"آخر انجام کیا ہوگا؟"۔۔۔ طاہرہ نے پوچھا۔

"انجام اچھا نظر نہیں آتا"۔۔۔ صبیحہ کے باپ نے کہا۔۔۔ "اگر یہاں کے عوام کی بات کی جائے تو ان لوگوں کے دلوں میں پاکستان کی وہی محبت ہے جو پہلے روز تھی لیکن جن عوام کو طاقت کا سرچشمہ کہا جاتا ہے، انہیں لیڈروں نے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ بنا ڈالا ہے۔ لیڈر اب قیادت نہیں کر رہے، وہ قوم کو ہانک رہے ہیں۔"

جب یہ لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو بھی ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ اس گھر کے اندر پتہ چلتا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان ایک پاکستان ہیں مگر اس چار دیواری کے باہر تخریب کاری اور علیحدگی پسندی کے بھیڑیے قومی اتحاد پر غرّار ہے تھے۔

جب بنگالیوں کے یہ پنجابی مہمان اس گھر سے رخصت ہوئے تو صبیحہ کے دونوں بھائی باہر کھڑے تھے۔ اُن کے باپ نے مہمانوں سے اتنا بھی نہ کہا کہ یہ میرے بیٹے ہیں۔ وہ ان بیٹوں پر فخر نہیں کرسکتا تھا۔ وہ دونوں ان پنجابی مہمانوں کو قہر اور غضب سے گھورتے ہوئے پرے چلے گئے۔

***

ان کے چلے جانے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد صبیحہ اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اُس کا بڑا بھائی کمرے میں داخل ہوا اور اُس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"میری بات دھیان سے سنو صبیحہ!"۔۔۔ بھائی نے تحمّل اور بُردباری سے کہا۔۔۔ "تم میری بہن ہو۔ بھائی اپنی بہن کا دشمن نہیں ہوسکتا..... میری اتنی سی بات مان لو کہ اور جس کسی کے ساتھ چاہتی ہو گھومو پھرو، ان پنجابیوں سے تعلق توڑ لو۔ میں تمہیں کوئی دھمکی نہیں دے رہا۔"

"میں پاکستان کے ساتھ تعلق نہیں توڑ سکتی"۔۔۔ صبیحہ نے کہا۔

"خدا کے لیے صبیحہ!"۔۔۔ بھائی نے کہا۔۔۔ "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیسا پاکستان، کس کا پاکستان! ہم دونوں نے انگریزوں کی غلامی نہیں دیکھی لیکن اُس وقت کے لوگ بتاتے ہیں کہ انگریزوں کی حکومت اس حکومت سے اچھی تھی جو پنجابی اور پٹھان ہم پر کر رہے ہیں۔ کوئی بنگالی ان کی غلامی نہیں کرنا چاہتا۔ ہم اسلام سے غدّاری نہیں کر رہے۔ اسلام رہ ہی کہاں گیا ہے۔ ہم مولویوں کے اسلام کو قبول نہیں کرتے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ کتنے مسلمان گھرانوں نے اپنی بیٹیوں کو ناچ گانے کی تربیت دینے کے لیے ہندو استاد رکھے ہوئے ہیں۔"

"یہ بات میرے ڈیڈی سے کہلوا دو تو میں مان لوں گی"۔۔۔ صبیحہ نے کہا۔۔۔ "تم ڈیڈی سے بات کیوں نہیں کرتے؟..... اس لیے نہیں کرتے کہ وہاں سے تمہیں جوتے پڑیں گے۔ تم نے اُس روز مجھے دھمکی دی تھی کہ یہ لیفٹیننٹ تمہارا پہلا شکار ہوگا۔ اگر تم نے اُس کی طرف نظر اُٹھا کر بھی دیکھا تو تم میرا پہلا شکار ہوگے۔"

"تم ان غنڈے بدمعاشوں کے سر پر بات کر رہی ہو جنہیں ڈیڈی پال رہے ہیں"۔۔۔ بھائی نے کہا

۔۔۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے اُس نے کہا۔۔۔ "ڈیڈی کا دماغ بڑھاپے نے خراب کر دیا ہے"۔۔۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔

صبیحہ نے کوئی اثر نہ لیا۔ اُس نے اپنے بڑے بھائی کو کمرے سے جاتے ہوئے بھی نہ دیکھا۔ صبیحہ کے لیے مسئلہ یہ پیدا ہوگیا تھا کہ کالج غیر معینہ مدت کے لیے بند ہوچکے تھے کیونکہ الیکشن ہو رہے تھے اور الیکشن ختم ہوتے ہی بڑے شہروں میں ہنگامے شروع ہوگئے تھے۔ ہنگامے اس نوعیت کے تھے کہ کالجوں میں غیر بنگالی طلبا۔ کو بنگالی طلبا مار پیٹ کر نکال دیتے تھے لیکن بنگالی طلبا میں محبِ وطن پاکستانی بھی تھے۔ وہ علیحدگی پسند طلبا پر جوابی حملے کرتے تھے۔ پھر فوج یا پولیس آجاتی تھی اور کالج میدانِ جنگ کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ بے شمار طلبا زخمی ہوجاتے اور دو چار مارے بھی جاتے تھے۔ فوجی حکومت نے تمام تعلیمی ادارے بند کر دیئے۔

ملکی انتخاب کا فیصلہ ہوچکا تھا۔ مشرقی پاکستان میں اس لیڈر کی جماعت جیت چکی تھی جو مشرقی پاکستان کو بھارت کی مدد سے بنگلہ دیش بنانا چاہتا تھا۔ اس جیت کے لیے تشدّد کا سہارا بھی لیا گیا اور انتہائی دل کش اور جھوٹے وعدوں کا بھی۔ بھارت کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی غیر بنگالیوں کو مشرقی پاکستان سے نکالنے کی مہم شروع ہوگئی جو غارت گری کی صورت اختیار کر گئی اور روز بروز بڑھتی گئی۔ محبِ وطن بنگالی ابھی تک "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے اور چیخ چیخ کر پوچھ رہے تھے۔۔۔ "ہماری فوج کہاں ہے؟..... اسلام آباد والے خاموش کیوں ہیں؟"

فوج اقتدار پسند لیڈروں کی تلوار بن گئی تھی جسے اُنہوں نے نیام سے باہر نہ آنے دیا۔ فوجی بارکوں میں بیٹھے دانت پیس رہے تھے لیکن انہیں بارکوں سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسلام آباد کے ایوان سیاسی بازی گری کے اکھاڑے بنے ہوئے تھے۔ قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا رہی تھی۔ مغربی پاکستانیوں کے منہ میں ایک نیا نعرہ دے دیا گیا CRUSH INDIA یہ ایک جوشیلا اور بالکل کھوکھلا نعرہ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ بھارت مشرقی پاکستان کو کرش کرنے کے انتظامات مکمل کرچکا تھا۔ اُس کی ...رہ ڈویژن فوج نے مشرقی پاکستان کو محاصرے میں لے لیا تھا۔ غیر بنگالی بنگالیوں کے ہاتھوں قتل ہو رہے تھے یا وہاں سے بھاگ کر مغربی پاکستان آرہے تھے۔

ان حالات میں صبیحہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی تھی۔ اُس کے بھائی نے آکر اُسے بڑے حسین تصور سے بیدار کر دیا تھا۔ وہ چلا گیا تو صبیحہ واپس اپنے تصوّر میں چلی گئی۔ وہ طاہر پرویز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ نوجوان لیفٹیننٹ اُس کی روح میں سما گیا تھا۔ صبیحہ اس تصوّر میں دُور ہی دُور اُڑتی چلی گئی۔

***

دس پندرہ دن بعد مشرقی پاکستان کے شہروں کے گلی کوچوں میں خون بہنے لگا۔ غیر بنگالیوں کا قتلِ عام بڑھتا جا رہا تھا۔ دیہات میں بنگالی ایک اور ہی قسم کے تشدّد کا نشانہ بن رہے تھے۔ یہ انڈین آرمی کے کمانڈو تھے جو بنگالی مسلمانوں کے بہروپ میں مشرقی پاکستان میں داخل کئے گئے تھے۔ یہ ٹولیوں میں بٹے ہوتے تھے اور دیہاتی علاقے میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ وہ ان غریب دیہاتیوں کے گھروں میں جا کر کھانے پینے کی چیزیں اٹھا لاتے تھے اور کسی کی جوان لڑکی نظر آجائے تو اسے بھی

خراب کرتے تھے۔ سارا ملک لاقانونیت کی گرفت میں آیا ہُوا تھا۔

ایک روز میجر اصغر کا کمانڈنگ آفیسر کرنل ارشاد اس کے گھر آیا۔ وہ خاصا پریشان نظر آرہا تھا۔

"آپ لوگ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جائیں" — کرنل ارشاد نے رجب علی وغیرہ سے کہا — "مسز اصغر کو بھی ساتھ ہی لے جائیں۔ یہاں کے فوجی افسر جن کی بیویاں ان کے ساتھ ہیں، بیوی بچوں کو مغربی پاکستان بھیج رہے ہیں۔ حالات بڑی تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔ ہوائی جہازوں میں سیٹ نہیں مل رہی۔ میں آپ کو سیٹیں دلا دوں گا۔ یہاں سے ڈھاکہ فون کر دوں گا۔ ہمیں اللہ کے سپرد کریں" — اُس نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ شہروں میں کیا ہو رہا ہے۔

تیسرے روز یہ سب لوگ ڈھاکہ ائرپورٹ پر پہنچ گئے جہاں کرنل ارشاد کی کوشش سے اُن کی سیٹیں بُک ہو چکی تھیں۔

"طاہری!" — طاہرہ نے طاہر پرویز کو الگ کر کے کہا — "معلوم نہیں حالات کیا ہوں گے۔ خدا سب کو سلامت رکھے۔ تمہارے تایا یوسف اور عصمت کی ماں بیتابی سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں، یہ تو تم جانتے ہو کہ عصمت تمہیں کتنا چاہتی ہے .... مجھے ایک بات بتاؤ۔ تمہاری روح صبیحہ میں تو نہیں اٹک گئی؟ لڑکی یہ بھی مجھے بہت اچھی لگی ہے لیکن عصمت تمہارا اپنا خون ہے۔ اگر تمہارا خیال صبیحہ کی طرف ہے تو مجھے بتا دو لیکن میں تمہیں بتا دیتی ہوں کہ تمہارے ابو اور تمہارے دادا جان مانیں گے نہیں۔ عصمت تمہارے کھاتے میں لکھ دی گئی ہے۔ بڑی پیاری لڑکی ہے"۔

طاہر ہنس پڑا اور بولا — "میں نے تو ابھی وہاں تک سوچا ہی نہیں جہاں آپ پہنچ گئی ہیں۔ فوجی قانون کی پابندی بھی ایسی ہے کہ میں ابھی کچھ عرصہ شادی کر بھی نہیں سکتا۔ میں نے ابھی صبیحہ اور عصمت کو شادی کے خیال سے پرکھا ہی نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بزرگوں کا حکم مانوں گا"۔

جب طیارہ مشرقی پاکستان کی زمین سے اٹھا تو طاہرہ نے نیچے دیکھا۔ ڈھاکہ شہر چھوٹا ہی چھوٹا ہوتا چلا جا رہا تھا اور ندی نالے ٹیڑھی میڑھی لکیریں بنتے جا رہے تھے۔ طاہرہ مشرقی پاکستان کی یہ سرگوشی نہ سن سکی — "اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں!"

⁂

طاہر پرویز نوجوان تھا۔ اُس کے جذبات نوجوان تھے۔ اُس کے خوابوں کا رنگ رُوپ نکھر آیا تھا۔ صبیحہ نے اُس کے خوابوں کو ایک اور دلکش رنگ دے دیا تھا۔ ایک روز وہ کسی کو بتائے بغیر اکیلا ہی صبیحہ کے گھر چلا گیا۔ اُس کے ماں باپ نے بڑے پیار سے اُس کی آؤ بھگت کی۔ دو تین روز بعد صبیحہ طاہر سے ملنے آگئی۔

"طاہر!" — صبیحہ نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا — "تمہارا جی نہیں چاہتا کہ گھر اور بارکوں کی دُنیا سے دور کہیں جنگل میں جا بیٹھیں؟"

"کیوں نہیں چاہتا!" — طاہر نے کہا — "جہاں کہو گی وہاں آجاؤں گا۔ اگلے اتوار آجانا۔ کسی اچھی سی جگہ چلے چلیں گے"۔

صبیحہ نے اُسے ایک جگہ بتائی جو کیمپ سے ڈیڑھ دو میل دُور تھی۔ اُس نے طاہر سے کہا کہ

اگلے اتوار دس بجے وہاں پہنچ جاتے، وہ آجاتے گی۔

اگلا اتوار دُور نہیں تھا۔ دس گیارہ بجے کے درمیان طاہر اور صبیحہ کیمپ سے ڈیڑھ میل دُور ایک خوشنما جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہرے بھرے درخت تھے۔ جھاڑی نما پودے تھے۔ پیچھے گھاس سے ڈھکی ہوئی ایک ٹیکری تھی۔ سامنے چھوٹی سی ایک ندی بہہ رہی تھی۔ معصوم اور حسین سی وہ ...یاست کے آسیب سے پاک تھی۔ صبیحہ نے طاہر سے پہلی بات یہ کہی تھی — "خدا کے لیے کوئی ایسی بات نہ کرنا۔ سوچ سوچ کر اور بھیانک خبریں سُن سُن کر میرا دماغ ماؤف ہُوا جا رہا ہے"۔

طاہر پر صبیحہ کی محبت کا خمار طاری تھا۔ وہ بھی صبیحہ سے یہی بات کہنا چاہتا تھا۔ اُن کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں اُلجھ گئے اور وہ تصوّر حقیقت کے روپ میں آگئے جو صبیحہ تنہائی میں ...الی اور سنوارتی رہتی تھی۔

معلوم نہیں کتنی دیر گذر گئی تھی کہ ایک بوڑھے بنگالی نے اُنہیں تصوّروں سے بیدار کر دیا۔ اُسے دیکھ کر طاہر کو غصّہ آگیا۔ وہ کہنے ہی لگا تھا کہ جاؤ بابا، کسی آبادی میں جا کر بھیک مانگو لیکن بوڑھا اُس کے ...لنے سے پہلے ہی بول پڑا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ طاہر کے پلّے نہیں پڑ سکتا تھا کیونکہ وہ بنگالی زبان ...ل رہا تھا۔ وہ جوں جوں بولتا جا رہا تھا، صبیحہ کے چہرے کا رنگ اُڑتا جا رہا تھا۔

"میرا بھائی میرے پیچھے آیا ہے" — صبیحہ نے بوڑھے کے خاموش ہو جانے کے بعد طاہر کو بتایا — "یہ بوڑھا کہتا ہے کہ یہ ہماری تنہائی میں مُخل نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن اس نے تم جیسے تین بنگالی نوجوانوں کو دیکھا ہے جو یہاں سے تھوڑی دُور بیٹھے ہوتے تھے۔ بوڑھا جب ان کے قریب سے گذرا تو ان میں سے ایک کہہ رہا تھا کہ اُس کا قصور صرف یہ نہیں کہ وہ میری بہن کو ساتھ لئے لئے پھرتا ہے ...اُس کا اصل جرم یہ ہے کہ وہ پنجابی ہے اور فوجی ہے۔ اس بوڑھے نے وہاں رُک کر تو کچھ نہیں سُنا، ...ھا چلا آیا اور آگے اس نے ہمیں بیٹھے دیکھا۔ اس نے مجھے کہا ہے کہ پنجابی کے نام سے اس کے ...ان کھڑے ہوتے۔ اسے معلوم ہے کہ شہروں میں غیر بنگالیوں کو قتل کیا جا رہا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ہندو ...جی جو یہاں کے کسانوں کے لباس میں رہتے ہیں دو مرتبہ ان کے گھروں سے چاول وغیرہ اٹھا کر لے ...گئے ہیں۔ دوسری بار وہ اس کے گاؤں کی ایک جوان لڑکی کو بھی ساتھ لے گئے اور اُسے صبح چھوڑا تھا۔ ...یہ کہتا ہے کہ یہ پاکستان کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم دونوں اس کے گاؤں میں پہنچ جائیں ورنہ ہم دونوں اُن تین آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔ گاؤں سے یہ بوڑھا اپنے ...کچھ آدمی ہمارے ساتھ کر دے گا۔ یہ کہتا ہے کہ جلدی اُٹھو" — صبیحہ نے یہ بات بڑی تیزی سے سنائی اور طاہر سے کہا — "اُٹھو طاہر! ہم اس کے گاؤں چلے چلتے ہیں۔ اگر ہم واپس چل پڑے تو وہ ہمیں نہیں چھوڑیں گے"۔

بوڑھے کا گاؤں جو بانسوں اور مٹی کے آٹھ دس جھونپڑے تھے، ٹیکری کے پیچھے دو اڑھائی سو گز دُور تھا۔ طاہر اور صبیحہ اُٹھے اور بوڑھے کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ٹیکری سے گھوم کر وہ پیچھے چلے گئے۔ تھوڑی ہی دُور جھونپڑے نظر آرہے تھے بوڑھا بار بار بائیں طرف دیکھتا تھا اور بنگالی زبان میں صبیحہ سے کچھ کہتا بھی جا رہا تھا۔

جھونپڑوں کے اس چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ کر بوڑھا انہیں اپنے جھونپڑے میں لے گیا اور خود کہیں چلا گیا۔

"صبیحہ!" — طاہر نے کہا — "یہ بوڑھا ہمیں پھندے میں ہی تو نہیں لے آیا۔ یہ بھی تو بنگالی ہے"

"ہمیں یہ خطرہ مول لینا ہی تھا" صبیحہ نے کہا — "کسی پر بھروسہ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن مجھے اس بوڑھے پر اعتماد ہے۔ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں باتیں کی ہیں۔ اللہ مالک ہے"۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں خالی ہاتھ آیا ہوں" — طاہر نے کہا — "پھر بھی تمہارے بھائی جیسے چار آدمیوں کو اکیلا سنبھال سکتا ہوں"۔

❀

جھونپڑے میں پانچ چھ عورتیں جن میں ایک دو جوان لڑکیاں بھی تھیں، داخل ہوئیں اور چپ چاپ صبیحہ اور طاہر کو دیکھنے لگیں۔ ان میں سے ایک عورت نے صبیحہ سے کچھ کہا۔

"یہ کہتی ہے ڈرو نہیں" — صبیحہ نے طاہر کو بتایا — "کہتی ہے کہ ان کے آدمی آ رہے ہیں۔ وہ ہمیں اپنی حفاظت میں واپس لے جائیں گے ..... یہ ہے اصل بنگال جو مشرقی پاکستان کہلاتا ہے۔ یہ بھولے بھالے لوگ سیاسی لیڈروں کے جھانسے میں آنے والے نہیں"۔

بوڑھا دروازے میں نمودار ہوا۔ عورتیں الگ ہٹ گئیں۔ بوڑھے نے سر کے اشارے سے طاہر اور صبیحہ کو باہر بلایا۔ باہر چھ بنگالی کھڑے تھے۔ دو کے ہاتھوں میں لمبے دھا تھے اور چار کے ہاتھوں میں بانس کی بنی ہوئی برچھیاں تھیں۔ بوڑھے نے صبیحہ سے کہا کہ ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ صبیحہ اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے رُکی تو بوڑھے نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور طاہر پرویز کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا — "رکو مت۔ جلدی نکل جاؤ"۔

تین آدمی آگے اور تین پیچھے ہو گئے اور وہ چل پڑے۔ طاہر اور صبیحہ اُن کے درمیان تھے۔ وہ جھونپڑے سے نکلے ہی تھے کہ صبیحہ کا بھائی دو آدمیوں کو ساتھ لیے آن دھمکا۔ اس نے بنگالیوں کو للکارا۔ بنگالی رُک گئے۔ صبیحہ کے بھائی کے ہاتھ میں سٹین گن تھی جس میں میگزین لگی ہوئی تھی۔ اُس کے دونوں ساتھیوں کے پاس لمبے خنجر تھے۔ صبیحہ کا بھائی جو کچھ بنگالیوں سے کہہ رہا تھا وہ صبیحہ اُردو میں طاہر کو بتاتی جا رہی تھی۔

"یہ پنجابی فوجی تمہارا دشمن ہے جسے تم پناہ میں لے رہے ہو" صبیحہ کے بھائی نے ان چھ بنگالیوں سے کہا جنہوں نے طاہر اور صبیحہ کو اپنے نرغے میں لے رکھا تھا — "اپنی حالت دیکھو۔ تمہارے پاس نہ کچھ کھانے کو ہے نہ پہننے کو۔ ہمارے ملک کی دولت یہ لوگ مغربی پاکستان لے گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔ یہ لڑکی میری بہن ہے جسے یہ پنجابی ساتھ لیے لیے پھرتا ہے"۔

صبیحہ نے اپنے بھائی کو کوسنا شروع کر دیا۔ بوڑھے بنگالی نے بھی صبیحہ کے بھائی کو غصے میں کچھ کہا۔

"ہم زیادہ باتیں سننے اور کہنے نہیں آتے" — صبیحہ کے بھائی نے بوڑھے سے کہا — "ان دونوں کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ میرے ہاتھ میں سٹین گن دیکھ لو۔ ہم پورے گاؤں کو ختم کر جائیں گے۔ ہمیں کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔ اب ہماری حکومت ہے" — وہ سٹین گن کی نالی محافظوں کی طرف کر کے

آگے بڑھا اور بولا — "ان دونوں کو فوراً میرے حوالے کر دو۔ ان کی خاطر موت کو آوازیں نہ دو"۔

طاہر پرویز اس وقت تک خاموش تھا۔ وہ فوجی تھا۔ وہ اتنی جلدی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ صبیحہ کے بھائی کی طرف بڑھا۔ وہ کہہ رہا تھا — "اتنے سارے بے گناہ لوگوں کو مت مارو۔ میں اکیلا اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ مجھے گولی مار دو"۔

صبیحہ اُس کی طرف دوڑی اور اُس کا بازو پکڑ کر چلّانے لگی — "آگے مت جانا طاہر! یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے"۔

"مجھے چھوڑ دو صبیحہ!" — طاہر نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا — "میں ان معصوم لوگوں کی خاطر اپنی جان خوشی سے دے دوں گا"۔

صبیحہ نے اس کا بازو نہ چھوڑا اور اُس کے ساتھ ہی آ گئی۔ طاہر اُس کے بھائی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ وہ اپنی جان دینے کی باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ صبیحہ سے اپنا بازو چھڑا رہا تھا جو وہ نہیں چھوڑ رہی تھی۔ صبیحہ کے بھائی نے سٹین گن کو لہے کے ساتھ لگا کر آگے کر رکھی تھی۔ طاہر نے اچانک اپنا بایاں ہاتھ اُس کی سٹین گن پر اوپر سے بڑی زور سے مارا اور اس کے ساتھ ہی دایاں گھونسہ اُس کی دونوں آنکھوں کے درمیان مارا۔ سٹین گن اُس کے ہاتھ سے گر پڑی اور سٹین گن والا تین چار قدم پیچھے پیٹھ کے بل گرا۔ طاہر نے جھپٹ کر سٹین گن اٹھا لی۔ صبیحہ کے بھائی کے دو ساتھی خنجر اٹھائے ہوئے قریب ہی کھڑے تھے۔ طاہر نے سٹین گن کو بٹ سے پکڑ کر ڈنڈے کی طرح گھمایا اور گن اُس کے ایک ساتھی کے سر پر ماری۔ وہ جوان سال آدمی تیورا کر گرا۔ ان کا تیسرا ساتھی اتنی تیز دوڑا جتنا تیز وہ کبھی بھی نہ دوڑ سکا ہو گا۔ صبیحہ کا بھائی آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا۔

"اُٹھو" — طاہر نے گن کی نالی اُس کی طرف کرتے ہوئے کہا — "بے غیرت مسلمان! سچ بتاؤ۔ تمہارے یہ دونوں ساتھی ہندو ہیں یا مسلمان؟"

"دونوں ہندو ہیں" — اُس نے اُٹھتے اُٹھتے شکست خوردہ آواز میں جواب دیا۔

"میں تمہیں گولی مار دوں تو مجھے کوئی نہیں پکڑے گا" — طاہر نے کہا — "قوم کے غدّار کو گولی مارنا ثواب کا کام ہے لیکن میں تمہیں زندہ رہنے دوں گا۔ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ ..... ایک بات دماغ میں رکھ لو۔ اگر تم نے صبیحہ کے ساتھ ذرا سی بھی بدتمیزی کی تو میں تمہیں کہیں نہ کہیں جان سے مار ڈالوں گا"۔

اُس کے جس ہندو ساتھی کے سر میں سٹین گن لگی تھی، وہ بے ہوش پڑا تھا۔ اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

"یہ کافر ہے" — طاہر نے گاؤں والوں سے کہا — "اسے ہاتھ نہ لگانا۔ یہ مر جائے تو اس کی لاش گھسیٹ کر ندی میں پھینک دینا" — اُس نے صبیحہ سے کہا — "چلو چلیں"

وہ چلنے لگے تو بوڑھے نے انہیں روک لیا۔ صبیحہ سے کہنے لگا کہ وہ اپنے آدمیوں کو ساتھ بھیجے گا کیونکہ ان لوگوں کا کچھ بھروسہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھی کہیں راستے میں مل جائیں۔ طاہر پرویز نہیں مان رہا تھا لیکن نہ صرف بوڑھا بلکہ وہ سب آدمی ان کے ساتھ جانے کو کہہ رہے تھے۔ صبیحہ کا بھائی وہاں سے غائب ہو گیا۔

جب وہ کیمپ کے قریب پہنچے تو طاہر نے سٹین گن اُن چھ آدمیوں میں سے ایک کے حوالے کر کے کہا کہ یہ اپنے پاس رکھو، کسی وقت کام آئے گی۔ اُس نے جسے سٹین گن دی تھی، اسے یہ بھی کہا کہ وہ یہیں سے واپس چلا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آبادی کے قریب جا کر کوئی پولیس والا اُسے پکڑ لے۔

طاہر پرویز کو بغیر اطلاع اور کسی معقول وجہ کے بغیر کیمپ سے اتنی دور جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن اُس نے یہ خطرہ بھی مول لے لیا کہ کیمپ کے دُور دُور سے گذر کر قصبے تک چلا گیا اور صبیحہ کو قصبے میں داخل کر کے واپس آیا۔ اُس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے بنگالیوں سے ہاتھ ملائے اور انہیں رخصت کر دیا۔ واپس آ کر اُس نے اصغر کو بھی نہ بتایا کہ آج کیا ہوا تھا۔

❀

طاہر سمجھتا تھا کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے لیکن اگلے ہی روز میس کے ایک بنگالی ملازم نے ایک خبر سُنا کر اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔

"یہاں کے غریبوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے صاحب!" — اس بنگالی نے بتایا — "یہاں سے تھوڑی دور آٹھ دس جھونپڑوں کا ایک گاؤں ہے۔ رات کو مکتی باہنی والے اُن تمام جھونپڑوں کو آگ لگا گئے ہیں۔"

"یہ گاؤں کس طرف ہے؟" — طاہر نے اس بنگالی سے پوچھا۔

بنگالی ملازم نے سمت بتائی اور گاؤں کا محل وقوع بھی بتایا۔ طاہر نے سوچا کہ یہ بلا شبہ وہی گاؤں ہے۔

"اُنہوں نے آگ کیوں لگائی ہے؟" — طاہر نے پوچھا۔

"وہاں کے رہنے والے بڑی مشکل سے جانیں بچا کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے ہیں" — بنگالی نے جواب دیا — "ان میں سے دو تین آدمی مجھے آج صبح ملے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ایک پنجابی کو مکتی باہنی کے تین آدمیوں سے بچانے کے لیے پناہ دی تھی اور اُس پنجابی نے ان کے ایک ہندو ساتھی کو مار ڈالا تھا۔"

طاہر پریشان ہو گیا۔ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر وہ کسی کو بتائے بغیر کیمپ سے نکل گیا اور یہ سوچے بغیر کہ وہ خطرے میں گھر سکتا ہے، اُس گاؤں تک چلا گیا۔ یہ وہی گاؤں تھا۔ طاہر پرویز دُور ہی رُک گیا۔ دو تین مٹی کی دیواریں کھڑی تھیں باقی سب راکھ تھی جس میں سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ طاہر پرویز کے خون نے جوش مارا لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ طاہر پرویز نے ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔ فضا اور ماحول پر موت کی خاموشی طاری تھی۔ طاہر پرویز کے دل سے ویسا ہی دھواں اُٹھنے لگا جیسا جلے ہوئے جھونپڑوں کی راکھ سے اُٹھ رہا تھا۔ چند ایک جھونپڑوں کا یہ گاؤں جس کا شاید کوئی نام ہی نہیں تھا، طاہر پرویز کے لیے پورا پاکستان بن گیا۔

"نہیں..... نہیں" — اُس کے دل میں جیسے کسی نے خنجر اُتار دیا ہو۔ اُسے اپنا واویلا سنائی دیا — "ایسا نہیں ہو سکتا..... پاکستان ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

"لیکن..... پاکستان کا قانون کہاں ہے؟" — اُسے خیال آیا — "پولیس کہاں ہے؟ کیا اِن جھونپڑوں میں رہنے والے پولیس سٹیشن نہیں گئے ہوں گے؟..... پولیس ابھی تک آئی کیوں نہیں؟ کیا ان غریبوں کے لیے قانون اور انصاف کے دروازے بند ہو گئے ہیں؟"

طاہر پرویز نوجوان تھا۔ اُس پر جذبات کا غلبہ تھا۔ وہ اکیلا کھڑا دانت پیس رہا تھا۔ وہ گاؤں کو آگ لگانے والوں کو فوراً پھانسی کے تختے پر کھڑا کرنے کو بیتاب ہو رہا تھا۔ اُسے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ اُس کے پیچھے ایک بنگالی کھڑا تھا۔ اُس کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ وہ دیہاتی نہیں لگتا تھا۔ اُس نے صاف ستھرا کرتہ اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اُس نے کندھوں پر بنگال کی بنی ہوئی موٹی چادر ڈال رکھی تھی۔ اُس کی آنکھوں پر اچھی قسم کا چشمہ تھا۔

"تم وردی میں نہیں ہو بیٹا!" — بنگالی نے طاہر پرویز سے کہا — "پھر بھی یقین سے کہتا ہوں کہ تم فوجی ہو اور اگر پٹھان نہیں ہو تو پنجابی ضرور ہو..... میرا نام عابد الحق ہے۔ سکول ٹیچر ہوں۔"

"میں سیکنڈ لیفٹیننٹ ہوں" — طاہر پرویز نے کہا — "طاہر پرویز۔"

"تمہیں ادھر نہیں آنا چاہیئے تھا" — عابد الحق نے کہا — "ڈیوٹی پر آئے ہو یا ویسے ہی اِدھر.....!"

"نہیں ماسٹر صاحب!" — طاہر پرویز نے کہا — "کسی نے بتایا تھا کہ ان جھونپڑوں کو کسی نے آگ لگا دی ہے۔ میں دیکھنے آیا تھا..... کیا پولیس کو اطلاع مل گئی ہو گی؟"

"کس کی پولیس؟" — ماسٹر عابد نے جواب دیا — "مشرقی پاکستان میں جو پولیس ہے وہ پاکستان کی پولیس نہیں۔ وہ پولیس اب اُن کی ہے جنہوں نے ان جھونپڑوں کو آگ لگائی ہے۔ تم فوجی افسر ہو بیٹا! تمھیں معلوم ہو گا کہ وہ کون ہیں۔"

"وہ ہندو ہیں" — طاہر پرویز نے کہا — "یہاں کے مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ آپ بنگالی ہیں۔ آپ کو میری بات اچھی نہیں لگے گی۔ بنگالی مسلمانوں میں غیرت نہیں رہی۔ وہ اپنے ملک کے دشمن کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو تباہ کر رہے ہیں۔"

"مجھے تمہاری بات بُری نہیں لگی لفٹیننٹ طاہر!" — ماسٹر عابد نے کہا — "اتنا ضرور کہوں گا

کہ تم نو عمر ہو۔ تم ابھی بات کی تہ تک پہنچنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ میں بنگالی مسلمان ہُوں۔ مجھ میں اتنی ہی غیرت ہے جتنی تم میں ہے اور جتنی ایک محبّ وطن اور سچّے پاکستانی میں ہونی چاہیئے لیکن میں ہندو پر کوئی الزام عائد نہیں کروں گا.... چلو، آؤ۔ اگر تم کسی ڈیوٹی پر نہیں ہو تو میرے ساتھ چل پڑو۔ تمھارا یہاں رُکے رہنا ٹھیک نہیں۔ اکیلے اتنی دور نہ آیا کرو۔ کہیں سے ایک گولی آئے گی اور تمھارے جسم سے پار ہو جائے گی۔"

★

وہ چل پڑے۔

"میں بھی تمھاری طرح جلے ہوئے جھونپڑے دیکھنے آیا تھا" ــــ ماسٹر عابد الحق کہہ رہا تھا ــــ "یہ چند ایک جھونپڑے نہیں جلے، یوں سمجھو پاکستان جل گیا ہے.... پاکستان جل رہا ہے بیٹا! معلوم ہوتا ہے تمھیں اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ یہ ہندو کی کارستانی ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ سارا الزام ہندو کو مت دو۔ سچ پوچھو تو میں ہندو کی تعریف کروں گا کہ وہ اپنے دشمن کو ختم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور موقعوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ تم بہت چھوٹے ہو بیٹا! تم آزادی کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۴۸ء کے شروع میں قائدِ اعظم یہاں آئے تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں انہوں نے طلباء سے خطاب کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ تمھارا دشمن تمھارے درمیان موجود ہے اور دوستی کے پردے میں تمھارے ملک کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ قائدِ اعظم نے تفصیل سے کہا تھا کہ اپنے دشمن کے پروپیگنڈے سے بچو اور اُس کی زیرِ زمین تخریب کاری کو روکو۔"

"میں ابھی پیدا نہیں ہُوا تھا" ــــ طاہر پرویز نے کہا ــــ "لیکن قائدِ اعظم کی یہ تقریر مجھے یاد ہے۔ میرے والد صاحب اور والدہ نے مجھے زبانی یاد کرا دیا تھا کہ ہم نے پاکستان کس طرح حاصل کیا اور اس کی کیا قیمت دی تھی۔ قائدِ اعظم نے گورنر جنرل کی حیثیت سے جگہ جگہ جو تقریریں کی تھیں، وہ میں نے اتنی بار پڑھی ہیں کہ زبانی یاد ہو گئی ہیں۔ میری والدہ نے میری سوچوں اور میرے خیالوں کو انہی تقریروں کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔"

"لیکن انہوں نے قائدِ اعظم کے الفاظ کو یاد نہ رکھا جن کے ہاتھوں میں قائدِ اعظم کے بعد پاکستان کی باگ ڈور آئی" ــــ ماسٹر عابد نے کہا ــــ "انہوں نے پاکستان کو اپنے باپ دادا کی جاگیر سمجھا اور اسے اپنی ملکیت سمجھنے لگے، پھر اس ملکیت پر آپس میں لڑنے لگے.... ایسا ہی ایک لیڈر ہندوؤں کا بھی تھا جو بھارت کا پہلا وزیرِ اعظم تھا۔ پنڈت نہرو۔ اُس نے آزادی ملتے ہی کہہ دیا تھا کہ جلدی یا دیر سے، ہم پاکستان کو ختم کر دیں گے۔ اُس نے اپنی قوم کے ذہن میں یہ نقش کر دیا تھا کہ ملک کی تقسیم غیر قدرتی ہے اور پاکستان بھارت کا حصّہ ہے۔ ہندو لیڈروں نے پاکستان کے خاتمے کو اپنا مذہبی فریضہ بنا لیا۔ انہیں معلوم تھا کہ قوم کو ساتھ لیے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ انہوں نے قوم کے ہر فرد سے کام لیا....

"پاکستان کے لیڈر قوم کو پرچیوں یعنی ووٹوں کے ڈھیر یا ووٹروں کے ریوڑ سے زیادہ کوئی اہمیّت نہیں دیتے۔ وہ قوم کو ملک و ملّت کے دشمن کے خلاف متحد کرنے کی بجائے قوم کو پارٹیوں اور

ٹکڑوں میں تقسیم کر کے انہیں آپس میں لڑاتے ہیں لیکن ہندوؤں کو اُن کے لیڈروں نے پاکستان کے خلاف متحد کر دیا۔"

سیکنڈ لیفٹیننٹ طاہر پرویز ماسٹر عابد الحق کے ساتھ اس طرح چلا جا رہا تھا جیسے وہ ماسٹر عابد کا شاگرد ہو اور ماسٹر عابد اُسے کوئی علمی مسئلہ سمجھا رہا ہو۔

"یہ تو تمھیں معلوم ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں ہندو خاصی زیادہ تعداد میں آباد ہیں" ــــ ماسٹر عابد کہہ رہا تھا ــــ "۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہُوا تو مغربی پاکستان سے ہندو بھارت چلے گئے لیکن مشرقی پاکستان کے ہندو باشندے یہیں رہے۔ یہاں کی صنعت اور تجارت انہی کے ہاتھ میں تھی، پھر وہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں استاد، لیکچرار اور پروفیسر بن گئے۔ انہوں نے بھارت سے آئی ہوئی دولت اور ہندو لڑکیوں کے ذریعے افسر شاہی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بنگالی طلباء اور طالبات کو بنگالی قومیّت، بھارت کی دوستی اور ہندوازم کے سبق دینے شروع کر دیئے۔ میں بھی استاد ہی تھا۔ میرے جیسے بے شمار مسلمان ٹیچر اور لیکچرار تھے لیکن محکمۂ تعلیم نے ہمیں تنگ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ سکولوں میں انسپکٹر آتے تھے۔ ہم انہیں بتاتے تھے کہ مسلمان بچوں کو کفر کے سبق دیئے جا رہے ہیں لیکن انسپکٹر سُنی اَن سُنی کر دیتے تھے۔ مجھے ایک انسپکٹر یاد ہے جس نے ہماری شکایت کے جواب میں بے بسی کے لہجے میں کہا تھا ــــ 'مجھے اپنے بچوں کے لیے نوکری زیادہ پیاری ہے'....

"یہ سب کچھ ڈھاکہ یونیورسٹی میں بھی ہو رہا تھا بلکہ ڈھاکہ ہندوؤں کا مرکز تھا۔ ڈھاکہ مسجدوں کا شہر کہلاتا ہے۔ وہاں علماء، خطیب اور چھوٹی مسجدوں کے امام بھی تھے۔ ہندو کلچر اور ہندو مت اُن کے سامنے لوگوں پر آسیب کی طرح طاری کیا جاتا رہا مگر ہمارے علماء اور امام ملائیّت کی بھول بھلیّوں میں بھٹکتے رہے، نماز روزے کی تلقین اور مسجدوں کے لیے چندے جمع کرتے رہے۔ وہاں تبلیغی جماعتیں بھی تھیں لیکن اُن کی تبلیغ ایسی نہیں تھی کہ غیر مسلموں کو اسلام کے سبق دیتے جاتے بلکہ یہ جماعتیں مسلمانوں کو نماز باقاعدگی سے پڑھنے کی تلقین کرتیں اور انہیں بہشت کے خواب دکھاتی تھیں۔ ہمارے ملاؤں کی نگاہیں قومی سطح تک جا ہی نہیں سکتیں....

"بظاہر یہ ناقابلِ یقین لگتا ہے لیکن ایسے ہُوا اور ہو رہا ہے کہ سکولوں کی نصابی کتابیں کلکتہ سے بھی چھپ کر آتی ہیں۔ میں تمھیں پرائمری کی ایک کتاب دکھا سکتا ہوں جس میں لکھا ہے ــــ 'رام اچھا لڑکا ہے۔ رحیم بُرا لڑکا ہے' ــــ مختصر یہ کہ چوبیس برسوں سے مسلمان بچوں کی برین واشنگ ہو رہی ہے اور ہمارے لیڈر کرسی کی لڑائیاں لڑتے رہے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ یہاں کا اسمبلی ہال غنڈہ گردی کا اکھاڑہ بن گیا ہے اور اسمبلی کے ایک اجلاس میں اسمبلی کے سپیکر کو قتل کر دیا گیا ہے؟ قاتل کوئی باہر کے غنڈے اور جرائم پیشہ نہیں بلکہ اسمبلی کے ممبر اور وزیر تھے۔"

"اگر انڈیا نے حملہ کیا تو ہم اُسے منہ توڑ جواب دیں گے" ــــ طاہر پرویز نے کہا۔

ماسٹر عابد الحق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی لیکن اُس کے چہرے پر دُکھ اور درد کا تاثر اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ اُس نے طاہر پرویز کو سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے اُسے اس نوجوان سیکنڈ لیفٹیننٹ [illegible]

"میں سکول ماسٹر ہوں" ــــ ماسٹر عابد نے کہا ــــ "لیکن میری نظریں ہر طرف لگی ہوئی ہیں.... تم کِس طرح اپنے دشمن کو منہ توڑ جواب دو گے؟ کیا ہے تمہارے پاس؟.... ایک ڈویژن فوج سے تم یہاں کے صرف ایک شہر کا بھی دفاع نہیں کر سکو گے۔ ایئر فورس کا یہاں صرف ایک سکواڈرن ہے اس میں سیبر طیارے ہیں اور وہ بھی صرف سولہ۔ پاکستان نیوی کا ایک اڈہ ہے جس میں کوئی جنگی بحری جہاز نہیں۔ وہاں صرف چار گن بوٹیں ہیں۔"

"آپ تو فوجی باتیں بھی جانتے ہیں" ــــ طاہر پرویز نے کہا۔

"مَیں اس سے زیادہ جانتا ہُوں" ــــ ماسٹر عابد نے کہا ــــ "مشرقی پاکستان میں جب بھی جنگ ہو گی محاصرے کی جنگ ہو گی۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ بھارت نے مشرقی پاکستان کے مشرق، مغرب اور شمال میں فوج جمع کر دی ہے اور جنوب سے اُس کی نیوی حملہ کرے گی۔ بھارت کی نیوی میں طیّارہ بردار بحری جہاز بھی ہے۔ بھارتی فوج کی تعداد بارہ ڈویژن کے لگ بھگ ہے اور اُس نے جو ایئر فورس آسام اور مغربی بنگال میں اکٹھی کر لی ہے وہ بارہ سکواڈرن کی ایئر فورس ہے جس میں جدید اور آواز کی رفتار سے تیز طیّارے ہیں....

"یہ تو ہمارے دشمن کی باقاعدہ افواج ہیں۔ اُس نے مشرقی بنگالیوں کے بہروپ میں اپنی کمانڈو فورس مشرقی پاکستان میں داخل کر رکھی ہے اس کی تعداد پچاس ہزار سے کہیں زیادہ ہے، اس فورس میں مشرقی پاکستان کے بھی نوجوان شامل ہو گئے ہیں اور انہیں باقاعدہ ٹریننگ دی گئی ہے بھارت نے مشرقی اور مغربی سرحد سے کچھ دور گوریلا کیمپ قائم کر دیئے ہیں جن میں مشرقی پاکستان کے نوجوانوں کو ٹریننگ دے کر واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی فورس بن گئی ہے جو پاکستان آرمی پر زمین کے نیچے سے بھی وار کرے گی اور پیچھے سے بھی۔"

طاہر پرویز ماسٹر عابد کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اُس کی زبان گُنگ ہو گئی تھی۔ وہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ اُس کا کیمپ آ گیا ہے۔ ماسٹر عابد رُک گیا۔

"تم جاؤ بیٹا!" ــــ ماسٹر عابد نے کہا ــــ "تم اب سوائے پریشان اور جذباتی ہونے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ جنہیں کچھ کرنا تھا وہ اسلام آباد میں شراب میں بدمست پڑے ہیں۔ تمہارا ایک جرنیل بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔ اُسے خوشامدیوں اور مشیروں نے تسلّی دے رکھی ہے کہ روس اگر بھارت کی مدد کر رہا ہے تو امریکہ اور چین ہماری مدد کریں گے.... میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ ہماری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔"

ماسٹر عابد سیکنڈ لیفٹیننٹ طاہر پرویز کو حیران و پریشان کھڑا چھوڑ کر چلا گیا۔

★

طاہر پرویز کیمپ میں پہنچا تو سب سے پہلے اُسے میجر اصغر ملا۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟" ــــ اصغر نے اُس سے پوچھا۔ اُس کے لہجے میں غصّہ تھا۔

"ویسے ہی باہر نکل گیا تھا" ــــ طاہر پرویز نے کہا۔ اُس کا لہجہ بُجھا بُجھا سا تھا۔

"طاہری!" ــــ اصغر نے ایسی دھیمی آواز میں کہا جس میں قہر جیسا غصّہ تھا ــــ "میجر کی حیثیت

میں تمہارا کورٹ مارشل کرا سکتا ہوں اور بڑے بھائی کی حیثیت سے میں تمہیں مُرغا بنا کر جُوتے مار سکتا ہوں۔ خالہ طاہرہ تمہیں میرے حوالے کر گئی ہیں۔ تم نہیں جانتے ارشد صاحب مجھے کیا کچھ کہہ گئے ہیں۔ تم میری ذمہ داری میں ہو۔ میں انہیں یہ اطلاع نہیں دینا چاہتا کہ آپ کا بیٹا جنگل میں یا بنگالیوں کے محلّے میں ایک بنگالی کی گولی سے مارا گیا ہے اور پی۔آئی۔اے کے بوئنگ میں اُس کی لاش آ رہی ہے۔"

"مکتی باہنی کے ایک سو آدمیوں کو مار کر مروں گا۔"

"بکومت" ــــ اصغر نے میجروں کے لہجے میں کہا ــــ "تم اُن جھونپڑوں کو دیکھنے گئے تھے جنہیں مکتی باہنی والوں نے جلا ڈالا ہے اور میں سی۔او کے آگے دو بار جھوٹ بول چکا ہوں کہ میں نے تمہیں کمپنی کے لنگر کے لیے کچھ چیزیں خریدنے کے لیے بازار بھیجا ہے.... اُس بنگالن کو دماغ سے اُتار دو۔"

طاہر پرویز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"یُو ایڈیٹ!" ــــ اصغر نے دانت پیس کر کہا ــــ "عورتوں کی طرح آنسو مت بہاؤ۔ تم مرد ہو۔ پلاٹون کمانڈر ہو.... میرے ساتھ چلو" ــــ اصغر نے اُسے ساتھ لیا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہ کہہ رہا تھا ــــ "تمہیں احساس نہیں کہ ہم پر کیا آفت آ رہی ہے۔ ہم محاصرے میں آ چکے ہیں۔ شہروں میں غیر بنگالیوں کا قتلِ عام شروع ہو چکا ہے۔ ڈھاکہ میں بنگالی سٹوڈنٹس غیر بنگالیوں کے گھروں میں داخل ہو کر لُوٹ مار کر رہے ہیں، آبروریزی کر رہے ہیں۔ بچّوں کو زندہ جلایا جا رہا ہے"

اصغر کو ہچکی سی آئی۔ اُس نے گھونٹ سا نگل کر کہا ــــ "غیر بنگالی بچّوں کو اس طرح مارا جا رہا ہے کہ کئی بچّوں کی لاشیں درختوں کے ساتھ اُن کے جسموں میں سے لمبے لمبے کیل گزار کر ٹھونک دی گئی ہیں" ــــ اصغر کی آواز میں لرزہ پیدا ہو گیا۔ یہ غصّے کا لرزہ تھا جس میں احتجاج کا رنگ بھی تھا لیکن اب اصغر کا غصہ طاہر پرویز پر نہیں تھا۔ اُس کا غصّہ بڑھتا گیا ــــ "غیر بنگالی عورتوں کو مسجدوں میں لے جا کر بے آبرو کیا جا رہا ہے۔"

"اور ہم یہاں کیمپ میں خاموش بیٹھے ہیں" ــــ طاہر پرویز نے اپنی ہتھیلی پر گھونسہ مارتے ہُوئے کہا ــــ "میں مان نہیں سکتا کہ بنگالی مسلمان، مسلمان عورتوں کی بے حُرمتی کر رہے ہیں۔"

"وہ جو کوئی بھی ہیں، میں تمہیں بتا رہا ہُوں کہ کیا ہو رہا ہے" ــــ اصغر نے کہا ــــ "ہمارے حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں نے جو بویا تھا وہ ہم کاٹیں گے۔ وہ تھوہر بوتے رہے ہیں اور آج تھوہر کا زہر بھائی اپنے ہی بھائیوں کو پلا رہے ہیں.... ہم کچھ نہیں کر سکتے طاہری! ہم حکم کے پابند ہیں۔ غیر بنگالیوں کا یہ قتلِ عام شہروں سے قصبوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔"

★

وہ کمرے میں پہنچ گئے۔ اصغر کُرسی پر یوں بیٹھا جیسے ہار کر گر پڑا ہو۔ طاہر پرویز کا چہرہ لال سُرخ ہو گیا تھا اور وہ مُٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

"تمہاری دو تین گھنٹوں کی غیر حاضری میں یہاں جو رپورٹیں ملی ہیں وہ بڑی بھیانک ہیں" ــــ اصغر نے کہا ــــ "ڈھاکہ میں آرٹلری کا ایک میجر اپنی بیوی اور دو بچّوں کو جیپ میں کہیں لے جا رہا تھا۔ جیپ

کا ڈرائیور بنگالی تھا۔ راستے میں کسی وجہ سے میجر نے جیپ رکوائی اور اُتر کر ذرا سی دیر کے لیے کہیں چلا گیا۔ واپس آیا تو جیپ اُس کی بیوی اور بچوں سمیت غائب تھی۔ پتہ چلا ہے کہ وہ میجر دماغی توازن کھو بیٹھا ہے.....

"غالباً یہ واقعہ ڈھاکہ کا ہی ہے۔ ایک بٹالین کے چار جوان رات چھاؤنی کے علاقے میں گشت پر تھے۔ دو آگے اور دو پیچھے تھے۔ اُن کے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ اچانک پیچھے والے دو جوانوں پر چار یا پانچ آدمیوں نے حملہ کر دیا۔ اگلے دو جوانوں کے پہنچنے تک بنگالی ان دو جوانوں کو قتل کر کے بھاگ رہے تھے۔ اگلے دو جوانوں نے اس حکم کے باوجود کہ گولی نہیں چلائی جائے گی، بنگالیوں کا پیچھا کیا اور انہیں جا لیا۔ دونوں جوانوں کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ اُنہوں نے دو تین برسٹ فائر کر کے تمام بنگالیوں کو مار ڈالا۔ فائرنگ کی آواز سن کر کئی اور بنگالی گھروں سے نکل آئے۔ ان دو جوانوں نے انتقامی جذبے سے بے قابو ہو کر ان پر بھی سٹین گنیں فائر کیں اور سب کو ختم کر دیا۔"

"کیا اُن کا کورٹ مارشل ہو گا؟"۔۔۔ طاہر پرویز نے پوچھا۔

"شاید نہیں"۔۔۔ اصغر نے جواب دیا۔۔۔ "کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے حکم آیا ہے کہ کوئی فوجی افسر اور جوان کیمپ سے باہر نہیں جائے گا۔ ڈیوٹی کے سلسلے میں باہر جانے والے اپنے ساتھ چند ایک جوانوں کی مسلّح ایسکارٹ لے جائیں گے۔"

طاہر پرویز اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اُس کی چال ڈھال اور انداز سے پتہ چلتا تھا کہ قہر و عتاب سے بم کی طرح پھٹ جائے گا۔

"طاہری!"۔۔۔ اصغر نے دھیمی سی آواز میں کہا۔۔۔ "میری جذباتی کیفیت تم جیسی ہی ہے۔ اپنے آپ پر قابو پائے رکھنا بھی ایک بہادری ہے۔ میں تمہیں یہی سبق دینا چاہتا ہوں کہ اپنے جذبات پر قابو رکھو۔ تم نوجوان ہو، ناتجربہ کار ہو۔ اپنے جذبات کے آگے ہتھیار نہ ڈال دینا۔ ہم فوجی ہیں۔ ہم حکم کے پابند ہیں۔"

"اگر فوج کو بیرکوں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تو ہمیں مغربی پاکستان کیوں نہیں بھیج دیا جاتا!"۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ "کیا ہمیں اپنے آپ پر قابو پانے کی ٹریننگ دی جا رہی ہے؟"

"فوج ایک چاقو ہے"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "چاقو خود نہیں چل سکتا۔ یہ چاقو والے پر منحصر ہے کہ اسے جیب میں پڑا رہنے دے یا اسے چلائے۔"

"ہم ایک بدمعاش شرابی کے چاقو ہیں"۔۔۔ طاہر پرویز نے دانت پیس کر کہا۔۔۔ "یہ بدمعاش اپنی بزدلی کو چھپانے کے لیے شراب میں بدمست رہتا ہے۔"

"سنو طاہری!"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "کمرے سے باہر ایسی بات نہ کہنا۔ سب جانتے ہیں کہ ہمارا پریذیڈنٹ ہم پر ٹھونسا گیا ہے۔ خوشامدیوں نے اس کے گرد حصار کھینچ رکھا ہے۔ وہ ہر وقت شراب کے نشے میں رہتا ہے۔ ایوانِ صدارت میں دن کے وقت بھی فاحشہ عورتیں موجود رہتی ہیں۔ پریذیڈنٹ نے اُن سیاسی لیڈروں کو اپنا غیر سرکاری مشیر مقرر کر رکھا ہے جو اُسی کی طرح شراب اور بدمعاشی کے رسیا ہیں۔ انہیں الیسٹ پاکستان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ موجودہ فوجی پریذیڈنٹ کے جانشین بننا چاہتے ہیں.... مجھے ڈر ہے کہ اس سیاسی معرکہ آرائی میں فوج کچلی جائے گی۔"

صرف طاہر پرویز کی ہی نہیں، اُس کی یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر سے لے کر لانگری تک کی جذباتی کیفیت ایسی تھی کہ وہ بیرکوں سے نکل کر مکتی باہنی کو ختم کرنے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے لیکن فوج کے کسی آدمی کو بیرکوں سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جن سیاسی دھاندلیوں، بدنظمی اور مفاد پرستی نے یہ خونچکاں حالات پیدا کیے تھے، ان پر قابو پانے کے لیے ایک ڈویژن فوج کی حیثیت طوفانی سمندر میں ایک کشتی جیسی تھی۔ بھارت کی جو کمانڈو فورس مکتی باہنی کے روپ میں مشرقی پاکستان میں موجود تھی، علیحدگی پسند بنگالی مسلمانوں کے ساتھ غیر بنگالیوں کا قتل عام کسی روک ٹوک کے بغیر کر رہی تھی۔ لوگوں کے مکانوں پر بنگلہ دیش کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ محبِّ وطن بنگالیوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ بھی منڈیروں پر بنگلہ دیش کے جھنڈے لگائیں۔ جس مکان پر جھنڈا نہیں ہوتا تھا، اس گھر پر حملہ کر کے تمام خاندان کو ختم کر دیا جاتا تھا۔

غیر بنگالی آبادیوں اور محلّوں کا پہلے پانی بند کیا گیا، پھر اُن کی بجلی کاٹ دی گئی۔ بازار سے انہیں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ بچّے دودھ کے لیے بلبلاتے تھے۔ لوگ پانی کی ایک ایک بوند کے لیے ترستے تھے۔ کئی دنوں کی بھوک اور پیاس کے بعد ان آبادیوں پر منظّم حملے کر کے اُن کے بچّے بچّے کو قتل کر دیا جاتا۔ نوجوان لڑکیوں اور جوان عورتوں کو سرِعام بے آبرو کیا گیا۔ پردہ نشین لڑکیاں کلکتہ کے عصمت فروشی کے بازار میں فروخت ہوئیں۔

کہا جاتا رہا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں مسلمانوں کا جو قتلِ عام، وسیع پیمانے پر آبروریزی اور آتش زنی ہوئی تھی، اس کی مثال کم از کم برِّصغیر کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی لیکن ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں غیر بنگالیوں کو جس طرح قتل اور بے آبرو کیا گیا، اُس نے ۱۹۴۷ء کا قتلِ عام لوگوں کے ذہنوں سے اُتار دیا۔ گلیوں اور سڑکوں پر لاشیں ہزاروں کی تعداد میں گل سڑ رہی تھیں ۔۔۔ مشرقی پاکستان خون میں اور اسلام آباد شراب میں ڈوب رہا تھا۔

مشرقی پاکستان میں پردہ نشین مستورات اغوا اور نیلام ہو رہی تھیں، اسلام آباد میں فاحشہ عورتوں کو سینے سے لگائے مغربی رقص ہو رہے تھے۔ مشرقی پاکستان سے ملٹری انٹیلی جنس کی رپورٹیں اسلام آباد پہنچ رہی تھیں لیکن وہاں جن مسائل پر غور ہوتا تھا اُن میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ جن افسروں کو سول اعزاز کے تمغے دیئے گئے ہیں وہ شکایت کرتے ہیں کہ تمغے ستاروں کی شکل کے ہیں۔ ان کے کونے اس قدر نوکیلے اور تیز ہیں کہ وہ جب خواتین کے ساتھ سینہ بسینہ رقص کرتے ہیں تو تمغوں کے یہ کونے اُن کی ہم رقص خواتین کی چھاتیوں کو مجروح کرتے ہیں۔

فوجی رپورٹوں میں تفصیل سے لکھا جاتا تھا کہ بھارت کس طرح اسلحہ وغیرہ مشرقی پاکستان میں پہنچا رہا ہے لیکن صدرِ مملکت ان رپورٹوں کو ذرا سی بھی اہمیّت نہیں دیتا تھا۔ مشرقی پاکستان میں فوج کی حالت یہ تھی کہ بیرکوں سے تو کوئی آدمی نکل نہیں سکتا تھا لیکن بازار سے ضروری اشیاء خریدنے اور سپلائی سے چیزیں لانے کے لیے فوجیوں کو باہر جانا ہی پڑتا تھا۔ سپلائی کے ٹھیکیداروں کو اس قدر دہشت زدہ کر دیا گیا تھا کہ وہ فوج کو سامان سپلائی نہیں کرتے تھے۔ فوجیوں کو گالیاں دی جاتی تھیں اور موقع ملے تو ان پر باقاعدہ حملہ کیا جاتا تھا۔

ایک واقعہ ایسا بھی ہوا کہ فوج کی چھوٹی سی ایک پارٹی کسی ضروری کام کے سلسلے میں باہر گئی۔

یہ لوگ ایسے علاقے سے گزرے جہاں ننھے ننھے بچوں کی لاشیں درختوں اور دیواروں کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں۔ بکھری ہوئی بے شمار لاشوں میں برہنہ عورتوں کی لاشیں بھی تھیں۔ اس پارٹی کے دو جوانوں کے دماغوں پر ایسا اثر ہوا کہ اُن پر پاگل پن کا دورہ پڑا۔ پارٹی واپس آئی تو ان دو جوانوں نے کسی طرح مشین گنیں حاصل کرلیں۔ پیشتر اس کے کہ انہیں کوئی روکتا، وہ پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے اُس علاقے میں جا پہنچے جہاں انہوں نے انسانی درندوں کی چیری پھاڑی ہوئی بچوں اور عورتوں کی لاشیں دیکھی تھیں۔ وہاں بنگالی لاشوں میں گھوم پھر رہے تھے۔ ان جوانوں نے اُن پر فائر کھول دیا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان دونوں کا انجام کیا ہوا، یہ پتہ چلا کہ انہوں نے وہاں کسی بنگالی کو زندہ نہیں چھوڑا۔

ایسے اور واقعات بھی ہوئے کہ بعض فوجی درندگی کے یہ مظاہرے دیکھ کر دماغی توازن کھو بیٹھے۔ ذہن اُن بھیانک مناظر کو تصوّر میں لانے سے اور قلم لکھنے سے کانپتا ہے۔

وہاں غیر بنگالیوں کو ہی نہیں، اُن بنگالی مسلمانوں کو بھی قتل کیا جارہا تھا جو سچے پاکستانی تھے اور بنگلہ دلیش کو شیخ مجیب الرحمٰن اور اندرا گاندھی کا سٹنٹ سمجھتے تھے۔

پاکستان کی حکومت نے عوام کو دکھانے کے لیے پاک فوج کے دو ڈویژن مشرقی پاکستان بھیج دیتے لیکن ان کے پاس ذاتی ہتھیار تھے اور تھوڑا سا ایمونیشن۔ ان کے ساتھ توپ خانہ اور ٹینک رجمنٹیں نہیں تھیں۔ ساز و سامان اور دیگر جنگی لوازمات کے لحاظ سے یہ دو ڈویژن بڑی جنگ لڑنے کے قابل نہیں تھے۔ ان کی حالت مسلّح پولیس کی سی تھی۔

مشرقی پاکستان بنگلہ دلیش بن گیا تھا۔ وہاں حکومتِ پاکستان کا قانون اور دستور بے بس ہو چکا تھا۔ وہاں کی انتظامیہ پاکستان کے قابو سے نکل گئی تھی۔ پولیس غیر بنگالیوں کے قتلِ عام کو روک نہیں رہی تھی بلکہ قتلِ عام کر رہی تھی۔ پاکستان نے ایک نیا فوجی گورنر بھیجا۔ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو گورنر سے حلف لینے کے لیے بلایا گیا مگر چیف جسٹس نے حلف لینے سے انکار کر دیا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ وہ اب پاکستان کا نہیں بنگلہ دلیش کا چیف جسٹس ہے۔

★

پاک فوج کے افسر اور جوان بیرکوں میں بیٹھے دانت پیسنے اور مُٹھیاں بھینچنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ طاہر پرویز اور اُس جیسے نوجوان افسر جو ستمبر ۱۹۶۵ء کے جذبے سے فوج میں گئے تھے، یہ سن سن کر پاگل ہوتے جارہے تھے کہ غیر بنگالیوں کے قتلِ عام میں ہندو پیش پیش ہیں اور مکتی باہنی دراصل انڈین آرمی کی کمانڈو فورس ہے۔

خون میں ڈوبے ہوتے ان دنوں کی ایک صبح طلوع ہوئی۔ طاہر پرویز اپنے کمرے میں تیار ہو رہا تھا۔ اَردلی نے اُسے بتایا کہ ایک بنگالی سویلین اُس سے ملنے آیا ہے۔ طاہر پرویز نے اُسے اندر بلا لیا۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ صبیحہ کا بھائی تھا ــــ وہی بھائی جس نے صبیحہ سے کہا تھا کہ طاہر پرویز ان کا پہلا شکار ہوگا۔

”آؤ شبیر الحسن!“ ــــ طاہر پرویز نے کہا ــــ ”کیسے آئے؟“

شبیر الحسن خاموش رہا۔ طاہر پرویز نے اُسے نظروں سے جانچا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ جوان سال بنگالی جو پاکستان کا دشمن اور کٹّر بنگلہ دلیشی ہے، ریوالور نکالتا ہے یا خنجر۔ وہ اچھی نیّت سے نہیں

آیا تھا۔ طاہر پرویز خالی ہاتھ تھا۔ کمرے میں چھوٹا سا ایک چاقو تھا جو میز کی دراز میں پڑا تھا۔ طاہر پرویز خالی ہاتھ مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ اُس نے اَردلی کو بلانا بزدلی سمجھا۔

”چپ کیوں ہو شبیر؟“ ــــ طاہر پرویز نے پوچھا ــــ ”بیٹھو گے نہیں؟“

شبیر الحسن کی نظریں طاہر پرویز کے چہرے پر جم گئیں اور وہ آہستہ آہستہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ طاہر پرویز کے سینے میں نفرت تڑپی جو غصّے کی صورت اختیار کرگئی۔ اگر فوجی ٹریننگ میں اُسے ڈسپلن اور تحمّل نہ سکھایا گیا ہوتا تو وہ بے قابو ہوکر شبیر پر ٹوٹ پڑتا۔

”شبیر بھائی!“ ــــ طاہر پرویز نے غصے کو دباتے ہوئے کہا ــــ ”بہت دن گزر گئے ہیں میں صبیحہ سے نہیں ملا۔ اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تمھارے ڈر سے صبیحہ سے نہیں ملا۔ وہ بھی نہیں آئی لیکن وہ آئے گی۔ میں نے صبیحہ کو اُس نظر سے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا جو تم نے سمجھا تھا لیکن میں نے تمھارا چیلنج قبول کیا ہے۔ میں تمھیں صاف الفاظ میں کہہ دیتا ہوں کہ صبیحہ مجھے چاہتی ہے اور میں اُسے چاہتا ہوں۔“

شبیر الحسن کی نظریں بدستور طاہر پرویز کے چہرے پر جمی رہیں اور وہ چپ بیٹھا رہا۔

”مجھے شرم آرہی ہے کہ تم میرے گھر میں بیٹھے ہو اور میں ناروا باتیں کہہ رہا ہوں“ ــــ طاہر پرویز نے کہا ــــ ”میں تمھیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ میری اور صبیحہ کی محبت بالکل پاک ہے اپنی بہن پر کوئی بیہودہ الزام نہ لگانا۔“

”صبیحہ کہاں ہے؟“ ــــ شبیر الحسن نے کہا ــــ ”محبّت کس سے کرو گے؟“

”کیا تم اپنی بہن کو قتل کر چکے ہو؟“ ــــ طاہر پرویز نے اپنے آپ پر بڑی مشکل سے قابو پاکر دبی دبی آواز میں پوچھا ــــ ”کیا مجھے یہ اطلاع دینے آئے ہو کہ تم نے صبیحہ کو اس لیے قتل کر دیا ہے کہ وہ ایک پنجابی کو چاہتی ہے اور وہ پاکستان کی حامی ہے؟ میں جانتا ہوں کہ اس ملک میں انسان مکھیوں کی طرح مارے جارہے ہیں اور قتل کوئی جرم نہیں رہا لیکن میں تمھاری جرأت کی تعریف کرتا ہوں کہ تم ایک فوجی افسر کے کمرے میں آکر...“

”طاہر بھائی!“ ــــ شبیر نے طاہر پرویز کی بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ ”میں تمھیں کوئی اور اطلاع دینے آیا ہوں۔ میں دلیر تھا، اب بزدل ہو کے تمھارے پاس آیا ہوں۔ مجھے اب یہ احساس پریشان کر رہا ہے کہ صبیحہ میری دشمن نہیں میری بہن تھی... صبیحہ کو مکتی باہنی کے ہندو اٹھا کر لے گئے ہیں۔“

طاہر پرویز یوں سُنّ ہو کے رہ گیا جیسے شبیر الحسن نے ریوالور فائر کیا ہو اور یکے بعد دیگرے کئی گولیاں اُس کے سینے سے پار ہوگئی ہوں۔ وہ کچھ دیر شبیر الحسن کے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ پتھر کا بے جان بُت بن گیا ہو۔

”مکتی باہنی کے ہندو؟“ ــــ طاہر پرویز نے یوں کہا جیسے اُس نے سسکی لی ہو۔ پھر غصے سے اُس کے دانت بجنے لگے۔ اُس نے کہا ــــ ”اُسے تم نے اغوا کرایا ہے۔“

”نہیں طاہر بھائی، نہیں“ ــــ شبیر الحسن نے جھنجھلا کر کہا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے روتی ہوئی آواز میں کہا ــــ ”میں تمھارے پاس مدد کے لیے آیا ہوں۔

میں اب بنگلہ دیشی نہیں، سچا پاکستانی ہوں۔"

"اس ایک دھچکے نے تمہیں مسلمان بنا دیا ہے؟" — طاہر پرویز نے طنزیہ لہجے میں کہا — "ملک کی آزادی کی خاطر بہنیں قربان کرنی ہی پڑتی ہیں۔ تم آزادی چاہتے ہو نا!"

"نہیں طاہر بھائی!" — شبیر الحسن نے غمزدہ آواز میں کہا — "میری پوری بات سن لو۔ مجھے دھچکہ صرف ایک ہی نہیں لگا۔"

★

طاہر پرویز نے اَردلی کو بلا کر اُسے چائے لانے کو کہا اور شبیر الحسن اُسے بتانے لگا کہ صبیحہ کس طرح اغوا ہوئی ہے۔

بنگلہ دیشی تحریک کا زور شہروں میں تھا۔ پھر یہ قصبوں تک پہنچ گیا لیکن دیہاتی علاقہ اس سے بالکل محفوظ رہا۔ دیہات کے لوگ بھوکے تھے یا ننگے، وہ جس حال میں بھی تھے اپنے آپ کو پاکستانی سمجھتے تھے۔ ان لوگوں پر مکتی باہنی والے ایک اور قسم کا تشدّد کر رہے تھے۔ وہ ان کے ہاں آکر پناہ لیتے تھے، ان سے کھانا وغیرہ بھی کھاتے تھے اور ان کی جوان بیٹیوں کو بھی خراب کرتے تھے۔ ان مجبور اور بے بس لوگوں کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ وہاں قانون کی حکومت نہیں تھی۔ دیہات پر اگر کسی کی حکومت تھی تو وہ مکتی باہنی کی تھی۔ انڈین آرمی کی اس کمانڈو فورس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

قصبوں میں بھی پاکستانی بنگالیوں کی تعداد کچھ کم نہیں تھی۔ یہ لوگ بھی عتاب اور تشدّد کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ صبیحہ اور شبیر کے ماں باپ سچّے پاکستانیوں میں سے تھے۔ وہ مکتی باہنی سے اس لیے بچے ہوئے تھے کہ شبیر اور اس کا چھوٹا بھائی مکتی باہنی میں تھے۔ شبیر نے طاہر پرویز کو سنایا کہ اُس کے ساتھیوں نے اُسے کہا تھا کہ اپنے مکان پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دے۔ اُس نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن اُس کے باپ نے جھنڈا نہ صرف اتار دیا بلکہ منڈیر پر کھڑے ہو کر اسے جلا دیا۔ باپ بیٹے میں خاصی تُو تُو میں میں ہوئی۔ باپ نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ وہ انھیں اپنی اولاد نہیں سمجھتا۔

"جاؤ اور ہندو ہو جاؤ" — باپ نے اپنے بیٹوں سے کہا — "اس مکان پر صرف پاکستان کا جھنڈا چڑھے گا۔ آج کے بعد میں تم دونوں کو اس گھر میں نہ دیکھوں.... سن سنتالیس میں میری قوم نے بہت بیٹے قربان کیے تھے۔ دو بیٹے میں نے پاکستان کے نام پر قربان کر دیتے تو یہ اتنی بڑی قربانی نہیں ہوگی۔"

شبیر مکتی باہنی کے اڈے پر گیا اور انہیں بتایا کہ اُس کا باپ بنگلہ دیش کے جھنڈے کو قبول نہیں کر رہا۔

"کیا ہم نے تمھیں گن نہیں دے رکھی؟" — ایک ہندو نے کہا جو انڈین آرمی کا نائیک تھا — "اگر باپ نے تمھیں اپنا بیٹا سمجھنا چھوڑ دیا ہے اور تمھاری بہن ایک پنجابی لیفٹیننٹ کو چاہتی ہے تو کیا تم انہیں گولی نہیں مار سکتے؟ اگر گولی نہ مارتے تو ایسے باپ کو گھسیٹ کر گلی میں لے آتے اور اُس کی وہ حالت

کر دیتے کہ اُس جیسے دوسرے پاکستانیوں کو عبرت حاصل ہوتی۔"

"نہیں" — شبیر نے کہا — "میں اتنی جرأت نہیں کر سکتا، اس لیے نہیں کہ وہ میرا باپ ہے بلکہ اس لیے کہ اُس نے چند ایک بدمعاش قسم کے آدمی اپنے ساتھ رکھے ہوتے ہیں۔ ان کے زور پر وہ بنگلہ دیشی بنگالیوں کو دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔"

"تو اس کا ہمیں خاص انتظام کرنا پڑے گا" — اس ہندو نائیک نے کہا — "وہ ہم کر دیں گے۔"

"یہ بھی خیال رکھنا میرے دوستو!" — شبیر نے کہا — "کہ میری بہن صبیحہ کو فوجیوں کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فوجی کیمپ جو ہمارے بالکل قریب ہے، وہاں سے فوج آجائے۔"

"کون سی فوج؟" — مکتی باہنی کے ایک اور ہندو نے طنزیہ ہنسی ہنس کر کہا — "تم دیکھ نہیں رہے کہ پاکستان کی فوج ہمارے ڈر سے بیرکوں سے باہر نہیں نکل رہی؟ شہروں میں کتنے فوجی ہمارے ساتھیوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔"

"اور وہ جو فوج کے دو ڈویژن اور آ گئے ہیں؟" — شبیر نے کہا۔

"کیا یہ تین ڈویژن ہمارے اُن بارہ ڈویژنوں کا مقابلہ کر سکیں گے جنہوں نے ایسٹ بنگال کو گھیرے میں لے رکھا ہے؟" — ہندو نائیک نے کہا — "پاکستان کی اس فوج نے ذرا سی بھی حرکت کی تو ہمارے بارہ ڈویژن اندر آکر بلڈوزر کی طرح پھر جائیں گے.... لیکن یہ میرا اور تمھارا مسئلہ نہیں۔ تم اپنے گھر کی بات کرو۔ ہم پہلے سے جانتے تھے کہ بہت سے لوگ تمھارے باپ کے زیرِ اثر ہیں۔ ہم یہ اثر ختم کر دیں گے۔"

"رام چرن!" — شبیر الحسن نے درخواست کے لہجے میں کہا — "ایک خیال رکھنا، وہ میرے ماں باپ ہیں اور صبیحہ میری بہن ہے۔ تم لوگ یوں کرو کہ کسی رات کو اُن کے ہاں جا دھمکو اور انہیں دھمکیاں دے کر اپنا حامی بنا لو۔ انہیں کہو کہ اُنھوں نے دھوکہ دیا تو ایسا حملہ پھر بھی ہو سکتا ہے اور وہ حملہ قتل و غارت پر ختم ہوگا.... مجھے امید ہے کہ میرے ماں باپ اتنے دلیر نہیں کہ وہ سٹین گنوں اور مشین گنوں کے آگے بھی اپنی بات پر قائم رہیں گے۔"

"چلو ایسے ہی سہی" — نائیک رام چرن نے کہا — "ایک کوشش کر دیکھتے ہیں۔"

★

دو دن اور گزرے تو مکتی باہنی کے اڈے سے شبیر الحسن اور اُس کے چھوٹے بھائی کو کہیں اور جانے کا حکم ملا۔ دونوں بھائی شام سے کچھ پہلے چلے گئے۔

وہاں اب موت کی حکمرانی تھی۔ چیخ و پکار اور گولیوں کے دھماکوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ محبِّ وطن پاکستانی شام کے بعد دروازوں کو اندر سے مقفّل کر لیتے تھے اور گھروں کے مُردات بھر جلتے رہتے تھے۔ یہی کیفیّت شبیر الحسن کے گھر کی تھی۔ شبیر الحسن کا باپ گھر میں اکیلا مرد تھا، وہ بیٹوں کی موجودگی میں بھی اکیلا ہی ہوتا تھا۔ اُس نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ تین چار لڑاکے بنگالیوں کو رات اپنے گھر میں رکھتا تھا۔ اُس نے ایک ریوالور اپنے پاس رکھا ہوا تھا اور اُس کے آدمیوں کے پاس ڈھال اور خنجر تھے۔ دو برچھیاں بھی تھیں۔

جس رات شبیرالحسن مکتی باہنی کے حکم پر اپنے بھائی کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا، اُس رات اُس کے باپ نے گھر میں پانچ آدمی رکھ لیے تھے۔ آدھی رات سے کچھ دیر پہلے دروازے پر دستک ہُوئی۔ گھر والے اتنے کچّے نہیں تھے کہ وہ فوراً دروازہ کھول دیتے۔ ایک آدمی نے اُٹھ کر پوچھا ـــ "کون ہے؟"

باہر سے جو جواب آیا اس پر کچھ شک ہُوا۔ دو تین بار پھر دستک ہُوئی۔ اندر سے ایک آدمی نے چھت پر جاکر نیچے دیکھا۔ باہر آٹھ دس آدمی کھڑے تھے۔ اُس آدمی نے نیچے آکر سب کو اُٹھا لیا۔ یہ آدمی ہتھیار بند ہو گئے۔ اتنے میں دروازہ رائفلوں کے کُندوں وغیرہ سے ٹوٹنے لگا۔ گھر کے آدمی اِدھر اُدھر چھپ گئے تاکہ دشمن کے اندر آتے ہی اُس پر حملہ کیا جا سکے۔

دروازہ ٹوٹ گیا اور مکتی باہنی کے آدمی بڑی تیزی سے اندر آ گئے۔ گھر کے آدمیوں نے دائیں بائیں سے اُن پر برچھیوں اور خنجروں سے حملہ کر دیا۔ مکتی باہنی کے آدمیوں کو فائر کرنے کا پُورا موقع نہ مل سکا۔ شبیر کے باپ نے ریوالور فائر کر کے دو تین آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ اڑوس پڑوس کے گھروں سے بھی کچھ آدمی آ گئے۔ مکتی باہنی نے فائر کیا لیکن وہ اتنا کارگر نہ تھا۔ فوراً بعد صورتِ حال ایسی ہو گئی کہ مکان کے ہر کمرے میں لڑائی ہو رہی تھی۔ محبِّ پاکستان بنگالیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد مکتی باہنی کے آدمی معرکے سے نکلنے لگے لیکن اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون کدھر ہے۔ فائرنگ بند ہو گئی۔ جب یقین ہو گیا کہ مکتی باہنی والے بھاگ نکلے ہیں تو گھر کا جائزہ لیا گیا۔ تین آدمی مارے گئے تھے۔ دو لاشیں مکتی باہنی والوں کی پڑی تھیں۔ چار پانچ محبِّ پاکستان زخمی ہوئے تھے۔

اتنے میں صبیحہ کی ماں چیختی چلّاتی کمروں میں بھاگتی دوڑتی نظر آئی۔ وہ صبیحہ کو پُکار رہی تھی۔ اُسے صبیحہ کسی کمرے میں نظر نہ آئی۔ پھر وہ دوڑتی ہُوئی مردوں میں آئی جو زخمیوں کو سنبھال رہے تھے۔ اُس نے چلّا کر پوچھا ـــ "صبیحہ کہاں ہے؟"

صبیحہ کہیں بھی نہیں تھی۔ پڑوسیوں نے اپنے گھروں میں جاکر دیکھا۔ شاید وہ کسی اور گھر میں چھپ گئی ہو لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ سب کو یہ حقیقت قبول کرنی پڑی کہ صبیحہ کو مکتی باہنی والے اُٹھا لے گئے ہیں۔

صبح طلوع ہونے میں ابھی بہت دیر باقی تھی۔ شبیرالحسن اور اُس کا بھائی آ گئے۔ گھر کی حالت، لاشوں اور زخمیوں کو دیکھ کر وہ چکرا گئے۔ باپ کی نظر جوں ہی اپنے بیٹوں پر پڑی، اُس نے غصّے سے پاگل ہو کر کہا ـــ "انہیں بوٹی بوٹی کر دو۔"

دو تین آدمی اُن پر ٹوٹ پڑے۔ اُن کی ماں چیختی چلّاتی اپنے بیٹوں کے سامنے آ گئی۔ یہ ماں کی برداشت سے باہر تھا کہ وہ اپنے بیٹوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے پِٹتا اور مرتا دیکھتی۔ ماں کی یہ جذباتی کیفیت دیکھ کر سب پیچھے ہٹ گئے۔

"بے غیرتو!" ـــ ماں نے اپنے بیٹوں سے کہا ـــ "وہ کافر تمہاری بہن کو اٹھا لے گئے ہیں۔"

"صبیحہ کو؟" ـــ شبیرالحسن نے پوچھا۔

ہر طرف سے اس پر گالیوں، کوسنوں اور طعنوں کی بوچھاڑیں پڑنے لگیں۔ باپ دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ یہی کہے جا رہا تھا ـــ "انہیں اس گھر سے نکال دو..... یہ میرے بیٹے نہیں..... انہیں اس گھر سے نکال دو۔"

چھوٹا بھائی تو رو پڑا اور ماں سے اور دوسرے لوگوں سے معافی مانگنے لگا اور شبیرالحسن باہر کو دوڑ پڑا۔ اُس کی آواز سنائی دی ـــ "میں اپنی بہن کو واپس لاؤں گا۔"

★

شبیرالحسن طاہر پرویز کو یہ واقعہ سنا رہا تھا اور طاہر پرویز اپنے خون میں ناقابلِ برداشت اُبال محسوس کر رہا تھا۔

شبیرالحسن دوڑتا ہی گیا۔ مکتی باہنی کی جو ٹولیاں اس علاقے میں سرگرم تھیں، ان کا اڈہ وہاں سے تقریباً چار میل دُور چند ایک جھونپڑوں کے ایک گاؤں میں تھا۔ ان کے ڈر سے وہاں کے رہنے والے بھاگ گئے تھے۔ شبیر وہاں پہنچا تو رات کا آخری پہر تھا۔ مکتی باہنی کا ایک آدمی جھونپڑوں کے قریب ٹہل رہا تھا۔ وہ پہرہ دے رہا تھا۔

"رام چرن کہاں ہے؟" ـــ شبیر نے اُس سے پوچھا۔

"سویا ہُوا ہے۔"

"اُسے جگاؤ" ـــ شبیر نے کہا اور پوچھا ـــ "کیا تم بھی میرے گھر پر حملہ کرنے گئے تھے؟"

"گیا تھا۔"

"میری بہن کہاں ہے؟"

"رام چرن سے پوچھ لینا" ـــ اس آدمی نے کہا ـــ "میرا خیال ہے تمہاری بہن یہاں نہیں ہے۔"

شبیرالحسن ہانپ رہا تھا۔ اُس نے یہ فاصلہ زیادہ تر دوڑتے طے کیا تھا۔ غصّے سے بھی اُس کی سانسیں اکھڑی ہُوئی تھیں۔

"میں خود اندر گیا تو میں رام چرن کو گولی مار دوں گا" ـــ شبیر نے کہا ـــ "رام چرن سے جا کے کہو کہ میری بہن مجھے واپس کر دے۔ میں اُسے معاف کر دوں گا۔ ہمیں آپس میں نہیں لڑنا چاہیئے۔"

وہ آدمی شبیرالحسن کو وہیں رُکے رہنے کو کہہ کر ایک جھونپڑے کی طرف چلا گیا۔ اُس نے رام چرن کو جگایا اور اُسے بتایا کہ صبیحہ کا بھائی آیا ہے۔ رام چرن باہر آ گیا۔

"سُنا ہے تم بڑے سخت غصے میں آئے ہو" ـــ نائیک رام چرن نے شبیرالحسن سے کہا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ میرے گھر میں داخل ہو کر میرے باپ کو ڈرانا اور اس سے زیادہ کچھ نہ کرنا" ـــ شبیر نے کہا ـــ "لیکن تم نے وہاں باقاعدہ حملہ کیا اور تین آدمیوں کو قتل کر کے تم میری بہن کو اغوا کر لائے ہو..... میری بہن مجھے واپس کر دو۔"

"ہم یہاں کھیل تماشہ کرنے نہیں آئے شبیر بھائی!" ـــ رام چرن نے کہا ـــ "ہم وہاں ڈرانے دھمکانے کے لیے ہی گئے تھے لیکن تمہارے باپ کے غنڈوں نے ہم پر حملہ کر دیا اور ہمارے سب سے پیارے ساتھی شفیع الاسلام کو مار ڈالا۔ تمہارے باپ نے ہم پر ریوالور فائر کیا۔ وہاں بات کرنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ تمہارے محلّے کے کتنے آدمی برچھیاں اور دھا اٹھائے آ گئے۔ اگر

ہم فائر نہ کھول لیتے تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہ آسکتا!"

"رام چرن!" ــــ شبیر الحسن نے غصّے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "میری بہن نے تو تم پر حملہ نہیں کیا تھا۔ اُسے کیوں اٹھا لائے ہو؟"

"اُس نے ہم پر حملہ کیا تھا" ــــ رام چرن نے کہا ــــ "اُس کے ہاتھ میں دہا تھا۔ ایک آدمی کو اُس نے زخمی کر دیا۔ دوسرے وار سے اُسے وہ مار ہی ڈالتی لیکن میرے دو آدمیوں نے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا اور اُسے گھسیٹ کر باہر لے آئے۔ مجھے اس وقت پتہ چلا کہ تمھاری بہن کو میرے آدمی ساتھ لے آئے ہیں جب ہم وہاں سے نکل آئے تھے۔"

رام چرن شراب کے نشے میں تھا اور اُس پر نیند کا خمار بھی طاری تھا۔ اُن کی باتیں سن کر ایک جھونپڑے سے اُن کا ایک اور ساتھی نکل آیا۔

"میں اپنی بہن کو واپس لے کر ہی جاؤں گا" ــــ شبیر نے کہا۔

"اگر تم رُعب اور دھمکی سے بات کرو گے تو نہ تمھاری بہن واپس جائے گی نہ تم زندہ واپس جا سکو گے" ــــ نائیک رام چرن نے کہا ــــ "اور اگر دوستوں کی طرح بات کرتے ہو تو میں سچ کہہ رہا ہوں کہ تمھاری بہن کے ساتھ ابھی تک ہم میں سے کسی نے کوئی بیہودہ حرکت نہیں کی۔ میں تمھارے ہی انتظار میں تھا۔ میں تمھاری بہن کو یرغمال میں رکھنا چاہتا ہوں۔ تم واپس جاؤ اور اپنے باپ سے کہو کہ دو لاکھ روپیہ نقد اور اپنا وہ ریوالور جس سے اُس نے ہمارے ایک ساتھی کی جان لی ہے، ہمیں دے دے۔ ہم اُس کی بیٹی اُسی طرح واپس کر دیں گے جس طرح لائے تھے۔"

"دیکھو رام چرن!" ــــ شبیر الحسن نے بارُعب طریقے سے کہا ــــ "میں اس وقت تمھارے پاس تمھارے ساتھی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اُس لڑکی کے بھائی کی حیثیت سے آیا ہوں جسے تم نے اغوا کیا ہے۔ میری بہن مجھے واپس کر دو۔ میں اپنی بہن کو ایک ہندو کے پاس امانت یا یرغمال کے طور پر نہیں رکھ سکتا۔"

"اور ہندو کی مدد کے بغیر تم ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتے" ــــ نائیک رام چرن نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لہجے میں کہا ــــ "ہم تمھارا ساتھ چھوڑ جائیں تو پاکستان آرمی تمھیں کچل کر رکھ دے۔ ... نے ہمارے ساتھ مِل کر مسلمان لڑکیوں کو بے آبرو کیا ہے۔ اب اپنی بہن کو ہمارے قبضے میں دیکھ کر اتنا پریشان کیوں ہوتے ہو؟ تمھاری بہن کے عوض ہم تمھارے باپ سے دو لاکھ روپیہ اور ریوالور ضرور لیں گے۔"

"اگر اُس نے روپیہ نہ دیا تو؟"

"تو تمھاری بہن ہماری ملکیّت ہو گی" ــــ رام چرن نے کہا۔

شبیر الحسن کے پاس سٹین گن تھی۔ اس نے گن کی نالی رام چرن کی طرف کی اور بولا ــــ "میری بہن کو باہر لاؤ نہیں تو مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

دائیں طرف سے ایک آدمی اتنی تیزی سے اس پر جھپٹا کہ شبیر اُس آدمی کے نیچے زمین پر گر گیا اور اُس کے ہاتھ سے سٹین گن لے لی گئی۔ اوپر والے آدمی نے اسے اُٹھایا۔ رام چرن کا شرابی قہقہہ گونجا۔

"میں اب بھی تمھیں موقع دیتا ہوں کہ اپنی بہن کو واپس لے جانے کی ضد نہ کرو" ــــ رام چرن نے کہا ــــ "تم پنجابیوں اور پٹھانوں سے آزادی چاہتے ہو۔ آزادی کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ وہ قربانیاں ہم دے رہے ہیں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ جو تمھاری خاطر اتنی مدّت سے ان جنگلوں میں جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں، انہیں ایک آدھ رات کے لیے اپنی بہن دے دو؟"

"میں ہندو نہیں جو اپنے مطلب کے لیے اپنی بہنیں دوسروں کے حوالے کر دیا کرتے ہیں" ــــ شبیر الحسن نے کہا ــــ "یہ مت بھولو رام چرن! تم یہاں کرائے کے قاتل بن کر آئے ہو۔"

رام چرن نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ اُس کے ساتھی جو وہاں کھڑے تھے، وہ بھی ہنس پڑے۔

"نہ مجھے تمھاری عزّت کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے نہ میری قوم کو" ــــ رام چرن نے کہا ــــ "ہم پاکستان کو توڑنے آئے ہیں۔ ہم نے حکم کے مطابق یہاں آگ لگا دی ہے۔ اب اس میں تم جلو، تمھارا باپ جلے یا کوئی اور جل مرے ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں.... دیکھو شبیر بھائی! میرے ساتھ دشمنی کی باتیں نہ کرو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھاری بہن کو پاک صاف رکھوں گا لیکن اس شرط پر کہ اپنے باپ سے مجھے دو لاکھ روپیہ لا دو.... چلو ڈیڑھ لاکھ ہی لا دو۔"

"اتنی رقم کو تم کیا کرو گے؟" ــــ شبیر الحسن نے پوچھا ــــ "اپنی حکومت کو یا اپنی فوج کو دو گے؟"

رام چرن نے اپنی حکومت اور اپنی فوج کو ننگی گالیاں دے کر کہا ــــ "کُتّوں کی طرح ہم جنگلوں میں مارے مارے پھریں اور لوگوں کو قتل کرتے پھریں اور پھر چھپ چھپ کر وقت گزاریں اور رقم ہماری حکومت یا ہمارا فوجی ہیڈ کوارٹر لے جائے۔ یہ رقم میری ہو گی۔ میں واپس جاؤں گا تو اپنے گھر لے جاؤں گا۔"

★

"طاہر بھائی!" ــــ شبیر الحسن نے یہ سارا واقعہ سیکنڈ لیفٹیننٹ طاہر پرویز کو سنا کر کہا ــــ "اس ہندو نے مجھے سچا پاکستانی اور پکّا مسلمان بنا دیا ہے۔"

"کیا تم صبیحہ کو لے آئے ہو؟"

"نہیں طاہر بھائی!" ــــ شبیر الحسن نے کہا ــــ "صبیحہ کو واپس لانے کے لیے میں وہاں سے سیدھا تمھارے پاس آ رہا ہوں۔ اُس کافر نے جب رقم دو سے ڈیڑھ لاکھ کر دی اور وعدہ کیا کہ وہ صبیحہ کے ساتھ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کرے گا تو میں نے ارادہ کر لیا کہ کسی اور طریقے سے صبیحہ کو یہاں سے نکالوں گا اور اس شخص کو دھوکے میں رکھوں گا۔ میں نے اُسے یوں دھوکہ دیا کہ اُسے کہا کہ وہ رقم اور کم کر دے۔ میں نے پچاس ہزار کہا۔ دھوکے کو پکّا کرنے کے لیے میں نے ہارے ہوئے لہجے میں بات کی۔ وہ ایک لاکھ پر آ گیا۔ بہرحال اسّی ہزار پر سودا طے ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے دو دن کی مہلت دی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ وہ صبیحہ کو امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھے گا لیکن دو دن گزر جانے کے بعد صبیحہ اُس کی ملکیّت ہو گی۔"

"کیا تم اسے اسّی ہزار روپیہ دو گے؟"

"نہیں طاہر بھائی!" ــــ شبیر الحسن نے کہا ــــ "میں اُسے ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ میں اپنی بہن

کو بھی واپس لاؤں گا اور رام چرن کو قتل بھی کروں گا لیکن مجھے کسی کی مدد کی ضرورت ہے۔ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟"

"فوجی افسر کی حیثیت سے نہیں"۔۔۔ طاہر پرویز نے جواب دیا۔۔۔ "میں چوری چھپے تمھارے ایک دوست کی حیثیت سے مدد کرنے کی کوشش کروں گا لیکن ذرا سوچ کر۔۔۔ تم جیسے تمھارے کتنے دوست ہوں گے۔ کیا اُن کو ساتھ لے جا کر تم رام چرن کی پارٹی پر حملہ نہیں کر سکتے؟"

"کر سکتا ہوں"۔۔۔ شبیر الحسن نے جواب دیا۔۔۔ "لیکن کروں گا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم سب بظاہر آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں لیکن اب اس چوٹ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم سب غدّار ہیں۔ میں اپنے کسی دوست پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ وہ سب غدّار ہیں۔ لُوٹ مار کرتے ہیں، آبرو ریزی کرتے ہیں۔ اگر ہم مخلص ہوتے تو ہم اپنی قوم کی لڑکیوں کو یوں خراب نہ کرتے نہ اپنی قوم کے بچّوں کو قتل کرتے۔ میں ڈھاکہ تک گیا ہُوں۔۔۔۔ طاہر بھائی! جو میں نے دیکھا ہے اور جو میں نے کیا ہے، وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"تم لوگوں نے عورتوں کو مسجدوں میں لے جا کر خراب کیا ہے"۔۔۔ طاہر پرویز نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"ہاں، ایسا ہُوا ہے"۔۔۔ شبیر الحسن نے شرمسار لہجے میں کہا۔۔۔ "لیکن اس طرح مسجدوں اور مسلمان لڑکیوں کی بے حرمتی کرنے والے ہندو تھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی مکتی باہنی کے مسلمان بھی اپنے مذہب کو فراموش کر بیٹھے۔"

"یہ باتیں بعد میں ہوں گی"۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ "تم مجھے یہ سمجھاؤ کہ وہ گاؤں کس طرف اور کتنی دُور ہے جہاں صبیحہ کو لے جایا گیا ہے۔"

شبیر الحسن نے اُسے وہ گاؤں اچھی طرح سمجھا دیا۔ طاہر پرویز نے کچھ دیر سوچ کر اُسے کہا۔۔۔ "سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے پھر ملنا لیکن کمرے میں نہیں۔ کیمپ کے گیٹ سے ذرا باہر میرا انتظار کرنا۔"

★

شبیر الحسن کے جانے کے بعد طاہر پرویز اپنی روزمرہ ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اُس روز اُس کی پلاٹون کا پروگرام ہتھیاروں کی صفائی تھا۔ طاہر پرویز کوتوں کی طرف چلا گیا اور جوانوں کو ہتھیار صاف کرتے دیکھنے لگا لیکن اُس کا دماغ کہیں اور اُلجھا ہُوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ صبیحہ کو کیسے رہا کرا سکتا ہے۔ اُسے کوئی ترکیب نہ سُوجھی تو اس نے سوچا کہ پوری پلاٹون کو ساتھ لے جائے اور اس گاؤں سے صبیحہ کو نکال لائے لیکن اُسے خیال آ گیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ پلاٹون تو حکم مان لے گی لیکن اُس کا اپنا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔

طاہر پرویز کی نظر پلاٹون حوالدار پر پڑی۔ سرگودھا کا رہنے والا حوالدار عجائب خان بریگیڈ کا ایتھلیٹ اور بڑا دلیر آدمی تھا۔ تین چار روز پہلے اُس نے طاہر پرویز سے کہا تھا۔۔۔ "سر! مجھے واپس سنٹر میں بھیج دیں۔ میں دن بدن بے قابو ہوتا جا رہا ہوں۔ معلوم نہیں کس وقت میرا دماغ خراب ہو

تے اور میں مشین گن اٹھا کر باہر نکل جاؤں۔ کسی بنگالی کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

طاہر پرویز نے حوالدار عجائب خان کو اپنے پاس بلایا۔ عجائب خان دوڑا آیا اور اُس نے طاہر پرویز کو سلیوٹ کیا۔

"عجائب خان!"۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ "میں نے جس کام کے لیے تمھیں بلایا ہے اس میں سلیوٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے افسر اور اپنے آپ کو حوالدار نہ سمجھو۔"

"کیوں سر؟"۔۔۔ حوالدار عجائب خان نے پوچھا۔۔۔ "ایسا کون سا کام آ پڑا ہے؟ حکم دیں۔ کام جیسا بھی ہوگا، میں کروں گا اور آپ کو اوکے رپورٹ ملے گی۔"

طاہر پرویز اُسے پرے لے گیا اور اُسے بتایا کہ صبیحہ کون ہے اور اُس کے ساتھ اُس کا کیا تعلق ہے۔ اُس نے عجائب خان کو صبیحہ کے گھر پر مکتی باہنی کے حملے کا پُورا حال سنایا، پھر اُسے بتایا کہ صبیحہ کا بھائی صبیحہ کو وہاں سے نکال لینے کے لیے مدد مانگنے آیا تھا۔

"سر!"۔۔۔ حوالدار عجائب خان نے کہا۔۔۔ "اِسی لیے میں اپنی کمانڈ کو گالیاں دیتا رہتا ہُوں۔ ہماری مائیں، بہنیں اغوا ہو رہی ہیں اور ہم یہاں بیٹھے ہتھیاروں کی نالیاں صاف کر رہے ہیں۔ میں ایک سیکشن کو ساتھ لے جا کر لڑکی کو وہاں سے لا سکتا ہُوں۔"

"یہی تو مشکل ہے عجائب خان!"۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ "ہم کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ میں ایک خطرہ مُول لینا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں مارا جاؤں یا زخمی ہو جاؤں۔ اگر تم میرا ساتھ دو گے تو ہو سکتا ہے تم مارے جاؤ لیکن میں یہ خطرہ مول لینا چاہتا ہوں۔"

"اس لڑکی کو میں نے دیکھا ہُوا ہے سر!"۔۔۔ حوالدار عجائب خان نے کہا۔۔۔ "ہم سیلاب کی ڈیوٹی پر گئے تھے تو وہ آپ کو وہاں ملا کرتی تھی۔ وہ ایک دو دفعہ کیمپ میں بھی آئی تھی۔"

"یہ وہی لڑکی ہے"۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ "لیکن میں اُسے مکتی باہنی سے اس لیے نہیں چھڑوانا چاہتا کہ میرا اُس کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ میں اُسے اپنی قوم کی ایک بیٹی سمجھ کر کافروں کے قبضے سے چھڑانا چاہتا ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ ایک بنگالی جوان جو اسی کا بھائی ہے، سچا پاکستانی بن گیا ہے اور اُس نے مجھ سے مدد مانگی ہے۔"

"سر! آپ حکم دیں"۔۔۔ حوالدار عجائب خان نے کہا۔۔۔ "میں اپنے اعتبار کے کچھ جوان ساتھ لے لوں گا اور سویلین کپڑوں میں انہیں ساتھ لے جاؤں گا۔"

"میرا ارادہ بھی کچھ ایسا ہی ہے"۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ "میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی ایسے جوان ہمیں مل سکتے ہیں جو ہمارا ساتھ دیں لیکن یہ نہ سمجھیں کہ میں انہیں حکم دے رہا ہوں۔"

"سر! میں خوشامد کی بات نہیں کر رہا"۔۔۔ حوالدار عجائب خان نے کہا۔۔۔ "آپ کو شاید معلوم نہیں کہ پلاٹون کے جوان آپ کو کس طرح دل سے چاہتے ہیں اور آپ کو پسند کرتے ہیں۔ آپ حکم دیں یا اشارہ کر دیں۔ پھر آپ دیکھیں کون سا جوان پیچھے رہتا ہے۔ آئیں الگ بیٹھ کر سکیم تیار کر لیتے ہیں۔"

دونوں ذرا پرے چلے گئے۔ طاہر پرویز پر جذبات کا غلبہ بڑا ہی شدید تھا۔ اُس نے حوالدار عجائب خان سے کہا کہ اُسے اگر پانچ سات جوان مل جائیں تو وہ رات کو وہاں باقاعدہ حملہ کرے۔

گا جہاں صبیحہ ہے، لیکن ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ رائفلیں اور سٹین گنیں وغیرہ نہیں لے جاسکتے تھے۔ تمام ہتھیار کوتوں میں بند ہوتے اور چابیاں کوارٹر گارد کے پاس چلی جاتی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ چھُریاں چاقو لے جاسکتے تھے۔

ان کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ وہ فوجی تھے اور وہ شام کے بعد کیمپ سے باہر نہیں جاسکتے تھے۔ وہ کیمپ سے صرف باہر ہی نہیں جا رہے تھے بلکہ وہ تربیت یافتہ کمانڈو پارٹی کے قبضے سے ایک لڑکی کو چھُڑانے جا رہے تھے۔ وہاں لڑائی لڑنی تھی۔ ان میں سے کسی کے مارے جانے یا زخمی ہو جانے کی صورت میں طاہر پرویز کوئی جواز پیش کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوتا۔ کورٹ مارشل سے اُسے فوج سے برطرفی کی سزا ملتی اور برطرفی کے علاوہ سزائے قید بھی مل سکتی تھی۔

"سر! آپ اپنی سوچ لیں" — حوالدار عجائب خان نے کہا — "میرے متعلق مت سوچیں۔ میں مرنے کے لیے تیار رہوں۔ ہم کہیں ڈاکہ ڈالنے نہیں جا رہے۔ میں نے کمانڈو ٹریننگ بھی لی ہوئی ہے۔ ستمبر ۶۵ کی جنگ میں میں اپنی بٹالین کی کمانڈو پلاٹون میں تھا۔ میں اُس وقت لانس نائک تھا۔ میں ٹینک ہنٹنگ پارٹیوں کے ساتھ بھی جاتا رہا ہوں اور رفائٹنگ پٹرولوں کے ساتھ بھی۔ اللہ مجھے ناکام نہیں کرے گا۔"

طاہر پرویز نے انجام سے بے خبر ہو کر حوالدار عجائب خان کو اپنی سکیم بتائی۔ حوالدار عجائب خان نے اُس کی سکیم میں ردّوبدل کیا اور دونوں نے گہری سوچ بچار کے بعد ایک سکیم بنائی۔

"چھ جوان مِل جائیں گے؟" — طاہر پرویز نے پوچھا — "لیکن ایسے جوان ملیں جن پر اعتماد کیا جاسکے۔"

"مِل جائیں گے" — حوالدار عجائب خان نے کہا — "ایسے جوان ملیں گے جو کٹ جائیں گے مگر یہ نہیں بتائیں گے کہ وہ آپ کے ساتھ گئے تھے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ باہر کی خبروں سے ہر ایک جوان کی حالت ایسے گرینیڈ کی سی ہو چکی ہے جس میں سے پن نکلی ہوئی ہو۔ وہ تو اشارے کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ مجھے دن اور وقت بتا دینا۔"

★

دوپہر کے وقت جب طاہر پرویز ڈیوٹی سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آیا تو اُس پر عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اُس کی روح تو وہی ہو لیکن جسم بالکل بدل گیا ہو۔ وہ بڑا بھیانک خطرہ مُول لے رہا تھا۔ وہ دل کی ہر بات میجر اصغر کے ساتھ کیا کرتا تھا لیکن یہ بات ایسی تھی جو اصغر سے چھُپا کر رکھی تھی۔ اگر اصغر کو پتہ چل جاتا کہ طاہر پرویز نے کیا ارادہ کر لیا ہے تو وہ اُس پر پہرے دار بن کر کھڑا ہو جاتا اور اُسے کمرے سے باہر بھی نہ نکلنے دیتا۔ اس معاملے میں طاہر پرویز تنہا تھا۔ کبھی تو اُس کا ذہن بالکل خالی ہو جاتا اور کبھی سوچیں اور خیالات اس کے ذہن پر یلغار کر دیتے۔ ذہن پر قابو پا کر وہ اُس سکیم پر غور کرنے لگتا جو اُس نے اپنے پلاٹون حوالدار کے ساتھ تیار کی تھی۔

اُس پر خوف سا بھی طاری ہوا جو اُس نے جھٹک ڈالا۔ وہ خدا سے ہمکلام ہُوا۔ اُس نے خدا سے کہا کہ وہ ایک مسلمان لڑکی کو کافروں کے قبضے سے چھڑانے جا رہا ہے۔ اُس نے خدا سے مدد مانگی اور کچھ

پڑھا بھی۔ یہی چند ایک آیاتِ قرآنی اُسے یاد تھیں جو اُس نے دو دو تین تین مرتبہ پڑھیں۔ اس سے اُسے کچھ سکون مِلا اور اس نے حوصلے میں تازگی محسوس کی تھی۔

اُس روز وہ اصغر کے کمرے میں نہ گیا۔ سورج غروب ہونے سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے وہ ٹہلتا ٹہلتا کیمپ کے مین گیٹ سے باہر نکل گیا۔ صبیحہ کے بھائی شبیر الحسن کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ طاہر پرویز کو آتا نظر آ گیا۔ طاہر پرویز اُس کی طرف چل پڑا۔ وہ جُھکے جُھکے درختوں کے ایک جُھنڈ کے پیچھے جا رکا تھا تاکہ کوئی اسے شبیر الحسن سے باتیں کرتے ہوتے نہ دیکھ سکے۔

"شبیر بھائی!" — طاہر پرویز نے کہا — "میں نے تم پر بلکہ تمہارے آنسوؤں پر اتنا اعتبار کیا ہے کہ میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تم نے مجھے قتل کروانے کے لیے ایک ڈرامہ کھیلا ہے، ایسا ہو سکتا ہے کہ تم مجھے اپنے ساتھ رات کو لے جاؤ اور مکتی باہنی والے تمہارے ساتھی مجھے پکڑ لیں۔"

"خدا کے لیے ایسا نہ کہو طاہر بھائی!" — شبیر الحسن نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر رندھیائی ہوئی آواز میں کہا — "اگر تم کسی پھندے میں پھنس گئے تو میں اپنی جان دے کر تمہیں اُس پھندے سے نکال لُوں گا۔"

"آج رات ساڑھے دس بجے تم اس جگہ آ جانا" — طاہر پرویز نے کہا — "میرے ساتھ میرے کچھ آدمی ہوں گے، لیکن ہم میں سے کسی کے پاس ریوالور یا رائفل نہیں ہو گی۔ ہمارے یہ ہتھیار رات کوتوں میں بند ہوتے ہیں اور وہاں ایک سنتری کھڑا رہتا ہے۔ ہمارے پاس صرف چاقو ہوں گے۔ کیا تم دو تین سٹین گنیں اور ایک دو ریوالور اپنے ساتھ لا سکتے ہو؟ تمہارے پاس ہتھیاروں کی کمی نہیں ہونی چاہیئے۔"

"جتنے ہتھیار میرے ہاتھ لگے میں لیتا آؤں گا" — شبیر الحسن نے کہا۔

"جاؤ شبیر بھائی" — طاہر پرویز نے کہا — "رات وقت پر پہنچ جانا۔"

★

رات جب طاہر پرویز کی بٹالین کی گنتی ختم ہو گئی تو طاہر پرویز کی پلاٹون کے وہ چھ سپاہی جنہیں حوالدار عجائب خان نے خفیہ طور پر منتخب کیا تھا، الگ الگ ہو کر بٹالین کی حدود سے نکل گئے۔ کیمپ کے اردگرد خاردار تار لگے ہوتے تھے۔ یہ سپاہی ان تاروں میں سے گذر گئے۔ وہ وردی میں نہیں تھے۔ اُن میں سے کسی کے پاس چھوٹا کسی کے پاس بڑا چاقو اور کسی کے پاس خنجر تھا۔ حوالدار عجائب خان بھی سنتریوں کی نظر بچا کر خاردار تار میں سے نکل گیا۔

طاہر پرویز کے لیے یہ مشکل پیدا ہو گئی کہ میجر اصغر اس کے کمرے میں آ گیا اور اُسے اسی طرح نصیحتیں کرنے لگا جس طرح وہ پہلے بھی کر چکا تھا۔ اُسے یہ خدشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ طاہر پرویز کی نوجوانی جذباتیت کے زیرِ اثر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اب طاہر پرویز پر زیادہ نظر رکھنے لگا تھا۔

اصغر اُٹھنے کا نام نہیں لے رہا تھا اور طاہر پرویز بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ آخر طاہر نے جماہیاں لینی شروع کر دیں اور سر درد کا بہانہ کر کے لیٹ گیا۔ یہ بہانہ کامیاب رہا۔ اصغر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ طاہر نے دراز سے چاقو نکالا اور اسے نیفے میں اُڑس کر کمرے سے نکل گیا۔ اُس نے سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ میس کے اُس طرف سے باہر گیا جدھر اندھیرا زیادہ تھا۔ بچتا بچاتا

خاردار تار تک پہنچا اور پیٹ کے بل لیٹ کر تار کے نیچے سے رینگتا ہوا گذر گیا۔ جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں شبیر الحسن کو آنا تھا تو اُس نے دیکھا کہ حوالدار عجائب خان اپنے چھ جوانوں کے ساتھ وہاں کھڑا تھا۔ شبیر الحسن ابھی نہیں آیا تھا۔

"سر!" — حوالدار عجائب خان نے طاہر پرویز سے پوچھا — "آپ نے اس بنگالی پر کس طرح اعتماد کر لیا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ ہم سب کو کسی جگہ مکتی باہنی والوں کے ہاتھوں مروا دے؟"

"عجائب خان!" — طاہر پرویز نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "میں نے اپنے آپ کو اور اپنے اِس نیک ارادے کو خداوند تعالیٰ کے قدموں میں رکھ دیا ہے۔ مجھے صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ ہے۔ ہماری نیّت اور ہمارا ارادہ نیک ہے اس لیے خدا ہماری مدد ضرور کرے گا۔"

"ہم سب خدا کے بھروسے پر ہی آئے ہیں" — حوالدار عجائب خان نے کہا — "میں نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کو کئی جگہوں پر دھوکے میں ایک جگہ اکٹھا کر کے اُن پر مشین گنیں فائر کی تھیں۔"

اتنے میں شبیر الحسن آ گیا۔ اُس کے پاس تین سٹین گنیں اور دو ریوالور تھے۔ ایک ریوالور طاہر پرویز نے لے لیا اور ایک سٹین گن حوالدار عجائب خان کو دے دی۔ باقی دونوں سٹین گنیں دو جوانوں کو دے دی گئیں اور ایک ریوالور شبیر الحسن کے پاس رہا۔ وہ شبیر الحسن کی رہنمائی میں چل پڑے۔ سپاہیوں کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ اُن کے حوصلے بلند ہیں اور وہ خوش ہیں اور اُنہیں اپنا غبار نکالنے کا موقعہ مل رہا ہے۔ وہ کیمپ سے دُور نکل گئے۔ طاہر پرویز نے شبیر الحسن کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ سکیم کیا ہے۔ وہ شبیر الحسن سے یہ بھی پُوچھتا رہا کہ جھونپڑے کس قسم کے ہیں اور وہاں کتنے کچھ لوگ ہوں گے۔ طاہر پرویز کو بہر حال یہ احساس تھا کہ وہ موت کے مشن پر جا رہا ہے۔

★

اُنہوں نے قریباً آدھا فاصلہ طے کر لیا تھا اور اب وہ گھنے جنگل میں جا رہے تھے جہاں جھاڑیاں، بانس کے درخت اور چھوٹے چھوٹے کئی قسم کے درخت تھے جو راستہ روکتے تھے۔

وہ کچھ اور آگے گئے تو اُس وقت طاہر پرویز اور شبیر الحسن اکٹھے آگے آگے چل رہے تھے۔ اُنہیں تیس چالیس گز دُور تین انسان اس طرح نظر آئے اور وہیں کہیں غائب ہو گئے جیسے وہ انسان نہیں انسانوں کے سائے ہوں۔ ایک دو سیکنڈ بعد اُنہیں قدموں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ مدھم سی چاندنی میں وہ ایک بار پھر نظر آئے اور جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔ اب کے طاہر پرویز نے دیکھا کہ وہ تین انسان تھے۔ اُس نے فوجی انداز سے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ گھیرا ڈالنے کی ترتیب میں آگے بڑھیں۔ جن کے پاس سٹین گنیں تھیں، وہ گنیں آگے کر کے دائیں بائیں ہو کر آگے بڑھنے لگے۔

"شبیر بھائی!" — طاہر پرویز نے سرگوشی میں کہا — "یہ جو کوئی بھی ہیں بنگالی ہوں گے۔ تم اُنہیں للکارو کہ یہ ہمارے سامنے آ جائیں۔"

شبیر الحسن نے بنگالی زبان میں للکار کر کہا کہ سامنے آ جاؤ ورنہ ہم گولی چلا دیں گے۔ اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا۔ ذرا دیر بعد جھاڑیاں زور زور سے ہلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ طاہر پرویز فوجی افسر تھا۔ اُس

نے فوجی انداز سے اس جگہ کو گھیرے میں لے لیا اور جوانوں سے کہا کہ وہ گھیرا تنگ کرتے جائیں۔

اُدھر سے کسی نے بنگالی زبان میں کچھ کہا۔ شبیر الحسن نے طاہر پرویز کو بتایا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم دیہات کے غریب کسان ہیں اور ہمارے ساتھ ہماری بہن ہے۔

"پھر تم ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے" — شبیر الحسن نے بنگالی زبان میں کہا — "اگر اب بھی باہر نہ آئے تو ہر طرف سے تم پر گولیاں فائر ہوں گی۔"

جھاڑیوں میں سے تین سر اُبھرے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ جب وہ قریب آئے تو مدھم سی چاندنی میں چہرے آسانی سے پہچانے جا سکتے تھے۔ وہ دو آدمی تھے اور اُن کے درمیان ایک عورت تھی۔ لباس سے وہ عورت غریب اور دیہاتی نہیں لگتی تھی۔

"یہ تم ہو میرے بے غیرت بھائی!" — عورت نے شبیر الحسن سے کہا اور لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ اُسے گریبان سے زور زور سے جھنجھوڑتے ہوئے کہنے لگی — "یہ میری بہادری ہے کہ میں صاف بچ کر نکل آئی ہوں۔"

"صبیحہ؟" — طاہر پرویز نے حیرت سے کانپتی آواز میں پوچھا — "صبیحہ تم یہاں .... یہ دونوں آدمی مکتی باہنی کے تو معلوم نہیں ہوتے۔ میں تمہیں رہا کرانے آیا تھا۔ اب اپنے اس بھائی کو بُرا بھلا مت کہو، یہ سیدھے راستے پر آ گیا ہے۔ یہ میرے پاس یہ درخواست لے کر آیا تھا کہ میں تمہاری رہائی میں اِس کی مدد کروں۔"

جذبات کے جوش میں صبیحہ طاہر پرویز کے ساتھ لپٹ گئی — اللہ کی مدد پہنچ گئی تھی۔

طاہر پرویز نے جذباتی کیفیت سے بیدار ہوتے ہوئے کہا کہ یہاں رُکے رہنا ٹھیک نہیں۔

"یہ لڑکی ہمارے پاس خدا کی امانت تھی" — اُن دو آدمیوں میں سے جو صبیحہ کو ساتھ لائے تھے، ایک نے بنگالی زبان میں کہا — "کل رات یہ لڑکی ہمارے جھونپڑوں میں آ گئی اور کہنے لگی کہ مکتی باہنی والے اسے اغوا کر کے لے آئے تھے اور وہ بھاگ آئی ہے۔ ہم نے اسے اپنے پاس چھپا لیا۔ رات اپنے پاس رکھا۔ ڈر تھا کہ باہر نکلے تو مکتی باہنی والے پکڑ لیں گے۔ دن کے وقت اسے گھر تک پہنچانا بھی خطرناک تھا۔ آج رات ہم اسے لے کر چل پڑے۔ آپ لوگوں کو دیکھا تو ہم نے اس ڈر سے چھپنے کی کوشش کی کہ آپ مکتی باہنی کے آدمی ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم نے امانت ٹھیک جگہ پہنچا دی ہے تو ہمیں جانے دیں۔"

"تم دونوں چلے جاؤ" — صبیحہ نے اُنہیں کہا اور شبیر الحسن کی طرف اشارہ کر کے بولی کہ یہ میرا سگا بھائی ہے۔

"ہم غریب لوگ ہیں" — دوسرے بنگالی نے کہا — "اور ہم پاکستانی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی پاکستانی کو پناہ دینے کی سزا مکتی باہنی کیا دیتی ہے لیکن ہم پاکستان اور پاکستان کی بیٹیوں کی عزت پر جان دینے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔"

وہ دونوں چلے گئے اور طاہر پرویز اپنے آدمیوں کو، صبیحہ اور شبیر الحسن کو ساتھ لے کر واپس چل پڑا۔ صبیحہ نے اُنہیں بتایا کہ مکتی باہنی کے آدمیوں نے اُس کے گھر حملہ کیا اور تین آدمی اُسے اُٹھا کر

لے آتے تھے۔ انہوں نے اُسے ایک جھونپڑے میں رکھا۔ اُن میں سے ایک نے صبیحہ سے کہا کہ وہ اُس کے باپ سے دو لاکھ روپیہ مانگے گا۔ اگر دو دِنوں میں رقم مل گئی تو اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالے بغیر اُسے اُس کے باپ کے حوالے کر دیا جاتے گا۔ اگر رقم نہ ملی تو اُس کے ساتھ اس جھونپڑے میں وہی سلوک ہوگا جو یہاں لائی جانے والی ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے۔

"میں نے رونا اور چلّانا بند کر دیا" — صبیحہ نے بتایا — "میں نے اُن لوگوں سے کہا کہ میں دو کی بجاتے اڑھائی لاکھ روپیہ دلا دوں گی، شرط یہ ہے کہ میں جتنے دن یہاں رہوں میری عزت محفوظ رہے۔ اگر میرے باپ نے رقم نہیں دی تو میں اپنے آپ کو تمہاری ملکیّت میں دے دوں گی .... وہ سب شراب پینے لگے۔ ان میں سے ایک میری طرف لپکا اور اُس نے میرا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا لیکن اُن میں سے ایک اور نے جو شاید اُن کا لیڈر تھا، اُسے دھکّا دے کر پرے کر دیا اور بولا — 'بے صبر مت بنو۔ یہ اپنا مال ہے' — پھر وہ شراب میں ڈوبتے چلے گئے۔ وہاں دو اور لڑکیاں بھی تھیں جنہیں معلوم نہیں وہ کہاں سے اُٹھا لائے تھے۔ ان کے ساتھ وہ بے ہودہ حرکتیں کرتے رہے۔ لیڈر کے کہنے پر ایک آدمی نے مجھے اس جھونپڑے کے دوسرے کمرے میں لے جا کر میرے پاؤں رسّی سے باندھ دیے۔ وہ شراب میں اِس قدر دُھت تھا کہ اُس نے یہ نہ سوچا کہ ہاتھ باندھنے بھی ضروری ہیں ....

"کچھ دیر بعد یہ لوگ پاگلوں کی طرح شور شرابہ کرتے رہے اور پھر اُن کی آوازیں دبنے لگیں۔ جب وہ بالکل خاموش ہو گئے تو میں سرک سرک کر دروازے تک آئی اور دیکھا۔ وہ سب بیہوش ہو گئے یا نشے کی گہری نیند سو گئے تھے۔ میں نے ہاتھوں سے وہ رسّی کھول لی جس سے اُنہوں نے میرے پاؤں باندھے تھے۔ اُن کے کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ میں اُٹھی اور دبے پاؤں کمرے میں سے نکل آئی ....

"مجھے راستے کا علم نہیں تھا۔ میں خدا کو پکارتی رہی اور اندھا دُھند سمت کا خیال رکھے بغیر چلی گئی۔ مجھے اپنے قریب پانچ چھ جھونپڑے نظر آتے۔ میں اُن کے قریب جاتے بھی ڈرتی تھی۔ مجھے شک تھا کہ یہاں مکتی باہنی کے آدمی ہوں گے لیکن میرے اندر سے ایک آواز اُٹھی کہ اِن جھونپڑوں میں چلی جاؤ۔ معلوم نہیں یہ میرا خوف تھا یا خدائی مدد تھی کہ میرے قدم اِن جھونپڑوں کی طرف اٹھتے گئے اور میں نے ایک جھونپڑے کی دیوار پر زور زور سے ہاتھ مارے ....

"اندر سے ایک آدمی نکلا۔ اُس کے پیچھے دو عورتیں نکل آئیں۔ میں نے روتے ہوتے انہیں بتایا کہ میں ان کے گھر تک کس طرح پہنچی ہُوں۔ اس آدمی نے کچھ کہے بغیر میرا بازو پکڑا اور مجھے اندر لے گیا۔ اُس کی خاموشی نے مجھے بہت ڈرایا لیکن مجھے جلدی ہی احساس ہو گیا تھا کہ میں صحیح ٹھکانے پر پہنچ گئی ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے جھونپڑے میں چھپاتے رکھا اور اب یہ مجھے واپس لا رہے تھے"

طاہر پرویز نے صبیحہ کو بتایا کہ اس کے بھائی شبیر الحسن میں کیا انقلاب آیا ہے۔ یہ سن کر صبیحہ نے شبیر الحسن کی طرف دیکھا شبیر الحسن پہلے تو اُس کے پاؤں میں بیٹھا اور اس کے پاؤں چھوتے۔ پھر اُس کے گلے لگ کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

مشرقی پاکستان کی وہ رات بڑی ہولناک تھی۔

رام رام کرنے والے ہندو نے بغل سے چھُری نکال کر بنگال کے کچھ مسلمانوں کو رام کر لیا اور چھُری اُن کے ہاتھوں میں دے دی تھی۔

مسلمان مسلمان کی انتڑیاں اور آنکھیں نکال رہا تھا۔

مشرقی پاکستان پر تو کبھی ختم نہ ہونے والی رات چھا گئی تھی۔ یہ بانجھ رات تھی۔ اس کی کوکھ سحر کو جنم دینے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ہندو کے کالے جادو نے اس رات کو کیل دیا تھا۔ یہ رات اُن مسلمانوں کا خون پی چکی تھی جو بنگالی نہیں تھے، اور اُن بنگالیوں کا بھی جو خون میں ڈوبے ہوتے اس خطے کو پاکستان کہتے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ ان غیر بنگالی اور بنگالی پاکستانیوں کی لاشیں اُن کے جلے ہُوتے، لُٹے پِٹے گھروں میں، گلیوں میں، میدانوں میں اور سڑکوں پر پڑی گل سڑ رہی تھیں۔ اُن کی تعداد لاکھوں میں تھی۔

وہ رات اُن راتوں میں سے ایک تھی جب کسی کے گھر میں ہلّہ بول دینا، لوٹ لینا اور ایک دو کو نہیں پورے خاندان کو قتل کر دینا جرم نہیں رہا تھا۔ اگر یہ جرم تھا تو اس کے مجرموں کو پکڑنے کے لیے قانون نہیں تھا۔ قانون تھا تو قانون کے محافظ نہیں تھے۔ وہ خود لوٹ مار اور قتل و غارت میں مصروف تھے۔

اُس رات صبیحہ کا بھائی مشرقی پاکستان کے جنگل میں اُس کے گلے لگ کر رو رہا تھا۔ بھائی کی غیرت جاگ اُٹھی تھی۔ ہندو نے ڈنک مار کر اُسے یاد دلا دیا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان اپنی غیرت پر مرمٹتا ہے۔ شبیر الحسن نے صبیحہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس کی سسکیوں نے اُس کے دل کی بات کہہ دی۔

"شبیر بھائی!" — صبیحہ نے اُس کے بازوؤں سے نکل کر اس کا منہ چُوما اور بولی — "میں تمہاری چھوٹی بہن ہوں۔ تم نے میرے پاؤں چھُو کر مجھے گناہگار کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جو بات تمہیں اپنا باپ بھی نہیں سمجھا سکا، وہ تمہیں تمہارے دوستوں نے سمجھا دی ہے۔ میں تمہیں صرف یہ یاد دلاتی ہوں کہ خدا ہمارا سچا ہے۔ میں نے ان کافروں کے قبضے میں آکر خُدا کو مدد کے لیے پُکارا تھا۔ دیکھ لو۔ خدا نے مجھے کس طرح نکالا ہے"

شبیر الحسن چپ چاپ کھڑا صبیحہ کی بات سُن رہا تھا۔ طاہر پرویز، حوالدار عجائب خان اور ان کے چھ جوان بھی چُپ چاپ تھے۔ انہیں جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ موت کے مُنہ میں کھڑے ہیں۔ طاہر پرویز کی اگر جان نہ جاتی تو اس کی نوکری جا سکتی تھی۔ وہ فوجی قوانین اور ضوابط کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ اُس کا کام ہو گیا تھا۔ وہ صبیحہ کو مکتی باہنی سے چھڑانے آیا تھا صبیحہ اُسے مِل گئی تھی۔ اس کے لیے اُسے لڑنا نہیں پڑا تھا۔ خدا نے اُسے بچا لیا تھا۔ اگر اس کا کوئی جوان مارا جاتا یا شدید

زخمی ہوجاتا تو اسے اپنے بٹالین کمانڈر سے چھپائے رکھنا ناممکن ہوتا، پھر طاہر پرویز کا کورٹ مارشل ہوجاتا۔

انہیں اب واپس آجانا چاہیئے تھا لیکن شبیر الحسن جو خاموشی سے صبیحہ کی بات سن رہا تھا یوں کانپا جیسے اُس نے خود اپنے جسم کو جھنجھوڑا ہو۔

"میں اپنی بے عزّتی کا انتقام لوں گا" — شبیر الحسن نے کہا اور اُس طرف دوڑ پڑا جدھر نائک رام چرن کی پارٹی نے جھونپڑوں میں اپنا اڈہ بنا رکھا تھا۔

طاہر پرویز نے پکارا — "رُک جاؤ شبیر! اکیلے نہ جانا.... مارے جاؤ گے" — اور وہ شبیر الحسن کے پیچھے دوڑ پڑا۔

حوالدار عجائب خان اور اُس کے جوان بھی اپنے سیکنڈ لیفٹیننٹ کے پیچھے دوڑے گئے۔ صبیحہ کو اُنہوں نے اپنے ساتھ رکھا۔

✪

شبیر الحسن نے عقل مندی کی کہ رُک گیا لیکن وہ انتقام لیے بغیر واپس آنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ صبیحہ نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر کہا کہ وہ آگے نہ جائے ورنہ بہت خون خرابہ ہوگا۔ طاہر پرویز نے اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"تم چلے جاؤ طاہر!" — شبیر الحسن نے طنزیہ لہجے میں کہا — "اپنے ان بہادر فوجیوں کو ساتھ لے جاؤ۔ تمہیں اپنی نوکری خطرے میں نظر آرہی ہے۔ تمہیں میری عزّت اور آبرو کی کیا پرواہ ہے۔"

طاہر پرویز کے نوجوان جسم میں خون جوش میں آگیا۔

"میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا شبیر!" — طاہر پرویز نے کہا — "تم نے مجھے چیلنج کیا ہے۔ میں تمہیں دکھا دوں گا کہ تمہاری عزّت اور آبرو کو میں اپنی عزت سمجھتا ہوں یا نہیں لیکن اندھا دُھند آگے نہ جاؤ۔ میں فوجی ہوں، فوجیوں کی طرح آگے جاؤں گا.... تم نے میرے کمرے میں مجھے بتایا تھا کہ جھونپڑوں کے باہر ایک آدمی پہرے پر ہوتا ہے۔"

"ہر رات ہوتا ہے" — شبیر الحسن نے کہا — "دو دو گھنٹے کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔"

"پہلے اس آدمی کو ختم کرنا ہوگا" — طاہر پرویز نے کہا — "اگر تم نے اس پر گولی چلائی تو ساری پارٹی باہر آجائے گی۔ ہم ایسا طریقہ اختیار کریں گے کہ اندر جو آدمی ہیں اُن پر اچانک جا پڑیں اور انہیں مقابلے کی مہلت نہ دیں۔"

طاہر پرویز نے اُس سے پوچھا کہ جھونپڑے کیسے ہیں اور ان کے دروازے کدھر ہیں۔ شبیر الحسن نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ جھونپڑے کیسے ہیں۔ طاہر پرویز نے سب کو بتایا کہ ان جھونپڑوں کو کس طرح گھیرے میں لینا ہے اور حملہ کس طرح کرنا ہے۔

وہ چل پڑے۔ صبیحہ ان کے ساتھ تھی۔ طاہر پرویز کے کہنے پر وہ مکمل خاموشی سے چلے جارہے تھے۔ وہاں جنگل گھنا تھا۔ اُنہوں نے ایک میل سے کچھ زیادہ فاصلہ نصف

گھنٹے سے زیادہ وقت میں طے کیا۔ چاندنی پھیکی پھیکی سی تھی۔

شبیر الحسن رُک گیا۔ درختوں میں سے جھونپڑے نظر آرہے تھے۔ شبیر الحسن نے بتایا کہ پہرہ دار یہیں کہیں ہوگا۔

"تم اکیلے آگے جاؤ" — طاہر پرویز نے شبیر الحسن سے کہا — "پہرہ دار تمہیں جانتا ہوگا۔ تم ان کی پارٹی کے آدمی ہو۔ اسے باتوں باتوں میں اس طرف لے آنا۔"

"یہ کوئی مشکل نہیں" — شبیر الحسن نے کہا اور آگے چلا گیا۔

✪

چند منٹوں میں شبیر الحسن پہرہ دار کے ساتھ واپس آرہا تھا۔ پہرہ دار ہندو تھا۔ وہ بنگالی زبان میں باتیں کرتے آرہے تھے۔ طاہر پرویز اور حوالدار عجائب خان موزوں آڑ میں چلے گئے۔ ان کے چھ جوان ایک جگہ بیٹھ گئے۔

طاہر پرویز کے ہاتھ میں ریوالور تھا جو اُسے شبیر الحسن نے دیا تھا۔ اُس نے ریوالور بائیں ہاتھ میں لے لیا اور دبے پاؤں پہرہ دار کی طرف بڑھا۔ پہرہ دار شبیر الحسن کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ طاہر پرویز کی طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ طاہر پرویز قریب آکر چیتے کی طرح جھپٹا اور پیچھے سے پہرہ دار کی گردن اپنے بائیں بازو کے شکنجے میں جکڑ لی۔

"گن پھینک دو" — طاہر پرویز نے کہا — "ورنہ گولی مار دوں گا۔"

شبیر الحسن نے بڑی زور سے پہرہ دار کے پیٹ میں گھونسہ مارا۔ طاہر پرویز نے اُسے روک دیا اور پہرہ دار کو گھسیٹتا ہوا جھاڑیوں کی اوٹ میں لے آیا۔ پہرہ دار کے پاس ٹامی گن (سب مشین گن) تھی جو اُس نے پھینک دی تھی۔ اوٹ میں لا کر طاہر پرویز نے اُس کی گردن سے اپنا بازو ہٹا لیا اور اُس سے پوچھا کہ جھونپڑے کے اندر کتنے آدمی ہیں، وہ کیا کر رہے ہیں اور دوسرے جھونپڑوں میں کیا ہے؟

ہندو پہرہ دار نے نظریں گھما کر سب کو باری باری دیکھا۔ اسے اپنا انجام نظر آرہا تھا۔ طاہر پرویز نے اُس کے ساتھ اُردو میں بات کی اس لیے ہندو نے اُردو میں ہی جواب دیا۔ اپنے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ مشرقی پاکستان کا شہری ہے اور ایک مسلمان ٹھیکیدار کے پاس ملازم تھا۔ اُس نے لُوٹ مار شروع کر دی اور اس پارٹی کے ساتھ ہو گیا۔

"نائک رام چرن کہاں ہے؟" — شبیر الحسن نے پوچھا۔

"اُسی جھونپڑے میں ہے" — اُس نے جواب دیا۔

صبیحہ کو ایک جوان کے ساتھ پیچھے رہنے دیا گیا تھا۔

"میری بہن کہاں ہے؟" — شبیر الحسن نے پوچھا۔

"وہ تو بھاگ گئی تھی" — پہرہ دار نے منّت سماجت کے لہجے میں کہا — "میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ مجھے چھوڑ دو.... تمہاری بہن بھاگ گئی تھی۔ تمہارا دست بدر ہمارے ساتھ تھا۔ صبح دیکھا، صبیحہ غائب تھی۔ رام چرن نہیں مانتا تھا کہ وہ خود ہی رسیاں کھول کر بھاگ گئی ہے۔

ہمارے ساتھ دو ہی مسلمان تھے۔ شفیع الاسلام تمہارے گھر میں مارا گیا اور بدر ہمارے ساتھ رہ گیا تھا۔ رام چرن کہتا ہے کہ تمہاری بہن کو بدر نے بھگایا ہے۔ بدر نہیں مانتا۔ وہ قسمیں کھاتا ہے کہ اُس نے تمہاری بہن کو نہیں بھگایا....

"آج سارا دن بدر کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اندر پیٹ کے بل لٹا دیا گیا تھا۔ شام تک وہ اسی حالت میں پڑا رہا۔ اب اُسے دیوار کے ساتھ کھڑا کیا ہُوا ہے اور سب اُسے کہہ رہے ہیں کہ وہ سچ بولے لیکن وہ نہیں مانتا۔ اس کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے بندھے ہُوئے ہیں اور سب باری باری اُس کے جسم کے ساتھ جلتا ہُوا سگریٹ لگاتے ہیں۔ وہ چپ چاپ کھڑا ہے۔ اُس کے منہ سے 'سی' بھی نہیں نکلتی.... باقی جھونپڑے خالی ہیں سب اسی جھونپڑے میں ہیں۔"

"اندر کتنے آدمی ہیں؟"

"گیارہ"۔۔۔۔ ہندو بہرہ دار نے جواب دیا ۔۔۔ "تین مہمان ہیں۔ وہ سوامی نگر کی پارٹی کے آدمی ہیں۔ صبح چلے جائیں گے.... مجھے زندہ رہنے دو۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہُوں کہ رام چرن نے کہا ہے کہ شبیر الحسن کے گھر پر کل رات پھر حملہ کریں گے اور اب خاموشی سے دیوار پھلانگ کر اندر جائیں گے صبیحہ کو اُٹھا لائیں گے اور گھر کو لُوٹ کر آگ لگا دیں گے۔"

اُس سے اپنے مطلب کی ہر ایک بات معلوم کر لی گئی۔ وہ سب بیٹھے ہُوئے تھے۔ طاہر پرویز نے جھپٹا مارنے کے انداز سے ہندو پہرہ دار کی گردن اپنے ہاتھوں میں جکڑ لی اور دونوں انگوٹھے اُس کی شہ رگ کے دائیں اور بائیں رکھ کر دبا دیئے۔

"گولی نہ چلانا"۔۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ "اسے خاموشی سے ختم کرنا ہے۔"

بہرے دار پیٹھ کے بل ہو گیا اور تڑپنے لگا۔ طاہر پرویز نے اپنا گھٹنا اُس کے پیٹ پر رکھ کر جسم کا بوجھ ڈالا اور شہ رگ کو دبائے رکھا۔ غصّے سے طاہر پرویز کے دانت پسنے لگے اور اُس کے ہاتھ لوہے کا شکنجہ بن گئے۔ اُس پر دورے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ یوں اپنے ہاتھ دبائے چلا جا رہا تھا جیسے بھارت کی گردن اُس کے ہاتھ میں آگئی ہو اور وہ سن سنتالیس کے قتلِ عام اور اب مشرقی پاکستان کے خون اور آبرو ریزی کا انتقام لے رہا ہو۔ ہندو پہرہ دار تڑپ تڑپ کر مر چکا تھا پھر بھی طاہر پرویز نے اس کی گردن نہ چھوڑی۔

"کافر مر گیا ہے سر!"۔۔۔۔ حوالدار عجائب خان نے کہا۔

"مر گیا ہے"۔۔۔۔ شبیر الحسن نے کہا۔۔۔ "مر گیا ہے.... اب اُدھر چلو۔"

"سانپ اتنی جلدی نہیں مرا کرتا"۔۔۔۔ طاہر پرویز نے دانت پیس کر کہا اور ہندو کی گردن چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے ہندو کی لاش کے پہلو میں بڑی زور سے ٹھڈا مارا اور بولا۔۔۔ "اب سنو ہمیں کیا کرنا ہے"۔۔۔۔ اور وہ انہیں فوجی افسروں کی طرح ہدایات دینے لگا۔

✪

صبیحہ کو حوالدار عجائب خان کے ایک سپاہی کے ساتھ پیچھے رہنے دیا گیا۔ اس جوان کو مرے ہُوئے بہرہ دار کی ٹامی گن دے دی گئی تھی۔

شبیر الحسن سٹین گن ہاتھ میں لیے جھونپڑے کے دروازے میں جا کھڑا ہُوا اور نعرہ لگایا۔۔۔ "جے بانگلہ دیش۔"

سب نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے سٹین گن آگے کو رکھنے کی بجائے ہاتھ میں لٹکا رکھی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لڑنے نہیں آیا۔ اُس نے ایک نظر میں کمرے کا جائزہ لے لیا۔ کمرے میں شراب کا تعفّن تھا۔ دو لالٹینیں جل رہی تھیں۔ اُس کا دوست بدر ایک دیوار کے ساتھ بالکل برہنہ کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے ہُوئے تھے۔ دو لالٹینوں کی روشنی میں بدر کے جسم پر جلتے ہوئے سگریٹوں کے کئی نشان اور اُس کے چہرے پر کربناک تاثر صاف نظر آ رہا تھا۔

رام چرن اور اُس کا ایک ساتھی بدر کے پاس کھڑے تھے۔ باقی سب بیٹھے ہُوئے شراب پی رہے تھے۔ ہندو گوشت نہیں کھاتے لیکن اُن کے درمیان چار پانچ پلیٹوں میں بُھنا ہُوا گوشت پڑا تھا۔ اُن کے ہتھیار ایک کونے میں رکھے تھے۔ شبیر الحسن کا نعرہ سُن کر سب پر خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر سب نے رام چرن کی طرف دیکھا۔ وہ سب کا لیڈر تھا۔ وہ شبیر الحسن کی طرف دیکھنے لگا۔

"رام چرن!"۔۔۔۔ شبیر الحسن نے کہا۔۔۔ "رقم لے آیا ہُوں، میری بہن میرے حوالے کر دو۔"

"لاؤ، پہلے رقم میرے حوالے کرو"۔۔۔۔ رام چرن نے کہا۔

بدر نے چلّا کر کہا۔۔۔ "مت رقم دینا اسے شبیر! تمہاری بہن...."

رام چرن نے بڑی زور سے بدر کے منہ پر گھونسہ مارا اور اُسے چُپ کرا دیا۔ شبیر الحسن نے دیکھا کہ بدر کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون بہنے لگا تھا۔ شبیر الحسن نے بجلی کی تیزی سے سٹین گن اپنی ہپ کے ساتھ لگا لی۔ میگزین گن کے ساتھ لگی ہُوئی تھی۔ اس نے بیٹھے ہُوئے آدمیوں پر دو لمبے برسٹ اس طرح فائر کیے کہ گن کو دائیں بائیں کرتا رہا جیسے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ کسی کو اُٹھنے کی مہلت نہ ملی۔

رام چرن اور اُس کا ساتھی بدر کے قریب کھڑے تھے۔ ان پر شبیر الحسن نے اس لیے فائر نہ کیا کہ بدر کے مارے جانے کا خطرہ تھا۔ وہ دونوں بدر سے ہٹ کر ہتھیاروں کی طرف دوڑے۔ شبیر الحسن نے سٹین گن اُدھر کر کے ٹریگر دبایا لیکن گن خاموش رہی۔ میگزین خالی ہو چکی تھی۔ رام چرن اور اُس کے ساتھی نے اپنی گنیں ہپ کے ساتھ لگا لی تھیں۔

لمبا برسٹ فائر ہُوا لیکن یہ نہ رام چرن کی سٹین گن کا تھا نہ اُس کے ساتھی کی گن کا۔ ان دونوں کے ہاتھوں سے سٹین گنیں گر پڑیں پھر وہ دونوں گرے اور بغیر تڑپے مر گئے۔ یہ برسٹ طاہر پرویز نے فائر کیا تھا جو پلان کے مطابق دوسرے کمرے کے پچھلے دروازے سے اندر آ گیا تھا اور دونوں کمروں کے درمیانی دروازے میں آن کھڑا ہُوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی حوالدار عجائب خان اور اُس کے جوان دوڑتے اندر آئے۔ اندر اب رام چرن کی پارٹی کا صرف ایک آدمی زندہ تھا اور وہ بدر تھا۔

دوسرے کمرے میں تین مسلمان بنگالی لڑکیاں تھیں جو پہلے سوتی ہوئی تھیں شبیر الحسن کے فائر پر وہ جاگ اٹھی تھیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ وہ مسلمان ہیں اور یہ ہندو انہیں ان کے گاؤں سے پکڑ

لاتے تھے۔ اُنہوں نے انہیں کہا تھا کہ صبح انہیں واپس بھیج دیں گے۔

انہیں باہر لے آتے۔ شبیر الحسن ایک لالٹین لے کر دوسرے کمرے میں گیا۔ وہاں سے نکل کر وہ ایک اور جھونپڑے میں چلا گیا۔ اُس میں اس پارٹی کا سامان اور باورچی خانہ تھا۔ وہاں سے شبیر الحسن مٹی کے تیل کا فوجی کین اٹھا لایا۔ واپس آیا تو طاہر پرویز بدر کو کھول کر باہر لے آیا تھا۔

اندر گئے اور لاشوں کو اکٹھا کر کے ان پر تیل چھڑکا۔ کچھ تیل جھونپڑے کی دیواروں پر چھڑک دیا۔ ایک لاش کے کپڑوں کو شبیر الحسن نے آگ لگا دی۔

سب باہر آ گئے۔ بانسوں کے چبوترے پر کھڑا بانسوں کا جھونپڑا جس پر گھاس پھونس اور سرکنڈوں کی چھت تھی، دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ شعلے اُوپر ہی اُوپر اُٹھنے لگے۔ طاہر پرویز کی پارٹی شبیر الحسن، صبیحہ اور بدر کو ساتھ لے کر چل پڑی۔ جھونپڑا بہت بڑا تھا۔ اس کے شعلے میلوں دور سے دکھائی دیتے ہوں گے لیکن کسی کو یہ شعلے عجیب نہیں لگے ہوں گے ـــــ پورا مشرقی پاکستان جل رہا تھا۔

✪

"بدر بھائی!ـــ واپس آتے ہوئے طاہر پرویز نے اُس سے پوچھا ـــ "کچھ سمجھے ہو؟"

"سمجھ گیا ہے" ـــ بدر کی بجائے شبیر الحسن نے جواب دیا ـــ "پہلے میں بھی کچھ نہیں سمجھا تھا لیکن ہندو نے خود ہی سمجھا دیا ہے۔"

صبیحہ چلتے چلتے طاہر پرویز کے قریب ہو گئی اور دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے میں اُلجھ گئے۔ دو تین بار صبیحہ کا پاؤں کسی جھاڑی یا کسی درخت کی اُبھری ہوئی جڑ سے اُلجھا اور اُس نے طاہر پرویز کا سہارا لے لیا۔ طاہر پرویز نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ صبیحہ نے ہر بار کچھ دیر اور اُس کے بازوؤں میں ہی رہنے کی کوشش کی۔

یہ پارٹی کیمپ کے قریب پہنچ گئی۔ وہاں سے انہیں جُدا ہونا تھا۔ اُنہوں نے پیچھے دیکھا۔ دور اُفق پر سرخی نظر آ رہی تھی۔ یہ انہی کی لگائی ہوئی آگ کی سرخی تھی۔ طاہر پرویز نے دل ہی دل میں خُدا کا شکر ادا کیا کہ وہ جس مشن پر گیا تھا وہ پورا ہو گیا ہے اور وہ اپنے حوالدار اور جوانوں کے ساتھ خیریت سے واپس آ گیا ہے۔ اُس نے شبیر الحسن سے کہا کہ وہ اُس کے گھر تک اُن کے ساتھ جائے گا۔

"نہیں طاہری!ـــ صبیحہ نے پیار سے لبریز لہجے میں کہا ـــ "اپنے آپ کو اتنے بڑے امتحان میں نہ ڈالو۔ تمہاری جان بچ گئی ہے تو اپنی نوکری کو خطرے میں نہ ڈالو۔"

"ہاں طاہر بھائی!ـــ بدر نے کہا ـــ "ہمارے دشمن جل کر راکھ ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس ہتھیار ہیں، ایمونیشن ہے۔ تم لوگ جاؤ۔ ملیں گے بھائیو! ملاقات ہو گی" ـــ اور وہ چلے گئے۔ اُن تین بنگالی لڑکیوں کو بھی وہ ساتھ لے گئے جو مکتی باہنی کے اڈے سے برآمد ہوئی تھیں۔ کہتے تھے کہ انہیں ان کے گھروں تک پہنچا دیں گے۔

کیمپ میں داخل ہونے کے لیے سنتریوں کی نظروں سے بچنا ضروری تھا۔ سب بکھر گئے اور جس طرح کسی کو موقع مِلا، تاروں کے نیچے سے کیمپ میں چلے گئے۔

صبح طاہر پرویز جلدی تیار ہو کر میجر اصغر کے کمرے میں گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اصغر کو پتہ تو نہیں چلا کہ وہ رات اپنے کمرے سے غیر حاضر رہا ہے.... اصغر بے خبر تھا۔

اُس روز بٹالین کمانڈر کرنل ارشاد نے بٹالین کے تمام افسروں کو اپنے دفتر میں بلایا۔ اس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ افسر کچھ حیران ہوتے کہ آج سی۔ او صاحب نے میٹنگ کیوں بلا لی ہے۔ اُس روز کمپنیوں کا پروگرام معمول کے مطابق کچھ اور تھا۔

"اسے باقاعدہ میٹنگ یا کانفرنس نہ سمجھنا" ـــ بٹالین کمانڈر نے کہا ـــ "اِس ملک میں کوئی اُمید افزا تبدیلی نہیں آئی، نہ ہی ہمارے لیے کوئی نیا حکم آیا ہے۔ اگر کوئی تبدیلی آئی ہے تو یہی آئی ہے کہ حالات پہلے سے زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ ایسٹ پاکستان پر علیحدگی پسند عناصر کی حکمرانی ہے اور ہم، یعنی ہم فوجی مجبور اور لاچار ہیں....

"مجھے بٹالین انٹیلی جنس سے پتہ چلا ہے کہ صرف افسروں میں ہی نہیں بٹالین کے جوانوں میں بھی بے چینی اور جوش وخروش پایا جاتا ہے۔ میری اپنی جذباتی کیفیت بھی یہی ہے" ـــ کرنل ارشاد اس طرح چپ ہو گیا جیسے اُسے ہچکی آئی ہو۔ اچانک میز پر مُکا مار کر اُس نے کہا ـــ "انڈیا کی کمانڈو فورس ایسٹ پاکستان کے چند ہزار مسلمانوں کو ساتھ مِلا کر ایسٹ پاکستان کے شہریوں کو قتل کر رہی ہے، مسجدوں کی اور مستورات کی بے حرمتی کر رہی ہے، ملک ہاتھ سے جا رہا ہے اور ہمیں بیرکوں سے نکلنے کی اجازت نہیں۔"

تمام افسروں کے چہروں پر جذباتیت کی سرخی آ گئی۔ ہر افسر محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے فرض سے کوتاہی کا مرتکب ہو رہا ہے۔

"ہمیں وہ فرض ادا نہیں کرنے دیا جا رہا جس کے لیے ہمیں قومی خزانے سے تنخواہ ملتی ہے" ـــ بٹالین کمانڈر نے کہا ـــ "اگر کوئی ایسی ویسی ہو گئی تو تاریخ یہ گناہ ہمارے کھاتے میں ڈال دے گی اور آنے والی نسلیں ہماری قبروں پر جوتے ماریں گی.... لیکن ہمیں حکم ماننا ہے۔ ہمیں ڈسپلن برقرار رکھنا ہے۔ اپنے جوانوں کو ٹھنڈا رکھو۔ میں جانتا ہوں جوان حکم کے منتظر ہیں۔ انہیں بے قابو نہ ہونے دو....

"گذشتہ رات یہاں سے تھوڑی دور ایک گاؤں میں آتش زنی کا واقعہ ہُوا ہے۔ میرے دیہاتی ذرائع نے مجھے بتایا ہے کہ اس گاؤں کو انڈین کمانڈو فورس کی ایک پارٹی نے اپنا اڈہ بنا رکھا تھا۔ دیہات کی مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے ہندو کمانڈو اپنے ساتھ لے جاتے اور دو چار دن انہیں خراب کر کے وہاں سے نکال دیتے تھے۔ گذشتہ رات اُن پر کسی نے حملہ کیا اور سب کو مار کر اُس جھونپڑے کو آگ لگا دی جس میں سب کو مارا گیا تھا۔ پتہ چلا ہے کہ جلے ہوئے جھونپڑے میں اُن کے ہتھیار بھی پڑے ہوئے ہیں....

"صاف ظاہر ہے کہ انہیں مارنے والے پاک آرمی کے آدمی نہیں تھے۔ سب سے قریب ہمارا ہی کیمپ ہے۔ ہماری بٹالین کا کوئی آدمی وہاں حملہ کرنے نہیں گیا تھا۔ اگر یہ حملہ فوجیوں کا ہوتا تو فوجی

اُن کے ہتھیار اپنے ساتھ لے آتے۔ اس اڈے پر محبِّ وطن بنگالیوں نے حملہ کیا ہوگا! اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام ہمیں کرنا چاہیئے وہ دیہات کے لوگ کر رہے ہیں۔ اس حملے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کا یہ خطّہ خانہ جنگی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مکتی باہنی میں بنگالی مسلمان بھی ہیں۔ اگر ان کے خلاف یہاں کے شہری اُٹھ کھڑے ہوتے تو یہ خانہ جنگی ہوگی اور یہ صُورت بڑی ہی خطرناک ہوگی۔ ہمارا دشمن ہمیں خانہ جنگی میں اُلجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"سر!— ایک میجر نے پُوچھا— "ہماری حکومت آخر سوچ کیا رہی ہے؟ اگر حکومت سیاسی لیڈروں کی ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ سیاسی لیڈروں کو فوج کا استعمال آتا ہی نہیں۔ حکومت تو فوجی ہے۔ سربراہ پریذیڈنٹ جرنیل ہے۔ ایسٹ پاکستان کا گورنر جرنیل ہے۔ کیا فوجی حکومت فوج کو استعمال کرنا نہیں جانتی؟"

"استعمال کرنا ہی نہیں چاہتی"— ایجوٹنٹ نے کہا۔

"میں پرسوں بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں گیا تھا"— بٹالین کمانڈر نے کہا— "بریگیڈ کمانڈر کے ساتھ کھُل کر باتیں ہُوئی تھیں۔ اُس نے جو صُورتِ حال بتائی ہے وہ بڑی تشویشناک ہے، بلکہ شرمناک ہے۔ حکومت سیاسی لیڈروں کی نہیں لیکن پردوں کے پیچھے یا زمین کے نیچے سیاسی لیڈر اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ مغربی پاکستان میں تمام سیاسی جماعتیں ایک پارٹی کے مقابلے میں آگئی ہیں۔ ایسٹ پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے فتح حاصل کی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ ملک کا اقتدار شیخ مجیب کی پارٹی کے حوالے کر دیا جائے لیکن مغربی پاکستان میں جس پارٹی نے فتح حاصل کی ہے اُس کا لیڈر کسی قیمت پر اقتدار سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا۔ مغربی پاکستان کے شکست خوردہ اور دھتکارے ہوئے سیاسی لیڈر در پردہ شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ مجیب جانتا ہے کہ یہ لیڈر وہی ہیں جنہوں نے ایسٹ پاکستان کو اس کے جائز حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔ آج وہی لیڈر وزارتوں کا لالچ لیے ہُوئے بنگالیوں کو اپنا بھائی کہہ رہے ہیں۔ وہ اس کوشش میں بھی ہیں کہ مغربی پاکستان میں جس پارٹی سے اُنہوں نے شکست کھائی ہے اُسے اقتدار نہ ملے....

"کمانڈر صاحب نے کہا ہے، اور یہ ہے بھی صحیح کہ ہمارے پریذیڈنٹ کے اِردگرد جن جرنیلوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے وہ اپنی سیاست چلا رہے ہیں۔ وہ پریذیڈنٹ پر زور دے رہے ہیں کہ اقتدار کسی بھی سیاسی پارٹی کو نہ دیا جائے.... میرے دوستو! اس وقت ضرورت یہ تھی کہ جیتتے ہوئے اور ہارے ہُوئے لیڈر ایسٹ پاکستان کو خانہ جنگی اور تباہی سے بچانے کے لیے متّحد ہو جاتے لیکن اتّحاد کے لیے دل میں ملک و ملّت کی محبت کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو ہمارے سیاسی لیڈروں میں ناپید ہے۔ جہاں تک میں صورتِ حال کو سمجھ سکا ہوں، وہ اس طرح ہے کہ دونوں طرف کی جیتی ہُوئی پارٹیوں کے لیڈر عہد کر چکے ہیں کہ ملک ٹوٹ جاتا ہے تو ٹوٹ جائے، اقتدار ہاتھ سے نہ جائے۔"

"سر!— سیکنڈ اِن کمانڈ نے کہا— "کیا یہ غلط ہے کہ اس وقت اِیسٹ پاکستان کا مستقبل اسلام آباد کی بجائے دلّی کے ہاتھ میں ہے؟"

"ہاں میجر عرفان!"— کرنل ارشاد نے کہا— "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر جنگی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ایسٹ پاکستان کا مستقبل انڈیا کے ہاتھ میں ہے۔ میں حیران ہوں کہ اسلام آباد والے کیا کر رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارے اپنے بھی اس سازش میں شریک ہیں کہ ایسٹ پاکستان ہمارے ساتھ نہ رہے۔ بریگیڈ کمانڈر نے مجھے بتایا ہے کہ ایسٹ پاکستان کے ملٹری گورنر نے پریذیڈنٹ کو ریڈیو ٹیلیفون پر کئی بار زور دے کر کہا ہے کہ وہ یہاں آئے اور یہاں کے سیاسی لیڈروں سے بات چیت کر کے حالات پر قابو پانے کی کوشش کرے پریذیڈنٹ ٹالتا رہا۔ اب اُس نے یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ہمارا ملٹری گورنر اسلام آباد میں پریذیڈنٹ کے ساتھ بات کرنے کے لیے فون کرتا ہے تو پریذیڈنٹ کا منہ چڑھا جرنیل جو اُس کا پرنسپل سٹاف آفیسر ہے کہہ دیتا ہے کہ ابھی پریذیڈنٹ کے ساتھ بات نہیں ہو سکتی۔ ملٹری گورنر نے تنگ آکر استعفٰی دے دیا ہے اور نیا گورنر آگیا ہے۔ یہ گورنر جو آیا ہے خالصتاً فوجی ہے جو سیاست کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ بہرحال ہمارا پریذیڈنٹ ڈھاکہ آرہا ہے۔ وہ شاید پندرہ یا سولہ مارچ کو یہاں پہنچے گا۔"

"سر!— ایک نوجوان کیپٹن نے کہا— "کیا ہمارا پریذیڈنٹ صرف باتیں کرنے آرہا ہے یا اپنے ساتھ کوئی فوج بھی لا رہا ہے؟"

"وہ اپنے ساتھ اپنے دو تین جرنیل لا رہا ہے"— بٹالین کمانڈر نے کہا— "وہ کوشش کرے گا کہ باتوں سے یہ مسئلہ حل ہو جائے۔"

"یہ مسئلہ باتوں سے حل نہیں ہو سکتا"— اس نوجوان کیپٹن نے اپنی ران پر بڑی زور سے ہاتھ مار کر کہا— "یہ ہمارا مسئلہ ہے سر! اسے ہم ہی حل کر سکتے ہیں۔"

"کیپٹن آصف!"— کرنل ارشاد نے اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھتے ہُوئے کہا— "ڈسپلن"۔

"معافی چاہتا ہوں سر!"— کیپٹن آصف نے کہا لیکن اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ نہ وہ معافی چاہتا ہے نہ وہ کسی کو معاف کرنے کے موڈ میں ہے۔

"میں نے تمہیں اتنی سی بات سمجھانے کے لیے بلایا تھا جو کیپٹن آصف ابھی تک نہیں سمجھ سکا"— بٹالین کمانڈر نے کہا— "خود بھی ڈسپلن میں رہو اور اپنے جوانوں کو بھی ڈسپلن میں رکھو۔ پریذیڈنٹ آرہا ہے۔ بہتری کی توقع رکھو۔"

✪

اُسی روز کا ذکر ہے، طاہر پرویز کو طاہرہ کا خط مِلا۔ طاہرہ نے لکھا تھا— "مشرقی پاکستان کے متعلق ہمیں اخباروں، ریڈیو اور ٹی۔ وی سے یہی بتایا جا رہا ہے کہ وہاں سب خیریت ہے لیکن ہمارے پڑوس میں ڈھاکہ سے ایک لیفٹیننٹ کی لاش آئی ہے۔ وہ مکتی باہنی کے ہاتھوں شہید ہُوا ہے۔ جو فوجی اس کی لاش لے کر آئے تھے، انہوں نے بڑی ہولناک خبریں سنائی ہیں۔ معلوم ہُوا ہے کہ شہروں میں غیر بنگالیوں اور محبِّ وطن بنگالیوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے اور

فوج کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ یہ خبریں سن کر مجھے یہ افسوس نہیں ہورہا کہ تم وہاں ہو بلکہ مجھے یہ خیال خون کے آنسو رُلا رہا ہے کہ پاکستان میں بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے.... میں تمہیں صرف یہ کہوں گی کہ تم پاکستان کے محافظ ہو۔ اپنے فرائض سے کوتاہی نہ کرنا۔ تم جیسے نوجوانوں نے یہ پاکستان بنایا تھا۔"

طاہرہ کا خط بڑا طویل تھا جو جذبات کی سرخی سے لکھا گیا تھا۔ طاہر پرویز نے وہ خط دو تین مرتبہ پڑھا تھا اور بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔ اُس وقت وہ کچھ دیر کے لیے سوجایا کرتا تھا لیکن یہ خط پڑھ کر اُس کی نیند اُڑ گئی۔ اس کا اردلی اندر آیا اور ایک لفافہ اُس کے ہاتھ میں دیا۔ اردلی یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ ایک بنگالی دے گیا ہے۔

طاہر نے جلدی جلدی لفافہ کھولا۔ یہ صبیحہ کا خط تھا جو اُس نے اپنے نوکر کے ہاتھ بھیجا تھا۔ صبیحہ نے لکھا تھا:

"میری جان سے عزیز طاہر! گذشتہ رات تمہیں اُس جنگل میں دیکھ کر میں ذرا سی بھی حیران نہ ہُوئی۔ مجھے صرف خدا کی ذات پر بھروسہ تھا لیکن یہ خیال مجھے بار بار آتا تھا کہ میرے طاہر کو پتہ چل گیا کہ اس کی صبیحہ اغوا ہوگئی ہے تو طاہر اپنی جان پر کھیل کر مجھے نکال لے جانے کی کوشش کرے گا۔ تمہارے ساتھ اتنے ہی آدمی ہونے چاہئیں تھے جتنے تم اپنے ساتھ لائے تھے لیکن تمہارے ساتھ اتنے آدمیوں کو دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہُوئی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں تمہیں اُن آدمیوں میں سے نکال کر دور کہیں تنہائی میں لے جاتی۔ میں اتنی جذباتی کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی کل رات تمہیں وہاں دیکھ کر ہُوئی....

"خدا نے شاید مجھے اس لیے مصیبت میں ڈالا تھا کہ میرے بھائیوں کے دماغ ٹھکانے آجائیں۔ میرا وہاں سے نکل آنا ایک معجزہ تھا۔ میں خدا کی ذات سے کبھی بھی مایوس نہیں ہُوئی لیکن یہ حقیقت مجھ پر پہلی بار کُھلی ہے کہ ایمان اور کردار مضبوط ہوں تو ہم جیسے ناچیز بندوں کی زندگی میں بھی معجزے رونما ہو سکتے ہیں....

"میرے دونوں بھائیوں نے جس طرح ڈیڈی کے پاؤں پکڑ کر معافیاں مانگیں اور جس طرح ڈیڈی نے مجھے گلے لگا کر پیار کیا وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ شبیر بھائی نے ڈیڈی کو جب یہ بتایا کہ تم اپنے آدمی ساتھ لے کر اُس کے ساتھ گئے تھے تو ڈیڈی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُنہوں نے اتنا ہی کہا کہ طاہر پرویز سے یہی توقع تھی۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں کہ طاہر نے اپنی جان کو بھی اور اپنی نوکری کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ فوجیوں کو تو اپنے کیمپ کی حدود سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں....

"تم باہر نہیں آ سکتے، میں پہلے تمہارے پاس آجایا کرتی تھی لیکن اب میرا باہر نکلنا مناسب نہیں۔ دل کی حالت یہ ہے کہ تمہاری جدائی برداشت نہیں ہو رہی۔ کوئی صورت نکالو اور آؤ۔ تم آؤ گے تو میرے گھر ہی آؤ گے۔ میں تمہیں علیحدگی میں نہیں مل سکوں گی لیکن تمہیں دیکھ تو لوں گی۔ میں سمجھتی تھی کہ میرے دل میں پاکستان کی محبت ہے اس لیے تمہیں بھی میں پاکستان کے حوالے سے ہی چاہتی ہوں لیکن میں بڑی شدت سے محسوس کرنے لگی ہوں کہ میں تمہارے بغیر ایک پل بھی چین سے نہیں گزار سکتی.... میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ تم بہت جوشیلے اور جذباتی ہو۔ خدا کے لیے ایسا خطرہ پھر کبھی مول نہ لینا۔ میں تمہیں زندہ اور سلامت دیکھنا چاہتی ہُوں۔"

یہ خط پڑھ کر طاہر پرویز کی وہ بے چینی ختم ہوگئی جو طاہرہ کے خط نے پیدا کی تھی۔ وہ صبیحہ سے ملنے کے لیے بیتاب ہو گیا لیکن دن کے وقت وہ کیمپ سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔

✪

دوسرے دن وہ بٹالین آفس میں گیا تو اتفاق سے اُسے کیپٹن کوارٹر ماسٹر برآمدے میں کھڑا مل گیا۔ کیپٹن کچھ پریشان سا تھا۔ اس نے طاہر پرویز کو بتایا کہ اُس نے میگزین سے ایمونیشن گنتی کے لیے نکلوایا ہُوا ہے لیکن بازار سے کچھ سامان لانا ہے جس کے لیے اُسے خود ہی جانا پڑے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میگزین کی چیکنگ ملتوی کر دے۔

"آپ میگزین چیک کریں" — طاہر پرویز نے کہا — "اور باہر کے کام کے لیے مجھے بھجوا دیں۔"

"سی۔ او مانے گا نہیں" — کیپٹن کوارٹر ماسٹر نے کہا — "تم رائفل کمپنی کے افسر ہو.... کیوں؟ بازار میں تمہارا کوئی اپنا کام ہے؟"

"بہت ضروری کام ہے" — طاہر پرویز نے کہا۔

"شاید میں وہ کام جانتا ہُوں" — کیپٹن کوارٹر ماسٹر نے مسکراتے ہوئے کہا — "اُس بنگالن سے ملنے جا رہے ہو؟"

"اس سے زیادہ ضروری اور کیا کام ہو سکتا ہے سر!" — طاہر پرویز نے کہا۔

"رگڑے جاؤ گے پٹھے!" — کیپٹن کوارٹر ماسٹر نے کہا — "سوچ لو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں" — طاہر پرویز نے کہا — "وہ پاکستانی خاندان ہے اور سارے خاندان کے ساتھ میرا دوستانہ ہے۔"

کوارٹر ماسٹر بٹالین کمانڈر کے دفتر میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا اور اُس نے طاہر پرویز سے کہا — "سی۔ او کہتا ہے اس لڑکے کو بھیج دو۔"

"سر!" — طاہر پرویز نے درخواست کے لہجے میں کہا — "میجر اصغر کو پتہ نہ چلنے دینا کہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کی ڈیوٹی پر جانا چاہتا ہُوں۔"

"جاؤ یار، جاؤ" — کیپٹن نے کہا — "میں جانتا ہُوں۔ میجر اصغر کو پتہ چل گیا کہ تم نے خود یہ ڈیوٹی لی ہے تو وہ تمہیں مُرغا بنا دے گا.... آؤ میں تمہیں بتاؤں کام کیا ہے!"

✪

طاہر پرویز نے ٹرک صبیحہ کے گھر سے کچھ دُور رکوا لیا اور کوارٹر ماسٹر حوالدار سے کہا کہ وہ پندرہ بیس منٹ تک واپس آجائے گا۔ ٹرک میں ایک نائیک اور آٹھ جوانوں کا ایسکارٹ بھی تھا۔ طاہر پرویز ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے بنگالی طاہر پرویز کو رُک کر دیکھ رہے تھے۔ باوردی فوجی کا بنگالیوں کی آبادی میں آنا عجوبہ تھا۔ فوجی سڑکوں پر کبھی فوجی گاڑیوں میں سے گزرتے نظر آتے تھے۔ اُن کے خلاف نعرے لگتے تھے۔ انہیں پتھر مارے

جاتے، انہیں گالیاں دی جاتیں اور انہیں غیر ملکی فوج کہا جاتا تھا۔ ان حالات میں سیکنڈ لیفٹیننٹ طاہر پرویز نے یہ خطرہ مول لیا کہ ٹرک سڑک پر کھڑا کر کے خود آبادی کی ایک گلی میں چلا گیا۔

صبیحہ کا باپ گھر نہیں تھا۔ شبیر الحسن بھی نہیں تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی موجود تھا۔ وہ باپ کو بلانے کے لیے باہر کو دوڑا۔ صبیحہ کی ماں غسل خانے میں تھی۔ طاہر پرویز کو صبیحہ اکیلی مل گئی اور وہ اُس سے اس طرح ملی جیسے اُس سے کبھی الگ ہوگی ہی نہیں۔ طاہر پرویز صبیحہ کے بازوؤں میں تمام خطرے بھول گیا۔ غسل خانے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو صبیحہ طاہر پرویز سے الگ ہُوئی۔ ذرا دیر بعد صبیحہ کا باپ بھی آگیا۔ اُس نے طاہر پرویز کو گلے لگایا لیکن اُس کے انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے وہ خوش نہیں۔

"باہر سڑک پر تمہارا ٹرک کھڑا ہے بیٹا؟" — صبیحہ کے باپ نے پوچھا۔

"میرا ہی ہے۔"

"ایسا خطرہ پھر کبھی مول نہ لینا" — صبیحہ کے باپ نے کہا — "تمہیں شاید باہر کے حالات کا علم نہیں۔"

"میں زیادہ دیر نہیں رکوں گا" — طاہر پرویز نے کہا — "آپ لوگوں کو دیکھنے آگیا ہوں..... آپ کا کوئی اور نقصان تو نہیں ہُوا تھا؟"

"نقصان تو ایک ہی ہُوا تھا جو تم نے پورا کر دیا ہے" — صبیحہ کے باپ نے کہا — "جوان بیٹی کا اغوا ہو جانا معمولی نقصان نہیں تھا۔ فائدہ یہ ہُوا ہے کہ میرے بیٹوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور دونوں سچے پاکستانی بن گئے ہیں..... ویسے بیٹا! حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ ان پر قابو پانا آسان نظر نہیں آتا۔"

وہ باتیں کر رہے تھے کہ صبیحہ کے گھر کا ملازم اندر آیا اور صبیحہ کے باپ کے کان میں کچھ کہہ کر چلا گیا۔ باپ نے صبیحہ کے چھوٹے بھائی سے کہا کہ سٹین گن نکال لائے۔

"طاہر بیٹا!" — صبیحہ کے باپ نے کہا — "اُٹھو، میں تمہیں ٹرک پر چھوڑ آؤں۔ نوکر بتا گیا ہے کہ بنگلہ دیشی گلی میں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اگر تم اکیلے گئے تو وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور اگر تم یہاں دیر تک بیٹھے تو پاکستان کے مخالفین کی تعداد بڑھتی جائے گی۔"

طاہر پرویز نے اس گھر سے نکلتے صبیحہ کی طرف دیکھا۔ صبیحہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ طاہر پرویز نے یوں محسوس کیا جیسے اُسے گھسیٹ کر اس گھر سے نکالا جا رہا ہو۔

صبیحہ کا باپ طاہر پرویز سے پہلے باہر نکلا۔ اُس کے پیچھے طاہر پرویز اور اس کے بعد صبیحہ کا چھوٹا بھائی دروازے سے نکلا۔ یہ کشادہ گلی تھی۔ جہاں یہ گلی سڑک سے ملتی تھی وہاں دس بارہ بنگالی کھڑے تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں اور بعض نے دھا اٹھا رکھے تھے۔ صبیحہ کے باپ نے طاہر پرویز کو اپنے پیچھے کر لیا۔ صبیحہ کا بھائی آگے ہو گیا۔ اس نے سٹین گن میں میگزین لگالی تھی۔ صبیحہ اور اُس کی ماں دروازے میں کھڑی تھیں۔

اُن آدمیوں کے قریب گئے تو وہ سب اکٹھے ہی بولنے لگے۔ وہ صبیحہ کے باپ سے کچھ کہہ رہے تھے۔ باپ نے بارعب آواز میں انہیں کچھ کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" — طاہر پرویز نے صبیحہ کے بھائی سے پوچھا۔

"یہ ڈیڈی سے کہہ رہے ہیں کہ یہ فوجی آئندہ اس محلے میں نہ آئے" — صبیحہ کے بھائی نے طاہر پرویز کو بتایا — "اور یہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کو قتل کر دیں گے۔ ڈیڈی نے انہیں کہا ہے کہ تم لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر تم نے اس لڑکے (طاہر پرویز) کو ہاتھ بھی لگایا تو تم میں سے کوئی زندہ نہیں رہے گا۔"

طاہر پرویز آگے ہو گیا۔

"سنو میرے بھائیو!" — اُس نے بنگالیوں سے کہا — "میں تم سب کو ایک منٹ میں ختم کر سکتا ہوں۔ میرے پاس ریوالور ہے۔ وہ ٹرک دیکھ لو۔ اس میں رائفلیں بھی ہیں اور سٹین گنیں بھی لیکن میں تمہارے ہاتھوں قتل ہونا پسند کروں گا۔ تم میں سے کوئی بھی میرے ہاتھوں قتل نہیں ہوگا۔ میں تم لٹیروں اور قاتلوں کو اپنا بھائی سمجھتا ہُوں۔ تم ہندو کو خوش کر رہے ہو، میں خدا کو خوش کرنا چاہتا ہُوں۔ آگے آؤ اور مجھے قتل کرو۔"

"ہٹ جاؤ آگے سے بے غیرتو!" — صبیحہ کے باپ نے گرج کر کہا — "جا کر اُن کا انجام دیکھو جنہوں نے میرے گھر پر حملہ کیا تھا۔"

صبیحہ کے باپ کا رعب چلتا تھا۔ اس محلے میں محبِ وطن بنگالی بھی تھے۔ پاکستان کے مخالف بنگالی ایک طرف ہو گئے۔ صبیحہ کے باپ نے طاہر پرویز سے کہا کہ وہ اپنے ٹرک تک چلا جائے۔

طاہر پرویز صبیحہ کے باپ اور بھائی سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ قتل کی دھمکی دینے والے بنگالی اِدھر اُدھر ہو گئے۔

✪

اس سوال کا جواب اُس وقت کے خود ساختہ صدرِ مملکت کے پرنسپل سٹاف آفیسر (جو ایک جرنیل تھا) کے سوا کوئی نہیں دے سکتا کہ جب مشرقی پاکستان جل رہا تھا، بھارت کی کمانڈو فورس بنگالی مسلمانوں کے بہروپ میں مشرقی پاکستان میں من مانی کر رہی تھی اور اس کی نفری میں اضافہ ہو رہا تھا اور مشرقی پاکستان اسلام آباد سے عملاً آزاد ہو چکا تھا اور انڈین آرمی، نیوی اور ائیر فورس نے مشرقی پاکستان کو محاصرے میں لے لیا تھا، اُس وقت صدرِ مملکت کو اندھیرے میں کیوں رکھا گیا؟ مشرقی پاکستان کا فوجی گورنر ٹیلیفون پر صدرِ مملکت سے بات کرنا چاہتا تو پی ایس او کیوں کہہ دیتا تھا کہ پریذیڈنٹ بہت مصروف ہے؟

کیا صدرِ مملکت اندھیرے میں رہنا چاہتا تھا؟

کیا درباری جرنیلوں کے لیے یہی کیفیت سُود مند تھی کہ صدرِ مملکت کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا ہی نہ جائے؟

ہم تاریخ کو دھوکے دینے والی قوم ہیں۔ ہم نے ہر دور میں تاریخ کی آنکھوں میں دھول جھونکی ہے۔ ہم نے نتائج کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم دن تھا۔ اُس روز صدرِ مملکت ڈھاکہ گیا۔ اُس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ سیر سپاٹے کے لیے آیا ہے۔ ضرورت یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کے سیاسی لیڈروں سے مِلتا اور اُن کی سُنتا لیکن صدرِ مملکت نے جو حاشیہ برداروں کے مشوروں کا محتاج رہتا تھا، جرنیلوں کی کانفرنس بلائی۔

ڈھاکہ آنے سے پہلے صدرِ مملکت سے ایک بڑی ہی خطرناک غلطی کرائی جا چکی تھی چونکہ انتخابات ہو چکے تھے اس لیے قومی اسمبلی کا ایک اجلاس ضروری تھا۔ اس پہلے اجلاس کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا مگر وجہ بتائے بغیر اجلاس منسوخ کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں اس کا یہ تاثر لیا گیا کہ مغربی پاکستان والے مشرقی پاکستان والوں کو اقتدار نہیں دینا چاہتے بلکہ اقتدار میں سے حصہ بھی نہیں دینا چاہتے۔

پاکستان کے فوجی صدرِ مملکت کی ڈھاکہ میں آمد سے پہلے شیخ مجیب نے ڈھاکہ میں جلسہ عام سے خطاب کیا تھا۔ یہ جلسہ اسمبلی کے اجلاس کی منسوخی کے ردِّعمل کے طور پر منعقد ہُوا تھا جس میں لاکھوں بنگالیوں نے شرکت کی۔ اس میں وہ بنگالی بھی شامل تھے جو مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کا عہد کر چکے تھے اور وہ بھی تھے جو علیحدگی پسند نہیں تھے لیکن تمام بنگالی جو اس جلسے میں شریک تھے وہ نالاں اور شاکی تھے اور بھڑکے ہُوتے تھے۔ شیخ مجیب کی تقریر نے انہیں مشتعل کر دیا۔ اُس نے اعلان کیا کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس بُلا کر اقتدار منتقل نہ کیا گیا تو سول نافرمانی کی تحریک چلائی جائے گی۔

سول نافرمانی کی تحریک نہ صرف چل رہی تھی بلکہ یہ بغاوت کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ انتظامیہ پر بنگالیوں کا قبضہ تھا۔ غیر بنگالی بنکوں سے اپنا روپیہ لینے جاتے تھے تو ان کے چیک پھاڑ کر پھینک دیئے جاتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے اخباروں نے مغربی پاکستان اور پاک افواج کے خلاف مہم شروع کر دی۔ پہلے صفحوں پر اس قسم کی شہ سُرخیاں چھپنے لگیں۔ "غیر ملکی ظالم فوجیو، یہاں سے نکل جاؤ"۔ اس کے ساتھ ہی کُھلے الفاظ میں "بنگلہ دیشی فوج" کی ٹریننگ اور تنظیم کی تفصیلات شائع ہونے لگیں۔ اغوا، آبروریزی اور قتل و غارت اور تیز ہو گئی۔ بھارت نے اپنے ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے مغربی پاکستان اور پاک افواج کے خلاف بے بنیاد اور شرمناک پروپیگنڈہ پہلے سے زیادہ کر دیا۔

✪

ان حالات میں ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے روز پاکستان کا فوجی صدرِ مملکت مشرقی پاکستان کی سرزمین پر یوں اُترا جیسے اُسے خدا نے زمین پر اُتارا ہو اور وہ زمین پر بسنے والے بندوں سے برتر اور اعلیٰ ہو۔ اُس نے اُسی شام جرنیلوں کی کانفرنس بلائی جس میں نیا فوجی گورنر جو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھا، نمبر چودہ انفنٹری ڈویژن کا جنرل آفیسر کمانڈنگ، صدرِ مملکت کا مشیرِ خاص جرنیل، انٹیلی جنس کا جرنیل، کوارٹر ماسٹر جنرل، صدرِ مملکت کا پرنسپل سٹاف آفیسر (جرنیل) کمانڈر انچیف، پاک فضائیہ کا ایک ایئر کموڈور (پاک فضائیہ کی ایسٹرن کمانڈ کا کمانڈر) اور پاک بحریہ کا کموڈور شریک ہوئے۔

یہ تاریخی کانفرنس تھی جس میں فیصلہ کرنا تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہو۔ پاکستان کے مستقبل کا دارومدار اسی کانفرنس پر تھا۔ قوم کی نگاہیں، ہمارے دشمن کی نگاہیں، ساری دنیا کی نگاہیں

اس کانفرنس پر لگی ہوئی تھیں۔ علیحدگی پسند بنگالی اعلان کر چکے تھے کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور اگر اُن کے مطالبات پورے نہ کیے گئے تو وہ بغاوت کر دیں گے۔

اس کانفرنس میں انٹیلی جنس رپورٹیں پیش کی گئیں جو صدرِ مملکت نے اور اُس کے مشیر جرنیلوں نے بھی دیکھیں۔ پاک فضائیہ کی ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر نے صدرِ مملکت کو انٹیلی جنس رپورٹیں غور سے دیکھنے کو کہا۔

"ہمارے سامنے دو صورتیں ہیں" ـــــ ایئر کموڈور نے کہا ـــ "ایک یہ کہ ملک کے پہلے حکمرانوں اور موجودہ حکومت کی لغزشوں اور کوتاہیوں کی سزا بھگتیں اور مشرقی پاکستان سے باعزت طریقے سے نکل جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ علیحدگی پسند بنگالیوں کو سزا دیں اور ظالم اور سفّاک کہلائیں۔ سزا دینے کی صورت میں بھی ہمیں یہاں سے نکلنا پڑے گا لیکن اس صورت میں ہم ذلیل و خوار ہو کر نکلیں گے"۔

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان باغیوں، ان قاتلوں اور ان لٹیروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیے؟" ـــ صدرِ مملکت کے ایک حاشیہ بردار جرنیل نے پوچھا۔

"اگر کارروائی سے آپ کی مراد فوجی کارروائی ہے تو ہمیں اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہیئے" ـــ ایئر کموڈور نے کہا ـــ "میں نے آپ کے سامنے دو صورتیں رکھی ہیں۔ تیسری صورت پُرامن تصفیہ کی ہے۔ صدرِ مملکت یہاں کے سیاسی لیڈروں، خصوصاً شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ برادرانہ فضا میں بات چیت کریں لیکن میں آپ کو انٹیلی جنس رپورٹوں اور یہاں کے حالات اور واقعات کی روشنی میں بتاتا ہوں کہ بنگالی بغاوت کی نہیں بلکہ آپ کے خلاف باقاعدہ جنگ لڑنے کی تیاریاں مکمل کر چکے ہیں اور انڈیا کی بارہ ڈویژن فوج ان کی پشت پناہی کے لیے ایسٹ پاکستان کی سرحدوں پر پہنچ گئی ہے۔ اگر ایسٹ پاکستان کے لیڈر آپ کے ساتھ پُرامن تصفیہ کے لیے تیار ہو بھی گئے تو وہ آپ کو دیں گے بہت کم اور لیں گے بہت زیادہ جو آپ دینا پسند نہیں کریں گے"۔

"میں کہتا ہوں میں ایک ہفتے میں ان بنگالیوں کا دماغ درست کر دوں گا" ـــ نئے فوجی گورنر نے کہا جو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھا ـــ "میں ملٹری ایکشن کی تجویز پیش کرتا ہوں اور یہی اس مسئلے کا حل ہے"۔

کانفرنس میں بیٹھے ہوئے دوسرے جرنیل چُپ بیٹھے تھے۔ صدرِ مملکت کے دو جرنیل ایئر کموڈور کے دلائل کم سنتے اور اپنے پریذیڈنٹ کی طرف زیادہ دیکھتے تھے۔ انہیں غالباً یہ ڈر محسوس ہو رہا تھا کہ پریذیڈنٹ کسی بات سے ناراض نہ ہو جائے۔ اگر کسی نے کوئی بات کی بھی تو وہ ایسی ٹھوس نہ تھی کہ اُس پر دھیان دیا جاتا۔

"اب آپ بنگالیوں کا دماغ درست نہیں کر سکتے" ـــ پاک فضائیہ کی ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر نے کہا ـــ "اگر اب آپ ان کو ملٹری ایکشن کے ذریعے دبانے کی کوشش کریں گے تو یہ انڈیا کے خلاف اعلانِ جنگ ہوگا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ انڈیا مشرقی پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا تو یہ آپ کی خوش فہمی

ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے ڈھاکہ میں مکتی باہنی کا باقاعدہ ہیڈکوارٹر بنا رکھا ہے۔ یہ اُن کا فوجی ہیڈکوارٹر ہے جسے انڈین آرمی کے تجربہ کار آفیسر چلا رہے ہیں۔ انڈیا سے اسلحہ بارود اتنا زیادہ آچکا ہے جو ہمارے اس ایک ڈویژن کو جو آپ نے یہاں رکھا ہُوا ہے، ختم کرنے کے لیے کافی ہے"۔

مغربی پاکستان سے فوج کے جو دو اور ڈویژن مشرقی پاکستان بھیجے گئے تھے، وہ اس کانفرنس کے بعد گئے تھے۔ پاک فضائیہ کی ایسٹرن کمانڈ کا کمانڈر بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ مشرقی پاکستان جیسے دشوار گذار خطّے میں ایک ڈویژن سے ملٹری ایکشن کرنا ناممکن ہے لیکن اُس کی بات کی طرف کوئی بھی دھیان نہیں دے رہا تھا۔

"یہ عجیب بات ہے" ـــ صدرِ مملکت نے ہلکے پھلکے موڈ میں کہا ـــ "کہ انٹیلی جنس کی جو رپوٹیں مجھے آرمی کی طرف سے ملنی چاہئیں تھیں وہ ایئر فورس کے کمانڈر کی طرف سے مل رہی ہیں"۔

"اگر آپ صرف ایئر فورس کی بات کرتے ہیں" ـــ ایئر کموڈور نے کہا ـــ "تو کیا آپ کو معلوم نہیں کہ پورے مشرقی پاکستان میں صرف سولہ سیبر طیارے ہیں اور ان کے لیے صرف ایک ہوائی اڈہ ہے۔ اس اڈے کو دشمن ایک دن میں بیکار کر دے گا۔ انڈین ایئر فورس کے دس سکواڈرن مغربی بنگال اور آسام میں موجود ہیں۔ ان میں رُوس کے ایس۔ یو سیون اور مِگ۔۲۱ طیاروں کے علاوہ دیگر جدید ترین بمبار طیارے بھی ہیں۔ اپنی اور دشمن کی طاقت کو دیکھتے ہوئے دانشمندی اس میں ہے کہ ہم جنگ کا خطرہ مول نہ لیں۔ یہ مت بھولیں کہ مشرقی پاکستان کے اندر دشمن کی کمانڈو فورس کے علاوہ لاکھوں بنگالی پاک افواج کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ نیوی کی حالت آپ کو معلوم ہے"۔

اس کے باوجود مشرقی پاکستان کا نیا فوجی گورنر بڑے جوش و خروش سے کہہ رہا تھا کہ اُسے ملٹری ایکشن کی اجازت دی جائے تو وہ ایک ہفتے میں حالات پر قابو پالے گا۔ یہ کانفرنس صرف اس فیصلے پر پہنچی کہ صدرِ مملکت شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ بات چیت کرے گا۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ دوسرے ہی دن شروع ہو گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن جب پہلی ملاقات کے لیے صدرِ مملکت کے پاس آیا تو اُس کی کار پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

اس ملاقات کے بعد بھی صدرِ مملکت اور شیخ مجیب کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ پتہ چلا تو صرف یہ کہ مشرقی پاکستان میں غیر بنگالیوں کا قتلِ عام اور تیز ہو گیا اور بھارت کی پروپیگنڈہ مشینری نے عالمی برادری میں پاکستان کو ایک غاصب اور ظالم ملک کی حیثیت سے متعارف کرانا شروع کر دیا اور سفارتی سطح پر پاکستان کو خوب رُسوا کیا۔

ادھر ہمارا ریڈیو اور ٹی۔وی اور سرکاری اخبار اپنے حکمرانوں کے گیت گاتے رہے اور اخباروں میں ایسے جلوسوں کی تصویریں چھپتی رہیں جن کے متعلق لکھا جاتا تھا کہ یہ ڈھاکہ میں محبِ وطن پاکستانیوں کے جلوس ہیں۔ مغربی پاکستان والوں کو سرکاری طور پر کبھی نہ بتایا گیا کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔

✪

ملاقاتوں کا سلسلہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء تک چلتا رہا۔ اُس دن کا سورج غروب ہو گیا ـــ قوم بے خبر رہی کہ مشرقی پاکستان کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ہے۔

رات ایک بجے پاک فوج کے ایک ٹینک نے پہلا گولہ فائر کر کے مشرقی پاکستان کے تابوت پر آخری کیل گاڑی۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان کی وہ رات ٹینکوں کی توپوں اور مشین گنوں کے دھماکوں سے لرزنے لگی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مشرقی پاکستان کو تابوت میں اُتارا جا رہا ہے اور اُسے آخری سلامی دی جا رہی ہے ـــ نئے فوجی گورنر کا ملٹری ایکشن شروع ہو چکا تھا۔

بعد میں معلوم ہُوا کہ صدرِ مملکت کے موڈ سے آخر دم تک یہی پتہ چلتا رہا کہ وہ ملٹری ایکشن کے خلاف ہے لیکن اس انتہائی خطرناک اور ظالمانہ کارروائی کا حکم اُس نے دیا تھا اور ساتھ یہ کہا تھا کہ جب اُس کا طیارہ کراچی ائیرپورٹ پر اُتر جائے اُس وقت ملٹری ایکشن شروع کیا جائے۔

فوجی طاقت سے زمین پر قبضہ کیا جا سکتا ہے، وہاں کے رہنے والوں کے دلوں پر نہیں۔ وہاں تدبر کی ضرورت تھی، توپ کی نہیں۔

تاریخ کو دھوکے دینے والی قوم کو تاریخ نے سزا دینی شروع کر دی تھی۔

علیحدگی پسندوں کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا لیکن اُس کی گرفتاری سے کوئی فرق نہ پڑا۔ فرق پڑ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اب وہاں کے حالات بھارت کی مٹھی میں تھے۔ ملٹری ایکشن ایسے ظالمانہ طریقے سے کیا گیا کہ ایک مکان سے فوج پر ایک گولی چلی تو پوری آبادی کو توپوں سے ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ اس میں وہ بھی مارے گئے جو محبِّ وطن پاکستانی تھے۔ مشرقی پاکستان ندیوں کا دیس ہے۔ چھوٹا سا ایک پل ٹوٹ جاتے تو کئی میل دُور کا چکر کاٹ کر کسی دوسرے پُل سے گذرا جاتا ہے۔ وہاں کے چھوٹے چھوٹے پُل جسم کی بڑی بڑی رگوں کی مانند ہیں۔ مکتی باہنی یعنی بھارتی کمانڈو فورس نے یہ رگیں کاٹنی شروع کر دیں۔ ہمارے ملٹری ایکشن نے یہ ظالمانہ کارروائی کی کہ اُڑائے ہوئے پُل کے قریبی گاؤں کو تباہ کر دیا گیا خواہ اس گاؤں کی تمام آبادی محبِّ وطن پاکستانیوں کی تھی۔

مشرقی پاکستان میں ایسٹ بنگال رجمنٹ کی پانچ پلٹنیں تھیں۔ پانچوں باغی ہو گئیں۔ وہ پاک فوج کے خلاف مورچہ بند ہو گئیں ـــ خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔

ایسٹ بنگال رجمنٹ کی پانچوں پلٹنیں خالصتًا بنگالیوں کی تھیں۔ وہاں ایسی پلٹنیں بھی تھیں جن میں بنگالی بھی تھے اور غیر بنگالی بھی۔ بنگالی فوجیوں نے غیر بنگالی افسروں کو قتل کر دیا۔ ان پلٹنوں کے علاوہ بھارت کی کمانڈو فورس نے بنگالی شہریوں کو ساتھ ملا کر کئی جگہوں پر پاک فوج کا جم کر مقابلہ کیا۔ بھارت اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ اُس نے دنیا بھر میں اپنا پروپیگنڈہ تیز کر دیا اور دنیا سے منوا لیا کہ پاکستان آرمی بنگالیوں کا قتلِ عام اور آبرو ریزی کر رہی ہے۔

میجر اصغر اور طاہر پرویز کی بٹالین بھی اس ملٹری ایکشن میں شامل تھی۔ اس بٹالین کا قریبی ٹارگیٹ وہی قصبہ تھا جہاں صبیحہ رہتی تھی۔ بٹالین کمانڈر نے اپنے افسروں سے کہا تھا کہ اسے ٹیلیفون پر جو احکام ملے ہیں وہ یہ ہیں کہ کسی پر رحم نہ کیا جائے اور اس بات کی کھلی اجازت ہے کہ جہاں ذرا سا بھی شک ہو، اس جگہ کو تباہ کر دیا جائے۔ بٹالین کمانڈر نے یہ بھی کہا کہ باغیوں کے دو گھر تباہ

کرنے میں کسی محبِ وطن پاکستانی کا گھر بھی زد میں آتا ہے تو اس کی پرواہ مت کرو۔

طاہر پرویز نے اپنی پلاٹون کو احکام دے کر پلاٹون حوالدار عجائب خان کو الگ کھڑا کر لیا۔

"عجائب خان!" — طاہر پرویز نے دوستانہ انداز میں کہا — "میں تمہیں شبیر الحسن کا گھر سمجھا دوں گا۔ اس گھر کے اردگرد باغی موجود ہیں۔ میں اس گھر کو بچانا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ہماری پلاٹون کسی اور طرف ہو۔ میں پلاٹون کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں جا سکوں گا۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ تم سیدھے شبیر الحسن کے گھر پہنچ جانا۔"

حوالدار عجائب خان ایسی ہنسی ہنس پڑا جس میں مسرّت کی بجائے اُداسی اور مایوسی تھی۔

"سر!" — عجائب خان نے کہا — "جو آپ چاہتے ہیں وہ شاید نہ ہو سکے۔ وہ گھر زد میں آ گیا تو میں اُسے کس طرح بچا سکوں گا۔ میں یہ کر سکتا ہوں کہ وہ گھر ملٹری ایکشن کی زد میں آیا تو میں اپنی جان اور اپنی نوکری کا خطرہ مول لے کر صبیحہ کو اُٹھا کر لے آؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس لڑکی کو بچا لاؤں گا... لیکن سر! میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کیا ہوگا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے پہنچنے تک باغی انہیں ختم کر چکے ہوں۔"

کمپنی کمانڈر کی گرجدار آواز سنائی دی۔ اُس نے "مُوو" کا حکم دے دیا — طاہر پرویز جھلّ ل سے اپنی پلاٹون کے ساتھ چل پڑا۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات پاک فوج کے ایک ٹینک کی توپ کے پہلے دھماکے نے مشرقی پاکستان کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ یہ گولا تو فوجی تھا لیکن اس کا دھماکہ سیاسی تھا۔ اس پہلے دھماکے نے پاکستان کی قسمت سر بمہر کر دی۔

یہ دھماکہ تاریخ پاکستان کے ایک سیاہ باب کا عنوان بن گیا۔

کہتے ہیں فوج سیاستدانوں کی تلوار ہوتی ہے۔ جب چاہا اسے نیام سے نکال لیا اور جب چاہا اسے نیام میں ڈال لیا، لیکن جب جرنیل سیاستدانوں کا کھیل کھیلنے لگتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ننّھا سا بچّہ باپ کی نیام سے تلوار نکال کر اس کے ساتھ کھیل رہا ہو۔

ملٹری ایکشن ایسے جرنیلوں کا فیصلہ تھا جو میدانِ جنگ کے نہیں، شاہی دربار کے جرنیل تھے۔

ہمارا دشمن اسی دھماکے کا منتظر تھا۔ اِدھر پاکستان کی ایسٹرن کمانڈ سے احکام بذریعہ ٹیلیفون اور بذریعہ وائرلیس اپنی یونٹوں کو دیئے جا رہے تھے، اُدھر دشمن کے احکام بھارت کی کمانڈو فورس کو پہنچنے لگے جس کی کم و بیش اسّی ہزار نفری مشرقی پاکستان کے جنگلوں میں آبادیوں میں، ندیوں کے اہم پُلوں کے قریب موجود اور تیار تھی۔ بڑے بڑے شہروں کے کالجوں کے طلبا پہلے ہی دشمن کی اس کمانڈو فورس کا ایک حصّہ بن چکے تھے۔ مشرقی پاکستان کے ہندو جو غیر بنگالیوں کے قتلِ عام میں پیش پیش تھے، اب پاک فوج کے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔

دشمن کو معلوم تھا کہ مشرقی پاکستان میں پاک فوج کی جو نفری ہے وہ مشرقی پاکستان کے چھوٹے سے ٹکڑے پر قابو پانے کے لیے بھی کافی نہیں۔

ہمارے دشمن کو سب کچھ معلوم تھا۔ اگر کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا تو وہ مغربی پاکستان کے عوام تھے جنہیں اس کے سوا کچھ بھی نہیں بتایا جا رہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں غدّاروں اور علیحدگی پسندوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ قلع قمع دراصل مشرقی پاکستان کا ہو رہا تھا۔

✪

ملٹری ایکشن کی رات کے بطن سے جنم لینے والی سحر ابھی اچھی طرح روشن نہیں ہُوئی تھی۔ صبیحہ کے دروازے پر دستک ہُوئی۔ گھر کے تمام افراد ابھی سوئے ہُوئے تھے۔ صبیحہ کے باپ نے انتظام کر رکھا تھا کہ دو یا تین آدمی رات ڈیوڑھی میں سوتے تھے۔ یہ محبِّ پاکستان خاندان تھا۔ اس کے اردگرد جو آبادی تھی اُس میں بیشتر گھرانے مکتی باہنی میں تھے یا مکتی باہنی کے حامی تھے۔ ان میں جو پاکستان کے حامی گھرانے تھے وہ اس قدر کمزور اور غریب تھے کہ ڈر کے مارے "پاکستان مُردہ باد" اور "بنگلہ دیش زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے۔ ان نعروں نے اُن کو تحفّظ دے رکھا تھا۔ جو خاندان مکتی باہنی سے تعلق رکھتے تھے اُن خاندانوں کے بڑے بوڑھے اپنی نوجوان نسل کے ڈر کے

مارے بنگلہ دیشی بنے ہوئے تھے۔ یہ وہ بزرگ تھے جو تحریکِ پاکستان کے نوجوان مجاہدین ہوا کرتے تھے۔ اب وہ آہیں بھرنے اور چوری چھپے آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ آبادی مکتی باہنی کا گڑھ بنی ہوئی تھی اور صبیحہ کا خاندان مکتی باہنی کے سینے میں کانٹے کی طرح اُترا ہوا تھا۔

صبیحہ کے دروازے پر دستک ہوئی تو ان آدمیوں میں سے ایک اُٹھا جو ہر رات صبیحہ کی ڈیوڑھی میں سویا کرتے تھے۔ مکتی باہنی والے ان آدمیوں کے متعلق کہا کرتے تھے کہ شمس نے کرائے کے غنڈے پال رکھے ہیں۔ صبیحہ کا باپ شمس امیر کبیر آدمی تھا۔ وہ کرائے کے غنڈے پال سکتا تھا لیکن اُس نے اپنے ساتھ جو آدمی رکھے ہوئے تھے وہ لڑاکے بھی تھے اور پاکستان کے حامی بھی۔ ان میں سے ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ باہر دو آدمی کھڑے تھے۔

"شمس میاں کو باہر بھیجو" — اُن دو میں سے ایک نے کہا۔

"وہ سوئے ہوئے ہیں" — شمس کے آدمی نے کہا — "اُن سے جو بات کرنی ہے وہ مجھ سے کر لو۔"

اس آدمی نے اُن دونوں کو پہچان لیا تھا۔ وہ دونوں مکتی باہنی کے آدمی تھے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دونوں اچھی نیّت سے کر نہیں آئے۔ انہیں وہ ٹال رہا تھا کہ اتنے میں اُس کے دو اور ساتھی جو ڈیوڑھی میں سوئے ہوئے تھے، جاگ کر باہر آ گئے۔

"دیکھو بھائیو!" — اِن میں سے ایک نے مکتی باہنی والوں سے کہا — "تم ہمیں جانتے ہو کہ ہم یہاں کیوں رات کو موجود رہتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ تم کون ہو اور کس لیے آئے ہو۔ ہم شمس میاں کو باہر نہیں آنے دیں گے۔"

"ہم جو بات کرنے آئے ہیں وہ تمھارے ہی فائدے کی ہے" — مکتی باہنی کے ایک آدمی نے کہا — "ہم لڑنے جھگڑنے نہیں آئے۔"

"تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو" — شمس کے ایک آدمی نے مکتی باہنی کے ایک آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑا اور کہا — "لیکن تم ہندو کی اولاد ہو۔"

مکتی باہنی کے دونوں آدمی ہنس پڑے۔ اتنے میں شمس خود ہی باہر آ گیا اور اُس نے پُوچھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

"شمس میاں!" — مکتی باہنی کے ایک آدمی نے کہا — "ہم آپ کو یہی بتانے آئے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔"

"آپ کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ رات کو اس دیش پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے" — مکتی باہنی کا دُوسرا آدمی بولا — "رات کو پاکستان آرمی باہر آ گئی ہے اور اُس نے بنگالیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب پاکستان کے فوجی ہمارے گھروں کو لُوٹیں گے اور ہماری عورتوں کو...."

"یہ تم نہیں، تمھاری زبان سے ہندو بول رہا ہے" — شمس نے کہا — "پاکستان آرمی اگر باہر نکل آئی ہے تو بہت اچھا ہُوا ہے۔ تم جیسے سانپوں اور بچھوؤں کے سر کچلنے کے لیے پاکستان

آرمی کا حرکت میں آنا ضروری تھا۔ قتلِ عام تم نے کیا ہے۔ غیر بنگالیوں اور مُحبِّ وطن بنگالیوں کے گھروں کو تم نے لُوٹا ہے اور اُن کی عورتوں کو تم نے اغوا کیا ہے۔ اب اگر تمھارے گھر لُٹ گئے تو اس کا مجھے کیا غم ہے۔ تمھارے ساتھی میرے گھر پر بھی وار کر چکے ہیں۔"

"شمس میاں!" — مکتی باہنی کے آدمی نے کہا۔

"پہلے میری بات سن لو غدّارو!" — شمس نے کہا — "دیہات میں جا کر دیکھو۔ بھارت کے ہندو کمانڈو مسلمان عورتوں کی آبرو ریزی کر رہے ہیں۔ ان ہندوؤں نے اُن کے گھروں میں چاول کا ایک دانہ نہیں رہنے دیا۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں شمس میاں!"

"جو میں جانتا ہُوں وہ تم نہیں جانتے" — شمس نے کہا — "بھارت کے کمانڈو جو بنگالی مسلمانوں کے بھیس میں ہمارے دیش میں پھیلے ہوئے ہیں وہ پاکستان آرمی کی طرح خاکی وردی پہن کر دیہات میں جاتے اور ان لوگوں کو لُوٹتے اور انہیں خراب کرتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں کہ ہم پاکستان آرمی کے سپاہی ہیں.... اب کہو، کیا کہنے آئے ہو؟"

"ہم کہنے یہ آئے ہیں" — ایک نے کہا — "کہ ہم پاکستان آرمی کا مقابلہ کریں گے۔ آج اس آبادی کے ہر گھر پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا رہا ہو گا۔ آپ بھی اپنے مکان پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لگا دیں۔"

"اگر نہ لگاؤں تو؟" — شمس نے پوچھا۔

"تو ہم بتا نہیں سکتے کہ آپ کا انجام کیا ہو گا" — مکتی باہنی کے آدمی نے جواب دیا۔

شمس ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اُس کے عقب سے آواز آئی — "اس مکان پر صرف پاکستان کا جھنڈا لہرائے گا" — یہ شمس کے بیٹے شبّیر الحسن کی آواز تھی جسے ماں نے جگا کر باہر بھیجا تھا۔

"ہم آپ کو صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ آج آپ کے مکان پر بنگلہ دیش کا جھنڈا ہونا چاہیے" — مکتی باہنی کے ایک آدمی نے کہا اور دونوں چلے گئے۔

✪

اس قصبے میں ایک ہائی سکول تھا جو اب ویران پڑا تھا۔ میجر اصغر اور لیفٹیننٹ طاہر پرویز کی بٹالین کو یہی قصبہ اور اس کے اردگرد کا دیہاتی علاقہ دیا گیا۔ اصغر اور طاہر پرویز کی کمپنی کو قصبے میں رکھا گیا۔ باقی بٹالین کو دیہاتی علاقے میں بھیج دیا گیا۔ اس علاقے میں انٹیلی جنس کی اطلاعات کے مطابق مکتی باہنی کی نفری خاصی زیادہ تھی۔ یہ قصبہ بھی بڑا خطرناک مقام تھا۔ اسے سنبھالنے کے لیے اگر پوری بٹالین کی نہیں تو کم از کم دو رائفل کمپنیوں کی ضرورت تھی لیکن پاک فوج کی نفری اس قدر کم تھی کہ اتنا نازک اور خطرناک مقام صرف ایک کمپنی کے حوالے کر دیا گیا۔ میجر اصغر اس کمپنی کا کمانڈر تھا اور اس کمپنی کی تین میں سے ایک پلاٹون کا کمانڈر طاہر پرویز تھا۔ میجر اصغر نے ہائی سکول میں اپنا کمپنی ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔

رات کو اُنہیں قصبے میں جانے کا حکم مِلا تھا لیکن اُنہوں نے رات کو کوئی فوجی کارروائی نہیں کی تھی۔ صبح میجر اصغر نے تینوں پلاٹون کمانڈروں، اُن کے صوبیداروں اور نائب صُوبیداروں کو احکام کے لیے بلایا۔

"آپ سب کو معلوم ہے کہ یہاں کی صُورتِ حال کیا ہے"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔ "ہمیں ایسی ڈیوٹی دی گئی ہے جو ہمیں نہیں کرنی چاہیئے تھی۔۔۔۔ کیا آپ میں سے کوئی ایسا ہے جو اپنے بھائی پر گولی چلائے گا؟۔۔۔۔ نہیں، لیکن آپ جب اس آبادی میں گشت کے لیے اور اپنی ڈیوٹی کے لیے نکلیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ ہمارے بھائیوں نے اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ آپ کو یہاں اُن بنگالی مسلمانوں کے جلے ہوئے گھر نظر آئیں گے جو 'پاکستان زندہ باد' کے نعرے کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ یہاں آپ کو غیر بنگالیوں کی لاشوں کی ہڈیاں بھی نظر آئیں گی۔ اُن کی بیٹیوں کو اغوا اور بے آبرو کر کے انڈیا بھیج دیا گیا ہے۔۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ اس درندگی اور وحشی پن کے پیچھے ہندو کا ہاتھ ہے لیکن میں آپ سے پوچھتا ہُوں، کیا آپ ہندو سے پیسہ لے کر ایک دوسرے پر گولیاں چلائیں گے؟"۔۔۔ میجر اصغر نے باری باری ہر ایک کے چہرے کو دیکھا اور کچھ دیر چپ رہا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہُوئی جا رہی تھیں جیسے وہ آنسوؤں کو روکنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہو۔

"ہمیں بڑا ہی ناخوشگوار فرض سونپا گیا ہے"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔ "لیکن پاکستان کی سلامتی اور وقار کا تقاضا یہی ہے کہ ہم یہ فرض پورا کریں۔ بریگیڈ ہیڈکوارٹر سے جو احکام آئے ہیں وہ بالکل صاف ہیں۔۔۔۔ جہاں سے ایک گولی تم پر فائر ہوتی ہے، وہاں مشین گن فائر کرو۔ جن مکانوں سے تم پر زیادہ فائر آئے وہاں مارٹر گنوں کے گولے پھینکو۔ اگر دس غدّاروں کو ختم کرنے کے لیے ایک محبِّ وطن بھی تمھاری گولیوں سے مارا جاتا ہے تو پروا نہ کرو۔ ہم بھی مرنے کے لیے آئے ہیں۔۔۔۔

"ہم حکم کے پابند ہیں۔ سیاست کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اتنے سخت ملٹری ایکشن کی ضرورت نہیں ہونی چاہیئے تھی لیکن یہ لوگ باتوں سے نہیں سمجھ سکے۔ باتوں کا وقت گزر چکا ہے۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ آپ کا مقابلہ صرف مسلمانوں سے نہیں۔ جہاں دس بنگالی تمھارے مقابلے میں آئیں گے اُن میں آدھے ہندو ہوں گے۔ یہ بھی سوچ لو کہ ہر بنگالی کو سویلین نہ سمجھ لینا۔ وہ انڈین آرمی کا کمانڈو اور گوریلا ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی پوزیشنیں مضبوط کر رکھی ہیں۔۔۔۔

"مجھے رپورٹیں ملنی شروع ہو گئی ہیں اور کچھ خبریں بٹالین ہیڈکوارٹر سے بھی آئی ہیں۔ ان کے مطابق ہمیں یہاں کئی گھروں پر چھاپے مارنے ہیں لیکن میں دن کے وقت ایسی کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ میں یہاں کے دشمن کو یہ تاثر دوں گا کہ اس قصبے کے متعلق ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں اور ہم یہاں صرف گشت کرنے اور سکول میں بیٹھنے کے لیے آئے ہیں۔ ہماری کمپنی کا ایکشن آج رات کو اُس وقت شروع ہو گا جب قصبہ سو رہا ہو گا۔ وقت نوٹ کر لیں۔۔۔۔ آج رات پُورے گیارہ بجے۔ کمپنی تیاری کی حالت میں رہے گی۔ ٹاسک اُس وقت بتایا جائے گا۔ ابھی صرف پٹرولیں بھیجی جائیں گی۔۔۔۔ لیفٹیننٹ طاہر!"

"یس سَر!"

"آج دن کو تمھاری پلاٹون کی پٹرولیں جائیں گی"۔۔۔ میجر اصغر نے لیفٹیننٹ طاہر پرویز کو حکم دیا۔۔۔ "ہر پٹرول پارٹی میں ایک نائیک یا لانس نائیک اور تین جوان ہوں گے۔ میں نقشے پر ان کی گشت کا رُوٹ ابھی بتاتا ہوں۔ یہ گشت اس طرح کریں گے جیسے سَیر سپاٹے کے لیے نکلے ہوں۔ اگر کوئی بنگالی انہیں گالی دیتا یا کوئی الٹی سیدھی حرکت کرتا ہے تو پٹرول پارٹی اس کے جواب میں کوئی حرکت نہیں کرے گی۔ جوانوں کو اچھی طرح سمجھا دو۔۔۔۔ میں ایک بار پھر دُہراتا ہوں کہ ہمیں یہ تاثر دینا ہے کہ ہم تو ویسے ہی ادھر آ نکلے ہیں، عملاً ہم کچھ نہیں کریں گے"۔

اس کے بعد میجر اصغر نے فوجی نوعیت کے احکام دیئے، کچھ ہدایات دیں اور سب کو جانے کی اجازت دے دی۔

"لیفٹیننٹ طاہر پرویز!"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔ "تم یہیں رہو"۔

طاہر پرویز رُک گیا۔ باقی سب چلے گئے۔

"بیٹھو طاہری!"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔ "تم جانتے ہو نا، کہ تم میری بہت بڑی ذمہ داری ہو۔ تمھارے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی تو مجھے خالہ طاہرہ کو جواب دینا پڑے گا کہ میرے ہوتے ہُوتے یہ گڑبڑ کیوں ہوئی۔ اگر تم ایکشن میں یا فیلڈ میں زخمی یا شہید ہو گئے تو خالہ طاہرہ اور انکل ارشد مجھ سے جواب طلبی نہیں کریں گے۔ اُنہوں نے تمہیں پاکستان کی قربان گاہ پر دل و جان سے کھڑا کر دیا ہے لیکن تم اپنی غلطی یا کسی حماقت کا شکار ہو گئے تو میں انکل اور خالہ کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔۔۔ میں اس وقت تمھارے ساتھ بڑے بھائی کی حیثیت سے بات کر رہا ہُوں"۔

"آپ فکر نہ کریں بھائی جان!"۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ "مجھ سے کوئی غلطی یا حماقت سرزد نہیں ہو گی۔ کمپنی صوبیدار میرے ساتھ ہو گا۔ وہ بڑا پرانا اور تجربہ کار سینئر جے۔ سی۔ او ہے۔ پلاٹون حوالدار مجاہد خان بھی میرے ساتھ ہے۔ مجھے اس کی قابلیّت پر بھروسہ ہے"۔

"میں ایکشن کی بات نہیں کر رہا"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔ "مجھے معلوم ہے کہ اپنا فرض پُورا کرنے میں تم اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرو گے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ صبیحہ اسی قصبے میں ہے"۔

"اوہ بھائی جان!"۔۔۔ طاہر پرویز نے ہنستے ہُوئے کہا۔۔۔ "آپ مجھے۔۔۔۔"

"طاہری!"۔۔۔ اصغر نے پہلے سے زیادہ سنجیدہ لہجے میں کہا۔۔۔ "نوجوانی کے جذبات ذاتی جذبے اور فرض پر غالب آ جایا کرتے ہیں۔ تم شاید ابھی تک سمجھ نہیں سکے کہ صورتِ حال کس قدر سنگین اور خطرناک ہے۔۔۔۔ میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہُوں کہ صبیحہ کا گھر مکتی باہنی کے لوگوں کے نرغے میں ہے۔ بٹالین ہیڈکوارٹر سے مجھے جو اطلاعات دی گئی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آبادی ہمارے خلاف بڑا سخت مورچہ بن سکتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم صبیحہ کے گھر جا پہنچو اور اُس کے خاندان کو بچانے میں لگ جاؤ"۔

"کیا وہ لوگ خطرے میں ہیں؟"

"بہت زیادہ خطرے میں طاہری!"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "مجھے اس قصبے کے دس گیارہ بنگالیوں کے نام اور ایڈریس دیئے گئے ہیں جو سچے پاکستانی ہیں۔ یہ سب ہماری مدد کریں

گئے۔ ان میں سرِفہرست صبیحہ کے باپ کا نام ہے۔ ہوسکتا ہے.... شاید ہوگا بھی یہی کہ مُکتی باہنی یا دوسرے لفظوں میں انڈیا کے کمانڈو اور یہاں کے ہندو شہری پہلے پاکستان کے اِن حامیوں کو ختم کریں گے۔"

"انہیں بچانے کے لیے کیا حکم ہے؟"

"کوئی حکم نہیں" —— اصغر نے کہا —— "اگر تم اتفاق سے اُدھر جا نکلو تو انہیں بچا سکتے ہو لیکن خاص طور پر یعنی اپنی ڈیوٹی سے ہٹ کر اُدھر نہیں جا سکتے.... یہ فوج ہے طاہری! ہوسکتا ہے تمھارے حکم سے مارٹر گن کا فائر کیا ہُوا گولا صبیحہ کے گھر میں جا پڑے۔"

"اگر پاکستان کے حامیوں کو ہم یہاں سکول میں لے آئیں تو....!"

"نہیں طاہری!" —— اصغر نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا —— "ایسا کوئی حکم نہیں آیا۔ میں تمھیں یہ کہہ رہا ہُوں کہ صبیحہ کو ذہن سے نکال دو.... میں نے بھی محبّت کی ہے طاہری!.... محبت کو قربان بھی کیا ہے۔ تم بھی اپنے جذبات کو سُلا دو، ورنہ مجھے ڈر ہے کہ تم حرام موت مرو گے.... سمجھے طاہری؟"

"ہاں بھائی جان!" —— طاہر پرویز نے کہا —— "سمجھ گیا ہوں۔"

✪

".... اور تم سب کو سمجھ لینا چاہیئے کہ آج کا دن ہماری زندگی کا آخری دن ہوسکتا ہے" —— صبیحہ کا باپ شمس اپنے کُنبے سے کہہ رہا تھا —— "اپنی ماں سے پوچھو ہم نے پاکستان کس طرح حاصل کیا تھا.... میں جہادِ آزادی کی داستان تمھیں کئی بار سُنا چکا ہُوں۔ ہم پاکستانی ہیں، پاکستانی ہی رہیں گے۔ میں خدا کے حضور اپنے منہ پر یہ سیاہ داغ لے کر نہیں جانا چاہتا کہ میں نے اپنے گھر پر اسلام اور پاکستان کے غدّاروں کا جھنڈا چڑھایا تھا۔"

"ڈیڈی!" —— صبیحہ بول پڑی —— "آپ نے کیوں ضروری سمجھا ہے کہ ہمیں یاد دلائیں کہ ہم پاکستانی ہیں؟ کیا آپ کو ہمارے ایمان اور جذبے پر شک ہے؟"

"کبھی کبھی حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ ایمان اور جذبے متزلزل ہو جاتے ہیں" —— شمس نے کہا اور اپنے دونوں بیٹوں شبّیر الحسن اور صغیر الحسن کی طرف دیکھ کر بولا —— "خدا کا شکر ادا کرتا ہُوں کہ ان دونوں بھائیوں کے دلوں اور دماغوں پر میرا خون غالب آگیا ہے، ورنہ یہ تو باغی ہو گئے تھے۔ میں خدشہ محسوس کر رہا ہوں کہ موت کو سامنے دیکھ کر تم میں سے کسی کے قدم اُکھڑ نہ جائیں۔"

"نہیں اُکھڑیں گے ڈیڈی!" —— شبّیر الحسن نے کہا —— "ہمارے قدم نہیں اُکھڑیں گے۔ آپ بتائیں ہمیں کرنا کیا ہے۔"

"پہلے یہ دیکھو کہ کیا ہونے والا ہے اور ہمارے لیے کتنی خطرناک اور صبر آزما صورت پیدا ہوسکتی ہے" —— شبّیر الحسن کے باپ نے کہا —— "اِس کے مطابق دیکھنا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہم بھاگیں گے نہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہم ابھی، اسی وقت اپنے

مکان پر پاکستان کا جھنڈا لہرائیں گے۔ ہوگا یہ کہ پاکستان کا جھنڈا بنگلہ دیشی جھنڈوں کے محاصرے میں ہوگا۔ مکتی باہنی والے ہمارے جھنڈے کو اتارنے کی کوشش کریں گے۔ ہم اُن کی کوشش کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ اُن کی کوشش زبانی نہیں ہوگی۔ وہ رائفلوں اور مشین گنوں کی زبان استعمال کریں گے۔ ہم باقاعدہ مورچہ بنا کر ان کا مقابلہ کریں گے۔ ہم اکیلے نہیں ہوں گے۔ فوج آ گئی ہے۔ میں فوجیوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ انہیں اس آبادی کی رپورٹ دوں گا۔"

"یہ میجر اصغر اور لیفٹیننٹ طاہر پرویز کی بٹالین ہوگی" —— شبّیر الحسن نے کہا —— "دونوں ہمارے دوست ہیں۔"

"دوست نہ بھی ہُوتے تو کیا" —— ان کے باپ نے کہا —— "پاکستان آرمی کے ہر ایک سپاہی اور افسر کو اپنا دوست سمجھو۔ اب سنو ہمیں کیا کرنا ہے.... تم جانتے ہو کہ یہ آبادی مکتی باہنی کا مرکز اور مضبوط اڈہ بن گئی ہے۔ ان لوگوں کے پاس انڈیا کا دیا ہُوا بےشمار اسلحہ اور ایمونیشن ہوگا۔ اب جب کہ فوج اچانک آگئی ہے، یہ لوگ یہاں سے اسلحہ اور ایمونیشن اٹھا کر کہیں اور نہیں لے جا سکتے۔ یہ لوگ زیرِ زمین رہیں گے یا چھاپہ پڑنے کی صورت میں مکانوں میں مورچہ بند ہو کر فوج کا مقابلہ کریں گے..

"اس صورت میں ہم اپنے مکان کی اوپر والی منزل کو مورچہ بنا کر ان لوگوں پر فائرنگ کریں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہم پر فائرنگ کریں گے اور تم جانتے ہو کہ ہم زخمی ہوں گے، شاید مارے بھی جائیں۔ یہ موت نہیں شہادت ہوگی۔ یہ سوچ لو کہ ہم بھاگیں گے نہیں اور اگر بھاگ اُٹھے تو ہمارے لیے کوئی پناہ نہیں۔ ہمارے لیے ہر جگہ موت ہے۔ اگر مرنا ہی ہے تو کیوں نہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہُوئے موت کو قبول کریں.... شبّیر! گھر میں کتنے ہتھیار ہیں؟"

"دو ٹامی گنیں اور چھ رائفلیں ہیں" —— اُس کے بیٹے شبّیر الحسن نے جواب دیا۔

"تین ریوالور ہیں" —— شبّیر الحسن کے چھوٹے بھائی صغیر الحسن نے بتایا —— "میرا مکتی باہنی والا لیڈر مجھ سے یہ ہتھیار واپس مانگ چکا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ دے دوں گا۔"

"اور ایمونیشن؟"

"کافی ہے" —— شبّیر الحسن نے جواب دیا —— "لیکن ایمونیشن کے معاملے میں ہم فضول خرچی نہیں کر سکیں گے۔"

"دوپہر کے بعد میرے پاس اگر زیادہ نہیں تو آٹھ آدمی آجائیں گے" —— شمس نے کہا —— "ان کے پاس ایک دو ہتھیار ضرور ہوں گے۔ وہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ اب یوں کرو کہ اوپر کی منزل پر اُس جگہ پاکستان کا جھنڈا لگا دو جو ہم نے ہر ۱۴ اگست کو جھنڈا لگانے کے لیے بنائی ہوئی ہے۔ دونوں منزلوں کی کھڑکیوں اور روشندانوں کو اچھی طرح دیکھ لو اور وہاں سے فائرنگ کرنے کی جگہ بنا لو" —— اُس نے صبیحہ اور اُس کی ماں کی طرف دیکھا اور کہا —— "تم دونوں اُوپر کی منزل میں رہنا۔ گھبرانا نہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ بھی نہ ہو لیکن بہت کچھ ہو جانے کا خطرہ بھی ہے۔"

"میں بیٹھوں گی نہیں ڈیڈی!" —— صبیحہ نے کہا —— "مجھے رائفل چاہیئے۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔"

"ہاں ہاں!" — صبیحہ کی ماں بولی — "ہم بیٹھیں گی کیوں؟ ایک رائفل مجھے بھی دے دینا۔"

"جاؤ، تم دونوں جھنڈا اوپر لگا آؤ" — صبیحہ کے باپ نے صبیحہ اور اُس کی ماں سے کہا — "اور تم شبیّر! باہر جاکر دیکھو کہ پاکستان آرمی کی کتنی نفری آئی ہے اور اُس کا ہیڈ کوارٹر کہاں بنایا گیا ہے۔"

صبیحہ اور اُس کی ماں اُس کمرے میں چلی گئیں جس میں کسی ٹرنک میں پاکستان کا پرچم رکھا تھا۔

✪

مشرقی پاکستان میں کوئی قانون نہیں رہ گیا تھا۔ وہاں اب خاک اڑتی اور خون بہتا تھا۔ لوگ رائفل اور ریوالور کی زبان میں بات کرتے تھے۔ خنجر اور دھا چلتے تھے۔ لوگ کھُلے بندوں اسلحہ اور دیگر ہتھیار اٹھائے پھرتے تھے۔ غیر بنگالی اپنے بیوی بچّوں سمیت مارے جا چکے یا وقت سے پہلے مغربی پاکستان چلے گئے تھے اور جو کسی نہ کسی طرح بچ گئے اور وہاں سے نکل نہیں سکے تھے، وہ ریفیوجی کیمپوں میں تھے۔ ان کیمپوں میں وہ قتل ہونے سے بچے ہوتے تھے لیکن بڑی ہی اذیّت ناک زندگی بسر کر رہے تھے۔ باہر سے کچھ کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ بچے بھوک پیاس سے بلبلاتے اور مرتے تھے۔

قتل ہونے والوں میں وہ بنگالی بھی تھے جو شمس اور اُس کے خاندان کی طرح ابھی تک اپنے آپ کو پاکستانی کہتے تھے۔ وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ ان میں سے وہی قتل ہوتے جو بے خبری میں مکتی باہنی کے ہاتھ آ گئے تھے یا جو نہتّے تھے باقی محبِّ پاکستان بنگالیوں نے اِدھر اُدھر سے ہتھیار حاصل کر لیے تھے اور وہ مکتی باہنی کا مقابلہ کر رہے تھے۔

اگر شمس کے گھر میں اتنے زیادہ ہتھیار تھے تو یہ عجوبہ نہ تھا مشرقی پاکستان میں بغیر لائسنس اسلحہ رکھنا جرم نہیں رہا تھا۔ اگر یہ جرم تھا تو پکڑنے والا کوئی نہ تھا۔

میجر اصغر نے اُس آبادی پر جو مکتی باہنی کا اڈہ بنی ہوُئی تھی، چھاپہ مارنے کا وقت رات گیارہ بجے رکھا تھا۔ شمس نے مکتی باہنی کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے دومنزلہ مکان کو مورچہ بنا لیا تھا اور مکتی باہنی والے فوج کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

"ایک کمپنی ....صرف ایک کمپنی" — مکتی باہنی کا ایک مُخبر شمس کے گھر کے پڑوس میں کہیں اپنے لیڈر کو بتا رہا تھا کہ قصبے میں پاکستان آرمی کی کتنی نفری آئی ہے۔ اُس نے بتایا — "اس کمپنی نے سکول کو ہیڈ کوارٹر اور کیمپ بنایا ہے۔ نفری شاید ایک سو پچاس یا اس سے کچھ کم یا زیادہ ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کمپنی پکنک پر آئی ہے۔ میں دیکھ آیا ہوں۔ صرف چار سپاہی شہر میں گشت کر رہے ہیں کمپنی کمانڈر نوجوان سا آدمی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے معلوم نہیں کہ ہماری یہاں کتنی نفری ہے۔ وہ شاید اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ اس قصبے میں امن ہی امن ہے۔ اگر اس کمپنی کو یہاں ہماری موجودگی کا علم ہوتا تو یہ لوگ آتے ہی آبادی میں گھُس آتے۔"

"ہمیں خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے" — لیڈر نے کہا — "ہماری تیاری مکمل ہے۔ یہ کمپنی کسی بھی طرف سے آبادی کے اندر آئی، اسے ہمارے بے پناہ فائر کا سامنا کرنا پڑے گا" — اُس نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کہا — "ہم اس کمپنی کے چھاپے کا انتظار

نہیں کریں گے۔ آج کا دن ہم کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ اپنے تمام آدمیوں سے کہہ دو کہ دن کے وقت معمولی سے کپڑے پہن کر باہر گھومتے پھرتے رہیں لیکن اپنے مورچے کا بھی خیال رکھیں۔"

مکتی باہنی کی جو نفری اس آبادی میں تھی، اس میں انڈین آرمی کے فوجی بھی تھے جو بنگالی مسلمانوں کے بھیس میں ان مکانوں میں موجود تھے۔ اس نفری میں ایسٹ بنگال رجمنٹوں کے بھگوڑے سپاہی اور عہدیدار بھی تھے اور ان میں اس آبادی کے رہنے والے بھی تھے جن میں ہندو بھی شامل تھے۔ یہ تمام نفری جن گھروں میں رہ رہی تھی یہ آباد گھر تھے۔ ان میں عورتیں اور بچّے تھے۔ ان مکانوں میں ایک مکان شمس کے مکان جیسا اچھا اور دومنزلہ تھا۔ یہ ان لوگوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس میں نہ کوئی عورت تھی نہ کوئی بچّہ۔ یہ ایک ہندو کا مکان تھا جو کئی نسلوں سے یہاں آباد تھا۔

"ذرا اوپر جاکر دیکھو" — ایک آدمی اندر آیا اور اطلاع دی — "شبیرالحسن کے مکان پر پاکستانی جھنڈا لہرا رہا ہے۔"

"شمس میاں اپنی اور اپنے خاندان کی موت کو آوازیں دے رہا ہے" — مکتی باہنی کے ایک آدمی نے کہا — "شبیّر اور صغیر ہم سے باغی ہیں اور اُنہوں نے مشین گنیں ابھی تک واپس نہیں کیں۔"

"آج صبح اُسے ہم نے کہا تھا کہ اپنے مکان پر بنگلہ دیش کا جھنڈا چڑھاتے" — لیڈر نے کہا۔ "اُس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اب اُس نے پاکستان کا جھنڈا چڑھا کر ہمیں چیلنج کیا ہے.... اگر فوج کے ساتھ ہماری ٹکر ہو گئی تو شمس کے گھر پر حملہ کر دینا۔ وہاں کسی کو زندہ نہ چھوڑنا اور اُس کی بیٹی کو زندہ اٹھا لانا.... اور اپنے تمام آدمیوں کو بتا دو کہ اب ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔ ہمیں لڑنا ہے اور پاکستان آرمی کی اس کمپنی کو ختم کرنا ہے۔"

لیڈر نے اپنے آدمیوں کو اُسی طرح ہدایات دیں جس طرح میجر اصغر نے اپنی کمپنی کے تینوں پلاٹون کمانڈروں کو اور شمس نے اپنے کنبے کو دی تھیں۔

"اِس کمپنی کا اندر رہنا رہا ہے کہ اسے اس قصبے کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں" — لیڈر نے کہا — "اگر آج رات کو بھی یہ کمپنی کوئی حرکت اور کارروائی نہ کرے تو ہم اس پر فائر کھول دیں گے۔ سکول ہماری زد میں ہے۔ ہمارا فائر اس طرح ہوگا کہ سکول کے احاطے سے ہم کسی کو باہر نہیں نکلنے دیں گے۔"

✪

دوپہر کے کھانے کے بعد میجر اصغر سکول کے برآمدے میں کھڑا تھا کہ شبیرالحسن آ گیا۔ لیفٹیننٹ طاہر پرویز نے اُسے دیکھ لیا اور دوڑا آیا۔ میجر اصغر نے شبیرالحسن کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ طاہر پرویز نے اصغر سے اُس کا تعارف کرایا اور اُسے اندر لے گئے۔

"میں کچھ بتانے آیا ہوں" — شبیرالحسن نے کہا اور اپنی آبادی کے متعلق پوری رپورٹ دی۔ اُس نے رپورٹ دے کر کہا — "ہمارا گھر مکتی باہنی کے خلاف مورچہ بن چکا ہے۔ ہمارے پاس ہتھیار ہیں اور ایمونیشن کافی ہے۔"

"لیکن تمہارا مکان مکتی باہنی میں گھِرا ہوُا ہے" — طاہر پرویز نے کہا — "تم لوگ نقصان اٹھاؤ گے۔"

"جو کچھ بھی ہوگا دیکھ لیں گے"۔۔۔ شبیر الحسن نے کہا۔۔۔ "ڈیڈی نے ہمیں ایسے ہی کہا ہے۔ ہم ایسے ہی کریں گے۔ آپ باہر نکلیں اور ذرا آگے جا کر دیکھیں۔ صرف ہمارا مکان ہے جس پر آپ کو پاکستان کا جھنڈا نظر آئے گا۔ ہم نے کچھ سوچ کر پاکستان کا جھنڈا چڑھایا ہے۔"

شبیر الحسن کی رپورٹ سُن کر میجر اصغر بہت خوش ہُوا۔ شبیر الحسن نے چند ایک گھروں کی نشاندہی کی تھی جن میں اسلحہ، ایمونیشن اور فوجی سامان تھا۔ اُس نے اُس دو منزلہ مکان کی بھی نشاندہی کی تھی جسے مکتی باہنی نے اس قصبے میں اپنا خفیہ ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ اصغر نے شبیر الحسن کو نہ بتایا کہ اُس نے اس آبادی کو دشمن عناصر سے پاک کرنے اور چھپا ہُوا اسلحہ نکالنے کے لیے کیا سکیم بنائی ہے۔

"میں تمہارے خاندان کے جذبے کی داد دیتا ہُوں"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔ "تمہارے ڈیڈی نے اپنے خاندان کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اب تم سب کو ہر لمحہ ہوشیار اور چوکس رہنا پڑے گا۔ میں احکام لے چکا ہوں۔ میری کمپنی جو بھی کارروائی کرے گی رات کو کرے گی۔ تم جاؤ اور کوئی اور خبر یا اطلاع ہو تو شام تک مجھے دے دینا..... اپنے ڈیڈی کو میرا اسلام کہنا۔ اگر دشمن نے تمہارے خلاف کوئی حرکت کی تو میں تمہاری مدد کو فوراً پہنچوں گا۔"

شبیر الحسن جانے لگا تو طاہر پرویز بھی اُس کے ساتھ چل پڑا۔

"آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہُوئی ہے طاہر صاحب!"۔۔۔ شبیر الحسن نے باہر جا کر طاہر پرویز سے کہا۔۔۔ "میں صبیحہ کو بتاؤں گا کہ آپ یہاں ہیں تو وہ بہت خوش ہوگی.... آپ ہمارے گھر آئیں گے نا!"

"اس کا انحصار حالات پر ہے"۔۔۔ طاہر پرویز نے جواب دیا۔۔۔ "ہم نے اس آبادی کو صاف کر دیا تو ضرور آؤں گا۔"

کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ حالات کیا سے کیا ہو جائیں گے۔ قصبے پر موت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہاں کی گلیوں اور وہاں کے بازاروں میں اچھے وقتوں والی رونق نہیں تھی۔ فضا میں کھچاؤ صاف محسوس ہو رہا تھا۔ شبیر الحسن نے جب طاہر پرویز سے ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہا تو وہ مسکرایا لیکن یہ مسکرانے کی کوشش تھی۔ طاہر بڑی مشکل سے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لایا تھا۔ شبیر الحسن کے جانے کے بعد وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا، پھر اُس کی نظریں سامنے مکانوں کی منڈیروں پر گھومنے لگیں۔ اُسے بنگلہ دیش کے بہت سے جھنڈے نظر آئے۔ طاہر پرویز وہاں اپنے آپ کو اجنبی اور غیر ملکی سمجھنے لگا اور اُسے ایسے لگا جیسے یہ مکان اُسے نفرت سے گھور رہے ہوں اور منڈیروں پر پھڑپھڑاتے ہُوئے یہ جھنڈے جو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے، اُسے یوں پھڑپھڑاتے دکھائی دینے لگے جیسے گِدھوں کے پَر اُس کی طرف بڑھ رہے ہوں۔

وہ تصور کی آنکھ سے صبیحہ کو دیکھنے لگا۔ وہ اُس گھر میں جا چکا تھا جہاں صبیحہ رہتی تھی مگر اب وہ اُس گھر تک نہیں جا سکتا تھا۔ اُس کے راستے میں خون کا دریا حائل ہو گیا تھا۔ اُسے جب خیال آیا کہ صبیحہ دشمن کے نرغے میں ہے اور اُس کے باپ نے اپنے مکان پر پاکستان کا جھنڈا لگا کر اپنے دشمن کو مشتعل کیا ہے تو اُس کے دل پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اُس نے بنگالیوں کی درندگی کی بہت سی کہانیاں سُنی تھیں۔ وہ کانپ اُٹھا۔ اگر وہ وردی میں نہ ہوتا اور فوجی ڈسپلن کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا نہ ہوتا تو دوڑ کر صبیحہ کے گھر پہنچ جاتا۔

"تم صبیحہ کے گھر نہیں جا سکو گے طاہری!"

وہ چونک پڑا اور دیکھا میجر اصغر اُس کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اپنے خیالوں اور تصوّروں میں ایسا گم ہو گیا تھا کہ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ اصغر کس وقت اُس کے پاس آن کھڑا ہُوا تھا۔

"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "تم لیفٹیننٹ ہو طاہری!.... پلاٹون کمانڈر!.... چلو یہاں سے۔"

طاہر پرویز وہاں سے چل پڑا۔

شبیر الحسن نے گھر جا کر بتایا کہ طاہر پرویز سکول میں اپنی کمپنی کے ساتھ ہے تو صبیحہ کا چہرہ چمک اٹھا۔ وہ اپنے بھائی سے پوچھ نہ سکی کہ طاہر اُن کے گھر آئے گا؟ وہ اپنے مکان کی دوسری منزل کی چھت پر چلی گئی اور ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر اُس طرف دیکھنے لگی جس طرف سکول تھا۔ اُسے تھوڑی ہی دُور درختوں میں سکول کی منڈیر نظر آ رہی تھی۔ اس سے نیچے اُسے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ آگے مکان تھے۔ وہ مایوس ہو کر چھت سے اُتر آئی۔

✪

رات کو سات آدمی صبیحہ کے گھر میں موجود تھے۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ دو آدمی چھتوں پر جاگ رہے تھے۔ رات خاموش تھی۔ راتیں تو خاموش ہی ہُوا کرتی ہیں لیکن اُس رات کی خاموشی ڈراؤنی سی تھی۔ صبیحہ کا باپ شمس اور بڑا بھائی شبیر الحسن اور چھوٹا بھائی صغیر الحسن باری باری جاگتے اور کھڑکی کھول کر یا کسی روشندان میں سے یا چھت پر جا کر ہر طرف دیکھتے تھے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کس لمحے کیا ہو جاتے۔ انہیں یہ تو معلوم ہی تھا کہ رات کو میجر اصغر کی کمپنی کوئی کارروائی ضرور کرے گی۔

مشرقی پاکستان میں ایک شمس کا ہی خاندان نہیں تھا جو پاک فوج کی مدد اور رہنمائی کر کے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہا تھا، بے شمار خاندان تھے جو ملٹری ایکشن کے ساتھ ہی باہر نکل آئے اور پاک فوج سے جا ملے تھے لیکن ان کا انجام بہت بُرا ہُوا۔ پاکستان کی محبت انہیں بہت مہنگی پڑی تھی۔

اس قصبے کی رات خاموش تھی۔ چاند دبے پاؤں اپنے سفر پر چلا جا رہا تھا۔ باہر زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ زندگی کے آثار تھے تو وہ مکانوں کے اندر تھے۔ چار دیواری کے اندر ہنگامے انگڑائیاں لے رہے تھے۔ طوفان اُٹھ رہے تھے۔

سکول کے اندر میجر اصغر کی کمپنی آبادی کو گھیرے میں لے کر گھروں پر چھاپے مارنے کے لیے فال اِن ہو گئی تھی اور میجر اصغر پلاٹون کمانڈروں اور صوبیداروں وغیرہ کو آخری ہدایات دے رہا تھا۔ کسی کو اُونچی آواز میں بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ سکول کے اندر بتیاں بجھی ہوئی تھیں تاکہ دشمن

کو کسی سرگرمی کا شک نہ ہو۔

آبادی کے کئی مکانوں میں مکتی باہنی کے آدمی کھڑکیوں، روشندانوں میں اور چھتوں پر بناتے ہوئے مورچوں میں بیٹھ گئے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ سکول میں پاک فوج کی جو کمپنی ہے، وہ کوئی حرکت نہیں کر رہی کمپنی سوئی ہوئی ہے، اس پر بے پناہ فائرنگ کرنی ہے پھر باہر نکل کر سکول کو گھیرے میں لینا اور پھر اندر جا کر کمپنی کو دست بدست لڑائی میں ختم کرنا ہے۔

رات کا ایک بج گیا۔

چاندنی میں سکول کی عمارت نظر آرہی تھی۔ مکتی باہنی والوں نے اس کی کھڑکیوں اور دروازوں کو دن کی روشنی میں بڑی اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ سکول کے احاطے میں چند ایک خیمے بھی کھڑے کر دیئے گئے تھے۔

✪

گھڑیوں کی منٹوں والی سوئیاں ذرا سا ہی آگے بڑھیں تو آبادی میں سے دو روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ یہ سکول کی عمارت کی طرف فائر کئے گئے تھے۔ ان کی روشنی میں سکول کی عمارت اور اس کے اردگرد کا کچھ علاقہ صاف نظر آنے لگا۔ یہ اشارہ تھا کہ سکول پر فائر کھول دو۔

میجر اصغر کی کمپنی کی ایک پلاٹون احکام لے کر برآمدے میں آگئی تھی۔ روشنی راؤنڈ فائر ہوتے ہی آبادی کی طرف سے رائفلوں اور مشین گنوں کا بے پناہ فائر کھل گیا۔ خوش قسمتی سے تمام فائر ذرا اونچا تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑوں کے زناٹے جوانوں کے سروں سے ذرا ہی اوپر سے گزر گئے۔ وہ فوجی تھے۔ ٹریننگ اور تجربے کے مطابق وہ پلک جھپکتے لیٹ گئے اور رینگ کر سکول کے احاطے کی دیوار تک چلے گئے۔ یہ دیوار بمشکل چار فٹ اونچی تھی۔

اب سکول کی طرف ایک روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ یہ پیراشوٹ والا راؤنڈ تھا۔ یہ کاغذ کا چھوٹا سا پیراشوٹ ہوتا ہے جو جلتے ہوتے روشنی راؤنڈ کو چند لمحوں کے لیے ہوا میں معلّق رکھتا ہے۔ دوسری پلاٹون نے بھی ایسا ہی ایک روشنی راؤنڈ فائر کر دیا۔ یہ پلاٹون اور تیسری پلاٹون ابھی سکول کے اندر تھیں وہ دوسری طرف سے ایک ایک جوان کر کے باہر آئیں۔ تمام جوان جھک کر یا رینگ کر احاطے کی دیوار تک پہنچتے تھے۔

اب دونوں طرف سے فائر ہونے لگا۔

"مشین گنیں اوپر بھیج دو" ــــ میجر اصغر نے چلّا کر کہا ــــ "ہر پلاٹون کی ایک ایک گن اوپر چلی جاتے"۔

سکول کی منڈیریں چھتوں سے تقریباً ایک ایک فٹ بلند تھیں جو بڑی اچھی آڑ مہیّا کرتی تھیں۔ تین مشین گنیں اوپر چلی گئیں۔ آبادی کی طرف سے بارش کی طرح فائر آرہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُدھر سے ایک روشنی راؤنڈ فائر ہوتا تھا۔ اِدھر سے بھی روشنی راؤنڈ فائر ہو رہے تھے۔ تین مشین گنیں جو اوپر چلی گئی تھیں، اُنہوں نے جاتے ہی فائر شروع کر دیا۔ ان کی بوچھاڑیں کھڑکیوں اور روشندانوں میں جا رہی تھیں۔

دشمن اناڑی نہیں تھا۔ اُس کی نفری میں انڈین آرمی کے کمانڈو اور پاک فوج کی ایسٹ بنگال رجمنٹوں کے بھگوڑے شامل تھے۔ اُن کا فائر اندھا دُھند نہیں تھا۔ پہلے تو ان کا فائر بے تحاشہ تھا جو دہشت پیدا کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد اُن کا فائر چپا تُلا ہو گیا اور رُک رُک کر آنے لگا۔ آدھے گھنٹے میں چھ سات جوان زخمی ہو گئے۔

پہلے فائر سامنے سے آرہا تھا پھر دائیں اور بائیں سے بھی آنے لگا اور ایک گھنٹے بعد دشمن کی پوزیشنیں نئے چاند کی شکل میں ہو گئیں۔ میجر اصغر سمجھ گیا کہ دشمن گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس نے اس کے مطابق اپنی پوزیشنوں میں ردّ و بدل کر لیا۔ اُس نے اپنے بٹالین ہیڈ کوارٹر کو وائرلیس سیٹ سے اطلاع دی اور تفصیل سے بتایا کہ یہاں کیا صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے اور کتنے جوان زخمی ہو چکے ہیں۔

"تمہیں ہماری پوزیشن معلوم ہے کہ کہاں ہے اور کتنی دُور ہے" ــــ میجر اصغر کو اُس کے کمانڈنگ آفیسر نے جواب دیا ــــ "ہم خود ایک ایکشن میں اٹکے ہوتے ہیں۔ ہم تمہیں مدد نہیں دے سکیں گے۔ دماغ حاضر رکھنا۔ اور اگر صورتِ حال تمہارے قابو میں نہ آتے تو مارٹر گنیں استعمال کرو۔ اُڑا دو۔ دشمن کو ختم کرنے کے لیے پوری آبادی کو اڑا دو۔ تمہارے پاس ایک آر۔ آر بھی ہے۔ پروا نہ کرو۔ اسے بھی استعمال کرو۔ اُڑا دو۔ اُڑا دو..... اطلاع دیتے رہنا"۔

کمانڈنگ آفیسر کے ساتھ بات کر کے میجر اصغر احاطے کی دیوار کی آڑ میں چلا گیا۔ فضا میں گولیاں اُڑ رہی تھیں۔ اُوپر سے اُوپر والی مشین گنوں کی بوچھاڑیں چیختی چنگھاڑتی گزر رہی تھیں۔ رات دھماکوں سے لرز رہی تھی۔ بارود کی بُو پھیلتی جا رہی تھی۔ اصغر کو یاد آیا کہ فائر کی پہلی بوچھاڑوں کے ساتھ ہی آبادی سے عورتوں اور بچّوں کی چیخیں سنائی دی تھیں۔ عورتیں اور بچّے ڈر کر گھروں سے نکل بھاگے تھے۔ اصغر نے دل میں درد کی ٹیس سی محسوس کی۔

"سر! مارٹر گنیں" ــــ میجر اصغر کو اپنے قریب کسی کی آواز سنائی دی۔ وہ اُس کی کمپنی کا صُوبیدار تھا جو کہہ رہا تھا ــــ "مارٹر گنیں دشمن کا منہ بند کر دیں گی۔ چار پانچ راؤنڈ کافی ہیں"۔

"نہیں صوبیدار صاحب!" ــــ میجر اصغر نے کہا ــــ "ابھی نہیں۔ آبادی میں عورتیں اور بچّے ہیں اور آبادی میں وہ لوگ بھی ہیں جو بنگالی ہوتے ہوتے بھی ہمارے دشمن نہیں۔ معلوم نہیں وہ گھروں سے بھاگ گئے ہیں یا گھروں میں ہی دبکے بیٹھے ہیں"۔

"سوچ لیں سر!" ــــ صوبیدار نے کہا ــــ "دشمن بڑی اچھی پوزیشن میں ہے"۔

میجر اصغر آبادی کو تباہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

✪

فائرنگ شروع ہوتے ہی شمس اپنے خاندان کے تمام افراد کے ساتھ جاگ اٹھا تھا۔ اُس کے گھر میں جو سات آدمی تھے وہ بھی جاگ کر اپنی اپنی کھڑکیوں اور روشندانوں تک پہنچ گئے۔ شمس دو آدمیوں کو ساتھ لے کر دوسری منزل کی چھت پر چلا گیا۔ اُسے تین چار مکانوں کے متعلق معلوم تھا کہ اُن کی چھتوں پر مکتی باہنی نے مورچے بنا رکھے ہیں۔ شمس نے اُن مورچوں پر فائرنگ شروع کرا

دی۔ اُن چھتوں پر دو چار آدمی نظر آتے شمس کے مکان سے گولیاں چلیں اور وہ آدمی ڈھیر ہو گئے۔

مُکتی باہنی والوں کو فوراً ہی پتہ چل گیا کہ شمس کے مکان سے اُن پر فائر آ رہا ہے۔ مُکتی باہنی کے لیڈر کو اطلاع ملی تو اُس نے حکم دیا کہ ایک پارٹی شمس کے مکان پر فائر کرے اور مکان کو آگ لگانے کی کوشش کرے۔

شمس فوجی نہیں تھا۔ اُس کے بیٹے اور اُس کے آدمی بھی فوجی نہیں تھے۔ اُنہوں نے رائفلیں اور ٹامی گنیں چلانی سیکھ لی تھیں۔ انہیں احساس نہیں تھا کہ لڑائی میں ہتھیار صرف فائر کر لینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اصل مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ دشمن کو نقصان پہنچایا جائے۔ اس کے لیے عقل اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شمس مکتی باہنی کے مورچوں پر گولیاں جو برسا رہا تھا وہ انتقامی جذبہ تھا جو قابلِ تحسین ہی سہی لیکن اُس کے مکان سے فائر کی ہوئی گولیاں دشمن کے دو تین آدمیوں کو مارنے کے سوا اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ رہی تھیں۔ البتہ دشمن کو پتہ چل گیا کہ شمس میاں کے مکان سے اُس کے مورچوں پر فائر آ رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکتی باہنی کے لیڈر نے دس بارہ آدمیوں کی ایک پارٹی کو شمس کے مکان پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔

اب ان کے لیے اصل لڑائی کا وقت آ گیا۔ دوسری منزل کی کھڑکی میں سے شبیر الحسن کو چار پانچ آدمی نظر آتے جو گلی میں اُس کے مکان کی طرف آ رہے تھے۔ چاندنی میں وہ صاف نظر آ رہے تھے۔ دو کے پاس سٹین گنیں اور دو کے پاس رائفلیں تھیں۔ وہ جُھکے جُھکے چلے آ رہے تھے۔ وہ قریب آئے تو شبیر الحسن نے اوپر سے اُن پر ٹامی گن کی ایک لمبی بوچھاڑ فائر کر دی۔ وہ سب گرے اور تڑپنے لگے۔ شبیر الحسن نے اپنے ایک آدمی سے کہا کہ اُس کے ڈیڈی کو جا کر بتائے کہ دشمن گلی میں مکان کی طرف آ رہا ہے، کچھ آدمی نیچے چلے جائیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد مکتی باہنی کے چند اور آدمی مکان کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ وہ جب قریب آئے تو نیچے والی کھڑکیوں میں سے انہیں بھی ختم کر دیا گیا۔

اِن کے لیڈر کو اطلاع ملی کہ اُس کی بھیجی ہوئی پوری پارٹی زخمی یا ہلاک ہو چکی ہے تو اُس نے کہا کہ اور کسی کو اُدھر نہ بھیجا جائے۔ اُسے فوج کے ساتھ فیصلہ کُن لڑائی کے لئے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت تھی۔

"اپنے اوپر کے وہ مورچے چھوڑ دو جو شمس کے فائر کی زد میں ہیں"۔۔۔ لیڈر نے کہا۔۔۔ "پہلے فوجیوں کو ختم کرو، شمس کی طرف ہم صبح توجہ دیں گے۔ دھیان رکھنا رات کو اُس کے گھر والے کہیں نکل نہ جائیں"۔

صبیحہ اور اُس کی ماں پریشان تھیں۔ اُن کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اُن کے لیے کوئی ہتھیار بچا ہی نہیں تھا۔ ان دونوں کو شمس نے کہا تھا کہ وہ بالائی منزل کے کسی کمرے میں بیٹھ جائیں۔ وہ کمرے میں جاتی تھیں اور فوراً ہی باہر نکل آتی تھیں۔ کبھی اوپر چلی جاتیں کبھی نیچے آ جاتیں۔ اُن پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ رات مسلسل دھماکہ بنی ہوئی تھی۔

✪

صبح کے تین بج رہے تھے۔

میجر اصغر کی کمپنی کی تینوں پلاٹونیں بڑی اچھی پوزیشنوں میں تھیں۔ مکتی باہنی نے دو مرتبہ اپنے کچھ آدمی مکانوں سے اِس مقصد کے لیے نکالے تھے کہ سکول کے عقب میں جا کر کمپنی پر ہلّہ بول دیں۔ دونوں مرتبہ وہ ناکام رہے تھے۔ اِدھر کے روشنی راؤنڈوں کی روشنی میں وہ نظر آ جاتے اور مشین گنوں کا رُخ اُن کی طرف کر دیا جاتا تھا۔

مکتی باہنی کی پوزیشنیں بدستور نئے چاند کی شکل میں تھیں۔ اب دونوں طرف سے فائر رُک رُک کا تھا۔

"سَر!"۔۔۔ میجر اصغر کو اپنے قریب آواز سنائی دی۔ وہ لیفٹیننٹ طاہر تھا جو اُسے کہہ رہا تھا۔۔۔ "مجھے اجازت دیں۔ میں اپنی پلاٹون کو دائیں یا بائیں پہلو سے آبادی کے اندر لے جاتا ہوں۔ یہ چند ایک مکان ہیں جن سے فائر آ رہا ہے۔ دوسرے مکانوں کی آڑ بڑی اچھی ہے۔ میں اُن مکانوں کے اندر جا سکتا ہوں جن سے فائر آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے دشمن کا ایمونیشن ختم ہو رہا ہے۔ وہ بھاگ جائے گا"۔

"لیفٹیننٹ طاہر!"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔ "مجھے معلوم ہے تم کون سے مکان میں داخل ہونا چاہتے ہو۔ میں تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گا..... میں نے بہت کچھ سوچ لیا ہے طاہر! اپنے سات جوان شہید اور آٹھ زخمی ہو چکے ہیں۔ میں دشمن کو بخشوں گا نہیں۔ میں تم سے بہتر طریقے سے آبادی کے اندر جا سکتا ہوں۔ میں کمانڈو ہوں مگر میں کمپنی کمانڈر بھی ہوں۔ میں جوانوں کو تنور میں نہیں پھینکوں گا..... صبیحہ کو ذہن سے اتار دو طاہر!"

"نہیں سَر!"۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ "اِس صورتِ حال میں آپ مجھ پر شک نہ کریں کہ میں صبیحہ اور اُس کے خاندان کی مدد کے لیے آبادی میں جانا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ ہم فائرنگ کا تبادلہ کب تک کرتے رہیں گے۔ یہ ایک پلاٹون دائیں سے اور ایک پلاٹون بائیں سے آبادی میں داخل ہو جائے تو....."

"آبادی میں کوئی نہیں جائے گا"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔ "ہمارے پاس مارٹر گنیں ہیں"۔

"مارٹر گنیں؟"۔۔۔ طاہر پرویز نے گھبرا کر کہا۔۔۔ "سَر! دوسرے مکان بھی تباہ ہو جائیں گے"۔

"اسی لیے میں ابھی تک انتظار کر رہا ہوں کہ دشمن خاموش ہو جائے"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔ "اور ہتھیار ڈال دے۔ اگر وہ خاموش نہ ہوا تو صبح کی روشنی ہوتے ہی میں مارٹر گنوں کا فائر کھلوا دوں گا"۔

"سَر!"۔۔۔ طاہر پرویز نے کہا۔۔۔ "مارٹر گنوں کے فائر کی صورت میں میں صبیحہ اور اُس کے گھر کی بات ضرور کروں گا۔ گولے وہاں بھی گر سکتے ہیں"۔

"میرے جوان مارے گئے ہیں طاہر!"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔ "مارٹروں کے علاوہ میں آر۔آر بھی فائر کراؤں گا، راکٹ لانچر بھی فائر کراؤں گا۔ یہ آبادی مکتی باہنی کا مضبوط اڈہ ہے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے وہ کتنا فائر کر رہے ہیں؟ وہ باہر آ کر ہم پر چارج کرنے کی بھی کوشش کر چکے ہیں۔ میں اِس آبادی کو ملبے کا ڈھیر بنا دوں گا"۔

"سَر!"

"لیفٹیننٹ طاہر پرویز!" — میجر اصغر نے حکم کے لہجے میں کہا — "اپنی پلاٹون میں چلے جاؤ۔"
طاہر پرویز احاطے کی چار فٹ بلند دیوار کی اوٹ میں جھک کر چلتا اپنی پلاٹون میں چلا گیا۔
سکول اور اُدھر آبادی کے مکان باقاعدہ جنگ کے مورچے بنے ہوتے تھے۔ فائرنگ کا زور تھمنے کی بجائے بڑھ رہا تھا۔

٭

صبح کی روشنی نمودار ہوئی۔
آبادی کے مکان نظر آنے لگے۔ میجر اصغر، تینوں پلاٹون کمانڈروں اور صوبیداروں نے دوربینیں آنکھوں سے لگا کر دیکھا۔ جن کھڑکیوں اور روشندانوں سے فائر آ رہا تھا، اُن کے اِردگرد دیواروں پر بےشمار گولیوں کے گہرے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ کمپنی کے جوان دشمن کی رائفلوں اور مشین گنوں کی نالیوں سے نکلتے ہوئے شرارے دیکھ کر ان پر فائر کرتے رہے تھے۔ ان کا فائر ضائع نہیں گیا تھا لیکن مکتی باہنی کے آدمی پوزیشنیں بدلتے رہے تھے۔
روشنی ہوتے ہی دونوں طرف سے فائر تیز ہو گیا۔ میجر اصغر کو ایک بنگالی مسلمان نے بڑی دُور کا چکر کاٹ کر اور پیچھے سے سکول میں آ کر بتایا کہ اِس آبادی کے بیشتر مکان خالی ہو چکے ہیں۔ یہاں کے رہنے والے رات کو اپنی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر نکل گئے تھے۔
"صرف ایک مکان ہے جس پر پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا ہے" — اطلاع لانے والے نے کہا — "وہ شمس میاں کا مکان ہے۔ وہ لوگ رات کو مکتی باہنی پر فائر کرتے رہے ہیں۔"
شمس کی منڈیر پر پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا۔ صبح کی پہلی روشنی میں مکتی باہنی کے تین چار آدمیوں نے ایک مکان کی چھت سے پاکستانی پرچم کو دیکھا اور اس پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ اتفاق سے صبیحہ کی ماں چھت پر گئی تو دیکھا کہ جھنڈے کا بانس گولیوں سے ٹوٹ گیا تھا اور جھنڈا چھت کی طرف جھکا ہوا تھا۔ صبیحہ کی ماں نے بانس کو وہاں سے توڑ دیا جہاں گولیاں لگی تھیں۔ ابھی جھنڈے کے ساتھ خاصا لمبا بانس تھا۔ اُس نے یہ بانس اُس جگہ لگا دیا جو اس کے لیے بنی ہوئی تھی۔ وہ جونہی وہاں سے ہٹی تو دو تین گولیاں اُس کے قریب سے گذر گئیں، پھر ایک گولی بانس کو لگی اور جھنڈا پھر جھک گیا۔
اُس وقت گھر کے تمام آدمی نیچے چلے گئے تھے کیونکہ اُنہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مکتی باہنی کے کچھ آدمی مکانوں کی کھڑکیوں اور روشندانوں میں فائر کرتے آ رہے تھے۔
"خالہ!" — صبیحہ کی ماں کو کسی مکان کی چھت سے للکار سنائی دی — "یہ جھنڈا اُتار لو۔"
صبیحہ کی ماں نے اُدھر دیکھا۔ ایک چھت پر دو آدمی ہاتھوں میں رائفلیں لیے کھڑے تھے۔ اِس خاتون نے دونوں کو پہچان لیا۔ وہ اسی محلے کے رہنے والے مسلمان بنگالی تھے۔
"تم پر خدا کی لعنت غدّارو!" — صبیحہ کی ماں نے للکار سے زیادہ بلند آواز سے جواب دیا — "تم اپنے جھنڈے کے دشمن ہو گئے ہو۔"
اُن دونوں نے رائفلیں کندھوں سے لگائیں اور فائر کر دیا۔ دونوں گولیاں جھنڈے میں سے گذر گئیں۔
"یہ جھنڈا ہمارا نہیں ہے خالہ!" — اُدھر سے للکار آئی — "اُتار لے اِسے۔"

"یہ جھنڈا نہیں اُترے گا بےغیرتو!" — صبیحہ کی ماں نے کہا — "پہلے مجھے گولی مارو۔ ہم نے اس جھنڈے پر جانیں دی تھیں۔ خون دیا تھا۔"
اُدھر سے دو اور گولیاں فائر ہوئیں۔ ایک گولی نے بانس کو جھنڈے کے قریب سے توڑ دیا۔ جھنڈا گلی کی طرف جھک گیا۔ صبیحہ کی ماں نے لپک کر جھنڈا تھام لیا۔
"مجھے گولی مارو" — صبیحہ کی ماں نے چلّا کر کہا — "جھنڈا نہیں گرے گا۔"
اب اُدھر سے تین گولیاں آئیں۔ دو جھنڈے میں سے گذریں اور ایک صبیحہ کی ماں کی ٹانگ میں سے گذر گئی۔ جھنڈے کو اُس نے تھام رکھا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل ہو گئی اور جھنڈا سنبھالے رکھا۔ بانس ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ بالکل ہی ٹوٹ گیا۔ اس خاتون نے جھنڈا ہاتھ میں لے لیا۔
"پاکستان کا جھنڈا نہیں گرے گا" — صبیحہ کی ماں چلّائی اور جھنڈا اوپر کر دیا۔
گولیاں پھر آئیں جو جھنڈے میں سے گذر کر صبیحہ کی ماں کے جسم سے پار ہو گئیں۔ وہ ایک پہلو پر لڑھک گئی۔ جھنڈا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اِس طرح گرا کہ اُس کے اوپر پھیل گیا۔
کچھ دیر بعد صبیحہ اپنی ماں کو دیکھنے اوپر آئی۔ دیکھا کہ ماں کی لاش خون میں ڈوبی پڑی تھی اور لاش کو پاکستان کے پرچم نے ڈھانپ رکھا تھا۔ صبیحہ چیختی چلّاتی نیچے گئی لیکن نیچے کا نقشہ ہی بدل رہا تھا۔
مکتی باہنی کے کچھ آدمی اسی مکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ دروازے کے قریب پہنچ کر دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سامنے والے کسی مکان سے کھڑکیوں میں گولیاں آ رہی تھیں۔ اب شمس اور اُس کے آدمی کھڑکیوں میں سے فائر نہیں کر سکتے تھے۔
دروازہ ٹوٹ رہا تھا۔
"صبیحہ!" — باپ نے اُسے بوجھل آواز میں کہا — "تم کہیں چھپ جاؤ۔"
سب کو غم صبیحہ کا ہی تھا۔ وہ جوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔
"میری فکر نہ کریں ڈیڈی!" — صبیحہ نے کہا — "اِن لوگوں کو میری لاش ملے گی۔ میں رائفل یا ریوالور سے اپنے آپ کو گولی مار لوں گی۔ صرف ایک گولی میرے لیے بچا کر رکھ لینا۔"
ان کا ایمونیشن ختم ہو چکا تھا۔ چند ایک گولیاں باقی تھیں۔

٭

اس دوران جب چھت پر پاکستان کا پرچم گولیوں سے چھلنی ہو رہا تھا، میجر اصغر لاؤڈ سپیکر سے مکتی باہنی والوں سے کہہ رہا تھا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور باہر آ جائیں۔ اس کے جواب میں آبادی سے گولیوں کی بوچھاڑیں آتی تھیں۔
میجر اصغر نے مارٹر گنیں پہلے ہی سکول کے احاطے میں لگوا دی تھیں اور فائر کرنے والے حکم کے منتظر تھے۔ مارٹر گن کا گولہ توپ کی طرح سیدھا نہیں جاتا، یہ اوپر جاتا اور ٹارگیٹ پر اوپر سے نیچے گرتا ہے۔ مکانوں کے اندر گولے پھینکنے کے لیے مارٹر گنیں ہی موزوں تھیں۔
جس وقت صبیحہ اپنے باپ سے کہہ رہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو گولی مارے گی، اُس وقت اُس کے دروازے کے کواڑ ٹوٹ گئے تھے۔ عین اُس وقت میجر اصغر نے تیسری مرتبہ اعلان کیا کہ ہتھیار

ڈال دو۔ اُدھر سے دو مشین گنیں اکٹھی فائر ہوئیں ۔ مارٹر گنیں آبادی کے فاصلے کے مطابق مطلوبہ زاویے پر تیار تھیں۔ میجر اصغر نے فائر کا حکم دے دیا۔

جوانوں نے مارٹر گنوں کی نالیوں میں اوپر سے گولے ڈال دیئے۔ گولے دھماکوں سے نالیوں میں سے نکلے اور اوپر جاکر آبادی میں گرے ۔ دو گولے صبیحہ کے مکان کے صحن میں گرے اور دو گلی میں۔ ان کے دھماکے بڑے ہی سخت اور زوردار تھے۔ بند چار دیواری میں دھماکے گلی کی نسبت زیادہ بلند تھے۔

میجر اصغر نے مارٹر گنوں کی گولہ باری جاری رکھی اور مارٹروں کے زاویے بدلتا گیا۔ آبادی کے مکانوں کے اندر گولے پھٹ رہے تھے۔ میجر اصغر نے آر۔آر۔ گن والی جیپ آگے کرالی اور اس کا بھی فائر شروع کرادیا۔ آر۔آر ٹینکوں پر فائر کی جاتی ہے ۔ اس کا گولا ٹینک کو پھاڑ دیتا ہے ۔ آر۔آر کے گولے آبادی کی دیواروں سے گزر کر مکانوں کے اندر پھٹنے لگے۔ آبادی میں بھگدڑ مچ گئی۔ دشمن کا فائر بند ہوگیا۔ مارٹر گنوں کے گولے بڑی تیزی سے آرہے تھے۔ آبادی کی گلیوں میں اور مکانوں کے اندر گولے پھٹ رہے تھے۔ دیواریں ٹوٹ رہی تھیں۔ چھتیں پھٹ رہی تھیں۔

پہلے دو گولے جو صبیحہ کے گھر کے اندر پھٹے اور وہ دو گولے جو گلی میں پھٹے، انہوں نے صبیحہ کا دماغ ماؤف کر دیا۔ مکتی باہنی کے وہ آدمی جو دروازہ توڑ کر اندر آگئے تھے، دہشت زدہ ہوکر باہر کو بھاگے۔ صبیحہ کا دل دہل گیا اور دماغ ہل گیا ۔ اُس کی چیخ نکل گئی اور وہ باہر کو دوڑ پڑی ۔ اتنے قریب پھٹنے والے گولے تجربہ کار فوجیوں کے بھی دماغ ماؤف کر دیا کرتے ہیں۔ صبیحہ تو لڑکی تھی۔ وہ گلی میں نکل گئی۔ گلی میں کئی آدمی اِدھر اُدھر بھاگے جا رہے تھے۔ گولے پھٹ رہے تھے۔

"طاہری ! طاہری" — صبیحہ چیخنے چلانے لگی — "طاہری کہاں ہو؟" — وہ دوڑتی چلی گئی۔

اوپر سے مارٹر گن کا ایک گولہ آیا جو اُس کے قریب پھٹا ۔ اُس کے ٹکڑے صبیحہ کے جسم میں اُتر گئے۔ وہ گر پڑی اور فوراً ہی اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ اُس کے کپڑے خون سے لال ہوگئے۔ وہ "طاہری، طاہری" پکارتی سکول کی طرف دوڑتی گئی۔

طاہر پرویز میجر اصغر کے حکم سے اپنی پلاٹون کو سکول کے احاطے سے نکال کر آبادی کی طرف جا رہا تھا۔ اُسے "طاہری، طاہری" کی پکار سنائی دی۔ اُس نے دیکھا صبیحہ آرہی تھی لیکن وہ اب دوڑ نہیں رہی تھی۔ وہ چل رہی تھی۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ سر ڈول رہا تھا۔ طاہر پرویز دوڑ کر اُس تک پہنچا۔

"صبیحہ!" — اُس نے کہا۔

صبیحہ نے بازو اُس کے گلے میں ڈال دیئے اور اتنا ہی کہہ سکی — "طاہری!" — اور اُس کا بے جان جسم طاہر پرویز پر گر پڑا۔ طاہر پرویز نے اُسے ہلایا، جھنجھوڑا مگر صبیحہ اب لاش تھی۔

"لیفٹیننٹ طاہر پرویز!" — میجر اصغر کی آواز گرجی — "آگے بڑھو۔ اپنا ٹاسک دیکھو"

طاہر پرویز نے صبیحہ کی لاش سڑک پر ڈال دی اور آبادی کی طرف چل پڑا۔

طاہر پرویز کو آگے ہی بڑھنا تھا۔ وہ پلاٹون کمانڈر تھا۔ اُس کی پلاٹون آبادی پر ہلّہ بولنے جا رہی تھی۔ ایک پلاٹون دائیں طرف سے اور ایک بائیں طرف سے آبادی کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ آبادی سے آنے والا فائر اب سنائپنگ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اِکّی دُکّی گولی آتی تھی یا لائٹ مشین گن کا ایک آدھ برسٹ فائر ہوتا تھا۔

میجر اصغر نے آر آر گنوں کا فائر روک لیا اور مارٹر گنوں کی گولا باری جاری رکھی۔ اُس کے سامنے دشمن کی رائفلیں اور مشین گنیں جلدی خاموش ہوگئیں۔

لیفٹیننٹ طاہر پرویز اپنی پلاٹون پر اور دشمن پر نظر رکھے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی اُسے پیچھے کو گھسیٹ رہا ہے۔ اُس نے پیچھے نہ دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی طاقت تھی جو بار بار اُس کی گردن پیچھے کو گھما دیتی تھی اور ہر بار اُسے سڑک پر پڑی ہوئی ایک لاش نظر آتی تھی — یہ اِس مٹی کی بیٹی تھی۔ اُس کا خون اسی مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔

"طاہری! طاہری!" — طاہر پرویز کو آوازیں سنائی دیں۔

اُس کے قدم بنگال کی مٹی نے جکڑ لیے۔ اُس نے گھوم کر دیکھا صبیحہ کی آواز لگتی تھی۔ طاہر کو پھر وہی لاش دکھائی دی۔ طاہر پرویز کو آواز بڑی قریب سے سنائی دی تھی۔ اُسے صبیحہ کے جسم کی بُو بھی محسوس ہوئی۔

"سر!" — اُس کے اردلی نے کہا — "اُس بنگالی لڑکی کا سارا خون آپ کی وردی کو لگ گیا ہے۔"

تب اُس نے سر جھکا کر دیکھا۔ اُس کی قمیض سینے اور پیٹ سے لال تھی۔ اُس کی پتلون پر بھی خون تھا۔ صبیحہ نے اُس کے گلے میں بازو ڈالے تھے اور وہ طاہر پر گر گئی تھی پھر اُس کا بے جان جسم طاہر پرویز کے جسم سے سرکتا سڑک پر گر پڑا تھا۔ اردلی نے اُسے بتایا کہ اُس کی وردی خون سے لال ہے تو اُس نے صبیحہ کے خون پر جس میں اُس کا اپنا پسینہ شامل ہوگیا تھا، ہاتھ پھیرا۔ اُس کا ہاتھ سرخ ہو گیا۔ اُس نے ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا پھر اُس کے رُکے ہوئے جذبات کا بند ٹوٹ گیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے آبادی جھلمل کرنے لگی جیسے کسی نے ساکن جھیل میں کنکری پھینک دی ہو۔

جانے کس کی للکار تھی جس نے طاہر پرویز کو یاد دلا دیا کہ وہ ایک پلاٹون کا کمانڈر ہے۔ اُس نے آنکھوں پر آستین پھیر کر آنسو پونچھ ڈالے۔ اُس کی پلاٹون کے جوان رائفلیں اور سٹین گن آگے کیے آبادی میں داخل ہو رہے تھے۔ دوسری دونوں پلاٹونیں بھی پہلوؤں سے آبادی میں داخل ہو چکی تھیں اور مارٹر گنوں کی گولا باری رُک گئی تھی۔

مارٹر گنوں اور آر۔آر گنوں کی گولا باری کی تباہ کاری ہولناک تھی۔ تین چار چھوٹے چھوٹے مکان جل رہے تھے۔ دوسری پلاٹونوں کے جوان مکانوں کے اندر جاکر دشمن کو ڈھونڈ رہے تھے۔ طاہر پرویز نے بھی اپنی پلاٹون کو حکم دیا کہ مکانوں کی تلاشی لیں اور جو کوئی اندر ہے اُسے باہر لے آئیں۔

”ہتھیار یا ایمونیشن ملے تو اٹھا لاؤ“ — طاہر پرویز نے کہا — ”کسی اور چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔“

جوان گھروں کے کھلے ہوئے دروازوں میں داخل ہو گئے اور طاہر پرویز اس گلی کی طرف دوڑ پڑا جس میں صبیحہ کا گھر تھا۔ اس گلی اور اس گھر سے وہ واقف تھا۔ وہ اس کشادہ گلی میں پہنچ گیا اور اسے صبیحہ کا دو منزلہ مکان دکھائی دینے لگا۔ اس کی بالائی منڈیر سے نیچے تک گولیوں کے نشان چھلنی کے سوراخوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

مکان سے چند گز دور چھ سات لاشیں پڑی تھیں سٹین گنیں اور رائفلیں بھی تھیں جو مرنے والوں کی ہی ہو سکتی تھیں۔ یہ مکتی باہنی کے وہ آدمی تھے جو صبیحہ کے گھر میں داخل ہونے آتے تھے لیکن صبیحہ کے گھر سے ان پر اتنی گولیاں چلیں کہ وہ زندہ نہ جا سکے۔ کچھ پرے بھی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں دو بچے، تین چار عورتیں اور اتنے ہی آدمی تھے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ بے گناہ مارے گئے تھے۔ گلی میں کئی چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے۔ یہاں مارٹروں کے گولے گرے تھے۔

طاہر پرویز صبیحہ کے مکان کے سامنے جا کر رُک گیا۔ سامنے والی دیوار میں دو کھڑکیاں نیچے اور دو اوپر تھیں۔ ہر کھڑکی کے اردگرد اتنی گولیاں لگی تھیں کہ دیوار کا پلستر اُڑ گیا تھا۔ کھڑکیوں کی لکڑی میں سے بھی گولیاں گزری ہوئی تھیں۔ نیچے والی منزل کے ایک روشندان کے قریب سے دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہاں مارٹر کا گولا لگا تھا۔

گلی میں اس کی کمپنی کے جوان دوڑتے پھر رہے تھے۔ وہ گھروں میں داخل ہوتے، نکلتے اور گھروں میں غائب ہو جاتے تھے۔ صبیحہ کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ طاہر پرویز کے قدم آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ اس نے دروازے کی طرف قدم اٹھایا تو اندر سے کوئی دوڑتا باہر نکلا۔

”سر!“ — طاہر پرویز کو آواز سنائی دی — ”اندر نہ جانا۔“

طاہر پرویز نے دیکھا۔ وہ اس کا پلاٹون حوالدار عجائب خان تھا۔ اس کے ساتھ پلاٹون کا ایک جوان تھا۔ طاہر پرویز میں تو بولنے کی جیسے ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے حوالدار عجائب خان کو یوں دیکھا جیسے اسے جانتا پہچانتا ہی نہ ہو۔

”اندر نہ جانا سر!“ — حوالدار عجائب خان نے ایک بار پھر کہا۔

عجائب خان کو معلوم تھا کہ اس گھر کے ساتھ اس کے پلاٹون کمانڈر کے جذبات وابستہ ہیں۔

”صبیحہ نہیں ہے؟“ — طاہر پرویز کے منہ سے یہ الفاظ یوں نکلے جیسے کوئی بچہ نیند میں بول رہا ہو۔

”سر! وہ تو...“

”وہ مر گئی ہے“ — طاہر پرویز جاگ اٹھا اور جاندار آواز میں بولا — ”وہ یقیناً ہماری مارٹر شیلنگ سے مری ہے۔“

”شہید ہوئی ہے سر!“ — حوالدار عجائب خان نے کہا۔

”ہاں ہاں!“ — طاہر نے اب افسروں کے لہجے میں کہا — ”تم نے اس کے گھر والوں کو بتایا ہے؟“

حوالدار عجائب خان کا سر جھک گیا۔

”بولو عجائب خان!“ — طاہر پرویز نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا — ”کیا صبیحہ کے گھر والے اندر نہیں؟ اگر وہ نکل گئے ہیں تو ٹھیک ہے۔ بچ گئے ہیں۔“

”نہیں نکل سکے سر!“ — حوالدار عجائب خان نے غم سے بوجھل آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے آہ بھر کر کہا — ”اندر سب کی لاشیں پڑی ہیں۔“

”سب کی؟“

”جی سر!“ — حوالدار عجائب خان نے کہا — ”کھڑکیوں کے قریب ان کے جن آدمیوں کی لاشیں ہیں، وہ تو صاف پتہ چلتا ہے کہ گولیوں سے شہید ہوتے ہیں۔ وہ مکتی باہنی کے مورچوں پر فائرنگ کرتے رہے ہوں گے۔ سب سے اوپر والی چھت پر صبیحہ کی والدہ کی لاش پڑی ہے اور لاش پر پاکستان کا جھنڈا پڑا ہوا ہے۔ جھنڈا خون سے لال ہے۔ اس کا بانس ٹوٹا ہوا ہے.... باقی جو لاشیں صحن میں اور پچھلے کمروں میں ہیں جن پر دوسری منزل نہیں، وہ ہماری مارٹر شیلنگ سے شہید ہوتے ہیں.... سر! ایسے لگتا ہے جیسے سب سے زیادہ شیل اسی مکان میں گرے ہیں۔“

لیفٹیننٹ طاہر پرویز کے سینے میں اور دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ اس کی آنکھوں کے آگے شرارے اُڑنے اور چمکنے لگے۔ پلاٹون کمانڈر کی حیثیت سے اس صورت حال میں اسے جو بھاگ دوڑ اور جو کام کرنا تھا، وہ اس میں مصروف ہو گیا لیکن ایک مشین کی طرح یا مشینی انسان کی طرح۔ اسے اس کی ٹریننگ اور کمپنی کمانڈر کے احکام چلا رہے تھے۔ وہ لاشعوری طور پر سرگرم تھا۔ اس کا شعور شدید زخمی ہو گیا تھا۔

✪

وہ جیسے ایک بڑا ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ حکم لے رہا تھا، حکم دے رہا تھا۔ اس کے سامنے لاشیں مکانوں میں سے نکال نکال کر ایک جگہ رکھی جا رہی تھیں۔ ایک جگہ رائفلوں، سٹین گنوں، گرنیڈوں اور ایمونیشن کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ مکتی باہنی والے چھوڑ کر مر گئے یا بھاگ گئے تھے۔

ان لاشوں میں اُن کی لاشیں بھی تھیں جن پر ہندو کا جادو چل گیا تھا اور اُن کی بھی جن کا ایمان متزلزل نہ ہو سکا تھا، اور ان میں ہندوؤں کی لاشیں بھی تھیں جو اپنے لیڈروں کے اسلام دشمن عزائم کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

میجر اصغر کمپنی کمانڈر تھا۔ وہ ساری آبادی میں گھوم پھر کر لاشیں اور اسلحہ بارود اکٹھا کرنے کا کام دیکھ رہا تھا۔ اسے طاہر پرویز کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جس سے بھی پوچھا اسے ایک ہی جواب ملا — ”ابھی یہیں تھے سر!“

میجر اصغر آبادی کے باہر کی طرف ایک مکان میں گیا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ یہ دشمن کا بڑا پکا مورچہ تھا۔ میجر اصغر اس مکان کی چھت پر چلا گیا۔ وہاں سے اسے وہ کھلا علاقہ نظر آ رہا تھا جس میں سے اس کی کمپنی گزر کر آئی تھی۔ وہاں سے سکول بھی دکھائی دے رہا تھا اور درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی سڑک بھی۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے جھاڑیوں کی اوٹ میں اسے سٹیل ہیلمٹ دکھائی دی جیسے وہاں کوئی فوجی بیٹھا ہوا ہو۔

میجر اصغر نے دُوربین اپنی آنکھوں سے لگائی۔ وہاں واقعی کوئی فوجی بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ اُسی کی کمپنی کا کوئی جوان ہو سکتا تھا۔ اُسے بیٹھا ہُوا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ میجر اصغر کو خیال آیا کہ وہ زخمی ہو گا یا اُسے کوئی تکلیف ہو گی۔ میجر اصغر اپنے اردلی کو کہنے ہی لگا تھا کہ دوڑ کر اُس جوان تک جائے اور دیکھے کہ اُسے کیا ہو گیا ہے کہ اُس جوان نے حرکت کی۔ وہ کم و بیش چار سو گز دور تھا اور اس طرف اُس کی پیٹھ تھی۔

وہ جوان ذرا آگے کو جُھکا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میجر اصغر نے دُوربین آنکھوں سے لگائی۔ اب وہ فوجی پورا دکھائی دیا۔ اُس نے منہ اِدھر کو کر لیا تھا —— وہ لیفٹیننٹ طاہر پرویز تھا اور اُس نے بازوؤں پر صبیحہ کی لاش اٹھا رکھی تھی۔ وہ آبادی کی طرف چل پڑا۔

میجر اصغر کو غصّہ آگیا۔ اُس نے دُوربین آنکھوں سے ہٹالی اور طاہر پرویز کو آتے دیکھتا رہا۔ اصغر نے اپنے خون میں عجیب سا اُبال محسوس کیا۔ اُس کے ذہن میں سوچوں اور خیالوں کا ایک ریلا آگیا۔ غالب خیال یہ تھا کہ طاہر کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ لیفٹیننٹ ہے اور پلاٹون کمانڈر ہے۔

طاہر پرویز شاید تھک گیا تھا۔ وہ رُکا، بیٹھ گیا اور اُس نے لاش زمین پر رکھ دی۔ وہ گھٹنوں کے بل لاش کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس نے لاش کا ہاتھ اٹھایا اور ہاتھ کو چوم کر ہاتھ لاش کے سینے پر رکھ دیا۔

دو چار منٹ بعد اُس نے لاش کو پھر بازوؤں پر اُٹھا لیا اور چل پڑا۔ دو جوان کہیں سے دوڑے گئے۔ وہ لاش اٹھانا چاہتے تھے لیکن طاہر نے انہیں لاش نہ دی۔

اصغر نے ارادہ کیا کہ اردلی کو بھیجے کہ طاہر کو کہے کہ لاش وہیں رکھ دو اور میرے پاس آؤ۔ اُس کا اردلی اور وائرلیس آپریٹر چھت پر اُس سے کچھ دور کھڑے تھے۔ اُس نے اُن کی طرف دیکھا لیکن کچھ بھی نہ کہا۔ وہ طاہر پرویز کو دیکھنے لگا جو آبادی کے قریب پہنچ گیا تھا۔

اصغر کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اُس کا غصّہ آنسوؤں میں بہنے لگا۔ وہ آگے منڈیر پر چلا گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا اردلی اور وائرلیس آپریٹر اُس کے آنسو دیکھ لیں۔ اُس نے بڑی مشکل سے آنسوؤں پر قابو پایا اور چھت سے اُتر آیا۔

★

میجر اصغر ایک گلی میں سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے طاہر پرویز آتا دکھائی دیا۔ اُس کے بازوؤں پر لاش نہیں تھی۔

"لاش کہاں ہے طاہری؟" —— میجر اصغر نے اُسے روک کر پوچھا۔

"مسجد میں رکھ آیا ہوں" —— طاہر نے پیچھے مڑ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور کہنے لگا —— "وہ ہے مسجد۔ صف پر رکھ آیا ہوں"

"کیا کرو گے لاش کو؟"

"دفن کروں گا" —— طاہر نے کہا —— "قبرستان قریب ہی ہے .... اور بھائی جان! مجھے یہ یاد نہ دلانا کہ میں لیفٹیننٹ ہوں .... میں اپنی ڈیوٹی سے بے خبر نہیں ہوں۔ جہاں کوتاہی ہو گی مجھے پکڑ لینا لیکن ...."

"طاہری!" —— اصغر نے بھائیوں کے لہجے میں کہا —— "کِس کِس کو دفن کرو گے؟ کِس کِس کا جنازہ پڑھو گے۔ ہوش میں آؤ طاہری! دیکھو میں کمپنی کمانڈر کی حیثیّت سے نہیں کہہ رہا۔ میں جانتا ہوں تم کیا محسوس کر رہے ہو۔ ابھی زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ میری صرف ایک بات مان لینا طاہری! .... آنکھ میں آنسو نہ آئے۔ وہ جذبہ یاد کرو جس نے تمہیں فوج میں آنے پر مجبور کیا تھا۔ بنگال کی مٹی کی آن کی خاطر ہمیں زہر کا پیالہ پینا پڑے گا" —— اُس نے طاہر کا گال تھپتھپاتے ہُوئے کہا —— "آنکھ میں آنسو نہ آئے"

طاہر پرویز نے سر جھکا لیا اور میجر اصغر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اُس نے منہ پرے کر کے ہاتھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"میں رات کو تین چار جوان لے جاؤں گا بھائی جان! اور قبر کھود کر صبیحہ کو دفن کر دوں گا" —— طاہر نے کہا —— "آپ روکیں گے تو نہیں؟"

میجر اصغر نے سر ہلایا کہ وہ نہیں روکے گا۔ اُس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

یہ ایک قصبہ تھا۔ یہ لڑائی قصبے کے ایک حصّے میں لڑی گئی تھی۔ اس حصّے سے آگے قصبہ ختم ہو جاتا تھا۔ اتنی زیادہ فائرنگ اور گولاباری سے سارا قصبہ خالی ہو گیا تھا۔ اُن مکانوں میں بھی کوئی نہیں رہا تھا جو لڑائی کی زد میں نہیں آتے تھے۔ جب میجر اصغر کی کمپنی اندر آگئی اور قصبے کے مسلمانوں نے دیکھا کہ مُکتی باہنی بھاگ گئی یا ماری گئی ہے تو وہ ڈرتے ڈرتے اپنے بیوی بچّوں کو ساتھ لیے واپس آنے لگے۔

میجر اصغر کے لیے ایک خطرہ پیدا ہو گیا۔ قصبے کے ان باشندوں میں مُکتی باہنی کے آدمی بھی ہو سکتے تھے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ یہی تو مشرقی پاکستان میں سب سے بڑی دشواری تھی شہریوں میں دوست اور دشمن کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ یہ قصبہ اب میجر اصغر کی ذمہ داری میں تھا۔ اُس نے اپنے ساتھ دو تین ایسے بنگالی سویلین بھی رکھے ہُوئے تھے جو قصبے کے تقریباً ہر فرد کو جانتے تھے۔ میجر اصغر نے انہیں کہا کہ وہاں کے قابلِ اعتماد اور معزّز آدمیوں کو لے آئیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد قصبے کی آدھی سے زیادہ آبادی اصغر کے سامنے جمع ہو گئی۔ منظر دلخراش تھا۔ کئی عورتیں اونچی آواز میں رو رہی تھیں۔ مردوں نے شور مچا رکھا تھا۔ ہر کوئی کچھ کہہ رہا تھا۔ اصغر اُن کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اُن کے چہروں کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ ہر چہرے پر گھبراہٹ، ملال احتجاج اور غصّے کے تاثرات تھے۔ اصغر نے چھ سات بزرگوں کو بلایا اور انہیں ایک جگہ زمین پر بٹھا کر خود اُن کے درمیان بیٹھ گیا۔

"میں جانتا ہوں کہ ہماری گولیوں اور گولوں سے بےگناہ لوگ بھی مارے گئے ہیں" —— میجر اصغر نے کہا —— "لیکن پاکستان کے دشمنوں کو ختم کرنے کے لیے یہ کارروائی ضروری اور یہ نقصان ناگزیر تھا۔ اگر آپ کا نقصان ہُوا تو ہمارا بھی نقصان ہُوا ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو سکول میں جا کر شہیدوں کی لاشوں اور زخمیوں کو دیکھ لیں"

"معلوم نہیں ہمیں کون سے گناہ کی سزا مِل رہی ہے" —— ایک بزرگ نے کہا —— "پہلے ہمارے گھروں کو اپنے غدّاروں اور ہندوؤں کی بنائی ہُوئی مُکتی باہنی نے لُوٹا۔ ہماری عورتوں کی جو بے حرمتی

ہوتی وہ میں بیان نہیں کر سکتا“۔۔۔ بزرگ کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے رندھیائی ہوئی آواز میں کہا ۔۔۔ ”آپ اُس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے میجر صاحب! جب ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ آپ تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے کہ ہم نے یہ خطّہ کس طرح آزاد کرایا تھا۔ آج اپنے ہی بھائی ہمارے دشمن ہو گئے ہیں“۔

”لیکن ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں“۔۔۔ میجر اصغر نے کہا ۔۔۔ ”میں نے آپ کو کسی اور مقصد کے لیے بلایا ہے“۔

”ہم اسی لیے آپ کے پاس آ گئے ہیں کہ آپ ہمارے دشمن نہیں ہیں“۔۔۔ ایک اور بزرگ بنگالی نے کہا ۔۔۔ ”آپ ہم سے جو قربانی مانگیں گے ہم دیں گے۔ آپ کو راشن کی ضرورت ہو گی تو ہم آپ کو راشن دیں گے۔ ہم آپ کو صرف یہ بتا رہے ہیں کہ ہم دونوں طرف سے پِس رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ مکتی باہنی کیا ہے۔ یہ ہندو فوجی ہیں اور ان کے ساتھ ہمارے اپنے چھوکرے اور چند باقی نوجوان شامل ہو گئے ہیں۔ مکتی باہنی والے آتے ہیں تو اپنی ہر ضرورت ہم سے زبردستی پُوری کرتے ہیں۔ اب فوج آئی ہے تو مکتی باہنی کے ساتھ فوج کی لڑائی میں بھی ہمارا نقصان ہُوا ہے“۔

”ہم آپ کی حفاظت کے لیے آئے ہیں“۔۔۔ میجر اصغر نے کہا ۔۔۔ ”یہ میرا فرض ہے کہ ہر ایک گھر کی تلاشی لوں اور جس گھر سے اسلحہ یا کوئی اور قابلِ اعتراض چیز نکلے، اُس گھر کے آدمیوں کو گرفتار کر لوں، لیکن میں آپ پر ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ہم آپ کے بھائی اور بیٹے ہیں۔ یہ فوج آپ کی ہے۔ ہم سب پاکستانی ہیں“۔

”ہم غدّار نہیں“۔۔۔ ایک ادھیڑ عمر بنگالی نے کہا ۔۔۔ ”یہ الیسٹ اور دلیسط کے لیڈروں کا کھیل ہے اور ہندو لیڈر اس سے پُورا پُورا فائدہ اٹھا رہے ہیں.... آپ ہمیں یہ بتائیں کہ ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں“۔

”ہم آپ سے کچھ نہیں لیں گے“۔۔۔ میجر اصغر نے کہا ۔۔۔ ”ہمیں راشن کی ضرورت نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ سے ہم صرف خبریں اور اطلاعیں لیں گے۔ جہاں کہیں آپ کو شک ہو کہ مکتی باہنی کے آدمی موجود ہیں، یہاں آ کر اطلاع دیں“۔

فوج کے پاس اور محبِّ پاکستان بنگالیوں کے پاس کہنے کو تو بہت کچھ تھا لیکن کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا سوائے اس کے کہ شہری فوج کو اطلاع دیں کہ فلاں جگہ مکتی باہنی کے آدمی موجود ہیں اور چند ایک فوجی وہاں پہنچ کر شب خون ماریں۔ اب یہ رُت بگڑے ہوئے حالات کو نہیں سنوار سکتی تھی کہ یہ اپنے سیاسی لیڈروں کی اقتدار پرستی اور بھارت کی تخریب کاری کا نتیجہ ہے۔ پاکستان اور بھارت کی لیڈر شپ نے مشرقی پاکستان کو پاکستانیوں کے خون میں ڈبونے کے لیے چوبیس سال کوشش کی تھی۔ یہ تو نتیجہ تھا جس کا یہی علاج تھا کہ یہ بھگتیں۔ اس کا علاج آغاز میں ہونا چاہیے تھا۔ اب تو انجام کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس قصبے کے شہری میجر اصغر کے ساتھ بہت دیر باتیں کرتے رہے اور اُسے یقین دلاتے رہے کہ وہ پاکستانی ہیں اور وہ فوج کی ہر طرح مدد کریں گے۔ وہ ایک دوسرے کو خوش فہمیوں میں ڈال رہے تھے۔ سرِدست اُن کے کرنے کا کام یہ رہ گیا تھا کہ جو شہری مارے گئے ہیں انہیں

دفن کر دیں اور ان میں جو لاشیں ہندوؤں کی ہیں انہیں ایک ہی گڑھے میں کہیں دبا دیں یا ندی میں پھینک آئیں۔

✪

دوسری صبح قصبے کے قبرستان میں بہت سی نئی قبریں نظر آ رہی تھیں۔ قبریں رات کو کھودی گئیں اور رات کو ہی شہریوں اور میجر اصغر کی کمپنی کے شہیدوں کا مشترکہ جنازہ پڑھا گیا۔ طاہر پرویز نے صبیحہ کی قبر سب سے الگ ایک گھنے درخت کے نیچے کھدوائی تھی اور صبیحہ کی میّت کو اُس نے اپنے ہاتھوں لحد میں رکھا تھا۔ اُس کے ساتھ حوالدار عجائب خان اور اپنا اردلی تھا۔

میجر اصغر کی کمپنی کے وہی چند ایک جوان جنازے میں شریک ہو سکے تھے جو قبریں کھودنے والوں کے ساتھ تھے۔ کمپنی کی باقی نفری میں سے کچھ قصبے میں گشت پر تھی اور کچھ قبرستان کے اردگرد پہرے پر چوکس کھڑی تھی۔ دشمن کا کچھ بھروسہ نہ تھا۔ یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ جو لوگ محبِّ پاکستان بن کر آئے ہیں، ان میں کتنے مکتی باہنی کے آدمی ہیں۔ جنازہ پڑھنے کے دوران کوئی صرف ایک گرنیڈ پھینک کر یا قریب سے گذرتی کار یا ٹرک سے سٹین گن یا لائٹ مشین گن کا صرف ایک لمبا برسٹ فائر کر جاتا تو صبح قبرستان میں نئی قبروں کی تعداد کئی گنا زیادہ ہو جاتی۔

سات آٹھ لاشیں ہندوؤں کی تھیں۔ ان میں مکتی باہنی بلکہ انڈین آرمی کے آدمی بھی تھے۔ صبح انہیں دو دستی ریڑھیوں پر ڈال کر اوپر کیلے کے پتے ڈال دیئے گئے تھے۔ انہیں ندی میں پھینکنے کے لیے لے جانا تھا۔ میجر اصغر نے کمپنی ہیڈ کوارٹر سکول میں رکھا تھا۔ لاشوں کی ریڑھیوں سکول کے احاطے کے باہر کھڑی تھیں اور انہیں دھکیل کر لے جانے والے ان کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

لیفٹیننٹ طاہر پرویز سکول کے کسی کمرے میں تھا۔ وہ ویسے ہی باہر نکلا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی کمپنی کی دوسری پلاٹون کا کمانڈر کیپٹن آصف لاشوں والی ریڑھیوں کے قریب کھڑا تھا۔ وہ پانچ چھ بنگالی شہریوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ طاہر پرویز ٹہلتا ٹہلتا اُن کے قریب جا رکا۔

”یہ یہیں کے رہنے والے ہندو حضرات ہیں“۔۔۔ کیپٹن آصف نے لیفٹیننٹ طاہر پرویز سے کہا ۔۔۔ ”کہتے ہیں کہ یہ لاشیں انہیں دی جائیں۔ انہیں یہ اپنے مذہبی طریقے سے جلائیں گے“۔

طاہر پرویز نے یوں محسوس کیا جیسے اُس کے جسم کا سارا خون اُس کے دماغ کو چڑھ گیا ہو۔ وہ نوجوان تھا، اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اُس کا ایک ہاتھ جیسے نادانستہ طور پر ریوالور پر چلا گیا ہو۔

”کیپٹن آصف!“۔۔۔ طاہر پرویز نے یہ بھی نہ سوچا کہ اُسے ایک کیپٹن کے ساتھ بات کرتے سر کہنا چاہیئے۔ اُس نے کہا ۔۔۔ ”آپ نے کہا ہے کہ یہ ہندو حضرات ہیں... ہندو حضرات نہیں ہُوا کرتے“۔۔۔ اُس نے اپنی شہادت کی انگلی خنجر کی طرح ان کی طرف کر کے دانت پیس کر کہا ۔۔۔ ”یہ حضرات نہیں۔ یہ سانپ ہیں جو ہماری آستینوں میں پل رہے ہیں۔ یہ ڈاکو ہیں۔ یہ پاکستانیوں کے قاتل ہیں“۔۔۔ طاہر پرویز نے ریوالور نکال کر کہا ۔۔۔ ”یہ اسلام کے دشمن ہیں۔ یہ پاکستان کے دشمن ہیں“۔

”ریوالور اندر رکھو طاہری!“۔۔۔ کیپٹن آصف نے اُسے دوستانہ لہجے میں کہا ۔۔۔ ”ہم انہیں کمپنی

کمانڈر سے مِلوا دیتے ہیں لیکن کمپنی کمانڈر شہر کے راؤنڈ پر نکل گئے ہیں۔"

"ہم اسلام کے دشمن نہیں ہیں"— ایک ہندو نے کہا جو لباس سے اچھی حیثیت کا لگتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا — "ہم پاکستانی ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد یہیں کے رہنے والے تھے۔"

"تو یہ کیا تمہارے باپ لگتے تھے؟"— لیفٹیننٹ طاہر پرویز نے غصے سے کہا۔ "انہوں نے ہم پر فائرنگ کی تھی۔ فوج کے جوان شہید اور زخمی ہوئے ہیں۔ اگر تم ان کی لاشیں لینے آئے ہو تو تم بھی انہی میں سے ہو۔ تم بھی مکتی باہنی کے آدمی ہو۔ تم انڈیا کے لوگ ہو۔"

"یہ تو مر چکے ہیں صاحب!"— ایک اور ہندو نے کہا — "زندگی میں یہ جیسے کیسے بھی تھے اس سے اب آپ کا اور ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مر گئے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ان کی آتما کی مکتی کے لیے اِن کی آخری رسوم پوری کر دیں۔"

"مکتی کے لیے"— طاہر پرویز نے ایسے کہا جیسے چیتا شکار پر جھپٹتے غرّاتا ہے — "آتما کی مکتی کے لیے نہیں، تم کو مکتی باہنی کا فرض ادا کرنے کے لیے۔"

وہ ہندو کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ طاہر پرویز نے ریوالور دائیں ہاتھ سے اُچھال کر بائیں ہاتھ میں لے لیا اور اس کے ساتھ ہی اس ہندو کے منہ پر باکسروں کی طرح اس قدر زور سے گھونسہ مارا کہ ہندو دُور پیچھے جا پڑا۔ باقی ہندو تین قدم پیچھے ہٹ گئے۔ گھونسہ کھانے والا ہندو اُٹھا تو اُس کے دونوں ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس کے ساتھی اکٹھے بول رہے تھے۔

طاہر پرویز نے ریوالور دائیں ہاتھ میں لے لیا اور ننگی گالیاں دینے لگا — "اگر تم دو سیکنڈ اور یہاں کھڑے رہے تو سب کو شوٹ کر دوں گا"— اُس نے اُن پر ریوالور تان کر کہا — "اپنے یہ مکروہ چہرے غائب کر دو۔"

کیپٹن آصف نے اُسے ڈانٹ کر کہا کہ وہ غنڈوں کی طرح بات نہ کرے۔ ہندوؤں کو شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہوگی کہ کیپٹن آصف انہیں معزز حضرات سمجھ رہا ہے۔ اس خوش فہمی میں تو وہ مبتلا تھے ہی کہ مشرقی پاکستان پر اُن کا اثر ہے جس سے وہ یہاں غیر بنگالیوں کا قتلِ عام کرا چکے ہیں۔

"ہم ڈھاکہ جا کر آپ کی رپورٹ کریں گے"— ایک ہندو نے کہا — "اور آپ کا کورٹ مارشل کرا دیں گے۔"

طاہر پرویز نے ریوالور آگے کیا اور اُس کی انگلی نے ٹریگر دبا دیا۔ دھماکہ ہُوا اور اُس کا کورٹ مارشل کرانے والا ہندو ایک دو سیکنڈ خاموش کھڑا رہا، پھر اُس کی ٹانگیں دوہری ہوئیں، اُس کے گھٹنے زمین سے لگے اور وہ ایک پہلو پر لُڑھک گیا۔ اُس کے سینے اور پیٹھ میں سے خون اُبل اُبل کر نکلنے لگا۔ گولی چلنے اور ہندو کے گرنے تک باقی ہندو اتنی تیز دوڑے جیسے وہ دو تین سیکنڈ پہلے یہاں تھے ہی نہیں۔ طاہر پرویز نے اِن کے پیچھے فائر کرنے کے لیے ریوالور سیدھا کر لیا تھا لیکن کیپٹن آصف نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ریوالور پکڑ لیا۔

گولی کا دھماکہ سن کر سکول میں کمپنی کی جتنی نفری تھی نکل آئی۔ بعض نے سکول کے احاطے کی دیوار کے ساتھ پوزیشنیں لے لیں۔ کیپٹن آصف نے اُسے ڈانٹنا شروع کر دیا لیکن طاہر پرویز پر کچھ اور ہی کیفیت

طاری تھی جیسے وہ کچھ سن ہی نہ رہا ہو۔

"اِدھر آؤ"— اُس نے اُن آدمیوں کو بلایا جو لاشوں والی ریڑھیاں دھکیلنے کے لیے بیٹھے ہوتے تھے — "یہ لاش بھی اٹھا کر ریڑھی پر ڈال لو.... اور تم بیٹھے ہوتے کیوں ہو؟ لے جاؤ ان کافروں کی لاشیں اور ندی میں پھینک آؤ۔"

"ٹھہر جاؤ"— کیپٹن آصف نے کہا — "کمپنی کمانڈر کو آ لینے دو۔"

"لے جاؤ"— لیفٹیننٹ طاہر پرویز نے کہا — "لے جاؤ.... کمپنی کمانڈر ان کا جنازہ تو نہیں پڑھے گا۔"

اِن چند ایک بنگالی مسلمانوں نے جو اسی کام کے لیے وہاں موجود تھے، ہندو کی لاش اٹھائی اور ایک ریڑھی پر ڈال کر دونوں ریڑھیاں دھکیل کر لے گئے۔ ندی قریب ہی تھی۔ طاہر پرویز ریوالور ہولسٹر میں ڈال کر سکول کے پھاٹک کی طرف چل پڑا۔

✪

"لیفٹیننٹ طاہر!"— اُسے کیپٹن آصف نے بلایا۔

"یس سر!"— طاہر پرویز نے اُس کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"میں کیپٹن ہوں"— کیپٹن آصف نے دھیمی سی مگر بڑی سنجیدہ آواز میں کہا — "اور تم لیفٹیننٹ ہو۔ رینک کے علاوہ بھی میں تم سے دو سال سینئر ہوں۔ تم میرے ساتھی ہو، میرے دوست ہو لیکن ڈسپلن کو میں مجروح نہیں ہونے دوں گا۔ تم نے کمپنی کی اتنی نفری کے سامنے میرے حکم پر اپنا حکم چلایا ہے۔"

"کیا آپ کو افسوس ہے کہ میں نے ایک ہندو کو...."

"شٹ اپ!"— کیپٹن آصف نے اُسے چُپ کراتے ہوئے کہا — "میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی.... میں جانتا ہوں کمپنی کمانڈر صاحب تمہارے قریبی رشتہ دار ہیں لیکن وہ تمہیں ڈسپلن کے خلاف چلنے کی اجازت نہیں دیں گے.... اور طاہر!"— کیپٹن آصف نے دھیمی سی آواز میں کہا — "تمہارے جذبات پر جو چوٹ پڑی ہے میں وہ بھی جانتا ہوں۔ رات کو تم نے اُسے اپنے ہاتھوں دفن کیا ہے لیکن اس ٹریجیڈی کا اثر یہ نہ لو کہ یہ بھی بھول جاؤ کہ تم فوجی افسر ہو۔"

طاہر پرویز کے چہرے کا رنگ اور تاثر بدلتا جا رہا تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ لیفٹیننٹ بن جانے سے وہ فرشتہ نہیں بن گیا تھا۔ انسان گولی اور تلوار کے گہرے زخم برداشت کر لیتا ہے، جذبات پر وہ ہلکی سی خراش بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ طاہر پرویز ارشد اور طاہرہ کا جذبہ لے کر فوج میں آیا تھا۔ پاکستان کو وہ اپنا ایمان سمجھتا تھا۔ اب آدھا پاکستان اُس کی نظروں کے سامنے خانہ جنگی کا میدانِ جنگ بن گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی پہلی محبت کا خون ہو گیا تھا۔ صبیحہ اور اُس کی محبت کی بنیاد میں بھی پاکستان کی محبت رچی بسی ہوئی تھی۔

صبیحہ جب زندہ تھی تو طاہر پرویز کبھی کبھی یہ سوچنے لگتا تھا کہ صبیحہ اُس کے دل میں کیوں اُترتی جا رہی ہے؟ اس لیے کہ صبیحہ اور اُس کے ماں باپ پاکستان کے شیدائی ہیں یا اس لیے کہ وہ بہت

ی دل کش لڑکی ہے جس کی آنکھوں میں بنگال کا جادو ہے؟ جب اُسے صبیحہ کی دل کشی کا خیال آتا تھا تو اُس کے اندر جرم کا ہلکا سا احساس پیدا ہو جاتا تھا۔ اُسے اپنا فرض عزیز تھا، پاکستان عزیز تھا، مگر اُس نے اپنے ہاتھوں صبیحہ کو قبر میں اتار دیا تو اُس کے ذہن میں، دل میں اور اُس کی روح میں صبیحہ کی محبت نکھر آئی۔

"صبیحہ کے بغیر تم کچھ بھی نہیں طاہر!" — اُسے اپنی ذات کے ویرانے میں آوازیں سنائی دینے لگیں — "وہ سراپا محبت تھی..... تم اُس کے پجاری تھے طاہر!..... تمہاری محبت قتل ہو گئی ہے..... کیا تم ..... کیوں قتل ہوئی ہے؟"

طاہر پرویز کم عمر تھا۔ اُس کا ذہن پوری طرح بالغ نہیں ہوا تھا۔ اگر لیفٹیننٹ بن کر وہ اپنے آپ کو بالغ سمجھنے لگا تھا تو صبیحہ کی موت نے اُسے پھر نابالغ کر دیا تھا۔ اُس کے ذہن میں یادوں کے بگولے اُٹھ رہے تھے۔ یادیں پرانی نہیں تھیں، چند دن پہلے کی ہی بات تھی۔ اُس نے تنہائی کی ملاقاتوں میں صبیحہ کی نشیلی آنکھوں میں پیار کا خمار دیکھا تھا۔

"پنجاب چلو گی نا صبیحہ؟"

"جہاں کہو گے چلوں گی۔"

"تمہارے بغیر تو میں واپس نہیں جا سکوں گا صبیحہ!"

"تو کیا میں تمہارے بغیر یہاں رہ سکوں گی؟"

کل سے طاہر پرویز محسوس کر رہا تھا جیسے صبیحہ کے نرم اور ملائم بال اُس کے چہرے پر رینگ رہے ہوں۔ صبیحہ کے بالوں کی اور اُس کے گالوں کی معطّر بُو طاہر کے اِردگرد منڈلا رہی تھی۔ اُس نے آج ہی صبح چونک کر اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا تھا مگر وہ سکول کے ایک کمرے میں تھا اور صبیحہ قبر میں۔ طاہر نے پھٹی پھٹی نظروں سے کمرے میں ہر سُو دیکھا تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس نے مارٹر گن کی بیرل میں گولا پھینکا ہو اور گولا اُوپر جا کر طاہر کے ہی اوپر آن گرا اور مہیب دھماکے سے پھٹا ہو۔

"سر! دوسری وردی تیار ہے" — طاہر پرویز کو اردلی کی آواز سنائی دی تھی — "یہ وردی خون سے بھری ہوئی ہے۔"

طاہر پرویز نے چونک کر اپنی پہنی ہوئی وردی دیکھی۔ اُسے قمیض اور پتلون پر صبیحہ کا خون نظر آیا۔ اُس نے صبیحہ کی باہیں اپنے گلے میں محسوس کی تھیں۔ طاہر کے پسینے نے اس خون کو خشک نہیں ہونے دیا تھا۔ اب اس خون میں صبیحہ کی قبر کی مٹی بھی شامل ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے بشیر!" — طاہر پرویز نے کہا تھا — "ابھی نہیں۔ میں تمھیں خود بتاؤں گا۔ ابھی نہیں۔"

وہ صبیحہ کے خون والی وردی نہیں اتارنا چاہتا تھا۔ وہ جب کمرے سے نکلا تھا تو اُسے احساس نہیں تھا کہ وہ کمرے سے نکلا ہے۔ وہ جب خراماں خراماں سکول کے پھاٹک سے نکل آیا تھا تو بھی اُس کے شعور نے محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ باہر نکل آیا ہے۔ وہ اپنے سینے میں لپکتے غرّاتے ہوئے شعلے محسوس کر رہا تھا۔ وہ جل رہا تھا۔

اس ذہنی اور جذباتی کیفیت میں وہ کیپٹن آصف کے پاس جا رکا۔ کیپٹن آصف نے اُسے

جُوں ہی کہا کہ یہ ہندو حضرات ہندوؤں کی لاشیں لینے آتے ہیں، لیفٹیننٹ طاہر کے سینے کے شعلے باہر آ گئے۔ اُسے جیسے آواز سنائی دی ہو — "یہ ہیں صبیحہ کے قاتل" — اُس نے ایک ہندو کو گھونسہ اور ایک کو گولی مار دی۔ وہ فوجی ڈسپلن کو بھول گیا۔

کیپٹن آصف نے اُسے یاد دلایا کہ وہ لیفٹیننٹ ہے۔ وہ اپنے آپ میں آ گیا۔ اُس نے کیپٹن آصف سے معافی مانگی۔

"دیکھو طاہری!" — کیپٹن آصف نے اُسے کہا — "مجھے غلط نہ سمجھنا۔ میں نے تم پر اپنی برتری ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ تمہیں صرف یہ یاد دلایا ہے کہ فوج ڈسپلن اور جذبہ مانگتی ہے جذبات نہیں۔"

"کیا اس ہندو کو گولی مار کر میں نے جُرم کیا ہے؟" — طاہر پرویز نے دبی اور دُکھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اِس کافر کو تو میں خود گولی مارنا چاہتا تھا" — کیپٹن آصف نے کہا — "لیکن کمپنی کمانڈر کی موجودگی میں ہم دونوں کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں۔ مجھے بہر حال اس ہندو کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں۔ میں تو اس کے پُورے خاندان کو ختم کر کے بھی چین نہ لوں لیکن ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"میں کچھ کرنا چاہتا ہوں سر!" — طاہر پرویز نے زیرِ لب کہا اور سکول کے پھاٹک کی طرف چل پڑا۔

✪

"کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" — رات کو میجر اصغر لیفٹیننٹ طاہر پرویز سے پوچھ رہا تھا — "تم کر ہی کیا سکتے ہو طاہری! کیا تم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ ہم حکم کے پابند ہیں؟..... پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ابھی تک وردی کیوں نہیں بدلی؟ اسے اتارو اور دُھلواؤ۔"

"بھائی جان!" — طاہر پرویز ایسی آواز میں بولا جس میں غم تو تھا لیکن اس آواز میں خود اعتمادی بھی تھی۔ کہنے لگا — "میں وردی بدل لوں گا لیکن دُھلواؤں گا نہیں۔ اسے اسی طرح اپنے پاس محفوظ رکھوں گا۔"

میجر اصغر کم فہم بچّہ تو نہیں تھا۔ اس نے طاہر پرویز کا دل یہ کہہ کر نہ توڑا کہ وہ اس وردی کو دھلوا لے۔ اصغر سمجھتا تھا کہ طاہر صبیحہ کے خون کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔

"تم نے آج ایک ہندو کو گولی مار دی ہے" — میجر اصغر نے کہا — "میں ہوتا تو شاید اُن سب کو گولی مار دیتا جو ہندو تخریب کاروں کی لاشیں لینے آتے تھے۔ اپنے دل میں دشمن کی اتنی ہی نفرت ہونی چاہیے جتنی تمہارے دل میں ہے۔ دشمن کی نفرت نہیں تو جنگ میں جیت بھی نہیں ہوتی، لیکن تم نے کمانڈ پر جذبات کو سوار کر لیا تو کسی معرکے میں اپنی پوری پلاٹون کو مروا دو گے۔ مجھے تمہارے متعلق فکر پیدا ہو گیا ہے۔ ایک لڑکی کی موت نے تمہارا دماغی توازن بگاڑ دیا ہے۔"

"صرف ایک لڑکی کی خاطر نہیں بھائی جان!" — طاہر نے جھنجھلا کر کہا — "آپ مجھ پر غلط الزام نہ لگائیں۔ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں کہ یہ کیسی جنگ ہے؟ میں فوج میں وہ جنگ لڑنے کے لیے بھرتی ہوا تھا جو ہم نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں لڑی تھی لیکن فوج میں آکر پہلی ڈیوٹی یہ ملی کہ مشرقی

پاکستان میں سمندری طوفان کے ہلاک کیے ہوتے لوگوں کی لاشیں اٹھاؤ اور انہیں دفن کرو۔ اب یہ جنگ لڑ رہے ہیں جس میں اپنے پرائے کی تمیز ختم ہوگئی ہے۔ ہم چند ایک بھارتی تخریب کاروں کو مارنے کے لیے چند ایک اپنے بھائیوں کو بھی مار ڈالتے ہیں۔ کیا ہماری حکومت کو معلوم نہیں کہ انڈین آرمی ہمارے ملک میں داخل ہو چکی ہے اور باقاعدہ گوریلا جنگ لڑ رہی ہے؟"

"یہ سوچنا تمہارا کام نہیں" ـــ اصغر نے کہا ـــ "تم لیفٹیننٹ ہو۔ ہم پر جو حکومت کر رہے ہیں وہ لیفٹیننٹ جنرل ہیں۔ ہم اُن سے بازپرس نہیں کر سکتے۔ میں تمہیں یہ کہہ رہا ہوں کہ اپنے آپ کو سنبھالو۔ صبیحہ کو دل سے اتارنے کی کوشش کرو.... تمہیں یاد ہوگا جب لاہور سے سب ہمیں ملنے یہاں آتے تھے تو شازی نے تمہیں کہا تھا کہ طاہری، یاد رکھنا تمہارے تایا جان نے اپنی بیٹی عصمت کے لیے تم پر نظریں لگا رکھی ہیں۔ شازی نے تمہیں یہ بھی کہا تھا کہ عصمت بھی جب تمہیں دیکھتی ہے تو اس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں.... تم ابھی کچی عمر میں ہو طاہری! سنجیدگی سے سوچو۔ ایک مری ہوئی لڑکی کی یاد میں اپنی زندگی تباہ نہ کر لینا.... اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ آج تم میرے ساتھ ہو اور میں تمہیں لگام ڈالے رکھتا ہوں۔ کل تمہیں کسی اور یونٹ کے ساتھ عارضی طور پر بھیج دیا گیا اور تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔"

"بھائی جان!" ـــ طاہر پرویز نے کہا ـــ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ میرا دماغی توازن ٹھیک رہے تو مجھے ہر اُس جگہ بھیجیں جہاں صحیح معنوں میں ایکشن ہو۔ مجھے کسی کمانڈو مشن پہ بھیجیں۔ گوریلا کارروائیوں کے لیے بھیجیں۔ حکم ملے گا کہ آگ میں کود جاؤ تو میں آگ میں کود جاؤں گا۔ مجھے شہر کی ڈیوٹی سے گھن آنے لگی ہے۔ جہاں کہیں اطلاع ملے کہ تخریب کار جمع ہو رہے ہیں وہاں مجھے بھیجیں۔"

میجر اصغر دیکھ رہا تھا کہ طاہر پرویز کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔ اُس نے طاہر کو بہت کچھ کہا لیکن طاہر کی حالت وہی رہی۔ میجر اصغر نے اس علاقے کا نقشہ نکالا اور طاہر کے آگے پھیلا دیا۔

"یہ دیکھو" ـــ اصغر نے نقشے پر ایک جگہ پنسل رکھ کر کہا ـــ "یہ جگہ مارک کر لو اور ریفرنس نوٹ کر لو۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر سے ٹاسک آیا ہے کہ اس جگہ کہیں مکتی باہنی کا اڈہ ہے اور وہاں ایمونیشن کا ذخیرہ بھی ہوگا۔ میں یہ ٹاسک نمبر دو پلاٹون کو دینا چاہتا تھا۔ تم کہتے ہو کہ ذہن کو نارمل کرنے کے لیے تمہیں ایکشن اور دشمن کی ضرورت ہے تو یہ ٹاسک تم لے لو۔ یہ تمہاری پلاٹون جائے گی۔ یہ جگہ یہاں سے دو میل سے ایک آدھ فرلانگ کم ہے۔ تم اس ایریا میں پٹرول کرو گے۔ اگر دشمن سے ٹکر ہو گئی تو دشمن کے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو زندہ پکڑنا ہے۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو دشمن کے چند ایک زندہ آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

میجر اصغر نے اُسے فوجی انداز میں ہدایات دیں اور کہا کہ صبح کی اذان سے ایک گھنٹہ پہلے روانہ ہونا ہے۔

لیفٹیننٹ طاہر پرویز نے نقشے پر ایک بار پھر نظریں جما دیں۔ اُس کا سر نقشے پر جھکا ہوا تھا۔ اب اُس نے سر اٹھایا تو اصغر نے دیکھا کہ طاہر پرویز کے چہرے پر رونق اور آنکھوں میں چمک تھی۔ اُس نے جب اصغر سے دو تین باتوں کی وضاحت مانگی تو اُس کی آواز میں فوجیوں والی جان تھی۔ اب اُس کی

آواز میں جذبات کا لرزہ نہیں تھا، غم سے آواز دبی دبی نہیں تھی۔ وہ اب پلاٹون کمانڈر تھا۔

✪

طاہر پرویز اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے خون آلود وردی اتاری اور دوسری وردی پہن لی۔ اُس صورتِ حال میں جو مشرقی پاکستان میں پیدا ہو گئی تھی، فوجیوں کا سلیپنگ سوٹ بھی وردی ہی تھی۔ طاہر پرویز نے خون آلود قمیض کو تہہ کر کے اس پر اخبار کا دوہرا کاغذ لپیٹا اور اسے اٹیچی کیس میں رکھ دیا اور پتلون دُھلوانے کے لیے الگ پھینک دی، پھر وہ خود چارپائی پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے اپنے آپ کو بھی پتلون کی طرح پھینک دیا ہو۔

"مجھے کوئی نہیں سمجھے گا" ـــ اُسے خیال آیا ـــ "ہر کوئی ایک ہی بات دہرائے جا رہا ہے.... اپنے آپ کو سنبھالو۔ جذبات سے نکلو.... ایک صبیحہ نہیں، مجھے پاکستان کی ہر شہید بیٹی کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب چکانا ہے۔"

اُس نے اردلی کو بلایا اور اُسے کہا کہ نائب صوبیدار شیر علی، پلاٹون حوالدار اور سیکشن کمانڈروں کو بلا کر لے آؤ۔

وہ سب قریب ہی تھے، دوڑتے آئے۔ طاہر پرویز نے انہیں نقشہ دکھا کر بتایا کہ اس علاقے کو کھوجنا ہے اور جہاں ضرورت پڑی وہاں چھاپہ مارنا ہے۔ اُس نے فوجی اصطلاحوں اور الفاظ میں انہیں ہدایات دیں اور کہا کہ صبح ساڑھے تین بجے روانہ ہونا ہے۔

"میں کوئی زندہ ہندو نہیں دیکھنا چاہتا" ـــ طاہر پرویز نے کہا ـــ "حکم یہ ہے کہ مکتی باہنی کے دو چار آدمیوں کو اور خاص طور پر ہندو تخریب کاروں کو زندہ پکڑ کر بریگیڈ ہیڈ کوارٹر پہنچانا ہے۔ آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ دشمن کے آدمیوں کو زندہ کیوں پکڑا جاتا ہے۔"

"معلوم ہے سر!" ـــ نائب صوبیدار نے کہا ـــ "اِن سے اُن کے خفیہ ٹھکانے معلوم کرنے ہوتے ہیں اور اُن سے اپنے کام کی انفارمیشن لی جاتی ہے۔"

"لیکن میرا حکم یہ ہے کہ کسی غدار مسلمان اور کسی ہندو کو زندہ نہیں لانا" ـــ طاہر پرویز نے کہا ـــ "جس پر شک ہو اُسے گولی مار دو۔"

نائب صوبیدار شیر علی نے طاہر پرویز کو گہری نظروں سے دیکھا، اُس کے ہونٹ ذرا سے کھلے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا اور آہ سی لے کر سر جُھکا لیا۔ طاہر پرویز نے انہیں صبح ساڑھے تین بجے تک برخاست کر دیا۔

صبح ساڑھے تین بجے طاہر پرویز اپنی پلاٹون کو لے کر نکل گیا۔

✪

شام کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ پلاٹون کو کبھی کا واپس آ جانا چاہیے تھا لیکن اس کی واپسی کے ابھی کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میجر اصغر پریشان ہو رہا تھا۔ اُس نے کیپٹن آصف کو بلا کر کہا کہ وہ اپنی پلاٹون کو صرف دس منٹ کے نوٹس پر تیار رکھے کیونکہ طاہر کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔

میجر اصغر کے کرنے کے اور بھی بہت سے کام تھے لیکن طاہر پرویز نے اُس کے لیے بڑا

نازک مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ اُسے یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ طاہر پرویز کی پلاٹون دشمن کی گھات میں نہ آگئی ہو یا طاہر پرویز کوئی جذباتی یا احمقانہ حرکت نہ کر بیٹھا ہو۔ مشرقی پاکستان کی اس صورتِ حال میں پاک فوج کی سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ نفری بہت ہی کم تھی اور ذمّے داری کے علاقے نہ صرف بہت بڑے تھے بلکہ دشوار گزار بھی تھے اور جنگل اتنے گھنے اور زمین کے خدوخال ایسے تھے جو دشمن کے گوریلا ایکشن کے لیے اور گھات لگانے کے لیے نہایت موزوں اور آسان تھے۔ میجر اصغر کو یہ صورت صاف نظر آرہی تھی کہ طاہر پرویز کی پلاٹون کہیں پھنس گئی تو اُس کی مدد کو پہنچنا اور اُسے اس مشکل سے نکالنا تقریباً ناممکن ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ مشکل بھی تھی کہ مدد کے لیے جانے والے ٹروپس کو اپنی جگہ خالی کر کے جانا تھا اور ان کی جگہ پوری کرنے کے لیے نفری نہیں تھی۔ تمام تر مشرقی پاکستان میں پاک فوج اسی خطرناک کیفیّت میں تھی۔

میجر اصغر پریشانی کے عالم میں سوچتا رہا کہ دوسری پلاٹون کو بھیجے یا بٹالین ہیڈکوارٹر کو اطلاع دے کہ اُس کی ایک پلاٹون فلاں مقام پر کسی مشکل میں پھنس گئی ہے۔ میجر اصغر وائرلیس پر طاہر پرویز کو پکار پکار کر تھک گیا تھا۔ اُدھر سے کوئی جواب نہیں آتا تھا۔ کئی بار کوشش کے باوجود وائرلیس کا ملاپ نہ ہوسکا۔ اس سے اصغر اور زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔

میجر اصغر بٹالین ہیڈکوارٹر کے ساتھ وائرلیس کا ملاپ کر ہی رہا تھا کہ کمپنی صُوبیدار نے اُسے بتایا کہ پلاٹون آگئی ہے۔ میجر اصغر دوڑ کر باہر نکلا۔ طاہر پرویز اپنی پلاٹون کے آگے آگے سکول کے پھاٹک میں داخل ہو رہا تھا۔ اصغر نے بڑی تیزی سے پلاٹون کی نفری کی گنتی کی نفری پُوری تھی۔ طاہر پرویز کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ میجر اصغر اُسے اندر لے گیا اور اُس سے رپورٹ لی۔ اصغر نے اُس کے ساتھ کوئی اور بات نہ کی۔ اتنا ہی کہا کہ وہ جا کر نہا دھو لے اور ذرا آرام کرلے۔ طاہر کے جانے کے بعد اصغر نے نائب صوبیدار شیر علی کو بلایا۔ اس نائب صوبیدار کو اصغر نے گذشتہ رات الگ بٹھا کر کہا تھا کہ وہ واپس آکر یہ رپورٹ دے گا کہ اس مشن کے دوران طاہر پرویز کا رویّہ اور اُس کی ذہنی کیفیّت کیسی رہی تھی۔

"کیا رپورٹ ہے صاحب؟" — میجر اصغر نے نائب صوبیدار شیر علی سے پوچھا۔

"آپ ناراض تو نہیں ہوں گے سر؟" — شیر علی نے پوچھا۔

"اگر آپ نے کوئی بات چھپالی تو میں یقیناً ناراض ہوں گا" — اصغر نے کہا — "مجھے مکمّل رپورٹ چاہیئے صاحب!"

"سر!" — نائب صوبیدار شیر علی نے ذرا جھجکتے ہُوئے کہا — "رپورٹ ٹھیک نہیں ہم جب اس جگہ پہنچے تو ہمیں کوئی آدمی نظر نہ آیا لیکن یہ پتہ چلتا تھا کہ یہاں دشمن کے آدمی موجود رہے ہیں۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہُوئی تھیں۔ سگریٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑے بھی تھے۔ ہم نے اُس جگہ کے اردگرد تمام علاقے کی گھوم پھر کر تلاشی لی۔ کچھ آثار ایسے ملتے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ دشمن یہاں رُکا تھا۔ طاہر صاحب نے حکم دیا کہ اور دُور دُور تک جا کر دیکھو۔ دشمن کہیں نہ کہیں مِل جائے گا....

"وہاں سے ایک میل دُور بارہ چودہ جھونپڑوں کا ایک گاؤں تھا۔ طاہر صاحب نے وہاں کے رہنے

والوں کو باہر نکال لیا۔ مردوں کو الگ لے جا کر ننگا کرالیا۔ ان میں دو ہندو تھے۔ طاہر صاحب دونوں کو پرے لے گئے۔ ہم نے دو گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ میں دوڑ کر اُدھر گیا۔ طاہر صاحب کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور دونوں ہندو مرے پڑے تھے" — نائب صوبیدار نے میجر اصغر کو خاصی لمبی رپورٹ دے دی جس میں اُس نے پورا ایکشن بیان کیا اور کہا — "سر! میں معافی چاہتا ہُوں۔ طاہر صاحب نے اگر وردی نہ پہنی ہوتی تو میں یہ کہتا کہ یہ لڑکا فوجی افسر نہیں، کوئی بلوائی ہے۔ طاہر صاحب میں اتنا زیادہ غصہ ہے کہ یہ کسی وقت اپنے غصّے کا شکار ہو جائیں گے اور پلاٹون کو بہت نقصان پہنچائیں گے۔ میں نے دو تین بار انہیں کہا کہ جس کام کے لیے ہم آتے ہیں اسے پورا کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں.... سر! آپ طاہر صاحب کو سمجھائیں۔ اُنہوں نے میری بات پر غور کرنے کی بجائے بڑے سخت غصے میں مجھے کہا کہ میں اُن کا صرف حکم مانوں اور انہیں ٹوکنے کی جرأت نہ کروں۔"

"کیا آپ کا وائرلیس سیٹ خراب ہوگیا تھا؟" — میجر اصغر نے پوچھا — "میں سارا دن ملاپ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔"

"کیا بتاؤں سر!" — نائب صوبیدار شیر علی نے کہا — "طاہر صاحب نے وائرلیس آپریٹر کو حکم دیا تھا کہ وائرلیس آف رہنے دو۔ اُنہوں نے کمپنی ہیڈکوارٹر کے ساتھ ملاپ توڑ لیا تھا.... آپ طاہر صاحب کی طرف توجہ دیں سر! انہیں باہر نہ بھیجا کریں۔"

میجر اصغر نے طاہر پرویز کو خیریّت سے واپس آتے دیکھا تھا تو وہ بہت خوش ہُوا تھا لیکن اُس کے رویّے کی رپورٹ سُن کر وہ پریشان ہوگیا۔ وہ اُس سے باز پُرس نہیں کرسکتا تھا۔ اُس کے خلاف کارروائی کرسکتا تھا جو اُسے کرنی چاہیئے تھی لیکن اُسے ارشد اور طاہرہ کا خیال آگیا۔ اُس نے طاہر پرویز کو جو کچھ کہنا تھا، وہ کئی بار کہہ چکا تھا۔ مزید کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ مشرقی پاکستان کی سلامتی کو دیکھے یا ایک لیفٹیننٹ کی ذہنی صحت کو۔ سوچ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ طاہر پرویز کی نسبت مشرقی پاکستان کا دفاع زیادہ ضروری ہے۔ اُسے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ یہ نوجوان اپنے ساتھ ملک کے دفاع کو بھی نقصان پہنچائے گا۔ اصغر نے فیصلہ کیا کہ وہ طاہر پرویز کو صرف ایک موقع اور دے گا۔

✪

یہ موقع دو ہی روز بعد آگیا۔ ایسی ہی ایک اور مہم آگئی۔ بٹالین ہیڈکوارٹر نے میجر اصغر کو اطلاع دی تھی کہ قصبے سے تین میل دُور مکتی باہنی کی ایک پارٹی ایک گاؤں میں وہاں کے رہنے والوں کو ڈرا دھمکا کر اپنا عارضی اڈہ بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ گاؤں میجر اصغر کی ذمّہ داری کے علاقے میں تھا۔ بٹالین کی دوسری کمپنیاں وہاں سے بہت دُور تھیں۔

میجر اصغر نے لیفٹیننٹ طاہر پرویز کو نقشے پر یہ گاؤں دکھا کر بتایا کہ کام کیا ہے۔ طاہر پرویز نے نارمل ذہنی حالت میں ٹاسک سمجھ لیا۔

"طاہری!" — اصغر نے اُسے کہا — "اپنے جذبات پر قابو رکھ کر.... ٹھیک ہے طاہری؟.... عقل سے کام لینا۔ میں تمہیں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ تم ایک غلطی کر چکے ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے اس پر پردہ ڈالا تھا۔ اب اپنے آپ کو حکم کا پابند رکھنا۔"

"خدا کے لیے بھائی جان!" — طاہر پرویز نے کہا — "یہ نہ کہنا کہ مجھ پر صبیحہ سوار ہے۔ میرے ذہن میں دشمن کے سوا کچھ بھی نہیں.... صبیحہ کو میں دل سے نہیں اتار سکتا بھائی جان! لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ صبیحہ مجھے پیچھے نہیں گھسیٹے گی، آگے دھکیلے گی۔ صبیحہ کی یاد میری کمزوری نہیں میری طاقت ہے۔"

"تمھاری طاقت تمھاری اپنی عقل ہے" — اصغر نے کہا — "میں تمہیں اور کچھ نہیں کہوں گا طاہری!.... اب میں تمھارے ساتھ کمپنی صوبیدار کو بھیج رہا ہوں۔ یہ تجربہ کار صوبیدار ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں حوالدار میجر تھا۔ چونڈہ کے محاذ پر لڑا تھا اور اسے تمغہ جرأت دیا گیا تھا۔ اگر وہ کوئی مشورہ دے تو اسے ٹال نہ دینا۔ اسے اپنا استاد سمجھنا۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان!"

"اللہ حافظ طاہری!" — اصغر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "صبح تین بجے نکل جانا۔"

طاہر پرویز کے جانے کے بعد میجر اصغر نے کمپنی صوبیدار کو بلایا اور اُسے کہا کہ طاہر پرویز کا خیال رکھے اور یہ بھی دیکھے کہ اُس کی ذہنی حالت کیسی رہتی ہے۔

"واپس آکر آپ مجھے علیحدگی میں پوری رپورٹ دیں گے" — میجر اصغر نے صوبیدار سے کہا — "طاہر صاحب کو آزادی سے فیصلے کرنے دینا۔ جہاں آپ دیکھیں کہ صاحب بے لگام ہو گئے ہیں اور فائدے کی بجائے نقصان کا خطرہ ہے تو انہیں ٹوک دینا۔"

"سر!" — کمپنی صوبیدار نے مسکرا کر کہا — "آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں تو طاہر صاحب کی جان پر اپنی جان قربان کر دوں گا لیکن ایک بات کہنے کی اجازت دیں.... جب سے ہم یہاں آئے ہیں، طاہر صاحب غصّے میں رہنے لگے ہیں۔ ہر بات غصے میں کرتے ہیں۔ نہ آرام کرتے ہیں نہ کسی کو دو منٹ کے لیے بیٹھا ہُوا دیکھ سکتے ہیں۔ میں پرانا آدمی ہوں سر! میں اچھی طرح جانتا ہُوں کہ طاہر صاحب میں جذبہ موجود ہے اور ان کا مورال بہت مضبوط ہے لیکن سر! فیلڈ میں آکر رویّہ نرم کر لینا ضروری ہوتا ہے۔"

"واپس آکر مجھے پوری رپورٹ دیں" — میجر اصغر نے کہا — "صوبیدار صاحب! جس طرح یہ علاقہ میری ذمّہ داری میں ہے اسی طرح یہ لڑکا میری ذمّہ داری میں ہے۔"

"میں جانتا ہوں سر!" — صوبیدار نے کہا — "مجھے معلوم ہے۔ آپ فکر نہ کریں سر! میں سنبھال لوں گا۔ ٹریننگ تجربے سے مکمل ہوتی ہے سر! آپ اور میں نے سن پینسٹھ کی جنگ لڑی ہے سر!.... بہر حال آپ فکر نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے صوبیدار صاحب!" — میجر اصغر نے کہا — "اللہ حافظ۔"

✪

لیفٹیننٹ طاہر پرویز پلاٹون کو لے کر صبح تین بجے نکل گیا۔ انہیں پیدل جانا تھا۔ علاقہ میدانی ہوتا تو تین میل کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے ہو جاتا۔ لیکن وہ بڑا مشکل علاقہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے درختوں کی جھکی ہوئی ٹہنیاں، اونچی گھاس اور جھاڑیاں راستہ نہیں دیتی تھیں۔ زمین اونچی نیچی بھی تھی۔ کہیں کہیں پانی جمع ہو گیا تھا اور کہیں کہیں دلدل بھی تھی۔ اونچی نیچی ٹیکریاں بھی تھیں۔ اندھیرا تھا اور کچھ پتہ

نہیں چلتا تھا کہ چار قدم آگے کیا ہے۔

نقشے کے مطابق طاہر پرویز گاؤں سے دو تین فرلانگ دُور رُک گیا اور اُس نے پلاٹون کو چھپ کر بیٹھ جانے کو کہا اور یہ بھی کہ کوئی جوان سگریٹ نہ پیئے اور اونچی بات نہ کرے۔ اُس نے حوالدار عجائب خان کو ساتھ لیا اور صوبیدار سے کہا کہ وہ پلاٹون کے ساتھ رہے۔ وہ خود حوالدار عجائب خان کے ساتھ گاؤں تک جا رہا تھا جو وہاں سے نظر نہیں آتا تھا۔

صبح کی روشنی سفید ہو چکی تھی۔ طاہر پرویز اور عجائب خان چل پڑے۔ وہ بیس پچیس قدم ہی گئے ہوں گے کہ دو بنگالی بازو اوپر کر کے لہراتے ہوتے اُن کی طرف آئے۔ وہ بہت ہی غریب لگتے تھے۔ طاہر پرویز رُک گیا۔ بنگالی اُس کے قریب آن رُکے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتے تھے۔ صوبیدار نے دیکھا تو وہ دوڑتا ہُوا پہنچا۔

بنگالی کہہ رہے تھے کہ انہوں نے نصف یا پَون میل دُور ندی کے کنارے مُکتی باہنی کے بارہ تیرہ آدمی دیکھے ہیں اور اُن کی باتیں سنی ہیں۔ ان بنگالیوں کا خیال تھا کہ ندی سے ایک یا دو لانچیں گذر رہی ہیں اور مکتی باہنی کے یہ آدمی اِن لانچوں کو تباہ کریں گے یا لُوٹیں گے۔

"تم کون سے گاؤں کے رہنے والے ہو؟" — صوبیدار نے اُن سے پوچھا۔

اُنھوں نے ایک طرف اشارہ کر کے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ یہ کوئی اور گاؤں تھا۔

"یہاں قریب ایک گاؤں ہے" — لیفٹیننٹ طاہر پرویز نے اُن سے پوچھا — "سُنا ہے مکتی باہنی نے وہاں اپنا اڈہ بنا رکھا ہے۔"

"معلوم نہیں صاحب!" — ایک بنگالی نے کہا — "ہم اُس گاؤں میں نہیں گئے۔ ہم نے جو دیکھا ہے وہ آپ کو بتا دیا ہے۔"

"سر!" — صوبیدار نے طاہر پرویز سے کہا — "اِن پر اعتبار نہ کریں۔ یہ ہمیں دھوکہ دینے آئے ہیں۔ یہ خود مکتی باہنی ...."

دونوں بنگالیوں نے اکٹھے بولنا شروع کر دیا۔ اُن کے انداز میں احتجاج اور غصّہ تھا۔ طاہر پرویز نے انہیں ڈانٹ کر کہا کہ ان میں سے ایک آدمی بات کرے۔

"ہم غریب لوگ ہیں" — ایک بنگالی نے کہا — "آپ سمجھتے ہیں کہ غریب آدمی سچ نہیں بولا کرتا۔ مکتی باہنی کے آدمی آتے ہیں تو وہ ہم پر ظلم کرتے ہیں کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ ہم پاکستانی ہیں۔ آپ آتے ہیں اور کہتے ہیں ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ ہمیں غدّار کہتے ہیں۔ ہم پاکستانی ہیں بنگلہ دیشی نہیں ہیں۔ ہم پر اعتبار کرو۔"

"ہم قسم نہیں کھائیں گے" — دوسرے بنگالی نے کہا — "ہم دونوں آپ کے ساتھ چلیں گے اور وہ جگہ آپ کو دکھائیں گے لیکن دُور سے دکھائیں گے۔ اُن لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا تو ہمیں بھی اور ہمارے بچوّں کو بھی قتل کر دیں گے۔"

"سر!" — صوبیدار نے کہا — "ہمیں پہلے اُس گاؤں میں جانا چاہیئے۔ ہمیں جو حکم ملا ہے پہلے وہ پورا کرنا چاہیئے۔"

"اب آپ وہ حکم مانیں گے جو میں آپ کو دُوں گا صوبیدار صاحب!" — طاہر پرویز نے کہا —

"ہم وہاں جائیں گے جہاں دشمن یقینی طور پر موجود ہے۔ اگر اِن دونوں کی اطلاع غلط نکلی تو میں اِن دونوں کو گولی مار دُوں گا۔"

صوبیدار خاموش رہا۔

طاہر پرویز نے دونوں بنگالیوں کو ساتھ لیا اور پلاٹون کو ایک خاص ترتیب میں کر کے چل پڑا۔

★

آگے جنگل بہت گھنا اور دشوار گذار ہو گیا تھا۔ اس سے گذرنا تو مشکل تھا لیکن اس کا فائدہ یہ تھا کہ آڑ بڑی اچھی مہیّا کرتا تھا۔ دونوں بنگالی آگے آگے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ رُک کر بیٹھ گئے۔ طاہر پرویز اُن کے پاس جا بیٹھا۔ ایک بنگالی نے جھاڑی کو ہاتھ سے ایک طرف کرتے ہُوتے طاہر پرویز کو سامنے دیکھنے کا اشارہ کیا۔

طاہر پرویز نے دیکھا۔ تقریباً ایک سَو گز دُور تیس پینتیس فٹ اونچی ٹیکری تھی جو جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکی ہوتی تھی۔ اُس پر ایک آدمی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ یہ ندی کا کنارا تھا۔ ندی گہری اور چوڑی تھی۔ وہ آدمی اُس طرف دیکھ رہا تھا جدھر سے ندی آ رہی تھی۔ اُس نے کسی کو ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا، پھر وہ بیٹھ گیا۔

ندی کے کنارے جنگل بہت گھنا تھا۔ ندی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہوا تیز تھی۔ درختوں میں گذرتی ہوتی تیز ہوا کا شور خاصا تھا۔ طاہر پرویز نے صوبیدار کو اپنے پاس بُلایا اور اُسے کہا کہ وہ ٹیکری پر اُس آدمی کو اس طرح پکڑنے جا رہا ہے کہ اُسے پتہ نہیں چلے گا کہ کوئی آ رہا ہے۔

"آپ نہیں جائیں گے سَر!" ــــ صوبیدار نے کہا ــــ "اس کام کے لیے ہمارے پاس بڑے اچھے جوان موجود ہیں"۔

"میں جاؤں گا سَر!" ــــ حوالدار عجائب خان نے کہا ــــ "یہ آپ کا کام نہیں"۔

طاہر پرویز نے اپنے صوبیدار اور پلاٹون حوالدار کی بات جیسے سنی ہی نہ ہو۔ وہ جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر آگے چلا گیا لیکن اٹھا نہیں۔ آگے اونچی گھاس اور بانسوں کے ہرے درختوں کی اوٹ تھی۔ طاہر پرویز ہاتھوں اور گھٹنوں کے بَل بانسوں تک پہنچ گیا۔

"صاحب!" ــــ حوالدار عجائب خان نے صوبیدار سے کہا ــــ "میں آگے چلا جاؤں؟ .... صاحب مارا جائے گا"۔

"نہ نہ!" ــــ صوبیدار نے کہا ــــ "اِس کا دماغ چل گیا ہے۔ آگے نہ جانا۔ تمہاری بے عزتی کردے گا .... میں یہ ضرور کہوں گا کہ لڑکا دلیر ہے"۔

طاہر پرویز ٹیکری کے ساتھ جا پہنچا ــــ حوالدار عجائب خان نے اپنی سٹین گن پر میگزین چڑھا کر سامنے کر لی اور صوبیدار نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی صوبیدار نے لائٹ مشین گن بھی تیار کرادی۔ مشین گن کا نمبر ایک گن کے پیچھے لیٹ گیا۔ اُس کی نظریں طاہر پرویز کے اردگرد اور ٹیکری پر گھوم رہی تھیں۔ اس طرح ایک سٹین گن، ایک ریوالور اور ایک مشین گن طاہر پرویز کو کوَر کر رہی تھیں۔

طاہر آہستہ آہستہ پیٹ کے بَل ٹیکری پر چڑھنے لگا۔ ٹیکری پر جو آدمی تھا، وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور ندی کے اوپر کی سمت دیکھنے لگا۔ اُس نے ہاتھ سے کسی کو اشارہ کیا۔ اب خطرہ تھا کہ اُس نے اِس طرف دیکھا تو اُسے طاہر نظر آجائے گا لیکن وہ بیٹھ گیا۔ وہ جھاڑیوں میں نظر نہیں آتا تھا۔

طاہر پرویز ہوا اور ندی کے شور سے فائدہ اٹھاتا ہُوا اوپر کو رینگتا گیا اور اُس جھاڑی تک پہنچ گیا جس کی دوسری طرف وہ آدمی بیٹھا تھا۔ صوبیدار اور پلاٹون حوالدار کی سانسیں جیسے رُک گئی ہوں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ طاہر پرویز اٹھا اور جھاڑی کے اوپر پیٹ کے بَل گر پڑا۔ وہ لیٹے لیٹے پیچھے ہٹا۔ وہ آدمی طاہر کے بازوؤں میں جکڑا ہُوا یوں طاہر کے ساتھ ہی پیچھے کو آ گیا جیسے شیر نے بکری کو دبوچ رکھا ہو۔ طاہر کا ایک ہاتھ اُس کے منہ پر تھا۔ وہ اُسے گھسیٹتا ہُوا نیچے لے آیا۔ اُس آدمی کی رائفل اوپر ہی رہ گئی تھی۔ ٹیکری کے نیچے آ کر طاہر اُٹھ کھڑا ہُوا اور اپنے قیدی کو اُس نے اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ صوبیدار اٹھا اور جھک کر چلتا اُن تک پہنچ گیا۔ طاہر نے ریوالور نکال لیا تھا۔

"فوراً بول اِدھر کیا ہو رہا ہے" ــــ طاہر پرویز نے ریوالور کی نالی اُس کی کنپٹی کے ساتھ لگا کر پوچھا اور اُسے دو تین گالیاں دے کر کہا ــــ "تمہاری زندگی میرے ہاتھ میں ہے"۔

اُس نے بتا دیا ــــ یہ گھات تھی۔ دس بارہ آدمی تھوڑی دُور گھات میں بیٹھے تھے۔ پاک فوج کی دو لانچیں ندی میں آنے والی تھیں۔ مکتی باہنی کو قبل از وقت اطلاع مل گئی تھی۔

"تمہارا مذہب کیا ہے؟" ــــ طاہر پرویز نے پوچھا۔

"ہندو ہوں"۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟" ــــ طاہر پرویز نے پوچھا ــــ "مشرقی پاکستان؟"

"نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "مغربی بنگال .... میں انڈین آرمی کا لانس نائک ہوں" ــــ اور اُس نے منّت سماجت کے لہجے میں کہا ــــ "ہم تو کرائے کی لڑائی لڑنے آتے ہیں سَر! تنخواہ کے ساتھ تھوڑا سا الاؤنس ملتا ہے"۔

"اور یہاں سے لُوٹ مار کا جو مال ملتا ہے وہ کس کھاتے میں جاتا ہے؟" ــــ طاہر پرویز نے پوچھا۔

وہ ہندو کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ طاہر پرویز نے دونوں ہاتھوں سے اُس کی گردن دبوچ کر دونوں انگوٹھے اُس کی شہ رگ پر دبا دیئے۔ ہندو ذرا سا تڑپا پھر اُس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ طاہر نے اُس کی گردن چھوڑی تو وہ گر پڑا۔ طاہر نے اُس کے مُنہ پر، پہلوؤں میں اور سَر پر زور زور سے ٹھُڈ مارنے شروع کر دیئے۔ ہندو مر چکا تھا اور طاہر لاش کو ٹھُڈ مارتا چلا جا رہا تھا۔

صوبیدار نے طاہر پرویز کو پیچھے کر دیا اور کہا ــــ "یہ ہیں پاکستان کے دشمن" ــــ اور وہ کچھ نہ کچھ کہتا جا رہا تھا۔

✪

"صوبیدار صاحب!" ــــ طاہر پرویز نے کہا ــــ "ایک مشین گن یہاں اوپر لگا دیں جہاں یہ بیٹھا ہُوا تھا۔ جوان رینگ کر اوپر جائیں۔ آپ نے اِس سے سُن لیا ہے کہ اس کی پارٹی کہاں ہے"۔

طاہر پرویز نے صوبیدار کو بتایا کہ پلاٹون کو نہایت خاموشی سے فلاں جگہ لے جائے اور جب اوپر سے مشین گن فائر ہو گی تو گھات میں چھُپے ہوئے آدمی باہر کو بھاگیں گے۔ پلاٹون اِن پر فائر کھول دے۔

چونکہ حرکت خاموشی سے کرنی تھی اس لیے ہر کسی کو اپنی اپنی جگہ پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ طاہر پرویز کے اشارے پر مشین گن نے فائر کھول دیا۔ ہدایت کے مطابق فائر دائیں بائیں پھیلایا جا رہا تھا۔ مکتی باہنی کے چھپے ہوئے چار پانچ آدمی اُس طرف باہر نکل آئے جدھر پلاٹون پوزیشن میں تھی لیکن صوبیدار نے فائر کا حکم نہ دیا کیونکہ اِن آدمیوں نے سامنے آ کر ہتھیار پھینک دیئے اور ہاتھ کھڑے کر لیے تھے۔

طاہر پرویز اوپر چلا گیا۔ جنگل کی وجہ سے اُسے ندی دُور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ ایک اور جگہ چلا گیا۔ وہاں سے دیکھا تو اُسے دو لانچیں پیچھے کو مڑتی دکھائی دیں۔ وہ پاک فوج کی لانچیں تھیں۔ فائر کی آوازیں سُن کر انہیں پیچھے کو موڑ لیا گیا تھا۔ طاہر نے مشین گن کا فائر بند کرا دیا اور وہ اُس طرف دوڑ گیا جدھر اُس کی پلاٹون پوزیشن میں تھی۔ اُس نے دیکھا کہ مکتی باہنی کے چار آدمی صوبیدار کے سامنے کھڑے ہیں اور جھاڑیوں میں سے جوان لاشیں گھسیٹ گھسیٹ کر لا رہے ہیں۔ یہ گھات کی پارٹی تھی۔ اوپر سے مشین گن کا جو فائر آیا تھا، اس میں سے صرف یہ چار آدمی زندہ نکلے تھے۔ سات مارے گئے تھے۔

"صوبیدار صاحب!" — طاہر پرویز نے غصّے سے پوچھا — "کیا یہ چار آپ کے اپنے آدمی ہیں؟"

"قیدی ہیں سَر!" — صوبیدار نے جواب دیا — "انہیں ہم زندہ ساتھ لے جائیں گے۔"

"یہ ہمارے معزز مہمان نہیں ہیں" — طاہر پرویز نے طنزیہ لہجے میں کہا — "اس زمین پر زندہ رہنے کا انہیں کوئی حق نہیں" — اُس نے قیدیوں سے پوچھا — "تم میں مسلمان کون ہے؟"

دو نے ہاتھ کھڑے کر کے بتایا کہ وہ مسلمان ہیں۔ باقی دو ہندو تھے۔ طاہر پرویز نے اپنے جوانوں کو پرے کر دیا اور اِن چار آدمیوں سے کہا کہ وہ پیچھے مڑیں۔ وہ مڑے تو طاہر پرویز نے ایک جوان سے سٹین گن لے لی۔

"نہیں سَر!" — صوبیدار نے طاہر پرویز کے سامنے کھڑے ہو کر دھیمی آواز میں کہا — "یہ آپ کیا کرنے لگے ہیں؟ اِن سے تو ہم انفارمیشن لیں گے۔ انہیں بریگیڈ ہیڈکوارٹر کے حوالے کیا جائے گا۔"

"ایک سیکنڈ میں میرے سامنے سے ہٹ جائیں صوبیدار صاحب!" — طاہر پرویز نے کہا — "جہنم میں جائے بریگیڈ ہیڈکوارٹر ..... ہٹو میرے آگے سے!"

صوبیدار نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اُنہوں نے گھات بڑی کامیابی سے ناکام کر دی ہے اِن کے ہتھیار اور ایمونیشن اپنے قبضے میں آ گئے ہیں اور یہ چار آدمی اپنی انٹیلی جنس کے لیے بڑے قیمتی ہیں لیکن طاہر پرویز نے اُس کی بات سننے کی بجائے اُس کی بے عزتی کر دی۔ اُس کے مُنہ سے جھاگ پھوٹ رہی تھی۔ صوبیدار نے اُس کی یہ حالت دیکھی تو وہ پرے ہٹ گیا۔

چاروں قیدی پیٹھ کیئے کھڑے تھے۔ طاہر پرویز نے سٹین گن اُن کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا اور گن کو دائیں بائیں کیا۔ چاروں آدمی گر پڑے۔ ایک کو گولیاں ایسی جگہوں پر لگی تھیں کہ وہ مر نہ سکا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ طاہر پرویز نے اُسے ایک دو اور گولیاں مارنے کی بجائے اُس کے سَر، مُنہ اور پہلوؤں میں زور زور سے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔ وہ پھر بھی نہ مرا تو طاہر پرویز نے گھٹنوں کے بَل ہو کر اُس کی شہ رگ دبا لی۔ طاہر دانت پیس رہا تھا۔ اُس وقت وہ نارمل ذہنی حالت میں نہیں تھا۔

صوبیدار نے دوڑ کر طاہر پرویز کو پیچھے سے پکڑا اور اُسے اٹھا لیا۔ طاہر پرویز نے اپنے جسم کو زور سے جھٹکا دیا لیکن صوبیدار نے اُسے اور زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ جب طاہر کا جسم ذرا ڈھیلا ہوا تو صوبیدار نے اُسے اپنی طرف موڑ لیا۔

"ہوش میں آئیں سَر!" — صوبیدار نے کہا — "جوانوں کے سامنے ایسی حرکت ٹھیک نہیں۔"

"آپ نے مجھے کیوں پکڑا ہے؟" — طاہر پرویز نے دانت پیس کر کہا — "میں آپ کا کورٹ مارشل کرا دُوں گا۔"

"دیکھ بچّے!" — صوبیدار نے کہا — "اس وقت نہ میں صوبیدار ہوں نہ تم لیفٹیننٹ ہو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ اپنے بیٹے کی یہ حالت باپ برداشت نہیں کرے گا۔ میں آخری بار کہہ رہا ہوں ہوش میں آ جاؤ۔ فوراً لیفٹیننٹ پلاٹون کمانڈر کے روپ میں آ جاؤ۔"

طاہر پرویز نے صوبیدار کے چہرے کو دیکھا اور اُس نے سَر جھکا لیا۔

"لاشیں یہیں رہنے دو" — طاہر پرویز نے دبی ہوئی سی آواز میں کہا — "ان کے ہتھیار اور ایمونیشن اٹھاؤ اور چلو۔"

"ہم جس گاؤں میں جا رہے تھے سَر!" — صوبیدار نے کہا — "وہ تو رہ ہی گیا ہے۔"

"جانے دو صاحب!" — طاہر پرویز نے کہا — "میں کمپنی کمانڈر کو جواب دے لُوں گا۔"

"میں نے گستاخی کی تھی سَر!" — واپس آتے ہوئے صوبیدار نے طاہر پرویز سے کہا — "آپ نے ....."

"ٹھیک ہے صاحب!" — طاہر پرویز نے کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا — "میں آپ کو اپنا باپ سمجھتا ہوں۔ آپ کی نیّت پر مجھے شُبہ نہیں" — اُس نے ذرا دیر سوچ کر کہا — "صوبیدار صاحب! معلوم نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ شاید بچپن سے اپنے ماں باپ سے اپنے دشمن کی باتیں سُن سُن کر میرا دماغ میرے قابو میں نہیں رہا۔"

"لڑائیاں اِس طرح نہیں لڑی جاتیں سَر!" — صوبیدار نے کہا — "اپنے آپ کو قابو میں رکھیں۔"

✪

"طاہر صاحب ٹھیک نہیں ہیں سَر!" — صوبیدار نے واپس آ کر میجر اصغر کو تفصیل سے بتایا کہ طاہر پرویز نے کتنی بہادری دکھائی ہے۔ اُس نے یہ بھی تفصیل سے بتایا کہ طاہر پرویز کی ذہنی حالت کیا ہو گئی تھی، اور یہ بھی کہ صوبیدار نے اُسے کس طرح ٹھنڈا کیا تھا۔

میجر اصغر نے ساری رپورٹ سنی اور صوبیدار کو فارغ کر دیا۔ اُس نے طاہر پرویز سے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ اُس گاؤں میں کیوں نہیں گیا جس کے لیے اُسے بھیجا گیا تھا۔ اُس نے طاہر کو شاباش دی کہ وہ بہت بڑا کارنامہ کر آیا ہے۔

دوسرے دن اصغر بٹالین ہیڈکوارٹر اپنے بٹالین کمانڈر سے ملنے چلا گیا۔ اُس نے بٹالین کمانڈر کرنل

ارشاد کو لفٹیننٹ طاہر پرویز کی ذہنی حالت بتائی ۔ ہر ایک تفصیل سنائی ۔

"میں اس کی تحریری رپورٹ بھیج سکتا تھا" ـــــ میجر اصغر نے کہا ـــــ "لیکن سر! آپ جانتے ہیں کہ طاہر کے خاندان کے ساتھ ہمارے بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ آپ طاہر کے والدین سے مل چکے ہیں۔ وہ پاکستان بنانے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے طاہر کی تربیت میں کوئی کسر نہیں رہنے دی تھی لیکن انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ لڑکے کو جذباتی بنا رہے ہیں۔ اس میں انتقام کا جذبہ بھرتا رہا۔"

"یہ تو میں سمجھ گیا ہوں اصغر!" ـــــ کرنل ارشاد نے کہا ـــــ "مجھے یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں۔"

"سر!" ـــــ میجر اصغر نے کہا ـــــ "یہاں کے حالات دیکھ کر اُس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ وہ خود کہتا ہے کہ اپنے دشمن کو دیکھ کر وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ اُسے سب سے بڑی چوٹ تو یہ پڑی ہے کہ جس لڑکی کو چاہتا تھا وہ ماری گئی ہے۔ شاید ہماری شیلنگ سے مری ہے۔"

"میجر اصغر!" ـــــ کرنل ارشاد نے ہلکی سی آہ بھر کر کہا ـــــ "صرف لیفٹیننٹ طاہر نہیں، ہم سب فوجی پاگل ہیں۔ اگر ہمارے دماغ صحیح ہوتے تو ہم یہ عجیب و غریب جنگ لڑنے سے انکار کر دیتے۔ پاک آرمی کی جتنی نفری اس وقت مشرقی پاکستان میں ہے، اس سے کئی گُنا زیادہ انڈین آرمی کی نفری یہاں موجود ہے جسے شیخ مجیب الرحمٰن اور اندرا گاندھی مُکتی باہنی کہتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر!" ـــــ میجر اصغر نے کہا ـــــ "اگر ہمارا دماغی توازن ٹھیک ہوتا تو ہم اپنے اُن لیڈروں کو گولی مارتے جنہوں نے مشرقی پاکستان میں یہ حالات پیدا کئے ہیں.... لیکن طاہر پرویز کا کیس مختلف ہے۔ وہ اپنے پاگل پن پر قابو نہیں پا سکتا۔"

"میں بالکل نہیں چاہوں گا کہ اس لڑکے کا مستقبل خراب ہو" ـــــ کرنل ارشاد نے کہا ـــــ "اچھا خاصا ذہین لڑکا ہے، جرأت والا ہے لیکن تم نے جو رپورٹ دی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کمانڈ کے قابل نہیں۔ میں یوں کرتا ہوں، اُسے بٹالین ہیڈکوارٹر میں اپنے پاس رکھتا ہوں۔ تمہیں کوئی اور پلاٹون کمانڈر دے دیتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں اُسے ٹھیک کر لوں گا۔"

✪

دوسرے ہی دن لیفٹیننٹ طاہر پرویز کو بٹالین ہیڈکوارٹر میں بلا لیا گیا اور اُس کی جگہ ایک نائب صوبیدار آ گیا۔

بمشکل ایک ہفتہ گذرا ہو گا کہ میجر اصغر کو کرنل ارشاد کا فون ملا۔

"میجر اصغر!" ـــــ کرنل ارشاد کہہ رہا تھا ـــــ "لیفٹیننٹ طاہر تو ذہنی مریض ہو گیا ہے۔ میں نے اسے انٹیلی جنس آفیسر لگا دیا تھا۔ ایک ہی روز بعد اس نے لڑائی جھگڑے شروع کر دیئے۔ میں نے اُسے بلایا اور پیار سے پوچھا کہ وہ کیا محسوس کرتا ہے۔ کہنے لگا کہ میں رائفل کمپنی میں جانا چاہتا ہوں۔ میں ایکشن چاہتا ہوں، میں فارغ نہیں بیٹھنا چاہتا۔ میں اپنے سامنے دشمن چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس کے آنسو نکل آئے۔ میں نے اُسے پاس بٹھا کر دوستوں کی طرح لیکچر دیا لیکن اُس پر ذرا سا بھی اثر نہ ہوا۔"

"سر!" ـــــ میجر اصغر نے کہا ـــــ "میں صرف یہ گذارش کروں گا کہ طاہر میری ذمہ داری ہے۔ اس

کے خلاف ...."

"نہیں اصغر!" ـــــ کرنل ارشاد نے کہا ـــــ "میں اس کے خلاف کوئی ایسی ویسی رپورٹ نہیں کروں گا..... میں اِس لڑکے کو بے تحاشہ خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ اس کے مورال کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ اگر اس میں خوبیاں نہ ہوتیں تو میں اس کا کورٹ مارشل اگر نہ کراتا تو اسے بورڈ آؤٹ ضرور کرا دیتا.... مجھے یہ بتاؤ اصغر! یہاں کس لڑکی کے ساتھ اس کی محبت چل رہی تھی؟"

میجر اصغر نے تفصیل سے طاہر اور صبیحہ کی محبت، پھر صبیحہ کی موت اور طاہر کا ردِّعمل بتایا۔

"اور یہ بتاؤ" ـــــ کرنل ارشاد نے کہا ـــــ "تم طاہر کی فیملی سے واقف ہو۔ کیا اس کی فیملی میں کوئی ذہنی مرض ہے؟"

"میں پوری طرح نہیں جانتا سر!" ـــــ اصغر نے جواب دیا ـــــ "میری امّی کو طاہر کی دادی نے طاہر کی والدہ کے متعلق کچھ سنایا تھا۔"

"اس کی والدہ یہاں آئی تھی نا!" ـــــ کرنل ارشاد نے کہا ـــــ "اُن سے تمہارے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔"

"نہ سر!" میجر اصغر نے کہا ـــــ "آپ خالہ طاہرہ کی بات کر رہے ہیں۔ وہ طاہر کی سوتیلی ماں ہیں لیکن سگی ماؤں سے زیادہ اچھی۔ طاہر کی والدہ طاہر کے پیدا ہوتے ہی لیبر رُوم میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔ میری امّی کو طاہر کی دادی سے پتہ چلا تھا کہ طاہر کی والدہ کسی ذہنی مرض میں مبتلا تھیں۔ بڑا عجیب سا مرض تھا کوئی۔"

"میرا خیال ہے طاہر کو وہ مرض ورثے میں ملا ہے" ـــــ کرنل ارشاد نے کہا ـــــ "والدہ اس کے خون میں اپنا یہ مرض چھوڑ گئی ہے۔"

"پھر آپ کیا کر رہے ہیں سر!" ـــــ اصغر نے پوچھا۔

"وہ اس قدر غصیلا اور مُنہ زور ہو گیا تھا کہ میڈیکل آفیسر سے مشورہ لینا پڑا" ـــــ کرنل ارشاد نے کہا ـــــ "یوں سمجھو کہ وہ ایسا خونخوار جانور بن گیا تھا جسے سدھایا نہیں جا سکتا... میڈیکل آفیسر نے اُسے ایک انجکشن دے کر سُلا دیا اور اُسے ایک کیپٹن اور دو جوانوں کے ایسکارٹ میں ڈھاکہ سی۔ ایم۔ ایچ بھیج دیا.... پرسوں.... آج فون پر بات ہوئی ہے۔ اُسے پاکستان ایئر فورس کے طیارے سی۔۱۳۰ سے راولپنڈی سی۔ ایم۔ ایچ میں بھیج دیا گیا ہے۔"

میجر اصغر کے آنسو نکل آئے۔

ارشد اور طاہرہ تقریباً دوڑتے ہوئے راولپنڈی کے فوجی ہسپتال کے اُس کمرے میں پہنچے جہاں انہیں اطلاع ملی تھی کہ اُن کے بیٹے لیفٹیننٹ طاہر پرویز کو رکھا گیا ہے۔ انہیں اگلے ہی روز اطلاع مل گئی تھی کہ طاہر پرویز بیمار ہو کر راولپنڈی ملٹری ہسپتال میں بھیج دیا گیا ہے۔ ارشد اور طاہرہ کے پیچھے پیچھے ملک رجب علی، سلمیٰ، شازی اور ارشد اور طاہرہ کا چھوٹا بیٹا اور اُس سے چھوٹی بیٹی طاہر پرویز کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں یہ تو کسی نے بتایا ہی نہیں تھا کہ طاہر پرویز کو ہسپتال میں کیوں بھیجا گیا ہے۔ وہ یہی سمجھے تھے کہ طاہر پرویز زخمی ہے۔

طاہر پرویز پلنگ پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اُس کی پیٹھ پلنگ کے تکیئے کے ساتھ تھی۔ اُس نے پاجامہ اور کُرتا پہن رکھا تھا۔ ارشد اور طاہرہ جب اُس کے کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں توقع تھی کہ طاہر انہیں جوش و خروش سے ملے گا اور بڑے فخر سے گردن تان کر بتائے گا کہ وہ کس طرح زخمی ہوا ہے مگر اُس نے اپنے باپ اور طاہرہ کو یوں دیکھا جیسے اُن کے ساتھ کبھی سرِ راہے ملاقات ہوئی ہو۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شباب اور جذبے کی چمک نہیں تھی۔ اُس کے انداز میں جوش و خروش کا شائبہ تک نہ تھا۔

"کہاں کہاں زخم آئے ہیں میرے چاند کو؟" — طاہرہ نے بیتابی سے اُس کے پاس بیٹھ کر پوچھا اور اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"کہیں نہیں" — طاہر نے خالی خالی اور بے جان سے لہجے میں جواب دیا۔

ارشد نے طاہر سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو طاہر نے اس طرح ہاتھ ملایا جیسے اس مصافحہ میں نہ اُس کا ارادہ شامل تھا نہ خواہش۔ رجب علی نے اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں میں دبایا، پھر اُس کے گال تھپتھپاتے اور پوچھا کہ زخم کہاں آئے ہیں۔ طاہر پرویز نے اُسے بھی خالی خالی نظروں سے دیکھا اور اپنی کنپٹی پر شہادت کی انگلی رکھ کر بڑی ہی دھیمی آواز میں کہا — "یہاں۔"

"سر پر چوٹ آئی ہے بیٹا؟" — ارشد نے پوچھا۔

"نہیں" — طاہر نے مری ہوئی سی آواز میں جواب دیا — "چوٹ تو کہیں نہیں آئی۔"

"طاہری!" — طاہرہ نے اُس کے گالوں کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر پوچھا — "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"کچھ نہیں امّی جان!" — طاہر پرویز نے خوابیدہ لہجے میں کہا اور اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ سلمیٰ نے بھی طاہر پرویز کے سر کو چوما اور کچھ کہا۔ شازی نے بھی طاہر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ طاہر کا چھوٹا بھائی جس کی عمر تیرہ چودہ سال تھی، اُس کے ساتھ لپٹ گیا تھا۔ طاہر کی چھوٹی

بہن جس کی عمر دس گیارہ سال تھی طاہر پرویز کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی۔ سب کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ پیار، محبت اور اُمڈتے ہوئے جذبات کا شور سا تھا۔ طاہر کو اس کیفیّت میں دیکھ کر شور تھم گیا۔ پھر ایسے ہوا جیسے کمرے میں سنّاٹا چھا گیا ہو۔

طاہر اُن سے لاتعلق ہی رہا۔ وہ آہستہ آہستہ لیٹ گیا اور گہری نیند سو گیا۔ سب نے ایک دوسرے کے مُنہ کی طرف دیکھا۔ ہر ایک کے چہرے پر ایک ہی سوال لکھا تھا — "اسے کیا ہو گیا ہے؟" — ارشد کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ طاہرہ نے جھک کر طاہر پرویز کا ماتھا چُوم لیا۔ ارشد اور رجب علی نے طاہر پرویز کے سر سے پاؤں تک ہاتھ پھیرے۔ جسم پر ایک بھی زخم نہ تھا۔

"میرا خیال ہے اسے نیند کی دوائی دی گئی ہے" — رجب علی نے کہا — "تم میرے ساتھ آؤ ارشد! ڈاکٹر سے پوچھتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ شیل شاک ہے۔"

"کیا ہے؟" — رجب علی کی بیوی سلمیٰ نے پوچھا۔

"توپوں کے گولے مورچوں کے اُوپر آ کر پھٹتے ہیں" — رجب علی نے جواب دیا — "ان کے دھماکے اتنے زوردار ہوتے ہیں کہ بعض فوجیوں کے دماغ ہل جاتے ہیں۔ اسے شیل شاک کہتے ہیں۔ اس کا مریض پاگلوں جیسی حرکتیں اور باتیں کرتا ہے۔"

"آئیں ملک صاحب!" — ارشد نے کہا — "ڈاکٹر سے بات کرتے ہیں۔"

ملک رجب علی اور ارشد باقی سب کو کمرے میں بٹھا کر چلے گئے۔ دروازے سے نکلتے ہی انہیں ایک نرس مل گئی۔ اُس سے اُنہوں نے پوچھا کہ لیفٹیننٹ طاہر کو کیا ہوا ہے۔

"آپ کون ہیں؟" — نرس نے پوچھا۔

"میں اس کا باپ ہوں" — ارشد نے جواب دیا — "اور یہ اس کے تایا ہیں۔ میرا نام ارشد ہے۔"

نرس کا چہرہ اُداس ہو گیا۔ اُس کے ہونٹوں میں کچھ ایسی جنبش ہوئی جیسے اُس نے مُسکرانے کی کوشش کی ہو۔ اُس نے ارشد کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر اُس کی نظریں اُوپر نہ اُٹھ سکیں۔

"کیا بات ہے سسٹر؟" — ارشد نے دُکھی ہوئی سی آواز میں پوچھا — "میرے بیٹے کو جو کچھ بھی ہے مجھے کُھل کر بتا دیں۔ اگر مرض خطرناک اور مہلک ہے تو بھی بتا دیں۔ میری مدد کریں کہ میں اپنے آپ کو ایک ٹریجیڈی کے لیے ذہنی طور پر تیار کر سکوں۔"

"آپ اتنا پریشان نہ ہوں ارشد صاحب!" — نرس نے کہا — "مرض خطرناک یا مُہلک نہیں۔ لیفٹیننٹ طاہر پرویز کے ذہن پر کوئی اثر ہو گیا ہے۔ انہیں ذہنی سکون کے لیے بڑی تیز دوائیاں دی گئی ہیں اور ایسی ہی ایک دوائی کا انجکشن بھی دیا گیا ہے۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ انہیں بے سُدھ اور بے حس کر دیا جائے۔"

"شیل شاک؟" — رجب علی نے پوچھا۔

"آپ میجر عظمت علی صاحب کے پاس چلے جائیں" — نرس نے قریب کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — "میجر عظمت سائیکاٹرسٹ ہیں۔"

❖

ماہرِ نفسیات میجر عظمت علی نے اُٹھ کر رجب علی اور ارشد سے ہاتھ ملایا اور انہیں بٹھایا۔ وہاں ایک کیپٹن بھی بیٹھا ہُوا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" ــــ ملک رجب علی نے میجر عظمت سے پوچھا ــــ "ہمارے لڑکے کو کیا ہو گیا ہے؟"

"یہ ڈیپریشن کی ایک قسم ہے" ــــ میجر عظمت نے جواب دیا ــــ "ڈیپریشن میں عام طور پر مریض آہیں بھرتے اور روتے بھی ہیں لیکن لیفٹیننٹ طاہر کی ڈیپریشن دوسری قسم کی ہے۔ اس کا مریض اس قدر غصّے میں آجاتا ہے کہ مرنے مارنے پر اُتر آتا ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں اسے بڑی تیز دوائیاں اور انجکشن دے رہا ہُوں۔"

"ڈیپریشن کی وجہ کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟" ــــ ارشد نے پوچھا۔

"اتفاق سے کیپٹن شامی یہیں بیٹھے ہیں" ــــ میجر عظمت نے اُس کیپٹن کی طرف اشارہ کر کے کہا جو وہاں بیٹھا ہُوا تھا ــــ "یہ لیفٹیننٹ طاہر کو ڈھاکہ سے لاتے تھے.... کیپٹن شامی! انہیں ساری بات بتا دو۔"

"میں تو ڈھاکہ میں تھا" ــــ کیپٹن شامی نے کہا ــــ "لیفٹیننٹ طاہر کی بٹالین ڈھاکہ سے بہت ہی دُور تھی۔ اس بٹالین کا ایک کیپٹن لیفٹیننٹ طاہر کو ڈھاکہ سی۔ ایم۔ ایچ میں لایا تھا۔ طاہر کو ڈھاکہ سے یہاں اُسکارٹ کر کے لانے کی ڈیوٹی مجھے دی گئی۔ مجھے لیفٹیننٹ طاہر کی بٹالین کے اُس کیپٹن نے جو کچھ بتایا تھا وہ میں آپ کو بتا دیتا ہُوں.... مجھ میں اور لیفٹیننٹ طاہر میں یہ فرق ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اپنے قابو میں رکھا ہُوا ہے۔ یہ بڑی ہمّت کا کام تھا۔ طاہر پرویز میں شاید اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے جذبات پر قابُو پا سکتا" ــــ کیپٹن شامی نے مشرقی پاکستان کی خونچکاں صورتِ حال پوری تفصیل سے بیان کی اور کہا ــــ "مجھ میں اتنی جرآت اور ہمّت نہیں کہ میں وہ سب کچھ بیان کر سکوں جو ہم نے وہاں دیکھا ہے۔ یہ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہاں بھائی کا بھائی نے کس طرح خون بہایا ہے۔ جب ملٹری ایکشن شروع ہُوا تو ایک مشکوک گھر پر شب خون مارنے کے لیے دس بے گناہ گھرانوں کو تباہ کرنا پڑا۔ توپوں کے گولے اور مشین گنوں کی گولیاں اپنے اور پرائے میں تمیز نہیں کر سکتیں۔ غداروں کو مارتے مارتے نہ جانے کتنے بے گناہ ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ ایسا ہونا ہی تھا اور ایسا ہی ہُوا....

"لیفٹیننٹ طاہر کو جو ٹاسک دیا گیا وہ ایسا ہی تھا۔ وہ مکتی باہنی کا گڑھ تھا جس پر رات کو حملہ کیا گیا۔ صبح تک مکتی باہنی کے اس بڑے ہی خطرناک اڈے کا صفایا ہو گیا۔ اُس وقت تک طاہر بہت خوش رہا لیکن آبادی میں جا کر دیکھا تو اُن بنگالیوں کے مکان بھی تباہ ہو چکے تھے جو محبِّ وطن پاکستانی تھے۔ مکانوں کے اندر اور گلیوں میں اُن کی اور اُن کی عورتوں کی اور اُن کے بچوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ لیفٹیننٹ طاہر اس منظر کو برداشت نہ کر سکا۔ بچّہ ہی تو ہے۔ وہ جذبات کو اپنے قابو میں نہ رکھ سکا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس کے ذہن پر ایسا بُرا اثر ہُوا کہ اس نے فوجی احکام کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اسے جہاں کہیں ہندو نظر آیا اس نے اُسے گولی مار دی۔ دو بار ایسے ہُوا کہ اسے

انٹیلی جنس کی اطلاع پر مکتی باہنی پر کہیں چھاپہ مارنا تھا اور حکم تھا کہ مکتی باہنی کے جو آدمی ہتھیار ڈال دیں انہیں زندہ لانا ہے۔ ایسے قیدیوں کو انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا جاتا ہے لیکن طاہر نے مکتی باہنی کے جتنے آدمیوں سے ہتھیار ڈلوائے انہیں اپنے سامنے کھڑا کر کے سب کو سٹین گن سے مار ڈالا...

"بس آپ یہ سمجھ لیں کہ طاہر پر بڑی خوفناک دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ دشمن کو دیکھ کر یہ پاگل سا ہو جاتا تھا۔ اس کا سی۔ او اس پر بہت خوش ہے لیکن جس طرح طاہر مُنہ زور اور بے لگام ہُوا یہ فوج کی جنگی کارروائیوں کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس نے کچھ ایسے مظاہرے بھی کیے جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کا ذہنی توازن خطرناک حد تک بگڑ گیا ہے۔ سی۔ او نے اسے اپنے ساتھ کچھ دن رکھا لیکن اس نے کہا کہ میں دفتر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ جب تک دشمن میری زمین پر موجود ہے میں ایکشن میں رہوں گا۔ سی۔ او نے جب دیکھا کہ یہ بالکل بے قابو اور منہ زور ہو گیا ہے، اسے ڈھاکہ سی۔ ایم۔ ایچ میں بھیج دیا۔ ڈھاکہ آکر یہ تشدّد پر اُتر آیا۔ میڈیکل بورڈ نے اسے اچھی طرح دیکھا بھالا۔ اس کی جذباتی کیفیّت اس قدر بگڑ گئی تھی کہ اسے ذہنی سکون دینے والی بڑی زیادہ طاقت کی دوائی کا انجکشن دے دیا گیا۔ اس انجکشن نے اسے تیرہ چودہ گھنٹے سُلائے رکھا۔ ایئرپورٹ سے یہاں تک ایمبولینس میں اسے اسی بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا تھا۔"

ارشد اور رجب علی کی زبانیں جیسے گُنگ ہو گئی تھیں۔ اتنی تیز دوائیاں دینے کا مطلب وہ یہی سمجھے کہ لڑکا پاگل ہو گیا ہے۔ طاہر کی حالت وہ دیکھ چکے تھے۔

"آپ کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئے ہیں" ــــ ڈاکٹر عظمت علی نے کہا ــــ "میرے پاس ایسٹ پاکستان سے کچھ اور کیس بھی آتے ہیں۔ وہاں کے حالات ایسے ہیں جنہیں برداشت کرنے کے لیے بڑے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہے۔ لیفٹیننٹ طاہر VIOLENT DEPRESSION کا مریض ہو گیا ہے۔ اس کیفیّت میں مریض تشدّد پر اُتر آتا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب!" ــــ ارشد نے کہا اور چپ ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"مسٹر ارشد!" ــــ میجر عظمت علی نے کہا ــــ "اتنا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے بچے کا دماغ بالکل صحیح ہے۔ یہ ذہنی عارضہ ہے۔ اسے دماغی مرض نہ سمجھیں۔ اسے کچھ عرصہ انہی دوائیوں پر رکھیں گے۔ اس میں جو شدید قسم کا انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا ہے وہ دب جائے گا.... ویسے ہی مجھے خیال آیا ہے۔ آپ کے خاندان میں یعنی آپ کے والد صاحب یا والدہ پر کبھی ڈیپریشن کا حملہ ہُوا ہے؟"

ارشد نے چونک کر ڈاکٹر عظمت کی طرف دیکھا۔ صاف پتہ چلتا تھا جیسے اُسے شدید دھچکا لگا ہو۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب!" ــــ ارشد نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اپنی مرضی کے خلاف بول رہا ہو ــــ "اس کی ماں کچھ اسی قسم کی ڈیپریشن میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ہم اسے جذباتی معاملہ سمجھے تھے لیکن اب محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنے آپ میں یہ ذہنی مرض اٹھائے پھرتی تھی اور یہ مرض ذرا سی انگیخت پر اُبھر آیا" ــــ ارشد نے یہ تو نہ بتایا کہ وہ جذباتی معاملہ کیا تھا، اُس نے یہ بتا دیا کہ اُس کی ڈیپریشن کی علامات کیا تھیں ــــ "اُسے تشنج سا ہو جاتا تھا جو ہسٹیریا اور مرگی سے مِلتا جلتا تھا۔ اس بچّے

کی پیدائش کے ساتھ ہی وہ لیبر روم میں فوت ہوگئی تھی.... ڈاکٹر صاحب! کیا ورثے میں ملا ہُوا مرض، ٹھیک ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے" ــــ میجر عظمت نے کہا ــــ "اچھا ہُوا آپ نے یہ فیملی ہسٹری مجھے بتا دی ہے" ــــ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد بولا ــــ "میں اس کا ذہن نارمل حالت میں لے آؤں گا تو پھر آپ کو دو چار باتیں بتاؤں گا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ جسمانی مرض نہیں۔ کہنے سے مطلب یہ ہے کہ دماغ میں کوئی خرابی نہیں۔ یہ سب سوچوں کا، بے قابو جذبات کا اور جذبے کے جنون کا معاملہ ہے.... مجھے یہ بتایئے کہ عام طور پر اس کا سلوک اور برتاؤ کیسا ہوتا تھا اور اس کے سوچنے کا انداز کیا تھا؟"

"پاکستان اور پاکستان کے دُشمنوں کے معاملے میں اس کے جذبات ایسے ہی تھے جیسے اس کے اندر بارُود بھرا ہُوا ہو" ــــ ارشد نے کہا ــــ "میں نے اور میری دوسری بیوی نے...."

"دوسری بیوی نے؟" ــــ میجر عظمت نے حیران ہو کر پوچھا اور کہنے لگا ــــ "آپ مجھے اس مرض کا ایک اور باعث بتا رہے ہیں.... سوتیلی ماں.... آپ خود اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ سوتیلی ماں ہمارے معاشرے کا ایک ایسا عنصر ہے جس نے بے شمار لڑکوں اور لڑکیوں کو پاگل پن کی حد تک ذہنی مریض بنایا ہے"۔

"لیکن یہاں معاملہ اُلٹ ہے ڈاکٹر صاحب!" ــــ ارشد نے کہا ــــ "میں آپ کو اتنی لمبی کہانی نہیں سناؤں گا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ میری دوسری بیوی وہ روائتی سوتیلی ماں نہیں جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔ طاہر میری اسی بیوی کو اپنی ماں سمجھتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنی ماں کی قبر پر جاتا ہے اور کچھ جذباتی سا بھی ہو جاتا ہے"۔

"میجر عظمت! میں آپ کو بتاتا ہوں" ــــ ملک رجب علی بول پڑا ــــ "ارشد اور اس کی بیگم نے بچّے کو ہوش سنبھالتے ہی پاکستان کی کہانیاں سنانی شروع کر دی تھیں۔ یہ خود امرتسر کے علاقے سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ ان کے گھروں کو آگ لگی، گھر لُٹے اور جب یہ پاکستان کی طرف پا پیادہ آ رہے تھے تو سکھوں نے تین چار بار ان پر حملہ کیا۔ انہوں نے مقابلہ کیا۔ چند ایک سکھوں کو قتل کیا۔ ان کی بیگم کی نانی شہید ہو گئیں۔ پھر انہوں نے سیلابی دریا تیر کر عبور کیا۔ یوں سمجھئے کہ یہ خون کا دریا پار کر کے آئے۔ انہوں نے لاشوں سے ٹھوکریں کھائیں اور یہ لاشوں پر گرتے پڑتے پاکستان میں داخل ہُوتے۔ پاکستان میں آ کر ارشد کی شادی ہوئی اور طاہر پیدا ہُوا۔ انہوں نے بچے کا شعور بیدار ہوتے ہی اسے بتانا شروع کر دیا کہ ہم نے پاکستان کس طرح حاصل کیا تھا۔ ان کی پہلی بیگم جو فوت ہو گئی تھیں کچھ مختلف تھیں لیکن دوسری بیگم صحیح معنوں میں پاکستانی تھیں۔ انہوں نے بھی بچے کے کان میں یہی کچھ ڈالا کہ یہ ہمارا ملک ہے اور وہ ہمارے ملک کا دشمن ہے"۔

"میں سمجھ گیا ہُوں" ــــ میجر عظمت نے کہا ــــ "انہوں نے لڑکے پر قومی جذبے کا جنون طاری کر دیا ہو گا۔ نفسیات کی روشنی میں دیکھیں تو یہ رجحان اچھا نہیں ہوتا"۔

"میں آپ کی بات سمجھتے ہوتے بھی نہیں سمجھنا چاہتا ڈاکٹر صاحب!" ــــ ارشد نے تڑپ کر کہا ــــ "میں نفسیات کی ایسی روشنی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں جس میں قومی جذبہ ایک جنون کی شکل میں نظر

آئے۔ ہو سکتا ہے آپ نے تحریکِ پاکستان میں مجھ سے زیادہ قربانیاں دی ہوں یا میری نسبت بہت ہی زیادہ کام کیا ہو۔ میں کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ پاکستان میں نے بنایا تھا، میرے اس بچے کی ماں نے بنایا تھا اور یہ پاکستان میری دوسری بیوی نے بنایا تھا۔ کیا آپ بھول گئے ہیں کہ یہ پاکستان ہمیں کس طرح ملا تھا؟ کیا آپ ہندوؤں اور سکھوں کو بھول گئے ہیں؟ میں اس نظریئے کو رَد نہیں کر سکتا کہ ہم اپنے بچّوں کو قومی جذبے کے لحاظ سے جنونی بنا دیں۔ میں نے اور میری دوسری بیوی نے اپنا جذبہ اپنے اس بچے اور دوسرے بچوں کے خون میں شامل کر دیا ہے۔ میں اُس باپ کو سچا پاکستانی نہیں کہوں گا جو اپنے وصیّت نامے میں یہ لکھے کہ میرے اس مکان کے وارث میرے بیٹے ہیں۔ ہر باپ کی وصیّت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے ایک مکان نہیں ایک ملک چھوڑ چلا ہے.... اگر میرا بیٹا اس لیے پاگل ہو گیا ہے کہ اُس میں قومی وقار کا احساس ضرورت سے زیادہ ہو گیا تھا تو میں خوش ہوں گا کہ میرا بیٹا ملک اور قوم کی خاطر پاگل ہو گیا ہے"۔

"میں نے اپنی بات ابھی پوری نہیں کی تھی ارشد صاحب!" ــــ ڈاکٹر عظمت نے کہا ــــ "میرا مطلب اعتدال سے تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے بچّے میں اپنے وطن کی محبّت اور دشمن کی نفرت اس طرح بھر دی ہے جیسے گرنیڈ میں بارُود بھرا جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ آپ نے اسے اپنے ساتھ چپکائے رکھا ہے۔ اس کے خیالوں اور سوچوں کا دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا.... مجھے دیانتداری سے بتایئے کہ میں ٹھیک کہ رہا ہُوں یا غلط"۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب!" ــــ ارشد نے ذرا دبی سی آواز میں جواب دیا ــــ "بچّے کی ماں فوت ہو گئی تھی۔ میں نے زیادہ سے زیادہ وقت بچّے کو اپنے ساتھ رکھا۔ جب دوسری شادی کی تو میری اس بیوی نے میری ہی طرح اسے اپنے ساتھ چپکا لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری یہ بیوی میری پہلی بیوی سے بڑی محبّت کرتی تھی"۔

"میں آپ پر یہ واضح کر رہا تھا کہ بچّے میں جذبہ پیدا کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں" ــــ میجر عظمت نے کہا ــــ "اس طرح جذبے عقل پر غالب آ جایا کرتے ہیں۔ میں آپ کا ہم خیال ہوں ارشد صاحب! ہمیں اپنے وطن کی محبّت اور دشمن کی نفرت اپنے بچّوں کے خون میں شامل کر دینی چاہیئے۔ ہمارے بچوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم نے آزادی کی اور اس وطن کی کیا قیمت دی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی بچوں کی عقل و دانش کی نشوونما بھی لازمی ہے۔ بچّوں کو اپنے ساتھ چپکا کر آپ ان کی شخصیّت کے اِٹھان کو کمزور کر دیتے ہیں۔ بچے کی عقل خام رہ جاتی ہے۔ وہ ایسا بارُود بن جاتا ہے جسے ذرا سی بھی حرارت مِلے تو وہ دھماکے سے پھٹ جاتا ہے.... کیوں کیپٹن شامی! لیفٹیننٹ طاہر ایسا ہی تھا نا؟"

"بالکل ایسا ہی" ــــ کیپٹن شامی نے کہا ــــ "اس کے ساتھ جو کیپٹن ڈھاکہ تک آیا تھا، اُس نے مجھے یہی بتایا تھا۔ اس کے جذبے میں قہر اور غضب بھرا رہتا تھا۔ اگر طاہر سپاہی ہوتا تو ہر کوئی اس کی تعریف کرتا، لیکن طاہر لیفٹیننٹ ہے۔ یہ ایک پلاٹون کی کمانڈ کر رہا تھا۔ اس کے منہ زور اور جذباتی ہو جانے سے پُوری پلاٹون منہ زور ہو جاتی تھی۔ طاہر عقل سے نہیں جذبات سے مغلوب ہو کر جنگی کارروائیاں کرتا تھا"۔

"بہرحال ارشد صاحب!" ــــ میجر عظمت علی نے کہا ــــ "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کے بچّے

کو ٹھیک کر لوں گا۔"

ارشد پریشان تھا۔ الفاظ اُسے تسلّی نہیں دے سکتے تھے۔ وہ اٹھا، رجب علی بھی اٹھا۔ وہ لوگ میجر عظمت علی سے ہاتھ ملا کر باہر آ ئے تو کیپٹن شامی بھی باہر آ گیا۔

"ارشد صاحب!" ــــ اُس نے کہا ــــ "میرے پاس طاہر کا اٹیچی کیس ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے چلے جانے سے پہلے آپ یہاں نہ آئے تو اٹیچی کیس لاہور آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔ آپ طاہر کے کمرے میں چلیں، میں اٹیچی کیس وہیں لے آؤں گا۔"

◆◆

طاہر پرویز گہری نیند سو گیا تھا۔ ارشد اور ملک رجب علی کمرے میں داخل ہوئے تو طاہرہ، اُس کے بچوں اور شازی نے اُن کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ طاہرہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ارشد اور رجب علی نے اُسے تسلّی دی۔ اتنے میں کیپٹن شامی اٹیچی کیس اٹھائے ہوئے آ گیا جو وہ ارشد کے حوالے کر کے چلا گیا۔ طاہرہ نے اٹیچی کیس کھولنا چاہا لیکن ارشد نے اُسے روک دیا۔ اُسے خیال آ گیا تھا کہ ہو سکتا ہے اس میں طاہر کے ذاتی خطوط ہوں یا کوئی اور ایسی چیز ہو جو وہ کسی اور کو نہ دکھانا چاہتا ہو۔ طاہرہ اٹیچی کیس اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی لیکن ارشد نے اُسے روک دیا اور کہا کہ یہاں محفوظ رہے گا۔

ارشد اور طاہرہ سوئے ہوئے طاہر کے چہرے پر نظریں جمائے چپ چاپ کھڑے رہے۔ سلمیٰ نے رجب علی کی طرف دیکھا۔ رجب علی یہ خاموش اشارہ سمجھ گیا۔ اُس نے ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"چلو ارشد!" ــــ رجب علی نے آہستہ سے کہا ــــ "بچہ بڑی گہری نیند سویا ہُوا ہے.... طاہرہ! تم بھی چلو۔ شام کو پھر آ جائیں گے۔"

ارشد اور طاہرہ کمرے سے نکل تو آئے لیکن اُن کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ جانا نہیں چاہتے۔ رجب علی اور سلمیٰ انہیں تسلّی اور حوصلہ دیتے ہوئے ہسپتال سے باہر لے آئے۔ رجب علی نے کہا کہ وہ سلمیٰ اور شازی کو اسلام آباد لے جا رہا ہے جہاں اُس کا ایک دوست رہتا ہے۔ وہ اُسی کے گھر ٹھہریں گے۔

"تم دونوں اگر وہاں ٹھہرنا چاہو تو ٹھہر سکتے ہو" ــــ رجب علی نے ارشد اور طاہرہ سے کہا۔

"نہیں" ــــ ارشد نے کہا ــــ "ہمارے بڑے پرانے ملنے والے ہیں ہم اُن کے ہاں ٹھہریں گے۔"

رجب علی سلمیٰ اور شازی کے ساتھ اسلام آباد چلا گیا اور ارشد اور طاہرہ اپنے بچوں کو لے کر نجمہ اور اطہر کے گھر چلے گئے۔

نجمہ اور اُس کا خاوند اطہر بوڑھے ہو چکے تھے۔ نجمہ کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو گئے تھے۔ نجمہ نے ارشد اور طاہرہ کو دیکھا تو جذبات کی شدّت سے اُن پر جھپٹ پڑی۔ اُس نے اُن دونوں کو اکٹھے ہی اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیا اور بڑی بے تابی سے اُن کے مُنہ چومنے لگی۔ پھر اُس نے اُن کے بچوں سے پیار کیا۔ اُسے ابھی معلوم نہیں تھا کہ یہ دونوں راولپنڈی کیوں آئے ہیں۔ نجمہ

خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔

"کیا بات ہے؟" ــــ وہ جب ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھے تو نجمہ نے ارشد اور طاہرہ سے پوچھا ــــ "خیر تو ہے؟ بُجھے بُجھے سے کیوں ہو؟"

نجمہ اور ارشد منہ بولے بہن بھائی تھے۔ ارشد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نجمہ اچھل کر اٹھی اور ایک ہی جست میں ارشد کے ساتھ لمبے صوفے پر جا بیٹھی۔ بازو اُس کی گردن میں ڈال دیئے۔

"کیوں ارشد!" ــــ نجمہ نے سگی بہنوں کے سے جذباتی انداز میں پوچھا ــــ "آنسو کیوں؟"

"طاہر ہسپتال میں ہے" ــــ ارشد نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اُس نے ہچکی لی ہو۔

"وہ مشرقی پاکستان میں تھا نا؟" ــــ نجمہ نے پوچھا ــــ "زخمی ہو کر آیا ہے؟"

"نہیں آپا!" ــــ طاہرہ بولی ــــ "اُسے کوئی ذہنی تکلیف ہو گئی ہے۔"

"ذہنی؟" ــــ نجمہ نے حیران ہو کر پوچھا ــــ "کوئی خاص وجہ؟"

ارشد اور طاہرہ کو طاہر پرویز کے متعلق جو کچھ معلوم ہُوا تھا اور اُنہوں نے اُسے جس حالت میں دیکھا تھا وہ نجمہ کو سنا ڈالا۔ اتنی دیر میں نجمہ کا خاوند اطہر بھی آ گیا۔ وہ بھی طاہرہ، ارشد اور اُن کے بچوں سے بڑے ہی پیار سے ملا۔ طاہر پرویز کے متعلق ہی باتیں ہوتی رہیں۔ ان باتوں میں افسردگی تھی، دُکھ تھا، غم تھا۔

"آپ غالباً یہ فرض کر کے باتیں کر رہے ہیں کہ طاہر ٹھیک نہیں ہو سکے گا" ــــ اطہر نے کہا ــــ "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ بچے پر جذبات کا غلبہ ہو گیا ہے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ وہ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مجھے ایک اور غم کھائے جا رہا ہے" ــــ ارشد نے کہا ــــ "آپا کو طاہر کی ماں یاد ہو گی.. عفّت.... آپا نے اُس کے متعلق آپ کو بتایا ہو گا۔ وہ ذہنی مریضہ تھی۔ طاہر کو یہ مرض ورثے میں ملا ہے۔ سُنا ہے کہ ورثے میں ملا ہُوا مرض لاعلاج ہوتا ہے۔"

"نجمہ نے مجھے عفّت کے متعلق سب کچھ بتایا تھا" ــــ اطہر نے کہا ــــ "عفّت نے محرومیوں اور غربت میں پرورش پائی تھی۔ آپ نے اور طاہرہ بہن نے اُسے ایسا ماحول دے دیا جو بچپن کے اُن اثرات سے جو عفّت کے ذہنِ لاشعور میں موجود تھے، ہم آہنگ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اگر اُسے اُسی کی ذہنی سطح کا خاوند اور جس گھر میں وہ پل کر جوان ہوئی تھی، ویسا ہی گھر مل جاتا تو وہ ذہنی مریضہ نہ ہوتی۔ طاہر غربت اور محرومیوں میں نہیں پلا۔ اس میں اپنی ماں والی ذہنی پسماندگی نہیں ہو سکتی۔"

اُس وقت تو ارشد کی اپنی ذہنی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ بات عفّت کی چل پڑی تو پیچھے ہٹتے ہٹتے بات بہت دور پیچھے وہاں تک چلی گئی جب ارشد فورتھ ایئر کا طالب علم اور طاہرہ اور عفّت دسویں جماعت کی طالبات تھیں اور نجمہ ان دونوں لڑکیوں کی اُستانی تھی۔ چاروں تحریکِ پاکستان کے محاذ پر اکٹھے ہوتے تھے۔ آج ان میں عفّت نہیں تھی۔ اُنہوں نے عفّت کو یاد کیا پھر وہ اُن لمحوں کو یاد کرنے لگے جب وہ جنگِ آزادی لڑ رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر نوجوان ہو گئے تھے۔ انہیں ہجرت بھی یاد آئی۔ پاکستان میں داخل ہونے کا لمحہ بھی یاد آیا۔

"کہاں ہے وہ پاکستان جس کی بنیادیں لہو میں نہائی ہوئی لاشوں سے اُٹھی تھیں؟" ــــ ارشد نے کہا ــــ "آج چوبیس برس بعد پاکستان پاکستانیوں کے لہو میں ڈوب رہا ہے۔ بھائی بھائی کو کاٹ رہا ہے۔"

بار بار دو سوال سامنے آتے تھے — "پاکستان کا کیا بنے گا؟.... کیا طاہری ٹھیک ہو جائے گا؟"

◆◆

ارشد، طاہرہ، اطہر اور نجمہ شام کو ہسپتال گئے۔ طاہر پرویز پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان سب کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسّم آ گیا۔ نجمہ اور طاہرہ نے اُسے گلے لگا کر اس کا منہ چوما اور اُس سے پوچھا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔

"معلوم نہیں امّی جان!" — طاہر پرویز نے غنودگی کی کیفیّت میں کہا — "نیند بہت آتی ہے معلوم نہیں یہ لوگ مجھے نیند کی دوائیاں کیوں دے رہے ہیں؟"

"یہ ڈاکٹر ہیں طاہری!" — طاہرہ نے اُسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا — "یہ تمہارے فائدے کے لیے دوائیاں دے رہے ہیں"

"مجھے یہاں کون لے آیا ہے؟" — طاہر پرویز نے ایسے لہجے میں پوچھا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔

"تمہیں معلوم ہے تم کہاں ہو؟" — ارشد نے پوچھا۔

"ہاں ابّا جان!" — طاہر پرویز نے کہا — "یہ ملٹری ہاسپٹل راولپنڈی ہے معلوم نہیں یہاں کیوں لے آتے ہیں؟"

"یہ تو تم ہی جانتے ہو گے کہ کیا ہوا تھا" — نجمہ نے ہنسی اور پیار سے کہا — "کیا ہوا تھا وہاں؟"

طاہر کے ماتھے پر شکن آ گئے۔ وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ذہن اُس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر بے چینی اور بیقراری کے تاثرات آ گئے۔

"نہ سوچو طاہری!" — ارشد نے کہا — "نہ سوچو۔ ذہن پر بوجھ نہ ڈالو"

طاہر پرویز ذہن پر بوجھ ڈالنے کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اِس ذہن سے اب اُسے کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ ڈاکٹر اُسے ذہن کو سکون دینے والی بڑی تیز دوائیاں دے رہا تھا۔ ان کا اثر ایسے ہی تھا جیسے ڈاکٹر نے طاہر کی یادوں کو اُس کے ذہن میں قید کر دیا ہو۔

"طاہری بیٹا!" — طاہرہ نے کہا — "تمہارا ایک اٹیچی کیس تمہارے ساتھ آیا ہے۔ وہ پڑا ہے۔ کھول کر دیکھ لو۔ چاہو تو ہم اپنے ساتھ لے جاتے ہیں"

"آپ کھول کر دیکھ لیں" — طاہر پرویز نے کہا۔

طاہرہ اٹھی اور اٹیچی کیس کھولنے لگی۔

"رہنے دیں امّی!" — طاہر پرویز نے ایسے کہا جیسے اچانک بیدار ہو گیا ہو — "چابی مجھے دے دیں۔ اٹیچی یہیں رہنے دیں"

طاہرہ پیچھے ہٹ آئی۔ ارشد کا بجھا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ سمجھ بیٹھا تھا کہ طاہر ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے اور حقیقی دنیا سے اس کا تعلق ٹوٹ گیا ہے۔ اگر اُس کے دماغ میں نقص پیدا ہو گیا ہوتا تو وہ طاہر کو اٹیچی کیس کھولنے سے نہ روکتا۔

"نہیں کھولیں گے بیٹا!" — ارشد نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا — "میں نے تمہاری امّی کو پہلے ہی منع کر دیا تھا"

میجر عظمت شام کی راؤنڈ پر آ گیا۔

"کیوں بچے!" — میجر عظمت نے بڑے شگفتہ اور دوستانہ لہجے میں طاہر پرویز سے پوچھا — "تم تو ماشاالله ٹھیک ٹھاک نظر آتے ہو"

"ٹھیک ہوں سر!" — طاہر پرویز نے کہا اور اُس کے ہونٹوں پر لطیف سا تبسّم آ گیا۔ کہنے لگا — "نیند بہت آتی ہے"

"آنے دو" — میجر عظمت نے کہا — "میں تمہیں خود سُلا رہا ہوں۔ یہ نیند تمہارا حق ہے"

میجر عظمت سائیکاٹرسٹ تھا۔ مسکّن دوائیاں دینے کے علاوہ وہ باتوں سے بھی طاہر کا علاج کر رہا تھا۔ اُس نے طاہر کے ساتھ اپنے انداز کی دو چار باتیں کیں جن میں دوستی کا رنگ تھا۔ وہ کمرے سے نکلا تو ارشد اور طاہرہ بھی اُس کے پیچھے نکل گئے۔ میجر عظمت ان کے لیے رُک گیا۔

"جلدی ٹھیک ہو جائے گا" — میجر عظمت نے کہا — "آپ نے صبح کے مقابلے میں اب خاصا فرق دیکھا ہو گا"

"صبح تو اس نے ہمیں پہچانا ہی نہیں تھا" — طاہرہ نے کہا — "اب ہوش کی باتیں کرتا ہے"

"تین چار دنوں میں اس کا ذہن دوائیوں کو قبول کر لے گا" — میجر عظمت نے کہا — "پھر یہ پوری طرح ہوش میں آ جائے گا۔ اس میں جو غصہ، تلخی اور انتقام کا جذبہ خطرناک حد تک شدّت سے پیدا ہو گیا تھا، وہ دبا رہے گا۔ پھر یہ آہستہ آہستہ نارمل حالت میں آ جائے گا" — اُس نے طاہرہ سے پوچھا — "آپ طاہر کی ...."

"سوتیلی ماں ہوں" — طاہرہ نے میجر عظمت کی بات پوری کرتے ہوئے کہا — "لیکن طاہری مجھے اپنی سگی ماں سمجھتا ہے۔ اس کے باوجود اس میں یہ خلش ضرور ہو گی کہ اس کی سگی ماں زندہ نہیں"

"اسے اور زیادہ شفقت کی ضرورت ہے" — ڈاکٹر عظمت نے کہا — "اور ایک احتیاط کی بھی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ اسے ایسٹ پاکستان کی باتیں یاد دلا کر بیدار کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ آپ مجھے بتا چکے ہیں کہ پاکستان کے معاملے میں آپ نے اسے ضرورت سے زیادہ جذباتی بنا دیا تھا۔ لڑکے کی موجودہ ذہنی کیفیت میں اس کے جذبات کو ذرا سا بھی نہ بھڑکانا" — میجر عظمت نے ارشد اور طاہرہ کے چہروں پر باری باری نظریں جمائیں اور مسکرا کر بولا — "میں جانتا ہوں آپ کیا محسوس کر رہے ہیں میری یہ بات آپ کو بہت بُری لگی ہو گی کہ لڑکے کے قومی جذبات کو نہ بھڑکایا جاتے .... مسٹر ارشد! میں بھی پاکستانی ہوں۔ پاکستان کے متعلق میرے جذبات آپ کے جذبات جیسے ہیں لیکن میں ڈاکٹر بھی ہوں.... نفسیات کا ڈاکٹر.... میری بات سمجھنے کی کوشش کریں اور اس پر عمل کریں۔ مجھے امید ہے کہ طاہر چھ مہینوں تک ٹھیک ہو جائے گا"

"چھ مہینے؟" — طاہرہ نے حیرت اور گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا — "کیا یہ چھ مہینے ہسپتال میں پڑا رہے گا؟"

"نہیں مسز ارشد!" — میجر عظمت نے کہا — "میں ایک مہینے بعد اسے آٹھ دس دنوں کے لیے گھر بھیج دیا کروں گا۔ یہ اس کی صحت یابی کی رفتار پر منحصر ہے کہ میں اسے کتنے وقفے بعد کتنی چھٹی دیا کروں گا۔"

اتنا تو میں آپ کو آج ہی بتا سکتا ہوں کہ ایک مہینے بعد میں اسے ہفتہ دس دن کی چھٹی دے دوں گا۔"

ارشد اور طاہرہ کو ڈاکٹر کی باتوں سے خاصا اطمینان ہوا۔ دونوں طاہر کے کمرے میں آگئے۔

"ڈاکٹر نے کیا بتایا ہے ابّا جان"؟ ——— طاہر نے غنودگی سے بوجھل آواز میں پوچھا۔

طاہر کے اِس سوال نے ارشد اور طاہرہ کو اور زیادہ مطمئن کر دیا۔

"ڈاکٹر نے تسلّی دی ہے"——— ارشد نے کہا۔

"نہیں ابّا جان!"——— طاہر نے مخمور سی آواز میں کہا ——"میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ مجھے ہسپتال سے کب چھوڑیں گے؟"

"چھوڑ دیں گے بیٹا!"——— ارشد نے کہا ——"جلدی چھوڑ دیں گے۔"

"تم آرام سے پڑے رہو نا طاہری!"——— طاہرہ نے بڑے پیار سے کہا ——"کیا جلدی ہے تمہیں؟"

"مجھے جانا ہے امّی جان!"——— طاہر نے ذرا جاندار آواز میں کہا ——"مجھے جلدی جانا ہے۔"

"کہاں جاؤ گے بیٹا!"——— طاہرہ نے کہا ——"ابھی تو ہم تمہیں اپنے گھر لے جائیں گے۔"

"آپ کو معلوم نہیں امّی!"——— طاہر نے کہا ——"حالات بہت خراب ہیں۔ حالات نے اجازت دی تو میں گھر آؤں گا۔"

"کہاں کے حالات کی بات کر رہے ہو بیٹا؟"——— نجمہ نے پوچھا۔

"مشرقی پاکستان کے حالات کی بات کر رہا ہوں خالہ!"——— طاہر نے جواب دیا۔ اُس کے انداز میں جوش و خروش نہیں تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اُس نے عادت سے مجبور ہو کر یہ بات کہہ دی ہو۔

"مشرقی پاکستان کے حالات بہتر ہو گئے ہیں طاہری!"——— ارشد نے طاہر کے جذبات کو اشتعال سے بچانے کے لیے کہا۔

❖

ارشد نے تو اپنے بیٹے کے جذبات کو بھڑک اٹھنے سے بچانے کے لیے کہہ دیا تھا کہ مشرقی پاکستان کے حالات بہتر ہو رہے ہیں لیکن پاکستان کے سرکاری ذرائع ابلاغ پوری قوم کو بتا رہے تھے کہ مشرقی پاکستان میں سب اچھا ہے۔ قوم کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی صحیح صورتِ حال معلوم کرنی ہے تو راولپنڈی کے ملٹری ہاسپیٹل کے اُن وارڈوں میں چلے جاؤ جہاں مشرقی پاکستان کے ملٹری ایکشن کے زخمی زیرِ علاج ہیں اور زخمی افسروں کے کمروں میں چلے جاؤ۔

مشرقی پاکستان میں بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کا قتلِ عام کیا پھر بنگالیوں کی باری آئی۔ وہ ملٹری ایکشن کی بھینٹ چڑھنے لگے۔ ملٹری ایکشن نے اتنا سا کام ضرور کیا تھا کہ علیحدگی پسند بنگالی دبک گئے اور ان کے لیڈر سرحد پار بھاگ گئے، لیکن پاکستان کا دشمن پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گیا۔ اُس نے مغربی بنگال کے لاکھوں بھوکے ننگے بنگالیوں کو اکٹھا کر لیا اور انہیں ہانک کر ریفیوجی کیمپوں میں بٹھا دیا۔ ہمارا دشمن اِدھر مشرقی پاکستان کے اِردگرد فوج کا بے پناہ اجتماع کرتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سفارتی میدان میں بھی سرگرم ہو گیا۔ اُس نے اقوامِ عالم کو چلّا چلّا کر بتایا کہ پاکستان بنگالیوں کا قتلِ عام کر رہا ہے اور لاکھوں

بنگالی بھارت میں پناہ لینے کو پہنچ گئے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے گورنر نے بار بار اسلام آباد کو پیغام بھیجے کہ اب وقت ہے، صدرِ مملکت آئے اور مشرقی پاکستان کے لیڈروں کے ساتھ بات چیت کرے۔ علیحدگی پسند لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن گرفتار ہو چکا تھا۔ حالات کا رُخ موڑا جا سکتا تھا لیکن صدرِ مملکت کے گرد جن جرنیلوں کا حصار تھا، وہ مشرقی پاکستان کے گورنر کی بات صدرِ مملکت سے کراتے ہی نہیں تھے۔ ہر بار یہی ایک جواب ملتا تھا ——"پریذیڈنٹ مصروف ہیں۔"

ہمارے پریذیڈنٹ صاحب کسی پُراسرار مصروفیت میں ڈوبے رہے اور دشمن اپنا محاذ مضبوط کرنے میں مصروف رہا۔

اُندلس کی تاریخ کے ورق پھڑپھڑاتے اور سقوطِ غرناطہ کا باب سامنے آگیا۔ صدرِ مملکت اتنے مصروف تھے کہ اس باب پر نظر نہ ڈال سکے۔ اُن کے درباریوں کی آنکھوں پر ذاتی مفادات کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ صدیوں پرانی تاریخ کیا پڑھتے، وہ تو نوشتۂ دیوار بھی نہ پڑھ سکے۔

تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی تھی، غرناطہ اور ڈھاکہ کی کڑیاں ملا رہی تھی۔

مشرقی پاکستان جل رہا تھا اور پاک فوج کنوآں کھود رہی تھی۔

وقت بڑی تیزی سے گذر رہا تھا۔

برسات کا موسم گذر گیا۔ اب مشرقی پاکستان کی زمین جنگ کے قابل ہونے لگی۔ بھارت نے اپنی فوجیں اور قریب کر لیں۔ اُس کے لڑاکا بمبار طیاروں کے سکواڈرن مشرقی پاکستان کے قریب کے ہوائی اڈوں پر پہنچ گئے۔ اُس کی نیوی کے جنگی بحری جہاز خلیج بنگال میں آگئے۔ اُس کا طیارہ بردار بحری جہاز "وِکرانت" بھی قریب آگیا تھا ——— بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

اِس بے پناہ جنگی قوت کے مقابلے میں پاکستان نے مشرقی پاکستان میں جو فوج بھیجی تھی، وہ پہلے دو ڈویژن پھر تین ڈویژن ہو گئی تھی۔ دشمن کی برّی، بحری اور فضائی فوج کے اجتماع اور عزائم کو دیکھتے ہوتے بھی صدرِ مملکت نے وہاں فوج میں اضافے کا حکم جاری نہ کیا کیونکہ ——"پریذیڈنٹ مصروف تھے" ——— اور پریذیڈنٹ کے حاشیہ بردار انہیں "مصروف" رکھنے میں مصروف تھے۔ مشرقی پاکستان میں ٹینک رجمنٹ کا ایک سکواڈرن بھی نہ بھیجا گیا۔ ڈویژنوں کے حساب سے توپخانہ رجمنٹیں نہ بھیجی گئیں۔ ڈھاکہ میں فضائی بیڑے کا صرف ایک سکواڈرن تھا جس کے پاس قدیم سیبر طیارے تھے۔

مشرقی پاکستان ایک طشتری پر رکھ کر بھارت کو پیش کرنے کے لیے تیار تھا۔

❖

پاک فوج مشرقی پاکستان کے جنگلوں، پہاڑوں، دلدلوں اور اونچی نیچی زمین پر بکھر گئی تھی۔ فوج کو شہروں میں مارشل لاء کے فرائض بھی سرانجام دینے تھے۔ اس طرح مکتی باہنی یعنی انڈین آرمی کے گوریلوں کے خلاف کارروائیاں کرنے کے لیے فوج کی نفری بہت ہی تھوڑی رہ گئی تھی۔ پاک فوج کے لیے یہ بڑا ہی سخت امتحان تھا، بڑی ہی کڑی آزمائش تھی۔ اپنے فرائض پورے کرنے کے لیے افسروں اور جوانوں کو ایسی دشواریوں کا سامنا تھا جو انسان کی برداشت سے باہر تھیں۔ پانی اور کیچڑ میں چل چل کر کئی جوانوں کے پاؤں خراب ہو گئے تھے۔ طبّی سہولتیں میسّر نہیں تھیں۔ پاؤں سُوج جانے کی وجہ سے جوان لُوٹ نہیں

پہن سکتے تھے۔

ایسی ایک نہیں کئی ایک دشواریاں تھیں جنگی سازوسامان کی کمی تھی۔ دشمن کے مقابلے میں پاک فوج کی حالت ایسی ہی تھی جیسے سپاہی بے تیغ میدان میں اُتر آیا ہو۔

سرحدوں پر بعض مقام ایسے تھے جو بھارت کے علاقے کے درمیان آتے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی دشمن کی توپوں کے گولے ایسے کسی نہ کسی مقام پر گرتے تھے۔ ایسی گولہ باری کا مقصد عموماً یہی ایک ہوتا تھا کہ بھارت کی کوئی کمانڈو پارٹی مشرقی پاکستان میں داخل ہو رہی ہوتی یا واپس جا رہی ہوتی تھی۔ ایسے تمام مقامات پر پاک فوج کی پوسٹیں تھیں۔ گولہ باری ان پوسٹوں پر ہوتی تھی۔ اِن پوسٹوں کی مجبوری یہ تھی کہ اِن کے پاس جوابی گولہ باری کے لیے توپیں نہیں تھیں۔

لفٹیننٹ طاہر پرویز کی بٹالین اب وہاں نہیں تھی جہاں سے طاہر پرویز کو ڈھاکہ اور وہاں سے راولپنڈی بھیجا گیا تھا۔ اس بٹالین کو اب بہت دُور ایک سرحدی علاقے میں بھیج دیا گیا تھا۔ میجر اصغر کی کمپنی کو ایسا علاقہ دیا گیا تھا جس میں درختوں اور اونچی گھاس سے ڈھکی ہوئی ٹیکریاں تھیں۔ ٹیکریوں کے درمیان کہیں کہیں دلدل تھی۔ بانس کے درختوں کی بہتات تھی۔ اونچی ٹیکریوں پر بٹالین کی پوسٹیں تھیں۔

اِس علاقے پر بھارت کے توپخانے کے گولے وقتاً فوقتاً گرتے رہتے تھے۔ یہ گولے فیلڈ گنوں کے ہوتے تھے۔ جس روز یہ بٹالین یہاں آئی اُس رات بھی اس علاقے پر گولہ باری ہوتی۔ گولہ باری زیادہ شدید نہیں ہوتی تھی۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے تین چار توپیں گولہ باری کرتی ہیں۔ اگلی رات بھی بٹالین کے علاقے میں پچیس تیس گولے گرے۔

❖

بٹالین کمانڈر نے کمپنی کمانڈروں کی کانفرنس بلائی۔

"کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی تھی جو بتانے کے لیے میں نے آپ سب کو بلایا ہو" —— بٹالین کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل ارشاد نے اپنے کمپنی کمانڈروں سے کہا — "یہاں کے حالات آپ کے سامنے ہیں اور جس قسم کی یہ جنگ ہے وہ آپ لڑ رہے ہیں۔ میں یہ اعتراف کروں گا کہ مجھے تو سمجھ ہی نہیں آتی کہ میں آپ کو کس قسم کی بریفنگ دوں۔ آپ میں سے ہر ایک کے سامنے جیسی زمین ہوتی ہے اور جیسا دشمن ہوتا ہے اور جیسی صورت حال ہوتی ہے، ویسی آپ کارروائی کرتے ہیں۔ آپ میں سے کوئی کسی صورتِ حال پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتا ہے تو میں نے اُس سے کبھی جواب طلبی نہیں کی۔ ہم بڑے ہی مشکل حالات میں لڑ رہے ہیں۔ ملک کی سیاست نے اور ہندو کی اسلام دشمن ذہنیت نے ہمیں بڑی ہی صبر آزما بلکہ جان لیوا آزمائش میں ڈال دیا ہے....

"آج ایک مسئلہ میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ یہ ایک نیا مسئلہ ہے.... آپ نے دیکھا ہے کہ دشمن نے سرحد پار سے ہمارا استقبال اکیس توپوں کی سلامی سے کیا ہے۔ چالیس پچاس گولے کل رات ہم پر فائر ہوئے ہیں اور تیس چالیس گولے گذشتہ رات ہمارے علاقے میں گرے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا ہوگا کہ ہمیں توپخانے کی سپورٹ کیوں نہیں دی جاتی۔ آپ جانتے ہیں کہ ایسٹرن کمانڈ کے پاس اتنی توپیں ہیں ہی نہیں۔ دشمن کی ان توپوں کو خاموش کرنا ہمارا فرض ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے بریگیڈ ہیڈکوارٹر کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو وہاں سے مجھے یہ جواب ملے گا کہ سرحد پار کی توپوں کے خلاف ہم کوئی کارروائی نہیں کر سکتے لیکن میرے عزیز دوستو! میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ دشمن شغل کے طور پر ہم پر گولے فائر کرتا رہے اور ہم فاکس ہول بنا کر ڈری ہوئی لومڑیوں کی طرح ان کے اندر سر دے کر چھپے رہیں۔ میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس اس مسئلے کا کیا حل ہے۔"

"سر!" —— ایک کمپنی کمانڈر نے کہا — "میں نے گذشتہ رات دشمن کی شیلنگ سے اُس کی توپوں کے فاصلے کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ ہم اگر مارٹر گنوں سے جواب دیں تو کیا یہ کارگر ہو سکتا ہے۔"

"نہیں" —— کرنل ارشاد نے کہا — "یہ میں نے بھی سوچا تھا لیکن دشمن کی گنیں ہماری مارٹر گنوں کے رینج سے باہر ہیں۔"

"سر!" —— میجر اصغر نے کہا —— "میں کمانڈو آپریشن کے سوا کوئی اور حل پیش نہیں کر سکتا۔"

"کیا ہماری کمانڈو پلاٹون سرحد پار جائے گی؟" —— کرنل ارشاد نے پوچھا۔

"سر!" —— میجر اصغر نے جواب دیا — "اگر سرحد پار سے گولے آ سکتے ہیں تو ہمارا سرحد پار جانا دشمن کے لیے قابلِ اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔"

"کوئی جوان دشمن کے علاقے میں زخمی یا شہید ہو گیا تو میں بریگیڈ ہیڈکوارٹر کو کیا جواب دُوں گا؟" —— کرنل ارشاد نے پوچھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں سر!" —— میجر اصغر نے کہا — "ہمیں ملک کے وقار کو دیکھنا ہے، بریگیڈ ہیڈکوارٹر کی جواب طلبی کو نہیں۔ سرحدیں ہماری ذمہ داری پر ہیں۔"

کرنل ارشاد نے سر جھکا لیا۔ فوج میں دو ٹوک لہجے میں اور ناپے تُلے الفاظ میں ہدایات دی جاتی ہیں۔ مخصوص الفاظ اور اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ یوں پتہ چلتا ہے جیسے یہ انسان نہیں مشینیں ہیں لیکن لفٹیننٹ کرنل ارشاد نے جب سر جھکایا تو صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس پر جذبات کا غلبہ ہو گیا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کے کمپنی کمانڈر ہی نہیں اُس کے جوان بھی جذبے کی جنگ لڑ رہے تھے۔ انہیں کسی کے حکم کا بھی خیال نہ تھا۔

"سر!" —— ایک اور کمپنی کمانڈر بولا —— "ہم اپنی ذمہ داری پر دشمن کے علاقے میں جائیں گے۔ اگر ہم میں سے کوئی زخمی یا شہید ہو گیا تو آپ سرکاری طور پر یہ رپورٹ اوپر بھیج دیں کہ فلاں فلاں آدمی لاپتہ ہیں۔"

"مجھے سوچنے دیں" —— کرنل ارشاد نے بوجھل سی آواز میں کہا —— "میں آپ سے متفق ہوں کہ دشمن کی ان توپوں کو تباہ کرنے کا واحد طریقہ کمانڈو آپریشن ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہم دشمن کی چار پانچ توپیں تباہ کر بھی دیں گے تو کیا ہو جائے گا۔ وہ ایک درجن توپیں اور لے آئے گا۔"

"سر! میں معافی چاہتا ہوں" —— میجر اصغر نے کہا — "مجھے آپ کے اس خیال سے اتفاق ہے لیکن دشمن کو یہ تاثر تو مل جائے گا کہ ہم میں جوابی حملے کی اتنی زیادہ ہمت ہے کہ ہم اُس کے گھر جا کر اُس کی توپیں تباہ کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے جوانوں کے مورال میں جان آ جائے گی۔"

"ہاں میجر اصغر!" ـــ کرنل ارشاد نے یوں کہا جیسے اُس نے آہ بھری ہو۔ ذرا توقف سے بولا ـــ "ہمیں موال کے زور پر ہی لڑنا ہے...... یہ کیسی جنگ ہے!" ـــ اُس نے جھنجلا کر ایک بار پھر کہا ـــ "یہ کیسی جنگ ہے! فائر کرتے ہیں تو ڈرتے ہیں کہ اپنے ہی پاکستانی نہ مارے جائیں فائر کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں"۔

"سر!" ـــ ایک اور کمپنی کمانڈر نے کہا ـــ "اگر آپ اجازت دیں تو میں بارہ جوانوں کی پارٹی لے کر جاؤں گا"۔

"نہیں سر!" ـــ میجر اصغر نے کہا ـــ "اگر کمانڈو آپریشن کرنا ہی ہے تو یہ میں کروں گا۔ مجھے ۱۹۶۵ء کے آپریشن جبرالٹر، کا تجربہ ہے"۔

کچھ دیر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر کار یہ دلیرانہ فیصلہ کیا گیا کہ دشمن کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ ہم زندہ و بیدار کھڑے ہیں، کمانڈو آپریشن سے دشمن کی توپیں تباہ کی جائیں اور اس آپریشن کا کمانڈر میجر اصغر ہوگا۔

❖

اُسی رات کا واقعہ ہے، میجر اصغر اپنی ذمہ داری کے علاقے میں گشت کے لیے نکلا۔ اُسے گشتی سنتریوں کو اور اپنی کمپنی کی پوسٹوں کو دیکھنا تھا۔ اُس کے ساتھ کمپنی صوبیدار تھا، کمپنی حوالدار میجر، وائرلیس آپریٹر اور اردلی بھی اُس کی پارٹی میں شامل تھے۔ علاقہ دشوار تھا۔ درختوں کی بہتات کے علاوہ گھاس، سرکنڈے اور جھاڑیاں اونچی تھیں۔ چلنے کا راستہ نہیں دیتی تھیں۔

چاند پوری طرح روشن تھا، میجر اصغر کی پارٹی دو ٹیکریوں کے درمیان جا رہی تھی جگہ کشادہ تھی۔ میجر اصغر کو سرسراہٹ اور آہٹیں سنائی دیں جو دُور کی نہیں، بالکل قریب کی تھیں۔ یہ جانوروں کی نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ ہر وقت فوج کی نقل و حرکت اور گولہ باری کی وجہ سے جنگلی جانور وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اس کے علاوہ یہ آوازیں جانوروں کی لگتی ہی نہیں تھیں۔

میجر اصغر نے اپنی پارٹی کو روک لیا۔ سب بیٹھ گئے اور سب نے کان کھڑے کر لیے۔ ایک تو ہوا کی آواز تھی۔ ہوا کا تیز جھونکا درختوں اور سرکنڈوں میں سے گذرتا تھا تو سیٹیاں بجنے کی آوازیں پیدا ہوتی تھیں۔ فوجی اس آواز کو پہچانتے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد کسی عورت یا بچے کی آواز آئی۔ آواز دبی دبی سی تھی۔ اس کے جواب میں ایسی ہی ایک اور آواز سنائی دی۔ اس سے آواز کی سمت اور فاصلے کا بھی اندازہ ہو گیا۔

میجر اصغر نے اپنی پارٹی کو سرگوشیوں اور اشاروں میں سمجھا کر اس طرح پھیلا دیا کہ جہاں سے آوازیں آئی تھیں اُس جگہ کو گھیرے میں لے لیا جائے۔ پارٹی آگے بڑھی۔ کوشش کے باوجود یہ سب گھاس اور سرکنڈوں میں چلنے کی سرسراہٹ کو دبا نہ سکے۔ سامنے والی ٹیکری کے دامن سے اب صاف آوازیں آنے لگیں۔ یہ عورتوں کی آوازیں تھیں۔ میجر اصغر کو گھاس، سرکنڈوں اور جھاڑیوں کے اوپر سے تین ننگے سر اور چہرے نظر آئے۔ فاصلہ بیس قدم ہوگا۔ چاندنی صاف تھی۔ وہ چہرے عورتوں کے تھے۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ کوئی اُن کی طرف آ رہا ہے۔ وہ ادھر اُدھر بھاگنے لگیں لیکن وہ گھیرے میں آ چکی تھیں۔

میجر اصغر نے انہیں للکار کر رُکے رہنے کو کہا۔ اُسے توقع تھی کہ ان عورتوں کے ساتھ کوئی آدمی بھی ہوں گے جو یقیناً مشکوک ہوں گے۔ انہیں للکار کر میجر اصغر نے اپنی پارٹی کو آگے بڑھنے اور جو کوئی بھی تھا، اُسے پکڑنے کا حکم دیا۔

جب میجر اصغر ایک پہلو سے اور اُس کی پارٹی کے آدمی دوسرے پہلو سے تیزی سے آگے بڑھے تو عورتوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ بنگالی زبان میں ایک دوسری سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ گھبراہٹ نمایاں تھی۔

❖

وہ پانچ جوان لڑکیاں تھیں۔ اُن کا لباس دیہاتی تھا۔ بنگال کے رواج کے مطابق اُن کے بال کُھلے ہُوتے تھے۔ وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں تھیں۔ فوجیوں کو دیکھ کر انہوں نے شور تو نہ مچایا لیکن بھاگ نکلنے کی کوشش کی۔ وہ سب رو رہی تھیں۔ میجر اصغر اور کمپنی صوبیدار نے انہیں تسلی دلاسہ دیا لیکن ان پر خوف طاری تھا۔ تین نے بیک وقت ہاتھ جوڑ کر اپنی زبان میں منت سماجت کی دوسری دونوں بیٹھ گئیں۔

"ہم پاکستانی ہیں" ـــ میجر اصغر نے انہیں اُردو میں کہا ـــ "ہم مسلمان ہیں۔ تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟..... مت ڈرو۔ سچ بولو۔ ہم تمہارے جسموں کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے"۔

دو لڑکیوں نے بیک وقت بولنا شروع کر دیا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو بول رہی تھیں۔ انہیں خاموش کرا کے ایک کو بولنے کے لیے کہا گیا۔

"تم پاکستانی ہو اور ہم بھی پاکستانی ہیں" ـــ ایک لڑکی اُردو زبان میں جس میں بنگالی کے الفاظ بھی تھے اور لہجہ ٹھیٹھ بنگالی تھا، کہنے لگی ـــ "معلوم نہیں ہم کون سا گناہ کر بیٹھی ہیں کہ ہمیں جانور بنا دیا گیا ہے۔ دو مہینوں سے ایسے ہو رہا ہے کہ کبھی تین چار اور کبھی دس بارہ آدمی ہمارے گاؤں میں آتے ہیں۔ اُن کے پاس ایسے ہی ہتھیار ہوتے ہیں جیسے تمہارے پاس ہیں۔ وہ گاؤں کے کسی گھر میں داخل ہو کر مہمان بن جاتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ اُن کے لیے بہت اچھا کھانا تیار کیا جائے۔ وہ اگر رات کو گاؤں میں ٹھہریں تو گاؤں میں جو جوان لڑکیاں ہیں، ان میں سے اچھی اچھی لڑکیاں چن کر رات کو اپنے پاس رکھتے ہیں۔ پہلی بار ہمارے آدمیوں نے انہیں لڑکیاں دینے سے انکار کر دیا۔ اُن لوگوں نے ہمارے دو آدمیوں کو سب کے سامنے کھڑا کر کے گولی مار دی۔ پھر انہوں نے زبردستی تین لڑکیوں کو اپنے پاس رکھا اور اگلے روز آسام کی طرف چلے گئے"۔

وہ تین لڑکیاں ان پانچ میں تھیں۔ وہ رو رہی تھیں۔

"کبھی اُدھر (آسام کی طرف) سے ایسے آدمی آتے ہیں اور وہ بھی ایک رات ہمارے گاؤں میں ٹھہرتے ہیں" ـــ لڑکی نے کہا ـــ "وہ ہمیں اسی طرح پریشان اور ذلیل کرتے ہیں۔ وہ ہمارے آدمیوں کو ڈراتے ہیں کہ فوج کو اُن کے متعلق کسی نے بتایا تو وہ گاؤں کو آگ لگا کر سب کو زندہ جلا دیں گے"۔

لڑکیوں کو معلوم تھا کہ وہ آسام (بھارت) سے آتے ہیں اور مشرقی پاکستان میں تخریب کاری اور تباہ کاری کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہر بار مختلف آدمی ہوتے ہیں۔

"ہمیں وہ پاکستان کی فوج کے ظلم اور قتل و غارت کی بڑی خوفناک اور گندی باتیں سناتے ہیں" ـــ دوسری لڑکی نے کہا ـــ "یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستان کی فوج بنگالی لڑکیوں کو زبردستی ساتھ لے جاتی اور انہیں بارکوں میں اپنے پاس رکھتی ہے..... کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ گاؤں میں پہلے ہی خبر پہنچ جاتی ہے کہ وہ آ رہے ہیں۔ یہ خبر ملتے ہی گاؤں کی تمام جوان لڑکیاں گاؤں سے دُور جا کر چھُپ جاتی ہیں۔ وہ جب چلے جاتے ہیں تو لڑکیاں اپنے گھروں کو چلی جاتی ہیں۔ ہم پانچوں تین تین بار پوری پوری رات یہاں چھپی رہی ہیں"۔

"کیا وہ آج رات آتے ہوتے ہیں؟" ــــ میجر اصغر نے پوچھا۔

"آج وہ نہیں آتے" ــــ لڑکی نے جواب دیا ــ "آج پاکستان کی فوج کے آدمی آتے ہوتے ہیں۔ ہمیں گاؤں کے دو آدمیوں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ پاکستان کی فوج کے آدمی آ رہے ہیں۔ ہمیں شام سے پہلے گاؤں سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ رات ہمارے گاؤں میں گزاریں گے۔"

"پاکستان کی فوج کے آدمی ایسا کبھی نہیں کر سکتے" ــــ میجر اصغر نے کہا۔

"میں نے انہیں گاؤں میں آتے دیکھا تھا" ــــ ایک اور لڑکی نے کہا ــ "میں گاؤں سے ذرا دیر سے نکلی اور قریب ہی چھپ گئی تھی۔ وہ چھ آدمی تھے۔ انہوں نے تمہاری طرح خاکی وردی پہنی ہوئی تھی۔"

"یہ وہی چکر ہے سر!" ــــ کمپنی صوبیدار نے میجر اصغر سے کہا ــ "انڈیا کے گوریلے خاکی وردی پہن کر یہاں کے کسی گاؤں میں پاکستان کے مسلمان فوجی بن کر رہتے ہیں اور ان بے چارے دیہاتیوں کو پریشان کرتے ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری آرمی ان پر ظلم کر رہی ہے۔"

"مت ڈرو" ــــ میجر اصغر نے لڑکیوں سے کہا ــ "ہم اُن آدمیوں کو پکڑیں گے اور تمہیں دکھائیں گے کہ وہ پاکستان کے فوجی نہیں" ــــ اس نے صوبیدار اور حوالدار میجر سے کہا ــ "نمبر دو پلاٹون کی دو سیکشنیں فوراً لے آئیں۔"

◆◆

اس علاقے میں گاؤں بہت دُور دُور تھے۔ یہ گاؤں سرحد کے قریب تھا۔ اس علاقے کے فوجی نقشے پر بھی یہ گاؤں دیا ہوا تھا۔ میجر اصغر سترہ اٹھارہ جوانوں کو جو تھوڑی سی دیر میں اُس کے پاس پہنچ گئے تھے، ساتھ لے کر اس گاؤں کی طرف چل پڑا۔ لڑکیاں اُس کے ساتھ جانے سے ڈرتی تھیں۔ اسے وہ دھوکہ سمجھ رہی تھیں۔ انہیں بڑی مشکل سے ساتھ لیا گیا۔ گاؤں وہاں سے تقریباً دو میل دُور تھا۔

راستہ صاف ہوتا تو وہ فوراً پہنچ جاتے۔ راستہ تو کوئی تھا ہی نہیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ گھاس، سرکنڈوں، جھاڑیوں اور درختوں کی جھکی شاخوں کے سمندر میں تیرتے جا رہے ہوں۔ جب گاؤں تقریباً دو فرلانگ دُور رہ گیا تو میجر اصغر نے اپنے جوانوں کو روک لیا۔ کمپنی صوبیدار اور حوالدار میجر اُس کے ساتھ تھے۔ اُس نے دونوں سیکشن کمانڈروں کو بلایا اور انہیں گاؤں کو محاصرے میں لینے اور آگے بڑھنے، پھر گاؤں پر چارج کرنے کے متعلق ہدایات دیں۔ چاندنی بہت فائدہ دے رہی تھی۔ چاندنی کے علاوہ درخت اور گھنی جھاڑیاں بھی اس ایکشن کے لیے سُودمند تھیں۔ میجر اصغر نے نہایت اہم حکم یہ دیا کہ خاموشی برقرار رکھنی ہے۔ کھانسی اور چھینک کو بھی روکنا ہے۔

رات کا سوا ایک بج رہا تھا۔ لڑکیوں نے میجر اصغر کا کام یہ کہہ کر آسان کر دیا کہ وہ اُسے اُس مکان تک لے جائیں گی جہاں یہ لوگ آکر ٹھہرتے ہیں۔ سیکشنیں گاؤں کے اِردگرد پھیلتی جا رہی تھیں۔ یہ اینٹوں یا پتھروں کے مکانوں کا گاؤں نہیں تھا۔ اس گاؤں کے تمام مکان مضبوط بانسوں کے پلیٹ فارم پر بانسوں کے ہی بنے ہوئے تھے اور ان کی چھتیں بانسوں اور سرکنڈوں کی تھیں۔ مکان ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے۔ مکانوں کی تعداد بمشکل بیس تھی۔

میجر اصغر نے سیکشنوں کو اپنی اپنی جگہ پہنچ جانے کا جو وقت دیا تھا وہ وقت جب پورا ہو گیا تو میجر

اصغر آگے چل پڑا۔ کمپنی صوبیدار کو اُس نے گاؤں کے دوسری طرف بھیج دیا تھا۔ اس طرح محاصرے کی کمانڈ صوبیدار کے پاس تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے گاؤں خالی ہو۔ پانچوں لڑکیاں میجر اصغر کو اُس جھونپڑہ نما مکان کے قریب لے گئیں جہاں انڈیا کے کمانڈو ایک دو راتوں کے لیے رُکا کرتے تھے۔ میجر اصغر نے اپنے اردلی کے کان میں کہا کہ وہ دوسری طرف جا کر صوبیدار سے کہے کہ تمام نفری مکانوں کے قریب آجائے۔ میجر اصغر کے ساتھ وائرلیس آپریٹر اور اردلی کے علاوہ تین جوان تھے جن کے پاس سٹین گنیں تھیں اور ہر جوان کے پاس دو دو گرنیڈ بھی تھے۔

یہ مکان زمین سے اونچا تھا۔ اس کے پلیٹ فارم کے ساتھ چار بڑے موٹے بانسوں والی سیڑھی تھی۔ میجر اصغر اوپر چلا گیا۔ اُس نے اپنے جوانوں کو دروازے کے دائیں اور بائیں اس پوزیشن میں کھڑا کیا کہ اُن کی سٹین گنیں فائر کے لیے تیار تھیں۔ میجر اصغر نے دروازے پر لات ماری اور اس کے ساتھ ہی کہا کہ جو لوگ اندر ہیں وہ باہر آجائیں۔

اندر سے کھُسر پھُسر کی آوازیں آنے لگیں۔ میجر اصغر نے ایک بار پھر للکار کر کہا کہ جس حالت میں ہو باہر آجاؤ۔ اتنے میں دونوں سیکشنوں کی تمام نفری گاؤں کے اندر آگئی اور ہدایت کے مطابق ہر ایک مکان کے دروازے پر ایک ایک دو دو جوان کھڑے ہو گئے۔

بانسوں کا دروازہ آہستہ سے کھُلا۔ یہ ایک ہی کواڑ کا دروازہ تھا۔ کواڑ ذرا سا کھُلا اور ایک ٹامی گن (سب مشین گن) کی نالی باہر آئی۔ اصغر کواڑ کے پیچھے ہو کر اس نالی کو دیکھتا رہا۔ جب گن اتنی باہر آگئی کہ وہ ہاتھ بھی نظر آنے لگا جس نے اس گن کو پکڑ رکھا تھا تو میجر اصغر نے بائیں ہاتھ سے جھپٹا مار کر گن کو باہر کی طرف کھینچا۔ گن والا ذرا سا باہر آیا تو اصغر نے ریوالور کی نالی اُس کے سینے پر رکھ دی۔

"ایک سیکنڈ مہلت نہیں دوں گا" ــــ میجر اصغر نے کہا ــ "گن چھوڑ دو۔"

گن والا گن کو میجر اصغر کے ہاتھ میں چھوڑ کر باہر آگیا۔ مکان کے اندر جانا خودکشی کے برابر تھا۔ اندر جو کوئی بھی تھے انہیں معلوم تھا کہ وہ پکڑے گئے ہیں اور اُن کی زندگی ختم ہو گئی ہے۔ وہ زندگی کی آخری دو چار گولیاں چلا کر میجر اصغر اور اُس کے جوانوں کو ختم کر سکتے تھے۔

"اندر جتنے آدمی ہو سب ہتھیار اندر چھوڑ کر باہر آجاؤ" ــــ میجر اصغر نے بلند آواز میں کہا ــ "صرف ایک منٹ کی مہلت ہے۔ یہ منٹ گزر گیا تو میں اندر گرنیڈ پھینک دوں گا" ــــ میجر اصغر نے اور زیادہ بلند آواز میں کہا ــ "تین جوان اپنا اپنا گرنیڈ پرائم کر لو۔"

تھوڑے تھوڑے وقفے بعد سات آدمی باہر آئے۔ اُس وقت تک کمپنی صوبیدار پہنچ چکا تھا۔ اُس نے بڑی تیزی سے دس بارہ جوان اکٹھے کر لیے اور سب نے اپنی اپنی سٹین گنوں اور رائفلوں کی نالیاں ان آدمیوں کی طرف کر لیں۔ یہ ساتوں خاکی وردی میں ملبوس تھے۔ ان کے ہاتھ اوپر کرا کے انہیں نیچے لے آئے۔ میجر اصغر نے اپنے صوبیدار سے کہا کہ تمام گھر خالی کرا لو۔ کوئی بچہ بھی کسی جھونپڑے میں نہ رہے۔

◆◆

میجر اصغر ان ساتوں آدمیوں کو مکان سے کچھ دور لے گیا اور انہیں ایک لائن میں کھڑا کر دیا۔

"تم پاکستان آرمی کی کون سی یونٹ کے ہو؟" ــــ میجر اصغر نے اُن سے پوچھا۔

وہ سب چپ رہے۔

"تمہارے زندہ رہنے کی صورت بھی ہے"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔"وہ یہ ہے کہ میں جو پوچھوں وہ ٹھیک ٹھیک بتا دو اور میں تمہیں جنگی قیدی کی حیثیت سے پیچھے بھیج دوں گا۔ پھر تمہیں وہ تمام سہولتیں ملیں گی جو جنگی قیدیوں کو دی جاتی ہیں۔ اگر جھوٹ بولو گے تو میں سٹین گن کے ایک برسٹ سے تم سب کو ختم کر دوں گا اور لاشیں یہیں پرے پھینک دوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم پاکستان آرمی کے نہیں، انڈین آرمی کے ہو"۔

اُن میں سے ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا.... میجر اصغر نے اپنے جوانوں سے کہا کہ وہ اپنی رائفلوں اور سٹین گنوں کے سیفٹی کیچ آگے کر لیں۔

"کیا آپ ہم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہمیں زندہ رہنے دیں گے؟"۔۔۔ ان ساتوں میں سے ایک نے کہا۔

میجر اصغر نے فوجیوں کی ایک دو مخصوص گالیاں دے کر کہا۔۔۔"میں تمہیں سودا بازی کی مہلت نہیں دوں گا، نہ میں وقت ضائع کروں گا"۔

وہ پھر بھی خاموش رہے۔ میجر اصغر نے اُن میں سے ایک آدمی کو گریبان سے پکڑ کر ان میں سے باہر کھینچ لیا اور اُسے کہا کہ وہ گھٹنوں کے بل ہو جائے۔ وہ گھٹنوں کے بل ہو گیا۔ میجر اصغر نے اپنے ریوالور کی نالی اُس کے پیچھے ہو کر اُس کے سر کے ساتھ لگا دی۔

"بولو، تم کون ہو"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔"اور یہاں کیا کرنے آتے ہو یا کیا کرنے آتے ہو اور اپنے منہ سے کہو کہ میں پاکستان آرمی کا نہیں، انڈین آرمی کا جوان ہوں"۔

وہ آدمی نہ بولا۔

"بولو گے یا نہیں؟"۔۔۔ میجر اصغر نے پوچھا۔

وہ آدمی یوں چپ رہا جیسے گونگا اور بہرہ ہو۔

اصغر نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی اُس ہندوستانی کے سر میں سے گزر کر زمین میں جا لگی اور وہ آدمی وہیں ایک پہلو پر لڑھک گیا۔ میجر اصغر نے باقی چھ کی طرف دیکھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ایک اور آدمی کو گریبان سے پکڑا اور جب اُسے اپنی طرف گھسیٹا تو وہ آدمی بلبلا اُٹھا۔

"حضور!"۔۔۔ اُس آدمی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔"ہم بھی آپ کی طرح حکم کے بندے ہیں۔ حکم پر ادھر آئے تھے.... ہم انڈین آرمی کے آدمی ہیں ہمیں کمانڈو ٹریننگ دے کر اور پاکستان آرمی کی وردی پہنا کر ادھر بھیجا گیا ہے"۔

"شاباش"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔"ہم تمہیں مہمانوں کی طرح رکھیں گے۔ تم بہادر آدمی ہو"۔۔۔ میجر اصغر اس کے باقی ساتھیوں سے مخاطب ہُوا۔۔۔"تم میں سے کون اتنا بہادر ہے جو یہ کہے کہ اس جوان نے جھوٹ بولا ہے؟"

"سر!"۔۔۔ ان میں سے ایک لمبا تڑنگا آدمی بولا۔۔۔"یہ جوان نہیں، یہ حوالدار ہے"۔

"پارٹی کمانڈر کون ہے؟"۔۔۔ میجر اصغر نے پوچھا۔

"یہی ہے"۔۔۔ اُس کے ایک ساتھی نے جواب دیا۔

میجر اصغر نے اپنے صوبیدار سے کہا کہ ان سب کو کچھ دور لے جاؤ۔ اُس نے اپنے حوالدار میجر سے کہا کہ گاؤں کے تمام آدمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لو۔ گاؤں کے لوگ پہلے ہی ایک جگہ اکٹھے ہو چکے تھے۔ میجر اصغر اُن کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔

"کیا تم لوگ جانتے ہو یہ کون ہیں؟"۔۔۔ میجر اصغر نے اُن سے پوچھا۔

"یہ کہتے تھے کہ ہم پاکستانی ہیں"۔۔۔ ایک بوڑھے آدمی نے بنگالی لب و لہجے میں اُردو زبان میں کہا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت ڈرا ہُوا ہے۔

"یہ پاکستانی نہیں"۔۔۔ میجر اصغر نے کہا۔۔۔"یہ ہندوستانی ہیں اور یہ پاکستان کی فوج کو بدنام کرنے کے لیے پاکستان کی وردی پہن کر ادھر آئے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ پاکستانی ہیں.... ہم پاکستان کے فوجی ہیں ہم تمہیں پریشان کرنے کے لیے نہیں بلکہ تمہاری پریشانیاں رفع کرنے کے لیے آئے ہیں ہمیں ٹھیک ٹھیک بتا دو کہ اس گاؤں میں کون کون آدمی اس قسم کے ہندوستانیوں کو مدد اور پناہ دیتا ہے"۔

تمام ہجوم نے بیک وقت بولنا شروع کر دیا۔ خاصا وقت صرف کر کے اصغر نے ان لوگوں سے جو رپورٹ لی، وہ وہی تھی جو اِن کی لڑکیاں پہلے دے چکی تھیں۔ ان لوگوں نے تین آدمیوں کو گھسیٹ کر سامنے کیا اور بتایا کہ یہ ہندوستانیوں کے ساتھی ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ یہ جو فوجی اس گاؤں میں آکر رُکتے ہیں اور ہماری بیٹیوں کو خراب کرتے ہیں، پاکستان کے فوجی ہیں۔ تین چار بوڑھے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

"پاکستان کو کیا ہو گیا ہے حضور؟"۔۔۔ ایک بُوڑھے نے روتے ہُوئے کہا۔۔۔"ہم نے کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کر کے پاکستان بنایا تھا۔ اب سُنا ہے کہ یہاں کے بڑے بڑے شہروں میں مسلمان ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ ادھر ہماری یہ حالت ہے کہ یہ ڈاکو اور بدمعاش ادھر آجاتے ہیں اور ہمارے سامنے ہماری عزّت برباد کرتے ہیں"۔

مشرقی پاکستان کے یہ بوڑھے کوئی نئی خبر نہیں سنا رہے تھے۔ میجر اصغر پاکستان بنانے والے ان بوڑھوں سے زیادہ جانتا تھا۔ ان بوڑھوں کو اپنی بیٹیوں کی بے آبروئی کا دکھ تھا۔ انہیں غالباً یہ معلوم نہیں تھا کہ پُورے مشرقی پاکستان کی آبرو ریزی ہو رہی ہے۔ میجر اصغر نے گاؤں والوں کو بتایا کہ اب وہ ہر طرح محفوظ رہیں گے۔ میجر اصغر نے انہیں تسلّی دلاسے تو بہت دیئے جن سے وہ لوگ مطمئن اور مسرور ہو گئے لیکن اس خیال نے اصغر کو افسردہ کر دیا کہ اُس کی یہ تسلّیاں کب تک ان لوگوں کے کام آئیں گی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دشمن اپنی کمانڈو پارٹیاں کس دلیری سے پاکستان کے دور اندر تک بھیج رہا ہے مگر مغربی پاکستان سے نہ فوج آ رہی ہے نہ جنگی ساز و سامان۔ انہیں اب اسی سے اپنے فرائض پورے کرنے تھے جو کچھ اُن کے پاس تھا۔

میجر اصغر نے صوبیدار سے کہا کہ جس مکان سے ان سات آدمیوں کو نکالا تھا، اُس مکان سے ان کے ہتھیار وغیرہ اٹھا لائے۔ صوبیدار چلا گیا تو میجر اصغر نے حوالدار میجر سے کہا کہ تمام جوانوں کو اکٹھا کر لو اور قیدیوں کو اپنے درمیان رکھ کر ساتھ لے چلو۔ قیدیوں میں چھ آدمی تو وہ تھے جو پاک فوج کی وردی پہنے ہُوئے تھے اور تین آدمی اس گاؤں کے رہنے والے تھے۔

میجر اصغر انہیں اپنے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ اُس نے کرنل ارشاد کو رات کی کارروائی کی مکمل رپورٹ دی اور قیدی اُس کے حوالے کر دیئے۔

"انہیں ہم آج ہی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بھیج دیں گے" — کرنل ارشاد نے میجر اصغر سے کہا — "میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنے مطلب کی چند ایک باتیں ان سے پوچھ لیں۔ بہتر ہے تم بھی میرے ساتھ رہو۔ ناشتہ میرے ساتھ ہی کر لینا۔"

اُنہوں نے باری باری سب کو بلایا اور ہر ایک سے ایک ہی قسم کی باتیں پوچھیں۔ ان چھ میں دو بنگالی مسلمان تھے جو باقاعدہ انڈین آرمی میں لانس نائیک اور نائیک تھے۔ باقی ہندو تھے۔ اس گاؤں کے رہنے والے اُن تین آدمیوں کو بھی الگ الگ بلایا گیا جن کے متعلق گاؤں والوں نے کہا تھا کہ یہ بھارتی جاسوس اور تخریب کار ہیں۔

ان سے اُن باتوں کی تصدیق ہو گئی جو پہلے ہی سب کو معلوم تھیں۔ نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ اس علاقے پر جو گولہ باری ہو رہی ہے وہ اس لیے ہوتی تھی کہ آسام سے انڈیا کی کوئی نہ کوئی کمانڈو پارٹی آ رہی ہوتی یا جا رہی ہوتی تھی۔ پہلے اس سرحد پر رینجرز تھے جو دشمن کی گولہ باری سے دبک جاتے تھے۔ اب یہاں باقاعدہ فوج آ گئی تھی۔ ان چھ آدمیوں نے بتایا کہ عموماً تین یا چار فیلڈ گنیں گولہ باری کرتی ہیں اور وہ ایک ہی جگہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پوزیشن میں رکھی جاتی ہیں۔ ان قیدیوں نے وہ جگہ بھی بتا دی جو وہاں سے تقریباً اڑھائی میل دور تھی۔

اُسی شام ان قیدیوں کو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر بھیج دیا گیا۔ رات کھانے کے بعد کرنل ارشاد نے اپنے کمپنی کمانڈروں کو اپنے پاس بٹھا لیا اور انہیں بتایا کہ دشمن کی گن پوزیشنوں کا پتہ چل گیا ہے۔ یہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ دشمن کی ان توپوں کو کمانڈو ایکشن سے تباہ کیا جائے گا۔ کرنل ارشاد نے کمپنی کمانڈروں کے ساتھ کمانڈو آپریشن کی پلاننگ کے متعلق بات شروع کر دی۔

"سر! معافی چاہتا ہوں" — میجر اصغر نے کہا — "یہ فیصلہ بھی ہو چکا ہے کہ یہ کمانڈو آپریشن میرا ہو گا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنا پلان پیش کروں۔"

"ہاں ہاں" — کرنل ارشاد نے کہا — "تم ہی جاؤ گے۔ اگر تم نے کوئی پلان بنا رکھا ہے تو وہ سب کو سنا دو۔"

میجر اصغر نے انڈین آرمی کے ان چھ آدمیوں سے صرف گن پوزیشنیں ہی نہیں پوچھی تھیں بلکہ وہاں کی زمین اور وہاں تک پہنچنے کے راستے کے متعلق بھی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس کے علاوہ کمانڈو آپریشن میں جو بات بھی کام آ سکتی تھی، وہ اس نے معلوم کر لی تھی۔ اُس نے کرنل ارشاد اور اپنے ساتھی کمپنی کمانڈروں کو اپنا پلان سنا دیا۔ وہ تجربہ کار کمانڈو تھا۔ اُس کا پلان نہایت دلیرانہ تھا۔

پلان تیار ہو گیا۔ کرنل ارشاد نے کانفرنس برخاست کر دی۔ جب سب جانے لگے تو اُس نے میجر اصغر کو روک لیا۔

❖

"بیٹھو اصغر!" — کرنل ارشاد نے اُسے اپنے پاس بٹھا کر پوچھا — "تم اس مشن پر کب جاؤ گے؟"

"سر!" — میجر اصغر نے جواب دیا — "جس رات ہم پر گولہ باری ہو گی، میں فوراً روانہ ہو جاؤں گا۔ ہم نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ توپیں ہر وقت وہاں نہیں ہوتیں۔ تین چار دن آگے رکھی جاتی ہیں۔"

کرنل ارشاد کے چہرے پر کچھ اور ہی تاثر آ گیا۔ اُس نے میجر اصغر کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر اُس کی نظریں اصغر کے پاؤں سے چلیں تو اُس کے چہرے پر جا رکیں۔

"کیوں سر؟" — اصغر نے ہلکی سی مسکراہٹ سے پوچھا — "کس سوچ میں پڑ گئے ہیں آپ؟"

کرنل ارشاد کی آہ نکل گئی۔ اُس نے کہا — "تمہیں ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ یاد ہو گی۔ شاید تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ اُس جنگ میں ہماری رُوحوں پر ایک سرور سا طاری ہو جایا کرتا تھا۔ کتابیں لکھنے والے غالباً اسے جذبۂ حریت کا خمار لکھا کرتے ہیں۔ اُس جنگ میں ہماری تعداد اور ہماری جنگی طاقت دشمن کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑی تھی لیکن دلوں میں ایک ولولہ تھا کہ ہم دشمن کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے، اور دشمن کامیاب نہ ہو سکا۔ اب بھی ہم اُسی جذبے سے اپنا فرض پورا کر رہے ہیں لیکن اصغر! دل کچھ بجھا بجھا سا ہے.... میں اِس وقت تمہارے سی۔ او کی حیثیت سے بات نہیں کر رہا۔ سچ پوچھتے ہو تو میں تمہیں دشمن کے علاقے میں اُس کی گنیں تباہ کرنے کے لیے نہیں بھیجنا چاہتا۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہارا یہ مشن منسوخ کر دوں لیکن مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے میرے ضمیر نے مجھے شرمسار کیا ہے اور کہا ہے کہ تم اپنے حکمرانوں کی تلوار ہو۔ تلوار چلتی ہے، سوچتی نہیں۔"

"میں سمجھ گیا ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں سر!" — میجر اصغر نے کہا — "میں بھی یہی کچھ محسوس کر رہا ہوں لیکن ہمیں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دشمن کی چار گنیں تباہ کر کے اور اُس کے کچھ آدمیوں کو مار کر ہم ہاری ہُوئی بازی جیت نہیں سکتے۔ میں صاف کہتا ہوں سر! ہمارے حکمران اور ہمارے سیاسی لیڈر بازی ہار چکے ہیں.... سر! آپ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے ہیں۔"

"ہاں اصغر!" — کرنل ارشاد نے کہا — "میں نے ان جذبات کو باہر پھینک دینے کے لیے تمہیں روک لیا تھا.... جانتے ہو میں آج اتنا جذباتی کیوں ہو گیا ہوں؟.... مجھے طاہر پرویز یاد آ گیا تھا۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔ تم نے اُس کے والد کو خط لکھا ہو گا۔"

"ہاں سر!" — اصغر نے جواب دیا — "میں نے اچھی طرح واضح کر کے لکھ دیا ہے کہ طاہر پرویز کو کیوں واپس بھیجا گیا ہے۔"

"طاہر کے والدین اچھے لوگ ہیں" — کرنل ارشاد نے کہا — "اور وہ صحیح جذبہ رکھنے والے لوگ ہیں۔ اُدھر تمہارے اُبّو ملک رجب علی بھی مجھے بڑے اچھے لگے ہیں۔ اُنہوں نے پاکستان کے لیے جو قربانی دی ہے وہ تاریخ میں نہیں آئے گی لیکن میں اسے ساری عمر نہیں بھول سکوں گا۔ مجھے خدشہ سا محسوس ہوتا ہے کہ ملک صاحب اور طاہر کے والد صاحب اور اُس کی والدہ میرے خلاف بدظن نہ ہو جائیں۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے طاہر کو فوج کے لیے نااہل قرار دے دیا ہے۔ تم تو اچھی طرح جانتے ہو۔ میں اس لڑکے کو مروانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر میں اُسے اس ذہنی کیفیت میں فیلڈ میں رکھتا تو یہ لڑکا کچھ کیے بغیر مارا جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پوری پلاٹون کو مروا دیتا لیکن خُدا گواہ ہے کہ مجھے صرف اس لڑکے کا خیال تھا۔"

"میں نے انہیں پوری تفصیل سے لکھ دیا ہے" — میجر اصغر نے کہا — "میں نے واقعات لکھے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ طاہر کا دماغی توازن بُری طرح بگڑ گیا تھا۔ میں نے انہیں

یہ بھی لکھا ہے کہ طاہر کو اس حالت تک بزدلی نے نہیں بلکہ غیر معمولی بہادری اور ضرورت سے زیادہ جذبے نے پہنچایا ہے۔ آپ فکر نہ کریں سر! وہ لوگ سمجھدار ہیں۔"

"تمھیں گھر سے کوئی خط تو نہیں ملا؟"

"نہیں سر!"— اصغر نے جواب دیا — "انہوں نے لکھا ضرور ہوگا لیکن ڈاک کا جو انتظام ہے وہ آپ جانتے ہیں۔"

"معلوم نہیں طاہر کی اب کیا حالت ہے"— کرنل ارشاد نے کہا — "اُسے گئے ہوئے دو مہینے گزر گئے ہیں۔"

❖

طاہر پرویز کی ذہنی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ بہتر ان معنوں میں کہ وہ ہوش و حواس کی باتیں کرتا تھا اور یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اس نوجوان کا ذہن ابنارمل ہے۔ یہ اُن اونچی طاقت کی مسکّن دوائیوں کا اثر تھا جو اُسے ابھی تک دی جا رہی تھیں۔ ان دو مہینوں میں اُسے تین دنوں کی چھٹی دے کر گھر بھیجا گیا تھا اور اس سے اگلے مہینے ایک ہفتے کی چھٹی دی گئی تھی۔ دونوں مرتبہ وہ اپنے گھر لاہور چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ارشد اور طاہرہ نے اُس کے ساتھ مشرقی پاکستان اور اُس کی اس ذہنی حالت کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ خود طاہر نے کوئی بات نہ کی۔ اُس کے جذبوں کو مسکّن دوائیوں نے سُلا رکھا تھا۔ اُس کی حالت چرس اور افیم کے نشئی جیسی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُسے یہ نشہ ایک ڈاکٹر دے رہا تھا۔

گھر میں ہر کوئی اُس کے ساتھ پیار اور محبّت سے پیش آتا اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتا تھا۔ کوئی شگفتہ سی بات سُن کر اُس کا ردِّ عمل اتنا سا ہی ہوتا تھا کہ اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسّم آ جاتا۔ ارشد اور طاہرہ اُس کے سامنے ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے لیکن جب طاہر اُن کے سامنے نہیں ہوتا تھا تو اُن کے چہرے رنج و الم سے بُجھ جاتے تھے۔ ارشد تو صاف کہتا تھا کہ اُس کا بیٹا باقی عمر انہی دوائیوں کے سہارے جئے گا۔

طاہر کا دادا اور دادی فوت ہو چکے تھے۔ گھر میں ارشد اور طاہرہ کے علاوہ ارشد کا بڑا بھائی اور اُس کی بیوی زینت اپنے بچّوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن کے بچّے بھی جوان ہو گئے تھے۔ اُن کی ایک بیٹی عصمت سیکنڈ ائیر میں پڑھتی تھی۔ عصمت کے باپ نے تقریباً طے کر رکھا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ طاہر کو دے گا۔ عصمت کی ماں کا بھی یہی ارادہ تھا لیکن مشرقی پاکستان میں جب شازی اصغر کے ساتھ تھی تو طاہر نے شازی سے کہا تھا کہ اُس نے عصمت کو اپنی بیوی کے روپ میں کبھی بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات بھی تھی کہ اُس وقت طاہر کے ذہن پر صبیحہ غالب آئی ہوئی تھی۔

اب طاہر ذہنی مریض بن کر گھر آیا تو عصمت اُس کے کچھ زیادہ ہی قریب ہو گئی۔ پہلے تین دن عصمت کا رویّہ یہ رہا کہ وہ کالج سے آتی تو کھانا کھانے سے پہلے طاہر کے کمرے میں جاتی اور کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھی رہتی۔ جب طاہر سات دنوں کے لیے آیا تو بھی عصمت کا رویّہ یہی رہا۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ طاہر عصمت کو دیکھ کر خوشی سی محسوس کرتا تھا۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ طاہر کوٹھی کے کمروں میں عصمت

کو تلاش کر رہا ہے۔

"دیکھو عصمت!"— طاہر کے جانے کے بعد عصمت کو ماں نے اپنے پاس بٹھا کر کہا — "طاہر کو دماغ سے اتارنے کی کوشش کرو۔"

"کیوں امّی؟"— عصمت نے حیران ہو کر پوچھا اور کہا — "آپ نے تو مجھ سے پوچھے بغیر میرا رشتہ طاہر کے ساتھ پکّا کر رکھا ہے۔"

"اُس کے ساتھ تمھیں بیاہ تو نہیں دیا"— زینت نے اُسے ڈانٹ کر کہا — "پاگلوں کو کون اپنی بیٹیاں دیتا ہے؟ اس کی ماں بھی پاگل ہو کر مری تھی۔ اُس نے تو سارے خاندان کو پاگل کر دیا تھا.... میں اب تمھیں اس لڑکے کے پاس بیٹھا نہ دیکھوں۔"

عصمت نے یوں چونک کر اپنی ماں کو دیکھا جیسے ماں نے اُسے کہا ہو کہ یہ ہے زہر کا پیالہ، لو پی لو۔ عصمت کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ اٹھی اور یوں کمرے سے نکلی جیسے اُس کی ٹانگیں اُس کے جسم کا بوجھ اُٹھانے سے معذور ہو گئی ہوں۔ وہ اپنے کمرے میں گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اُس نے اپنی ایک کتاب کھولی جس میں سے طاہر کی تصویر نکلی۔ اُس کی نظریں تصویر پر جم گئیں۔

"تم پاگل نہیں ہو طاہر!"— عصمت کو اپنی آواز سنائی دی — "میں تمھیں ہوش میں لاؤں گی یا میں بھی تمھارے ساتھ پاگل ہو جاؤں گی۔"

اُس نے کتاب بند کر کے طاہر کی تصویر کو چھپا لیا اور پلنگ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

❖

طاہر پرویز کی چھٹی کے سات دن پورے ہو گئے۔ اُسے اگلے روز شام کی ریل کار سے راولپنڈی جانا تھا۔ وہ دو تین دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ عصمت اُس کے پاس پہلے کی طرح بے ساختگی اور وارفتگی سے نہیں آتی۔ ان دو دنوں میں اگر وہ اُس کے کمرے میں آئی بھی تو اس انداز سے جیسے یہاں سے گزرتے ایک آدھ منٹ کے لیے رک گئی ہو۔ عصمت کی مُسکراہٹ میں بھی وہ رنگ نہیں رہا تھا جو دو روز پہلے تک تھا۔

طاہر عصمت کا یہ رویّہ محسوس کر رہا تھا لیکن اُس پر مسکّن دوائیوں کا ایسا اثر تھا جو اُس کے احساسات کو اندر ہی اندر مُردہ سا کر دیتا تھا۔ وہ عصمت سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نشے کی کیفیت اُسے کچھ بھی نہیں کہنے دیتی تھی۔ نشے اور بیداری کا یہ تصادم اُسے بے چین سا کر دیتا تھا لیکن فتح نشے کی ہوتی تھی۔

چھٹی کے آخری روز عصمت اُس کے کمرے میں آئی اور اتنا ہی کہہ کر چلی گئی کہ کل ساڑھے گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان میرے کالج کے سامنے آ جانا۔

طاہر پرویز حیران سا ہوا کہ عصمت نے یہ کیا انداز اختیار کر لیا ہے۔ طاہر کو کون بتاتا کہ عصمت کی ماں نے اُسے پاگل قرار دے دیا ہے اور اُس کی نفسیاتی بیماری کو اُس کی ماں کا ورثہ کہہ رہی ہے۔

"عصمت بیٹی!"— ماں عصمت سے بڑے پیار سے کہہ رہی تھی — "تم نے میری بات مان کر میرا دل خوش کر دیا ہے۔ میں دو دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم طاہر کے کمرے میں نہیں گئیں۔ یہ لڑکا ٹھیک نہیں ہو سکے گا۔ تمھارے لیے میں نے بڑا اچھا رشتہ دیکھا ہے۔ وہ ایک ڈی۔ ایس۔ پی

کا بیٹا ہے۔"

"ڈی۔ایس۔پی پولیس کے افسر ہوتے ہیں ناامّی!" ——عصمت نے معصوم سے مگر طنزیہ لہجے میں کہا——"پھر تو اُن کا گھر پیسوں سے بھرا ہُوا ہوگا۔"

"ہاں بیٹی!" ——ماں نے باچھیں کھلا کر کہا——"لاہور میں تین تو اُن کی کوٹھیاں ہیں۔ پیسے کا ہی تو سارا کھیل ہوتا ہے۔ لڑکا بھی اچھا ہے۔"

"پولیس والوں کے بیٹے اچھے بھی ہوتے ہیں امّی؟" ——عصمت نے اُسی معصوم سے لہجے میں پوچھا

"ہاں بیٹی!" ——ماں نے کہا——"بزرگوں نے جھوٹ تو نہیں کہا کہ جس کے گھر دانے اُس کے کملے بھی سیانے ...... پیسہ ہو تو عقل بھی آجاتی ہے۔ پیسہ کم عقلی پر پردہ ڈال دیا کرتا ہے۔"

عصمت ہونٹوں پر عجیب سی مُسکراہٹ لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے وہ کتاب نکالی جس میں اُس نے طاہر کی تصویر چھپا رکھی تھی۔ اُس نے تصویر نکالی اور طاہر کے خاموش خدوخال میں کھو گئی۔

★

دوسرے دن گیارہ بجے کے بعد طاہر عصمت کے کالج کو جانے کے لیے باہر نکلا تو طاہرہ نے اُسے روک لیا اور بڑے پیار سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

"ذرا گھومنے پھرنے جا رہا ہُوں امّی!" ——طاہر نے کہا۔

"دُور نہ نکل جانا طاہری بیٹا!" ——طاہرہ نے کہا——"ذرا سنبھل کر چلنا۔"

"کیا اب میرے چلنے پر بھی پابندی عائد ہوگئی ہے؟" ——طاہر نے جُھنجھلا کر کہا——"کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں چلنے کے قابل بھی نہیں رہا؟ آپ لوگ مجھے آزاد کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

طاہرہ جذباتی عورت تھی اور اُس میں عقل و دانش بھی تھی۔ اُس نے طاہر پرویز کو اپنے بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا۔ اُس نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو آنکھوں میں ہی روکے رکھا۔

"اتنی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو طاہری بیٹا!" ——طاہرہ نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا——"کس نے تمہیں کہا ہے کہ تم چلنے کے بھی قابل نہیں رہے ہو؟ تمہیں چلنا ہے بیٹا!.... تمہیں بہت دُور تک جانا ہے۔"

طاہرہ نے اُسے مُسکرا کر رخصت کیا اور برآمدے میں رُک کر اُسے جاتا دیکھتی رہی جب طاہر کوٹھی کے پھاٹک سے نکل گیا تو طاہرہ کے آنسو اُس کے ہونٹوں پر آئی ہُوئی مُسکراہٹ کو بہا لے گئے۔

طاہر فٹ پاتھ پر اس طرح خراماں خراماں جا رہا تھا جیسے اُسے کہیں پہنچنے کی جلدی نہ ہو۔ اُس کے قریب سے لوگ گزر رہے تھے۔ بعض لوگوں کے کندھے اُس کے کندھے سے ٹکرائے۔ اُس نے کچھ بھی محسوس نہ کیا۔ چلتے چلتے اُس نے دائیں طرف دیکھا اور وہ رُک گیا۔ اُس کی نظریں ایک دیوار پر جم کے رہ گئیں۔ دیوار پر ایک بہت بڑا پوسٹر چسپاں تھا جس پر لکھّا تھا CRUSH INDIA۔

طاہر پرویز آہستہ آہستہ چلتا اس پوسٹر کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ اُسے ایسے محسوس ہُوا جیسے ان دو لفظوں کے ساتھ اُس کا کچھ تعلّق رہا ہے۔ اُس نے یاد کرنے کی اور کچھ سوچنے کی بہت

کوشش کی۔ اُس کے ذہن میں ایسا شور سا اُبھرنے لگا جیسے ریل گاڑی چلی جا رہی ہو اور اُس کے پہیّوں سے آوازیں آ رہی ہوں——"انڈیا۔ انڈیا۔ انڈیا...."

طاہر نے اپنے جسم میں اینٹھن سی محسوس کی۔ پھر اُسے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ کوئی بڑی قیمتی چیز کھو بیٹھا ہے۔

"ان دو لفظوں کے معنی جانتے ہو بیٹا!" ——طاہر کو یہ آواز اپنی ہی آواز لگی۔ پھر بھی اُس نے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ ایک بُوڑھا سا آدمی تھا۔ وہ کہہ رہا تھا——"ہمارے جسموں میں وہ دَم خم نہیں رہا بیٹا! اب اس دشمن کو تم کرش کرو گے۔"

طاہر پرویز کے مُنہ سے سرگوشی سی پھسل گئی——"ہاں بابا جان! اپنے دشمن کو ہم کرش کریں گے۔"

"ہم نے تمہیں ایک ملک دیا ہے" ——بوڑھے نے کہا——"اور ہم تمہیں اس ملک کا ایک دشمن دے کر بھی جا رہے ہیں۔ دشمن بھی ایسا جو ہمیشہ تمہارا دشمن رہے گا۔"

اس بوڑھے پاکستانی نے طاہر پرویز کے کندھے پر اپنا پار عشہ گیر ہاتھ رکھا، ذرا سا مسکرایا اور چلا گیا۔ طاہر پرویز کی نظریں اس بوڑھے پر جم گئیں اور اُس وقت تک نظریں اُسی پر جمی رہیں جب تک وہ دور جا کر لوگوں کے ہجوم میں تحلیل نہ ہوگیا۔

طاہر لاشعوری طور پر پوسٹر کے سامنے سے ہٹا اور چل پڑا۔ ذرا آگے جا کر اُس نے ایک رکشہ روکا۔ رکشے کی سکرین پر چھوٹا سا ایک لمبوترا پوسٹر چپکا ہُوا تھا۔ اُس پر لکھّا تھا CRUSH INDIA ——جب وہ رکشے میں بیٹھا تو اُس کی نظریں اسی پوسٹر پر جمی رہیں لیکن اب پوسٹر اُلٹا تھا کیونکہ یہ سکرین کے باہر چسپاں کیا گیا تھا۔

طاہر کی نظریں اس اُلٹے پوسٹر سے اُس وقت ہٹیں جب رکشا عصمت کے کالج کے سامنے جا رکا۔ طاہر پرویز چونکا اور رکشے سے اُتر آیا۔

"دیکھ لیں باؤ صاحب!" ——رکشا ڈرائیور نے کہا——"میرا میٹر بالکل صحیح چلتا ہے۔"

طاہر پرویز نے اُسے پیسے دیتے ہُوئے کہا——"آج کل میرا میٹر صحیح نہیں چل رہا۔"

"تھوڑی دیر یہاں کھڑے رہیں" ——رکشا ڈرائیور نے ڈرائیوروں والی مُسکراہٹ سے کہا——"لڑکیوں کو چھٹی ہوگی تو آپ کا میٹر بالکل صحیح ہو جائے گا۔"

اُس نے ہنستے ہوئے رکشہ چلایا اور وہاں سے غائب ہوگیا۔

★

لڑکیاں گیٹ سے نکل بھی رہی تھیں اور اندر بھی جا رہی تھیں۔ طاہر پرویز کی نظریں عصمت کو تلاش کر رہی تھیں۔ عصمت نے اُسے زیادہ انتظار نہ کرایا۔ اُس نے گیٹ میں آ کر طاہر پرویز کو دیکھا۔ بڑی تیزی سے سڑک پار کر کے اُس تک پہنچ گئی۔ دونوں کچھ سوچے بغیر پیدل ہی چل پڑے۔ عصمت اِدھر اُدھر کی شگفتہ سی باتیں کرتی گئی اور طاہر بھی مسکراتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ باغِ جناح میں داخل ہو رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

"تم آج مجھے یہاں کیوں لے آئی ہو عصمت؟"

عصمت نے آہ بھری اور طاہر کے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عصمت کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ پھر ان آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی۔

"کیوں؟" ـــ طاہر نے گھبرا کر پوچھا ـــ "تمھاری آنکھوں میں آنسو کیوں؟"

عصمت نے سر جھکا لیا۔ طاہر نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا اور اُس کا چہرہ اوپر اُٹھایا۔ عصمت کے آنسو بہ نکلے۔ طاہر پرویز نے اپنے جسم میں لرزہ سا محسوس کیا۔ عصمت نے دوپٹے سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"تم ہوش میں ہو طاہری!" ـــ عصمت نے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا ـــ "کیا تم دکھ سکھ کو محسوس کر سکتے ہو؟"

"میں مر تو نہیں گیا عصمت!" ـــ طاہر پرویز نے جھنجھلا کر کہا ـــ "میں تمھارے دکھ کو محسوس کر سکتا ہوں اور تم پر اپنا سکھ قربان کر سکتا ہوں۔"

"میں تمھیں کوئی صدمہ نہیں پہنچانا چاہتی تھی" ـــ عصمت نے کہا ـــ "اور میں تم سے یہی کہوں گی کہ میں تمھیں جو کچھ بھی کہوں اسے صدمے کی طرح قبول نہ کرنا۔"

"خدا کے لیے کچھ کہو بھی" ـــ طاہر نے اکتاہٹ کے لہجے میں کہا۔

"کہنا صرف یہ ہے طاہری!" ـــ عصمت نے کہا ـــ "کہ ہوش میں آجاؤ۔"

"کیا میں تمھیں ہوش میں نظر نہیں آتا؟" ـــ طاہر نے کہا ـــ "جب تم میرے پاس ہوتی ہو تو میں پوری طرح ہوش میں آجاتا ہوں۔"

"وہ تو میں نے بھی دیکھا ہے" ـــ عصمت نے کہا ـــ "لیکن میری ماں کی رائے کچھ اور ہے۔"

طاہر نے اُس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"امّی کہتی ہیں طاہر پاگل ہو گیا ہے" ـــ عصمت نے کہا ـــ "میں نے انھیں کہا تو نہیں لیکن میں انھیں کہہ دوں گی کہ طاہری پاگل ہے تو میں بھی پاگل ہوں۔"

"نہ کہنا" ـــ طاہر نے کہا۔

"کب تک نہیں کہوں گی" ـــ عصمت نے کہا ـــ "کیا تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے؟"

"میں تو اب بھی ٹھیک ہوں" ـــ طاہر نے کہا ـــ "معلوم نہیں یہ کیوں مجھے دوائیاں دیئے چلے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ابّو اور امّی مجھے ساری عمر اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں لیکن میں ان کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ میں ہسپتال سے بھاگ جاؤں گا۔"

طاہر پرویز یہ باتیں ایسے لہجے میں کر رہا تھا جیسے وہ اپنے ماں باپ اور ہسپتال سے بھاگ ہی جائے گا لیکن اُس پر دوائیوں کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ اُس کی آواز میں جوش نہیں تھا نہ اُس کے انداز میں عزم تھا۔ دونوں کم عمر تھے اور عمر کا یہ وہ حصّہ تھا جہاں نوجوان عقل و دانش سے نہیں جذبات سے سوچا کرتے ہیں۔ عصمت تو ابھی بچی تھی۔ اُسے یہ احساس نہیں تھا کہ طاہر کی اس ذہنی کیفیت میں اُسے کون سی بات کرنی چاہیئے، کون سی نہیں کرنی چاہیئے اور کہنے والی بات کس انداز میں کہنی چاہیئے لیکن محبّت اتنی شدید تھی کہ عصمت یہ باتیں اپنے آپ میں روک

ہی نہیں سکتی تھی۔

"مجھے ایک شک ہو رہا ہے" ـــ عصمت نے کہا ـــ "میری امّی نے کسی ڈی۔ ایس۔ پی کا بیٹا دیکھ لیا ہے۔ کل مجھے کہہ رہی تھیں کہ وہ بڑا اچھا لڑکا ہے۔ وہ میرا رشتہ اُسے دینا چاہتی ہیں۔"

طاہر پرویز کو چونک اُٹھنا چاہیئے تھا لیکن اُس کا چہرہ بے تاثر رہا۔ اُس کا ردِّعمل اتنا سا تھا کہ اُس نے عصمت کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور اُس کے اپنے چہرے پر کوئی تاثر نہ آیا۔

"میں نہیں مانوں گی طاہری!" ـــ عصمت نے کہا ـــ "خدا کی قسم میں نہیں مانوں گی۔ میں ماں سے صاف کہہ دوں گی کہ ایسے حالات مت پیدا کرو کہ لوگ یہ کہنا شروع کر دیں کہ راوی روڈ کی اتنی بڑی کوٹھی میں دو پاگل رہتے ہیں۔"

"میں ابّو اور امّی سے بات کروں؟" ـــ طاہر نے کہا۔

"نہیں" ـــ عصمت نے جواب دیا ـــ "میری امّی کا رویّہ دیکھتے رہو۔"

"تمھارے ابّو بھی یہی کہتے ہیں کہ طاہری پاگل ہو گیا ہے؟" ـــ طاہر نے پوچھا۔

"نہیں" ـــ عصمت نے سر زور زور سے ہلا کر جواب دیا ـــ "میں نے تین مرتبہ دیکھا ہے کہ ابّو تمھیں دیکھ کر اپنے کمرے میں آئے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے.... اگر امّی نے مجھے زیادہ پریشان کیا تو میں ابّو سے کہوں گی کہ مجھے امّی سے بچائیں۔ امّی نے تو مجھے یہاں تک کہا کہ میں تمھارے کمرے میں جایا ہی نہ کروں۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟" ـــ طاہر نے پوچھا۔

"میں نے کچھ بھی نہیں کہا" ـــ عصمت نے جواب دیا ـــ "میں نے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی" ـــ عصمت نے اچانک طاہر کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بڑی پیاری آواز میں بولی ـــ "طاہری! میری ان باتوں نے تمھارا دل تو نہیں دکھایا؟"

"مجھے سمجھ نہیں آتی عصمت کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں" ـــ طاہر نے کہا ـــ "تم کہتی ہو کہ میرا دل دُکھا تو نہیں کبھی ایسے بھی لگتا ہے جیسے ان لوگوں نے میرے دل کو مار ڈالا ہے۔"

"نہیں طاہری!" ـــ عصمت نے کہا ـــ "جس دل میں میری محبّت ہے وہ دل مر نہیں سکتا.... طاہری! میری محبت کی خاطر بیدار ہو جاؤ۔"

"تمھاری محبّت مجھے بیدار کرے گی" ـــ طاہر نے کہا۔

عصمت نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بولی ـــ "گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تم جاؤ میں روزمرّہ کی طرح آؤں گی.... اور یہ خیال رکھنا کہ ابھی اپنے ابّو اور امّی سے بات نہ کرنا۔"

عصمت اُٹھی اور چل پڑی۔ طاہر پرویز اُسے کچھ دیر دیکھتا رہا۔ پھر وہ باغ کے اندر چلا گیا۔

★

طاہر پرویز آہستہ آہستہ چلتا باغِ جناح میں سے گزر رہا تھا کسی نے اُس کا نام لے کے پکارا۔ اُس نے رُک کر اُدھر دیکھا۔ وہ ملک رجب علی تھا۔ اُس کے ساتھ سلمیٰ اور شازی تھیں۔ وہ اُس کی طرف چلے آ رہے تھے۔ طاہر اُن کی طرف چل پڑا۔

"ارے طاہری!" — ملک رجب علی نے کہا — "چپ کر کے آتے ہو اور بغیر ملے چلے جاتے ہو؟" — رجب علی نے اسے گلے لگا لیا اور پوچھا — "کہو، کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہوں" — طاہر پرویز نے جواب دیا۔

ملک رجب علی نے اُسے چھوڑا تو سلمٰی نے اُسے گلے لگا لیا اور شازی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"اصغر بھائی کا کوئی خط آیا ہے؟" — طاہر نے رجب علی سے پوچھا۔

"ڈیڑھ مہینہ ہُوا اُس کا خط آیا تھا" — رجب علی نے جواب دیا — "اس کے بعد کوئی خط نہیں آیا۔"

"طاہری!" — شازی بولی — "صبیحہ کا بہت ہی افسوس ہے۔ مجھے تو وہ اُسی طرح ہنستی کھیلتی پیاری پیاری باتیں کرتی نظر آتی ہے۔"

"افسوس کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں باجی!" — طاہر نے کہا — "کس کس کو روئیں گے۔ وہاں تو صبیحہ جیسی ہزاروں لڑکیاں شہید ہو گئی ہیں۔"

"تمھیں تو بہت یاد آتی ہو گی" — شازی نے کہا — "اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں طاہر کے ساتھ پنجاب آؤں گی۔"

"وہ خواب کی باتیں تھیں باجی!" — طاہر نے آہ بھر کہا۔

"ارے طاہر بیٹے!" — ملک رجب علی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے تکلّف دوستوں کی طرح کہا — "کیوں ایک لڑکی کو اپنے دماغ پر سوار کر لیا ہے! ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے۔ معلوم نہیں کتنی لڑکیاں تمھاری راہ میں آئیں گی۔"

"یہ بات نہیں انکل!" — طاہر نے کہا — "صبیحہ کو میں نے اُن لڑکیوں میں سے کبھی بھی نہیں سمجھا تھا جو مجھ جیسے نوجوانوں کی راہ میں آجاتی ہیں۔ یہ میری امّی اور شازی باجی تھیں جنہوں نے میری اور صبیحہ کی شادی کی بات کی تھی۔ میں تو سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ صبیحہ کے ساتھ میرا لگاؤ کس قسم کا ہے۔ میں اتنا ہی محسوس کرتا تھا کہ میرا اور اُس کا روحانی رشتہ ہے یا میں اسے کبھی کبھی خون کا رشتہ کہا کرتا تھا۔ وہ شہید ہو گئی ہے تو میں نے کبھی سوچا تک نہیں کہ وہ لڑکی مر گئی ہے جس کے ساتھ میں شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"بیٹھ جاؤ" — رجب علی نے کہا — "یہیں بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر گپ شپ لگا لو.... طاہری! اللہ تمھیں نظرِ بد سے بچائے، تم تو بہت بہتر ہو گئے ہو۔ ہم سب نے تمھیں پہلی بار پنڈی فوجی ہسپتال میں دیکھا تھا تو ہم تو یہ سمجھے تھے کہ تمھارا دماغ بیکار ہو چکا ہے۔ اللہ تمھیں جلدی ٹھیک کرے۔"

"مجھے ہُوا ہی کیا تھا انکل!" — طاہر نے کہا — "یہی نا کہ میں فوجی ڈسپلن سے ذرا باہر چلا گیا تھا۔ میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا تھا۔ اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کی تھی۔"

"نہ طاہری بیٹا!" — سلمٰی بولی — "جانے دو ابھی۔ ان تلخ تلخ سی باتوں کو ابھی ذہن میں نہ آنے دو۔ میں تو کہتی ہوں کہ جو کچھ ہُوا ہے اچھا ہی ہُوا ہے۔"

شازی جوان تھی کھل کر بات کرنے کی عادی تھی۔ ویسے بھی وہ خوش طبع تھی۔ وہ سمجھتی تھی

کہ طاہر کے ساتھ خوشگوار باتیں کرنی چاہئیں۔

"طاہری!" — شازی نے کہا — "فوراً شادی کر لو تمھیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔"

"ہاں طاہری!" — سلمٰی نے کہا — "تمھیں رشتے کے لیے کون سا دُور جانا پڑے گا تمھارے تایا نے اتنی خوبصورت بیٹی تمھارے لیے ہی تو پالی ہے۔"

"اور اُس کی ماں کہتی ہے کہ میں اس پاگل کو بیٹی نہیں دوں گی" — طاہر نے کہا۔

"کون کہتی ہے؟" — سلمٰی نے پوچھا۔

"عصمت کی ماں" — طاہر نے جواب دیا۔

"وہ گھٹیا عورت ہے" — سلمٰی نے حقارت کے لہجے میں کہا — "تمھارے تایا جان باوقار انسان ہیں تمھیں وہ اتنا ہی چاہتے ہیں جتنا تمھارا باپ۔"

"عصمت تو تمھیں چاہتی ہے نا!" — شازی نے چھیڑ خانی کے انداز میں کہا — "تم اُسے نظر آجاتے ہو تو اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔"

"سنو طاہری!" — سلمٰی نے کہا — "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے صبیحہ کو ذہن پر سوار کر رکھا ہو اور عصمت بے چاری خواب دیکھتی رہ جائے۔"

"نہیں خالہ جان!" — طاہر نے جھنجھلا کر کہا — "میں آپ کو بتا چکا ہُوں کہ صبیحہ کے ساتھ میرا رشتہ یہ نہیں تھا جو عصمت کے ساتھ ہے۔ عصمت کو جب میں دیکھتا ہُوں تو خیال آتا ہے کہ اس لڑکی کو میری بیوی بننا چاہیئے لیکن صبیحہ کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہُوئے بھی ایسا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ احساس ضرور تھا کہ صبیحہ نہ ہو گی تو میں بھی نہیں ہوں گا.... اگر میرا دماغ ٹھیک کام کرتا ہے تو میں کہوں گا کہ صبیحہ کو میں مشرقی پاکستان کی عصمت کی علامت سمجھتا تھا۔"

"تم دونوں عورتوں نے یہ کیا بک بک شروع کر دی ہے" — ملک رجب علی نے شگفتہ سے لہجے میں کہا — "مجھے بھی کوئی بات کر لینے دو۔"

"آپ کیا بات کریں گے" — سلمٰی نے پیارے سے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" — رجب علی نے کہا — "کیا میں بات نہیں کر سکتا؟ میری ٹانگ کٹی ہے زبان تو نہیں کٹ گئی۔"

سب ہنسی مذاق کے موڈ میں تھے۔ رجب علی اور سلمٰی شازی کو گھمانے پھرانے لائے تھے۔ رجب علی نے طاہر پرویز کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں شروع کر دیں۔ طاہر کو یاد آگیا کہ اُسے جانا بھی ہے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"میں شام کی ریل گاڑی سے پنڈی جا رہا ہوں" — طاہر نے کہا — "اصغر بھائی کا کوئی خط آئے تو مجھے ضرور بتانا۔ خدا کرے کہ وہ خیریّت سے ہوں۔"

"خیریّت سے تو وہ ہو گا ہی" — رجب علی نے کہا — "لیکن وہاں کے حالات بہت بگڑ چکے ہیں۔"

"اخباروں میں تو کچھ بھی نہیں ہوتا" — طاہر نے کہا — "صاف پتہ چلتا ہے کہ اخباروں

میں وہی خبریں چھپتی ہیں جو انہیں گورنمنٹ کی طرف سے ملتی ہیں۔"

"میں تمہیں انٹیلی جنس کی خبریں دے رہا ہوں"— رجب علی نے کہا —"انڈین آرمی کی تین کوریں جن میں بارہ ڈویژن فوج ہے، ایسٹ پاکستان کی سرحد پر حملے کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ انڈیا حملے کا جواز تلاش کر رہا ہے۔"

★

مغربی پاکستان میں CRUSH INDIA کے نعرے لگ رہے تھے۔ دیواروں پر جدھر دیکھو CRUSH INDIA لکھا نظر آتا تھا لیکن انڈیا مشرقی پاکستان کو کرش کرنے کے لیے بالکل تیار تھا جس روز طاہر پرویز نے پہلی بار یہ نعرہ ایک پوسٹر کی صورت میں دیوار کے ساتھ چپکا ہوا دیکھا تھا، اُس سے دو روز بعد انڈین آرمی کے ایک نوتنیتن ڈویژن نے مشرقی پاکستان کی مغربی سرحد پر ہلّی کے مقام پر حملہ کر دیا۔ اس ڈویژن کے ساتھ ایک آرمرڈ (ٹینک) بریگیڈ بھی تھا جس میں رُوس کے PT-76 قسم کے ٹینک تھے جو خشکی پر چلتے اور پانی میں تیرتے ہیں۔ اس بریگیڈ میں رُوس کے دوسرے ٹینک T-55 قسم کے تھے جو رات کے اندھیرے میں بھی لڑ سکتے ہیں۔ بھارت کے اس نوتنیتن ڈویژن کے ساتھ کور آرٹلری (توپخانہ) تھی جس کی توپوں کی تعداد اڑھائی سو سے زیادہ تھی۔ یہ حملہ روکنے کے لیے پاکستان کی صرف ایک بٹالین تھی۔ اس کے دائیں اور بائیں دو پلٹنیں اور بھی تھیں لیکن یہ محاذ اس قدر لمبا تھا کہ یہ تینوں پلٹنیں ایک دوسری کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ بے مائیگی کا یہ عالم تھا کہ اس ایک بٹالین کے پاس صرف چھ فیلڈ توپیں اور صرف تین لائٹ ٹینک M-24 تھے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ چلنے کے قابل نہیں تھے۔ یہ توپوں کا ہی کام دے رہے تھے۔

آسمان دم بخود تھا۔ پاکستان کی تاریخ کانپ رہی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ دشمن کی اتنی ہیبت ناک جنگی قوت پاکستانیوں کی اس ایک بٹالین کو جو جنگی ساز و سامان سے محروم تھی اور جو مارچ سے مکتی باہنی اور انڈین آرمی کی کمانڈو فورس کے خلاف جنگلوں اور پہاڑوں میں لڑ رہی تھی کچلتی ہوئی مشرقی پاکستان میں داخل نہیں ہو جائے گی۔ ہمارے دشمن کو بجا طور پر اپنی طاقت پر ناز تھا لیکن فلک کے چاند ستاروں نے وہ منظر دیکھا جو اُنہوں نے بدر کے میدان میں دیکھا تھا۔ گوشت پوست کے انسان آگ اُگلتے ہوئے لوہے کے ٹینکوں سے ٹکرا گئے۔

اُدھر جنگی قوت تھی اِدھر جذبہ تھا۔ اُدھر آتشِ نمرود تھی اِدھر سرفروشانِ وطن کا ایمان تھا جو بُت شکنی کے ابراہیمی جذبے سے معمور تھا۔ اگر پاکستان کی اس بٹالین کے ایک ایک فرد کی شجاعت اور جذبۂ حب الوطنی کی کہانی سنائی جائے تو کئی راتیں یہ داستان ختم نہ ہو۔ بات مختصر کی جائے تو اتنی سی ہے کہ یہ حملہ جو ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء کی رات ہوا تھا، ۱۶ دسمبر تک جاری رہا۔ خود دشمن نے ان جانبازوں کو جنہوں نے پورے ڈویژن اور ٹینک بریگیڈ کو روکے رکھا تھا، دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔

آج فلک بھی اُن پر آنسو بہا رہا ہے جو جذبوں کو سینوں سے لگائے ارضِ مقدّس کی آبرو پر قربان ہو گئے۔ وہ دشمن کی بے پناہ جنگی قوت اور اپنے سیاسی لیڈروں کی شعبدہ بازیوں کی بھینٹ

چڑھ گئے۔ پنجاب اور سرحد کی ہڈیاں بنگال کی مٹی میں مل کر مٹی ہو گئیں اور حاصل کیا ہوا؟— ذلّت اور رسوائی — تیتو میر شہید اور سیّد احمد شہید کے رشتے ہندو کی تلوار نے کاٹ دیئے۔

دشمن اس پہلے حملے سے ہی جان گیا کہ مشرقی پاکستان میں داخل ہونا آسان نہیں لیکن پاکستان کے حکمران دشمن کی مشکلیں اس طرح آسان کر رہے تھے کہ وہاں جو تین ڈویژن مسلسل گوریلوں کے خلاف لڑ رہے تھے انہیں نہ اسلحہ بارود بھیجا نہ جنگی ساز و سامان نہ کمک۔ ہمارے جانباز اپنی محرومیوں کو جذبے کی شدت سے پورا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دشمن کے سامنے چٹانیں بن گئے تھے لیکن یہ چٹانیں سیاست کی ریت پر کھڑی تھیں۔

★

مشرقی پاکستان کی جنگ تو اُس روز شروع ہو گئی تھی جس روز بھارت نے مشرقی پاکستان میں بنگالی مسلمانوں کے بہروپ میں اپنی کمانڈو فورس داخل کی تھی لیکن اسلام آباد پر خوش فہمیوں کے بڑے خوبصورت بادل چھائے رہے۔ ہلّی پر جب دشمن نے اتنا زوردار حملہ کر دیا تو بھی اسلام آباد والوں نے اسے ہنس کر ٹال دیا۔ پاکستان کی مُٹھی بھر فوج مشرقی پاکستان میں ہاری ہوئی جنگ لڑ رہی تھی۔

اللہ کے سپاہی بے تیغ لڑ رہے تھے۔

ہمارے دشمن نے کہا —"مشرقی پاکستان بھارت کا مسئلہ ہے.... ہم بنگالی مسلمانوں کو پاکستان کے استبداد سے آزاد کرائیں گے۔"

اِدھر مغربی پاکستان میں اقتدار کی سیاست کا اونٹ ایک کروٹ بیٹھ گیا تھا۔ ایک آواز اُٹھی —"اُدھر تم۔ اِدھر ہم"— مطلب یہ تھا کہ تم پورے کا پورا مشرقی پاکستان لے سکتے ہو، کرسی نہیں لے سکتے۔

آدھا پاکستان اقتدار کی بازی پر لگا دیا گیا۔ فوج سیاست کا مُہرہ بن گئی اور یہ مُہرہ بساط کے اُس خانے میں رکھ دیا گیا جہاں اس کا انجام پٹ جانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ اپنے بھی دیکھ رہے تھے۔ پرائے بھی دیکھ رہے تھے۔ پاکستان کے دوست بھی اور دشمن بھی دیکھ رہے تھے — دیکھنے والی بات اب صرف یہ رہ گئی تھی کہ مشرقی پاکستان کب جاتا ہے۔

اسلام آباد میں قصرِ صدارت کے انداز وہی تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے محمد شاہ رنگیلا واپس آ گیا ہے۔

مشرقی پاکستان کے محشر میں پاک فوج کے افسر اپنے جوانوں سے کہہ رہے تھے —"جوانو! اب ہمیں یہیں لڑنا اور یہیں مرنا ہے۔"

وہ تو ۲۵ مارچ کی رات سے لڑ رہے تھے اور اب نومبر کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ ان کے لیے اب مرنا باقی تھا۔ خانہ جنگی پاک بھارت جنگ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ بھارت کو اب مشرقی پاکستان پر ہر طرف سے حملے کے لیے ایک ٹھوس جواز کی ضرورت تھی۔ مغربی پاکستان میں "کرش انڈیا" کا نعرہ آسمان تک پہنچنے لگا۔ بسوں پر، کاروں اور ٹیکسیوں پر، رکشا اور ریل گاڑیوں پر، دیواروں اور دروازوں پر لکھا تھا— CRUSH INDIA — پھر اس کا ترجمہ نظر آنے لگا—"بھارت کو کچل دو"— یہ نعرہ

ایک جنون کی صورت اختیار کر گیا۔

تاجروں اور کارخانہ داروں نے اس نعرے کو اپنے کاروبار اور اپنی مصنوعات کی تشہیر کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ دیواروں پر پوسٹر نظر آنے لگے جن پر موٹے انگریزی حروف میں "کرش انڈیا" چھپا ہوا ہوتا اور نیچے "منجانب فلاں ....." لکھا ہوا ہوتا۔

ہم جذباتی لوگ ہیں۔ ہم جذباتی نعروں اور جوشیلی تقریروں کے مارے ہوئے عوام ہیں۔ ہم عقل پر جذبات کا فسوں اور لیڈروں کی تقریروں کا سحر طاری کر لیا کرتے ہیں۔ ہم ہپناٹائز ہو جانے میں لذت اور قرار محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے خون میں اُبال پیدا کرنے کے لیے چند ایک جوشیلے اور جذباتی الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔

نومبر ۱۹۷۱ء کے آخر تک مغربی پاکستانیوں کا خون اُبال کے آخری نقطے تک جا پہنچا تھا۔

پھر یہ نعرہ قوم کا مطالبہ بن گیا، پھر یہ مطالبہ قصرِ صدارت کے در و دیوار ہلانے لگا۔

مغربی پاکستان میں کسی نے بھی نہ سوچا کہ نعرہ اٹھا کہاں سے تھا اور اس کا خالق کون ہے۔ کسی نے یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ ہمارے دشمن نے پروپیگنڈے اور دروغ گوئی کا فن دوسری جنگ عظیم کے نازی جرمنی سے سیکھا ہے اور نفسیاتی جنگ کے اسرائیلی ماہرین نئی دلّی میں بیٹھے ہیں اور بھارت کی انٹیلی جنس اور سیکرٹ سروس کی ہدایت کاری ان اسرائیلی ماہرین کے پاس ہے۔ "کرش انڈیا" اور "بھارت کو کچل دو" کے نعرے کا خالق ہمارا دشمن ہے۔

اسلام کے دو سب سے بڑے دشمن — ہنود اور یہود — پاکستان کے خلاف ایک محاذ پر اکٹھے ہو گئے تھے۔

ہمارا دشمن جانتا تھا کہ پاکستان کے دفاعی پلان کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا یعنی جب کبھی مشرقی پاکستان پر حملہ ہوا، بھارت پر مغربی پاکستان سے حملہ کیا جائے گا، مگر ہمارا دشمن دیکھ رہا تھا کہ مغربی پاکستان میں الفاظ میں گرمی تو ہے اور عوام بارود بنے ہوئے ہیں لیکن جنہیں دفاعی پلان پر عمل کرنا ہے، اُن پر برف پڑی ہوتی ہے۔ بھارت کو مشرقی پاکستان پر حملے کا یہی ایک جواز مل سکتا تھا کہ مغربی پاکستان سے اُس پر حملہ ہو جائے۔ اُس کے پاس اس قدر جنگی طاقت تھی کہ وہ دونوں محاذوں پر آسانی سے لڑ سکتا تھا۔ مشرقی پاکستان تو اب وہ پھل بن گیا تھا جو پک کر گرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ بھارت نے اس کے نیچے اپنی جھولی پھیلا دی تھی۔

روس نے بھارت کو بے پناہ اسلحہ، ٹینک اور جدید طیارے دے دیئے تھے اور دونوں ملکوں میں دوستی کا معاہدہ ہو گیا تھا۔ روس نے اپنے فوجی ماہرین بھی بھارت کو دے دیئے تھے۔ اسرائیل نے اپنے ماہرین بھیج دیئے۔ مشرقی پاکستان میں گوریلا جنگ لڑانے والا ایک اسرائیلی جرنیل تھا جسے گوریلا جنگ کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔

پاکستان کا دوست امریکہ تھا جو اُن دوستوں میں سے تھا جن کے متعلق کہاوت مشہور ہے کہ بیوقوف دوست سے عقل مند دشمن بہتر ہوتا ہے، لیکن امریکہ بیوقوف اور نادان نہیں تھا۔ اُس

نے پاکستان کے سر پر خالی ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ دوست بن کر پاکستان کو تباہی کی طرف جاتا دیکھ رہا تھا۔ اُس کا بھی مفاد اسی میں تھا کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے الگ ہو جائے۔

پاکستان کے لیے بھارت پر حملے کا وقت اور موقع گذر چکا تھا۔ بھارت نے بہت موقعے فراہم کئے تھے۔ یہ اعلان مغربی پاکستان میں سرکاری طور پر ہوا تھا کہ بھارت نے پچاس ہزار نفری کی کمانڈو فورس مشرقی پاکستان میں داخل کر دی ہے۔ ہماری سرکار نے بیان بازی اور احتجاجی مراسلوں کے سوا کوئی کارروائی نہ کی۔ پھر بھارت نے اپنی توپیں سرحد کے قریب لا کر مشرقی پاکستان میں گولہ باری کی اور ۲۲ نومبر کو تین محاذوں پر حملہ کر دیا مگر مغربی پاکستان پر برف پڑی رہی۔

بھارت نے اب ایسی پوزیشن حاصل کر لی تھی جس میں وہ ضرورت محسوس کرنے لگا کہ مغربی پاکستان سے اُس پر حملہ ہو۔ اُس نے اس مقصد کے لیے اپنے ایجنٹوں کو استعمال کیا جن کی پاکستان میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ان ایجنٹوں میں پاکستانیوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ ان کا اثر و رسوخ اسلام آباد کے ایوانِ صدارت کے اندرونی حلقوں تک تھا۔ اُنہوں نے پاکستانی بن کر پاکستانیوں کے منہ میں نعرہ دے دیا "مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کر دو اور بھارت کو کچل دو" — یہ نعرہ دو لفظوں میں سمٹ آیا — CRUSH INDIA۔

جب یہ نعرہ ہماری سرکار کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگا تو سرگوشیاں سنائی دینے لگیں — "حضور! کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ورنہ عوام ہمارے خلاف ہو جائیں گے"۔

"فوج کو سرحد پر بھیج دو" — حکم ملا۔ "کچھ عرصہ عوام چُپ رہیں گے"۔

اُس وقت فوج کی ضرورت شہروں میں بھی تھی کیونکہ محمد شاہ رنگیلے نے مارشل لاء نافذ کر رکھا تھا۔ ٹینکوں میں لڑنے والے افسر شہروں میں ایئرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھے سول افسر بنے ہوئے تھے۔ نوجوان لیفٹیننٹ اور کیپٹن تھانیداروں اور مجسٹریٹوں کا رول ادا کر رہے تھے۔ شہری زندگی اور حکومت نے اُن کی عسکریت کو زنگ آلود کر دیا تھا۔

وہ بھی اسی پاکستان کی فوج تھی جو مشرقی پاکستان کے دلدلی جنگلوں، پہاڑی علاقوں، ندیوں اور دریاؤں میں دس مہینوں سے اس کیفیت میں لڑ رہی تھی کہ اُس کے سامنے بھی دشمن تھا، پیچھے بھی دشمن، دائیں اور بائیں بھی دشمن۔ اس فوج کے پاس جنگی ساز و سامان کی کمی کے علاوہ یہ محرومی بھی تھی کہ زخمیوں کو دُور دراز علاقوں سے ہسپتال تک پہنچانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کئی زخمی بروقت طبّی امداد نہ ملنے کی وجہ سے شہید ہو جاتے تھے، اور اب دشمن نے اُس پر باقاعدہ حملے شروع کر دیئے تھے مگر اس فوج کو کوئی رسد یا کمک نہیں مل رہی تھی — اور یہ بھی فوج تھی جس کے افسر مغربی پاکستان کے شہروں کے باقاعدہ حاکم بنے ہوتے تھے۔

پھر ایسے ہوا کہ مغربی پاکستان میں جو فوج چھاؤنیوں میں تھی، اسے سرحد پر مورچوں میں بھیج دیا گیا اور باقی فوج شہروں میں حکومت کا کاروبار چلاتی رہی۔

★

مشرقی پاکستان کی مشرقی سرحد پر جہاں میجر اصغر کی بٹالین مورچہ بند تھی، رات کو پھر گولہ باری ہو

رہی تھی جو تین چار توپوں کی تھی۔ جب سے یہ بٹالین یہاں آئی تھی کبھی کبھی رات کو اس کے مورچوں پر گولہ باری ہوتی تھی۔ میجر اصغر نے مشرقی پاکستان کے ایک گاؤں پر حملہ کر کے انڈین آرمی کے کچھ آدمی پکڑے تھے جو پاکستانی فوجیوں کے بہروپ میں آتے تھے۔ اُنہوں نے بتایا تھا کہ یہ توپیں اُس وقت گولہ باری کرتی ہیں جب بھارت سے کمانڈو یا تخریب کار پارٹی مشرقی پاکستان میں آرہی ہوتی ہے یا ادھر سے کوئی پارٹی واپس جارہی ہوتی ہے۔

اِن قیدیوں نے یہ بھی بتادیا تھا کہ یہ توپیں آسامی علاقے میں کسی مقام پر ہیں۔ وہ علاقہ کس قسم کا ہے اور فاصلہ کتنا ہے، قیدیوں نے تمام معلومات دے دی تھیں۔ ان کے مطابق کرنل ارشاد نے فیصلہ کیا تھا کہ ان توپوں کو، جب کبھی وہ گولہ باری کریں، کمانڈو پارٹی بھیج کر تباہ کیا جاتے۔ میجر اصغر چونکہ کمانڈو ایکشن کا تجربہ رکھتا تھا اس لیے ان توپوں کو تباہ کرنے کا کام اُس نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔

بہت دنوں بعد رات کو جب کھانے سے فارغ ہوتے تو گولہ باری شروع ہوگئی مگر کرنل ارشاد نے ان توپوں کو کمانڈو پارٹی سے تباہ کرانے کا پلان منسوخ کر دیا۔

"سَر! مجھے جانے دیں" — میجر اصغر اپنے بٹالین کمانڈر کرنل ارشاد سے کہہ رہا تھا — "مجھے جانے دیں سَر! میں اپنی ذمہ داری پر جاؤں گا سَر! میں نے یہ کمانڈو ایکشن پلان کیا تھا اور سَر! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میں اس ایکشن کی کمانڈ کروں گا۔"

"ہاں سَر!" — سیکنڈ اِن کمانڈ نے کہا — "میجر اصغر کو یہ ایکشن کرنے دیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو میجر نذر!" لیفٹیننٹ کرنل ارشاد نے ذرا رعب سے کہا — "کیا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا سگنل تم نے نہیں پڑھا؛ اس میں کیا صاف نہیں لکھا ہوا کہ سرحد سے باہر جاکر کوئی جنگی کارروائی نہیں کی جائے گی؟ ویسٹرن بارڈر پر ہلی دیناج پور سیکٹر میں دشمن نے پورے ڈویژن سے حملہ کر دیا ہے۔ ایسا ہی حملہ ہمارے سیکٹر میں آسکتا ہے اور آئے گا۔ میں کس طرح ایک میجر، تین عہدیداروں اور سات آٹھ جوانوں کو ضائع کر دوں؟"

تھوڑے تھوڑے وقفے سے توپوں کے گولے آتے تھے۔ دھماکوں سے رات لرز رہی تھی۔

"سَر!" — میجر اصغر نے کہا — "ہم بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو پتہ ہی نہیں چلنے دیں گے۔ آپ یہ ایکشن کسی کھاتے میں نہ لکھیں۔ دیکھتے، دشمن ہم پر کتنی شیلنگ کر رہا ہے۔ یہ وہی آرٹلری اور وہی بیٹری ہے جس کی گنیں کبھی کبھی ہم پر شیلنگ کیا کرتی ہیں۔ جن قیدیوں کو ہم نے پکڑا تھا، انہوں نے اِن گنوں کی پوزیشن اور تمام انفارمیشن دے دی تھی۔ میں اپنی پارٹی کو لے کر ابھی چلا جاتا ہوں گنیں رات کو وہیں رہیں گی۔"

"میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں اصغر!" — کرنل ارشاد نے کہا — "لیکن وہ انفارمیشن پرانی ہوچکی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سرحد پار جاکر پھنس جاؤ، پھر میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو کیا جواب دوں گا" — اُس نے سیکنڈ اِن کمانڈ میجر نذر سے کہا — "میجر نذر! تمام کمپنی کمانڈروں کو پیغام دو کہ وہ خبر رکھیں دشمن کی کوئی پارٹی آرہی ہے یا جارہی ہے ..... اور تمام کمپنیوں سے اوکے رپورٹ لو ..... تم اپنی جگہ چلے جاؤ

میجر اصغر!"

"سَر!" — میجر اصغر نے کہا — "میں آج محسوس کر رہا ہوں کہ لیفٹیننٹ طاہر کا دماغ کیوں خراب ہوگیا تھا۔ وہ نوجوان تھا، برداشت نہ کرسکا، میں برداشت کرلوں گا لیکن سَر! میری زمین پر دشمن کے گرتے ہوئے گولے کبھی میرا بھی دماغ خراب کر دیں گے۔"

"تمہیں ایک بات بتاؤں اصغر!" — کرنل ارشاد نے کہا — "یہ تو مجھے یقین ہے کہ تم حکم اور ملٹری ڈسپلن کے خلاف کوئی کام نہیں کرو گے، میں تمہیں یہ بتادوں کہ ایسٹ پاکستان کو بچانے کے لیے ہمیں پاگل ہوکر لڑنا پڑے گا اور حاصل پھر بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اِس وقت ایسٹ پاکستان تین کوروں کے محاصرے میں ہے اور ہمارے پاس صرف تین ڈویژن ہیں ہمیں اب کمک نہیں مل سکتی۔ وہ وقت تیزی سے آرہا ہے کہ ہمیں ایمونیشن بھی نہیں ملے گا۔"

جذبات کی یہ کیفیت صرف ایک بٹالین کے ایک دو افسروں کی نہیں تھی بلکہ پاک فوج کے ہر افسر اور ہر جوان کی یہی کیفیت تھی۔ اُنہیں نومبر کے آخر تک احساس ہوگیا تھا کہ انہیں تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔ انہیں یہ احساس بھی ہوگیا تھا کہ انہیں دشمن نے محاصرے میں نہیں لیا بلکہ اپنوں نے انہیں دشمن کے محاصرے میں پھینک دیا ہے۔ لیکن اپنے ملک کا دفاع فوج کی ذمہ داری تھی۔ ہر وہ فرد جس نے خاکی وردی پہن رکھی تھی اُس نے ذہنی طور پر قبول کرلیا تھا کہ یہ خاکی وردی اُس کے اپنے لہو سے لال ہوگی۔ یہی وردی اُن کا کفن ہوگی اور اپنے آپ کو وہ آخری غسل اپنے لہو سے دیں گے۔

وہ ایک نوجوان لیفٹیننٹ تھا جس کے جسم سے دو گولیاں پار ہوگئی تھیں۔ اُسے اٹھا کر پیچھے لاتے۔ معلوم نہیں کس نے کہا کہ اس کی وردی اتار دو تاکہ مرہم پٹی آسان ہو جاتے۔

"میری وردی نہ اتارنا" — زخمی لیفٹیننٹ نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا اور اپنی وردی کی طرف دیکھ کر بولا — "خاکی وردی پر لال لہو کتنا اچھا لگتا ہے۔"

★

لیفٹیننٹ طاہر پرویز دو دنوں کے لیے لاہور اپنے گھر آیا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ طاہرہ اور ارشد بھی خوش تھے۔ طاہر کا چھوٹا بھائی اور بہن بھی خوش تھے۔ انہیں خوش ہونا ہی تھا، طاہر اُن کے لیے یہ خوشخبری لایا تھا کہ اُسے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا ہے اور وہ اپنے رجمنٹل سنٹر میں جارہا ہے۔ اُسے تین دن کی چھٹی دی گئی تھی۔ گھر سے سیدھا اُسے رجمنٹل سنٹر جانا تھا۔

راولپنڈی فوجی ہسپتال کے سائیکاٹرسٹ میجر عظمت نے اُسے یہ ہدایت دے کر ہسپتال سے عارضی طور پر فارغ کیا تھا کہ وہ باقاعدگی سے دوائیاں لیتا رہے جو میجر عظمت نے اُسے لکھ دی تھیں۔ میجر عظمت نے طاہر کے رجمنٹل سنٹر کے میڈیکل آفیسر کو الگ چٹھی لکھی تھی کہ طاہر کس ذہنی مرض کا مریض ہے اور اس کی دیکھ بھال کس طرح کی جاتے چٹھی میں کئی اور ہدایات لکھی تھیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ طاہر کو رجمنٹل سنٹر میں ہی رکھا جاتے اور اسے ہلکی پھلکی دفتری ڈیوٹی دی جاتے اور اگر ذرا سا بھی شک ہو کہ اس کا انداز نارمل نہیں لگتا تو اسے فوراً وہاں کے ملٹری ہسپتال میں بھیج دیا جاتے۔

طاہر کو گھر آتے دوسری شام تھی۔ وہ باقاعدہ دوائیاں لے رہا تھا۔ یہ دوائیاں اُس کے

مرض کا علاج نہیں تھیں۔ یہ تو اُس کے ذہن اور جذبوں کو سلاتے رکھنے کے لیے دی جا رہی تھیں۔ تمام گولیاں زیادہ طاقت کی تھیں۔

شام کا دُھندلکا گہرا ہو گیا تھا۔ اچانک باہر شور اٹھا ——"لائٹ آف کرو .... بتیاں بُجھا دو .... بلیک آؤٹ کرو" —— اس کے ساتھ ہی کئی طیاروں کا گرجدار زنّاٹہ سنائی دیا۔ یہ طیارے بھارت کی طرف جا رہے تھے۔ طاہر کے گھر میں کھلبلی مچ گئی اور تمام کمرے تاریک ہو گئے۔ گھر کے تمام افراد دوڑتے ہوتے باہر لان میں گئے۔ لاہور تاریکی میں ڈوبا ہُوا تھا۔ کوٹھی کے سامنے سے گذرتے ہوتے لوگ بلند آوازوں میں کہتے جا رہے تھے ——"پاکستان نے انڈیا پر حملہ کر دیا ہے .... جنگ شروع ہو گئی ہے"۔

یہ تین دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام تھی۔

سڑکوں پر جو ٹریفک آ جا رہی تھی اس کی بتیاں بھی بُجھی ہوتی تھیں۔ لوگوں کے جوشیلے نعرے بھی سنائی دے رہے تھے۔ کوٹھی کے پھاٹک کے قریب کسی جوشیلے پاکستانی کا نعرہ گرجا —"کرش انڈیا"۔

اچانک طاہر پرویز بم کی طرح پھٹا ——"نعرۂ تکبیر .... پاکستان زندہ باد" —— اور وہ کوٹھی کے پھاٹک کی طرف دوڑ پڑا۔ اُس کی آواز سنائی دی —"میں محاذ پر جا رہا ہوں"۔

ارشد، اُس کا بڑا بھائی یوسف، طاہر کا چھوٹا بھائی اور طاہرہ طاہر کے پیچھے دوڑ پڑے۔ طاہر کو ذہنی مرض کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ پھاٹک سے نکل کر سڑک پر جا رُکا اور چلانے لگا ——"ٹیکسی ٹیکسی .... مجھے میری بٹالین میں پہنچا دو۔ دُگنے پیسے دُوں گا"۔

ارشد نے پیچھے سے اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"چھوڑ دو مجھے" — طاہر نے اپنے جسم کو زور زور سے جھٹکے دیتے ہوتے کہا —"کون ہو تم؟ .... تم انڈیا کے آدمی معلوم ہوتے ہو"۔

گھر کے دوسرے افراد بھی پہنچ گئے۔ طاہرہ اُس کے آگے ہو گئی۔

"طاہری بیٹے!" —— اُس نے طاہر کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بڑے پیار سے کہا —"طاہری بیٹے! اندر چلو۔ ہم تمہیں محاذ پر لے چلیں گے"۔

ارشد ابھی تک طاہر کو بازوؤں میں جکڑے ہوتے تھا اور اُسے پیچھے کو گھسیٹ رہا تھا۔ طاہر کا جسم تشنّج کی طرح اکڑ گیا تھا۔ وہ چلّا رہا تھا۔ طاہرہ نے کہا کہ اسے گھسیٹ کر اندر لے چلو۔

"کون ہو تم مجھے اندر لے جانے والی؟" — طاہر پرویز نے سخت غصیلی آواز میں کہا۔

"میں تمہاری ماں ہوں طاہری بیٹا!" —— طاہرہ نے کہا۔

"تم میری ماں نہیں ہو" —— طاہر نے چلّا کر کہا —"تم جھوٹ بولتی ہو کہ پاکستان تم نے بنایا تھا۔ جن ماؤں نے پاکستان بنایا تھا وہ اپنے بیٹوں کو گھسیٹ کر گھروں میں نہیں لے جاتیں۔ وہ انہیں محاذوں پر بھیجتی ہیں"۔

ارشد کا بڑا بھائی یوسف دوڑتا ہُوا اندر گیا۔ اُسے راولپنڈی فوجی ہسپتال سے ایک انجکشن اس ہدایت کے ساتھ دیا گیا تھا کہ ہو سکتا ہے کسی وقت طاہر بے قابو ہو جاتے، اس کیفیت میں

اسے یہ انجکشن دے دیا جاتے۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ یہ انجکشن اسے کم از کم بارہ گھنٹے سلاتے رکھے گا۔ اتفاق سے یوسف خود انجکشن لگانا جانتا تھا۔ اُس نے سرنج گھر میں رکھی ہوئی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ سرنج اور انجکشن کہاں رکھے ہیں۔ اُس نے انجکشن سرنج میں بھرا اور دوڑتا ہُوا باہر آیا۔ اُس وقت طاہر کو ارشد، طاہر کا چھوٹا بھائی اور طاہرہ تقریباً اُٹھا کر پھاٹک کے اندر لے آتے تھے۔ یوسف نے انہیں روک لیا اور طاہر کے بازو سے آستین زبردستی اوپر اُٹھا کر اور اُس کے بازو کو مضبُوطی سے جکڑ کر انجکشن دے دیا۔ دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ طاہر کا جسم بے حس ہو گیا۔ اُسے اٹھا کر اندر لے آتے۔

کھڑکیوں کے شیشوں پر ابھی کالے کاغذ یا کپڑے نہیں چڑھاتے گئے تھے اس لیے بتی نہیں جلائی جا سکتی تھی۔ اندھیرے میں ہی طاہر کو پلنگ پر لٹا دیا گیا .... سسکیاں سنائی دینے لگیں۔

"طاہرہ!" —— یُوسف نے کہا —"یہ تم ہو؟ .... روکیوں رہی ہو؟ .... دعا کرو .... طاہری ٹھیک ہو جاتے گا"۔

"میرے بچّے کو کیا ہو گیا ہے بھائی جان!" —— طاہرہ نے اُونچی آواز میں روتے ہُوتے کہا —"میرے غازی کو کیا ہو گیا ہے" —— روتے روتے طاہرہ کی ہچکی بندھ گئی۔

ارشد طاہرہ کو تسلّی تشفی دینے لگا۔ کچھ دیر بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ طاہر کے پاس ارشد، طاہرہ اور ان کے بچّے رہ گئے۔ پھر بچے سو گئے اور ارشد اور طاہرہ نے طاہر کے پاس بیٹھ کر ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

★

اگلے دن کی صبح اس طرح طلوع ہوئی کہ ہوائی حملے کے سائرن چیخنے لگے۔ اِدھر طاہر پرویز کا چیخ نما نعرۂ تکبیر سنائی دیا۔ گھر کے تمام افراد دوڑتے طاہر کے کمرے میں پہنچے۔ طاہرہ اور ارشد تھوڑی ہی دیر پہلے طاہر کے کمرے میں سے نکلے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ طاہر پرویز جاگے اور اسے ناشتہ دیا جاتے۔ اب وہ طاہر کا نعرہ سُن کر اُس کے کمرے میں آتے تو وہ اُٹھ کر دروازے میں پہنچ چکا تھا۔ سب سے پہلے ارشد نے اُسے بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا۔ طاہر نے پھر رات والا منظر پیدا کر دیا۔ اُسے پلنگ پر زبردستی لٹا دیا گیا۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بھائی جان!" — ارشد نے اپنے بڑے بھائی یوسف کے کان میں سرگوشی کی —— "انجکشن لے آئیں"۔

"ذرا ٹھہرو ارشد!" —— بڑے بھائی نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا ——"بار بار اتنا تیز انجکشن بچّے کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ ذرا ٹھہرو کچھ سوچ لیتے ہیں" —اُس نے طاہر پرویز کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا —"ہمیں دشمن نہ سمجھو بیٹا! ہم آج ہی تمہیں تمھارے رجمنٹل سنٹر پہنچا دیں گے"۔

"میں سنٹر میں نہیں جاؤں گا" —— طاہر نے چلّا کر اور اپنے جسم کو اکڑا کر کہا —"میں فارورڈ ایریا میں جاؤں گا" —— اور وہ زور لگا کر ارشد اور طاہرہ کی گرفت سے آزاد ہونے لگا۔

عصمت پلنگ کے قریب چپ چاپ کھڑی تھی۔ طاہر نے اُسے دیکھا۔

"عصمت!" —— طاہر نے کہا —"انہیں کہو مجھے جانے دیں"۔

عصمت نے طاہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیمی سی آواز میں کہا— "طاہری! چُپ کر کے لیٹے رہو۔ میں تمہیں لے جاؤں گی۔"

سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ طاہر کا جسم اس طرح ڈھیلا پڑ گیا جیسے اُسے رات والی دوائی کا انجکشن دے دیا گیا ہو۔ عصمت نے پروا نہ کی کہ کوئی کیا کہتا ہے یا کیا سمجھتا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر پلنگ پر طاہر کے قریب بیٹھ گئی اور ہاتھ اُس کے سینے پر رکھ دیا۔

"ہوش میں آ طاہری!"— عصمت نے پہلے کی طرح دھیمی مگر بڑی پختہ آواز میں کہا— "اب نہ ہلنا!"

طاہر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر یہ آنسو بہ نکلے۔ طاہرہ اپنے دوپٹے سے اُس کے آنسو پونچھنے لگی لیکن عصمت کا آنچل اُس سے پہلے ہی طاہر کی آنکھوں تک پہنچ چکا تھا۔ طاہرہ نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ یوسف نے سب کو سر سے اشارہ کیا کہ یہاں سے نکلو۔ سب دبے پاؤں کمرے سے نکل گئے۔

"اٹھو طاہری!"— عصمت نے کہا— "اُٹھ کر بیٹھ جاؤ۔"

طاہر یوں اُٹھ بیٹھا جیسے عصمت نے اُسے ہپناٹائز کر لیا ہو۔

"میں نے تمہیں کیا کہا تھا!"— عصمت نے کہا— "کیا تم پر میری محبت کا اتنا اثر بھی نہیں؟"

"میں پاکستان کی محبت کو تمہاری محبت پر قربان نہیں کر سکتا عصمت!"— طاہر نے نارمل سے لہجے میں کہا— "مجھے پاکستان کی عصمت پکار رہی ہے۔"

"میں تمہیں روک نہیں رہی طاہری!"— عصمت نے کہا— "اگر میں تمہیں روک رہی ہوں تو یہ میرے اپنے لیے نہیں۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں رخصت کروں گی لیکن حقیقت کو دیکھو اور سوچو۔ اگر اس حالت میں تم محاذ پر چلے بھی جاؤ تو کیا ہو گا۔ یہی ہو گا ناکہ تم دشمن کی گولی کا نشانہ بن جاؤ گے۔"

فضا میں ہوائی جہازوں کا گرجدار زناٹہ سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی مشین گنوں کی فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد بڑے زوردار دو دھماکے سنائی دیئے۔ دشمن کے طیارے راوی کے پُلوں پر بم گرانے آتے تھے۔ طیارہ شکن مشین گنیں اور توپیں ان پر فائر کر رہی تھیں وہ بم گرا کر نکل گئے۔

وہ تو نکل گئے لیکن طاہر پرویز کا جسم پھر تشنج کی کیفیت میں آ گیا۔ اُس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ عصمت نے محسوس کیا کہ طاہر اُٹھنے کے لیے سرک رہا ہے۔ عصمت نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال دیں اور دھیمی سی آواز میں بولی— "طاہری!"— لیکن طاہر پر کچھ اثر نہ ہُوا۔

باہر سڑک پر بڑی ہی بلند ایک آواز سنائی دی— "انڈیا کا ایک جہاز مار لیا گیا ہے۔ میں نے اُسے پُل سے دُور گرتے دیکھا ہے"— اس کے ساتھ دو تین آوازیں شامل ہو گئیں— "ہم نے بھی دیکھا ہے۔ ہوا میں پھٹ گیا تھا۔"

"سُن رہے ہو طاہری!"— عصمت نے کہا— "کافروں کا ایک جہاز گرا لیا گیا ہے۔"

طاہر نے سکون کی آہ بھری اور اُس کا جسم ڈھیلا ہوتے ہوتے نارمل حالت میں آ گیا۔

"عصمت!"— طاہر نے بے بسی کے عالم میں کہا— "مجھے ایک گولی دے دو۔"

"خالی پیٹ گولی نہ لو"— عصمت نے کہا— "میں چچی سے کہتی ہوں تمہارا ناشتہ لے آئیں۔"

طاہر نے پلنگ پر ہی اپنے ابو، امّی اور عصمت کی موجودگی میں ناشتہ کیا اور اُس نے وہ دوائیاں لے لیں جو ڈاکٹر نے اُس کے لیے لکھی تھیں۔

★

"کیا جوان لڑکی کا ایک جوان لڑکے کے پاس یوں تنہائی میں بیٹھنا آپ کو اچھا لگتا ہے؟"— عصمت کی ماں عصمت کے باپ سے کہہ رہی تھی۔

"زینت!"— عصمت کے باپ یوسف نے پوچھا— "کیا وہ کوئی بدمعاش لڑکا ہے؟ کیا وہ باہر کا لڑکا ہے؟"

"وہ فوجی ہے"— زینت نے کہا— "اور وہ پاگل ہے۔"

"وہ میرا بھتیجا ہے"— یوسف نے اپنے غصّے کو قابو میں رکھتے ہُوئے کہا— "وہ میرے چھوٹے بھائی کا بیٹا ہے۔ ابّا جان کی وفات کے بعد میں اپنے چھوٹے بھائی کا باپ بھی ہوں۔ طاہر میرا خون ہے۔"

"اور عصمت میری بیٹی ہے"— زینت نے بھڑک کر کہا— "میں اُسے خراب ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔"

"دیکھو زینت!"— یُوسف نے اب کے ذرا بزرگانہ دبدبے سے کہا— "طاہر کی پیدائش سے پہلے بھی تم نے اس گھر میں ایسا ہی کھچاؤ پیدا کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہُوا تھا کہ طاہرہ جیسی پاک صاف اور مخلص لڑکی اس گھر سے بھاگ گئی تھی۔"

"وہ حالات اس لڑکے کی ماں نے پیدا کیے تھے"— زینت نے جوابی حملہ کرنے کے انداز میں کہا— "وہ بھی پاگل تھی۔"

"اگر تمہارا دماغ ٹھکانے رہتا تو وہ حالات پیدا نہ ہوتے"— یُوسف نے کہا— "اور یہ بھی سُن لو زینت! اُس وقت ابُو اور امّی تھے۔ اب خاندان کی عزّت اور آبرو کا محافظ میں ہوں۔ میں گھر میں کوئی ایسی بات برداشت نہیں کروں گا.... اور زینت! عمر کے اس حصّے میں آ کر ہماری زندگی میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہونی چاہیئے۔ کسی کے بیٹے کو پاگل نہ کہو۔ تم خود اولاد والی ہو۔ خدا سے ڈرو۔"

زینت خاموش تو ہو گئی لیکن یوں لگتا تھا جیسے اُس نے بادلِ نخواستہ اپنے خاوند کا حکم مانا ہے۔

وہ دن اس طرح گزرا کہ طیاروں کے زنّاٹے سنائی دیتے رہے۔ کبھی اپنے طیارے لاہور سیکٹر میں اپنی فوج کی مدد کے لیے آتے تھے کبھی بھارت کے طیارے لاہور ریلوے سٹیشن پر اور راوی کے پُلوں پر بم گرانے آتے تھے۔ ہوائی حملے اور آل کلیئر کے سائرن بجتے رہے۔ دن میں تین چار مرتبہ طاہر کو تشنج کا دورہ پڑا لیکن عصمت یا طاہرہ یا طاہر کے چھوٹے بھائی نے آ کر طاہر سے کہا کہ بھارت کا ایک یا دو طیارے گرا لیے گئے ہیں۔ یہ خبر اُس کے لیے ذہنی

سکون دینے والی دوائیوں جیسا اثر کرتی اور اُس کے چہرے پر رونق آجاتی۔ ایک ہی دن میں دشمن کے اتنے طیّارے نہیں گرائے گئے تھے لیکن عصمت نے سب کو بتایا تھا کہ جب طاہر کے کانوں میں پہلی آواز پڑی تھی کہ انڈیا کا ایک طیّارہ گرا لیا گیا ہے تو اُس پر اس کا بڑا اچھا اثر پڑا تھا۔ اب گھر والے اس خبر کو طاہر کے علاج کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

طاہر نے دوپہر کو بھی دوائیاں لے لیں جن کے اثر سے وہ گہری نیند سو گیا اور شام کو اُس کی آنکھ کھلی۔ عصمت کو ماں نے کچھ کہا تو نہیں لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ ماں اپنی بیٹی سے کھچی کھچی سی ہے۔

★

تمام دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں پر موٹے سیاہ کاغذ چڑھا دیے گئے تھے۔ طاہر پرویز اپنے کمرے میں ٹیبل لیمپ جلائے بیٹھا تھا۔ وہ کھانا کھا کر دوائیاں لے چکا تھا۔ طاہرہ اُس کے پاس بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔ طاہر بے خیالی میں اُس کی باتیں سُن رہا تھا۔

"امّی جان!" — طاہر نے کہا — "کل شاید میں نے خواب میں آپ سے کہا تھا کہ آپ میری ماں نہیں ہیں" — طاہر گہری سوچ میں کھو گیا اور بولا — "خواب میں کہا تھا؟ کہیں بیداری میں ہی میں نے ...."

طاہرہ نے اُسے یہ نہ بتایا کہ اُس نے یہ بات بیداری میں کہی تھی اور اُسے یہ بھی نہ بتایا کہ یہ اتنی تیز اور اتنی زیادہ مقدار میں مسکّن دوائیاں کھانے کے اثرات ہیں کہ اُس کا ذہن خواب اور بیداری کو گڈمڈ کر دیتا ہے۔

"نہ طاہری!" — طاہرہ نے بڑے پیار سے کہا — "تم نے خواب میں کچھ کہا ہوگا" — اور طاہرہ ہنس پڑی۔

"امّی جان!" — طاہر نے چھوٹے سے بچّے کی طرح پوچھا — "عصمت مجھے کیوں اچھی لگتی ہے؟"

طاہرہ کھل کر ہنسی۔ اُس نے طاہر کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولی — "اپنے ابّو سے پوچھنا کہ میں اُسے کیوں اچھی لگا کرتی تھی"۔

"یہ بات نہیں امّی جان!" — طاہر نے سنجیدگی سے کہا — "کوئی بات ضرور ہے"۔

اتنے میں عصمت کمرے میں داخل ہوئی۔

"تمہاری عمر بڑی لمبی ہے عصمت بیٹی!" — طاہرہ نے کہا — "طاہری ابھی تمہیں یاد کر رہا تھا" — طاہرہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی — "تم بیٹھو۔ میں چلتی ہوں"۔

طاہرہ کے جانے کے بعد عصمت اور طاہر پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"کیسے ہو؟"

"کوئی بیماری ہو تو بتاؤں کہ پہلے کیسا تھا اور اب کیسا ہوں" — طاہر نے کہا — "کبھی ایسے لگتا ہے جیسے مجھے کہیں اور ہونا چاہیے اور مجھے یہاں قید کر لیا گیا ہے۔ میں کسی اور منزل کا مسافر ہوں، اور کبھی یوں محسوس کرتا ہوں جیسے میرے اندر کوئی حس نہیں، کوئی جذبہ نہیں اور میں چلتی پھرتی لاشوں کے

درمیان ایک لاش کی طرح چل پھر رہا ہوں"۔

"تم جو کچھ بھی محسوس کرتے ہو، اپنوں کو پہچانتے تو ہو نا!" — عصمت نے کہا — "مجھے پہچانتے ہو! امّی کو، ابّو کو ...."

"پہچانتا ہوں" — طاہر نے کہا — "یہ بھی جانتا ہوں کہ میری امّی میرے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھیں اور میں جنہیں اپنی امّی سمجھتا رہا ہوں وہ میری امّی نہیں اور میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے غلط بتایا گیا ہے کہ میری امّی مر گئی تھیں۔ میری امّی یہی ہیں۔ سگی مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں نا، عصمت!"

"یہی تمہاری سگی ماں ہیں طاہری!" — عصمت نے کہا — "ایسی سوچوں میں نہ اُلجھا کرو جن میں تلخی ہو"۔

"کچھ سوچیں ایسی ہیں جن کی تلخیوں سے بھی مجھے پیار ہے" — طاہر نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

اُس کا اٹیچی کیس کمرے میں پڑا تھا۔ اُس نے اٹیچی کیس اُٹھا کر پلنگ پر عصمت کے پاس رکھ دیا اور بیٹھ کر اسے کھولا۔ اس میں سے کپڑے وغیرہ نکال کر پلنگ پر رکھتا گیا۔ عصمت اُس کے کپڑے دیکھتی رہی۔ اُس کی کسی بوشرٹ یا کسی شلوار یا قمیض کی تعریف کر دیتی تھی۔ جب تمام کپڑے وغیرہ باہر آگئے تو طاہر نے وہ خاکی قمیض اور خاکی پتلون اٹیچی کیس میں سے اٹھائی جو سب سے نیچے پڑی تھی۔ طاہر نے یہ دونوں کپڑے بھی اٹیچی کیس سے نکالے لیکن انہیں الگ رکھنے کی بجائے اٹیچی کیس بند کر دیا اور دونوں کپڑوں کی تہہ کھول کر اٹیچی کیس پر عصمت کے سامنے رکھ دیا۔

"ارے طاہری!" — عصمت نے کہا — "یہ اتنی گندی وردی تم نے اٹیچی کیس میں کیوں دبا رکھی ہے! اسے باہر رہنے دو۔ میں دھوبی کو بھجوا دوں گی"۔

"نہ عصمت!" — طاہر نے ہلکی سی آہ بھر کر کہا — "اسے گندہ نہ کہو۔ اس پر جو داغ دھبے ہیں یہ تم جیسی ایک بنگالی لڑکی کا خون ہے"۔

"کون تھی وہ؟" — عصمت نے ایسے پوچھا جیسے اُس کی سسکی نکل گئی ہو۔

"صبیحہ" — طاہر نے جواب دیا اور اُس کی نظریں عصمت کے چہرے پر جم گئیں۔ ذرا سا چپ رہ کے بولا — "میں تمہارے چہرے پر کوئی اور تأثر دیکھ رہا ہوں"۔

"میں نے یہ نام پہلے بھی سنا ہے" — عصمت نے کہا۔

"باجی شازی سے سنا ہوگا" — طاہر نے کہا — "شازی باجی نے، جب وہ ایسٹ پاکستان گئی تھیں، اس لڑکی کو دیکھا تھا .... دیکھا تو سب نے تھا۔ امّی اور ابّو نے بھی۔ صبیحہ کے والدین نے ہم سب کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ صرف شازی باجی تھیں جنہوں نے صبیحہ کو ایک عام لڑکی کے رُوپ میں دیکھا اور مجھے کہا تھا کہ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں۔ شازی باجی نے تمہارا ذکر بھی کیا تھا۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ میں نے ابھی کسی لڑکی کو بیوی کے رُوپ میں تصوّر میں نہیں دیکھا"۔

"پھر تمہارے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا؟" — عصمت نے پوچھا۔

طاہر نے اسے صبیحہ کی پہلی ملاقات سے لے کر صبیحہ کی شہادت تک کی کہانی ایک ایک تفصیل کے ساتھ سنا ڈالی۔

"معلوم نہیں کیوں میں شروع سے ہی محسوس کرتا رہا کہ ہمارا ساتھ جلدی چھوٹ جائے گا"۔۔۔ طاہر نے کہا۔۔۔"ایک وہم سا تھا جو اکثر میرے ذہن میں بیٹھ جاتا تھا کہ بہت جلدی یا میں اس دنیا میں نہیں رہوں گا یا صبیحہ نہیں رہے گی۔ وہ زندہ رہنے والی لڑکی نہیں تھی عصمت!"۔۔۔ طاہر پریشان سا ہو گیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ دماغ پر زور دے کر ایسے الفاظ تلاش کر رہا ہے جو عصمت سمجھ سکے۔۔۔"تم سمجھ رہی ہو نا عصمت! خدا کے لیے میری یہ بات سمجھنے کی کوشش کرنا۔ صبیحہ کو میں پاکستان کی عصمت سمجھتا ہوں۔ اُس کے دل میں میری جو محبت تھی وہ میری نظر میں بنگال اور پنجاب کی محبت تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اُسے ادھر لے آؤں گا اور ہم شادی کر لیں گے"۔

"میرے متعلق تم نے کیا سوچا تھا؟"۔۔۔ عصمت نے لطیف سی مسکراہٹ سے پوچھا۔

"میں تمہیں بھول تو نہیں گیا تھا"۔۔۔ طاہر نے کہا۔۔۔"لیکن میں نے تمہیں اس روپ میں کبھی نہیں دیکھا تھا کہ تم میری بیوی ہو گی۔ بات یہ ہے عصمت! مشرقی پاکستان کے جو حالات تھے وہاں ہم سب کی سوچیں بدل گئی تھیں۔ نوجوانی کے جذبات اور رومانی تصوّرات ذہن سے نکل گئے تھے۔

میں وہاں گیا تو لاشوں نے میرا استقبال کیا۔ ان لاشوں کا قصّہ تمہیں سنا چکا ہوں۔ یہ وہ لوگ تھے جو سیلاب میں ڈوب گئے تھے، اور مجھے اُن لوگوں نے وہاں سے رخصت کیا جو اپنے خون میں ڈوبے ہوتے تھے۔ وہاں محبّت کی نہیں موت کی حکمرانی تھی۔ صبیحہ مجھے ملا کرتی تھی اور ہم صرف پاکستان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ میں نے یہ وردی اِس لیے اُسی حالت میں سنبھال کر نہیں رکھی ہوئی کہ اس پر اُس لڑکی کا خون ہے جسے میں چاہتا تھا.... نہیں عصمت! یہ خون پاکستان کی عصمت کی علامت ہے اور یہ خاکی وردی پاکستان کی غیرت ہے، پاکستان کا وقار ہے"۔۔۔ طاہر نے بے چین سا ہو کر عصمت سے پوچھا۔۔۔"تم سمجھ گئی ہو نا عصمت؟ خدا کے لیے سمجھ جانا"۔

عصمت ذہین لڑکی تھی۔ اپنی ماں کی نسبت وہ طاہرہ سے زیادہ متاثر تھی۔ طاہرہ اُسے پاکستان کی عظمت کی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ صبیحہ کے ساتھ طاہر کا کیا تعلق تھا۔

"عصمت!"۔۔۔ دروازے میں سے آواز آئی۔

طاہر اور عصمت نے چونک کر کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ عصمت کی ماں کھڑی تھی۔ اُس کے ماتھے پر خفگی کے شکن تھے۔

"سونا نہیں ہے آج؟"۔۔۔ ماں نے عصمت سے کہا۔۔۔"چلو اُٹھو"۔

"آتی ہوں امّی"۔۔۔ عصمت نے قدرے بے رخی سے کہا۔۔۔"آپ چلیں"۔

ماں کے ماتھے کے شکن گہرے ہو گئے۔ اُس نے پہلے عصمت کو پھر طاہر کو گھورا اور چلی گئی۔

"تین دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام جنرل یحییٰ خان نے ہمیں کرسمس کا وہ تحفہ دیا جس کا ہم بے تابی سے انتظار کر رہے تھے"۔

یہ الفاظ انڈین آرمی کی ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے ہیں جو اُس نے المیۂ مشرقی پاکستان کے بعد ایک انٹرویو میں کہے تھے۔ اُس نے کہا تھا کہ اندرا گاندھی نے ہمیں حکم دے دیا تھا کہ ذرا سا بھی بہانہ مِل جائے تو ہر طرف سے مشرقی پاکستان پر آرمی، نیوی اور ایئر فورس سے حملہ کر دو۔

بھارتیوں کو حملہ کرنے کا کوئی جواز نہیں مِل رہا تھا۔ مغربی پاکستان کے فوجی صدر جنرل یحییٰ خان اور اُس کے مشیروں نے دیکھا کہ مشرقی پاکستان میں اپنی فوج اس طرح بکھر گئی ہے کہ اب باہر کا حملہ روکنے کے قابل نہیں رہی اور اُسے کمک بھی نہیں پہنچائی جا سکتی تو اُنھوں نے مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کر دیا۔ یہ صحیح تھا کہ دفاعی پلان کے مطابق مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کرنا تھا لیکن یہ حملہ جو تین دسمبر کی شام کیا گیا، کم از کم آٹھ ماہ پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ اب تو ہمارا دشمن اس انتظار میں تھا کہ مغربی پاکستان سے اُس کے ساتھ ہلکی سی سرحدی چھیڑ چھاڑ بھی ہو جائے تو وہ اُسے کھلی جنگ کہہ کر مشرقی پاکستان پر حملہ کر دے۔

کلکتہ کے فورٹ ولیم میں جو انڈین آرمی کی ایسٹرن کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر تھا، ہیجانی اور اضطراری کیفیّت طاری تھی۔ جرنیلوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"پاکستانی اتنے بیوقوف نہیں کہ وہ مشرقی پاکستان کی صورتِ حال اور اپنی فوج کی کیفیّت کو دیکھتے ہوئے بھی مغربی پاکستان سے حملہ کریں گے"۔

"اور وہ کریں گے بھی کیا! ایسٹ پاکستان تو اُن کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ہمیں اب ڈھاکہ جا کر اس ملک کا چارج لینا ہے"۔

"نہیں نہیں۔ پاکستانی اتنے احمق نہیں۔ وہ ویسٹ سے حملہ نہیں کریں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ انڈین فورسز دونوں محاذوں پر آسانی سے لڑ سکتی ہیں۔

"میرا قیاس کچھ اور ہے۔ پاکستان کی حکومت جرنیلوں کے ہاتھ میں ہے۔ جرنیل سیاستدان نہیں ہوتے۔ فوجی وردی پہن کر ہم لوگ کارروائی کے جواب میں جوابی کارروائی کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ کوئی بعید نہیں کہ اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے جرنیل حملے کا حکم دے ہی دیں"۔

"دے ہی دیں تو اچھا ہے..... اب تو ہمیں بہانہ چاہیئے"۔

"اپنی قوم کو خوش کرنے کے لیے فوجی حکمران یہ حماقت ضرور کریں گے"۔

اور ہمارے جرنیل بادشاہوں نے یہ حماقت کر ہی ڈالی جس کی دعائیں بھارتی ایسٹرن کمانڈ کے جرنیل مانگ رہے تھے۔ نتائج سے بے خبر ہماری ہائی کمانڈ نے تین دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام

مغربی پاکستان سے حملہ کر دیا۔ حملے کی ابتدا، پاک فضائیہ کے بمباروں سے کرائی گئی جنہوں نے پہلی اڑان میں ہی بھارت کے آٹھ بڑے ہوائی اڈوں پر جا کر بمباری کی۔ بھارت کے دوسرے ہوائی اڈوں پر بھی اُس رات بمباری کی گئی۔ بظاہر یہ ایک دلیرانہ اقدام تھا لیکن اس کے پیچھے وہ جذبہ نہ تھا جو جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء میں کارفرما تھا۔

ہوائی حملوں کے ساتھ ہی پاک فوج نے بھی حملہ کر دیا۔ بھارت نے اس طرف کا دفاع مضبُوط رکھا ہُوا تھا۔ اُس کے پاس بے پناہ فوج تھی۔ پاک فوج کے افسروں اور جوانوں میں تو وہی جذبہ اور وہی جوش و خروش تھا جو ہونا چاہیئے تھا لیکن اُن کی لگام اُن سیاسی جرنیلوں کے ہاتھ میں تھی جو اس جذبے اور جوش و خروش سے عاری تھے۔ پاک فوج سمجھ نہ سکی کہ اس کے خون سے ایک سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ رات بارہ بجے تک ہمارے ٹروپس کئی جگہوں پر دشمن کے علاقے میں خاصے آگے نکل گئے تھے لیکن اُن کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ وہ اس سے آگے بڑھ نہ سکے۔ دشمن اسلحہ بارود اور نفری کی افراط کے باوجُود قلیل تعداد پاک فوج کے اِس غضب ناک حملے کی تاب نہ لا سکا اور پیچھے ہٹ گیا مگر صبح تک ہمارے ڈویژن کمانڈر جنہوں نے حملہ کیا تھا، جان گئے کہ یہ معاملہ سیاسی طور پر کچھ اور ہے۔ اُنہوں نے اور آگے بڑھنے کی بجائے جہاں جہاں تک پہنچے تھے وہیں مورچے کھود لیے۔

افسروں اور جوانوں نے جان کی بازی لگا دی تھی۔ انہیں پُورا پُورا احساس تھا کہ وہ اپنے اُن بھائیوں کی خاطر لڑ رہے ہیں جو مشرقی پاکستان میں دشمن کے محاصرے میں آئے ہُوئے ہیں لیکن پاکستان کے ان جانبازوں کی قربانیاں رائیگاں جا رہی تھیں۔ اس حملے کی داستان بڑی لمبی ہے۔ اسے صرف ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ حسینی والا سیکٹر میں تھوڑے سے وقت میں لیفٹیننٹ سے لیفٹیننٹ کرنل تک پانچ افسر شہید ہو گئے۔ اُنہوں نے جانوں کے نذرانے دے کر دشمن کا وہ دفاع توڑا تھا جسے وہ ناقابلِ تسخیر سمجھتا تھا۔ دشمن اتنا مضبوط دفاع چھوڑ کر دریائے ستلج کے پار بھاگ گیا۔

جرأت اور شجاعت کی ایسی مثالیں اپنے ہر محاذ پر ملتی ہیں لیکن ہائی کمانڈ سے ایسے احکام جا رہے تھے جیسے ہمارے ٹروپس کو پابجولاں کر دیا گیا ہو۔ پاک فوج کو پاک فضائیہ کی سپورٹ نہیں ملتی تھی۔ توپ خانے کا ایمونیشن ضرورت کے مطابق بروقت نہیں پہنچتا تھا۔ بالائی حلقوں کی اس بے رُخی نے ٹروپس میں بددلی پھیلا دی۔

انڈین ایئر فورس کے طیّارے پاکستان کی فضا میں اور پاکستانی مورچوں کے اُوپر دندناتے پھرتے تھے بعض اوقات ایسے لگتا تھا جیسے انہیں روکنے والا کوئی نہیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہمارے طیّارے بھارت کے ہوائی اڈوں پر پہلے روز ہی تباہی پھیلا آئے تھے اور چھ سات دنوں میں ہی پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے انڈین ایئر فورس کے طیّاروں کو نہ صرف پاکستان کی فضا سے بلکہ بھارت کے آسمانوں سے بھی بیدخل کر دیا تھا مگر ۱۹۷۱ء میں ہمارے شاہباز بھارت کے ہوائی اڈوں پر حملے کرنے جاتے تھے تو وہاں انہیں زمین پر کوئی طیّارہ نظر نہیں آتا تھا۔ دشمن

نے اپنے طیّارے ہر ایک ہوائی اڈے پر بکھیر کر اور کنکریٹ کے بَین بنا کر ان میں چھپا کر رکھے ہُوئے تھے۔

ایک وہ جنگ تھی جو انہی محاذوں پر ستمبر ۱۹۶۵ء میں لڑی گئی تھی۔ قوم کا بچّہ بچّہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اس جنگ میں شریک ہے۔ ایک یہ جنگ تھی جو دسمبر ۱۹۷۱ء میں لڑی جا رہی تھی۔ قوم نمایاں طور پر محسوس کر رہی تھی کہ اُسے اس جنگ سے بے تعلق اور بے خبر رکھا جا رہا ہے دشمن کی کیفیت یہ تھی کہ اُس نے اپنی ستمبر ۱۹۶۵ء والی خامیوں کو خوبیوں میں بدل لیا تھا۔ اِدھر ہماری خوبیاں خامیاں بن گئی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستانی قوم اور فوج کے ذہن میں جنگ کا مقصد واضح تھا لیکن دسمبر ۱۹۷۱ء میں بھارتیوں کے ذہن میں بڑا صاف مقصد تھا۔

لاہور میں طاہر پرویز کی ذہنی کیفیّت یہ رہی کہ جب وہ طیّاروں کے زنّاٹے اور گھن گرج سُنتا تھا تو اُس پر تشنّج کا دورہ سا پڑ جاتا تھا جس کا علاج اُس کے گھر والے یہ کرتے تھے کہ اُسے ویسے ہی یہ خبر سنا دیتے تھے کہ آج انڈین ایئر فورس کے دو یا تین طیّارے گرا لیے گئے ہیں اُسے محاذوں کی ایسی خبریں سنائی جاتی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ پاک فوج دلّی سے تھوڑی ہی دُور رہ گئی ہے۔ عصمت سکول کالج بند ہونے کی وجہ سے گھر رہتی تھی اور اُس کا زیادہ تر وقت طاہر کے ساتھ گزرتا تھا۔ گھر میں صرف ایک فرد تھا جس کے ماتھے کے تشکن گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ وہ عصمت کی ماں تھی۔ عصمت کے باپ نے ایسا رویّہ اختیار کر لیا تھا کہ عصمت کی ماں کو بولنے کی یا عصمت کو ٹوکنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ماں بیٹی میں ناراضگی کی سی کیفیّت پیدا ہو گئی تھی۔

"عصمت بیٹی!" — ایک روز طاہرہ نے عصمت کو الگ بٹھا کر کہا — "تم ابھی بچّی ہو۔ میں بھی تمھاری عمر میں رہ چکی ہوں۔ میں تم سے زیادہ خود سر ہُوا کرتی تھی لیکن میری بات اور تھی۔ میرے آگے پیچھے کوئی بھی نہ تھا۔ میں ایک صحرا میں چلی جا رہی تھی۔ میرے سامنے کوئی دیوار نہ تھی لیکن بیٹی! تمھاری بات کچھ اور ہے..... اپنی ماں کو ناراض نہ کرو۔"

"چاچی جان!" — عصمت نے پختہ سے لہجے میں پوچھا — "میری امّی نے آپ سے کچھ کہا ہے؟"

"ہر بات زبان سے نہیں کہی جاتی عصمت!" — طاہرہ نے آہ بھر کر کہا — "بعض باتیں دوسروں کے چہروں پر صاف پڑھی جاتی ہیں.... میرا طاہر پاگل ہو گیا ہے۔ تمھاری امّی یہی کہنا چاہتی ہے۔ تم تو طاہر کے پاس بیٹھی ہوتی ہو اور میں تمھاری امی کا چہرہ اور اُس کی بے چینی اور خفگی اُس کی حرکتوں سے دیکھتی رہتی ہوں۔ تمھارے پیدا ہونے سے پہلے اس گھر میں ایک حادثہ ہو چکا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس گھر کی تاریخ اپنے آپ کو دُہرائے۔"

"چاچی جان!" — عصمت نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا — "اگر آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میں طاہر کے پاس نہ بیٹھا کروں تو آپ اپنے بیٹے پر ظلم کر رہی ہیں۔"

"لیکن بیٹی!" — طاہرہ نے کہا — "میں تمھاری امی کو تمھارے خلاف کر کے تم پر ظلم نہیں

کرنا چاہتی۔ میں یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری امّی اور تمھارے ابّو کے درمیان بھی خفگی سی پائی جاتی ہے۔"

"ابُو مجھے اسی لیے تو اچھے لگتے ہیں"۔۔۔ عصمت نے کہا ۔۔۔ "وہ مجھے کہہ چکے ہیں کہ طاہر کا خیال رکھا کرو۔ انہوں نے تو امی کو ڈانٹا بھی ہے۔ کل کی بات ہے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی سن رہی تھی۔ ابّو امّی سے کہہ رہے تھے کہ تم بھی بیٹوں والی ہو۔ کسی کے بیٹے کو پاگل نہ کہو اور اُسے پاگل سمجھ کر اُس سے نفرت نہ کرو۔ بیٹے خدا دیتا ہے اور وہ چاہے تو واپس بھی لے لیتا ہے۔"

"یہی تو مجھے ڈر آتا ہے"۔۔۔ طاہرہ نے کہا ۔۔۔ "کہ اس گھر کی فضا میں پھر وہی کھچاؤ اور تکدّر پیدا ہو گیا ہے جو تمھاری اور طاہر کی پیدائش سے پہلے پیدا ہُوا تھا۔ میں تمھاری امّی کے اشارے سمجھتی ہُوں۔ وہ دو تین مرتبہ مجھے کسی ڈی۔ ایس۔ پی کے بیٹے کی باتیں سُنا چکی ہیں حالانکہ اُس لڑکے کے ذکر کا کوئی موقع اور محل نہ تھا۔ تمھاری امی دراصل کہنا یہ چاہتی تھی کہ طاہر پاگل ہے۔"

"چاچی جان!"۔۔۔ عصمت نے دو ٹوک لہجے میں کہا ۔۔۔ "میں نے ابھی تک یہ بات کسی سے کہی نہیں، میں آپ سے کہتی ہوں کہ کسی نے مجھے طاہر کے پاس بیٹھنے سے اس لیے روکا کہ وہ پاگل ہے تو میں بھی پاگل بن کر دکھا دوں گی۔ آپ میری طبیعت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ خوبی ہے یا خامی، یہ مجھ میں آپ ہی نے پیدا کی ہے۔ مجھے جرأت آپ نے دی ہے۔ آپ تو اس گھر سے اکیلی نکلی تھیں، میں طاہر کو لے کر نکل جاؤں گی۔"

"ہوش میں آؤ عصمت!"

"میں ہوش میں ہوں چاچی جان!"۔۔۔ عصمت نے کہا ۔۔۔ "میں اپنی اور طاہر کی زندگی کا فیصلہ کر چکی ہُوں۔ اگر طاہر مجھے دُھتکار دیتا ہے تو میں کہہ نہیں سکتی کہ میرا ردِّ عمل کیا ہو گا.... چاچی جان! ستمبر ۱۹۶۵ء میں مَیں چھوٹی سی تھی۔ پھر بھی میرا سارا سارا دن کسی ہسپتال میں یا ریڈ کراس کے دفتر میں گزرتا تھا۔ اب تو میں جوان ہوں۔ مجھے اس وقت کسی فوجی ہسپتال میں محاذ کے زخمیوں کے پاس ہونا چاہیے، مجھے اپنے ملک اور اپنے ملک کی فوج کے لیے کچھ کرنا چاہیے لیکن میں سارا وقت طاہر کو دے رہی ہوں۔ اسے کوئی محبت کہہ لے، نیکی کہہ لے، جہاد کہہ لے، میں طاہر کو اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ میں اسے سنبھال سکتی ہوں اور اسے نارمل حالت میں لے آتی ہوں۔ وہ جو باتیں میرے ساتھ کر لیتا ہے وہ آپ کے ساتھ اور اپنے ابُو کے ساتھ نہیں کر سکتا۔"

"میں یہ سب کچھ سمجھتے ہُوئے تمھیں کہنا چاہتی ہوں کہ اپنی امی کو ناراض نہ کرو"۔۔۔ طاہرہ نے کہا ۔۔۔ "ماں کا درجہ بہرحال بلند ہے۔"

"لیکن چاچی جان!"۔۔۔ عصمت نے کہا ۔۔۔ "میں اپنی امّی کا یہ حکم کبھی نہیں مانوں گی کہ کسی ڈی۔ ایس۔ پی کے بیٹے کی بیوی بن جاؤں۔ مجھے تھانیدارنی بننے کا ذرا سا بھی شوق نہیں۔"

طاہرہ ہنس پڑی۔ اس کے ساتھ ہی عصمت کی سنجیدگی بھی اُس کی اپنی ہنسی میں ختم ہو گئی لیکن

ان دونوں کی ہنسی سے وہ تکدّر دُور نہیں ہو سکتا تھا جو عصمت کی ماں نے پیدا کر دیا تھا۔

"ارشد!"۔۔۔ اُس کے بڑے بھائی یوسف نے جنگ کی تیسری رات اُسے اپنے کمرے میں بلا کر کہا ۔۔۔ "طاہر کے متعلق تم نے کیا سوچا ہے؟ کل شام اسے رجمنٹل سنٹر کو روانہ ہو جانا چاہیے لیکن میں اسے اکیلا جانے کے قابل نہیں سمجھتا۔"

"میں ساتھ چلا جاؤں؟"۔۔۔ ارشد نے پوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ یوسف نے کہا ۔۔۔ "میں نے کچھ اور سوچا ہے۔ کل راولپنڈی میجر عظمت کو فون کریں گے۔ میں اُسے بتانا چاہتا ہوں کہ طاہر کی ذہنی کیفیت جنگ کی وجہ سے غیر یقینی سی ہو گئی ہے۔ میں اُسے بتاؤں گا کہ لاہور کی فضا سے طیّارے گزرتے رہتے ہیں اور انڈیا کے طیّارے کبھی ریلوے سٹیشن پر اور کبھی راوی کے پلوں پر بمباری کرنے آتے ہیں۔ ہمارا گھر سٹیشن اور راوی کے درمیان ہے۔ بموں کے دھماکے بھی سنائی دیتے ہیں اور طیّارہ شکن گنوں کی آوازیں بھی بڑی صاف آتی ہیں۔ طاہر پر ان کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دوائیوں کے باوجود اس کا خون اس قدر جوش میں آجاتا ہے کہ اس کا جسم اکڑ جاتا ہے اور وہ محاذ پر پہنچنے کے لیے اُٹھ دوڑتا ہے۔"

"اور یہ بھی بتائیں گے"۔۔۔ ارشد نے کہا ۔۔۔ "کہ ہم یہ خبر سنا کر کہ انڈیا کے دو تین طیارے گرا لیے گئے ہیں یا یہ کہ اپنی فوج سرحدوں سے دُور آگے نکل گئی ہے، اسے نارمل حالت میں لے آتے ہیں۔"

"اور ارشد!"۔۔۔ یوسف نے کہا ۔۔۔ "میجر عظمت سائیکاٹرسٹ ہے۔ میں اُسے صاف الفاظ میں بتاؤں گا کہ میری بچی کا جو تقریباً طاہر کی ہم عمر ہے، اُس پر ایسا اثر ہے کہ وہ اسے سنبھالے رکھتی ہے۔ میں ایسی بات میں کوئی جھجک محسوس نہیں کروں گا۔ اپنے بچّوں کا معاملہ ہے۔"

"بھائی جان!"۔۔۔ ارشد نے دبی سی آواز میں کہا ۔۔۔ "ڈاکٹر عظمت کو ہم یہ بات کہہ تو دیں گے لیکن کیا آپ نے محسوس نہیں کیا کہ عصمت جب طاہر کے پاس بیٹھی ہوتی ہے تو بھابی جان کی ذہنی کیفیّت ٹھیک نہیں رہتی۔ طاہرہ بھی اس معاملے میں کچھ پریشان ہے۔"

یوسف نے ایک لمبی آہ بھری اور کچھ دیر خاموش رہا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں۔

"میں اس عورت کو سنبھال لوں گا"۔۔۔ یوسف نے کہا ۔۔۔ "مجھے وہ وقت یاد ہے جب ایسی ہی فضا میں طاہرہ گھر سے نکلی تھی.... خدا کی قسم ارشد! میں آج بھی طاہرہ سے شرمسار ہُوں۔ عفّت بیچاری کے ذہن پر کچھ الٹا اثر ہُوا اور اس اثر کو ہماری امّی مرحومہ نے اور عصمت کی ماں نے اور زیادہ مضبُوط کیا۔ میں ایسا حادثہ اب نہیں ہونے دوں گا۔"

دونوں اٹھے اور طاہر کے کمرے میں گئے۔ طاہرہ طاہر کے پاس بیٹھی تھی اور طاہر گہری نیند سویا ہُوا تھا۔

اگلے روز ارشد نے راولپنڈی فوجی ہسپتال میں فون کیا اور میجر عظمت اسے فون پر مل گیا۔

ارشد نے اُسے طاہر کی مفصّل رپورٹ دی۔ میجر عظمت نے پہلے تو یہ کہا کہ طاہر کو واپس راولپنڈی اُس کے پاس لے آئیں لیکن اُس نے عصمت کے متعلق سن کر اپنا فیصلہ بدل دیا اور ارشد سے کئی ایک سوال پوچھے۔ ارشد نے اُسے بتایا کہ عصمت اور طاہر کا روحانی سا لگاؤ ہے اور دونوں میں قومی جذبہ بڑا ہی مضبوط ہے۔ میجر عظمت نے ارشد سے کہا کہ طاہر کو وہ گھر ہی رہنے دے اور میجر عظمت اس کے لیے مزید چھٹی منظور کر کے سرکاری طور پر سب کو اطلاع دے دے گا جس میں طاہر کا رجمنٹل سنٹر بھی شامل ہوگا۔ میجر عظمت نے طاہر کو ایک مہینے کی چھٹی دے دی اور ارشد کو دیگر ہدایات کے ساتھ یہ بھی کہا کہ لڑکے پر گہری نظر رکھے۔ اگر اُس میں کوئی خطرناک تبدیلی دیکھے تو اُسے پنڈی لے آتے اور اگر تبدیلی بہتر ہو تو اُسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کرے۔

"آپ نے قومی جذبے کی بات کی ہے مسٹر ارشد!" ——میجر عظمت نے کہا —— "میں سائیکاٹرسٹ ہوں۔ میں جذبوں کو کسی اور رنگ میں دیکھا کرتا ہوں۔ لڑکا جوان ہے۔ قومی جذبے کے ساتھ کچھ جذبے اور بھی ہوتے ہیں۔ لڑکے نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ اب اُسے یہ دھچکا پڑا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عصمت ایک علامت کا کام کرے گی۔ آپ شاید سمجھ نہ سکیں کہ علامت سے میری مراد کیا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ لڑکی طاہر کی روح کے زخموں کے لیے مرہم کا کام دے گی لیکن یہ ذرا بعد کی بات ہے۔ ابھی آپ لڑکے کو اپنے پاس رکھیں۔"

"ڈاکٹر صاحب!" —— ارشد نے دکھی ہوئی سی آواز میں کہا —— "کم از کم مجھے بتا دیں کہ طاہر کے ٹھیک ہونے کا کتنا کچھ امکان ہے.... میں بہت پریشان ہوں ڈاکٹر صاحب!"

"وقت لگے گا مسٹر ارشد!" —— میجر عظمت نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا —— "آپ کا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔ البتہ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ ڈاکٹر اس قسم کے کیس کو مینٹل ہاسپٹل بھیج دیا کرتے ہیں لیکن میں اتنے ذہین اور ایسے محبِّ وطن نوجوان کو ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ اسے میں زندگی کی حقیقی راہ پر لے آؤں گا۔ میں آپ کو تقریباً ہر احتیاط بتا چکا ہوں۔ انتہائی ضروری احتیاط یہ ہے کہ بچّے کو یہ احساس نہ دلائیں کہ اُس میں کوئی ذہنی نقص پیدا ہو گیا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب!" —— ارشد نے کہا —— "طاہر تو یہ توقع لیے بیٹھا ہے کہ وہ اپنے رجمنٹل سنٹر میں جا رہا ہے۔ اب میں اُسے کیا بتاؤں کہ اُسے مزید چھٹی کیوں دے دی گئی ہے۔"

"اُسے کہنا میجر عظمت کا فون آیا تھا" —— میجر عظمت نے کہا —— "انہوں نے کہا ہے کہ پہلے بات کچھ اور تھی، اب جنگ شروع ہو گئی ہے اس لیے تمہیں سیدھا محاذ پر بھیجا جائے گا لیکن پندرہ دنوں بعد تمہیں آخری معائنے کے لیے راولپنڈی آنا پڑے گا.... آپ اُسے یہ کہہ دیں، وہ خوش ہو جائے گا۔"

شام کو ارشد نے گھر آ کر طاہر کو یہی بتایا کہ میجر عظمت کا فون آیا تھا اور انہوں نے آرام کا وقفہ بڑھا دیا ہے اور پندرہ دنوں بعد اُسے راولپنڈی جانا پڑے گا، وہاں سے اُسے سیدھا محاذ پر بھیج دیا جائے گا۔

"ابو!" —— طاہر نے کہا —— "پندرہ دن تو بہت زیادہ وقت ہے۔ آپ مجھے ابھی کیوں نہیں جانے دیتے؟"

"بیٹا!" —— ارشد نے کہا —— "ڈاکٹر ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ تم اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھو۔"

طاہر خاموش ہو گیا اور خلا میں گھورنے لگا۔ اُس نے زیرِ لب کہا —— "معلوم نہیں ایسٹ پاکستان کا کیا حال ہے۔"

***

ایسٹ پاکستان کا حال وہی تھا جو جاں بلب مریض کا ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان سے جوں ہی پاک فضائیہ اور فوج نے حملہ کیا بھارت کی تین کوروں نے جو مشرقی پاکستان کو پہلے ہی محاصرے میں لیے ہوئے تھیں، پوری شدت سے یلغار کر دی۔ انڈین ایئر فورس کے دس سکواڈرن جن میں جدید لڑاکا بمبار طیّارے تھے، مشرقی محاذ کے قریب قریب ہوائی اڈوں پر بالکل تیار حکم کے منتظر تھے۔ انہیں ٹارگیٹ پہلے ہی بتا دیئے گئے تھے۔ حکم ملتے ہی وہ اپنے ہوائی اڈوں سے اڑے اور اپنے اپنے ٹارگیٹ پر جا گرجے۔ ان کا سب سے زیادہ اہم اور پاکستان کے لیے بے حد نازک مقام ڈھاکہ کا ہوائی اڈہ تھا۔

ڈھاکہ مشرقی پاکستان میں ہمارا واحد فوجی اڈہ تھا۔ دشمن کے دس سکواڈرنوں کے مقابلے میں پاک فضائیہ کا صرف ایک سکواڈرن ڈھاکہ میں مقیم تھا جس کے پاس صرف سولہ طیّارے تھے، وہ بھی قدیم سیبر طیّارے تھے جو روسی طیّاروں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھے لیکن پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے دشمن کے اتنے ہیبت ناک فضائی بیڑے سے مرعوب ہونے کی بجائے اس اصول کو اپنا ایمان بنا لیا کہ طیّارہ نہیں طیّارے میں بیٹھا ہوا باز لڑا کرتا ہے۔ پاک فضائیہ کے شاہباز اللّٰہ کا نام لے کر فضا میں پہنچ گئے۔ زمین سے پاک فوج کے طیّارہ شکن توپچیوں نے ڈھاکہ کی فضا کو آگ سے بھر دیا۔ ڈھاکہ کی فضا میں بڑے ہی تیز اور خونریز فضائی معرکے لڑے جانے لگے۔ فضائی معرکے میں صرف ہوا باز لڑتے ہیں۔ زمین سے طیّارہ شکن گنوں کا فائر روک لیا جاتا ہے تاکہ اپنا کوئی ہوا باز زد میں نہ آ جائے لیکن ڈھاکہ کی فضائی جنگ زندگی اور موت کا معرکہ تھا۔ دشمن کے پاس اتنے زیادہ طیّارے تھے جن میں پاک فضائیہ کے طیّارے نظر ہی نہیں آتے تھے۔ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے کو ہر قیمت پر بچانا تھا۔ ان حالات میں یہ خطرہ مول لیا گیا کہ فضائی معرکے کے دوران زمینی توپچی بھی دشمن کے طیّاروں پر فائر کرتے رہے۔

غیر ملکی نامہ نگار اور جنگی مبصر ڈھاکہ کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کی چھت پر کھڑے یہ فضائی معرکے دیکھ رہے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مٹھی بھر پاکستانی ہوا باز سیبر جیسے سُست رفتار اور پرانے طیّاروں سے یوں لڑیں گے کہ انڈین ایئر فورس کے جدید طیّارے ایک دوسرے کے پیچھے جل جل کر گرتے چلے جائیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے فضائی معرکوں کی تاریخ میں ایسی مثال قائم کر دی جس نے اقوامِ عالم کو انگشت بدنداں کر دیا۔

دشمن کے کچھ طیّارے طیّارہ شکن توپچیوں نے گرا لیے لیکن دشمن کے پاس تباہ کرانے کے لیے بیشمار طیّارے تھے اور اُس کے پاس روس کے بنے ہوئے وہ بم تھے جو ہوائی اڈوں کے رن وے کو تباہ کرنے کے لیے پھینکے جاتے ہیں۔ ایسا ایک بم زمین پر گر کر جب پھٹتا ہے

توکئی حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ یہ حصے جہاں جہاں گرتے اور پھٹتے ہیں وہاں گہرے گڑھے بن جاتے ہیں۔ دشمن نے ڈھاکہ کے ہوائی اڈے کو بیکار کرنے کے لیے یہ بم گرانے شروع کر دیئے۔

ڈھاکہ کی فضا میں مسلسل تین دن معرکے لڑے جاتے رہے۔ فضا میں طیارہ شکن گنوں کے گولے اور طیّارے پھٹتے رہے۔ تیسرے دن کی شام تک ڈھاکہ کے ہوائی اڈے کے رن وے طیّاروں کو اڑانے اور اتارنے کے لیے بیکار ہو چکے تھے۔ رن وے کے علاوہ جتنا بھی میدان تھا وہ گڑھوں سے بھر گیا تھا۔ پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے یہ خطرہ بھی مول لیا کہ جہاں کافی میدان ہموار مل جاتے، اُسی سے طیّارے اڑائیں اور اتاریں لیکن کوئی بھی جگہ گڑھوں سے خالی نہیں رہ گئی تھی۔ اب کوئی طیّارہ اڑایا یا اتارا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ ایسی مجبوری تھی کہ شاہباز بے بس ہو گئے۔

اتنے شدید اور خونریز فضائی معرکوں میں پاک فضائیہ کے سولہ طیّاروں میں سے صرف پانچ گرے جن میں سے ایک اپنے ہی زمینی توپچیوں کی زد میں آ گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں دشمن کا نقصان دس گنا سے بھی زیادہ تھا۔ کچھ دنوں بعد جب شکست صاف نظر آنے لگی تو باقی ماندہ گیارہ طیّاروں کو اپنے شاہبازوں نے اپنے ہاتھوں تباہ کر دیا تاکہ یہ دشمن کے کام نہ آ سکیں اس طرح پاک فضائیہ کا یہ واحد لڑاکا سکواڈرن بالکل صاف ہو گیا۔ اس نقصان کی زد پاک فوج پر بھی پڑی کیونکہ پاک فوج فضائیہ کی مدد سے محروم ہو گئی تھی۔ مشرقی پاکستان کی پوری فضا انڈین ایئر فورس کے ہاتھ تھی۔

پاک بحریہ کی کیفیّت اور زیادہ دگرگوں تھی۔ چٹاگانگ کی بندرگاہ میں پاک بحریہ کی دو تین گن بوٹیں تھیں یا ایک آدھ جنگی بحری جہاز تھا۔ انڈین نیوی پوری طاقت سے آئی۔ اس میں طیّارہ بردار بحری جہاز "وکرانت" بھی شامل تھا۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے چٹاگانگ کی بندرگاہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ پاک بحریہ کے جانبازوں نے یہ کمال کر دکھایا کہ وہ گن بوٹوں کو جان کی بازی لگا کر وہاں سے نکال لائے اور بڑی ہی کٹھن اور بے حد خطرناک ہزاروں میل کی سمندری مسافت طے کر کے کراچی پہنچ گئے۔

پاک فوج محض جذبے کے زور پر لڑ رہی تھی۔ تین تھکے ہوئے ڈویژن جن کی نفری کھلی جنگ سے پہلے ہی زخمیوں اور شہیدوں کی وجہ سے کم ہو گئی تھی، بارہ تازہ دم ڈویژنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ مقابلہ کر رہے تھے۔ ڈویژنوں کے حساب سے مقابلہ ایک اور چار کا تھا لیکن نفری اور جنگی قوت کے لحاظ سے مقابلہ ایک اور پندرہ کا تھا۔ بعد میں دشمن نے اعتراف کیا کہ پاکستان کے ان سرفروشوں نے جہاں قدم جما لیے وہاں سے اُن کی لاشیں ہی اٹھائی گئیں۔ اتنی کم نفری کا نقصان یہ تھا کہ پاک فوج کی پوزیشنوں کے درمیان میلوں خالی جگہ تھی۔ انڈین آرمی ان خالی جگہوں سے بے دھڑک آگے نکلتی گئی۔ دشمن اپنے اس حملے پر فخر نہیں کر سکتا۔ جس طرح دشمن کے ڈویژن مسلح تھے اور جس طرح انہیں لڑاکا بمبار طیّاروں کی مدد بھی حاصل تھی، اس طرح اگر پاکستان کے صرف چار ڈویژن مسلح ہوتے اور انہیں اپنے طیّاروں کی مدد حاصل ہوتی تو وہ بارہ ڈویژنوں کا حملہ روک سکتے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے صرف پانچ ڈویژنوں نے کم و بیش اکیس ڈویژنوں کا حملہ روکا تھا۔

پاک فوج ٹینکوں اور توپوں سے بھی محروم تھی۔ انڈین آرمی کے پاس روس کے وہ ٹینک بھی تھے جو خشکی پر چلتے چلتے ندی یا جھیل آ جائے تو اس میں سے تیر کر گزر جاتے ہیں۔ انڈین آرمی کے پاس اتنے ہیلی کاپٹر تھے کہ وہ جہاں چاہتی اپنے ٹروپس اتار سکتی تھی۔

پاک فوج کی پیٹھ پر بھی دشمن تھا۔ یہ تھی مکتی باہنی اور انڈین آرمی کی کمانڈو فورس جو پہلے ہی مشرقی پاکستان میں موجود تھی۔ اس طرح پاک فوج پر بیک وقت دو حملے ہو رہے تھے سامنے سے بھی عقب سے بھی۔ پاک فوج کا پٹرول یا ایمونیشن کا کوئی ذخیرہ سلامت نہیں رہ گیا تھا ندیوں کے پُل مکتی باہنی اور گوریلوں نے اڑا دیئے تھے۔ صرف وہ پُل قائم تھے جن پر دشمن کا قبضہ تھا۔ پاک فوج پہلے ہی ضروری سازوسامان اور رسد سے محروم تھی۔ اب ایمونیشن سے بھی محروم ہونے لگی۔ آپس کے رابطے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ صرف وائرلیس رابطے کا ایک ذریعہ رہ گیا تھا۔

جنگی مبصّروں کا کہنا ہے کہ پاکستان کی ہی فوج تھی جس نے اتنی بے مایگی اور کم نفری سے دو ہفتے جنگ لڑی۔ انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل مانک شا نے برملا تسلیم کیا تھا کہ انڈین آرمی کے تیس ہزار افسر اور جوان پہلے چند دنوں میں ہی ہلاک ہو گئے تھے۔

میجر اصغر بائیس جوانوں کی پارٹی کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ دو حوالدار، دو نائیک اور باقی سپاہی تھے۔ وہ جنگل تھا۔ چھوٹی بڑی ٹیکریاں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک پگڈنڈی گزرتی تھی۔ اصغر کی کمپنی کی پوزیشن قریب ہی تھی۔ اُس کی بٹالین کی ایک کمپنی ڈیڑھ پونے دو میل دائیں اور اتنی ہی دُور ایک اور کمپنی مورچہ بند تھی۔ ان کے درمیان جو خالی جگہیں تھیں، وہاں ان کمپنیوں کی پٹرولیں (گشتی پارٹیاں) گشت کرتی رہتی تھیں۔ یہ کمپنیاں خونریز معرکے لڑ چکی تھیں۔ انہوں نے بڑے شدید اور بہت زیادہ نفری کے حملے روکے تھے۔ اُنہوں نے دشمن کو پتہ ہی نہیں چلنے دیا تھا کہ پوزیشنوں کے درمیان اتنا خلا ہے کہ لڑے بغیر اس میں سے گزرا جا سکتا ہے چار دنوں کی مسلسل لڑائی کے بعد دشمن آگے نہ بڑھ سکا تو اُس کے ٹروپس پیچھے ہٹ گئے۔

دشمن کے ٹروپس جو پیچھے ہٹ گئے تھے، وہ پسپا نہیں ہو گئے تھے۔ انہیں میجر اصغر کی بٹالین کے مورچوں کو روند کر آگے نکلنا تھا۔ اگر یہ ممکن نہیں تھا تو انہیں کوئی اور راستہ دیکھنا تھا میجر اصغر اپنے بٹالین کمانڈر کے حکم سے بٹالین ہیڈ کوارٹر کو جا رہا تھا جو اُس کی کمپنی کی پوزیشن سے کم و بیش دو میل دُور تھا۔ اُسے کسی مقام پر کمانڈو ایکشن کے لیے جانا تھا۔ دشمن کی یہ بٹالین جسے آگے نہیں بڑھنے دیا گیا تھا، کسی اور سمت سے حملے کے لیے تیار ہو رہی تھی یا کسی طرف سے آگے نکل رہی تھی۔ کرنل ارشاد نے دشمن کی اس بٹالین پر شب خون مارنے کا پلان بنایا تھا تاکہ وہ ایک دو دنوں کے لیے حملے کے قابل نہ رہے۔ کرنل ارشاد نے میجر اصغر کو بیس جوانوں کی ایک پارٹی کے ساتھ بریفنگ کے لیے بلایا تھا۔

رات کا وقت تھا۔ میجر اصغر اپنی پارٹی کے ساتھ جا رہا تھا۔ پاک فوج وہاں اب شب خُون کے انداز کی ہی جنگ لڑ سکتی تھی۔ یہ جذبے کی دیوانگی کی جنگ تھی۔ اس جنگ کا انجام صاف

اُمڈ آرہا تھا۔ یہ فتح کی نہیں شہادت کی جنگ تھی۔ اب لڑنا اور شہید ہونا تھا۔

میجر اصغر کی پارٹی اس ترتیب سے پیدل جارہی تھی کہ ایک حوالدار اور چھ جوان آگے آگے تھے جو پارٹی کی ایڈوانس گارد تھی۔ اس سے پچیس تیس قدم پیچھے میجر اصغر ایک حوالدار، اردلی اور وائرلیس آپریٹر کے ساتھ جارہا تھا اور اتنا ہی پیچھے باقی پارٹی تھی۔ وہ اپنی پوزیشن اور بٹالین ہیڈکوارٹر کے درمیان ہوں گے کہ اچانک دو تین مشین گنیں اکٹھی فائر ہوئیں۔ یہ فائرنگ ایڈوانس گارد پر ہوئی تھی —— یہ دشمن کی گھات تھی۔

میجر اصغر اور باقی پارٹی کے جوان اِدھر اُدھر آڑ میں ہو گئے۔ اب پیچھے فائرنگ ہوئی اور دو گرینیڈ بھی پھٹے۔ میجر اصغر کی پارٹی نے جوابی فائرنگ کی۔ دشمن نے روشنی راؤنڈ فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی ہر طرف سے فائر آنے لگا۔ دشمن مشین گنوں اور لائٹ مشین گنوں کا فائر چھڑکاؤ کے انداز سے کر رہا تھا۔ میجر اصغر کو اپنے جوانوں کی للکار سنائی دی جو بڑی جلدی دب گئی۔

میجر اصغر کو اپنے وائرلیس آپریٹر کی کربناک آواز سنائی دی —"سر! مجھے....." —— اور آواز خاموش ہو گئی۔ میجر اصغر سرک کر وائرلیس آپریٹر کے پاس گیا۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔

صورتِ حال ایسی ہو گئی تھی کہ وہاں رُکنا خودکشی کے برابر تھا۔ دن کے وقت گھات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ رات کی گھات میں آکر لڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ میجر اصغر نے اپنے اردلی سے کہا کہ نکلنے کی کوشش کرے۔ آڑ اچھی تھی۔ گھاس اور سرکنڈے تھے اور چھوٹے چھوٹے درخت زیادہ تھے جو روشنی راؤنڈ کی روشنی سے بچا سکتے تھے۔ میجر اصغر کمانڈو تھا۔ اُسے چھپ کر نکلنا آتا تھا۔ وہ اردلی کو ساتھ لیے کیڑوں مکوڑوں کی طرح رینگتا ایک طرف نکل گیا۔

اس علاقے کے متعلق وہ اتنا ہی جانتا تھا کہ یہ پگڈنڈی بٹالین ہیڈکوارٹر کو جاتی ہے۔ گھات سے نکلتے وہ کسی اور طرف نکل گیا۔ سمت کا اُسے اندازہ تھا۔ وہ ستاروں سے سمت کا تعیّن کر لیا جاتا تھا اور اُس کے پاس کمپاس بھی تھی لیکن وہ راستے سے دُور ہٹ گیا تھا۔ اُس کے لیے راستے پر آنا اور بٹالین ہیڈکوارٹر یا اپنی کمپنی کے مورچوں میں پہنچنا مشکل نہ تھا۔ مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ دشمن کے تین چار جوانوں نے اُسے فوراً ہی روشنی راؤنڈ کی روشنی میں گھات سے نکلتے دیکھ لیا تھا اور وہ اُس کے تعاقب میں چل پڑے تھے۔ دشمن کو غالباً یہ شک ہو گیا تھا کہ یہ شخص جو گھات سے بھاگ نکلا ہے، افسر ہے۔ اُسے دشمن زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ میجر اصغر کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے۔

❧

اس علاقے میں کہیں کہیں دلدل بھی تھی۔ کہیں کہیں پانی بھی جمع تھا۔ درختوں اور گھاس کی ڈھکی ہوئی اُونچی نیچی ٹیکریاں بھی تھیں۔ گہرائیاں اور بلندیاں بھی تھیں۔ ڈر یہ تھا کہ ٹیکریوں کے ارد گرد گھومتے کہیں دھوکے میں دشمن سامنے نہ آجائے۔ اصغر نے اردلی سے کہا کہ دشمن اچانک سامنے آگیا تو جم کر مقابلہ کریں گے، بھاگیں گے نہیں لیکن اصغر کی کوشش تھی کہ مقابلے کی نوبت نہ آئے اور وہ اپنے ٹھکانے تک زندہ پہنچ جائے۔ اُسے جنگ لڑنی تھی، اپنی کمپنی کی قیادت کرنی تھی۔ وہ دو اونچی ٹیکریوں کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ ایک روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ میجر اصغر نے اندازہ کر لیا کہ یہ راؤنڈ کہاں سے فائر ہوا ہے۔ وہ جگہ تین سو گز سے ذرا دُور تھی۔ اُس نے رُخ بدل لیا۔ تھوڑی ہی دُور گیا ہو گا کہ اُسے قریب سے للکار سنائی دی —"تم بھاگ نہیں سکو گے پاکستانی! ہمارے پاس آجاؤ، نہیں تو مارے جاؤ گے۔"

اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ دشمن سائے کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ آرہا تھا اور دشمن کو معلوم تھا کہ اصغر انہی ٹیکریوں میں ہے۔ اُس نے دوسری طرف نکلنے کی کوشش کی۔ اُدھر سے بھی للکار سنائی دی۔ اس نے رُخ بدل لیا۔ بیس بائیس قدم چلا ہو گا کہ اُس کا پاؤں کیچڑ میں دھنس گیا۔ وہ رُک گیا۔ آگے دلدل تھی۔ دائیں اور بائیں ٹیکریاں تھیں۔ وہ پیچھے آنے لگا تو اُسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دشمن کے آدمی اِدھر ہی آرہے تھے۔ وہ رک کر بیٹھ گیا اور اردلی کو بھی بٹھا لیا۔

اُس نے قدموں کی چاپ سے اندازہ کیا کہ تعاقب میں آنے والے ایک سو اور ڈیڑھ سو گز کے درمیان دُور ہیں۔ اصغر پیٹ کے بل رینگ کر ٹیکری پر چڑھنے لگا۔ اردلی اُس کے پہلو میں تھا۔ ٹیکری زیادہ اُونچی نہیں تھی۔ دونوں اُوپر چلے گئے اور دشمن قریب آگیا۔ درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ بہت گھنی تھی۔

"سر!— اردلی نے اُس کے کان میں کہا —"سٹین گن کے دو برسٹ کافی ہیں۔ مار دوں؟"

"نظر نہیں آرہے"— میجر اصغر نے کہا —"معلوم نہیں کتنے ہیں۔ راستے میں درخت زیادہ ہیں۔ فائر ضائع جائے گا، ہم پکڑے جائیں گے۔"

نیچے سے دو گالیاں سنائی دیں۔ ایک بھارتی نے کہا —"اِدھر نہیں آتے۔ آگے کیچڑ اور پانی ہے۔"

"پکڑنا ضرور ہے"— کسی اور نے کہا —"افسر معلوم ہوتا ہے۔ میجر ہو گا۔"

میجر اصغر اپنے اردلی کے ساتھ ٹیکری سے دوسری طرف اُتر گیا۔ اترتے ہوئے دو تین پتھر لڑھک گئے۔ رات کے سناٹے میں پتھروں کی آوازیں مشین گنوں کی طرح سنائی دیں۔ دشمن للکارنے لگا۔ دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ اصغر نیچے جا کر ایک سمت دوڑ پڑا۔

ٹیکریوں سے نکلے تو آگے میدان آگیا۔ درخت کم ہو گئے تھے۔ اصغر اب تیز چل رہا تھا۔ تین ساڑھے تین سو گز فاصلہ طے کیا ہو گا کہ بانسوں کے پلیٹ فارم پر بانسوں کا ایک جھونپڑا آگیا۔ یہ پانی میں تھا۔ پلیٹ فارم کی تین چار سیڑھیاں تھیں۔ یہ پانی کا تالاب تھا جو جھونپڑے میں رہنے والوں کی کھیتی تھی —— مچھلیوں کی کھیتی —— بنگال میں اس قسم کے قدرتی تالابوں میں جھونپڑے جو کچھ پانی میں اور باقی خشکی پر ہوتے ہیں، بڑے عام ہیں۔

"اس میں چلے چلو"— اصغر نے کہا —"جھونپڑا خالی ہو گا۔"

"سر!— اردلی نے کہا —"خالی نہ ہُوا تو اس میں مسلمان ہی رہتے ہوں گے۔"

"جنگ میں یہاں کون رہ گیا ہو گا۔"

وہ سیڑھیاں چڑھ گئے۔ یہ اچھی قسم کا جھونپڑا تھا۔ اس کا سائز بتا رہا تھا کہ اس کے تین چار کمرے ہیں۔ اصغر نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً کھُل گیا۔

"ہم پاکستان آرمی کے آدمی ہیں" ــــ اصغر نے کہا ــــ "کیا آپ مسلمان ہیں؟"

"الحمدللہ!" ــــ دروازہ کھولنے والے نے کہا ــــ "اندر آجائیں۔"

اصغر اور اردلی اندر چلے گئے۔ دروازہ کھولنے والے نے کونے میں رکھی ہوئی لالٹین کی مدھم بتی اونچی کر دی۔ اصغر نے روشنی میں دیکھا۔ وہ ایک معزز صورت بنگالی تھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ داڑھی لمبی تھی، گھنی نہیں تھی۔ اُس کے کپڑے معمولی سے تھے لیکن صاف ستھرے۔ وہ اُردو اچھی طرح بول سکتا تھا۔

"اگر آپ کہتے کہ آپ انڈین آرمی کے آدمی ہیں تو بھی میں دروازہ کھول دیتا" ــــ بنگالی نے کہا اور رنجیدہ آواز میں کہنے لگا ــــ "ہمیں کس کے گناہوں کی سزا مل رہی ہے؟"

"محترم!" ــــ میجر اصغر نے کھسیانے سے لہجے میں کہا ــــ "باتوں کا وقت نہیں۔ ہم اللہ کے بھروسے آتے تھے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ہم غلط جگہ نہیں آئے ہیں۔ اپنے کچھ جوانوں کے ساتھ جا رہا تھا اور ہم دشمن کی گھات میں آگئے۔ میں میجر ہوں۔ معلوم نہیں میرے کتنے جوان شہید ہو گئے ہیں۔ ہم دونوں بڑی مشکل سے بچے ہیں۔ چند ایک انڈین ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔"

بنگالی نے پوری بات بھی نہ سُنی۔ اُٹھا اور ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر بولا ــــ "دونوں اِدھر آجاؤ۔ اس کمرے میں کچھ سامان پڑا ہے۔ اِدھر بیٹھ جاؤ" ــــ اُس نے ایک اور دروازہ دکھا کر کہا ــــ "اگر انڈین تمھاری تلاش میں اس گھر میں آ گئے تو آپ دونوں اس دروازے سے نکل جانا۔ پاؤں کی آواز نہ ہو۔"

دونوں اُس کمرے میں چلے گئے۔ بنگالی نے دروازہ بند کر دیا اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

***

جھونپڑے کے پلیٹ فارم کی سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی دھمک سنائی دی پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ دشمن ہے۔ بنگالی نے دروازہ کھولا۔ چار بھارتی فوجی جن میں ایک حوالدار تھا، دندناتے ہوئے اندر آئے۔

"یہاں دو پاکستانی فوجی آئے ہیں" ــــ ہندو حوالدار نے کہا ــــ "انہیں باہر نکالو۔"

"یہاں کوئی نہیں آیا" ــــ بنگالی نے ڈرے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا ــــ "میں کسی پاکستانی فوجی کو اپنے گھر میں چھپانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

"ہم تمہیں زیادہ بک بک کرنے کی مہلت نہیں دیں گے" ــــ ایک اور بھارتی نے کہا ــــ "خود نہیں بتاؤ گے تو پہلے تمہیں گولی ماریں گے پھر جھونپڑے کو آگ لگا دیں گے.... فوراً بولو۔"

"آپ نے جو کچھ کرنا ہے کر لیں" ــــ بنگالی نے کہا ــــ "میرے گھر میں کوئی پاکستانی فوجی نہیں۔"

اصغر اور اردلی دوسرے کمرے میں سُن رہے تھے۔ اردلی نے اُس کے کان میں کہا کہ دوسرے دروازے سے نکل چلیں لیکن اصغر چپ رہا۔ اردلی بے چین ہوا جا رہا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر اصغر کو نکل چلنے کو کہا۔

"بے غیرت!" ــــ اصغر نے سرگوشی کی ــــ "اس بزرگ کو ہم دشمن کے ہاتھوں مرنے کے لیے چھوڑ کر بھاگ جائیں؟.... ٹھہرو ذرا!"

بھارتی فوجی گرج گرج کر بول رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں بنگالی کے بیوی بچے سوئے ہوئے تھے۔ اُس کی ایک بیٹی جوان تھی۔ اُس کی آنکھ کھُل گئی اور اس کمرے میں آگئی جہاں چار بھارتی اُس کے باپ کو دھمکیاں دے رہے تھے۔

"یہ کون ہے؟" ــــ ہندو حوالدار نے بنگالی سے پوچھا۔

"میری بیٹی ہے" ــــ بنگالی نے جواب دیا۔

"پکڑ لو اس لڑکی کو" ــــ حوالدار نے کہا ــــ "او دیکھ او بنگالی مسلمان! اگر اب تُو نے نہ بتایا تو تیری اس بیٹی کو تیرے سامنے ننگا کر کے...."

"آپ جو چاہیں کر لیں" ــــ بنگالی نے کہا ــــ "یہاں کوئی پاکستانی فوجی نہیں۔ کمروں کی تلاشی لے لو۔"

بنگالی کو توقع تھی کہ میجر اصغر اپنے اردلی کے ساتھ نکل گیا ہو گا لیکن اصغر وہیں تھا۔ اب اصغر نے سُنا کہ بنگالی کی بیٹی بھی بھارتیوں کے ہاتھ لگ گئی ہے تو اُس نے نکل بھاگنے کا ارادہ ذہن سے نکال دیا۔

"میں پہلے اس کی بیٹی کا حساب برابر کر لوں" ــــ حوالدار نے کہا ــــ "یہ تو جنگل میں منگل بنا ہوا ہے۔"

لڑکی کی آواز سنائی دی ــــ "میرے جسم کو ہاتھ نہ لگانا" ــــ پھر لڑکی بنگالی زبان میں چلّانے لگی۔

اصغر کے پاس ریوالور تھا۔ اُس نے جھپٹ کر اردلی کے ہاتھ سے سٹین گن لی۔ اس کے ساتھ میگزین لگی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے بڑھا اور دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ایک ثانیے میں اُس نے دیکھ لیا۔ بنگالی ایک طرف کھڑا تھا۔ اُس کی بیٹی اُس کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہندو حوالدار اس کی طرف لپک رہا تھا۔ اس کے تین سپاہی دائیں طرف دروازے والی دیوار کے ساتھ کھڑے تھے۔

میجر اصغر نے ایک دو سیکنڈ سے زیادہ وقت ضائع نہ کیا۔ اُس نے سٹین گن حوالدار کی طرف سیدھی کی اور ایک برسٹ فائر کیا۔ حوالدار رکا، گھٹنوں کے بل گرا اور ایک پہلو پر لڑھک گیا۔ اصغر نے سٹین گن بھارتی سپاہیوں کی طرف گھمائی لیکن اُن میں سے ایک نے آٹومیٹک رائفل سے یکے بعد دیگرے تین گولیاں اصغر پر فائر کر دیں۔ تینوں اصغر کے جسم سے پار ہو گئیں۔ اصغر نے گرنے سے پہلے سٹین گن کا ٹریگر دبایا اور نالی دائیں پھر بائیں کی۔ تینوں بھارتی سپاہی ڈھیر ہو گئے۔ اس کے بعد اصغر گر پڑا۔ ایک گولی اُس کی ہنسلی توڑ گئی تھی۔ دوسری گولی پہلو میں لگی اور تیسری ران میں۔ اس سے ران کی ہڈی ٹوٹ گئی ــــ اصغر نے اپنی جان کی بازی لگا کر ایک لڑکی کی عزّت بچا لی تھی۔

اردلی، بنگالی اور اُس کی بیٹی نے اصغر کے زخموں پر کپڑے باندھ دیئے اور اُسے بھارتیوں کی لاشوں میں سے اُٹھا کر بستر پر ڈال دیا۔ وہاں اُسے اس سے زیادہ فسٹ ایڈ نہیں مل سکتی تھی۔ اردلی کو بٹالین ہیڈ کوارٹر کا راستہ یاد نہ تھا۔ اس نے بنگالی کو اُس جگہ کی نشانیاں بتائیں جہاں بٹالین ہیڈ کوارٹر تھا۔ بنگالی ان علاقوں سے واقف تھا۔ اُس نے اردلی کو راستہ سمجھا دیا۔ اردلی اُسی وقت دوڑ پڑا۔ اب تعاقب کا خطرہ نہیں تھا۔

بٹالین ہیڈ کوارٹر دور نہیں تھا۔ اردلی دوڑتا گیا اور آدھے گھنٹے میں بٹالین ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گیا۔ کرنل ارشاد نے اردلی کی رپورٹ سُنتے ہی رجمنٹ کے ڈاکٹر اور چند ایک جوانوں کو اردلی کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ سٹریچر ساتھ لے گئے۔

میجر اصغر ہوش میں تھا۔ خُون رُک نہیں رہا تھا، بنگالی، اُس کی بیٹی اور بیوی اصغر کے خُون سے اپنے بہت سے کپڑے لال کر چکے تھے۔ جو بھی کپڑا اُس کے زخموں پر باندھتے تھے وہ ذرا سی دیر میں لال ہو جاتا تھا۔ خُون رکتا نہیں تھا۔

"محترم!" ——— میجر اصغر نے بنگالی سے کہا ——— "میں شاید زندہ نہ رہ سکوں۔ میری رُوح آپ کو سلام کرنے آیا کرے گی۔ میں صرف یہ دکھ اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں کہ میں نے یہاں آ کر آپ کے لیے اتنی بڑی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔"

"میرے عزیز بیٹے!" ——— بنگالی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا ——— "تم نے میری بیٹی کی آبرو کی حفاظت کر کے صلہ دے دیا ہے۔"

کمرے میں چار بھارتی فوجیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ہر لمحہ خطرہ تھا کہ انڈین آرمی کی اس بٹالین کی ایک پارٹی اپنے ان چار آدمیوں کی تلاش میں اِدھر آ نکلے گی اور ان کی لاشیں دیکھ کر بنگالی کو اس کے بیوی بچّوں سمیت پکڑ کر لے جائے گی۔

بنگالی کی بیٹی اصغر کو دیکھ دیکھ کر اس طرح بے چین اور پریشان ہُوئی جا رہی تھی جیسے اپنی جان دے کر اُسے زندہ رکھنا چاہتی ہو۔ اُس نے اپنے باپ سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ باپ نے اصغر سے کہا کہ اس کی بیٹی کہتی ہے کہ اُس کی وردی اتار کر اپنے کپڑے پہنا دو۔

"نہیں" ——— اصغر نے مُسکرانے کی سر توڑ کوشش کرتے ہُوئے کہا ——— "مجھے خاکی وردی میں ہی دفن کر دینا ——— مجھے غسل نہ دینا۔ میں اپنے لہُو سے نہا چکا ہُوں۔"

لڑکی اور اُس کی ماں کے آنسو بہہ نکلے۔

جب میڈیکل آفیسر اپنی پارٹی کے ساتھ پہنچا، اُس وقت اصغر نیم غشی کی کیفیت میں تھا۔

"پہلے ایک کام کرو" ——— میجر اصغر نے نحیف آواز میں کہا ——— "یہ چاروں لاشیں پانی میں پھینک دو۔ ان کے ساتھ پتھر باندھ دینا۔ پھر یہ پانی کے نیچے ہی رہیں گی ...... اور تمام جوان جلدی سے پانی لاؤ اور اس گھر سے خون دھو ڈالو۔ دشمن کے ہتھیار اور ایمونیشن اٹھا کر ساتھ لے چلو۔ دشمن کا یہاں ذرا سا بھی نشان نہ رہنے دو، ورنہ یہ لوگ مارے جائیں گے۔"

میجر اصغر کو لینے کے لیے جو جوان آئے تھے انہوں نے میجر اصغر کے حکم کی تعمیل بڑی تیزی

سے کی۔ لاشیں غائب ہو گئیں اور ان کا خون بالٹیوں کے اس مکان سے صاف ہو گیا۔ اِس دوران میڈیکل آفیسر نے اصغر کی مرہم پٹی کر دی۔ اُسے فوراً ڈھاکہ پہنچانا تھا۔ خون کی ضرورت تھی لیکن حالات ایسے ہو گئے تھے کہ شدید زخمیوں کو ہسپتالوں تک پہنچانا ناممکن ہو گیا تھا۔ اگلے مورچوں میں زخمی کو خون دینے کا انتظام ہوتا ہے لیکن مشرقی پاکستان میں ہماری فوج ان سہُولتوں سے محروم تھی۔ کئی زخمی موزوں طبّی امداد نہ ملنے سے شہید ہو گئے تھے۔

میجر اصغر کو سٹریچر پر ڈال کر بٹالین ہیڈ کوارٹر میں لے گئے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ ایک ہیلی کاپٹر میجر اصغر کے بٹالین ہیڈ کوارٹر کے قریب اُترا۔ اس میں ایک کمانڈو پارٹی تھی جسے کسی اور جگہ اُتارنا تھا لیکن وہ جگہ محفوظ نہیں رہی تھی۔ دشمن وہاں پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں بھی کچھ خرابی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے چیک کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر یہاں اتار لیا گیا۔ خرابی دیکھی گئی لیکن کوئی ایسی خطرناک خرابی نہیں تھی۔

اس کمانڈو پارٹی کا کمانڈر ایک میجر تھا جس کے کرنل ارشاد کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ کرنل ارشاد نے اسے میجر اصغر کے متعلق بتایا کہ وہ اس قیمتی میجر کو بچانا چاہتا ہے۔ کرنل ارشاد نے میجر کو بتایا کہ اصغر کتنا جرأتمند اور کتنا ذہین افسر ہے۔ میجر نے جب میجر اصغر کا نام سنا تو وہ تڑپ اُٹھا اور وہ دوڑ کر وہاں پہنچا جہاں اصغر سٹریچر پر پڑا تھا۔ میجر اصغر کو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ملٹری اکیڈیمی میں وہ اکھٹے رہے تھے اور کشمیر کے کمانڈو آپریشن میں بھی دونوں کمانڈو فورس میں تھے۔

اصغر نیم غشی کی کیفیت میں تھا۔ اُس نے اپنے دوست کے ساتھ ہاتھ ملایا لیکن ایسے جیسے خواب میں کوئی حرکت کی ہو۔ کمانڈو میجر نے کرنل ارشاد سے کہا کہ وہ میجر اصغر کو ڈھاکہ تک تو نہیں لے جا سکتا، تقریباً آدھے راستے تک لے جائے گا اور وہاں سے ڈھاکہ لے جانے کے لیے گاڑی کا انتظام ہو جائے گا۔

اصغر کا سٹریچر ہیلی کاپٹر میں رکھ دیا گیا اور ہیلی کاپٹر اُڑ گیا۔ جہاں ہیلی کاپٹر اترا وہاں میجر نے ایک گاڑی کا انتظام کر لیا اور اصغر کو ڈھاکہ روانہ کر دیا۔ ابھی انڈین آرمی اُس علاقے سے کچھ دُور تھی جس میں سے گذر کر یہ گاڑی ڈھاکہ کو جا رہی تھی۔ توقع نہیں تھی کہ یہ گاڑی ڈھاکہ تک پہنچ سکے گی کیونکہ دشمن کی پیش قدمی کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ ڈھاکہ باقی ملک سے کٹتا جا رہا تھا۔ یہ تو دوستی کا مظاہرہ تھا کہ میجر اصغر کو ڈھاکہ پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی ورنہ ہماری فوج نے یہ ذہن سے ہی اتار دیا تھا کہ کسی زخمی کو ڈھاکہ تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

میجر اصغر کو ڈھاکہ پہنچا دیا گیا۔

یہ اُس دن کا ذکر ہے جس دن ڈھاکہ سے تھوڑی ہی دور دشمن ہیلی کاپٹروں سے فوج اتار رہا تھا اور ڈھاکہ والوں کو خبر تک نہیں تھی۔ اصغر کو تازہ خون دیا جانے لگا۔ اُدھر مشرقی پاکستان کی رگوں سے سارا خون نکل چکا تھا۔ مشرقی پاکستان اب بے جان لاش تھا۔ ڈھاکہ پر ابھی تک بم برس رہے تھے۔ ڈھاکہ جو مسجدوں کا شہر کہلایا کرتا تھا اب دھماکوں کا شہر بن گیا تھا۔

طاہر پرویز کی ذہنی کیفیت میں کوئی تغیّر نہیں آیا تھا۔ اُس کی حالت بگڑی بھی نہیں تھی عصمت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور عصمت کی ماں کا رویّہ بھی نہیں بدلا تھا۔

پاکستان کی دنیا یکسر بدل گئی۔

سولہ دسمبر کی شام تھی۔ ریڈیو نے یہ خبر سنائی کہ بھارت کی فوج ڈھاکہ میں داخل ہوگئی ہے۔

طاہر نے ٹرانسسٹر اپنے کمرے میں رکھا ہُوا تھا۔ اُس نے جب یہ خبر سُنی تو فوراً ٹرانسسٹر کی سوئی آل انڈیا ریڈیو کے جالندھر سٹیشن پر کردی۔ آل انڈیا ریڈیو ساری دنیا کو سُنا رہا تھا کہ بھارت کی فوج ڈھاکہ میں داخل ہوگئی ہے اور پاک فوج کی ایسٹرن کمانڈ سے ہتھیار ڈلوائے جا رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو بار بار اپنی فتح کی خبر سنا رہا تھا۔

ارشد اور طاہرہ بھی یہی خبریں سن رہے تھے۔ طاہرہ کو اچانک طاہر کا خیال آگیا۔ اُس نے ارشد سے کہا کہ چل کے طاہر کو دیکھو۔ اگر اُس نے یہ خبر سن لی تو وہ بالکل ہی پاگل ہو جائے گا۔ ارشد اور طاہرہ بڑی تیز تیز چلتے طاہر کے کمرے میں گئے۔ دونوں کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ وہ آنکھوں میں آتے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بات کرتے اُن کی زبانیں ہکلاتی تھیں۔ چلتے ہوئے وہ قدم رکھتے کہیں اور تھے اور قدم پڑتے کہیں اور تھے۔ اُن سے وہ پاکستان چھن گیا تھا جو اُنہوں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر حاصل کیا تھا۔ اُن کے سامنے خونچکاں لاشیں تڑپ رہی تھیں لیکن وہ جب طاہر کے کمرے میں داخل ہوتے تو اُنہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

طاہر کا ٹرانسسٹر آل انڈیا ریڈیو کی خبریں سنا رہا تھا اور طاہر پلنگ پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس کی نظریں سامنے دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ اُسے محسوس ہی نہ ہُوا کہ کمرے میں کوئی آیا ہے۔ ارشد نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"طاہری!" --- اُس نے آہستہ سے کہا۔

طاہر کی نظریں جہاں جمی ہوئی تھیں وہیں جمی رہیں۔ اُس کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت نہ ہوئی۔

"طاہری بیٹے!" --- طاہرہ نے اُس کے سامنے کھڑے ہوکر اور اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا --- "کیا سوچ رہے ہو؟"

طاہر کے بُت میں ذرا سی بھی جنبش نہ ہوئی۔

"طاہری!" --- ارشد نے اب کے اُسے جھنجھوڑ کر بلند آواز میں کہا۔

طاہر پر سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ ارشد اور طاہرہ پریشان ہوگئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں نے اُسے مل کر جھنجھوڑا طاہرہ نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھایا۔ چہرہ تو اُٹھ گیا لیکن طاہر کو اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ ارشد نے اُس کی نبض پر انگلی رکھی۔ اُسے یہ ڈر تھا کہ لڑکا اتنے بڑے صدمے کو برداشت نہیں کر سکا اور اس کی حرکتِ قلب بند ہوگئی ہے لیکن طاہر زندہ تھا۔ ارشد اور طاہرہ نے اُسے پلنگ پر لٹا دیا۔ اب اُس کی نظریں چھت پر جم گئیں۔ وہ آنکھیں جھپک رہا تھا لیکن لگتا تھا جیسے اُس کی آنکھیں ٹھہر گئی ہوں۔ یہ غم کی انتہا تھی۔

ارشد اور طاہرہ یہ تو بھول ہی گئے کہ پاکستان کی سیاست آدھا پاکستان دشمن کو دے بیٹھی ہے۔ انہیں اپنے بیٹے کی اس حالت نے پریشان کر دیا۔ ارشد نے اپنے بڑے بھائی یوسف کو بلا لیا۔ زینت اور عصمت بھی آگئیں۔ یوسف نے بھی طاہر کو بلایا، ہلایا اور اُس کے گال تھپکائے مگر سکتے کی کیفیت میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا۔

"اُسے رونا چاہیئے" --- یوسف نے ارشد سے کہا --- "یہ کیفیت اچھی نہیں"۔

"انجکشن نہ لگا دیں؟" --- ارشد نے یوسف سے پوچھا --- "یا گولیاں دے دیں؟"

"نہیں ارشد! نہیں" --- یوسف نے کہا --- "اُسے اب بیدار ہوکر حقیقت کا سامنا کرنا چاہیئے" --- یوسف آگے بڑھا اور طاہر کے پاس پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے طاہر کے گال تھپکاتے ہوئے کہا --- "طاہری! جاگو یار! ہوش میں آؤ۔ آدھا ملک ہاتھ سے نکل گیا ہے اور تم سوئے ہوئے ہو۔ اُٹھو بھائی! .... مشرقی پاکستان ...." یوسف خود بھی پاکستانی تھا۔ مشرقی پاکستان کا نام زبان پر آیا تو اُسے ہچکی سی آئی اور اُس کے آنسو بہہ نکلے۔

سارا خاندان طاہر کے کمرے میں آگیا تھا۔ یوسف اس خاندان کا بزرگ تھا۔ اُسے روتا دیکھ کر سب کے آنسو بہہ نکلے۔ طاہرہ کو ایک غم طاہر کا تھا، دوسرا غم مشرقی پاکستان کا۔ وہ سسکنے لگی، پھر اُس کی ہچکیاں نکلنے لگیں۔ ارشد نے طاہرہ کے کندھے پر تھپکی دے کر بہلانے کے لیے کچھ کہا۔ یوسف نے اُسے اشارے سے روک دیا۔ یوسف ماہر نفسیات نہیں تھا، اُس نے زندگی کے حقائق کو بڑی غور سے دیکھا تھا۔ اُس نے انسانوں کو پڑھا تھا۔ اُس نے مختلف حالات میں مختلف انسانوں کے ردِّعمل دیکھے تھے۔ گہری نظر سے مشاہدے کئے تھے۔ اُسے اچھے بُرے تجربے ہوئے تھے اور ہر تجربے کا اُس نے تجزیہ کیا تھا۔

"طاہرہ کو رونے دو" --- یوسف نے ارشد کے کان میں سرگوشی کی۔

طاہرہ نے اپنے منہ پر دوپٹہ ڈال لیا تھا اور وہ سسکیاں اور ہچکیاں لے رہی تھی۔ وہ طاہر کے پاس پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"مشرقی پاکستان بھی گیا، ہمارا بچہ بھی گیا" --- یوسف نے کہا --- "مغربی پاکستان بھی خطرے میں آگیا ہے"۔

ارشد نے یوسف کی طرف یوں دیکھا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ یوسف کے منہ سے کبھی ایسی بات نہیں نکلی تھی۔

"بھائی جان!" --- ارشد نے کہا --- "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ خدا کے لیے ایسی باتیں ...."

"مجھے صرف اِس بچّے کا غم ہے" --- یوسف نے جذباتی لہجے میں کہا --- "مجھے اس مری ہوئی ماں کے بیٹے کا غم ہے"۔

طاہرہ کی ہچکیاں اور بلند ہوگئیں۔ یوسف کی نظریں طاہر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ طاہر کی آنکھیں کھلی ہوئی اور ایک مقام پر مرکوز تھیں۔ کمرے میں اتنے افراد کے ہوتے ہوئے بھی سکوت طاری تھا جس میں طاہرہ کی سسکیاں اور ہچکیاں زیادہ بلند سنائی دے رہی تھیں۔

طاہر کے چہرے پر کچھ تبدیلی سی نظر آنے لگی۔ یوسف اُس کے چہرے کو بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ بڑی تیزی سے طاہر کے چہرے کا تاثر بدلتا گیا۔ پھر اُس نے سر دائیں بائیں ہلایا۔ اسے طاہرہ نظر آئی جو دوپٹہ منہ کے آگے لیتے ہوئے سسک رہی تھی۔ طاہر آہستہ آہستہ اُٹھا اور طاہرہ کی طرف گھوما۔ اُس نے طاہرہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"امّی جان!"——— طاہر نے دھیمی سی آواز میں کہا ——— "آپ رو رہی ہیں؟ کیوں؟.... کیوں رو رہی ہیں آپ؟"

"تمہاری یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی طاہر!"——— طاہرہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ "اپنے ابُو کو دیکھو .... تمہارے غم نے انہیں چند دنوں میں ہی بوڑھا کر دیا ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں امّی جان!"——— طاہر نے نارمل سی آواز میں کہا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا ——— "کہاں ہیں ابُو؟"——— ارشد کو دیکھ کر اُس نے کہا ——— "میرا اتنا غم نہ کریں ابُو! مجھے کچھ نہیں، میں ٹھیک ہوں .... لیکن آپ کا آج کا رونا میری سمجھ میں آتا ہے۔"

طاہرہ کی ایک دو ہچکیاں اور نکل گئیں۔ طاہر نے سر کو جھٹک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"امّی جان!"——— طاہر نے گرجدار آواز میں کہا ——— "میں جانتا ہوں، آپ مشرقی پاکستان کے لیے رو رہی ہیں۔ آپ کیوں روتی ہیں میں زندہ ہوں۔ اس شکست کا انتقام لینا میرا فرض ہے، آپ کا نہیں۔"

طاہرہ نے چونک کر بڑی حیرت سے طاہر کی طرف دیکھا۔ طاہر کی آواز میں اور اُس کے الفاظ میں طاہرہ کو اُس کی ذہنی صحت مندی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

یوسف طاہر میں یہی تبدیلی لانا چاہتا تھا۔ اُسے پوری طرح توقع نہیں تھی کہ طاہر کا ردِّعمل یہ ہوگا لیکن امید سی تھی کہ ماں کی ہچکیاں اور سسکیاں طاہر کو حقیقت میں لے آئیں گی۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک دھچکہ انسانی ذہن کو مریض بنا دیتا ہے اور اس جیسا ایک اور دھچکہ یا اس سے زیادہ شدید جھٹکہ ذہن کو نارمل حالت میں لے آتا ہے۔ یوسف کو یہ احساس بھی تھا کہ ہر کیس میں یوں نہیں ہوتا۔ دوسرے جھٹکے کے نتائج تخریبی بھی ہو سکتے ہیں، پھر بھی یوسف نے یہ خطرہ مُول لیا اور کہا کہ مشرقی پاکستان بھی گیا اور بچہ بھی گیا اور اب مغربی پاکستان بھی خطرے میں آ گیا ہے۔ یوسف نے طاہرہ کو رُلانے کے لیے جذباتی باتیں بھی کی تھیں۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ طاہر رو پڑے اور اس کے خوب آنسو بہیں۔

یوسف نے جب دیکھا کہ طاہر سکتے کی کیفیت سے نکل آیا ہے اور اُس نے حقیقت کو بھی کسی حد تک قبول کر لیا ہے تو یوسف نے طاہرہ کو طاہر کے پاس رہنے دیا اور باقی سب کو اشارہ کیا کہ کمرے سے نکل جائیں۔ سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔

عصمت رُکی رہی۔ اُس کی ماں نے اُسے بازو سے پکڑا اور اپنے ساتھ لے گئی۔

"میرے لیے نہ روئیں امّی جان!"——— طاہر پرویز نے کہا ——— "میں اپنے ملک کو دشمن سے

نہیں بچا سکا، آپ کو اپنے غم سے بچا سکتا ہوں .... لیکن امّی! مجھے دوائیاں دے دے کر آپ نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ میں کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایسے لگتا ہے جیسے میں خواب اور بیداری کے درمیان ایک دلدل میں پھنس گیا ہوں .... تایا جان کیا کہہ رہے تھے؟ مغربی پاکستان بھی خطرے میں آ گیا ہے؟"

"اِدھر جنگ ہو رہی ہے بیٹا!"——— طاہرہ نے کہا ——— "مغربی پاکستان کو کوئی خطرہ نہیں مشرقی پاکستان اس لیے ہاتھ سے نکل گیا ہے کہ وہاں کے چند لیڈروں نے بنگالی مسلمانوں کو گمراہ کر لیا تھا۔ اُنہوں نے پاکستان کے سب سے بڑے دشمن سے مدد لی۔ ہمارا یہ دشمن تو چاہتا ہی یہی تھا۔ اُس نے بنگالیوں کو مزید گمراہ کیا۔ وہ لوگ مشرقی پاکستان دشمن کو دینا چاہتے تھے مغربی پاکستان کے لوگوں کا جذبہ کچھ اور ہے۔ اس خطے کو دشمن فتح نہیں کر سکتا شکست اُنہیں ہی ہوتی ہے جو شکست کھانا چاہتے ہیں۔"

"امّی جان!"——— طاہر نے معصوم سے بچّے کی طرح پوچھا ——— "وہ پاکستان کہاں ہے جو آپ نے اور ابُو نے بنایا تھا؟"

"یہی ہے وہ پاکستان طاہر!"——— طاہرہ نے کہا ——— "ملک نہیں بدلا کرتے لوگ بدل جایا کرتے ہیں۔ لوگوں کی نیّت بدل جایا کرتی ہے۔"

"ماننے کو جی نہیں چاہتا امّی!"——— طاہر نے کہا۔ "یہ وہ آپ والا پاکستان نہیں لگتا۔ یہاں تو میں نے یہی کچھ دیکھا ہے، سیاست، مارشل لاء .... یوں لگتا ہے جیسے اس ملک میں یا سیاسی لیڈر ہیں یا جرنیل ہیں۔"

"ہاں بیٹا!"——— طاہرہ نے آہ بھر کر کہا ——— "جب جرنیل سیاسی لیڈر بن جاتے ہیں تو ملک کا یہی حال ہوتا ہے۔"

طاہر طاہرہ کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ باتیں پوچھتا رہا اور طاہرہ سنبھل سنبھل کر اُس کے سوالوں کا جواب دیتی رہی۔ اُس نے ایسی کوئی بات نہ کی جس میں طاہر کے بھڑک اُٹھنے کا خطرہ ہو۔

"طاہر!"——— طاہرہ نے کہا ——— "کھانا کھا لو اور اپنی دوائیاں لے لو۔"

طاہر نے طاہرہ کی طرف یوں دیکھا جیسے اپنی ماں کا حکم ماننا چاہتا ہو ورنہ اُسے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

سترہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح طلوع ہوئی۔ اخبار فروش جاگ اُٹھے۔ جب اخبار لوگوں کے سامنے آئے تو جس نے اخبار دیکھا اُس پر سکتے کی وہی کیفیت طاری ہوگئی جو گزشتہ رات طاہر پر طاری ہوتی تھی۔ مغربی پاکستانیوں کو تو رات کو ہی پتہ چل گیا تھا کہ انڈین آرمی ڈھاکہ میں داخل ہوگئی ہے۔ اُنہوں نے آل انڈیا ریڈیو سے سقوطِ ڈھاکہ کی خبر بھی سن لی تھی لیکن اُنہوں نے اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھا کہ یہ سب جھوٹ ہے ہمیں کون شکست دے سکتا ہے۔ صبح طلوع ہوتے ہی اخباروں نے، اپنے ریڈیو اور اپنے ٹی۔وی نے پردہ اٹھا دیا۔

مغربی پاکستان پر سناٹا طاری ہو گیا۔

پھر یہ سناٹا کہرام بن گیا۔

لوگ اس طرح روتے جیسے قائدِ اعظم ایک بار پھر فوت ہو گئے ہوں۔

پھر لوگ جذبات اور جوش و خروش سے پھٹنے لگے۔ لوگ جلوسوں کی صورت سڑکوں پر نکل آتے۔ مُردہ باد کے نعرے لگے۔ "بھارت کو کچل دو"۔ کے نعرے لگے۔

بعض لوگ حرکتِ قلب بند ہونے سے مر بھی گئے۔ خودکشی کی خبریں بھی سنائی دیں۔

وہ لوگ ابھی زندہ تھے جنہوں نے اپنے ہاتھوں پاکستان بنایا تھا۔ اُنہوں نے پاکستان بنانے کے لیے جو قربانیاں دی تھیں اُن سے کہیں زیادہ قربانیاں وہ پاکستان کو بچانے کے لیے دے سکتے تھے، دینے کے لیے تیار بھی تھے لیکن پاکستان جن جاگیرداروں اور سیاسی جرنیلوں کی مٹھی میں آ گیا تھا وہ پاکستان کا سودا کرنے پر تلے ہوتے تھے۔ پاکستان بنانے والوں کے سامنے دو ہی راستے تھے ـــ اُن کی حرکتِ قلب بند ہو جاتی یا وہ خودکشی کر لیتے۔

مغربی پاکستان کی سرحد پر جنگ ابھی جاری تھی۔ یہ ایک برائے نام جنگ تھی۔ ہمارے ٹروپس تین دسمبر کی شام جہاں تک پہنچے تھے، سترہ دسمبر کی صبح تک وہیں تھے۔ پاک فوج کے جذبوں کے ساتھ سیاسی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اعلان ہُوا کہ دن کے بارہ بجے صدرِ مملکت قوم سے خطاب کریں گے۔

اور دن کے بارہ بجے کے لگ بھگ ریڈیو سے صدرِ مملکت کی آواز سنائی دی۔ جھومتی لڑکھڑاتی ہوئی اس آواز نے قوم سے کہا کہ جنگ جاری رہے گی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس آواز سے شراب کی بُو آ رہی ہو۔ بعض لوگ جو حقائق سے بے خبر جذبات میں اُلجھے ہوتے تھے، خوش ہوتے کہ جنگ جاری رہے گی لیکن یہ خوشی کچھ دیر بعد خوف و ہراس میں بدل گئی۔ ایک افواہ سارے ملک میں پھیل گئی کہ بھارت مشرقی پاکستان سے فارغ ہو چکا ہے اور اب وہ مغربی پاکستان پر بھی ہاتھ صاف کر جائے گا۔ یہ افواہیں پھیلانے والے ایک تو ففتھ کالم کے ایجنٹ تھے اور دوسرے اپنے فوجی حکمران جو قوم پر خوف و ہراس طاری کر کے جنگ بندی کرنے کا فیصلہ کئے بیٹھے تھے۔ اُنہیں ایک جواز کی ضرورت تھی جو اُنہوں نے خوف و ہراس پھیلا کر پیدا کیا۔

اُسی شام آل انڈیا ریڈیو نے جنگ بندی کا یک طرفہ اعلان کر دیا۔ ادھر جنگ جاری رکھنے کا اعلان کرنے والوں نے اپنی تلوار نیام میں ڈال لی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہمارے لیڈروں نے بھارتی لیڈروں کے ساتھ پہلے سے طے کر رکھا تھا کہ تم یوں کرنا، ہم یوں کریں گے۔

اگلی صبح مغربی پاکستانیوں کو پتہ چلا کہ بھارت کے حکم سے جنگ بند ہو گئی ہے۔ پھر کچھ دنوں بعد کچھ اور پردے اٹھنے لگے۔ پتہ چلا کہ سیالکوٹ سیکٹر میں ایک پوری کی پوری تحصیل پر بھارت کا قبضہ ہے۔ اُدھر راجستھان سیکٹر میں اپنا ہزاروں مربع میل علاقہ دشمن کو دے دیا گیا۔ پھر یہ پتہ چلا کہ پاک فوج کی ایک کور اور پاک فضائیہ کے چار لڑاکا بمبار سکواڈرن جنگ میں استعمال ہی نہیں ہوتے۔

جوں جوں پردے اٹھتے گئے ایک سازش کی کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ یہ سازش کامیاب ہو چکی تھی اور اس سازش کا خالق دشمن نہیں ہماری اپنی قیادت تھی۔

مارشل لاء قوم پر مسلّط رہا لیکن اس کا لیبل بدل گیا۔ نئے آمر نے اسے "عوامی مارشل لاء" کہا۔ مارشل لاء کی ضرورت اس لیے بھی جا رہی تھی کہ ابھی قوم اور فوج کے باغی ہو جانے کا خطرہ تھا۔ لوگ انتقام انتقام کے نعرے لگا رہے تھے۔ ایسی ہی بے چینی مورچوں میں بیٹھے ہوتے فوجیوں میں بھی دیکھی گئی تھی۔ پھر یوں ہُوا کہ جو پردے اُٹھے تھے وہ پھر ڈالے جانے لگے اور اس شکست کی تمام تر سیاہی فوج کے مُنہ پر مَل دی گئی۔ فوج کے خلاف نفرت پھیلانے کی درپردہ مہم شروع کر دی گئی۔

گنہگاروں نے اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے شہیدوں کو رُسوا کیا۔

لال لہو میں ڈھلی ہوئی خاکی وردی کو نفرت کے کوڑے کرکٹ میں پھینک دیا گیا۔

سولہ دسمبر کی شام ملک رجب علی اور سلمٰی کے ہاں بھی صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ اُن کا تو ایک بیٹا مشرقی پاکستان میں لڑ رہا تھا جس کی اُنہیں کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی کہ وہ کس حال میں ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ میجر اصغر کو جس روز زخمی حالت میں ڈھاکہ پہنچا گیا تھا اس روز انڈین آرمی ڈھاکہ کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اس سے اگلے ہی روز اپنی فوج نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

ملک رجب علی ڈیڑھ ایک مہینے کے دوران تین چار مرتبہ جی۔ ایچ۔ کیو راولپنڈی گیا۔ وہاں سے بھی اُسے اس کے سوا کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی کہ مشرقی پاکستان میں اپنی فوج کی جتنی نفری زندہ تھی وہ جنگی قیدی بن چکی ہے اور اس وقت بھارت میں مختلف جنگی قیدی کیمپوں میں ہے۔ ایسی کوئی اطلاع نہیں آ رہی تھی کہ میجر اصغر زخمی ہے۔ سلمٰی پر تین چار مرتبہ غشی کے دورے پڑ چکے تھے۔

آخر ایک روز اُن کے ہاں ایسی سرکاری اطلاع آئی کہ اُنہیں خواب کا دھوکہ ہونے لگا۔ اطلاع یہ تھی کہ میجر اصغر زخمی ہے اور راولپنڈی کے فوجی ہسپتال میں آ گیا ہے۔ ملک رجب علی، سلمٰی اور شازی اُسی وقت راولپنڈی کو روانہ ہو گئے۔

ابتدا میں بھارت نے شدید طور پر زخمی ہونے والے پاکستانی افسروں اور جوانوں کو پاکستان کے حوالے کر دیا تھا۔ ان میں میجر اصغر بھی تھا۔

"میں آپ سے شرمسار ہوں" ـــ اپنے ماں باپ کو دیکھ کر اصغر نے پہلی بات یہ کہی اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

"بھول جاؤ اصغر!" ـــ رجب علی نے کہا ـــ "یہ تمہاری شکست نہیں۔ تم تو سیاسی شطرنج کے ایک مہرے تھے۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ پاک فوج کو شکست کی طرف لے جایا جا رہا ہے"۔

"یہ پیش گوئی تو شازی نے بھی کی تھی" ـــ اصغر نے کہا۔

سلمٰی اسی میں خوش تھی کہ اُسے اُس کا بیٹا زندہ مل گیا ہے۔ اصغر کے زخم اتنے گہرے تھے کہ مہلک ثابت ہو سکتے تھے۔ اُس کی زندگی کے کچھ دن باقی تھے اس لیے اللہ نے اُسے بچا لیا۔

"ابّا جان!" ـــ اصغر نے کہا ـــ "آپ بھی جانتے ہیں، میں بھی جانتا ہوں، سب جانتے ہیں کہ اس جنگ کا اور اس شکست کا پس منظر کیا ہے۔ اور پسِ پردہ وہ کون سے ہاتھ تھے جنہوں نے ہمیں ذلّت اور رسوائی اور تباہی کی کھائیوں میں پھینکا۔ میں اب یہ سوچتا ہوں، کیا ہم کبھی اس شکست

کا انتقام لے سکیں گے ؟"

"نہیں" —— ملک رجب علی نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا —— "اب انڈیا سے جنگ نہیں ہو گی ۔ اب پاکستان میں اقتدار کی جنگ ہو گی ۔ اب شہید اُسے کہا کریں گے جو سیاسی ہنگاموں میں مارا جائے گا"

"اصغر بیٹا!" —— سلمٰی نے کہا —— "ارشد اور طاہرہ کا طاہر تو بے چارہ پاگل ہی ہو گیا ہے ۔ اُس کی ذہنی حالت خاصی بگڑی ہوئی ہے "

"کہاں ہے وہ ؟" —— اصغر نے چونک کر پوچھا —— "مجھے تو اُس کا خیال ہی نہیں رہا تھا ۔ بڑا قیمتی لڑکا ہے ۔ اگر وہ جذباتی نہ ہوتا تو پاکستان اُس کی بہادری کے کارنامے سنتا.... آپ نے کبھی اُس کے ساتھ بات کی ہے ؟"

سلمٰی نے اُسے طاہر کے متعلق تمام تر تفصیل سنا دی ۔ یہ بھی سنایا کہ اُس کے تایا کی بیٹی کا اُس کے ساتھ بڑا گہرا لگاؤ ہے جو اس لڑکی کی ماں کو پسند نہیں ۔ سلمٰی کو یہ بھی معلوم تھا کہ تین دسمبر کی شام سے اُس کی کیا حالت ہونے لگی تھی ۔

ان لوگوں نے راولپنڈی سے واپس آکر ارشد اور طاہرہ کو بتایا کہ اصغر زخمی حالت میں راولپنڈی سی ۔ ایم ۔ ایچ میں آگیا ہے ۔ طاہر نے سُنا تو وہ اُسے ملنے کے لیے بے تاب ہو گیا ۔ ارشد اور طاہرہ کو تو اصغر کو دیکھنے جانا ہی تھا ۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ طاہر کو ساتھ لے چلتے ہیں اور اسے میجر عظمت چیک بھی کر لے گا ۔ بارہ چودہ روز پہلے ارشد طاہر کو راولپنڈی چیک اَپ کے لیے میجر عظمت کے پاس لے جا چکا تھا ۔ میجر عظمت ابھی مطمئن نہیں تھا ۔ اُس نے ارشد کے ساتھ علیحدگی میں طاہر کے متعلق بہت سی باتیں کی تھیں ۔ ارشد میجر عظمت کو عصمت اور طاہر کی محبت کے متعلق پہلے ہی بتا چکا تھا ۔ اب میجر عظمت نے ارشد سے خاص طور پر پوچھا کہ اس لڑکی اور طاہر کی محبت کے اثرات طاہر پر کیا ہیں ۔ ارشد نے بتایا کہ اثرات بڑے اچھے ہیں ۔

اب ارشد اور طاہرہ اصغر کو دیکھنے راولپنڈی گئے تو طاہر کو بھی ساتھ لیتے گئے ۔ وہ ایسے وقت پہنچے جب میجر عظمت ہسپتال میں موجود تھا ۔ وہ اصغر کو دیکھنے سے پہلے میجر عظمت کے پاس چلے گئے ۔ اُس نے طاہر کو اکیلے اپنے پاس بٹھایا اور بہت دیر اُس کا انٹرویو لیتا رہا ۔ پھر اُس نے طاہر سے کہا کہ وہ میجر اصغر کے کمرے میں چلا جاتے ۔ ارشد اور طاہرہ کو اُس نے اپنے پاس بٹھا لیا اور طاہر کی ذہنی کیفیت اور اُس کے برتاؤ اور روّیے کے متعلق پوچھنے لگا ۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد طاہر کی ذہنی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ ہر وقت چپ رہنے لگا تھا ۔ اٹھتا تھا، چلتا پھرتا تھا، باہر بھی نکل جاتا تھا مگر خاموش ، بالکل چُپ ۔ گھر میں اُس کے ساتھ کوئی بات کرتا تو وہ سُن لیتا اور اگر جواب دینا ہوتا تو وہ انتہائی مختصر الفاظ میں جواب دے کر پھر خاموشی میں ڈوب جاتا تھا ۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اپنے کسی خیال میں گُم ہو ۔

عصمت اپنی ماں کی ناراضگی مول لے کر طاہر کے کمرے میں جاتی تھی ۔ دو تین بار ایسے ہُوا کہ

عصمت نے اُس سے کچھ پوچھا تو وہ یوں چُپ رہا جیسے اُس نے سُنا ہی نہ ہو ۔ عصمت نے ہر بار جھنجھوڑ کر اُسے بیدار کیا ۔ ایک بار عصمت اُٹھ کھڑی ہوئی اور طاہر سے کہنے لگی کہ وہ اُس کے پاس نہیں آیا کرے گی ، وہ بولتا تو ہے نہیں ۔

"نہ جانا عصمت !" —— طاہر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا —— "مجھے بتاؤ میں کیا بولوں ، کیا کہوں ۔ مجھے خود معلوم نہیں میں کہاں چلا جاتا ہوں"

ارشد اور طاہرہ نے میجر عظمت کو اُس کی یہ کیفیت تفصیل سے بتائی ۔

"کیفیت یہ بھی ٹھیک نہیں" —— میجر عظمت نے کہا —— "اور یہ بھی ٹھیک نہیں کہ لڑکے کو ہم باقی عمر ذہنی سکون کی گولیاں دیتے چلے جائیں ۔ یہ تو ذہنی بیساکھیاں ہیں مسٹر ارشد ! اتنے ذہین لڑکے کو میں اس حالت میں نہیں رہنے دوں گا ۔ میں نے طاہر کے ذہن لاشعور کو بڑی اچھی طرح دیکھ لیا ہے ۔ آپ کی بھتیجی .... کیا نام ہے اُس کا ! .... ہاں ! عصمت .... میں نے طاہر کے ساتھ عصمت کے متعلق بہت سی باتیں کی ہیں ۔ یہ لڑکی طاہر کے ذہن کی گہرائیوں میں اُتری ہوئی ہے ۔ آپ اس کے ساتھ طاہر کی شادی کر دیں ۔ لڑکا جلدی ٹھیک ہو جاتے گا ۔ وہ آپ کے بھائی کی بیٹی ہے ۔ آپ کو کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی"

"یہ ایک اور مسئلہ ہے ڈاکٹر صاحب !" —— ارشد نے کہا —— "مجھے اپنے بچّے کے لیے ایک صدمہ نظر آرہا ہے .... عصمت ہے تو میری بھتیجی لیکن اُس کی ماں نہیں چاہتی کہ شادی تو دُور کی بات ہے ، لڑکی طاہر کے پاس بیٹھے بھی ۔ وہ عصمت کا رشتہ کہیں اور دینا چاہتی ہے ۔ اگر ایسا ہو گیا تو طاہر کا بالکل ہی پاگل ہو جانا حیران کن نہیں ہو گا"

"لڑکی کے باپ کا روّیہ کیا ہے ؟"

"وہ تو طاہر کو اپنے بچّوں کی طرح چاہتے ہیں" —— ارشد نے جواب دیا —— "لیکن لڑکی کی ماں اُن کی ناراضگی مول لینے کو بھی تیار ہے "

"میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا" —— میجر عظمت نے کہا —— "آپ کو ایک طریقہ بتایا ہے جو لڑکے کے علاج میں بہت مدد دے گا ۔ لڑکی کے والد سے کہیں کہ وہ لڑکی کی ماں پر اپنا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کریں"

"یہ ایک ایسا خطرہ ہو گا جو اِن بچّوں کی ازدواجی زندگی پر ہمیشہ منڈلاتا رہے گا" —— ارشد نے کہا —— "یہ خاتون ہمارے بیٹے کو ساری عمر نہیں بخشے گی"

"میں عصمت کی ماں سے بات کر چکی ہوں" —— طاہرہ نے کہا —— "وہ تو ہمارے بیٹے کا نام نہیں سننا چاہتی —— لفظ 'پاگل' اُس کی زبان پر چڑھا ہُوا ہے"

"میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ طاہر کے لیے ناقابل برداشت صدمہ ہو گا" —— ارشد نے کہا ۔

کچھ دیر تک وہ اِسی موضوع پر باتیں کرتے رہے ۔ میجر عظمت نے انہیں بتایا کہ قومی جذبوں کا اپنا ایک مقام ہے لیکن یہ جذبے انسان کی فطرت کے جذبوں ، احساسات اور ضروریات کو ختم نہیں کر سکتے ، ان پر غالب آجاتے ہیں پھر ایک وقت آتا ہے جب انسان ذہنی طور پر ابنارمل ہو جاتا

ہے۔ اُسے ہم فلسفی، مفکر، عظیم اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ میجر عظمت نے کہا کہ اُس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ طاہر کے جذبے کو مارنے کے لیے اُسے ایک خوبصورت لڑکی دے دی جاتے۔ طاہر کو جس جذبے اور احساس نے ذہنی مریض بنا رکھا ہے اسے مارا نہیں جاسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی پسند کی لڑکی کی رفاقت اُسے اعتدال پر لے آتے گی۔ وہ تنہا نہیں ہو گا۔

"مسز ارشد!" — میجر عظمت نے طاہرہ سے کہا — "میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ لڑکا آپ کو ہی اپنی ماں سمجھتا ہے اور آپ اسے اپنا بیٹا سمجھتی ہیں لیکن انسان اپنی نفسیات کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ سگی ماں کی موت کی خلش طاہر کے لاشعور میں نہ صرف موجود ہے بلکہ سرگرم ہے۔ طاہر کو شعوری طور پر احساس نہیں۔ وہ آپ کو ہی ماں سمجھتا ہے لیکن لاشعور اسے ڈستا رہتا ہے۔ اس زہر سے بچنے کا بہترین ذریعہ، بلکہ واحد ذریعہ عصمت ہے ..... یہ نفسیات کے لگے بندھے اصول ہیں۔ ان سے کوئی پیغمبر ہی بچ سکتا ہے ..... آپ کوشش جاری رکھیں کہ اسے عصمت بیوی کی حیثیت سے مل جاتے۔ میں اسے ایک ماہ اور گھر رہنے کے لیے چھٹی دے دیتا ہوں۔ آپ اسے وہی دوائیاں دیتے رہیں"۔

طاہر پرویز میجر اصغر کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ اصغر اُسے مشرقی پاکستان کی جنگ اور اپنے زخمی ہونے کی تفصیلات سنا چکا تھا۔

"تمہیں یاد ہو گا طاہری!" — اصغر نے کہا — "جب تم کہا کرتے تھے کہ تم آرمی میں جانا چاہتے ہو تو میں نے تمہیں کہا تھا کہ جذباتی افسر اور جوان جنگ میں فوج کو نقصان دے سکتے ہیں، کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔ تم نے اِس اصول کو صحیح ثابت کر دیا ہے۔ جنگ ٹھنڈے مزاج سے اور دماغ سے لڑی جاتی ہے۔ شکست بھی ہوتی ہے۔ شکست ہو جاتے تو دیواروں سے اپنے سر نہیں پھوڑے جاتے۔ شکست کو فتح میں بدلنے اور شکست کا انتقام لینے کے لیے جذبات سے نکل کر عقل سے کام لیا جاتا ہے۔ شکست کو قبول نہ کرو۔ شکست ایک جھٹکہ ہوتا ہے جو قدرت کسی قوم کو بیدار کرنے کے لیے دیتی ہے۔ قومیں وہی ابھرتی ہیں جو قدرت کے جھٹکوں سے کچھ سبق لیتی ہیں۔ اپنے گریبان میں مُنہ ڈال لیتی ہیں"۔

"ہمارے ہاں تو کچھ اور ہو رہا ہے بھائی جان!" — طاہر نے کہا — "مشرقی پاکستان کے سقوط کو فوج کی شکست کہا جا رہا ہے، بلکہ فوج کو ذلیل اور رُسوا کیا جا رہا ہے"۔

"مشرقی پاکستان کی جنگ پاک بھارت جنگ بن گئی تھی" — میجر اصغر نے کہا — "یہ دراصل پاکستان کے اپنے لیڈروں کی جنگ تھی۔ یہ اقتدار کی جنگ تھی، یہ اُس کرسی کی جنگ تھی جس کی خاطر دین و ایمان الگ رکھ کر جھوٹ بولے جاتے ہیں۔ ان لیڈروں نے آدھا پاکستان دے کر اقتدار حاصل کیا ہے"۔

"پھر شکست کا انتقام کون لے گا؟" — طاہر پرویز نے پوچھا۔

"تم انتقام لو گے شکست کا!" — اصغر نے کہا — "میں انتقام لُوں گا۔ وہ جو آج دشمن کے ملک میں قیدی کیمپوں میں پڑے ہیں، شکست کا انتقام لیں گے لیکن ضروری نہیں کہ ہم اپنی زندگی میں انتقام لے سکیں۔ ہمارے بچّے ہماری شکست کو فتح میں بدلیں گے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں میں یہ جذبہ پیدا کریں۔ جس کے ہاں بچہ پیدا ہو، وہ بچّے کے کان میں اذان کے بعد یہ الفاظ کہے کہ تمہیں پاکستان کی شکست کا انتقام لینا ہے۔ اب میں اور تم یہی فرض ادا کریں گے کہ قومی غیرت کو اپنے بچّوں کی فطرت کا جزو بنائیں گے، فطرت کا بنیادی پتھر غیرت ہو گا"۔

طاہر انہماک سے سُن رہا تھا۔

"ہوش میں آؤ طاہری!" — اصغر نے کہا — "مجھے میرے ابّو، امّی اور شازی تمہارے متعلق بہت کچھ بتا گئی ہیں۔ بیدار ہونے کی کوشش کرو۔ حقائق میں آجاؤ۔ مجھے جب ڈھاکہ سی۔ ایم۔ ایچ سے اُٹھا کر انڈیا کے ایک سی۔ ایم۔ ایچ لے آتے تو ایک روز میرے آنسو نکل آتے۔ اتفاق سے ایک سکھ لیفٹیننٹ کرنل آ گیا۔ اُس نے میرے آنسو دیکھ لیے۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا — 'تم صرف اِس لیے رو رہے ہو کہ تم نے ذہنی طور پر شکست کو قبول کر لیا ہے اور یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ بس، بات ختم ہو گئی ہے۔ بیوقوف آدمی! تمہارا اصل کام تو اب شروع ہُوا ہے۔ تمہیں اِس شکست کا بدلہ لینا ہے اور تم یہاں لیٹے ہوتے رو رہے ہو۔ ایسٹ پاکستان میں تو لڑائی ہوتی ہی نہیں تھی۔ یہ تو کوئی لڑائی نہیں تھی کہ بارہ ڈویژنوں نے تین ڈویژنوں پر قابو پا لیا۔ تم مورچوں میں بیٹھے رہے اور ہم خالی علاقوں سے آگے نکل گئے اور ڈھاکہ پہنچ گئے۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے ایک ہجوم نے چند ایک نہتے آدمیوں کو دبوچ لیا ہو..... مت رو میرے دوست! اپنا مورال اور حوصلہ قائم رکھو اور جوابی وار کرنے کی سوچو، اور یہ بھی سُن لو۔ انڈین آرمی پاکستان آرمی کو شکست نہیں دے سکتی۔ تمہیں دھوکے میں مروایا گیا ہے۔ تمہیں تمہارے ملک کی سیاست نے مروایا ہے۔ تمہارے ملک کی سیاست کبھی سیاسی لیڈروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے کبھی جرنیل جھپٹا مار کر اُن سے سیاست چھین لیتے ہیں۔ یہی پاکستان کی بدنصیبی ہے'.....

"طاہری! اس سکھ نے میری آنکھیں کھول دیں اور میرا دماغ روشن کر دیا، پھر میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی نہیں آئی۔ تم بھی دماغ روشن کر لو" — اصغر نے مُسکرا کر کہا — "سُنا ہے عصمت دن رات تمہارے ساتھ رہتی ہے۔ کیا اُس کے ساتھ بھی ذہنی مریض بنے رہتے ہو؟"

"اُس کی بات کچھ اور ہے بھائی جان!" — طاہر نے کہا — "وہ مجھے ذہنی مریض نہیں رہنے دیتی لیکن اُس کی ماں مجھے پاگل کہتی ہے"۔

"شادی تو اس کے ساتھ ہو رہی ہے نا!"

"نہ جی!" — طاہر نے کہا — "اُس کی ماں کہتی ہے کہ پاگلوں کو کون بیٹی دیتا ہے" — اُس نے آہ بھی لی اور مُسکرایا بھی اور کہنے لگا — "معلوم ہوتا ہے مجھے ایک اور دھچکہ لگے گا"۔

"دھچکہ لگنے سے پہلے ٹھیک ہو جاؤ" — میجر اصغر نے کہا — "یہ نشے والی گولیاں چھوڑ دو۔ ..... میں تمہیں ایک اور بات بتا دوں۔ یہ گولیاں تمہیں جسمانی لحاظ سے بیکار کر دیں گی۔ شادی کے قابل نہیں رہو گے"۔

"اگر مجھے عصمت نہ ملی تو میں شادی کروں گا ہی نہیں" — طاہر نے کہا — "کسی اور لڑکی کے

لیے میں شادی کے قابل ہوں گا ہی نہیں۔"

ارشد اور طاہرہ آ گئے۔ بیجر اصغر سے وہ بہت پیار سے ملے۔ کچھ باتیں آہوں اور آنسوؤں نے کیں۔ طاہر کی شادی کی باتیں ہوئیں اور ارشد، طاہرہ اور طاہر پرویز وہاں سے نجمہ اور اطہر کے ہاں چلے گئے۔

وہ دوسرے روز لاہور واپس چلے گئے۔ یوسف، زینت اور عصمت کو انہوں نے پریشانی کے عالم میں دیکھا۔ عصمت کا چھوٹا بھائی جس کی عمر چودہ سال تھی بخار میں مبتلا تھا۔ خیال تھا کہ ملیریا ہے لیکن دوائی سے ذرا سا بھی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ ایک اور ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ اُس نے ٹائیفائیڈ بتایا اور اس کے مطابق دوائیاں دے دیں۔ ان سے بھی افاقہ نہ ہوا۔

دو دن اور گزر گئے۔ درجۂ حرارت ذرا سا بھی نہ گرا۔ بچہ جل رہا تھا۔ پھر ایک رات ایسی آئی کہ بچے کی حالت بگڑ گئی۔ رات آدھی گزر گئی تھی۔ بچے کے کراہنے کی آوازوں پر اس کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اُٹھ کر دیکھا۔ بچہ بڑبڑا رہا تھا۔ وہ پیٹھ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بچے کی اتنی خوبصورت آنکھیں لال سرخ ہو گئی تھیں۔ ماں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی لوہے کی طرح تپ رہی تھی۔

"وہ کہتے ہیں تم پاگل ہو"— بچہ بخار کی شدت کی وجہ سے ہذیانی کیفیت میں بول رہا تھا —
"میں کہتا ہوں تم سب پاگل ہو"— بچہ زور سے ہنسا۔ پھر یکلخت چپ ہو گیا۔ ذرا دیر بعد بولا —"میں کل پاگل خانے جاؤں گا.... میں ہوائی جہاز چلاؤں گا.... طاہر بھائی جان کیا کہتے ہیں؟ وہ بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ میں اُن سے زیادہ اچھی باتیں کیا کروں گا۔"

اُس کی ماں کو چکر آ گیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ بخار بچے کے سر کو چڑھ گیا ہے، اُس کے ذہن میں کچھ اور ہی سوچیں آنے لگیں۔ اُس پر اس قسم کا خوف طاری ہو گیا جیسے اُس کا بچہ پاگل ہو گیا ہو۔ اُسے یہ خیال بھی نہ آیا کہ بچے کے باپ کو اور ارشد کو جگا لاتے۔ ایسے لگتا تھا جیسے اُس کے بچے کی یہ ہذیانی باتیں اُس کے ضمیر پر پتھروں کی طرح پڑ رہی ہوں۔ وہ خود گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھی تھی اُس کے اپنے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔

بچہ بڑی تیزی سے کچھ بڑبڑا رہا تھا لیکن کوئی لفظ صاف نہیں تھا۔ وہ بولتے بولتے ہنس پڑا۔ پھر صاف الفاظ میں بولا —"میرا تانگہ کہاں کھڑا ہے؟ میں انڈیا جا رہا ہوں"— اس کے بعد بچہ پھر غیر مبہم الفاظ بڑبڑانے لگا۔

"کسی کے بچے کو پاگل نہ کہو زینت! تم خود اولاد والی ہو"— یہ ایک بھاری بھرکم سی آواز تھی جو زینت کو سنائی دی۔ اُس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ کمرے میں ہر سُو دیکھا۔ اُسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ اُس کی خوفزدہ نظریں اس آواز کی بھٹکتی ہوئی گونج کا تعاقب کرنے لگیں۔ یہ آواز اُس کے خاوند کی تھی اور یہ بہت دن پہلے کی آواز تھی۔ زینت نے اپنے بچے کی طرف دیکھا۔ اُسے بلایا۔ اُس کا ماتھا چُوما لیکن بچے کو جیسے محسوس ہی نہ ہوا ہو کہ اُس کی ماں اُس کے پاس بیٹھی ہے۔

"خدا جو دیتا ہے وہ لے بھی لیتا ہے"— زینت کو ایک اور گونجدار آواز سنائی دی۔

زینت اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ اُس نے اپنے چودہ سالہ بیٹے کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر اُسے یُوں اپنی گود میں رکھ لیا جیسے وہ چودہ مہینوں کا دُودھ پیتا بچہ ہو۔ اُسے یوں چھپانے لگی جیسے کوئی بڑی خوفناک چیز کمرے میں آ گئی ہو اور اُس کے بچے پر جھپٹ رہی ہو۔ بخار نے بچے کا جسم شعلہ بنا رکھا تھا۔

زینت کو صاف طور پر محسوس ہونے لگا جیسے اُس کا ضمیر اس پر طعنوں کے تیر چلا رہا ہو اور موت کمرے کی دہلیز کو پھلانگ آئی ہو۔

"کسی کے بچے کو پاگل نہ کہو زینت!"— اُسے وہی آواز پہلے سے زیادہ زوردار اور قہر آلود محسوس ہوئی۔

اُسے یوں لگا جیسے کسی غیبی قوت نے اُسے للکار کر کہا ہو کہ تمہارا بیٹا بھی پاگل ہو گیا ہے۔

وہ خوفزدگی کی انتہا تک جا پہنچی۔ اُس نے بچے کو لٹا دیا۔ تیزی سے اٹھی اور قبلہ رُو ہو کر ہاتھ پھیلا دیئے۔ دُکھی ہوئی آواز میں بولی —"مجھ سے مانگ میرے خُدا! بچے کے عوض کیا مانگتا ہے۔ اپنے بچے کے لیے میں جان دینے کے لیے تیار ہوں.... میں کسی کو پاگل نہیں کہوں گی...... خدائے ذوالجلال! میری زبان کے گناہ کی سزا میرے بچے کو نہ دے.... میں تیرے نام کا صدقہ دوں گی"— اُس کی آواز رقت میں دب گئی۔ پھر وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد زینت کا بیٹا سو گیا۔ زینت نے اُس کے ماتھے اور گالوں پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے محسوس کیا جیسے حرارت میں کچھ کمی آ گئی ہے۔ بچہ تو سو گیا لیکن اُس نے خود باقی رات اُس کے پاس بیٹھتے جاگتے گزار دی۔

صبح سب سے پہلے زینت کا خاوند یوسف کمرے میں آیا۔ اُس نے زینت کو روتے ہوئے دیکھا۔ زینت نے اُسے بتایا کہ رات بچے کی کیا حالت ہو گئی تھی۔ یوسف اُسے کہہ ہی رہا تھا کہ رات کو اُسے اُسی وقت جگا لیتی کہ اتنے میں طاہر کمرے میں داخل ہوا۔ زینت اور یوسف اُسے دیکھ کر حیران ہوئے کہ وہ اتنی سویرے کیسے آ گیا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ گولیوں کے اثر سے طاہر بہت دیر تک سویا رہتا ہے۔

"آؤ طاہر!"— یوسف نے پوچھا —"تم اتنی سویرے کیسے جاگ پڑے؟"

"اصغر بھائی جان نے کہا تھا کہ یہ گولیاں چھوڑ دو"— طاہر نے جواب دیا —"میں نے ابو اور امّی کو نہیں بتایا تھا۔ میں نے رات کوئی گولی نہیں لی۔ رات میں سو تو گیا تھا لیکن تین بجے سے جاگ رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ مصنوعی نیند سے جاگنا بہتر ہے۔ دو ڈھائی گھنٹوں سے مجھے رشدی (زینت کا بیٹا) کا خیال آ رہا تھا۔ میں اس لیے نہ آیا کہ سب سو رہے ہوں گے۔"

زینت نے اُسے بتایا کہ رات رشدی کی کیا حالت رہی ہے۔ یوسف پریشان تھا کہ کوئی دوائی اثر نہیں کر رہی۔

"تایا جان!" ـــــ طاہر نے کہا ـــــ "اگر مجھے اجازت دیں تو میں رشدی کو ایک ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔ وہ میرے ایک دوست کے والد ہیں۔ بڑے قابل ڈاکٹر ہیں میں اُن کے گھر چلا جاؤں گا۔"

یوسف طاہر کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو کہ یہ لڑکا نارمل حالت میں باتیں کر رہا ہے لیکن زینت کی نظریں کچھ بدلی بدلی سی لگتی تھیں۔ اُس نے اپنے بچے کو رات جس حالت میں دیکھا تھا اس حالت نے اُس کی تو جیسے فطرت ہی بدل ڈالی تھی۔ وہ ماں تھی۔

"لے جاؤ طاہری بیٹا!" ـــــ زینت نے التجا کے لہجے میں کہا ـــــ "کہیں لے جاؤ اسے جتنی دولت لگتی ہے لگا دو۔ کہیں سے اس کا علاج کراؤ۔"

زینت نے یوسف کو بولنے کی مہلت ہی نہ دی۔ طاہر کمرے سے نکل گیا۔ پھر وہ کوٹھی سے نکل گیا اور ایک ٹیکسی لے کر واپس آیا۔ ارشد اور طاہرہ نے جب اُسے ٹیکسی سے اُترتے دیکھا تو وہ پریشان ہو گئے۔ وہ سمجھے کہ طاہر پر پاگل پن کا پھر شدید دورہ پڑا ہے لیکن طاہر کوٹھی کے اندر ہی غائب ہو گیا تھا۔ باہر آیا تو اُس کے ساتھ رشدی تھا جسے وہ سہارا دے کر ٹیکسی کی طرف لے جا رہا تھا۔ یوسف بھی ساتھ چل پڑا لیکن زینت نے اُسے کہا کہ وہ اپنے بچے کے ساتھ جائے گی ـــــ ٹیکسی انہیں لے گئی۔

گھر میں سب فکرمند تھے کہ طاہر بیمار بچے اور اُس کی ماں کو اپنی اس ذہنی کیفیت میں لے کر چلا گیا ہے، خدا خیر کرے لیکن طاہر گھنٹے ڈیڑھ بعد خیریت سے واپس آ گیا۔

شام کو تھرمامیٹر لگا کر دیکھا۔ بخار کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ اگلی صبح دیکھا تو درجہ حرارت نارمل تھا۔ وہ کوئی پرانا تجربہ کار ڈاکٹر تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ یہ نہ ملیریا ہے نہ ٹائیفائیڈ، کسی اور وجہ سے ٹمپریچر ہو گیا ہے۔ بچہ تو تیسرے دن نارمل حالت میں آ گیا لیکن طاہر نارمل نہیں تھا البتہ وہ کوشش پوری کر رہا تھا۔ تنہائی میں اس کی ذہنی حالت بگڑ جاتی تھی۔ زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔

***

رُشدی کے ٹھیک ہو جانے کے تین چار روز بعد کا واقعہ ہے۔ طاہر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے عصمت اُٹھ کر گئی تھی۔ عصمت نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کی ماں کا رویہ کچھ بہتر سا ہو گیا ہے۔ عصمت اُٹھ کر گئی تو طاہرہ آ گئی۔

"طاہری بیٹا!" ـــــ طاہرہ نے شگفتہ سے لہجے میں کہا ـــــ "عصمت نے تمہیں کچھ بتایا نہیں"؟

"نہیں امی!" ـــــ طاہر نے جواب دیا ـــــ "اُس نے تو کچھ نہیں بتایا۔ پھر بھی مجھے پتہ ہے کہ کیا ہُوا ہو گا۔ ماں نے اُسے آج پھر ڈانٹا ہو گا کہ وہ میرے پاس نہ آیا کرے۔"

"نہیں یہ بات نہیں" ـــــ طاہرہ نے کہا ـــــ "آپا زینت میرے پاس آئی تھی"۔

"پھر آپ دونوں کی لڑائی ہوئی کہ نہیں؟"

"نہیں طاہری!" ـــــ طاہرہ نے جواب دیا ـــــ "وہ لڑائی کے لیے نہیں پیار اور محبت کا پیغام لے کر آئی تھی۔ اُس نے عصمت تمہیں دے دی ہے۔"

"جھوٹ نہ بولیں امّی" ـــــ طاہر نے کہا ـــــ "میجر عظمت نے آپ سے کہا ہو گا کہ اس لڑکے کو جھوٹ موٹ کی خوشخبریاں سناتے رہا کرو"۔

یہ جھوٹ موٹ کی خوش خبری نہیں تھی۔ طاہر اللہ کا سپاہی تھا۔ وہ اللہ کی راہ میں اس ذہنی کیفیت کو پہنچا تھا۔ اُسے پاگل کہنے والی کو خدا نے ایسا جھنجھوڑا کہ اُس کا اپنا ضمیر اُسے ملامت کرنے لگا۔ اس ایک جھٹکے نے اُس کے سارے بل نکال دیے۔

چند دنوں بعد طاہر اور عصمت کی شادی کر دی گئی۔

"امّی جان!" ـــــ ازدواجی زندگی کی پہلی صبح طاہر نے طاہرہ سے کہا ـــــ "یہ میرا عہد ہے کہ میں پاکستان کے ملبے میں سے وہ پاکستان نکالوں گا جو آپ نے اور ابو نے بتایا تھا"۔

طاہرہ نے اُس کا منہ چوما اور اُس سے پوچھا ـــــ "بیٹا! تمہاری وہ وردی دُھلوا دوں جس پر خون لگا ہُوا ہے؟"

"نہ امّی جان!" ـــــ طاہر نے کہا ـــــ "اُسے ایسے ہی رہنے دیں۔ خاکی وردی سے لال لہو دُھل گیا تو پیچھے گارڈ آف آنر، سلامی اور سیاست رہ جائے گی"۔

* *